CamScanner

"ماہنامہ تخلیق" کی ادبی سرگرمیوں کی تصویری جھلکیاں

[illegible]

محترم [illegible] (مدیر تخلیق) [illegible]

محترم [illegible]
ہمراہ اعوان اظہر جاوید (ماہنامہ تخلیق)

محترم [illegible]
ہمراہ اعوان اظہر جاوید (مدیر تخلیق)

محترم [illegible]
ہمراہ اعوان اظہر جاوید (مدیر تخلیق)

محترم خلیل الرحمٰن قمر ہمراہ اعوان اظہر جاوید
(ایک تقریب میں (ماہنامہ تخلیق)

محترم [illegible] اور محترم ڈاکٹر [illegible]
[illegible] ماہنامہ تخلیق پیش کرتے ہوئے

محترم [illegible] اور محترم ڈاکٹر فرحت عباس [illegible] تخلیق میں
ہمراہ اعوان اظہر جاوید تخلیق پیش کرتے ہوئے

محترم ڈاکٹر فرحت عباس، محترم [illegible]
ہمراہ اعوان اظہر جاوید (ماہنامہ تخلیق) پیش کرتے ہوئے

محترم [illegible] ہمراہ اعوان اظہر جاوید (مدیر تخلیق)
محترم [illegible] ہمراہ (مدیر تخلیق)

محترم [illegible] ہمراہ اعوان اظہر جاوید (مدیر تخلیق)
محترم کاشف منظور [illegible] ہمراہ (مدیر تخلیق)

محترمہ [illegible] ہمراہ اعوان اظہر جاوید (مدیر تخلیق)
محترم [illegible] ہمراہ (مدیر تخلیق)

محترم [illegible]

محترم [illegible]

محترم [illegible] عباس شاہ

محترم ڈاکٹر [illegible] خان

محترم خالد شریف [illegible]
[illegible] تخلیق

CamScanner

مسلسل اشاعت کا 55 واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصۂ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 55 | دسمبر 2023ء | شمارہ : 4 | CPL نمبر 96

قیمت : -/500 روپے —— 2,500 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر —— ہندوستان کے لیے 3,500 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

ماہنامہ "تخلیق" بینک اکاؤنٹ نمبر : 202-777-434 یو بی ایل واپڈا ہاؤس برانچ لاہور 1236

ماہنامہ "تخلیق" ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر : 0323-9526505

موبائل فون: 0321-8899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نفیر جہاں (امریکہ) —— ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ) —— نارنگ ساقی (انڈیا) —— جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جانِ آفریں کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نو وارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رواں رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''عصریہ''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (ان شاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

55 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، ڈاکٹر فوقیہ مشتاق، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف -/3,500 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Opposite (Toyota Cantt Motor), Main Chowk, Walton Road, Lahore-Cantt. (04237187500 - 04236671007)

U.S.A.
Nayyar Jahan
[illegible] South Barrington
AVE Los Angeles
C.A. USA
Ph: [illegible]
Email: [illegible]
[illegible]

U.S.A.
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
Ph: [illegible]
Email: [illegible]

INDIA
K.L. Narang Saqi
[illegible] Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: [illegible]
Email: [illegible]

PAKISTAN
Javed Manzoor
[illegible]
[illegible] Road, Lahore
Ph: [illegible]
Cell: [illegible]
Email: [illegible]

○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

ترتیب

پہلی بات	سونان اظہر جاوید	5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ	صفدر صدیق رضی	7
حمد باری تعالیٰ	ڈاکٹر سید رضی	
حمد باری تعالیٰ	ڈاکٹر احمد ندیم (امریکہ)	
نعت رسول مقبولؐ	خالد اقبال یاسر	
نعت رسول مقبولؐ	نسیم سحر	
نعت رسول مقبولؐ	ڈاکٹر ایوب ندیم	8

مضامین

رفیع الدین راز کا نیا شعری مجموعہ	محمود شام	9
ڈاکٹر انور سدید کی یاد میں	ڈاکٹر زاہد منیر عامر	13
تحمید کردگار، صورت امر	ڈاکٹر نجیب جمال	16
غالب فہمی اور تنقید میں	ڈاکٹر یونس خیال	19
کھوٹا ... ناول کی تحریک	ڈاکٹر ناصر شہزاد	24
منٹو زندہ ہے	نعیم احمد بشیر	26
دکھیر میں فروغ سخن کے بنیادی کردار	عامر اعجاز	29
شہر میں گاؤں ... غلام عقیل	جمیل سروقی (انڈیا)	37
قلب کی زمین	فوزیہ الست ہاشمی	40
دو سکوت صدا ...	ڈاکٹر فرید الدین راہی	44
میلان امام ناصر الدین شیرازی ...	خالد عبداللہ قمی	45

گوشۂ خاص

چند گفتگوئیں	ڈاکٹر اسلم انصاری	47
خاک سے اٹھنے والا آدمی	ڈاکٹر عباس جعفری	51

منظومات

75 برس یوم آزادی پر ایک خواب	ڈاکٹر انعام الحق	57
غزل	گلزار بخاری	
مرا اعت	صفدر صدیق رضی	
ایک تحمید و ادائی علم	ایوب خاور	
میں عورت ہوں	نعیم احمد بشیر	
اف اللہ	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال	
ترے گداز	امجد ناز	
قا وجے	انور زاہد علوی	
قوافیے	عاصم بخاری	
اجنبی روح	فوزیہ مشتاق (امریکہ)	
آخر تصور	محمد نظام	
ماں		60

سرائیکی اور پنجابی گوشہ

دا (تجوک)	مسرت کلانچوی	61
سے بلی پیلی	تسلیم کوثر	63

افسانے

وہ ایک ماں تھی	حفیظ باوا	67
مجرم	طارق بلوچ صحرائی	70
بلی	نیلما ناہید درانی (کینیڈا)	73
سنگم	اقبال خورشید	75
دل جلے	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال	78
ہیروشیما	حمید رازی	82
میکا	ڈاکٹر فضیلت بانو	86
مصنف	ڈاکٹر وحید (آسٹریلیا)	90
بے چارگی	شیخ تحسین خان	92
لاحاصل	امتیاز نسیم	96

غزلیں

ندا انصاری، حماد ظفر، انور شعور، آصف ثاقب، محمود شام، خالد اقبال یاسر، قیصر نجفی، سید ریاض حسین، اقتدار جاوید، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، مسلم شمیم، احمد صغیر صدیقی، بیدار سرمدی، خاور اعجاز، اسلم سحاب ہاشمی، اختر فرخ، شاہد ذکی، شیخ محمد اقبال، احمد ندیم رفیع، احمد نواز، شہباز انور خان، طاہر حنفی، غلام شبیر، اسد نجیم، احسان بٹ، شفقت حسین شفق، اظہر سلیم، وسیم جبران، احمد سجاد، آکاش، اسماعیل عباس، شاہانہ شفق، شاہد بیدار، عاصم بخاری، علی کاظم 99 — 109

سفرنامہ

سفرنامہ تھائی لینڈ	ڈاکٹر محمد رفیق خان	110

پنجاب رنگ

شیدا دا شان دی اگی دے نال	حنیف باوا	116
الٹے شاہ دی ول	سلیم شہزاد	
پنجابی	اظہر جاوید	
یار کولوں	سلیم شہزاد	
بیت	محمد عباس مرزا	117

موسیقی

تریاق نگر	ڈاکٹر امجد پرویز	118

جائزے

نئے افکار کے نام (خطوط) تجزیہ	جمیل احمد عدیل	121
چاند میرا انجم، سفر، فکر و شاعری کا	شاہین زیدی	127
اردو ڈراما کی تنقیدی روایت	شمیم سید	132

تبصرے نسیم سحر کے

مسافر عمر جاں	سرفراز سید	137
بانسری میں چاند	محسن عباسی	
ڈاکٹر سعد تنویر (ادبی جہات)	ڈاکٹر سعید حیات	
فلک تحسین لوگ	ہارون الرشید تبسم	
تفہیم قرآن	سید مبارک علی شمسی	
نئی رت کی خوشبو	محمد خان	
اونچے پہاڑ سے	حمید رازی	145

انجمن خیال

محمود شام، سلطان سکون، ایم زیڈ کنول، آصف ثاقب، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، محمد اقبال صمصام، خاقان ساجد، محمد طارق علی، محمد اسلم، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، خالد عبداللہ وقاص، شہباز انور خان، ممتاز راشد لاہوری، ماجد وفا عابدی، شاہد بیدار 140 — 159

تخلیق کو موصول رسائل و کتب

علمی اور غیر علمی 160

12واں تخلیق ایوارڈ 2023ء ..... محترم نسیم سحر (راولپنڈی)

12واں تخلیق ایوارڈ کمیٹی کے جج صاحبان کے نام

ٹیلی فونک رابطہ: 1۔ محترمہ صفیہ حیات 2۔ محترم غلام حسین ساجد

1۔ محترم خالد شریف 2۔ محترم عزت عباس شاہ 3۔ محترم ڈاکٹر محمد رفیق 4۔ محترم حمید رازی 5۔ خاکسار سونان اظہر

سرورق

حنیف سوان

بانی مدیر "تخلیق" 1969-2012

طابع: بیدار سرمدی

مطبع: پبلیکس پرنٹرز گلشن راوی، لاہور

دفتر "تخلیق"

H. No. E-12, Sheraz Villas, Phase-I,
Mian Chowk, Madina Colony, Walton Road,
Lahore -Cantt.

0321-8899007, 042-37187500

E-mail : ajavedtakhleeq@gmail.com

(اداریہ کے حقوق محفوظ)

o بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o

پہلی بات

موجودہ پاکستان کے نامساعد حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمیں آزادی لینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ انگریزوں کا دور تو آج کے موجودہ دور سے بہت بہتر تھا۔ کیا پاکستان ایک آزاد ملک ہے؟ کیا ہم بحیثیت قوم آزاد ہیں بھی یا نہیں؟ تاریخ صرف فتوحات کی ہے۔ میں پاکستان کے تمام اداروں کا آئین اور قانون کے مطابق احترام کرتا ہوں، خاص طور پر فوج جیسے ادارے کا لیکن یہ حقیقت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ پاکستان میں اگر کوئی ادارہ طاقت کا سرچشمہ ہے تو وہ فوج ہی ہے۔ پاکستان اپنی 76 سالہ زندگی کے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ہم صرف سیاست دانوں کی بات کرتے ہیں اور اپنی تمام تر ناکامیوں کا سارا ملبہ ان کی کرپشن اور بدعنوانیوں پر ڈالتے ہیں۔ ہم نے بحیثیت قوم کبھی باقی اداروں کے احتساب کے لیے بھی غور ہی نہیں کیا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاست دانوں نے غلطیاں کیں اور ہم نے اپنے ووٹ کی طاقت سے انہیں دوبارہ منتخب نہ کر کے کسی حد تک اپنی حق تلفی کا بدلہ لیا۔ پھر ان ہی سیاست دانوں کو جیلیں بھی کاٹنی پڑیں، جلاوطنی کا کرب بھی ان کا مقدر ٹھہرا مگر عام لوگوں کا نشانہ بھی یہ سیاست دان ہی بنے اور بعض دفعہ تو ان کو جبراً پھانسی کا پھندا بھی چومنا پڑا۔ اگر ملک کو تباہی کی دہلیز پر پہنچانے والے باقی اداروں کی نگاہ ہی ضروری امر ہے۔ اعلیٰ عدل کسی بھی ملک کی ساکھ اور اس کے عدالتی نظام کا آئینہ ہوتا ہے لیکن ہماری عدلیہ نے کیسے کیسے بے ضمیر ججوں کو جنم دیا ہے۔ جنہوں نے کبھی نظریہ ضرورت کے پیش نظر اور کبھی برسر اقتدار حلقوں کو خوش کرنے کے لیے انصاف کے پلڑے کو جس طرف چاہا جھکا دیا۔ دوران ملازمت یا ریٹائرمنٹ کے بعد ہم کسی جج کو انصاف کے کٹہرے میں نہ لا سکے؟ آج جج صاحبان اپنے بیوی بچوں کے حلقوں کے مددگار نہیں تو سیاست دان اور بیوروکریسی کا احتساب کیسے ممکن ہے؟ ہمارے ملک کی دوسری تلخ حقیقت کالا دھن جاگیردارانہ نظام کا ہے۔ ہر طاقت ور قانون سے بالاتر ہے۔ غریب اور امیر کے لیے الگ الگ قوانین ہیں۔ پچھلے دنوں ایک خبر نظر سے گزری۔ سابق مشیر میں واپڈا لیفٹیننٹ جنرل مزمل حسین کو نیب میں 753 ملین ادا کر دیا۔ غریب 48 ارب روپے کی مبینہ کرپشن پر طلب کیا گیا مگر طاقت ور ہونے کی وجہ سے نہ پیش ہوئے اور آج بھی آزاد گھوم رہے ہیں اور دوسری طرف ایک کنڈا لگا کر ایک بلب جلانے والے کو بجلی چور کہہ کر فوراً گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے حامی لوگ لینڈ مافیا، پٹواری، ملا، بزنس مافیا، پولیس مافیا کی سرپرستی کر کے انہیں کسی بھی کارگر ہونے نہیں دیتے تاکہ ان کے تحفظ سے ان کی غاصبانہ سوچ ایک مخصوص طبقے پر قائم رہے۔ اس ملک میں طاقت کس طرح اصولوں پر حاوی ہوتی ہے۔ قانون کیا ہے؟ ''عدالت کو کیا نہیں کرنا چاہیے؟'' کیا ہمیں عدالتی نظام کے پوسٹ مارٹم کی اشد ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے کی اخلاقی تباہی کا ذمہ دار تیسرا ہمارا اعمال بھاری قرض ہے۔ بعض مذہبی سکالرز، علمائے دین اور مفتی صاحبان نے کشمیر کی آزادی کا نعرہ لگا کر عوام کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ حالانکہ آج تک اس سلسلے میں ایک بھی تک ہم نے نہیں ماری۔ آخری خون کے قطرے تک جہاں لڑتے اور کبھی پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی خواہش میں دونوں ہاتھوں سے ملک کے سرمایہ کو لوٹا۔ ان مٹھی بھر شرفا نے نہ صرف فرقوں میں نفرت اور تفرقات کو پیدا کیا بلکہ دین کو وسعت دے کر بیان کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بعض علمائے دین نے مذہب کو ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' سمجھ کر توڑ مروڑ کر اپنی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جیسے چاہا استعمال کیا۔ ایسے ایسے دلائل پیش کیے کہ ہر صاحبِ عقل دنگ رہ جاتا ہے۔ ہمارے معاشی زوال کی طویل داستان کے کرداروں میں ایک کردار رشوت خور اور ناقدر شناس بھی آتے ہیں جنہوں نے ضمیر ہاتھ میں لیے اپنی اپنی بولی کے منتظر اداروں میں لگے ہوئے ہیں۔ ملک روشن کرنے میں اس ملک کے میڈیا کا چہرہ صاف دیکھا جاسکتا ہے جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے ایک میڈیا ہاؤس گروپ کے ذریعے عوام کے غیظ و غضب کا رخ پر نکال کر کئی صحافیوں کا انہوں نے مراعات دیں۔

آج کے سوشل میڈیا، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا پر وہی کچھ دکھایا جاتا ہے جو برسراقتدار حکمرانوں کی خواہشات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ حکمرانوں کے پیدا ہونے والے طبقہ عوام کو ذاتی طور پر غلام بنانے کی مسلسل کوشش میں لگا رہتا ہے تاکہ کوئی بھی باشعور انسان اپنے حق کے لیے کھڑا نہ ہو سکے۔ ان میں شامل کالی بھیڑوں کی نشاندہی بھی اہم ہے کا واحد طریقہ ہے۔ اب تک دو وزیراعظم قتل ہوئے اور وزیراعظم اسمبلی سے عدم اعتماد کا ووٹ لینے میں ناکام رہے۔ اس لابنگ میں میڈیا کا ایک منصوبہ کردار رہا ہے۔ میرے ملک کا ایک المیہ فوج بھی ہے۔ فوج کسی بھی ملک کی دفاعی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کا بنیادی کام ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت ہوتا ہے لیکن پاکستان جیسے ملک میں فوج اپنی قائم کردہ معاشی سلطنت کی بھی محافظ ہے۔ فوج کی اہمیت مسلم ہے لیکن ہماری فوج شاید واحد فوج ہے جسے سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ کاروبار کرنے کی بھی مکمل اجازت حاصل ہے

۔ پاکستان میں صرف 32 فیکٹریاں ہیں جس کے تمام انتظامات فوج کے ذمہ ہیں۔ ایک سوال میرے دل و دماغ میں اکثر گردش کرتا رہتا ہے کہ ہمارے ملک کا ایلیٹ طبقہ ریٹائر ہونے کے بعد یہ وطن ملک چھوڑ کر اپنی فیملیوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کیوں اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔ بیوروکریٹس، چیف جسٹس، سینئر صحافی اور بیشتر جرنیل جو ساری زندگی کے لئے اپنے ملک کی مٹی سے وفا کا عہد اٹھاتے ہیں۔ اپنی عمر بھر کی کمائی تمام دولت اور زندگی کے باقی دن عیش و عشرت سے بسر کرنے کے لئے اپنی سرزمین کو بھی رہنے کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ ان میں سے اکثر وہاں جزیروں کے مالک ہیں۔ آسٹریلیا میں ایک جزیرے کی مالیت 1000 ارب روپے ہے جو صرف ایک ریٹائرڈ جنرل کی ملکیت بتائی جا رہی ہے۔ امریکہ، نیویارک، لندن، فرانس اور سعودی عرب میں کروڑوں ڈالرز کی اپارٹمنٹس کے مالک ہیں۔ وہاں کے بہترین بزنس وہ چلا رہے ہیں جس کے کاروبار کی شاخیں دنیا کے کئی ممالک تک پھیلی ہوئی ہیں تو کیا ایلیٹ کلاس ان غیر ملکی آقاؤں کی خدمت گزار نہیں جو پہلے بھی ان کے مفادات کو مقدم سمجھتے تھے اور اب ان کی سرپرستی میں حکومتیں گرانے اور حکومتیں بنانے جیسے مقاصد کے لئے بھی متحرک ہو جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق بیرون ملک 50 ہزار اعلیٰ عہدوں پر فوجی آفسران متعین ہیں مگر میری تشویش کی وجہ بیرون ملک ہے!!! برٹش اسٹیبلشمنٹ کا شعبہ ہے جس کے چنگل میں میری قوم کے دشمن یہ انتظام کا راز پنہاں ہے۔ ہم شاید 76 سال سے نہیں بلکہ 350 سال سے ہی ایسے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری ساری تاریخ ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مجھے آزاد پاکستان، نیا پاکستان، پرانا پاکستان کی زندگی سے غلام پاکستان بہتر لگا جہاں کچھ تو قواعد و ضوابط کی پابندی ہوتی تھی۔ اگر آپ کو میری بات سے اختلاف ہو تو فرانسیسی سیاح برنیئر جو فرانس کا رہنے والا تھا وہ بارہ سال (1658 سے 1670) ہندوستان میں رہا، اس کا سفرنامہ ضرور پڑھیے۔ اس زمانے کے مسلمان اور آج کے مسلمان میں کیا فرق ہے؟ برنیئر لکھتا ہے کہ "مغل دربار، شاہی خاندان، مغل سلطنت، شہزادوں اور شہزادیوں کے رسم و رواج کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حکمرانی کے نشے میں چور بادشاہوں کے ہاتھوں بھائیوں اور ان کے خاندان کے کٹے سر اور تخت کو خون آلود ہوتے دیکھا۔ چاپلوس بہت ہی تیز اور ذہین تھے۔ خوشامد کا دور عروج پر تھا۔ وزراء، گورنر اور سرکاری اہلکار دو دو گھنٹے خوشامد کرتے۔ بازار عجیب تھے۔ قریب المرگ جانوروں کا گوشت سرعام فروخت ہوتا۔ اہم دستاویزات پر سرکاری مہر لگانے کے لئے اعلیٰ درباری اہلکاروں کو رشوت دی جاتی۔ اشرافیہ طوائفوں کی دلدادہ تھی۔ بادشاہ اپنے پروٹوکول میں پچاس ہزار اور دو دو سو کا قافلہ جن کا سامان اٹھانے ہوتے تھے، ساتھ لے کر چلتے۔ تخت کے قریب اردو بیچے کے لئے 3 کروڑ کی خطیر رقم پھینک دی جاتی۔ مصنف لکھتا ہے کہ مجرم دلال تو پکڑے ہی نہیں جاتے اور اگر پکڑے جائیں تو رشوت دے کر چھوٹ جاتے ہیں۔ برنیئر کے سفرنامے میں لکھی ساری تحریر پڑھ کر مجھے لگا کہ ہم کئی سو سال سے ایسے ہی رہے ہیں۔ کاش ان سب رنگین خداؤں کا تاریخ کے ایک اور کردار بہادر شاہ ظفر کا انجام پڑھنا نصیب ہو کہ کس طرح بے چارہ اور مغل بادشاہ آخری سانسوں کے لئے بھی آزادی کی ہوا کی حسرت رہی۔ کس طرح اس نے رنگون میں جلاوطنی کے دوران بیماری کی طرح انگریز کی کالی قیدیں گزاریں کہ مجھے آخری سانس آزاد وطن میں لینے دیے جائیں مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ اس بدنصیب بادشاہ کو دفن کے وقت رنگون میں دو گز زمین ملنا بھی مشکل ہو گئی اور پھر مغل سلطنت کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اسی قید کے دوران بہادر شاہ ظفر نے معروف غزل حسب حال لکھی:

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں … کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں

اور اسی غزل کا مقطع ہے:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے … دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

شاید ہم سب اپنی تاریخ کے ان صفحات سے ہی کچھ سبق سیکھ سکیں۔ ہم سب کو اپنا اپنا احتساب خود ہی کرنا ہے اور ملک کو ظلم سے محفوظ رکھنا ہے۔ آخر میں مجھے ایک عربی کہاوت یاد آ گئی: "کیا یہ وہ زندگی ہے جس کے لئے میں ماں کے پیٹ میں لاتیں مارا کرتا تھا؟" ہم ایک گرداب میں 76 سال سے پھنسے ہوئے ہیں۔ اس ملک میں "میں" کا جو عالم ہے وہ کسی حکومت یا سیاسی حکومت ہے وہ نظام جو قائم رہتا ہے۔ ہم ہر لمحہ امید کرتے ہیں کہ معاشرے میں شاید کچھ شعور بیدار ہو اور آنے والی نسلیں سمجھیں گی کہ یہ وقتی معاملہ نہیں ہے۔ ہمیں اس ارتقائی عمل میں کہاں کھڑے ہونا ہے، کس طرف اپنا قدم اٹھانا ہے مگر ابھی تک ہم درست سمت تعین کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ شاید مجھے بھی اچھی زندگی گزارنے کا حق مل جانا چاہیے اور آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کے لئے آواز بلند کرتے رہنا چاہیے۔

رب راکھا!

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

حمد و نعت

حمد

ورق دیتے ہیں کبھی زہد و اطاعت کا مجھے
اور کامل ہے یقیں تیری شفاعت کا مجھے

تیرا احساس کہ عطا کی ہے مجھے عمر دراز
لیکن ادراک نہیں ایک بھی ساعت کا مجھے

تیری تخلیق ہوں یا رب تری مخلوق ہوں میں
کچھ نہیں علم کسی اور شباہت کا مجھے

کر عطا مجھ کو بھی شعر کی زرخیز زمیں
پھر ہنر بخش دے لفظوں کی زراعت کا مجھے

ہے یہی حمد یہی نعت یہی میری غزل
اور کچھ شوق نہیں نثر و اشاعت کا مجھے

صفدر صدیق رضی

000

حمد

تجلی چہروں پہ یہ تیری، مکاں اپنی مولا
دلوں کو جو ہے اطمینان، تیری دین مولا

وہی الجھے نہیں اسرار سربستہ سے پردے
عقل و شعور اور وجدان، تیری دین مولا

عبادت ہو تری یا تیرے بندوں سے محبت
مری بخشش کے یہ سامان، تیری دین مولا

اندھیرے بھی تو بن سکتے تھے اس دل کا مقدر
جو ہوں میں صاحب تیری، ایمان دین مولا

طلب کرتی ہے جب تری [illegible] کی
[illegible] اور [illegible]، تیری دین مولا

کہیں رستے میں ہو جاتی ہے جب دیوار حائل
تو کھلتا ہے در تیری، امکان دین مولا

کیا ہے مجھ کو مخلوقات میں جو تو نے افضل
مرا یہ فخر اور یہ تیری، مان دین مولا

ڈاکٹر بدر منیر

000

حمد

(خانہ کعبہ کے سامنے)

[illegible]

ایک طرف میری آنکھ جھکا
ایک طرف سنگ در آستاں
ایک طرف ساحل کوئے حرم
[illegible]
میری طرف بھی نظر التفات
[illegible]

ڈاکٹر احمد ندیم رفیع (امریکہ)

000

نعت

ہمیشہ اکا دکا جیسے کوئی کمی رہ گئی ہے
مگر تیری مدحت میں اک آگہی سی رہ گئی ہے

کئی الفاظ تھے تیری سرکار میں دست بستہ
مگر میرے اظہار میں عاجزی رہ گئی ہے

الوہی ترنم ہے اسمِ مبارک میں تیرے
مری گفتگو اس کے آگے بے تری رہ گئی ہے

خیالی مری حاضری پر بھی اتنی عنایت
خطاؤں کی تو سب دھری کی دھری رہ گئی ہے

ترا نام لکھا تھا کاغذ پہ ظلمت میں
مرے قلب کے طاق پر روشنی رہ گئی ہے

فضا میں ترے شہر کی ہے دلاسا سا ایسا
جھڑی رک گئی آنسوؤں کی، نمی رہ گئی ہے

قدم تو مرے واپسی کے لیے اٹھ گئے تھے
مری جان لیکن اسی گلی میں ہی رہ گئی ہے

خالد اقبال یاسر

ooo

نعت

ہمیشہ رہتا ہے آمد کا سلسلہ جاری
خدا کے فضل سے ہے مدحتِ مصطفیٰ جاری
دعا کہ ہاتھ اٹھاؤ جو بھول بھی جاؤں
لبوں پہ رہتی ہے ہر دم کوئی دعا جاری
لکھا گیا تھا قرینہ حضورؐ دیا کہ
اسی لیے ہے تسلسل سے ارتقاء جاری
انہی کی برکتیں کرتی ہیں روح کو سرشار
سو چاہتا ہے توصیفِ مصطفیٰ جاری
انہیؐ کا ذکر ہے اور انہیؐ کی بات رہے
درود کا جو تسلسل رہے سدا جاری
یقین ہے کہ انہی اور فقط انہی کا ہوا
وہی ہے مجھ پہ مسلسل بھی عطا جاری
تو کیوں نہ پھیلتا جائے اجالا چاروں طرف
کہ روشنی کا ہے سرچشمہ ہر جا جاری
نبیؐ کے ذکر، درود و ثناء کی صورت میں
ہے کائنات سے اب بھی مکالمہ جاری
یقین ہے کہ ہمیشہ اسی تسلسل سے
رہے گی مدحتِ آقائے دوسرا جاری
یہ ایک شہرِ طہارت ہے زندگی کی قسم
زمانے بھر میں رہے فیضِ مصطفیٰ جاری

نسیم سحر

ooo

نعت

جو انؐ کے نام پہ قربان ہوتے جاتے ہیں
وہی تو صاحبِ ایمان ہوتے جاتے ہیں

خوشی سے دیتے ہیں ہم جان آپؐ کی حرمت پر
ہم اہلِ عشق ہیں، قربان ہوتے جاتے ہیں

وہؐ چاہتے ہیں تو بول اٹھتے ہیں یہ پتھر بھی
وہ سنگ، الفت کا بے جان ہوتے جاتے ہیں

جو کر رہے ہیں مسلمان ہونے کا دعویٰ
بہت ہی کم ہیں جو انسان ہوتے جاتے ہیں

حدود چال چلے، خوب ہم سمجھتے ہیں
جو انؐ کی ہیں وہ دربان ہوتے جاتے ہیں

درِ حضورؐ کی جس کو گدائی مل جائے
وہی تو اصل میں سلطان ہوتے جاتے ہیں

لگاتا کون کسی پر ہے اپنا گھر، ایوب
مگر جو کرم یا احسان ہوتے جاتے ہیں

ڈاکٹر ایوب ندیم

ooo

مضامین

رفیع الدین راز کا نیا شعری مجموعہ

محمود شام

وقت سے خائف ہیں یہ خوف خسارہ سب کو ہے ـــــ بیٹھے ہیں قزاق ہمارے آج سر جوڑے ہوئے

بات حسب حال سے آغاز ہونی چاہیے۔ پھر ماضی کی خاک چھانیں گے۔ مستقبل میں جھانکیں گے۔ آج ہم اس تازہ شعری مجموعے کی رونمائی کے لیے فاران کلب میں یکجا ہیں۔ اس کا نام بھی حسب حال ہے۔ اور مقام شکر بھی کہ ''ابھی کپڑے بدن پر ہیں''۔ کیونکہ اس عہد میں بڑے بڑوں کے بدن سے کپڑے اتارے جا چکے ہیں اور اتارنے والے بھی بڑے بڑے ہیں۔ اب یہ سب بڑے بڑے سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاعری سچ بولتی ہے۔ شاعر اپنے معاشرے کی خاموشی، مصلحت کوشی، چشم پوشی کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ جب سب زبان دراز چپ ہوتے ہیں تو غزلیں بولتی ہیں۔ نظمیں شور مچاتی ہیں۔ یہ لوگوں کو ایک ولولہ تازہ دیتی ہیں۔ اقبال کے ''شکوہ جواب شکوہ'' سے فیض کے ''پرورش لوح و قلم'' پھر حبیب جالب کی ''صر صر کو صبا لکھنا'' سے ہوتی ہوئی رفیع الدین راز کی ''پیرہن جلتا ہے لہو'' اور پھر ''ابھی کپڑے بدن پر ہیں'' تک پہنچتی ہے۔ شاعر اپنے ضمیر کی آواز پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ اشارۃً کنایۃً مزاحمت کرتا ہے۔ کبھی کھل کر سینہ تان کر کہہ دیتا ہے۔

''غلامی خون میں حسن خودی رہنے نہیں دیتی ـــــ غلاموں کی طرح کار اطاعت ہم نہیں کرتے''

شاعری کو پاکستان کے کثیر نسلی اور کثیر لسانی ہوتے ہوئے ان پیچیدہ معاشروں میں وہ اہمیت اور وقعت نہیں ملتی ہے جو اس کا استحقاق ہے۔ امریکہ میں بھی کثیر نسلی معاشرہ ہے۔ مگر وہاں اپنی روایات اور اقدار کو اب بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ امریکہ کو تو دریافت ہوئے چند سو سال ہوئے ہیں۔ ہم تو جس خطے میں رہتے ہیں اور جن سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ وہ سب کئی کئی ہزار سال قدیم ہیں۔ ان سب کی اپنی اپنی اقدار ہیں۔ آداب ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کے علاقے ہوں یا موجودہ پاکستان کے یا سابقہ مشرقی پاکستان کے ان سب میں شاعری کی بھی اپنی اپنی کئی ہزار سالہ روایت ہے۔ جو زیادہ تر صوفی شاعری سے آغاز ہوتی ہے۔ رفیع الدین راز کے تازہ ترین کلام کے مطالعے کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ہر غزل گزرے زمانوں اور موجود میں ہوتی کشاکشوں کا خوبصورت امتزاج ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ایک شاعر۔ ایک افسانہ نویس۔ ایک فنکار۔ ایک مصور اپنے زمانے میں اپنی تہ دار مزاحمت کے باعث تنہا تنہا رہ جاتا ہے۔ رفیع الدین راز بھی اس تنہائی کا شکار رہتے ہیں۔

گاہے گاہے کوئی مجھ سے پوچھتا رہتا ہے راز ـــــ لوگ لڑتے ہیں قلم کی جنگ کیوں شمشیر سے

قلم اور جنگ کی شمشیر صدیوں سے جاری ہے۔ شاعری تو اپنے عہد کو آئینہ دکھاتی ہے۔ وہ بھی حرف سے۔ تشبیہ سے تلمیح سے۔ استعارے سے۔ حرف اکثر تلوار سے زیادہ کاٹ رکھتے ہیں۔ اور سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ راز صاحب کے ہاں ٹوٹی ہوئی تلوار کا

استعارہ بھی بار بار سامنے آتا ہے۔

بارہا ہوتا ہے یہ تاریخ کو پڑھتے ہوئے ہچکیاں سنتا ہوں میں ٹوٹتی ہوئی تلوار کی

تلوار کی اس شکست و ریخت کے پس منظر میں تاریخ اسلام کی بھی پندرہ صدیاں ہیں۔ اور ماضی قریب میں سلطنت دہلی کے حوالے سے مغل شہنشاہوں کی تلوار کے اندر سے گھنے اور ٹوٹنے کی۔ جب آپ انسان اور خاص طور پر مسلمانوں کی آج کی بے بسی اور بے کسی کی حالت دیکھتے ہیں تو آپ کو خالد بن ولید، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی کی تلواریں ٹوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ نسیم حجازی کی لکڑی کی تلواروں میں دیمک لگتا دیکھتے ہیں۔ مگر رفیع الدین راز ہمیں اس سوچ بچار سے دور رہنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔

چھیڑو گے اگر قصۂ ماضی کو تو پھر راز شمشیر نہیں غیرت شمشیر کھلے گی

غیرت شمشیر کی اضافت صدیوں کو محیط ہے۔ اس میں تہذیب کا نوحہ بھی ہے۔ روایات خاک ہونے کا الم بھی۔ اقدار کی پامالی کا غم بھی۔ اس میں دمشق، بغداد، قاہرہ، قسطنطنیہ ہی نہیں دہلی اور اسلام آباد کے قلعے بھی کھنڈر ہوتے دکھائی دیتے ہیں اب غیرت کے نام پر قتل رہ گئے ہیں۔ شمشیر کی غیرت نہیں رہی۔ راز صاحب کی یہ اضافت آج کے اہل شمشیر سے بھی بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ شمشیر کی دھار اور تیزی کی نمائش اصل قوت نہیں ہے بلکہ اصل طاقت اس کی غیرت ہے۔ اقبال کا مصرع بار بار ذہن میں چمک رہا ہے۔ بولنا ہی پڑے گا۔

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اب اکیسویں صدی میں تو تیمور کے گھر سے بہت کچھ جا چکا ہے۔ اب جو کچھ رہ گیا ہے وہ بھی Out Source کیا جا رہا ہے۔

بھوک کے عالم میں بڑھ جاتی ہے دانے کی کشش کب تلک رکھے کوئی اپنی نگاہیں جال پر

راز صاحب کو اپنی عظمت رفتہ بھی ایسے عالم ادبار میں یاد آتی ہے۔

کرتا تھا سفر اپنے ہی گردوں پہ میں دن بھر اور اپنے ہی افلاک پہ ڈھلتا تھا کبھی میں

جناب راز کی یہ شاعری نہ تو گل و بلبل، ہجر و وصال والی روایتی شاعری ہے۔ نہ ہی صنعت تضاد اور لفاظی سے مشاعرے لوٹنے والی قافیہ بندی۔ اور نہ ہی صرف چونکا دینے کی خواہش میں محفل میں ہاتھ کا پیوند لگانے کی تک بندی۔ راز صاحب جن صعوبتوں سے گزر رہے ہیں۔ جن ہجرتوں کا سامنا کیا ہے۔ جن کلفتوں سے دوچار رہے ہیں۔ ان حادثوں نے ہی انہیں رفیع الدین راز بنایا ہے۔ اور ان المیوں نے ہی انہیں رنگا رنگ سوچیں، عہد کی گواہی، دروں ذات کے سفر، منزل کے تعین کا سلیقہ، مزاحمت کی جرأت، خوش خیالی، تخیل کی پہنائیاں، فکری گہرائیاں عطا کی ہیں۔

مجھے رشک آتا ہے ان کی خوش نصیبی پر کہ 1960 کی دہائی سے شعر گوئی کا آغاز کرنے والے اس جدید، منفرد، متین غزل گو کو اردو کے عظیم مشاہیر سے پذیرائی میسر آئی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، رئیس امروہوی، احمد ندیم قاسمی، اسلم فرخی، خالد علیگ، انجم اعظمی، کریم بخش خالد، جاذب قریشی، امجد اسلام امجد، محسن بھوپالی، شان الحق حقی، ڈاکٹر رشید نثار، ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، ڈاکٹر شاداب احسانی، نقادوں، شاعروں، افسانہ نویسوں کی کئی نسلوں کے ممدوح ہیں۔ یہ سعادت کم کم ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

رفیع الدین راز کے ساتھ میری کئی گھنٹے غائبانہ (آج کل کی زبان میں Virtual) نشست رہی ہے۔ جس نے ان کی

شاعری میں رفیع الدین راز کو ہی تلاش کیا ہے۔ یگانہ چنگیزی یا کسی اور کو نہیں ڈھونڈا۔ میرے خیال میں ڈھونڈنا بھی نہیں چاہئے۔ ہر فرد کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ قدرت نے ہر انسان کو اپنی ایک شناخت عطا کی ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں اسے دوسری شناخت دینے والے۔ جس دور میں ناصر کاظمی میں میر، سید عابد علی عابد میں غالب تلاش کیا جا رہا تھا۔ ان دنوں حبیب جالب نے کہا تھا۔

اپنے انداز میں بات اپنی کہو ـــــ میر کا شعر تو میر کا شعر ہے

جالب کی اس غزل کا ایک اور شعر بھی سنانا چاہوں گا۔

اک قیامت ہے جالب یہ تنقید تو ـــــ جو سمجھ میں نہ آئے بڑا شعر ہے

راز صاحب کا شعری سفر ’دیدۂ خوش خواب‘ 1988 سے شروع ہوتا ہے۔ ’بیاض‘ 1997، ’بے امان لفظ‘ 2002، ’آتی قیامت کس لیے؟‘ 2007، ’اک کون و مکاں اور‘ 2023، ’کہسار خوش جمال‘ 2014، ’بے امن بدلتے لہو‘ 2015، اور اب 2023 میں ’ابھی کچھ سے بدن پر ہیں‘۔ تازہ تازہ دوسرا سنگ میل ہے۔ ’تحسین سرمایہ‘ کے عنوان سے ان کی کلیات بھی آ چکی ہے۔ مجھے ’کلیات‘ کی اشاعت سے کچھ اختلاف ہوتا ہے۔ کیونکہ کلیات Total works کا متبادل ہے اور یہ Total Works، عام طور پر لکھنے والوں کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد شائع کیے جاتے ہیں۔ کلیات میر، کلیات مومن، کلیات سودا وغیرہ۔ حیرت یہ ہوتی ہے کہ کلیات کے بعد بھی لوگ لکھتے رہتے ہیں۔ ناشروں کو اس سے ضرور فائدہ ہوتا ہے۔ ان کو کلیات کا مرتبہ دینے کی بجائے مجموعوں کا مجموعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ امید ہے راز صاحب میرے اس تاثر کا برا نہیں مانیں گے۔ ان کی شاعری یقیناً آج کل کے اردو کے بے شمار شاعروں سے بہت مختلف اور منفرد ہے۔ وہ خالصتاً حرف و قلم کے آدمی ہیں۔ ’ابھی کچھ سے بدن پر ہیں‘ ان کا 12واں مجموعہ کلام ہے، اور 29ویں کتاب ہے۔

وہ تحریریں تو جل کر راکھ کا حصہ بنیں کب کی ـــــ مگر وہ آگ زندہ ہے وہ آتش دان باقی ہے

راز صاحب کے ہاں خود کی تلاش کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کمال کی خود اعتمادی ہے ان کے ہاں۔ شاعری ان کے لیے ریاضت کا درجہ رکھتی ہے۔ غزل ان کی اہم سطر ہے۔ یہ روایت، جدت، عورت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان کی اپنی تراکیب ہیں، استعارے ہیں، مشکل ردیفیں، قافیے۔ اپنا رنگ برقرار رکھتے ہیں۔

’اوروں کی برتی زندگی برتوں میں کب تلک ـــــ ہوگا یہ فرض منصبی برتوں میں کب تلک‘

مشکل پسندی ملاحظہ کیجئے:

’لیا اوقات ستانے کی خاطر ـــــ ٹھہر جاتا ہے سورج میرے گھر پر‘

76 سال بعد کے پاکستان کا اعتراف:

’مجھے تو ابھی نہیں معلوم اب تک ـــــ یقیں رستے پہ ہے یا راہبر پر‘

ہم بار بار لکھتے ہیں کہ ہمیں آئی ایم ایف، عالمی بینک کے در پر دستک دینے کی بجائے اپنے قدرتی وسائل سے استفادہ کرنا چاہئے۔ راز صاحب نے اس حقیقت کو کس دلکش آہنگ سے شعر کا پیراہن دیا ہے:

’دیکھئے تو ہاتھ میں ہے کاسہ دریوزہ گر ـــــ سوچئے تو عالم امکاں ہمارے نام ہے‘

''عالمِ امکاں کی وسعتیں اندازہ کیجیے۔ اور ہمارا اس سے مسلسل اشتراک۔ جناب راز کے ہاں آئینہ۔ عکس۔ خواب۔ ریاضت۔ خوگری۔ دشمن وغیرہ گرآ ہے۔ حساب دلات بار بار ورآتے ہیں۔ ایک لفظ عروس بھی کئی مقامات پر رقص کرتا دکھائی دیتا ہے۔

عروسِ بے گھری کیوں خیمہ زن ہے میرے آنگن میں
سنا تو یہ تھا میں نے یہ کسی کے گھر نہیں جاتی

عروس ایک استعارہ ہے تمنا یا خواب۔ یہ تحقیق طلب ہے۔ عروس ایک تمنا بھی ہو سکتی ہے۔ شعوری یا لاشعوری۔ میں نے ابھی کچھ سے بول رہے ہیں" کا بغور اور سخن سرمایہ کے ایک ہزار سے زیادہ صفحات سے سرسری گزرتے ہوئے یہ محسوس کیا ہے کہ رفیع الدین راز لب و رخسار، عارض و گیسو، جسم کی قوسوں اور سراپا نگاری سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ غزل تو ہے ہی "حرف یار زماں گفتن" مگر راز صاحب نے اسے "حرف باز ماں گفتن" میں تبدیل کر دیا ہے۔ صنف نازک سے پرہیز اس حد تک کہ ان کی شاعری کے دامن میں بڑے بڑے نام ہیں۔ مگر کسی خاتون کی پذیرائی نہیں ہے۔ چلتے چلتے میں صفحہ 62 پر 10 اشعار کی ایک غزل کا ضرور ذکر کروں گا۔ اس میں شہر آشوب تو ہے ہی، لیکن یہ عمر آشوب بھی ہے۔

قصے گزرے قصوں کا ہے راتیں ہیں چوپالوں کی
بھولی بسری باتیں ہیں کچھ بھولے بسرے لوگوں کی

کبھی کبھی تو تنہائی میں ساری رات رلاتی ہیں
کھنکن کھنکن۔ شیتل شیتل۔ مسکانیں وہ یادوں کی

خون کی اک اک بوند میں اب تک تحریریں گریاں ہیں
کچے آم کا کھٹا پن اور ڈانٹیں وہ رکھوالوں کی

خواہش کی بازاروں میں ہم نے کیا کچھ کھویا راز نہ پوچھ
حد تو یہ ہے بھول گئے شکلیں تک اپنے پیاروں کی

ایک اور غزل کے دو اشعار، خالصتاً سیکولر:

وہ رنگ کیا ہوئے وہ اجالے کہاں گئے
تکیے پہ پھول کاڑھنے والے کہاں گئے

مندر کی شام۔ سیڑھیاں۔ پنگھٹ۔ دیویاں
منظر وہ کیا ہوئے وہ شوالے کہاں گئے

دوسرا شعر ہندو مسلم فساد پر پار کرتا ہے۔ ہم نے سب کو مشرف بہ اسلام کر دیا ہے۔ کینیڈا ہم بھی جاتے رہتے ہیں۔ ہم وہاں کی شاعرانہ چشمک اور معاصرانہ رقابت کا اندازہ رکھتے ہیں۔ راز صاحب وہاں بھی در گزر سے کام لے رہے ہیں۔ ایک ہی سانس میں اشفاق حسین اور تسلیم الٰہی زلفی کا ذکر کر رہے ہیں۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف برسوں سے صف آرا ہیں۔

ہاتھ میرا بھی تھا میری ہار میں
میں بھی شامل تھا صفِ اغیار میں

میں نے آپ سے خواتین و حضرات کا بہت وقت لے لیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"

1968 سے 2023 تک 55 سال کی مسلسل ریاضت ہے۔ قرطاس و قلم کا وصال ہے۔ اس لیے رفیع الدین راز کا حق بنتا ہے کہ ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ اور ان کو سمجھا جائے۔ میں اپنی بات ان کے ایک شعر پر ختم کروں گا۔ جس میں ایک ابدیت ہے۔ انسان کی عظمت ہے۔ انسانیت کا وقار ہے۔

چشم ہائے دو عالم دیکھتی ہیں کیوں ہمیں
عکس وہ جہاں ہے کیا۔ راز کی شباہت میں

آپ اس شعر کی وسعتِ معنویت میں چہروں گم رہیں گے۔ انشاءاللہ۔

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید کی یاد میں

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

''میں تو گھسان میں رہ کر زندگی کا مزہ لوٹتا ہوں، دھکے کھا کر ہجوم میں رہنا پسند کرتا ہوں، اونچا اڑنا مجھے پسند نہیں، میں نے زمین کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور ایک روز اسی میں گم ہو جانے کا آرزومند ہوں'' 4 دسمبر 1928ء کو سرگودھا کے قصبے میانی میں آنکھ کھولنے والے میاں انوار الدین المعروف ڈاکٹر انور سدید گھسان کی زندگی گزار کر 20 مارچ 2016ء کو رخصت ہو گئے اور اسی شام اپنی آرزو کے مطابق اس خاک میں گم ہو گئے جس سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔

انور سدید کے ادبی مرشد ڈاکٹر وزیر آغا نواسی برس جیے تھے عمر بھر وزیر آغا کا احترام کرنے والے انور سدید نے یہاں بھی ان سے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی زندگی کے اٹھاسی ویں برس میں جہانِ رنگ و بو کو چھوڑ دینا مناسب خیال کیا۔ انور سدید ایک شخص نہیں ایک ادارے کا نام تھا انھوں نے ستاسی برس کی عمر میں اسی (80) سے زیادہ کتابیں لکھیں اگر ان کے مضامین جمع کیے جائیں تو ان سے مرتب ہونے والی کتابوں کی تعداد اس سے بھی بڑھ جائے گی کثرتِ تصانیف اور اٹھاسی ویں برس میں وفات پر ہمیں عراقی مصنف عمر بن احمد بن عثمان المعروف ابن شاہین (297ھ — 385ھ) یاد آتے جنھوں نے اٹھاسی برس عمر پائی اور 380 کتابیں لکھیں جن میں سے صرف ایک "التفسیر الکبیر" ایک ہزار اجزا پر مشتمل ہے (جز سے ہمارے ہاں کے رسائل سائز کے تیس صفحے مراد ہوتے ہیں) "المسند" تیرہ سو اجزا پر "التاریخ" پچاس اجزا پر اور "الزهد" سو اجزا پر مشتمل ہے۔ صرف ابن شاہین ہی نہیں ہماری قدیم علمی روایت میں ایسی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں جن میں مصنفین نے زندگی کے دنوں سے بڑھ کر کام کیا۔ ابوالفرج ابن جوزی نے مختلف فنون میں ایک ہزار سے زائد کتب لکھیں وہ کہا کرتے تھے کہ کتاب العالم ولدہ المخلد عالم کی کتاب اس کی ابدی اولاد ہے۔ ابن جریر (224ھ — 310ھ) کی زندگی کے چھیاسی سالوں کو ان کے لکھے ہوئے اوراق پر تقسیم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے ان چھیاسی برسوں میں جن میں طفولیت اور بچپن کا زمانہ بھی شامل ہے تین لاکھ اٹھاون ہزار اوراق قلمبند کیے۔ یہ نتائج دراصل زندگی کے ایک ایک لمحے سے اس کی قوت کشید کر لینے کی صورت میں برآمد ہوتے ہیں۔ علم عروض ایجاد کرنے والا ابو عبدالرحمٰن خلیل بن احمد دنیا کے ذہین ترین انسانوں میں سے تھا۔ اس کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ الثقل الساعات علیّ: ساعة آکل فیها وہ ساعتیں مجھ پر سب سے گراں گزرتی ہیں جب میں کھانا کھاتا ہوں" یعنی اس دوران چونکہ علمی شغل رک جاتا ہے اس لیے یہ وقت بھی گراں گزرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید مرحوم کے بارے میں ایک بار ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا کہ "پہلے مجھے یہ پتا ہے کہ آپ کھاتے پیتے اور سوتے کس وقت ہیں کیوں کہ جس رفتار سے آپ کی معلومات افزا مقالات اور کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ آپ کے نظام الاوقات میں کھانے پینے اور سونے کے لیے وقت بچتا نظر نہیں آتا۔ بسیار نویسی اور خوش گفتاری کا اجتماع اگر کہیں دیکھنا ہو تو وہ انور سدید کے پاس ہے۔" ادب و شعر کے ساتھ جس ذات کا تصور وابستہ ہے انور سدید اس سے مبرا تھے۔ وہ صلابت، استقامت اور محنت بلکہ مشقت کا مظہر تھے ان کے ہاں خوابوں کی جگہ حقائق اور تصورات کی جگہ زندگی کی کڑی دھوپ چمکتی دکھائی دیتی ہے۔

انھوں نے افسانہ نگاری سے آغاز کیا، پھر تحقیق کی طرف آ گئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی صحبت نے طبیعت کو انشائیے کی طرف مائل کیا۔ پی ایچ۔ ڈی کا سفر اردو کی تحقیق میں لے گیا۔ داخل کی تحریک شعر کہنے پر بھی اکساتی رہی، اس طرح ان کی تحریروں میں رنگا رنگی بلکہ ہمہ رنگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ انھوں نے عمر بھر محنت اور مسلسل محنت کے اصول پر عمل کیا۔ میں نے انھیں اس عالم میں بھی لکھتے دیکھا جب ان کے چاروں اور مستری مزدور گھر کی مرمت کے کام میں لگے شور برپا کرنے میں مصروف تھے۔ وہ صبح جلد کام کا آغاز کر دیتے تھے اور رات دیر گئے تک کام کرتے، لکھنے کی میز کے نیچے پاؤں رکھنے کی جگہ سے قالین کا ٹکڑا اس لیے کاٹ رکھا تھا کہ پاؤں کو چھونے والی زمین کی ٹھنڈک نیند کی دیوی کو مہربان ہونے سے روکے رکھے۔ بسیار نویسی کے باوصف ان کی تحریروں میں حیران کن حد تک زیرِ بحث متن سے وابستگی کا جوہر دکھائی دیتا ہے۔ وہ اردو ادب کے جدید دور میں سب سے زیادہ کتابوں پر تبصرے لکھنے والے مصنف تھے۔ تبصرہ نگاری عام طور سے تقریبِ ضرورت سے ختم ہوتی ہے لیکن ان کے تبصرے سرسری تعارف سے آگے بڑھ کر تنقیدی شان اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ آغاز، کتاب اور مصنف کے خارجی حوالوں سے ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ متن کی سلطنت کی گہرائیاں اجاگر ہونے لگتی ہیں گویا انھی کے الفاظ میں۔

پہلے تو ایک لفظ کا کوندا چمک اٹھا — پھر دفعتاً خیالوں کی برسات آ گئی

انھوں نے صرف انور سدید کے نام ہی سے نہیں لکھا بلکہ غار نشیں، قلم بردار، دوراندیش، میرزا غالب، ابن اسمٰعیل، ابن قلم، بدزبان، دراز سرگودھوی اور نہ جانے کس کس نام سے لکھتے رہے۔ اردو زبان کا شاید ہی کوئی رسالہ ہو جس میں ان کی تحریر شائع نہ ہوئی ہو۔ انھوں نے دنیائے ادب میں چوکھی لڑنے کی روایت زندہ کی، وہ مولانا ظفر علی خان کے "مکھی" کی طرح آسمانِ ادب پر اڑنے والی پتنگوں سے اکیلے ہی لڑتے رہے۔ اگرچہ ان کی بنیادی مصروفیت شاعری نہیں تھی لیکن انھوں نے اس فنِ شریف میں بھی اپنے نقش یادگار چھوڑے اور اپنی چوکھی لڑائیوں کی نسبت سے کہا۔

ضربِ پیہم کا تسلسل نہ ابھی توڑ سدید — اک نئی ضرب بھی ہو سکتی ہے کاری تیری

وہ جس خیال سے وابستہ تھے عمر بھر اسی سے وابستہ رہے گویا بقول غالب انھوں نے اعلان کیے رکھا کہ "زمانہ کہ بتان را ابراہیم یار آزاست، من از آذرم تکرار تشیر کر بیاد بنیاد است" ان کے اس رویے کی بنا پر انھیں "انور شدید" بھی کہا گیا حالانکہ ان کے نام میں سدید کا لفظ قرآنی آیت "قولوا قولاً سدیداً" (70:33) کی جانب متوجہ کرتا تھا اور انھیں اس نسبت کا احساس بھی تھا۔ آخری زمانے میں اپنے مجموعہ مضامین کا نام رکھنے کے لیے انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا تو میرے منہ سے ارتجالاً "قولِ سدید" نکلا۔ وہ کہنے لگے نہیں مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ میں اپنے مجموعہ مضامین کے لیے یہ نام اختیار کروں۔ اس سے پہلے ایک بار جب انھوں نے "نہ کہنے کی باتیں" کے زیرِ عنوان کالم لکھنا شروع کیا تو میں نے ان سے کہا کہ اس عنوان سے تو بہتر تھا کہ آپ "ناگفتنی" کا عنوان اختیار کرتے۔ انھوں نے اگلے ہی کالم سے "نہ کہنے کی باتیں" کو "ناگفتنی" کر دیا۔ وہ صرف اپنے لکھنے ہی میں منہمک نہیں تھے بلکہ ان کا ایک خاص وصف نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی تھا۔ راقم الحروف گورنمنٹ کالج سرگودھا کا طالب علم تھا جب انھوں نے اسے دریافت کیا اور ایک روز کلاس میں جاتے ہوئے جب میں کالج ہال کے سامنے سے گزر رہا تھا تو پروفیسر ریاض احمد شاد صاحب مرحوم نے اپنے انداز خاص میں کہا کہ "میاں انور سدید سرگودھا آئے ہوئے ہیں اور آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں" اس طرح ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور اسی دوران وہ اسلام پورہ سرگودھا میں واقع راقم کے غریب کدے پر جسے اس نے "دانش کدہ" کا نام دے رکھا تھا تشریف لائے۔ وہ ہمیشہ راقم کی ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے

اور واپس جا کر روزنامہ حریت کراچی میں ان کے بارے میں پورا ایک کالم لکھا۔ اس کے بعد جب بھی راقم کی کوئی کتاب شائع ہوتی وہ اس پر ضرور تبصرہ و کالم یا مضمون تحریر کرتے۔ حالانکہ راقم کبھی کسی دبستان سے وابستہ نہیں رہا۔ وہ زمانہ جب وہ فیصل آباد میں ڈپٹی افسر تھے اور پھر ان کا ٹرانسفر ہو کر محکمہ آبپاشی پنجاب میں بطور ایگزیکٹو انجینئر لاہور آ گئے اور محکمہ آبپاشی کے دفتر کے سامنے پنجاب پبلک لائبریری میں روزانہ بیٹھنا اور دیر تک اردو شعرا سوں پر تحقیق میں مصروف رہنا یہ سب تصویریں نگاہوں پر ابھر رہی ہیں۔ پنجاب پبلک لائبریری میں راقم کے ساتھ اسی کمرے بلکہ اسی میز پر بیٹھ کر اپنے تحقیقی مضمونوں پر کام کرتا رہا جس میز پر وہ بیٹھا کرتے تھے پھر ان کی ریٹائرمنٹ (دسمبر 1988ء) اور اس کے بعد کی طویل صحافتی زندگی اور پھر عوارض و ضعف کے سبب خانہ نشینی یہ سب مرحلے دیکھے۔ آخری ملاقات ان کی زندگی کی آخری عیدالاضحی پر ہوئی یہاں تک کہ ان کا بلاوا آ گیا اور ان کی زندگی کے آخری سلوں میں ڈھلتے ہوئے شام و سحر، ایک بے نور اداسی کی گھٹا میں چپ چاپ، بزم بودوں کی طرح گزرتے چلے گئے اور وہ وہاں چلے گئے جہاں سے کبھی کوئی پلٹ کر نہیں آیا۔ ان کی رخصتی کے ساتھ ہی دبستان سرگودھا کی کہانی کا یہ رنگ ترین باب بند ہو گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، سجاد نقوی کے بعد انور سدید کی رخصتی سے وہ محفلیں خیال و خواب بن گئیں جو کبھی ریلوے روڈ سرگودھا پر واقع ڈاکٹر وزیر آغا کے گھر میں برپا ہوا کرتی تھیں۔ اب وہاں صرف ایک بوسیدہ بورڈ لگا رہ گیا ہے جس پر جلی حروف میں "شارع ڈاکٹر وزیر آغا" لکھا ہوا ہے۔ یہاں دبستان سرگودھا کے جغادری ادیب بیٹھ کر ادبی مسائل پر مباحثے کیا کرتے تھے اور انور سدید کے بقول اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ ادب میں گروہ بندیاں شخصی ہوں تو نقصان دہ ہوتی ہیں لیکن "اگر کوئی گروہ ادیب کے داخل میں تخلیقی شعلے کو فروزاں رکھتا ہے، علمی سطح کو بلند کرنے کا مشورہ دیتا ہے، نئے مباحث، نئی کتابوں اور مصنفوں سے متعارف کراتا ہے، اختلافی باتوں کو سننے اور صداقت کو قبول کرنے کی تربیت دیتا ہے تو اس قسم کا گروہ ادب کے لیے نعمت ہے" یہی خیال ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی تھا۔ انور سدید کا نظریہ فن، فن کو زندگی کے خارج اور انسان کے داخل میں رابطہ باہم پیدا کرنے کا منصب عطا کرتا تھا اور ان کے نزدیک فن کی تخلیق ہی فن کار کا سب سے بڑا انعام تھا۔ یہ بات ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ اس موضوع پر ہونے والی گفتگوؤں سے بھی واضح ہوتی تھی۔ راقم کے ساتھ کئی مکالموں میں انھوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ فن کار بحالت تخلیق جس گرد و پیش سے کٹ کر ارتکازی جس کیفیت سے گزرتا ہے دراصل وہی اس کا انعام ہوتی ہے۔

انور سدید کی زندگی میں ان کی شخصیت اور فن پر کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ ایم اے، ایم فل کے چار مقالات لکھے گئے۔ بھاگلپور یونیورسٹی (ہندوستان) نے انور سدید شخصیت اور فن پر لکھے جانے والے ایک مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی اور دو تین کتابیں شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب سجاد نقوی صاحب کی "ارمِ دمِ جستجو" جو مکتبہ اردو زبان سرگودھا سے 1990ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے ہی اکادمی ادبیات کے لیے ڈاکٹر انور سدید شخصیت اور فن مرتب کی۔ شفیق کھوکھر نے کثیر الجہت ادیب ڈاکٹر انور سدید کے عنوان سے خراج تحسین پیش کیا (کلاسیک لاہور 2015ء)۔ ذوالفقار احسن نے انور سدید کے خوابیدہ افسانے تلاش کیے (نقش گر راولپنڈی / سرگودھا 2019ء)۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی ڈاکٹر انور سدید کی ڈاکٹر وزیر آغا شناسی سامنے آئی جو ڈاکٹر انور سدید کی وفات سے کچھ ہی پہلے جنوری 2016ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر اظہار مسرت کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے کہا کہ میں نے ملک الموت کو چٹھی لکھ دی ہے کہ اب وہ جب چاہے آ جائے مجھے زندہ رکھنے والے موجود ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے یہ کتاب شائع کر کے اپنی جوہر شناسی اور زندہ لوگوں کو زندگی میں پہچاننے کا ثبوت دیا لیکن حقیقت میں تو ڈاکٹر انور سدید کا کام انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

◆◆◆

''تحمید کردگار'': صورتِ امر پر مبنی حمدیہ دیوان

ڈاکٹر نجیب جمال

اردو نعت کے امام، امام احمد رضا خاں کی نعت کا ایک خوب صورت شعر ہے:

سکھایا ہے یہ کس گستاخ نے آئینے کو یا رب
نظارہ روئے جاناں کا بہانہ کر کے حیرت کا

یہ شعر روئے جاناں کے مقابل آئینے کی حیرت یا کم مائیگی کو ظاہر کرتا ہے اور شاعر کے نزدیک یہ عمل گستاخی کے ذیل میں آتا ہے۔ آئینے کی یہ مجال کہاں کہ دیکھنے کی تاب لا سکے اور مظہرِ نبوت کے حُسنِ بے مثال سے دوچار ہو سکے۔ آئینہ عکسِ صورت کا ذمہ دار ہے اور اپنی شفافیت میں بہارِ حُسن کی عکس پذیری پر مائل ہے تاہم یہ محض حُسنِ صورت کو منعکس کرنے پر ہی قدرت رکھتا ہے تاکہ آئینۂ دل کے مصفّیٰ ہونے کی صورت پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حمدیہ دیوان 'تحمید کردگار' کی ابتدا میں ہی اس کے خالق گستاخ بخاری کو ذات کے آئینے اور آنکھ کے دیکھنے کی ظاہری صلاحیت سے انکار کرنا پڑا ہے:

تیری صورت آئینے سے ماورا
آنکھ کے ہر زاویے سے ماورا

اس ابتدائی مرحلے پر ہی گستاخ بخاری کو اس کش مکش سے گزرنا پڑا جس کی وجہ سے حمد و نعت کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں اور شاعر کو ہر لمحہ اپنے تخلیقی عمل اور تخلیقی صداقتوں کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ اپنی اس خود احتسابی کے سبب ہر قدم احتیاط سے اٹھانا ہوتا ہے اور اُسے ذات و صفات کے لطیف و نازک فرق میں توازن کو قائم رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

معروف نقاد ممتاز حسن نے اپنے مرتب کردہ نعتیہ انتخاب بہ عنوان ''خیر البشر کے حضور میں'' میں ذات و صفات کے مسئلے کی نزاکت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ ''ذات اور صفات کا باہم گہرا تعلق ہے۔ صفات، ذات کا مظہر ہیں مگر اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ صفات نشان دہی کر سکتی ہیں، ذات تک پہنچا نہیں سکتیں۔ تماشائے صفات مقصود بالذات بن جائے تو یہی وسیلہ راستے کی رکاوٹ بن جائے گا۔ یہ زمین، آسمان، چاند، ستارے، کائنات کے دل کش اور نظر افروز مناظر سب کے سب ذات خداوندی کے پرتو ہیں البتہ اگر انسان ان کی رنگا رنگی میں محو ہو جائے تو یہی پرتو اس کی آنکھ کا پردہ بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ صفات کو ایک بت کدہ کہا گیا ہے جہاں حسن شوق صنم پرستی پر مائل ہوتی ہے۔'' گویا حمد کے مضمون میں بت کدۂ صفات کی رنگینیوں، رعنائیوں اور دل فریبیوں کا تذکرہ دراصل قربِ ذات کا ہی ایک وسیلہ ہے۔ یہ انسان، فطرت اور کائنات محض مظاہر ہیں، عکس ہیں، پرتو ہیں اور بس۔ حقیقی ذات ابھی تک نقاب میں ہے اور 'دمادم صدائے کن فیکون' کی صدا سے اپنے ہونے کا اعلان کیے جا رہی ہے۔ اسی مضمون کو اقبال سے پہلے غالب نے بڑے منفرد انداز میں لکھا تھا۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

یہ آرائش جمال، یہ بنتے سنورنے کا عمل اور یہ مشاطگی بھی کائنات کے نا تمام ہونے کا اشارہ ہے۔ اس لیے ابھی ممکن نہیں کہ وجودِ حقیقی کے مکمل احساس کو گرفت میں لیا جا سکے۔ حمد نگاری کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ وہ جمال و جلال کا قصہ تو بیان کرتا رہا ہے مگر صرف اس حد تک جو اس کے حواس کی گرفت میں آ سکا یا جہاں تک اس کی یادداشت، اس کی صلاحیت، اس کی ذہانت اور اس کا وجدان اپنے پر پھیلا کر تخیل کو گرفت میں لے سکے۔ گستاخ بخاری کے حمدیہ دیوان میں اختیار و جبر کی دونوں صورتیں نظر آتی ہیں۔ جہاں اس کی فنی پختگی، تخیل کی اڑان اور علم بالحواس کی صورت مائل پرواز نظر آتے ہیں وہاں ابتدا و انتہا سے ماقبل و مابعد کے مرحلے اس کے احساس سے بالاتر اور ماورا بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں کبھی یقین کا مرحلہ اثبات کی حقیقت کا پیام بن جاتا ہے تو گمان کا وسوسہ حقیقت سے دوری کی طرف بلاتا ہے گویا دوری کے ملاپ اور کافری کے وسوسے کے درمیان ایک مسلسل کش مکش رہتی ہے جس کا سامنا شاعر کی طاقت پرواز کو ہر لحظہ کرنا پڑتا ہے تاہم یہ بات ان کے حق میں جاتی ہے کہ وہ پورے سبھاؤ اور رچاؤ کے ساتھ حمد کہنے کا راستہ بناتا ہے اور صانع وجود کائنات کی تحسین رنگ بدل بدل کے کرتا ہے۔ یوں وہ توحید کے مضمون کی مرکزیت کو اجاگر کرتا ہے اور تشبیہ کے امکانات کو دور کرتا جاتا ہے۔

واحد ہے وہ اور کبریا کرتے رہو اس کی ثنا

یہ ہے وہ مرکزی خیال جو گستاخ بخاری کو حمد و ثنا کا جواز فراہم کرتا ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک اور پہلو سے بھی اس کی حمد نگاری اپنی بنیاد میں مضبوط دکھائی دیتی ہے، وہ پہلو ہے ظہورِ محمدی اور مدحِ رسول۔ ڈاکٹر ممتاز حسن نے درست لکھا ہے کہ "ذاتِ محمدی کا ظہور کون و مکاں کی تخلیق کا نقطۂ عروج ہی نہیں منتہائے مقصود بھی ہے۔" ان کی اس بات کا ایک زاویہ یہ بھی ہے کہ خیر البشر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے عشق وہ زینہ ہے جس سے حقیقی ذات (وجودِ حقیقی) تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یعنی شعورِ صفات ہی شعورِ ذات کی اصل ہے۔ یوں گستاخ بخاری کا حمدیہ تجربہ عشقِ ذات و صفات سے آگے بڑھ کر اس کی ذات اور مطلق ذات تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے اور اس آخری حقیقت (Ultimate Reality) تک پہنچنے کا وسیلہ و واسطہ وہ مثالی شخصیت ہے جس کی ذاتِ رسالت بھی صفاتِ رسالت کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔

محمدؐ کو تھا اتنی اس لیے گھڑی بھر بھی مجھ سے نہ مختصر رہا
حد کو نہ آ سکے جہاں کوئی بھی خدا کے محمدؐ ہی یاور رہا
اسی کو وسیلہ ہمارا بنا جو تیرا حبیب اور محمود رہا
یہ دیوان کی حمد تھی گستاخ کی محمدؐ زباں کا جو زیور رہا

اور شاہ امم دکھلا مدینے کا حرم دکھلا
محمدؐ پاک کے صدقے یہ دوری کر کے کرم دکھلا
مرا ایمان محمد ہیں محمدؐ کے کرم دکھلا
جو وجہ کن فکاں ٹھہرے محمدؐ محترم دکھلا
دل گستاخ کہتا ہے بھی لوح و قلم دکھلا

گستاخ بخاری کے مضامین حمد میں ایک مضمون نور کی شرح بھی ہے۔ وہ عالم امکان کے ہر گوشے میں نور کی جھلک صورتوں کو دیکھتا اور بیان کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ازل اور ابد میں صرف نور کی جلوہ گری ہے گویا اس کے نزدیک نور ذات بھی ہے اور صفات بھی اور یہ ایسی روشنی ہے جو کسی میر وسیلہ کی محتاج نہیں۔ خدائے بزرگ و برتر کی ذات اور صفات کا ادراک اس کے ناموں سے بھی ہو جاتا ہے جس میں سب سے نمایاں خوبی رحیم، شفیق اور رحمان ہونا ہے۔ ان ناموں کی صفات کا اندازہ کرنا یا حتمی طور پر ان کی نہایت کے بارے میں کچھ کہنا شاید حیطۂ انسانی میں ہے ہی نہیں پھر بھی ذات حقیقی کی کبریائی، الوہیت، محبوبیت، خالقیت، قدرت اور رحمت کا بیان اتنا تو کیا اور سنایا ہی جا سکتا ہے جتنا کسی کو یاد ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ وہ ستار بھی ہے اور غفار بھی۔ جس کا رحم لازوال اور مہربانیاں بے مثال ہیں۔ جو کچھ شرق و غرب ہے اور سوائے شمال و جنوب ہے وہی محبوب ہے اور وہی مطلوب ہے، وہی رب کائنات ہے اور وہی تحریرِ شش جہات ہے۔ غرض گستاخ بخاری کے لفظوں میں او اضح ہے تیرے نور کا ہم پہ ہزار روپ اور اس ہزار روپ کے کچھ خد و خال ان اشعار میں نمایاں ہیں:

ہر قدم پہ دکھائی پڑتی ہے	یا تجلی بار بار ایک ہی ذات
سجدے سے اٹھ کے لاتا ہے سورج نوید صبح	سجدے میں گر کے کرتا ہے سورج مناجات
وہ ازل ہے وہ ابد ہے، ہے وہی پروردگار	کل وہی تھا، کل رہے گا، ہے وہی موجود آج
سارے جہاں کا اللہ مالک	کوئی نہیں ہے اس سے بڑا سچ
ہے تیرا نور ہی موجود ہر جا	ہے تیرا نام تنویر افروز
ساری باتیں تری، کائناتیں تری	تیری قدرت کی ہر داستاں معترف
تیری ستائیوں میں تنوع بہت	ماہ و خورشید و ہر کہکشاں معترف
صورت امر تو موجود ہے میرے اندر	اور نادان تجھے مجھ سے جدا کہتے ہیں

گستاخ بخاری اپنے نام کے برعکس اپنے اسلوب میں سادہ، اپنے لہجے میں دھیمے اور اپنے فن میں رسیلے ہیں اور یہی ''تحمید کردگار'' کا موزوں ترین انداز ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

◆◆◆

معروف ادبی جریدہ ماہنامہ **ارژنگ** مدیر اعلیٰ عامر بن علی
اور مدیران حسن عباسی، لطیف صفدر کی زیر نگرانی اپنی اشاعت
کے مسلسل 24 سال مکمل کر چکا ہے ۔۔۔۔ مبارک ہو!
قیمت فی پرچہ -/100 روپے زر سالانہ -/1000 روپے
ملنے کا پتہ F-3، الحمد سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
(پاکستان) فون نمبر: 0300-4489310

غالب فہمی اور تنقید میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا نیا اسلوب

ڈاکٹر یونس خیال

غالب فہمی اور اس کے اشعار پر تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے غالب پر تنقید کا ایک نیا اسلوب اور ذائقہ اپنایا ہے۔ غالب یا کسی اور شاعر پر اس طرز کے تنقیدی کام کی کوئی مثال اب تک سامنے نہیں آتی۔ یہ تنقید اور تخلیق کی شاندار آمیزش ہے۔ انھوں نے غالب کی شعری بستی میں بیٹھ کر، غالبیت اوڑھ کر اور اس کی مخصوص فضا میں سانس لیتے ہوئے غالب سے منظوم تنقیدی انداز میں براہِ راست مکالمہ کیا ہے اور نہ صرف اس مکالماتی عملی تنقید سے غالب اور کلامِ غالب کی گرہیں کھولی ہیں بلکہ اپنے قاری کو تنقید کی طرف مائل کرنے کے پُرکشش اسباب بھی پیدا کیے ہیں۔ اردو تنقید میں سب سے زیادہ تعداد شاید غالب اور اقبال کے ناقدین اور شارحین کی ہے۔ ان میں سے اکثریت نے تنقید اور تدریس سے منسلک اکابرین کے رٹے رٹائے جملوں اور ان کے الٹ پھیر سے بغیر کوئی اپنی ٹھوس رائے شامل کیے یا ملی جلی بات کر کے یا پھر انگریزی تنقید کی مبہم اصطلاحوں سے کام چلا کر مضامین کے ڈھیر لگائے اور نام کمایا۔ یہی تنقیدیں نئے لکھاریوں کے ہاتھ لگیں اور یوں اردو ادب طرزِ تنقید کی صحت و دیعت کا شکار ہو گیا۔ یہاں تک کہ اب لوگ تنقید کی موت اور تنقید میں بے ہودگی کی بات کھل کر کرتے نظر آتے ہیں۔

غالب کے دور سے لے کر اب تک اس کے کلام کی گرہیں کھولی جا رہی ہیں۔ ان کے اشعار میں پنہاں رموز و معانی کا نیا پن آج بھی اسی طرح برقرار ہے اس لیے کلامِ غالب کی پرتیں کھولنے کا سلسلہ جاری ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس حوالے سے پروفیسر شمیم حنفی نے درست کہا کہ" بڑا شاعر بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔ حالی جہاں تھے وہاں بیٹھے ہیں، میر کی اپنی جگہ ہے، اسی طرح غالب جہاں ہیں وہیں رہیں گے۔ ان کا مقام کوئی نہیں لے سکتا۔" اور پھر " جتنا ابہام غالب کے عہد کی تاریخ میں ہے اس سے زیادہ ابہام غالب کی شاعری میں ہے۔ ان کے شرح اور تعبیر و تفہیم کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔" اچھی تنقید لکھنے کے لیے ایک متوازن اور خصوصی صالح تنقیدی مزاج کا ہونا بہت ضروری ہے۔ نقاد بادشاہ یا قاضی نہیں ہوتا کہ کسی فن پارے کے بارے میں حکم صادر کرے یا فتویٰ لگائے بلکہ اس کا رویہ تو ایک فقیر اور امانت دار کے جیسا ہوتا ہے جو فن پارے کے در کھولنے کے لیے دستک دیتا اور گلی گلی تو خوشبو سونگھتا یا اشتہا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی" خامہ بجوشِ غالب" اپنی نوعیت کی واحد اور شاندار تنقیدی دستاویز ہے جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ" غالب کے یک صد اشعار پر مذاق کے عمل میں خود اپنے ہاتھ بھی زخمی کیے ہیں اور اس کا خمیازہ بھی بھگتا کیا ہے۔"

ہر شعر پر ایک نظم کے روپ میں تنقید و تشریح، غالب کے ذہنِ رسا سے اگر ان میں کوئی کمی یا بیشی ہوئی ہے تو اس پر دو ٹوک رائے، شعر کے دو مصرعوں کے آگے پیچھے جھانک کر دیکھنے کا عمل اور غالب کی ذاتی کمزوریوں کو اس کے سامنے بیٹھ کر گوش گزار کرنے کا منفرد انداز لیے یہ نظمیں اردو میں تنقیدی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ کسی شاعری کی روح تک رسائی اور لفظوں کے پیچھے جھانکنے کے لیے

اس کے عہد، ذاتی زندگی اور عمری، ذہنی کی کھوج ایک نقاد کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ''غالب شناسی'' کے لیے ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے کتنے جتن کیے یہ ایک طویل داستان ہے۔ غالب کے شعری اور فکری مزاج کو سمجھنے کے لیے بیدل سے رجوع کرنا ایک فطری عمل تھا کیونکہ غالب ابتدا میں بیدل سے پوری طرح متاثر تھے۔ اس کا ذکر مولانا حالی نے بھی ''یادگارِ غالب'' میں کیا ہے اور غالب خود بھی بیدل کی عظمت کا اظہار کرتے ہیں

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

بیدل سے اپنے ''تعلقات'' کے حوالے سے وہ کہتے ہیں: ''یہ حادثہ غالب سے یارانہ قائم ہونے کے بعد ہوا۔ اس سے پہلے بیدل میرے لیے اجنبی تھا۔ یعنی غالب کو پہچاننے کے لیے مجھے بیدل کو پہچاننا پڑا۔ اس سفر کے ابتدائی مراحل میں مجھے یہ تجربہ تھی (اگر خال خال) کہ غالب کے کچھ اہم اشعار کی ماہیت کو سمجھنا ہو تو بیدل کی طرف رجوع لازمی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری لگتا ہے کہ غالب، جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا، کنارے ہوتے بیدل پر پیاسا کیسے بیٹھا رہتا! چلو، چل کے بیدل سے باتیں کریں۔۔۔ میں نے خود سے کہا۔ اور بیدل سے ہمکلام ہوا۔'' بیدل سے غالب کے متاثر ہونے کے حوالے تو بھی نقادوں کے ہاں ملتے ہیں لیکن ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے جس طریق سے اس عقیدت اور متاثریت کی کڑیاں ملائی ہیں یہ ان کا تنقیدی کمال بھی ہے اور غزل کے نئے لکھاریوں کے لیے شعری تربیت کا سامان بھی۔ ایسی تنقید کی یہ بہت بڑی خوبی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے بھی، جسے آج کل عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بیدل اور غالب کے یہاں شعری خوبیوں کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایک خصوصیت جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ بیدل کی عادت تھی یہ ہے کہ مصرعِ اولیٰ کی نسبت مصرعِ ثانی کو تحقیقِ معنی کا حامل بنایا جائے۔۔۔ اس سے بیدل کی یہ خوبی کا اثر قاری پر دیر تک رہتا ہے۔ مصرعِ اولیٰ کو اگر یہ خوبی بخشی جائے تو خدشہ یہ ہے کہ مصرعِ ثانی کا جلال اسے اگر ملا نہ بھی سکے تو بھی کم تر رہ سکتا ہے۔۔۔ غالب نے جن اشعار میں بیدل سے فیض حاصل کیا ان میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔۔۔ دوسرا پہلو جو غالب نے بیدل سے مستعار لیا وہ شراب کی تشبیہ کی طرح تشبیہی الفاظ سے تشبیہ ہے۔'' اب یہاں غالب کے ایک شعر پر بیدل کے حوالے سے ڈاکٹر آنند اور غالب کا آپس میں مکالمہ لیے ایک نظم دیکھیے:

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے   اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے   (غالب)

ستیہ پال آنند : حضور، اب کیا کہوں میں آپ کے اس ''عجز'' کے حق میں کہ ''قاری'' کی زباں میں آپ نے کچھ یوں کہا بھی تھا'' وہ ادا تغافل عرض یک رنگی تو ان دونوں تہی دامی کی پہلو بنا موجود جانا''

مرزا غالب : یقیناً، میں نے ایسا ہی کہا تھا، پر یہ مت بھولو کہ خودداری کی یہ تلمیح میری عجز گوئی ہے اسے بھی یاد رکھو۔ مکمل بحث ستیہ پال کر بیٹھے، یقیناً موزوں ہوا تھا کچھ برس پہلے۔

ستیہ پال آنند : مگر یہ بات بھی اچھی نہیں، سمجھو کہ یہ قدرے عیاں مضمون بیدل میں بھی ہے موجود، عالی جاہ

مرزا غالب : ارے بھائی، اگر یہاں گیر کیوں ہوتے ہو تم میرے؟ کہ میں تو بندۂ بے دام ہوں بیدل کا، اور اس کے تتبع و اقتدا و پیروی پر فخر ہے مجھ کو، کہو، اب اور کیا کہنا ہے اس قدر دین میں، آنند؟

ستیہ پال آنند : مجھے "پہلوتہی" (ذو معنویت) پتا نہیں، قبلہ کسی کو اپنے پہلو سے الگ کرنا تو تیزی ہے۔ اگر پہلوتہی کا صرف مطلب ہے تو بھی ہے تو پھر اپنی طرف مبذول کرنا بھی ضروری تھا اگر خود کو'' تغافل دوست'' کہہ کر ست سمجھے گا کہ عالی ظرف ہو جائے گا تو کارہ "دماغ عجز" دماغ عجز کو اول تو اوپر ہی سمجھے، پھر اسے "عالی" کہیں یا اور کچھ، اللہ مراتب دیں۔

مرزا غالب : عزیزی، مجھ سے مت الجھو کہ تم تو مشق ہو اب بھی سکھاو مت مجھے، کچھ خود بھی سیکھو اس حوالے سے سمجھتے کیوں نہیں، یہ ہیں معانی'' روزمرہ'' میں اگر بدلیں، بکھر جائے گا تشنہ اپنے لفظوں کا۔

ستیہ پال آنند : حضور، اب (المعتنے) کی نہیں ہے عمر، یہ میری مجھے سمجھائیں، استفادہ، دعیر نے سے اٹھا ہے۔

مرزا غالب : ''دماغ عجز'' کی ترکیب کیا ہے، جانتے ہو تم؟ ''دماغ'' اکثر مزاج ہے، رعونت کے معانی میں اداہیت، تکبر، سرو میری اس کے پہلو ہیں'' دماغ عجز'' جب کہتا ہوں میں تو میری شخصیت عزت، بندگی، عجز و خشوع و خاکساری ہے یہی اک وصف ہے میر امعانی در معانی میں اسے سمجھو تو شاید تم کو بھی کچھ عقل آجائے۔

ستیہ پال آنند : یہ تجدید کی مذمت میری بہبودی کی خاطر ہے مجھے یہ علم ہے، یہ مہربانی یا سعادت ہے! اسے سر آنکھوں پر قبلہ یہ تنبیہی مراوف، پر یہ شعر اب واقعی پر معنی و تصریح لگتا ہے کہاں تو'' عجز'' اور اس پر'' نخوت'' کا ٹکراؤ یہی تنبیہ و امتزاج ہے، بجا و بر ملا بھی ہے۔

یہ کسی دوسرے بڑے تخلیق کار کو اس کی ذات سے باہر نکالنے کے لیے کڑی ریاضت درکار ہوتی ہے اور پھر بھی اس میں کامیابی کے امکانات کسی حد تک ہی ہو سکتے ہیں۔ اس شخص کی نفسیات، معاشرتی پیچیدگیاں، زبان و بیان کی سطحیں، شخصی اور معاشی ضرورتیں اور اس جیسی بہت سی بے شمار رکاوٹیں اور مسائل راہ کا پتھر بن جاتے ہیں۔ اور خاص طور پر جب متذکرہ شخصیت اور محقق کار کے درمیان تقریباً ڈیڑھ صدی کا زمانی فاصلہ موجود ہو اور رسائی کی سواسطہ کے طور پر صرف لفظوں کی اردو زبان ہاتھ میں ہو۔

غالب شناسی کے عمل میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا رویہ ایک ایسے کھوجی کا ہے جو انسانی نفسیات کی باریکیوں اور لفظوں کی حرمت سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اور جب وہ فن کی باریکیوں سے لیس ہو کر غالب جیسے استاد کے اشعار میں اترتے ہیں تو خوب صورت اور مدلل گفتگو کے جواہر اپنے قاری کے سامنے ابھرتے ہیں۔ غالب کے ایک مشہور شعر پر ان کی مکالماتی رائے دیکھیے :

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو (مرزا غالب)

ستیہ پال آنند : یقیناً صنعت ترصیع وہ تسجیع ہے جس سے بحر کی ارکان یعنی آٹھ کے آٹھوں (مفاعیلن) بھی لفظوں سے اک اک کر کے جیسے جڑتے جاتے ہیں یہ کہہ سکتے (مفاعیلن) ہو ہم دل میں (مفاعیلن) نہیں ہیں پر (مفاعیلن) یہ بتلاؤ (مفاعیلن) یہ استادی ہے استادی اسے ہم بھی سمجھتے ہیں۔

مرزا غالب : سمجھتے ہیں عزیزی تم بہت ہشیار ہو لیکن اسے الفاظ میں ملبوس کرنا کار دشوار ہے۔

ستیہ پال آنند : نہیں قبلہ، ذرا دیکھیں یہ استفسار کیسا ہے۔

مرزا غالب : کہو، جو کچھ بھی کہنا ہے، کہو اے ستیہ پال آنند۔

ستیہ پال آنند : ذرا'' دل'' اور'' آنکھوں'' پر تو قبلہ غور فرمائیں ہے ان میں یہ فراغ و فیض کیسی، جناب من مجھے اتنا تو سمجھائیں کہ اس جھگڑے میں کیا کچھ ہے؟ کہاں دل، گوشت کی اک'' ڈگڈگی'' جو بولتی بھی نہیں سینے میں حیث و بحث میں ادبا ہوا، اور کہاں میں

انگلیں، جمالی کی محرم پیدا آنکھیں ؟ بہر جا مطلق وحشت ۔۔۔۔ کبھی کچھ دیکھنے والی۔

مرزا غالب : عزیزی چشم بینا اور دل میں فاصلہ کیا ہے، بس اک لمحے کا، لیکن دل تو خود میں بے اثر ٹھہرا۔

ستیہ پال آنند : ہمارے بے بصر دل اور ان بیدار آنکھوں میں بھلا کیا ہے تو فرق آپ فرمائیں گے کیا، استاد؟ جہاں دل راست گفتاری سے آزردہ ہے، وہاں آنکھیں صداقت کی امیدیں، ناظر و موجود و شاہد ہیں۔

مرزا غالب : وہ جو ہم وشماں ہے دل کی دنیا میں وحدت کے سما بجا، ابھی نہیں آنے کا آنکھوں کے نیا جانے میں اگر معنی تو سیدھے سادے ہیں اس شعر کے، تمنا گر دل میں بسیرا ہے مرے معشوق کا تو پھر مجھے بیدار رہنے میں ہے کیوں آزردگی صاحب؟

ستیہ پال آنند : تو گویا آپ بھی تسلیم کرتے ہیں، جناب من! ''پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا'' تو پھر اس 'نارسا' کو دل میں ہی محبوس رہنے دیں۔

غالب ہی کی ایک غزل کا مطلع ہے:

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بہ خوں غلطیدۂ صد رنگ، دعویٰ پارسائی کا

غالب کی سخن فہمی و سخن شناسی پر کہا جاتا ہے کہ اچھے شعر کو وہ صرف مزے لے لے کر پڑھتے بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دیتے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مومن خاں مومن کا یہ شعر سن کر غالب نے کہا تھا کہ ''کاش مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھے دے دیتا۔''

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ابراہیم ذوق اور داغ دہلوی کے اشعار پر مرزا کے جھوم اٹھنے کی روایات بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ غالب اپنے خطوط میں بھی دوسروں کے اچھے اشعار درج کرتے تھے۔ لیکن یہ کیا کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے میر تقی میر کے متعلق ان کے غالب کے مشہور اشعار کو نئے زاویے سے دیکھ کر ایک نئی بحث کا آغاز کر دیا۔

ریختے کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ستیہ پال آنند : مدح میں میر تقی میر کی، یہ دو اشعار خوب ہیں قدر شناسی کے لیے، یہ قبلہ شعر اول کی اعلیٰ کو سمجھنے کے لیے جو بھی ہے دل میں مرے، عرض کیے دیتا ہوں قول ناسخ کا ہے جس کا کہ حوالہ بے ثبوت اور اس قول میں مضمر ہے، یہ تحریب، حضور میر کی مدح اگر غیر کے ناطے سے ہوئی پھر تو خود آپ نہیں اپنے عقیدے کے مرید آپ کہتے تو ہیں ''اپنا یہ عقیدہ ہے''۔ مگر آپ کا ''اپنا عقیدہ'' نہیں یہ بندہ نواز۔

مرزا غالب : یاں کی کہاں اشارہ ہو رہی تھی، ستیہ پال کیا غلط بات ہے ناسخ کے حوالے کی میاں؟ صرف ناسخ ہی نہیں میر کا قائل کہ یہاں میر کا حق دوسروں نے کیا ہے تسلیم۔

ستیہ پال آنند : ''آپ بے بہرہ ہیں'' یعنی قدر شناسی کی کمی ہوگی ''بے بہرہ'' کہیں گے مجھے اس قصے میں اگر تسلیم کیا میر کی استادی کو بھی اور پردہ محرک تھا، جناب عالی چلیے آگے چلیں اس تلخ حقیقت سے کہ گر اس جگہ رک گئے تو آگے کہاں جائیں گے؟

مرزا غالب : بے شک دلچسپ ہے پر خاش، یہ بحثا بحثی اور کیا کچھ تمہیں کہنا ہے کہو ستیہ پال۔

ستیہ پال آنند : ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو، غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا واہ وا کیا ہاتھ کی چالاکی ہے، عیاری

بے وفا خود کو ہی "استاد" کا درجہ بخشا اور پھر میر کو "کہتے ہیں" کی صف میں ڈالا " کہتے ہیں" (لوگ) مگر میرا یہ فرمان نہیں کہنا لوگوں کا تو الٹا وسے بہ عدد کر دیا ہے میر کو "کوئی" فقط اجنبی تسلیم کیا اور "بھی تھا" کے معانی ہیں؟ "کئی اور بھی تھے" اور اب "اگلے زمانے" کے ہونے وقتوں آپ نے جب بھی یہ ترکیب کتنی برتی ہے۔

مرزا غالب : " اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو" جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں مضمرات اس میں جہاں اب کے سوا کچھ بھی نہیں واہ استاد، یہ ہے آپ کا حسن تعریف کیسی یہ شعبدہ بازی ہے، یہ چالاکی ہے میر کے ساتھ یہ کھلواڑ، یہ حیلہ کاری؟ ہے کوئی اس کی صفائی میں مدلل ارشاد؟

مرزا غالب : کیسی گستاخی، کیسی بیچ ہے یہ ستیہ پال؟ چوں چنانی، حیلہ ہوا ہے یہ بک بک، جھک جھک اپنی منطق ہے یہ اعتراض ہے، رنج بخشی ہے میں نے سمجھا تھا کہ تم بحث و فکر میں ہو عقیل مگر یہ سائل یہ خرافات، یہ واہی منطق تم سے امید نہیں تھی مجھے دم بازی کی حضرت میر سے مجھ کو نہیں کوئی پرخاش۔

ستیہ پال آنند : عفو و غفران، معافی، میرے قبلہ، مخدوم میں کف دست ہوا آپ کو جھٹلاتے ہیں۔

ڈاکٹر آنند نے زندگی کا زیادہ وقت بطور پروفیسر گزارا۔ شاید یہی وجہ ہے انھوں نے غالب کو سمجھنے، اس کے اشعار کے معانی تک رسائی حاصل کرنے اور انھیں اپنے قاری تک منتقل کرنے کے لیے وہی استاد اور شاگرد کے درمیان مکالماتی تحقیقی انداز کو ترجیح دی۔ ایک فطری استاد کے لیے اس سے بہتر اور موثر طریقہ شاید ممکن بھی نہیں تھا۔ غالب سے ان کے اشعار پر براہ راست مکالمہ کرنے کے علاوہ انھوں نے خود ایک استاد کے روپ میں کلاس روم میں بیٹھے طالب علموں کو غالب پڑھانے کا انداز بھی اپنایا۔ اس کی ایک مثال دیکھیے:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

(غالب)

پہلا طالب علم : دونوں جہان کیا ہیں ذرا یہ تو بتا دیں کہ یہ دونوں جہاں ہیں کیا؟ یا اور بھی کچھ ہیں؟

دوسرا طالب علم : محسوس و لامحسوس ہونے کی کیفیت؟ یا خاکی و عرشی ہیں، فقط ارض و فلک؟ یا زیر زمیں بھی کچھ ہے، یعنی کوئی پاتال؟

ستیہ پال آنند (استاد) : کون و مکاں کہیں کہ سماوات ارض و دو سرے زمین، زیر فلک، ساری کائنات

پہلا طالب علم : شاعر کے تصور میں فقط حاضر و موجود؟ یا مخفی و پنہاں بھی ہے اس اپنے جہاں سے؟ "کچھ"؟ سے کیا مقصود ہے؟ کہ صاف سیدھی بات؟ یا صرف طلب، صرف تاثر، غلط؟ درست؟

دوسرا طالب علم : "وہ" کون ہے جو مصرع کے صیغے میں ہے مرقوم۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی اردو ادب سے وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بانوے سال کی عمر میں بھی وہ اپنے قارئین میں نہ صرف اپنا شعری اور نثری سرمایہ تقسیم کر رہے ہیں بلکہ ان تحریروں کے توسط سے نوجوان لکھاریوں کی فنی اور فکری سطح پر تربیت کا سامان پیدا ہو رہا ہے۔ اب تک ان کی مختلف اصناف پر پچاس کے قریب کتب شائع ہو چکی ہیں۔ میں ان کی طویل اور صحت مند زندگی کے لیے دعا گو ہوں۔

◆◆◆

مکھوٹا......ناول کی تکنیک

ڈاکٹر غافر شہزاد

''مکھوٹا'' نجیبہ عارف کا اولین ناول ہے۔ نجیبہ عارف ناول کے آغاز میں ہی اس بات کا اعلان کرتی ہیں: ''سچ تو یہ ہے کہ مصنف کو ناول لکھنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ اس نے یہ ناول اناڑی پن اور بہت دھڑلے سے لکھا ہے۔ اسے طرح طرح کے تجربے کرنے اور ان تجربوں کے ذریعے خود کو کھنگالنے کا جنون ہے۔ آپ کو کچھ بتانا یا سمجھانا اس کا مقصد نہیں۔ پھر بھی آپ یہ ناول پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ مصنف کا اس پر تو بس نہیں۔'' اگلا سوال یہ ہے کہ کیا ہم مصنف کی بات مان کر ناول ایک طرف رکھ دیں۔ میرا خیال ہے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اس بات کی کھوج ضرور لگانا چاہیے کہ مصنف کو آخر یہ لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ مصنف نے لکھا ہے: ''طرح طرح کے تجربات کرنے اور ان تجربوں کے ذریعے خود کو کھنگالنے کا جنون ہے''۔ یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصنف نے اس ناول میں کیا تجربہ کیا ہے اور اس تجربے سے اسے کیا سجھائی دی ہے؟

ناول پڑھتے ہوئے ہمیں ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ نجیبہ عارف لسانیات کی ماہر ہیں۔ اس وقت بھی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ڈین آف فیکلٹی آف لینگوئج اینڈ لٹریچر کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ اس ناول میں بھی لسانیات کے جدید تر نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ تجربات کیے گئے ہیں جو ناول کی کہانی اور کرافٹ کی زیریں سطح پر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے کہ یہ کوئی ٹیکنیکل قسم کا ناول ہے۔ البتہ اس میں جو تکنیک اپنائی گئی ہے اس کا لسانیات کے ساتھ گہرا تعلق ضرور ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے؟ ناول کے بنیادی طور پر تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں صفحہ 9 تا 179 ناول کے بنیادی کردار سلیمہ بی بی کی کہانی چلتی ہے۔ کسی دور دراز گاؤں کے علاقے کے پرائمری اسکول سے تعلیم کی منزلیں طے کرتی ہوئی سلیمہ بی بی لاہور کالج میں داخل ہوتی ہے۔ یہاں آکر پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک سلیمہ بی بی کے والد کا تعارف مرزا نسیم بیگ ہے جو دال چنے کی ریڑھی سے رزق کماتا ہے۔ سلیمہ بی بی کو پڑھنے کا جنون ہے اور وہ ہر وقت اس خوف میں رہتی ہے کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے کہ اسے اسکول سے اٹھا لیا جائے۔ ناول کی کہانی کا یہ حصہ اپنے اندر ایسی تفصیلات اور جزئیات سمیٹے ہوئے ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار اپنی قوت اظہار اور زبان پر اپنی گرفت کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہتا ہے۔ قاری کو کئی مقامات پر لگتا ہے کہ تفصیلات سے کہانی بوجھل ہو گئی ہے مگر آگے چل کر پتا لگتا ہے کہ یہ تفصیلات اس حصے کی ایک ضرورت تھی۔

ناول کے دوسرے حصے کے آغاز میں محمد عمر میمن کے الفاظ میں ناول نگار لکھتی ہے: ''کیا کسی لکھنے والے کی تخلیقی کائنات میں کوئی دوسرا داخل ہو سکتا ہے؟'' یہیں سے ناول کی تکنیک کا لسانیات کے حوالے سے تجزیہ شروع ہوتا ہے۔ لسانیات کے حوالے سے کسی بھی نثر پارے میں الفاظ ہوتے ہیں جو بیان میں معاونت کرتے ہیں۔ ان الفاظ کی مدد سے متن تشکیل پاتا ہے اور یہ الفاظ زبان کا سٹرکچر بناتے

ہیں۔ ناول کے پہلے حصے میں بتایا گیا ہے کہ ناول نگار نے نہایت کامیابی کے ساتھ وہ کچھ لکھ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے اور اسے زبان پر پوری گرفت ہے۔ دوسرے حصے میں بتایا جاتا ہے کہ کوئی شخص بھی کسی دوسرے کی تخلیق کی کائنات میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ناول نگار کہانی کو آگے بڑھانا چاہتی ہے، جہاں اسے تخیل کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ سلیمہ بی بی پر کالج داخلے کے بعد حقیقی طور پر آگے کیا گزرتی ہے، اسے اس کا علم نہیں۔ یہاں زبان بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور اظہار پر گرفت بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ قاری کے ذہن میں سلیمہ بی بی کا کردار زندہ صورت اختیار کر چکا ہے اور وہ آگے اس کے بارے میں کچھ پڑھنا چاہتا ہے۔ جب ناول نگار یہیں کہانی روک دیتی ہے تو قاری احتجاج کرتا ہے۔ گویا متن کے ساتھ قاری کا تعلق بہت مضبوط ہو چکا ہے۔ جب ناول نگار تخیل کے زور پر قاری کے اصرار پر کہانی آگے بڑھاتی ہے تو سلیمہ بی بی کا حقیقی کردار ناول کی کہانی میں داخل ہو جاتا ہے اور اس پر سخت احتجاج کرتا ہے کہ اس کو اصل نام کے بجائے کہیں سلیمہ بی بی لکھا گیا کہیں فرزانہ کہیں رخسانہ۔ یہاں پہلے حصے کی کہانی کا اصل کردار ناول نگار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

”تم یہ ناول کبھی مکمل نہیں کر سکو گی اس لیے کہ تم مجھے کبھی نہیں جان سکتیں۔ تم میرے تجربے کو اپنے اندر نہیں اتار سکتیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر میں تمھیں بتاؤں جب بھی نہیں۔“ یہیں نجیبہ عارف کا لسانیات کا علم ناول میں شامل ہو جاتا ہے۔ لسانیات کی نئی تھیوری کے مطابق زبان کی کم مائیگی کا ذکر کرتے ہوئے، یہ کردار کہتا ہے: ”کبھی کبھی یہ سوچ کر بہت الجھن ہوتی ہے کہ زبان کا سرمایہ کتنا ناکافی ہے۔ چھوٹی چھوٹی عام سی بھی باتوں کے اظہار کے لیے ناکافی۔“ آگے چل کر یہ کردار کہتا ہے ”اس خود فریبی کے ساتھ کہ ایک نئی زندگی تخلیق کر رہے ہو تم لوگ تو ایک پرانی زندگی کو بھی ڈھنگ سے بیان نہیں کر پاتے۔ اس میں کئی زندگیوں کی آمیزش کر کے ایک عجیب ملغوبہ سا بنا دیتے ہو۔ میرے ساتھ بھی تم نے ایسا ہی کیا ہے“۔ اس حصے میں ناول کا حقیقی کردار بتاتا ہے کہ مرزا قسیم بیگ تو ہندوستان میں ایک نواب تھا جو یہاں آ کر مہاجر ہو گیا اور اسے روزگار کے لیے نان چنے کی ریڑھی لگانی پڑی۔ بیرسٹر کمال الدین مرزا قسیم بیگ کو اس شرط پر کلیم کے ذریعے یہاں جائیداد دلا رہا ہے کہ وہ اس کا آدھا حصہ فیس کے طور پر اسے دے گا۔ یہ بات ناول نگار کے علم میں ناول کا حقیقی کردار لاتا ہے۔ ناول کے تیسرے حصے میں محمد عزیز حسن کے یہ الفاظ درج ہیں

”لکھنے والا، ہم خود اس کی نگارش میں کچھ بھی دخل لیں، ناول و آخر وجود سے ہی سر مارتا ہے۔۔۔۔ موت نہ ہو تو فکشن بھی نہ ہو۔“ ناول کے تیسرے اور آخری حصے میں موت کی ناگزیریت اور قطعیت کو ہی بنیاد بنایا گیا ہے۔ یہاں ایک بار پھر ناول نگار نے لسانیات میں ساختیات سے مدد لی ہے لکھتی ہیں: ”اس کا چہرہ ایک کھوپڑی کے ڈھانچے میں بھری ہوئی گوشت کی فلنگ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کھوپڑی کے ڈھانچے تو کم و بیش سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کم از کم کسی غیر ماہر، عام آدمی کے لیے تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ سارا فرق تو اس فلنگ سے پڑتا ہے، کہاں کم ہے کہاں زیادہ، کہاں گہرائی ہے کہاں اونچائی۔“ اسی فلنگ سے انسانوں کے مکھوٹے تشکیل پاتے ہیں۔ یہ مکھوٹے ایک دوسرے سے الگ اور منفرد بھی فلنگ کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہی لسانیات کے اندر ساختیات اور پس ساختیات کی تھیوری ہے جسے یہاں زندگی میں کھوپڑی سے جوڑا گیا ہے۔ ناول کی کہانی کو وجود سے جوڑا گیا ہے۔ ناول میں لسانیات کی مجبوریاں، الفاظ کے استعمال میں احتیاط، زندگی کو پیش کر سکنے کا احساس نمایاں ہے۔ یہی آج کا لسانیات کا علم کہتا ہے یہی دریدہ کہتا ہے۔

◆◆◆

منٹو زندہ ہے

نیلم احمد بشیر

پچھلے چند برسوں سے سعادت حسن منٹو صاحب کا نئے سرے سے ہر سو تذکرہ پھر اُبھر آیا ہے۔ انہیں تقسیم سے پہلے کے زمانے میں ہی افسانہ نگاری کے موضوعات کی نئی جہات تلاش کرنے کا کریڈٹ دیا جا رہا ہے، جس کے وہ بلاشبہ حقدار ہیں۔ یہاں تقریب، وہاں مذاکرہ، کہیں ڈرامائی تشکیل، کہیں فلم، جگہ جگہ مضامین کی بھرمار، سوشل میڈیا پہ مباحث، غرضیکہ منٹو صاحب کی ہر طرف عزت افزائیاں ہو رہی ہیں جو یقیناً ایک خوشی کی بات ہے اور بالکل بجا بھی ہے۔

مجھے بطور ایک جونیئر افسانہ نگار، یہ سب دیکھ کر خوشی ہوتی ہے مگر پھر حیرت بھی میرا دامن نہیں چھوڑتی کہ انہوں نے ایک مختصر عمر پائی مگر اس میں بھی چوٹی کا ادب تخلیق کر گئے اور امر ہو گئے۔ آج منٹو کی تحریریں، دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ کر کے پڑھی جا رہی ہیں اور مقبولیت کا معیار قائم رکھنے میں بہت کامیاب ہیں۔ سبھی کا ماننا ہے کہ اس جیسا آزاد فکر، بے پرواہ، بے خوف، زندگی اپنے ڈھب سے جینے اور بسر کرنے والا کوئی دوسرا ادیب کم کم ہی اردو ادب کو نصیب ہوا ہے۔ اس نے ادب کے میدان میں جو جو پھول کھلایا، اس کی مہک باقی اور طلسم قائم ہے، گو کہ ان تحریروں کو منظر عام پر آئے اب ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ زمانہ اب بھی کہیں کہیں پہلے جیسا ہی ہے اور مسائل جوں کے توں موجود ہیں۔ تنگ نظری، تعصب اور ناانصافی کے رویے اب بھی ہمارے گرد مضبوطی سے قدم جمائے کھڑے ہیں۔ عورت آج بھی زیادہ تر مجبوریوں اور مصلحتوں کے تحت زندگی گزار رہی ہے۔ منٹو کا پسندیدہ موضوع، جسم فروشی کا دھندہ، یعنی دنیا کا قدیم ترین پیشہ، در پردہ اور کھلے عام اب بھی جاری ہے۔ اس نے شکلیں ضرور بدلی ہیں مگر وہ ہمارے معاشرے سے کبھی غائب نہیں ہوا بلکہ آج کے کٹھن حالات میں تو بہت سی عورتوں بلکہ لڑکوں، مردوں کی بھی ضرورت بن گیا ہے کہ ان لوگوں نے گھر بھی چلانے ہوتے ہیں اور افرادِ خانہ کی کفالت بھی کرنا ہوتی ہے۔ منٹو کی زندگی بھی آسان نہ تھی، وہ بھی معاشی مشکلات کا شکار رہتے تھے۔ اکثر گھر میں پیسے نہ ہوتے اور بیوی بچوں کی ضروریات پوری نہ ہو پاتیں مگر وہ کیا کرتے؟ لکھنے کے سوا انہیں تو کوئی اور کام بھی نہیں آتا تھا۔ وہ مسلسل لکھتے تھے۔ کبھی شوق سے اور کبھی حاجت سے۔ کئی بار تو انہوں نے آن آرڈر بھی افسانے لکھے تاکہ انہیں کچھ رقم مل سکے اور سہولت ہو جائے مگر شراب نوشی کی علت کی وجہ سے رقم خرچ ہو جاتی اور بیوی بچوں کی بنیادی ضروریات پوری ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ وہ اپنی جرأتِ رندانہ کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر اس موضوع پر لکھتے رہے جو ان کے نزدیک اہم تھا۔ ان کی تحریریں اکثر ان کے اپنے ہم عصر ادیبوں، پڑھنے والوں، ناقدین تک کو حیرت انگیز لگتیں اور وہ گھبراہٹ میں اعتراض کر بیٹھتے مگر منٹو صاحب پرواہ نہ کرتے۔ وہ لڑتے جھگڑتے، مقدمے جھیلتے، اپنے مؤقف پر ڈٹے رہتے کہ معززینِ شہر کے پردے چاک کرنے میں انہیں بہت مزا آتا تھا۔

منٹو سادہ زندگی گزارنے والے ذاتی طور پر بہت اعلیٰ سطح کے ادیب تھے۔ ادب اور سچائی سے کمٹمنٹ کی وجہ سے اپنی زندگی ایمانداری سے مکمل تخلیقی وجود کے ساتھ گزار دی۔ مقبولیت کا ہما ان کے سر پہ بیٹھا ہوا تھا سو ان کے لکھے کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔

انہوں نے قلم کے ذریعے اپنے افکار کی روشنی پھیلائی اور اپنا ایک الگ منفرد مقام بنایا۔ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی منٹو کا ادب اسی طرح تر و تازہ اور مختلف ہے جیسے اس زمانے میں تھا، یہی ان کی کامیابی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ آج ان کے فن اور شخصیت کا تذکرہ زیادہ تر اپر کلاس یعنی پڑھے لکھے، سوفسٹی کیٹڈ، ایلیٹ طبقے میں ہی سننے کو ملتا ہے۔ آج منٹو کو ڈسکس کرنا ایک فیشن بن چکا ہے۔ قیمتی ڈیزائنر ملبوسات، ماڈرن ڈریسنگ والے، عالیشان بنگلوں میں رہنے والے، فر فر انگریزی بولتے لوگوں کو جب میں تکتی ہوں کہ وہ منٹو کو اپنا پسندیدہ ادیب کہتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ میں سوچ میں پڑ جاتی ہوں کہ مخصوص، غریبوں، پچھلے، کچلے اور پسے ہوئے طبقے، استحصال کی ماری عورتوں کی ایک جیسی زندگی اور اداس کہانیاں سننے اور پڑھنے میں انہیں بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ منٹو کی کہانیوں کے کردار تو درحقیقت ہمارے آس پاس ہی گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے سرسراتے عطر ایمپیریٹ والے لوگ اس بائی طبقے کو تو کچھ بھی نہیں لگتے۔ اصلی زندگی میں تو یہ اپر کلاس ایسے لوگوں کو اپنے قریب تک بٹھانا پسند نہیں کرتی۔ ان الٹے مارے لوگوں کے دکھوں اور تکلیفوں کا احساس اور سمجھ بوجھ کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آج کل منٹو پر زیادہ تر مضامین انگریزی اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہمارا اردو کا قاری اتنا باشعور اور تعلیم یافتہ نہیں کہ منٹو کو سمجھ سکے۔ تو پھر یہ کیا وجہ ہے کہ منٹو آج اپر کلاس کا ادیب بن کے رہ گیا ہے؟ جبکہ منٹو خود عوام میں سے تھا اور عوام کی ہی بات کرتا تھا۔ ان ہی کے دکھوں کی کہانیاں سناتا تھا۔ وہ تو گلی محلوں، تاریک راہداریوں، طوائفوں کے بوسیدہ مکانوں سے جنم لینے والی کہانیوں کا مصنف تھا۔ مجھے یقین ہے آج اگر منٹو زندہ ہوتا تو خود کو یوں اپر کلاس میں مقبول ہوتا دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ ایسی کسی بھی فیشن ایبل محفل میں بیٹھ کر جہاں اس کا نام گونجتا جہاں اس کی سوگندھی، سوکندھی، کیارن، خارش زدہ کتیا اور بگھو قریب غریب قسم کے کرداروں کو کبھی کوئی اندر بھی نہ گھسنے دے۔ وہ تو غالباً خود بھی ایسی محفلوں سے اٹھ جاتا جہاں ملمع چڑھے کردار یوں تو چمکتے دمکتے دکھتے ہیں مگر اندر سے کھوکھلے اور مردہ ہوتے ہیں۔

منٹو کو اپنے حسن تحریر، اپنے کرافٹ پر حد درجہ اعتماد تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ اور کتنی بے باکی اور جرأت سے لکھ رہا ہے۔ وہ نڈر تھا اس لئے اپنی قبر پر جو کتبہ لکھوانا چاہا وہ بھی اس کی سوچ کا آئینہ دار تھا۔ منٹو کی وصیت تھی کہ اس کی قبر پر جو کتبہ لگے اس پر یہ عبارت لکھی جائے۔ "یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں فن افسانہ نگاری کے تمام اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے دبا یہ سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟"

افسوس کہ آج منٹو کی لحد پر یہ جرأت مندانہ تحریر موجود نہیں بلکہ ایک عام سا کتبہ ہے۔ اس کے گھر والوں نے احتیاطاً یہ کتبہ نہیں لگایا ہوگا کہ نہیں اس کا اندیشہ بہت پریشان کن ہوتا ہے۔ انہیں اندازہ تھا کہ ایسی کسی بھی عبارت سے غلط انداز سے لگا کر ہنگامے کھڑے کیے جا سکتے ہیں۔ اس گہری سچائی اور ظرافت کو کون سمجھتا سوائے ان کے جو یہ کتبہ لکھوانا ہی نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ منٹو نے اللہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے ہی یہ تو شرم تو منٹو کی شوخی کے پیار بھرے احساس کو الفاظ کا جامہ پہنایا تھا مگر شاید ہر خاص و عام کو یہ بات سمجھ میں نہ آتی۔ خدا نے تو خود کہا ہے کہ انسان کو خدا کے تصور میں تخلیق کیا گیا ہے تو اس میں تنگ ذہن لوگوں کو اعتراض نہیں کرنا چاہیے مگر خیر یہ منٹو کا لاابالی پن تھا کہ اس نے اس عبارت کی نگینی کا اندازہ نہیں لگایا اور جو لکھنا چاہتا تھا لکھ گیا۔ اس نے تو پیارے ایک تکا چھپا کر خدا کو بھیجا تھا۔ اللہ کو دوست سمجھ کر یہ کہہ دیا تھا "انا الحق" جیسی بات کر دی تھی مگر اس کی آخری آرام گاہ پر اس کی مرضی کی تحریر پھر بھی نہ لکھی جا سکی جس کا افسوس ہے۔

تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب انسان اور خدا ایک دوسرے میں مدغم ہوتے نظر آتے ہیں۔ مانا کہ ہماری زیست کی کہانی اللہ ہی لکھتا ہے مگر اس کا نائب انسان بھی تو کہانیاں گھڑنے اور گھڑنے کا اہل ہے۔ بائبل میں ایک جگہ ایک قصہ درج ہے کہ ایک بار حضرت یعقوب اور خدا کے درمیان رات بھر کشتی ہوئی تو یعقوب نے خدا کو پچھاڑ دیا۔ صبح دم جب وہ الگ ہوئے تو یعقوب نے اللہ سے کہا، ''میں تجھے اس وقت تک جانے نہ دوں گا جب تک تو مجھے اپنی برکت نہ بخشے گا۔ خدا نے تب ہی انہیں یعقوب کا لقب دیا یعنی خدا اور بندوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے والا۔ خدا آگہتا تھا اور خدا سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟''

منٹو بھی غالباً خدا سے ایسی ہی کشتی اور بے تکلفانہ محبت کی توقع کر رہا تھا۔ اس کی نوازش کا طلبگار تھا۔ دونوں ہی تخلیق کار ہیں تو ہو ہی سکتے ہیں۔ اللہ کہتا ہے میں تمہاری شہ رگ سے قریب ہوں تو پھر دوری کیسی اور فاصلہ کیسا؟! انسان میں بھی تو خدا کی صفات اور مختلف ہوتی ہے تو دوست تو ہو سکتے ہیں نا۔ غالباً اسی سوچ کے نتیجے میں منٹو نے ایسا کتبہ لکھوانے کی سوچی ہوگی۔ مگر مذہبی منافرت کے اس دور میں منٹو صاحب کے گھر والوں کی دوراندیشی بھی یقیناً درست رہی ہوگی۔ منٹو صاحب آج جہاں کہیں بھی ہیں یہ سوچ کر پریشان ہو رہے ہوں گے کہ جس فرسودہ نظام اور رجعت پسند سوچ کے بارے میں، میں لکھتا تھا وہی جیت گیا اور میں ہار گیا۔ دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں گے۔ ''یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟'' منٹو صاحب کا یہ ان کا احساس، ان کے آدرش، ان کے سوچنے کا منفرد انداز صرف انہی کا خاصہ تھا۔ منٹو صاحب کا یہ کتبہ اگرچہ اپنی مصلحت، ان کے کتبے پر چسپاں کر دینا ان کی یقیناً حق تلفی ہے۔ کیا خبر یہ احساس انہیں ان کی قبر میں بے آرام ہی رکھتا ہو۔ یہی کتبہ اگر مغرب کے کسی ادیب کی قبر پر ہوتا تو ہم سب بڑی واہ واہ کرتے اور اسے شخصی آزادی کے کھاتے میں ڈال کر اس پر قہقہوں کے ڈونگرے برساتے۔ اس قبر پر جا کر شوق سے تصویریں کھنچواتے۔ پھول چڑھاتے۔ مگر ہمارے معاشرے کے ادیب کو یہ عزت نصیب نہ ہوئی۔ منٹو جیسا نکتہ شناس، حساس، باغی، غیر معمولی ادیب، اردو ادب کو کم کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ وہ اردگرد کی تلخیوں سے ہیروں جیسی کہانیاں چن لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسے تقسیم ہندوستان کے سیاسی حالات و محرکات سے زیادہ اس نازک دور سے گزرنے والے ہر مذہب اور ہر نسل کے افراد کی خون آلود داستانوں میں زیادہ دلچسپی تھی سو وہ لکھتا چلا گیا۔ بلا جھجک، بلا خوف اپنی دھن میں مست منٹو نے ہندو پاک کے تو ہوا سے یہ جو بھی لکھا ادب عالیہ قرار پایا۔ انسانوں کی ٹوٹ پھوٹ، شکست و ریخت اس کی کہانیوں کا موضوع بنتی رہی اور عظیم ادب پارے منظر عام پر آتے رہے۔ منٹو تو گزر گیا مگر ظلم و ستم کا دور اب بھی گزر رہا ہے اور ہم اسے سہہ رہے اور گزار رہے ہیں۔ آج بھی اس معاشرے میں منٹو کی کہانیوں کے پاگل، ظالم، مطلب پرست، گھٹیا، عام دندناتے پھرتے ہیں ہر طرف ناانصافی اور زیادتی کا دور دورہ ہے، عورتیں اور بچے ریپ ہو رہے ہیں، بیٹیوں پر تیزاب پھینکے جا رہے ہیں اور مجرم سزا سے بچ کے آرام سے گھروں میں بیٹھے ہیں۔

آج ادب بھی ویسا نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے منٹو نے عالم بالا سے نیچے کو جھانک کر ہمارے معاشرتی انحطاط اور پستی میں گری اخلاقیات کا مشاہدہ کر کے بڑی بڑی کہانیوں کی سطریں اٹھائے خدا کے حضور کھڑا پوچھتا ہوگا۔ ''اے میرے عظیم تخلیق کار بتا، کیا یہ آدم کی اس جھلک، کبھی نہ دیکھو میں آنے والی، ابھی ہوئی تھا میں بھی کوئی نیا موڑ آئے گا؟'' منٹو جنت کی کسی لائبریری کے عقب میں سے خوبصورت باغیچے میں کھلے حسین پھولوں کے ایک خوشبودار گچھے کے قریب بیٹھا، اپنی موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے مسکرا کر دیکھتا، یا ساحل سمندر پر بیٹھا اپنی شراب کی خالی بوتل کو دور افق پر بادلوں کی طرف اچھالتا ہوا کہہ رہا ہوگا۔''

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

◆◆◆

اجمیر میں فروغِ سخن کے بنیادی کردار

خاور اعجاز

اجمیر شہر کی بنیاد راجہ اجے پال چوہان نے دسویں صدی عیسوی میں رکھی۔ اجمیر راجستھان کا دل کہلاتا ہے۔ دلّی سے خصوصی سیاسی اور انتظامی روابط کے باعث اجمیر کو تاریخِ پاک و ہند میں ایک اہم مقام کا درجہ حاصل رہا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کے حوالے سے اجمیر شہر کی ایک مستقل اہمیت ہے۔ ان سے منسوب فارسی اشعار ہو تر دیا آگئی کی کاوش ہیں جیسے:

ما طلبگار تو ایم و تو گریزانی ز ما　　　ما ہوسِ مشکل تو روئے گردانی ز ما

تاہم ان کے بعض خلفاء کے ہاں اردو کے اولین نقوش کی تصدیق ہوتی ہے جیسے ان کے خلیفہ خواجہ حمید الدین ناگوری (م 673ھ/1276ء) کے بارے میں خود خواجہ ناگوری (م 673ھ/1276ء) اور ان کے بیٹے شیخ فرید الدین محمود کے مجموعہ ملفوظات ''سرور الصدور و نور البدور'' میں درج ہے کہ ''بہ زبانِ ہندوی گفتند''۔ تاریخی طور پر یہ شہادت موجود ہے کہ خواجہ ناگوری کے ہاں ہندوی بولی جاتی تھی۔ مزید یہ کہ خواجہ فرید شکر گنج کے ارشاد ''پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے'' سے بھی ہندوی کے چلن کی تصدیق ہوتی ہے۔ عہدِ اکبری میں تصنیف کی گئی ایک منقبت کا سراغ بھی ملتا ہے جسے قوال ان درگاہ شریف حضرت خواجہ معین الدین چشتی ایک زمانے سے گاتے چلے آ رہے ہیں جس کا پہلا بند یوں ہے:

ہے تو شیخ (سہی) معین الحق بندہ سنوارا　　　چشتی چراغ جگ میں اجیارا
ہے تو شیخ (سہی) معین الحق بندہ سنوار
تو قطب دنیا دین بھیو　　　جھلل ولی نور ہدیٰ حور ہدیٰ ہردوارا
بھیو راجہ گھیر لئیں اجمیر　　　جب کیو اسلام توڑا کفارا
ہے تو شیخ (سہی) معین الحق بندہ سنوار

عہدِ شاہجہانی میں خواجہ معین الدین چشتی کے خدام میں سے ایک صاحبِ اسرار قادری بزرگ شاہ ابوالمعالی خدمتِ درس پر فائز تھے۔ سادات کرمان سے تعلق تھا اور ستائیسویں پشت میں شجرہ نسب امام محمد تقی سے ملتا ہے۔ ان کا اصل نام سید خیر الدین محمد، لقب اسد الدین اور کنیت ابوالمعالی تھی۔ 1552ء کو شیر گڑھ تحصیل دیپالپور، ضلع اوکاڑہ میں پیدا ہوئے اور 1615ء کو لاہور میں وفات پائی اور بیرون موچی دروازہ لاہور مدفون ہوئے۔ علوم منقولات و معقولات اپنے والد سید رحمت اللہ سے سیکھے اور جلد ہی مروجہ علوم کے علاوہ عربی و فارسی ادب میں دسترس حاصل کر لی۔ اپنے چچا شیخ المشائخ داؤد کرمانی شیر گڑھی کے داماد اور خلیفۂ اعظم تھے۔ خرقۂ خلافت ملتے ہی لاہور میں مامور ہوئی تو شیر گڑھ سے لاہور کے سفر کے دوران جہاں قیام کیا وہاں سرائے، کنواں، تالاب یا باغ لگوایا جن میں کچھ کے آثار آج بھی

باقی ہیں۔ شاعر بھی تھے اور معالی کے علاوہ ساقی، معطی اور فرہنگی تخلص کرتے تھے۔ عموماً عربی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔

آں ترک عجم چوں ز تنے حسن طرب کرد ۔۔۔ بر پشت سمن آمدہ و صید عرب کرد

ان کے ایک ہندی فارسی ریختہ کا سراغ بھی ملتا ہے:

اے صنم تیری یاد کیسیں (کیسے) کروں ۔۔۔ فکر ہجر بود و ذکر جلی
خاک درگاہ مصطفےٰ کا ہو ۔۔۔ بعد ازاں حب اہل بیت علی
حسن تیرے کا جب خیال کیا ۔۔۔ چشم مجنوں بدید رخ لیلی
کچھ اپنے سیں دور کر کچھ گفت ۔۔۔ راز ظاہر مکن تو اے معالی

جلال الدین اکبر کے ملک الشعرا فیضی ان کے بڑے مداح تھے اور مسلسل تقاضا کر کے ایک مرتبہ اپنے ہاں مدعو کیا جہاں فیضی کے کتب خانے سے انھوں نے بغیر کچھ کھائے پیے تین دن استفادہ کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (1551ء۔1642ء) بھی ابوالمعالی کے مداحوں اور عقیدت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ابوالمعالی کی تصانیف میں رسالہ غوثیہ (منقبت شیخ عبدالقادر جیلانی)، تحفۃ القادریہ (کرامات شیخ عبدالقادر جیلانی)، علیہ سرود و عالم، گلدستہ باغ ارم، مونس جان، زعفران زار، رسالہ شوقیہ المعروف ہفت کرسی، رد مذاہب، رسالہ اصول صوفیا، رسالہ نوریہ اور قلمی ملفوظات کا مجموعہ ہشت مجلس شامل ہیں۔

اجمیر کی نسبت سے اکبر کے فرزند اور جہانگیر کے برادر خورد شاہزادہ سلطان دانیال مرزا (1572ء۔1605ء) کی شعری کاوشوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان کی پیدائش اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کے ایک مجاور شیخ دانیال کے گھر پر ہوئی اور اسی مناسبت سے ان کا نام دانیال رکھا گیا۔ 1597ء میں وہ الہ آباد کے صوبیدار مقرر کیے گئے۔ بے حساب شراب نوشی کے سبب محض تینتیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اکبر کے حکم پر شراب کی بندش کے بعد دانیال کے ایک خادم مرشد قلی بندوقچی نے "یکہ و جنازہ" نامی بندوق کی نال میں شراب فراہم کی۔ شراب اس قدر تیز تھی کہ بندوق کی نال میں موجود لوہے کا زنگ بھی شراب میں حل ہو گیا اور موت کا سبب بنا۔ دکن میں وفات پائی اور سکندرہ (آگرہ) میں مقبرہ جلال الدین محمد اکبر کے احاطہ میں مدفون ہیں۔

وہ مغل خاندان کے دیگر افراد کی طرح فنون لطیفہ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ شاعر بھی تھے اور فارسی کے علاوہ قدیم ہندی میں بھی اشعار کہا کرتے تھے جس کی تصدیق تزک جہانگیری میں منقول شہنشاہ جہانگیر کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ ان کا بھائی دانیال "کبھی کبھی ہندوستان والوں کی زبان میں اور ان کے ڈھنگ پر شعر کہتا تھا" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دانیال پرانی ہندی میں شعر کہتے ہوں گے کہ ابھی اردو نے رواج نہیں پکڑا تھا تاہم دانیال کی ہندوی شاعری دستیاب نہیں ہو سکی البتہ ان کا ایک فارسی شعر تزک جہانگیری میں نقل ہوا ہے جو انھوں نے اپنی ایک بندوق "یکہ و جنازہ" پر کندہ کروایا تھا:

از شوق شکارت تو شود جان تر و تازہ ۔۔۔ بر ہر کہ خورد تیر تو یکہ و جنازہ

میر نظام الدین ممنون (1766ء۔1844ء) اجمیر میں صدر الصدور رہے۔ تذکرہ نگاروں کی مجموعی رائے میں وہ سنجیدہ، شیریں سخن اور نیک کردار شخص تھے۔ پرگو، پختہ، شیریں کلام اور فصیح زبان شاعر تھے۔ ممنون نے تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار کہے۔ وہ اردو غزل کی

اس روایت کی توسیع و اشاعت کرنے والے شاعر تھے جو ولی دکنی اور شاہ حاتم کے اثرات لے کر آئے۔ اس روایت میں وہ شکوہ و الفاظ اور عامیت لفظی کے ساتھ ان کے میر و سودا کی نظر سے بچتے ہوئے سخن ریختہ سے تلاش کرنے میں مصروف اور روایت کی پاسداری میں مصحفی، جرأت اور انشا کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں حتیٰ کہ ناسخ کے عہد میں بدلے ہوئے لہجے کو بھی روایت کا تسلسل سمجھ کے قبول کرتے اور اپنے تئیں نئی سمت میں قدم بڑھانے کی سعی کرتے ہیں۔ اس سعی کو ان کے زمانہ میں ''طرز تازہ'' کہا گیا لیکن یہ طرز تھوڑی بہت مختلف ہوتے ہوئے بھی مصحفی، جرأت اور ناسخ کے دائرہ استادی کے اندر رہی اور مضمون کا قدم مذکورہ شعرا سے آگے نہ بڑھ سکا تاہم وہ اس سلسلے کی ایسی کڑی ہیں کہ الگ کر دی جائے تو علاقہ زنجیر باقی نہیں رہتا۔ ان کی غزل متنوع ہے اور اپنے زمانے کے اعتبار سے اس میں جدت کے اثرات کی نشاندہی سعادت خاں ناصر کی اس رائے سے کی جا سکتی ہے جو انہیں ''متلاشی سخن نو، جویائے تازہ مضمون'' کہتے ہیں۔ ان کے اشعار میں پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ محاورے کی چاشنی اور مضمون آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔

بندہ ہوں حسن صورت و عشق مجاز کا — ہر آئنہ میں جلوہ ہے اس جلوہ ساز کا
نہ ہو قلم میں ہے زور اتنا بھی بہانے کا — کہ اس قفس میں نہیں حکم آب و دانے کا
نالہ اثر ہیں کہ شعار دل ناشاد ہوا — جو نفس لب تلک آیا سو وہ فریاد ہوا
کل جو خلوت میں وہ گل محو خود آرائی تھا — آئینہ پشت بدیوار تماشائی تھا
قامت قیامت یار و قیامت میں ہے کیا مضموں — وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

شیخ محمد عبداللہ فاروقی تنجر اجمیری نے سید شیر زمان خاں صاحب (شاگرد حافظ عبدالرحمان احسان 1769ء) کے علاوہ عبدالقادر خاں ذکی ناگپوری اور بیا اجمیری (شاگرد داغ دہلوی 1831ء) سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ تنجر اجمیری محاورہ گوئی میں مشاق اور عاشقانہ مضامین باندھنے میں طاق تھے۔ صنف ریختی میں بھی کہا۔

گرم ہے فصل خزاں میں یہ فغان عندلیب — پڑ گئے ہیں آبلے زیر زبان عندلیب
کافی ہے رہنے کے لیے تکیہ فقیر کو — مطلب نہ قصر سے ہے نہ کچھ بام سے غرض
ہجر میں ہم بچے ہیں مر مر کے — دیکھ لیں اب تجھے نظر بھر کے
گیا نہ سر سے جو سودا سیاہ زلفوں کا — عدم سے آئے تھے کیا ہم اسی بلا کے لیے

شیخ محمد عبدالصمد فہیم اجمیری (1788ء۔1893ء) شاگرد غالب نے ناموری پائی۔ جوانی میں اجمیر چلے گئے جہاں اجمیر کے علاوہ اجمیر کے نواحی شہر نصیر آباد میں رہے جسے دربار دلی سے نصیر جنگ کا خطاب ملنے والے جنرل آکٹرلونی نے بسایا تھا۔ فہیم نسباً فاروقی تھے۔ پیشہ معلمی۔ زود گو اور بسیار گو تھے۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں بڑی مہارت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فہیم کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں میں اختلاف ہو گیا اور ان کا کلام جس کے پاس تھا وہ اسے اپنا بنا کر پڑھتا رہا۔ اجمیر کے ایک حاکم طو خاں سے موسوم محلہ آسا گنج سے متصل قبرستان طوسر میں مدفون ہوئے مگر اب فہیم کے مزار سمیت بہت سے مزار برابر کر کے مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔

یار نے دیدار دکھلایا دم آخر فہیم — عمر بھر کے غم اٹھانے کا گلہ جاتا رہا

ملایا خاک میں ہستی کو بن گئی اکسیر — اٹھائی خاک تو مٹی میں تخم زر آیا
پرتو اسی کا ہے یہ مہ و آفتاب میں — جلوہ دکھا رہا ہے وہ لاکھوں حجاب میں
زندہ دل کب ہوں آپ بجا کرتے ہیں — ہم تو مر جانے کی اے خضر دعا کرتے ہیں
مارا ہااا اک نظر میں عاشق دلگیر کو — کیا نکالے یہ لگا ہے، آفریں اس تیر کو
خواب میں دیکھا ہے میں نے ماہ کی تصویر کو — کوئی کامل چاہیے اس خواب کی تعبیر کو
اے سوز ہوشیار مری آنکھ تر نہ ہو — پردے کی بات ہے یہ کسی کو خبر نہ ہو
گر چاہتا ہے تو کہ خبر یار کی ملے — اس کو تلاش کر کہ تجھے اپنی خبر نہ ہو
بیٹھا کبھی نہ رہوں گا جو اس جہان میں کلیم — رہے گی مجھ سے جہاں میں یہ گفتگو باقی
کیسا عروج خاک میں سونا ہے ایک دن — اب مثل فلک پہ تمہارا قدم سہی
آج کچھ مشورہ رقیب سے ہے — دیکھیے کیا کرے وہ کیا نہ کرے
بے وفا ہے وہ اس کا وعدہ کیا — فکر ہے حشر تک وفا نہ کرے
علم توحید میں حاصل ہے مجھے عین کمال — جز الف اور کوئی حرف نہیں یاد مجھے
ہیں رہ مقصود میں لاکھوں ہی خضر آشنا — عرش تک پہنچا ہوں لیکن پہلی ہی منزل میں ہے
میں ہی مست بادۂ وحدت نہیں منصور وار — ساقیا شور اناالحق ہر طرف محفل میں ہے

شاہ معین الدین چشتی خاموش (1790ء ۔ 1871ء) نے اجمیر میں چلہ کشی کی۔ حضرت بندہ نواز کی اولاد سے تھے اور علاؤالدین صابر چشتی کے مرید تھے۔ اسی نسبت سے صابریہ چشتیہ طریقہ اختیار کیا۔ بارہ سال تک عالم سکوت میں رہے جس کے باعث خاموش مشہور ہو گئے۔ کلام متصوفانہ ہے۔ خیال ہے کہ قیام اجمیر کے دوران انھوں نے کچھ شاعری ضرور کی ہوگی۔

مطلع دل پہ مرے چھایا تھا زنگار کدورت — چاند بدلی میں چھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا
چمن میں رہتی ہے بلبل ترس ترس کے پاس — یہ شور کرتی ہے ہوا قفس قفس کے پاس
وہ عالم کی ہستی ہے موہوم ساری — جسے دیکھتا ہوں عدم جانتا ہوں

پیرزادہ حکیم میر جواہر علی جواہر اجمیری (1791ء ۔ 1856ء) اردو اور فارسی کے شاعر تھے اور اجمیر کی دور قدیم کی ادبی سرگرمیوں کا حصہ رہے۔

حنائی ہاتھ کو دریا میں دھو لو — لگا آگ پانی میں ہنر ہے

منشی میر کرامت علی خاں شہیدی (1798ء ۔ 1840ء) گاہے گاہے اجمیر بھی جاتے رہے۔ بے تکلف، عاشق مزاج، زندہ دل اور وسیع المشرب آدمی تھے۔ سرکار انگلشیہ میں ملازم رہے۔ پاداش میں سرکاری روپیہ بھی اڑا دیا۔ پوچھ گچھ سے گھبرا کر دفتر کو آگ لگا دی اور کچھ روز تک دیوانوں کی سی حالت بنا کر گلو خلاصی کرائی۔ علم حساب اور عروض میں ماہر تھے۔ حج کے بعد مدینہ منورہ کے نہایت قریب میں

روضۂ اقدس پر نظر پڑتے ہی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات پائی اور اپنے اس شعر کے مصداق ہو گئے

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

کلام میں شستگی موجود ہے۔ ان کی غزل نے داغؔ کی پیدا کردہ شگفتگی میں تھوڑی تازگی کے جز پیدا کر کے ضرور ابھارے۔ سنگلاخ زمینوں میں چو غزلہ، سہ غزلہ اور ہر غزل میں پچیس تیس اشعار کا ہونا شہیدی کا خاصا تھا۔ ان کی غزل میں عشقِ حقیقی کی جھلک نظر آتی ہے۔

وعدۂ شام پہ کی ہم نے صبح جاگ کے صبح
وہ اسی وقت نہ آتے اگر آنا ہوتا

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی، اگر تو کسی قابل ہوتا

گزر بل سے اگر طالب ہے عمر جاودانی کا
چھپا ہے گور کی ظلمت میں چشمہ زندگانی کا

میر یعقوب علی خان یعقوبؔ اجمیری۔ شاگردِ داغؔ۔ فارسی اور گجراتی زبانوں کے علاوہ علم موسیقی سے بھی واقف تھے۔

انصاف تم ہی کرو وہ اگر بیٹھ کر کبھی
پھر کیوں دعائیں مانگوں میں روزِ حساب کی

یعقوبؔ ذکر چھوڑو، تم اپنے شباب کا
گزرا ہوا فسانہ ہے باتیں ہیں خواب کی

ہے اس کی یہ خو گھر سے جو پل پل میں نکالے
پر ہم بھی ہیں وہ تنگ کر لیتے نہیں ٹالے

نواب شمس الدین علی خان عاشقؔ اجمیری۔ شاگردِ داغؔ دہلوی۔

دیکھیے تو کوئی سوزِ محبت کے حوصلے
اک نام برقِ طور ہے عاشق کی آہ کا

خط عدو کو لکھا، لفافے پر
نام لکھا ہوا ہمارا تھا

آئینہ کی طرف نظر کیجیے
سامنے کون ہے برابر کا

مری جان یہ کیا قیامت سے کم ہے
ادھر دکھ لینا ادھر دیکھ لینا

فقط اک دم ہے جو آیا نہ آیا
بھروسہ کیا ہے اپنی زندگی کا

نہیں بعدِ فنا کوئی کسی کا
مری جاں ساتھ ہے یہ جیتے جی کا

آئینہ دیکھ کے حیران ہوئے کیوں اتنے
تم نے اس میں بھی کوئی عیب نکالا ہوتا

یہ عشق کی منزل تو بہت سخت ہے منزل
اس راہ میں تو خضر بھی رہبر نہیں ہوتا

اس دل میں کچھ نہ کچھ مرے آزار ہی رہا
کم بخت اچھا ہو کے بھی بیمار ہی رہا

سزاوارِ محبت ہوں، گرفتارِ مصیبت ہوں
تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

وہاں قاصد پر لے دے کی یہاں دم نکل گیا
قابو میں تھا ہمارا دلِ بے قرار کب

یہ وہی دن ہے جو عاشق نے کہا تھا بارہا
ہوش اب کیوں اڑ گئے روزِ جزا کو دیکھ کر

وہ نظروں سے مرے دل کو اڑا کر
چلے ہیں مٹھیاں خالی دکھا کر

بھلا یہ تو بتاؤ بزمِ خوباں سے ہے کیا نسبت
اگر دیکھے ہوئے ہیں آپ کے خلد و جناں واعظ

حکیم مراد علی بیمارؔ اجمیری (1841ء۔1900ء) شاگرد غالبؔ اسد اللہ خاں۔ انتیس برس کی عمر میں اجمیر پہنچے۔ یہاں قیام کے کچھ عرصہ بعد "چراغ راجستھان" کے نام سے ایک مطبع قائم کرنے کے علاوہ یہاں سے نکلنے والے ایک رسالے "رہنما" اور ایک ہفت روزہ "راجپوتانہ گزٹ" کے مدیر مقرر ہوئے۔ زبان کے چیکے تھے لہٰذا اجمیر کو شاید ہی اہم فرد ان کے حلقوں سے محروم رہا ہو۔ اجمیر کے "کوہ مدار" نامی پہاڑ پہ مدفون ہوئے۔ عہد جوانی میں ہی دیوان مکمل کر لیا تھا مگر ان کے مطبع کے ایک کاپی نویس نے، جو "شگفتہ" تخلص کرتے تھے، دیوان چرا لیا۔ حکیم صاحب کی تالیف "بوستان خواجہ" میں مذکور منشی محمد اکبر جہاں شگفتہ کے تذکرے سے گمان گزرتا ہے کہ یہ کارروائی انھی حضرت کی نہ ہو۔ حکیم صاحب کی تصنیف "یادگار مراد علی" میں ان کے اشعار بھی ہیں جو بقول سید فضل المتین "اس قدر عریاں ہیں کہ ان کے مطالعے سے شرح چشتی بھی محجوب و شرمسار نظر آتی ہے" تاہم عمر کے آخری حصے میں سنجیدہ کلام کی طرف متوجہ ہوئے۔

ے ان ہستی موہوم پہ نازاں نہ ہو ناداں — اک دم کا بھروسہ نہیں بیمار یہاں کا
ے نام والوں کے مٹا ڈالے ہیں سب نام و نشاں — اے فلک بے مہر بتا تجھ کو حاصل کیا ہوا
ے وہ مسیحا جب نہ آیا ہم تڑپ کر رہ گئے — جان دینا تم کو اے بیمار مشکل ہو گیا
ے آزمایا خوب ہی دنیا کو ہم نے ہوشیار — مطلبی ملتے ہیں، کوئی باوفا ملتا نہیں
ے گو ہوشیار ان کے در پہ ہے عاشق — بھلا کب وہ ملنے کی حامی کریں گے

قاضی سید شاہ امام الدین علی اخترؔ اجمیری (1847ء۔1912ء) خلف قاضی منیر الدین منیر۔ خواجہ اجمیری کی اولاد میں تھے۔ کم عمری میں میر جواد اجمیری سے فارسی کا سبق لیا۔ ملازمت کا آغاز پندرہ سال کی عمر میں بحیثیت نائب تحصیلدار کیا، گرداور سے ریونیو اسسٹنٹ کمشنر ہو کر 1908ء میں سبکدوش ہوئے تو اگلے برس درگاہ شریف کے دیوان مقرر ہوئے۔ فارسی خوب جانتے تھے لہٰذا عربی سے بھی اچھی واقفیت تھی۔ غالبؔ کی وفات کے بعد سید مظفر حسین شوقؔ نیر آبادی (تلمیذ غالبؔ) اور مولوی حکیم محمد حسن امروہوی کو کلام دکھایا۔

ے رقیب اٹھ شکایت کریں نہیں شکوہ — گلہ تو یہ ہے کہ تم نے بھی اعتبار کیا
ے ہم نہ کہتے تھے اخترؔ اس بت ناداں سے نہ مل — چار ہی دن میں یہ کیا ہو گیا نقشا تیرا
ے آفت جان دل ناکام ہمارا نکلا — دوست بھی دشمن آرام ہمارا نکلا
ے جلوۂ حسن جہاں سوز دکھا کر مارا — شعلہ رو تو نے مجھے مارا جلا کر مارا
ے کعبے میں، بت کدے میں، کلیسا میں، دیر میں — تیرا پتہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا
ے دل کسی پہ جانا ہونا ہی تھا — عشق میں جو کچھ ہوا ہونا ہی تھا
ے بنا بنا کے بگاڑیں گے زلف ساری رات — وہ آ چکے، شب وعدہ، اگر سنگھار کیا
ے بعد مدت کے ملی آج ملاقات کی رات — اب کہاں جاؤ گے رہ جاؤ یہیں رات کی رات
ے گل کی طرف نظر ہے نہ گلزار کی طرف — آنکھیں لگی ہوئی ہیں رخ یار کی طرف
ے یہ تو مانا کہ محبت میں اخترؔ کچھ بھی نہیں — پھر یہ کس بات کے جھگڑے ہیں اگر کچھ بھی نہیں
ے جذبۂ دل تو ہے گو نامہ و پیغام نہیں — خیر کرتے نہ آؤ تو اخترؔ کام نہیں

معمورۂ لحد میں اگر شادماں نہ ہو ۔۔۔ نیچے زمیں کے اور کہیں آسماں نہ ہو
برقؔ اس عمر تغافل سے شکایت ہے عبث ۔۔۔ بھول جاؤ تو غنیمت ہے اگر یاد رہے

محمد عبدالغفور خان برقؔ اجمیری۔ شاگرد نظمؔ طباطبائی (1850ء۔1900ء)۔

جستجو نے تری اس درجہ کیا گم مجھ کو ۔۔۔ اپنی ہستی کا بھی ہوتا ہے توہم مجھ کو
دشمن کی شکایت پہ میں بگڑوں تو مزا ہو ۔۔۔ اللہ کرے حشر کے دن کوئی خدا ہو

نواب محمد عبداللہ خان مطلبؔ اجمیری (1860ء۔1895ء) قوم مغل۔ والد کشمیر سے اجمیر آئے۔ مطلب نے اجمیر میں تعلیم پائی۔ والد کی وفات کے بعد جودھپور کے راجہ نے مطلب اجمیری کو نواب کا خطاب اور عہدۂ دیوانی سے سرفراز کیا۔ شاگرد داغؔ۔ شیخ سلام الدین نادرؔ اجمیری ان کے بہنوئی اور غلام محمد رفیع الدین رفیقؔ اجمیری ان کے بھانجے تھے۔

نکلی ہی اس کو دیکھا جس کے جگر کو تاکا ۔۔۔ اس کی نگہ ہے یارب یا تیر ہے قضا کا
باہر نہیں نکلتے ہو کیوں دل سے تیر کے ۔۔۔ تم میری آرزو، مری حسرت نہیں ہو تم
زخم سے زخم ہیں وہ جنگی سے کیا ہوتا ہے ۔۔۔ چارہ گر رکھ دے نمکداں کا نمکداں دل میں
مجھ سے اتنا تو وہ ناراض نہ ہوں گے مطلب ۔۔۔ کچھ یہ لوگ اپنی طرف سے بھی ملا دیتے ہیں
دیکھیں وہ آتے ہیں یا آج اجل آتی ہے ۔۔۔ کہہ گئے ہیں کہ نکل جائے گا ارماں کوئی
زمانہ دگرگوں ہو رہا ہے ۔۔۔ تجھے بھی خبر ہے کہ کیا ہو رہا ہے
وہ کہتے ہیں توڑیں گے مطلب کا تقویٰ ۔۔۔ بہت متقی پارسا ہو رہا ہے
مونس کوئی نہ کوئی مرا غمگسار ہے ۔۔۔ اک دل رہا تھا اس پہ ترا اختیار ہے

حکیم بہاءالدین بہاؔ اجمیری (1860ء/1281ھ۔1923ء) لکھنؤ سے طب کی تعلیم حاصل کی اور طب کا پیشہ اختیار کر کے مہاراجہ جودھپور جسونت سنگھ کے پاس 300 روپیہ ماہوار پر معالج طب مقرر ہوئے مگر جودھپور کی آب و ہوا راس نہ آئی تو نواب عبداللہ خان مطلب کی ایماء پر اجمیر آ گئے جہاں درگاہ معین الدین چشتی میں طبیب خاص کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اردو فارسی شاعر تھے! شاگرد داغؔ دہلوی۔ کلام زیادہ تھا لیکن اجمیر کے فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گیا۔

بات اب جانے کی چھپایا ہو کر ۔۔۔ قتل یہ میرے نہ گھبرایئے گا
قتل میرا جو ہے منظور نظر ۔۔۔ میرے ہی سر کی قسم کھایئے گا
ہے بہا ایک فسوں گر عیار ۔۔۔ اس کی باتوں میں نہیں آیئے گا

حسینوں کیا تم برا کیوں مانتے ہو ۔۔۔ شکایت ہے مجھے گر آسماں سے
بہا کہتے رہے وہ کیوں ہو مضطر ۔۔۔ نہ نکلا بات کچھ میری زباں سے
تری بلا سے مجھے کیوں کسی کی چاہ رہے ۔۔۔ کوئی خراب رہے یا کوئی تباہ رہے

حاجی منشی حاجی محمد طالب حسین خاکؔ اجمیری (1861ء۔1953ء) حافظ محمد یوسف سے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم مکمل کی۔

1880ء کے قریب شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ شاگرد حکیم عبدالصمد اجمیری (تلمیذ غالبؔ)۔ سیماب اکبر آبادی کے استاد تھے۔ اوائل عمری میں رومانی شاعری سے شغف رہا پھر رفتہ رفتہ نعت کے اسیر ہو گئے۔

مجھ سے کیا پوچھتے ہو حسنِ دل افروز کا حال
آئینہ دے گا جواب آپ کی یکتائی کا

سرہانے میری تربت کے وہ بیٹھے لب ہلاتے ہیں
نہیں کھلتا کہ کچھ پڑھتے ہیں یا جادو جگاتے ہیں

عشق نے خاک کر دیا مجھ کو
کس قدر پاک کر دیا مجھ کو

زباں کرتے ہو شوخی کے دے اپنی قسم کھائے
نہ آئے پھر بھی وعدہ پر تو اس کا کیا کرے کوئی

کلیسا بھی گیا، کعبہ بھی پہنچا، دیر بھی دیکھا
لیے ہر سمت مجھ کو جستجوئے یار پھرتی ہے

پنڈت منشی امر ناتھ مدن ساحرؔ (1863ء ۔ 1942ء) تحصیل دار کے عہدہ پر فائز رہے۔ بارہ سال کی عمر سے شعر کا آغاز ہوا۔ شاگرد پنڈت رام پرشاد راز دہلوی۔ پہلے مولوی عبدالحلیم عاصمؔ کاشانی کی شاگردی میں فارسی شاعری کی پھر بائیس سال کی عمر اجمیر شریف جا بسے۔ یہاں وہ روحانیت کی طرف راغب ہوئے۔ ہر مہینے اپنے گھر پر مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ مضامین تصوف سے خصوصی رغبت تھی جس کے باعث ان کے کلام میں واردات قلبی کی صورت پذیری ہوئی ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر ان کی غزلوں میں تسلسل کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔

تجلیات میں حسنِ ازل عیاں ہوتا
وگرنہ پردۂ پندار درمیاں ہوتا

تنگ ہے جان پہ میری قفسِ تن میرا
طائرِ قدس ہوں، طوبیٰ ہے نشیمن میرا

دل ہے بت خانۂ اصنامِ خیالی ساحرؔ
تو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

کیفِ مستی میں عجب جلوۂ یکتائی تھا
تو ہی تو تھا نہ تماشا نہ تماشائی تھا

کتابِ درسِ مجنوں مصحفِ رخسارِ لیلیٰ ہے
حریفِ نکتہ دانِ عشق کو مکتب سے کیا مطلب

طریقِ عشق میں ہے رنج پہلے، اور خوشی پیچھے
مدارِ صبحِ روزِ وصل ہے اک شامِ ہجراں پر

حسن پابندِ تعین نہیں محدود نہیں
دل مرا جلوہ گہِ حسن ہے کوہِ طور نہیں

حقیقت آشنا ہیں جو غریقِ بحرِ الفت ہیں
کہاں کے ڈوبنے والے کہاں جا کر نکلتے ہیں

خالی ہاتھ آئیں گے اور جائیں گے بھی خالی ہاتھ
مفت کی سیر ہے کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں

ہے گلشنِ جہاں میں گلِ حسن دیدنی
گر طاقتِ نظارہ کسی کو نہیں نہ ہو

کیا کہوں کام پڑا ہے مجھے نادانوں سے
عشق کو جانچتے ہیں عقل کے پیمانوں سے

جانِ ساحرؔ ستمِ تازہ سے غافل مت ہو
کہ مبادا وہ تری یاد سے غافل ہو جائے

بعد کے شعراء نے بھی اجمیر کے ادبی منظر میں اپنی اپنی کاوشوں کے رنگ بھرے تاہم مذکورہ بالا شعرائے اجمیر ہی شعر و سخن کی عمارت میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

◆◆◆

شہر میں گاؤں: ندا فاضلی

سیفی سرونجی (انڈیا)

پدم شری ندا فاضلی کی یہ کلیات شہر میں گاؤں ان کے تمام شعری مجموعوں کا انتخاب ہے۔ لفظوں کا پل، مور ناچ، آنکھ اور خواب کے درمیان، کھویا ہوا سا کچھ، شہر میرے ساتھ چل، زندگی کی طرف جیسے اہم مجموعوں کا انتخاب ہے۔ مور ناچ اور لفظوں کا پل اب تلاش کے بعد بھی نہیں ملتے۔ ندا فاضلی جدید شاعری کا ایک معتبر نام تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے ہیں لیکن ان کی ہر کتاب شائع ہوتے ہی فروخت ہو جاتی ہے۔ اس کلیات سے ایسے تمام لوگوں کی تلاش کا سلسلہ یقیناً ختم ہو گیا کہ انہیں ایک ساتھ ندا فاضلی کے تمام شعری مجموعوں کا کلام مل جاتا ہے۔ دراصل اب یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہر کوئی شاعر اپنی کلیات چھپوانے کے چکر میں ہے لیکن ان میں یہ شعور نہیں ہوتا کہ لوگ کیے پڑھنا چاہتے ہیں اور کیوں۔ ندا فاضلی ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ہندوستانی تہذیب کو اپنی شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر تہوار، میلے ٹھیلے، رسم و رواج کے علاوہ ہندوستانی تہذیب کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت بھی بہت مشہور ہیں۔ یہاں کی زمین، یہاں کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ان کے ذہن میں رچ بس گئی ہے۔ جس طرح گوپی چند نارنگ کی نثری تحریروں میں ہندوستانی تہذیب پائی جاتی ہے اسی طرح ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں اس کی عکاسی کی ہے اور تعریف کی بات یہ ہے کہ ندا فاضلی کے یہاں زبان بہت سادہ ہے۔ روزمرہ کے استعمال میں آنے والے الفاظ سے ندا فاضلی نے ایک ایسی گہری فکر اور معنویت پیدا کر دی ہے کہ ان کے شعر اردو ادب میں زندہ رہنے والے شعر بن گئے ہیں۔ ندا ایک ایسے خوددار شاعر ہیں کہ جنہوں نے آج تک اپنی شاعری سے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کیا نہ آج تک کسی ایوارڈ کے لیے کسی سیاسی اثر و رسوخ کا استعمال کیا تا آنکہ انہیں درجنوں ایوارڈ مل چکے ہیں پدم شری دیے میں کسی علاقہ و وزنہ ہوتے ہوئے شاعروں کو ایوارڈ کے لیے سفارشیں اور جوڑ توڑ کرتے ہوئے دیکھا ہے ندا فاضلی نے لفظوں کے پل سے لے کر آج تک جس تنقیدی شعور کے ساتھ کام کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ عام فہم لفظوں میں بڑی باتیں کہنے کا ہنر ندا فاضلی خوب جانتے ہیں چاہے وہ دوہے ہوں غزل ہو یا نظم ہو ندا فاضلی کی شاعری میں ایک گہری فکر اور معنویت پائی جاتی ہے ان کے کئی شعر اتنے مقبول ہیں جو لوگوں کے ذہن و دل میں بسے ہیں یہاں چند شعر پیش کر رہا ہوں۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں — کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ — دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

چھننے لگے ہیں زخم چمکنے لگے ہیں غم — بازار بن کے نکلے تو بکنے لگے ہیں ہم

نیندوں کے پاس بھی نہیں اب کوئی راستہ — سوتے ہیں تھک کے جسم مگر جاگتے ہیں ہم

بیٹھے ہیں دوستوں میں ضروری ہیں قہقہے — سب کو ہنسا رہے ہیں مگر رو رہے ہیں ہم

بات کم کیجیے ذہانت کو چھپاتے رہیے — اجنبی شہر ہے یہ دوست بناتے رہیے

ہم کو یاد تھیں کئی رنگین کہانیاں — پھر بتا دیے گئے خاموش ہو گئے

گھر سے چلے تھے پوچھنے موسم کا حال چال — جھونکے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے

دکھ میں نیر بہا دیتے تھے سکھ میں ہنسنے لگتے تھے — سیدھے سادے لوگ تھے لیکن کتنے اچھے تھے

وہ جن کے ذہن میں گہرائیاں ہیں — جہاں جائیں وہاں تنہائیاں ہیں

ندا فاضلی کے ان میں چند شعر تو وہ ہیں جو ان کی پہچان بن گئے ہیں ذہانت کو چھپاتے رہیے یا دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے یہ رشتہ وغیرہ یہ وہ شعر ہیں جن میں ندا فاضلی ایک بڑے مفکر کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جس طرح فراق گورکھپوری اپنی پوری علمیت کو شاعری میں صرف نہ کر سکے یہی بات ندا فاضلی کے یہاں ہے ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور انہیں انگریزی ہندی فارسی کے علاوہ مراٹھی، گجراتی کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے جتنا ان کے پاس علم ہے وہ بھی فراق کی طرح اپنی شاعری کو نہیں دے سکے ان کے ہمعصروں میں دور دور تک نظر نہیں آتا جس نے کہ شاعری میں اتنا کچھ دیا ہو لفظوں کا ہیر پھیر اور سوراج کے بعد ندا فاضلی ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے نظم نثر پر یکساں عبور رکھنے والے شاعر ندا فاضلی کی یہ شاعری یہ قیاسات شہر میں گاؤں ندا فاضلی کے شائقین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے ندا فاضلی کی شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زمین سے رشتہ ہمیشہ استوار رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شہر اور گاؤں دونوں کی علامتوں کے ساتھ معنویت کی پرتیں کھولتا چلا جاتا ہے گاؤں ان کی ایک ایسی پہچان بن گیا ہے کہ گاؤں شہر گھر اور گھر تو خاص طور پر ندا کے یہاں ایسا ہے کہ ندا کی شاعری میں اور سے پہچان لیا جاتا ہے۔

تمام شہر میں پہلے بھی کون اپنا تھا — مگر یہ حال کسی سے بھی دشمنی نہ رہی

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے — گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے

کیا ہوا شہر کو کچھ تو دکھائی دے کہیں
یوں کیا جائے کبھی خود کو رلایا جائے

گھر سے نکلے تو ہو سوچا بھی کدھر جاؤ گے
ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے

اتنا آسان نہیں لفظوں پہ بھروسا کرنا
گھر کی دہلیز پکارے گی جدھر جاؤ گے

ہر نئے شہر میں کچھ راتیں کڑی ہوتی ہیں
چھت سے دیواریں جدا ہوں گی تو ڈر جاؤ گے

نہ جانے کون سے لمحے کی بددعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں کہیں آسماں نہیں ملتا

تمام شہر میں ایسا نہیں خلوص نہ ہو
جہاں امید ہو اس کی وہاں نہیں ملتا

کہاں چراغ جلائیں کہاں گلاب رکھیں
چھتیں تو ملتی ہیں لیکن مکاں نہیں ملتا

اس طرح کے بے شمار شعر ندا فاضلی کے یہاں موجود ہیں جن میں گھر کو کئی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس لیے کہ ندا کی زندگی میں گھر بہت اہمیت رکھتا ہے جب ان سے گھر چھین لیا گیا تھا اور وہ ساری رات سردی میں کسی سڑک کے ایک کھمبے کے نیچے ٹھٹھرتے رہے۔ وہ کتنی خطرناک رات تھی۔ جب وہ اپنے گھر پہنچے تھے اور گھر پر دوسروں کا قبضہ تھا گوالیار کی وہ سرد رات جب ان سے اپنا گھر چھوٹا تھا پھر بھلا ندا فاضلی کی شاعری میں گھر کیسے جا سکتا ہے۔ وہ تمام عمر انہیں تڑپاتا رہا اور گھر چھوڑنے کی یہ تڑپ ندا فاضلی کی شاعری میں ایک ایسی گہری معنویت پیدا کرتی چلی گئی جس سے ایک تڑپ نمایاں ہو گئی اور یہی ندا فاضلی کی شاعری کی پہچان بن گئی شہر میں گاؤں یا گاؤں میں شہر ندا فاضلی کے لیے لازم و ملزوم بن گیا ندا فاضلی کی یہ کلیات شہر میں گاؤں ان کے تمام شعری مجموعوں کا ایک ایسا انتخاب ہے جو شعر و ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

◆◆◆

مرد بھی کیا عجیب شے ہے، بیوی میں طوائف جیسی ادائیں اور طوائف میں بیوی جیسی وفاداری تلاش کرتا ہے۔
(سعادت حسن منٹو)

عُتبہ بن ربیعہ

پیروز بخت قاضی

مکہ میں جب رسول اللہ نے لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کیا اور خدائے واحد کی عبادت کی تلقین کی تو مشرکین کی جانب سے طرح طرح کے الزامات لگائے جانے لگے۔ ان کو یقین نہ آتا تھا کہ ہم میں سے ہی ایک شخص جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے اس پر اللہ اپنا کلام وحی کرتا ہے۔ وہ سمجھتے کہ شاید آپ ؐ کو دولت یا سرداری یا بادشاہت کی خواہش ہے۔ وہ آپ کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے اور قرآن کا پیغام سننے پر بھی آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ جب بھی پیغمبرِ اسلام یا ان کے پیروکار عام لوگوں کو قرآن سنانے کی کوشش کریں تو فوراً ہنگامہ برپا کر دیا جائے اور اتنا شور مچایا جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ حضورؐ کو اس اندھی اور بہری مخالفت کا سامنا تھا۔

ایک روز قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے دوسرے گوشے میں رسول اللہ تنہا تشریف رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ کر قریش کے لوگ پریشان تھے۔ اس موقع پر عتبہ بن ربیعہ نے جو ابوسفیان کے خسر تھے سردارانِ قریش سے کہا کہ صاحبو اگر آپ پسند کریں تو میں جا کر محمدؐ سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں۔ شاید وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور عتبہ اٹھ کر نبیؐ کے پاس جا بیٹھا۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا ''بھتیجے تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمہیں معلوم ہے۔ مگر تم اپنی قوم پر ایک بڑی مصیبت لے آئے ہو۔ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بیوقوف ٹھہرایا۔ قوم کے دین اور ان کے معبودوں کی برائی کی اور ایسی باتیں کرنے لگے جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔ اب ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو۔ شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔''

رسول اللہ نے فرمایا ابوالولید آپ کہیں میں سنوں گا۔ اس نے کہا ''بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے اس سے اگر تمہارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطبا بلواتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں۔'' عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا ابوالولید آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟ اس نے کہا ''ہاں''۔ آپؐ نے فرمایا اچھا اب میری سنو۔ اس کے بعد آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورہ حم السجدہ (41) کی تلاوت شروع کر دی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (38) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا پھر سر اٹھا کر فرمایا ''اے ابوالولید میرا جواب آپ نے سن لیا۔ اب

آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' ان آیات قرآنی کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''ح م۔ یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں'' جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لئے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں' ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں' اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے۔ تو اپنا کام کر' ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔'' (41:1 تا 5)

اے نبیؐ! ان سے کہو' میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا الٰہ تو بس ایک ہی الٰہ ہے' لہٰذا تم سیدھے اسی کا رُخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ تباہی ہے ان مشرکوں کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے ان کے لئے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ (41:6 تا 8)

اے نبیؐ! ان سے کہو' کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔ اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لئے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا'' وجود میں آ جاؤ' خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔'' دونوں نے کہا'' ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح۔'' تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے'' اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔ (41:9 تا 12)

اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا تھا جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا'' ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا' لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لئے تم بھیجے گئے ہو۔ (41:13 تا 14)

عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے'' کون ہے ہم سے زیادہ زورآور۔'' ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زورآور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے' آخرکار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزا چکھا دیں' اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے' وہاں کوئی ان

کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔ رہے ثمود تو ان کے سامنے ہم نے راہِ راست پیش کی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کی بجائے اندھا بنا رہنا پسند کیا۔ آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بدعملی سے پرہیز کرتے تھے۔ (41:15تا18)

اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لئے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا' پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے ''تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟'' وہ جواب دیں گی ''ہمیں اسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے۔'' اس حالت میں وہ صبر کریں (یا نہ کریں) آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہوگی، اور اگر رجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع انہیں نہ دیا جائے گا۔ ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلط کر دیئے تھے جو انہیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوشنما بنا کر دکھاتے تھے، آخر کار ان پر بھی وہی فیصلہ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں کے گروہوں پر چسپاں ہو چکا تھا۔ یقیناً وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے۔ (41:19تا25)

یہ منکرین حق کہتے ہیں ''اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو شاید کہ تم اس طرح غالب آ جاؤ۔'' ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزا چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ انہیں دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کا گھر ہوگا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔ وہاں یہ کافر کہیں گے کہ ''اے ہمارے رب' ذرا ہمیں دکھا دے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا' ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں۔'' جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، اور ان سے کہتے ہیں کہ ''نہ ڈرو' نہ غم کرو' اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی' وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور جس چیز کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی' یہ ہے سامانِ ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور و رحیم ہے۔'' (41:26تا32)

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبیؐ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہیں۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ (41:33تا36)

اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔ لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آ کر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پروا نہیں، جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے ہیں۔ (41:37تا38)

عتبہ حضور پاکؐ سے یہ تلاوت سننے کے بعد اٹھ کر سرداران قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دور سے اس کو دیکھتے ہی کہا خدا کی قسم عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے، یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آ کر بیٹھا تو لوگوں نے کہا "کیا سن آئے؟" اس نے کہا "بخدا میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم نہ یہ شعر ہے نہ سحر ہے نہ کہانت ہے۔ اے سرداران قریش میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہی ہوگی۔"

سرداران قریش اس کی یہ بات سنتے ہی بول اٹھے "ولید کے ابا! آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔" عتبہ نے کہا "میری جو رائے تھی وہ میں نے تمہیں بتا دی، اب تمہارا جو جی چاہے کرتے رہو۔" (ابن ہشام جلد 1، 313تا314)

اس قصے کو متعدد دوسرے محدثین نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے جن میں تھوڑا بہت لفظی اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضورؐ تلاوت کرتے ہوئے آیت نمبر 13 پر پہنچے (ترجمہ: اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں) تو عتبہ نے بے اختیار آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "خدا کے لئے اپنی قوم پر رحم کرو۔" بعد میں اس نے سرداران قریش کے سامنے اپنے اس فعل کی وجہ یہ بیان کی کہ "آپ لوگ جانتے ہیں محمدؐ کی زبان سے جو بات نکلتی ہے پوری ہو کر رہتی ہے۔ اس لئے میں ڈر گیا کہ کہیں ہم پر عذاب نازل نہ ہو جائے۔" (تفسیر ابن کثیر جلد 4، صفحہ 90-91)

◆◆◆

خلیل الرحمٰن قمر: جس کے پاس دوسرا آپشن ہوتا ہے وہ آپ کا نہیں ہوتا۔ جس نے آپ کو چھوڑ جانے کا ارادہ کر لیا ہو وہ دروازے کی درز سے بھی نکل جائے گا اور جو آپ کے قریب آنے کا خواہش مند ہوگا وہ دیوار سے بھی راستہ بنا لے گا۔

دبا سکو تو صدا دبا دو

ڈاکٹر فرید احمد پراچہ

غزہ کے اس معصوم بچے کو میں تو نہیں بھلا سکا۔ شاید آپ بھی نہیں بھولے ہوں گے! وہ اپنے تباہ حال گھر کے ملبے پر بیٹھا ہے، یہ وہ گھر ہے جس میں اس نے جنم لیا تھا، جہاں اس نے ماں کی محبتوں کے پھول سمیٹے تھے، جہاں اس کے پیارے باپ نے اس پر اپنی شفقت کے پھول نچھاور کئے تھے۔ جس گھر میں اس کے بہن بھائی تھے، جہاں اگرچہ اسرائیلی مظالم کا خوف فضاؤں میں موجود رہتا تھا لیکن پھر بھی وہ اپنے گھر میں پرسکون تھا۔ جہاں سے وہ اپنے سکول جاتا تو اس کے دل میں زیورِ تعلیم سے مزین ہونے کی تمنائیں مچلتیں۔ وہ نماز ادا کرنے قریبی مسجد میں جاتا تو قرآنی آیات اس کے دل کو اللہ کی کبریائی کے نور سے بھر دیتیں۔ اس کا رب پر یقین مستحکم ہو جاتا۔ اس کا سینہ عشق رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی کا مرکز بن جاتا۔ آج اس کا پیارا گھر کھنڈر بن چکا ہے۔ ملبے کا ڈھیر بنا ہے۔ اس کے پیارے اس سے جدا ہو گئے ہیں۔ صدمات کا مارا یہ نو دس سال کا بچہ چیخ نہیں رہا، آسمان سر پر نہیں اٹھا رہا، دھاڑیں نہیں مار رہا، سینہ نہیں پیٹ رہا، آنسو نہیں بہا رہا، اپنے گھر کے ملبے پر سکون سے بیٹھا قرآن پاک کی خوب صورت تلاوت کر رہا ہے۔ ارشاد ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔ ہم تمہیں خوف اور بھوک سے آزمائیں گے تم مالوں، جانوں پھلوں کے نقصان سے آزمائے جاؤ گے اور صبر کرنے والوں کے لئے خوشخبری ہے وہ کہ جن پر جب مصیبت آتی ہے تو پکار اٹھتے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہوتی ہیں اور یہی کامیاب ہیں۔ مجھے اس بچے کا نام نہیں معلوم۔ شاید اس کا نام صلاح الدین ایوبی ہے۔ شاید وہ میدان بدر کا معاذ و معوذ ہے۔ شاید وہ محمد بن قاسم ہے لیکن وہ غزہ کا بیٹا ہے۔ تلاوت کی نہیں نورانی کرنیں اس کے چہرے کو روشن کر رہی ہیں۔ لیکن غزہ کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اسرائیلی دہشت گردی سے غزہ لہولہو ہے۔ عمارتیں کھنڈرات میں بدل رہی ہیں۔ 17 مساجد شہید ہو گئی ہیں۔ 67 سکول ملبے کا ڈھیر بن گئے ہیں۔ 84 صنعتیں تباہ ہو گئی ہیں۔ وحشیانہ دہشت گردی اور درندگی کی انتہا یہ ہے کہ ہسپتال پر بمباری کر کے عورتوں بچوں مریضوں، زخمیوں، ڈاکٹروں طبی عملہ سمیت 1000 افراد شہید کر دیے گئے ہیں۔ غزہ کربلا میں بدل چکا ہے۔ پانی ختم ہے۔ علی اکبر علی اصغر پیاسے ہیں۔ دریائے فرات بھی پاس نہیں۔ اب تیر نہیں برستے بم برستے ہیں۔ اب نیزے نہیں چلتے، میزائل جسموں کے چیتھڑے اڑاتے ہیں۔ یہ کیسی اندھی بہری گونگی دنیا ہے۔ کیا انسانی حقوق کے نام نہاد رکھوالوں تک یہ چیخیں نہیں پہنچتیں؟ شاید ان کے کان بند ہیں، شاید ان کی آنکھوں پر پردے ہیں، شاید شاید ان کے نزدیک پالتو جانوروں کے حقوق ہیں، مظلوم انسانوں کے نہیں اور کیا عالم اسلام کے حکمران جاگ چکے ہیں۔ کیا یہ قتل عام رک سکے گا۔ کیا غزہ کے پیاسوں کو پانی مل سکے گا۔ کیا آج کی کربلا کے بہتے لہو کا سیلاب تھمے گا۔ آج دنیا سے دم رخصت کلمہ پڑھتے معصوم بچے اللہ اکبر پکارتی عفت مآب بہنیں، بیٹیاں۔ 500 کے قریب پورے کے پورے خاندان خلعت شہادت سے سرفراز ہو کر سربلند ہونے والوں کے مقدس لہو کا قطرہ قطرہ پکار رہا ہے۔ کیا کوئی ہماری مدد کو آئے گا؟

◆◆◆

میلہ امام ناصر الدین شیرانی جالندھر

خالد عبداللہ ویمس

ضلع جالندھر کے عام سکولوں اور کالجوں میں میلہ امام ناصر الدین پر مضمون لکھوایا جاتا تھا۔ اساتذہ کرام امام ناصر الدین کے دینی کردار کے متعلق طلباء کو کچھ نہ کچھ بتاتے رہا کرتے تھے تاہم ان کوششوں اور مصروفیات کے باوجود اس وقت کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی تھی جس کے ذریعے امام ناصر الدین شیرانی کے مجموعی کردار پر روشنی پڑتی۔ ہم نے اپنے اساتذہ کی باتوں سے کچھ چیزیں اخذ کی ہیں، جو اس تحریر کی وجہ تحریر بن گئی ہیں۔ پہلے اس حوالے سے کچھ باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے قدوۃ ابو یوسف ناصر الدین چشتی کو امام ناصر الدین سمجھ رکھا تھا اور اس کے مطابق انہوں نے اپنا ذہن بھی استوار کر رکھا ہے۔ جبکہ ابو یوسف ناصر الدین چشت کے رہنے والے تھے اور وہ ہندوستان نہیں آئے۔ ان کا روضہ بھی چشت میں ہے اور عوامی عقیدت کا مرکز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امام ناصر الدین شیرانی جالندھر ہی کے رہنے والے تھے اور وہ سیالکوٹ والے امام صاحب کے بھائی نہیں تھے۔ میاں رشید صاحب نے اپنی کتاب حکایات پنجاب میں یہی لکھا ہے۔ اس لئے جو ایسا سمجھتے ہیں ان کو یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہیے۔

ملکی تاریخی احوال کے مطابق وہ دور ہندوستان میں سلاطین کی حکومت کا دور تھا جب امام ناصر الدین نے جالندھر میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسے کا ذکر کشمیری مصنف بی۔ ایم دین صوفی نے اپنی انگریزی کتاب "المنہاج" میں بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ یہیں سے امام ناصر الدین کے تعلیمی اور تبلیغی کردار کا آغاز ہوا۔ امام ناصر الدین شیرانی کی زندگی اور علمی مصروفیات کے متعلق ہمیں کوئی مستند کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔ اسلامیہ ہائی سکول جالندھر میں طالب علمی کے دوران اپنے اساتذہ کرام سے سنی ہوئی جو باتیں اب تک یاد ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ کرام کے مطابق امام ناصر الدین شیرانی دینِ اسلام کا اعلیٰ ادراک رکھنے والے مستند عالم تھے اور غیر معمولی روحانی صلاحیت کے مالک تھے۔ ان کی علمی رہنمائی اور روحانی اثر پذیری سے علاقے کے لوگوں میں دینی جذبہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے جالندھر کے کئی ہندو جٹ نسل خاندانوں نے مذہب اسلام قبول کیا اور مسلمان ہوئے۔

امام ناصر الدین شیرانی کا جالندھر میں دینی مدرسہ قائم کرنے کا زمانہ تقریباً وہی زمانہ ہے جب پاکپتن میں بابا فرید الدین مسعود اور دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء اسلام کی شمع روشن کیے ہوئے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر [illegible] محمد کی تحقیق کے مطابق یہ وہی مشہور و معروف مدرسہ ہے جس کے دالان میں الغ خان اعظم بلبن نے ایک مہم کی فتح کے بعد دہلی واپس جاتے ہوئے عیدالاضحیٰ کی نماز باجماعت ادا کی تھی۔ اس مدرسہ کی بدولت اس زمانے کے حالات پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ تاریخی کتب میں اس مدرسہ کا ذکر موجود ہے۔ اس مدرسہ کے قیام میں جالندھر کے جٹ نسل مسلمان خاندانوں نے ہی زیادہ تعاون کیا تھا جو اس وقت کھیتی باڑی کرتے تھے اور جنہوں نے ابھی تازہ تازہ اسلام قبول کیا تھا اور جذبہ اسلامی سے سرشار تھے۔

امام ناصر الدین کا بنیادی کردار تعلیم و تدریس تھا۔ وہ دینی علوم کا پرچار کرتے تھے اور اسی کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیری مریدی

تسلیم کرتے تھے۔ وہ معلم تھے اور قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ اور اس کی تبلیغ کرتے تھے تاہم جالندھر میں کئی ایک بزرگان دین کے مزارات تھے لیکن امام ناصر الدین کے مزار کی شان منفرد تھی۔ انگریز وقائع نگار آر۔ سی۔ ٹیمپل کے مطابق "یہ دربار جالندھر کا سب سے بڑا دربار تھا اور امام ناصر کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں ہر سال ایک بڑا ہجوم میلہ لگتا تھا اور لوگ ذوق و شوق سے اس میلہ میں شریک ہوتے تھے۔" قیام پاکستان کے وقت تو وہاں ایک شاندار عمارت موجود تھی جس کی تزئین و آرائش کا کام عام طور پر جاری رہتا تھا۔ یہ دربار پانسا توالا بازار اور رینک بازار کے درمیان واقع تھا اور ایک بڑی درگاہ کی حیثیت میں قائم تھا۔ اس دربار کے سامنے بھی ایک نہایت پررونق بازار تھا۔ اس درگاہ کا بڑا دروازہ نہایت قابل دید تھا۔ اس دروازے کی تعمیر تو مین مستری احمد علی ہوشنگ نے کی تھی جس میں آیات قرآنی کی تحریر بھی شامل تھی۔ یہ دروازہ اسلامی ثقافت کا مکمل نمونہ پیش کرتا تھا۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک بڑا صحن تھا جس میں جلسہ کی تمام تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ صحن کے آخر میں مزار تھا جہاں لوگ عقیدت اور احترام کے ساتھ حاضری دیتے تھے اور صرف دعاؤں پر قناعت کرتے تھے جو زیادہ تر فاتحہ خوانی کی صورت میں ہوتی تھیں۔ غالباً یہ سب کچھ امام صاحب کی وصیت کے مطابق تھا نیز امام ناصر الدین شیرازی کے مزار پر گانے والے اور نشہ کرنے والے اور ملنگ قسم کے لوگ نہیں آتے تھے۔ وہاں دھمال بھی نہیں ڈالی جاتی تھی۔ اس کے برعکس وہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ علماء و مشائخ آتے اور دینی اور علمی تقاریر کرتے تھے جس سے عقیدت مندوں کے ایمان تازہ اور ذوق عمل میں اضافہ ہوتا تھا۔

کہتے ہیں امام صاحب کا تعلق مدینہ منورہ سے تھا لیکن ان کے نام کے ساتھ شیرازی لکھا جاتا تھا جس کی وضاحت تو کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جس نے مزار پر لگا ہوا کتبہ دیکھا ہوگا۔ وہ جالندھر میں اس وقت تشریف لائے جب ہندوستان پر شمس الدین التمش کی حکومت تھی۔ امام صاحب نے اسی مقام پر اپنا مشن شروع کیا اور اذان دی۔ نزدیک ہی ایک سرائے اور پانی کا کنواں تھا جو قطب الدین ایبک نے بنوائے تھے۔ لوگوں نے امام صاحب کی باتوں اور مواعظ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ یوں ہی قربت میں اضافہ ہوتا گیا اور سامعین بڑھتے گئے۔ ہندو آبادی اس صورت حال کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی۔ انہوں نے ہر ممکن طریقے سے اس مشن کو روکنے کی کوشش کی۔ یہ تقریباً 850 سال پرانی بات ہے۔ مسلمان سلاطین کا اسوقت دینی مدارس قائم کرنے یا ان کی سرپرستی کرنے کی طرف دھیان نہیں تھا۔ اس لئے امام صاحب کو اپنا مشن جاری رکھنے کیلئے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنا کام جاری رکھا اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے کامیاب ہوئے اور لوگوں میں قبول اسلام کا شوق بڑھتا گیا۔ دربار کے صحن میں بائیں جانب ایک کنواں تھا جسے آسمانی کنواں کہتے تھے۔ یہ کنواں صحن کے فرش سے کافی بلندی پر موجود تھا۔ اس پر رہٹ لگا ہوا تھا جو بیلوں کے ذریعے چلتا تھا۔ اس لئے یہ کنواں اپنی نوعیت میں بہت عجیب اور حیرت انگیز تھا۔ وہ ایک دیکھنے کی چیز تھی اور لوگ اسے دیکھنے کی تمنا کیا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ راقم الحروف نے چھوٹی عمر میں بچشم خود دیکھا ہوا ہے۔ صحن میں دائیں جانب ایک مسجد تھی جو دراصل ان تمام دینی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز تھی جو ہر وقت اس درگاہ میں جاری رہتی تھیں۔ میلہ تو ایک سال بعد مقررہ دنوں میں ہوتا تھا لیکن تقاریر اور مواعظ کا سلسلہ سارا سال وہاں جاری رہتا تھا۔ یہ وہاں کی روایت تھی۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی وہاں آتے تھے اور حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب بھی اپنے روحانی مواعظ سے لوگوں کو مالا مال کرتے تھے جبکہ نعت خوانی کا فریضہ جناب ابرار قریشی ادا کرتے تھے۔ یہ بھی سنا ہے کہ مولانا شیخ محمد خان جالندھری جنہوں نے قرآن پاک کا شہرہ آفاق اردو ترجمہ کیا ہے بھی وہاں درس دیا کرتے تھے۔ فکری اعتبار سے اس درگاہ کے ساتھ جڑی شاندار روایات وابستہ ہیں جن کو اعلیٰ پر اعتماد طریقے سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

◆◆◆

توشۂ خاص

چند مکتوب

ڈاکٹر اسلم انصاری

مکتوب نمبر 1 بنام شاہد علی خان مدیر الحمراء

[نوٹ: اردو ناول نگاری میں عزیز احمد [1910ء-1978ء] کا نام بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وہ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے، عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے اور لندن یونیورسٹی سے بی اے آنرز ان انگلش لٹریچر کیا۔ کچھ عرصہ عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھایا۔ ایک عرصے تک حیدرآباد دکن کی شہزادی درشہوار کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے نو سال شعبہ اشتہارات، فلم اور ریڈیو کلکشنز میں گزارے۔ اسی شعبے میں قرۃ العین حیدر ان کے اسٹاف میں تھیں۔ آخر میں وہ یونیورسٹی آف ٹورانٹو میں اسلامیات کے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور بعد ازاں پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز میں پروفیسر ہوئے۔ ان کے ناولوں میں گریز، ایسی بلندی ایسی پستی، ہوس، مرمر اور خون، شبنم شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں اور تصویر شیخ کو خاصی شہرت حاصل ہوئی]

مکرم و محترم جناب شاہد علی خان صاحب، مدیر الحمراء ——— السلام علیکم، مزاج گرامی!

گزشتہ عید مبارک۔ "الحمراء" کا یادرفتگاں نمبر مل گیا تھا۔ اس عنایت بے پایاں کا بے حد شکریہ۔ یہ شمارہ فی الحقیقت دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ سعید احمد خان صاحب کے دونوں مضامین بے حد عمدہ ہیں، اور پروفیسر سعید احمد خان کی شخصی زندگی کے بعض گوشوں پر ان سے روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا پر کم و بیش تمام تحریریں قابل توجہ ہیں۔ جناب رؤف نیر کا مضمون "مدیر نقوش سے عزیز احمد کی سودے بازی" خاصا دلچسپ ہے۔ افسوس کہ عزیز احمد کی مجلسی زندگی (اور) معاشرتی روابط کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں بہ حیثیت انسان ان کی شخصیت کی ایک جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ مدیر نقوش کے نام ایک خط میں انہوں نے ڈاکٹر احسن فاروقی اور قرۃ العین (حیدر) کے ساتھ ایک مختصر سے سیاق و سباق میں اپنے کام کا موازنہ کیا ہے۔ اس سے بہرحال اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ کن لوگوں کو اپنے موازنے کے لائق سمجھتے تھے۔ قرۃ العین حیدر جب ان کے محکمے میں آئی ہوں گی تو شاید انہیں معلوم نہیں ہوگا کہ یہ وہ شخصیت ہے جو آنے والے چند سالوں میں انہیں اردو ناول نگاری کی اقلیم سے dethroned کر کے اپنی عمل داری قائم کرے گی۔ اس میں شک

نہیں کر کہ عزیز احمد کے ناول اردو فکشن میں دوام حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو فکشن قرۃ العین حیدر کے magnum opus "آگ کا دریا" کے بعد وہ نہیں رہا جو اس ناول کی اشاعت سے پہلے تھا۔ عزیز احمد نے اسلامی تہذیب و ثقافت پر جو کام کیا اس کو ہمارے ہاں کے علمی حلقوں نے کچھ زیادہ پذیرائی نہیں دی۔

(چند سطریں محذوف) امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ کار لائقہ سے سرفراز فرمایئے۔ والسلام

نیاز مند ——— اسلم انصاری

22/11/2010

خط نمبر 2۔ بنام ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب

مکرمی جناب ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب ——— سلام و رحمت!

"شورا طالیہ کی بہار" اپنی تجلیات کے ساتھ شرفِ صدور لائی۔ آپ بھی خوب ہیں۔ گھر بیٹھے ہمیں ملکوں ملکوں کی سیر کرا دیتے جاتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ مناظر ہمارا آنکھوں کے سامنے مجسم ہوتے رہیں، اور کردار جیسے خود ہم سے ہم کلام ہو رہے ہوں۔ کہ اس ربطِ فضا ایسے کہ اس نظر کا لطف آ جائے۔ اب اسی "شورا طالیہ کی بہار" ہی کو دیکھئے۔ مطالعے میں جب آغاز سے پہنچا کے پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ الفاظ تو اس اطالوی حسینہ کے لئے ہوں گے جو کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران آپ کے سامنے کی نشست پر جلوہ افروز تھی (معلوم نہیں آپ کھانے سے انصاف کر سکے یا نہیں) لیکن مزید آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ الفاظ مولانا ظفر علی خاں کی دو نظموں سے ماخوذ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے بھی کسی اطالوی نے جو حور و جمال کے لئے یہ ترکیب (یا تشبیہ یا استعارہ) ایجاد کی تھی۔ آپ نے اپنے الفاظ میں اس بہار اطالیہ کی ادھوری سی جھلک ہی دکھائی۔ ذرا اور تفصیل سے کام لیا ہوتا تو ہم دور نشینوں کی تالیفِ قلب بھی ہو جاتی۔ (تالیف قلب کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں!)

عنوانِ کتاب کی صورت خطی، جناب عرفان قریشی صاحب کے فن کا شاہکار معلوم ہوتی ہے۔ اس پر جیتا تاج الدین زریں رقم کا پرتو نظر آتا ہے۔ ان کی خدمت میں میری طرف سے خراجِ تحسین پیش کر دیجئے اور یہ "تحریک" بھی کہ وہ آج کے زمانے میں بھی فن کی آبرو کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ ان سے ذرا سا استفسار فرمائیے کہ وہ زریں رقم سے مستفید ہیں یا نہیں۔ (ان کی خطاطی میں مجھے پرویز رقم کی جھلک نظر نہیں آئی)۔ ابھی مطالعہ کتاب کا نصف سے بھی کم ہے لیکن لطفِ مطالعہ کامل ہے۔ کلامِ ظفر علی خان کے مجموعے اور اشاریہ ایک غیر معمولی تحقیقی کارنامہ ہے جو اپنے معاون حافظ محمد سعد عبداللہ کے تعاون سے آپ ہی انجام دے سکتے تھے۔ مقدمات تحقیق و تدقیق کا اعلیٰ ترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ والسلام (خاکسار ——— اسلم انصاری)

(پس نوشت) امید ہے کہ آپ کلیاتِ ظفر علی خاں کی تدوین میں مصروف ہوں گے۔ اس اشاریے کی اشاعت کے بعد کلیات کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔

خط نمبر 3۔ بنام شائستہ اعوان صاحبہ☆

26/7/2023

محترمہ شائستہ اعوان صاحبہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔۔۔۔ آپ کا خط اور مطبوعہ مقالے کا پرنٹ آج ہی ملے ہیں۔ دونوں کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔ آپ نے پی ایچ ڈی کے کام کی تکمیل کی خوش خبری بھی سنائی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ وقیع ثابت ہوگا۔ اسی دوران میں نے آپ کے مطبوعہ مقالے (ڈاکٹر اسلم انصاری کی مکتوب نگاری) کو پڑھ کر ختم کیا ہے۔ آپ نے بے حد تحسین لکھے میں مضمون کے عنوان پر بحث کی ہے۔ اور قابل توجہ تجزیے پیش کئے ہیں۔ میرے بارے میں آپ نے جو کلمات تحسین شامل مقالہ کئے ہیں ان کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے سامنے میرے بہت کم خطوط آ سکے۔ اصل خطوط کے مقابلے میں ان کی حیثیت عشر عشیر کی بھی نہیں۔ میری کوشش ہوگی کہ جب آپ اس مضمون کو اپنے Thesis کا حصہ بنائیں گی تو کچھ اور خطوط بھی اس میں شامل ہو سکیں گے۔ (اگر آپ نے پسند کیا) آپ کے لئے میری تلقین یہی ہے کہ کام کی رفتار کو تیز کریں۔۔۔ اور اکثر و بیشتر مجھ سے مشورہ کرنے سے بھی گریز نہ کریں۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گی۔

☆ ادیب، شاعرہ، نقاد، مدون، محقق، سفرنامہ نگار، ماہر تعلیم

مخلص ۔۔۔۔ اسلم انصاری

پس نوشت (9/9/2023)

میں نے یہ خط لکھ کر رکھ چھوڑا تھا کہ اسے کسی وقت ای میل کراؤں گا۔ لیکن بھول گیا۔ اصل میں میں خود ای میل نہیں کر سکتا۔ گھر کے بچوں میں سے کسی سے ای میل کرواتا ہوں۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گی۔ یہ خط آپ کے موبائل فون کے نمبر پر وٹس ایپ کیا جا رہا ہے۔

خط نمبر 4۔ بنام یاسمین حمید صاحبہ☆

29/9/2023

محترمہ یاسمین حمید صاحبہ، سلام و رحمت! آپ کا مجموعہ مضامین "ایک اور رخ" مل گیا تھا۔ اس سے پہلے آپ کا مجموعہ شاعری "ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے" اور پاکستانی شاعری بھی مل گئی تھیں۔ میں بے حد معذرت خواہ ہوں کہ میں اتنی تاخیر سے ان قیمتی تحفوں کی رسید سے مطلع کر رہا ہوں۔ وجوہات گوناگوں رہی ہیں۔ میں یکسوئی کے ساتھ "ایک اور رخ" کے بعض مندرجات کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ ویسے میں "ایک اور رخ" کے بیک کور پر درج جناب ابوالکلام قاسمی کے ارشادات سے کلی طور پر متفق ہوں۔ "ایک اور رخ" دراصل آپ کی ذات کا ایک اور رخ ہے۔ جو آپ کے مطالعے کے تنوع اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ "جدید نظم میں طرز احساس کی تبدیلیاں" ایک اہم مضمون ہے۔ اس میں تصدق حسین خالد کے "سرودِ نو" سے اقتباس مجھے بہت دلچسپ لگا۔ اگرچہ یہ تحریر پہلے بھی میری نظر سے گزر چکی

تھی۔ لیکن آپ کے انتخاب میں شامل ہونے کے بعد اس میں نئے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ گو بظاہر ایسا لگا کہ تصدق حسین خالد کو یہ بات واضح کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ لیکن میری ناچیز رائے میں بات اتنی مشکل نہیں۔ جدید نظم جو در اصل نظم آزاد کا دوسرا نام ہے، بحر کی پابندی اور مصرعوں کے ارکان کی کمی بیشی کے مترادف ہے۔ جدید نظم میں نظم معریٰ بھی شامل تھی جس سے مراد ایسی نظم ہے جس کے مصرعے وزن میں برابر ہوں لیکن ان میں ردیف و قوافی کا اہتمام نہ ہو۔ یہ ہمارے تہذیبی مزاج کے بہت قریب تھی لیکن معلوم نہیں کیوں اس کو زیادہ رواج نہ مل سکا۔ اس میں تو خیر شبہ نہیں کہ نظم آزاد لکھنے والوں نے (جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے) اظہار کے وسیع تجربات کے ذریعے نئے طرز احساس کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ اس میں طرز احساس میں کیا پایا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ پابند نظم میں ہمارا طرز احساس غزل کے قریب جا پڑتا ہے۔ جدید نظم نے اس امکان سے گریز کیا اور نئی معنویتیں ضرور دریافت کیں۔ اس معاملے میں ن م راشد زیادہ واضح ہیں۔ (یہاں ایک لفظ حذف کیا گیا ہے) آپ کے مضمون میں راشد کے بعد کے جدید نظم نگاروں کے تجزیے قابل تحسین ہیں۔ ''زہرا نگاہ کی شاعری'' اور ''بانو قدسیہ کے بارے میں'' دو ایسے مضمون ہیں جو میرے لئے خاص دلچسپی کے حامل ہیں۔ جنہیں میں ایک سے زیادہ بار پڑھ چکا ہوں۔ آپ کا مضمون زہرا نگاہ کی تفہیم میں بہت معاونت کرتا ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا (چاہتا ہوں) کہ زہرا نگاہ کی شاعری اور عصری کی شاعری میں کیا فرق ہے؟ بانو قدسیہ والا مضمون میرے خیال میں (انداز بیان میں ذرا سی تبدیلی کی گئی ہے) زیادہ تفصیل کا متقاضی تھا۔ بانو قدسیہ ایک فطری قصہ گو ہیں گو اس سلسلے میں ان کا نام اشفاق احمد کے بعد ہی آتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کی قصہ گوئی کا آغاز اشفاق احمد کی طویل صحبت ہی میں ہوا ہو۔ وہ ایک منفرد قصہ گو ہیں۔ پھر بھی ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے اشفاق احمد کا یاد آ جانا ایک قدرتی بات ہے۔ میرے خیال میں ان کا معروف ناول ''راجہ گدھ'' ایک ایسا ناول ہے جس کو antiaesthetic یا groqtesque کہا جائے گا۔ گو کسی نقاد نے ابھی تک ایسا نہیں کہا۔ جنگل اور گدھوں کی imagery کو بار بار evoke کرنا پڑھنے والے کے احساسات پر اچھا اثر نہیں چھوڑتا۔ اس کی ہیروئن کا اخلاقی زوال بھی ناول کی قدر و قیمت میں اضافہ نہیں کرتا۔ میں آپ کے ان قیمتی تحائف کا بار دیگر شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی خیر و عافیت کے لئے دعا گو ہوں۔

والسلام ——— خاکسار ——— اسلم انصاری

29/9/2023

☆ یاسمین حمید۔ ماہر تعلیم، شاعرہ، نقاد، 2007 سے 2016 تک لمس سے وابستہ رہیں۔

◆◆◆

ضروری اعلان

تمام تخلیق قارئین اور لکھاریوں کو ادارے کی طرف سے یہ اطلاع دینا ضروری ہے کہ پرچے کی رکنیت لینے کا مطلب ہے کہ آپ کو سالانہ باقاعدگی سے پرچہ بھیجا جائے گا۔ پرچے کی رکنیت لے کر ممبر بننے کا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ آپ کی تحریروں کو شامل کرنا ادارے پر فرض ہے کہ وہ رکنیت لینے پر لازمی شائع کریں۔ پرچے کے معیار کے مطابق تحریروں کو شامل کرنے کا اختیار صرف مقررہ کمیٹی کی صوابدید پر ہے اور ادارہ اس سلسلے میں کسی کو جواب دہ نہیں۔ (ادارہ تخلیق)

خاک سے اُٹھنے والا فن

......1......

ڈاکٹر جواز جعفری

پہلوانی کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان۔ انسان کی تحریری تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر دور کا انسان اپنے عہد کے شہ زوروں پر فخر کرتا رہا ہے۔ شاعروں اور مورخوں نے ہمیشہ ان شہ زوروں کے کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ اس حوالے سے سب سے شاندار مثال زمانہ جاہلیہ کے عرب شاعروں کی ہے۔ جنھوں نے اپنے قبائلی سورماؤں کے جنگی کارناموں کو محفوظ بنانے کے لیے عظیم شعری کارنامے انجام دیئے۔ جنھیں مکہ کے اردگرد ہونے والے مجنہ، ذوالمجاز اور عکاظ جیسے میلوں میں ہونے والے شاعری کے مقابلوں میں پڑھا گیا اور ہر سال اول آنے والے قصیدے کو سونے کے پانی سے لکھ کر کعبے کے اندر لٹکایا گیا۔

عرب کے لوگ تین مواقع پر مبارکباد دینے دوسروں کے گھر جایا کرتے تھے۔ نمبر 1۔ جب گھوڑی بچہ جنتی۔ نمبر 2۔ جب کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا۔ نمبر 3۔ جب کسی قبیلے میں شاعر کا ظہور ہوتا تھا۔ قبیلے میں شاعر کے سامنے آنے پر جشن منائے جاتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاعر ان کے جنگی کارناموں کو منظوم کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر کر دے گا۔ ہر شخص شاعر کو قبیلے کی آبرو کا محافظ سمجھتا تھا۔ شاعر بھی اپنے قبیلے کے سورماؤں کی شان میں قصائد کہتے اور ان کے شاندار کارناموں کے ذکر کے ساتھ ساتھ قبیلے کی بہادری، مہمان نوازی، انسان دوستی اور سخاوت کے قصے بیان کر کے دوسرے قبائل پر اپنی فضیلت اور برتری ثابت کرتے تھے۔

یونان، روما، قرطاجنہ، مصر، عرب، ایران اور ہندوستان میں جسمانی ورزش پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سرزمینوں سے ہرکلیز، ہنی بال، سکندر اعظم، حضرت علی، حضرت حمزہ، رستم و سہراب، اسفندیار، افراسیاب، بھیم اور ارجن جیسے پہلوان اٹھے جن کے کارناموں نے پوری دنیا کو حیران کر دیا۔ طاقت جسم کی ہو یا پھر دولت و اقتدار کی، دنیا بھر میں انسانوں کی اکثریت طاقت کو ظلم، زیادتی، دوسروں کو نیچا دکھانے، اپنے ہم جنسوں کی جان و آبرو کو پامال اور ان کے مال و املاک پر قبضہ کرنے کے لئے استعمال کرتی آئی ہے۔ مگر طاقت کا غلط استعمال کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ایسے افراد ہر عہد میں موجود رہے ہیں جو طاقت کے فنکارانہ استعمال میں یقین رکھتے تھے۔ طاقت کے اسی فنکارانہ اور دانشمندانہ استعمال کا نام فن پہلوانی ہے۔ اور اس فن میں صرف طاقت ہی نہیں عقل بھی استعمال ہوتی ہے۔ کشتی کے دوران حریف کی جان لینے کی بجائے اس کے زندہ رہنے کے حق کی حفاظت کی جاتی ہے اور اس فن میں طاقت کے ساتھ ساتھ شرافت کو شہ زور کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ استاد زماں نور الدین ہو یا صدیق کلو، بوٹا لاہوری ہو یا محمد بخش چوہا پہلوان، امام بخش ہو یا پھر رستم زماں گاما پہلوان، یہ سارے پہلوان اپنے اپنے عہد کے صوفی، درویش اور ولی بھی تھے۔ لوگ پیاری

سے شفا اور بہتر مستقبل کی آرزو میں اپنے بچوں کو ان پہلوانوں سے پھونکیں مروانے لے جاتے۔ یہ پہلوان نہ صرف خود عبادت گزار تھے بلکہ کشتی کو بھی عبادت کا درجہ دیتے۔ پہلوان میدان میں اترنے سے پہلے باوضو ہونا ضروری سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام اپنے ان ہیروز کے لنگوٹ کی پاکیزگی کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ قوموں کو اپنے ان پہلوانوں کی طاقت اور دیانت پر اتنا بھروسہ تھا کہ بعض اوقات وہ دشمن ریاستوں کے لاینحل مسائل دو پہلوانوں کی کشتی کے ذریعے حل کر لیتے تھے۔ اس طرح خلق خدا قتل و غارت گری سے بچ جاتی۔ دیکھا جائے تو آج کا فن پہلوانی ماضی کی قدیم روایت ہی کا تسلسل ہے۔

سترہویں صدی کا ہندوستان سیاسی اعتبار سے مستحکم اور مادی وسائل سے مالا مال تھا۔ یہاں کے باشندے پُر امن اور خوشحال تھے اور اپنے جنوبی ساحلوں کے ذریعے مالدیپ، سری لنکا، جاوا، سماٹرا، افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے عربوں کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ یورپی ممالک میں ہندوستانی مصنوعات انہی عرب تاجروں کے ذریعے پہنچا کرتی تھیں۔ سترہویں صدی کے خوشحال اور مستحکم ہندوستان کی سیاسی باگ ڈور شہنشاہ شاہجہان کے ہاتھ میں تھی۔ بادشاہ علوم و فنون کا دلدادہ تھا اور مقامی مٹی سے جنم لینے والے فنون کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا۔ ان فنون میں ایک فن پہلوانی بھی تھا۔ شاہجہان کے تیس سالہ دور حکومت کا چھٹا سال تھا جب ایک روز اسے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق ہوا۔ شہنشاہ کے علاوہ شاہی خاندان کے افراد اور ارکان دولت بھی موجود تھے۔ لڑائی شروع ہوئی تو اچانک کالے ہاتھی نے حریف ہاتھی کے گلے میں اپنے تیز دانت گاڑ دیئے۔ حریف نڈھال ہو کر گر پڑا مگر کالے ہاتھی کے سر پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اس نے جنگلہ توڑ کر شہنشاہ اور درباریوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ قریب تھا کہ ہاتھی شاہجہان یا کسی درباری کو نقصان پہنچاتا۔ ایک سترہ سالہ خوبصورت نوجوان خوفزدہ لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور اس نے ہاتھیوں کے جنگلے میں چھلانگ لگا دی۔ شہنشاہ کے قریب بیٹھے جرنیل جمال الدین نے پہلے تو نہتے نوجوان کے لئے جنگلے میں تلوار پھینکی اور پھر خود بھی نوجوان کی مدد کے لئے جنگلے پر چڑھنے لگا۔ مگر بہادر نوجوان نے جمال الدین کو اندر آنے سے روک دیا۔ جنگلے میں ہونے والی اس انسانی مداخلت پر کالا ہاتھی مزید مشتعل ہو گیا اور اس نے نوجوان پر سونڈ سے حملہ کر دیا۔ نوجوان نے ہاتھی کی سونڈ پر ایسا وار کیا کہ ہاتھی بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا اور جنگلے سے ٹکرا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اب حیرت اور خوف کی جگہ تالیوں نے لے لی تھی۔ شہنشاہ دلاوروں کی پروا کیے بغیر تخت سے اٹھ کر آگے بڑھا اور نوجوان کو گلے لگا لیا۔ تلوار کے ایک ہی وار سے دیو قامت ہاتھی کو ڈھیر کر دینے والا یہ نوجوان شاہجہان کے جرنیل جلال الدین کا بیٹا اور اوائل پہلوانی کا روشن ستارہ نورالدین، استاد زماں قطب پہلوانی تھا۔ 5 فروری 1635ء کو لاہور کی سنہری مسجد کے قریب واقع محلہ کوٹھی داراں میں پیدا ہونے والا نورالدین ہندوستان میں فن پہلوانی کا بانی ہے۔ اورنگزیب عالمگیر کی تخت نشینی کے سولویں جشن میں نورالدین استاد زماں نے روئے زمین پر موجود تمام پہلوانوں کو للکارا اور 361 داؤ ایجاد کر کے فن پہلوانی کا نصاب مرتب کیا۔ اور آج تک یہی داؤ شہ زوروں کا کل سرمایہ ہیں۔ اس سے قبل وہ کئی سال تک ایران میں قیام پذیر رہا اور وہیں اس نے اس عہد کے استاد شہ زور پوریا پہلوان سے فن پہلوانی میں کمال حاصل کیا اور ایران کے تمام پہلوانوں کو پچھاڑ کر ایران کا فن پہلوانی کا سب سے بڑا اعزاز درفشِ کاویانی حاصل کیا۔ یہ ایران کا وہ قدیم جھنڈا ہے جسے 517 قبل مسیح میں ضحاک ابن علوان کے خلاف کاوہ نامی لوہار نے بطور علم بغاوت بلند کیا تھا۔ ضحاک نے ایرانیوں کے ہر دلعزیز بادشاہ جمشید کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کیا تھا۔ جمشید کو پارسی پیغمبر کا درجہ

رہتے تھے۔ جام جمشید اسی کی ایجاد ہے۔ وہ حکیم فیثا غورث کا ہم عصر تھا اور اسی کے دور میں جشنِ نوروز کا آغاز ہوا جسے آج بھی ایرانی نہایت جوش جذبے سے مناتے ہیں۔ سمندروں سے غوطہ خوری کے ذریعے مروارید نکالنے کا طریقہ بھی اسی کی ایجاد ہے۔ ضحاک ابن علوان تازیوں کی مدد سے ایران کا بادشاہ بن بیٹھا۔ پھر اچانک ہی اس کے دونوں کندھوں پر دو رسولیاں (جنہیں بعض لوگ سانپ بھی کہتے ہیں) ابل آئیں۔ جن کے نتیجے میں ہونے والے درد کی شدت سے بچنے کے لیے وہ انسانی دماغ کا گوشت ان پر لگایا کرتا تھا۔ پہلے قیدیوں کی شامت آئی، زندان خالی ہو گئے تو عوام کے دماغ ان ناگوں کو کھلائے جانے لگے۔ اصفہان کے کاوہ نامی لوہار کے چار جوان بیٹے جب ضحاک کے ظلم کا شکار ہوئے تو وہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو گیا۔ اس نے چمڑے کے ٹکڑے کا ایک جھنڈا بنایا اور گلی گلی ڈھول کی تھاپ پر ظلم کے خلاف گیت گانے لگا۔ اس کے گیتوں نے پورے ملک میں آگ لگا دی۔ ظلم کا شکار عوام مصلحت کوشی چھوڑ کر کاوہ نامی لوہار کے ساتھ شامل ہونے لگے۔ وہ اس کے جھنڈے کو خدائی علم تصور کرنے لگے جس کے سامنے شاہی لشکر تتر بتر ہو گیا تھا۔ ضحاک کے قتل کے بعد کاوہ نے اپنے جھنڈے کو زر و جواہر سے سجا دیا۔ یہی علم ایرانی تاریخ میں درفشِ کاویانی کے نام سے مشہور ہوا۔ ضحاک کے قتل کے بعد لوگوں نے کاوہ لوہار کو ایران کا بادشاہ بنانا چاہا مگر اس نے اقتدار مقتول بادشاہ جمشید کے بیٹے فریدون کے سپرد کر دیا اور عمر بھر اس کی فتح و نصرت کے لیے لڑتا رہا۔ (5) ہر جنگ جیتنے کے بعد بادشاہ اس جھنڈے پر کچھ مزید جواہرات جڑ دیتے۔ یہ علم بڑے بڑے بادشاہوں کے لیے وحشت کی علامت بن چکا تھا۔ فریدون سے ہوتا ہوا یہ جھنڈا ساسانی بادشاہوں تک جا پہنچا اور آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کے دور میں بالآخر عرب مسلمانوں کے لشکر کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ مسلمانوں نے درفشِ کاویانی کے جواہرات سپاہیوں میں تقسیم کر دیے اور چمڑے کو جلا دیا گیا۔ بظاہر یہ جھنڈا ختم ہو گیا مگر ایرانی عوام کے دلوں میں درفشِ کاویانی ہمیشہ لہراتا رہا۔ لہٰذا ایرانی سورماؤں نے اسی علم کی یاد میں ایک اعزاز کا اجرا کیا جسے درفشِ کاویانی کا نام دیا گیا جو ایران کے سب سے بڑے پہلوان کو پیش کیا جاتا تھا اور یہی وہ تمغہ تھا جسے لاہور کے سپوت اور عظیم شہ زور استاد نور الدین پہلوان نے سولہویں صدی میں ایران کے بڑے بڑے پہلوانوں کو لگاتار شکستوں سے دوچار کرنے کے بعد اپنے سینے پر سجایا۔ عالمگیر جیسا زاہد خشک بھی نور الدین کے کمالاتِ فن کا عاشق تھا۔ ایک روز جب نور الدین نے عظیم الجثہ مرہٹہ پہلوان کو ایک یادگار معرکے میں شکست دی تو عالمگیر تمام شاہانہ جاہ و جلال کو بھلا کر اکھاڑے میں کود پڑا اور نور الدین سے بغلگیر ہو گیا۔ اس نے اپنے پسندیدہ پہلوان کو قطبِ پہلوانی کے خطاب سے نوازا۔ نور الدین نے اپنے دو سو شاگردوں کو تین ٹولیوں یا گروہوں میں تقسیم کر دیا تاکہ آپس میں صحت مند مقابلوں کے نتیجے میں فنِ پہلوانی ترقی کرتا رہے۔ یہ تینوں ٹولیاں نورے والی، کالو والی اور کوٹ والی وف کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ قطبِ پہلوانی کو دل دے بیٹھنے کے باعث نور الدین نے عمر بھر شادی نہیں کی اس لیے استادِ زماں نے اپنا فن اپنے بھائی محمد بخش ڈھڈ پہلوان کی اولاد میں منتقل کیا۔ اس خاندان میں آگے چل کر استاد روشن دین، خلیفہ چراغ دین، رمضی پہلوان، خلیفہ عبدالرحیم، استاد امیر بخش ٹنگلی، خلیفہ معراج دین اور آفتابِ ہند خلیفہ غلام محی الدین جیسے ممتاز پہلوان پیدا ہوئے۔ اگرچہ ہندوستان میں فنِ پہلوانی کا بانی یہی خاندان ہے مگر آگے چل کر بعض ایسے گھرانے بھی سامنے آئے جن کے ذکر کے بغیر پہلوانی کی تاریخ بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ پہلوانی کی تاریخ کو اپنے خون پسینے سے لکھنے والے خاندانوں میں نور والا، کالی والا، سلطانی والا، ریاں والا، کھلی والا اور علیا پہلوان کے خاندان شامل ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں کالی والا

کے علاوہ باقی سارے خاندان کشمیری الاصل ہیں۔ اگرچہ کشمیر کی ریاست بھی فن پہلوانی کے حوالے سے کم زرخیز نہ تھی مگر ان خاندانوں نے اصل کارنامے پنجاب منتقل ہونے کے بعد ہی انجام دیے۔

علیا پہلوان اور گاما رستم زماں کے دادا نے ایک ہی پس منظر میں کشمیر سے ہجرت کی۔ گاما رستم زماں کے دادا کو بھی پہلوانی کا شوق تھا۔ مگر اس کے دس بیٹوں میں صرف عزیز بخش ہی نامور پہلوان بنا۔ وہ جب بڑے بڑے پہلوانوں کو گرا چکا تو ہندوستان کی ریاست دتیہ کے مہاراجہ بھوانی سنگھ نے اسے اپنی ریاست میں خوش آمدید کہا اور یہ تعلق عزیز بخش کی آخری سانس تک قائم رہا۔ گاما پہلوان اور رستم ہند امام بخش کا نانا امیر بخش المعروف نون پہلوان بھی اپنے عہد کا نامور گرز بند پہلوان تھا۔ یہ خاندان بھی پہلے کشمیر سے لاہور اور آخر میں جودھ پور پہنچا۔ یہاں نون پہلوان نے راجا بھوانی سنگھ کی تجویز پر ریاست دتیہ کے عزیز بخش پہلوان کو اپنی فرزندی میں لے لیا مگر عزیز پہلوان جوانی ہی میں اپنے دونوں بیٹوں کو یتیمی کے حوالے کر کے زیر زمین جا سویا۔ یہی دو بھائی آگے چل کر رستم زماں گاما اور رستم ہند امام بخش کہلوائے۔ چونکہ عزیز کے مرنے کے بعد ان دونوں بھائیوں کی ذمہ داری ان کے نانا نون پہلوان پر آپڑی تھی اس لئے گاما پہلوان ایک عرصے تک گاما نون والا ہی کہلواتا رہا۔

ادھر علیا پہلوان کا خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر میں آ بسا۔ یہاں پہلوانوں کے خاندان کٹڑہ کرم سنگھ اور بھگتاں والا دروازے کے علاقے میں آباد تھے۔ علیا خود نامور پہلوان تھا۔ فن پہلوانی کے بعض ناقدین اسے رستم ہند بھی کہتے ہیں جو اس عہد میں ریاست جودھپور سے سات روپے روزانہ وظیفہ لیتا تھا۔ فن پہلوانی کے لئے علیا کا دین یہ ہے کہ اس نے برصغیر کو غلام پہلوان رستم ہند، کلو پہلوان، رحمانی پہلوان، گاما کلو والا، عیہان پہلوان اور حمیدہ رحمانی والا جیسے نامور پہلوان عطا کئے۔ جیسے جیسے پہلوانوں کا شہر بنتا چلا گیا۔ لاہور، دہلی اور لکھنؤ جیسے تہذیبی مراکز سے دور ہونے کے باوجود امرتسر کی اپنی ایک تہذیبی اور سیاسی اہمیت رہی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کا امرتسر اپنے شاعروں، موسیقاروں، ادیبوں، سیاستدانوں، انقلابیوں اور پہلوانوں کے باعث بڑے بڑے تہذیبی شہروں کی ہمسری کرنے لگا تھا۔ سکھوں کا مذہبی مرکز ہونے کے علاوہ اس شہر کی سیاسی اور ادبی پہچان بھی نہایت مستحکم تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ اسی شہر میں ہوا جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ پھر یہیں ترقی پسند کانفرنس بھی منعقد ہوئی اور ایم اے او کالج کے اجراء نے نامور ادیبوں کی ایک کہکشاں بھی یہاں روشن کر دی تھی جس میں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، فیض احمد فیض، محمود الظفر اور رشید جہاں جیسے اہل قلم شامل تھے جن کے فکری نتائج نے پوری نسل کو متاثر کیا۔ امرتسر ایک طرف نامور شاعر اور ادیب پیدا کر رہا تھا تو دوسری طرف امرتسر کے کئی پہلوان رستم ہند کے اعزاز سے سرفراز کئے گئے۔ فن پہلوانی کو ملنے والے اس عروج ہی کے نتیجے میں جگہ جگہ اکھاڑے وجود میں آگئے جن میں شمشیر زنی اور گتکے کے اکھاڑے بھی ہوا کرتے تھے۔ ان اکھاڑوں میں بھگتاں والا دروازہ، کٹڑہ کرم سنگھ، کٹڑہ مہت سنگھ اور چاٹی ونڈ کے اکھاڑے بہت مشہور ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی درجنوں اکھاڑے تھے جن میں پانچ بڑے اکھاڑے تو صرف ککھی والا خاندان کے تھے۔ پہلا باغ اکالیاں، دوسرا بازار دیالساں والا، تیسرا راجے شاہ بوڑھ والا، چوتھا مزار سائیں حیوان والا اور پانچواں چاٹی ونڈ دروازے کے قریب ہوا کرتا تھا۔ امرتسر کے شہزوروں میں ککھی والا خاندان کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ فن پہلوانی کے لئے اس خاندان کی عطا یہ ہے کہ اس میں مسلسل پندرہ نامور پہلوان پیدا ہوئے جو ہندوستان کی مختلف

ریاستوں سے وابستہ رہے۔ ان میں امیر بخش، احمد بخش، عزیز الدین، حبیب پہلوان اور جھنڈو پہلوان جیسے نامور شہ زور شامل ہیں۔ 1874ء میں پیدا ہونے والا میراں بخش اس خاندان کا سب سے نامور پہلوان تھا جو اپنے عہد کا رستم ہند ہونے کے علاوہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی فوج کا سپہ سالار بھی تھا۔ یہ شیر سے بالوں والا خوش پوش میراں بخش پہلوان ہی تھا جس نے 1901ء میں غلام محمد عرف گاما اور 1904ء میں بوٹا لاہوری کے مرنے کے بعد اس میدان میں پیدا ہونے والے خلا کو کامیابی سے پر کیا۔ میراں بخش کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ ایک زمانے میں گاما رستم زماں اور امام بخش رستم ہند اس کی تربیت میں رہے تھے۔ گاما پہلوان کو رحیم بخش کے ساتھ پہلے معرکے کی تیاری بھی میراں بخش بھگی والے ہی نے کروائی تھی۔

رنجیت سنگھ کا درباری پہلوان عمر بخش، سلطانی والا خاندان کا جد امجد تھا جو 1790ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ وہ کشمیر میں رنجیت سنگھ کے گورنر ہری سنگھ نلوا کا دوست تھا۔ پنجاب میں فن پہلوانی کو عروج ملا تو گورنر اس خاندان کو پنجاب لے آیا اور گوجرانوالہ میں آباد کیا۔ عمر بخش نے کھیالی دروازے میں ایک عظیم الشان اکھاڑے کی بنیاد رکھی اور اپنے عہد کے ممتاز پہلوانوں سے یادگار معرکے کیے۔ عمر بخش کے گھر 1840ء میں سلطان پہلوان پیدا ہوا جس کے نام پر پنجاب کا مشہور سلطانی والا خاندان وجود میں آیا۔ سلطان نے سانجھو پہلوان اور نون پہلوان سمیت نامور پہلوانوں سے یادرہ جانے والی کشتیاں لڑیں۔ سلطان پہلوان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس فن کو رحیم بخش سلطانی والا جیسا شہ زور بیٹا دیا۔

سیالکوٹ کے گاؤں بھاراں والی میں آباد بالی والا خاندان کا شمار بھی فن پہلوانی کے معماروں میں ہوتا ہے۔ یہ خاندان نامور شہ زور بالی پہلوان کے نام سے مشہور ہے جو کشمیر سے نقل مکانی کرنے کے بعد سیالکوٹ میں آباد ہوا تھا۔ بالی پہلوان کے دو بیٹوں مکھا پہلوان اور کاموں پہلوان میں صرف کاموں بالی والا ہی کو عزت اور شہرت نصیب ہوئی۔ اس کی گاما رستم زماں، رحیم بخش سلطانی والا اور کریم بخش پیلڑے والا اور ناتی والا سمیت نامور ریاستی پہلوانوں سے معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ فیروز دین گونگا پہلوان جسے علامہ اقبال کا پسندیدہ پہلوان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی کاموں بالی والے ہی کا بیٹا تھا۔

پنجاب کی فن پہلوانی کا ایک اور ستون ملتان کا ناتی والا خاندان ہے جس نے کئی پشتوں سے ایک سے بڑھ کر ایک شہ زور پیدا کیے۔ ناتی والا خاندان کا مورث اعلیٰ کرم خان تھا جو قندھار سے آ کر ملتان میں آباد ہوا تھا۔ اس نقل مکانی کے دوران اس کی شریک حیات چل بسی تو اس کے ننھے منے بیٹے کریم خان کی پرورش کی ذمہ داری اس کی نانی کو اٹھانا پڑی۔ اسی وجہ سے وہ کریم خان ناتی والا مشہور ہو گیا۔ کریم خان نے ملتان میں اکھاڑہ قائم کر کے اپنے پانچوں بیٹوں کو فن پہلوانی کے سپرد کر دیا۔ ان پانچوں بھائیوں میں سلطان خان ناتی والا بہت نامور شہ زور بنا جسے اہل ملتان کرنل خان کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ ملتان کا سلطانی محلہ اور فصیل شہر کا سلطانی دروازہ آج بھی اسی کے نام سے موسوم ہیں۔ سلطانی والا خاندان میں عبدالکریم خان اور امین خان جیسے شہ زور پیدا ہوئے۔ بیسویں صدی کا نامور پہلوان حمیدا ناتی والا امین خان ہی کا بیٹا تھا جو کرم سنگھی اور بھا بھو والا جیسے پہلوانوں کو للکارتا ہوا رستم زماں گاما کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ 1707ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے مرنے کے بعد مغل حکومت کی گرفت کمزور پڑتے ہی ہندوستان چھوٹی

چھوٹی درجنوں ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ ان ریاستوں کے وجود میں آنے سے مغل حکومت کی مرکزیت کو جو نقصان پہنچا وہ ایک الگ کہانی ہے مگر ان ریاستوں نے فنِ پہلوانی کے فروغ میں جو کردار ادا کیا، وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ادھر ہندوستان میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی یلغار اور اس کے سامنے مغل حکومت کی کمزوری اور مسلسل پسپائیت کے پس منظر میں اہل ہندوستان کے سینوں میں جو لاوا پک رہا تھا اس کا اظہار میدانِ جنگ کی بجائے دو نئے محاذوں پر ہوا۔ یہ شاعری اور پہلوانی کے محاذ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے عرصے میں عظیم المرتبت شاعر اور ناقابلِ تسخیر پہلوان پیدا ہوئے اور بالخصوص ان پہلوانوں کی سرپرستی کے لئے بیشتر ریاستیں والہانہ انداز میں آگے بڑھیں۔ یوں تو اکثر ریاستوں نے یہ کام ایک قومی فریضے کے طور پر انجام دیا مگر اس سلسلے میں ریاست بڑودہ کے مہاراجہ راؤ، ریاست دتیہ کے راجہ بھوانی سنگھ، جودھپور کے راجا جسونت سنگھ، جونا گڑھ کے نواب غلام رسول، کلم گڑھ کے راجا مہندر سنگھ، اندور کے راجہ شیوجی راؤ اور پٹیالہ کے بھوپندر سنگھ کی فنِ پہلوانی کے فروغ کے لئے کی جانے والی کوششیں ہماری تاریخ کا شاندار باب ہیں۔ یہ راجے مہاراجے اور نواب جہاں بھی کسی جوہرِ قابل کو دیکھتے، فوراً اس کی سرپرستی کے لئے پہنچ جاتے۔ خود پہلوان بھی ہندوستان کے کونے کونے سے کھل کر ان ریاستوں کا رخ کر رہے تھے جہاں ایک خوشحال اور آسودہ زندگی ان کے انتظار میں ہوتی تھی۔ یہ راجے مہاراجے جیتنے والے پہلوانوں کو خطابات کے ساتھ ساتھ خلعتیں، تنخواہیں، وظیفے اور جاگیریں دیا کرتے۔ سواری کے لئے گھوڑے، ہاتھی اور رہنے کے لئے محل دیئے جاتے۔

جب یہ پہلوان زرق برق لباس، سروں پر رنگ برنگی پگڑیاں اور گلوں میں قیمتی موتیوں کے ہار پہن کر ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تو وہ بھی بالکل راجے ہی لگتے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب جسونت سنگھ، بوٹا پہلوان لاہوری کو لے کر ملکہ برطانیہ کے دربار میں پہنچا تو اس نے پہلوان کا شاہانہ لباس اور طاقت و خوبصورتی کے اس خوبصورت مجسمے کو دیکھ کر بے ساختہ پوچھا ''یہ کس ریاست کے راجہ ہیں؟'' ہندوستان کے شاعروں اور پہلوانوں میں ایک چیز مشترک رہی ہے کہ جب وہ اپنے حریفوں کو للکارتے تو اپنے اپنے حمایتوں پر مشتمل جلوس ضرور نکالتے۔ انشا اور مصحفی کے جلوس تو تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ انشا اور مصحفی کی چشمک کا آغاز ایک دوسرے کی ہجو گوئی سے ہوا۔ جس میں دونوں طرف کے دوستوں کی طرفداری اور شاگردوں کی وفاداری نے وہ گرما گرمی پیدا کی کہ بات ایک دوسرے کے خلاف جلوس نکالنے تک جا پہنچی۔ صاحب ''نقوش معرکۂ زیبا'' کے مطابق جلوس کا آغاز انشا کی طرف سے ہوا تھا۔(8) انشا نے اپنا سوانگ جس طرح نکالا اس کا نقشہ محمد حسین آزاد نے بڑے دلچسپ انداز میں کھینچا ہے۔ لیکن پھر سید انشا اللہ خاں نے جو اس کا جواب حاضر کیا وہ قیامت تھا۔ یعنی ایک انبوہ کثیر بارات کے سامان سے ترتیب دیا اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں۔ کچھ گھوڑوں پر چڑھے جاتے تھے، کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے، ایک ہاتھ میں گڈا اور ایک میں گڑیا، دونوں کو لڑاتے تھے اور زبانی ہجو پڑھتے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے:

سوانگ نیا لایا ہے دیکھا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

(جاری ہے)

منظومات

ڈاکٹر انعام الحق

75ویں یومِ آزادی پر ایک خواب

قائد اعظم نے کل شب مجھ سے پوچھا خواب میں
حال اپنے وطن کا ارضِ پاک کے باب میں
عرض کی مشکل بہت ہے گو مرا اب کھولنا
آپ کا ارشاد ہے تو فرض ہے اب بولنا
حکمراں بیٹھے ہوئے ہیں آ کے جیسے قید میں
نوٹ ان کے بینک میں ہیں اور ان کی چھت میں
رہنماؤں کی یہاں سیدھی نہیں ہے کوئی کل
اور اپوزیشن کا بھی بہتر نہیں ہے ردِ عمل
ہم کے باہم ہیں سب یکجا ہم سے جدا ہے
ہے آزادی تو بس امریکیوں سے رہا ہے
Unity کا پوچھو مت پوچھیں جیسے کچھ لگتے ہیں
پرچمِ رشوت تلے سب متحد ہیں ایک ہیں
چینلوں کا سارا بزنس ہے بے تکلف جھوٹ پر
عقل حیراں اور سرگرداں ہے اس Misuse پر
لشکروں کو ہے ازرہ صرف ہے شک پر یقیں
اور سیاست داں اتفاق رکھتے ہیں نہ حق پر یقیں
چار بار اس ملک کے آئین کو توڑا گیا
عدلیہ کا تعلق فوج سے جوڑا گیا
مختلف حکموں کی جگہ اب رہ گئے ہیں صرف نیک
لوٹ کے ہیں دن دہاڑے چار سو چوروں میں چیک
کل جو بیوروکریٹ تھے وہ آج شاہی کریٹ ہیں
جس کی اک انگلی کے آگے سب کے سب لیٹ ہیں
دیتا ہے اقبال کا شاہین اب ''ایف 8'' میں
جا رہا ہے رشوتوں کا مال ان کے پیٹ میں
کوئی نہیں پر سمت ہے اور کوئی سو قصد یہاں
اور کمیشن کی مقرر ہی نہیں ہے حد یہاں
ملک کے ایشن کی خاطر ہر الیکشن میں
ہر کوئی لڑا رہا ہے کوششیں ایکشن میں
زر کا احساس مجبوری کی جلتی کا جنازہ
ہے اسی بیماریوں میں جکڑا ہر زندگی زدہ
ہے 75 سال سے یہ اپنی حالت کیا کہوں
حکمراں ہیں خوش و خرم قوم ہے خوار و زبوں
ہو رہے ہیں قوم کا بس قرض پر ہے انحصار
اور حد یہ ہے کہ اب دیتا نہیں کوئی ادھار
پوری دنیا میں چل رہا ہے تم سے ایوانِ صدر
جن کے گھر روشن ہوں ان کو کیسے ہو بجلی کی قدر
کیا بتاؤں پورا پی ایم ہاؤس جنریٹر پہ ہے
قوم کا تکیہ اسی جمہوری ایکٹر پہ ہے
رہنمایانِ گرامی سوچتے ہیں بیٹھ کے
آ رہے ہیں گرمیوں میں جیب کے جھانسے لے
لوڈشیڈنگ بھی بازاری ہے اور مہنگائی ہے
اور دلّہ دو الا سب سے بڑی بلائی ہے
اور ملاوٹ اس قدر ہے کوئی شے خالص نہیں
صد قے ہے کہ میکدوں تک میں بھی مے خالص نہیں
قیمتوں میں بھی وہ اب پہلے سی ارزانی نہیں
کارخانوں میں بھی بجلی کی فراوانی نہیں
ہے کہیں پر آپ کا جو کوئی بچا ہوا وقار
ہو رہا ہے وہ بچارا جا کے ہر دفتر میں خوار
آپ کے فرمان پر کرتا نہیں کوئی عمل
آپ کی تصویر کا ممکن نہیں نعم البدل
جب بھی جی چاہیں دیکھ لیں دل کھول کر اہلِ نظر
ان پہ چھائی ہوئی ہے ہر کرنسی نوٹ پر
اور ان تصویر کا ہے دل میں اتنا احترام
پیش کر دیں جس کو وہ فوراً ہی کر دیتا ہے کام

OOO

گلزار بخاری

غرور

مت اس مال پہ تو غرور کر
تجھے اصلیت کا پتا نہیں
تجھے زندگی جو عطا ہوئی
وہ ہمیشہ تیرے ساتھ رہے
تو ادھورا رہتا ہے ایک دن
جو گزر گیا کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا
تو آ کے اللہ جل ہے وہ گلی ہے ایک دن
اسے عمر میں نہ شمار کر
کہ وہ ہے کبھی تو یقیں نہیں
تجھے زندگی حیات ہی پائے گا
ترے پاس ایک ہی روز ہے
تجھے آج کہتے ہیں کچھ دن
ترے روزِ حیات میں
کبھی اور اس کے سوا نہیں
تو اکیلا ہے جایا ایک دن
اسے لفظوں میں کچھ نہیں
مت اس مال پہ تو غرور کر
تجھے اصلیت کا پتا نہیں

OOO

صفدر صدیق رضی

مراجعت

مجھے وہ نظم اب دوبارہ لکھنی ہے
تری آنکھوں کو
جس میں نرگس لکھا تھا
اب سفاک لکھنا ہے
لبوں کو جو دیا لکھا تھا
اب بے باک لکھنا ہے
محبت کو وفا لکھا تھا
اب چالاک لکھنا ہے
ترے رویّے کو
دامنِ صد چاک لکھنا ہے
تباہ شدہ دل کی تجھ سے خطا کاریوں کو
عبرت ناک لکھنا ہے
جو تجھ سے رشتے ناتے ہیں
انہیں اب خاک لکھنا ہے

OOO

ایوب خاور

ایک منجمد وداعی لمحہ

میں نے تو اُن کے گھر کا دروازہ کھولا
دیکھتا کیا ہوں!
کمرے کی بیچ و بیچ جہاں تھی
وہیں کی وہیں دھری ہوئی ہے
اور میکے ٹیبل کے کونے پر
سیٹی پیس کے اوپر کا ڈھکنا بس یوں ہی کھلا پڑا
ہے
برش کے دانتوں میں
کچھ بال ہیں تیرے پھنسے ہوئے
جست کی شیشی کھلی ہوئی ہے
تیرے پرس کے اندر سے ایک تھیلی کی ڈوری اس
کے اوپر گری ہوئی ہے
میری چٹھیاں
بکس کے دروازے کی اوٹ میں اٹکی پڑی
ہوئی ہیں
میری گھڑی
اور میری انگوٹھی
تجھ کے بیگ سے ہو کر فرش پہ اوندھے پڑے
ہوئے ہیں
کین سے سنگل جیلی کے اک پیالہ
میری چوکھٹ کے کونے میں تیرے سبز دوپٹے کا
اک کونا الجھا ہے
بستر کی چادر اور تکیے
اک دوجے سے گتھم گتھا ہو کر گہری نیند کے قفل
میں رخصت ہوئے ہیں
مرا دم گھٹا جا رہا ہے
شام ڈھلی ہے!
اے میرے دل والی!
کون فرعون ہے
جس کے جادو گروں نے
اندھیرے کی مٹھی پہ ایسا کوئی سخت جادو کیا ہے
کہ جدائی کے سائے والی گھڑی بھی منجمد ہو گئی ہے
یہ گھڑی جو ہے جس اندھیرے کی مٹھی میں بند ایک
اپنے کے اندر تجھے جا رہا ہے
اندر مر گیا تو!!!

OOO

نیلم احمد بشیر

میں عورت ہوں

میں عورت ہوں، داستاں ہوں
حق اپنے کی خود نگراں ہوں۔ میں عورت ہوں
حالات کے ہاتھوں جلتی رہی
آبلہ پا میں چلتی رہی
دنیا نے بہت تنگ کیا
پھر بھی مضبوط چٹان ہوں
میں عورت ہوں انسان ہوں
قندیل بنی اندھیرا تھا
تیرا اجالا میرا چہرہ تھا
میرا عزم میرا اجالا ہے
سایہ ہوں سائبان ہوں
میں عورت ہوں انسان ہوں
میں ظلم کے در سے جاتی ہوں
امن کے گھر میں سجاتی ہوں
دنیا میں جہاز اڑاتی ہوں
میں پیار کا ایک جہان ہوں
میں عورت ہوں انسان ہوں
تخلیق بھی ہوں اور خالق بھی
اپنے بخت کی مالک بھی
میں جرأت کی تصویر بھی ہوں
میں تو رضیہ سلطان ہوں
میں عورت ہوں انسان ہوں
حق اپنے کی خود نگراں ہوں

OOO

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

اُف اللہ!

اُف اللہ یہ جلتا سورج
ہر سو آگ اگلتا سورج
جھلساتا پگھلاتا سورج
آگ لگا دے آگ سمندر
دل کے اندر دل کے باہر
یہ کیا میرے خالق مولا!
بادل آ جا بادل گرجا
ٹوٹ کے برسا
ہر آنگن میں دلکش ٹھنڈک
خنک ہوائیں دل بہلائیں
میرے اللہ میرے مولا!
ہر پل تیرے ذکر میں مولا
آگ لگا دے جذبہ ہر سو
تیری مرضی تیری رضا ہے
جل تھل کر دے
آگ لگا دے

OOO

احمد نواز

خرد کے گھاؤ

آخر یہ اک فریب ہے
جہاں اک فریب ہے

قدم قدم پہ حیرتیں
نجم نجم ہیں حسرتیں
نظر نظر فراز ہے
ڈگر ڈگر نشیب ہے
جہاں اک فریب ہے

یہ وجود میں
کوئی وجود ڈھونڈتے گئے
کئی سرابوں کو ٹٹولتے گئے
سراب بانٹتے گئے
ازل سے جو ہے شیخ شہود ڈھونڈتے گئے
مقصد یہ ہے جو ہو نہیں سکا
وہی تو حسن لا مقصود وجود ہے کیا؟
جہاں اک فریب ہے

نظر کی مار سے پرے
حقیقت بعید ہے
یہ جستجو کی جستجو
متاع رہروان ہے بس
جو جاتے ہیں راہ میں
مسافروں کی تاک میں

مسافتوں کی مار سے
نظر وہ سن میں گم ہے
وحشتیں ریگ زار میں
ہلاکتیں رفیق ہے
زیاں گری میں مست ہیں
جو راستوں میں لٹ گئے
نظر سفر نہیں رکا
یہ ارتقا کے مراحل ہیں
جو رزق تیری جو ہے
تماشے کی مثل
عقل جلتی ہے
جو عقل کے گناہ کا اک عارضی علاج ہے
نظر خرد کے گھاؤ ہیں
کہاں کوئی علاج ہے
نگاہ ہے دل کی کے لیے فقط
ایہام و تخیل ہے
جہاں اک فریب ہے
آخر یہ دل فریب ہے
جہاں اک فریب ہے

OOO

انور ندیم علوی

فارمولے

پیار کی سلطنت میں کبھی
فارمولے ریاضی کے چلتے نہیں
اس لیے تم یہ مت سوچو
ابتدا کس نے کی، انتہا کیا ہوئی
ساتھ رہ کر بھی دونوں جدا ہی رہے

یہ بھی مت سوچنا کس نے چاہا کسے؟
پیار کم تھا کسے اور زیادہ کسے؟
اک جمع اک، بنیں دو ضروری نہیں
اتفاقاً یہاں ایسا ہوتا نہیں

ہم بھی دونوں ملے تھے مگر یوں ہوا
تو بھی تنہا رہا، میں بھی تنہا رہا
درمیاں اک رواجوں کا دریا بہا
اس طرح سے سماجوں کا ریلا چلا
فارمولے بنا کر سبھی لے گیا

میں اکیلے کھڑا سوچتا ہی رہا
یہ مساوات کا فارمولا نہیں
یہ ضروری نہیں، ایسا ہوتا نہیں

OOO

عاصم بخاری

فادرڈے

باپ کا یوم آنے والا ہے
یوم فادر کے واسطے کوئی
اس کی تصویر چاہیں اک
جو کہ اچھے لباس والی ہو
خوب ہو اور پہ شملے والی ہو
جس میں چہرے پہ مت تفکر ہو
الغرض آنکھوں میں مت نظر آئے
اس کی تصویر چاہیں اک
جس میں چہرے پہ مسکراہٹ ہو
کرب اس کا ذرا نہ نظر آئے
جیسے کی تھی دعا سے اس کے
ہم سے جو کچھ بنی دعا دیا کر ہے
پھر کتنا تھا جس کا آج رہا
جو ہوا سو ہوا اسے چھوڑو
وقت اس بات پر گنوا دیا
ماضی پر افسوس اب بے جا کیا
حاصلِ کلام المختصر
باپ کا یوم آنے والا ہے
لوگ عاصم نہیں کہ یہ کیا

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

اجنبی روح

اے ستارے تم نے آنے میں دیر کر دی
میں رات بھر تمہاری راہ تکتی رہی
اور نہ راہ پہ چلے ہی
جب صبح کا گھونٹ لیا تھا
میں کسی اجنبی روح کا ہاتھ تھامے
کسی انجان سفر کو روانہ ہو چکی ہوں
بس اب میں ایک دوسرے کو
دعاؤں میں یاد رکھنا ہے

OOO

ندیم فراز

ترا تصور

ترا تصور یوں مجھ میں تن کے
سنوار دیتا ہے جھلملاتے کو
کلیوں پہ ٹوٹے بہار جیسے
قمر پہ مخفی اوس جھار جیسے
نظر میں تیری نشے اترے سب
جل مچل جیسے کے پیار جیسے
نظر سے دل کے تمام رستے
سبھی اصولوں کو چاک کر کے
تمہارے جلوے کو راہ دیں گے
فقط ہی چوکھٹ بھی تجھی سے
بس کرے اب حساب سارے
کہاں تکا ہے جلوہ ترا کا
تصور تکا ہے میرے دل کا

OOO

سرائیکی اور پنجابی گوشہ

واجھلوڑا

مسرت کلانچوی

مختصر تعارف

مسرت کلانچوی 10 نومبر 1956ء کو بہاولپور میں پیدا ہوئیں۔ پانچویں جماعت سے کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا۔ وہ اردو اور سرائیکی کی 10 کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ PTV لاہور سے ان کے 13 سیریل اور 2 درجن سے زائد انفرادی ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان بہاولپور اور لاہور سے ان کے لاتعداد ڈرامے نشر ہو چکے ہیں۔ انھیں خواجہ غلام فرید قومی ایوارڈ اور 2 بار گریجوایٹ ایوارڈز مل چکے ہیں۔ حکومت پنجاب نے انھیں فاطمہ جناح میڈل سے نوازا ہے۔

توں بہوں سوہنڑی ہیں موتی۔ خواباں تے سوچاں توں وی ودھ۔ احساس دی شیشہ وچ ڈٹھے ایہہ لفظ موتی نے اپڑیں حیاتی وچ پہلی واری سنڑے ہن۔ ہر ہیں ودے پنج سال بعد۔ آج ہیں پے مصطفےٰ دے موہوں ہوز دے الفاظ سنڑن بیٹھی اوندی ساعت وی منہ سکدی ہن اصلوں ای ترک کر گئی ہئی۔ ہن ایندے وچ ہک ہے مرد اتج دے الفاظاں دی چھوار وسا ڈتی ہئی۔ اوندا چہرہ وی تکھی تاتش وچ تنور وچ روٹیاں پئی لیندی ہئی۔ پر اوکوں ایویں لگیا اوجیویں وچ پل گئی ہووے۔ رم جھم رم جھم کا تنا اوہ چڑا ان گئی ہووے۔ روٹی لاون لیتے او تنور وچ نیویں تھئی تاں تاتش نال اوندا اہب تپ گیا۔ اوں سر چا گھدا۔ اتھاں مسات تو یہ کھڑا ہا۔ او بولیا۔ بکھ۔ توں ہر ویلے تاں والا کیں چپ آ، مینکوں روٹی ڈیون دا۔ موتی نے ووڈیاں ووڈیاں جھکدیاں اکھیں نال تو یہ کوں ڈٹھا تے ہتھیاں اوتے دل تنور اندر ڈھیکس پئی گئی۔ اوں روٹی لہاتے تنور دے بنے تے رکھ ڈتی۔ روٹی پھل گئی۔ موتی نے روٹی وچ انگل ماری تاں روٹی دی ساری ہوا ڈوہ اندر لہہ گئی۔ اوندے ہوٹھاں توں ڈسکاری نکلی۔ تو یہ نے اوندی انگل پکڑ تے پھوک ماری۔

''پھلاں تے سویں ہتھاں کوں بھاہ وچ سڑا اے انھیں توں تاں پٹنگا ہی ہے میں بکھ ویا مراں۔ توں تاں پھلاں دی تج تے پاہون دی ڈاہی ہیں موتی'' موتی نے نکا جیہا ہڑا تے تو یہ کوں ڈٹھا۔ جلدی جلدی ساریاں روٹیاں چنگیر وچ رکھیاں تے ہوا دے ٹھنڈے جھولے وی کار چھیڑی چلی گئی۔ روٹیاں کھسن لیندیاں اوکوں لگیا جو اوندا دل دھڑکدا پے۔ اوندیاں اکھیں وچ جگنوں بھر تج آئے۔ آپڑیں پیو دے گھر اوندا دل کڈاہیں ایویں نہ دھڑکیا ہا۔ پیو دا ساتھ تاں ایویں ہا جیویں کوئی بلدے انگاریاں تے پاء کریں ویندا ہووے۔ تے وت مسرت ڈال اوندے وچوں اڈدے دھوں کوں ڈیکھے۔ ہر ایہہ کجھی ڈیہدے ہوئے موتی دے دلیاں وچ پئے

لکھدے سن۔ او مصطفےٰ توں پرے ہٹ دیاں پہ حکھ نویں احساس دے پیڑ ے۔ اوہدیاں اکھیں وچوں ہنجوں کرن پے گئے۔ او سوچن پے گئی کاش جو مصطفےٰ اوہنوں اج ای آ کے مل دیندے۔ ستاں او کجھ نہ کر سکدے سن۔ ہوہیں دی گئیں عجب جئے جرم دے احساس وچ پے گئی۔ او معصوم ہوئی پر خود نوں پتھر مارکے رو رو کے رات گزاری۔

موہل تے مصطفےٰ دی حیاتی دے دیہاڑ ہجے ای لکھدے پئے سن۔ او ہیں بک دوجے دا خیال رکھدے سی۔ بک دوجے دے دکھ درد دا احساس کر یندے سی۔ پر ایویں ای لگدا انساناں دے اندر کوئی جا خالی ہے۔ موہل دا خیال ہا جایاں دا موقعا بھر دی سی تے پیر لے بھر بھج ویسی۔ دل دی تے روح دی۔ زبان تے کدا ہیں کدا ہیں پر بنج سال تھی گئے ہن جا بھریندی ای نہ پئی ہئی۔ کہو ادا اکو یا۔ کہو حکیم۔ کہو ای تے کہو اختیر جیندے رہ دے اوہ نگی ہووے۔ کہو اعزاز حالی جیندی ہئی اوں اکھیں وچ نہ پانی ہووے۔ پر ہن ایویں لگدا ایں۔ ہنجکیاں وچ ایہ کجھ ڈیمبہ اوہدی روح اوہدے دل تے اوہدے دماغ نوں سوچاں تے جذبیاں دی رنگا بھری پکھلوں ڈال بھر یندے ویندی۔ اوہدے اندر دی سنجھی دھرتی ساوی تھیندی ویندی ہے۔ خیالاں وچ پر دے الفاظاں نے اوہدے ان ڈٹھے زخماں تے مرہم لاتی ہووے۔ احساس جرم دا انکا جیہا گنڈ اوہدے دل وچ پیا۔ او سوچن پے گئی کاش او کجھ نہ آئی ہوندی۔ آپڑیں مسافت نوں ڈھلی ہوندی۔ اوہدی کوئی گالھ نہ سنوری ہوندی۔ اوڑدی ای راہندی۔ اوہدی ساعت لے ٹال لویں راود کجھ کہدی سن۔

موہل دا پے مصطفےٰ موہل نوں بھوں جا اندا ہا۔ پر پیار وچ دے الفاظاں نوں بے ہودگی سمجھدا ہا۔ او حک سیاسی پارٹی دا کارکن ہا۔ اوسار الا مہ سیاست وچ رجھیا راہندا۔ دیگر ویلے موہل کول آ خدا ساں اوہنوں سمجھ نہ آ خدا جو ڈل پاس بھوں موہل کول کے ہیں ڈسے جو کہ غدار کون ہو ہن؟ ہیرو تے دا اصلی ممنکر کون ہے؟ لوگ آپڑیں مفاد دی خاطر کیویں پارٹیاں بدل گھندے نے۔ بجٹ کہ بے تے کیوں پالیسی ملک دے مفاد وچ ہے۔ خارجہ پالیسی کیا ہو ونی چاہیدی ہے۔ او چپ کر کے ہنر ہے تے دہ پچھدا کے چھت نوں گھور راہندا۔

موہل دا رو کر یندا ہی جو او مصطفےٰ توں پچھے۔ تیکوں میڈیاں اکھیں دا رنگ کیہا لگدے۔ میڈیاں پلکاں تلے ہجر دے خواب وسدن۔ ڈس ہاں بھلا۔ او میڈیاں اکھیں وچ وی لے۔ اس ہاں میڈے ہوٹھاں تے ہجوی مسک قلندری ہے اوہدے پچھے کیہڑے جذبے، کیہڑے خیال ہن؟ ڈس بھلا؟ میڈے دل نوں میڈے دل دی دھڑ دھڑ سنیدی ہے اساں مچے سکھ دی چھاں وچ کداں وسوں۔ یا بک دوجے دا دکھڑے کٹھے کیویں چڑھسوں؟ توں میڈے کی کیا کر سکدیں؟ میں میڈے کی کیا کراں؟ پیار دیرہ اڈ کتوں خالی مصطفےٰ وسدہ دکھدی تاں سارے سوالیاں گھن گھن تے اوہدے اندر رم پوندے۔ مصطفےٰ آ تے موہل کول گھن گیا۔ رات تھی تاں اج وی اوں کوئی گالھ کیتے بغیر موہل نوں ہاں نال لا گھدا۔ موہل دے کناں وچ خوشبو دا الا آیا۔ توں بھوں سوہنڑیں ہیں موہل۔ خواباں تے سوچاں توں وی ودھ۔ پر شے توں پیاری۔ موہل بک نویں احساس دے اجھوڑ دے نال الان پے گئے۔ اگلے مہینے موہل امید نال ہئی۔ بک عجب جئے خیال اوہنوں واسطہ گھدا۔ ''ایہ بال دا پیو کون ہے۔ مصطفےٰ یا نویہ؟''

◆◆◆

چھُٹی پیٹی

تسنیم کوثر

مختصر تعارف

تسنیم کوثر 18 فروری کو ساہی وال میں پیدا ہوئیں۔ جہاں سے شادی کے بعد مستقل لاہور منتقل ہو گئیں۔ ان کی اب تک 4 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں "سرگوشی" شعری مجموعہ، پنجابی افسانوں کی کتاب "دے سترنگے" "کہانی ان ڈوں دی" اور "جہاں رحمت برستی ہے" شامل ہیں۔

پورے ویہڑے وچ سامان کھلریا ہویا سی۔ اک پیٹی تے شنیل دیاں رضائیاں تے گدیاں دا ڈھیر پیا سی تے دوجی پیٹی تے گاؤ تکیے، دریاں تے کھیس کھلارے ہوئے سن۔ سامنے پلنگ تے تانبے دے پانڈیاں دی لین لگی ہوئی سی۔ میہاگی دیاں گولیاں تے نم دیاں خشک پتیاں دی ہمک پورے گھر وچ پھیلی ہوئی سی۔ میں ہولی ہولی ایس کھلارے نوں سانبھدی سانبھدی ہف گئی سی۔ میرے بچیاں وچوں کوئی اک وی میرے نیڑے نہیں آیا سی۔ نویں نسل نوں ایہناں پرانیاں چیزاں نال کوئی رغبت نئیں رہی۔

مینوں یاد اے میرے بچپن وچ جدوں میری ماں اپنی چھوٹی جستی پیٹی کھولدی تے ای سارے بہن بھرا بڑے چاؤ نال اس پیٹی دے آلے دوالے کھلو جاندے۔ ماں دیاں سانبھیاں ہویاں شیواں نوں للچائیاں ہویاں نظراں نال تکدے رہندے تے ماں نوں ایہ شیواں ورتن دی ضد کر دے۔ پر ماں بستر، رضائیاں، کپڑے دھپ لوا کے تے فیر ایس پیٹی وچ بند کر دیندی۔ اک واری ماں نے پیٹی کھولی تے میں اوہدی اکھ بچا کے گوٹے دیاں دھاریاں والی لال چنی لکو لئی سی۔ ماں نوں جدوں پتہ لگا تے اوہنے رج کے جھڑکاں دتیاں تے چنی کھو کے فر پیٹی وچ سانبھ دتی اوہنے تے میرے دل دی دھڑکن اوہدی ہلکی سی۔

پر میں سوچدی پئی آں اج کل دے بال ایہناں شیواں ول دھیان ای نہیں دیندے۔ پڑھائی لکھائی تے موبائل دی دنیا نے اوہناں دا دھیان ایس پیٹی تے اوہدے اندر رکھیاں پرانیاں شیواں ول جان ای نہیں دتا۔ جس تے میں وی ایس پیٹی تے ایہدے وچ سانبھے ہوئے سامان توں تنگ آ گئی سی۔ پچھلے کئی ورہیاں توں ایہ پیٹی میرے نال سی۔ جدوں گھر وچ پروہنے آندے یا فیر گل کھلے وچ کوئی خوشی دی ہو جاندی ایہ پیٹی تاں میں کھولدی سی۔ بستر بچھاون لئی کڈھے جاندے تے ورتن توں بعد فیر سانبھ کے رکھ دتے جاندے سی۔ فیر موسم دی دھپ لوان توں بعد چیزاں سانبھ دتیاں جاندیاں سی۔ میں جدوں وی ایس پیٹی نوں کھولدی یاداں دے کئی بوہے تے باریاں آپ ای آپ کھلدے جاندے۔ جنہاں نوں چیتے کر کے میری اکھیاں اتھروآں نال بھر جاندیاں سی۔ ایس ویلے وی میری اکھیاں وچ پانی تے پلکاں تے یاداں دے تارے جھلمل لگ گئے سی تے میں سوچن لگ پئی جنی زندگیاں کنیاں کملیاں ہوندیاں نیں۔ ہر ویلے اکھاں وچ سمندر لئی پھر

ویلاں سن۔ میری اکھاں وچ وی ایس ویلے سندر رنگاں والا ایہو جیہا ویہڑے وچ ڈگی ہوئی رہی سی تے کھلدی بسترے دی اک چھوٹے تے
مینوں ڈاہڈا ادروہ سی۔ جیہڑا عشق ورھے پہلے کتے جانوراں نال میں ایس ہلکے آسمانی رنگ دے پلنگ پوش تے شیڈ والے دھاگیاں نال
کڈھائی کر کے موتے مکمل ہوئے ہائے سی۔ ایسے ورھے گزرن توں وی ایہہ پلنگ پوش تے ایہدی کڈھائی اوسے طرح لشکارے مار دی
پئی سی۔ ایس پلنگ پوش نوں ویکھ کے مینوں لگیا جیویں کوئی میرے سینے وچ برچھی مار گیا اے۔ یاداں دے کئی موتی میریاں اکھیاں وچوں
ڈگے تے میری چیتی وچ جا کے گواچ گئے مینوں چیتے آیا کہ جدوں میں دسویں دا آخری پرچہ دے کے گھر آئی تے میری ماں تے ماسی آسمانی
رنگ دی کاٹن دا تھان کھولی بیٹھیاں سی۔ دوواں نے کاٹن بیونت کر کے پلنگ پوش سرہانے تے کشن وکھرے کیتے تے اگلے دیہاڑے
مینوں شہر دے سب توں چنگے سلائی سکول وچ داخل کرا کے مینوں مارے لاڈ دے پہلاں ای تے میری چنیاں ایس چادر تے سرہانیاں تے پھل
بوٹے کڈھن لگ گئیاں سی۔

اسے سمجھے ویلیاں دی گل ایہہ جدوں گھر گرہستی دی اہمیت ہوندی سی ماواں اپنیاں دھیاں نوں پڑھائی لکھائی دے نال نال گھر
دے کم تے سلائی کڑھائی وی ول سکھاندیاں سی۔ ٹی وی دا جن وی ہجے بوتل توں باہر نہیں آیا سی۔ لوک چھیتی سوں دے تے سویرے چھیتی
جاگن دے عادی سی۔ راتاں نوں دیر تائیں صرف پڑھن لکھن والے لوک ای جاگدے ہوندے سی تے یا فیر اللہ والے رب کریم نال عشق
دے تقاضے جاگدے سی۔ مینوں ایس چادر دی کڑھائی کردیاں ہویا دیر راتیں تیکر جاگن دی عادت ہو گئی سی۔ اپنا ایہہ پلنگ پوش میں کنیاں
ای راتاں جاگ کے کڈھائی کیتا سی۔ سارا محلہ سوں جاندا سی پر میں تے میری دادی راتیں کئی کئی دیر جاگدے رہندے سی۔ میری دادی
نمازاں تسبیحاں کردی رہندی تے میں پڑھ دے تے تسبیح ارشاد کردیاں ہویاں اپنیاں انگلاں نوں تیز تیز چلاندے ہویاں پلنگ پوش دے پھل
بوٹیاں وچ رنگ بھردی رہندی تے نالے میں اپنی خواب ویکھدی آں اکھاں نال دھاگے دے اک اک رنگ وچ اپنیاں سدھراں پروندی
رہندی اپنے دل دے کینوس ای جاوان توں میں ارماناں پھل بوٹیاں وچ ٹانکے تے ایس پلنگ پوش تے کھلاردا سی۔ پورے تن مہینے دی محنت
بعد جدوں ایہہ پلنگ پوش تیار ہویا تے پورے ٹبر وچ میری واہ واہ ہو گئی۔ ماسیاں، چاچیاں، تائیاں میرے ہنر دی تعریف کرن لگ گئیاں۔ او
چنگے ویلے سن اوہدوں لوکی گھرداری تے سلیقے نوں پسند کردے سی۔ اوہ زنانیاں شیواں دے شوقین نہیں سی ہوندے اوہناں دے خیال وچ
گھر دیاں بنیاں ہویاں شیواں گھر دے نال محبت دا رشتہ مضبوط کردیاں نیں۔ اوہناں شیواں نال جڑیاں سدھراں گھر توں وی جوڑے
رکھدیاں نیں۔ میں وی سدھراں نال جڑے سفنے ویکھدیاں ہویاں اپنے داج دیاں ساریاں شیواں اپنے ہتھیں بنائیاں سی تے ویاہ توں بعد
اپنے گھر نوں ہوئے جانوراں نال سجائی سی میں اپنے داج دے پلنگ پوش صوفے دیاں گدیاں تے کانٹے سجا کے خوش ہوندی رہندی سی پر
میری خوشی اوہدوں بھنگ کر کے اڈ جاندی سی جدوں میرا گھر آلا تھکیا ہویا پلنگ پوش تے جا بیٹھدا صوفے دیاں گدیاں اکٹھیاں کر کے
اوہناں نوں سر تھلے رکھ لیندا۔ ایہہ سب ویکھدی تے سڑ کے سواہ ہو جاندی سی۔ اک دو واری میں اوہنوں ماڑے نوں سمجھان دی کوشش وی
کیتی پر اوہنے غصہ کر لیا۔ ایس فیر میں اپنی زبان تے تالے لا لئے۔ روز دی جھک جھک توں بچن لئی چپ کرنا ای چنگا سی۔ گھر سجان والیاں ساریاں
چیزاں سجایاں تے پیٹی وچ سنبھ دتیاں تے اوہدے نال ای میں اپنے کئی خواب وی ایس صندوق وچ بند کر دتے۔ میں اپنا آپ اپنے
گھر والے مطابق ڈھال لیا تے اوہدے ورگی بے رنگی ہو گئی۔ ہن ورھے بیت گئے موسم بدلدے تے میں پیٹی دا سامان کڈھ کے دھپ لواندی تے فیر

سب کجھ سانبھ کے رکھو ہندی سی تے چھوٹی رب نے مینوں دھی دتی سی۔ میں سوچیا کہ ایہہ سب کجھ اوہدے داج واسطے سانبھ دی آں پر اوہدے داج دا ویلا آن تک زمانہ ایڈی تیزی نال بدلیا کہ گھر گرہستی دیاں چیزاں دی قدر ہی مُک گئی اے۔ میں ایہہ سب کجھ چاء نال پتی کھولی تے اوہنوں آکھیا ایہہ ویکھ جیہڑی چیز نوں چاہویں لے لے۔ رضائیاں گدے پسند نہیں کردی، حاشی والی چادر تکیے پسند نہیں تے دکھ دے کرکے پر ایس توں پہلاں کہ میری دھی کجھ بولدی میرا اوہدا منہ ابول پیا۔ حد کردی اے ماں ایس زمانے وچ کوئی نہیں ہتھ نال بنیاں ایہہ چیزاں ورتدا، ایہہ پرانی گلاں ہو گئیاں نیں۔ شیشیاں نوں پسند کردا اے۔ ہن ایہناں گھراں کوئی نہیں لبھدا ایہہ کملا ان دا زمانہ اے۔ عشقی تے پیشی دورا آیا اے میرے پتے بھولیے ماں جی۔

میں اپنے پتر دی گل ان کے شرمندی جہی ہو گئی۔ میں سوچن لگ گئی کہ میرے بالاں دی خاطر وچ میری محنت نال بنائیاں پیڑھیاں سرہانے تے گدیاں دی کوئی قدر نہیں۔ سیانے آکھدے نے۔ جس گھر دیاں دھیاں محبت پیار دی گل نال بھریاں چادریاں نیں چاہندیاں ان دے گھر دے بال کنداں اساریاں چادریاں نیں پر ایس توں زمانے وچ تے سب کجھ ای ریڈی میڈ ہو گیا اے۔ میں سوچیا اس توں پہلاں کی پتہ کر اپنے ہتھ دی محنت نال بنیاں ہوئیاں چیزاں دا مل۔ گھر دیاں دھیاں ہوئیاں چیزاں محبت سدھراں تے چاواں نال بنائیاں چادریاں نیں تے پیار دی بنی ہالی تے پھوکی ہوندی اے وچھوڑ دل شیشیاں طرح۔ اوہناں وچ محبت دا کوئی تروپا نہیں لگیا ہوندا اوہناں نوں سٹن گلیاں دل نوں چنگا نہیں لگدا۔ میں گل دے وچ مندے دے ہوکا بھریا۔ پر میرے دل کرڑا کیتا اپنے ہنجو پونجھے تے اک فیصلہ کر لیا۔ میں اپنی پتی دا سارا سامان صغراں نوں دین دا فیصلہ۔ صغراں دی دھیاں توں میرے گھر جھاڑو پوچے دا کم کردی سی اوہ صرف میرے گھر ای نہیں کئی ہور گھراں وچ وی کم کر کے اپنی دھی دا داج اکٹھا کر رہی سی۔ صغراں میری ایس گل نوں ان کے پہلاں تے حیران ہوئی تے فیر خوشی نال جیویں کھلی ہو گئی۔ صغراں دی خوشی ویکھ کے میریاں اکھاں وچوں ہنجو ڈگن لگ گئے۔ میں صغراں دی خوشی تے نہیں اپنے داج دے نال جڑیاں ارماناں نال دیاں یاداں تے رو رہی سی۔ میں اکھراں دی نہیں سی پر ایہناں سدھراں نال بنائیاں ہوئیاں شیواں کسے ہور دے حوالے کرن لگیاں میرا دل ڈاڈھا دکھن لگ پیا سی تے میرے ہنجو کرن لگ پئے سن۔

◆◆◆

غزل

تسنیم کوثر

ہر جگہ ممکنات کو رکھا
شاخ کے ساتھ پات کو رکھا

دن کے پہلو میں رات کو رکھا
پردے میں اپنی ذات کو رکھا

کر کے گلزار جہاں ویرانہ میرا
دور کیوں شش جہات کو رکھا

حرف ابجد سے لکھتے ہم بھی
اس میں کیوں مشکلات کو رکھا

کیا ہے افسانہ محبت میں
ہر جگہ حادثات کو رکھا

یہ معمہ کسی سے حل نہ ہوا
عقدہ اس کائنات کو رکھا

تقریب کُچھ بھی سہی!
ہمیشہ شاداب
وشگفتہ رہئیے!
Tibet
Tibet

افسانے

وہ ایک ماں تھی

پریتم سنگھ پنچھی

مترجم: حنیف باوا

مختصر تعارف

حنیف باوا 1936ء کو اپنے ننھیالی پاکل نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ یہ 1959-60ء سے مسلسل پنجابی اور اردو میں ادب تخلیق کرتے آ رہے ہیں ان کی اب تک 12 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ معروف ادیب، صحافی اور شاعر اظہر جاوید کی پنجابی کہانیوں کے اردو تراجم کیے جو پچھلے آٹھ سال سے مسلسل تخلیق میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اب کتابی شکل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ اسی سال سب سے بڑا ادبی ایوارڈ "**11**واں تخلیق ایوارڈ **2022**ء" بھی ادارہ 'تخلیق' نے انھیں پیش کیا۔

کوٹلہ پل کے عین نیچے ایک اپاہج لڑکا بیٹھا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کی اس گزرگاہ کے پاس بیٹھ کر ان کے پاؤں کی آہٹ پہچاننے کا عادی ہو گیا تھا۔ بارش ہو یا آندھی، سردی ہو یا گرمی۔ وہ بھی ان موسموں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ موسم آتے اور اپنا اثر دکھا کر چلے جاتے۔ لیکن جب کوئی موسم بدلتا تو اسے ایک جھرجھری سی ضرور آتی۔ گوشت پوست کا یہ انسان لوگوں کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہا تھا۔ جب وہ بھوک سے نڈھال ہو رہا ہوتا تو وہ پل سے نیچے اترنے والے ہر شخص سے امید رکھتا کہ وہ اس کے پاس آ کر رکے گا اور اس کی بھوک کا ازالہ کر کے آگے بڑھے گا۔ لیکن اکثر لوگ اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیتے۔ یہ تمام کسی نہ کسی جلدی میں ہوتے۔ کاروبار کے جھمیلوں میں پھنسے ان لوگوں کو شاید اس کا چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نڈھال اور مرجھایا ہوا سا چہرہ۔

لیکن دھیرے دھیرے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کا اسے گُر آ گیا تھا۔ وہ ٹین کے ایک ڈبے کو پورے زور سے کھٹکھٹا کر، بغیر کسی سُر تال کے کوئی بھجن گا کر راہ گیروں کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ بھجن کے ٹوٹے پھوٹے سروں سے جب وہ "ماں" کا اثر محسوس کرتا تو رحم طلب لہجے میں کہتا۔ "ماں! مجھے بھوک لگی ہے۔ ماں پیاس سے میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔ ماں تو سنتی بھی ہے کیا؟"

اس کی یہ پکار، پل پر چڑھتی ہوئی عورتوں کے پاؤں جیسے جکڑ لیتی۔ صبح ہوتے ہی گوردوارے کو جانے والی گوربانی کا ورد کرتی ہوئی مستورات دیکھتیں کہ جب ابھی رات کی آزردگی ختم بھی نہیں ہوئی ہوتی تو وہ قدرے جلدی بیدار ہونے لگا تھا۔ اس کی آواز میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ سوز پیدا ہو گیا تھا کیونکہ کئی دیوانوں نے اسے ستنام کا جاپ کرنا بھی سکھا دیا تھا۔ صبح کے تازہ اور پرسکون ماحول میں ستنام واہگورو کا ورد ان عورتوں کو بہت اچھا لگتا تو دھیرے دھیرے اس بھکاری کے ہاتھ پر پیسے گرنے لگے۔ لیکن صبح نمودار

ہوتے ہی وہ تمام دکھ درد کو بھول کر ماں کو پکارنا شروع کر دیتا۔ کہتا: ''میری ماں آ رہی ہے۔ بابا بھی آئے گا۔ وہ تمام لوگ گاڑی میں سوار ہو کر آئیں گے۔ نہیں وہ تو مجھے لینے آ رہے ہیں۔۔۔آ۔۔۔!''

پھر جب دور دور سے اسٹیشن سے اچانک کسی گاڑی کی چیخ سنتا تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک در آتی۔ بھویں تن جاتیں۔ اس کی آواز میں اور زور پیدا ہو جاتا۔ ماں آ رہی ہے بابا آ رہا ہے۔ وہ میرے لئے بہت سی چیزیں لائیں گے۔ میری بہن بھی آئے گی۔ میری ماں کے ساتھ اس کا جھنجھنا بھی ہوگا۔ میں اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس لئے اسے وہ اپنے ہمراہ لانا کبھی نہیں بھولے گی۔ پھر جب تھک ہار کر خاموش ہو جاتا تو اس کی آنکھوں سے کھارا پانی ٹپ ٹپ گرنے لگتا۔ لوگوں کی ایک چھوٹی سی بھیڑ اسے گھیر لیتی۔ آپس میں کانا پھوسی کرتے لوگوں کی آواز سے وہ چوکنا ہو جاتا اور ایک معصوم سی مسکراہٹ ان تمام کا سواگت کرتی۔

چند برس پہلے اس کا کٹھور باپ یا مجبور باپ اسے کسی گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ تمام گاؤں کو اس سال ایک سخت قحط نے آ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے ڈھور ڈنگر مرنے لگے۔ کھیتوں میں اناج کی جگہ گھاس پھوس اور بوٹی نے لے لی تھی۔ تبھی روز سے وہ بھوکا پیاسا کسی نہ کسی طرح دہلی کے ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا تھا اور اس روز سے ہی اس نے کوڑا پل کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ صبح و شام کو وہ آنے جانے والی عورتوں میں ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اسے سب سے زیادہ پیار کرنے لگی تھی۔ جب دوسری عورتیں آگے بڑھ جاتیں تو وہ بڑے پیار اور لاڈ سے اس کی پشت پر تھپکی دے کر اس کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال جاتی۔ پہلے وہ اس کے لئے بھنے ہوئے چنے لاتی رہی پھر وہ کبھی پوریاں اور کبھی کوئی اور چیز پکا کر لانے لگی۔ ہر نئی سویر کو اب لوگ اسے صاف ستھرے لباس میں دیکھنے لگے تھے۔ اس کا پانی پینے والا اپنا کٹورا بھی کہیں سے آ گیا تھا۔ اب وہ ننھا لڑکا پہلے سے زیادہ خوش نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کی زردی بھی ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود بھی اسے اپنا گھر نہیں بھولا تھا۔

ماں کو پکارتی ہوئی اس کی آواز پر اداس شام ایک چھپے ہوئے دکھ کی مانند سنائی دیتی۔ دوسرے بھکاری اس سے حسد کرنے لگے تھے۔ اندھیرا چھا جانے پر وہ جب نیند کی آغوش میں جانے لگتا تو کوئی ڈاکو اس کا پانی کا کٹورا اٹھا لیتا۔ کوئی اس کی چادر نوچ کر لے جاتا۔ اچانک آنکھ کھلنے پر وہ چیخ اٹھتا۔ لیکن دوسرے ہی روز جب اجنبی خاتون اس کی خالی جھولی بھر جاتی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ دن گزرنے کے ساتھ اس اجنبی خاتون کے دل میں اس سے ایک انس سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سی سوچیں جنم لیتی رہتیں۔ وہ سوچتی کہ کیوں نہ اس لڑکے کو اپنے گھر لے جائے۔ کیوں نہ وہ اس کی آنکھوں کی روشنی بن جائے۔ ذات برادری اور دیگر لوگ اس کے بارے میں جو سوچتے ہیں سوچتے رہیں۔ لیکن ایک بیٹے کی کمی نے اس کے کلیجے میں جو زخم لگائے ہیں وہ تو بھر جائیں گے نا۔

پاکستان کو معرض وجود میں آئے کافی عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس عرصے میں وہ اپنے بیٹے کو بھلا نہیں سکی ہے؟! اس کا اکلوتا بیٹا ملک کی تقسیم کے وقت اس سے بچھڑ گیا تھا جس کا آج تک کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ جب بھی اسے اپنے بیٹے کی یاد ستاتی تو اس کا دل دہل سا جاتا اور وہ چیخ چلا کر رہ جاتی۔ خوشیوں سے بھرا اس کا گھر جیسے اسے پرایا سا لگ رہا تھا۔ بعض اوقات وہ بہت دیر تک تکیے میں منہ چھپا کر آنسو بہاتی رہتی۔ اس کا خاوند کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر رہتا تھا۔ گھر میں نوکر چاکر اس کے احترام میں کھڑے

رہتے لیکن ان کے اس احترام اور ان کی خاطر داری سے اسے کوئی تحفظ محسوس کرنا اور کجا وہ تو کسی بھی قسم کے سکون کا احساس کرنا ہی بھول چکی تھی۔ جب وہ گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتی تو وہ واہ گورو کا نام لیتے ہوئے ہاتھ میں چھوٹی سی مقدس کتاب پکڑ کر منہ اندھیرے ہی گوردوارے کی جانب چل پڑتی۔ دوسری عورتیں جب چٹکیاں کر کے اپنا اندر ہلکا کر لیتیں تو وہ کوئی بھی بات کرنے کی بجائے ان سے چار قدم آگے یا پیچھے رہ کر ستنام کا ورد کرتی رہتی۔ اس طرح اس کا چت مصروف اور دھیان بٹا رہتا۔ ایک روز اسے بہت بے چینی محسوس ہوئی۔ اس کا جی جیسے بھرے باہر تھا۔ تنہائی سے اسے ایک عجیب سا خوف لگنے لگا تھا۔ ایک روز تو جیسے وہ تمام رات انگاروں پر لوٹتی رہی تھی۔ وہ اپنی تو جیسے سمت ہی بھلا بیٹھی تھی۔ گوربانی کے شبد اس کی زبان پر آتے ہی لڑکھڑا کے اٹک جاتے۔ اس نے وہ تمام رات بجلی کے بلب کی روشنی میں بیٹھ کر گزار دی تھی۔

صبح وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ تیزی سے کپڑے بدل کر تیجا جی گوردوارے کی اور چل پڑی۔ پل پر چڑھتے ہی اس کے قدموں پر یکدم لرزہ سا طاری ہو گیا لیکن وہ حوصلے کو یکجا کر کے پل پر آ گئی۔ نابینا لڑکا سویا ہوا تھا۔ اس نے سوچا آج وہ بہت جلدی آ گئی ہے۔ یہ وقت اس کے بیدار ہونے کا نہیں تھا۔ وہ اسی طرح سویا رہے تو بہتر ہے۔ اس کی گوردوارے سے واپسی پر وہ ضرور اٹھ چکا ہوگا اور واہگورو کا نام جپ رہا ہوگا۔ گوردوارے کے سیوادار ابھی تک گوردوارے کا فرش دھو رہے تھے۔ گورو گھر کی اس پریمکا کے اتنی جلدی یہاں آ پہنچنے پر وہ حیران تھے اور اس کی آواز کو سننے کے مشتاق بھی رہے تھے لیکن وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی گوردوارے کے ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس روز اس نے اپنے من کی شانتی کے لئے گورو جی مہاراج سے دعائیں مانگیں۔ گوردوارے سے لوٹتے ہوئے وہ مصمم ارادہ کر چکی تھی کہ وہ اس یتیم کو آج ضرور اپنے گھر لے جائے گی۔ اس کا پوری طرح خیال رکھے گی۔ اسے دیکھ دیکھ کر جیئے گی۔ رات بھر جاگتے رہنے کی بے زاری کو اس ارادے نے کافور کر دیا تھا۔ اس کے قدموں میں انجانے کی پھرتی آ گئی۔ ابھی .... سر کی اوڑھنی درست کرتی اور کبھی زبان سے پھسلتے ہوئے گوربانی کے مصرعوں کو جوڑتی ہوئی گوردوارے سے اترتے وقت وہ دو ایک بار گرتے گرتے بچی۔ پل سے اتر کر اس نے دیکھا کہ وہ نابینا لڑکا ابھی تک چادر اوڑھ کر سو رہا ہے۔ کہیں وہ بیمار نہ پڑ گیا ہو۔ اس کے من میں تھوڑا سا شک گزرا لیکن دوسرے ہی پل وہ سوچنے لگی کہ رات دیر تک وہ دیگر بھکاریوں کی صحبت میں گھر کر جاگتا رہا ہوگا۔ ایک تو وہ ویسے بھی آسانی سے گھل مل جاتا تھا۔ دوسرے آنکھوں سے معذور اور سیدھا سادہ جان کر کوئی اسے لوٹ لیتا۔ اس اجنبی عورت نے اس نابینا لڑکے کو بڑے پیار سے تھپکا لیکن وہاں تو کوئی اور تھا جو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے منہ پر کوڑھ کے داغ تھے۔ یہ کوئی دوسرا بھکاری تھا جو اس لڑکے کی صاف ستھری چادر میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ وہ یہ سمجھتی رہ گئی کہ وہ نابینا لڑکا کہاں چلا گیا لیکن اس بھکاری نے اپنے پیلے دانت نکوس کر کہا ''ہمارا اینڈ کیوں خراب کرتا ہے۔ ہم سونے کو مانگتا ہے۔''

اس عورت کے منہ سے شاید چیخ نکل جاتی لیکن نہ جانے وہ کیوں حواس باختہ سی ہو کر آگے چلنے لگی لیکن اس کے پاؤں تو آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کو کھنچتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے قدموں پر بھاری پتھر باندھ دیئے گئے ہوں۔ اب تو اس کے ہاتھ سے گوربانی کا گٹکا بھی کھسکتا جا رہا تھا۔

◆◆◆

بھرم

طارق بلوچ صحرائی

مختصر تعارف

12 اگست 1967ء کو ریالہ قصور میں پیدا ہوئے۔ سات کتابیں لکھیں۔ دو افسانوی مجموعوں کو خوب پذیرائی ملی۔ کتاب "سوال کی موت" کو پی۔ ایل۔ ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ "گونگے کے خواب" اس وقت پاکستان میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ہے۔ بانو قدسیہ صاحبہ کی زندگی کی آخری تحریر اسی کتاب کا دیباچہ ہے۔

رات کو خاموشی اور سکوت پسند ہے اور دن کو شور اور ہنگامہ۔ دن کی طلب والے قیامت خیز دھوپ میں بھٹکتے رہتے ہیں اور رات مانگنے والوں کو چاند کا حسن بھی عطا کر دیا جاتا ہے۔ رات کی تاریکی بہت سارے بھرم رکھ لیتی ہے۔ اہل دل جانتے ہیں بھرم سے بڑی کوئی خوبصورتی نہیں۔ زندگی کے ریشمی لمحات کو ممتا کی سلائیوں سے بُنیں کیونکہ ماں کا اپنی اولاد کے ساتھ ایسا تعلق ہوتا ہے جس کا موت کا جلاد بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ رات کی برکھا میں یادوں کی رم جھم جاری ہے اور میں سوچ رہا ہوں خالق کائنات شاید جلال میں ہوگا جس وقت اس نے رات کا اسرار تخلیق کیا ہوگا۔ یہی اسرار رات کا وجود وحدانیت کا نام ہے۔ یہ خاک کے پتلوں کو فرشتوں سے ممتاز کر دیتی ہے یا اسے ان کی طوائف بنا دیتی ہے۔ عطا کو عطا کرنے والے کی مرضی کے مطابق استعمال کرو ورنہ خسارے میں رہو گے اس بات کا ادراک برکت کا مفہوم جاننے والی رات کو حاصل ہے۔ رات کو یاد کرنا بہت پسند ہے رات کہتی ہے اس کو مت بھولنا جس نے اپنے منہ کا نوالہ تمہاری بھوک کی نذر کیا ہو احسانات کو یاد کرنا اندر کے انسان کو زندہ رکھتا ہے۔ اگر ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے محسن کے ذکر کو اپنی نسلوں میں منتقل کرو اور اس کائنات کا سب سے بڑا محسن اللہ رب العزت ہے۔ رات دلوں کو نرم کرتی ہے اور نرم دلوں میں رب خود ہی آن بیٹھتا ہے۔ رات کو اگر آپ ندامت کے آنسوؤں کا عطیہ نہیں دو گے تو وہ مزدور کی خالی جیب کی طرح بھاری ہو جاتی ہے۔ رات کی بزرگی کا اندازہ آپ اس سے بھی کر سکتے ہیں کہ عرش والا اپنے محبوبؐ سے ملنے کی ساعت کا اعزاز بھی رات کو عطا کرتا ہے۔ رات یہ راز جانتی ہے کہ زندگی کا حسن صرف دیوانوں ہی سے سلامت ہے یا ان ہستیوں سے جن کی خون آلود دستار اور سر تو مل جاتے ہیں مگر میت نہیں ملتی۔ رات کو معلوم ہے سرد خانوں میں مُردے رکھے جاتے ہیں اور سرد لہجوں اور رویوں میں مُردہ روحیں۔ یہ اسرار رات ہی جانتی ہے کہ نصاب تبدیل کرنے کے بعد جب لغت بدلی جا رہی تھی اور بے رنگی کو رنگ اور دہشت کا مفہوم دیا جا رہا تھا تو رات نے اپنا تاریک سیاہ آنچل اوڑھ لیا تھا۔ رات جانتی ہے غلطی اور گناہ کا احساس ہی دراصل توبہ ہے اور توبہ کے کھیت میں ہی معافی اور بخشش کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور زندگی کا عارضی ہونا ہی مستقل دکھ ہے وقت کا قفس تم پر جانتا ہے کہ رات کی غذا گہرے سمندر نہیں ندامت کے چند آنسو ہیں جو گرنا اس کی بھوک کو مٹاتے اور سونے خانے آباد کر دیتی ہے۔ رات کی ملکہ

عیب چھپا لیتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے عیبوں کو ڈھونڈنا عیب سے بڑا عیب ہے اور خوبیوں کو ڈھونڈنے والے لوگ ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ رات کی راہیں بھری جاتی ہے کہ رات کی تاریکی میں ہم جتنا اخلاص آسمان کو بھیجیں گے دن کا اجالا اتنی ہی تخلیق زمین پر لے آئے گا۔ ہم مکمل ٹوٹ کر نے ہوئے کواڑ کے قفل ہیں تو پھر اترا ہوا کیسا آزار اتارا ہوا شخص ایسی شان سے ہارتا ہے کہ دن کا سورج احساس ندامت لیے عمر بھر مغموم رہتا ہے۔

میرے ساتھ ایک المیہ ہے کہ مجھے آگہی کا روگ ہے مجھے وہ لوگ اچھے نہیں لگتے جو جیتے جی مر جاتے ہیں۔ جیتے جی مر جانا خودکشی ہے۔ مہذب لوگ خودکشی نہیں کرتے خودکشی موت کو داغدار کر دیتی ہے۔ رب جس کو مقرب کر لیتا ہے اسے مردود نہیں ہونے دیتا شاید اس لیے آج تک کسی درویش نے خودکشی نہیں کی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شاید میں بھی اس بے ہنگم عارضی تھکا دینے والی فعل کرنے والی لاحاصل، غیر مطمئن بھیڑ چال کا حصہ ہوں جسے لوگ زندگی کہتے ہیں۔ جس دور میں موٹے چشمے اور سفید بالوں کا مقید حال وزر ہو یہاں انسانیت بال کھولے ننگے پاؤں گلیوں میں بھاگتی پھرتی تھی۔ کبھی کبھی لگتا ہے میں زندگی کے دائرے میں قید ہوں مجھے دوڑتے جانا ہے اس وقت تک جب تک مجھے روند نہ دیا جائے۔ میرے اندر کچھ بے نام سا ہے کسی نے بلھے شاہ سے پوچھا درویش کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا جو بتایا نہ جا سکے میں نے دوسروں سے اپنا موازنہ کر کے بھی دیکھا ہے۔ موازنہ کی دوڑ میں جیت نہیں ہوتی صرف تھکاوٹ اور ذہنی اذیت ہوتی ہے۔ اس دور کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ایک سفاک، بے حس، بے علم، بے رحم اور جرائم پیشہ دنیا ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ اس کا ثبوت مجھے کل اس وقت ملا جب میں نے فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی کتابوں میں دیوان میر دیکھا اور میت کو تنہا پڑے اور جنازوں کو خاموش دیکھا۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والے ظلم کو اگر آپ اپنے وجود پر محسوس نہیں کرتے تو آپ اشرف المخلوقات نہیں بلکہ ایک بے حس، بے جان، بے حس وجود ہیں۔ ورکاؤ شب پر صبح کی دستک ہونے لگی تھی خنکی اور بڑھ چکی تھی موسم کی اس تبدیلی کی بلائیں پری ابھی آگئی ہے اور میں سوچ رہا تھا گاؤں کے یہ پرانے رسم و رواج اور روایات بھی کیسے عجیب ہیں، پیدائش سے پہلے ہی ان کی نسبتیں طے کر دی جاتی ہیں، اکثر تو اس لیے کہ زمین تقسیم نہ ہو۔ ویسے میں نے یہ اکثر دیکھا ہے کہ زمین جب بٹتی ہے تو دل بھی بٹ جاتے ہیں۔ میری تایا زاد ناصرہ کی نسبت اس کی پیدائش سے پہلے ہی میرے بھائی ساجد کے ساتھ طے کر دی گئی تھی۔ اگرچہ میری ہونے والی بھابی خوش شکل اور خوش مزاج تھی مگر بھائی کو باہر جانے کا جنون تھا وہ باہر جا کر سیٹ ہونے کے لیے کسی غیر ملکی عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر خاندان کی ناراضی سے ڈرتا تھا اس لیے کسی سے اظہار نہیں کرتا تھا کبھی کبھی دبے چھپے الفاظ میں بات بھی کر لیتا تھا۔ اس بات کا علم میری ہونے والی بھابی کو بھی تھا مگر وہ خاموش تھی۔ بس وہ حسرت اور محبت سے میرے بھائی کو دیکھتی رہتی تھی۔ میں اس کے کرب سے واقف تھا میں نے بہت کوشش کی مگر ساجد نہیں مانا۔ وہ اپنے فیصلے پر بضد تھا۔

پھر ایک دن خاندان میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ناصر بھائی نے ساجدہ کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔ تایا جانی اماں اور اس کے گھر والوں نے بھرپور کوشش کی مگر ناصر بضد رہا۔ ہم دونوں گھروں کے درمیان ایک اجنبیت کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ گھروں میں آنا جانا بند ہو گیا مگر ہم رشتہ داری کی وجہ سے تعلق توڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ کبھی کبھی کسی خوشی غم میں ہم دونوں گھرانوں کی ملاقات بھی ہو جاتی تھی مگر اس کے گھر والے ہمارے گھر والوں سے شرمندہ تھے اور پھر ایک دن ناصرہ کی شادی ساتھ والے گاؤں میں ہماری برادری میں ایک زمیندار سے طے کر

دی گئی۔ شادی کا ہنگامہ جاری تھا، بارات آ چکی تھی مجھے ناصرہ کا پیغام آیا مجھے طو جب میں اس سے ملا تو اس نے سب سے چھپا کر مجھے ایک بند لفافہ دیا اور کہا یہ ساجد کو دے دینا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

بارات دلہن کو لے کر واپس جا چکی تھی۔ ناصرہ کے گھر میں ہجر کا دکھ تھا اور اس کے آنسو تھے جو اس کے سرخ کپڑوں پر سے گزر کر بھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ میں ساجد بھائی کو ڈھونڈتا ہوا گاؤں سے باہر برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ ساجد وہاں شرمندہ شرمندہ سا موجود تھا۔ میں نے پوچھا ساجد بھائی تم شادی پر کیوں نہیں گئے۔ سب تمہارا پوچھ رہے تھے۔ وہ زمین کو دیکھنے لگ گیا۔ بولا میں نے ناصرہ کو پہلے ہی بتا دیا تھا شاید ہماری شادی نہ ہو سکے گی میں نے باہر جانا ہے۔ شاید مستقل ہونے کے لیے اس ملک میں شادی بھی کرنا پڑے۔ مجھ میں اپنے گھر والوں کے سامنے انکار کی جرأت بھی نہیں اور پھر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ ہاں ناصرہ کیسے آنا ہوا؟؟ آپ کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ پیغام بتاؤ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ میں نے لفافہ اس کو دے دیا ہے۔ ساجد نے لفافہ کھولا۔ لکھا تھا

"ساجد تم نے کبھی آخری چوڑی ٹوٹ جانے کے بعد کلائی کا دکھ دیکھا ہے؟ محبت کا راز اور نارسائی کا دکھ صرف رات ہی جانتی ہے۔ رات کی خاموش تاریکی ہی جانتی ہے۔ ماتم کا ماتم کیا ہوتا ہے تم بھی جانتے ہو میں تم سے کس قدر محبت کرتی ہوں عمر رواں وقتی ہے جو کسی در پہ آ کر رک جائے ورنہ آدمی ہی کرچیں تھک کر مر جاتا ہے۔ تعلق کمزور پڑ جائے تو لفظ اپنے مفہوم بدل لیتے ہیں۔ تم نے کہا تھا کہ مجھے باہر جانا ہے کیا میرا انتظار کرو گی مجھے برسوں لگ جائیں گے۔ مستقل ہونے کے لیے مجھے وہاں شادی بھی کرنا پڑے گی۔ میں نے تمہیں کہا تھا وصل کی ریل ہجر کی پٹڑی پر نہیں چل سکتی۔ جس کی رگوں میں خون دوڑتا ہو جس کے پاؤں سلامت ہوں وہ بستر کبھی نہیں ہوتا جو ایک جگہ کھڑا پیغامات اور خطوط کا منتظر رہے۔ انتظار کے موسم سے کئی موسم پھوٹتے ہیں۔ ساتھ کی رت بھی اسی موسم سے جنم لیتی ہے جس کی شدت سے کچی قبریں صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتی ہیں۔ انتظار کے بادلوں سے صرف اشکوں کی بارش ہی برستی ہے۔ تم نے پوچھا تھا کہ تم اداس کیوں ہو سنو اداسی وقار کی علامت ہے اور چیخ و پکار گلے شکوے چھوٹے پن کی نشانی ہے۔ میں نے تمہارا خوف ختم کر دیا ہے اور خود ہی انکار کر دیا تاکہ تم پر حرف نہ آئے۔ محبت کے مقدر میں ازل سے قربانی لکھی ہے۔ کہنے کو قربانی قرب کا سبب بنتی ہے جس کو قرب حقیقی عطا ہو گیا سمجھو اس کی قربانی قبول ہو گئی شاید یہ خوش گمانی مجھے بھی ہے۔

اس کھیل میں ہجر اور نارسائی کا کنول ہی کھلتا ہے۔ اگر مزدور کی بیٹی چھپ کر راج کمار کے خواب دیکھ سکتی ہے تو میرے تو خواب بھی اپنے تھے اور انہوں کے ہی دیے ہوئے تھے۔ آج تک کوئی در بھی ایسا نہیں بن سکا جو خوابوں کو روک لے۔ رات اور خاموشی بہت سارے بھرم رکھ لیتی ہے۔ اپنی محبت سے دستبردار ہونا آسان نہیں ہوتا رات بھر ایک کسک جھلکتا رہتا ہے۔ جمال والے رب کی دنیا بدصورت ہوتی جا رہی ہے۔ مال و زر کے لالچ نے اسے بہت بدصورت بنا دیا ہے جب یہ مکمل بدصورت ہو جائے گی تو مٹ جائے گی۔ خدا بڑھ کر جلا دینے والا ہے چلتے ہوئے شعلوں کی وجہ سے ہی آباد ہے اور اس کی خوبصورتی اہل دل سے ہی روشن ہے۔ بھرم کی کائنات ایک بار اجڑ جائے تو دوبارہ کبھی آباد نہیں ہوتی۔ دیکھو میرے انکار نے تمہارا بھرم رکھ لیا ہے۔ یاد رکھو بھرم سے بڑی کوئی خوبصورتی نہیں۔

فقط تمہارا بھرم ——— ناصرہ

◆◆◆

ببلی

نیلما ناہید درانی (کینیڈا)

مختصر تعارف

نیلما ناہید درانی۔۔۔ معروف شاعرہ، افسانہ نگار، کالم نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔۔۔ اردو اور پنجابی زبان میں ان کی 16 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔۔۔ پی ٹی وی کی اناؤنسر، ریڈیو پاکستان کی کمپیئر، پی ٹی وی کی پروگرام ہوسٹ رہ چکی ہیں۔ پاکستان کی پہلی خاتون جو ایس ایس پی کے عہدے تک پہنچیں۔ (PSP) گورنر پنجاب سے فاطمہ جناح ایوارڈ برائے ادب۔۔۔ 2004 میں حاصل کیا۔ وزیراعظم پاکستان سے فاطمہ جناح گولڈ میڈل 2005 میں برائے ادب اور پولیس سروس حاصل کیا۔ ماہنامہ تخلیق سے 1969 سے وابستہ ہیں۔۔۔ سکول کے زمانے سے ہی ان کے مضامین، کہانیاں اور شاعری تخلیق میں شائع ہوتی رہی ہے۔ اپنے لکھنے کا آغاز بھی تخلیق سے کیا۔

ببلی ایک چار سال کی بچی تھی   جو لیہ میں رہتی تھی   لیہ ان دنوں مظفر گڑھ کی ایک تحصیل تھی   ببلی کا والد ایک وکیل تھا۔ وکیل صاحب کی کل چھ بیٹیاں تھیں اور دو بیٹے   دو بیٹے ان کی دوسری حقیقی بیوی سے بھی تھے   بڑی بیوی جسے سب بوبو کہتے تھے   ایک صابر شاکر عورت تھی   اس کو تو اپنے خاوند سے کوئی شکایت تھی نہ معاشرے سے   اس کا سارا دن باورچی خانے میں گزرتا   اور وہ چولہے میں جلتی لکڑیوں کے ساتھ سلگتی رہتی   لکڑی کے چولہے بھی خوب تھے   عورتوں کے دکھ سکھ کے ساتھی   لکڑیوں کی راکھ میں ہزاروں آنسو جذب ہو جاتے   کسی کو خبر ہی نہ ہوتی۔ وکیل صاحب کا سارا کنبہ ایک جگہ ہی رہتا تھا۔ سب رشتے داروں کے گھر قریب ہی تھے۔ اس لیے بچے ایک دوسرے کے گھروں کے صحنوں میں کھیلتے رہتے۔ وکیل کی بھابھی کا گھر بھی ساتھ ہی تھا   اس کی دو بیٹیاں ببلی کی عمر کی تھیں   ببلی اکثر ان کے گھر جا کر ان کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ایک دن ببلی کھیلنے گئی تو روتی ہوئی واپس آئی اور گھر کے صحن میں گر کر بے ہوش ہو گئی   بوبو نے اٹھا کر دیکھا   تو اس کی ٹانگیں خون آلود تھیں   چادر غائب تھی   بچی کو اسی وقت ہسپتال لے جایا گیا جہاں اس سے زیادتی کی تصدیق ہو گئی۔

مجرم وکیل کی سگی بھابھی کا خاوند تھا جو خود بھی دو بیٹیوں کا باپ تھا   اس روز گھر میں اکیلا تھا۔ ببلی کو دیکھ کر شیطان سوار ہوا اور وہ جرم کر بیٹھا۔ پولیس اس کو پکڑ کر لے گئی۔ وکیل کے دوستوں نے ببلی کا مقدمہ لڑا اور مجرم کو دس سال کی قید ہو گئی۔ اب بھابھی اور اس کے بچوں کی کفالت بھی ان کے ذمہ ہو گئی کیونکہ اس کا خاوند جیل میں تھا۔ ببلی صحت یاب ہو کر گھر آ گئی۔ مگر اب وہ ایک ڈری سہمی بچی تھی جو گھر کے

کونے میں پڑی رہتی۔ اسے سکول داخل کرایا گیا تو دوسری لڑکیاں اس کے قریب نہیں آتی تھیں جیسے وہ کوئی اچھوت ہو یا اس سے کوئی جرم سرزد ہوا ہو۔ وہ سکول سے گھر جاتی اور پھر سارا وقت بوبو کے ساتھ چمٹی رہتی۔ گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ اور اس کی بہنیں جوان ہو گئیں۔ سب کے لیے رشتے آنے لگے اور ایک ایک کر کے سب کی شادیاں ہو گئیں۔ بجلی کے لیے جو بھی رشتہ آتا تو یہ سنتے ہی کہ اس کے ساتھ بچپن میں ایک حادثہ پیش آیا ہے۔ لڑکے والے انکار کر دیتے۔ لڑکے کی ماں کہتی۔ میرے بیٹے کی پہلی شادی ہے۔ ہمیں تو کنواری لڑکی چاہیے۔ بجلی اس جرم کی سزا بھگت رہی تھی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا جبکہ اس کی جوانی کی اٹھان ایسی تھی کہ جو کوئی اسے ایک بار دیکھتا۔ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس میں تمام گن تھے جو ایک گھریلو لڑکی میں ہونے چاہئیں۔ وہ خوبصورت تھی، پڑھی لکھی تھی، سگھڑ تھی، سلیقہ شعار تھی۔ اس کے ہاتھ کے پکے کھانوں میں لذت تھی۔ مگر بچپن کا جو داغ اس کے ماتھے پر لگ گیا تھا وہ اس کی سب خوبیوں پر بھاری تھا۔ اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ بوبو کو اس کی فکر تھی۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ آخر ایک بڑے زمیندار کا رشتہ آیا جو شادی شدہ تھا، بچوں والا تھا۔ بجلی سے نکاح تو کرنا چاہتا تھا مگر اسے اپنے گھر لے جانے کو تیار نہیں تھا۔ بجلی کی اس سے شادی کر دی گئی وہ ہفتے میں دو بار آتا۔ اس نے بوبو کے گھر کے ساتھ ہی بجلی کو ایک گھر لے دیا تھا اور باقاعدگی سے ماہانہ خرچہ بھی دیتا تھا۔ بجلی کی ایک بیٹی پیدا ہوئی تو اس نے بھاری رقم ادا کر کے دونوں ماں بیٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ بوبو اس صدمے سے چل بسی۔ کچھ دنوں بعد بجلی بھی بیمار رہنے لگی۔ اس کو کینسر کی تشخیص ہوئی۔ علاج کا خرچہ کون کرتا۔ وہ کینسر کی تکلیف میں تڑپ تڑپ کر اس بے رحم دنیا سے چلی گئی اس کی بیٹی کو ایک خالہ نے گود لے لیا۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2023ء کے انتخاب کے لئے نامزد جج حضرات

ٹیلی فونک مشاورت :	محترم اصغر ندیم سید	محترم غلام حسین ساجد

جج صاحبان کے نام

(1) محترم خالد شریف (2) محترم ڈاکٹر محمد رفیق (3) محترم فرحت عباس شاہ

(4) محترم حمید رازی (5) خاکسار سونان اظہر جاوید

"تخلیق ایوارڈ" کی نامزدگی میں سب سے پہلے اُمیدوار کی ادبی خدمات کو مدِنظر رکھا جاتا ہے پھر پچھلے 55 سال سے اُمیدوار کی ماہنامہ "تخلیق" کے ساتھ وابستگی، قلمی تعاون اور ماہنامہ "تخلیق" کے دائرہ اختیار کو دوستوں تک وسیع کرنے پر دیا جاتا ہے۔ (ادارہ "تخلیق")

مسٹر ٹم

اقبال فیروز

مختصر تعارف

اقبال فیروز کا تعلق چھاؤں کے متوسط گھرانے سے ہے۔ افسانہ نگاری میں ایک مخصوص طرز تحریر ہونا کے باعث ادبی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے افسانے اردو کے کئی میگزین میں شائع ہو چکے ہیں۔ 2014ء میں جنگ عظیم اول کے پس منظر میں ان کا لکھا ہوا ناول ''پس ساحل'' بہت مقبول ہوا تھا۔ چھاؤں میں امپورٹ اور ایکسپورٹ کے کاروبار سے منسلک ہیں آج کل ایک دوسرے ناول کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو جنگ عظیم دوم کے پس منظر میں لکھا جا رہا ہے۔

میں اس بوڑھے انگریز کو اکثر صبح سویرے گرسمندر کے ساحل پہ اور جانے والی بس کے انتظار میں کھڑا دیکھتا تھا۔ لمبے پتلے جسم لمبے قد اور دبلے پتلے چہرے والا یہ شخص بس سٹاپ پہ کھڑے ہر شخص کی توجہ کا مرکز بنا رہتا۔ مجھے کسٹم ہاؤس جانا ہوتا اور وہ راستے میں ہی کہیں بس سے اتر کر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو جاتا۔ اس کی انگلش کسی کو سمجھ آئے نہ آئے وہ اپنے ساتھ کھڑے شخص سے ضرور گفتگو کرتا اور اگر بس میں سیٹ پہ کوئی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا تو دیکھتے دیکھتے انداز میں اس سے بھی اس طرح گفتگو کر رہا ہوتا جیسے وہ اسے برسوں سے جانتا ہو اور اس سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا ہو۔ بہت سے لوگ اس کی باتیں صرف سنتے تھے لیکن کچھ پڑھے لکھے اس کی ہاں میں ہاں بھی ملاتے اور کچھ باتوں کا جواب بھی دیتے۔ ایک دن صاحب بہادر میرے ساتھ کھڑے ہو کر بس میں سفر کر رہے تھے۔ وہ پہلے تو خود کلامی کی کیفیت میں بڑبڑا رہے تھے پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "دادا بھائی میرے بعد دفتر پہنچتے ہیں" "میں ان کے آنے سے پہلے ایل اے ایل کر چکا ہوتا ہوں پھر ترجمے کا کام شروع ہوتا ہے تو کسی کو مجھے ڈسٹرب کرنے کی اجازت نہیں ہوتی" صاحب بہادر کی انگلش بہت آسان اور سیدھی سادی تھی کوئی انگریز تو ایسے بات نہیں کرتا میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "پوچھ سکتا ہوں آپ کس چیز کا ترجمہ کرتے ہیں؟" "میں بندر روڈ پہ دادا بھائی پوپٹ والے کے ہاں کام کرتا ہوں ان کی فرم سندھ گوڈیل امپورٹ کے نام سے ہے میں جرمن زبان کی دستاویزات کا انگلش ترجمہ کرتا ہوں" "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی جرمن بہت اچھی ہے" میں نے ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔ "نہیں ایسا نہیں ہے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میری انگلش بہت اچھی ہے جرمن تو میری مادری زبان ہے"

"اچھا جی" میں نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور لگتا تھا ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے۔ "میرا نام تو کچھ مشکل سا ہے آپ مجھے مسٹر ٹم کہہ کر پکار سکتے ہیں میں جب دفتر میں بیٹھ کر جرمن زبان کا انگلش میں ترجمہ کرتا ہوں تو اونچی آواز میں جرمن لفظوں کو بولتا جاتا ہوں اور انگلش میں لکھتا جاتا ہوں۔ جب کبھی دادا بھائی میرے پاس بیٹھے ہوتے ہیں تو وہ بہت ہنستے ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں کیا جرمن زبان اتنی مضحکہ خیز ہے؟ تو وہ کہتے ہیں نہیں تو دلچسپ ہے بہت دلچسپ" مسٹر ٹم چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔ میں نے دیکھا ان کے چہرے کے تاثرات کچھ بدل سے گئے ہیں بہت دیر بعد

احساس ہوا وہ اصل میں مسکرا رہے تھے۔ کیا آپ کو یہاں جرمنی سے زیادہ گھٹن ہوتی ہے جناب؟ وہاں تو لوگ بہت بڑی بڑی گاڑیوں کو چلاتے ہیں!" "جی درست ہے لیکن میں یہاں ایک عام جرمن سے زیادہ گھٹا ہوا محسوس کرتا ہوں" مسٹر ہم نے انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر دائرہ بنا کر مجھے دکھاتے ہوئے اپنے مطمئن ہونے کا اشارہ دیا۔ ان کا جواب آیا تو ٹھیک سلیک کے بغیر تیزی سے بس کے دروازے کی طرف چل دیے۔ "مگر آپ سے ضرور دوبارہ ملاقات ہوگی" میرے منہ سے حسب عادت چند الفاظ ادا ہو گئے تو وہ اچانک کھڑے ہو کر کہنے لگے "کیوں کیا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے" اور پھر تیزی سے بس سے اتر کر ہجوم میں گم ہو گئے۔ مجھے کچھ شرمندگی تو ہوئی مگر میرے اور ان کے درمیان روایتی اور کچھ کی دیوار استوار تھی جس کے آر پار دیکھنا دونوں کے بس میں نہیں تھا۔ کئی دنوں کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی آج ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایک ہی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کی زبان سے الفاظ کا روپ دھار کر میں بول پاتا "مسٹر ہم کیا آپ نے مجھے پہچانا؟" "نہیں تو میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا آپ کہاں ہو؟ ہم کس نے بتایا؟" "سر میری آپ سے اسی گاڑی میں ملاقات ہوئی تھی آپ جرمنی کے ... ہیں اور ... کے دفتر میں" "اوہ سوری" جرمن الفاظ تھے جن کا مطلب میں ان کے تاثرات دیکھ کر سمجھ گیا۔ "کیا آپ کو جرمن آتی ہے" انہوں نے بے تکلف ہوتے ہوئے میری طرف دیکھا اور میرا جواب آنے تک مجھے گھورتے رہے۔ "بالکل نہیں انگلش اور اردو ہی آتی ہے" "کیا آپ جرمن سیکھنا چاہتے ہیں" وہ اور اپنے کھسک کر میرے قریب آ گئے۔ "ضرور سیکھیں گے" مجھے یہ گمان ہونے لگا جیسے اگر میں جرمن سیکھ گیا تو ان جوڑے جرمن کے چلے جانے کے بعد ... میں ہی ہوں گا۔ "میں سکھاؤں گا۔" مسٹر ہم ادھر سے مسکرایا اس نے جیسے میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا۔ وہ ... جا رہا تھا اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جیب سے ایک چھوٹی سی چٹ نکال کر اس پر کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے صدر میں ایک کمرہ لیا ہے جہاں لوگوں کو جرمن سکھانے کا ارادہ ہے۔ اگر تم چاہو تو مجھ سے جرمن سیکھ سکتے ہو" اس نے کاغذ کا ٹکڑا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں ضرور آؤں گا۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی تھی اور کیا ہوگی کہ میں ان چند لوگوں میں شامل ہوں گا جو انگلش کے ساتھ ساتھ ایک دوسری زبان بھی جانتے ہوں گے" "مجھے خوشی ہوگی لیکن میری دو شرائط ہیں آپ کو اپنے ساتھ دو اور ساتھیوں کو بھی لانا ہوگا اور ہر ماہ تمہیں ... روپے فیس ادا کرنی پڑے گی۔"

یہ تو عجیب سی بات ہوئی میں اپنی ساڑھے چار سو تنخواہ میں سے تیس روپے تو بچا سکتا تھا لیکن دو ساتھی ... بڑا مسئلہ تھا۔ کوشش سے ہر چیز ممکن ہے میں نے دل ہی دل میں سوچا اور مسٹر ہم سے ایک ہفتے کے اندر اندر ملاقات کا وعدہ کر لیا۔ دفتر میں میرے ساتھ دو بنگالی ایک پنجابی اور تین اردو سپیکنگ تھے۔ اس ایک ہفتے کے دوران جتنا ممکن ہو سکا میں جرمن زبان کی خوبیوں میں طرح طرح کے رنگ بھر کر اپنے دوستوں کو قائل کرتا رہا۔ مجھے دو کی ضرورت تھی مگر مجھے تین ساتھی مل گئے۔ جسیم الدین بنگالی، صادق خان فیصل آبادی اور ضیاء الحسن کانپوری۔

منگل کو شام چار بجے ہم صدر میں کیفے جارج کے سامنے والی سڑک عبور کرنے کے بعد دائیں جانب ایک چھوٹی سی گلی کے سامنے پہنچے تو ایک بوسیدہ سے مکان کے اوپر بنے ہوئے سادہ سے کمرے کے باہر مسٹر ہم ٹہل رہے تھے۔ "تم لوگوں نے آنے میں آدھا گھنٹہ دیر کی اس کے بعد ایسا ہوا تو میں تم کو دوبارہ نہیں ملوں گا۔" مسٹر ہم نے بغیر کسی تمہید کے ہمیں اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور پہلا سبق دینا شروع کیا بالکل اسی طرح جیسے پچیس برس قبل استاد اللہ دتہ صاحب نے ایک دو تین سکھانے کے لیے ہمیں پہلا درس دیا تھا۔ اس وقت بھی ہمیں گنتی کے حروف اجنبی لگتے تھے اور آج بھی۔ ایک سے دس تک جرمن کی گنتی جس کا لہجہ درست کرنے کے لیے ہمیں دو گھنٹے لگے۔ اگلے دن تیس تک اور پھر سو تک۔ حروف ابجد سکھانے کے لیے مسٹر ہم کو اتنا سر کھپانا پڑا کہ ہمیں کبھی کبھی یوں لگتا جیسے وہ کلاس چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد وہ انگلش کے ایک لفظ کا متبادل جرمن لفظ بولتے اور ہمیں بار بار اس کی پریکٹس کراتے یہاں ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا

بنگالی شین کو سین اور قبلی آیا وہی جرمن لفظ کا پہلا الف کھا جاتا مسٹر تم اپنی زبان کی اس طرح جنگ پر اس قدر رنج پا ہوتے کہ میز پر مکے مار مار کر اپنے غصہ ٹھنڈا کرتے۔ انہوں نے ایک جرمن لفظ " شائیزے " کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا یہ ایک ایسا لفظ ہے جسے ایک عام جرمن دن میں پچاس سے زیادہ مرتبہ بولتا ہے اس کے بہت سے مطلب ہیں بعض اوقات تو یہ لفظ بلاوجہ ہی بول دیا جاتا ہے اٹھتے بیٹھتے اب تم سب اس کو باری باری بولو۔ ہم سب نے یہ لفظ آسانی سے بول لیا مگر جب جسیم نے اسے شائیزے کی بجائے سائیسے بولا تو مسٹر تم نے سر ہلاتے ہوئے اسے پھر سے بولنے کو کہا لیکن پھر وہی سائیسے۔ "ادھر میری طرف دیکھو" انہوں نے اپنے منہ کو کھولا زبان کو دانتوں سے لگایا اور "شا" کی آواز نکالی اور اس کے بعد پورا لفظ ٹکڑوں میں ادا کیا "شا۔ ای۔ زے" انہوں نے تین مرتبہ اسی انداز میں اپنے چہرے کے زاویے کو تبدیل کیا تو کمرہ صادق خان کے فرشی اسٹائل قہقہے سے گونج اٹھا۔ مسٹر تم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی جو چند سیکنڈ کے بعد سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی چہرے کے نقوش بدلنے لگے تو انہوں نے میز پر مکے مارتے ہوئے جرمن لفظوں کی گردان شروع کر دی" یہ بندیستا ناداش ڈام فاؤل شیم اوس اور نہ جانے اور کیا کیا اگر صادق خان کو ان لفظوں کا مطلب سمجھ آ جاتا تو شاید پنجاب کا گجر مرچ مصالحہ لگا کر بولتا۔ ہم سب نے باری باری مسٹر تم سے معافی مانگی وہ جتنی جلدی آپے سے باہر ہوئے اتنی تیزی سے ہی نارمل ہو گئے۔ سبق آگے بڑھا تو انہوں نے ایک انگلش لفظ "نول" کے جرمن معنی " آپارات " بتائے اور ہم سب کو حسب معمول باری باری اس لفظ کو دہرانے کے لیے کہا یہاں ایک اور تماشہ بن گیا صادق بولتے ہوئے الف کھا جاتا اور اپارات کو پارات بولتا" پھر وہی چہرے کو بگاڑ اور پھیلا کر الفاظ کو ایک مخصوص سانچے میں کسنے کی مسٹر تم کی کوششیں اور صادق خان کی بے بسی۔ "بولو آ۔ پا۔ رات" مسٹر تم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے جیسے اپنی سانس روک لی۔ صادق نے ٹکڑوں میں کئے الفاظ کو بخوبی بیان کر لیا مگر جب پورا لفظ ادا کیا تو الف پھر سے کھا گیا۔ مسٹر تم اس طرح سر پکڑ کر بیٹھ گئے جیسے اب ان کے سر کو اونچا کرنے کے لئے ہم سب کو آگے آنا پڑے گا۔ ایک ماہ گزر گیا ہم نے بہت سے جرمن الفاظ اور فقرے ازبر کر لیے تھے لیکن مسٹر تم کی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں جب بھی الف اور شین کی تکرار سامنے آتی انہیں جرمن زبان رسوا ہوتی نظر آنے لگتی۔ انہیں سخت ٹینشن تھی کہ جسیم اور صادق کا لہجہ درست کیوں نہیں ہوتا اور میں الفاظ جلدی کیوں بول جاتا ہوں وہ مطمئن تھے تو صرف ضیاء سے جس کے الفاظ کی ادائیگی درست تھی۔ ایک شام وہ جسیم سے اتنے بیزار ہوئے کہ سر کو پیٹتے ہوئے باہر نکل گئے اور جب ہم اگلے دن ان کے کمرے کے باہر پہنچے تو وہاں تالا تھا۔ کہاں گئے ہم سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا اور اس کے بعد وہ مکمل غائب ہو گئے۔ اب وہ گرومندر کے حلیب پر بھی نظر نہیں آتے تھے میں ایک شام دفتر سے چھٹی کرنے کے بعد پیدل ہی گھر آ رہا تھا تو راستے میں مجھے مسٹر تم کا خیال آیا اور میں دادا بھائی پوہ والے کے دفتر جا پہنچا وہ وہاں بھی موجود نہیں تھے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ نوکری چھوڑ کر جرمنی چلے گئے ہیں وجہ یہ تھی کہ انگلش ترجمے کے بعد اس میں بہت سے جرمن الفاظ بھی شامل ہوتے تھے جو قابل قبول نہیں تھے دادا بھائی نے غلطی کی نشاندہی کی تو بگڑ گئے۔ مجھے ان کے اس طرح چلے جانے کا دکھ تھا کیا اس کے ذمہ دار ہم تھے یا ان کا ذہن جو اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ کسی ملک کی زبان تو سیکھی جا سکتی ہے مگر اس کے لب و لہجہ سے مطابقت اختیار کرنی بہت مشکل ہے۔

◆◆◆

Tell Tale Heart (E.A.Poe)

دل بیتی

ترجمہ نگار: ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

مختصر تعارف

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال 15 سال کی عمر میں ہی بصارت سے محروم ہو گئے لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ لاہور میں نابینا افراد کے ایک سکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر میٹرک، ایم۔ اے انگلش، ایم اے اردو اور پی ایچ۔ ڈی عام تعلیمی اداروں سے کی۔ انھیں پاکستان کے پہلے نابینا ایم۔ اے انگریزی کرنے والے فرد اور پہلے لیکچرار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اردو، انگلش، پنجابی اور فارسی میں 10 کتب شائع ہو چکی ہیں۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی کئی کتب آ چکی ہیں۔ اب تک 24 سے زائد کتب قارئین کی نذر کر چکے ہیں۔ حکومت پاکستان نے حال ہی میں تمغۂ امتیاز سے نوازا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں پریشان تھا، بہت ہی پریشان، میں پریشان تھا بھی اور اب بھی ہوں، لیکن کیوں! شاید آپ مجھے دیوانہ کہیں، شاید مجھے بیماری لاحق تھی، جس نے نقصان دینے کے بجائے میری حسیات کو تیز کر دیا تھا، میری سننے کی قوت حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی تھی، مجھے ہر چیز جو زمین و آسمان میں ہے سنائی دینے لگی تھی، یوں لگتا تھا جیسے میں جنت اور جہنم کی تمام آوازیں سننے لگا تھا۔ تو کیا میں دیوانہ ہوں لیکن میں تو آپ کو ساری کہانی بڑے سکون سے سنا سکتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں، بالکل معلوم نہیں کہ یہ خیال مجھے کیسے آیا۔ میں نے ایک بار سوچا اور پھر یہ خیال دن رات مجھ پر غالب ہو گیا۔ کوئی مقصد بھی نہیں تھا اور نہ کوئی جذباتی واقعہ۔ مجھے تو بوڑھا آدمی بہت پسند تھا، اس نے مجھے کبھی ذرا بھر تکلیف بھی نہ دی تھی۔ نہ کبھی میری بے عزتی کی تھی۔ مجھے اس کی دولت سے کوئی سروکار نہ تھا، ہاں مجھے یوں لگتا ہے سارا مسئلہ اس کی آنکھ کا تھا، ہاں! یہی بات تھی۔ مجھے اس کی آنکھ گدھ جیسی لگتی تھی۔ زرد نیلی آنکھ جس پر جھلی چڑھی ہوئی تھی، جب کبھی مجھ پر اٹھتی تو میرا خون منجمد ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس بوڑھے کو جان ہی سے مار دوں اور یوں مجھے اس کی آنکھ سے نجات مل جائے گی۔ یہ بات تھی، تم مجھے پاگل کہو گے، پاگلوں کو تو کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا، آپ مجھے دیکھیں گے کہ میں نے کس چابک دستی سے سارا منصوبہ بنایا، کتنی دوراندیشی کا ثبوت دیا اور کس طرح اسے عملی جامہ پہنایا۔ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کے لئے میری ساری ہمدردیاں ختم ہو گئی تھیں، ہر رات، ہر آدھی رات میں اس کے دروازے کی چٹخنی کو توڑتا اور دروازہ کھول لیتا۔ میں یہ سب کچھ بڑی آہستگی سے کرتا اور جب میں نے اس میں ایک سوراخ بنا لیا اس میں سے میں اندر جھانک سکتا تھا۔ میں نے ایک لالٹین تھام لی، اس لالٹین سے روشنی ادھر ادھر نہیں پھیلتی

تھی اور پھر میں اپنا سر بھی ابھرے جا سکتا تھا۔ اگر آپ دیکھتے تو چلتے چلتے کہ میں کتنی پھرتی سے اندر گھس جایا کرتا تھا اور بوڑھے آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور وہ سوتا رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے میں سر ڈالنے میں مجھے کوئی گھنٹہ لگ جاتا تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ بوڑھا کیسے سویا ہوا ہے اور اس نے اپنا سر کیسے رکھا ہوا ہے۔ آپ ہی کہیے! کہ سب باتیں کسی دیوانے کو سوجھ سکتی تھیں؟ یہ ایک دیوانہ کا فرزانہ ہو سکتا تھا! جب میرا سر کمرے کے اندر گھس جاتا تو میں لالٹین کو ذرا سا ہٹا دیتا اور ایک مہین سی روشنی بوڑھے کی گدھ جیسی آنکھ پر ڈالتا۔ میں ایسا مسلسل سات راتیں کرتا رہا اور ہر رات کو جب آدھی رات گزر جاتی تو اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کہا نا مجھے بوڑھے آدمی سے کوئی دشمنی نہیں تھی بس اس کی آنکھ سے بیر تھا۔

ہر صبح کو میں کمرے میں چلا جاتا اور بوڑھے آدمی سے باتیں کرتا اور پوچھتا کہ اس نے رات کیسے گزاری۔ بوڑھا آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کیا چال چل رہا ہوں۔ جب آٹھویں رات آئی تو میں کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہو گیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور میں نے یہ سب کچھ بڑی پھرتی سے کیا۔ دراصل مجھے اس وقت تک معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کتنا باصلاحیت ہوں، کتنا ذیرک ہوں۔ میں بہت ہی خوش تھا۔ میرا انداز فاتحانہ تھا۔ میں سوچ کر ہنسنے لگا۔ مجھے لگا کہ جیسے اس نے میری ہنسی سن لی ہو کیونکہ بستر پر اس نے کچھ حرکت سی کی تھی جیسے وہ چونک گیا ہو۔ میں ذرا پیچھے ہٹ گیا لیکن کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ دروازے پوری طرح بند تھے کیونکہ بوڑھا چوری چکاری سے ڈرتا تھا۔ اچانک میرا انگوٹھا ایک ٹین پر لگا۔ بوڑھا آدمی اپنے بستر پر چونک کر بیٹھ گیا اور چیخا "کون ہے" میں خاموش رہا۔ کچھ بھی نہیں بولا۔ ایک گھنٹے تک میں نے اپنے تمام اعصاب کو بے حس رکھا۔ وہ ابھی بستر پر بیٹھا تھا کہ مجھے ایک کراہنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے لگا کہ یہ کوئی خوف زدہ انسانی آواز ہے۔ یہ کوئی درد کی آواز نہیں تھی یہ تو روح سے پیدا ہونے والی چیخ تھی۔ میں آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ تو بوڑھے کی آواز تھی۔ میں بھی کچھ خوف زدہ سا تھا لیکن میں مسکراتا رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ بہت دیر سے جاگ رہا تھا۔ اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا "یہ تو ہوا کی آواز ہے" یا کسی چوہیا کے چلنے کی آواز یا کسی جھینگے کی آواز۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے تسلی نہ ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ موت اس کے بہت قریب تھی۔ یہ بے وجہ خوف کا پرتو تھا۔ اس نے اس کو سنا تھا نہ دیکھا تھا۔ میں نے بہت دیر انتظار کیا۔ بڑے صبر و سکون کے ساتھ۔ مجھے لگا کہ شاید وہ لیٹ گیا ہے۔ میں نے لالٹین کو ذرا سا کھولا۔ آپ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے یہ سب کچھ کس طرح چپکے چپکے کر لیا۔ ایک تھوڑی سی شعاع باہر آئی اور بوڑھے کی آنکھ پر پڑی۔

یہ بالکل کھلی ہوئی تھی۔ میرا غیض اس کو دیکھ کر اور بڑھ گیا۔ میں نے اسے دیکھا ایسا لگا کہ اس کے اوپر ایک پردہ ہے۔ میری ہڈیاں لرز اٹھیں۔ مجھے کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ میں نے بوڑھے کا چہرہ دیکھا نہ جسم۔ بس میری لالٹین کی شعاع اس "ملعون دھبے" پر پڑی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ حسیات کی بہت زیادہ پھرتی ہی تو دیوانگی ہوتی ہے۔ مجھے لگا کہ میرے کانوں کو ایک دھیمی سی بے کیف اور خفیف سی آواز چھو رہی ہے۔ جیسے کہ کسی کپڑے میں لپٹی گھڑی کی ٹک ٹک ہو۔ میں اس آواز کو خوب پہچانتا تھا۔ یہ بوڑھے کے دل کے دھڑکنے کی آواز تھی۔ مجھ میں جوش پیدا ہو گیا۔ میرا غیض و غضب اور بڑھنے لگا۔ لیکن پھر بھی رکا رہا اور خاموش رہا۔ میں نے اپنا سانس تک روک لیا۔ میں نے لالٹین بھی ہلنے نہ دی اور لالٹین کی شعاع باقاعدہ اس کی آنکھ پر پڑتی رہی اور اس کے دل کی دھڑکن اور زیادہ بڑھنے لگی۔ اور تیز ـــــ اور تیز ـــــ اور بلند ـــــ اور بلند۔"

یقیناً بوڑھا بہت خوف زدہ ہو گیا ہوگا، مجھے یوں لگا کہ اس کے دل کی دھڑکن ہر لمحہ بلند تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میری پریشانی بھی اور بڑھتی چلی جا رہی تھی، یہ آدھی رات کا وقت تھا اور گھر میں موت کی سی خاموشی تھی لیکن دل کی دھڑکن کا شور مجھ میں ناقابل برداشت خوف پیدا کر رہا تھا۔ میں چند ساعت کھڑا رہا۔ دل کی دھڑکن اور تیز ہوتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس سے میری پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں ہمسایہ اہل محلہ نہ سن لیں۔ بوڑھے کی موت کا وقت قریب آ چکا تھا۔ میں نے لالٹین پھینک دی اور کمرے کے اندر چھلانگ لگا دی۔ بوڑھے کی چیخ بلند ہوئی، صرف ایک بار ہی وہ چیخا۔ میں نے کھینچ کر اسے فرش پر پھینک دیا اور چارپائی اس کے اوپر گرا دی اور پھر فاتحانہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی۔ میں نے کارنامہ سرانجام دے دیا تھا لیکن کئی منٹ تک میرا دل دھڑکتا رہا۔ میں پریشان نہیں تھا بوڑھے کا دل دھڑکتا رہا اس کی دھڑکن دیوار کے پار نہیں جا سکتی تھی۔ آخر کار یہ دھڑکن بند ہو گئی۔ میں نے بستر ہٹایا اور اس کی لاش کو غور سے دیکھا، وہ پتھر بن چکا تھا۔ میں نے ہاتھ اس کے دل پر رکھ دیا اور کئی منٹ رکھا۔ اس میں کوئی حرکت نہ تھی، وہ مر چکا تھا، میں خوش تھا کہ اس کی آنکھ اب مجھے پریشان نہیں کرے گی۔

اگر آپ مجھے اب بھی پاگل سمجھیں تو یہ غلط بات ہوگی کیونکہ میں نے پوری احتیاط سے کام لیا اور اس کے جسم کو چھپا دیا۔ رات بڑھتی گئی اور میں تیزی سے اور چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہا۔ پہلے تو میں نے لاش کے ٹکڑے کئے۔ میں نے اس کا سر کاٹا، بازو کاٹے اور پھر ٹانگیں۔ پھر میں نے خوشی سے تین تختے اٹھائے اور ان ٹکڑوں کو ان کے اندر ڈال کر بند کر دیا۔ میں نے تختوں کو اتنی مہارت سے اپنی جگہ پر رکھا کہ کوئی انسانی آنکھ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے پاس دھونے کے لئے بھی کچھ نہیں تھا، ہاتھ پر کوئی دھبہ نہیں تھا۔ لیکن میں نے ہر طرح تسلی کر لی تھی۔ جب میری یہ مشقت تمام ہوئی تو صبح کے چار بج چکے تھے لیکن ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا پھر ایک گھنٹی بجی۔ ایک دستک ہوئی میں نیچے گیا۔ بڑے بشاش بشاش انداز میں میں نے دروازہ کھولا۔ تین آدمی داخل ہوئے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ پولیس کے آفیسر ہیں انہوں نے بتایا کہ کسی اہل محلہ نے ایک چیخ سنی تھی اور انہیں اطلاع دے دی تھی چنانچہ وہ صورت حال کا جائزہ لینے آئے ہیں۔ میں مسکرا کر انہیں ملا، مجھ میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا، میں نے انہیں خوش آمدید کہا، میں نے کہا یہ چیخ تو میری اپنی تھی جو سوتے میں بلند ہوئی ہوگی۔ میں نے انہیں بتایا کہ بوڑھا آدمی تو گاؤں گیا ہوا ہے۔ میں نے انہیں سارے گھر کا چکر لگوایا۔ میں نے کہا تلاش کر لو، خوب تلاش کر لو۔ میں انہیں اس کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے انہیں اس کی تمام چیزیں دکھائیں جو محفوظ تھیں، کسی نے چھیڑی تک نہیں تھیں۔ جوش ہی جوش میں میں کرسیاں بھی اندر لے آیا اور انہیں بیٹھنے کو کہا اور میں نے اپنی کرسی اس جگہ پر رکھ دی جس کے نیچے بوڑھے کی لاش کے ٹکڑے مدفون تھے۔

پولیس آفیسر مطمئن ہو گئے۔ میرا انداز گفتگو ہی ایسا تھا کہ انہیں مطمئن ہونا پڑا۔ میں بھی پرسکون تھا وہ بیٹھ گئے اور ان کے سوالوں کا ہنس ہنس کر جواب دیا پھر وہ اپنی گھریلو باتوں میں لگ گئے۔ لیکن پھر کیا ہوا میرا رنگ اڑ سا جانے لگا۔ میں نے چاہا کہ وہ چلے جائیں میرے سر میں درد ہونے لگا مجھے لگا کہ میرے کانوں میں گھنٹیاں بج رہی ہیں لیکن وہ بیٹھے رہے، خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ میرے کانوں میں گھنٹیاں اور تیز ہو گئیں۔ میں نے چاہا کہ میں خوب باتیں کروں تاکہ میرا انجانا خوف ختم ہو جائے لیکن یہ خوف بڑھتا گیا۔ بڑھتا ہی گیا اور پھر مجھے یوں لگا کہ شور میرے کانوں کے اندر نہیں تھا بلکہ باہر تھا۔ میرا چہرہ زرد پڑ گیا میری باتوں کی آواز اور تیز ہو گئی۔ میں بلند آواز میں بولنے لگا۔ آواز تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ میں بے بس ہوا چلا جا رہا تھا اور پھر مجھے یوں لگا کہ یہ آواز سی ایسی گھڑی کی آواز ہے جو کپڑے میں بند ہو۔ میں ہانپنے لگا، میرا

سانس بند ہوتا جا رہا تھا لیکن پولیس والوں کو کوئی اندازہ ہی نہیں تھا کیونکہ میں جو بھی تیز اور دروازہ والا میں باتیں کرتا جا رہا تھا مگر شور شرابہ کرنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ بڑھتا ہی جا رہا تھا میں کھڑا ہو گیا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی وضاحتیں کرنے لگا۔ اشارے کرنے لگا، ہاتھ پاؤں ہلانے لگا لیکن شور کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا آخر یہ پولیس والے کب تک دیکھتے رہیں گے؟ آپ جائیں گے؟ میں اٹھ کر ادھر ادھر چکر لگانے لگا اور مجھے ایسا لگا کہ میرا خون کھولتا جا رہا تھا، شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ''اے میرے مولا میں کیا کروں'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلنے لگی میں دیوانہ وار قسمیں کھانے لگا، میں نے وہ کرسی الٹا دی جس پر میں براجمان تھا لیکن شور بڑھتا جا رہا تھا۔ گھنٹیوں کا شور زیادہ سے زیادہ بلند تر ہوتا جا رہا تھا پولیس آفیسر آرام سے بیٹھے ہنس رہے تھے مسکرا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ آوازیں سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ سب لوگ بہرے ہو رہے تھے۔ شاید وہ مجھ پر شک کر رہے تھے شاید وہ سب سمجھ جاتے تھے اور صرف میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میں سوچنے لگا میں نے کہا کہ اس کرب سے بہتر تو یہ ہے کہ جو قیامت ٹوٹنی ہے ٹوٹ جائے۔ اس بوڑھے کے مذاق سے جو سب سے بڑا دکھ بھی کم ہوگا۔ میں ان مکاروں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ مجھے چیخ اٹھنا چاہیے اور مر جانا چاہیے۔ سنو! آوازیں کتنی تیز ہیں۔ بڑھتی جا رہی ہیں۔ میں چیخ اٹھا ''بدمعاشو! زیادہ مکاریت اب میں اعتراف جرم کرتا ہوں کہ میں نے بوڑھے کو قتل کیا ہے۔ ان تختوں کو اکھاڑو یہاں سے، یہاں سے۔'' یہ سارا شور اس کے دل کی دھڑکن کا ہے۔

◆◆◆

رشحاتِ قلم

غیر مطبوعہ (جنوبی افریقہ سے)

ڈاکٹر سید جاوید سبزواری

آج ہم جنوبی افریقہ کے ایک علاقے بوسوتھو دیہات گئے جہاں آج بھی سولہویں صدی عیسوی میں سوتھو قبیلے کے لوگوں کے رہنے سہنے کے انداز، ان کی ثقافت، ان کا نظام عدل، تہواروں پر موسیقی و رقص کی محافل کا انعقاد اور ان کے کھانے پینے کے طریقوں کے بارے میں لوگوں کو بتایا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی خوراک میں مکئی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ عدل کے حوالے سے ان کے سردار یا چیف کے فیصلے کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ چیف کو ایک مشیر کی سہولت بھی حاصل تھی۔ سولہویں صدی میں چیف اور مشیر کیسے بیٹھا کرتے تھے اس کا ایک انداز ہمیں دکھایا گیا۔ میری بائیں طرف چیف جبکہ ان کے ساتھ ان کے مشیر بیٹھے ہیں۔ بوسوتھو گاؤں میں سوتھو قبیلے کے چیف کا لباس گائے کی کھال ہوتی تھی۔ وہ گھر میں اسے پہن کر رہتا تھا جبکہ قبیلے کے دوسرے افراد اپنے بدن پر صرف جانور کی کھال سے بنا جانگیہ پہنا کرتے تھے۔ چیف کو جب کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا یا دوسرے قبیلے کے سردار اس سے ملنے آتے تو وہ شیر یا چیتے کی کھال زیب تن کیا کرتا تھا۔ ایک ہاتھ میں اسلحہ اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی ہوتی تھی جو چیف کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ بوسوتھو گاؤں میں ہمیں چیف کا لباس پہنا کر سولہویں صدی کے دور کی یاد تازہ کی گئی۔

ہیروشیما

حمید رازی

مختصر تعارف

حمید رازی سرائے عالمگیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو صدارتی ایوارڈ تمغہ برائے حسن کارکردگی 2023 مل چکا ہے۔ آپ مختلف سرکاری عہدوں پر تعینات رہے۔ لکھنے لکھانے کا آغاز 80ء کی دہائی میں کیا۔ آپ کی کئی کتابیں، متفرقات، تراجم اور ناول چھپ چکے ہیں۔

ریل گاڑی ہیروشیما اسٹیشن کے باہر آ کر رک گئی تھی۔ میرا دھیان اٹھتر برس پیچھے چلا گیا۔ 6 اگست 1945 کو رات بارہ بج کر پچیس منٹ پر ہوائی حملے کی وارننگ دی گئی تھی۔ پورا شہر جاگ رہا تھا۔ دو بج کر دس منٹ پر خطرہ ٹلنے کے سائرن بجا دیے گئے۔ آدھا شہر سویا اور آدھا نیند کو آنکھوں میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ سات بج کر نو منٹ پر ایک بار پھر ہوائی حملے کے خطرات منڈلانے لگے لیکن سات بج کر اکتیس منٹ پر یہ خطرہ ٹل گیا۔ مجھے تین بمبار بی۔ 29 کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ان جہازوں میں "اینولا گے" کی جیب میں "لٹل بوائے" تھا۔ دوسرے بمبار دیکھ بھال اور تصویریں کھینچنے کے مشن پر تھے۔ صبح آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر جب حملے کی وارننگ ابھی دی جانی تھی، ہیروشیما پر دنیا کا پہلا ایٹم بم گرا دیا گیا۔ یہ بمبار جہاز "Tinian" جزیرے سے اڑے تھے جو ہیروشیما سے تیرہ سو کلومیٹر کی مسافت پر تھا اور ابھی بے خبر تھا کہ وہاں سے اڑنے والے جہازوں نے ہیروشیما پر کیا قیامت ڈھا دی ہے۔ ٹرین اسٹیشن پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ ہوٹل ہیروز ان پہنچنے تک میں ہیروشیما کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ شہر دریائے "اوتا" کے ڈیلٹا سے وجود میں آیا۔ کوئی چار سو سال پہلے تری موٹو موری نے جو اس علاقے کا وائسرائے تھا، یہاں ایک قلعہ تعمیر کروایا اور اس کا نام ہیروشیما رکھا۔ ایڈو زمانے (1630-1867) میں لوگوں نے دریا سے تھوڑی زمین اور چھین لی، یوں اس کی حدیں اور پھیل گئیں۔ میجی دور (1868-1912) میں اس نے فوجی چھاؤنی کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہاں سے افواج دوسرے ممالک کو بھیجی جاتی تھیں۔ چین جاپان لڑائی (1894-1845) اور روس جاپان لڑائی (1904-1905) میں ادھر سے ہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ یہاں بہت سے سکول بھی کھولے گئے، یوں ہیروشیما علمی اور فوجی شہر کہلانے لگا۔ ہم امن پارک پہنچے تو 6 اگست 1945 کی طرح موسم صاف تھا۔ میوزیم میں جانے کے لیے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہوں تو دو ہیروشیما نظر آتے ہیں، ایک ایٹمی دھماکے سے پہلے کا اور دوسرا دھماکے کے بعد کا۔ "اینولا گے" کو "لٹل بوائے" گراتے ہوئے ایک بڑی سکرین کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ اس دن شہر میں کوئی لگ بھگ ساڑھے تین لاکھ افراد موجود تھے، جن میں چالیس ہزار فوجی تھے اور آٹھ ہزار طالب علم بھی ضروری امور سرانجام دے رہے تھے۔ "Prefectureal Industrial Promotion Hall" اب "Atomic Bomb Dome" کہلاتا ہے۔ اس کے مشرق کی جانب ایک ٹی شکل کا پل ہے جو پورے شہر کو ملاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پل کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ قریب ہی شیما ہسپتال بھی

ہے۔ ایٹم بم اس ہسپتال پر کوئی چھ سو میٹر اوپر پھٹا تھا۔ پہلے ہسپتال سے کوئی تین سو میٹر جنوب کی جانب ہے۔ ایٹم بم پھٹنے سے جو آگ کا گولہ بنا تھا وہ سورج سے دس گنا زیادہ روشن تھا۔ آگ کے اس گولے نے ہر طرف تابکاری لہریں پھینکی تھیں۔ دسمبر 1945ء تک کوئی ایک لاکھ چالیس ہزار افراد مر چکے تھے۔ ان میں کوریا اور چین کے کچھ افراد بھی شامل تھے۔ ایٹم بم کے لیے امریکہ نے ہیروشیما کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ یہاں اتحادی جنگی قیدی نہیں ہوں گے۔ امریکہ کا اندازہ غلط نکلا۔ اس حملے میں دس امریکی قیدی بھی مارے گئے۔ آگے بڑھے تو ایک مقام پر سکول کے بچوں کے جلے ہوئے یونیفارم پڑے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ایک جاپانی عورت کے آنسو اس کے قابو میں نہ رہے۔ ٹوٹی دیواریں، ادھ جلے دروازے اور کھڑکیاں بھی وہاں رکھی گئی ہیں۔ گھر کے برتن بھی نظر آتے ہیں جو بھسم ہو گئے تھے۔ شیشے کے گلاس بھی پگھلے پڑے تھے۔ لوگوں کے کپڑے، کتابیں اور گھڑیاں بھی موجود تھیں۔ بم پھٹنے کے بعد یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ یہاں پچھتر سال تک کوئی فصل نہیں اگ سکے گی۔ یہاں کے اخبار یہ مناظر بھی دکھاتے رہے اور ساتھ ساتھ بحالی کے کاموں پر بھی روشنی ڈالتے رہے۔ جلے ہوئے ٹین بکس، آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر رکی ہوئی گھڑی، ریڈ کراس کوارٹر کی تباہی کا منظر، تین گھنٹے بعد پھٹنے والے کالے بادل، اُشیما ہسپتال کی تباہی، تباہ شدہ چرچ، تین منزلہ ہیروشیما گیس کمپنی کے کھنڈرات، دراکو ہوا کو یاما ڈیپارٹمنٹل سٹور، واچ شاپ کی ٹیڑھی دیواریں، مڑی ہوئی ریل پٹریاں، ٹیڑھی میڑھی لوہے کی سیڑھیاں، سڑکوں پر ایٹم بم کے سائے، عورتوں اور مردوں کے جلے ہوئے کپڑے، سیڑھیوں پر جم گیا بندے کا سایہ، زندگی کی بازی ہارنے والوں پر بیٹھی مکھیاں اور سڑی لاشیں۔ یہ وہ مناظر ہیں جو آپ کو میوزیم کے اندر جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے کی پینٹنگز بھی موجود ہیں۔ یہ پینٹنگز ان لوگوں نے بنائی ہیں جو اس آگ کے دریا سے بچ نکلے۔ ''ہیروشیما ریلوے اسٹیشن اور ڈاکخانے کے سامنے گری ہوئی عمارت میں سے ایک عورت لوگوں کو بلا رہی ہے۔'' (فوروکاوا عمر چونتیس سال 1945ء)۔ ''6 اگست کو ایک سال تین مہینے کا مرنے والا بچہ''، ''اس کی راکھ سات دنوں بعد ملی (ڈیکو اور چیکو)'' ''جلے گھر میں چھپنے اس بچے کے لیے کچھ کرو''۔ (سیکے سوبی، عمر اکتیس سال 1945ء) ''ڈیپارٹمنٹ سٹور میں آگ کے شعلے'' (ہوادا وائی، عمر انتیس سال 1945ء) ''کالے بادل، بم پھٹنے کے بعد کالے بادل برسنے شروع ہو گئے، بہت سے لڑکیوں کی ایک ٹولی، جن کے کپڑے پھٹ گئے تھے، بچاؤ کے لیے اپنے سکول کی طرف بھاگ رہی ہے۔ ایک ماں جس کی آنکھیں اُبل گئی تھیں، بچے کو اپنے ہاتھوں میں لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک بچہ اپنے مردہ بھائی کو پکار رہا ہے۔ ایک طالب علم جس کے سر کے بال اُڑ گئے تھے۔'' (تاکاڑا کی شیرو عمر چالیس سال 1945ء) ''ایک ماں ـــــ میں اپنے مردہ بیٹے کو کہاں دفناؤں۔'' (کوزو عمر تیس سال 1945ء) ''ایک کار میں آدھی اندر آدھی باہر مری عورت'' (جن جی عمر چھیالیس سال 1945ء) ''مری عورت کے ہاتھ میں بچی، یوراکا سنگ مشن کے قریب کا منظر'' (یاسو عمر ستر سال 1945ء) ''آسمان کی جانب اٹھا ہاتھ جس میں سے دھواں نکل رہا ہے'' (تویوکو عمر اٹھارہ سال 1945ء) ''ایک ماں اپنے بے سر بچے کو اٹھا کر بھاگ رہی ہے'' (مسلو)

میوزیم میں آگے بڑھے تو انڈونیشیا کے امیر اللہ نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ ''پاکستان، پاکستان'' میں نے دیکھا یہ ان ممالک کے جھنڈے تھے جو اتحادی قوت میں پھنسے تھے۔ یہ سارے منظر دیکھنے کے بعد مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں رو دوں یا ـــ میں نے شکریہ ادا کیا اور ان جھنڈوں کی تصویر بنائی۔ میوزیم میں رجسٹر بھی رکھے گئے ہیں جہاں لوگ اس سانحہ کے بارے میں کچھ لکھ بھی سکتے ہیں۔ میں نے ایک رجسٹر پر لکھا ''یہ سارا کچھ بہت دردناک اور دکھوں بھرا ہے۔'' دوسرے پر لکھا ''یہ اتنا خوفناک اور دردناک ہے کہ اب بھی آنسو نکل آتے ہیں۔'' میوزیم دیکھنے کے بعد الفاظ آپ کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ مجھے ان رجسٹروں پر لکھنے کا موقع ملا۔ آگے عالمی رہنماؤں کے لیے

رجسٹر رکھے گئے ہیں جن رہنماؤں نے میوزیم دیکھا ان کی تحریریں، تصویروں کے ساتھ موجود ہیں۔ میں کچھ دیر یہ رجسٹر دیکھتا رہا۔ مجھے کسی پاکستانی لیڈر کی کوئی تحریر نظر نہ آئی۔ البتہ مجھے ہندوستان کے سابق صدر رادھا کرشنن کی 6 دسمبر 1965ء کی ایک تحریر دکھائی دی۔

آج سکول کے بچے یہاں بڑی تعداد میں موجود تھے۔ وہ تصویریں بھی بنا رہے تھے اور کچھ لکھتے بھی جا رہے تھے۔ ایک بچی ساداکو ساساکی اس بم سے متاثر ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر دو برس تھی۔ دس سال بعد وہ خون کی کمی کے مرض کا شکار ہو گئی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اس آس میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پھول بناتی رہی کہ ایک دن وہ تندرست ہو جائے گی پر آٹھ ماہ بعد وہ وفات پا گئی۔ جس کے بعد سکولوں اور کچھ اور لوگوں نے مل کر اس کی ایک یادگار بنائی ہے۔ لوگ اس کی یاد میں پھول بنا کر وہاں رکھتے ہیں۔ اس کی یادگار پر آنے والے بچے کچھ گاتے ہیں اور اسے یاد کرتے ہیں۔ اس کی یاد میں کاغذی پھولوں کی یہ بستی بستی جا رہی ہے۔ پارک کے درمیان "Memorial Monument for Hiroshima City of Peace" بھی بنایا گیا ہے۔ وہاں ایک فرضی قبر بھی موجود ہے جس میں رجسٹر پر ان لوگوں کے نام درج ہیں جو اس ایٹمی حملے میں ہلاک ہوئے تھے۔ اب بھی جس کے نام کی تصدیق ہوتی ہے تو اس کو اس رجسٹر پر درج کرلیا جاتا ہے۔ پارک میں ایک پتھر پر لکھا تھا "let all the Sould here rest in peace for we shall not repeat the evil" اس پتھر کے قریب بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ ہم بھی وہاں کچھ دیر احتراماً کھڑے رہے۔ لوگ یہاں پھول چڑھاتے ہیں اور خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ ہم ٹی شکل کے پل (جس کا میں نے پیچھے ذکر کیا ہے) سے گزر کر Industrial Promotion Hall بھی دیکھنے گئے۔ یہ Hypocenter سے ایک سو ساٹھ میٹر دور ہے۔ اسے اب A-Bomb Dome کہتے ہیں۔ یہ ایٹمی تباہی کی سچی جاگتی تصویر ہے۔ اس کے دروازے جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔ دیواریں آدھی ٹوٹی اور آدھی ایستادہ ہیں۔ یہ عمارت لوگوں کو پکار پکار کر کہتی ہے کہ امن کتنا ضروری ہے۔ اسے یونیسکو کی Heritage فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ اس عمارت کے قریب ایک آواز جاپانی اور انگریزی میں اس سارے منظر کو بیان کرتی ہے۔ وہ لوگ جو ایٹمی جنگ کی بات کرتے ہیں انہیں ایک بار اس میوزیم اور عمارت کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ اس ایٹمی حملے میں زندہ بچ جانے والی تیکیو یماؤکا کی ادھوری کہانی ملاحظہ فرمائیں۔

''میری جوانی بھی لوٹ کے نہیں آئے گی پر 6 اگست 1945ء کے مناظر اب بھی میرے ذہن میں زندہ ہیں۔ جب میں وہ سارا کچھ اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں۔ میں پندرہ سال کی تھی اور ہائی سکول کے تیسرے سال میں پڑھتی تھی اور ہیروشیما سنٹرل ٹیلی فون آفس میں کام بھی کرتی تھی اور روزانہ آتی جاتی تھی۔ یہ دفتر ہائپو سنٹر سے پانچ سو چالیس میٹر دور تھا۔

میں تین سال کی تھی جب میرے والد فوت ہو گئے تھے۔ میں اور میری ماں اکیلے رہتے تھے۔ میری ماں مجھے بڑا ہوتے دیکھ رہی تھی۔ وہ 1988ء اپنی موت تک میرے ساتھ رہی۔ 6 اگست 1945ء کو ہیروشیما کا آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ "پانی کا شہر" بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس دن کام پر جانے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں نے اپنی طاقت کو جمع کیا اور آٹھ سے پہلے گھر سے نکل پڑی۔ میرے کزن جو گاؤں سے آئے تھے مجھ سے پہلے نکل گئے۔ ہمیں نہیں پتہ ان کے ساتھ کیا بیتی اور وہ کہاں مرے۔ ہمیں ان کی ہڈیاں بھی نہ ملیں۔ میں ہمیشہ کی طرح "شام کو ملیں گے" کہہ کر نکل پڑی۔ "بی 29 چلے گئے ہیں پر اپنا خیال رکھنا" میری ماں نے پیچھے سے آواز دی۔ میں نے پانچ منٹ سے آٹھ سو میٹر دوڑ لی۔ 29 کی آواز تھی۔ "اوہ یہ کیا، ابھی تو کہا گیا تھا سب ٹھیک ہے ..." جس وقت میں نے آسمان کی

طرف دیکھا، کوئی زرد رنگ کی شے چمکی، میں ہوا میں اچھلی۔ ''میرے اوپر حملہ ہو گیا ہے۔'' — ''میں پورے زور سے چیخی'' ''اچھا ماں خدا حافظ'' مجھے اب بھی یاد ہے میں اس یا میں صحت کے لئے، بے ہوش رہی۔ ایک بچے کی چیخ مجھے ہوش میں لے آئی۔ میں ملبے تلے دبی تھی اور ہل نہیں سکتی تھی۔ ہر شے سیاہ نظر آ رہی تھی۔ ''میری مدد کرو، ماں میری مدد کرو۔'' میں چیختی رہی، پھر میں نے ماں کی آواز سنی: ''چیکو، چیکو'' — ''ماں میں یہاں ہوں'' میں ملبے کے نیچے سے بولتی رہی۔ وہ مجھے دیکھ نہ سکی۔ میں مایوس ہو گئی۔ میں نے اپنے قریب آوازیں سنیں ''آگ آگے بڑھ رہی ہے، یہاں سے بھاگ جائیں۔'' ''مجھے شعلوں کی آواز آ رہی تھی۔ مجھے لگا یہ میرے بالکل قریب ہی ہے، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔'' ''ماں، میری مدد کرو، میری بچی یہاں دبی ہے۔'' اس نے آخر مجھے ڈھونڈ لیا۔ ''ماں جلدی کرو، وہ یہاں جلنے لگے ہے۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ میں ملبے کے نیچے سے خود کو گھسیٹ کر باہر لے آئی۔ مجھے لگا میرا چہرہ غبارے کی طرح پھٹ گیا ہو۔ آگے پیچھے دیکھا تو سانس رک گئی۔ میرے ارد گرد سارا منظر بدل چکا تھا۔ یہ جیتی جاگتی جہنم تھی۔ میں نے دیکھا سر کے بغیر ایک بندہ، مری عورت کے ہاتھ میں بچہ، ایک لاش جس کی ساری آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔ زخمی لوگوں کی ایک قطار، ہر طرف دہشت کا منظر تھا۔ یہ سارا کچھ میرے اندر زندہ ہے۔ مجھے جب بھی یہ سارا کچھ یاد آتا ہے، آنسوؤں کا ایک سیلاب امڈ آتا ہے۔ میں نے پچھلے تیس سال سے گوشت نہیں کھایا۔ مجھے لوگوں کی آنتیں یاد آ جاتی ہیں۔ مجھے ماں نے کہا ''ہیجی یاما پہاڑی کی جانب بھاگ جاؤ'' ''ہم ایک دوسرے پر گر پڑیں۔ میں نے اکیلے ہی پہاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہ مجھے چھوڑ کر گھر کی جانب چل پڑی۔ گھر میں میرے چچا اور چچی آئے ہوئے تھے۔ وہ زخمی ہو گئی تھی۔ لیکن جان سے بچ گئی تھی۔ جب میں بھاگ رہی تھی، میں نے اپنی ایک سہیلی کو دیکھا، میں اسے بلاتی رہی لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکی۔ ''تم کون ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''چیکو یاد ہے کا'' وہ مجھے پھر بھی نہ پہچان سکی۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ میرا تو حلیہ ہی بدل گیا ہے، مجھے بہت دکھ ہوا۔ ہیجی یاما پہاڑ زخمی لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں لیٹ گئی۔ کسی نے میرے زخموں پر تیل ملا۔ ماں نے مجھے پھر ڈھونڈ نکالا تھا۔ جب ہم ملیں، اپنے دکھ بھول گئیں۔ میں بہت زخمی تھی، اس لیے مجھے کشتی کے ذریعے شہر سے باہر بھیج دیا گیا۔ زخمی لوگ کشتی میں مرتے جا رہے تھے۔ میں سوچتی: ''اگلی باری میری ہے۔'' — میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دعائیں شروع کر دیں۔ ''پیاس، مجھے پانی دو'' — میں منتیں کرتی رہی۔ ''تم پانی پی کے مر جاؤ گی۔'' — ''میری ماں سے میری حالت دیکھی نہ گئی۔ اس نے مجھے تھوڑا سا پانی پلا دیا۔ جس سے میری حالت اور خراب ہو گئی۔ میرے سر کے سارے بال اڑ گئے تھے اور پیشاب کے رستے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ موت میری آنکھوں کے سامنے تھی لیکن میں کسی نہ کسی طرح بچ گئی۔ میرا چہرہ بالکل بدل گیا تھا۔ میرے نقش خراب ہو گئے تھے۔ میں نے خود کو گھر کے اندر مقید کر لیا۔ میں بالکل مایوس ہو گئی تھی۔ میں اکیلی ہوتی تو میں نے خود کو مار لیا تھا لیکن ماں کی خاطر ایسا نہ کر سکی۔ مئی 1955ء میں، میں پلاسٹک سرجری کے لیے امریکہ چلی گئی۔ میرے پیچھے کوئی بولا'' یہ وہاں جا رہی ہے جنھوں نے ہم پر بم گرایا تھا، وہ اسے مار دیں گے۔'' — ''میرے ستائیس آپریشن ہوئے۔ میں سوچتی ہوں کاش یہ جنگ نہ ہوتی۔ اور ہم پر بم نہ پھینکا جاتا۔'' — ''مجھے آخر سمجھ آ گئی، اپنے آپ کو اندھیرے میں بند کر لینا کوئی اچھی بات نہیں۔ میں نے تیس سال بعد چپ توڑ دی اور جنگ کا تجربہ نئی نسل کو منتقل کرنا شروع کر دیا۔ میں پوری دنیا سے اپیل کرتی ہوں، نیوکلیئر ہتھیار ختم کر دیے جائیں۔ میں امن کے لیے کام کرتی رہوں گی۔ مجھے یقین ہے ہم بے بس لوگ نہیں ہیں۔ ہر شخص کوشش کرے تو امن کی راہیں روشن ہو سکتی ہیں۔ میری بھی خواہش ہے، نیوکلیئر ہتھیار ختم ہو جائیں اور دنیا میں امن کا راج ہو جائے۔''

◆◆◆

مسیحا

ڈاکٹر فضیلت بانو

مختصر تعارف

ڈاکٹر فضیلت بانو منہاج یونیورسٹی لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو ہیں۔ ادب اطفال کی معروف اور ایوارڈ یافتہ مصنفہ ہیں۔ تحقیق و تدوین اور افسانہ نگاری ان کا خاص میدان ہے۔ ادب اطفال اور تحقیق و تدوین پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پنجاب آرکائیوز کے قدیم اردو اخبارات ان کی مہارت کا خاص شعبہ ہے۔ حکومت پنجاب سے دو بار بیسٹ ٹیچر ایوارڈ، بیسٹ ماسٹر ٹرینر ایوارڈ اور منہاج یونیورسٹی سے بیسٹ ٹیچر ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔

تیز دھوپ میں ننگے پیر ایک ایک قدم چلنا محال ہو رہا تھا۔ ساتھ چلتے ہوئے منیر بابا کو شاید یہ سب محسوس نہیں ہو رہا تھا یا اس نے احساس ذمہ داری کو ہر چیز پہ مقدم رکھا ہوا تھا۔ ہم تقریباً ایک کلومیٹر سفر طے کر چکے تھے میرے پاؤں ایسے راستوں پر چلنے کے عادی نہ تھے اس لیے میری رفتار کم ہو رہی تھی۔ منیر بابا آگے آگے چل رہا تھا اسے تھوڑی دیر رک کے میرا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ راستہ دونوں طرف سے چٹیل میدانوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اس لیے کہیں بیٹھنے یا سستانے کا کوئی موقع نہ تھا۔ منیر بابا مجھ سے عمر میں کہیں بڑا اور جسم کا بھی بہت کمزور تھا مگر ہمت اور طاقت میں مجھ سے بڑھ کر تھا۔ سفر کے آغاز میں جو اہم بات منیر بابا نے مجھ سے کی وہ یہ تھی کہ سر کو اچھی طرح کپڑے سے لپیٹ لو اور جوتے اتار دو۔ پہلے تو مجھے جوتے اتارنے کی حکمت سمجھ نہ آ سکی۔ لیکن سفر کرتے ہوئے احساس ہو گیا کہ راستے کی ڈھلوان اور پھسلن دونوں جوتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں بار بار سوالیہ نظروں سے منیر بابا کی طرف دیکھتا جس کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ راستہ ابھی اور کتنا باقی ہے وہ میری طرف دیکھتا اور آگے آگے چلنا شروع کر دیتا ہمارے دونوں کے پاس پانی کی بوتلیں موجود تھیں لیکن اس نے مجھے پانی پینے سے منع کر دیا تھا اب تو پیاس سے بھی حلق سوکھنے لگا تھا۔ ننگے پیر اور پیاسے چلنے کی حکمت آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اب صاف اور سیدھا راستہ ختم ہو رہا تھا اور راستہ مشکل نظر آ رہا تھا مگر ایک بہتری تھی کہ راستہ اب بڑے بڑے پتھروں کے بیچ میں سے ہو کے گزر رہا تھا۔ اب تھوڑی دیر کے لیے کہیں بیٹھا جا سکتا تھا مگر شاید وقت کی کمی کے باعث منیر بابا نے بیٹھنے کی بجائے چلتے رہنا مناسب سمجھا۔ سورج ڈھلنے لگا تھا اس کی حدت میں بھی شدت کم ہونے لگی تھی مگر میری طاقت اور ہمت دونوں پست ہونے لگی تھی ایک جگہ میں بڑے سے پتھر کے ساتھ ایک درخت کے پاس کھڑا ہو گیا تو منیر بابا مجھ سے بہت دور نکل گیا جب مجھے اس کے ساتھ ملنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھانے پڑے تو میں نے بھی آئندہ کہیں رکنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سورج اب ہماری پشت پر آ گیا تھا۔ ہمارے سامنے ہمارے لمبے لمبے سائے چلنے

گئے تھے۔ اچانک راستہ ختم ہو کے ایک سوکھے ہوئے برساتی نالے میں اتر گیا۔ یہاں رک کے منیر بابا نے اپنی کمر کے ساتھ بندھے ہوئے جوتے کھولے اور پہن لیے اور مجھے بھی جوتے پہننے کا اشارہ دیا۔ میں نے بھی کمر سے بندھے ہوئے جوتے کھولے اور پہن لیے۔ اب پاؤں کی یہ حالت تھی کہ جوتا پہن کے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے جوتے پہن کے کئی بار پاؤں کو جھٹکا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ نالے کے اندر چلتے ہوئے دور سے جھونپڑیاں نظر آنے لگیں تو میں نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا منزل کے کچھ آثار تو نظر آئے۔ نالے کا سوکھا پن ختم ہو رہا تھا آگے پانی بھی نظر آ رہا تھا ایک جگہ رک کے منیر بابا نے کنارے کو پکڑا اور خود کو اوپر اٹھاتے ہوئے کنارے پر کود گیا پھر ہاتھ پکڑ کے مجھے بھی اوپر کھینچ لیا۔ اب ہم دونوں نالے کے کنارے اگی ہوئی گھاس پر چلنے لگے یہ راستہ بہت صاف اور ہموار تھا چلنا بھی قدرے آسان تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد جھونپڑیاں شروع ہو گئیں تو منیر بابا نے زور سے کسی کا نام پکارا تو دو تین لڑکے ایک ساتھ بھاگتے ہوئے ہماری طرف آ گئے ان کی آنکھیں خوف سے پھٹی جا رہی تھیں اور آواز حلق سے بمشکل نکل رہی تھی وہ، وہ، وہ بس اتنا ہی کہہ پا رہا تھا منیر بابا ان کی بات کا جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا نیلے رنگ کے ایک جھونپڑی نما گھر کے پاس کھڑا ہو کے اوپر کی طرف دیکھنے لگا دروازہ اندر سے بند تھا۔ منیر بابا دیوار کے اس حصے کی طرف بڑھا جو قدرے چھوٹا تھا اس نے اس ایک لڑکے کو اشارہ کر کے بلایا اور اسے جھکنے کا اشارہ کر کے اس کے اوپر پاؤں رکھ کر دیوار کود گیا۔ اندر جا کے اندر سے دروازہ کھول دیا میں اور سارے لڑکے اندر چلے گئے منیر بابا نے جلدی سے کمرے کا بھی دروازہ کھولا اور وہاں سے بنڈل اٹھا کر سب کو پکڑا دیے۔ ہم سب جلدی سے پیچھے پلٹے اور واپس جھونپڑیوں کی طرف آ گئے۔ جھونپڑی میں موجود افراد میں سے پہچاننا مشکل تھا کہ کتنے زندہ ہیں اور کتنے مر چکے ہیں۔ میں اور منیر بابا ہر ایک کی باری باری نبض چیک کرتے اور ان لڑکوں کو ساتھ لگا کے سب کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا کے سانس کی بحالی کی کوشش کرتے اور پھر اگلی جھونپڑی کی طرف بڑھ جاتے۔ منیر بابا آکسیجن ماسک لگاتا۔ میں لڑکوں کے ساتھ مل کر سانس اور نبض چیک کرتا جاتا۔ اکثریت زندگی کی بازی ہار چکی تھی جو رہ گئے تھے ان کی بھی آخری سانسیں چل رہی تھی یوں کہہ لیں کہ جن کو قدرت ابھی زندہ رکھنا چاہتی تھی وہی سانس لے رہے تھے۔ اللہ کا شکر کہ آکسیجن ماسک ضرورت کے مطابق بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ موجود تھے جن لوگوں کی سانس بحال ہو رہی تھی انہیں انجکشن لگا کے منیر بابا ان کی ڈرپ بھی لگا رہے تھے اس سارے کام میں لڑکوں نے بہت پھرتی دکھائی اس ساری تگ و دو میں ہم کوئی 20، 25 لوگوں کو زندگی کی طرف واپس لانے میں کامیاب ہو سکے۔ اس سے دوگنا زیادہ تعداد طبی امداد ملنے سے پہلے ہی موت کی گود میں سو چکے تھے۔ بچ جانے والوں کو یہاں سے نکالنا اور دوسری جگہ منتقل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ میں نے فون کر کے ساری صورتحال سے حکام بالا کو مطلع کیا تو مجھے انتظار کرنے کو کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ کچھ اور ڈاکٹرز لوگ بھی ہمارے پیچھے نکل چکے تھے اور وہ بس پہنچنے ہی والے تھے۔ شام تک وہ بھی پہنچ گئے اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے مسخ شدہ جسموں کی تدفین کر دی گئی۔ اب بچ جانے والوں کو صبح سے پہلے یہاں سے نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ ہم نے جگہ جگہ آگ کے الاؤ روشن کر دیے۔ مریضوں کو سردی سے بچانے کے لیے ادھر ادھر سے سوکھی لکڑیاں اکٹھی کر کے لڑکوں نے ایک ڈھیر لگا دیا۔ یہ رات اذیت ناک اور سرد ترین راتوں میں سے ایک رات تھی میری ملازمت بھی نئی نئی تھی اور اس قسم کا میرا یہ پہلا ایکشن تھا۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے حالات کی اس قدر سنگینی کا واقعی احساس نہیں تھا۔ بابا تجربہ کار ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں ایک طویل عرصے سے مقیم تھا وہ اس قسم کے حادثات سے بارہا گزر چکا تھا۔

آج کے حادثے کی اطلاع ملتے ہی مجھے فوری طور پر میر بابا کے پاس پہنچنے کا کہا گیا۔ مائننگ انجینئرنگ میرا بچپن کا شوق تھا لیکن سب گھر والوں کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ ایف ایس سی میں اچھے نمبر آنے کی وجہ سے مجھے میڈیکل ٹیسٹ پاس کر کے آسانی سے ایک اچھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا میرے دوست بھی میرے ساتھ میڈیکل میں داخلہ لے چکے تھے۔ پڑھائی کی روٹین شروع ہوئی تو سارا کچھ بھول بھال کے ساری توجہ پڑھائی کی طرف ہو گئی اس طرح ذہن بھی آہستہ آہستہ مائننگ انجینئرنگ کو بھولنے لگا۔ ماہ و سال گزر گئے پاس ہو کر ہم سب ڈاکٹر بن کر فیلڈ میں نکل آئے۔ جس کو جہاں جگہ ملی اس نے ملازمت کر لی۔ ہر کوئی کہیں نہ کہیں مصروف ہوتا جا رہا تھا۔ میں بھی روز اشتہارات والا صفحہ کھول کر بیٹھ جاتا ایک دن اچانک مائننگ انجینئرنگ ہسپتال کا اشتہار نظر سے گزرا تو نظریں اٹک کے رہ گئیں میں نے فوراً رابطہ نمبر سے تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی تو رابطے پر موجود شخص نے بڑی تفصیل سے ساری معلومات بہم پہنچائیں میں نے شکریہ ادا کیا اور گھر والوں سے مشورے کے لیے فرداً فرداً بات کی لیکن گھر میں سے کوئی میرے اس فیصلے سے متفق نہ ہو سکا۔ مائننگ ہسپتال شہری علاقے سے بہت دور پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ شہری زندگی کی وافر سہولتیں وہاں موجود نہ تھیں۔ مائننگ سرنگوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے بنائے گئے ہسپتالوں میں دور دراز علاقوں سے پہلے کوئی جانے کے لیے آسانی سے تیار نہ ہوتا تھا۔ یہاں اکثر ایمرجنسی کی صورت میں متاثرین کو فوری طبی امداد پہنچانا کافی مشکل ہوتا تھا۔ مریضوں کو دور دراز کے شہروں میں ہسپتال تک پہنچانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ اسی لیے اب ان کے لیے حکومت نے سرکاری ہسپتال بنا دیے تھے۔ اب ان میں ڈاکٹرز کو تعینات کیا جا رہا تھا انجینئرنگ سے مجھے قدرتی طور پر دلچسپی تھی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا بالآخر میں نے گھر والوں کو سمجھا بجھا کر ان کی مخالفت کے باوجود وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا یہ کام مائننگ انجینئرنگ سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ یہ ملازمت نہیں ایک چیلنج تھا جسے میں نے خوشی سے اور میرے گھر والوں نے بادل نخواستہ قبول کیا یہ ملازمت بھی بہت مشکل تھی لیکن انسانیت کو یہاں انجینئرز کے ساتھ ساتھ ڈاکٹرز کی اشد ضرورت تھی۔ یہاں آنے والے صرف مسیحا ہی ہو سکتے تھے۔ شاید میں بھی اب ایک مسیحا ہی تھا۔ ان مائننگ سرنگوں میں دو روز پہلے ہونے والے حادثے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا مائننگ انجینئرز اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد مائننگ سرنگ میں ہونے والے دھماکے کا شکار ہو چکی تھی یہ دھماکہ اب تک یہاں ہونے والے سب حادثوں سے زیادہ سنگین تھا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد متاثر ہوئی تھی میر بابا کو یہاں کام کرتے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے سب انہیں ڈاکٹر میر نہیں بلکہ میر بابا کہتے تھے۔ وہ ایک پٹھان قبیلے سے تعلق رکھتا تھا بہت بہادر اور دین دار تھا۔ میں بھی اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ وہ معاملات میں بھی وہ بہت سچا اور کھرا انسان تھا۔ بہت نرم دل لیکن سخت فیصلے کرنے والا مسیحا۔ وہ یہاں سب کو بہت عزیز تھا۔ مائننگ علاقوں میں اس نے چھوٹے چھوٹے طبی امداد کے کلینک اپنے خرچے سے بھی بنا رکھے تھے۔ یہاں آکسیجن ماسک انجکشن اور فوری طبی امداد کا سامان ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ اس حادثے کے بعد جب مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا تو مجھے بغیر سامان کے وہاں جانا بڑا عجیب لگا لیکن وہاں جا کے معلوم ہوا ضرورت کی ہر چیز وہاں پہلے سے موجود تھی اس لیے ہم نے مقامی لڑکوں کو ساتھ لگا کر زخمیوں کی فوراً مرہم پٹی شروع کر دی صبح تک بچاؤ اور ڈاکٹر بھی پہنچ گئے تو کام آسان ہو گیا۔ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مائننگ پہاڑوں سے کافی فاصلے پر مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں وہاں رہنے والے اپنے پیاروں کی موت پر صدمے سے بے حال تھے۔ ہمارے پاس ان کی دلجوئی کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ جن لوگوں کے رشتہ دار حادثے کا شکار ہوئے تھے اب وہ بھی یہاں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ دور دراز کے مزدوروں کے گھروں میں تو دور سے اطلاع بھجوا دی گئی تھی۔ اکثریت ایسے متوفیوں کی تھی جن کی لاشیں بری طرح مسخ ہو چکی تھیں جن کی حالت دیکھ کر ہمت تھی انہیں جھونپڑیوں میں ان

کے گھر والوں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سارے کام سے ذرا فرصت ہوئی تو منیر بابا اور میں ڈسپنسری نما ہسپتال کی طرف چل دیے جن لوگوں کو فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی انہیں فوری طور پر ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ ہسپتال میں اس وقت کوئی ڈاکٹر موجود نہ تھا صرف دو کمپوڈر تھے جو مقامی تھے ادویات اور دیگر ضروری چیزیں وہاں موجود تھیں۔ منیر بابا کی کوششوں کی وجہ سے سب چیزیں قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں خلاف توقع ہسپتال بھی بہت صاف ستھرا تھا منیر بابا نے پہلے مجھے سارے ہسپتال کا ایک چکر لگوایا پھر مجھے میرے بیٹھنے کی جگہ بتائی۔ پانی کی شدید پیاس تھی وہاں پڑے صاف ستھرے کولر کو دیکھا تو اپنی پیاس کا خیال آیا اور میں نے کولر کے پاس پڑے گلاس کو بھر اور غٹا غٹ پانی پی گیا۔ ہم زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ زخمیوں کو فوری طور پر منتقل کرنا بہت ضروری تھا طے یہ پایا کہ میں یہاں ہی ٹھہر جاؤں اور لڑکے منیر بابا کے ساتھ مل کر زخمیوں کو یہاں بھیجیں گے اور میں ان کو بینڈیج کرتا جاؤں گا۔ بابا منیر یہ کام بھی خوش اسلوبی سے ختم کر کے زخمیوں کی مرہم پٹی کی طرف مصروف ہو گئے۔ اپنے کھانے پینے کی پرواہ کیے بغیر دوسروں کے لیے اس قدر ہمدردی اور محبت سے کام کرنا منیر بابا کی ایک بڑی خوبی تھی۔ وہ اپنی اس خوبی کی بنا پر اس علاقے میں بوڑھا دلیر ہیرو مشہور تھا۔ اس ایک واقعہ نے مجھے ساری زندگی کے لیے کئی سبق سکھا دیے۔ مجھے زندگی کے اصل مفہوم سے آشنا کر دیا۔ منیر بابا کو دیکھ کر میں دعا کرتا یا اللہ مجھے بھی ایسا ہی مخلص، بے لوث اور بے ریا ڈاکٹر بنا دے۔ شاید یہ میرے اخلاص اور جنوں کا ہی اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میری مرضی کی جگہ پہنچا دیا تھا۔ یہاں مضافات کا وہ ذخیرہ تھا جس سے میرے ملک کی ریڑھ کی ہڈی قائم اور دل کی دھڑکن سلامت تھی۔ میرے ملک کو ایسے ہی منیر بابا جیسے مسیحاؤں کی ضرورت تھی۔ یا اللہ ہمیں ایسے ہی مسیحا عطا فرما۔

◆◆◆

قواعد وضوابط

تمام قلمی تعاون کرنے والے شاعر اور ادیبوں کو ادارہ "تخلیق" کی پالیسیوں سے اتفاق کرنا لازم ہے۔

☆ تحریریں صاف اور نمایاں طور پر واضح ہونی چاہئیں اور صرف Inpage فائل میں تحریر بھیجی جائے۔ ☆ کوئی تحریر واٹس ایپ، ایس ایم ایس یا مسنجر ... 8 اشعار سے طویل نظم یا غزل نہ بھیجی جائے۔ اختصار کی دولت کو کفایت سے استعمال کریں۔ ☆ صرف غیر مطبوعہ تحریریں ہی تخلیق میں شائع کی جائیں گی لہٰذا ہر لکھاری اپنی تحریر کے اوپر غیر مطبوعہ کا لفظ لازمی لکھے۔ ☆ تخلیق کسی بھی قاری کو اس کی تحریر شائع ہونے یا نہ ہونے کا پرچہ شائع ہونے سے پہلے بتانے کا مجاز نہیں۔ ☆ پرچہ شائع ہونے سے کم از کم ایک ماہ قبل وصول ہونے والی تحریریں ہی قابل اشاعت ہوں گی۔ ہر وقت پرچہ بھیج کر شائع کرنے کا اصرار نہ کیا جائے۔ ☆ کوئی بھی مضمون یا تبصرہ جو مصنف براہ راست تبصرہ نگار کو دے کر لکھوائے وہ تخلیق میں قابل قبول نہیں۔ ☆ تبصرہ صرف تخلیق کو بھیجی گئی دو کتابوں کی وصولی پر تخلیق اپنے تبصرہ نگار سے کرائے گا ☆ تمام لکھاری اس بات کو یقینی بنائیں کہ اگر پرچہ شائع ہونے والے ماہ میں نہ ملے تو بروقت ادارے کو اطلاع دیں۔ پرچہ شائع ہونے کے دو یا تین ماہ بعد پرچہ نہ ملنے کی شکایت نہ کریں ☆ تمام تخلیق ممبران پر فرض ہے کہ اگر وہ اپنا گھر تبدیل کریں تو اپنا پتا ادارے کو فون کر کے ضرور نوٹ کروا دیا جائے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ پرچہ باقاعدگی سے پرانے پتے پر ارسال کیا جاتا ہے اور کافی عرصے بعد بتایا جاتا ہے کہ گھر تبدیل کر لیا گیا تھا۔ آپ کے تعاون سے ہی "تخلیق" آج بین الاقوامی مقام پر ہے۔

(ادارہ "تخلیق")

غصہ

فائزہ سیّد (آسٹریلیا)

مختصر تعارف

1993ء میں کنیرڈ کالج لاہور سے بی۔اے کرنے کے بعد بیشتر زندگی پاکستان سے باہر گزری اور اب آسٹریلیا میں آباد ہیں۔ وہ بیک وقت انگلش اور اردو دو زبانوں کی شاعرہ و مترجم ہیں۔ پہلا افسانہ تقریباً چودہ سال پہلے ''تخلیق'' میں شائع ہوا تھا۔

سکینڈے نیویں جزیرے پر کام کرنے والے ڈاکٹر چکرورتی نے فون اٹھایا تو دوسری طرف کلینک کی سیکرٹری بتا رہی تھی: "ابھی ایک نئے مریض نے کل صبح آپ کے ساتھ ارجنٹ اپائنٹمنٹ لینے کے لیے فون کیا تھا۔ نام سے پاکستانی لگتا ہے۔ وہ مقامی زبان بہت خراب بول رہا تھا۔ میں نے کل کے لیے انٹرپریٹر بلانے کا پوچھا تو اس نے منع کر دیا۔ کہتا تھا ڈاکٹر چکرورتی اور میں ایک دوسرے کی زبان سمجھ لیں گے۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔" ڈاکٹر جانتا تھا کہ وہ ہندی ٹھیک نہیں بول سکتا، خاص طور پر طبی معاملات پر ہندی میں بات کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس نے سیکرٹری کو ہدایت دی، "اردو انٹرپریٹر کو بلا لو۔" ملک کا نظام صحت مقامی زبان پر عبور نہ رکھنے والے سب لوگوں کو مفت انٹرپریٹر کا حق دیتا تھا۔ مریض کو یہ سہولت دینا ڈاکٹر نے اپنا فرض سمجھا۔ اپائنٹمنٹ کے وقت ڈاکٹر چکرورتی نے انتظار گاہ کے دروازے پر جا کر پکارا "فیاض راجا"۔ گندمی رنگ، لمبے قد اور مضبوط جسم کا تقریباً پچاس سالہ مرد اٹھ کر اس کی طرف آنے لگا۔ ڈاکٹر نے ایک طرف کھڑے اپنے جانے پہچانے اردو انٹرپریٹر کو بھی آنے کا اشارہ کر دیا۔ راہداری میں پہنچ کر انٹرپریٹر نے دونوں سے علیک سلیک کی تو نئے مریض نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا۔ ڈاکٹر نے وضاحت کی، "یہ ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے میں مدد دیں گے۔" مریض ایک دم آگ بگولا ہو گیا، "مجھے کسی انٹرپریٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کل سیکرٹری کو بتا دیا تھا۔" ڈاکٹر نے معذرت کی اور بتانے لگا "میں زیادہ ہندی نہیں جانتا۔ اس لیے میں نے ہی سیکرٹری کو انٹرپریٹر بلانے کے لیے کہا تھا۔" مریض کی نظروں میں ایسا غصہ تھا جیسے اس کی غیرت پر حملہ ہوا ہو۔ وہ ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان میں بولا، "میں یہاں کی زبان بول سکتا ہوں۔ کیا سمجھا ہے تم نے مجھے؟ ابھی اپنے انٹرپریٹر کی چھٹی کرو۔" ڈاکٹر مزاج کا دھیما اور با اخلاق تھا۔ اس نے انٹرپریٹر سے معذرت کرتے ہوئے اسے رخصت کیا اور مریض کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ اس مریض کا مسئلہ کس قسم کا ہو سکتا ہے جو کسی پاکستانی نژاد ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گیا اور انٹرپریٹر کے ذریعے بات کرنے سے بھی انکاری ہے۔ ڈاکٹر نے کمرے کا دروازہ بند کر کے سوالات شروع کیے تو اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ فیاض راجا ایک ایس ٹی آئی کی وجہ سے تکلیف میں تھا اور معاملہ ٹالتے رہنے کی وجہ سے اب انفیکشن بڑھ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے ضروری سوالات کر کے اسے ہدایات دیں۔ دوائی لکھ دی اور دوائی کا کورس پورا کرنے کے بعد دوبارہ معائنہ کروانے کی تاکید کی۔ بات چیت میں زبان کی وجہ سے کچھ خاص رکاوٹ نہ ہوئی۔

انفیکشن کی نوعیت ایسی تھی کہ آئندہ بھی بیماری عود کر آ سکتی تھی۔ فیاض راجا ہر چھ مہینے بعد طوعاً و کرہاً معائنے کے لیے آ جاتا۔ اس ملک کے ڈاکٹروں کو مریضوں کی زندگی کی پروا کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ ڈپریشن اور خودکشی کی بلند شرح کی وجہ سے نظام صحت میں

بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ ڈاکٹر مریضوں سے تفصیلی بات کریں اور ان کی ذہنی اور جذباتی صحت کا بھی جائزہ لیں۔ ڈاکٹر چکرورتی تو تھا ہی بھلے مانس، بڑی نرمی اور سمجھداری سے مریض کے حالات دریافت کرتا۔ کچھ ملاقاتوں کے بعد فیاض ڈاکٹر کے ساتھ کھل گیا۔ وہ دو تین ذرائع سے پیسہ کما رہا تھا جن کے لیے کسی خاص تعلیم کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس ملک کا شہری تھا لہذا اپنے بیوی بچوں کو بھی یہاں بلا سکتا تھا لیکن اس کے بیوی بچے، ماں باپ سب شمالی پنجاب کے ایک گاؤں میں تھے جنہیں وہ رقم بھیجتا۔ اس شہر میں اس کا ذاتی اپارٹمنٹ تھا جس میں وہ دوسرے تارکین وطن کو بھی کرایہ پر رکھتا۔ اپنی بے راہروی کے نتیجے میں لگنے والی بیماری کے علاوہ اس کی صحت اچھی تھی۔ بے فکر تھا، اپنی مرضی سے جیتا تھا، خوب کھاتا اور خوب پیتا تھا۔ کم تعلیم اور زبان پر عبور نہ رکھنے کے باوجود وہ خود اعتماد تھا۔ ایک ترقی یافتہ ملک میں سیٹل ہونے، دونوں ہاتھوں سے پیسہ کمانے اور خاندان کی کفالت کرنے کے باعث شاید وہ خود کو بہت معزز انسان سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر بڑے تحمل سے اس کی لن ترانیاں سنتا۔ ان چار سالوں میں ڈاکٹر کو فیاض کے خاندان کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا جسے وہ اپنے پیشہ ورانہ فرض کی رو سے راز میں رکھتا۔ صحت کی خاطر بعض حرکتوں میں اعتدال برتنے کی نصیحت وہ ایسے بے تکے انداز میں کرتا کہ بے جا مداخلت نہ لگے۔ فیاض کو شراب کا چسکا بھی تھا۔ اس نے کسی کے ساتھ پارٹنرشپ کر کے ایک ریسٹورنٹ شروع کر دیا تھا جسے وہ ہمیشہ ہوٹل کہتا۔ اپنے ریسٹورنٹ کی شراب با آسانی میسر ہونے سے اس کی شراب نوشی بڑھ گئی۔ جب وہ ایک سال کے وقفے سے کلینک آیا تو اس کی صحت میں کافی فرق آ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ لکھ دیے مگر فیاض نے کہا کہ وہ بیٹی کی شادی کرنے پاکستان جا رہا ہے لہذا کچھ عرصے بعد ہی ٹیسٹ کروا سکے گا۔ بیٹی کو اپنے بھتیجے کے ساتھ بیاہ کر واپس آتے ہوئے وہ اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے آیا اور پھر بیٹی کو اس کے شوہر سمیت بلانے کے لیے کارروائی شروع کر دی۔ اخراجات کی وجہ سے وہ کام بھی زیادہ کرنے لگا۔ کلینک کی کئی یاد دہانیوں کے بعد آخر جب وہ ٹیسٹ کروا کے ڈاکٹر چکرورتی کے پاس آیا تو جگر پر شراب کے اثرات واضح تھے۔ ڈاکٹر نے اسے احتیاط کی تاکید کی۔ یہ کیفیت ایسی تھی کہ علاج سے زیادہ پرہیز کی ضرورت تھی۔

بیٹوں کو فیاض زیادہ عرصہ اپنے فلیٹ میں نہ رکھ پایا کیونکہ ان کی وجہ سے اس کی آزادی میں خلل پڑتا تھا۔ کرایہ داروں کو وہ پہلے ہی رخصت کر چکا تھا۔ ریسٹورنٹ اچھا چل رہا تھا جسے اب اس کے بیٹے دیکھ لیتے۔ فیاض کی نوکری محنت طلب تھی اور اسے جوڑوں کی تکلیف بھی ہو گئی تھی۔ جب اس کی صحت جواب دینے لگی تو ڈاکٹر چکرورتی نے بیماری کی بنیاد پر نوکری سے مستقل رخصت اور سرکاری وظیفہ دلانے میں اس کی بہت مدد کی۔ اب فیاض زیادہ تر گھر پر فارغ پڑا رہتا۔ جب دل چاہتا، ریسٹورنٹ سے شراب اٹھا لاتا اور کسی جسم فروش عورت کو بلا لیتا۔ اگرچہ ڈاکٹر کے سوالات کے جواب وہ دیانتداری سے نہ دیتا تھا لیکن ڈاکٹر کو خوب اندازہ ہوتا۔ ڈاکٹر چکرورتی مریض کے خاندانی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے اصول پر کاربند تھا مگر فیاض کی عمر، صحت اور مزاج کے پیشِ نظر اب وہ ضروری سمجھتا تھا کہ فیاض کی زندگی میں جو بہت بڑی کمی رہ گئی ہے، وہ درست ہونی چاہیے۔ اچھی طرح سوچ لینے کے بعد ڈاکٹر نے فیاض کو کلینک میں آنے کا پیغام بھجوایا۔

کمزور مگر ہنستا مسکراتا فیاض اپنی باری پر آ کر ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد ڈاکٹر نے سیدھے فیاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، "دیکھو دوست، تم نے سارا جیون بہت کام کیا ہے، سارے پریوار کا خیال رکھا ہے۔ اب تمہارے پاس بھی کوئی خیال رکھنے والا ہونا چاہیے۔" فیاض نے سدا کی لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔ ڈاکٹر نے ہار نہ مانی، "تم اپنی بیوی کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے بلا لو۔" فیاض کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ کچھ دیر وہ ڈاکٹر کو گھورتا رہا، پھر خشک آواز میں بولا، "خدا کا خوف کرو، ڈاکٹر۔ تمہیں پتہ ہے یہاں کا ماحول کتنا خراب ہے؟" اس کی نظروں میں وہی غصہ تھا جو ڈاکٹر نے پہلی ملاقات میں دیکھا تھا۔

◆◆◆

بے چاری

نشاط یاسمین خان

مختصر تعارف

کافی ادبی جرائد اور اخبارات میں کالم بھی لکھ چکی ہیں۔ 3 ناول اور 3 افسانوں کے مجموعے شائع ہونے کے علاوہ ایک سفر نامہ اور ایک طنز و مزاح پر مضامین کی کتاب منظر عام پر آ چکی ہے۔

پہلی نظر میں تو میں شادو کو بالکل بھی پہچان نہیں پائی تھی۔ وہ تنور پہ جھکی روٹیاں نکال رہی تھی۔ اس نے پاؤں کو میلے سے کپڑے سے باندھا ہوا تھا اور ایک بے رنگ سا پرانا دوپٹہ اسی طرح سر سے لپٹا ہوا تھا جیسے تنور والیاں باندھتی ہیں۔ پسینے سے تربتر قمیض اس کے جسم پر چپک رہی تھی اور اس کا سینہ پیٹ سب برابر لگ رہا تھا۔ روٹیاں نکال کر جب وہ دم لینے کو بیٹھ گئی اور دوپٹے سے چہرے پر آئے پسینے کو پونچھ رہی تھی تو اس کا رخ میری جانب ہو گیا تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی اور ہم اس وقت کھنڈرات میں شادو کو دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت مجھے اپنے بازو پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں شادو کو دیکھنے میں اتنی محو ہو گئی تھی کہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ وہ رانی تھی۔ میرے بھتیجے شیر داد کی بیوی۔ کبھی مجھے اور کبھی شادو کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی "پھوپھی جی! یہ تو ماسی ہے!" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ میں نے تسلی کے انداز میں اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

عین اسی وقت ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ٹھنڈی بوتلیں ہمارے ہاتھ میں تھما دیں۔ "آپ لوگ آرام سے بیٹھیں... میں سامنے ہوٹل سے کھانا کھا کر آتا ہوں"۔ ہم لوگ اس وقت گاؤں سے واپس آ رہے تھے۔ بھائی افضل داد کے انتقال کے بعد پہلی بار میں گاؤں آئی تھی جب کہ رانی کو گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اتنے عرصے بعد گاؤں تو بالکل بدل چکا تھا اور شادو..... شادو تو اس سے بھی زیادہ بدل چکی تھی۔ یہ ہوٹل بس اسٹینڈ کے بالکل قریب تھا۔ یہاں بسوں کے ساتھ ٹرک ڈرائیور بھی کھانا کھانے کے لیے رکتے تھے اور اب ڈرائیور نے بھی کھانا کھانے کے لیے گاڑی روکی تھی۔ زیادہ گاہک دیکھ کر شادو نے بھی تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کر دیے تھے اور ماہر تنور والی لگ رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے..... شادو نے کبھی گھر میں اپنے شوہر اور بچوں کے لیے روٹی نہیں بنائی تھی بلکہ چولہے کے قریب بھی نہیں جاتی تھی۔ وہ تین بھائیوں کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ گھر کا چولہا روٹی کرنے کے لیے اس کی بھابیاں موجود تھیں۔ ان کا گھر گاؤں کے آخری سرے پر تھا جہاں سے کھیت شروع ہوتے تھے اور ان سے ذرا آگے جا کر ہمارا اسکول تھا۔ میں اور بھائی افضل روز اس کے گھر کے سامنے سے گزر کر اسکول جاتے تھے۔ آتے جاتے ہمیں شادو اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی نظر آتی تھی۔

میرے میٹرک کرنے سے پہلے بھائی افضل میٹرک کر کے اپنی دکان سنبھال چکا تھا اور جب بھائی افضل کی شادی کی بات چلی تو کسی نے شادو کا بتا دیا۔ بھائی افضل کا رشتہ جاتے ہی اس کے بھائیوں نے حامی بھر لی تھی مگر نکاح کے وقت شادو سے اسٹامپ پیپر پر لکھوایا تھا

کہ باپ کی زمین جائیداد میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ شادو پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اس نے نکاح کے کاغذات سمجھ کر انگوٹھا لگا دیا تھا۔ بعد میں اس کے شریکوں نے یہ راز کھولا کہ شادو کا دل اس کے خالہ کے بیٹے کے ساتھ اٹکا ہوا تھا مگر ان کی آپس میں شادی اس لیے نہ ہو سکی کہ رواج کے مطابق وہ نکاح کے وقت ہی زمین، جائیداد میں حصہ لے لیتا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ شادو اپنے باپ کے ترکے کی حق دار ہے۔

شادی کے کچھ عرصہ تک بھائی افضل کے ساتھ شادو خوش رہی۔ اسے کبھی بھی چولہے سے دلچسپی نہیں تھی۔ شیرداد پیدا ہوا تو اس کو میں نے اور اماں نے مل کر پالا۔ اب بچہ بھی اسے بوجھ لگتا تھا۔ بچے کو چھوڑ کر پندرہ بیس دن میکے جا کر رہنے لگی تھی۔ بھائی افضل کچھ کہتا تو آگے سے زبان درازی کرتی۔ اماں بھائی افضل کو منع کرتی کہ اسے کچھ نہ کہو، وقت کے ساتھ سمجھ جائے گی ۔۔۔ مگر وہ سمجھنے والی نہ تھی۔ اسے کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ نکاح نامے کے کاغذات کے ساتھ اس کے بھائیوں نے جائیداد کے کاغذات پر بھی انگوٹھے لگوا لیے ہیں۔ اکثر بھائی افضل سے کہتی کہ تم میرے بھائیوں سے کاغذات کا مطالبہ کرو۔ مگر بھائی افضل کو ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جب بھی میکے جاتی تو بھائیوں اور بھابیوں سے لڑتی کہ مجھے میرا حصہ دو۔ بھابیاں اسے بہلاتیں ''شادو! آرام سے رہ ۔۔۔ جب تک تیرا دل چاہے، یقین کر یہ بھی تیرے باپ بھائیوں کا گھر ہے۔'' وہ کچھ دن تو بہل جاتی پھر لڑنا شروع کر دیتی۔ آخر تنگ آ کر اس کے بھائی اسے گھر لا کر چھوڑ جاتے اور بھائی افضل کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہتے کہ ''اسے کچھ نہ کہو اور گھر میں بسا رہنے دو۔'' تھوڑے عرصے میں بھائی افضل کا اس روز روز کے تماشے سے دل بھر گیا۔ میری شادی کے بعد اماں کا بھی انتقال ہو گیا مگر شادو کا رویہ وہی رہا۔ بھائی افضل نے شیرداد پر پوری توجہ دی۔ اسے اسکول لانا، لے جانا، کھانا کھلانا سب بھائی افضل نے اپنے سر لے لیا تھا۔ شیرداد نے کالج پاس کر کے نوکری کر لی تو بھائی افضل نے اس کی شادی اپنے دوست کی بیٹی رانی سے کر دی۔ بھابی شادو نے بہت شور مچایا۔ جائیداد کے چکر میں وہ اپنی بھتیجی بیاہ کر لانا چاہتی تھی مگر بھائی افضل اور شیرداد نے شادو کو اس شادی کی خبر بھی نہ ہونے دی اور نکاح خواں اور چار لوگوں کو لے جا کر چپکے سے بہو بیاہ لائے تھے۔ نکاح کے وقت میں بھی رانی کے گھر آ گئی تھی۔ بھائی افضل کو معلوم تھا کہ شادو اس شادی پر بہت ہنگامہ کرے گی کیوں کہ شادو کے بھائیوں نے اس سے کہہ رکھا تھا ''اگر شادو ۔۔۔ شیرداد سے اپنی سگی بھتیجی کی شادی کرنے پر تیار ہو جائے تو نکاح کے وقت شادو کے حصے کے ساتھ شیرداد کو بھی حصہ دینے پر تیار ہیں مگر بھائی افضل نے صاف کہہ دیا کہ ''میں ساری زندگی تیرے جیسی جاہل عورت سے گزارا کرتا رہا ہوں۔ اب میں اپنے بیٹے کو اپنے جہنم میں نہیں دھکیل سکتا۔'' شیرداد نے بھی باپ کی حمایت کی تھی۔

اب تو شادو کے بھائی بھاوجوں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ سارا دن گھر پر پڑی رہتی اور رانی سے لڑتی رہتی اور بھائی افضل یا شیرداد کے آنے پر چپ کر کے پڑ جاتی تھی۔ شیرداد صبح نوکری کرتا اور شام کو آ کر دکان پر بیٹھ جاتا تھا اور رانی کو گھر بھیج دیا کرتا تھا۔ یوں رانی کی جان شادو سے چھوٹ جاتی تھی۔ اس دوران رانی کے تین بچے ہو گئے۔ شیرداد پر ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ کچھ دن سے بھائی افضل کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ شیرداد نے مجھے فون کیا کہ ''پھوپھی! ابا آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔'' میرے دل میں ہول سے آنے لگے۔ میں تو ہر ہفتے ان سے ملنے آتی تھی ایسا کیا ہوا کہ آج بھائی افضل مجھے یاد کر رہے تھے؟ میں فوری طور پر گاؤں پہنچی۔

وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ شیرداد ان کا ہاتھ پکڑے بیٹھا تھا۔ رانی روتی صورت میں مجھ سے ملی۔ بچے سہمے سہمے آنگن میں بیٹھے تھے مگر شادو غائب تھی۔ بھائی افضل نے مجھے دیکھتے ہی شیرداد کو باہر بھیج دیا اور مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ ''دیکھا ۔۔۔ میرے دل پر بڑا

بوجھ سے مگر کیا کرتا؟ —— یہ مکان اور دکان ہی میرا اصل سرمایہ ہے۔ اگر ان کو بیچ کر تیرا حصہ دے دیتا تو خود کیا کرتا؟ کہاں جاتا؟" میں نے کہا "بھائی! آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں؟ کبھی میں نے آپ سے اس کا مطالبہ کیا تھا؟" کہنے لگے "مگر بیٹا! —— میرا دل تو مجھے ملامت کرتا ہے کہ بہن کا حق کھا کر بیٹھا ہوں۔ اب مکان یا دوکان میں سے جو تیرا دل کرے لے جا۔" میرا دل غم سے بھر گیا۔ میں نے کہا "بھائی! مجھے صرف تمہاری دعائیں چاہئیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ تمہاری دعا سے مجھے اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔"'' —— تو بیٹا! مجھ سے ایک وعدہ کر —— میرے بعد میرے شیر داد اور اس کے بیوی بچوں کا خیال رکھنا —— انہیں شادو کے رحم و کرم پر مت چھوڑنا۔" میں نے بہتے آنسوؤں اور دکھی دل سے وعدہ کر لیا۔ انہوں نے شیر داد کو بلا کر جائیداد کے سارے کاغذات میرے حوالے کر دیے۔ میں گھر واپس آ گئی تھی کہ بھائی افضل کے انتقال کی خبر آ گئی۔ میں تین دن وہاں رہ کر اپنے گھر آ گئی۔ گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے میں زیادہ دن وہاں نہیں گزار سکتی تھی تاہم معمول بنا لیا تھا کہ ہر ہفتے وہاں چلی جاتی تھی۔ جب بھی جاتی —— ایک نئی کہانی ہوتی۔ شادو نے ہر روز ایک نیا جھگڑا کھڑا کیا ہوتا۔ اسے تو اب بھائی افضل کا ڈر بھی جاتا رہا تھا۔ میں جب جاتی تو وہ مجھے دیکھتے ہی کہتی "جا یہاں سے —— جس سے ملنے آتی تھی —— وہ اب یہاں نہیں ہے۔" میں خاموش ہی سب کچھ سہتی رہتی۔ رانی اور بچوں کے ساتھ بھی اس کا سلوک بہت خراب تھا۔ باورچی خانے تک کو تالا لگا دیتی تھی۔ بچے سارا دن بھوکے رہتے۔ شیر داد نے اب پورا دن دکان کھولنا شروع کر دی تھی کیوں کہ بھائی افضل کی بیماری کے دوران اس کی نوکری بھی چھوٹ گئی تھی۔ شام کو وہ گھر آتا تو بچوں کے لیے کھانا خرید کر لے آتا مگر ماں کو کچھ نہ کہتا۔ جب میں آتی تو اپنا دکھ مجھ سے کہتا۔ میں نے کئی بار کہا کہ دکان کو تالا لگاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ مگر وہ کہتا "ابا کا چالیسواں نہیں ہوا۔ ان کی روح آئے گی تو کم از کم گھر کی بتی تو اسے جلی ملے۔ اماں کا کیا ہے! گھر کو تالا لگا کر چلی جائے گی۔" اس دن تو شادو نے حد ہی کر دی۔ مجھ سے بولی "یہ جو تو روز روز آ جاتی ہے —— گھر سے کاغذات بھی چرا کر لے جا چکی ہے۔ میں نے سارا گھر ڈھونڈ مارا —— مجھے کچھ نہیں ملا۔ میں افضل کی بیوہ ہوں —— اس کی جائیداد پر میرا حق ہے۔" اس دن پہلی بار میں نے اس سے دو ٹوک بات کی۔ میں نے کہا "بھابی! یہ جائیداد بھائی افضل کی نہیں ہے میرے باپ کی ہے اور کاغذات بھائی افضل نے مجھے خود دیے ہیں۔ اب ان پر شیر داد اور اس کے بچوں کا حق ہے۔ میں نے بھائی افضل سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے اس میں سے ایک پائی بھی نہیں چاہیے۔ اب تمہاری مرضی ہے —— ادھر رہتی ہو یا تم بھی اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ۔" اس وقت تو وہ چپ ہو گئی مگر چالیسویں سے دو دن پہلے اس نے رانی اور بچوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ شیر داد چالیسویں کے انتظامات کے سلسلے میں لگا مصروف تھا جب وہ رات گئے گھر لوٹا تو بیوی بچے گھر کے دروازے پر پڑے تھے۔ اس نے بہت دروازہ کھٹکھٹایا۔ شادو نے دروازہ کھولا نہ جواب دیا۔ شیر داد نے اسی وقت ٹیکسی کی اور میرے پاس آ گیا۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ اب وہ گاؤں واپس نہیں جائے گا۔ پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اسے نوکری مل گئی اور وہ سب کرائے کے مکان میں چلے گئے۔ رانی نے بھی اس کا بہت ساتھ دیا۔ تنگی ترشی میں گزارا کرتی رہی۔ شیر داد بھی دو دو نوکریاں کرتا تھا۔ بچے پڑھ بھی رہے تھے۔ مگر ان کو اذیت کے ذریعے سے نجات مل گئی تھی مگر ابھی تک گھر نہیں بن سکا تھا۔ بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ کرائے کے گھر میں تنگی سے گزارا ہو رہا تھا۔ اس نے بمشکل ایک پلاٹ خریدا تو مکان بنانے کا مرحلہ آیا۔ کچھ دن پہلے گاؤں کے کسی آدمی نے رابطہ کیا تھا کہ "مکان اور دکان دونوں بیچ دو۔ کافی سال سے بند پڑے ہیں۔ شادو اب ادھر نہیں رہتی ہے۔" شیر داد نے مجھے اور رانی کو بھیجا تھا کہ ہم کاغذات اس کے حوالے کر دیں۔ وہ بینک میں رقم منتقل کر دے گا۔ جب

ہم کاغذات اس کو دے کر واپس آ رہے تھے تو ڈرائیور کو بھوک لگنے لگی۔ اس نے سڑک کے کنارے اس چھپر ہوٹل پر گاڑی روک دی۔ شاید اللہ نے انہیں شاہدہ کا انجام دکھانا تھا۔ نہ وہ اچھی بیوی بن سکی ---- نہ اچھی ماں۔ اس وقت وہ چھپر ہوٹل کے تنور پر روٹیاں لگا رہی تھی۔ وہ تنور میں سے ایک بار روٹیاں نکال کر دم لینے کو رکی تھی اور گاڑی کی سمت اپنی گرمی سے جھلستے ہوئے چہرے اور راکھ ---- گرمی اور پانی بھری لگی ہوئی آنکھوں سے گاڑی کی سمت دیکھ رہی تھی۔ میں نے بلا لحاظ اٹھا کر شیشے پر چڑھا دیے۔ میں اس عورت کی شکل دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ رانی نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا ''پھوپھی! اللہ سے دعا کریں ---- شاہدہ کو اللہ معاف کر دے۔'' میں نے اس کے ہاتھ پر تسلی کی تھپکی دیتے ہوئے کہا ''اچھے! ---- بندوں کو دیے دکھ تو بندہ معاف کرتا ہے۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی ''پھوپھی! میرا اور آپ کا تو اس سے خون کا رشتہ نہیں ہے مگر شہزاد کی ماں ہے۔ ہم اسے اس حالت میں یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔'' ''مجھے معلوم تھا ---- رانی اتنے ہی نرم دل کی مالک ہے۔ میں نے کہا ''جیسے تمہاری مرضی'' میرا خیال تھا کہ اس وقت وہ جس حال میں ہے ---- ہمارے ساتھ چلنے پر راضی ہو جائے گی۔ اتنے میں شور کی آواز آئی۔ ہم نے بلا ضیائیہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ شاہدہ کے گرد لوگ جمع تھے اور وہ کسی آدمی کا گریبان پکڑے اسے مار رہی تھی ساتھ ساتھ گالیاں اور کوسنے بھی دیے جا رہی تھی۔ کچھ لوگ بیچ بچاؤ کرا رہے تھے۔ پھر اس نے اس آدمی کا گریبان چھوڑ دیا اور ننگے پیر بس اسٹینڈ کی طرف بھاگتی چلی گئی اور ایک بس میں سوار ہو گئی۔ اسی وقت بس اسٹارٹ ہوئی گویا اسی کے انتظار میں تھی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اسی وقت ہمارا ڈرائیور آ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا ''کوئی جھلی تھی ---- ہوٹل والے کہہ رہے تھے کبھی کبھی ادھر آ جاتی ہے۔ اپنی مرضی سے کام کرتی ہے۔ اگر کسی نے کچھ کہہ دیا تو اس سے جھگڑا کرتی ہے اور کسی بھی بس میں سوار ہو جاتی ہے ---- بے چاری۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ہم دونوں نے نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ''ہاں! ---- بے چاری۔''

◆◆◆

معروف غزل گو شاعر، مدیر 'نیرنگ خیال' راولپنڈی سلطان رشک انتقال کر گئے

معروف غزل گو شاعر اور برصغیر پاک و ہند کے کلاسیکی ادبی رسالے ماہنامہ 'نیرنگ خیال' راولپنڈی کے مدیر اعلیٰ سلطان رشک راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ سلطان رشک 10 اپریل 1943ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پہلے چند سال گوجر خان اور پھر بعد ازاں راولپنڈی منتقل ہوئے۔ گورڈن کالج راولپنڈی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کالج میں تعلیم کے دوران ہی ادبی سرگرمیوں میں متحرک ہوئے۔ دسمبر 1963ء میں حکیم یوسف حسن کے انتقال پر کلاسیکی ادبی رسالے 'نیرنگ خیال' کے مدیر بنے جس کی ادارت تا دمِ مرگ نبھاتے رہے۔ نیرنگ خیال میں برصغیر پاک و ہند کے تمام نامور شعراء اور ادیبوں کی نگارشات تسلسل سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ سلطان رشک کا اولین شعری مجموعہ ''دریا کی دلیل'' تھا۔ بعد ازاں ''کاغذ کا گھر'' کے نام سے دوسرا شعری مجموعہ بھی شائع ہوا۔ طنز و مزاح پر مبنی رسالے ''اردو پنچ'' کے بھی مدیر رہے۔ جڑواں شہروں کی معروف ادبی شخصیات احمد فراز، سید ضمیر جعفری، جوش ملیح آبادی، کرنل محمد خان، نثار ناسک، سید عارف، شوکت مہدی، کرنل سید مقبول حسین، زاہد حسن چغتائی، ڈاکٹر رشید نثار، حکیم فضل الٰہی بہار، جاوید مسعود ملک سے رفاقت رہی۔ کئی سال قبل فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے لیکن اسے مجبوری نہ بنایا اور علالت کے باوجود باقاعدگی کے ساتھ نیرنگ خیال کی اشاعت کا اہتمام کرتے رہے۔

لاحاصل

افشین نسیم

مختصر تعارف

مختلف رسائل اور اخبارات میں لکھتی ہیں ۔ ایک جاسوسی کتاب زیر طبع ہے اور "تخلیق" میں یہ ان کا دوسرا افسانہ ہے جو شائع ہو رہا ہے۔

طاہر نے اپنے بیڈ روم میں قدم رکھا۔۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں وہ ایک مدت سے تنہا رہ رہا تھا۔۔ ماں باپ کو بچپن میں گنوانے کے بعد دادا کے ساتھ ایک عرصہ تک اس گھر میں اکیلے ہی رہے تھے دونوں پھر ایک دن دادا بھی سڑک پہ پھسل کر سر میں گہری چوٹ آنے سے اسے دنیا بھر میں بالکل ہی تنہا چھوڑ گئے تھے۔۔ لیکن آج ۔۔ آج اس کمرے کی دھج ہی نرالی تھی اس کے بچپن کے جگری دوست تنویر نے بہت محنت اور محبت سے اس کمرے کو سجایا تھا۔۔ نیا رنگ و روغن ، گلابی دیواروں کے ساتھ گلابی کارپیٹ ، گلابی رنگ کے پردے ، اور کریم اور گولڈن امتزاج کا فرنیچر ، ، گلاب کے پھولوں کی لڑیاں جو بیڈ کے چاروں اطراف لٹک رہی تھی۔۔ اور بہترین خوشبو سے معطر اس کا حجلہ عروسی آراستہ کیا گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں بیڈ پر اسکی محبت ، طاہرہ ، اس خوبصورت ترین منظر کو مکمل کرتے ہوئے اس کے دل میں اتر گئی تھی۔۔۔ وہ آگے بڑھا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے اپنی ماں کی ہیرے کی انگوٹھی نکالی اور سرشاری کے عالم میں بیڈ کی طرف قدم بڑھائے۔۔۔۔۔ "طاہر ، طاہر ، یار باہر بھی آ جا میری امی اور بھابھی بھی آئی ہوئی ہیں ۔۔ ناشتہ کر لیں " تنویر نے کوئی تیسری بار دروازہ پیٹتے ہوئے کہا تھا دروازہ کھولا اور طاہر اور طاہرہ بے حد خوش اور سرشار کمرے سے باہر نکل آئے۔۔ طاہرہ کے بھی ماں باپ نہیں تھے۔۔ اسکی بڑی بہن اور بہنوئی موجود تھے سب نے ناشتہ کیا اور طاہرہ انکے ساتھ چلی گئی۔۔ طاہر تنویر اور اس کی امی اور بھابھی کا شکریہ ادا کرنے لگا کیونکہ انہوں نے ہی اسکی شادی میں مدد کی تھی رشتہ لے کر جانے سے بارات لے جانے تک ۔۔ دوسرے دن ولیمہ بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔۔ کچھ دن ناران کاغان گھومنے کے بعد طاہر اپنے آفس جانے لگا۔۔ پہلے طاہرہ بھی اسکول میں ٹیچر تھی لیکن اب طاہر کے مطابق ان دونوں کی زندگی کے لیے اسکا کمانا کافی تھا۔۔ وقت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے کی نعمت سے بھی نوازا اور فراخی اور دولت میں بھی اضافہ ہوا تھا۔۔ طاہر اس کو طاہرہ کے نصیب کی برکت کہتا تھا۔ طاہر کی شادی کے کچھ عرصے بعد ہی تنویر کی شادی اس کی امی کی پسند سے ایک گھریلو مگر عام سی شکل وصورت والی سلیقہ مند لڑکی سے ہو گئی تھی۔۔ لیکن چار سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم تھے۔ طاہرہ دوبارہ امید سے تھی۔ لیکن دولت کی فراوانی نے اب اسکے رنگ ڈھنگ بدل دیے تھے۔ لیکن بھلا طاہر کو اس بات کا احساس کیسے ہوتا وہ ہی تو اسکی کل کائنات تھی۔

"طاہر ، یار کبھی باہر ملتے ہیں " بہت دن بعد تنویر کی کال طاہر نے ریسیو کی اور فوراً ہی ہاں کر دی "ہاں ، یار کہو کیسے یاد کیا بھائی کو؟"

"طاہر نے اس کے بلانے پر ریسٹورنٹ میں میز پر بیٹھ گیا،، ساتھ ہی ویٹر کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔۔" کچھ نہیں بس دوستوں سے ہی انسان دل کی باتیں بلکہ بھڑاس نکال سکتا ہے اس لیے تمھیں یاد کیا ہے" تنویر نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔۔ طاہر کو ریسٹورنٹ کے خواب ناک اور خوبصورت ماحول میں تنویر کی مسکراہٹ اور لہجہ کچھ زیادہ ہی محسوس ہوا "میں بھائی ہوں تمھارا تنویر یار جو کچھ بھی ہے کھل کر کہو" طاہر نے اسکے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دلاسہ دینے والے انداز میں کہا تنویر نے ویران آنکھوں سے اسکی طرف دیکھا اور پھر رشک اور حسد سے پر ٹھنڈی سانس لی۔ طاہر حالات کی آسودگی کی وجہ سے بہت خوش اور آسودہ حال نظر آ رہا تھا۔۔ "مجھے چھوڑو تو بتا بھابھی اور بچے کیسے ہیں؟؟" طاہر نے محسوس نہیں کیا کہ اسکے لہجے میں کچھ بہت الگ ہے۔۔ "ماشاءاللہ بھئی تمھاری بھابھی اور بھتیجا بھتیجی سب خیریت سے ہیں۔۔ تم تو راستہ ہی بھول گئے ہو گھر کا۔ اب آتے کیوں نہیں ہو" طاہر نے پیار بھرے انداز میں شکوہ کیا تھا۔۔ وہ تنویر کی بدلتی ہوئی کیفیت سے بے خبر تھا اتنے میں ویٹر نے پرتکلف ڈنر میز پر رکھ دیا۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے ہی اچانک طاہر کو خیال آیا کہ وہ طاہرہ کو فون کر دے اس نے جیب سے موبائل فون نکالا تو اس کی بیٹری ختم تھی۔ طاہر نے تنویر سے کہا کہ وہ طاہرہ کو بتانا چاہتا ہے وہ کھانا کھا کر آئے گا۔ "اب یار میرے موبائل فون میں بیلنس نہیں ہے۔۔ اور تم اتنا بزدل کیسے ہو گیا کہ میرے ساتھ کھانے کی اطلاع بھی بیوی کو دے گا" تنویر کا انداز اس قدر استہزائیہ تھا کہ طاہر چپ کر گیا۔۔ وہ دونوں رات بہت دیر تک اپنی پرانی گلیوں پر گھومتے اور پرانے دوستوں سے ملتے رہے۔۔ تقریباً ایک بجے جب طاہر گھر پہنچا تو اس کے خیال میں طاہرہ سو گئی ہوگی لیکن وہ جاگ رہی تھی۔۔ اور بہت پریشان بھی تھی۔۔ "کہاں رہ گئے تھے آپ میں نے کہاں کہاں فون نہیں کیا تھا" اس نے پریشانی سے کہا تو طاہر مسکرا دیا اور اس کو بانہوں میں بھر کر پوچھا "بچے سو گئے ہیں کیا" طاہرہ سب بھول گئی تھی یہ بھی کہ اس نے سب سے پہلے تنویر کو فون کیا تھا اور اس نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔۔۔

"تم میری زندگی میں عذاب بن کر نازل ہوئی ہو۔ تمھاری بدقسمتی سے میں ٹھکانے لگا رہا ہوں۔۔ نا تو نے مجھے اولاد دی دی ہے۔۔ منحوس عورت نکل جا میری زندگی سے" تنویر کی چنگھاڑتی ہوئی آواز نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔۔ "چل آج میں تجھے تیرے ماں باپ کے گھر پھینک کر ہی آؤں گا" وہ آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگا۔ اماں نے روکا تو وہ ان پر الٹ پڑا تھا پھر بلقیس نے برقع پہنا کر اور کچھ کپڑے بیگ میں ڈالے باہر آ کر اپنی ساس کو سلام کیا اور کہا۔ "ان بارہ برسوں میں تنویر کو دیا ہی کیا ہے سوائے دکھوں کے یہ مجھے چھوڑ آئیں" وہ کہتے ہوئے دروازے کے باہر چلی گئی اور تنویر ہکا بکا اس کے پیچھے چلا گیا۔۔ غصے میں بائیک چلاتے ہوئے اچانک سامنے سے آتی ایک لینڈ کروزر سے اٹ کر آگے چلتی ہوئی دیہاتی عورت بائیک کی زد میں آ گئی۔۔ حادثہ تو خطرناک نہیں تھا لیکن وہ عورت رحیم داد ہزارے کی بیوی تھی جو دوسرے بچے کی آپریشن سے پیدائش کے لیے شہر آئی ہوئی تھی بائیک کی ٹکر سے وہ کچھ اس طرح گری کہ جاں بحق ہی ہو گئی۔۔ رحیم داد نے تنویر کو پولیس کے حوالے کر دیا۔۔ بلقیس نے اپنے باپ بھائیوں سے مدد مانگی اور پھر کیس چل گیا۔۔ بہر حال رحیم داد نے پچیس لاکھ دیت خون بہا کے مطالبے پر تنویر کی جان بخشی کا پروانہ دے دیا تھا۔

تنویر پولیس کی لسٹ پر آ گیا تھا اس لیے اس کی نوکری چھوٹ گئی تھی۔۔ بلقیس نے کپڑے سینے اور سلائی کڑھائی کا کام شروع کر دیا تھا۔۔ ساتھ ہی اپنا زیور بیچ کر اس نے گھر کے باہر کے حصے میں تنویر کو کریانے کی دکان کھلوا دی تھی۔۔ انہیں حالات میں تنہا اکی زندگی میں بہار بن کر داخل ہوئی تو تنویر کو اپنے تمام دوستوں کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کا خیال آیا تھا۔۔ اس نے بلقیس سے ذکر کیا تو وہ چپ سی ہو گئی۔۔ تنویر جو اسکے

سلیقے اور وفا کا گرویدہ ہو گیا تھا اس کو فوراً محسوس ہوا۔ ایک اصرار پر شمس نے بتایا کہ "میں سب سے پہلے طاہر بھائی اور عاتیہ کے گھر مدد کے لیے گئی تھی۔۔۔ عاتیہ نے میری بہت بے عزتی کی تھی اور مجھے اور اماں کو چلے جانے کو کہا تھا۔ اور یہی نہیں اس نے مجھے بدتہذیب بھی کہا تھا۔۔۔ لیکن اس وقت مجبوری تھی گھر سے ہم واپس آ گئے تھے۔۔۔ طاہر بھائی دوسرے دن دس لاکھ کا چیک دے گئے تھے۔۔۔ میں نے واپس کرنا چاہا تو ہاتھ جوڑ کر رونے لگے تھے۔۔۔ مجبوراً میں نے رکھ لیا تھا۔ آپ کی جان بخشی کے لیے ضروری تھا لیکن اب میں انکی وہ رقم لوٹانے کے لیے بی سی ڈال کر انتظار کر رہی ہوں۔۔۔" عتیقہ بس خاموش ہو گئی تھی" اور تو یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا دوست بدل گیا ہے۔۔۔ طاہر نے عاتیہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے بچوں کو لے کر کینیڈا اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔۔۔ طاہر کی بے تحاشا محبت، اعتبار اور آزادی نے اس کو اتنا خود سر کر دیا تھا کہ وہ اب کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔۔۔ اس کا مطالبہ تھا کہ طاہر بھی اب کینیڈا چلے، اس ملک میں کچھ نہیں رکھا ہے۔۔۔ طاہر نے گھر میں داخل ہو کر خالی گھر کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ اس نے زندگی سے کیا پایا ہے۔۔۔ کچھ حاصل بھی کیا ہے یا لاحاصل رشتہ اور بے مقصد زندگی گزار آیا ہے"۔

◆◆◆

عالمی اردو کانفرنس اور نفاذ اردو مشن سے گریز!

فاطمہ قمر (پاکستان قومی زبان تحریک)

پاکستان میں 77 سال سے عالمی اردو کانفرنس ہو رہی ہیں ان کانفرنسوں سے نفاذ اردو مہم کو کیا فائدہ ہوا؟ جن کے ایجنڈے میں نفاذ اردو شامل ہی نہیں ہے "عالمی اردو کانفرنس" کا انعقاد کرنے والے آج تک اردو کو تعلیمی، سرکاری، عدالتی زبان بنانے کے لیے آواز اٹھا سکے تو اردو کو عالمی زبان کا درجہ کیونکر دلا سکیں گے؟ ان کا مشغلہ اردو کے نام پر گرانٹوں کے نام پر فنڈ وصول کرتے ہیں اور اردو کے نام پر نوکری کرتے ہیں۔ نفاذ اردو ان کا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ عالمی اردو کانفرنس کے منتظمین کے نزدیک نفاذ اردو "قومی مسئلہ" ہے اس لئے قوم اپنے مسئلے کو خود حل کرے۔ عالمی اردو کانفرنس کی جتنی بھی نشستیں ہیں ان میں علاقائی زبانوں سے متعلق بھی نشست ہے لیکن نفاذ اردو کے حوالے سے کوئی ایک نشست نہیں ہے۔ منتظمین کانفرنس اس بات کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ جب زبان ہی اپنی بقا کے خطرے سے دوچار ہے تو ادب کیسے پروان چڑھے گا؟ دنیا میں اور بھی زبانوں کے ادب ہیں بلکہ بڑی بڑی عالمی زبانیں بھی ہیں ان زبان کے ادیب کہیں بھی اپنی زبان کے نام پر "عالمی ادبی کانفرنس" منعقد نہیں کرتے؟ کیا کبھی کسی نے سنا ہے عالمی انگریزی کانفرنس، عالمی فارسی کانفرنس، عالمی عربی کانفرنس؟ جبکہ ان کے باوجود وہ زبانیں نہ صرف انتہائی عالمی زبانیں ہیں بلکہ اپنے ملک کی بھی سرکاری زبانیں ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے ادیب خود اپنی زبان کو عزت دیتے ہیں۔ اس کے وقار کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ انگریزی کے نام پر کانفرنس کا انعقاد کر کے اس کے دعوت نامے اردو میں یا کسی اور غیر ملکی زبان میں شائع کریں۔ وہ ادیب دوغلے پن کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اس کے برعکس پاکستانی ادیب اپنی زبان کے حوالے سے انتہائی احساس کمتری کا شکار ہیں۔ جس زبان میں وہ پیدائش سے لے کر موت تک ذاتی زندگی سے لے کر سماجی زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں لیکن اس زبان کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس میں دعوت نامے بھی شائع کیے جائیں۔ ادب کے نام پر "عالمی اردو کانفرنس" منعقد کرنے والے کیا کسی اور زبان کی اپنی زبان سے متعلق بے حسی کی ایسی دوسری مثال پیش کر سکتے ہیں؟ آج کوئی گوئٹے، غالب اور اقبال کی شاعری پر بات بھی کرتا ہے یا ان کی کسی تقریب کا انعقاد برطانیہ میں کرتا ہے تو وہ اپنے دعوت نامے انگریزی ہی میں شائع کرے گا۔ اس کے برعکس پاکستان میں گزشتہ دنوں شیکسپیئر کی شاعری پر ایک نشست منعقد ہوئی تو تمام کارروائی دعوت نامے سے لے کر مقررین تک انگریزی میں خطاب کرتے رہے۔ جیسے ان کے شرکا بڑے عالم ہوں اور وہ ان سے شیکسپیئر کی شاعری کی خوبیاں منوا رہے ہوں۔ غلام قوموں کے معیار بھی غلام ہی ہوتے ہیں!

غزلیں

سحر انصاری

O

پار دریا اُتر نہیں سکتے
اک دیا بھی جلا نہیں سکتے

کشتی و بادبان و موج رواں
وہ کنارے ملا نہیں سکتے

کون کہتا ہے کائنات کے راز
ایک دل میں سما نہیں سکتے

یہ محبت کی دوڑ ہے اس میں
آپ مجھ کو ہرا نہیں سکتے

گر حقیقت ہو کچھ سوچو
اپنا ماضی بھلا نہیں سکتے

پوچھتے ہیں وہ آنکھوں آنکھوں میں
کیا یہ آنسو چھپا نہیں سکتے

کار دنیا بھی اک حقیقت ہے
ہم تجھے یاد آ نہیں سکتے

OOO

صابر ظفر

O

خلوت گل سے آشنائی کی
اور ہم رنگ دلربائی کی

پھر گل شگفتہ سامنے ہے
پھر سے تقریب رونمائی کی

گل و بلبل ہیں ساتھ یوں جیسے
دوستی آبجو سے کائی کی

کھلتے ہی مژدہ پانے قرار پایا
میں نے گلزار کی صفائی کی

گل نے خود کو سمجھ کر دیکھا
یعنی یوں بھی گرہ کشائی کی

کون آیا تھا باغ کی جانب
ایک اک گل نے جبہ سائی کی

گلشن دہر میں ہم ایسے پھرے
گل کے ہر روپ تک رسائی کی

گل ہوا میں کھلا دیا ہم نے
یعنی جو بات کی بھلائی کی

OOO

انور شعور

O

کرتے رہتے ہیں شکر ادا ہم
دوسروں کے اور اپنوں کے کرم

شہر میں بھی رہتی ہے جانے کیوں ہمیں
بے قراری، گاہ بے حد، گاہ کم

رُخ مسافر کا کسی بھی سمت ہو
اٹھ رہا ہے ہر قدم سوئے عدم

روز رخصت ہو رہے ہیں لوگ آہ
مستقل رہنے لگا ہے دکھ بہم

منزل آنے میں لگی ہے ایک عمر
راہ میں تھے پیچ و خم ہی پیچ و خم

خوب، دنیا میں علامت امن کی
ہیں خطرناک اور وحشت ناک بم

میری ہر تحریر اب تاریک ہے
کر لیا میں نے قلم گویا علم

سر سے ٹلتا ہے کہاں جلدی شعور
سر پہ آتا ہے تو وہ جاتا ہے جم

OOO

آصف ثاقب

O

کرے ہر لفظ کو تعمیر جیسا
بنے شام غزل کو تیر جیسا

مرے آنسو رواں ہو جاتے ہیں یوں
ملا گیت مجھ کو ہیر جیسا

میں اس کو آنکھ بھر کر دیکھتا ہوں
جو ہے دیوار پہ تصویر جیسا

پھر اک یاد میں روتی ہے ماں
بہائے آنسو آنسو نیر جیسا

ہمارے دین کی پھر آن رکھے
کوئی میدان میں ہو شبیر جیسا

میں جن کے دم سے خوش ہوں رہنے والا
ترا ہر بول ہے تحریر جیسا

تمہارا حرف میں نے سن لیا ہے
ہوا اظہار ترا تو تیر جیسا

جو ٹھہروں تو ٹھہر جاتا ہوں ثاقب
ستارہ ہے مرا رہ گیر جیسا

OOO

محمود شام

O

کیجئے سیر چمن، غنچوں سے باتیں کیجئے
تتلیوں کو پکڑیے، پتوں سے باتیں کیجئے

عالم وحشت ہے انسانوں سے رکھئے فاصلہ
پتھروں کو چومیے، اینٹوں سے باتیں کیجئے

حلقۂ احباب میں اب کچھ اثر نہیں
خامشی میں عالمیت، ساعتوں سے باتیں کیجئے

ہر گلی مجبور ہے تحریریں بے آواز ہیں
تو لکھے پھر بولیے، صفحوں سے باتیں کیجئے

دیکھ بھوکی آنکھیوں میں تشنگی ہر ایک کے
دیکھئے چاروں طرف، ذاتوں سے باتیں کیجئے

آپ کتنے خاص ہیں یہ بات اب تو عام ہے
اپنی بابت سوچئے، بچوں سے باتیں کیجئے

ہر گھڑی ہے تیری میری شکل وہ رکھتے ہیں پر نظر
بالکونی میں گئے، بگلوں سے باتیں کیجئے

OOO

خالد اقبال یاسر

O

غلط بھی نہیں ہوا کہ فیصلہ بدل گیا
دلیل کارگر ہوئی تو ضابطہ بدل گیا

مرا رفیق بن گیا فریق ساتھ چھوڑ کر
مسل وہیں وہی رہی مقدمہ بدل گیا

گلی تو اس کی دھول ہی تھی عمر بے لحاظ میں
مگر گواہ چشم دید کا بیاں بدل گیا

وہی ہے مدعا مرا وہی ہے بے رخی تری
ادا زبان اور ہے محاورہ بدل گیا

سوال وصل یار تھا جواب ہے ابھی
جو ایک مہرباں ہوا تو دوسرا بدل گیا

وہی ہے راستہ مرا وہی ہیں اس کے پیچ و خم
وہی ہے منزل مراد راستہ بدل گیا

شکست و فتح ایک طرف ثبات میں کمی نہیں
وہی محاذ آج بھی ہے مورچہ بدل گیا

دل اجڑ گئے پہ یاسر اعتبار کس لیے کریں
نصیب خود ہی لکھ لیا تو زائچہ بدل گیا

OOO

قیصر نجفی

○

سائے میں جس شجر کے تھے بیٹھے لگے ہوئے
اب دیکھیے وہاں تو ہیں پتے گرے ہوئے

شاید مرے خطوں کا ہوا آئی ہے جواب
اڑتے ہوئے ملے مجھے کاغذ جلے ہوئے

پھیلی ہے اس دیار میں شاید کوئی وبا
ہر شخص کو ہیں جان کے لالے پڑے ہوئے

پکڑا کا حسن کا، اہلِ جلے لائے ہیں پردہ سر
کس اہتمام سے ہیں وہ رستے سجے ہوئے

ہر چہرے پہ لکھی ہے وہاں داستانِ مرگ
انساں ہیں وہ کہ قبروں پہ کتبے لگے ہوئے

وہ یوں کھڑے ہیں جابجا ویران شہر میں
پودے ہوں جیسے دشت میں خودرو اگے ہوئے

قیصر ستم ظریفی حالات دیکھیے
قاتل ہیں جو وہ ہیں مسیحا بنے ہوئے

OOO

سیّد ریاض حسین زیدی

○

مالیت ہے ضبط فضاؤں میں
شاید اب وہ ملے خلاؤں میں

کرتی ہو گئی ہے ناکردہ
بے خطا بھی ہیں اب خطاؤں میں

دشت و دریا میں کشتیاں اوجھل
تیریں اجڑی ہیں یہاں ہواؤں میں

بجلیاں ہو گئی ہیں گل ساری
اب سویرا نہیں ہے گاؤں میں

اس کی پلکوں میں راحتِ جاں ہے
بیٹھ جاتا ہوں ٹھنڈی چھاؤں میں

کوزوں میں بھی لہر مندی
کامرانی ہے اب تو "ناؤں" میں

لوہا ہونے سے کام رکھا ہے
جادو جاگا ہے پھر نواؤں میں

ہے روشنی ہر بھی شرمندہ
بے اثر کے رہا ہے پاؤں میں

OOO

اقتدار جاوید

○

اک عکس سی دیکھے گی، اک عکس سا دیکھے ہے
اب کھینچ اور کوئی تو اب بھی تجھ پہ ہی جا لکھے ہے

ہے خاص تو ہے ہنستے گلے کی، واضح جو ہے ہنستے گلے کی
کوئی جھلمل جھلمل کرتا ہے راتوں کا راز مرے ہے

جب لوٹ کے تنہا جاتی ہے، دریچوں میں تکتی جاتی ہیں
اب گھر وہ رنگ سجاتی ہیں، اس دل کو ڈھکے ہے

پہلے وہ صورت تکتی تھی، تکتے ہوئے دیکھی تکتی تھی
اب پلٹا پلٹا پھیلا ہے، اک عکس غبار آ دیکھے ہے

کچھ عکس اوپر آتی ہیں، جب خلاؤں تو بھر جاتی ہیں
جو اشک گرے وہ اشک کرے ان آنکھوں کے روزن سے ہے

جو ساری لرزش جاتا ہو، جو ٹھہرا ٹکڑا پھیلا ہو
جو دیکھے لرزاں کرتے ہے، کا جو ترکے سارے ہے

اک میں سے سارے میں بے لی آوازیں کی لے کر لی ہے
اقتدار سلامی رستے پہ تصویر لگائی رکھے ہے

ہے رنگی پہ رنگی پہ، میں شعروں کی آوارگی ہے
اک ہوا مسافر سینے میں، جس رستے گماں دیکھے ہے

ہے صبح کوئی آساں کی، ہے عمر خاص پہلی کی
اک گرم دو پہر سندر کی، اک نرم بچھونا دیکھے ہے

OOO

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

○

کرم ہے اس کا رتِ ہجر میں مہلت قرار دی
دل کو دل رُبا بھی دی، ادا سے بے شمار دی

حیات مختصر تھی لیکن اس قدر کبھی نہ تھی
کہ ایک رات بیٹھ کر ہی زندگی گزار دی

نہ فرصت فروغِ دید تھی کہ دیکھتے اسے
جو شے بھی ہاتھ لگ گئی وہ میں نے اس پہ وار دی

نظروں کی پالکی اٹھائے نکل پڑے تھے اس طرف
دل ہزار درد میں یہ پالکی اتار دی

تجھے کچھ کے لیا ہے کیا مرے خیالِ زود رس
ترے لیے تو زندگی یہ جیت کر بھی ہار دی

نظر ہما کے ہی رہے ہیں چوڑ خیال پر
درست کر دیا گیا الف بھی سنوار دی

خزاں کی رت میں تجربہ کیا اس چمن کی پرورش
ترے قدوم میمنت لزوم نے نکھار دی

○○○

مسلم شمیم

○

وقتِ رخصت ڈھلک گیا آنچل
جاتے جاتے برس گیا بادل

سازِ ہجر و وصال چھیڑ گیا
ساتھ اس کا رہا تھا بس دو پل

اس کا جانا تھا، چھن گیا جیسے
ایک پیاسے کے ہاتھ سے چھاگل

بھیگتے ہی رہے آنکھوں کے کنول
زندگی ہے کہ درد کا جنگل

صبح ہوتی ہے شام کی صورت
ایک جیسا یہاں ہے آج اور کل

دل سمندر میں کوئی طوفاں ہے
ساحلِ جاں پہ کیسی ہے ہلچل

کچھ ہوا مائلِ جراحت ہے
دیکھ کر پتھروں کو حسن پاگل

○○○

احمد صفی

○

رابطہ جسم و جاں دیکھیے کب تک رہے
زیست کا ہم پہ گماں دیکھیے کب تک رہے

ہم پہ فلک مہرباں دیکھیے کب تک رہے
دورِ لطفِ دلبراں دیکھیے کب تک رہے

عہدِ تیشہ زناں دیکھیے کب تک رہے
فکر کا کوہِ گراں دیکھیے کب تک رہے

وہ مرگ آشنائی عشق کو کب تک رہے
حسن میں شعلہ فشاں دیکھیے کب تک رہے

پھر وہی مرگ و حیات، درد، الم و بلا
اس دلِ آشفتہ جاں دیکھیے کب تک رہے

آ رہی ہیں پھر نظر جلوہ فگن اور یاں
شہر میں امن و اماں دیکھیے کب تک رہے

جوہری تھے یہ آئی انتقام جاہ کا
ظلم ہر ان کا سماں دیکھیے کب تک رہے

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ کہہ گئے غالب مگر
گردشِ ساعت آسماں دیکھیے کب تک رہے

○○○

بیدار سرمدی

O

ہر لمحہ نیا رنگ دکھا دیتی ہیں شامیں
ماحول کو کس طرح سجا دیتی ہیں شامیں

لے جاتی ہے اک پھول اگر توڑ کے دنیا
ڈالی سے نیا پھول اُگا دیتی ہیں شامیں

بے رحم زمانے کو بخشیں نہیں شاہد
کیوں سب کی طرف ہاتھ بڑھا دیتی ہیں شامیں

ہیں جان کے دشمن بھی وہی دن کو جو جھلسے
سایہ بھی نئی ٹھنڈی ہوا دیتی ہیں شامیں

سچ پوچھئے بیدار تو ویران دلوں کو
اک پل میں ہی گلزار بنا دیتی ہیں شامیں

OOO

خاور اعجاز

O

جشن و آب نہ کچھ خاک بدلنے سے ہوا
مجھ میں تبدیل کوئی چاک بدلنے سے ہوا

کچھ تو پہلے سے ہی تاریک تھا سارا منظر
کچھ فزوں اور مرا طاق بدلنے سے ہوا

سب مجھے دیکھتے ہیں میرا کفن سرکا کر
برگزیدہ نہیں یہ پوشاک بدلنے سے ہوا

بارے ہم سلسلۂ تیرہ شبی سے بھی گئے
اور کیا جامۂ صد چاک بدلنے سے ہوا

دہر کی کارگری اپنی جگہ پر لیکن
حادثہ تو میاں تریاق بدلنے سے ہوا

یوں تو میں پہلے ہی تھا مفلس و نادار بہت
اور کچھ کاسۂ افلاک بدلنے سے ہوا

آگ تو پہلے بھی موجود تھی لیکن خاور
جو ہوا وہ خس و خاشاک بدلنے سے ہوا

OOO

اسلم سحاب ہاشمی

O

آنکھوں میں شب کے کٹتی ہیں برسوں کی راتیاں
تنہا فضا میں ہو گئیں کیا کیا کہانیاں

ہاں اک گلوں کی شاخ نے ہم کو رجھا لیا تھا
اب خواب رفتہ ہو گئیں اپنی جوانیاں

اپنی زمیں سے جن کے قدم تک نہ ہو سکے
ان کی سمجھ میں آئیں نہ رشتے پرانیاں

اب میرے گھر کا طور طریقہ جدید ہے
دادی مری تو ختم ہو گئیں قصہ خوانیاں

ہاتھوں میں غیر کے جو ہتھیں اور مرتیں
مہندی کی طرح ہوتی ہیں "دھانیاں نمانیاں"

تقدیر کے قلم نے جو لکھا سو لکھ دیا
کام آ گئیں کو دو گھر کی کہاں کامرانیاں

پہنچا سحاب کل جو اسی کوہ طور پر
اب تک فضا میں گونجتی ہیں لن ترانیاں

OOO

اظہر فراغ

O

وہ جسے شوقِ قرب زیادہ ہو
یہ ضروری نہیں کہ پیاسا ہو
یوں بچھڑ ساتھ زمانے کے
جیسے گھر میں کوئی اکیلا ہو
آسماں ایک تو نہیں سب کا
کیا پتہ اس کا ہاتھ پکڑا ہو
جس طرح ہم بنے ہیں احوال اس کی
اس نے دیوار ہی نہ دیکھا ہو
صرف دیکھ خلا بے ملے میں
کس کوئی پوچھ لے کہ زندہ ہو

OOO

O

کہاں پہ سکۂ حرص و ہوس نہیں چلتا
شریف دوست یہاں جس کا بس نہیں چلتا
تمہارے ترش رویے کا رعب اپنی جگہ
ہمارے ٹھٹھے پہ لیموں کا رس نہیں چلتا
وہ جانے ہم نے تجھے کب سے تاب پہ رکھا ہے
اداس ابھی بھی اتنے برس نہیں چلتا
دکھائی دیتی ہے راہِ فرار مجھ کو مگر
مرے بغیر نظامِ قفس نہیں چلتا
یہاں کا قرق ہے چپ چاپ ساتھ دیجیے
ہر ایک قافلے میں ہے جرس نہیں چلتا

OOO

شہزاد نیّر

O

کہیں پہ کھوٹا چہرہ مرے قریں نکلا
وہ شخص دل کی زمینوں سے پھر نہیں نکلا

وہ چاند ایسا نہیں تھا کہ ہر نگاہ میں ہو
جہاں تلاش تھا اس کو فقط وہیں نکلا

غلط تھا میں کہ مری ہی نظر درست نہ تھی
جو دل کی آنکھ سے دیکھا تو وہ حسیں نکلا

دکھائی دیتا رہا تھا جو دور چاند کہیں
بغور دیکھا تو وہ روح کا مکیں نکلا

بدن کی دھول میں چلتے ہوئے وہ خوش قامت
میں آسمان سمجھتا تھا وہ زمیں نکلا

الٹ گیا تو میں سمجھا کہ جا چکا ہے کہیں
پلٹ کے دل میں جو دیکھا تو وہ یہیں نکلا

وہ خوب سوچ سمجھ کر خدا ہوا نیّر
جو بے ثمر نظر آتا تھا وہ امیں نکلا

OOO

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

O

ہم کو اپنے قلب و جاں کو آزمانا چاہیے
لفظ کی دھرتی پہ گردوں بنانا چاہیے

حرفِ حق رہیں تو زندگانی شاد کام
راستے کی مشکلوں کو بھول جانا چاہیے

کام کرنے کا ارادہ ہو تو موسموں سے بے نیاز
سردیوں کو گرمیوں کو بھول جانا چاہیے

لفظ کے بے ساختہ اشعار ہو کے جائیں گے
کچھ ہنر اور کچھ طبیعت شاعرانہ چاہیے

درد انساں اور اپنی مختصر سی زندگی
درد انساں کے بیاں کو اک زمانہ چاہیے

ہم نے روشن کر لیے ہیں ہم رہِ حسرت کے چراغ
اب کہیں رکنا نہیں ہے چلتے جانا چاہیے

راہ میں چلتے ہوں کانٹے پھول بنتے جائیں گے
مشکلوں میں خوب ہنستا مسکرانا چاہیے

OOO

احمد ندیم رفیع (امریکہ)

O

آگہی روشنی سے بہتر ہے
روشنی تیرگی سے بہتر ہے
گفتگو خامشی سے بہتر ہے
خامشی بے رخی سے بہتر ہے
زندگانی کا مختصر لمحہ
وقت کی راگنی سے بہتر ہے
وصل کی شب کا ٹمٹماتا دیا
ہجر کی چاندنی سے بہتر ہے
ایک دوشیزہ اپنے جوبن پر
آسمانی پری سے بہتر ہے
جلوہ آرا ہو سامنے جب حسن
ہوش دیوانگی سے بہتر ہے
ایک دریدہ دامن کی صحبت
مخمل سے کسی سے بہتر ہے
راست ہو انجانے شوق اگر
تو میانہ روی سے بہتر ہے
حسن تہذیب ہو لطف اگر
تو لطف سادگی سے بہتر ہے
چاہے نیت ثواب ہی کیوں نہ ہو
پھر بھی نیکی بدی سے بہتر ہے
ہو کسی اور کو ہنسا کے ملے
وہ خوشی ہر خوشی سے بہتر ہے
نفع نقصان کا نہیں جھنجھٹ
عشق سوداگری سے بہتر ہے

OOO

احمد نوازؔ

O

اہل زر کو جو افلاس کا سبب دیکھتے ہیں
وہ تو بس اپنا جہاں، اپنی طرب دیکھتے ہیں

دیکھتے کب ہیں وہ محرومی خلق مضطر
یوں تو کہتے ہیں کہ اب دیکھتے، اب دیکھتے ہیں

یوں بدل دیتا ہے جلوہ ترا سب معمولات
ہونے لگتی ہیں آنکھیں تجھے، لب دیکھتے ہیں

دیکھیں اکون تجھے میری نظر سے دیکھے
دیکھنے کو تو تجھے آئینے سب دیکھتے ہیں

دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھنے والا تو نہیں
اور پھر چھپ کے ترے عارض و لب دیکھتے ہیں

پھر پکارتا ہے جنوں، دل بھی مچلتا ہے مگر
دیکھتے وقت بھی ہم حد ادب دیکھتے ہیں

بعد میں اٹھ کے وہ وہ نوش ہو کے ملا کرتے ہیں
پہلے ہیں ہم کو ذرا حسن طلب دیکھتے ہیں

ان کا کہنا تھا کہ اک بار ادھر دیکھیں گے
آنکھ مشتاق ہے، اب دیکھیے کب دیکھتے ہیں

حادثہ کیا بھی ابھار تحسین ہو احمدؔ
دیکھنے والے مگر ان کا سبب دیکھتے ہیں

OOO

شہباز انورؔ خان

O

جن پہ ان کے ستم نہیں ہوتے
وہ کبھی محترم نہیں ہوتے

کم تو ہوتی ہیں قربتیں لیکن
فاصلے دل کے کم نہیں ہوتے

چند لمحوں کا ساتھ ہوتا ہے
یار تو ہم قدم نہیں ہوتے

داستاں کہہ رہے تھے عشق و اثر
بے زباں تو صنم نہیں ہوتے

لکھتے جائیں گے داستاں اپنی
ہاتھ جب تک قلم نہیں ہوتے

وہ بھی ہمدم تھے ہر محفل
وہ جو کہتے تھے ہم نہیں ہوتے

ان کو ملتی ہیں منزلیں انورؔ
حوصلے جن کے کم نہیں ہوتے

زندگی بے مزہ ہے وہ انورؔ
جس میں شامل الم نہیں ہوتے

OOO

طاہرؔ منظور

O

اک جہاں کے تقاضے اور تھے کچھ
دلِ مضطر کے ولولے اور تھے کچھ

جنہیں سمجھا تھا اپنا غیر نکلے
حقیقت میں سہارے اور تھے کچھ

نظر جو آج آئے ہیں پیارے
محبت کے یہ رشتے اور تھے کچھ

ہمارے تو وہی جہاں و گھر تھے
مگر ان کے ٹھکانے اور تھے کچھ

نگاہیں پھیر لیں تم نے اگرچہ
ملے تھے جو اشارے اور تھے کچھ

وہ ہم پہ یوں اگر برہم نہ ہوتے
ہمارے تو ارادے اور تھے کچھ

عداوت بھی دکھاوے کی ہے طاہرؔ
عقیدت کے وہ سجدے اور تھے کچھ

OOO

غلام شبیر اسدؔ

O

جہاں آئینہ خود کا آئینہ ہو
وہاں دوئی کا معنی انتہا ہو

اشارے سے کنارے کے سفر میں
تلاطم قطرہ ہی کھلتا ہو

زمانوں پہ ظلمت کو ہے کافی
قیامت جب طریقِ کربلا ہو

خلافت، پانچویں کو جاں فدا ہے
بچ جاتے ہے وہ یکتا کو پہنچا ہو

یہ آوازوں کو حیرت ہے کہ جیسے
کوئی خاموش بازی لے گیا ہو

اسدؔ اک خواب کے تیشے سے ظاہر
عزائم ناگہاں اور عین تعبیر ہو

OOO

کلیم احسان بٹ

O

یہاں ذرا ذرا مرے ذہن میں اُتارا خوف
کہ تیغ تیغ کے کمروں میں پھر پکارا خوف

کسی نے چاپ بچھائی ہمارے رستے میں
ہمارے پاس سے بچتا رہا ہمارا خوف

سیاہ رات میں آنکھیں چراغ ہو جائیں
نکال دے مرے دل سے کوئی تمہارا خوف

کسی کو وہم تجسس میں ڈال دیتا ہے
کسی کے واسطے سب سے بڑا سہارا خوف

لکھے جاتے مرے دشمنوں کے افسانے
مری رگوں سے مرے یار نے گزارا خوف

ہمارے جسم سے یہ دو خوف چپکے ہیں
خدا کا خوف، زمانے کا، پھر تمہارا خوف

OOO

شفقت حسین شفق

O

ساحل سمندروں کی حفاظت پہ ڈٹ گئے
پھر اشک میری آنکھ کے اندر سمٹ گئے

میں بے طلب شخص اک منتظر رہا
بادل مرے لیے کہیں اور چھٹ گئے

مشکل سے اک دیا تھا اک چاند کی کرن
تارے ہوا میں باندھ کر پلٹ گئے

ہر سمت تیرگی ہے اجالوں کے باوجود
روشن تو ہیں چراغ مگر لو سے ہٹ گئے

شور جہاں میں ہم کو تری جستجو رہی
جس سے ملا تمہارا اسی سے لپٹ گئے

ہر مرض کی دوا ہے مگر عشق کی نہیں
میں تھا مریض عشق مرے نقش کٹ گئے

OOO

خضر سلیم

O

مرے بے ربط خوابوں کی کوئی تعبیر تو ملے
کسی تخریب نے کھینچا کوئی تصویر تو ملے

اسے سب تو کہتے ہیں پر یہی اک سیاہی ہے
دکھائے ہم کو راہ حق کوئی شبیر تو ملے

مقدر تو مرے لوگوں کا سنورے گا کبھی مولا
تمنا تھامے باتوں میں کبھی تقدیر تو ملے

گو ماضی کا ہے قصہ اب تجارت تو غلاموں کی
پڑی لوگوں کی گردن میں مگر زنجیر تو ملے

مری بستی کے آنگن میں تو راتوں کے ہی ڈیرے ہیں
طلوع صبح کی اب کوئی تدبیر تو ملے

ڈھلیں سب جہالت کی تقدیر پہ دار چڑھائیں گی
مہاوں سے ترے اس علم کی شمشیر تو ملے

OOO

وسیم جبران

O

مار ہی ڈالا ہے دل کو یہ انکار کا دکھ
تم کو کیا یاد کہ کیا ہے غم یار کا دکھ

مجھ سے بچھڑا ہے تو کس حال میں رہتا ہوگا
رات دن مجھ کو ستاتا ہے مرے یار کا دکھ

جب شکاروں میں نکلے تو زیاں کتنا ہے
جانتا ہے کہاں کوئی یہ انکار کا دکھ

سامنے کس کے بھلا کھول کے میں دل رکھ دوں
کاش آ جائے مسیحا مرے پیار کا دکھ

کتنے ہیرے ہیں جو بک جاتے ہیں دو کوڑی میں
کون سمجھے گا بھلا حسن کے بازار کا دکھ

کامیابی پہ میں اپنی بہت افسردہ ہوں
جیت سے اپنی زیادہ ہے تری ہار کا دکھ

کتنے خوش بخت ہیں جبران پرندے سارے
کاٹنے پڑنے کی کوئی فکر نہ گھر بار کا دکھ

OOO

احمد سبحانی آکاش

O

جب بھی احساس کو خواہش کی ہوا لگتی ہے
دل دھڑکنے کی صدا کان سے آ لگتی ہے

روز خیرات میں کھلتے ہیں کئی راز ، چلو
روز دیکھو پہ لبے کی صدا لگتی ہے

ایک ساعت میں اٹھائے ہوئے ہاتھوں کی قسم
ہر دعا مانگی ہوئی میری دعا لگتی ہے

آ مرے دل میں تجھے آج وہاں لے کے چلیں
باد صرصر بھی جہاں باد صبا لگتی ہے

آ ذرا سانس تو لے، دیکھ گزرتے ہوئے دن
روشنی آج چراغوں سے خفا لگتی ہے

جب سے ہو کر وہ گیا ہے مرے کاشانے سے
گھر کی ہر چیز کوئی یاد نما لگتی ہے

یہ ضروری تو نہیں عشق بھی تقسیم کرے
بات جو علم و فراست کو بجا لگتی ہے

زندگی تو بھی مروت کی رواداری میں
پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے جا لگتی ہے

ایک ماحول بدلتا ہے جو چلتی ہے آکاش
ایک خوشبو ہے جو ہر بار جدا لگتی ہے

OOO

راحیل عباس

O

جب تہذیب ختم ہونے لگی ہے
دل کی آنکھ نم ہونے لگی ہے

لفظ میں جو پہلے چمک تھی
محبت اب کم ہونے لگی ہے

مرے دل سے اترتے جا رہے ہو
تری پرواہ کم ہونے لگی ہے

تمہارے بعد ہے اک حشر برپا
مری دنیا جہنم ہونے لگی ہے

محبت میں ہوا راحیل ایسے
گرانی دم بہ دم ہونے لگی ہے

OOO

شائستہ مفتی

O

بے شرم بد نظر ہیں بے وفا عورتیں
تیری بستی میں ہیں فاحشہ عورتیں

خواب مرتے نہیں خواب سوتے نہیں
خواب سولی ہیں، ان پہ چڑھا عورتیں

پیار کرتی ہیں دیکھو تو چپ چاپ
تیرے آنگن میں ہیں بے خطا عورتیں

رات اپنی بتا کے گزارا کریں
روز مرتی رہیں باکرہ عورتیں

خوف خون جگر میں چھپا دے
رقص کرتی رہیں بے نوا عورتیں

روز بکتی محبت کی بستی رہے
روز بکتی رہیں دلربا عورتیں

جسم ڈھلتا ہوا روح زخمی رہی
کیا سے کیا ہو گئیں سانحہ عورتیں

چمن کی وارثیں بھی تنہا نہ تھیں
آگ میں جل بجھیں سوختہ عورتیں

چاند ٹھہرا رہا جھیل ٹھہری رہی
اور بہتی رہیں گمشدہ عورتیں

عورتیں ہیں فقط رنگ کی داستاں
ان چھڑکے ہو گئیں نقش پا عورتیں

OOO

شازیہ رباب

O

یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پھر سے پکارے جائیں
خواہشِ زیست کی پاداش میں مارے جائیں

کتنے جسموں کا تسلسل ہے کہانی میری
اس میں اب کچھ نئے کردار اتارے جائیں

کتنی صدیوں سے یہاں صرف خدا آتے ہیں
اب تو انسان مری دھرتی پہ اتارے جائیں

جیتیں ساری محبت کی ہمیں چھوڑ کے جا
کیوں ترے ساتھ سفر میں یہ خسارے جائیں

وقت کی گرد میں دھندلا گئے جو چہروں سے
کبھی فرصت میں وہ چہرے بھی نکھارے جائیں

اب خدا تنگ ہوئی تیری زمیں لوگوں پہ
اب بتا تو ہی کہاں درد کے مارے جائیں

تم نہ پاؤ گے کبھی، ساتھ چلیں گے دونوں
جس طرح سے کسی دریا کے کنارے جائیں

OOO

عاصم بخاری

O

مشکل اک ایک روگ، دیوار ہٹ گئی
اچھا ہوا غموں کی یہ رات چھٹ گئی

سائے میں والدین کے خوش حالیاں رہیں
بدبختی بعد جن کے گلے سے لپٹ گئی

"کچھ جیل" سے ہماری کسی طور کم نہ تھا
اس کی تمام عمر کہ جس گھر میں کٹ گئی

قسمت کی یاوری کا تو ، انتہا ہی کہیں
تدبیر اس نے جو بھی کی ، یکسر الٹ گئی

کوئی جگر کا گوشہ ، کہاں ہے کوئی کہاں
ہستی ہے کتنے حصوں میں ، اپنی یہ بٹ گئی

دیوانوں ہی اس کا ، مقصد ، دکھائی دے
مڑ کے اپنے قدم پہ دیکھو اپنے ہٹ گئی

پہچان اپنی آپ وہ ، عاصم نہ کر سکا
تصویر گردِ وقت سے ، یوں اس کی اٹ گئی

OOO

علی کاظم

O

جب نہ تھا پیار تو پیار سے ناواقف تھا
کبھی میں جرأتِ اظہار سے ناواقف تھا

تم سمجھتے ہو کہ اس عرصۂ ہمراہی میں
کس قدر میں ترے گفتار سے ناواقف تھا

مرے بچپن کا حسیں وقت گزارے مالک
جب دیا تو نے، میں اقدار سے ناواقف تھا

اتفاقاً اتنا گہرا ہوگا، نہ سوچا تھا کبھی
میں تو بالکل ہی سرِ دار سے ناواقف تھا

راز جو اجمل سے کھلا تھا ہے وہ علم کے
اپنی ہی ذات کے اسرار سے ناواقف تھا

میں نے سمجھا تھا کہ جینے کو ہے اک عمر پڑی
زندگی! میں تری رفتار سے ناواقف تھا

حالتِ زار وطن سے ہے عیاں کہ گلشن
حلقۂ گوشۂ گلزار سے ناواقف تھا

دیکھ کر صبرِ حسینؑ، بول اٹھا دشمن بھی
میں تو اس جذبۂ ایثار سے ناواقف تھا

OOO

سفرنامہ

سفرنامہ تھائی لینڈ

......5......

ڈاکٹر محمد رفیق خان

گڈی ہوٹل توں چلن دے بعد اسی گائیڈ نوں پچھیا کہ سب توں پہلاں ساہنوں کتھے لے کے جا رہیا ایں؟ اوہنیں جگہ دا ناں لیا تے ساہنوں جگہ دی حدوی گرشا تک ہائی توں 30,35 کلو میٹر دوری۔ مین روڈ توں گڈی اتر گئی تے تھلے پاسے اک چھوٹی سڑک تے مڑ گئی۔ کجھ کلو میٹر چل کے ویکھیا کہ اک وڈا سارا شیڈ بنیاں ہویا اے تے اوہدے اندر بہت سارے ہاتھی بجے ہوئے نیں۔ تھوڑا جتاں ہور اگے گئے تے ویکھیا کہ ہاتھیاں نوں اوہناں دے رکھوالیاں ٹورا دے نیں۔ تھوڑی دیر توں بعد ہاتھیاں نوں اک پنڈال وچ لے کے آ گئے۔ اوہ سارے اپنے اپنے ہاتھی تے سوار سن۔ پنڈال وچ ہاتھیاں نے اپنے کرتباں دا مظاہرہ کرنا سی۔ پنڈال دے اک پاسے بینچ نصب سن جتاں اتے بیٹھ کے تماشائیاں نے مظاہرہ ویکھنا سی۔ اسی سارے اوہناں اتے بیٹھ گئے تے ہاتھیاں نے مظاہرہ شروع کر دتا۔ ایہہ شو تھائی لینڈ وچ ''ہاتھی شو'' کروایا جاندا اے، جیہڑا بہت ای دلچسپ ہوندا اے۔ پہلا کرتب ایہہ سی کہ تن چار ہاتھیاں نے اپنے سونڈاں اتے خوش آمدید (Welcome) لکھیا ہویا سی۔ اوہ اوہ دکھاندے ہوئے اک طرفوں چکر کٹ کے دوجی طرف چلے گئے۔ لگدا سی کہ آپس وچ اک قدم ملا رہے نیں جس طرح کہ ہاتھیاں دل دی فوج جارہی ہووے۔ اوہناں نے قطاراں طراں بنائی ہوئی سی کہ اگے والے ہاتھی دی پوشل پچھے والے ہاتھی نے اپنے سونڈ وچ پھڑی ہوئی سی۔ تے اوہ اگے پچھے چل رہے سان۔ نال نال ہاتھیاں دیاں خاص آوازاں کڈھدے سان جیہڑیاں موقع دی مناسبت نال گڈیاں جا رہیاں سان۔ خوش آمدید کہن کے ہاتھی ناظرین دے قریب آ گئے تے دکے جیہڑیاں ہویاں دے نال سونڈاں دے ذریعے روپئے لین دا سلسلہ شروع کر دتا۔ انگریز بالخصوص جانوراں دے انداز پسند کر دے نیں۔ ایس طراں لگدا سی جیویں آسٹریلین پاپے دی عید ہو گئی اے۔ سوتیاں نوں وی اک ہاتھی نے پیار دی پیشکش کیتی تے اوس نے وی سونڈ دے اتے پیار دا ہتھ پھیر کے اس دی محبت دا جواب دتا۔ اوہدے بعد ہاتھیاں نے ایہہ پیشکش کیتی کہ جے کوئی چاہوے تے سونڈ دے اتے بیٹھ کے ہوٹے وی لے سکدا اے۔ کافی لوکاں نے سونڈ تے بیٹھن دا شغل کیتا۔ اسی چونکہ ایہاں گلاں دے اینے شوقین ناں۔ ایہہ جیہڑا ہاتھی ساڈے ول پیار کرن نئیں آیا سی اودھے کولوں معذرت کر لئی۔ ہاتھی مناوی دے کے چلا گیا۔

اگلا کرتب ہاتھی دی سونڈ اتے اک رنگ چڑھا کے دکھایا سی۔ ہاتھی دی سونڈ تے رنگ چڑھا دتا گیا تے اوہنوں ایس طراں

دکھا دِتا جس طرح کوئی شخص ٹی وی اُتے مظاہرہ کر رہیا ہووے۔ اوہدے بعد ہاتھیاں نے باقاعدہ رقص کیتا جیہڑا ایس طرح سی کہ ہاتھیاں اسے ویلے اتے تھلے یک وقت ہِل رہے سن تے اوہناں وچ بڑا اردھم سی۔

ایک سوار سونڈ توں چڑھ کے ہاتھی دے ٹڈاں اتے بیٹھ گیا تے دوجا ہاتھی دے سونڈ اتے۔ ایس طراں کئی سوار بیٹھ گئے تے ہاتھیاں نے دائرے دی شکل وچ ناظرین دے سامنے چکر لگایا۔ ایس دے بعد اک فٹ بال گراؤنڈ تے لیا کے رول کیتا گیا۔ اک شخص نے اپنے بال توں ہاتھی دی طرف رول دتا تے ہاتھی نے اوہنوں پیر دے نال زور دی کک لگائی تے بال بہت دور جا کے ڈگیا۔ اوہدے بعد سارے ہاتھیاں دے ول بال رول کیتا گیا۔ تے ہاتھیاں کولوں اگے لگائے گئے اک کھڈے تے باقاعدہ نشانے لگوائے گئے جیہڑے اوہناں بڑی کامیابی نال لگائے۔ اوہدے بعد کجھ دور کجھ رنگ لگا دتے گئے تے ہاتھیاں کولوں ایس انداز وچ کک لگوائی گئی کہ بال رنگ دے وچوں گزر کے پار جاوے پر رنگ باہر نہ ڈگے۔ بعض رنگ ہاں دی جرأت تے ہاتھیاں دا ایس طراں چلنا کہ اوہناں دے رانگاں نوں کوئی قسم دا نقصان نہ پہنچے۔

اک خاص کرتب جیہڑا ہاتھیاں کولوں کرایا گیا اوہ ایہہ سی کہ وڈے وڈے لکڑی دے لاگ گراؤنڈ وچ رکھ دتے گئے تے ہاتھیاں دی قطار بنائی گئی تے اوہناں نوں کہیا گیا کہ ایہناں لاگاں نوں اتے تھلے جوڑو۔ جس ہاتھیاں نے اک لاگ نوں اپنی سونڈاں وچ پھڑیا تے زور لا کے پہلے اک نوں اک جگہ رکھیا اوہدے بعد دوجے ہاتھیاں نے سونڈاں دے ذریعے اوہدے اتے دوجا تے ایس طراں ای ترتیب رکھیا۔ ہاتھی ایس طریقے نال یک وقت وکھن دیندے سن تے لاگ اتے اتھا کے پہلے دے اتے سیٹ ہو جاندا سی۔ ایس طراں اوہناں نے چار پنج لاگ اتھا کے جوڑ دتے۔

ہاتھی شو اختتام پذیر ہون توں کجھ دیر پہلاں ناظرین کول آئے تے اوہناں نوں پچھیا کہ جے کوئی سونڈ دے اتے بیٹھ کے ہاتھی دے اتے چڑھنا چاہے تے ہاتھی حاضر نیں۔ بعض نے ایس سرگرمی وچ حصہ لیا۔ انجھوں تک کہ سونیا بی بی سونڈ تے سوار ہوئی تے مارک نوں تے ایہو جئے موقعے اللہ دے۔ آخری کرتب ایہہ سی کہ ہاتھی بذریعہ سونڈ انعام منگن لئی پرس تھیں حاضر ہوئے۔ اوہناں نے اپنے اپنے سونڈ اگے کیتے تے سب نے اوہناں دے سونڈ وچ نوٹ رکھے جیہڑے اوہ دے کے چلے گئے تے بعد وچ اپنے مہاوتاں نوں پیش کر دتے۔ میں بس ایس گل تے حیران ساں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان نوں کناں اعلیٰ دماغ دتا اے۔ کتھے چھوٹے تے چار پنج فٹے قد تے کتھے ایڈا وڈا جانور جنہوں ویکھ کے اج ای ڈر لگدا اے کس طراں قابو کیتا ہویا اے تے کس طراں اوہدی تربیت کیتی ہوئی اے کہ جس طراں بندہ چاہندا اے اوسے طراں ای اوہ کردا جاندا اے۔ اک تھائی رات دے پہلے اک وڈا سارا ہاتھی شاپنگ مال دے اک مین بازار وچ لئی پھردا سی تے سوداں جو کجھ اوہناں دے ہتھ وچ سی ہاتھی نوں خوب کھوا رہیاں سن۔ لگدا سی کہ ہاتھی نال لوکاں نوں خاص لگاؤ اے تے تھائی معاشرے دے وچ ایہدی بڑی اہمیت اے۔ بلکہ جے ایہہ کیہا جاوے کہ تھائی لینڈ دا قومی نشان ہاتھی اے تے ایہہ غلط نہیں ہووے گا۔ آخر وچ بالکل ایس طراں ای جس طراں ہاتھیاں نے جی آیاں والا چکر لگا کے چکر لگایا سی ایس طراں ای اوہناں نے ''خیر نال جاؤ'' والا اپنے سونڈاں وچ پھڑ کے چکر لگایا تے ناظرین نے تالیاں وجا کے اوہناں نوں دل کھول کے داد دتی۔

اگے کیہ ہووے ایہدا سانوں کجھ پتہ نہیں سی۔ اگے جا کے ویکھیا کہ باقاعدہ اک پورٹ بنی ہوئی سی جتھوں لوک ہاتھی تے سوار ہو رہے سن تے رستے دے وچ تھائی عورتاں تیاں دے ٹوٹے کٹ کے تے بعد دے وچ رسیاں ڈال کے چھوٹے چھوٹے گچھے تیار کر کے ویچیاں ہوئیاں سن۔ سانوں نہیں سی پتہ کہ ایہہ کس واسطے نیں۔ اصل گل ایہہ سی کہ لوک سارے آ ٹکاں وی ادائیگی ای کر چکے ساں۔ ضروری نہیں سی کہ ایہہ گچھا خریدیے تے فیر ای ہاتھی تے سواری کر سکدے آں۔ ساہنوں ویکھ کے عورتاں نے گلیاں دا گچھا ساڈے اگے کیتا تے تھائی زبان وچ ساہنوں کہن لگیاں کہ ایہہ خریدو کے ہاتھیاں نوں راہ وچ کھوان لئی اے۔ ای کہیا کہ شاید ایہہ خریدنا ضروری اے تے فیر سواری دی اجازت ہووے گی۔ بہر حال اوہناں معصوماں لئی 30 بات خرچنے معمولی گل سی۔ اوس ویلے ای اے کہیا جس طراں کہ ایہہ سواری توں پہلاں ٹکٹ خریدن دے مترادف اے۔ ای گچھا چکیا تے پورٹ ول چلے گئے۔ جتھوں کہ ہاتھی دے اوچائی تو کوئی اک فٹ اچی بنائی گئی سی۔ ہاتھی دے اتے دو بندیاں والا کجاوہ بنیا ہویا سی جتھاں اتے دو دو بندے بیٹھ سکدے سن۔ سارے ساتھی ساڈے توں پہلاں سوار ہو چکے سن۔ اسی گئے تے گائیڈ تے ڈرائیور نے ساہنوں کلے نوں ای سوار کرا دتا۔ اتے جا کے پتہ چلیا کہ اسی کلے ای سوار ہو آں۔ بہر حال بہ یاراں دوزخ بہ یاراں بہشت۔ ساہنوں کوئی ہاتھی تے بیٹھن دا بہوں شوق نہیں سی پر ایس عمرے ساہنوں اوہ کجھ کرنا پیا جو کجھ ساتھی کر رہے سن۔ اگے کئی جوڑیاں جا چکیاں سن۔ پچھے پچھے ساہنوں لے کے ہاتھی چل پیا۔ ساڈے اگے مارگ تے جا پانی سن تے اوہناں توں اگے سوچیا تے وی۔ ساہنوں نہیں سی پتہ کہ ایہہ سواری کنی دیر دی اے۔ رستے وچ مارگ نوں پچھیا تے اوہنیں دسیا کہ چالی منٹ۔ ایہہ بڑا مشکل کم سی کیونکہ کجاوہ کوئی صوفہ یا بیڈ تے نہیں سی۔ لکڑی دا بنیاں ہویا سی ایہدا خوب جسم نوں چبھ رہیا سی۔ سب توں پہلاں ہاتھی اوسے جھیل وچوں گزرے۔ عربی میں کرنی سی۔ جھیل خاصی ڈوہنگی تے ہاتھی اچا۔ سوچیا کہ کتاں خطرناک منظر ہووے گا۔ اک تے ساہنوں سیٹ دے وچ بیلٹ کیتا ہویا سی تے دوجے ہاتھی خوب سدھائے ہوئے سن۔ ہاتھی جھیل وچ وڑ دے تے پانی وچوں گزر کے باہر نکلے تے اگے اوہناں دا ٹریک پہاڑی اتے بنیاں نظر آیا۔ اوس ٹریک تے ہاتھیاں نے آہستہ آہستہ پہاڑی تے چڑھنا شروع کر دتا۔ اوہی ''قہر درویش بر جان درویش'' والی گل سی۔ اسی کر وی کیہ سکدے ساں۔ بس ہاتھی تے رحم بان دے رحم و کرم تے ساں تے چالی منٹ دی قید با مشقت کٹنی سی۔ مشقت ایہہ اپنے آپ نوں سنبھالن دی سی۔ رستے دے وچ کئی چوکیاں نظر آئیاں جتھاں اتے زیادہ تر عورتاں گنے دے گچھے یا کیلے دے گچھے لے کے بیٹھیاں سن تے آواز لگا رہیاں سن کہ ہاتھی تھکے نیں ایہناں لئی خرید لو۔ ای چونکہ پہلے ای خرید چکے ساں۔ رحم بان دے ہتھ وچ گچھا پھڑا دتا سی کہ اوہ ہاتھی نوں کھوا لئے۔ ساہنوں اوہ کے بعد کھواندا نظر نہیں سی آیا۔ ہو سکدا اے گچھا دوبارہ ویچ لیا گیا ہووے۔ ایہدے علاوہ رستے وچ اک اسٹکچر نظر آیا۔ جدے وچ صرف گاواں تے بیل بنے ہوئے سن تے باہر لکھیا ہویا سی "The Cows House"۔ تھوڑی دیر ہور اگے آئے تے اگے لکھیا ہویا سی "The Buffalo House"۔ دوواں دے اندر گاواں تے مجھاں الگ الگ بندیاں ہویاں سن۔ خیر اسی سب کجھ ویکھ کے ہاتھی تے سوار ہاتھی ہوم آ گئے۔ راہ دے وچ اک شیڈ دے باہر اک بچہ ہاتھی بیٹھا ہویا سی تے نال اک گھڑا رکھیا ہویا سی جدے تے لکھیا ہویا سی۔ ''بے بی ہاتھی تے اوہدی ماں دی صحت لئی ایہدے وچ کجھ نہ کجھ پا جاؤ۔''

لوک اسی اترے تے اگے تھائی عورتاں تے چند مرد مختلف کرنسی شاپس تے بیٹھیاں سیاحاں نوں آوازاں دے رہیاں سن

کی آؤ تے ساڈے کولوں کجھ نہ کجھ خریدو۔ اسی اک نکڑ ووروں تجھیاں اتے پل تے تواکیں نوں اندازہ ہو گیا کہ صرف ایہہ اک مرغا اے جیہڑا پھس سکدا اے۔ اک خاتون نے سب توں پہلاں اک بیگ وکھایا جیہڑا اوہ خاتون اوہناں اپنے ہتھ نال بنایا ہویا سی۔ اوہدے اپنے ہتھی بنائے ہوئے ہن تے بڑی خوبصورت کڈھائی کیتی ہوئی سی۔ اسی سوچیا کہ لے ہو سکدا اے ساڈی بیگم نوں ایہہ شیلی عمرے کجھ نہ کجھ پسند آ جائے۔ ویسے اج کل ایہہ حال اے کہ اسی ملکوں باہر ہووئیے تے گھر والے ضرور آکھن کہ جناب کیہ لیاواں؟ جواب ایہہ ہوندا اے کہ گئے سے وقت لنگھاؤن بس تسی آپ جلدی واپس آ جاؤ۔ ایدے لئی پیسے ضائع کرنے ہیں۔ ایس خاتون کولوں پچھیا کہ کنے دا اے؟ کہن لگی 350 بات دا۔ اسی کہیا مہنگا اے۔ کہن لگی کہ تہانوں میں گھٹ کر دیندی آں۔ انداز بالکل پاکستانی کاروبار والا سی۔ ایہدے علاوہ کجھ بریس لٹاں وکھائیاں تے کہن لگی ہر اک دی قیمت 100 بات اے۔ اسی اوہنوں کہیا کہ ایہہ بہت زیادہ پیسے منگے نیں لہذا اسی اوہنوں بریسلیٹس دے 200 بات کہے تے اوہ وی کجھ حوصلہ افزائی ہوئی۔ کہن لگی کہ بیگ میں تہانوں گھٹ تے گھٹ 200 بات دا دیاں گی تسی کل مینوں پنج سو دے دیو۔ کہیا نہیں۔ بس ایس خاتون کولوں جان چھڑا کے گئے تے اوہ مینوں پچھدن ڈئے سو وچ ہیں سی۔ اوس دی اک وجہ ایہہ وی ہو گئی کہ اسی اوہدے کولوں دھپ توں بچن لئی اک ٹوپی خریدی پچھے سال جہڑی 100 بات وچ خریدی گئی سی۔ اوہدا حوصلہ بلندی کہ ضرور کجھ نہ کجھ خرید کے جاوے گا۔ بالآخر اوہ کامیاب ہوئی گئی تے کہن لگی کہ بریسلیٹس دے دو سو ٹھیک نیں تسی اوہ لے جاؤ تے بیگ رہن دو مینوں واداں گیں کما دو۔ تے نال ای ٹوپی تے بریسلیٹس بیگ وچ پا کے میرے ہتھ وچ پھڑا دتیاں تے عجب قسم دے انداز اختیار کر کے ساتھوں قائل کر لیا۔ اسی 350 بات دے کے دوویں چیزاں لے لیاں۔ کہندی اسی رقی کہ چار سو بات دے دے پر ساتھوں پورا یقین سی کہ ایہہ لوکی قیمت کم از کم دوگنی ضرور منگدے نیں لہذا مناسب پیسے دے تے چار نے گئیں۔ اوہناں والوں ویکھ کے اگے ٹکلو تے ہوئے سارے الرٹ ہو گئے تے ساتھوں پھڑ لیا۔ بڑی جان چھڑائی اوہدے باوجود اک خاتون کامیاب ہوئی گئی تے ساتھوں اک تھیلا 100 بات وچ خریدنا پے گیا۔ باقی آوازاں دیندے ای رہ گئے تے اسی اگے نکل گئے کیونکہ ساتھی کافی اگے نکل چکے سان تے ڈرائیور ساڈا وی انتظار کر رہیا سی۔ اوہ مینوں کہن لگا کہ اگلا آئٹم جنگل گاڑی دی سیر اے۔ اگے اک تھائی جنگل گڈی لے کے اک پوست اگے کھلوتا ہویا سی تے ساتھوں اشارہ کر رہیا سی کہ کوئی چارج نہیں تے کوئی ٹی سیر نہیں صرف 10 منٹ۔ ڈرائیور نے ساتھوں سوار کرا دتا تے اسی جنگل گڈی دی سیر کر کے اپنے ساتھیاں نوں جیہڑے اوس ویلے دوپہر دے کھانے وچ مصروف سن۔ کھانا کیہی اوہ وی حلال حرام دا معاملہ۔ اسی کوئی تھوڑے جیہے چاول لئے تے نال کجھ سبزی تے سلاد جیہا ایہہ کہیا جاوے کہ دوران سفر بس سلاد تے ای گزارا کیتی رکھیا۔ سوائے رات دے کھانے دے جیہڑا اک پاکستانی ریسٹورنٹ وچ ہوندا سی۔ اوکھیاں سوکھیاں ہو کے کجھ پیٹ پوجا کر لئی تے بعد وچ خیال آیا کہ چلو کجھ مٹھاوی لے لیا جاوے۔ ہوٹل تے ہور اک پھل ساتھوں پسند آیا صرف تن ویں پیے سن۔ جہڑا انجی دا سیب لگدا سی۔ فرق ایہہ سی کہ پھل دے اتے لے کے سر کٹدے سن تے فروٹ دی شکل سرخ سی۔ آسی اک کھولیا تے اندروں پھٹی دی طرح دا نکلیا۔ اسی کھادا تے مزہ وی پھٹی دی طرح دا ای سی۔ ساتھوں مزہ آیا تے اسی تن ای کھا گئے۔ سروس تے موجود لڑکی نوں پچھیا کہ ایہہ کیہڑا پھل اے۔ پہلاں تے اوہنیں نہ وچ ای جواب دتا جیہڑا کہ تھائی لینڈ دے شہر پرر بندے کولوں متوقع ہوندا اے۔ بعد وچ اوہنیں دسیا کہ اس نوں بمبو لائن (Bumboo Line) آکھدے نیں۔

اسی یقین نال نہیں کہہ سکدے کہ ایہہ انج ای اے۔ بہر حال ایس ول توں معلوم ہوندا اے کہ شاید کسے خاص قسم دے بانس اتے ایہہ پھل لگدا اے۔ اسی فارغ ہو گئے تے جناب رہنما نوں پچھیا۔ کہن لگا کہ علاقے دا اک بڑا اہم آئٹم رہندا اے جدھا ناں بمبو رافٹنگ (Bamboo Rafting) اے۔ ایس کھیڈ دا ناں چینی وادی سنیاں تے دوجیاں دے پچھے پچھے اے۔

ساڈوں گائیڈ تے ڈرائیور جھیل تے واپس لے گئے جدھے وچ بانس دے بنے ہوئے تختے نظر آئے۔ سمجھو کہ ایہہ بیڑیاں ہن جنہاں دیاں دیواراں نہیں ہوندیاں سیدھے تختے ہوندے نیں جیہڑے زمانہ قدیم وچ بطور بیڑی استعمال ہوندے سن۔ ایس تختے وچ تے موجودہ کشتی وچ فرق ایہہ وے کہ کشتی بڑی چوڑی ہوندی اے تے گہرے پانی تک ہوندی اے جدوں کہ ایہہ تختے گھٹ پانی تک ہوندے نیں تے ایہناں نوں چپو دی بجائے بانساں نال کنٹرول کیتا جاندا اے۔ چپو پانی نوں پچھے دھکدا اے تے کشتی اگے جاندی اے۔ چپو کدی وی پانی دے تھلے مٹی وی تھاں نیں پنچ نہیں کردا جدوں کہ بانس کنٹرول ای زمین تے لگ کے کردا اے۔ اک تختے نوں دو کشتی بان کنٹرول کردے نیں۔ اک اگے تے اک پچھلے کونے تے ہوندا اے۔ اصول اے نیوٹن دا تیجا کلیہ تجاذب اے۔ کشتی ران زمین پچھے دھکدا اے تے تختہ اوس دی الٹ سمت وچ حرکت کردا اے۔ اسی وی سوار ہو گئے۔ اسی تے چار پانچ اک تختے تے مارک دا خاندان دو بچے تے۔ کشتیاں نے چلنا شروع کر دتا۔ دوواں تے نوجوان تھائی لڑکے جیہڑے لگاتار اک دوجے نال ہسے تے کھول کر رہے سن۔ ماحول مارک تے سونیا نے مزید خوشگوار کر دتا۔ اوہناں نے منڈیاں نوں کہیا کہ کسی بانس ساڈے ہتھاں وچ دیو کیونکہ اسی کشتی رانی دا شوق پورا کرنا چاہندے آں۔ اوہناں دے ہتھ بانس پھڑا کے اوہناں دی کشتی دے منڈے آزاد ہو گئے تے اوہناں مزید اودھم مچانا شروع کر دتا۔ منٹوں تک کہ مارک تے سونیا تے پانی دے چھٹے مارنے وی شروع کر دتے۔ کدی اک اتر جاندا سی تے کدی دوجا۔ دوجے اوہناں نوں جھیل وچ کجھ نظر آندا ای تے کشتی چھڈ کے اوہنوں پھڑن لئی پانی وچ چھال مار جاندے سن تے اوہدے پچھے نس جاندے سن تاکہ پھڑ سکن۔ اک واری اوہناں نے کوئی چیز پھڑی وی پر اوہ اوہدے ہتھ وچ نظر نہیں سی آئی۔ ساڈا خیال اے کہ ایہناں پچھو یا نکی مچھلی دا ہو سکدا اے۔ فیر مارک تے سونیا نوں جلدی عقل آ گئی تے اوہناں نوں کہن لگے کہ تسی اپنی پوزیشن سنبھالو۔ اوہناں دی کشتی تے یر الٹم کرا ای رہی سی جیہڑی کدی اگے دا کنٹرول نہیں سی رہندا تے کدی پچھے دا۔ اوہناں ولوں دیکھ کے ساڈے پچھے والا منڈا پانی وچ چھال مار گیا تے جھٹکے پچھے دوڑ گیا۔ پچھے دا کنٹرول نہ رہیا۔ فیر اگلے منڈے نے پچھے جا کے کشتی نوں دوبارہ متوازن کیتا تے کشتی نے ٹھیک طراں چلنا شروع کر دتا۔ ذرا آرام سکون ہویا تے اگلے منڈے نوں پچھیا کہ کنی کو دور اسی جانا اے۔ کہن لگا کہ ایہہ 30 منٹ وچ کھیڈا اے تے اسی کل چار کلومیٹر سفر کرنا اے۔ اگے جا کے سرکل لے کے واپس آواں گے۔ خیر خیر کر کے 30 منٹ پورے ہوئے تے اسی دوبارہ اوسے مقام توں جتھوں سوار ہوئے سی اوتھے واپس آ گئے۔ کشتیاں کنارے لگیاں تے اسی اتر کے باہر آ گئے۔ ایہناں کشتیاں دے بارے وچ اک خاص گل ایہہ وے کہ چونکہ تفریح گاہ دا انتظام ای ایہدا اک ریونیو ہوندی سی ہوئی کشتی نوں جھیل وچ اتار دیندے تے واپسی دے بعد باہر کڈھ دیندے تاکہ باہر دھپ کے لگ جاوے تے ایہہ بانس خراب نہ ہوون۔

ایس شغل دے بعد اسی گائیڈ نوں پچھیا کہ ہون کیہ رہ گیا اے۔ کہن لگا کہ اک آئٹم رہ گیا اے جیہڑا اوسے تے اک چھوٹی جئی سیرگاہ دی سیر اے۔ پندرہ ویہہ منٹاں بعد اسی پہنچ گئے۔ ایس جگہ دا ناں سی نرسری اور جڑی بوٹیاں فارم (Nursery

(Orchards Butterfly Farm)۔ ایہہ اک ایسا فارم سی جہدے وچ اوریچڈ پھل کئی طرحاں نال اگائے جاندے سن۔ صرف قدرتی پرورش نہیں سی بلکہ مصنوعی عمل دخل وی سی۔ ایس لئی بنیادی طور تے ایہہ اک ہٹلان دا فارم سی جہدے وچ تتلیاں اڈدیاں پھردیاں سن۔ ایہدے اندر کجھ نہیں سی سوائے اک وڈا اسارا کینٹین ایہہ جہدے وچ لوک بیٹھ کے کھا پی رہے سن۔ بس اک چھوٹا جیہا چکر سی چھوٹے جیہے فارم دا۔ اوس ویلے کھانے دے بعد کافی چائے دی طلب سی تے کجھ ہور چیز وی۔ اسی گائیڈ نوں پچھیا کہ فارم کتھے وے۔ اوہ کہن لگا ایس اوتھے جا کے میں تہانوں وکھاواں گا۔ اندر وڑے تے بس پھل سن تے تتلیاں۔ گولڈن اوریچڈ تیار کرن دا طریقہ باہر لکھیا ہویا سی۔ اوہ درج ذیل اے:

(1) اوریچڈ دے بوٹے کے اوہناں نوں خشک کیتا جاندا اے تاں کہ اوہناں دا پانی بالکل ختم ہو جائے۔ (2) خشک شدہ اوریچڈاں دی تیلیر (Lacqur) وچ ڈبویا جاندا اے تاں کہ اوہ سخت ہو جائے تے اوہدی ڈھاکت ختم ہو جائے تاں کہ گل سڑ نہ سکے۔ (3) گھری دی پینٹ کیتا جاندا اے تے ایس تے لائیکس لگائی جاندی اے تے خشک کرایا جاندا اے تاں کہ مزید سخت ہو جان۔ (4) آخری مرحلے وچ اوہناں تے تانبے دا کوٹ کیتا جاندا اے تے اوہدے بعد سلفامیٹ (Sulfamate) تے نکل (Nickel) اور بعد ایہناں اتے 24 قیراط گولڈ پلیٹنگ کر دتا جاندا اے۔

جس ویلے واپس ہوٹل اپڑے تا تقریباً 4 وج چکے سن۔ تھکے ہوئے ساں ایس لئی تھوڑی دیر لئی سوں گئے۔ نماز مغرب دے بعد اسی کھانا کھان لئی پاکستانی ریسٹورنٹ دا رخ کیتا۔ باقر واحد مجید وغیرہ دیاں گلاں ریکھن لگے تے اسی سمجھایا اوہناں نوں کہ تکلف نہ کرن بس بکرے دے گوشت دا قورمہ تے آوں تے گرم گرم روٹی۔ باقر اپنے ولوں پوری کوشش کیتی کہ بہترین کھانا کھوایا جائے۔ اوہناں گوشت جیہڑا ہویا تیار کروایا کمال سی۔ اسی کھانا کھاندے تے باقر نال گل بات شروع کیتی۔ اسی اوہنوں پچھیا کہ کیا ایتھے زیادہ مسلمان مالش کرواندے نیں۔ کہن لگا سارے ای کرواندے نیں بلکہ میں خود وی کروانا واں۔ میں اوہنوں کہیا کہ جنہوں گوڈیاں دی تکلیف اے مالش کروان نال کجھ فائدہ ہووے گا؟ کہن لگا کہ میں تہانوں ایہہ تجویز دیاں گا کہ تسی کروا کے ویکھو فٹ مساج (Foot Massage) دے بعد وچ تسی ویکھو گے کہ تسی ہلکے پھلکے ہو جاؤ گے۔ فیصلہ ہویا کہ ہوٹل دے قریب دکان توں کروائی جائے۔ اسی دکان وچ داخل ہوئے تے اک نوجوان کاؤنٹر تے سی تے اک لڑکی نے پیراں نوں اک اک کر کے مالش شروع کر دتی۔ بس لتاں دیاں پنیاں تے پیر۔ اوہناں مختلف قسم دے تیل لائے۔ صرف پیر تے پنیاں ٹچ کیتیاں۔ بس اوہ مالش کر دی جا رہی سی تے نال نال میں ساتھیاں سوال کر دی جاندی سی کہ کیا سکون مل رہیا اے؟ حیرانگی دی گل اے سی کہ ساڈے گوڈیاں زیادہ مالش دے عمل توں اوہ خود لطف اندوز ہو رہی سی۔ ساڈا خیال اے کہ ہر شخص اپنے پیراں دے وقت ضرور مساج کرواوے۔ اسی 150 بات ادا کیتے تے دکان توں باہر آ گئے۔ ساہنوں محسوس ہویا کہ واقعی بہت ہلکے پھلکے ہو گئے آں۔ نہ کوئی پیراں وچ درد نہ تھکن۔ اگلے دن کانفرنس سی ایس لئی جان کے سوں گئے۔ صبح اٹھنے تے وقت دا پتہ چل سی۔

(جاری ہے)

◆◆◆

پنجاب رنگ

حنیف باوا

شہید بابل دی دھی دے وَین

اوہدی تُربت تے
9 مئی دے وکھانت مگروں

ماں تیری دھی
شہید
بابل گھر دے
مندروں ویہڑے دے دیوے
ہنجھوں دھوئیں دا
دھیراں بھریا
گودے دا کہیر ۔ کیوں ہے؟
اوہتے جاں
ہر ٹی میرے ماں نیں
چانن رہا ایں
اتے چانن دی گھر دا رستہ وی
تے ایس چانن نوں
جھنگ کرن دی
سنگل کہاں تک
اتے کیہاں
ایس لگے
اتے شاواں والے
گھر دیاں کندھاں ڈھائیاں
تیرے میرے دے ساہ نیں تیرے میرے دے
ساہ نیں
اتے میرے بابل ہوندیاں دے
سکھ دی نوں
پتھر مار کے بھنیاں تنہاں
دس
اتے دس کھاں میرے بیبا ماہیں
کیہاں
ایہہ ساڈے قبر لانے
وانس میرے تن تاں ماہیں
وانس اپنے دیاں
کندھاں تاں آئیاں نوں
اپنی کھیڈ تے ڈنگ کے
ساڈی لکھیاں سونے گھروں
ہویاں دی پیار دیاں ڈال
شہیداں دی ایس گھری دے وچ
ایہہ سوہنا گھر
آن وسایا
اوہدے
وانس ہر کسے نوں آکے لوکیں
سبھے کو وطن دے کدی دس تھکے
پر میرے سوہنے دیس نوں ویسے
ایہہ کون لگیں ماہیں
جتھاں
وانس میرے دی
ایس وطن دی رستی رستے نوں
عشق تر وڑ تے شہید ہوا
ماں جیہی
کی دسیا اپنے تیں
لہو نیں
ایہہ تاں کوئی ہور لگیں ماہیں
ویریاں دی توں وطن دے کوئی ہور
تیرے ساہی کوئی ہور
ساڈے وانس دے لکھے وچ
تیرے ساہی کوئی ہور

OOO

سلیم شہزاد

بُلھے شاہ دی ویل

بلھے شاہ! اساں وچھڑے رو رکھے ، بازی لے گئے
اُتے
ساتھوں رُٹھے
بلھے شاہ!
تیرے عشق نرالے
اکھاں نچ کے پئے
ساتھوں رُٹھے
بلھے شاہ! اساں نچ نچایا
بھیجے پچھے گئے
ساتھوں رُٹھے
بلھے شاہ!
اساں نیڑے اں دوریوں
اوہ دوری لگے
پار دے دوڑے
بلھے شاہ! اساں دے پچھے ساڈو گئے
کلی تاں کے پئے
ساتھوں رُٹھے
بلھے شاہ!
کدی پھیرا پا جا
یار اساں اٹھے
ساون ہاڑ ہن دے سکے

OOO

اظہر جاوید

پنجابی

کچیاں تیریاں قسماں کچے قول قرار گئے

توں تے میرے ارماناں دے اک محل نوں ڈھا کے آئی ایں
مرن جوگے دے دل اتے تیغ چلا کے آئی ایں
خوشیاں دے ہر پل دے اتے سوگ منا کے آئی ایں

توں نے میلوں آ کھیا ای ہن میرے دکھ دی تیر گئے
ہمدرداں دا ہس ہتھوکیاں گئے ہن تے سکھ میرے گئے
جادو اظہر نے سوہنے یار دے بولاں دے وار گئے

تیریاں تے اپنے کولوں وی میرے شعر پیارے سن
میرے اکھراں میرے پیار دے سارے ہاں دے تارے سن
کھلے شعر سنائے سن توں کچے گل اسارے سن

توں نے کیہ کیتی ایں ہن سوچاں فکراں ای کچھ دوا نئیں
توں نے کیتی ہیں ''اظہر'' ہن سارا پچھے دا نئیں
ہن تے مینے دے میرے وچ جنہاں دا کوئی مول نئیں

توں تے ہسیوں اگے دا ایں ہتھ پھڑ کے گئی ایں
ہمّت دے پیار بنا رہنے کے آپوں بھجا کے گئی ایں

OOO

سلیم شہزاد

یار گوانڈھی

یار گوانڈھی
کاہلا چنگا
جیہڑے ہوندیاں آپس آپس دے دکھ سکھ دے
تیرے سینے
پھری چھری
اتے
ہووں
کتے
دکھ نہ ٹریا جاوے ویکھیں
اوس گھر دے وچ ویہڑے دے تے
مینوں جاپے
جیویں آپ ای زخمی ہووے
جیہڑا گھر نوں پیا اگے
تیرے ساہ
کنڈ مڈھ بھنے ٹھاوں
ہڈی والا آنگاں دوں

OOO

محمد عباس مرزا

بیت

رب توں کیہا سوہنے وچوں اوکھ ودھا
کدی کتے میں ہسا ای اکھراں بن جاواں

عاروواں دے تھانے آکھوں رکاں تے
ہٹی کرواں اے کوئی سیدھے ڈوک چھاں تے

تیری محفل وچ جاواں، اوہ پھٹی ڈال
ہانی سکھیں دا تم نیوں دے ویدا ے

میں تے کیتا گھین چولیاں یوسف دا
رب جانے انہاں دکاں پھیچا کیہ پھڑیاں

ایہہ دنیا دا کجھ وی نظارہ اے
میں وی اکثر اوہدی ٹکی تک بیٹھاں

آ وہ ہوا وی جد بھٹا اے جانا
اوہ کے دیاں پانواں رکے کے آؤندا اے

اتے گھت جاگیاں دا میں مالک ہاں
چہاں اندر کھیم دیاں جڑاں واروں میں

ساتوں ہنگ توں دھرا سہمے گریانے
ودا رو دا ای دینا تے کوئی مرزا اے

اکھ چوں ونگھے قطرے بہت ہیانے نیں
کیے توں کجھوں وانے موضع دیندے ای نیں

ہار تے جیت دواں نوں ادھا اک ہا
انسان ولیا تے دووے ای کے گلاں نیں

OOO

موسیقی

ثریا ملتانیکر

ڈاکٹر امجد پرویز

میری زندگی میں معروف مغنیہ ثریا ملتانیکر سے پی ٹی وی کے سٹوڈیوز میں گاہے بگاہے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ جہاں وہ اپنی ریکارڈنگ کے سلسلے میں تشریف لایا کرتی تھیں۔ کچھ برسوں سے ان کے ہمراہ ان کی بیٹی راحت بانو بھی موجود ہوتی تھیں۔ راحت بانو بھی وقت کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ کے ورثہ کو آگے بڑھانے میں مصروف کار ہیں۔ ہماری آخری ملاقات میں ثریا ملتانیکر اور میں اپنی یادوں کے سفر میں کھو گئے۔ ذکر چلا ثریا ملتانیکر کے 1950ء اور 1960ء کی دہائی کے مقبول ترین گانے 'بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے / کہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا' کا، جو فلم 'بدنام' کیلئے موسیقار دیبو بھٹہ چاریہ نے ثریا ملتانیکر کی پیانو بیسڈ ریکارڈنگ سے مستعار لیا تھا۔ اقبال شہزاد کی اس فلم میں اداکارہ زمرد کا رقص اور نیلو کی اداکاری نے ہی اس نغمے کو چار چاند لگائے تھے۔ میری حیرانگی میں اس نغمے کی مقبولیت کا اس وقت اضافہ ہوا کہ اس دور میں ریڈیو پاکستان کے فرمائشی پروگرام میں جہاں فرمائش کرنے والے شائقین موسیقی کے نام بھی پڑھے جاتے تھے' کے ایک پروگرام میں بیسیوں منٹ تک نام پڑھے گئے اور آخر میں پانچ منٹ میں یہ گانا سنوایا گیا۔ یہ پاکستان کی موسیقی کی تاریخ میں ایک ایسا واحد اور منفرد واقعہ ہے۔ (نوٹ: میری آخری ملاقات 13 اکتوبر 2010ء کو الحمرا بین الاقوامی ادبی ثقافتی فیسٹیول میں ہوئی۔)
ثریا ملتانیکر کا ملتان شہر سے تعلق' ان کی زبان و بیان کے علاوہ گائیکی میں بھی جھلکتا تھا۔ آواز کہیں کہیں سخت محسوس ہوتی لیکن مسلسل ریاضت سے انہوں نے اپنی آواز میں ملائمت پیدا کر لی تھی اور لہجہ زمزمے اور مرکی کی ادائیگی مہارت سے ادا کی جاتی اور گلے کا دانہ بہت واضح طریقے سے بولتا تھا۔ اور اس کی واضح مثال ان کے مندرجہ بالا نغمے میں موجود ہے۔ یہ خصوصیت بہت خوش قسمت گائیکوں میں موجود ہوتی ہے ورنہ یہ زمزمے یا مرکیاں یا تو آواز کی گولائی یا گھسی ہوئی آواز میں پیش کی جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے' ثریا ملتانیکر اپنے دور کی دو مشہور مغنیاؤں اقبال بانو اور فریدہ خانم کے شانہ بشانہ کھڑی ہو گئیں۔ ثریا ملتانیکر خیال کی گائیکی' ٹھمری' غزل اور کافی بآسانی ادا کرتی ہیں۔ اپنی کلاسیکی موسیقی کی تعلیم اور لہجے کی مٹھاس' گائیکی ادائیگی کا خاصا ہے۔ آج جو گائیکی کے میدان میں ثریا ملتانیکر کا مقام ہے' وہ انہیں ایسے ہی نہیں ملا۔ اس کے پیچھے برس ہا برس کی مسلسل محنت و ریاضت کا عمل دخل رہا ہے۔ انہوں نے استاد غلام نبی خان جو کہ دلی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے سے گیارہ برس کی عمر میں ہی کلاسیکی گانے کی تعلیم لینا شروع کر دی۔ استاد صاحب' جو امراؤ خان کے شاگرد تھے (میاں تان رس خان کے پوتے) نے ثریا ملتانیکر کو اپنے علم کی دنیا روشن کرنے کی خاطر دہلی سے ملتان' اپنے خاندان سمیت ہجرت کر لی۔ خان صاحب ثریا کو پانچ گھنٹے صبح کے راگوں کی تعلیم دیتے اور شام کے وقت اتنے ہی گھنٹے شام کے راگوں کی۔ دو سال کی اس مسلسل تعلیم میں ثریا ملتانیکر استھائی۔ انترا خیال اور ترانہ مہارت سے ادا کرنے کے قابل ہو گئیں۔
ثریا ملتانیکر سے میں نے بھی وہ سوال کیا جو کہ اکثر مداح ان سے کرتے رہے ہیں کہ ان کے نام کے ساتھ ' ثریا ملتانیکر'

کا خطاب کیسے لگا۔ انہوں نے فرمایا کہ اُن کے استاد' نے انہیں 1953ء میں' کلاسیکی موسیقی کی مزید تعلیم کے لئے خان صاحب بندو خاں' جو کہ باوجود اسی برس کی عمر کے اپنے پورے ہوش و حواس میں گائیکی کیا کرتے تھے' کے سامنے راگ ایمن گانے کو کہا تو خان صاحب بندو خاں نے انہیں "ثریا ملتانیکر" کے خطاب سے نوازا کیونکہ ثریا ملتان سے آئی تھیں۔ تب سے وہ ثریا سے " ثریا ملتانیکر" بن گئیں۔ ثریا کے لئے اگلا قدم یہ اٹھانا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ریڈیو پاکستان کی ایک تصدیق شدہ آواز بنائیں۔ یہ وہ دور تھا جب کہ ریڈیو پاکستان کی مہر لگوانے کے لئے ایک فنکار کو ماہرینِ فن کے آگے اپنی آواز' سُر اور لے کی تمیز اور موسیقی کے علم پر دسترس وغیرہ کا امتحان دینا ہوتا تھا جسے آڈیشن (audition) کا نام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے آڈیشن کے لئے درخواست دائر کی۔ دس سے بارہ ماہرین فن کو ان کا کٹھن امتحان لینے کے لئے معمور کیا گیا۔ ثریا ملتانیکر کا کہنا تھا کہ آڈیشن کا مرحلہ انتہائی مشکل تھا۔ ان کو مختلف راگوں کی تفصیل بتانے کا کہا گیا۔ ان کے ادا کرنے کے اوقات' ان کے وادی اور سموادی سُروں اور مختلف ٹھاٹھوں کے متعلق سوالات کی پوچھ گچھ کی گئی۔ ممتحن حضرات میں میاں قادر بخش طبلہ نواز' بابا میرو ڈھولو۔ سارنگی نواز اور خان صاحب صابر خان دلی والے وغیرہ شامل تھے۔ ثریا کو کلاسیکل راگوں کی ادائیگی میں مختلف زیر استعمال گمکوں کا بھی پوچھا گیا۔ پھر ان کو صبح کا راگ جون پوری اور رات کا راگ ملتانی گانے کو کہا گیا۔ اور آخر میں رات کا راگ کیدارا بھی ادا کرنے کی فرمائش کی گئی۔ ثریا نے کہا کہ ان دنوں کے مقابلے میں آج کل آڈیشن آسان ہے۔ شاید یہ ایک وجہ ہے کہ سینئر آرٹسٹ موسیقی کی مضبوط بنیاد کے حامل ہیں بنسبت آج کل کی پود کے' جو راتوں رات اپنے آپ کو منوانا چاہتی ہے۔ ان دنوں کے بعد ثریا نے کبھی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ 1955ء کے بعد' انہوں نے کلاسیکل اور نیم کلاسیکل موسیقی میں اپنے جوہر دکھانا شروع کر دیے۔ انہوں نے موسیقی کی اصناف' کافی' غزل اور پنجابی گیت گانے کی تعلیم استاد جمال الدین ملتانی سے حاصل کرنا شروع کر دی۔ لاہور میں نامور اور قابل موسیقاروں استاد نیاز حسین شامی' اور عبدالحق قریشی کی زیر نگرانی' ریڈیو پاکستان پر ریکارڈ کرنا شروع کر دیں۔ ثریا ملتانیکر نے اس دور کو کلاسیکل موسیقی کا' گائیکوں اور سننے والوں کا سنہرا دور گردانا۔ پاکستانی فلم انڈسٹری میں اپنے مختصر دور کو یاد کرتے ہوئے ثریا ملتانیکر نے فرمایا کہ ان کا پہلا گیت قتیل شفائی کا لکھا ہوا گیت 'بجریا کا ہے لائے بتیاں' تھا۔ موسیقار صفدر حسین کی موسیقی میں' فلم 'اُف یہ بیوی' کے لئے یہ نغمہ باری سٹوڈیوز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ ثریا ملتانیکر کے چہرے کے تاثرات جذبات سے بھرپور تھے جب انہوں نے ہنستی دل کی اس فلم میں اپنے پہلے گیت کو یاد کیا۔ پھر انکا اگلا گیت موسیقار کمال احمد کی فلم 'تین دن' کیلئے گایا گیا تھا جس کے بول تھے: "مکھڑے سے بھی کوئی پہچان کرے وہ نہ لگانے دل" پھر ان کی پہچان' گیت "بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے کہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا" کا ذکر چھڑ گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ گیت ان کا ایک پرائیویٹ گیت تھا جو کہ عوام میں بہت مقبول تھا۔ بہت عرصہ بعد شاعر مسرور انور نے اس گیت کو دوبارہ لکھا اور فلم 'بدنام' میں شامل کیا گیا۔ انہوں نے پہلے پہل یہ گیت گارڈن کالج' راولپنڈی کی ایک میوزک کنسرٹ میں پیش کیا تھا۔ اپنی ذاتی زندگی اور کردار کے متعلق ثریا ملتانیکر فرماتی ہیں کہ وہ قدرے شرمیلی طبیعت کی مالک ہیں۔ اور فلمسازوں' ہدایتکاروں' موسیقاروں' شاعروں وغیرہ سے تعلقات بنانے سے ذرا جھجکتی ہیں۔ جو کام ان کو اپنی کارکردگی پر مل جائے' اسی پہ اکتفا کرتی ہیں' چاہے وہ فلم انڈسٹری سے متعلق ہو یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے۔ وہ میڈیا میں دعوت ملنے پر جاتی ہیں' نہ کہ تعلقات کی بنا پر۔ وہ مقدار کی بجائے کوالٹی پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ وہ اسلم اظہر کی اس ٹیم کا حصہ تھیں جب 1960ء کی دہائی کے وسط میں ٹیلی ویژن کی ٹرانسمیشن ایک ٹینٹ (خیمہ) سے نشر ہوتی تھیں۔ اسی وجہ سے پاکستان ٹیلی ویژن پر وہ اس کی ابتدا سے اب تک اس کے موسیقی کے پروگراموں کا حصہ ہیں

اور آج موسیقی کی تمام اصناف میں گراں قدر خدمات کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے 1992ء کی وہ ریکارڈنگ یاد ہے جس میں فرخ بشیر کے پروگرام "آواز و انداز" کے دو عدد episode ایک ہی نشست میں ریکارڈ کئے گئے۔ ایک میں ثریا ملتانیکر اور ایک میں میں تھا۔ ثریا جی کے موسیقار ماسٹر منظور اور میرے موسیقار اختر حسین اکھیاں تھے۔ ان کی اس پروگرام میں غزل "افسانہ یار کے دور تک تو چلے گئے" کے نقوش کی مہر اب تک میرے ذہن پر ثبت ہے۔ 1995ء میں میرے پروگرام "دیس پردیس" میں ان کی پرفارمنس بہت معیاری تھی۔ اس کے علاوہ پی ٹی وی کے پروگرامز "طارق عزیز شو"، "نغمہ ساز"، "مہمان" وغیرہ میں ثریا ملتانیکر کی شرکت یادگار تھی۔ ان کی موسیقار میاں شہریار اور پروڈیوسر خاور حیال کی مشترکہ کاوش "پروگرام "چندن دا کلا" میں شمولیت باعث افتخار تھی۔ یہ پروگرام ہر جمعہ کے روز ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ ثریا ملتانیکر حیات احمد خان کی آل پاکستان میوزک کانفرنس میں باقاعدگی سے شرکت فرماتی رہی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ 1960ء کی دہائی میں خان صاحب نے انہیں ایک شام گانے کیلئے بلایا تھا لیکن ان کو پانچ دن متواتر گانا پڑا۔ اس جشن موسیقی میں امید علی خاں' روشن بائی اور اختری بائی بھی مدعو تھیں جنھوں نے ان کی پرفارمنس کو سراہا تھا۔ بقول ثریا ملتانیکر یہ اچھی موسیقی کا دور تھا۔ اس دور میں وہ موسیقی کانفرنس جو کہ مشرقی پاکستان کے شہر چٹاگانگ میں منعقد ہوئی تھیں پرفارمنس کے لئے گئیں۔ اسکے علاوہ ثریا جی کو متعدد بار دہلی اور جے پور وغیرہ میں پرفارم کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ پاپ موسیقی کے متعلق ثریا ملتانیکر کے خیالات میں بہت ترشی ہے۔ وہ اس موسیقی کو "شور" کا درجہ دیتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ یہ موسیقی نہیں ہے۔ انہیں یہ گلہ ہے کہ سینئر آرٹسٹ جو کہ کلاسیکل موسیقی کی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں' انہیں وہ درجہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس نے پاپ موسیقی کو کلاسیکل اور نیم کلاسیکل موسیقی پر ترجیح دی۔ انہیں یہ گلہ ہے۔ وہ مزید فرماتی ہیں کہ وہ پاپ موسیقی کے خلاف نہیں ہیں' صرف اس صنف کو دوسری مستند اصناف موسیقی پر میڈیا میں ترجیح دینے پر شاکی ہیں۔ دوسرے وہ گلہ کرتی ہیں کہ الیکٹرونک میڈیا میں آج اور دیگر سینئر آرٹسٹوں کی پرفارمنس کو ایک سے زیادہ مرتبہ ٹیلی کاسٹ نہیں کیا جاتا۔ ان کا خیال ہے کہ ایک گانا اس وقت تک مقبول نہیں ہوتا جب تک اسے بار بار نہ چلایا جائے۔ بعض اوقات یہ معیاری پرفارمنس کے نقوش مٹا بھی دیئے جاتے ہیں۔ ان کو محفوظ نہیں کیا جاتا۔ اس لئے پی ٹی وی مینجمنٹ کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ ان گانوں یا محافل کی ریکارڈنگ کو محفوظ کرے۔ اسی طرح دیگر پرائیویٹ چینلز کا بھی یہی وطیرہ ہونا چاہیے۔ ثریا ملتانیکر فرماتی ہیں کہ انکا یہ مشاہدہ ہے کہ گاؤں اور دور دراز علاقوں میں لوگ بے سری موسیقی سننے سے پرہیز کرتے ہیں اور ٹی وی چینل بدل دیتے ہیں۔ وہ ذہنی سکون چاہتے ہیں نہ کہ بے سکونی۔ صرف اچھل کود اور بے سرا پن کانوں اور ذہنوں میں انتشار پھیلاتا ہے۔ اگر ایسی موسیقی ہی شائقین موسیقی کو دیکھنے اور سننے کو ملتی ہے تو وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایسی موسیقی ہی سنیں کیونکہ ٹیلی ویژن سیٹ ہر ڈرائنگ روم میں موجود ہوتا ہے۔ اپنی فیملی کے متعلق ثریا ملتانیکر نے بتایا کہ ان کا بڑا بیٹا محمد علی ایف۔ آر۔ سی۔ ایس' ڈاکٹر ہے اور برطانیہ میں رہائش پذیر ہے۔ وہ ہڈیوں کے علاج کا ماہر ہے۔ اسکی موسیقی سے رغبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پڑھائی کرتے وقت بھی ریڈیو سنتا رہتا تھا۔ پھر ان کی ایک بیٹی رقیہ ساجد ہے جو کہ شادی شدہ ہے اور ملتان میں رہائش پذیر ہے۔ پھر انکا لڑکا رمضان علی ہے جو بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی میں ریسرچ آفیسر ہے۔ اسکے بعد آتی بیٹیوں شائستہ' رابعہ' عالیہ اور راحت بانو کی پیدائش ہوئی۔ راحت بانو اچھا گاتی ہیں۔ انہوں نے انگریزی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی ہے اور پی ٹی وی پر گا چکی ہے نظر آتی ہیں مجھے انکی دہائی میں پی ٹی وی پر پروگرام "مذاق رات" میں شمولیت یاد ہے!

◆◆◆

جائزے

نئے نقاد کے نام خطوط: مختصر تاثر

جمیل احمد عدیل

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نثر کی معروف اصناف: انشائیہ، افسانہ، سفرنامہ، ناول، روزنامچے کو اظہار کا ذریعہ بناتے آ رہے ہیں لیکن ان کی شخصیت اپنی مرکزی شناخت کے لیے تنقید ہی کو نشان زد کرتی ہے۔ واضح رہے اس ضمن میں ترجیح کی مناسبت سے ان کا وقیع تنقیدی سرمایہ خود متکلم ہے۔ گویا یہ تعین کسی بیرونی تجربے کا مرہونِ منت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی چند دن پہلے طبع ہونے والی تصنیف "نئے نقاد کے نام خطوط" علمی ادبی حلقوں میں اس لیے بھی موضوعِ گفتگو بن رہی ہے کہ انھوں نے جدید تنقیدی مباحث کو مکتوب نگاری کی تکنیک میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ فکری جہات پہلے بھی مشاہیر کے ہاں مکاتیب کا اہم مضمون بنتی رہی ہیں لیکن ناصر عباس نیر صاحب نے عہدِ موجود میں یہ اختصاص اپنے نام کیا ہے کہ ان تمام (تیئیس) خطوط میں خالص علمِ تنقید کی روح کو افکارِ تازہ سے مشروط کر کے پیش کیا ہے۔ یہ صورتِ حال اس لیے بھی افراد کی ترجمان ہو جاتی ہے کہ رواں زمانہ مکتوب نگاری کو تیزی کے ساتھ ماضی بنا رہا ہے۔ سو وہ دور نہیں جب لوگ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے مابین تعلق کی مہک کو یکسر اجنبی گمان کرنے لگیں گے۔ یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر ناصر عباس نے بھی ان مکاتیب میں اپنے مخاطبین کو اسمِ معرفہ میں محدود نہیں کیا۔ یوں اس طرف کو کھلا چھوڑ کر کے ہر قاری کی خاطر ایک گنجائش پیدا کر دی گئی ہے کہ وہ خود کو خط کا مخاطب فرض کر سکتا ہے۔ فی الاصل یہی وہ رنگ ہے جو مذکورہ کتاب کو ممتاز کرتا ہے۔ کہ دو افراد کے بیچ موثر ہمدردی بلکہ محبت کا عنصر افہام و تفہیم کی نئی فضا تخلیق کر سکتا ہے۔ خط میں ملفوف اس زاویے ہی کو وسیلہ بناتے ہوئے رسمی علمی ثقافت کو منہا کر کے لطافت کو غالب کیا جا سکتا تھا۔ زیرِ تعارف کتاب نے یہ مشترکہ Bond تشکیل دے کر یہ وحدت کو رسائی کی بجائے کشادگی فراہم کی ہے۔ اس نکتے کی صراحت کرتے ہوئے مصنف "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں:

> "کسی زمانے میں نوجوان شاعر کے نام جرمن زبان کے آسٹریائی شاعر رلکے کے خطوط پڑھے تھے — یہ خطوط لکھتے ہوئے کہیں لاشعور میں وہ خطوط ضرور موجود تھے۔ خط کی تکنیک، ایسی بہت سی باتیں، قدرے بے تکلفی اور اپنائیت کے ساتھ کہنے کا موقع دیتی ہے، جو مضمون یا مقالے میں ممکن نہیں۔"

اس پس منظر میں ایک قضیہ ضرور ابھرتا ہے۔ وہ ہے، 'ناصحانہ انداز'! ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے بھی 'نئے نقاد'[1] سے رابطہ بحال کرتے ہوئے نصیحت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ عین ممکن ہے اسی مقام پر احتراز واقع ہو سکتا تھا کہ چند کیمیائی مشقتانہ کیفیت ہے جو ردِعمل ابھار کر جرح کو دعوت دیتا ہے۔ یوں لاگ اور مضمون میں بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ 'نئے نقاد کے نام خطوط' کا مطالعہ کرتے ہوئے خود تجسس چند صفحات تک برقرار رہا کہ مصنف اس مسئلے سے کیسے عہدہ برآ ہوتے ہیں؟ لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان کی ذہانت نے اسے الجھاؤ نہیں بننے دیا۔ ایک تو انھوں

نے تشکیک کی مقدار عمداً بہت کم رکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے بنیادی مقدمے سے کہیں انحراف کے مرتکب نہیں ہوئے، جس کے مطابق سوچ کے بیج کو صعودی تفوق حاصل رہے گا۔ مطلب یہ کہ انھوں نے جذبات کی یورش سے کمک پا کر مخاطب کے گرد محاصرہ تنگ نہیں کیا۔ اسے آزادی کے حق سے محروم نہیں کیا۔ اس طرح اپنا عندیہ بیان کرتے ہوئے حقانیت کو تسابق کہہ کر نفسیاتی دباؤ نہیں ڈالا بلکہ اسے سوچنے اور سوچتے رہنے کی دعوت دی ہے۔ اسی لیے وہ 'اصول تعریف' کی روشنی میں اس نکتے کو اہمیت دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

''سوچنا مشکل اور محسوس کرنا آسان ہے۔ لوگ اپنی قدیمی جبلتوں کو آج بھی اپنی استفہام پسند کھوپڑی (یہاں کوئی ملائم مترادف ہونا چاہیے تھا: ناقل) پر ترجیح دیتے ہیں۔ انھیں دماغ سے زیادہ ریڑھ کی ہڈی پر بھروسا کرنا زیادہ فطری محسوس ہوتا ہے۔ وہ گالی، نفرت، تعصب، حسد، بغض، عناد جیسے جذبوں کو، جنھیں قدیم زمانے میں حقیقی دشمن کے مقابلے کے لیے آدمی نے پیدا کیا تھا، انھیں اپنے وجود کے سچے اظہار کے طور پر قبول کرتے نظر آتے ہیں۔''

ظاہر ہے اس تناظر میں جب مکتوب الیہ میں یہ شعور پوری توانائی کے ساتھ منتقل کر دیا گیا کہ حریت فکر اس کا خلقی حق ہے؛ کسی کا احسان نہیں تو اب 'نصیحت' محض یاد دہانی ہے، توجہ مبذول کراتا ہے، دانستہ سازش نہیں، جس میں اکثر سماجی عوامل اور بے جا اقدار حاوی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی کتاب کا سرنامہ اپنے عنوان و مضمون کی درست نمائندگی کرتے ہوئے شاہد ہے کہ یہاں نقاد کے منصب کا دفاع ناگزیر خیال کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی نگاہ میں تنقید معصیت کے باعث قابل تعزیر ہو رہی ہے۔ انھوں نے یہ جانا کہ تنقید سے متعلق طنز و تضحیک کے تیر برسائے جا رہے ہیں۔ یہ عمل تنقید سے منسلک بصیرت کی راہ روکنے کے مترادف ہے۔ تنقید تو علمی تازگی کی ضامن ہے۔ اگر اس نوع کا پروپیگنڈا جاری رہا تو معاشرے میں متشدد رویوں کو بڑھاوا ملے گا۔ یوں سوقیانہ اسلوب میں تنقید کو ہدف بنانا غاصب اور طاقت کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہوگا:

''تنقید کو بطور صنف ادب پسپا کرنا، ایک معمولی بات نہیں کہ جسے نظر انداز کرنے کے ہم سب متحمل ہو سکیں۔ کسی سماج سے تنقیدی فکر کے خاتمے کا خواب، اس سماج میں سیاسی، سماجی آمریت قائم کرنے والا ہی دیکھ سکتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کے ان لفظوں میں کھرا لہجہ ضرور ہے مگر تنقید کی معنویت کا اثبات کرتے ہوئے انھوں نے جارحیت سے اپنا دامن بچایا ہے۔ وکٹر ڈیملیس میں اوڈیس چھپ کر وار کرنے کا پیادہ عادی ہے۔ وہ اپنے لیے Subverter ہونے میں کوئی کشش نہیں دیکھتے۔ اس لیے انھوں نے غیر جذباتی ہو کر رسان کے ساتھ یہ ذہن نشین کرانا چاہا ہے کہ تخلیق اور تنقید (نقاد اور تخلیق کار) کے درمیان عداوت / رقابت کا رشتہ نہیں، یہ ایک دوسرے کے حریف نہیں حلیف ہیں۔

ان مراسلوں میں ناصر عباس نیر صاحب نے ایک بار پھر سوال کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ وہ اپنے مکتوب الیہ کے توسط سے قاری پر یہ استعجاب کھولتے ہیں کہ یہ کیسے اور کب ہو گیا؟ ہمارے سوال اپنے انجام کو پہنچ گئے؟ ہمارے جواب تکمیل کے دائرے پورے کر چکے؟ واقعتاً تشکر کیا جائے کہ ہمیں ہر سوال کی بابت علم کا دعوا ہے؟ ہمیں ہر جواب کی بے تکلف آگہی میسر ہے؟ یا للعجب!!! تو پھر یہ دوام صدائے کن

فیکون کیا ہے؟ ناصر صاحب نے تنقید کو نیوٹرلس مانتے ہوئے علم و فن اور ثقافت و تمدن سے وابستہ تخصیص بلکہ مقدس و تجبر سے پر سوالیہ نشان عائد کرتے ہوئے کلیشوں کو رد کرتے ہوئے نئے استفسارات کی معقول مقدار کو ایجاد کیا ہے۔

ناصر عباس نیر کو پڑھنے والے یہ توقع باندھتے ہیں کہ وہ طبقاتی استبداد اور Indoctrination کے باب میں بہت واضح سائنس رکھتے ہیں۔ ان کی دانست میں خطابت کا جبر سامع / قاری کی سوچ کو محدود بلکہ مقید کرتا ہے۔[2] ہاں! یہ صحیح ہے کہ اپنے عصر کی سوچ سے ہم آہنگ ہونا 'ریلیف' تو فراہم کرتا ہے۔ گویا یہ پیکیج اسے متبادل پروگرام دیتی ہے "Faith" کے سائبان تلے زیست گزارو گے تو قلب و ذہن کامل اطمینان کے ساتھ وقت بتائیں گے۔ اگر اس کے برعکس نئے فکری امکانات کی جستجو میں مسافرت کا قصد کرو گے تو ہر گام پر رنج و محن کو اپنے استقبال کے لیے مستعد پاؤ گے! ناصر صاحب نے خوانندہ کو آمادہ کرنا چاہا ہے کہ اس 'سہولت' سے مستفید ہونا ذہنی انجماد کے مساوی ہوگا، علوم سے دوستی کا خواہاں اس انتخاب کی جانب التفات ظاہر نہیں کر پائے گا۔ اس کے لیے زندگی، سوچ / تدبر کے تلون میں پوشیدہ ہے۔ اس اور کے راستے پر گامزن ہوتے ہوئے ممکن ہے کہ وہ خود کو غیر محفوظ تصور کرے مگر آگے چل کے ذہنی وسعت اسی کی ملکیت بنے گی۔ سوال کا گلا گھونٹنے کا مطلب واقعی علم کو مصلوب کرنا ہے۔ صاحب ادراک ایسے بھاشن بھرے براہین کا پیدا کار نہیں ہو سکتا جن میں محض مان لینے میں رفع درجات کی بشارت ملے۔ تیمور زمان راشد کے لفظوں میں: "سوال سے اپنی قوم میں تجلی ہو جاتی ہیں۔ جنھیں مذہبی اور سیاسی گدڑیے ہانک کر مرضی کی چراگاہ میں لے جاتے ہیں، وہ ایسی قوموں کا قتل ہوتا ہے۔" یاد رہے! سوالات کے چشمے اگر خشک ہو گئے تو سماج پر کائی کی تہیں دبیز ہوتی جائیں گی۔ یوں سوچ رکھنا چاہیے، جہاں سوال کی دھار کند ہو جائے وہاں چھری کی دھار اپنے آپ تیز ہو جاتی ہے! ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے سوال کی ماہیت پر لطیف گفتگو کی ہے اور وہ فرق منور کیے ہیں جو بادی النظر میں سامنے نہیں آتے۔ ان کی نظر میں سوال محض Note of Interrogation کا درجہ دینے سے نہیں بن جاتا۔ ایک عمیق لاشعور ہے جو دری استفسار کو 'سوال موصل الی المطلوب' کے درجے میں لے جاتی ہے: "سوال کو پہچاننے کی صلاحیت ایک نقاد میں سب سے بڑھ کر ہونی چاہیے۔ سوال کی زبان اور منطق پر غور کرو گے تو جلد پہچان جاؤ گے کہ کہاں سوال ہے اور کہاں محض کسی سے نفرت، دشمنی، تعصب کو سوال کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے۔"

جناب ناصر عباس نیر نے اپنی اس کتاب میں اردو تنقید کو نامانوس اور مختلف بحثوں کی وساطت سے وہ منہاج دینے کی آرزو کی ہے جس کی روایت کو مدرسانہ انتقاد کیا رائج الوقت تنقیدی دبستانوں میں بھی نہیں اپنایا جا سکتا۔ ہاں! اگر کچھ مطلوب ہے تو فقط اشارات کی صورت میں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر علم نفسیات کے ساتھ گہرا شغف رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں شاید ہی ایسا کوئی خط ہو گا جس میں ادیب یا قاری کی شخصیت کا مرکز پرت بے نقاب نہ ہوا ہو۔ اس اعتبار سے پڑھت کے عمل میں انکشاف اپنا کیف یا بار خاطر نقاد کے سپرد کرتا ہے یعنی اسے تحیر سے ثروت مند کرتا ہے۔ اس ضمن میں پچیسواں خط خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں تخلیق کار، نقاد اور عام قاری کی نفسی حالتوں کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے کے بعد انھیں تین شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس طرح سارا متن نادر ہو گیا ہے، یہ ہی قرأت اچھوتی ہو گی ہے۔ مصنف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زبان تکلم کرے یا ساکت رہے، دونوں صورتوں میں 'اظہار' کو روکا نہیں جا سکتا: ایسے خوف کی خود کاری کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔[3] جانے یہ جبر ہے یا کیا ہے لیکن اس میں بہ حیثیت کلام نہیں کہ تخلیق کے قلب القلوب میں اپنا تماشا"

دیکھنے کی چاہت لازماً موجود ہوا کرتی ہے۔ اس تمنا کی تکمیل کے لیے اسے اردگرد/جہانِ خراب کی تعمیر بھی خسارے کا سودا محسوس نہیں ہوتی۔ چناں چہ وضع ہونے سے پیشتر ہی تعبیر کی جستجو میں مسافر ہو جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر نے لکھنے والے اور خواب دیکھنے والے کے مابین مشترک قدر کو دریافت کیا ہے:

> ''ہر راز کسی خاص زبان میں ظاہر ہونا چاہتا ہے۔ کئی بار تو وہ راز اپنے اظہار کے معاملے میں ضد کرتا ہے؛ وہ اجنبی معلوم زبان کو باہر والوں سے اوجھل کے رکھ دیتا ہے۔ تم اپنے کسی انوکھے خواب کو یاد کرو — آدمی کا ہر خواب اس کا اپنا راز ہے، یہ راز جتنا گہرا، جتنا عجیب، جتنا پر پیچ ہوتا ہے، اس کی زبان اتنی ہی نامانوس، اجنبی ہوتی، علامتی اور تہ دار ہوتی ہے۔ ایک بڑا فن پارہ، ایک عظیم راز ہے اور یہ بڑی حد تک کسی گہرے خواب کی مانند ہے۔''

گویا جو لفظ بھی تخلیق ہو گیا، اب وہ مجسم اضطراب ہے، اسے ہر حال میں وصال چاہیے اور اسے مطلوب براہِ راست قاری سے ہمکلام ہو کر ہی ملے گی۔ یوں تخلیق کار کی 'بے نیازی' محض ایک واہمہ ٹھہری: ''یاد رکھو! جہاں زبان ہے وہاں دوسرا ہے۔'' میڈیم جو ہر لحاظ سے ایک عامل ہے جس کا کام ہی دو افراد کے درمیان رابطہ استوار کرنا ہے۔ مصنف نے اس Thesis کے لیے عالمی ادب سے ماخوذ نظائر کو تقویت دی ہے۔ مثال کے طور پر فرانز کافکا کی وصیت اور بے یقینی اپنے لکھے کو نا معتبر تصور کر کے تنسیخ کرتی تھی مگر اپنے مرقومہ اسرار کو وہ خود نذرِ آتش نہ کر سکا، اسی طرح ہم اس خطے پر بسنے والے نوآبادیاتی عہد کو دیکھیں تو بظاہر وہ 'زہر کا دریا' گزر چکا ہے لیکن اس کا بعد از اثرات مختتم نہیں۔ کیا استعمار کے مویدِ جملہ مشاہیر انتقام کی تعذیب کا شکار نہیں ہوئے؟ ان مشاہیر میں سے ایک مولوی نذیر احمد ہیں۔ جن کے کردار 'نصوح' نے کلیم کا کتب خانہ جلا کر 'Natives' کو سریت سے معمور یہ پیغام دیا کہ اب جینا ہے تو اپنا ماضی جلانا ہے۔ اس بیک ڈراپ میں ناصر عباس نیر کی یہ سطر ذہن میں زیادہ معلّق رہے گی: ''نذیر احمد نے اپنی ہی کتاب 'امہات الامہ' کو خود تلف کیا تھا... مگر اپنے دل کا حال نہیں لکھا، جب اس نے اپنی ہی کتاب کو شعلوں کی نذر کیا۔''

موجود تناظر میں یہ حالِ دل اب چھپا نہیں رہا کہ غور کیا جائے تو یہ واقعہ براہِ راست 'زخم' کی تفسیر ہے جو نوآبادیات کا مرہونِ منت ہے۔ تاہم ناصر عباس نیر صاحب نے ثانوی سیاق میں گولالی، گوگول، جیمس جوائس، غالب، ایملی ڈکنسن کی سوانح سے وہ اجزا اخذ کیے ہیں جو ان مصنفین کے تخلیقی سرمائے کی بابت دو قول کا مظہر اور تعلیل دیتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ ہر ادیب اپنی تخلیق کے ذریعے بقا کا متمنی ہے۔ اگر وہ سماجی دباؤ کے تحت اپنی تخلیقوں کے اتلاف کا فیصلہ کر بھی لیتا ہے تو اس لمحے وہ اپنے دل اور دماغ کے درمیان تفریق کی لکیر پر لرز رہا ہوتا ہے۔ (4)

سو ناصر صاحب کا یہ مقدمہ ناتواں نہیں، جو لکھتا ہے وہ اپنی تخلیقوں کو بلا جواز تلف نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں وہ عام قاری سے زیادہ مستند قاری سے تحسین کا طلب گار رہتا ہے کہ اس کا ادراک ذہن بے تحیر نہیں، عام قاری کی معصومیت روایتی مجمل توصیف سے اوپر اٹھنے کی اہلیت نہیں رکھتی جبکہ زیرک نقاد کی توجہ اسے حقیقی تسکین فراہم کر سکتی ہے۔ اس فرق کو ذرا کھل کر سمجھنے کی ضرورت ہے کہ در حقیقت دونوں میں دورانیے کا فرق ہے، وابستگی میں تفاوت ہے، جیسے شوقیہ قرأت کا جو بن سے واسطہ اور واردات ہے، نقاد کا متن سے معاملہ یکسر مختلف واقعہ ہے کہ

اول الذکر میں 'عارضی پن' کا التباس اپنا چمکارا رکھتا ہے جبکہ ثانی الذکر میں قرأت کسی ہنگامی یا جذباتی عمل کی پیش کار نہیں ہوتی کہ جس کا رفتار متن کی عارضی حرارت، وقتی دہشت اور لمحاتی مہک کے قریب بھی نہیں آتا۔ اس کے ادراک میں گہرائی کی بجائے گہری جہت کارفرما رہتی ہے۔ اس مسلسل ارتکاز کے بغیر معانی کے موتی برآمد کیے بھی نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ استفتاح معنی خیز ہے کہ تخلیق کار نقاد کی مذمت صرف اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ دراصل شاکی ہے بلکہ متمنی ہے کہ اسے وہ خور اعتنا کیوں نہیں سمجھا جا رہا؟ یوں تنقید کو لاحق کہنا صرف اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے ایک طرح سے 'کج روی' کا اظہار ہے۔ یہ رویہ اپنی جگہ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر کہا جائے کہ نقاد کی کا التفات پانے کے لیے تخلیق کار چپکے چپکے اپنا معیار بہتر کرتا رہتا ہے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے اور جب وہ اپنے تئیں سرفراز ہو جاتا ہے تو اس کی ماہیئت یوں بھی عیاں ہونے لگتی ہے کہ وہ ایسے اسٹیبلشڈ نقاد کا طالب بن جاتا ہے جو اس کے معاصرین کو بالعموم مسترد کرے، بالخصوص اسے قبول کرے۔ عبداللہ حسین سامنے کی مثال ہیں کہ انھوں نے اپنے ناول 'نادار لوگ' کے آغاز میں لکھا:

"نقاد و تبصرہ نگار حضرات سے استدعا ہے کہ کم از کم چھ ماہ کے عرصے تک اس کتاب کے بارے میں کچھ لکھنے سے اجتناب برتیں تاکہ میرے قارئین کو کسی مداخلت کے بغیر اسے پڑھنے کا موقع مل سکے۔"

اب اس معصومانہ ہدایت کو "حسن طلب" کے زمرے ہی میں جگہ مل سکتی ہے۔(5) لیکن یہ اہم نکتہ بھی قابل غور ہو رہا ہے کہ لکھت جس بھی حیلے سے نقاد کو اپروچ کرے مگر ایک قطرہ تخلیق کا اپنے تیور کن لفظوں اور در و بست سے عاری فقروں کے زور پر کوئی بھی شاہکار طباعت نہیں کر سکتا۔ اگر یہ اوپر نظرانداز کر لیا جائے کہ تخلیق کا امر کرنا فرد واحد کا اختیاری نہیں تو یہ کہنا مجموعی طور پر خلاف نہ ہوگا "یا شاید ادب کی تاریخ زمانہ مرتب کرتا ہے۔ زمانہ ریاضت اور وسیع النظر، بے غرض اور صداقت پسند لوگوں کے ذریعے ہی اپنا اظہار کرتا ہے۔"

آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ناصر صاحب کی یہ کتاب اسی مرحلۂ عمر اور اتنا کام کر لینے کے بعد ہی آنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ یہاں ان کی دانش خوش خرام ندی کی مانند بہہ رہی ہے۔ اصل کچھ بھی نہیں۔ مصنف جلالی تو کبھی نہیں رہے مگر ان اوراق میں تو وہ اپنی فکری جمالیات کے نقطۂ عروج کو چھو رہے ہیں۔ جس کے لیے 'خلعت' ہی کو موزوں لفظ قرار دینا پڑے گا۔ یہ کہنا بجا ہے کہ وسیع المطالعہ عالم کے لہجے میں ایک خلوص آ جاتا ہے۔ علمی برتری کا احساس وجود کے گرد تحسین کا ہالہ کھینچ لیتا ہے لیکن مجال ہے یہاں کسی لوح کے غرے کا شائبہ بھی محسوس ہو۔ اس تصنیف کے لیے مصنف تند و تیز نکتے کو کمال ملاحت کے ساتھ پیش کرنے پر ملکہ حاصل کر چکے ہیں۔ اسی بنا پر اوپر کہا گیا ہے کہ ان کے عمر و جود پر اس کتاب کا ثمر اسی وقت آنا چاہیے تھا۔

صاحبو! خطابات کے اس مجموعے کا حصہ ہونے والے مندرجات نے اپنے لیے جس والا و دبیز سبک کا اہتمام کیا ہے، وہ وقت کو اتفاق کر کے مجموعے اپنے نام کر لیتا ہے۔ سوچیے یہ گستاخانہ قول ہے، وہ اس کتاب کی خود نوشت کا رنگ لے سکتا ہے!!

حواشی:

1۔ بظاہر مکتوب نگار تو محرم نقاد سے مخاطب ہیں۔ خطوط کے متون میں 'تم' کا صیغہ اس کی تائید بھی کرتا ہے لیکن شاید ایسا نہیں کیونکہ یہاں صرف نو آموز نقاد مراد نہیں بلکہ ہر اس فرد کی جانب تخاطب ہے جو تخلیقی/ فکری صورت حال کو قبول کرنے پر آمادہ ہے،

بھلے ہی وہ سالم ہو!

2۔ ''تم محسوس کرو گے کہ خطابت سب سے زیادہ دھوکا دیتی ہے۔ جو شخص سوچنے سے پہلے اپنا منہ وا کرنے والے وہ خطابت کا ماہر ہے۔''

3- My Fear is Free and is a manifestain of my freedom. (Jean Paul Sartre)

4۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے خود پر ملامت کرتے ہوئے مذہب مخالف اپنی ابتدائی تصنیف 'فلسفۂ اجتماع' کو اعلانیہ ڈس اون تو کر دیا لیکن اپنی خودنوشت میں اس واقعے کو رقم کرنا نہیں بھولے۔ بادی النظر میں یہ بات ناقابلِ فہم سی لگے گی مگر جس طرح مولانا 'گستاخ' یاس یگانہ چنگیزی کو عبرت کا نشان بنا رہے تھے تو ان کے جوشِ انتقام نے مذکورہ کتاب کی جدائی کا کرب ضرور خود میں جذب کیا ہوگا۔ اب کیا کہیے! ایسے لاشعور نہایت پُراسرار واقع ہے۔ اسی طرح تحلیلِ نفسی اپنی ذات میں بہت پیچیدہ عمل ہے۔

5۔ 'ناول لوگ' کی 1996ء میں اشاعت ہوئی۔ ستائیس برس بیت جانے کے بعد بھی اسے ان کے ایک اور ناول 'راجا' کی طرح اگر بالکل پذیرائی نہیں مل سکی تو کیا یہ علامت نہیں ہو رہا کہ وقت مصنف کی بجائے تصنیف سے متعلق فیصلہ صادر کرتا ہے۔ جیسا کہ 'راجہ گدھ' کی مصنفہ بانو قدسیہ کے قدرے ضخیم ناول 'عمر لازوال' آبادِ ویرانے (2011ء) کے حصے میں ناقابلِ ذکر توجہ نہیں آئی۔ اس ناول کی مناسبت سے ایک ہی آرٹیکل پڑھنے کو ملا ہے، جس کی رائٹر ڈاکٹر صفیہ بیگم نے اسے مجموعی طور پر ایک ناکام ناول قرار دیا ہے۔

◆◆◆

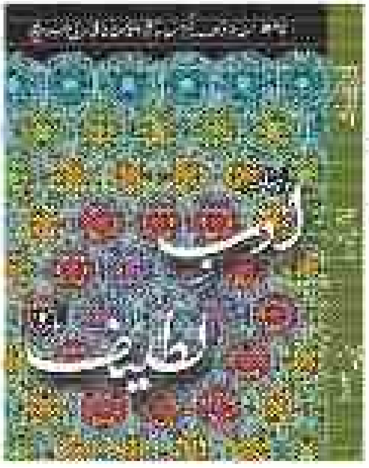

1935ء سے شائع ہونے والا ادبی جریدہ

ماہنامہ **ادب لطیف** لاہور

مدیرِ منتظم سلیم چوہدری اور نائب مدیر شہزاد نیّر کی سرپرستی میں ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کر چکا ہے۔ مسلسل ادبی خدمات پر ادارہ ''تخلیق'' کی طرف سے مدیر اور نائب مدیر دونوں کو مبارک باد۔

قیمت -/800 روپے — سالانہ زرِ اعانت مبلغ -/5,000 روپے

ملنے کا پتہ: کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

(0333-4377794, 0321-8110989)

چاند میرا ہم سفر: منفرد شاعری کا ایک حوالہ

شاہین زیدی

شاعری ہمیں اس لیے اچھی لگتی ہے کہ اس سے انسان کے تمام جوئی اور تلاشِ کمال کی تسکین ہوتی ہے۔ ایک اوریجنل اور ماہر تخلیق کار کی حیثیت سے ڈاکٹر ایوب ندیم نے اپنی شاعری میں تمثالوں کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ عام طور پر تمثالوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان میں تین خصوصیات ہوں: یعنی ندرت، ایجاز اور جذبہ انگیزی ہیے۔

دور افق میں ایک ستارہ باقی ہے　　میرے دل میں نام تمہارا باقی ہے (1)

ایوب ندیم نے اپنی رومانوی شاعری میں شاعرانہ فکر کی ماورائیت کا انکشاف بھی کیا ہے۔ شاعر کا تخلیقی عمل بے غرض نہ ہو اور اسے کوئی خارجی مفاد مقصود ہو تو شاعر کے ابتدائی تفکر کی جادو سے مشابہت بڑی آسانی سے سرفروشی بن جاتی ہے۔ مگر ایوب ندیم کو اپنے دل کی صداقت اور فضا سے محبت ہے۔ کہتے ہیں:

صدائے کون و مکاں تھا تو بے صدا بھی تھا　　رہا بھی تھا دل بے تاب، ہارا بھی تھا
میں اس سے اپنے تعلق کو نام کیا دیتا　　وہ ساتھ ساتھ تھا میرے، گریز پا بھی تھا (2)

جس طرح موسیقی روح کی غذا ہے اسی طرح شاعری بھی ایک غذائے روحانی ہے۔ شاعری محسوس اشیاء کے اندر کی روح کا انکشاف ہے اور یہ انکشاف محسوسات کے لباس میں ہی ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایوب ندیم کے اس شعر سے دی جا سکتی ہے۔

کسی آرزو میں حد سے گزرتے چلے گئے　　گہرے سمندروں میں اترتے چلے گئے (3)

انسان فطرت کے مظاہر میں اپنی صفات کو ڈھونڈتا ہے اور ان کو دریافت کر کے نئی ہیئتوں میں مجسم کرتا ہے۔ فطرت کی جمالیاتی اشیاء اس کی لذت کا منبع تخلیق ہیں اور انسان کو ان میں اپنے عکس کے بعض اوصاف نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ خاص فطرت کے نشان یا مظاہر مثلاً پہاڑوں، جنگلوں، بیابانوں اور طوفانوں میں بھی انسان کو اپنی بعض صفات کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسے فطرت حسین معلوم ہوتی ہے، اسے ہر حسین منظر اور بھی دلفریب لگنے لگتا ہے۔ یوں شاعر کو اپنے اندر نئے نئے راز کھلتے محسوس ہوتے ہیں اور خواب پرندوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کا اظہار ایوب ندیم نے بھی شعری پیرائے میں کیا ہے۔

اڑ گئے خواب پرندوں کی طرح　　آنکھ میں اتری سحر بے سایہ (4)

ہر صنف ادب یا تخلیق اپنے ماحول سے جڑی ہوتی ہے اور اسی بنا پر یعنی ماحول کے زیر اثر ہر مصنف کی اپنی ایک الگ شخصیت بنتی ہے بلکہ مصنف اپنی تخلیقات میں اپنے ماحول، زندگی، جغرافیائی حالات اور معاشرتی اثرات کو بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر ایوب ندیم کی غزلوں میں فکری ندرت اور جذباتی گہرائی صاف دکھائی دیتی ہے۔ سنجیدہ سوچ، پاکیزہ جذبے اور روحانی لطافت نے ان کے اشعار کو چار چاند لگا

دیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قاری ان کی شاعری کو سرور آمیز روانی سے پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

غزل میں فرد کا مخصوص تجربہ اجتماعی اور عمومی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس لیے غزل کے کردار مثالی نمونے کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ معاصر ادب میں ایک جدید شعری ساختیات کے تناظر میں یوں تو بہت سے نام ابھر کر سامنے آتے ہیں مگر بنظر حقیقت دیکھا جائے تو ڈاکٹر ایوب ندیم کا نام ان میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اپنے شعری اسلوب، آہنگ، مزاج اور مخصوص تخلیقی تکنیک کے لحاظ سے وہ نہ صرف اپنے ہم عصر شعراء سے منفرد اور دلکش ہیں بلکہ ان کے لہجے کی شیرینی اور کیف و گداز اپنے قاری یا سامع پر سحر طاری کر دیتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جیسے عہد ساز دانشور کا یہ کہنا اہم ہے کہ ''ایوب ندیم نظم سے زیادہ غزل کے شاعر ہیں اور فارسی غزل کی روایات پر حاوی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بعض ریختی غزلیں بھی کہی ہیں۔ تاہم انہوں نے غزل میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی محسوس کیا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے آخری ربع میں شاعری کر رہے ہیں اس لیے اس دور کے حالات و محسوسات کی جھلک بھی ان کے شعروں میں موجود ہے، جو اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ کھلی بصیرت و بصارت کے شاعر ہیں۔''(5)

ڈاکٹر ایوب ندیم نے غزل جیسی نازک صنفِ سخن میں اپنے تخلیقی جوہر کے کمالات دکھائے ہیں جس کا اعتراف اردو ادب کے ایک بڑے نقاد، ادیب اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ ''ایوب ندیم کی شاعری بالخصوص غزل کا اہم ترین وصف ان کا صوتی بہاؤ ہے۔ ان کی غزل میں کہیں کوئی ایسا لفظ، ادغام، شعری ترکیب یا خیال اس وضع کا موجود نہیں ہوا جو قرأت کی فطری روانی میں رخنہ انداز ہوا ہو۔ ایوب ندیم کی غزل تیرتا جاتی ہے اسی لیے اس میں پانی کے قدرتی بہاؤ سے ہم آہنگ ہونے کا انداز دیتی ہے۔''(6)

ایوب ندیم صرف یہی نہیں بلکہ اس سے آگے کی منزل کے مسافر ہیں اور جدید جدید کے خوب صورت لب و لہجے کے شاعر ہونے کی سند تو انہیں منیر نیازی جیسے شاعر سے بھی ان الفاظ میں ملی ہے: ''شاعر پڑھنے والے پر اپنا پہلا تاثر احساس کی سطح پر قائم کرتا ہے۔ شاعری کی فکری سطحوں کی دریافت بعد کا کام ہے۔ ایوب ندیم اپنی شاعری میں یہ ابتدائی تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہا ہے اور اس کے بعد وہ روایت سے جدیدیت، معلوم سے نامعلوم کے سفر پر نکلا ہے۔ نئے طرزِ احساس کے ساتھ قدم ملاتی ہوئی اس کی شاعری خوش آئند ہے جو اسے اپنے ہم عصر شاعروں میں ممتاز کرتی ہے۔''(7)

یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر سعادت سعید کے لفظوں میں، ایوب ندیم کی غزلوں کی خوب صورتی یہ ہے کہ: ''ان کی تازگی قاری کو ایک گونہ سرشاری کا احساس دلاتی ہے انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں اپنی ادبی پہچان کروائی ہے۔ انہیں ہم ان غزل گو شعراء کی صف میں شامل کر سکتے ہیں جن کا کلام قابلِ ذکر اوصاف سے مملو ہوتا ہے۔ حسن پرستی اور معاملہ بندی کے روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں آرزوئے عشق، جستجوئے منزل، عصری معاملات، زندگی کی لاحاصلی، بے معنویت، احساسِ محرومی اور داخلی خوف و دہشت سے متعلقہ موضوعات عصری انسان کی مسخ شدہ تمثال اجاگر کرتے ہیں کہیں کہیں ایسا بھی لگتا ہے کہ شاعر تصوف کے راستے سے خود شناسی کی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے۔''(8) اردو غزل کی روایات بہت تو مند اور وسیع ہیں اور اس کے کئی پہلو ہیں۔ میر سے مصحفی تک، غالب سے فیض تک اور فراز سے ایوب ندیم تک یہ تسلسل ایک مربوط انداز میں جاری ہے، جس کا ثبوت ان کی غزل کا یہ مطلع ہے۔

کبھی تو خود سے بچھڑنے کا مرحلہ آئے ــــــ یہ راہ ختم ہو اور اک اور راستہ آئے

اپنی ذات سے بچھڑنے کا تجربہ ایک ایسا تجربہ ہے جو گوتم کے نروان سے شروع ہو کر عہد جدید کے شاعر کے وجدان تک پہنچتا ہے۔ ذات کی گمی تصوف کے راستے کا وہ سنگِ میل ہے جہاں پہنچ کر حقیقت اور ماورائے حقیقت کے درمیان خطِ امتیاز واضح ہو جاتا ہے اور پھر شاعر اپنی بازیافت کے سفر میں اندر یا بیرون ذات کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے جس کی منہ بولتی مثال ایوب ندیم کے یہ اشعار ہیں:

وہ اس طرح مرے تاریک دل میں اترا ہے / کہ جیسے گنبدِ بے در میں چاند سا آئے
یہ میرے آخری سانسوں میں کس کی خوشبو ہے / مجھے یہ لگتا ہے شاید تو اب قضا آئے
کبھی تو اوڑھ کے سوؤں میں یادوں کی ردا / کبھی تو میرے تصرف میں یہ خلا آئے
وہ آئے تو میں مرے پاس، پہ وہ آخر / سفینہ ڈوب رہا تھا کہ ناخدا آئے
کبھی کبھی تری یادوں سے یوں لرزتا ہوں / کہ جیسے کچے مکانوں میں زلزلہ آئے
بیاں کیسے کروں اس کی نازکی، ایوب / وہ پاؤں پھول پہ رکھے تو زخم سا آئے (۹)

ڈاکٹر ایوب ندیم کا یہ مقطع صرف ایک خوب صورت احساس اور حسین منظر کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایت کا شاعرانہ احساس بھی ہے۔ عہد جدید کے اس رجحان ساز شاعر ایوب ندیم نے مندرجہ بالا اپنے مقطع میں نزاکت پر اپنے محبوب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ نہ صرف اس شعری خوب صورتی میں اضافہ ہو گیا ہے بلکہ نزاکت کا خوب صورت اور پاکیزہ تصور بھی اجاگر ہو کر سامنے آیا ہے۔ شاعر کے احساس اور خیال کی پختگی کی بھی داد دی جائے وہ کم ہے۔ بلاشبہ ایوب ندیم کی شاعری میں داخلی احساس نمایاں ہے مگر جب بیرون ذات کا یہ شاعر بیرون ذات سے طلسم آشنا ہوتا ہے تو اس کا یہ کہنا ایک تاریخی حقیقت بن جاتا ہے۔

انساں شکستہ پا ہوئے، سر ٹوٹتے گئے / نکلے حصارِ جسم سے، در ٹوٹتے گئے

ہاں! مسافتِ حیات کو بیان کرتے ہوئے ایوب ندیم کے حوصلے جوان سے جوان تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور یوں وہ امید و رجائیت کے شاعر بن کر ابھرتے ہیں۔ انہوں نے خود کہا ہے۔

صدیوں کے فاصلے بھی قدم چومنے لگے / ہم چل پڑے تو سنگِ سفر ٹوٹتے گئے

مسافتوں کے اسی تسلسل میں ان کا یہ شعر انتہائی دلکشی اور اعلیٰ شعری حسن کا آئینہ دار ہے۔

آخر ہماری ناؤ بھی ساحل پہ آ گئی / بپھرے رہے بھنور، پہ بھنور ٹوٹتے گئے

محبوب کی صورتوں میں جلوہ آرا ہوتا ہے لیکن صرف محبوب ہی کیوں محبوب کے استعارے میں ایک جبر جو ہر دور میں بھی تو ہو سکتا ہے جسے انہوں نے اپنے مقطع میں یوں بیان کیا ہے۔

وہ آندھیوں سا شخص، عجب شخص تھا ندیم / گزرا جہاں جہاں سے شجر ٹوٹتے گئے (۱۰)

میرے خیال میں یہاں شجر سے مراد معاشرے کے کمزور افراد ہیں اور آندھی سے مراد حالات کا جبر بھی ہو سکتا ہے اور اس وسیع کینوس کے تناظر میں ان کی غزل کا مقطع دلوں کو چھو جاتا ہے۔

وفا کی بستی کے رہنے والو تم اس جہاں کو رقیب رکھنا / نہ دشمنوں سے تعلق بڑھانا، نہ دوستوں کو قریب رکھنا (۱۱)

ڈاکٹر ایوب ندیم کی غزل کی ایک اور خوبی جو بطور خاص قابلِ ذکر ہے وہ ان کا طویل بحور میں نہایت آسانی سے خوب صورت اشعار کے پھول کھلانے کا ہنر ہے جس سے صرف انہی کی ذات آشنا ہے۔ اس ضمن میں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر" چاند میرا ہم سفر" کی یہ غزل بطور خاص قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔

میں ایک مدت سے اس جہاں میں رہیں رنج و الم تھا لیکن　　تمہارے آنے سے میری ہستی کے سارے رنج و ملال مٹے
جو ملتفت ہو تو روشنی ہے، جو بے رخی ہو تو تیرگی ہے　　تمھی سے رنج و الم کے سارے تمھی سے حسن و جمال مٹے
فراق آخر فراق کیوں ہے؟ وصال یکسر وصال کیوں ہے؟　　کبھی تو اپنا بھی لمحہ آئے، فراق رت میں وصال مٹے
وہ کیا نظر تھی کہ جس نے بخشی کی تیرہ راہوں کو روشنی دی　　نہ جانے کتنے صعوبتیں چھٹے، نہ جانے کتنے ملال مٹے (12)

محبت میں گہرائی اور اپنائیت کے رشتے اس وقت اپنائیت کی جڑیں مضبوط کرتے ہیں جب دوئی کا فرق مٹ جائے۔ ایوب ندیم کی غزل کا یہ شعر اس دعوی کی دلیل ہے۔

پیار وہ اور مرے دل میں چھپا دیتا ہے　　کبھی روتا ہے کبھی مجھ کو رلا دیتا ہے (11)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ محبت کے ایک اور پہلو کو بھی نظر انداز کرتے نہیں ہو تے جو ان کی دوسری غزل کے اس مطلع میں موجود ہے۔

مری وفا کا، مگر اعتراف کیسے کرے　　وہ اپنی ذات سے اب انحراف کیسے کرے

بظاہر چھوٹا ہوا یہ خوب صورت سا شعر محبوب کے ایک خاص رویے کا غماز دکھائی دیتا ہے مگر اس مطلع میں شاعر کی وفا اور راست قدری بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ذرا اس سے آگے جا کر ان کی نظر میں معاملات کے دیگر پہلو بھی ہیں جو ایک خاص ترتیب سے اس غزل میں آ جاگر ہوئے ہیں مثلاً یہ چند اشعار دیکھئے۔

وہ ماہتاب ہے، ہر گھر میں روشنی اس کی　　خود اپنی ذات میں وہ اعتکاف کیسے کرے
میں چپ رہوں تو سزاوار بے رخی ٹھہروں　　گلہ کروں تو وہ مجھ کو معاف کیسے کرے
وہ جانتا ہے کہ میں کس کی تیغ کا ہوں قتیل　　وہ آج فیصلہ اپنے خلاف کیسے کرے
جو شخص گرد ملامت سے آشنا ہی نہیں　　وہ اپنے آئینۂ دل کو صاف کیسے کرے
چھپا کے کیسے رکھے مجھ سے اپنا پیار ندیم　　"کتابِ دل کو رہین غلاف کیسے کرے (14)

غزل کا مقطع غور طلب ہے اور داد طلب بھی، قاری کے لبوں سے بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔ ڈاکٹر ایوب ندیم کی غزلوں میں ایک خصوصیت جو بہر حال امتیازی خصوصیت ہے وہ یہ دکھائی دیتی ہے کہ ان کی غزلیں اگرچہ مرصع اور متنوع ہوتی ہیں مگر ان غزلوں کے بعض اشعار اپنی جگہ مکمل نظم بھی بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر۔

ایک سورج زمیں سے ابھرا　　چہرہ لت پت تھا خون میں اس کا
کھا گیا کتنے آسمانوں کو　　فتنہ پرور زمین کا بیٹا (15)

ایسے ہی اشعار اپنے اندر نہ صرف تاریخی حقائق سموئے ہوئے ہیں بلکہ شاعر کی تاریخی بصیرت کا بھی بھرپور احساس دلاتے

ہیں۔ ڈاکٹر ایوب ندیم غزل کے ایک منفرد شاعر تو ہیں ہی، نظموں میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ بات ڈاکٹر سعادت سعید کے اس خیال کو مزید تقویت دیتی ہے کہ وہ نہ صرف غزل کے بلکہ نظم کے بھی توانا اور معتبر شاعر ہیں۔ نظم میں ان کی حیثیت ایک ایسے کردار کی ہے جو تلاشِ صداقت میں سرگرداں ہے۔ وہ کائنات کے اسرار و رموز کے پہلو بہ پہلو قومی و بین الاقوامی مسائل اور ان پیچیدگیوں کے حل کا طالب بھی ہے، جو انسان کے ذہن کو الجھائے رکھتی ہیں۔ بالخصوص ان کی نظم ”یہ کیسا جبر ہے“ حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں زندگی کی عکاس اور بامعنی نظر آتی ہے۔ ”چاند میرا ہم سفر“ میں ان کی غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں کا بھی ایک لاجواب خزانہ موجود ہے۔ ان کی ایک دلکش نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں، ان مصرعوں میں فطرت کا حسن دیکھیے:

میں کب انکار کرتا ہوں / مجھے معلوم ہے موسم کبھی یکساں نہیں رہتا / رتیں چہرہ بدلتی ہیں / تو موسم بھی بدلتا ہے / نئے
کپڑے پہنتا ہے / نئے رنگوں میں ڈھلتا ہے / نئے ماحول کی رنگینیوں سے حظ اٹھاتا ہے / کبھی وہ زرد رو بکھرے
ہوئے پتوں کو چاہتا ہے / کبھی گرمی کی چادر اوڑھ کر بے خوف سوتا ہے / کبھی بارش پہنتا ہے / کبھی وہ برف کی اینٹوں سے
اپنا گھر بناتا ہے / کبھی فصلِ بہار اس بن کے پھولوں اور کلیوں کی تمنا میں بِتاتا ہے / انہیں سندر بناتا ہے / میں کب
انکار کرتا ہوں / مجھے تو یاد ہے اب بھی / کبھی سب رنگ موسم کے میری آنکھوں میں بستے تھے / میرے دل میں اترتے
تھے / میرے ارماں جگاتے تھے / کسی ان دیکھی دنیا کا مجھے راہی بناتے تھے (۱۱)

گویا ان کی طویل اور مختصر بحروں میں کہی ہوئی خوب صورت غزلوں کی طرح ان کی نظمیں بھی وسیع کینوس اور بڑے ویژن کی حامل اور تمثال نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ مجموعی طور پر جب ہم ان کی پوری ادبی شخصیت اور شاعری کا احاطہ کرتے ہیں تو عہدِ جدید میں نظم اور غزل کے حوالے سے بہت کم شعرائے کرام اس قد و قامت کے ملتے ہیں جو ہم ڈاکٹر ایوب ندیم کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ یہ محض لفظی تحسین نہیں بلکہ ڈاکٹر ایوب ندیم کے شعری مجموعے ”چاند میرا ہم سفر“ کے عمیق مطالعے اور سوچ بچار کے ساتھ ایوب ندیم کے اسلوب پر نظر ڈالنے کے بعد غور و فکر کے وہ نتیجے ہیں جو میں نے نہایت صاف دلی اور خلوص کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ میں یہ کہنے میں فخر محسوس کرتی ہوں کہ ہمارے درمیان اس عہد کا ایک بڑا شاعر اور اس عصر کا اہم ترین دانشور موجود ہے اور ”چاند میرا ہم سفر“ ان کا ایک منفرد تخلیقی اظہار ہے۔

حوالہ جات

(1) ایوب ندیم، چاند میرا ہم سفر، لاہور، دارالشعور، 2009ء، اشاعت سوم، ص 143۔ (2) ایضاً، ص 35۔ (3) ایضاً، ص 53۔ (4) ایوب ندیم، غزل، مطبوعہ ماہنامہ ”تخلیق“ لاہور، ستمبر 2021ء، ص 87۔ (5) احمد ندیم قاسمی، فلیپ، بیک ٹائٹل، مشمولہ چاند میرا ہم سفر (ایوب ندیم) (6) وزیر آغا، ڈاکٹر، فلیپ، چاند میرا ہم سفر۔ (7) منیر نیازی، فلیپ، بیک ٹائٹل، چاند میرا ہم سفر۔ (8) سعادت سعید، ڈاکٹر، دیباچہ، مشمولہ چاند میرا ہم سفر، ص 15۔ (9) ایوب ندیم، غزل، مطبوعہ سہ ماہی ”الوحی ادب“ کراچی، جولائی تا دسمبر 2021ء، ص 171 / چاند میرا ہم سفر، ص 37۔
(10) ایوب ندیم، چاند میرا ہم سفر، ص 39-40۔ (11-16) ایضاً، ص 71،45،46،47،49،50،73،41،42

اُردو کا ادراکی تنقیدی دبستان

ثمینہ سیّد

"ادب" زندگی شائستگی سے گزارنے کا نام ہے۔ جو اور جیسی زندگی سماجی، معاشی، ذاتی، سیاسی اور تاریخ و ثقافت کے لحاظ سے گزر رہی ہے اسے کہہ دینا یعنی لفظوں کے حوالے کر دینا اور خود ہلکے پھلکے ہو جانا لیکن "تخیل" شامل ہو تو ادب ہے۔ باتیں گھڑنے کی صلاحیت نے داستان کو جنم دیا۔ اصل میں یہ "تخیل" تھا ادراک اور شعور تھا جو جذبات و احساسات کو اور ماحول کو زبان دے کر کہانی بنا لیتا تھا۔ انسان چونکہ خود ایک تخلیق ہے۔ نسل در نسل وہ ارتقا کے نظریہ تخیل کی تحقیق کو تخلیق بنانے میں نجانے کب سے کوشاں ہے۔ اب داستان گھڑ تو لی لیکن داستان کو بڑی داستان گھڑ رہا ہے یا منظوم۔ وہ کیا اسلوب و لہجہ اور زبان استعمال کر رہا ہے؟ جو عام فہم ہے، جس میں آرائش و زیبائش ہے لفظی حسن، نظم، افسانوی رنگ، جمالیاتی حس اور عام باتوں سے ماورا، کسی قدر مبالغہ ہوگا تو وہ تحریر کی فضا بنا سکے گا۔ اب سننے والوں میں کچھ لوگ اپنے حساب سے غور کرتے ہیں کہ تخلیق کار فضا بنانے میں سامعین، قارئین اور ناظرین کی توجہ حاصل کر سکا یا نہیں۔ یہ نقاد تھا، جو غور و فکر، فہم و ادراک کے دریچے کھول کر دیکھتا ہے جس کی تمام تر حسیات ساتھ بنی رہتی ہیں جو عام آدمی سے زیادہ منظر سمجھتا اور پرکھتا ہے۔ جو تخلیق سے مسرت اور مدلل کشید کرتا ہے۔ ہم نے اردو ادب میں تنقید انگریزی ادب سے لی اور بہت بھاری اصطلاحات کے ساتھ تراجم کے سانچوں میں ڈھال دیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی کتاب "ولی سے اقبال تک" میں لکھتے ہیں: "حکیم ارسطو کے نزدیک وہ تمام علم جو کتب کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے ادب کہلاتا ہے۔ حکیم ارسطو اپنے عہد کی اخلاقیات کا نقاد اور معترض تھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور نقاد بھی لیکن ان اوصاف کے علاوہ وہ نقادوں کا نقاد اور معاشرے کا نقاد بھی تھا۔"(1)

اب ایک بات تو واضح ہو گئی کہ ادب کو نقاد کی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ کہ نقاد اور معترض میں فرق ہے۔ نقاد تحریر کی پرکھ کرے گا، غیر جانبدار طریقے سے جبکہ معترض صرف اعتراض اور نکتہ چینی کرتا ہے۔ وہ حتمی رائے زیادہ دیتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ نقاد اگر شاعر اور ادیب بھی ہو تو وہ اپنے اردگرد پھیلے علم کے گزشتہ اور حاضر خزانے کو اپنے اندر اتارتا رہے تاکہ وسیع المطالعہ ہو کر اپنی رائے دینے کے قابل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں زیادہ تعداد میں نقاد نہیں ہوتے۔ یہاں ایک اور مضبوط وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے سامنے تنقید کو مشکل بنا کر، دشوار انداز میں پیش کیا گیا کہ خود ادب کا طالب علم اس صنف ادب سے دور بھاگنے لگا۔ اس قدر مشکل الفاظ جو انگریزی سے اردو تراجم کی صورت ہم پر لاگو کر دیے گئے کہ "تنقید" کا لفظ ہی ناگوار ہو گیا۔ میں خود کئی سال سے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر رہی ہوں حتیٰ کہ کتابیں پڑھ کر گہرائی سے ان کے موڈ اور موٹیویشن، مقاصد اور اثرات پر رائے دیتی رہتی ہوں۔ لیکن جب مجھے تنقید بحیثیت ایک سبجیکٹ پڑھنے کی ضرورت پڑی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ چند مخصوص مصنفین کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ جنہوں نے افلاطون اور ارسطو کی تحریروں اور نظریات کو ہی الجھا کے رکھ دیا ہے۔ ایڈگر ایلن پو، حکیم ارسطو، رسکن، والٹر پیٹر، ہنری جیمس، ٹی ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈز آپ ان کے خالص تحریات کو پڑھیں تو نظم و نثر سے زیادہ لطف اندوز تنقید ہے لیکن انہی کے کیے کو اردو میں ایک عفریت بنا دینے والی تنقید

ہمارے ہاں مرتب کی گئی۔ ہندوپاک کے تنقید میں جو بڑے نام آئے آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر انیس ناگی، پروفیسر خورشید الاسلام، محمد حسن عسکری، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر قمر رئیس، سلیم احمد، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، عبدالقادر سروری اور سید سجاد ظہیر۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں جنہوں نے تنقید میں متعدد نظریات دیئے۔ ان ناموں اور ان کے نظریات سے بھی اتفاق اور رد کی بحث ہر دور میں چلتی رہی ہے۔ بحث ادب کی جاودانی زندگی ہے جو ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔ عہد حاضر میں جمیل الدین عالی، ناصر عباس نیر، امجد طفیل اور دیگر نقادوں نے بھی کمر شامل ہونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی انہوں نے تنقید کے بھاری تاثر کو آسان دکھانا چاہا۔ اس کے باوجود تنقید عام دلچسپی اور رجحان کی چیز نہیں بن سکی۔

حال ہی میں فرحت عباس شاہ صاحب نے ادراکی تنقید سے تعارف کروایا۔ کتاب جب تک ہاتھ میں نہیں آئی تھی میں نے یہی اندازہ لگا رکھا تھا کہ یہ ایک اور مشکل ترین چیز ہوگی جسے راستے بھی سمجھنا تو دور ہے گا۔ علم و ادب مسلسل تربیت اور توجہ کا متقاضی رہتا ہے۔ کتاب "اردو کا تنقیدی دبستان" شاہ صاحب نے مجھے عنایت کی۔ تو میں پڑھتی چلی گئی۔ آغاز سے اختتام تک انہوں نے علم و ادراک کے مختلف مراحل تک ایسی آسانی اور سہولت سے سفر کروایا کہ کسی دشواری یا بوجھل پن کا احساس تک نہیں ہوا۔ مجھ پہ پہلی بار یہ کھلا کہ تنقید اصل میں ادراک کی دین ہے اسی کی عطا ہے۔ اس سے پہلے میں نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب "غزل اور مطالعہ غزل" میں پڑھا تھا۔ "اصناف ادب کی تخلیق کسی تجربے کی محتاج نہیں ہوتی مخصوص جغرافیائی حالات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مخصوص تمدنی اور معاشرتی ماحول تخلیق میں ممد و معاون ہوتا ہے۔"[2] یہاں ہم دیکھتے ہیں ادیب کے پاس اپنا ایک مخصوص نقطہ نظر اور فکر ضرور ہے لیکن وہ گئے بندھے قوانین کا پابند ہو یہ ضروری نہیں۔ فرحت عباس شاہ نے ادراکی تنقید کو یوں تشکیل بخشی کہ " ادراکی تنقید پہلے سے موجود تصورات و نظریات کی عینک سے ادب کی پہچان پرکھ کی بجائے فنون کو ان کے بنیادی تخلیقی جواز کے تناظر میں دیکھنے کا نام ہے۔ ادیب کوئی ناول کیوں لکھتا ہے؟ مصور تصویر کیوں بناتا ہے اور کیسے بناتا ہے؟ اور وہ اس میں کس حد تک کامیاب رہا؟"[3]

خود ہی ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ جب تنقید کے اتنے دبستان پہلے سے موجود ہیں تو پھر ادراکی تنقید کیوں؟ اس کا جواب یوں دیتے ہیں: "پہلے سے موجود دبستان براہ راست فنون لطیفہ کی پرکھ اور پرچول کے لیے نہیں بنائے گئے بلکہ پہلے سے موجود نظریات کے معاشرے اور فرد پر اثرات اور اثر و نفوذ کے باعث موثر نقطہ نظر کے طور پر ان کی روشنی میں تخلیق کی پرکھ پرچول کی ضرورت کے تحت لاگو کیے گئے ہیں۔ جبکہ ادراکی تنقید تمام فنون لطیفہ پر بالعموم اور ادب پر بالخصوص جغرافیے یا تہذیب و تمدن اور ثقافت تک محدود نہیں۔"[4] یعنی کہ ادراکی تنقید تخمین زدہ اور اکتاہٹ سے بھرے بھاری پن کو لاگو نہیں کرتی۔ بلکہ تنقید کے جمالیاتی اوصاف کو تخلیق اور پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں پچھلا دعویٰ ہے۔ "اردو کا ادراکی تنقیدی دبستان" (Perceptionalism) عمومیت کے دائرہ توڑ کر خصوصیت کے ساتھ منظر عام پر آگئی۔ تنقیدی رویوں میں مقامیت کی شناخت کے ساتھ ادبی منظرنامے میں ایک بالکل نئی جہت کا آغاز ہوگی۔"[5]

"فرحت عباس شاہ جیسے صاحب فکر نقاد و تخلیق کار نے اس تنقیدی موقف کو نئے رنگ کی پہلی بھرپور کوشش کر دی ہے جو یقیناً دنوں تک کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہوگی۔ اس وقت تعمیری ادبی تنقید اور سماجیات سے لدی تنقید نے جس طرح ادبی تنقید کا چہرہ مسخ کر رکھا ہے یہ کتاب اس اثر کو زائل کرنے کا فریضہ بھی انجام دے گی۔ فرحت عباس شاہ کا کمال یہ ہے کہ وہ ادبی بطن پر تنقید کو خاص علمی اور منطقی دلائل کے ساتھ نیز ادبی اور ادراکی پیمانوں کی بنیاد پر رد کرتے ہیں۔ اس وقت ایک ایسے ہی نقاد کی ضرورت تھی جو ادبی تنقید کی گھتی سلجھا سکے اور سا کو

بحال کرے۔ ادب کے ہر سچے قاری کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔(6) "عہد حاضر کے عظیم شاعر اور مفکر فرحت عباس شاہ نے ایکنامکس، مائنگر و فاٹس، جلیادی لاشعور کی نفسیاتی تھیوریز، اور ادب یا اردو کی تنقید چار تھیوریاں پیش کر کے ہمارا قومی شکوہ دور کیا کہ ہمارے ہاں کوئی موجد، تھیوریسٹ یا نظریہ ساز بھی پیدا نہیں ہوا۔ دوسرا تخلیقی ادب اور تخلیقی ادیب کو اہمیت، عزت اور ترجیح دینے کی ضرورت اور اہمیت کا شعور اجاگر کرنے کی تحریک کا عملی نمونہ خود پیش کر کے دکھا دیا ہے تاکہ زبانی کلامی گفتگو کر کے چل گلی سے نکل جانے والے دانشوروں کی منافقت بے نقاب ہو سکے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمارے اس مشکل ترین علم اور ادب دشمن عہد میں ایک بڑا انسان مرتبان کے کھرا اناج کے بیچ کچھ اہل علم اور اہل بصیرت افراد کو عزت دینے کا قرینہ سکھا رہا ہے۔(7) "فرحت عباس شاہ نے اس تنقید کا اردو پود گذشتہ کی ابجائے آئیڈیولوجی عملی سے ترتیب دیا ہے۔ وہ تھیوریز کے نام پر کنفیوژن پیدا کرنے والے نقادوں کو تحت ہدف تنقید بناتے ہیں اور مرعوب ذہنوں کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ ان نقادوں نے مغربی فکر کو لنڈے کے ملبوسات کی طرح قبول کر لیا ہے اور تفاخر سے سینہ پھیلا کر چلتے ہیں۔"(8) "مندرجہ بالا تمام شہادتوں سے ہم اردو تنقید اور فرحت عباس شاہ کی پیش کردہ اس کاوش "اردو کا اردو تنقیدی دبستان" کی وجہ اور غرض و غایت تک سفر کرتے ہیں۔ ہم پر اردو کی آسانیاں واضح ہو چکی ہیں۔ اور دوسرے تمام دبستان جو اصل میں سابقہ طے شدہ پیمانے ہیں ان کا بخوبی ادراک ہو چکا ہے۔ "تخلیق ہو یا تنقید۔۔۔ تصورات تو کے چراغ فروزاں ہوتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ چراغوں کی لو مدھم پڑ جاتی ہے، کچھ بجھ جاتے ہیں تو بجھنے کے بعد دھواں دیتے رہتے ہیں۔ یہی زندگی کا چلن ہے۔"(9)

یہاں ہم نے دیکھا سلیم اختر اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ زمانے کے تغیر کے ساتھ ادب کی ہیئت، معیار اور اس پر رکھے کے تنقیدی سانچے بدلتے رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب عہد حاضر کے بہترین فنکار جنہیں نظر انداز کیا گیا ہے ان کے فن کی معراج کے روشن گوشوں تک ہمیں رسائی دیتی ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب کو چند حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ چند معتبر تخلیق کاروں اور ناقدین کی آراء کے بعد اردو کی تنقید کے جواز پر "مباحث" ناول کے لیے اردو کی نقد و نظر، افسانہ کے لیے اردو کی نقد و نظر اور پھر شاعری کے لیے اردو کی نقد و نظر پیش کیے ہیں۔ یوں ادب کی کسی صنف کیلئے تشنگی نہیں رہی۔ میں سمجھتی ہوں یہ کتاب فرحت عباس شاہ صاحب کے لیے اردو کی تنقید کے سفر کا آغاز ہے وہ اس سلسلے کو آگے ضرور بڑھائیں گے۔ تاکہ اس نظریے کا تسلسل اور مستقبل وجود قائم رہے۔ ناول میں ڈاکٹر انیس ناگی کے ناول "چوہوں کی کہانی" کے بارے میں تفصیلی تبصرہ کرتے ہیں اس کی جزئیات کو نمایاں کرتے ہیں۔ مختلف ناول نگاروں کے اسلوب کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ: "ڈاکٹر انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال، ایک گرم موسم کی کہانی، ایک لمحہ سوچ کا، قلعہ محاصرہ اور چوہوں کی کہانی" ان میں سے کوئی بھی ناول اردو ادب کی کسی روایت سے منسلک نہیں ہے۔ اگرچہ انہوں نے مغربی ناول نگاری سے انسپائریشن ضرور لی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ناولوں کے ایک ایک جملے سے لے کر پلاٹ اور بیانیے تک ہر شے بڑی وضاحت اور قوت سے بتاتی ہے کہ وہ انیس ناگی ہے۔"(10) پھر آگے بتاتے ہیں کہ ناول ضخیم نہیں لیکن گہری معنویت کا حامل ہے۔ ہمارے معاشرتی زوال کو ہماری ہی سازشوں کی وجہ دکھاتے ہیں۔ جگہ جگہ اپنی غلطی کا اعتراف اور تدارک کرتے ہیں۔ علی نواز شاہ کے ناول "یہودہ" پر روشنی ڈالتے ہیں: "یہ ناول دراصل انسانی تاریخ کی کہانی ہے۔ انسانی عقائد کے ارتقاء، زوال، علوم کی ماہیت، فکر و فلسفہ کی منازل، تفہیم فطرت اور نظریات کے تصادم کی ایسی دستاویز ہے جسے انتہائی اختصار سے تحریری کی تحصیل قرار دیا جا سکتا ہے۔"(11)

منصور آفاق کے ناول "آقا قاقا" کے متعلق لکھتے ہیں: "ظاہرا یہ سمجھ میں آتا آسان ہے کہ ناول کا مرکزی کردار اپنے جنس

خیالات، احساسات، خواہشات یا جذبات کو کسی بھی وجہ سے اپنے لاشعور میں دفن کر چکا تھا وہ زندگی کے کسی حصے میں تخلیقی پیرہن اوڑھ کر ذہن کے نفسیاتی نظام کے زیرِ اثر تحت الشعور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔" لکھتے ہیں کہ: "اس ناول کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ اس کہانی کے دونوں حصوں میں ناول نگار اپنے نام سمیت مرکزی کردار کے طور پر موجود ہے۔" (12)

گلوبل ولیج بنی دنیا کے مختلف تقاضوں کو زیرِ قلم لاتا یہ ناول شاہ صاحب نے پوری طرح پرکھ ڈالا ہے۔ وہ اسے صرف اردو ادب کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے ادب کے لیے بھی بہترین اور مفید قرار دیتے ہیں۔ پھر وہ منصور آفاق کے ناول "علی روبی" جو کہ تخلیقی ادب سے ماخوذ ہے۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ اس خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے کہ نیا ناول تیار ہو گیا ہے۔

اسد محمود خان کے ناول "پیاری حلیمہ" کو شاہ تنقید کرتے ہیں۔ یہ محبت اور وفا کی کہانی ہے۔ اسد محمود خان کے شاعر ہونے کی وجہ سے اس ناول کو فرحت عباس شاہ ناول نگار کے اندرون کی داستان قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "ناول کی زبان خالصتاً تخلیقی ہے اور میرے پاس اسے نثری نظم کے قریب قریب قرار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" کا مرید ریاظ احمد کے ناول "شجرِ حیات" کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے لمحۂ موجود کی کہانی کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ: "اس ناول کی زبان شاعرانہ اور اسلوب منفرد ہے۔ جو اسے نہ صرف ایک معتبر انفرادیت بخشتا ہے بلکہ مصنف کی علمی، سائنسی، فلسفیانہ اور تحریکی بصیرت سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔" (12)

دوسروں کی تخلیقات کو اس طرح غیر جانبداری سے پرکھنا جب آپ خود ایک اعلیٰ مقام اور حقوق اعزازات کے حامل ہوں ایک معجزے اور معرکے سے کم نہیں۔ شاہ صاحب کی بصیرت اور ادوار کی تحقیق سے تیر ان کی پہلو سامنے آتے ہیں اور بیشتر خصوص میں ادبی حلقوں میں فرحت عباس شاہ کی بصیرت و بصارت کا جتنا انکار کیا جاتا ہے وہ اتنا ہی ابھر کر شان سے سامنے آتے ہیں۔ ایک عاجز اور مخلص انسان کی طرح وہ اپنے ہی سفر کی کھوج میں لگے رہتے ہیں۔ موسیقی، شاعری، تنقید اور ادیبوں، شاعروں کے حقوق کی جنگ لڑنا انہوں نے اپنا مشن بنا لیا ہے۔ جس میں ان کی نیت صاف اور ارادے مشتاق ہیں تو کامیابی ضرور قدم چومے گی۔ ایسے لوگ صدیوں یاد رکھے جاتے ہیں۔

علی خان کے ناول "گرنے کی مراسے" کو ادب میں تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ: "ناول کو شخصیت کے اسی بنیادی اصول کے گرد بنا گیا ہے کہ کس طرح ارد گرد موجود افراد کی طرف سے دی جانے والی ری انفورسمنٹ بچے کے نفسیاتی خصائص وضع کرتی ہے۔ جو عمر بھر اسے اپنے مرتب شدہ ذیزائن پر چلاتی ہے۔" اس کے بعد افسانے کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ اظہار اللہ اظہار کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ادب کو جمود نہیں ہے۔ ارتقاء پوری شان سے ہو رہا ہے ورنہ ہمارے نقاد مسلسل یہی تجزیہ دیتے ہیں کہ اب کچھ بھی معیاری نہیں لکھا جا رہا۔ "آخری افسانہ" اظہار اللہ اظہار کا افسانوی مجموعہ ہے جس کے محاسن پر تفصیلی تبصرہ ہے۔ لکھتے ہیں: "اب تک میں نے ان کے تین افسانے پڑھے ہیں جن میں عموماً دو کردار سامنے آتے ہیں لیکن ان کے درمیان ہونے والا مکالمہ ان دونوں میں پڑی گرہوں کو کھولتا چلا جاتا ہے۔"

اظہر جاوید کے افسانوں جن کے مترجم حنیف باوا ہیں۔ وہ تخلیق جیسے شاندار ادبی جریدے کے مدیر رہے ہیں۔ جو ان کی خاص پہچان ہے جسے اب ان کا بیٹا جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ لکھتے ہیں کہ: "اظہر جاوید کی کہانیوں کا مطالعہ میرے لیے خوشگوار رہا کہ ان میں ہمارے عہد کے بیشتر کہانی میکرز کی طرح تصنع اور کہانی گھڑنے کی کوشش کی بجائے خود رو پودوں کی طرح اگتی کہانیوں کی ماہر شاخ

تراش کے ہاتھوں بچ بچ منظر سے منظر ہوتی چلی جاتی ہیں اور اجتماعی سماجی ادراک کی کنجی سے ان کے دروازے کھولنا قطعاً مشکل نہیں رہتا ہے۔ (12) اس کے بعد وہ شاعری کا معطر دریچہ وا کر کے بیٹھے اور ادراک کے پھول بکھیرتے چلے گئے ہیں۔ یہ حصہ منیر نیازی، ن م راشد، مجید امجد، میرا جی، اختر حسین جعفری، شفیق احمد، فیصل زمان چشتی، زین عباس، راقب تحسین، ممتاز اطہر، ڈاکٹر خالد وانور، خالد احمد، ڈاکٹر شاہد اشرف، اعجاز رضوی، عابد حسین عابد، منظر حسین اختر، جون ایلیا، صابر ظفر اور جمیل الرحمٰن۔ پر مبنی ہے۔ میرے حساب سے کچھ معتبر اور خالص شعراء کے نام شامل نہیں ہیں۔ شاید وہ ان ناموں کو اگلے سلسلے کا حصہ بنائیں کیونکہ یہ تمام شعراء حضرات میرے عہد کے ہیں۔ میں ان سب کو تخلیق اور ان کے شخصی اوصاف سے پوری طرح واقف ہوں۔ تو میں شاہ صاحب کے گہرے مشاہدے اور تجزیے کی صلاحیت کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں کہ انھوں نے تمام شخصیات کی خوبیوں، خامیوں، انداز بیاں اور جن کے بارے میں کچھ بھی جانچ جا کر پیش کیا گیا تھا ان سے ملتے اجاگر ہو چکے ہیں۔

بہترین طریقے سے اور انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ شائستہ لب و لہجے میں ادراکی تنقید کے مراحل کو بخوبی طے کیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے میں خود تشنگی محسوس کر رہی ہوں میں شاعری والے حصے کے حوالے سے ان پر بھی بات کرنا چاہتی ہوں جو شاہ صاحب نے منیر نیازی کی بے نیازیاں اور شاعری کی شان بیان کی۔ جو انھوں نے ن م راشد کی نظموں کے حصے لے کر تجزیے کیے، جو اختر حسین جعفری کی اعلیٰ نظم نگاری کو خراج تحسین پیش کیا۔ جو راقب تحسین اور اعجاز رضوی جیسے بہت شاعروں کو نظر انداز کیے جانے کا المیہ بیان کیا۔ جو عابد حسین عابد کی شاعری کے رنگ و آہنگ بیان کیے۔ جو شاہ صاحب نے جون ایلیا کے بارے میں لکھا جسے سوشل میڈیا پر بالکل مختلف بیانیہ بنا کر ادا کیا گیا تھا۔ خالد احمد کے شاعروں میں گھرے رہنے کے باوجود منفرد شعر کہنے کا اعتراف کیا۔ جس طرح ممتاز اطہر، صابر ظفر، منظر حسین اختر، ڈاکٹر شاہد اشرف، فیصل زمان چشتی اور ڈاکٹر خالد وانور کے شعری اور شخصی اوصاف پر تفصیلات فراہم کی ہیں۔ وہ یقینی طور پر ادراکی تنقید کا کمال ہے۔ کوئی ساختیاتی، جدیدیاتی یا مابعد الطبعیاتی تنقید ان شخصیات کو شاید کبھی بھی قابل اعتنا نہ سمجھے کیونکہ یہ سب تخلیق کے وہ رنگ ہیں جو کئی بھیدوں کی نوید دیتے ہیں جبکہ تنقید کو کئی بھیدوں کی روشنی سے ہمیشہ ہی فاصلے پر رکھا گیا ہے۔ میری گہری دلچسپی اور دلی خواہش فرحت عباس شاہ صاحب سے اس ادراکی تنقید کے سلسلے کو جاری رکھنے کی گزارش کرتی ہے۔ رب ذوالجلال ان کی عزت اور مرتبہ بلند رکھے اور الطاف الٰہی ایسے ہی شفاف رکھے۔ آمین۔

حوالہ جات :

(1) ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء، ص 22۔ (2) ڈاکٹر عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل، انجمن ترقی اردو کراچی، 1997ء، ص 7۔ (3) فرحت عباس شاہ، اردو کا ادراکی تنقیدی دبستان، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، 2023ء۔ (4) اسد محمود خان، مضمون مشمولہ، ایضاً۔ (5) ایضاً۔ (6) ایضاً۔ (7) ایضاً۔ (8) ایضاً۔ (9) سلیم اختر، تنقیدی دبستان، سنگ میل، 1997ء۔ (10) فرحت عباس شاہ، اردو ادراکی تنقید، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، ص 10۔ (11) ایضاً، ص 18۔ (12) ایضاً، ص 90، 95۔ (13) ص 106

◆◆◆

تبصرے

تبصرے نسیمِ سحر کے

مختصر تعارف

نسیم سحر ۱۶ فروری ۱۹۴۲ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے ہے۔ کئی اصنافِ نظم و نثر میں ان کا قلم سحر کی دہائی سے رواں دواں ہے۔ حمد، نعت، غزل، رباعی، نظم، مزاحیہ شاعری میں ان کے کم و بیش ۱۹ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جبکہ حمد و نعت اور دیگر کتابوں پر ان کے دیباچوں، مضامین اور تبصروں پر مشتمل ۵ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ اکتیس برس تک سعودی عرب کے ایک بین الاقوامی ترقیاتی ادارے میں ایک اہم عہدے پر فائز رہے ہیں جس کے دوران انہیں تقریباً تمام مسلم اور غیر مسلم ممالک کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ انہیں بیشمار ادبی اداروں اور تنظیموں کی طرف سے شیلڈز، میڈلز اور ایوارڈز مل چکے ہیں جن میں نظریہ پاکستان کونسل، اسلام آباد کی جانب سے حیات ادبی خدمات کے اعتراف میں ملنے والا گولڈ میڈل انہیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے دستِ مبارک سے عطا ہوا۔ ان دنوں وہ نعت اور تنقیدِ نعت پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ جن پر ان کی مزید کئی کتابیں تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔ اسی سال معروف نقاد اور شاعر جناب اکرم کنجاہی نے ان پر ’’نسیم سحر کی تخلیقی جہات‘‘ کے عنوان سے ایک اہم کتاب لکھی ہے جو ادبی حلقوں میں بڑی مقبول ہو رہی ہے۔

حصار شہر جاں (انتخابِ کلام)

مصنف : سرفراز سید

صفحات: 96 قیمت: -/250 روپے ناشر: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، لاہور

سینئر صحافی، کالم نگار اور شاعر جناب سرفراز سید کی شاعری کا آغاز ۷۰ برس پہلے اُن کے زمانہ طالب علمی میں ایک فی البدیہہ شعر سے ہوا تھا جس کی بدولت وہ کتاب کے دیباچے میں بجا طور پر اس وقت کے کم عمر ترین شاعر کہلوانے کا ذکر کرتے ہیں جبکہ اب وہ سینئر ترین شاعر کے درجے پر فائز ہو چکے ہیں۔ اس عمر تک عموماً شاعروں کے کئی کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہوتے ہیں مگر سرفراز سید کی یہ دُبلی پتلی سی کتاب کوئی شعری مجموعہ نہیں بلکہ ان کی طویل شعری تخلیقات کا ایک انتخاب ہے جو ان کی بیٹیوں سحرین فرخ بخاری اور سیماب فرخ بخاری کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس انتخابِ کلام میں مصنف کی ۴ حمدیں، سات نعتیں، پانچ سلام، بائیس نظمیں، ۳۰ قطعات، تیرہ غزلیں، پانچ پنجابی زبان میں غزلیں اور تین نظمیں شامل ہیں۔ یہ تمام تخلیقات ان کے شعری اور تخلیقی تنوع کا احساس دلاتی ہیں۔ ایک صحافی ہونے کے ناتے انہوں نے غزل کے روایتی مضامین کے علاوہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی موضوعات پر بھی عمدہ شعر کہے ہیں۔ تاہم ایک طویل شعری

عمر کے نتیجے میں ان کی شاعری کی صنف وار کتب شائع ہوتیں تو ان کی شاعری پر کوئی مجموعی تاثر مرتب ہو سکتا تھا۔ ان کی صاحبزادیوں کا کیا گیا انتخاب کلام موجودہ صورت میں اپنے والد کے لیے ایک خراجِ تحسین کی حیثیت ضرور رکھتا ہے مگر اسے پڑھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ کئی عشروں کی شاعری سے کیے گئے اس انتخاب پر شاید جناب سرفراز سید کو نظر ثانی کا موقع نہیں مل سکا ورنہ اس انتخاب میں کچھ بہتر اور فنی اعتبار سے بے عیب تخلیقات شامل ہو سکتی تھیں۔ اس کے باوجود مختلف موضوعات پر ان کے شعروں میں سے کچھ بہت عمدہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں جمالیاتی حسن کے علاوہ سیاسی و سماجی شعور بھی اجاگر ہو رہا ہے۔

اک عہد ستم کل تھا اک عہد ستم اب ہے — کوئی دست شفا جاناں، کوئی دست دعا جاناں
ہم تو تھک بن چپ کی نیندیں سو لیں گے — لیکن دیکھو لوگ بہت کچھ بولیں گے
جس دن شہر پناہ سے قاضی اتریں گے — اس دن شہر کے باسی آنکھیں کھولیں گے
بوڑھے برگد کی گھنیری چھاؤں بھی گدرا گئی — سب مسافر چل دیے اور شہر سونا ہو گیا
سارے دوست وکیل ہمارے، ساتھ ہمارا چھوڑ گئے — سچائی کے سارے قصے پہنچے زہر پیالے تک

کتاب میں جناب سرفراز سید کے پیش لفظ بعنوان 'بیاں اپنا' کے علاوہ ان کی صاحبزادیوں کا دیباچہ "ہم جو شاعری میں جیتے" اور مصنف کے نواسے لمان احمد کا مضمون بھی شامل ہے۔ یہ تمام تحاریر جناب سرفراز سید کے گھرانے کی آپس کی محبت و احترام کے رشتوں کی عکاسی کر رہی ہیں۔ کتاب کا انتساب مصنف کی مرحومہ شریک حیات فریدہ ناہید بخاری کے نام ان الفاظ کے ساتھ ایک طویل محبت بھری زندگی کی یاد دلاتا ہے "۴۴ سال قدم قدم ہم قدم، آج بھی قدم قدم ساتھ"۔ یہ کتاب معروف ناشر علامہ عبدالستار عاصم کے ادارے قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل لاہور سے بہت عمدہ دبیز کاغذ اور جناب سرفراز سید کی خوبصورت تصویر سے مزین سرورق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ تاہم اس مہنگائی کے دور میں بھی ۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت اڑھائی ہزار روپے خاصی زیادہ لگتی ہے۔ اسی حساب سے ۳۰ امریکی ڈالر اور ۲۲ برطانوی پاؤنڈ بھی کم نہیں لگتے۔

بانسری میں چاند ہے (حسن عباس کی منتخب شاعری)

مرتب: محمد اورنگزیب

صفحات: 216 قیمت: -/500 روپے ناشر: رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی

اس رومانی اور جمالیاتی عنوان کی کتاب ایک ایسے خوبصورت شاعر کی خوبصورت تر شاعری کے انتخاب پر مشتمل ہے جو "ارژنگ" کے نام سے کئی برس سے ایک شاندار ادبی جریدہ بھی مرتب کر رہا ہے اور "ارتقاء پبلی کیشنز" کے نام سے اس کے ادارے کے زیرِ اہتمام لگاتار ادبی کتابیں بھی ایک تسلسل سے شائع ہو رہی ہیں۔ حسن عباس کا نام ان کی متنوع ادبی، ادارتی اور صحافتی سرگرمیوں کے سبب ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ "سائیں" اور "صاحب" کے عنوانات سے ان کے دو مجموعے ایک انفرادی طرز کی

محامد پر مشتمل ہیں جبکہ دیگر شعری مجموعوں کے علاوہ ''ہم نے بھی محبت کی ہے'' ''اک شام تمہارے جیسی ہو'' اور ''ایک محبت کافی ہے'' کے عنوانات سے ان کی غزلوں کے تین مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب ان کتابوں کی خوبصورت شاعری سے متاثر ہو کر ایک اور معروف ناشر اور شاعر جناب شاعر علی شاعر نے ان کی شاعری کا انتخاب شائع کرنے کا پروگرام بنایا جس کا جواز انہوں نے ان کی شعری زرخیزی کا اعتراف کرتے ہوئے یوں دیا ''میں ادبی میگزین ''ارژنگ'' اور فیس بک پر انہیں مسلسل پڑھتا رہا اور ان کی ہر تازہ غزل پہلے سے بہتر ہوتی تھی۔ میرے دل میں ان کے شاعرانہ اوصاف جگہ بناتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے اشاعتی ادارے ''رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی'' سے حسن عباسی کی غزلیات کا انتخاب شائع کروں''۔ ممتاز شاعر دلاور علی آزر کے ذریعے اس انتخاب کے لیے ایک اور ادب دوست محمد اورنگ زیب کا نام تجویز کیا گیا جنہوں نے یہ کام انتہائی خوش اسلوبی سے مکمل کر کے بطور مرتب یہ کتاب مکمل کی۔

کتاب کے عنوان کی مناسبت سے اس کا دیدہ زیب سرورق بھی کسی آرٹسٹ کے موئے قلم کا شاہکار ہے۔ اندرونِ سرورق پر انتہائی معروف شاعروں اور ادیبوں ڈاکٹر سلیم اختر، ظفر اقبال، امجد اسلام امجد اور سرور جاوید کی آرا دی گئی ہیں جس میں ان قد آور ادیبوں نے حسن عباسی کو بلاشبہ صفِ اول کے شعراء میں شمار کیا ہے۔ کتاب کا انتساب حسن عباسی نے زحل اور شاذمے کے نام کیا ہے جو شاید ان کی صاحبزادیوں کے نام ہیں۔ بلاشبہ ان جلیل ادیبوں نے حسن عباسی کی شعری تولیفات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ اور احاطہ کرتے ہوئے رائے دی ہے۔ کتاب میں شامل ۱۱۹ غزلیات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ ان کے تینوں غزلوں کے مجموعوں سے عطر کشید کر کے اس انتخاب میں شامل کیا ہے جس کے لیے وہ بھی داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ ان کے اس ماہرانہ انتخاب میں حسن عباسی کی وہ غزلیں بھی شامل ہیں جن میں انہوں نے اچھوتی ردیفیں اور قافیے برت کر اور نئے نئے موضوعات کا احاطہ کر کے مختصر اور طویل بحروں میں اپنی تخلیقی زرخیزی اور شعری آوردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی تقریباً تمام غزلیں ہی ''بانسری میں چاند ہے'' کے رومانی منظر نامے کو وسعت دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس انتخاب سے اگر چند شعر درج کیے جائیں تو اسے انتخاب در انتخاب ہی کا درجہ دینا پڑے گا۔

میں بادلوں میں گھرا جزیرہ　　وہ مجھ میں ساون گزارتی ہے
صحن کی تنہائی بچانے کے لیے　　کچھ کبوتر اپنے گھر لے آؤں گا
تمہارا آنچل اڑا تو ایسے لگا ہے مجھ کو　　ہوا نے رنگوں کا تھال جیسے گرا دیا ہے
اس کو ہجرت کا سبب کچھ تو بتا کر جاؤں　　اپنی آنکھیں کسی کاغذ پہ بنا کر جاؤں
گھر کی ویرانی بدل ڈالی ہے رونق میں حسن　　صحن کا پیڑ پرندوں کے حوالے کر کے

ڈاکٹر بدر منیر : ادبی جہات

مصنف : ڈاکٹر سکندر حیات میکن

صفحات: 198　　قیمت: 800/- روپے　　ناشر: مثال پبلشرز، فیصل آباد

اسی سال شائع ہونے والی یہ کتاب سرگودھا کی زرخیز زمین سے تعلق رکھنے والے ایک بڑے محقق اور نقاد ڈاکٹر سکندر حیات میکن

کی ایک بڑے شاعر، مزاح نگار اور محقق ڈاکٹر بدرِ منیر کی ادبی جہات کی تنقید و تحسین پر مشتمل ہے جن کا تعلق وادیٔ سون سکیسر سے ہے۔ دونوں میرے دل پسند قلمکار ہیں اور بہ حیثیت دوست میرے دل کے بہت قریب بھی ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے موثر طور پر ان کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی جہات کو الگ الگ مضامین میں موضوع بنایا ہے اور ان کی تینوں جہات پر جامعیت سے روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا پیش لفظ ایک اور نامور مزاح نگار اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے "پیش گفتار" کے خوبصورت عنوان سے تحریر کیا ہے۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر سکندر حیات میکن کے بارے میں یہ مستند رائے دی ہے کہ وہ "کسی تخلیق کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے ابھرتی ڈوبتی تصویروں اور تیوریوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتے بلکہ ہر چیز کا تعین اپنے ذاتی احساس و قیاس کے بل بوتے پر کرتے ہیں" اور بجا طور پر یہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر بدر منیر اپنے متنوع ادبیات قلم کار کو تنقیدی و تحقیقی کٹہرے میں لانے کے لیے یقیناً کسی سکندر صفت محقق اور نقاد ہی کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے بڑے سلیقے اور قرینے سے کتاب کو ان تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) شخصی جہات: جس میں ڈاکٹر بدر منیر کی سوانح و شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ (۲) شعری جہات: جس میں ان کی مزاحیہ شاعری، سنجیدہ شاعری، بچوں کی شاعری، پنجابی شاعری، مصنف کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر جیسے اہم موضوع شامل ہیں۔ (۳) متفرق ادبی جہات: جس میں ڈاکٹر بدر منیر کی بطور مدون و مرتب، محقق، مدیر، مضمون نگار کے طور پر تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی حصے میں ان کے ساتھ ایک مصاحبہ اور ایک خاکہ بھی بعنوان "خاک سے لپٹا آدمی" شامل ہے جبکہ کچھ معاصرین کی ان کے بارے میں رائے بھی دی گئی ہے۔ یہ تمام مضامین و تحاریر ڈاکٹر بدر منیر کی شخصیت و ادبی جہات کا جزوی احاطہ کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر پڑھنے والے پر ان کی مکمل شخصیت اور ان کی تمام تر تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی جہات کا ایک بھرپور منظرنامہ سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر سکندر حیات میکن کے انفرادی اسلوبِ تحریر کا حسن بھی آشکار ہو جاتا ہے۔

یہ تبصرہ اس کتاب، صاحبِ کتاب یا موضوعِ کتاب پر زیادہ تفصیل سے بات کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تاہم ڈاکٹر بدر منیر کی ایک اہم ادبی جہت گزشتہ کچھ عرصے سے نمایاں ہونے والی ان کی تقدیسی شاعری بھی ہے جس کا مجموعہ "ارمغانِ نوالات" کے عنوان سے شاید اب تک شائع ہو چکا ہوگا۔ ڈاکٹر بدر منیر غزل سے نعتیہ شاعری کی طرف آئے اور اس تخلیقی خطے میں اپنی بلند آہنگ سکونت کا اعلان کر کے دھیرے دھیرے نعت گوئی کی اس کائنات میں بھی داخل ہو گئے جس میں شامل ہونا بڑے نصیب کی بات ہے۔ ماضی میں کئی شعرا نعتیہ شاعری کے ساتھ ساتھ حقیقی اور تقدیسی شاعری میں بھی اپنی تخلیقی ثروتمندی کا اظہار کرتے رہے۔ پھر کچھ تو ان دونوں علاقوں میں زرخیزی اور شادابی بکھیرتے رہے جبکہ کچھ فقط حمد و نعت و مناقب کی روحانی خوشبو بکھیرنے کے لیے ہی وقف ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر بدر منیر کا شمار ان دونوں علاقوں میں سرگرم شعرائے کرام میں ہوتا ہے۔ یہاں مجھے یہ دیکھ کر کسی قدر حیرت ہوئی کہ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ڈاکٹر بدر منیر کی دیگر تمام جہات کا ذکر تو ہے مگر تقدیسی شاعری کے بارے میں کہیں ایک لفظ بھی دکھائی نہیں دیا۔ نہ دیباچہ نگار کی تحریر میں، نہ مقالہ نگار کے کسی مضمون میں، اور نہ ہی خود ڈاکٹر بدر منیر کے مصاحبے میں۔ ممکن ہے یہ خود ڈاکٹر بدر منیر کی ہی "کار ستانی" ہو کہ اپنے نعتیہ موڈ میں انہوں نے اپنی تقدیسی شاعری کا یہ گوشہ دانستہ دوسروں سے مخفی رکھنے کی کوشش کی ہو کہ کہیں کوئی آ نہ جائے، کہیں کوئی جان نہ جائے۔

فلک نشیں لوگ

مرتب: پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

صفحات: 216 قیمت: -/1,000 روپے ناشر: مثال پبلشرز، فیصل آباد

اپریل 2023ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب ایک زیرک، کثیر الجہات اور صاحبِ کمال نقاد، محقق اور تخلیق کار ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی یادنگاری پر مشتمل ہے جنھوں نے گذشتہ کچھ عرصے میں اتنے متنوع موضوعات پر اس قدر کتابیں لکھی ہیں جن کی تفصیل پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ سارا علمی، ادبی، تنقیدی و تحقیقی کام کسی ایک شخص نے کیا ہوگا۔ پشت سرورق پر دیے گئے کوائف کے مطابق وہ اب تک ایک سو پچاس ادبی کتابیں اور ستائیس نصابی کتابیں لکھ کر پاکستانی ادب میں بیش بہا اضافہ کر چکے ہیں۔ مگر صاحبو، کتابوں کی یہ تعداد تو اپریل 2023ء تک کی ہے۔ بعد کے سات مہینوں میں ان کی بسیار نویسی اور زرخیزیِ قلم نے مزید کتنی کتابیں لکھ کر یہ اعداد و شمار بدل دیے ہوں گے اس کا علم ان کی جانب سے بہت سے دیگر قلم کاروں کے ساتھ ساتھ راقم السطور کو بھی نئی کتابوں کا پارسل ملنے پر ہی ہو سکے گا۔ (ان کی زیرِ تبصرہ کتاب بھی پانچ دیگر کتابوں کے ساتھ ہی موصول ہوئی تھی!)۔

مصنف کا تعلق سرگودھا کی سرزمین سے ہے اور وہ اہم تدریسی عہدوں سے ۲۰۱۵ء میں ریٹائر ہونے کے بعد ادبی کائنات میں کہیں زیادہ فعال ہو گئے ہیں اور درجنوں ادبی، سماجی و قومی نوعیت کی تنظیموں سے وابستہ ہو کر قوم و وطن کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان کی تمام کتابوں کا ایک سرسری جائزہ بھی مجھ جیسے آدمی کو حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے کیسے کیسے اہم موضوعات پر کہاں کہاں سے معلومات اکٹھی کر کے اور پھر ان میں اپنی ذاتی تخلیقی زرخیزی کی خوشبو سمو کر اتنی کتابیں پاکستان کی ادبی کائنات کی نذر کر دی ہیں۔

کتاب کا عنوان ''فلک نشیں لوگ'' اور اس کا سرنامہ ''ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں خاص افراد کا ذکرِ خیر ہے جو اپنے اپنے حصے کی شمع جلا کر اور روشنی کو وسعت دینے کے بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر کے اب فلک نشیں ہو چکے ہیں۔ مصنف نے کتاب کے پیش لفظ میں اس پہلو پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس کتاب میں ان ہستیوں پر مضامین شامل ہیں جن سے ہم نے جینے کا سلیقہ سیکھا۔۔۔ فلک نشیں لوگ اپنی آواز رکھتے ہیں، ان کے تجربات ہماری کامرانیوں اور کامیابیوں کی راہیں ہموار کرتے ہیں، سرزمینِ وطن کو جذبوں سے سیراب کرنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔۔۔ سرگودھا سے تعلق رکھنے والے کئی ایسے احباب اس کتاب کی زینت ہیں جنھوں نے سرگودھا کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔ ان شخصیات نے اپنے مرنے کے بعد اپنے شخصی نقوش چھوڑے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم اس شہر کی خدمت کر سکتے ہیں''۔ کتاب میں جن اکتیس معروف شخصیات پر مصنف نے قلم اٹھایا ہے ان میں سرگودھا کے علاوہ پاکستان کے دوسرے شہروں اور صوبوں سے تعلق رکھنے والی اہم ہستیاں بھی شامل ہیں۔ مصنف کی ان میں سے بیشتر سے ملاقاتیں اور رابطے بھی رہے ہیں اس لیے ان کی یہ یادنگاری اردو ادب کی تاریخ میں سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ادبی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں تحقیق و تنقید سے وابستہ قلم کاروں کے لیے بھی اہم مواد دستیاب ہے۔ کتاب میں شامل اکتیس نامور ہستیوں میں محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبد

اللہ یار خان، والتحیر پاکستان بشریٰ رحمٰن، سابق صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ، جسٹس بانو ایوبی، نظام الثقلین نقوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بیگم اختر ریاض الدین، امجد اسلام امجد اور شوکت صدیقی جیسے لوگوں کا ذکر بھی ہے اور شاہد رشید، مولانا منظور احمد چنیوٹی، سید مختار احمد اختر، واحد تحسین نگاہ جیسے کم معروف افراد کا ذکر بھی ہے جن کے اسمائے گرامی اور کارنامے پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی اس کتاب میں شامل ہو کر تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ کتاب میں شامل چند ہستیوں پر مضامین کچھ ادبی جرائد میں بھی راقم السطور کی نظروں سے گزر چکے ہیں مگر ان سب کا بار دیگر مطالعہ بھی مصنف کی خوبی تحریر اور اسلوب بیان کی کشش کے تحت ''قند مکرر'' کا سا لطف دے گیا جس پر لبوں پہ یہ مصرعہ آگیا: اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

تفہیم فکروفن

مصنف: سید مبارک علی شمسی

صفحات: 248 قیمت: -/500 روپے ناشر: ایم ارسلان پبلشرز، ملتان، لاہور، فیصل آباد

''تفہیم فکروفن'' کے بلیغ عنوان سے یہ ضخیم کتاب سید مبارک علی شمسی کے چیدہ ادبی، تنقیدی و تحقیقی کالموں کے علاوہ کچھ ادبی جرائد کے خصوصی نمبروں پر تبصروں، کچھ علاقائی ادبی شخصیات اور چند ادبی تقریبات کی روداد پر مشتمل ہے۔ وہ گذشتہ چونتیس سال سے ہمہ جہت موضوعات پر کالم لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے مختلف قومی اخبارات میں شائع ہونے والے اپنے ادبی کالموں کو کتابی شکل دے کر تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔ ان کا اصلی نام سید مبارک علی ہاشمی اور قلمی نام سید مبارک علی شمسی ہے۔ ان کی شناخت محض ایک کالم نگار کی نہیں بلکہ وہ شاعر، ادیب، صحافی اور دانشور پرور بھی ہیں۔ ان کے تخلیقی سرمائے میں نعت، غزل، نثری نظموں پر مشتمل کتابیں بھی ہیں اور افسانوں کا ایک مجموعہ بھی۔ موصوف اہل بیت کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جن کی شخصیت ایک روحانی سکالر، ایک سینئر صحافی، ایک منجھے ہوئے کالم نگار اور ایک محبِ وطن دانشور پرور کا متناسب امتزاج ہے۔ وہ متعدد شعری مجموعوں کے مصنف بھی ہیں جو اپنی شاعری اور نثر نگاری دونوں جہات میں اسلامی و اخلاقی، دینی و مذہبی، سیاسی و سماجی، قومی و بین الاقوامی موضوعات کے ساتھ ساتھ عوامی و علاقائی مسائل کو بھی اپنے قلم کا موضوع بنا رہے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ان کا شجرہ نسب بھی ان کے روحانی سلسلے کی نسل در نسل نشان دہی کرتے ہوئے انہیں حضرت امام علی علیہ السلام کے رحمِ عالیہ سے ملاتا ہے۔ اسی نسبت سے کتاب کے دیباچہ نگار نسیم لاقب بلوچ لکھتے ہیں کہ '' اگر یہ کہا جائے کہ ان کے کالم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا منہ بولتا ثبوت ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ سید ہونے کے ناطے وہ امانتداری کے فرض کو نبھانا خوب جانتے ہیں اسی لیے وہ الفاظ کے چناؤ میں بھی خیانت نہیں برتتے''۔ روزنامہ ''پیغام زمانہ'' ملتان کی ایڈیٹوریل ایڈیٹر سائرہ شہزادے نے بھی اپنے مختصر دیباچے میں مصنف کی علمی و تخلیقی کاوشوں کو عمدہ انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

کتاب پر مختصر تبصرے میں مختصر یا طویل اقتباسات کی گنجائش محدود ہوتی ہے اس لیے راقم السطور اس قابلِ صد احترام سیدزادے کے کچھ کالموں کے عنوانات لکھ کر ان کے تخلیقی و تحقیقی منصب، علمی و ادبی دسترس، اور ان کی مثبت اسلامی سوچ کو قارئین پر آشکار کر رہا ہے کہ ان عنوانات سے ہی ان کے اسلوبِ تحریر اور فکری کیفیات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں: الہام کی رم جھم، اسلام میں فلاحِ انسانیت کا نظریہ، شاہ است حسین علیہ السلام۔ جن ادبی ہستیوں پر انہوں نے کالم لکھے ہیں ان میں محسن نقوی، جون ایلیا، جوش ملیح آبادی، پروین شاکر، وردانہ توصیف خان، تسنیم کوثر، ڈاکٹر جو دہ منیر، ڈاکٹر سکندر حیات میکن جیسی چند معروف ہستیوں کے ساتھ نسبتاً کم معروف قلمکاروں کے نام بھی شامل ہیں۔ ادبی رسائل و جرائد کے حصے میں "تخلیق" (اظہر جاوید) "طلوعِ اشک" پر تبصراتی کالم شامل ہیں جبکہ جن علاقائی شاعروں کا ذکر کر کے اپنی دھرتی کا قرض اتارنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں ملازم حسین چمن، دیوانہ بلوچ، محمد یعقوب فردوسی اور مقبول ذکی مقبول شامل ہیں۔ اسی طرح ٹی ہاؤس ملتان میں مصنف کی کتاب "مسافرِ شب" کی جلد اول کی تقریبِ رونمائی اور بزمِ شمسی کے زیرِ اہتمام ہونے والی دو تقریبات کا ذکر بھی اس شعبے کی ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے معلوماتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید مبارک علی شمسی جیسی درویش صفت اور روحانی شخصیت کا وجود اولیا کی سرزمین ملتان میں باعثِ خیر و برکت کے ساتھ ساتھ ادبی حوالے سے بھی فیض رسانی کا سبب ہے۔

نئی رُت کی خوشبو

مصنفہ: نجمہ عثمان

صفحات: 150 قیمت: درج نہیں ہے ناشر: سورتی اکادمی، کراچی

برطانیہ میں مقیم شاعرہ نجمہ عثمان کا نام پاکستان بھر کے ادبی حلقوں کے علاوہ دنیا کی تمام اردو بستیوں میں بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ زیرِ نظر شعری مجموعہ "نئی رُت کی خوشبو" ان کا چوتھا مجموعہ ہے جبکہ اس سے قبل ان کے تین شعری مجموعے "شاخِ حنا" (۱۹۸۹)، "کڑے موسموں کی زد پر" (۱۹۹۹) اور "خیال کی خوشبو" (۲۰۱۳) میں شائع ہو کر ایک منجھی ہوئی اور سچی ہوئی شاعرہ کے طور پر ان کی پہچان کرا چکے ہیں۔ ان شعری مجموعوں کے علاوہ نثر میں بھی ان کا تخلیقی سفر عمدگی کے ساتھ جاری ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "پیڑ سے بچھڑی شاخ" ۲۰۰۸ء میں اور "کتابِ دل" کے عنوان سے سفرنامہ ۲۰۲۲ء میں شائع ہو چکا ہے جس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کاتب پبلشرز کے زیرِ اہتمام The Pearl of Heart کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

میں نجمہ عثمان کے ماضی میں شائع کردہ تینوں مجموعے بھی پڑھ چکا ہوں اور اب اس کتاب کی خواندگی کے بعد ان کے تخلیقی اور فکری سفر کے ارتقاء کا مزید قائل ہو گیا ہوں۔ ان کے ہاں اظہار و اسلوب کے منظرنامے میں تخیل کی ندرت کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے کلاسیکی انداز کے ساتھ جدت کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ زندگی کے بے شمار تلخ و شیریں روز و شب گزارنے کی عکاسی میں ان کی حوصلہ مندی اور مشکل حالات سے نمٹنے کی حوصلہ مندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ رفعت شمیم کے الفاظ میں ان کے ہاں دو تین موضوعات کو خاص اہمیت حاصل

ہے جس میں زندگی کی بے مائیگی و بے ثباتی کا عرفان، ظلمت و ریخت کے ملبے سے سینہ سپر ہونے کا عزم اور وقت کی بدلتی رُتوں کا ادراک شامل ہے۔ ان کی نظم و غزل دونوں میں رقصاں ان کے جذبات و احساسات ان کے انفرادی اور اجتماعی رنج و الم کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر ان کی شاعری میں ایک امید اور مثبت انداز کا رویہ پایا جاتا ہے جس کا اظہار اس مجموعے کے عنوان "نئی رت کی خوشبو" سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن بجا طور پر لکھتی ہیں کہ سچا فنکار خوب سے خوب تر اظہار کے لیے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھتا ہے۔ اس راہ میں جو لعل و جواہر اس کے ہاتھ لگتے ہیں ان کی قیمت آشکار ہونے میں بھی طویل عرصہ لگتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے کہ اچھا شعر قاری تک نہ پہنچے۔ "نئی رت کی خوشبو" میں متعدد اشعار ایسے ہیں جو قاری کو روک لیتے ہیں اور سرشاری کی وہ کیفیت پیدا کرتے ہیں جو اچھی شاعری سے ہی ممکن ہے۔ تو لیجیے ان کے کچھ بہت اچھے غزلیہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ کس خواب میں آج لے جا رہی ہے نئی رت کی خوشبو
مجھے بچھڑے لمحوں سے ملا رہی ہے نئی رت کی خوشبو

دن ہیں خوشیوں کے جی لے جی بھر کے
پھر نہ آ جائیں دن ملال کے دیکھ

گھڑی کی سوئی تھک کر رک گئی ہے
میں ہندسوں کے سہارے چل رہی ہوں

جو دوسروں سے بہت مختلف تھے میرے غم
انھی کو ہنس کے اڑانے میں عمر بیت گئی

مرے گھر کے دریچوں سے مناظر جھانکتے ہیں
میں پابند تحفظ کے قفس میں جی رہی ہوں
(یہ شعر کرونائی دور میں کہا گیا)

جب سے تتلی کا پیچھا چھوڑ دیا میں نے میرا آنگن پھولوں سے بھر گیا

یہ مجموعہ سوری اکادمی کراچی سے عمدہ معیاری انداز میں شائع ہوا ہے۔ اس کے دیباچہ نگاروں میں معروف شاعرہ ڈاکٹر فاطمہ حسن اور مصنفہ کے بھتیجے حمزہ حسن وصی شامل ہیں جبکہ فلیپ نگاروں میں خواجہ رضی حیدر اور رفعت شمیم شامل ہیں۔ ایک سو چھپن صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں حمد و نعت کی ایک ایک، دو نظمیں، چھپن غزلیں (کرونائی غزل سمیت)، اکیس نظمیں، ایک قطعہ اور کچھ متفرق اشعار شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب انھوں نے اپنی مرحومہ بہن عابدہ عبداللہ (بی بی) کے نام کیا ہے۔

اوکھے پینڈے

مصنف : ہرتا ملر ------ مترجم : حمید رازی

صفحات: 160 قیمت: -/500 روپے ناشر: عکس پبلی کیشنز، لاہور

رومانیہ کے معروف مصنف ہرتا ملر Herta Muller کا یہ ناول جرمن زبان میں ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا اور اب ہمارے سامنے پاکستان کے معروف ناول نگار، کہانی کار، سفرنامہ نگار اور مترجم حمید رازی کا اس ناول کا پنجابی

میں ترجمہ "ادھکے پینڈے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا عنوان Travelling on One Leg تھا جس کا لفظی ترجمہ "ایک ٹانگ پر سفر" بنتا تھا مگر حمید رازی نے لفظی نہیں معنوی ترجمہ کر کے اسے "ادھکے پینڈے" جیسا خوبصورت نام دیا ہے۔ ناول پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ اس انگریزی عنوان کا اس سے بہتر پنجابی ترجمہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کے مرکزی کرداروں کا سارا سفری ادھکے پینڈوں پر مشتمل ہے۔ یہاں اس عمدہ ترجمے کے حوالے سے یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ جناب حمید رازی نے ترجمے کی محدودات کے سبب اگر اس کے مرکزی کرداروں کے اصلی نام اور پلاٹ کے ماحول کو من وعن نہ رکھا ہوتا اور مغربی ماحول اور ثقافت کے تحت محبت اور جنس کے کچھ مناظر واشگاف لفظوں میں بیان نہ کیے ہوتے تو اس ترجمے کو قاری ترجمہ ماننے پر تیار ہی نہ ہوتا۔ بے ساختہ اور با محاورہ ترجمے کی خصوصیات نے بلاشبہ اس ترجمے کو ایک تخلیق کا سا درجہ دے دیا ہے جس پر حمید رازی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس ناول کی کہانی سرد جنگ کے خاتمے سے کچھ پہلے رومانیہ سے ترک وطن کر کے جرمنی کے شہر برلن میں منتقل ہونے والی پینتیس سال آخرین اور فرانز کے گرد، اور بعد ازاں دیگر دو کرداروں سلیمان اور تھامس کے گرد بھی گھومتی ہے۔ رومانیہ میں آخرین ایک آوارہ پنچھی کی طرح سمندر کنارے لمبی لمبی واک کرنے کی عادی تھی یہ جانتے ہوئے کہ رات کے وقت تاریک جھاڑیوں میں کوئی ایک عمر رسیدہ شخص محض نظر بازی کر کے جنسی تسکین حاصل کر رہا ہوگا۔ جرمنی میں اسے فرانز کی صورت میں ایک نوجوان شرابی ملتا ہے لیکن فرانز کسی نفسیاتی کشمکش کی وجہ سے ایئرپورٹ پر اسے لینے کے لیے خود جانے کے بجائے اپنے دوست سلیمان کو بھیج دیتا ہے۔ پھر یہ کہانی آخرین کے ساتھ فرانز، سلیمان اور سلیمان کے ایک اور دوست تھامس کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ آخرین بنیادی طور پر ایک خود سر اور تیز مزاج کی عورت ہے جو تین مردوں، فرانز، سلیمان اور تھامس کی محبت میں بیک وقت گرفتار ہوگئی جبکہ تینوں میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ پہلے دونوں مردوں کی نسبت اگرچہ تھامس اس سے محبت کرتا تھا تاہم بنیادی طور پر وہ Homosexual تھا۔ آخرین کو اپنے لیے روزی کمانے کی غرض سے لگاتار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ سرد جنگ کے دنوں میں پورے جرمنی میں اقتصادی اور معاشی مسائل درپیش تھے۔ بہرحال خرابی بسیار کے بعد بھی آخرین تقدیر کے لکھے کا مسلسل شکار رہتی ہے۔ اپنا وطن چھوڑ کر ایک دوسرے ملک میں آباد ہونے کے مسائل آخرین کو گھیرے رہتے ہیں۔ ناول نگار اپنے ناول میں بنیادی پیغام یہ دینا چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی مفہوم میں اس دنیا کا ہر آدمی اکیلا ہے۔

یہ ناول قدرے مختصر ہے تاہم اس کی کہانی خاصی سست روی سے آگے بڑھتی ہے جس کی وجہ سے قاری شاید بوریت بھی محسوس کرے لیکن اس میں سرد جنگ کے باوجود کچھ عمدہ منظر نگاری بھی ہے، کچھ دلچسپ رومانی مکالمے بھی ہیں اور کہیں کہیں رومانی شاعری بھی ہے جو اسے قابل مطالعہ بنا دیتی ہے۔ مترجم حمید رازی نے اس ناول کا انتساب "بے حاوا" کے عمدہ عنوان کے ساتھ "پنجابی پیاریاں پروفیسر راشد حسن رانا تے ہارون عدیم دے ناں" کیا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ اس کتاب پر تبصرہ بھی پنجابی زبان میں ہی لکھا جاتا لیکن حمید رازی نے جس گوہڑی اور ٹھیٹ پنجابی زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے اسے پڑھنے کے بعد راقم السطور اپنے آپ کو اسی اسلوب اور کمال کے ساتھ پنجابی زبان میں تبصرہ کرنے کا اہل نہیں پاتا، چنانچہ اردو میں ہی تبصرہ کر رہا ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ تخلیق اب مدیر کی تخلیقی صلاحیتوں کو ہر بار پہلے سے زیادہ اجاگر کرتا ہے۔ سرورق سے لے کر انجمن خیال تک۔ تخلیق کے ساتھ ساتھ آپ کی تکنیکی مہارت بھی ہر شمارے میں قاری سے ہم کلام ہوتی ہے۔ اظہر جاوید ہوں یا ہم جیسے مدیر۔ رسالے ایک لاابالی پن سے شائع کرتے ہیں۔ کسی تحریر پر ضرورت سے زیادہ خوش ہو جاتے ہیں۔ کسی کو مطلوبہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس لیے ہمارے مرتب کردہ شمارے اپنا توازن کھو دیتے ہیں۔ مگر سونان اظہر جاوید تخلیق میں تخلیق۔ تخلیق۔ ترتیب۔ تدوین کا توازن قائم کرنے میں ہر بار پہلے سے زیادہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تخلیق ستمبر 2023ء کا سرورق امکان کے کتنے ہی در کھولتا ہے۔ رنگوں کا انتخاب۔ امتزاج۔ اسد قاسمی کی مصورانہ مہارت کی مجسم مثال ہے۔ اسد قاسمی آپ کا حسن انتخاب ہیں۔ اس سرورق نے مجھ سے نادر گفتگو کی ہے۔ لوک کہانیوں کے شہزادے کی طرح میں اس کے در کھولتا رہا۔ ہر مقام پر سات دروازے میرے منتظر تھے۔ سات دریچے از خود کھلتے رہے۔ دروازوں پر مجھے اپنا شعور اور زور استعمال کرنا پڑا۔ پہلی بات۔ ہمیشہ کی طرح اردو کے حالیہ ادبی منظر کا احاطہ کر رہی ہے۔ اہل قلم کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہی ہے۔ لیکن میں گلہ کروں گا کہ آپ ہم عمر رسیدہ اور ہم خود جہاں دیدہ لکھنے والوں کی نازک رگوں کو چھیڑنے کی کوششیں زیادہ کرتے ہیں۔ خیال ہے کہ ہم عمر کے ساتھ ساتھ ضدی اور ڈھیٹ ہوتے جاتے ہیں۔ ہم پر کلام نرم و نازک بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ آپ کا لہجہ ایسا ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ شاعری، افسانے، تنقید، ورد ہیں۔ ان سے نمبر کی تشنگی رہتی ہیں۔ لیکن شور کرتے مدعی والے ان میں شامل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کیس سا کمعد ہو کر متعین نہیں ہوتے۔

کہیں رستے میں ہو جاتی ہے جب دیوار حائل　　　جو کھلتا ہے در امکاں تیری دین مولا

ڈاکٹر بدر منیر کی محدود روایت سے ہٹ کر بہت ترو تازہ اور پُر جوش عقیدت بھی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریر تو پاکستان کا حقیقی اظہار ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں ایک وجہ سمجھاتے رہتے ہیں۔ وہ تاریخ کو محلات سے نکال کر چھوٹے گھروں، بستیوں تک لے آتے ہیں۔ اب تاریخ کھل کر پہلو بدلتی ہے۔ آزادی سے انگڑائیاں لیتی ہے۔ سوشل میڈیا تو بعد میں آیا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے چھپیروں، ترکھانوں، لوہاروں، ماہی گیروں۔ مناعوں کو پہلے سے اپنی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ اپنے ہنر سے اپنی مٹی سے محبت کی طرف مائل کیا تھا۔ اردو ادب میں اس وقت معروضی تنقید کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ کتابوں کی رونمائیوں، اخبارات کے ادبی صفحات نے صرف قصیدہ خوانی کو رواج دیا ہے۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے قلم کو آزاد کریں اور اس دور کی شاعری، افسانہ نویسی، ناول نگاری پر اپنے ضمیر کی آواز پر تنقید کریں۔ عذرا اصغر کا کالم نویسی کی حیثیت سے جائزہ ایک اہم تحریر ہے۔ صرف عذرا اصغر کے کالموں پر ہی نہیں۔ آج کی کالم نویسی پر بھی ان کے تحقیقی خیالات سامنے آتے ہیں۔

میں "تخلیق" کا اور ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا ممنون اور شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ حقیر پُر تقصیر کے لیے چار صفحات وقف کیے۔ میں یقیناً اس قابل نہیں ہوں۔ قلم و قرطاس سے اگرچہ کئی دہائیوں سے وابستہ ہوں۔ کچھ لکھ لوں تو بہت تسکین ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم جیسے بلند پایہ محقق، مصنف، مؤلف کے معیار پر میں کیسے پورا اتر سکتا ہوں۔ "من آنم کہ من دانم"۔ اور دوام ادب۔ جیسی اضافت کا تو میں قطعی استحقاق نہیں رکھتا۔ معلوم نہیں "تخلیق" جیسے معیاری ادبی مجلے کے مستقل قارئین پر یہ تحریر پڑھ کر کیا گزری ہوگی۔ البتہ میں نے اسے دو تین بار پڑھا۔ اب میری کوشش یہ ہے کہ میں اپنی شاعری، اپنی نثر کو ہارون الرشید تبسم صاحب کی تحسین کے مطابق لائق مطالعہ بنا سکوں۔

شجاعت علی راہی سے فیس بک پر ملاقات رہتی ہے۔ ان کی قومی سوچ قابل قدر ہے۔ "صنف نازک اور ادب" میں اردو دیوان کی گرفت نے بہت لطف دیا۔ اپنے مطالعہ کی طوالت پر تشویش کے باوجود میں یہ سطور دہرانا چاہوں گا کہ انہیں پڑھ کر جوانی کچھ دیر کے لیے تو لوٹ آئی۔ "اور یہ حقیقت ہے کہ عورت نے نہ صرف اپنے ظاہری حسن و جمال سے تصویر کائنات میں وجود کے رنگ بھرے بلکہ راحت، ملاحت، غیرت، تربیت، رحمت اور جنت کے در بھی وا کیے۔ صاحبو! ہمارے حواسِ خمسہ بیدار ہو جاتے ہیں، آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، مشام جاں معطر ہو جاتے ہیں، اور روح میں نغمے رچ بس جاتے ہیں جب ہم شعر و ادب میں دھانی یا کالی چنری لہراتی، قوس قزح کے رنگ بکھیرتی، کپاس، بیلیا پھول چنتی، چھم چھم آلو بیچنے پر پاؤں دھرتی، ساون رت میں جھولتی، دودھ دوہتی، پکوان تیار کرتی، اپلے تھاپتی، ہرن کی طرح قلانچیں بھرتی، پھول کی پنکھڑیوں ایسے لب کھولتی، ڈھول کی تھاپ پر گیت گاتی، دلہن کی طرح سجتی، جسم کے پھول بانٹتی، کومل خواب بنتی، لوریاں سناتی، گٹھڑی کی طرح سمٹی ہوئی، سکھی سہیلی، شرماتی لجاتی، زیرِ لب سرگوشیاں کرتی، اٹھلاتی، البیلی، گوری گوری، سانولی سلونی، پری چہرہ، شعلہ عذار، چنچل، نٹ کھٹ، شوخ و شنگ، سادہ و پرکار دوشیزاؤں، بیاہتاؤں، ماؤں، بہنوں، سکھیوں اور سہیلیوں کا ذکر پڑھتے اور سنتے ہیں اور تصورات کے کوہ قاف کی سیر کرتے ہیں۔"

ہر ایک کی زندگی میں ایک دوشیزہ ضرور ایسی آتی ہے جس کی خوشبو پاگل کر دیتی ہے اس کی دھن میں جینے کا ایسا لطف آتا ہے کہ مارشل لاء کتنا سفاک ہو، جمہوریت کتنی بے عنوان ہو، سب بے اثر ہو جاتا ہے۔ انور عدیم علوی صاحب نے ستر کے احمد ضیا کو یاد دلا دیا۔ ہمارے بھی ان سے برسوں رابطے رہے ہیں۔ اردو ادب صحافت کے لیے احمد ضیاء نے بھرپور جدوجہد کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی تحریر 'عاشق دل گیر' اطہر جاوید پڑھ کر نہ جانے کتنی کہانیاں یاد آ کر رہ گئیں۔ طفیل شفائی کی مسکراہٹ۔ احمد ندیم قاسمی کی سنجیدگی۔ وزیر آغا کا تدبر۔ اور اس دور کے بہت سے معاشقے۔ محاذ کے اور محاذ کے۔ سرگودھا کی عظمت کا میں ہمیشہ قائل رہا ہوں کہ میرا ننھیال انبالے سے وہاں آ کر آباد ہوا۔ بھیرہ میں سے ہمیں اپنی اکلوتی رفیقۂ حیات بھی یاد آ گئیں۔ جو کئی دہائیوں سے ہماری صحافت، شاعری، اور مال و زر سے بے نیازی برداشت کر رہی ہیں۔ سرگودھا کی ادبی روایات کا میں نزدیکی سے عینی شاہد ہوں۔ انور گوندل۔ طفیل گوندل، وزیر آغا، سجاد نقوی ان کے ہاں آنا جانا رہا۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم جب کسی تحریر میں تاریخ، ادب، تعلیم، حلقہ احباب کو یکجا کرتے ہیں تو ایک محفل جم جاتی ہے۔ حقائق آج کی اصطلاح میں ڈیٹا، مستند انداز میں سامنے آتا ہے۔ جس سے محققین کو بہت مدد ملتی ہے۔ اہل سرگودھا اور بالخصوص دبستان سرگودھا کو ڈاکٹر صاحب کا احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ سرگودھا کو ادبی دوام عطا کر رہے ہیں۔

مطالعہ کی طوالت مجھے خوف زدہ کر رہی ہے اس لیے افسانوں کا تذکرہ پھر کبھی سہی۔ لیکن "مشت ذرا ہمت" پڑھ کر کچھ دیر میں ایک

الگ سی دنیا میں رہا۔ کچھ اشعار جنھوں نے مجبور کیا کہ انھیں خط کا حصہ بنایا جائے۔

- کون ہوگا جو تجھے دل سے نہ رکھے گا عزیز — کیا کوئی ہے جو تجھے دل سے نہیں چاہتا ہے (اسلم انصاری)
- کیسی بے حرمتی پیڑوں کی پرندوں کی ہوئی — تم جو شہروں میں مضافات اٹھا کر لے آئے (سلیم کوثر)
- جائیں گے ہم سرِ دہ مرغ پہ بھی جام بکف — رند عادات سے اوپر نہیں اٹھے اپنی (انور شعور)
- مجھ کو اولاد تو سمجھتے ہیں لوگ سب — اب اس کے گھر کی اور لڑائی تو ہے نہیں (بیدار سرمدی)
- ایسی خلوت کہ جو ترتیب بھی خود ہی دی تھی — ایسی خلوت میں خدا جانے کہاں رہ گئے ہم (شاہین عباس)
- کالجاں دے وچ توں والے ہو گئے نیں — دیہاڑیاں اتے تازہ کیوں آ گئے نیں (ممتاز راشد لاہوری)

حنیف باوا کی نظم "راق" پنجاب رنگ کی تصویر ہے۔ معاف کیجئے۔ کچھ زیادہ ہی لکھ گیا ہوں۔ پھر بھی تشنگی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ ہمارا مستقبل ہیں۔ "تخلیق" کی باقاعدہ اشاعت سے پتہ چلتی ہے کہ "تخلیق" محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اور ملک کا کوئی ادارہ مستحکم ہو یا نہیں۔ اداروں پر بھی برا وقت آیا ہوا ہے۔ خاص طور پر ادبی و لسانی ادارے۔ وہ ادب کی آبیاری کی بجائے اپنے اپنے حلقوں کی سرپرستی میں مصروف ہیں۔ "تخلیق" کے لیے الطاف حسین حالی کی زبان میں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

محمود شام (کراچی)

﴿2﴾ نہایت خوبصورت سرورق کا حامل ماہنامہ "تخلیق" چند روز پہلے موصول ہوا۔ شکریہ کا لفظ کثرت استعمال سے بہت چھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ آپ کی محبت مہربانی ہے جو "تخلیق" باقاعدگی کے ساتھ ایک مدت سے ارسال فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمت میں اور حوصلہ میں مزید اضافہ فرمائے۔ اسی سال مئی کے مہینے میں میری بہت پیاری بیٹی اللہ تعالیٰ کے پاس واپس چلی گئی تو اس کے دکھ سے اب تک نڈھال ہوں بیٹیاں تو سبھی کو پیاری ہوتی ہیں اور سچ تو یہ ہے بیٹیاں بیٹوں سے زیادہ ماں باپ کی خدمت گزار ہوتی ہیں۔ میرے بہت عزیز اور تقریباً نصف صدی سے زائد عرصہ کے مہربان دوست محترم آصف ثاقب نے اپنے خط میں میری بیٹی کی رحلت کے بارے میں اور میرے بارے میں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ آصف ثاقب ہزارہ کے ادب کا سرخیل ہیں اور ایک ماہر فن عروض ہیں۔ ایک مدت سے آپ کا خوبصورت اور منفرد کلام ملک کے معتبر ادبی جرائد کی زینت بنتا آ رہا ہے۔ اور ایبٹ آباد شہر سے بہت دور ایک پہاڑی مقام پر ادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں ایسی جگہ جہاں دور دور تک ادبی ماحول نہیں ہے ایک شاعر و ادیب کا ایسے مقام پر ادب سے جڑے رہنا قابل قدر و قابل داد ہے۔ پھر بھی کچھ ادب نواز اور شعراء اس دور دراز جگہ بھی آپ کی محبت میں کھنچے جاتے ہیں۔ اور آپ سے مل کر خوشی خوشی واپس ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ادب کی اس شمع کو تادیر روشن رکھے۔ آمین اور سونان صاحب آپ کے لئے بھی یہی دعا ہے۔

سلطان سکون (ایبٹ آباد)

﴿3﴾ خوبصورت ٹائٹل سے مزین نمبر کا تخلیق ملا۔ پہلی بات میں آپ نے ادب پروری کے موضوع پر بڑی دل سوزی سے خامہ فرسائی کی ہے۔ آپ کی تلخ و شیریں باتیں بڑی برحق ہیں۔ میں متشکر ہوں کہ اس بحث میں آپ نے بڑی محبت سے راقم کا ذکر تخلیق لکھاریوں کی فہرست میں کیا ہے۔ عزیزم مجھے احساس ہے کہ میں کوئی لکھاری تو نہیں ہوں لیکن مجھے تخلیق کے ساتھ پینتیس سالہ رفاقت پر فخر ضرور ہے۔ اب آتے ہیں اس شمارے کے حاصل مطالعہ کی طرف۔ یوں تو پورا ہی حصہ مضامین معلوماتی تھا لیکن ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون "غلامانہ پرورش کلچر" منظر سیال کا "مغرب، فکر اسلامی کی ابتدا"، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا "صبح دوام ادب ... محمود شام"، خالد عبداللہ ویٹس کی "عدم کے کلام میں قنوطیوں کے ذریعے" ادبی تحریریں قدرے ٹھوس معلومات پر مبنی دکھائی دیں جنہیں پڑھ کر مطالعے کا لطف دوبالا ہو گیا۔ گوشہ خاص کی دونوں تحریریں واقعی خاصے کی چیز تھیں۔ چونکہ ڈاکٹر عبدالکریم خالد اور ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا شمار تخلیق کے بانی اظہر جاوید کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے اس لیے یہ دونوں جید لکھاری ان کی ادبی اور نجی زندگی کے کئی نئے پہلو سامنے لائے۔ سچ پوچھیں تو آپ کے والد گرامی پر اتنے مفصل مضمون اب تک کسی اور نے نہیں لکھے تھے۔ اسی طرح عذرا اصغر کی "میری چند یادیں" میں بھی بانی تخلیق کی میری یادیں پڑھنے کو ملیں۔ مضامین کی طرح سبھی افسانے بھی اچھے تھے لیکن حنیف باوا اور صوفیہ بیدار کے افسانوں کی کہانیاں دل کو چھو گئیں۔ تخلیق کے حصہ شاعری کی بڑائی تو مسلمہ ہے۔ اس مرتبہ پنجاب رنگ میں پروفیسر محمد عباس مرزا اور ممتاز راشد لاہوری کے چیتوں نے بھی خوب رنگ جمایا۔ ان میں ماں جائی بولی کی لہک اور مہک محسوس ہوتی ہے۔ چاننے اور تبصرے بھی خوب تھے۔ انجمن خیال میں محمد طارق علی، نسیم سحر، منصور صدیقی رضی، شاہد اعجاز، نسیم کوثر، شازیہ بابر، خاقان ساجد کے مفصل خطوط میں شمار گزشتہ پر بہترین آرا پڑھنے کو ملیں۔ تسنیم کوثر کے خط میں راقم کے پرخلوص تذکرے پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ آپ کی صحت اور ترقی کی دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

ایم ڈی ملک (راولپنڈی)

﴿4﴾ 1969 سے باقاعدہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ "تخلیق" ملا۔ "پہلی بات" کا دروازہ کھول کے میں اندر داخل ہوا تو باغ و بہار تحریروں کا سامنا ہوا بہت لطف آ گیا۔ برسوں پرانی روایت کا نشان، حسن و خوبی کا مرقع، من بھاوا خوش آمدید اور خوش اطوار دل خوش کن خوب ہے۔ میرپور کے مراد خان نے ہزارے والا تہذیب کی لاج رکھی ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی میں میرپور کا رنگ نمایاں ہے۔ مضمون قربانی لائق صد توصیف ہے۔ محترم طارق علی اور محترمہ تسنیم کوثر کی توجہ میرے لیے بہت ہے۔ طارق علی صاحب کا یہ شعر یوں ہے:

ہمارا عشق پوشیدہ نہیں تو زمانے کا زمانہ جانتا ہے

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم رونق افروز ہوتے ہیں تو تخلیق کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ وہ بقولے "سحر تحریر" ہیں۔ خدا انہیں اجر دے کہ وہ ادبی کتابیں مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کی کتابوں کی دل پذیری لاجواب ہے۔ میں شوق سے پڑھتا ہوں اور ڈاکٹر صاحب کو شکریے کا خط بھی لکھتا ہوں۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

﴿5﴾ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ تخلیق کی صورت دیکھے ہوئے زمانہ ہو گیا تھا۔ کبھی یادوں ماری تھی تو ایک آدھ پرانا پرچہ نکال کر اس کے خستہ اوراق سے گزری ساعتیں کشید کر لیتا تھا۔ اور کچھ وقت اظہر جاوید کی رفاقت میں بسر ہو جاتا تھا۔ مجھے خبر تو تھی کہ اپنے والد کا بارِ امانت آپ نے نہایت محبت اور محنت کے ساتھ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے لیکن آپ کی زیرِ ادارت تخلیق کے تیور میری نظروں سے اوجھل رہے۔ آج تخلیق سے دوبارہ رابطہ ہوا تو حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات دامن گیر ہیں۔ لگتا ہے اظہر جاوید زندہ ہو کر میرے سامنے آ گئے ہیں۔ میں اظہر جاوید کے اداریے پڑھ کر ان سے کہا کرتا تھا کہ آپ کی پہلی بات ہی آخری بات ہوتی ہے۔ تیکھے انداز میں مناسب الفاظ میں بات کہنا ان کا شعار تھا۔ بے باکی اور جرأت آموزی ان کی شان تھی۔ اداریہ کسی ادبی جریدے کا صدر دروازہ ہوتا ہے جو مضبوط اور پائیدار چوکھٹ میں استوار ہوتا ہے اس سے گزر کر ہی ہم سیرِ چمن کرتے ہیں۔ جہاں انواع و اقسام کی تخلیقات ہماری منتظر ہوتی ہیں۔ آپ کی تحریر پر آپ کے والد گرامی کی گہری چھاپ ہے یہ نقش دیدہ زیب بھی ہے اور دل آویز بھی۔ آپ تیکھی اور صاف بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ پرچے کا حسنِ ترتیب بھی بہت عمدہ ہے۔ آپ کے زیرِ انتظام تخلیق نے صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ان برسوں میں بہت ترقی کی ہے۔ مضامین نظم و نثر کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ ایک مصنف کی ایک ہی تحریر کافی ہوتی ہے۔ ایک نام بار بار سامنے آئے تو کھٹکنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم میرے پرانے دوست ہیں اور بہت اچھا لکھنے والے ہیں۔ اظہر جاوید والے مضمون سے ان کی بھرپور نمائندگی ہو جاتی ہے ان کی دوسری تحریر اگلی اشاعت میں آ سکتی تھی۔ اسی طرح عذرا اصغر کے کالموں پر ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کی تحریر ان کے منصب کے شایانِ شان ہے۔ اس شمارے میں ان کی اپنی تحریر اگلے شمارے کے لیے موخر کی جا سکتی تھی۔ غزلوں کا معیار بہت عمدہ ہے مجموعی اعتبار سے آپ کی محنت اور خصوصی توجہ تخلیق کے ہر صفحے سے عیاں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں میں برکت ڈالے اور یہ سلسلہ یونہی قائم رہے۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد (لاہور)

﴿6﴾ تخلیق ستمبر 2023ء کا شمارہ ملا۔ خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق نے دل کھینچ لیا۔ میں حسرت سے ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے لگا۔ اسلامی تہذیب و تمدن اور فنِ تعمیر کی خوشنما اور دلفریب جھلکیاں اپنی پوری آب و تاب سے نظر آنے لگیں۔ مسلمانوں کے شاندار اور تابناک ماضی، ان کی عظمتِ رفتہ کا جاہ و جلال، قوت و شوکت، ہیبت، کمالِ فن نظروں میں گھومنے لگا۔ تخلیق کے سرورق کا عکس ان ہی خصوصیات کا حامل اور آئینہ دار ہے۔ عمارت کا ڈھانچہ محراب اور در و دیوار پتھروں کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ ہندسی اشکال کا بڑی مہارت سے استعمال کیا گیا ہے۔ مربع نما، مستطیل نما اور مثلث نما پتھروں سے محراب، در و دیوار اور جاذبِ نظر جالی سے عمارت کو زینت بخشی گئی ہے اور حسین و جمیل نقش و نگار بنا کر پتھروں کا ایک گلزار بنا دیا ہے۔ محراب کے قاعدے میں خوبصورت سیڑھیاں بھی نظر آتی ہیں جو بڑے سلیقے اور قرینے سے ترتیب دی گئی ہیں۔ اسلامی فنِ تعمیر میں سیڑھیوں کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں انہی خیالوں میں گم تھا اور خواب و خیال کی دنیا کی جنت میں مزے لوٹ رہا تھا کہ خیالی دنیا نے مجھے حقیقی دنیا میں پھینک دیا لیکن حقیقی دنیا میں آ کر بھی اپنی روایتی بے عمل زندگی کے باعث آسودہ، نرم و گداز بستر پر غفلت، لاپرواہی اور کاہلی کی گود میں لمبی تان کر سو گیا۔ بے عمل مسلمانوں کو اسی حالت میں آرام و سکون ملتا

ہے۔ دل راحت پاتا ہے اور وقت بہت ہی اچھا گزرتا ہے۔ بغیر محنت کے خود بخود ہی بستر پر لیٹے لیٹے سندر سندر سپنے دیکھ کر دل بہلا دینے والے خیالوں میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ یہ مزے اور زندگی کا لطف یورپ اور امریکہ میں بھی نہیں۔ انھیں یہ خوشگوار زندگی کہاں میسر ہے۔ اندھا کیا جانے بسنت کی بہار۔ یہ تو ہمارے نصیب ہیں کہ مشرقی پاکستان کو کھو کر بھی ہم نے حوصلہ نہیں ہارا۔ ہر ایک ہمارے حوصلے اور صبر و استقلال کی داد دیتا ہے۔ حشرات سیاست نے گلشنِ عزیز کو اجاڑ دیا ہے۔ اگر ہماری ہر دلعزیز جاں نثار فوج نہ ہوتی تو ہم خزاں رسیدہ پتوں کی مانند باد صرصر کے جھونکوں سے ادھر ادھر بکھر کر رہ گئے ہوتے اور ہمارا کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا۔ پاکستان کی مسلح افواج عطیہ خداوندی ہے جو ہر مشکل گھڑی میں اپنی قوم، ملکی سرحدوں کی حفاظت، پاکستانی عوام کے تحفظ اور خدمت کے لئے ہمہ وقت چوکس اور تیار رہتی ہے۔ سوہان صاحب! آپ نے بجا کہا ہے کہ اب صرف فوج ایک ادارہ بچا ہے جو نظم و ضبط اور اصولوں پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس محبِ وطن، شاندار روایتوں کے امین اور مثالی قومی ادارے کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

"پہلی بات" میں آپ نے بڑی دل سوزی سے زندگی کے بعض تلخ حقائق بیان کر کے اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا ہے۔ بیدار دل و دماغ رکھنے والا ہی پریشان ہوتا ہے اور کرب کا شکار رہتا ہے۔ سچی باتیں ہی تلخ اور کڑوی ہوتی ہیں۔ یہ ہم سے کب برداشت ہوتی ہیں۔ ہم تو میٹھا میٹھا ہپ، کڑوا کڑوا تھو کے عادی ہیں۔ اس دور میں خود غرضی اپنی انتہا پر ہے ہم صرف اپنی ذات میں گم اور مگن رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے بغیر اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ہمیں اپنے مفادات ہی عزیز ہیں۔ خواہ ان کے حصول کے لئے اپنا ملک چھوڑ کر باہر ہی کیوں نہ بھاگنا پڑے۔ اپنے محسنوں اور بزرگوں کو بھول جانا ہماری ثقافت ہے۔ یہ ہماری عادت بن چکی ہے ان کی خدمات کا اعتراف کرنا ہمیں ناگوار اور گراں گزرتا ہے۔ ان پر کچھ لکھنا اور ان کی یاد کو ان سے روشناس کروانا اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ہم بھول کے منہ سے ان کا نام بھی نہیں لیتے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہماری ہی ڈگڈگی بجتی رہے اور ہماری زبان سے کسی کی تعریف میں ایک لفظ بھی ادا نہ ہو۔ آپ نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا ذکر کیا ہے۔ خود بھی ہمیشہ سچ کہنے کا علم بلند رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اوروں سے بھی آپ یہی امید رکھنے کے خواہاں ہیں

سچ ہو جو سچ ہی لکھا اب سب کو کہنا ہے سوہان!

بین بجاتا رہتا ہے بھینسوں کے آگے میرا جی۔ بڑی اچھی بات ہے لیکن اتنا بڑا ظرف کہاں سے آئے گا۔ ہمارا تو دل چھوٹا ہے۔ ہمیں تو اس بات پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے والا اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کیوں لکھتا ہے۔ ہمیں اپنی نام نہاد زبان دانی کی بیماری، تجربہ اور پانچ کو تو یہ بھی بے جا فخر ہوتا ہے کہ الفاظ و معانی کی ساخت، ہیئت اور اس کی نزاکتوں اور لطافتوں کو وہ ہی سمجھتے ہیں باقی لوگ سمندر کی ریت ہیں جن سے بچے ساحلِ سمندر پر گھروندے بناتے اور مسمار کرتے رہتے ہیں۔ سوہان صاحب! وہ ساتھی اب روٹھ چکے ہیں جن ساتھیوں میں مائیں اعلیٰ ظرف، صاحبِ کردار، پُرخلوص اور نیک جذبوں والے بیٹے خوشحال کر جنم دیتی تھیں۔ اب تو خود غرضی، منافقت، بے حسی، جھوٹ، مکر و فریب، ریاکاری کے جدید اوزاروں سے سجی ہوئی صورتیں ہر سو نظر آتی ہیں۔ بیوٹی پارلر میں قدرتی حسن کو بگاڑ کر مصنوعی سجاوٹ اور بناوٹ والے چہرے اور ریاکار لوگ اپنے منہ میاں مٹھو بن کر اپنے نام کو نیلام کرتے اور بیچتے ہیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ اب تو ہماری نظر دوسروں کی خوبیوں پر پڑتی ہی نہیں۔ ہم محرومیوں کا شکار ہیں اور اپنے احساسِ محرومی کو دوسرے لوگوں کی ذات میں تلاش کرتے ہیں۔ دوسروں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنا ہمارے

دل کرنے والوں کا کام ہے کوئی بھی ماں کے پیٹ سے سب کچھ سیکھ کر نہیں آیا۔ اگر کسی نے کوئی مقام حاصل کرلیا ہے تو دوسروں کی تعلیم و تربیت، رہنمائی اور تعاون سے ہی حاصل کیا ہے۔ ہمیں اپنا طرزِ عمل بدلنا ہوگا۔ ہم میں دوسروں کو برداشت کرنے کی ہمت اور جرات ہونی چاہیے۔ نئے لکھنے والوں کو حوصلہ دینا چاہیے اور ان کی خوبیوں کو نکھارنے کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین!

محمد اقبال صمصام (مردان)

7 دسمبر "تخلیق" ستمبر 2023ء نظر نواز ہوا۔ "پہلی بات" حسبِ روایت لاجواب ہے۔ آپ کریز سے باہر آ کر عمدگی سے کھیل رہے ہیں! شاید یہ کرکٹ کے موسم کا اثر ہے۔ حمد و نعت کی برکات سے مستفید ہونے کے بعد ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون "خانہ بدوش گجر" پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ہر تحریر خاص ہوتی ہے۔ سہیل سرور گل نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بارے میں مشاہیر کی آراء پر مبنی مضمون بخوبی انداز میں لکھا ہے کہ ان کی شخصیت کے جملہ اوصاف اور ادبی کارنامے واضح ہو گئے ہیں۔ اس شمارے میں شامل دیگر مضامین، بالخصوص ظفر سہیل اور شجاعت علی راہی کی نگارشات بھی قابلِ تعریف ہیں۔ "توجہ خاص" واقعی خاصے کی چیز ہے۔ بالخصوص ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی تحریر "عاشق دل گیر — اظہر جاوید" نے دل موہ لیا۔ پرلطف اور سحر آفریں تحریر ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید نے "اظہر جاوید اور سرگودھا" کے عنوان سے مضمون نگاری کرتے ہوئے بہت محنت کی ہے۔ یہ مضمون مجھے اس حوالے سے بھی اچھا لگا کہ یہ میرے شہر سرگودھا کے مشاہیر ادب کے تذکرے سے معمور ہے۔ یہ جان کر میری معلومات میں خوش گوار اضافہ ہوا کہ اظہر جاوید نے فوج میں بھی دو سال سروس کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ ہمارے "پیٹی بھائی" ہوئے! گوناگوں مصروفیات کے باعث اس بار منظومات اور غزلوں کا مطالعہ نہیں کر پایا اور بغیر پڑھے تبصرے کا فن ہنوز سیکھ نہیں پایا۔ ویسے اقلیمِ ادب میں ایسے فنکار تبصرہ نگار بھی پائے جاتے ہیں جو بڑے بڑے ناولوں اور کتابوں کی سرسری ورق گردانی کے بعد بڑے اعتماد سے تبصرہ لکھ مارتے ہیں اور مہان نقاد کہلاتے ہیں! اچھے افسانوں پر بات کرتے ہیں۔ افسانوں کے سیکشن کا دروازہ کھولا تو سب سے پہلے محمود احمد قاضی کا "دروازہ" دکھائی دیا۔ اچھا افسانہ ہے۔ رواں دواں۔ یادِ ماضی کا تذکرہ انہوں نے خوب کیا ہے۔ مختصر افسانے میں کئی بہت خوبصورت تخلیقی جملے ہیں۔ تحریر میں کہیں کہیں کرشن چندر کا انداز جھلکتا ہے۔ تحریر اور تکرار ان کے افسانے کی خوبی بھی تھی اور خامی بھی۔ اس مختصر افسانے کے آخری پیراگراف میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ بہرکیف ہر افسانہ نگار اپنے رنگ میں لکھتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا اسلوب ہے۔ خلاقِ ازل نے یہ کائنات تنوع میں تخلیق کی ہے۔ یہی اس کی خوبصورتی کا راز ہے۔ حنیف باوا کا افسانہ "کیا حرام کیا حلال" پڑھ کر دل افسردہ ہوگیا۔ بے زبان جانور کو اذیت ناک موت سے دوچار کرنا، اسے تڑپا تڑپا کر مارنا محض اس لیے کہ وہ نجس ہے، حرام ہے، کسی طور جائز نہیں۔ ایسا کرنے والے مسلمان تو کیا انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں۔ میں اسے اس لحاظ سے ایک کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں کہ اس میں وحدتِ تاثر کا عنصر نمایاں طور پر موجود ہے۔ افسانہ نگار نے قاری کے ذہن پر جو خیال اور تاثر مرتب کرنا چاہا وہ ہوگیا۔

صوفیہ بیدار کے قلم کا اعجاز "کامو" ایک شاندار افسانہ ہے۔ تھیٹر کی دنیا کے رنگ نرالے ہیں۔ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ ایسے ماحول میں کامو جیسے بھلا بھگت کردار ہی پرورش پاتے ہیں۔ موضوع، تاثر، اسلوب، لفظیات الغرض ہر لحاظ سے یہ ایک بہترین افسانہ ہے۔

اختتام پہ بیٹے کی والدہ سے واد۔۔۔ "گاموں کے سر سے کبھی ٹوپی سرکتی، کبھی اضطراب میں تسبیح کے دانوں پہ انگلیوں کی پوریں بے قرار سی پھسلتیں، کبھی تذبذب کبھی غصہ، کبھی بے قراری، اعصابی جانچنی رنگت سیاہ پڑتی ہوئی، خیالات کے ہجوم سے تیجھو گزارتا گاموں کے لبادے میں واپس ہو رہی نہ پار رہی تھی۔۔۔" تقسیم ہند کے پس منظر میں اردو ادب میں ان گنت افسانے لکھے گئے ہیں۔ "امیر خان اور جنت کور" اس فہرست میں ایک اور افسانہ ہے۔ اقبال فیروز کا طرزِ نگارش عمدہ ہے مگر افسانے میں چونکا دینے والی کوئی بات نہیں ہے۔ "لمحت از محبت" گلزار مولا کہانی پہ مبنی افسانہ ہے جسے پڑھتے ہوئے آمد سے زیادہ آورد کا گمان ہوا۔ نورین عامر نے افسانہ لکھتے ہوئے اپنی انشاء پردازی کے جوہر دکھائے ہیں مگر اس کوشش میں بیانیہ (بیان) کہیں کہیں کمزور ہو گیا ہے۔ انہیں ضرورت سے زیادہ اور دانستہ عبارت آرائی سے گریز کا مشورہ دوں گا۔ The aim should be to express, not to impress. محمد اعظم کا افسانہ "جھوک میں چنے" نے متاثر نہیں کیا۔ محسن سکھیرا کا افسانچہ "جھوٹا ہوا کا تھا" پسند آیا۔ ڈاکٹر نعمان الحق کا افسانچہ "تماشا" بھی اچھا ہے۔ یہاں ہماری آدھی ملاقات تمام ہوئی۔ دیکھتے ہیں پوری ملاقات کب ہوتی ہے۔

خاقان ساجد (راولپنڈی)

8 محترمی! ایل "تخلیق" ماہ ستمبر 2023ء کے پہلے ہفتے میں نظر نواز ہوا۔ خوبصورت سرورق دعوتِ مطالعہ دے رہا تھا۔ حسبِ معمول پرچے کا آغاز اداریہ یعنی "پہلی بات" سے ہوتا ہے، جس میں مدیرِ محترم آغاز کرتے اور اپنے دل کی باتیں کھولتے جاتے ہیں۔ بات زیادہ طویل نہیں، مختصر اختصار کے ساتھ صرف دو صفحوں میں سموئی ہوئی مطالعے کی ابتدا اداریے سے کی۔ انہوں نے بتایا کہ "تخلیق" کو ان کی ادارت میں شائع ہوتے تیرہ سال ہو چکے اور یوں پرچے نے اپنی اشاعت مسلسل کے چون برس (بشمول بانی مدیر کا عرصہ ادارت 1969-2012) مکمل کر لیے۔ سو ان صاحب کو دلی مبارکباد۔ اداریے میں ان کا یہ کہنا درست ہے: "ادبی پرچہ نکالنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ (تاہم) میں نے کسی پر احسان نہیں کیا" بلکہ والد گرامی کی جلائی شمع کو فروزاں رکھا۔ قوشی نظر مقصد اولین تھا: ادب کی خدمت اور ادیب سازی۔ انہوں نے بہت سے نام لیے اور کہا کہ ان قلمکاروں نے اسی پرچے کے پلیٹ فارم سے آغاز نگارش کیا تھا اور یہ بات ادارے کے لیے باعثِ مسرت ہے۔ لیکن آج کل ادب کے نام پر جو بے ادبیاں چل رہی ہیں، محترم نے ان پر بھی انگلی اٹھائی اور کہا "ذاتی مفادات نے ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔" بات درست ہے۔ حصہ نثر میں ایک عمدہ مضمون "عذرا اصغر ایک کالم نگار کی حیثیت سے" لکھا ہے مشتاق لکھاری قرۃ العین طاہرہ نے۔ انہوں نے بتایا کہ عذرا اصغر کی کتاب "قلم پارے" کی مولفہ ڈاکٹر صدف نقوی نے مختلف اخبارات و رسائل اور ریڈیو کے لیے لکھے گئے کالموں کو یکجا کیا۔ مطالعہ کے بعد اپنا تاثراتی رائے اب لکھا۔ طاہرہ بتاتی ہیں کہ کتاب "قلم پارے" میں موجود کالموں کے موضوعات روزمرہ والے مسائل کو کور کرتے ہیں۔ بنیادی مقصد ہے اصلاح۔ "ان کالموں میں انشائیے کے قرینے اور ادبیت کی چاشنی ملتی ہے۔" سو عذرا اصغر جو ناول و افسانہ نگاری کے ذریعے ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہیں، ایک اچھی کالم نگار کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ نثری شعبے میں عذرا اصغر کا مضمون "سنہری چند یادیں" کاثر انگیز ہے۔ اس میں پچھلی صدی کی ساٹھویں دہائی کے زمانے سے تعلق

رکھنے والی چند نامور شخصیات کی یادنگاری ملتی ہے اور ان میں اظہر جاوید ایڈیٹر تخلیق بھی شامل ہیں۔ مصنف نے ذاتی حالات عمدگی سے پیش کیے ہیں۔ ''گوشۂ خاص'' کے تحت دو مضامین اظہر جاوید کے بارے میں ہیں۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے اپنی نگارش ''عاشق اکبر'' میں بانی تخلیق کو ایک دل پھینک عاشق ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کی۔ آخر ڈاکٹر موصوف کو کیا ملا۔ ان کی تحریر پسند نہیں آئی۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے اپنے مضمون ''اظہر جاوید اور سرگودھا'' میں لکھا کہ مرحوم نے سرگودھا میں قیام کے دوران مختلف حلقوں اور خصوصاً ادبی حضرات سے دوستانہ تعلق بنائے جو تا حیات قائم رہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے لاتعداد ناموں کی فہرست دی ہے۔ دوستوں کے نام، ان کی پیدائش و اموات کی تواریخ بھی پیش کیں۔ یہ محض کارلا حاصل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ فرحت عباس شاہ نے اپنے مضمون ''اردو میں ایک نئے شاعر کی آمد'' میں احمد نواز سے تعارف کرایا۔ تاہم عباس شاہ جی نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے کلام کے یہ گراں قدر نمونے شاعر کی کونسی کتاب سے حاصل کیے۔ حصہ شعر میں خوب جھلک ہے۔ چند آبدار موتی:

صبح ہوتی ہے شام کی صورت — ایک جیسا یہاں ہے آج اور کل (مسلم تبسم)
اس طرح طلب گرا ہے، راستے گم ہو گئے — ملک مٹی میں ملا ہے راستے گم ہو گئے (محمود شام)
چلے جاتے ہیں ہم آگے ہی آگے — مگر آگے زمانہ آ گیا ہے (آصف ثاقب)
پہلی ہی بار ہو گیا میں مبتلائے عشق — دل میں جو آئے پھر کبھی دل سے نہ جائے عشق (وسیم جبران)

محمد طارق علی (راولپنڈی)

﴿9﴾ سلام مسنون! ماہ ستمبر 2023ء کا تخلیق ملا۔ اس میں میرا انشائیہ ''بھوک میں پتے'' چھپا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ اس سے پہلے کہ میں شمارے کے مندرجات کے بارے میں کچھ لکھوں میری دو معروضات ہیں۔ اول میرے تعارف میں ''مرزمی کا دیا'' کو ''مری کا دیا'' لکھا جا رہا ہے۔ اس بارے میں میں پہلے بھی آپ کی توجہ دلا چکا ہوں۔ امید ہے آپ اپنے کمپوزر کو یاد دہانی کرا دیں گے۔ دوم ''بھوک میں پتے....'' انشائیہ ہے جبکہ یہ سہواً افسانوں میں شامل کر دیا گیا ہے۔ امید ہے اگلے شمارے میں اس کا ذکر ہو جائے گا۔ اب شمارے کے مندرجات کی طرف آتا ہوں۔ حمد و نعت معمول کے مطابق آنکھوں اور روح کو تازگی بخشتا ہے اور چند کر لکھاریوں کیلئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی کا خانہ بدوش گروہ ایک پُر مغز تحریر ہے اس میں ان کی تحقیق کہ ''ایک اہم خانہ بدوش قبیلہ جوتیوں کا ہے'' میں اپنی معلومات کیلئے قارئین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا یہ وہی ہوتی ہیں جو آج کل صوبہ خیبر پختونخواہ میں آباد ہیں؟

شجاعت علی راہی کا لکھا مضمون ''صنف نازک اور ادب'' بھی خاصہ پُرکشش ہے۔ افسانوں کے حصے میں محمود احمد قاضی کا ''دروازہ'' وطن عزیز کے پرآشوب دور کا غماز ہے۔ افسانے کا ڈکشن ایک آزاد نظم کا ماحول لیے ہوئے ہے۔ حنیف باوا کا افسانہ ''کیا حرام کیا حلال'' ایک نہایت حساس نکتے کو سامنے لاتا ہے جس پر تبصرے کی گنجائش نہیں۔ عذرا اصغر صاحبہ نے ''شہری چند یادوں'' میں اپنی ادبی زندگی کے لیل و نہار اور ان میں شامل ہونے والے ادبا کا ذکر کیا ہے جس میں دلچسپی کا خاصہ سامان ہے۔ ''انجمن خیال'' میں صفدر صدیق رضی، شہباز

انور خان، تسلیم کوثر، ممتاز راشد لاہوری اور خاقان ساجد نے میرے افسانے "عکسی پینٹنگز" پر اپنی رائے دی ہے۔ میں ان تمام لکھاریوں کا ممنون ہوں۔ ان کی رائے میرے لئے بیش قیمت ہے۔ آپ کی صحت و تندرستی کیلئے بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔

محمد اسلم (لاہور)

﴿10﴾ ماہ ستمبر 2023ء کا "تخلیق" میرے سامنے ہے اور آپ کا اداریہ بھی جس میں آپ نے چند تلخ حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں اور میری خواہش ہے کہ ادب کی سربلندی کیلئے تخلیق کاروں کو ہر تعصب سے بالاتر ہو کر قلم و قرطاس کا استعمال کرنا چاہیے۔ اظہر جاوید صاحب کی وفات کے بعد جس آن بان اور ادبی سوجھ بوجھ کا ثبوت آپ نے فراہم کیا ہے، وہ لائق تعریف ہے۔

ڈاکٹر توفیق مشتاق کی حمدیہ نظم انتہائی متاثر کن ہے اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون خانہ بدوش گجر انتہائی معلومات افزا ہے۔ خانہ بدوش زندگی کے حوالے سے انگریزی ناولسٹ "جارج ایلیٹ" نے اپنے ناول Mill on the Floss میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں سیمیوئل آر ڈیلانی کی نظم "بنجارے" کا ترجمہ بھی انتہائی دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کی عذرا اصغر کے بارے میں تحریر حقائق پر مبنی ہے محترمہ پوری تحقیق ادب دوست اور ادب شناس ہے ان کا ایک پرچہ بھی شائع ہوتا رہا ہے اور وہ اپنی تحریریں ماہنامہ "سفید چھڑی" میں بھی تحریر کراتی رہی ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ فرحت عباس شاہ نے احمد نوازش کی شاعری پر انتہائی خوبصورتی سے ان کا تعارف کرایا ہے۔ معروف ادیب محمود شام پر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا مضمون موصوف کے بارے میں بڑی دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا اپنا مخصوص اسلوب نگارش ان کی اس تحریر میں بھی جھلکتا ہے۔ انہوں نے اظہر جاوید کا تعارف بھی بڑی تفصیل سے کرایا ہے کہ ہمیں اظہر جاوید کچھ زیادہ اپنے سے لگے ہیں۔ استاد محترم پروفیسر بخت قاضی صاحب نے ایوب کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں انتہائی دلچسپ ہیں۔ قاضی صاحب سے میں نے اکتساب فیض بھی کیا اور میں ان کے ادبی قد کاٹھ کا دل سے قائل ہوں۔ میں نے کم و بیش تمام تحریریں پڑھی ہیں بہت اچھا لگا۔ آپ کا انتخاب لاجواب ہے شعری حصے سے چند اشعار نذر قارئین ہیں:

اب مجھے یاد نہیں تیری گلی کی جانب — خود چلا آیا کہ حالات اٹھا کر لے آئے
نفع نقصان سے واقف ہی نہیں اہل جنوں — اور تم لوگ حسابات اٹھا کر لے آئے (سلیم کوثر)
کیوں زمیں کی گردشیں بے سمت ہونے لگ گئیں — آسماں حیرت زدہ ہے راستے گم ہو گئے (محمود شام)
جائیں گے ہم مہ و مریخ پہ بھی جام بکف — نہ عادات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی (انور شعور)

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (سرگودھا)

﴿11﴾ سلام مسنون! ماہنامہ "تخلیق" شاندار ادبی روایات کا حامل ہے۔ اس کی اشاعت میں تسلسل اور تواتر شروع دن سے برقرار ہے اور معیار میں بھی روز افزوں اضافہ قارئین کے ذوق اور اظہر جاوید کی یاد کا مظہر ہے۔ اسی لئے تمام قارئین ماہنامہ "تخلیق" سے پیار کرتے ہیں۔

اللہ کرے آپ کی یہ محنت اور رواداری سدا قائم رہے۔ جناب عالی! ان ہی احساسات کے پیش نظر میں اپنی ہر تحریر ماہنامہ ''تخلیق'' کیلئے لکھتا ہوں۔ یہ آپ کی از حد مہربانی ہے کہ آپ میرے جیسے عام لکھاری کا بھی دل رکھتے ہیں اور میری تحریریں اپنے عالمی شہرت یافتہ ماہنامہ ''تخلیق'' میں شائع کرتے ہیں۔ جناب عالی! میں بہت ضعیف العمر اور علیل شخص ہوں لیکن تخلیق سے تعلق پر خوش اور پرجوش محسوس کرتا ہوں۔ جناب عالی میں عالم فاضل نہیں ہوں۔ اس لئے میری تحریروں میں عوامی انداز فکر نمایاں رہتا ہے۔ موجودہ شمارے میں جناب ظفر سیلی صاحب کا اعلیٰ اور زبردست مضمون ''شرح فکر اسلامی فی الہند'' بہت دھیان سے پڑھا ہے۔ انہوں نے اس وقت کے حالات و واقعات کا ذکر بہت خیر خواہی اور نیک نیتی سے کیا ہے لیکن امام ناصر الدین شیرازی کا کردار عہد سلاطین کے روحانی اور علمی ابلاغ کا ایک خاص نمونہ ہے۔ ان کا ذکر اس تحریر میں شامل نہیں کیا۔ اس لئے راقم الحروف نے بیماری اور تکلیف کے باوجود امام ناصر الدین شیرازی کا ذکر اس شمارے میں بذریعہ تحریر میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔

خالد عبداللہ وینس (راولپنڈی)

﴿12﴾ السلام علیکم! ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ اپنے خوبصورت سرورق کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ حسب روایت اور حسب معمول بہترین اور معیاری تخلیقات سے آراستہ یہ شمارہ بھی اہل ادب و صحافت میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مضامین کے ذیل میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک مضمون ہے جب کہ گوشہ خاص کے زیر عنوان ڈاکٹر عبدالکریم خالد اور ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم جنہیں ''شہر کی چند یادیں'' کے عنوان سے محترمہ عذرا اصغر نے ہمارے پیارے اور ہردلعزیز اظہر جاوید مرحوم کی حسین یادوں کے چراغ روشن کیے ہیں۔ اس شمارے میں ہمارے دوست ہارون الرشید تبسم نمایاں طور پر جلوہ گر ہیں اور اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ جناب اظہر جاوید کی سرگودھا سے وابستگی اور وہاں کے اہل علم و دانش کے ساتھ ان کے تعلق اور دوستیوں کو حسن خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے جو ان کی ادب پروری، ادب نوازی اور علم دوستی کا مظہر ہے۔ حصہ غزل اور نظم بھی خوب ہے۔ اسی طرح افسانوں میں محمود احمد قاضی، حنیف باوا اور ڈاکٹر محسن مگھیانہ کے افسانے پسند آئے۔ محترمہ صوفیہ بیدار خوبصورت نثر نگار ہیں تاہم ان کی تحریر ''کاما'' پڑھ کر کچھ نہیں آئی کہ یہ افسانہ تھا یا کیا تھا۔ بہر حال مجموعی طور پر تمام تخلیقات اپنے اندر دلچسپی اور قابل مطالعہ مواد لیے ہوئے ہیں۔ سلامتی ہو آپ پر!

شہباز انور خان (کراچی)

﴿13﴾ آداب و تسلیمات! ''تخلیق'' ستمبر 2023ء بدست ہوا۔ نظر نواز ہوا۔ اداریے میں آپ نے بند ہو جانے والے ادبی رسالوں کا ذکر کیا اور میری نظروں میں نقوش، اوراق، افکار، فنون، ادب دوست، ساتھیاں، ظرافت اور رابطہ سمیت متعدد رسالوں کا عروج و زوال گھوم گیا۔ غنیمت ہے کہ پرانے رسالوں میں تیر نیک خیال، شاعر، شاداب اور آپ کے ''تخلیق'' کا سفر اب بھی جاری ہے۔ اداریے میں مرحوم قلمکاروں کے کافی نام آپ نے لکھ دیے ہیں۔ ان میں یہ نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں: احمد راہی، بشریٰ رحمن، الحمیدہ ریاض، قتیل شفائی، منیر نیازی، تنویر ظہور، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر اختر شمار، امجد اسلام امجد، مجید نظامی، طارق عزیز، ڈاکٹر طارق عزیز، قاسم نقوی، محمد خالد، خالد احمد،

نجیب احمد، شفیق سلیمی، قاضی جاوید، علامہ بشیر رزمی، ایم اے راحت، رابعہ رشید محمود، علامہ ذوقی مظفر نگری، ریاض رومانی، رخسانہ نور، بشیر راز، مقصود عامر، اسلم کولسری، رشید مصباح اور دیگر کی۔ "پنجاب رنگ" میں آپ نے میرے نو عدد پنجابی بیت شائع کیے۔ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ یہاں یہ عرض کروں کہ ان بیتوں کے "موجد" محمد عباس مرزا کے مطابق یہ بیت ساڑھے پانچ فعلن کے ہیں۔ ایم زیڈ ملک نے نیرنگ خیال (اگست 2023ء) میں ان کو چھ فعلن کا قرار دیا ہے تو اب میں اور عباس مرزا بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ ایم زیڈ ملک کے بقول یہ بحر متقارب ہے اور بارہ رکنی ہے۔ اس کا عروضی نام ہے "محذوف پد زحاف مثلاً ــــ یا ــــ اثرم محذوف مسکن بیت نگاری کی بات چلی تھی تو میں نے سوچا کہ یہ گزارشات بھی پیش کروں۔ "تخلیق" کا یہ شمارہ بھی حسب روایت خاصا زرخیز ہے اور اس کا مطالعہ جاری ہے۔

ممتاز راشد لاہوری (لاہور)

14ء سلام مسنون ادبی دنیا کا انمول جریدہ دسمبر 2023ء ملا جسے پڑھ کر ادبی تشنگی کو راحت نصیب ہوئی۔ پچھلے دو شماروں کا مطالعہ نہ ہو سکا کیونکہ اگر انسان کی صحت میں خرابی پیدا ہو جائے تو پھر اسے دنیا کی تمام رونقیں بے معنی لگتی ہیں۔ یہ شمارہ بھی ادب کے کئی رنگ لیے ہوئے ہے۔ معلوماتی مضامین، عمدہ نظمیں، غزلیں ہیں۔ حصہ حمد و نعت میں ڈاکٹر بدر منیر کی حمد تبسم کی حمد نے متاثر کیا۔ موصوف نے کیا شعر کہا ہے:

میری محدود سی ہستی میں سما کیسے خدا　　　مجھ پہ وا فلسفہ شاہد و شہود کیا کرتے

سید ریاض حسین زیدی کی نعت بھی خوب ہے۔ حصہ مضامین میں تمام مضامین ادبی معلومات کا خزانہ ہیں۔ فرحت عباس شاہ کی تحریر اردو میں ایک جز سے شاعری آمد کا پتہ دیتی ہے۔ واقعی ایک اچھا مضمون ہے۔ مرحوم کے کلام میں تغیر ان کے ذریعے۔ خالد عبداللہ وٹس کی تحریر ایک خاصے کی تخلیق ہے۔ اس میں ایک شعر اصل میں اس طرح ہے: "جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں ــــ آدمی بے نظیر ہوتے ہیں"

گوشہ خاص میں اظہر جاوید اور سرگودھا، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا نایاب گوشہ ہے۔ بہت ہی کامیاب رہا۔ یہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ہیں جو کتاب سے اور مصنف سے عشق کرتے ہیں ورنہ اس دور میں کتابیں تو ماضی کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ تبسم جیسے خاص ادیب اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔ افسانوں میں تمام افسانے دل کو چھو لینے والے اور ادبی ذوق کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دسمبر کے شمارے میں غزلیات کے چند اشعار جو پسند آئے۔

ے اب تو کچھ اس کے سوا اور نہیں چاہتا ہے　　　دل تجھے خانۂ خاطر میں مکیں چاہتا ہے (اسلم انصاری)
ے مارکیٹوں میں ہیں بکھری دھجیاں تہذیب کی　　　جابجا ناکا لگا ہے راستے گم ہو گئے (محمود شام)
ے چاند بھی لینا نہ آیا ڈھنگ سے　　　کر لیا اپنا ہی سچا نام بھی (خالد اقبال یاسر)
ے جلتا ہوا چراغ تھا بجھا دیا مجھے　　　احسان مند ہوں میں ہوائے زبان کا (خاور اعجاز)

ماجد وفا عابدی (گوجر خان)

---

15 ﷺ السلام علیکم! سلمان اظہر نے "تخلیق" کی صورت میں ایک حسین دنیا بسا رکھی ہے۔ ہر شمارہ ایک تازہ اور نئے پن کے ساتھ نمودار ہوتا ہے جو اس امر کا غماز ہے کہ سلمان اظہر ترویج ادب کے لئے نہ صرف اپنے کردار سے واقف ہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی تحریک کا باعث ہیں۔ ماہ دسمبر 2023 کا شمارہ اپنی پوری آب و تاب اور خوبصورت سرورق کے ساتھ ہاتھ میں آیا تو حسب عادت میں نے "پہلی بات" سے مطالعہ کا آغاز کیا جس میں سلمان نے اپنی صاف گو طبیعت کے عین مطابق یہ اعلان کرنے میں دیر نہیں لگائی کہ ادبی پرچہ نکالنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ وطن عزیز میں کتاب یا کسی ادبی جریدے کو خرید کر پڑھنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے تخلیق کار اپنی تخلیقات کو کتابی شکل دیتے ہوئے پریشان نظر آتے ہیں کیونکہ انہیں اشاعت کے اخراجات کے ساتھ ساتھ اپنے احباب کو کتاب بھیجنے کے لئے ڈاک کے اخراجات بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ میں کیونکہ خود صاحب کتاب ہوں اس لئے یہ پریشانی سمجھ سکتی ہوں۔ خیر سلمان صاحب نے دوسری ہی سطر میں یہ بھی اعتراف کر لیا کہ وہ کسی پر احسان نہیں کر رہے بلکہ وہ یہ ساری کاوش اپنے والد صاحب کا نام زندہ رکھنے کے لئے کر رہے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔ آمین! نوجوان لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کے حوالے سے ان کی سوچ قابل تعریف ہے مگر اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے کسی ٹھوس لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر AllocationPercentage کے تحت ہر جریدے کا کچھ حصہ سینئرز اور کچھ جونیئرز کے لئے مختص کر کے سب کو مساوی موقع دے سکتے ہیں (یہ صرف رائے ہے جس پر اختلاف کا حق ہر کسی کے پاس ہے)۔ ورنہ ہمارے سینئرز، جونیئرز کو موقع فراہم کرتے ہوئے کتراتے ہیں اور اپنی پذیرائی نہ ہونے کی صورت میں ناراض بھی جلدی ہو جاتے ہیں۔ مگر اس بات کا ادراک رکھنا بہت ضروری ہے کہ ادب کو جدت اور روایت کے حسین ملاپ کی ضرورت ہے جو وہ شاید نوجوان لکھاری خوبصورتی سے عطا کر سکتے ہیں اور ادب کی بقا اسی میں ہے کہ پرانے اور نئے لکھاری سب مل کر اس کے لئے حکمت عملی مرتب کریں اور ایک دوسرے کے وقار کا خیال رکھتے ہوئے ادب کا وقار قائم رکھنے کے لئے کوششیں کریں۔ حمد و نعت کے روح پرور سلسلے کے بعد مضامین کے مطالعہ نے سرشار کر دیا۔ ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون "خاندیش کلچر" "سنگی سرونجی کا" پروفیسر گوپی چند نارنگ" اور شہباز انور خان کا "فیض اور طبقاتی کشمکش" بہترین مضامین ہیں۔ منظومات اور غزلوں کے حصے میں ادارے کے ممبران نے بہترین نظموں اور غزلوں کا چناؤ کر کے ایک بار پھر ادارے کے ساتھ مخلص ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے اور قارئین کا بھروسہ تخلیق اور اس کی ٹیم پر مزید پختہ ہوا ہے۔ افسانوں میں "کیا حرام کیا حلال"، "بھوک میں بچے" اور "کشت زارِ محبت" دل کو بھائے۔ سرائیکی، توشہ اور پنجاب رنگ نے یہ باور کرا دیا کہ "تخلیق" ملک عزیز میں بولی جانے والی ہر زبان کا جریدہ ہے اور اس پر کسی ایک زبان یا علاقے کی مہر نہیں لگی جو کہ خوش آئند بات ہے۔ انجمن خیال میں سلمان اظہر اور ان کی انتھک محنت کو سراہتے ہوئے چند مخلص لوگوں کے خطوط باعث حیرت کرتے ہیں کہ ابھی بھی کچھ ادب پسند اور ادب شناس لوگ ہیں جو ہماری ہر کاوش کو پورے خلوص کے ساتھ سراہتے ہیں اور یہی لوگ امید کی کرن ہیں جو کو بہ کو روشنی بکھیرتی ہے۔ دعا ہے کہ پروردگار سلمان اظہر اور ان کے خاندان کو سلامت رکھے تخلیق کی صورت میں ادب کی شمع یوں ہی روشن رہے۔ آمین!

شازیہ رباب (ملتان)

◆◆◆

تعارف نامہ

نسیمِ سحر...... تخلیق ایوارڈ یافتہ 2023ء

خاندانی نام : محمد نسیم ملک ـــ والد کا نام : محمد امین ملک ـــ ادبی نام : نسیم سحر

موبائل ٹیلی فون نمبر : 0092-333-541-5091 ای میل ایڈریس : naseemesehar@gmail.com

تاریخ پیدائش : 15 فروری 1944ء ـ مقام پیدائش : راولپنڈی ـ تعلیم : ایم اے (اردو)

پتہ : مکان نمبر 181، اے/429، سید پور سکیم نمبر دو، نزد گورنمنٹ کالج فار کامرس، اعظم چوک، سٹلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی۔

پیشہ : 1962ء سے مختلف حیثیتوں میں حکومت پاکستان کے اداروں اور وزارتوں میں ملازمت کا آغاز کیا۔ 1972ء میں قومی اسمبلی میں بطور آفیشل رپورٹر (انگلش) تعینات رہے جہاں سے 1980ء میں ڈیپوٹیشن پر اسلامی ترقیاتی بنک جدہ (سعودی عرب) میں انگلش رپورٹر کے طور پر تعینات ہوئے اور 31 برس کی ملازمت کے بعد چیف انگلش رپورٹر کی حیثیت میں 2011ء میں ریٹائر ہوئے۔

اصنافِ سخن : حمد، نعت، غزل، نظم، افسانہ، ہائیکو، رباعی، ماہیے، خاکہ نگاری، تنقید، تبصرے، مزاحیہ شاعری، ترجمہ نگاری۔

تصنیفات : غزلوں، نظموں اور ہائیکوز کے 13 مجموعے، 3 حمدیہ و نعتیہ مجموعے، ادب اور تنقیدی ادب پر تنقید کے 5 مجموعے، خاکوں کا ایک مجموعہ، مزاحیہ شاعری کا ایک مجموعہ۔

ادارتی سرگرمیاں : پاکستان اور سعودی عرب سے بیک وقت ایک سہ ماہی ادبی مجلہ "سحاب" کے عنوان سے نکالتے رہے جس کے تا حال چودہ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان سے ابھی پر کچھ شمارے نکالنے کے بعد فی الحال یہ سلسلہ موقوف ہے۔

سعودی عرب کی ادبی اور سماجی و ثقافتی تنظیمیں جن سے وابستہ رہے : دائرۂ ادب جدہ کے بانی اور جنرل سیکرٹری، پاکستان رائٹرز فورم جدہ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبر، پاکستان سوشل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن جدہ کے بنیادی رکن، عالمی اردو مرکز جدہ کے اساسی رکن، بانی اور جنرل سیکرٹری حلقۂ دانشوراں جدہ کا اساسی رکن، ادبی ثقافتی اور سماجی تنظیم "ہم آواز" کا بانی اور تاحیات سرپرستِ اعلیٰ۔

ایوارڈز، اسناد، اعزازات وغیرہ : بہت سی ادبی تنظیموں، اداروں اور افراد کی جانب سے انھیں تخلیقی سرگرمیوں کے اعتراف میں شیلڈز، ایوارڈز، اسناد اور اعزازات وغیرہ مل چکے ہیں جن میں سے یہاں چند بطور خاص قابلِ ذکر یہ ہیں : (1) نظریۂ پاکستان کونسل (ٹرسٹ)، اسلام آباد کی جانب سے لائف ٹائم ادبی خدمات پر علامہ اقبال گولڈ میڈل 2016ء جو انھیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان مرحوم کے دستِ مبارک سے عطا ہوا۔ یادگاری شیلڈ برائے حسنِ کارکردگی، پہلی عالمی حمد و نعت کانفرنس 30-31 جنوری 2021ء، چمنستانِ حمد و نعت ویلفیئر ٹرسٹ کراچی۔

◆◆◆

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

نمبر شمار	کتاب	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	[illegible]	[illegible]	0334-2981432	[illegible]	500/-
2	[illegible]	[illegible]	0300-4827500	[illegible]	500/-
3	[illegible]	[illegible]	0306-5109344	[illegible]	1,000/-
4	[illegible]	[illegible]	0306-5109344	[illegible]	1,000/-
5	[illegible]	[illegible]	0306-5109344	[illegible]	500/-
6	[illegible]	[illegible]	0306-5109344	[illegible]	700/-
7	[illegible]	[illegible]	0300-4489310	[illegible]	300/-
8	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	800/-
9	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	1,000/-
10	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	1,200/-
11	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	800/-
12	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	800/-
13	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	800/-
14	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	800/-
15	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	1,000/-
16	[illegible]	[illegible]	0300-6668284	[illegible]	1,000/-
17	[illegible]	[illegible]	0333-7189996	[illegible]	600/-
18	[illegible]	[illegible]	0300-4489310	[illegible]	1,000/-
19	[illegible]	[illegible]	0300-4489310	[illegible]	500/-
20	[illegible]	[illegible]	0300-668284	[illegible]	1,000/-
21	[illegible]	[illegible]	0326-7844094	[illegible]	600/-
22	[illegible]	[illegible]	0302-7844094	[illegible]	1000/-
23	[illegible]	[illegible]	0302-7844094	[illegible]	800/-
24	[illegible]	[illegible]	0300-21287280	[illegible]	1000/-
25	[illegible]	[illegible]	0333-4387871	[illegible]	1100/-
26	[illegible]	[illegible]	0301-4044061	[illegible]	150/-
27	[illegible]	[illegible]	0300-4020955	[illegible]	1000/-
28	[illegible]	[illegible]	0300-4020955	[illegible]	1,000/-
29	[illegible]	[illegible]	0300-4020955	[illegible]	1,000/-
30	[illegible]	[illegible]	0300-4020955	[illegible]	1,000/-
31	[illegible]	[illegible]	0300-4020955	[illegible]	1,000/-
32	[illegible]	[illegible]	0300-4020955	[illegible]	1,500/-

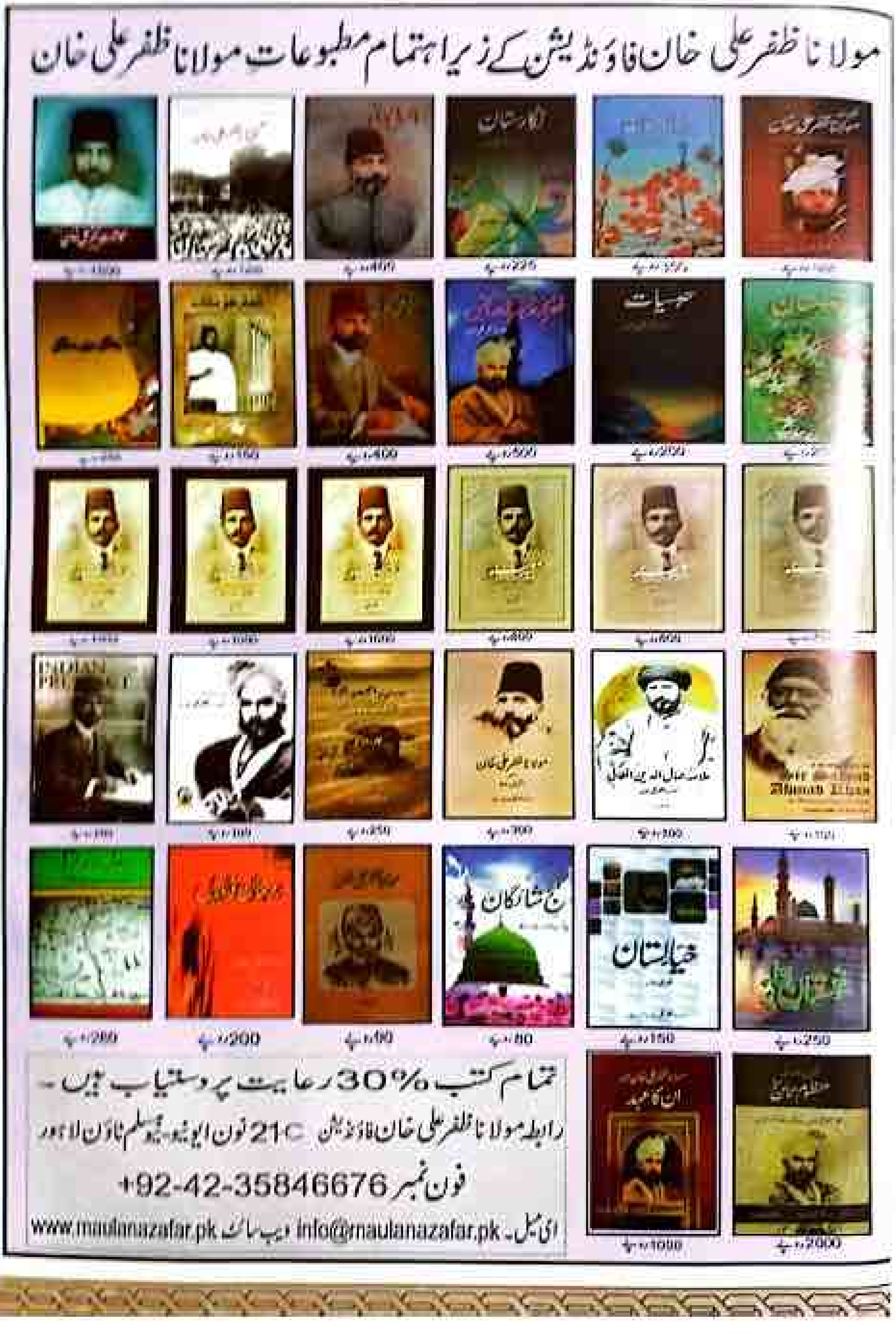

مولانا ظفر علی خان فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مطبوعات مولانا ظفر علی خان
تمام کتب 30% رعایت پر دستیاب ہیں۔
رابطہ مولانا ظفر علی خان فاؤنڈیشن C-21 نون ایونیو، مسلم ٹاؤن لاہور
فون نمبر 35846676-42-92+
www.maulanazafar.pk ویب سائٹ info@maulanazafar.pk ای میل۔

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE

December 2023

CS CamScanner

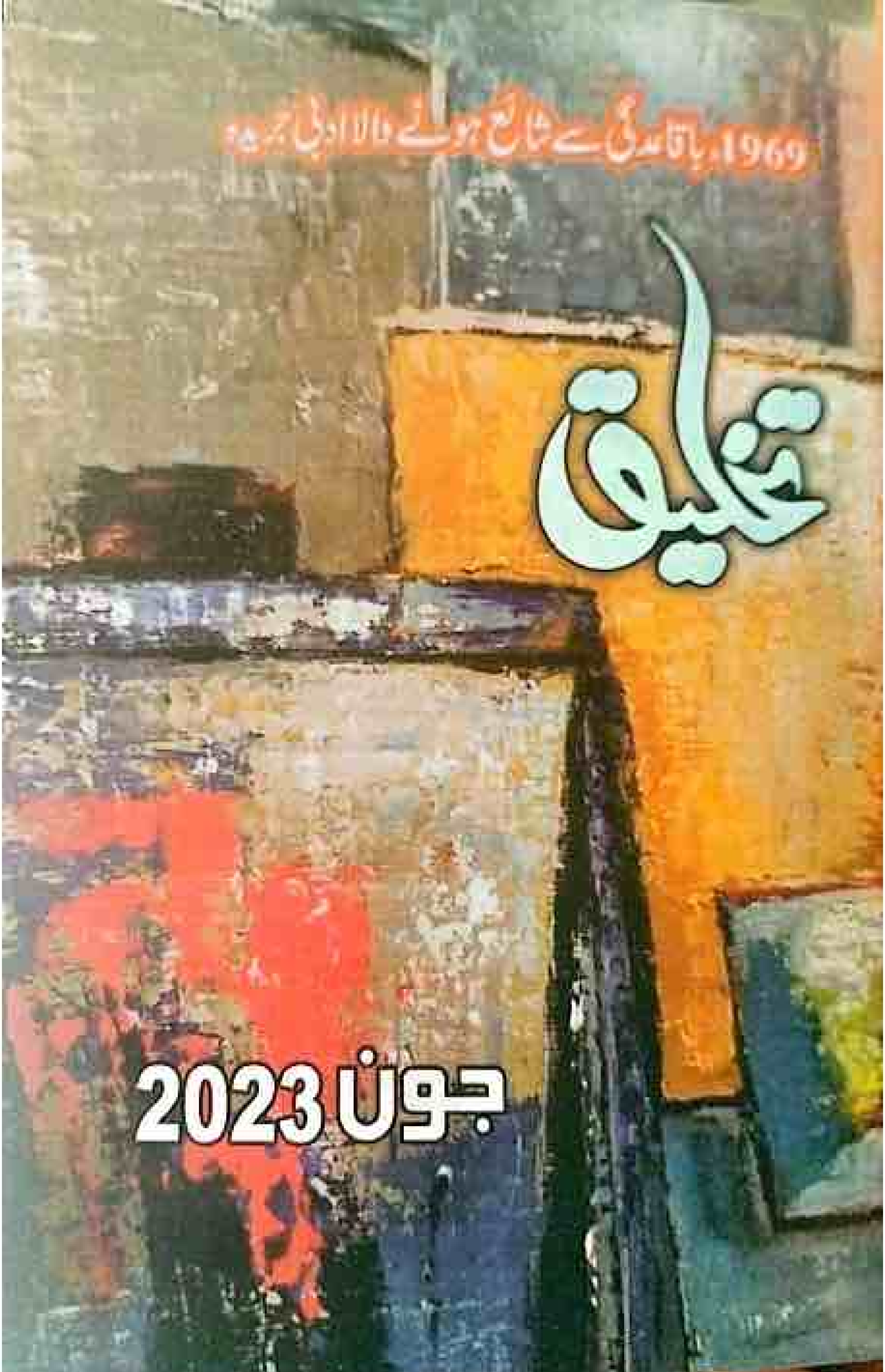

CamScanner

"ماھنامہ تخلیق" کی ادبی سرگرمیوں کی تصویری جھلکیاں

امیر بہادر ہوتی (سیکرٹری ANP) عرفان اطہر (ایڈیٹر تجارت اخبار) محمد سرور (ایڈیشنل SHO) محمد اکرام برکت (ڈائریکٹر [illegible]) ہمراہ سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) کے گھر میں۔

رانا مسعود علی (SSP) احمد علی [illegible] (ایڈیٹر [illegible] اخبار) محمد مسعود [illegible] (SSP) ہمراہ سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) کے گھر میں ایک ملاقات۔

ڈاکٹر [illegible] (شاعر) [illegible] خالد شریف (ڈائریکٹر CEO [illegible]) [illegible] (SSP) [illegible]

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) اعظم چوہدری (صدر پریس کلب) خاور نعیم ہاشمی (سینئر جرنلسٹ) ہمراہ [illegible] (سینئر جرنلسٹ) PC ہوٹل میں۔

محمد اشرف خان (سیکرٹری پنجاب PPP) سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) ہمراہ [illegible] ایک ملاقات۔

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) ڈاکٹر [illegible] ہمراہ [illegible]

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) [illegible]

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) [illegible]

[illegible] (مدیر تخلیق) ہمراہ [illegible]

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) ہمراہ [illegible] (C.E.O) [illegible]

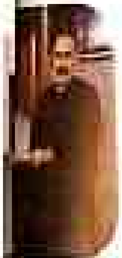

سوہان اظہر جاوید [illegible]

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) ہمراہ [illegible] سے ایک ملاقات۔

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) ہمراہ [illegible] (C.E.O) سے ایک ملاقات۔

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) ہمراہ [illegible] سے ایک ملاقات۔

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) ہمراہ [illegible] کے گھر میں۔

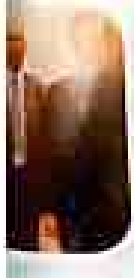

سوہان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) ہمراہ [illegible]

CamScanner

مسلسل اشاعت کا 55 واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی ایوارڈ حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 55 — جون 2023ء — شمارہ : 2 — CPL نمبر 96

قیمت : -/500 روپے ——— 2,500 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر ——— ہندوستان کے لیے 3,500 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

ماہنامہ "تخلیق" بینک اکاؤنٹ نمبر : 202-777-434 یو بی ایل واپڈا ٹاؤن روڈ لاہور برانچ کوڈ 1236

ماہنامہ "تخلیق" ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر : 0323-9526505

موبائل فون : 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

تنویر جہاں (امریکہ) — ڈاکٹر فوزیہ مشتاق (امریکہ) — نارنگ ساقی (انڈیا) — جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفریں کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نو وارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو "تخلیق" پیہم رواں رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "عصریہ"، "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

55 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ "تخلیق" کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر "تخلیق" کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کے مضامین کے انتخاب کے لیے "تخلیق پینل" تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں "تخلیق" کے امور کی ذمہ داری محترمہ تنویر جہاں، ڈاکٹر فوقیہ مشتاق، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف -/3,500 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Opposite (Toyota Cantt Motor), Main Chowk, Walton Road, Lahore-Cantt. (04237187500 - 04236671007)

U.S.A.	U.S.A.	INDIA	PAKISTAN
[illegible]	Fauqia Mushtaq	K.L. Narang Saqi	Javed Manzoor
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
C.A. USA	[illegible]	Delhi-110001, India	[illegible]

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — سید ریاض حسین زیدی — 7
حمد باری تعالیٰ — تسنیم کوثر
نعت رسول مقبولؐ — صفدر صدیق رضی — 7

مضامین

تعبیری کچھ — ڈاکٹر مبارک علی — 8
ہزارہ میں جدت آہنگ ہزارہ رنگ — آصف ثاقب — 11
"کافر" کی معنی آفرینی — پروفیسر قاری علیم الدین — 12
عمارت کی سرگزشت — ڈاکٹر جواد جعفری — 20
HEC کے منتخب رسائل اور مسائل — سید نصرت بخاری — 29
پوٹھوہاری رسائل کا تاثر — ڈاکٹر اشفاق احمد ورک — 31

منظومات

جب تم عشق نہیں کرتے — اسلم انصاری — 13
الماس — ایوب خاور
خوشبو بکھری — گلزار بخاری
ٹین ایجڈ کی — صفدر صدیق رضی
بچے اداس تھی — افتخار بخاری
آنے کا تحفہ — ڈاکٹر سہیل ممتاز خان
میں اور میری ماں — ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ)
محبت — ندیم فراز — 34

افسانے

وہ جب یاد آئے — عذرا اصغر — 36
سفر جنج — فرحت پروین — 39
محبت ایک سفر ہے — ڈاکٹر شیخ محمد اقبال — 43
عین آشام۔ ایک خوفناک کہانی — احمد علی — 49
شفق کے رنگوں کی دھنک — شمسہ ریاض — 51
تھیسس پی تجربے — محمد اسلم — 56
مرچ اسپرے Pepper Spray — شائستہ مفتی — 59
وہ رات — نگہت ایران — 61
ڈو — نگار ایمن خان — 67
فنکار سے نکاح — پروفیسر عاصم بخاری — 68

غزلیں

اسلم انصاری، تسنیم کوثر، سحر انصاری، آصف ثاقب، خالد اقبال یاسر، گلزار بخاری، مسلم شمیم، صفدر صدیق رضی، افتخار جاوید، ڈاکٹر ایوب ندیم، قمر رضا شہزاد، حسن عباسی، شاہین عباس، ڈاکٹر فرحت عباس، محمد سلیم ساگر، ڈاکٹر محمد رفیق، ضیاء الحسن خان، سرفراز تبسم، غلام حسین ساجد، شکیلہ سحر، احمد بخاری، آفتاب، واجد امیر، طاہر منظور، علیم احسان بٹ، ڈاکٹر شیخ اقبال، راحیل عباس، شفقت حسین شفق — 69 تا 77

سرائیکی گوشہ

ناول "بیگم" — بشریٰ رحمٰن — 78

سفرنامے

سفرنامہ تھائی لینڈ — ڈاکٹر محمد شفیق خان — 83
سفرنامہ ساحل اقبال — ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی — 88

انشائیہ

غلطیاں — ممتاز راشد لاہوری — 90

طنز و مزاح

کرسیاں بھی ہمراہ اٹھا کر چلے —— ڈاکٹر محسن مگھیانہ 92

قطعات —— ڈاکٹر بدر منیر 96

یادِ رفتگاں

چند یادیں چند باتیں —— پروفیسر قیصر نجفی 97

شوکت علی، ایک آواز جو خاموش ہو گئی —— علی رضا 100

ڈرتا تھا میں جدائی کو —— بشریٰ رحمٰن —— سونان اظہر جاوید 102

جائزے

ماہنامہ "تخلیق" کا شمارہ مارچ 2023ء ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم 107

راولپنڈی کی ادبی روایت —— ضیا اثر (2) 110

دبستانِ نعت کے نعت نگار، ایک جائزہ —— جمیل احمد عدیل 121

ڈاکٹر خرم الطاف کا شعری مجموعہ —— ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم 126

شہزاد نیر کی غزل اور نظم کا تجزیاتی مطالعہ مریم عباس خاور 129

پنجاب رنگ

ویکھ کی اے؟ —— محمد عباس مرزا 132

تبصرے نسیمِ سحر کے

آرٹس ہاؤس اور دوسرے افسانے —— اقبال خورشید 136
چاک کہانیاں —— محمود احمد قاضی
صحرا اگلتی ملتا —— انور زاہد علوی
ڈوہلیاں (پنجابی) —— محمد عباس مرزا
سفرِ شب (جلد اوّل) —— سید مبارک علی شمسی
دائرہ در دائرہ —— اقبال ندیم 144

انجمنِ خیال

محمد علی طارق، ڈاکٹر بدر منیر، ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی، اخلاق احمد، ... 145
شہزاد انور خان، تسنیم کوثر، صفدر رشید لاہوری، ایم اے ملک
ڈاکٹر محسن مگھیانہ، خاقان ساجد، محمد اسلم، انجم رضوی، محمد اقبال عصام 159

تخلیق کو موصول رسائل و کتب

ملکی اور غیر ملکی 160

بانی مدیر "تخلیق" 1969-2012

سرورق

حذیفہ سونان

طابع: سونان اظہر جاوید

مطبع: مکتبہ پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

دفتر "تخلیق"

H. No. L-12, Sheraz Villas, Phase-I,
Mian Chowk, Madina Colony, Walton Road,
Lahore -Cantt.
0321-8899007, 042-37107500
E-mail : ajavedtakhleeq@gmail.com

(ایڈیٹنگ کے حقوق محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی بات

احساس زندگی کی روح ہے۔ انفرادی و اجتماعی طور پر جب احساس ہماری شناخت ہے۔ احساس کی موت، انسانیت کا خاتمہ ہے۔ احساس مر جائے تو معاشرہ مر جاتا ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ اور عملی تجربہ ہے کہ 90 فیصد لوگوں کے اندر احساس کا جذبہ مر چکا ہے۔ ان میں بعض ایسے لوگوں سے پالا پڑتا ہے جو ہنس کر جواب دینا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ جب ان کو اخلاقیات کا درس دیا جائے تو ان میں احساس بیدار ہوتا ہے کہ بخیلی کسی چیز کا نام ہے۔ میرا ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ انسان اچانک نہیں بلکہ رفتہ رفتہ واقعات سے مرتا ہے۔ اس کا کوئی دوست چلا جاتا ہے تھوڑا مر جاتا ہے۔ جب کوئی پیارا رشتہ جدا ہوتا ہے تو تھوڑا اور مرتا ہے۔ جب خواہشات کا دم گھٹتا ہے تو مزید ختم ہو جاتا اور مر جاتا ہے اور آخر میں ان سب مرے ٹکڑوں کو یکجا کرنے سے موت آ جاتی ہے اور اجل تمام ٹکڑوں کو سمیٹ کر لے جاتی ہے۔ احساس کا رشتہ خون کے رشتوں پر ہمیشہ حاوی رہا ہے۔ کسی کے احساس کا تھوڑا سا جذبہ آپ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ آپ مدتوں اس کے زیر اثر رہتے ہیں۔ اسی طرح کسی کی بے حسی کا رویہ بھی اس انسان کی شخصیت کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ کسی انسان کی پہچان علم سے نہیں اس کی تربیت سے ہوتی ہے۔ میں بہت چاہنے والے محبت کرنے والوں کے احساس کے جذبے کے زیر اثر ہوں اور ان کے لیے ہر وقت دعا گو رہنا چاہتا ہوں مگر حقیقت تو یہ ہے ہم اخلاقی پستی کے گہرے سمندر میں ڈوب چکے ہیں۔ جب معاشرے میں بے حسی، بے یقینی اور ہر وقت دہشت گردی کی فضا گرد آلود ہو تو وہاں اخلاقیات کا درس دینا ناممکن ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے ملکی سطح پر ہر طرف مایوسی کی تحریریں لکھی جا رہی ہیں محسوس ہونے لگا ہے کہ کسی جنگل میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہر انسان ذہنی مریض بن گیا ہے۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے؟ کیسے فرق کو معلوم کیا جائے کیونکہ یہاں جھوٹ کو اتنی مہارت سے اور بار بار ڈھٹائی سے بولا جاتا ہے کہ وہ بھی سچ نظر آنے لگتا ہے۔ جھوٹ اور سچ کی تفریق کرنا صرف مجھ جیسے انسان کو ہی نہیں بہت سوں کی کیفیت ایسی ہے کہ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ ہر وقت لب پر دعا رہتی ہے کہ کسی طرف سے تو صحت افزا ہوا کا جھونکا آ جائے۔ ہمارے تمام ... سیاسی جوڑ توڑ میں دن رات مصروف ہیں۔ وفاق اور پنجاب کے تخت کی جنگ اور ایک دوسرے پر طاقت کی حیثیت ثابت کرنے کی دوڑ نے ملک کو جڑوں سے ہلا دیا ہے اور رہی سہی کسر کرپشن اور لوٹ کھسوٹ نے پوری کر دی ہے۔ مجھے تو نعروں کا مطلب ہی کچھ نہیں آتا جس جس کا جو نعرہ ہے وہ اس کے برعکس عملی طور پر مظاہرہ کرتا ہے۔ آج بھی دماغ ماؤف ہے۔ آخر ان نعروں کا مقصد روٹی کپڑا اور مکان نعرہ تو نہیں ... پٹرول 46 روپے لیٹر ہوگا۔ آئی ایم ایف کا کشکول توڑ دیا جائے گا۔ ڈالر 100 روپے سے نیچے رہے گا۔ 300 ڈیم بنائے جائیں گے۔ ایک ارب درخت لگائیں گے۔ 200 ارب ڈالر کرپشن کا پیسہ باہر کے بینکوں میں ہے، جلد پاکستان میں واپس لا کر ... ختم ہو جائے گا۔ تھانہ کلچر تبدیل ہوگا۔ سمندر سے تیل نکال کر ملک کو تیل کی پیداوار میں خودکفیل کریں گے۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں پر کنٹرول ہوگا۔ پچاس لاکھ گھر بنیں گے۔ گورنر ہاؤس اور دوسری بڑی سرکاری عمارتوں کو یونیورسٹیوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ایک کروڑ نوکریوں کے مواقع پیدا کیے جائیں گے۔ ... آئی ایم ایف کا کشکول ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جائے گا۔ کشمیر آزاد ہوگا اور وہاں بسنے والے اپنی مرضی سے آزادی کا سانس لے سکیں گے۔ مطالعہ قرآن کو لازمی نصاب کا حصہ بنایا جائے گا۔ ریاست مدینہ کا نظام نافذ کیا جائے گا۔ عدالت عظمیٰ 1973ء کے آئین کے آرٹیکل 251 (1) کے تحت اردو زبان کو قومی زبان کا نفاذ عمل کرائے گی۔ یہ دبنگ دعوے صرف کھوکھلے نعرے ہی رہے۔ ہم حقیقت کا لبادہ کب اوڑھیں گے؟ کب ان سیاسی جوکروں اور اداکاروں کے بچھائے جال سے باہر نکل سکیں گے

تمام دنیا میں خود ساختہ تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ سیاست کے پرانے اتحادی کل کے دوست آج کے دشمن ہیں اور کل کے دشمن آج کے دوست۔ بین الاقوامی مفادات، ملکی پالیسیاں، ... اپنی اپنی بولی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر کوئی سیاسی بساط پر اس گھات میں ہے کہ کب کوئی اسے پوری قیمت ادا کرے اور وہ لوٹ کھسوٹ میں اپنا حصہ لے سکے۔ گزشتہ 75 سال سے قوم کو سنگین تجربوں کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے اور نتائج

ہمیشہ قوم کو دیتی محسوس ہوتے ہیں۔ کرسی اقتدار پر قابض ہونے والا جانے والے کو غدار اور خود کو فرشتہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ ہر نیا چہرہ امید کی کرن دل میں پیدا کرتا ہے اور ہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ مصائب میں الجھا ہوا انسان آج بھی کسی مسیحا کے انتظار میں ہے کہ شاید آنے والی سحر کی کرن روشن مستقبل دیکھ سکے۔

پرانے اور نئے پاکستان سے ہمارا پاکستان تک کا سفر طے کرتے کرتے پاؤں پر چھالے پڑ گئے ہیں مگر مصائب کے پہاڑ ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ مجھے تو نیا پرانا اور ہمارا پاکستان کے نعرے سے اور سے تمام طبقہ فکر کے افراد اور گدھ میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔ گدھ ایک مردار گوشت کھانے والا پرندہ ہے اس کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوتی وہ بار بار کھانے کا عمل دہراتا ہے مگر حرص ختم نہیں ہوتی۔ یہی بھوک دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹنے والے افراد کی ہے جن کے ہاتھ میں ہمارا ملک کا مستقبل ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ایک خوبصورت ملک ہمیں گدھ کی فطرت کی صورت میں نہیں دیا۔ کیونکہ یہ قدرت نے ان لوگوں کو جتنا لوٹنے کا اختیار دیا وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر بھی انہیں سیری کی لذت سے ہمیشہ محروم رکھا۔ حرام مال تمہارے لیے ایک ساعت کے سوا کچھ نہیں اور پانچ فٹ قبر کی مٹی ہی شاید تمہارا پیٹ بھر سکے۔ انسان موت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے مگر جہنم سے بچنے کی نہیں۔ کیا کبھی ان دنیاوی خداؤں نے اپنی اوقات کا وزن معلوم کرنے کی تحقیق کی؟ امریکہ کے ایک ڈاکٹر ابراہم نے انسانی روح کا وزن معلوم کرنے کے لئے سینکڑوں تجربات کرنے کے بعد ایک حیران کن اعلان کیا۔ پانچ سال کی شب و روز کی محنت کے بعد اس نے 1200 تجربات کیے اور پھر اس نے اعلان عظیم کیا جس کا ہر کوئی منتظر تھا کہ انسانی روح کا وزن صرف 21 گرام ہے۔ یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری خواہشات دل میں رکھنے کا وزن کتنے گرام ہوتا ہوگا ہم تو شاید خود کو کھربوں ان وزنی کائنات کا خدا سمجھتے ہیں۔ غرور تکبر، دولت، شیر انا بھری ہی چوٹی، سازش، بچے کا غرور، تکبر، اخلاقیات کا قتل ان سب چیزوں کا وزن بھی دل و دماغ میں ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ فقط 21 گرام ہماری اوقات ہے؟ شاید وزن میں لاکھوں سے بچنے کے لئے ایک لمحہ ایک پیار، سچی ایک خوشی، بیٹا ٹکڑا ہمیں کے وزن کے برابر ہماری حیثیت ہے اس لائق دیا ہمیں کہ ہم نے 75 سال میں بہت کچھ بیچا بھی ہے۔ ایمانداروں کی فہرست میں ہم 140 نمبر پر مولویوں، مجلسوں اور دعاؤں کی تعداد میں دوسرے نمبر پر ہے 2000 سے اب تک کے ملک کے علاقے میں جیتا آپریشن اور اس میں داعش کا طوق اور حکومت کی رٹ کی دھاک کا تعفن بچے سے اٹھاتے پھرتے ہیں۔ ورلڈ بینک میں پاکستانی عوام کی ذاتی ضرورت پوری ہو جانے کا عظیم کارنامہ بیٹھے کا اعزاز ہمارے پاس ہے۔ 5000 ہزار کے نوٹ چھاپ کر کرنسی میں سونا نہیں اور 75 روپے کا نوٹ چھاپ کر عوام کے لئے پریشانی بیچنے کا رواج بھی دنیا کے ریکارڈ میں ہیں اور 75 کے ملک کو پاکستان میں بھی کوئی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ کامیابیوں کی فہرست طویل ہے سوچتا ہوا شرما جاتا ہے۔ جس معاشرے میں تعلیم یافتہ لوگ بے روزگار ہیں اور جاہل لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں وہاں ایسے کارنامے چھوٹی چیز تصور کی جاتی ہے۔ میں نا امید یا شکوہ نہیں مایوسی گناہ ہے۔ مگر دعاؤں سے صرف کام نہیں چلتا ہماری قوم صرف دعاؤں اور معجزوں کے انتظار میں آس و امید کا دیا جلائے اور اپنی زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں۔ مجھے یہاں بھی اسرائیل کے پہلے وزیراعظم کا ایک تاریخی جملہ یاد آ گیا۔ وزیراعظم بن گوریان نے اپنی بیٹی سے کہا اگر صرف دعاؤں سے کام ہوتا تو تمام عرب اور مسلمان جو کہتے ہیں کہ اجتماع میں جو ہر سال اسرائیل کی تباہی کی دعا مانگتے ہیں مگر تمام مسلمان چونکہ عمل سے عاری ہیں تو نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ عرب اور پوری دنیا کی مسلم امہ کس حال میں ہے؟ اور خود انتہائی یہودی ریاست دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ آج عمل کے بجائے صرف دعاؤں، التجاؤں اور معجزوں کا انتظار ہی ہمارا مقدر ہے تو ہمیں خود کو بدلنے کے لئے عملی ثبوت دینا پڑے گا اسی صدق اور ہمت دوسری جنگیں اور نہ ہی آپریشن، ضرب عضب، رد الفساد اور نجات اور ایک خطرہ جیسے عملی قدم اٹھانے پڑتے۔ یا اللہ 75 سال سے ہم کسی مسیحا کے انتظار میں ہیں کوئی تو نجات دہندہ بھیج دے جو ہماری قوم کو پار لگا سکے۔ اللہ نہ کرے کہ حالات اس قدر خراب ہو جائیں کہ ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں اور دنیا کے سامنے تماشا بن جائیں۔ وقت کس رخ کروٹ بدلتا ہے آپ اور میں صرف اپنے حصے کی محنت کر سکتے ہیں مگر ہمیں بھی حقیقی آزادی کے لیے عملی ثبوت دینا ہوگا صرف دعاؤں سے کام نہیں چلے گا۔

رب راکھا!

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

حمد و نعت

حمد

فرحِ زدہ گردشِ ایام کو کر دیتا ہے
شب دیجور کو وہ رنگِ سحر دیتا ہے

قربتِ لفظ و معانی کا بھرم ہو کے
اک سخنور کو وہ زرخیزیٔ سر دیتا ہے

حسن کو جلوہ کشائی کا ہے جوہر بخشا
عشق کو دل کے دھڑکنے کی خبر دیتا ہے

جو کہ خوش رنگ بہاروں کو بھی شرما جائیں
شوخ تتلی کو عجب رنگ کے پر دیتا ہے

احتیاجات کو کیا فکرِ کفالت ہے
ایک مٹھی کو جو افلاس سے بھر دیتا ہے

سجدۂ شکر بجا لانے کو حاضر ہے ریاض
ہے یقیں عجز کو وہ کوئی اثر دیتا ہے

سیّد ریاض حسین زیدی

OOO

حمد

میرے چار سو اندھیرا گھور سائیں
ہوائیں ہو گئیں منہ زور سائیں

زمانہ مجھ پہ حاوی ہو رہا ہے
مری ہستی بڑی کمزور سائیں

بنے تو جیسا چاہے دنیا کر دے
تیرے ہاتھوں میں سب کی ڈور سائیں

بچا لے اب تو سوئے جنت میرے
اٹھے دل سے یہ ہر پل شور سائیں

تو ہی حاجت روا مشکل کشا ہے
میں عاجز اور تو شہ زور سائیں

مرادیں دل کی پوری ہوں اگر تو
میرے من کا بھی ناچے مور سائیں

تیری نظرِ کرم کی ملتجی ہوں
کرم کی کر گھٹا گھنگھور سائیں

تسنیم کوثر

OOO

نعت

دل میں اک عمر سے برپا ہے جو ہنگامۂ نعت
لب پہ ہے صلِ علیٰ ہاتھ میں ہے خامۂ نعت

میں تو کرتا ہوں فقط سیرتِ سرکار کا ذکر
اور الفاظ بدن لیتے ہیں تو جامۂ نعت

اس قدر مختصر و سہل نہ جانو اس کو
بے کراں بحر ہے گویا نہیں پیمانۂ نعت

حرف اوقات تو بہت کچھ ہے لکھوں یا نہ لکھوں
اک طرف خامہ تو اک طرف نامۂ نعت

نامہ بر میرے درودوں کے ملائک ہیں رضی
اک خداؤں سے نہ بھجواؤں گا میں نامۂ نعت

صفدر صدیق رضی

OOO

مضامین

فقیری کلچر

ڈاکٹر مبارک علی

درباری کلچر کے ردعمل کے طور پر برصغیر ہندوستان میں فقیری کلچر پیدا ہوا۔ یہ درباری کلچر کے خلاف ایک احتجاج تھا کیونکہ یہ حکمرانوں اور امراء کے محلات امارت کا ہیں، مقبرے، باغات ان کا رہن سہن، لباس فاخرہ، لذیذ غذائیں، ہیرے جواہرات اور سونے کے زیورات سے خود کو آراستہ کرنا، اپنے حرم میں خوبصورت عورتیں جمع کرنا، جلسے اور جلوس کے ذریعے اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا اور فیاضی اور سخاوت کے ذریعے غریبوں کو خیرات دے کر انہیں احسان مند بنانا۔ اس کے علاوہ جنگ و جدال کے ذریعے دوسرے ملکوں اور شہروں پر قبضے کرنا، لوگوں کا قتل عام کرنا یا مال غنیمت لوٹنا اور سزاؤں کے ذریعے اپنے جبر اور ظلم کا اظہار کرنا۔ فقیرانہ کلچر ان سب علامات سے منحرف تھا۔ نہ ان کے پاس محل، جاگیر اور نہ مال و دولت کا ذخیرہ۔ وہ بنیادی مسائل سے آزاد تھے۔ ان کی اپنی دنیا تھی، جس میں سادگی اور قناعت تھی۔ اسی کلچر سے انہیں خوشی اور مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اپنی زندگی میں وہ کسی کے وفادار اور تابع نہیں ہوتے تھے۔

فقیرانہ کلچر کی تشکیل میں کردار فقراء، ملنگ، قلندر، درویش شامل تھے۔ اس ضمن میں ہم بھانڈوں اور مراثیوں کا بھی ذکر کریں گے جو اس کلچر کی پیداوار تھے۔ لیکن سب سے پہلے ہم فرہنگ آصفیہ میں دیے جانے والے معنوں کی وضاحت کریں گے۔ مثلاً گداگروں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ بھیک اور خیرات طلب کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ فقیروں کے بارے میں فرہنگ کہتی ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز نہیں رکھتے ہیں۔ قلندروں کا تعلق اس گروہ سے ہے جو دنیاوی معاملات سے دور ہوتے ہیں اور طالب حق ہوتے ہیں۔ ملنگوں کا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو بے خود اور مدہوش ہوتے ہیں اور درویشوں کے حصے میں مسکینیت اور غربت آتی ہے۔ لیکن ان کے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ یہ ملکوں کی سیاحت بھی کرتے ہیں۔ ملامتی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے عیب نہیں چھپاتے اور اپنے ہنر نہیں دکھاتے۔ بھانڈوں کا تعلق اس گروہ سے ہے جو بادشاہوں اور حکمرانوں کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ جیسے Tod نے "Annales of Rajastan" میں حکمرانوں کی تاریخ کا مواد بھانڈوں کی بیان کردہ تاریخ سے لیا ہے۔ مراثیوں کا تعلق اس گروہ سے ہے جو امراء اور حکمرانوں کی محفلوں میں لطیفے اور مزاحیہ قصے سنا کر انہیں محظوظ کرتے تھے۔ یہ بڑے حاضر جواب ہوتے تھے لیکن ان کے مذاق کو حکمران اور امراء برداشت کرتے تھے اور انہیں انعام و اکرام دیا کرتے تھے۔

تاریخ میں چونکہ معاشرہ طبقاتی رہا ہے، لہٰذا امیر و غریب کے فرق کی وجہ سے نچلے طبقے کے بعض گروہ اس قدر غربت کا شکار ہو جاتے تھے کہ وہ اپنی روزمرہ کی گزر اوقات کے لیے بھیک اور خیرات پر گزارا کرتے تھے۔ لیکن فقراء کی یہ جماعت منظم بھی ہوتی تھی اور اپنے گروہ میں رہتے ہوئے اس کے اصول اور قوانین کی پابندی کرتی تھی۔ مشہور رومی فلسفی سینیکا (d.AD65) لکھتا ہے کہ شہر روم میں فقیروں

کی منظم جماعت تھی، جو بھیک مانگ کر اپنا گزارا کرتی تھی۔ DickensCharles (d.1870) اپنے ناولوں میں فقیروں کی اس تنظیم کے بارے میں لکھتا ہے جو شہر لندن میں رہتے ہوئے بھیک کے ذریعے گزر اوقات کرتے تھے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "White Trash" کی مصنف IsenbergNancy نے لکھا ہے کہ لندن میں 17 ویں صدی میں فقیروں کی اس قدر تعداد ہو گئی تھی کہ امراء کا طبقہ ان سے عاجز ہو گیا تھا، کیونکہ جب بھی وہ باہر نکلتے تھے، ان کے ارد گرد مانگنے والے جمع ہو جاتے تھے۔ ان لوگوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ انہیں جہازوں میں بھر کر امریکہ بھیج دیا جائے تا کہ لندن ان مانگنے والوں سے پاک صاف ہو جائے۔

برصغیر ہندوستان میں فقرا تقریباً ہر شہر میں موجود ہوتے تھے لیکن ان کے بھیک مانگنے کا طریقہ کار یہ تھا کہ یہ گیت اور شاعروں کی غزلیں گلی گلی گاتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ خوشی خوشی انہیں دے دیا کرتے تھے۔ فقیروں کی اپنی آزادی اس واقعے سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب فرخ سیر کا قتل ہوا اور اس کا تابوت تدفین کے لئے 1719ء میں ہمایوں کے مقبرے کی طرف چلا تو اس کے جنازے میں دہلی کے فقراء شامل ہوئے، کیونکہ اسے قتل کیا گیا تھا اس لئے ان کا اس پر احتجاج تھا۔ وہ روتے پیٹتے ماتم کرتے جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے۔ وہ امراء جو اس جنازے میں شریک تھے، انہوں نے ان فقیروں کو خیرات دینا چاہی، مگر انہوں نے خیرات لینے سے انکار کر دیا۔ مولوی ذکاء اللہ نے اپنی کتاب سلطنت مغلیہ کے زوال میں لکھا ہے کہ دوسرے دن فقراء کی یہ جماعتیں اس چبوترے پر جمع ہوئیں جہاں فرخ سیر کی لاش کو غسل دیا گیا تھا اور وہاں کھانا پکا کر فاتحہ کا انتظام کیا اور رات بھر میلاد شریف کی محفل جاری رہی۔

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقراء کی یہ جماعتیں امراء کی ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتی تھیں اور اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے عوام میں اس کا اظہار بھی کرتی تھیں۔ فقراء کی جماعتیں زندگی گزارنے کے مختلف طریقوں پر عمل کرتی تھیں۔ ایک جماعت وہ تھی جو اولیاء اور صوفیا کے مزاروں پر مستقل رہائش رکھتی تھی۔ دنیا کے مسائل سے دور رہنے کا علاج جو انہوں نے دریافت کیا تھا وہ بھنگ اور چرس کا نشہ تھا۔ بھنگ کو بڑے شوق اور دلچسپی سے گھوٹا جاتا تھا اور پھر سب مل کر اسے پیتے تھے اور دنیا سے بے خود اور مدہوش ہو جاتے تھے۔ مزاروں پر لوگ ان فقیروں کے لئے دیگیں پکوا کر لاتے تھے، لہٰذا ان کے دن رات زیارت کے لئے آنے والوں میں گزرتے تھے۔ عرس کے موقع پر یہ گانے بھی گاتے تھے اور دھمال بھی ڈالا کرتے تھے۔ قوالیوں کے دوران ان پر وجد بھی طاری ہو جاتا تھا۔ فقیروں کی دوسری جماعتیں کوئی مستقل رہائش نہیں رکھتی تھیں۔ یہ در بدر پھرتے تھے اور عام لوگ ثواب کے لئے انہیں کھانا کھلا کر ان کی دعاؤں کے منتظر رہتے تھے۔ نشہ ایک ایسی طاقتور چیز تھی جو ان کی ذات کو مطمئن کرتی تھی۔ یہاں ہم چنڈو خانے کا ذکر بھی کریں گے۔ جہاں چلم اور حقے کے ذریعے افیون پی جاتی تھی۔ مگر یہاں ایسے غریب نشئی ہوتے تھے۔ جو افیون کی مصنوعی قیمت بھی ادا نہیں کر سکتے تھے تو وہ چنڈو خانے کے دروازے پر کھڑے ہو کر افیون پی کر دھواں چھوڑنے والوں کے دھوئیں سے نشہ پورا کرتے تھے۔ وہ چھو لینے مفتی (مفت میں نشہ پورا کرنے والے) کہلاتے تھے۔ چنڈو خانہ اپنی گپ شپ اور افواہوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر قبضہ کیا تو چنڈو خانے سے ہی کسی نے یہ افواہ اڑائی کہ مغل شہنشاہ محمد شاہ رنگیلا نے نادر شاہ کو قتل کرا دیا ہے۔ اس افواہ پر یقین کرتے ہوئے دہلی کے لوگوں نے نادر شاہ کی فوج پر حملہ کر دیا۔ جس میں اس کے فوجی مارے گئے۔ اس پر نادر شاہ کو غصہ آیا اور اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ دہلی کے شہریوں کا قتل عام کریں اور ان کے گھروں کو لوٹیں۔ چنڈو خانے کی اس اطلاع نے ہزاروں شہریوں کی جانیں لے لیں۔

جس طرح سے فقیروں کا کلچر درباری کلچر کے خلاف ابھرا تھا اسی طرح سے ملامتی فرقے کا کلچر صوفیا اور ان کے خانقاہ کے کلچر کے خلاف پیدا ہوا۔ جب صوفیا کے تعلقات حکمرانوں اور امراء سے بڑھے تو اس کا ردعمل ملامتی فرقے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس فرقے کے لوگ کھلے عام مذہبی، سماجی اور صوفیانہ رسومات کے خلاف عمل کرتے تھے اور جب ان کو ملامت کی جاتی تھی تو اسے وہ اپنی ذات کے لئے فائدہ مند سمجھتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ مذہبی منافقت کا پردہ چاک کرتے تھے۔ اس کی مثال ایک عیسائی فرقے کی ہے جس کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک انسان گناہوں میں مبتلا نہیں ہوگا۔ وہ گناہ کی اذیت سے واقف بھی نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ لوگ پہلے گناہ آلود زندگی گزارتے تھے اور پھر عبادت کی طرف جاتے تھے اور اس خیال کے حامی تھے کہ گناہ کے راستے سے گزر کر اگر عبادت کی جائے تو اس میں خلوص اور سچائی آ جاتی ہے۔ فقیروں اور ملامتیوں کے اس کلچر میں معاشرے کی اصلاح کا کوئی نظریہ نہیں تھا نہ ہی انہیں لوگوں کے سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے کوئی واسطہ تھا۔ یہ دنیاوی معاملات سے کٹ کر اپنی ذات کے سکون کے لئے اپنی دنیا میں رہتے تھے۔ لیکن عام لوگوں کی اکثریت انہیں پہنچا ہوا یا روحانی طاقت کی علامت سمجھتی تھی اور ان کی خدمت کو باعث ثواب سمجھتی تھی۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس کلچر نے نہ تو مذہبی منافقت کو ختم کیا اور نہ ہی معاشرے کی کوئی اصلاح کی۔

اب یہاں ہم یورپ میں پیدا ہونے والے فقیرانہ کلچر کا مختصراً ذکر کریں گے۔ اس کی ابتداء ہم گیارھویں صدی میں ابھرنے والے اس گروہ سے منسوب کریں گے جو شہر شہر اور گلی گلی عشقیہ واقعات کو گانوں کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ یہ گروہ Troubadours (ٹروبا دور) کہلاتا تھا۔ یہ سپاہیوں یعنی نائٹس کی بہادری اور شجاعت پر گیت لکھتے تھے اور پھر اس کی موسیقی بھی خود ہی کمپوز کرتے تھے۔ ان کے گیتوں کی وجہ سے یورپی معاشرے میں رومانی شعور پیدا ہوا۔ لیکن یہ شعور بالادست طبقوں کے لئے تھا لیکن عوام کے جذبات ان سے متاثر ہوتے تھے۔ اس کے برعکس چند ایسے مذہبی فرقے پیدا ہوئے جنہوں نے دنیا کو ترک کر کے غربت کو اختیار کیا اور عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ ان فرقوں میں ایک فرقہ فرانسسکن کا تھا جو ابتدائی تیرہویں صدی میں وجود میں آیا جس کا بانی Saint Francis of Assisi (d.1226) تھا۔ اگرچہ اس کا تعلق ایک مالدار خاندان سے تھا لیکن جب اس میں مذہبی جذبہ پیدا ہوا تو ایک دن اس نے چرچ میں اپنا پرانا لباس اتار کر فقیرانہ لباس پہن لیا۔ اس فرقے کے پیروکاروں نے غربت اور مفلسی کو اختیار کرتے ہوئے عام لوگوں کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ نہ صرف لوگوں میں انہوں نے اپنے خلوص اور مذہبی جذبے کے ساتھ عوام کی اصلاح کے لئے کام کئے، یہ بھی ان کا ایک ردعمل تھا کیونکہ اس وقت چرچ اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے بہت بدنام ہو چکا تھا۔ اس لئے اپنی خدمات کے ذریعے یہ لوگوں میں عیسائی مذہب کی تعلیمات کا رواج دینا چاہتے تھے۔ جب یہ بطور مشنری ایشیا اور یورپ کے ملکوں میں گئے تو وہاں انہوں نے تعلیم کے لئے سکول کھولے، عوام کی صحت کے لئے ہسپتال قائم کئے، تاکہ لوگ ان کے کردار سے متاثر ہو کر عیسائیت کو قبول کر لیں۔ فرانسسکن فرقے کے علاوہ اور بھی بہت سے فرقے قائم ہوئے جنہوں نے مذہبی اور اصلاحی سرگرمیوں کے لئے غریب لوگوں کی خدمت کی۔

وقت کے ساتھ کلچر بھی بدلتا رہا ہے۔ درباری کلچر ہو یا فقیرانہ یہ سب تو تاریخ کا حصہ بن گئے۔ لیکن درباری کلچر کی رسومات اور ادب آداب اب بھی موجود ہیں۔ فقیرانہ کلچر بھی موجود ہے۔ لیکن اب وقت کے ساتھ اس کی شکل بدل گئی ہے۔

◆◆◆

ہزارہ میں جدت آہنگ ہزارہ رنگ

آصف ثاقب

ہزارہ غزل کے متنوع اسلوب کا گہوارہ ہے۔ غزل میں یہاں کے کئی شاعروں نے تغزل آشنائی کے گونا گوں پیرائے استوار کیے ہیں جن میں نسیم عباسی کو مثالاً لیا جا رہا ہے۔ نسیم عباسی نے "از خود رفتہ" اسلوب کا انچھوتا اور دل فریب پیرایہ قائم کر رکھا ہے۔ اس قبیل کا ادعا بہت کم دیکھنے میں آتا۔

وزن گھٹ جاتا ہے چیزوں کا یہاں   اس بلندی پہ مجھے تولا گیا

یہ تغزل کا منفرد نقش ہے جو نسیم عباسی کے خوش رنگ تخیل کا "چارہ کار" ٹھہرا ہے۔ نسیم عباسی کے غزلیہ شعری اطوار کا مشہود ترین عکس دوسری جگہ شکیب جلالی کے ہاں آئینہ بند نظر آتا ہے۔ شکیب جلالی کا شعر ہے۔

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے   جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

یہ شکیب جلالی کے نصیب کہ انہیں مقبولیت کے باب میں بے اطمینانی کا سامنا نہیں ہوا۔ بلکہ ان کے غزلیہ قرینے بیشتر شعرا کے ہاں بھی راہ پاتے ہیں۔ شکیب جلالی کا یہ شعر جدید اظہاری آہنگ کی بہترین مثال ہے۔

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر   تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

ہزارے کے نسیم عباسی اپنے باکمال اور پیرایۂ تغزل کے ہوتے ہوئے اتنے مقبول نہیں ہو سکے جتنا کہ ان کا استحقاق ہے۔ تاہم "تنقیدی گریز" کے سبب سے وہ کسی نہ کسی وقت مرکزِ توجہ ہو سکتے ہیں۔ شکیب جلالی کو جو اسباب میسر تھے وہ نسیم عباسی کو کوئی اوقات حاصل نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نسیم عباسی کی غزل کو بہ اہتمام خاص مطالعے میں لایا جائے اور اس کی خصوصیات، انفرادی نظم، مشاہدات اور بیانیے کو تجدیدی شعور کی تحسین سے نظر افروز کیا جائے۔ نسیم عباسی کے یہ شعر دیکھیے۔

ہم لوگ ہیں سلیٹ پہ لکھے ہوئے نسیم   مٹنا پڑے گا اگلے سوالات کے لیے
ہر سمت اس نے آتشی شعلے لگا دیے   سڑکوں پہ لوگ آ گئے تھے کالے لباس میں

ذرا مختلف پیرائے میں اسی جذباتی استحصال پر شکیب جلالی بھی ہیں، جس کو ندرتِ غزل کا درجہ حاصل ہے۔ شکیب کہتے ہیں

رہتے ہیں کچھ ملول سے چہرے پڑوس میں   اتنا نہ تیز کیجیے ڈھولک کی تھاپ کو
کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئیں   وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

یہ شعر "نظریں جمی ہوئیں" شکیب نے مرنے سے پہلے ایک ہوٹل کے اخبار پر لکھا تھا۔ اب یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شکیب جلالی اور نسیم عباسی کے جذباتی پس منظر میں یکساں حسیت انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ شکیب رخصت ہو گئے پر ناموری کے ساتھ۔ نسیم موجود ہیں مگر دل تنگی کے ساتھ۔ یہ دل تنگی ان کو کہاں تک لے جائے گی۔ یہ اللہ جانے۔ نسیم عباسی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

بچپن میں آسمان کو چھونے کا شوق تھا   جب قد بڑھا تو پیار زمینوں سے ہو گیا

شکیب اور نسیم کی یکسانی کا دھارا ایک ہے جو دو راستوں پہ چلا جاتا ہے۔

◆◆◆

''پھر'' کی معنی آفرینی

پروفیسر غازی علم الدین

راقم السطور جنوری 2022ء میں سرطان (Cancer) کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ چار ماہ تک، چارہ گروں سے اس موذی مرض کی تشخیص نہ ہو سکی۔ مرض بڑھتا گیا اور نوں دوا کی نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ چلنا پھرنا اور اٹھنا بیٹھنا موقوف ہو گیا۔ آواز میں اس قدر نقاہت اور پستی آگئی کہ فون پر بات کرتے ہوئے اپنے بھی مشکل سے پہچان پاتے۔ شفا انٹرنیشنل ہسپتال اسلام آباد میں میرے مرض کی تشخیص ہوئی تو پتا چلا کہ پانچ ماہ پہلے سے سرطان لاحق ہو چکا ہے۔ کیمیائی علاج (Chemotherapy) کے اثرات اکثر مجھے شدید تکلیف اور استغراقی کیفیت میں پہنچا دیتے۔ استغراقی کیفیت ہی میں ایک دن لفظ ''پھر'' میری نظروں کے سامنے گھوم گیا اور اس کے استعمال کی معنوی پرتیں اور جہتیں مجھ پہ کھلتی چلی گئیں۔ متعلقہ کئی شعر اور نثر پارے ذہن میں اور نظر کے سامنے منڈلانے لگے۔ اس سے راقم کو تحریک ملی کہ جب بھی استعداد نصیب ہو ''پھر'' کی معنی خیزی پر ایک تحقیقی مضمون لکھا جائے۔

اپنی متنوع لسانی خصوصیات اور الفاظ کی معنوی وسعت کے ساتھ اردو زبان زندہ اور متحرک نظر آتی ہے۔ بعض الفاظ جہاں معانی رکھتے ہیں جنھیں مختلف زاویوں اور جہتوں سے دیکھا اور پرکھا جائے تو رنگا رنگ معانی اور مفاہیم کا تنوع نظر آتا ہے۔ الفاظ، جو معنوی تنوع اور لطافت و نزاکت کا خزانہ ہوتے ہیں، نباتات و حیوانات کی طرح ہی نشوونما پاتے ہیں۔ پھولتے پھلتے ہیں اور گروہ خاندانی بناتے ہیں۔ نثر اور شعری لوازم میں مفہوم کے مطابق برمحل اور برجستہ الفاظ کا بہتر انتخاب بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی انتخاب پر شعری خوش آہنگی اور اثر آفرینی کی تعمیر ہوتی ہے۔ علامہ ابن خلدون نے الفاظ کو ''پیالہ'' اور مفہوم کو ''پانی'' قرار دیا ہے۔ پانی سونے کے کٹورے میں ہو یا مٹی کے پیالے میں، پانی تو وہی رہے گا لیکن جہاں تک انسانی رغبت کا تعلق ہے تو وہ جام سفال کے مقابلے میں جام زریں کی طرف زیادہ ہوگی۔ اس لیے الفاظ کا بہتر انتخاب بلاشبہ زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس تناظر میں اردو شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ الفاظ کے رنگا رنگ گلزار میں لفظ ''پھر'' کے معنوی تحیر کی بہت جہتیں ہیں۔ ہمارے اردو شعرا نے لفظ ''پھر'' کو مختلف انداز سے برت کر صوت و معنی کا پایا حسن عطا کیا ہے۔ لفظ ''پھر'' (جو اپنی معنوی حیثیت میں تابع فعل، متعلق فعل اور حرف عطف ہے) بظاہر اسم اور فعل سے ربط رکھے بغیر اپنا کوئی معنی اور مفہوم نہیں رکھتا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ اپنے باطن میں دھنک رنگ معنوی جہتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ شعر اور نثر پارے میں اس کا زاویہ تحیر، معنوی رنگ اور مفہوم بدل دیتا ہے۔ جو لوگ ''پھر'' کی معنوی پرتوں اور اس کے نحوی استعمال سے کما حقہ شناسا نہیں ہیں، تفہیم شعر میں الجھن کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس میدان میں مبتدی اور ادیب، دونوں ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں ''پھر'' کے صرفی و نحوی معمولات کی کئی جہتیں ہیں اور ہر جہت سے اس کے معنوی ابعاد وابستہ ہیں۔ گویا جملے یا شعری نحوی ترکیب میں مختلف انداز سے استعمال ہونے والے ''پھر'' کے مختلف معنی ہو سکتے ہیں لیکن ان مختلف الجہات معنوں میں تمیز

کرنے کا کوئی مستقل اصول اردو قواعد میں دکھائی نہیں دیتا۔ ہو سکتا ہے کہ قواعد نویسوں اور محققین نے "پھر" پر توجہ دی ہو لیکن اس نوع کا کام ابھی تک راقم کی نظروں سے نہیں گزرا۔ آیئے! "پھر" کے مفہوم اور اس کے استعمال کی جادوگری پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کی معنی داری پر غور و خوض کرتے ہیں:

قواعد کی رو سے "پھر" کیا ہے؟ مولوی سید احمد دہلوی (1) اور خواجہ عبدالمجید (2) کے مطابق یہ تابع فعل ہے۔ حضرت نسیم امروہوی (3) اسے حرفِ عطف کہتے ہیں جب کہ محمد اسحاق جلال پوری (4) اور وارث سرہندی (5) اسے متعلق فعل لکھتے ہیں۔ "پھر" پھرنا مصدر سے فعل امر کا صیغہ واحد حاضر بھی ہے۔ "پھر" کے معنوی تنوع کا احصا کیا جائے تو درج ذیل معانی ہمارے سامنے آتے ہیں:

1۔ دوبارہ—ایک دفعہ اور—مکرر 2۔ مزید برآں—اور 3۔ بعدازاں—بعدازیں—اس کے بعد
4۔ پس ازیں—پس ازاں 5۔ ضرور 6۔ آگے 7۔ جب—تو
8۔ تاہم 9۔ باوجود اس کے 10۔ ہرگز 11۔ مگر—لیکن
12۔ اس وقت—اس دم 13۔ اس صورت میں 14۔ از سرِ نو 15۔ حالت کا بدستور رہنا
16۔ ترتیب کا پایا جانا 17۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں 18۔ آخر کار (Ultimately)
19۔ گھوم جا—گردش میں آ—منحرف ہو جا۔ ("پھرنا" مصدر سے فعل امر کا صیغہ واحد حاضر)

"پھر" سے کئی ضرب الامثال اور محاورے بھی تشکیل پاتے ہیں جن سے اس کی معنوی وسعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ راقم السطور نے اپنی بساط اور استعداد کے بموجب نثری اور شعری مثالوں سے "پھر" کی معنوی جہتیں دیکھیں اور انہیں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشعار کی تشریح مقالے کے موضوع میں شامل نہیں ہے۔ "پھر" کی معنی آفرینی ملاحظہ ہو: پھر: دوبارہ—ایک دفعہ اور—مکرر

تم کل ایک ہزار روپے لے گئے تھے، آج پھر تقاضا ہے۔ اب تمہیں معاف کرتا ہوں، پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو — دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو (اقبال)

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا — کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا (میر تقی میر)

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا (غالب)

پھر: اس کے بعد—بعد میں

1۔ دو دن کی چاندنی پھر اندھیاری رات۔ 2۔ شہزادہ کوہ قاف پر جا پہنچا، پھر کیا ہوا؟
3۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہوا، پھر ہم گھر چلے گئے۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا (میر تقی میر)

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے — سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا (اقبال)

پھر : تو اب۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں

تحقیق نہیں ہے یہ کہ شوق، ہم تھکیں! — پھر اور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی (اقبال)

پھر : ضرور

کرے مجھ سے ہر چند وہ بھولی باتیں — مگر پھر کہوں گا کہ قاتل بھی ہے (داغ)

پھر : اب

زاہدو! دریائے مے سے پھر کنارا کس لیے — شک نجاست کا اگر آبِ رواں رکھتا نہیں (صبا)

پھر : ایسی صورت میں

وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آشامی نہیں — فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے (اقبال)

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں — غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام (غالب)

تری نگاہِ کرم ہے تو پھر کمی کیا ہے — ترے نثار مجھے فکرِ زندگی کیا ہے (نامعلوم)

پھر : مدام

اگرچہ تم ہو قریب تر دل سے — پھر بہت دور ہیں منزل سے (جلال)

پھر : مگر لیکن

مے واعظا حرام ہے پھر کیا کرے کوئی — کیوں کر تلافیِ غمِ دنیا کرے کوئی (انجم)

سب کی تو آرزوئیں پوری کیں — پھر ہمارا ہی دل رکھا نہ کبھو (حقیر)

پھر : اس وقت، اس دم

پھر رہے ہوں میری نظروں میں وہ جب — پھر کوئی دیکھے پریشانی مری (جلال)

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے (غالب)

پھر : ہرگز

وہ ایک ایک کی سو سو سنا گئے مجھ کو — کھلی زبان جو ان کی تو پھر نہ بند ہوئی (نوح)

پھر : اور مزید، دوبارہ

وعدہ نہ وفا کرتے پھر اس پہ یہ تاکیدیں — تا حشر ٹھہر جاؤ کیوں جان نکلتی ہے (داغ)

پھر : ترتیب کا پایا جانا — احمد آیا پھر حامد آیا۔ یعنی احمد پہلے آیا اس کے بعد حامد آیا۔

پھر : تعجب کے لیے — یہ کیا تو پھر مجھ سے ذرا کوئی نہیں۔

پھر : آگے — پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

پھر : پیچھے، واپس — (1) کمان سے نکلا ہوا تیر اور منہ سے نکلی ہوئی بات پھر نہیں آتی (2) گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

پھر : کے باعث، کی وجہ سے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ — پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے (غالبؔ)

(یعنی آمدِ فصلِ بہاری کے باعث شاعر کو سودائے غزل خوانی تازہ ہو گیا۔)

پھر : تو (حرفِ شرط)

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ — جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ (غالبؔ)

پھر : آخرکار (Ultimately)

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے (غالبؔ)

پھر : افسوس

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

پھر آنا : لوٹ آنا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو — چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا

پھر بھی : اس کے باوجود، ایسا کرنے کے باوصف، ایسا ہوتے ہوئے بھی

ہم نے تمھارے لیے اتنی قربانیاں دیں، پھر بھی شکوہ ہے کہ کچھ نہیں کیا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے (غالبؔ)

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں — ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں (اقبالؔ)

پھر بھی : استمرار اور تسلسل کے لیے۔ حالت کا بدستور رہنا

(1) وہ پھر بھی سوچتی کے سوچتی رہے۔ (مسلسل) یعنی کچھ ترقی نہیں کی۔ (2) اسے سرزنش کی گئی وہ پھر بھی وہ اپنی ڈگر پر چلتا رہا

پھر زندہ کیا : از سرِ نو حیات بخشی

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو؟ — کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟ (اقبالؔ)

پھر کبھی۔ کسی اور وقت

ہم کو کس کے غم نے مارا یہ کہانی پھر سہی — کس نے توڑا دل ہمارا یہ کہانی پھر سہی

غیروں سے تیر کھا کر دوستوں کے شہر میں — ہم نے کس کس کو پکارا یہ کہانی پھر سہی
کیا بتائیں پیار کی بازی وفا کی راہ میں — کون جیتا کون ہارا یہ کہانی پھر سہی (سرور انور)

پھر سے: از سر نو

تجھ سے بھی کم از کم تجھ اسیر نہیں — ہر بار ہر مقام پھر سے جواں ہوتا ہے (سحر)
رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ — آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ (احمد فراز)

پھر کہو: کہو، عجیب سے تو کیا ہوگا؟ دیکھو تو کیا ہوتا ہے؟

کرتے تو ہو سوال امیر اس سے حشر میں — اور اس کو گر جواب نہ آیا تو پھر کہو (امیر)

پھر کیا؟ : تو کیا ہوا؟

مذاق دید سے نا آشنا نظر ہے مری — تری نگاہ ہے فطرت کی راز داں، پھر کیا؟ (اقبال)

پھر کیا؟: تو کیا ہوا؟

مذاق دید سے نا آشنا نظر ہے مری — تری نگاہ ہے فطرت کی راز داں، پھر کیا؟

پھر مانگو : (محاورہ) آگے جاؤ

جب صاحب خانہ کو دینا منظور نہیں ہوتا تو کہتا ہے "پھر مانگو" یعنی پھر آنا- آگے جاؤ۔

خوش ہوتا تو کبھی جس کے نہ کہتا پھر مانگ — کیا ہوا اس سے جو سائل میں ہوا بوسے کا (ذوق)

جب مانگوں ہوں میں اس سے سائل کی طرح بوسہ — کہتا ہے مجھ سے ہنس کر پھر مانگو خدا دے دے (نجم)

پھر نہ کہنا : (محاورہ) الزام نہ دینا، شکوہ نہ کرنا

یہ وقت مناسب نہیں ہے پھر نہ کہنا کہ بتایا نہیں تھا۔

تو پھر : کیا ہوگا؟ کیا ہو جائے گا؟ (استفہامیہ انداز میں بے خوفی اور بے نیازی کا اظہار)

ایک شخص دوسرے سے مخاطب ہے: تمھیں اندازہ ہے کہ تم نے کتنا بڑا نقصان کر دیا؟ دوسرا شخص کہتا ہے: ''تو پھر'' یعنی کیا ہوا؟ - مجھے کیا پرواہ ہے؟

وہ طلب گار ہو گیا تو پھر — مجھ سے انکار ہو گیا تو پھر (زہرہ بخش)

پھر کیا چاہیے؟ (محاورہ) سب کچھ میسر ہے۔ اللہ کی مہربانی سے بڑی راحت ہے۔

پھر کون مرے کون جیے۔ (مثل) زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کام فوراً کر لینا چاہیے۔

1- اپنے بیٹے کی شادی کر دو پھر بھلا کون مرے کون جیے۔ 2- کاش میرے ارمان پورے ہو جائیں پھر کون مرے کون جیے۔

آج برس کے پھر نہ برسوں گا (مثل) جب بارش تھمنے میں نہ آئے تو کہتے ہیں- یعنی بارش ساری کسر آج نکالے گی۔

آج چل کے پھر نہ چلوں گی (مثل) جب ہوا بہت زور کی چل رہی ہو تو کہتے ہیں۔ یعنی آج ہوا تمام کسر پوری کر کے چھوڑے گی۔

اپنی تو ٹیڑھ لو پھر دوسرے کو کہنا (مثل) دوسروں کے عیب نکالنے سے پہلے اپنی حالت کو دیکھ لینا چاہیے۔ یعنی پہلے اپنے آپ کو درست کرو پھر دوسروں پر اعتراض کرو۔

پہلے اپنے پھر پرائے (مثل) صدقہ، خیرات اور مالی مدد اپنے مستحق رشتے داروں سے شروع کرنی چاہیے۔

پہلے بھتو، پھر دوجا چو (مثل) پہلے اپنے پیٹ کی فکر، پھر خیرات۔

پہلے بیوے بھکوا، پھر بیوے حلوا، پیچھے بیوے پیلم پات (مثل) کھلے پینے میں وہ شخص فائدے میں رہتا ہے جس کو درمیان (وسط میں) ملے۔ پہلا سلانے میں رہتا ہے اور آخری کے حصے میں جلا ہوا آتا ہے۔

پہلے تو ناک کاٹ لی پھر ریشم کے رومال سے پونچھنے لگے (مثل) پہلے ذلیل کرنا اور پھر معافی چاہنا۔

پہلے سوچ بچار، پھر کیجے کار (مثل) سوچ سمجھ کر کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیے۔

پہلے گھر میں، پھر مسجد میں (مثل) اپنوں سے بچے تو دوسروں کو دیا جائے۔

پہلے لکھ پیچھے دے، پھر بھولے تو کاغذ سے لے (مثل) لین دین میں لکھ لینے سے بھول چوک نہیں ہوتی۔

پہلے تولو پھر منہ سے بولو (مثل) بات کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے۔

روپیہ ٹوٹا اور ڈلی بکھری پھر نہیں رہتی (مثل) روپیہ بھنانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے اور گڑ کا ڈلا ٹوٹ جائے تو جلدی ختم ہو جاتا ہے۔

ساکھ گئی پھر ہاتھ نہ آوے (مثل) اعتبار ایک دفعہ چلا جائے تو پھر ہاتھ نہیں آتا۔

نکلے ہوئے دانت پھر نہیں بیٹھتے (مثل) جو بھید کھل جائے وہ پھر نہیں چھپتا۔

ہاتھی ہزار لٹے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا
ہاتھی ہزار لٹے پھر بھی لاکھوں کا (مثل) امیر کیسا ہی غریب ہو جائے، پھر بھی اس کی قدر باقی رہتی ہے۔

پھرے گھوڑے بیگن سے (مثل) اس آدمی کی نسبت بولتے ہیں جو متلون مزاج ہو، ادھر بات کہے اور ادھر پھر جائے۔

پھرنا مصدر سے ''پھر'' کا استعمال

پھر : ''پھرنا'' سے فعل امر — گھوم جا۔ گردش میں آ۔ منحرف ہو جا۔

پھر بیٹھنا : منحرف ہو جانا — وہ اپنے کیے ہوئے وعدے سے پھر بیٹھا۔

پھر پڑنا : غصے میں کسی کی طرف متوجہ ہونا

لطف شام و لطف ماہ آ نہ سکے آگئی
کب کے تھیں تو پھر پڑے ہوتے چکور پر (رشک)[18]

پھر پھر کر: پلٹ پلٹ کر پھر جانا۔ برگشتہ ہو جانا۔

پھر پھر کے دیکھنا: کسی کے پیچھے کے چلے جانے پر اشتیاق دیدار جتانا

نکلی کس طرح ہے جان مضطر دیکھتے جاؤ
ہمارے پاس سے جاؤ تو پھر کر دیکھتے جاؤ (آتش)[19]

پھر پھر کے دیکھنا: اشتیاق، انتظار یا خوف کی حالت ظاہر کرنے کے لیے

سب ہیں کوٹھے پہ شب ماہ میں اک یار نہیں — آج پھر پھر کے نہیں دیکھنے جانے والے (سحر)

دیکھتا رہتا ہوں پھر پھر کے ہوا گلشن کی — پتا کھڑکا تو میں سمجھا کہ وہ صیاد آیا (قدر)

پھر کے معنی — بھاگنے والے کی نسبت کہا جاتا ہے
پشت نہ دیکھنا — جو بھاگتے ہوئے پلٹ کر بھی نہ دیکھے

غیر ایسے اڑیں پھر کے بھی پشت نہ دیکھیں
اللہ کرے اقبال سے دو بار بدل جائے (رشک)[22]

پھر کے نہ دیکھنا — کمال نفرت، بیزاری اور بے پروائی کا اظہار

جاتے ہیں کوئے یار سے ہم ایسے ہو کے تنگ
کب بھی ہو تو پھر کے نہ اک بار دیکھیے (آتش)[23]

منہ پر ہوائیاں پھر جانا — منہ پر ہوائی چھوٹنا۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو جانا

خورشید رو نے جس گھڑی آنکھیں دکھائیاں
مہتاب کے بھی پھر گئیں منہ پر ہوائیاں (ہدایت)[24]

زیر نظر مقالے میں ''پھر'' کی معنوی جہتوں کو تلاش کرنے اور ان سے پیدا ہونے والے تغیرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ راقم السطور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وسائل اظہار میں کبھی کبھی الفاظ اپنے اصل معنی کے برعکس دیگر مختلف معنوں میں استعمال ہو جاتے ہیں جس کی زندہ مثال ''پھر'' ہے۔ اردو شعرا نے ''پھر'' کو مختلف انداز سے برت کر صوت و معنی کا نیا حسن عطا کیا ہے۔ ''پھر'' کی دھنک رنگ جہتوں سے معنوں کے نئے جہان آباد ہوتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان جہانوں کو قریب سے دیکھا جائے اور ان کی سیر کی جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فرہنگوں کی موہوم دنیا سے ایسے الفاظ کو نکال کر عملی دنیا کے حقیقی ماحول میں لایا جائے اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔

حواشی و حوالے

1۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد 1 (لاہور: اردو سائنس بورڈ، 2003ء)، ص 547۔
2۔ عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات، جلد 1 (لاہور: اردو سائنس بورڈ، 2003ء)، ص 571۔
3۔ نسیم امروہوی، حضرت، فرہنگ اقبال (لاہور: اظہار سنز، اردو بازار، 1984ء)، ص 167۔
4۔ اشفاق جلال پوری، محمد، دری اردو لغت (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2004ء)، ص 329۔
5۔ وارث سرہندی، قاموس مترادفات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2001ء)، ص 356۔
6۔ بحوالہ نیر، مولوی نور الحسن، نور اللغات، جلد 1 (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1989ء)، ص 874۔
7۔ ایضاً، ص 875۔ 8۔ ایضاً، ص 874۔ 9۔ ایضاً، ص 875۔ 10۔ ایضاً، ص 9۔ 11۔ ایضاً، ص 875
12۔ ایضاً، ص 875۔ 13۔ ایضاً، ص 874 14۔ ایضاً، ص 875 15۔ ایضاً، ص 875۔
16۔ بحوالہ فرہنگ آصفیہ، جلد 1، ص 548۔ 17۔ ایضاً، ص 548۔ 18۔ بحوالہ نور اللغات، جلد 1، ص 578۔
19۔ ایضاً، ص 875۔ 20۔ ایضاً، ص 875۔ 21۔ ایضاً، ص 875۔ 22۔ ایضاً، ص 875۔ 23۔ ایضاً، ص 875۔ 24۔ ایضاً، ص 13۔

◆◆◆

عمارت کی سرگذشت

......2......

ڈاکٹر جواز جعفری

قدیم عمارتیں انسانوں کا مشترکہ اثاثہ ہیں ان عمارات (جن کی تعداد 529 ہے) کے تحفظ کے لیے اقوامِ متحدہ سالانہ بنیادوں پر نہ صرف کثیر سرمایہ خرچ کرتی ہے بل کہ لوگوں کے اندر ان عمارتوں کا احترام اور تحفظ کا شعور پیدا کرنے کے لیے قدیم عمارتوں کا عالمی دن (18 اپریل) بھی منایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اکثر ممالک میں قائم آثارِ قدیمہ کا محکمہ افسران کی ملی بھگت سے عمارتوں کے لیے مختص کیے گئے فنڈز خورد برد کر لیتا ہے۔ یہ عمارتیں نہ صرف بے توجہی اور تجاوزات کا شکار ہیں بل کہ انھیں موسمیاتی تبدیلیوں کے علاوہ جنگوں اور نوادرات کے بیوپاریوں کی لوٹ مار کا بھی سامنا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں ایسی تاریخی و ثقافتی عمارتیں بمباری اور آتش زدگی کا شکار ہیں۔ ان عمارتوں کا میٹریل بل کہ ڈیزائنرز اور معمار تیزی سے کم ہو رہے ہیں لہٰذا ایسی نئی عمارتیں بنانا ناممکن ہوتا جا رہا ہے اور پہلے سے موجود عمارتوں کی مرمت اور تزئین و آرائش کرنے والے کاریگر بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں قدیم عمارتوں کو ناقدری کا بھی سامنا ہے۔ نجی ملکیت میں پائی جانے والی نادر عمارات کے نودولتیے مالکان ان کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں ہیں لہٰذا وہ انھیں بے دردی سے گرا کر ان کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں۔ قدیم عمارتوں کو اپنی تاریخی زندگی میں اتنے زمانے ادوار کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر انھیں اصل خطرہ ماحولیاتی آلودگی اور موسمی تبدیلیوں سے لاحق رہتا ہے۔ صنعتی سرگرمیوں نے بھی ان کی زبوں حالی میں اہم کردار ادا کیا۔ عہدِ حاضر کے سائنس دانوں نے قدیم عمارتوں کو ماحولیاتی آلودگی سے بچانے کے لیے بیکٹیریا استعمال کرنے کی تکنیک ڈھونڈ لی ہے۔ اس تکنیک کو فرانس نے متعارف کرایا ہے۔ بیکٹیریا کاربونیٹ جینسس کے ذریعے قدیم عمارتوں میں استعمال ہونے والے پتھر کا تحفظ ممکن بنایا جاتا ہے اور اس تکنیک کو فرانس، اسپین اور پرتگال میں کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے تجربات لاطینی امریکی ملک ہونڈوراس میں واقع مایا تہذیب کے کھنڈرات پر نہایت کامیابی سے کیے گئے ہیں۔

اس وقت فنِ تعمیر دنیا کی سب سے بڑی صنعت کا روپ اختیار کر چکا ہے اور ہر تہذیب کے اپنے اپنے دبستان ہیں۔ جو اپنے مخصوص ڈیزائنز، طرزِ تعمیر اور میٹریل کی بنیاد پر ایک دوسرے سے الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔

۱۔ **عراقی فنِ تعمیر:** یہ دنیا کا اولین اور قدیم ترین طرزِ تعمیر ہے جو دجلہ و فرات کے درمیان بسنے والے شہروں (اروک، بابل، نپور، نمرود اور اشور) میں پروان چڑھا۔ اس طرزِ تعمیر کے مطابق بننے والی عمارتیں مستطیل اور مربع شکل کی ہوتی ہیں۔ ان عمارتوں میں استعمال ہونے والے مواد، گارے، مٹی اور لکڑی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایسی عمارتوں کے آثار میسوپوٹیمیا کی کھدائیوں کے دوران ملے ہیں جو سرکاری استعمال کے لیے بنائی گئی تھیں جیسے اُر اول کا محل 3400 قبل مسیح میں تعمیر کیا جانے

والا یہ محل آج بھی عظیم کھنڈرات کی صورت میں باقی ہے۔ اس محل کی پہچان اس کے ستر میٹر بلند دروازے، کشادگی اور ستون ہیں۔ عراقی طرزِ تعمیر کے نمایاں ترین فن پاروں میں مینار و بابل اور باغات معلقہ کا شمار ہوتا ہے۔

2۔ <u>مصری فنِ تعمیر:</u> اس طرزِ تعمیر کا نمایاں ترین اظہار اہرام کی شکل میں ہوا ہے جنہیں بڑے بڑے پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس طرزِ تعمیر کے لیے بڑے پیمانے پر مزدوروں کی ضرورت پیش آتی ہے اور عمارتوں میں کثرت سے ستونوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ آراستہ و پیراستہ عمارتوں کی اشکال مثلث ہوتی ہیں۔ یہ عمارتیں بلند، پائیدار اور کشادہ بنائی جاتی ہیں۔ اس فنِ تعمیر کا تعلق حال سے زیادہ آخرت سے ہے۔

3۔ <u>ویدک فنِ تعمیر:</u> اس طرزِ تعمیر کو آریائے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے خاتمے پر متعارف کرایا تھا جو آہستہ آہستہ گنگا و جمنا کے آس پاس کے علاقوں میں پھیل گیا۔ آریا مذہبی قسم کے لوگ تھے ان کا ذات پات کا نظام تقسیم کار کی بنیاد پر قائم تھا اور تعمیراتی تکنیکس بھی مذہبی نظریات ہی کے گرد گھومتی تھیں۔ ویدک فنِ تعمیر کے مطابق غریب جھونپڑوں میں رہتے تھے جبکہ امراء کے گھر بڑے، کشادہ اور پُرآسائش تھے۔ عمارت کے درمیان کشادہ صحن رکھا جاتا جس کے چاروں طرف کمرے بنائے جاتے، کچن کے علاوہ مندر بھی گھر کے اندر ہی موجود ہوتا۔ اس طرزِ تعمیر میں مکان کی کھڑکیاں بازار کی طرف رکھی جاتی تھیں۔ آریا اپنے مکان تو اماٹی کو سامنے رکھ کر ڈیزائن کرتے تھے۔ ان کو ذہ کا رخ مشرق جبکہ کوڑے کا مغرب کی طرف رکھا جاتا تھا۔ دریائی تہذیب ہونے کے باعث لکڑی، گارے اور مٹی کا استعمال عام تھا۔ آریا چھتوں کے نیچے لکڑی کے ستون نصب کرتے یہ تکنیک آج بھی برصغیر کے دیہات میں رائج ہے۔ مکانوں کی چھتیں اونچی رکھی جاتیں جبکہ صحن کی زمین کو کوٹ کر برابر کر کے اس پر گائے کے گوبر کا لیپ کر دیا جاتا۔ گھر کے داخلی راستے پر زرد رنگ کا اضافہ خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

4۔ <u>مغل طرزِ تعمیر:</u> یہ طرزِ تعمیر ترک، ایرانی اور ہندوستانی فنون تعمیر کا آمیزہ ہے۔ مقامی طرزِ تعمیر میں وسط ایشیائی رنگوں کی آمیزش مغل آرٹ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ مغلوں میں فنِ تعمیر کا سب سے عمدہ اور اعلیٰ ذوق شاہجہان کو ودیعت ہوا تھا اس میدان میں کوئی ہندوستانی بادشاہ اس کا ہمسر نہیں۔ تاج محل، لال قلعہ دہلی، جامع مسجد (دہلی)، موتی مسجد اور جامع مسجد (آگرہ) اور شیش محل لاہور اس کے دورِ حکومت کو فنِ تعمیر کے سنہرے عہد کے درجے پر فائز کرتے ہیں۔ فتح پور سیکری کی تعمیرات، اعتماد الدولہ کا مقبرہ، بادشاہی مسجد (لاہور)، صفدر جنگ کا مقبرہ (دہلی)، مسجد وزیر خان، مقبرہ جہانگیر، کامران کی بارہ دری، حضوری باغ، شالیمار باغ اور ہرن مینار وہ فن پارے ہیں جو برصغیر کے طرز ہائے تعمیر میں مغل فنِ تعمیر کو بلند درجے پر فائز کرتے ہیں۔ یہ عمارتیں کم اور تخلیقی فن پارے زیادہ لگتے ہیں۔ یہ شہکار حسن و دلکشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان عمارتوں میں محنت کاری، تناسب، مینار و گنبد، دیواروں پر خطاطی اور کاشی کاری، باغات، فوارے اور پتھروں سے بنائے گئے گل بوٹے ان عمارتوں کو حسن و جمال کے تخلیقی مرقعوں میں بدل دیتے ہیں۔

5۔ <u>بدھ فنِ تعمیر:</u> بدھ طرزِ تعمیر کئی شکلوں میں دستیاب ہے۔ مثلاً چٹانوں، پتھروں، ستونوں اور اسٹوپوں کی شکل میں۔ بدھ فن

تعمیر میں موجود مخصوص ستون جو بہت مقبول تھا ایک ہی چٹان سے بنایا جاتا تھا۔ اس کی لمبائی چالیس سے پچاس فٹ تک ہوتی ہے یہ ستون نیچے سے موٹا اور اوپر کی طرف پتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسٹوپا بدھ مت کی مقبول عمارت ہے جنہیں مہاتما بدھ کی راکھ کو محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اسٹوپا کی شکل انڈے جیسی ہوتی ہے اور اس کے چاروں اطراف میں چار دروازے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے ٹاپ پر چھتری بنائی جاتی ہے۔ اس عمارت کے اندر عبادت ہوتی ہے اس اہتمام کے ساتھ کہ پروہت اس کے اندر عبادت کرتا ہے جبکہ عام لوگ دروازے کے باہر ہوتے ہیں۔ اشوکا کے زمانے سے پہلے کے اسٹوپا شکستگی کا شکار تھے چنانچہ اس نے ہندوستان میں چوراسی ہزار نئے اسٹوپے تعمیر کرائے۔

6۔ <u>یونانی طرز تعمیر:</u> یہ فن تعمیر نویں سے چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران پروان چڑھا۔ اس فن کے ارتقاء میں یونانی جغرافیے، مذہبی، تاریخی اور موسمیاتی صورت حال نے اہم کردار ادا کیا۔ چٹانوں اور پتھروں کی بہتات ہونے کے باعث پتھر ان عمارتوں کا بنیادی میٹیریل ہے۔ آرکیٹیکچر کے حوالے سے یہ یورپ کی پہلی بڑی تہذیب ہے۔ یہاں کا مذہب اساطیری ہونے کے باعث ہر دیوی اور دیوتا کا الگ ٹیمپل بنایا جاتا تھا۔ یہیں سے مذہب اور فن تعمیر کے درمیان گہرے رشتے قائم ہوئے۔ اس فن تعمیر میں ستونوں کی کثرت اور اہمیت پائی جاتی ہے۔ یونانی عمارتوں میں سنگ مرمر، مختلف رنگوں اور رنگین آرائش کا کلیدی کردار رکھا گیا ہے۔ بیشتر عمارات دائروی، مثلث اور مستطیل کی شکل کی ہوتی ہیں۔

7۔ <u>گوتھک فن تعمیر:</u> چودھویں صدی میں فرانس سے شروع ہونے والے اس طرز تعمیر کا موجد ایک اطالین ماہر تعمیر تھا۔ یہ فن فرانس سے شروع ہو کر یورپ میں پھیل گیا اور چار سو سال تک رائج رہا۔ محرابی دروازے، نوک دار مینار، قوس دار کھڑکیاں، بڑے بڑے دروازے اور کمان دار محرابیں اس طرز تعمیر کے نمایاں خد و خال شمار ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے رومن طرز تعمیر میں کم رستے اور زیادہ وزن پر زور دیا جاتا تھا جبکہ گوتھک آرٹ میں وسیع رستے اور ہلکے تعمیراتی میٹریل کو ترجیح دی جاتی ہے۔ دیواروں کو عمارت کا مرکز بناتے ہوئے ان میں بڑی بڑی کھڑکیاں نصب ہوتی ہیں جن کے رنگین شیشوں میں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی ایک عجیب روحانی ماحول تشکیل دیتی ہے۔ اس عمارت (جو عموماً چرچ ہوتا ہے) کے وسط سے ایک بڑا ہال، بغل میں راستے اور سامنے کی طرف دو مینار بنائے جاتے ہیں اور داخلی راستوں کو بڑے بڑے فن کار کے مجسموں اور تصویروں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ صلیب کے عین اوپر اور بازوؤں پر مینار بنائے جاتے ہیں اور اوپر والے حصے کے اطراف میں پتیوں اور کنگروں کا جنگل ہوتا ہے۔ اس طرز کی پہلی عمارت سینٹ ڈینس کا گرجا گھر تھا جو 1140-1444ء کے درمیان فرانس میں تعمیر ہوا اور اسی کے ساتھ یہ طرز تعمیر ہر طرف مقبول ہونے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے ہوتے چلے گئے۔

8۔ <u>جدید طرز تعمیر:</u> بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں شروع ہوا اور 1930 تک پوری دنیا میں پھیل گیا۔ یہ فن تعمیر علاقائی، عالمی اور بہت سے دوسرے طرز تعمیر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں بنائی گئی فلک بوس عمارتیں اسی فن تعمیر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نقشے سے لے کر تعمیراتی مواد اور مجموعی انتخاب میں ہر جگہ جدیدیت کے خدوخال کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ہموری، مستطیل اور چکوری اشکال جدید طرز تعمیر کے بنیادی عناصر ہیں۔ ایک بکس نما عمارت، کیوبک حجم، سیدھی اور چپٹی چھت اور صاف ستھری لائنیں جدید طرز تعمیر کی پہچان ہیں۔ اس طرز تعمیر میں روایتی انداز میں الگ الگ کمروں یا مقامات کی بجائے غیر منقسم رہ کر کام کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس طرز تعمیر میں ایسے میٹریل اور سہولیات کو ترجیح دی جاتی ہے جس سے زیادہ سے زیادہ افراد اہل خانہ یا ملازمین استفادہ کر سکیں۔ ایسا ڈیزائن جو کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کو بھی بھلا معلوم ہو۔ اس طرز تعمیر میں گھر یا عمارت کے سامنے والے حصے شیشے یا سٹیل سے تعمیر کیے جاتے ہیں مگر آرائشی اشیا اور ڈیزائن سادہ رکھے جاتے ہیں تا کہ یہ ایک ہی وقت میں جدت اور سادگی کا خوبصورت امتزاج نظر آئیں۔

9۔ **عالمی طرز تعمیر:** یہ جدید فن تعمیر ہی کا عالمی زاویہ ہے اسی لیے دونوں کے خد و خال میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ اس طرز تعمیر میں عمارت کو کارآمد اور باسہولت انداز میں تعمیر کیا جاتا ہے۔ اس کی کھڑکیاں فرش سے دیوار تک اور چھت ہموار ہوتی ہے۔ اس انداز میں گھر میں صنعت الیکٹرک مشینوں اور کچن کو اس طرح کارآمد بنایا جاتا ہے کہ عمارت میں موجود ہر شخص کے لیے وقت کی بچت اور کام کی انجام دہی آسان ہو سکے۔ عالمی طرز تعمیر میں قدرتی روشنی اور تازہ ہوا کے حصول کو زیادہ سے زیادہ ممکن بنایا جاتا ہے۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں صنعتوں میں استعمال کیے جانے والے میٹریل کو اپنایا جاتا ہے تا کہ مضبوطی اور پائیداری کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس طرز تعمیر میں ان طریقوں اور تکنیکس کو بروئے کار لایا جاتا ہے جن کے نتیجے میں عمارت کی نظر آنے والی ساخت بظاہر بے وزن اور ہلکی پھلکی دکھائی دیتی ہے۔ عمارتوں کے کونوں اور کناروں کی ساخت گول رکھی جاتی ہے۔ متعدد رنگوں اور آرائشی عناصر کو شامل کرنے کی بجائے سادگی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ شیشے، سٹیل اور کنکریٹ پر مشتمل عمارتیں اس طرز تعمیر کی نمائندگی کرتی ہیں۔

10۔ **عصری طرز تعمیر:** یہ پاکستان میں اپنایا جانے والا مقبول عام طرز تعمیر ہے۔ اس میں سادگی، صفائی اور کم آرائش پر توجہ دی جاتی ہے۔ اکیسویں صدی میں اس طرز تعمیر کا عروج دیکھنے میں آیا ہے۔ اگرچہ اس فن میں قدیم و جدید رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں تاہم یہ مروجہ ڈیزائنز کو اپنانے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کرتا۔ اس میں عام طور پر ماحول دوست عناصر اور ری سائیکل شدہ تعمیراتی مواد استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی عمارتوں میں بالائی منزلیں اور چھتیں ہموار رکھی جاتی ہیں۔ نتیجتاً گھر کا فرنٹ یا ابتدائی حصہ غیر متناسب تعمیر کے طور پر ابھرتا ہے۔ عمارت یا گھر کے داخلی دروازے کی دہلیز پر باہر کی طرف چند چھوٹی سیڑھیاں یا ڈھلوان تعمیر کی جاتی ہے تا کہ گاڑی پارک کرنے اور آمد و رفت میں آسانی ہو۔ نچلی اور بالائی منزلوں پر ہوا کے رخ پر کھڑکیاں رکھی جاتی ہیں۔ اس طرز تعمیر میں توانائی کی بچت کے لیے سولر سسٹم نصب کیا جاتا ہے اور عمارت میں باغیچے کی گنجائش بھی رکھی جاتی ہے۔

11۔ **مرصع طرز تعمیر:** اس سٹائل میں تعمیرات کے اختصار پر زور دیا جاتا ہے تا کہ عمارت سے سادگی کا تاثر ابھر کر سامنے آئے۔ اس طرز تعمیر میں ڈیزائنر، ڈیزائن کی سادگی پر زور دیتے ہیں۔ اس فن تعمیر کا آغاز 1922ء میں ہوا۔ اس کے مطابق گھر صرف مفید عناصر پر مشتمل ہونا چاہیے اور آرائشی عناصر کو کم سے کم جگہ دی جاتی ہے۔ اس طرز تعمیر میں صاف ستھری لکیروں،

ہندسی شکلوں اور یک رنگی کلر سکیم پر زور دیا جاتا ہے۔ صاف اور سیدھا ڈھانچہ، سادہ دیواریں اور قدرتی روشنی کا حصول اس طرزِ تعمیر کے بنیادی خدوخال ہیں یہ سٹائل پاکستان میں تیزی سے عصری فنِ تعمیر کی جگہ لے رہا ہے۔

گھر خوشی، امید، تحفظ، آرام، وابستگی اور خوابوں کا استعارہ ہے۔ انسان کے بنائے پہلے گھر سے لے کر جدید طرز کی عمارات تک ڈیزائنز اور میٹریل ہمیشہ تبدیل ہوتا آیا ہے۔ غلام گردشوں سے لے کر روشن دانوں تک اور صحنوں سے لے کر باغیچوں تک سب کچھ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ صدیوں کے تہذیبی سفر کے دوران عمارتیں اندر اور باہر سے مکمل تبدیل ہو چکی ہیں۔ عمارتوں کی شکل اور معیار میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت دیکھنے میں آئی جب بیسویں صدی کے دوران لوگ بڑے پیمانے پر مقامی علاقوں سے ہجرت کر کے بڑے بڑے میٹروپولیٹن شہروں میں آباد ہونے لگے جس کے نتیجے میں ماہرین تعمیرات کو رہائش کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تعمیراتی منصوبوں میں تبدیلی کرنا پڑی۔ شہروں کی طرف نقل مکانی کا یہ سلسلہ ابھی تک تھمتا نظر نہیں آ رہا اور ماہرین کا خیال ہے 2031ء تک دنیا کی ساٹھ فیصد آبادی دیہاتوں اور قصبوں سے نکل کر بڑے بڑے شہروں میں منتقل ہو جائے گی۔ ہاؤسنگ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکی ہے جس نے فنِ تعمیر کو بھی بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے۔ بیسویں صدی میں فنِ تعمیر کو صرف انتقالِ آبادی ہی نے متاثر نہیں کیا بلکہ ان بڑے بڑے شہروں میں پروان چڑھنے والی فکری تحریکیں اور ذاتی رجحانات بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ بیسویں صدی میں سامنے آنے والی جدیدیت، وجودیت، تجریدیت، دادا ازم، علامتیت اور بہت سی دوسری ذہنی تحریکوں نے جہاں ادب اور فنونِ لطیفہ کے دوسرے شعبوں کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا وہاں فنِ تعمیر بھی ان تحریکوں کے اثرات سے دامن نہ بچا سکا۔ ان تحریکوں نے انسان کے شعور، مزاج اور کردار میں گہری تبدیلیوں کو جنم دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اتنا غیر روایتی بن کر سامنے آیا کہ وہ اپنی پیشرو نسل سے (ذہنی طور پر) یکسر مختلف نظر آنے لگا۔ جدیدیت کے اثرات ہی کیا کم تھے کہ رہی سہی کسر وجودیت نے نکال دی۔ اس فلسفے میں اجتماع کی بجائے فرد کا انفرادی وجود سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جبلتات یا گروہ اس کی آزادی کے دشمن ہیں۔ تنہائی وجودیت کا اہم موضوع ہے اور موت، زندگی اور کائنات کی تنہائی، لاتعلقی، بے دلی، بے گانگی، بوریت، یکسانیت، مہملیت، خوف، بے حسی، بے یقینی اور بیزاری کو فروغ دیا چنانچہ تنہائی کا احساس ادب سے لے کر تعمیر تک کا بنیادی نقطہ قرار پایا۔ بے معنویت اور تنہائی کے احساسات نے مل کر خاندان اور گھر کے قدیم تصور کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ بے معنویت کے احساس نے انسان کو غیر ضروری سامان کی طرح گھروں سے باہر نکال دیا اور وہ قدیم اجتماعی تصورات سے مایوس ہو کر صرف اپنی طرف دیکھنے پر مجبور ہوا اس کے گھروں کو خیر باد کہہ کر فلیٹس اور ویرانوں میں جا بسا۔ صوفی ازم اور تیاگ وجودیت کا ایک خاص زاویہ ہے مگر جو لوگ تیاگ نہ کر سکے وہ گھر کی اجتماعی چھتوں کے تنہا رہ گئے۔ چنانچہ وجودیت اور جدیدیت کے ملے جلے نتیجے کرتے ہوئے فن کاروں نے تنہائی، لاتعلقیت، بے معنویت، مایوسی اور بیزاری کو اپنے آرٹ کے ذریعے پیش کیا۔ فنِ تعمیر پر (وجودیت اور جدیدیت کے ساتھ ساتھ) تجریدیت کے اثرات بھی کچھ کم نہ تھے۔ تجریدیت ایک آزاد منش آرٹ ہے جو معلوم مظاہر کی نفی کرتا ہے چنانچہ تجریدیت کے زیر اثر ڈیزائنرز اور معماروں نے ایسے گھر تعمیر کیے جنہیں دیکھ کر مروجہ گھروں کا خیال تک ذہن میں نہ آتا تھا (حوالے کے لیے عرب نژاد ماہرِ تعمیرات زہا حدید کے شاہکار ڈیزائن دیکھے جا سکتے ہیں)۔

شہروں کے پھیلنے اور مذکورہ بالا تحریکوں کے فروغ کے نتیجے میں طرزِ تعمیر پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں چھوٹی عمارتوں کو فروغ ملا اور ان عمارتوں میں مختلف حرارت اور روشنی کے مصنوعی نظام کا اہتمام کیا جانے لگا۔ جگہ کی کمی کے باعث درجنوں منزلہ عمارتوں کو فروغ ملا اور سیڑھیوں کی بجائے عمارتوں میں لفٹ کا اضافہ سامنے آیا اور ٹیرس، حجرہ کے ایئر جینسی گیٹ اور گھروں کے اندر پارکنگ کے تصورات جنم لینے لگے۔ تنہائی، یکتائی اور انفرادیت پسندی نے چھوٹے اور ارد گرد سے لاتعلق گھروں کو تحریک دی۔ نئی تحریکوں نے انسان کے جمالیات کے تصورات کو بھی بدل کے رکھ دیا تھا لہٰذا یہ طرزِ تعمیر بدلتے ہوئے جمالیاتی ذوق کا مظہر تھا جو فنِ تعمیر کے علاوہ ہر جگہ اظہار کر رہا تھا۔ جدیدیت نے ایک طرح کی آئیڈیلزم کو بھی فروغ دیا جو ادب، مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی اور فنِ تعمیر میں بھی اظہار کر رہی تھی۔ اس آئیڈیلزم سے بعض اوقات آرکیٹکٹ کے ذوق کی تو تسکین ہو جاتی مگر گھر کا باسی اس تسکین سے محروم رہ جاتا جب کہ اصولی طور پر عمارت کو اپنے مکین کے ذوقِ جمال کا مظہر ہونا چاہیے۔ اور آرکیٹکٹ کا کہنا تھا کہ وہ ایک عمارت کو ایک فن پارے کے طور پر دیکھتا ہے لہٰذا رہائشی کو اپنا ذوقِ جمال آرکیٹکٹ کی سطح تک بلند کرنا چاہیے۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں جرمنی اور فرانس میں ایسی عمارات سامنے آئیں جنھوں نے آرکیٹکٹ کے ذوقِ جمال کو عام لوگوں کے ذوق سے الگ کر دیا تھا۔ نئی گھریلو عمارات سے وابستہ کیا گیا پرائیویسی کا تصور بھی بیسویں صدی کی انھی تحریکوں کی دین تھی۔ قدیم عمارتوں میں بسر کی جانے والی زندگی میں اکبر بادشاہ کے بچوں کو بھی آج کے معنوں میں پرائیویسی میسر نہ تھی مگر جدیدیت اور وجودیت سے متاثرہ ذہن اپنے لیے الگ کمرے کا مطالبہ کر رہا تھا اور یہ الگ الگ کر کے الگ الگ دنیاؤں کی تشکیل کر رہے تھے۔ نئی عمارتیں اپنے رہائشیوں کے طرزِ زندگی کو تبدیل کر رہی تھیں اور ان عمارتوں کے مکین ان عمارتوں کے غیر مانوس ماحول اور آرکیٹکٹ کے ذوقِ جمال کے ہاتھوں تنہائی اور یکتائی کا شکار ہو رہے تھے کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ خوف، اداسی، خوشی، تنہائی اور اطمینان کا گھر سے گہرا تعلق ہے۔ جدیدیت کے زیرِ اثر بعض آرکیٹکٹ عمارت کو ایک مشین سے تشبیہ دیتے ہیں یعنی ایک عمارت کو بھی ایک مشین کی طرح فعال اور مکمل ہونا چاہیے۔ (کاربوزیر) لہٰذا ایسی عمارتوں کے مکین بھی انسانی جذبات و احساسات اور رشتوں سے کٹ کر اس مشین کے پرزے بن کر رہ جاتے ہیں۔ تنہائی اور علیحدگی پسندی کے تصورات نے فنِ تعمیر کو اس شدت سے متاثر کیا کہ صحن، چھت اور دالان جو کبھی گھریلو زندگی کا لازمہ تھے جدید طرزِ تعمیر میں نہ صرف انھیں عمارت سے الگ کر دیا گیا بلکہ ان مقامات سے وابستہ ثقافتی سرگرمیاں بھی خواب و خیال بن کر رہ گئیں۔

جدید عمارات، موسمی تغیرات، سکون اور ثقافتی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھیں۔ ان عمارتوں نے جب اپنے مکینوں کے طرزِ بود و باش کو بدلنے کی کوشش کی تو دونوں کا نباہ مشکل ہو گیا۔ یہیں سے مکین کی ضروریات کو عمارت کے ڈیزائن اور خریدار کے ذوقِ جمال کو عمارت، مجسموں اور پینٹنگز میں پیشِ نظر رکھنے کی تحریک کا آغاز ہوا گویا فن میں خریدار کے ذوقِ جمال کو احترام دیا جانے لگا۔ ماضی میں موسموں اور علاقوں کے مطابق عمارتوں کی پہچان ہوا کرتی تھی۔ ایک علاقے کا طرزِ تعمیر دوسرے خطے میں موزوں نہیں سمجھا جاتا تھا مگر عالمگیریت کے فروغ کے باعث انسان کا طرزِ زندگی عالمی رنگ اختیار کر رہا ہے۔ ایئر کنڈیشنگ اور ہیٹنگ کے نظام کی ایجاد کے باعث فنِ تعمیر بڑی حد تک اردگرد کی آب و ہوا اور موسمی تبدیلیوں سے لاتعلق ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے موسمیات، ماحولیات اور طرزِ تعمیر کے درمیان نئے رشتوں کی نشان دہی کی ہے جسے آپ مابعد جدید رجحان کہہ سکتے ہیں۔ مابعد جدید

ماہرینِ تعمیرات نے نہ صرف خریدار کے ذوقِ جمال اور ضروریات کو تعمیراتی منصوبوں میں جگہ دی بلکہ انہوں نے نئی عمارتیں ڈیزائن کرتے ہوئے پرانے طرزِ تعمیر سے رجوع بھی کیا۔ جدیدیت اور وجودیت نے انسانی ماحول، معاشرتی زندگی، طرزِ بود و باش، ثقافتی اقدار، اخلاقیات، معیشت، ذرائع آمد و رفت، مجلسی آداب اور طرزِ تعمیر سب کچھ بدل کے رکھ دیا تھا مگر مابعد جدید آرٹسٹوں نے گزری ہوئی زندگی کو پھر سے آواز دی۔ گلوبل ولیج کے تصور کے زیرِ اثر دبا دی گئی علاقائی ثقافتوں کے احترام کو فروغ دیا جانے لگا۔ نئے تعمیراتی آرٹسٹ طرزِ تعمیر کو سمجھنے کے لیے علاقائی بود و باش، جغرافیائی اور موسمیاتی صورتِ حال اور علاقائی تاریخ کو ضروری قرار دینے لگے۔ جدیدیت اور وجودیت کے زیرِ اثر تعمیراتی سامان کے خالص پن کو سب کچھ سمجھ کر عمارت کی تعمیراتی تزئین و آرائش کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ نئے تعمیراتی فن کاروں نے پھر سے عمارات کو آراستہ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایک بار پھر ثقافتی تاریخ سے رجوع کیا جانے لگا۔ ان معماروں نے اطالوی ماہرِ تعمیرات ماریو بوٹا کے خیالات سے رجوع کرتے ہوئے سبزے کے علاوہ عمارتی مقام کی گہری تفہیم، ثقافتی و سماجی عناصر کو بھی نئے ڈیزائن میں شامل کیا تا کہ ایک عمارت کو فرد کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کے لیے بھی کارآمد بنایا جا سکے کیوں کہ یہی عمل وقت کے ساتھ ساتھ ایک عمارت کو مقبول اور پائیدار بناتا ہے۔ مابعد جدید ماہرینِ تعمیرات تاریخ کی تلاش میں قبل مسیح کے رومن ماہرِ تعمیر، سول انجینئر اور مصنف مارکس وٹروویس پولیو تک پہنچے اور اس کی کتاب "دی آرکیٹیکچر" کے تین اصولوں مضبوط، کارآمد اور خوب صورت کا اطلاق اپنی تعمیرات پر کیا اور بعد میں آنے والے کئی ماہرین نے انہی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس فن کو بلندیوں تک پہنچایا۔ مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر بنائی گئی تمام عمارات پرشکوہ، خوبصورت اور پائیدار نظر آتی ہیں۔ یہ وہ اصول ہے جس کا اطلاق فزیکل سسٹم اور ٹیکنیکل آرکیٹیکچر پر یکساں ہوتا ہے۔ اس دور میں بنائی گئی عمارات کشادگی، روشنی، ہواداری، سبزے اور پائیداری کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ فن کار عالمی ماحولیاتی آلودگی اور بڑھتے ہوئے درجہ حرارت سے عمارتوں کو بچانے کے لیے کشادگی کو ترجیح دیتے ہیں تا کہ ان میں گھٹن اور بوسیدگی پیدا نہ ہو۔ بیسویں صدی کے مشہور آرکیٹکٹ آگسٹے پیرٹ نے ایک آئیڈیل عمارت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا کہ تعمیراتی ساخت کو مضبوط بنانا بھی ایک فن ہے۔ ایک عمدہ عمارت کے مکینوں کا جہاں سے بھی گزر ہو وہ دیواروں سے نہ ٹکرائیں، کھڑکیوں کے آس پاس سبزے کی چادر دکھائی دے۔ عمارت کے کارآمد ہونے کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ اپنے مکینوں کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ عمارت فلک بوس ہو یا عام مکان مضبوطی و پائیداری کے ساتھ ساتھ اس میں مکینوں کی سہولتوں کا خیال رکھا جانا بے حد ضروری ہے۔ اس عہد کی عمارتوں میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مکین اس کے اندر قید و گھٹن محسوس نہ کریں، سامانِ آرائش مکینوں کو اپنے سروں پر بوجھ محسوس نہ ہو یعنی مکان کی آرائش کرتے وقت کشادگی کے احساس کو غالب رکھا جائے۔ آرکیٹیکچرل ڈیزائن میں جمالیاتی ذوق کا اظہار فنِ تعمیر کا لازمہ ہے کیوں کہ بدنما عمارت مستحکم ہونے کے باوجود آنکھوں میں جگہ نہیں پاتی۔ آپ میری بات کی تائید کریں گے کہ دنیا کی بے شمار عمارتیں اپنی مضبوطی سے زیادہ اپنی خوبصورتی کی بنا پر ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

آج کل فنِ تعمیر میں ماحول دوست عمارات کا تصور مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور تعمیر کا یہ تصور مابعد جدیدیت ہی کا ایک زاویہ ہے۔ ماہرینِ تعمیرات کا کہنا ہے کہ کنکریٹ اور شیشے سے بنی عمارتیں زیادہ سے زیادہ دو سو سال تک قائم رہ سکتی ہیں۔ اس دوران

یہ بے تحاشا توانائی استعمال کرتی ہیں۔ یو۔این کی رپورٹ کے مطابق دنیا کی چالیس فیصد توانائی صرف تعمیرات کا شعبہ خرچ کر رہا ہے۔ اس پس منظر میں ماہرین تعمیرات کا کہنا ہے کہ اگر ہم زمین کی بقا اور دنیا کی تائید کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ماحول دوست عمارتوں کے ڈیزائنز کو فروغ دینا ہوگا تاکہ زندگی کو زیادہ صحت مند اور زمین پر انسانی موجودگی کو زیادہ عرصے تک ممکن بنایا جا سکے۔ ان ماہرین کا خیال ہے کہ عمارتی پائیداری کا کوئی عالمی پیمانہ مقرر کیا جانا چاہیے جیسے عمارتوں کے اندر اور ارد گرد سبزے کی موجودگی۔ علاوہ ازیں عمارت کی پائیداری، پانی کے انتظام اور بجلی و حرارتی طریقوں کے لیے استعمال ہونے والے مواد کو ماحول دوست بنانے پر غور ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں سرمایہ کاروں اور ٹھیکیداروں کو (جو ماحول دوست منصوبوں سے زیادہ عمارتوں کی فروخت میں دلچسپی رکھتے ہیں) کو بھی اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں ماحول دوست ڈیزائنز کو بھی منصوبہ بندی کے مرحلے میں مرکزی دھارے میں شامل کرنا ہوگا تاکہ زمین کی تزئین اور ارد گرد کے ماحول پر ماحولیاتی اثرات کو کم کرنے کے لیے وہ نئے ڈیزائنز کے ساتھ سامنے آ سکیں۔ ماحول دوست ماہرین تعمیرات کے خیال میں پولی ایتھرین سانچوں کو فروغ دے کر اسٹیل، ٹائلز اور دھاتوں جیسے قدرتی وسائل کے استعمال میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ حرارتی اور وینٹیلیشنل عناصر کو ایسے طریقوں سے استعمال کرنا ہوگا جس سے توانائی کی طویل المدتی بچت ہو سکے۔ پائیدار فن تعمیر کے لیے مقامی طور پر دستیاب وسائل کے بارے میں معلومات جمع کرنے اور تعمیراتی ڈیزائنز تیار کرنے سے پہلے مقامی کمیونٹیوں کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ ان تمام معلومات کو فن تعمیر سے متعلق عالمی اداروں سے بھی شیئر کیا جانا چاہیے تاکہ سرمایہ کاروں اور ٹھیکیداروں کے دلوں میں چھپے ناکامی کے خوف کو ختم کیا جا سکے۔

ماحول دوست عمارت کا مطلب ہے کہ نہ صرف کاربن کے اخراج میں کمی ہو بلکہ ایسی عمارتوں کے فروغ سے گاڑیوں کے لیے کم اور انسانوں کے لیے زیادہ جگہ ہوگی۔ اس کے نتیجے میں یقینی طور پر انسانوں کے باہمی تعلقات بھی بہتر ہوں گے۔ ماحول دوست عمارت میں کشادہ صحن رکھا جاتا ہے تاکہ خواتین مرغیاں پال سکیں، سبزیاں اگا سکیں اور بچوں پر نظر رکھ سکیں۔ ان عمارتوں میں قدرتی اور صحت افزا مواد کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ ان میں کاربن فٹ پرنٹ نہ ہونے کے برابر ہوں کیونکہ کنکریٹ، اسٹیل، ایلومینیم اور شیشے کا استعمال ہی عالمی درجہ حرارت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ عالمی درجہ حرارت میں اضافے کے باعث ماحول دوست عمارتیں نہ صرف اپنے حسن سے لوگوں کو متاثر کر رہی ہیں بلکہ ان کی مقبولیت اور مانگ میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ان عمارتوں کا نقشہ بناتے ہوئے پانی اور توانائی جیسی بنیادی ضرورتوں کو اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ تعمیراتی میٹریل کے بہتر استعمال کو بھی یقینی بنایا جاتا ہے۔ یہ عمارتیں بجٹ فرینڈلی بھی ہیں۔ سبز تعمیرات کے ذریعے ان عمارتوں سے کاربن کے اخراج کو روکنے کی کامیاب کوشش کی جاتی ہے۔ ماحولیاتی تبدیلیوں کو روکنے کے لیے عمارتوں کی چھتوں پر سولر پینلز لگا کر بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ناروے کے ایک شہر (ٹرونڈ ہیم) میں واقع ایک ماحول دوست عمارت کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ عمارت سولر پینلز کے ذریعے اپنے استعمال سے دو گنا زیادہ بجلی (5 لاکھ کلوواٹ) پیدا کر رہی ہے۔ اس عمارت کے احاطے میں ایک بجلی گھر بھی تعمیر کیا گیا ہے جس میں توانائی کو محفوظ بنایا جاتا ہے۔ اس عمارت کو یورپ کی سب سے زیادہ انرجی پازیٹو عمارت قرار دیا گیا ہے۔ انسولیشن کے عمدہ نظام کے ساتھ ساتھ وینٹی لیشن میں حرارت کو دوبارہ

استعمال کرنے کا بہترین نظام بھی موجود ہے۔ اس عمارت کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے ایک پمپ نصب کیا گیا ہے جو قریبی سمندر سے پانی کی فراہمی کو یقینی بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چھت پر جمع ہونے والے بارش کے پانی کو (واش روم کے لیے) دوبارہ قابلِ استعمال بناتا ہے۔ اس کے بلب بہتر ارکے، یہ اس وقت جلتے ہیں جب کوئی کمرے میں موجود ہو اور اپنے مکین کی عدم موجودگی میں خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ اس عمارت کی زندگی کی معیاد دو سو پچاس برس رکھی گئی ہے۔ سبزے میں گھری یہ خوب صورت عمارت حیران کن اور آرام دہ ہونے کے ساتھ ساتھ ماحول دوست بھی ہے۔ اس عمارت میں موجود باغ میں چھہتر (76) اقسام کے چھتیس ہزار پودے لگائے گئے ہیں۔ پودوں کے علاوہ یہاں شمسی پینل، ونڈ ملیں اور دفاتر بھی رکھے گئے ہیں۔ اس ماحول دوست پروجیکٹ کو کئی عالمی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ ایک ایسا ہی ماحول دوست عمارتوں پر مشتمل گاؤں ساؤتھ لندن کے ایک برج میں واقع ہے جس کا نام بیڈ زیڈ ہے۔

ماحول دوست عمارات کا تصور یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں کچھ اور بھی متبادل نمونے موجود ہیں۔ انہی متبادل نمونوں میں سے ایک "بادگیر عمارت" کا تصور بھی ہے۔ ایسی عمارتوں کو موسمیات سے موافقت رکھنے والی عمارتیں بھی کہا جاتا ہے جو گرمی میں ٹھنڈی اور سردی میں گرم رہتی ہیں۔ یہ عمارات ایندھن کے استعمال کو نوے فیصد کم کر دیتی ہیں۔ سیلم سائنس دان برتھولڈ کاشمیں کے مطابق ایسی عمارتوں کے پس پشت یہ تصور کارفرما ہے کہ توانائی کی بچت صرف صارفین کی ذمہ داری نہیں ہونی چاہیے بلکہ تعمیراتی صنعت سے وابستہ دیگر افراد کو بھی اس کی ذمہ داری قبول کرنا ہو گی۔ صارفین سے لے کر تعمیراتی ماہرین تک سب کو مل کر تعمیراتی عناصر اور عملی علم کے ذریعے، باہمی مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ پاسیو ہاؤس انسٹی ٹیوٹ جرمنی کی ایک تعمیراتی کمپنی ہے جس نے بادگیر یا موسمیات سے مطابقت رکھنے والے تعمیراتی معیار قائم کیے ہیں جو دنیا بھر میں تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں توانائی کے استعمال کو کم کرنے کا انحصار صرف تھرموسٹیٹ کو کم کرنے اور سردیوں میں گرم لباس پہننے کی عادت پر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس مقصد کے لیے فنِ تعمیر کو بھی مدد کے لیے آگے آنا چاہیے۔ یقیناً اس تصور کے تحت بنائی جانے والی عمارتیں گرم اور سرد علاقوں میں اپنی شکل و صورت میں ایک دوسری سے مختلف ہوں گی۔ سرد علاقے میں یہ عمارات ایسی جگہ ہوں گی جہاں سورج کی حدت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے اور جھلسا دینے والے گرم علاقوں میں یہ عمارتیں سایہ دار جگہوں پر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ ان عمارتوں کی تعمیر کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد ہے یعنی توانائی کا کم سے کم استعمال۔ ایسی بادگیر عمارت ہر سال زیادہ سے زیادہ 15 کلو واٹ مربع میٹر بجلی استعمال کرتی ہے جب کہ ہمارے عام گھر ایک سو پچاس سے تین سو کلو واٹ بجلی سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ جدیدیت اور وجودیت کے زیرِ اثر بننے والی عمارات نے اپنے مکین کے دل پر تنہائی، بیگانگی اور بے معنویت کا جو زخم لگایا تھا ماحول دوست عمارتوں نے اسے بھرنے کی کامیاب کوشش کی۔ آرکیٹکٹس نے اپنے ماضی کی سماجی، ثقافتی اور آرکیٹکٹ تاریخ سے رجوع کر کے جو عمارتیں تعمیر کیں انہوں نے تنہائی، مایوسی، بے بسی، بے یقینی، لایعنیت اور لامرکزیت کے شکار اپنے مکینوں کو ایک بار پھر مرکزیت سے وابستگی پر آمادہ کیا اور یوں روحانی اور سماجی سطح پر تنہائی کا شکار انسان ایک بار پھر اجتماع سے آملا۔

(ختم شد)

◆◆◆

HEC کے منتخب رسائل اور مسائل

سید نصرت بخاری

جہاں تک میں جانتا ہوں پاکستان بھر میں اس وقت 100 سے زیادہ اردو رسائل کی اشاعت ہو رہی ہے۔ ان میں بعض رسائل تو اتنے معیاری ہیں کہ جن میں پاکستان کا ہر اچھا ادیب اور شاعر شائع ہونا اپنا اعزاز اور اپنے لیے سند سمجھتا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن کی نظر انتخاب صرف چند رسائل تک محدود رہی۔ ان کے نام یہ ہیں: (1) اقبال ریویو، اقبال اکیڈمی، لاہور (2) الماس، شعبۂ اردو، شاہ عبداللطیف بھٹائی یونیورسٹی، خیرپور (3) اورینٹل کالج میگزین، شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، لاہور (4) بازیافت، شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب، لاہور (5) تحقیق، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف سندھ، جام شورو (6) تحقیق نامہ، شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور (7) تخلیقی ادب، شعبۂ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد (7) خیابان، یونیورسٹی آف پشاور، پشاور (8) دریافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد (9) فکر و نظر، اسلام آباد۔

اہل علم و ادب جانتے ہیں کہ ان کے علاوہ بھی برصغیر پاک و ہند میں کتنے ہی اچھے اور معیاری رسائل تسلسل سے شائع ہو رہے ہیں، میں صرف پاکستان کے چند ایک رسائل کے نام گنوائے دیتا ہوں: (1) سہ ماہی پیغام آشنا، اسلام آباد (2) ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد (3) سہ ماہی الزبیر، بہاول پور (4) الحمرا، لاہور (5) سہ ماہی تسلسل، راولپنڈی (6) مکالمہ، کراچی (7) دنیا زاد، کراچی (8) نقاط، اسلام آباد (9) چہار سو، راولپنڈی (10) تخلیق، لاہور (11) ادب لطیف، لاہور (12) بیاض، لاہور۔

ایسے رسائل اور بھی ہیں مگر میں نے بطور نمونہ از خروارے، چند ایک کے نام لیے ہیں۔ ان رسائل میں شعر و افسانے کے ساتھ ساتھ وقیع تحقیقی مواد بھی شائع کیا جاتا ہے جس کو مدیران جانچ پڑتال اور ٹھونک بجا کر شائع کرتے ہیں جن کے حسن و قبح پر اہل علم اپنے خطوط کے ذریعے باقاعدہ گفتگو بھی کرتے ہیں۔ ان کی رائے خطوط کی صورت میں ان رسائل میں شائع بھی کی جاتی ہے۔ اسی لیے ان رسائل کو محققین قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں چھپنے والے مواد کو وہ اپنے تجزیے اور حوالوں میں شامل کرتے ہیں۔ ان رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کا معیار HEC کے منتخب رسائل کے مواد سے کسی طرح بھی کم نہیں لیکن HEC کی طرف سے ان پر یہ اعتراض لگایا گیا کہ ان رسائل کا مزاج تحقیقی نہیں اس لیے دائرہ قبولیت سے خارج کر دیے گئے۔ یہاں اپنی ایک اور خلش کا اظہار بھی کرتا چلوں کہ اخبار اردو اور پیغام آشنا تو خالص تحقیقی مزاج کے رسائل ہیں، ان کو منتخب کیوں نہیں کیا گیا؟ پھر ایک لطیفہ اور بھی ہے کہ HEC کے منتخب رسائل میں جو مضمون نگار اور مقالہ نگار شائع ہوتے ہیں ان میں سے کئی ایک اپنے مقالوں کے لیے مواد انھیں رسائل سے لیتے ہیں جن کو HEC نے رد کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، جنوری 2008ء کے دریافت کے صفحہ 97 پر الزبیر، بہاول پور، صفحہ 180 پر فنون، لاہور، صفحہ 199 پر سب رنگ کراچی، صفحہ 225 پر محور کراچی کے حوالے موجود ہیں۔ اسی طرح

پشاور یونیورسٹی کے خیابان کے صفحہ 52 پہ اخبارِ اردو، اسلام آباد، صفحہ 71 پہ جیب کراچی اور صفحہ 127 پہ پیغام آشنا کے حوالے موجود ہیں۔ سندھ یونیورسٹی کے میگزین تحقیق 2009ء کے صفحہ 391 پہ لفظوں کا حوالہ ہے۔ اگر یہ رسائل جو HEC کے انتخاب میں جگہ نہ پا سکے ناقابلِ اعتبار ہیں تو پھر جو مقالے ان رسائل کے حواشی سے مرصع ہوتے ہیں ان کو منتخب رسائل میں کیوں شائع کیا جاتا ہے۔

اگر بات صرف انتخاب کی ہوتی تو شاید لکھنے والے اس غیر مساوی رویے سے اتنے زیادہ متاثر نہ ہوتے کہ کون سا HEC نے ایوارڈ دیا جاتا ہے لیکن ہائیر ایجوکیشن کمیشن نے مقالے اور پروموشن کے انتخابات کے لیے یہ لازمی شرط عائد کر دی کہ طلبہ کے صرف ان مقالہ جات اور مضامین کو اہمیت دی جائے جو صرف HEC کے منتخب رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہ شرط ایک طرف تو اردو ادب کے ان رسائل کی خدمات سے انکار ہے جو بغیر کسی سرکاری امداد کے شائع ہو رہے ہیں دوسرے ان مدیروں کی حوصلہ شکنی ہے جو اردو ادب کی ترویج و ترقی کے لیے اپنے حصے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اگر کسی کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال آئے کہ اس سے انھیں مالی منفعت یا کوئی اور فائدہ حاصل ہوتا ہوگا تو اس سے بڑا الزام اور بے انصافی کوئی نہیں ہوگا۔ مالی فائدہ تو دور کی بات ایک رسالے کا مدیر ہونے کی وجہ سے مجھے یہ تلخ تجربہ بھی ہے کہ بے چارے مدیران اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے رسالہ چھاپتے ہیں اور پھر اپنے پاس سے ڈاک خرچ ادا کر کے دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیتے ہیں۔ ایسے عالم میں بجائے اس کے کہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے، الٹا ان کے معیار پر شک کر کے انھیں مسترد کر دیا گیا۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ دوسری زیادتی کی زد میں طلبا اور ادیب آتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ HEC کے منتخب رسائل میں ان بے چاروں کو جگہ کون دیتا ہے۔ HEC کے منتخب رسائل پر اگر آپ غور کریں تو اکثر جامعات کے رسائل ہیں۔ اس لیے ان میں اکثر جامعات کے استاد خود خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، یا یوں ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کے استاد اس یونیورسٹی کے استاد کو اس لیے چھاپتے ہیں کہ کل کلاں ان کے رسالے میں بھی تو شائع ہونا ہے۔ آپ مذکورہ بالا کسی بھی رسالے کی فہرست پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں، نوے فی صد مقالات جامعات کے اساتذہ یا ان کے دوستوں کے ہوتے ہیں۔ ایسے عالم میں طلبہ یا عام ادیب کی ان رسائل تک رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ بات عاشقاں بر شاخ آہو۔

تیسرے یہ کہ یہ غیر مساوی سلوک ان لکھنے والوں کی بھی توہین ہے جن کے مضامین و مقالات HEC کے منظورِ نظر مجلوں میں سفارش نہ ہونے کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکتے۔ اب تو یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ HEC نے جن رسائل کو ''معیار'' کی سند عطا کر رکھی ہے، انھوں نے اسے باقاعدہ کاروبار بنا لیا ہے اور پروموشن یا ایم۔فل، پی ایچ۔ڈی اسکالرز کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مقالہ شائع کرنے کے لاکھوں روپے لینے لگے ہیں اور مجبور لوگ یہ رشوت دینے پر اس لیے مجبور ہیں کہ اس مقالے کی اشاعت کے ساتھ ان کی پروموشن یا سند کا حصول وابستہ ہے۔ HEC کے اربابِ اختیار کی شاید اس طرف بھی توجہ نہیں گئی کہ HEC کے منظورِ نظر یہ رسائل ماہ نامے یا سہ ماہی نہیں ہیں، ان کی اشاعت سال میں ایک دو بار ہی ممکن ہوتی ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ یا تو اس شرط کو فوری طور پر ختم کر دیا جائے اور ہر ادبی رسالے میں شائع مواد کو تسلیم کیا جائے یا پھر HEC کے منتخب رسائل میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقالات کی تعداد نصف کر دی جائے تاکہ طلبہ اور ادیبوں کی معیاری تحریریں بھی ان میں جگہ پا سکیں۔

◆◆◆

چوراسی سال کا تارڑ

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

اس عنوان کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا تعلق شام چوراسی گھرانے سے ہے۔ ان کی نسبت تو صحیح چوراسی کے اس خاندان سے ہے، جس کا ستارہ اردو ادب پہ کئی دہائیوں تک پوری آب و تاب سے چمکتا رہے گا۔ ندا فاضلی کا نہایت خوب صورت شعر ہے کہ :

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

لیکن آج کی بات یہ ہے کہ اس شعر کی نزاکت، لطافت اور تاثیر کو پوری طرح محسوس کرنے کے باوجود ہمیں اس کے مفہوم و معانی سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ اسی دنیا میں نصف صدی کی ڈنگر کھیلنے کے بعد ہم اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ دس بیس کی شرط تو بہت کڑی ہے یہاں تو اکثر لوگوں کے اندر ایک آدمی ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ یہاں نوے پچانوے فیصد لوگ اپنے وجود میں قدرتی طور پر در آئی محض پانچ حسیات (باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ) پر موجیں مارتے پھرتے ہیں۔ وہ اس بات پہ بھی دھیان نہیں کرتے کہ یہی پانچوں خاصیتیں تو بھیں، مچھر، گدھے، بکری، اونٹ، الو، ککھڑ وغیرہ کو بدرجہ اتم ودیعت کی گئی ہیں اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ بلی ان سے زیادہ دور تک دیکھ سکتی ہے، کتا ان سے زیادہ بہتر سونگھ سکتا ہے، کوا چکھنے کے معاملے میں ڈھیر باریک ہے، مکھی کی چکھاوٹ ہم سے فزوں تر ہے اور ہاتھی کہیں تیزی اور مضبوطی سے چیزوں کو چھو اور ٹٹول سکتا ہے۔ ہمیں تو غالب کی آدمی سے انسان بننے کی فکر، خواہش یا حسرت کے پیچھے بھی چھٹی حس (Common Sense) حسِ جمال اور حسِ مزاح کا فقدان کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ کامن سینس کی بابت تو اہلِ دانش و بینش نے "Is not so common" جیسا دو ٹوک فیصلہ دے رکھا ہے۔ حسِ جمال کا اندازہ اس بات سے لگا لیجیے کہ ہمارا پیارا تاریخی اور ثقافتی شہر لاہور، دنیا کے گندے ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس پہ ستم یہ کہ اہلِ اداران کو ڈوب مرنے کی توفیق بھی نہیں۔ اور حسِ مزاح جیسی لطیف چیز کا تو پوچھیے ہی مت! ہمارے میڈیا میں زر کی طلب کی کثرت کی بنا پر کسی کی ماں بہن ایک کرنے اور سرِ عام لترپولا کرنے جیسی قبیح حرکت کو 'کامیڈی' کہہ کے پیش کیا جا رہا ہے۔

ایسے بےتوقیری وقت میں کسی آدمی کے اندر دس بیس آدمی ڈھونڈنے کی بات چلے تو نظر خود بخود مستنصر حسین تارڑ جیسے نابغوں پہ آ کے ٹھہر جاتی ہے۔ کیسا عجیب شخص ہے کہ بظاہر دیکھنے میں تو ایک ناول نگار، سفرنامہ نویس یا کالمسٹ ہے لیکن ان کے بھیتر جھانک کے دیکھیں تو کئی دنیائیں گردش میں دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے نزدیک ایک ناول، ایک جیون جینے جیسا عمل ہے۔ عام لوگوں سے تو ایک زندگی بھی ڈھنگ سے نہیں گزرتی، یہ درجنوں کاٹ دیتا ہے۔ اسی طرح سفرنامہ بھی محض آوارہ گردی کا کاروبار نہیں بلکہ کئی تہذیبوں کی مختاروں سے وار چٹنی تیار کرنے جیسی مہارت ہے۔ ہمارے ہاں اخباری کالم کو بھی محض وقتی غبار، بخار یا انتشار سمجھ کے اڑا دیا جاتا ہے حالانکہ یہ عزیزی اپنے عہد کی ہر لحظہ بدلتی صورتِ حال کا سچا اور چشم دید ترجمان ہوتا ہے۔ ہم نے کسی زمانے میں لکھا تھا کہ 'اگر قلم کا سر جھکا ہوا ہو تو حرف بنتا ہے اور قلم کار کا سر جھکا ہوا ہو تو حرف آتا ہے۔' المیہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں اپنی اور دوسروں کی خواہشوں کے سامنے جھکے سروں کی منڈی لگی ہوئی ہے۔ جعلی ماحول بنانے کے 'ماہرین' کی پانچوں گھی میں ہیں۔ لالہ بسمل نے ایسے ہی تھوڑی کہا تھا کہ :

وڈے آ گئے، نکے آ گئے ہر شعبے وچ جھلے آ گئے
کھریاں تھوڑی دیر ای بکیاں ہر تھاں کھوٹے سکے آ گئے
آون والے لیٹ ہوئے تے پچھے آ گئے، اگے آ گئے
چھکا چوکا اپنا کھلیا بڑکر آ گئے، تکے آ گئے

ایسے میں مستنصر حسین تارڑ جیسے جہاں دیدہ، تجربہ کار اور دیدہ ور لوگوں کا اس شعبے سے وابستہ ہونا غنیمت سے آگے کی چیز ہے کہ جن کا ہر عالم بصارت کی پگڈنڈی پہ چلتے چلتے، چپکے سے بصیرت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ان کی ناول نگاری کا تعلق ہے، یہ ناول جمالیات کے علم بردار ہونے کے باوجود محض رومانوی قصے نہیں ہیں۔ وہ تہذیبوں کے موازنے اور تاریخ کے تڑکے کے ذریعے اسے چیزے دیگر بنا دیتے ہیں۔ تارڑ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھیں تاریخ اور تہذیب جیسے بزرگوں کو بچوں کی طرح انگلی لگا کے ساتھ لیے چلے جانے کا ہنر آتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں چین و عرب یا روم و ایران کی ثقافت کے قصے سنانے پہ اکتفا نہیں کرتے بلکہ جا بجا اپنی جیتی جاگتی پنجابی رہتل پہ فخر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں رومیو جولیٹ یا لیلیٰ مجنوں کی بجائے اپنی سسی، سوہنی، صاحباں پہ لوٹ کے پیار آتا ہے۔ وہ تو مولانا روم کے دیسی پیروں کو بھی گھیر گھار کے پنجاب کی سرزمین پہ لینڈ کرانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ان کے ضخیم ناول ''خس و خاشاک زمانے'' میں روایتی اردو فکشن میں پیش کی جانے والی دیہاتی معاشرت کی جگہ سچا اور کھرا پنجابی کلچر ہمکتا ہے۔ یہ محض ناول نہیں بلکہ سکھوں کی ٹائم لائن سے لے کے امریکیوں کی ٹائم لائن تک کا ناول قریب ساگا ہے۔ اسی طرح ''اے غزال شب'' ہماری نوجوان نسل کو کئی دہائیوں تک بہکانے اور دہکائے رکھنے والے سرخ سویرے کی کھوکھلاہٹ اور ڈراؤنی، سناؤنی ہے۔ جس سے میں ساٹھ سال کے قریب سرکتا جا رہا ہوں ''قربت مرگ میں محبت'' میرے اندر وحشتیں ڈالتی چلی جاتی ہے۔ ''بہاؤ'' کا گھاؤ ناول کے ہر معقول قاری کے دل پہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ''راکھ'' کی ساکھ تو ناول کی سرزمین پہ معیار کا سنگِ میل بنی بیٹھی ہے۔ یہ چوراسی سال کا نوجوان تو گردِ راہ کے شب و روز میں بھی فارغ نہیں بیٹھا۔ لوگ حیران ہیں کہ اس عمر میں تو سوچ اور بوچ کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں لیکن ان کی آئے دن کوئی نہ کوئی کتاب تارڑ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ ''شہر خالی، کوچہ خالی'' ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کی ایسی ہی ایک پڑھ مثال ہے۔ کس کس کا ذکر کروں؟ ابھی تو ''قلعہ جنگی'' وقت اور اخباری کالم کی تنگی کی بھینٹ چڑھتی جاتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں، سفرناموں، کالموں میں مختلف کرداروں کے تعارف، مناظر کی عکس بندی اور مکالموں میں ہلکا پھلکا مزاح ان کی شخصیت کی شگفتگی کا پتا دیتا ہے۔ کسی زمانے میں ان کی ترش سیدھ اور دوسروں کو وہ لوگ ہدف بنانے پہ غصہ آتا تھا لیکن اب تو ان کی فن کاری، اداکاری کی ایسی دھاک بیٹھ چکی ہے کہ لوگ موضوعِ بحث بننے کی دعوت چہرے پہ سجائے پھرتے ہیں کہ تو مشتاق تارڑ کو وہ عالم میری گردن پر اپنے میں لاہور کا تذکرہ گونج رہا ہے جو ہمہ وقت تارڑ صاحب کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم ان کی ہمہ جہتی، ہمہ فکری اور ہمہ گیری کی بابت فخر و انبساط کے ساتھ کہہ سکتے ہیں:

''اس کو جو دیکھا تو کئی بار دیکھا''

◆◆◆

منظومات

اسلم انصاری

جب تم عشق نہیں کرتے

جب تم عشق نہیں کرتے
پھر آخر تم کیا کرتے ہو؟
عشق بنا جینا کیا ہے کیسے جیا جاتا ہے!
خالی خالی سے جیسے بجھے بجھے ہوئے دیپک
ٹھٹھری ٹھٹھری روشنیاں اور سہمے سہمے دیپک!
عشق تو جیسے خواب دکھانے والا ایک انوکھا شعبدہ
گر ہے
عشق نہ ہو تو خواب کوئی کیوں دیکھے گا
عشق نہ ہو تو اک انہونا جیسے ہوا کی دستک
اس دستک پہ دروازہ کھولو تو کوئی نہیں ہوتا!
عشق تو اک دستورِ عمل ہے اک منشورِ عمل
یہ نہیں ہو تو کیا ہے پھر اس جنگل کا کوئی حل
عشق بنا معمورۂ ہستی اک ویران خرابہ
عشق بنا ہے منظر منظر سوکھا پڑا خرابہ
پھر تم کیسے جیتے ہو، ہم جیسے تو ڈر سے ہی مر جاتے
ہیں!
عشق بنا ہم اچھا خاصا جیتے ہیں!

OOO

ایوب خاور

اماوس

رقص کرتا تھا سمندر
تو یہ ہوا
اس کو کیا ہوا
اس چودھویں کے چاند کو کس کی نظر سے
کالے بادل گھیر کر اپنی گپھا میں لے گئے

اے رات!
آنکھیں کھول
اس لمحے کو دیکھ
اپنے ساحل سے پرے
بپھرا سمندر
رقص کے اک زاویے میں منجمد ہے
منتظر ہے
چاند کو اپنی گپھا سے نکال
تاروں سے کہہ
بادلوں کی اوٹ سے نکلیں
ذرا سی دیر کو
اپنی جھلمل کی
کھنک کی لے دکھائیں
آنکھ بھر دیں آسمان پر
کہکشاں ترتیب دے کر تال دیں
بپھرا سمندر
رقص کرنے کو بہت بے تاب ہے

OOO

گلزار بخاری

خوشبو بکھر گئی

(پروین شاکر کی نذر)

آغاز و انتہا کی حکایت عجیب ہے
ہاتھوں نے تخم اس کا دبایا زمین میں
پانی نے خاک اس کے لیے نرم کی گئی
چپکے سے اک زمین سے پودے نے پھوٹ کر
کونپل نے جھانکنے کو ہوا وا کیا
کونپل سے شاخ، سبز شجر دار دیکھتا
دیتا ہے تتلی پر خوشی جیب اداکو و
پانی بطون گل میں بہت ابر پرورش
تتلی پہ پھول جیسے کسی سر پہ تاج ہو
پھر وہ اس طرح سے پتہ جل گیا ہے
جانے اسے نظر لگی کس بدگمان کی
اک سانحہ گزر گیا طوفان کی طرح
مانا مہک وجود کی بکھری گلاب سے
لیکن دل و دماغ کو شاداب کر گئی
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سراغ تھا
معلوم ہو رہا تھا کہ خوشبو بکھر گئی

OOO

صفدر صدیق رضی

تین سیکنڈ کی

تین سیکنڈ کی
ایک گھنٹی سی بج اٹھی ہے
تین کو صدیوں کے ملبے سے الگ کر کے
مرے جسم پر خاک کی تمام کی میلی چادر پھاڑ دی
مرے سامنے جسد کے
تین سو تھائی بیلوں کی دیواروں پہ
شاید کہیں میری تصویر ہو
یا کسی کو مرا نام بھی یاد ہو
کیونکہ مٹی میں آرام سے ڈرتا ہے
تین سیکنڈ کے بعد
میں اپنا پہلا قدم اٹھانے ہی والا تھا

OOO

افتخار بخاری

بچے اُداس نہیں

وہ بچے مرنے والی بچی سے محبت کرتے تھے
سب لوگ اداس ہیں
پھر بھی وہ بچے اداس نہیں
ایک معجزہ وہ ساری رات
ایک عام سا واقعہ
مرے ہوئے بچے کیسے اداس ہو سکتے ہیں
وہ بچے ہرگز اداس نہیں
کوئی ان بچوں کے لیے اداس نہیں

OOO

ڈاکٹر سہیل ممتاز خان

آٹے کا تھیلا

روٹی، برتنوں کی قطار سے
خود پہ برسے تھپیل لیتی ہیں
گرم
بھوک
تین کبھی کبھی
کوئی ان میں جھانک کے دیکھ لے جاتا ہے
کار بیکار لگے
یہ ٹکڑے جوڑ کر
دلیز پہ چھوڑ آتے ہیں
اور سرہانے
آٹے کا ایک تھیلا رکھ کر
غائب ہو جاتے ہیں

OOO

ڈاکٹر فوقیہ مشتاق (امریکہ)

میں اور میری ماں

میری ماں تو روشنی ہوئی
سارے خواب اس کی آنکھوں سے
چھینے گئے
اس کی ایک ایک خواہش کو کچلا گیا
روز زندگی رستی اور جلتی
جا بجا گئی حسرت لے کے خاک میں مٹ گیا
اور یہاں اک سکوت اور ظلم لاتا ہے
وہ تھی تو خواہشوں کا اسیر نہیں
روح پر ایک سکتہ ہے اور یہ جان
خاموشی کے لبادے میں چھپا ہوا
خاک ہونے کو تیار ہے

OOO

ندیم فراز

محبت

محبت تو کرو ہے یہ رشتوں کا قیدی
لکیروں کی قیدی یہ اک قید کی کشتی
یہ پھولوں کی دنیا یہ جگنوں کی جنت
جہاں خاک کی ہے اسد سے قدامت
محبت کو میرے گناہوں میں لکھے
گناہوں سے میرے تو گر آئے کو بکھرے
یہ جنتی فضا کی فرشتوں کا مسکن
جہاں پاک رہتا ہے ان کا ہی دامن
فرشتوں کی دنیا ہے آراستی
جہاں ان کا دستور رہتا نہیں ہے
جہاں ان کا قانون نافذ نہیں ہے
محبت کو رشتے کی حاجت نہیں ہے
فرشتہ کوئی ہے نہ بیت کا کاتب
کسی دل کے باہر نہ تختی لگی ہے

OOO

تقریب کُچھ بھی سہی!
ہمیشہ شاداب
وشگفتہ رہئیے!
Tibet
Tibet

افسانے

وہ جب یاد آئے

عذرا اصغر

مختصر تعارف

عذرا اصغر 22 دسمبر کو دہلی (بھارت) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی پہلی کتاب 1962ء میں چند روزہ "پیام" لاہور میں شائع ہوئی۔ 5 سے زائد ناول، 7 افسانوی مجموعے جن میں "مسافتوں کی تھکن" ناول اور افسانوی مجموعے "پت جھڑ کا آخری پتہ"، "بیسویں صدی کی لڑکی"، "کھڑکی میں بیٹھا وقت" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے، پنجابی افسانے، بچوں کا ادب، تراجم، انشائیے، خاکے، انٹرویو، تبصرے، نظمیں، ہائیکو اور ماہیے تحریر کیے ہیں۔ "تجدید نو" کے نام سے ادبی مجلے کی ادارت کے فرائض بھی ادا کرتی رہی ہیں۔ سال 2016ء میں آپ کو "تخلیق ایوارڈ" سے نوازا گیا۔

پھلوں سے لدا انار کا قد آور پودا تیز ہوا کی زد میں آ گیا۔ آندھی اتنی شدید تھی کہ اس نے تناور پیڑ کو اکھاڑ پھینکا۔ انار کا پودا تو پھر بھی کم عمر تھا۔ ممی نے مالی سے کہا: "اسے سیدھا کھڑا کر کے اچھی طرح مٹی سے دبا دو۔" "دیکھو کیسا پھل سے لدا پھندا ہے۔" اگلے روز جب چہلم کی صفیں لپیٹ دی گئیں اور کھانے کے برتن سمیٹ لیے گئے اور ایک ایک کر کے سب مہمان رخصت ہو چکے تو اس نے دیکھا انار کا پودا زمین پر دوبارہ پڑا تھا۔ وہ حسرت سے تادیر کھڑی کچے پکے اناروں کو تکتی رہی اور پھر اپنے بہتے آنسوؤں کو دوپٹے کے پلو میں جذب کرتی چپ چاپ کمرے میں آ گئی۔ اس وقت اسے اپنا کمرہ کس قدر اجاڑ لگا اور ویران بھی۔ جی چاہا ایک ہی جست میں کہیں بھاگ جائے مگر جائے اماں تو کہیں بھی نہیں تھی۔ اب تو اسے صبر کا بھاری پتھر ہی تلاش کرنا تھا۔

ہم ابھی ابھی اس شخص کے چالیسویں سے نمٹے تھے جو میرے بچپن کا گواہ تھا۔ میرا کزن ــــ میرا دوست ــــ ایک ساتھ کھیل کود کے بچپن بتایا تھا ہم نے۔ برسوں پہلے ابھی معاشرہ اتنا آراستہ و پیراستہ نہ ہوا تھا۔ گھر کی چھت پر پلنگوں چارپائیوں کی دیواری بنا کے اور چادروں کا سائبان تان کے ہم بچے مل کر ایک گھر بناتے۔ پیسہ پیسہ اکٹھا کر کے چنے، پھلیاں، پتاشے اور مرمرے منگاتے۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتنوں میں جھوٹ موٹ کے کھانے پکاتے اور جب دسترخوان بچھا جاچکتا تو وہ اچانک زینہ چڑھتا سامنے آ کھڑا ہوتا۔ آواز کو گھمبیر بنا کے کھنکھارتا اور دسترخوان کے ایک سرے پر بیٹھتے ہوئے اسی مصنوعی آواز میں کہتا۔ "اوہو بھئی! بہت بھوک لگی ہے۔ کیا پکایا ہے۔" ہم لڑکیاں مارے ادب کے سروں پر دوپٹہ کھینچ لیتیں۔ وہ ابا میاں بنا ہوتا۔ ہمارا سارا جمع جتھا چٹ کر کے وہ بڑے بزرگانہ انداز سے اٹھتا اور کہتا۔ "اچھا لڑکیو! ابا میاں حج کرنے جا رہے ہیں۔ خدا حافظ۔" باری باری وہ سب کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا اور زینہ اتر جاتا۔ یہ ہمارا ہر چھٹی والے دن کا معمول تھا۔ ہم اپنے اسی قسم کے کھیلوں میں مشغول رہتے۔ کبھی کبھی بیچ بیچ کی

ہنڈ (کھانا) بھی پکتی۔ اور ابا میاں کی ضیافت ہوتی۔ ابا میاں کے رخصت ہوتے ہی سائرہ واویلا مچاتی اور اپنے پیچھے یاد رکھنے کی طالب ہوتی ہم سب مل کر اسے سمجھاتے اور منانے کی کوشش کرتے۔ منت سماجت کرتے مگر وہ اپنی ہٹ جاری رکھتی۔ رونا دھونا شروع کر دیتی اور پھر کسی نہ کسی طرح اس کا دھیان ادھر ادھر لگایا جاتا۔ ہم فیصلہ کرتے کہ آئندہ سائرہ کو اپنے ساتھ نہیں کھلائیں گے۔ مگر ہم اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ پاتے۔ سائرہ کے اکیلے رہ جانے پر ترس آ جاتا۔ آخر تو ہماری بھولی سی تھی نا۔ زندگی کا کارواں یونہی چلتا رہا۔ ہموار اور ناہموار راہوں پر چلتا چلا گیا اور وہ وسیع و عریض ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، بکھر گیا۔ لٹے پٹے سب خاندان تتر بتر ہو گئے۔ نئی سرزمین میں جس کو جہاں جگہ ملی سر چھپا کے بیٹھ گیا۔ رہائش کا مسئلہ ــــ روزگار ملے نہ ملے ہی تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ آپا دھاپی کا عجب سا تھا۔ اسی بزدھڑ میں ہم بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی میں داخل ہو گئے تھے نئی سی تھی۔ نیا ماحول۔ نئی زبان اور کلچر کی کسی قدر تفریق ــــ ہمیں تو سب اچھا لگتا البتہ بڑے بوڑھے کبھی کبھی یاد کرتے۔ انہیں اپنے بھرے پرے گھر اور کھیت کھلیان، اونچی چوڑی حویلیاں یاد آتیں۔ لیکن تا بکے ــــ وقت کا مرہم ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن جیسے بدلتے موسم میں پرانی چوٹیں ابھرتی ابھر آتی ہیں ایسے ہی فرصت کے اوقات میں پچھلی یادیں دل میں کسک بن کر کروٹیں لینے لگتی ہیں۔ اس سے میرا اپنا رشتہ یہ بنا تھا کہ وہ میری بڑی خالہ کی بیٹی سے بیاہا گیا تھا اور میں ایک غیر خاندان کے ساتھ وابستہ کر دی گئی تھی۔ اب ہم سب اپنے اپنے مقام پر آسودہ حال تھے۔ وہ اپنا کلینک منظور کرا کے زمینداری کر رہا تھا۔ مجھے اکثر وہ زمانہ یاد آتا جب گرمیوں کی شاموں میں ہم لڑکیاں نہا دھو کر اور سج سجا کر اپنے بڑے بھائیوں اور کزنوں کے ساتھ تفریحاً باغ جایا کرتے۔ رہٹ کے پانی سے کھیلتے، موسمی پھلوں کو توڑ توڑ کھاتے اور جب شام رات کے گلے ملنے لگتی تب ہم سب ہنستے کھیلتے اور موتیا کی ادھ کھلی کلیوں سے جھولی بھر کے گھر لوٹتے۔ رات کو برابر بچھے پلنگوں پر لیٹے ہم کزنز کہانیاں کہتے، باتیں کرتے رہتے تھے۔ یہ ستاروں کا جو کھولا ہے نا جو ل، جب تم پاکستان چلی جاؤ گی تو اسے دیکھ کر سوچنا میں بھی اسی کو دیکھ رہی ہوں گی۔ پھر وہ پوچھتی۔ "کیا تم بھی مجھے یاد کیا کرو گی؟" وہ اداس ہو جاتی۔ "تو بھلا کیوں نہیں۔ بچپن کے یہ سنہرے دن کیا کبھی میں بھول پاؤں گی جنت ــــ" میں تو شدتِ دل سے اسے دلاسہ دیتی۔ لیکن دل ہی دل میں پاکستان جانے کی مجھے خوشی بھی تھی۔ نئی جگہ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ اور پھر وہ تو اپنا ملک ہوگا۔ ان دنوں متحدہ ہندوستان میں بڑی شورش تھی۔ ایک نیا ملک دنیا کے نقشے پر ابھرنے والا تھا جس کا نام پاکستان تجویز ہو چکا تھا۔ اور میرے ابا طے کر چکے تھے کہ پاکستان بننے کے اعلان کے ساتھ ہی وہ ہجرت کر جائیں گے۔ اور ہوا یوں کہ میں پاکستان کے ایک بڑے تاریخی شہر لاہور میں آ بسی۔ اور وہ سمندر پار کر کے سیدھی انگلستان جا پہنچی۔ اور روشنیوں کی چکا چوند نے ستاروں کے کھولے کو نگل لیا۔ ٹٹولتی پھرتی ہوں۔ دل دھیما ہو جائے تو بچپن سے پر نمی آنکھیں بیکار ہو جاتی ہیں۔

میں اس شہر میں اس کے چالیسویں میں شرکت کیلئے آئی تھی لیکن یہ شہر اب مجھے پہچانتا نہیں۔ یہ شہر جو کبھی میرا اپنا تھا۔ میں یہاں اجنبی ہوں اور تنہی کے پچھلے لان میں کھڑی ان پودوں کو دیکھ رہی ہوں جہاں وہ انار کا قد آور درخت تھا۔ بھی کہتی ہے۔ "آپا وہ پودا انہوں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ بڑی دیکھ ریکھ کرتے تھے اس کی۔ آندھی سے سب بچ تو سلامت رہے جانے وہ کیسے گر گیا۔ شاید پھلوں کا بوجھ نہیں سہار سکا۔ نازک سا تھا۔" "نہیں بھی میری بہن اور درخت بھی حس رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مالکوں کو پہچانتے ہیں۔ ان سے محبت کرتے ہیں۔ بس ہم انسان ان کی محبت کا ادراک نہیں رکھتے۔ وہ بھلا کیسے کھڑا رہتا۔ کے اپنی بہار دکھلاتا جب اس کا مالک ہی نہیں

رہا تھا، جو اس سے پیار کرتا تھا۔''

اور یہی سچ ہے! یہ دنیا تو مسافر خانہ ہے۔ ہر جاندار اور بے جان مخصوص مدت تک اس مسافر خانے میں قیام کرتا ہے اور پھر اپنی راہ لیتا ہے اور اس مسافر خانے میں رہ کر بھی تو انسان مسلسل اور پیہم سفر میں ہے۔ مجھی کو لو۔ متحدہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئی اور یہاں بھی شہر شہر بھٹکتی پھری۔ ہجرت اور سفر میرے وجود سے بندھ گیا ہے۔ میں اب جس شہر میں ہوں یہ دور دور تک بلند و بالا پہاڑوں میں گھری ہوئی خوبصورت بستی ہے۔ رات کو ستاروں کا کھلا آنگن نظر نہیں آتا۔ ان اونچے پہاڑوں پر بتی جھلملاتی روشنیاں دلفریب منظر پیش ضرور کرتی ہیں اور میں نے اپنے وسیع لان کی کیاری میں انار کا پودا لگایا ہے اور اس پر سرخ سرخ کلیاں آ رہی ہیں اور میرے دل کے ویرانے میں بیتے دنوں کے پھول کھل رہے ہیں۔

◆◆◆

تبصرہ

خیال کی شطرنج

شاعر : امجد بابر

صفحات: 144 قیمت: -/700 روپے ناشر: سانول پبلشنگ، گوجرہ

امجد بابر نظم اور غزل کے پرانے شاعر ہیں۔ ان کی تین دیگر کتب بھی شائع ہو چکی ہیں جن میں غزلیات کا مجموعہ بھی شامل ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ صرف نظموں پر مشتمل ہے اور یہ نظمیں شاعر کے دل سے نکلی ہوئی وہ صدائیں ہیں جن میں عصری حسیات ہی جلوہ فگن ہیں اور کائنات کے سربستہ رازوں کی بات بھی کی گئی ہے۔ ان کا اندازِ تحریر پرکشش اور دلربا ہے۔ انھوں نے الفاظ کے چناؤ میں بھی تخلیقی پہلو کو مدِنظر رکھتے ہوئے عمدہ اور بہترین استعاروں کے استعمال سے شعری فضا کو مالا مال کیا ہے۔ ان نظموں کے موضوعات گرد و پیش سے لیے گئے ہیں مگر انھیں نظموں کا روپ دینے کے لیے امجد بابر نے اپنا منفرد اسلوب اپنایا ہے اور ایسی روانی عطا کی ہے کہ یہ نظمیں خود کو پڑھنے کے لیے اکساتی ہیں۔ چند نظموں سے اقتباس ملاحظہ کریں: (1) اس کا کوئی پتہ نہیں ہے / اسے وہ غربت کے صندوق میں بند کر کے / دریا کے نیل میں بہا دیں گے (غریب بچے کا خواب) (2) تخلیق کار بذاتِ خود ناقد ہے / یہ بازاری ناقد / تعصب کی عینک سے / اپنی کھوکھلی ادبی تحسین کرتے ہیں / جمع و ضرب کی تقسیم کرتے ہیں (نقاد نہیں جانتا) (3) شاعر کے حصے میں / ہاتھ کی تختی / پھولوں سے بھرے ہوئے کاغذ / لفظوں کی ریزہ کاری / تنہائی کی ریزی آتی ہے (شاعری وراثت)

نظم کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک خاص مقام پر جا کر رک جاتی ہے۔ غزل کی طرح اس کی پرواز انتہائی بلندی تک نہیں ہے مگر پھر بھی عصرِ حاضر میں بہت سے ایسے نظم نگار ہیں جو نظم کی روایت سے پوری طرح منسلک ہیں اور اس کی سربلندی کے لیے کوشاں ہیں۔ ایسے نظم نگاروں میں امجد بابر بھی اپنے حصے کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ ان کی ان نظموں کی قرأت ذہن و دل کو ایک سرشاری اور طمانیت سے ہمکنار کرتی ہے اور قاری کے دماغ کے بند دریچے وا کرتی ہیں۔ ایک اور نظم ملاحظہ ہو: ''ہم اپنی زندگی نہیں گزارتے / بلکہ اپنی مرضی کے لحاف اوڑھ کر / نیند کی گہرائی میں اتر جاتے ہیں (خواب کہانی)

سلور پینی

فرحت پروین

مختصر تعارف

فرحت پروین معروف فکشن رائٹر ہیں۔ ان کی 5 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ افسانوں کی کتاب "کانچ کی چٹان"، "منجمد" ناول "صندل کا جنگل" بہت خوبصورت کتابیں ہیں۔

"آخر آدھی رات کو تمہیں یہ ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔ صبح ہونے کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔" ماں نے دھیمی آواز میں سمن کو جھڑکا۔ سمن نے بہت دکھ سے ماں کو دیکھا مگر خاموش رہی۔ وہ سوچ رہی تھی لوگ بوڑھے ہو کر اتنے کٹھور کیوں ہو جاتے ہیں۔ کیا پتہ اسے اب مدد کی ضرورت ہو۔ کیا پتہ صبح تک کیا ہو جائے۔ وہ اندر ہی اندر کانپ گئی۔ اس نے تو ماں کے بیڈروم چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد پولیس کو فون کیا تھا۔ اور خود باہر نکل کر دروازے پہ کھڑی ہو گئی تھی تاکہ پولیس کو گھنٹی نہ بجانی پڑے اور ماں کو پتہ نہ چلے۔ مگر عین اس وقت جب پولیس کار پہنچی اور ابھی آفیسر اس میں سے اترا ہی تھا کہ ماں جو غالباً کچن سے کچھ لینے آئی تھی۔ اس نے کچن کی کھڑکی میں سے پولیس کار اور بیٹی کو پولیس آفیسر سے بات کرتے دیکھ لیا۔ وہ باہر آ گئی۔ آن کی آن میں دوسری اور پھر تیسری کار بھی آ گئی۔ اور وہ تینوں سمن کی رہنمائی میں سوزین کے گھر کی طرف چل پڑے۔ ماں بھی ساتھ چل پڑی۔ گھر کے سامنے پولیس افسران جن میں ایک لیڈی پولیس آفیسر تھی۔ اس نے ماں بیٹی کو ہدایت دی کہ "آپ لوگ یہیں باہر کھڑے رہیں ہم چیک کر کے آتے ہیں۔" وہ گھنٹیاں بجاتے رہے مگر کوئی جواب نہ ملا۔ انہوں نے ٹارچ جلا کر سمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا اور دروازے پہ لگا ہوا نوٹ پڑھا۔ لیڈی پولیس آفیسر ان کی طرف آئی اور سمن سے پوچھا۔ "کیا تم اس لیڈی کی کیئر گیور ہو؟ پرائیویٹ یا سوشل سکیورٹی کی طرف سے؟" "نہیں، وہ صرف میری دوست ہیں۔" لیڈی آفیسر نے دھان پان سی نوعمر سمن کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ وہاں اپنے ساتھیوں سے جا ملی۔ لیڈی آفیسر پھر ان کی طرف آئی اور سمن سے مخاطب ہوئی۔ "ممکن ہے وہ کہیں گئی ہوئی ہوں۔" "مگر ان کے گھر کا دروازہ غیر مقفل ہے۔" "وہ عمر رسیدہ عورت ہے۔ ممکن ہے وہ تالا لگانا بھول گئی ہو۔ ممکن ہے وہ اکثر تالا نہ لگاتی ہو۔" "نہیں وہ ایسا نہیں کرتی۔ مجھے وہ کہیں جائے تو بہت تاکید سے اپنے گھر کو تالا لگا کر جاتی ہے۔" "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"میں جانتی ہوں۔ کیونکہ جب میں نے اسے ہائی سکول کی گریجوایشن پہ بلایا تھا تو اس نے ربن میں پروئی ہوئی چابیاں گلے میں پہنی ہوئی تھی۔ اور جب واپسی پر میں اسے چھوڑنے گئی تھی تو اس نے چابی گلے سے اتارے بغیر جھک کر تالا کھولا تھا۔" پولیس آفیسر مسکرا دی مگر دوسرے ہی لمحے اسکے چہرے کی پیشہ ورانہ سنجیدگی لوٹ آئی۔ "جب تم اتنا کچھ جانتی ہو تو تمہیں اس کے گھر کا نمبر کیوں نہیں معلوم تھا کہ تم پولیس کو اپنے گھر بلا کر گھر دکھانے ساتھ آئی ہو۔" ماں نے کڑی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ "مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا نمبر دیکھنے کا۔ اتنے قریب ایک ہی سڑک پر تو رہتی ہے۔" "آں ہاں" آفیسر نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور وہ واپس مڑ گئی۔

پولیس آفیسر جو بھی جو بھی دار بھی جلا کر گھر کے اندر چلے گئے۔

”یہ تو بہت زیادہ کھٹا باقی والا قصہ ہو گیا ہے۔ اچھا سلسلہ مل رہا ہے تمہیں اور روزی کا۔“ ماں فکرمندی سے بولی۔ سمن خاموش رہی۔ وہ نہ تو ہوزین پر ترس کھا رہی تھی اور نہ ہی تنگ کھا رہی تھی۔ وہ اسے سچ مچ دوستوں کی طرح چاہتی تھی۔ اس کی شخصیت کی وجہ سے وہ اس کے لیے فکرمند تھی اور دل ہی دل میں اس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگی۔ گزشتہ واقعات کی فلم اس کے ذہن کے پردے پر چل رہی تھی۔ جب انھوں نے اس علاقے میں گھر لیا تھا تو وہ بہت چھوٹی تھی۔ ابھی نئی نئی تیسری جماعت میں آئی تھی۔ وہ سڑک پر سکیٹنگ کرتی ہوئی اس کے گھر کے سامنے سے گزری تو اس نے ہوزین کو اپنے لان میں کام کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ”ہیلو پیاری لڑکی۔“ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ واپسی میں وہ اس کے پاس رکی اور اس سے پوچھا۔ ”کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”اوہو تو تم بھی بڑی میری مدد کرنا چاہتی ہے۔۔۔ اگر مجھے مدد کی ضرورت نہ بھی ہوئی تو بھی میں تمہاری پیشکش قبول کر لیتی تاکہ تمہاری خوبصورت صحبت میں تھوڑی دیر خود کو تروتازہ کر سکوں۔“ اور یوں ان کی دوستی ہو گئی۔ وہ ان کے چھوٹے سے لان کی دیکھ ریکھ میں ان کی مدد کرتی۔ کبھی کبھی وہ اسے اندر بلا لیتی۔ اپنی شاپنگ دکھاتی۔ کبھی کبھی وہ باتھ ٹب میں پانی بھر کر اس میں اپنی کاغذ کی کشتیاں تیراتے اور بیٹھ کر دیکھتے کہ کس کی کشتی آخر تک تیرتی ہے۔ وہ بالکل بچوں کی طرح بے ایمانیاں بھی کرتی۔ جب اس کی کشتی ڈوبنے لگتی تو وہ اسے اٹھا لیتی۔ میں نے سوچا تم جیت جاؤ۔۔ اوکے۔۔ اوکے۔۔ تم جیت گئیں اور وہ تالیاں بجانے لگتی۔ وہ بالکل برابر کی عمر کی دوستوں کی طرح باتیں کرتے۔ لیڈی آفیسر پھر سے نمودار ہوئی اور اس سے پوچھا کیا اس کے بچے ہیں، اور اگر ہیں تو کہاں رہتے ہیں؟ ”ہاں، بچے ہیں ایک۔۔۔ یہ اپنے بیٹوں کا ذکر کرتی ہے۔“ ”کہاں رہتے ہیں؟“ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ میں نے ہوزین سے کبھی کچھ نہیں پوچھا۔ وہ خود ہی جو کچھ بتاتی ہے میں سن لیتی ہوں۔“ ”آس پاس کے لوگوں کو معلوم ہوگا۔ اس گھر میں ہمارے آنے سے پہلے سے رہتی ہے۔“ ماں نے آفیسر کو بتایا۔ ”آپ لوگ کب سے یہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”بارہ سال سے۔“ ماں نے جواب دیا۔

”میں دراصل اب کالج پڑھنے دوسرے شہر چلی گئی ہوں۔ چھٹیوں میں آئی تھی، ہوزین سے ملنا چاہتی تھی۔ میری اس کی بچپن کی دوستی ہے۔“ سمن نے پولیس سے کہا۔ آفیسر واپس چلی گئی۔ سمن پھر سے اپنی سوچ میں کھو گئی۔ ہوزین اتنی محبت کرنے والی، اتنی زندہ دل اور اچھی ہے۔ وہ بڑے مزے سے اپنے سکول اور کالج کے زمانے کے قصے سناتی ہے۔ اس نے میوزک پڑھا تھا اور اپنے بینڈ کے ساتھ امریکہ کے مختلف شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے پاس اب بھی پیانو تھا، جسے وہ سمن کو بجانے دیتی اور خود پاس کھڑی مسکراتی رہتی۔ حالانکہ وہ خود میوزک ٹیچر ہے پھر بھی اسے اوندھے سیدھے بجانے پر کبھی نہیں ٹوکتی۔ وہ اب بھی پرانے قصے سناتے ہوئے ہنس ہنس کر لال گلال ہوتی ہوئی کمسن لڑکی لگنے لگتی۔ وہ اپنی شادی کا قصہ بھی بہت مزے سے سناتی ہے۔ ”میری ماں نے میری شادی کے لیے جو لڑکا پسند کیا وہ مجھے اچھا نہیں لگا، اس لیے جس دوسرے لڑکے نے مجھے شادی کی پیشکش کی میں نے فوراً منظور کر لی۔“ وہ اکثر اپنی بات درمیان میں ادھوری چھوڑ کر دوسری بات شروع کر دیتی۔ اور دوسری بات سناتے سناتے جیسے ہی اسے پہلے بات یاد آتی تو وہ دوسری کو ادھورا چھوڑ کر پہلی کو مکمل کرنے لگتی۔ سمن کو بات کے تسلسل سے زیادہ اس بات کا خیال رہتا کہ اسے احساس نہ ہو کہ وہ بات کرتے کرتے بھول جاتی ہے۔ اس لیے بڑی دلچسپی سے سنتی رہتی۔ وہ اپنی سرجری اور ڈاکٹروں کے قصے یوں مزے مزے سے سناتی جیسے کسی دلچسپ کہانی کی روداد۔ اس نے بتایا کہ ”تم لوگوں کے آنے سے ایک برس پہلے میرا بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ کئی ہڈیاں چورا چورا ہو گئیں۔“ وہ یوں ہنسنے لگی جیسے کوئی لطیفہ سنا رہی ہو۔ ”بے بی میں تم سے زیادہ مضبوط ہوں، میری ہڈیاں لوہے کی ہیں۔“ پھر وہ بالکل بچوں کی طرح مٹھیاں بھینچ کر اور بازوؤں کو

سینے پہ کراس کر کے ایک لے میں بولی۔ "آئی ایم این آئرن لے۔۔۔۔۔۔ آئی ٹی ٹی کا" (ladyironamanI) "اس سے تمہیں گھٹنے موڑنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی" "اس نے پوچھا۔ "ہوتی ہے اسٹیپ میں گھٹنے موڑتی ہی نہیں"۔ وہ زور سے ہنسی۔ "پلیز مم جو ہو یہ ہے تو پھر سیڑھیاں۔۔۔۔۔۔" ثمن نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیا سے احساس ہوا تھا کہ اس سوال کی کیا ضرورت تھی۔ "اس کا تو بہت آسان حل ہے، ذرا سی دیر کو بھالو بن جاؤ۔ ایسے۔۔۔۔۔" اور وہ حیرت انگیز پھرتی سے بچوں کی طرح سیڑھیوں پہ ہاتھ ٹکا ٹکا کر پتہ نہیں کیسے گھسٹتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ "آئی ایم سپر ہیرو۔۔۔ (SamhereamI)"

اس نے اوپر پہنچ کر نعرہ لگایا۔ "اب میں نیچے نہیں آ رہی، تم نے آنا ہے تو اوپر آ جاؤ۔" "نہیں، میں چلتی ہوں اب"۔ اسے اس طرح سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر اسکا دل دکھ گیا۔ زندگی کے ہر نشیب و فراز کے ساتھ خوشی خوشی تن تنہا جینے کا یہ ہنر کتنی پیاری ہے یہ خاتون۔ وہ اپنے لیے پیدل ہی جا کر گروسری سٹور سے سودے لے آتی ہوا تنا قریب بھی نہیں تھا۔ پچھلی بار کوئی دو مہینے پہلے وہ اسکے لیے ایک بیتی لے آئی جس کے اوپر گول گول سے پیلے پتے تھے۔ "اسے سلور چپی کہتے ہیں ننھی پری۔ یہ ہمیشہ ایسے ہی رہتے ہیں۔ جب یہ تازہ ہوتے ہیں تو بھی انکے پتوں کا رنگ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے پاس یہ کب سے ہے۔ بہت کمیاب ہے۔ اسے تم اپنے کمرے میں سجاؤ" "اچھا" ثمن نے احتیاط سے اس بیتی کو پکڑ کر تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمیشہ شاداب رہتی ہے۔ پھر تو یہ تم ہو سویٹ ہارٹ"۔ "ہاں ہم یہ میں ہوں، ہمیشہ تمہیں اپنی یاد دلانے کے لیے۔" اس کے لہجے میں اداسی در آئی اور ثمن کو لگا کہ جیسے اسکی آنکھوں میں نمی آ چکی ہو۔ "چلو آج یک پارک میں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں"۔ ثمن نے پیشکش کی۔ "نہیں ہم میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں"۔ "کیا ہوا سویٹ ہارٹ تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں پیاری پری"۔ اس نے اس کا گال تھپتھپانے کیلئے ہاتھ بڑھایا مگر پھر واپس کھینچ لیا اور ہاتھ دیکھتے ہوئے بولی۔ "بہت کھردرے ہیں نا"۔ اور شرمندہ سی ہو کر ہاتھ گرا دیے۔ اس لمحے وہ اتنی معصوم اتنی پیاری لگی کہ ثمن نے اسکے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ "نہیں، میں نے اس سے خوبصورت ہاتھ کبھی نہیں دیکھے"۔ "تم تو سچ مچ بڑی ہوگئی ہو میری ننھی دوست۔" اس نے ثمن کے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "فنکار ہاتھ ہمیشہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ وہ حسن تخلیق کرتے ہیں۔ تم پینٹنگ کرتی ہو نا۔" "اور تم میوزک تخلیق کرتی تھی نا خوبصورت لیڈی"۔ اور وہ دونوں ہنس دیں۔ "زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ ہے نا ہم؟" "ہاں زندگی بھی خوبصورت ہے اور اس کو سراہنے والی بھی"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت ہے۔ ابھی بھی اسکی شکل پہ کیسی ملاحت ہے۔ جوانی میں تو انتہائی حسین رہی ہوگی۔ "آنٹی دیر لگا دی۔ پتہ نہیں کیا کر رہے ہیں"۔ ماں کھڑے کھڑے اکتا گئی۔ "اماں، آپ چلی جائیں میں آ جاؤں گی"۔ "نہیں ایک ساتھ چلیں گے"۔ "اماں یہاں کی پولیس بہت اچھی ہے۔ آپ فکر نہ کریں"۔ "ہاں تبھی رہتی ہوں واقعات!"۔ "ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے"۔ "کون جانے وہ بہت کم کب ہو جائے۔ ہوشیار رہنا چاہیے"۔

"ٹھیک ہے" ثمن نے کہا۔ "تو پھر کیسے بے اعتبار ہو جاتے ہیں بڑے ہو کر یہ لوگ"۔ اس نے بدمزہ ہوتے ہوئے سوچا۔ اور اس کا دھیان پھر سے سویٹ ہارٹ میں جا پڑا۔ "ایک روز اس نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر کیسٹ تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ کتنے باز ہے۔ اس نے سٹور کے فرنیچر میں شراب رکھی ہوئی تھی۔ جسے وہ مستقل پیتا رہتا تھا۔ کثرت شراب نوشی نے اسکے گردوں کو تباہ کر دیا۔ وہ بہت بیمار رہنے لگا۔ اور ایک رات وہ ایسا سویا کہ پھر نہیں اٹھا۔ وہ کیسٹ تھا اس نے کوئی دوائی کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ وہ اپنی صحت کی خرابی سے تنگ آ گیا تھا۔ یہ تم جس گھر میں رہتی ہو یہاں ایک سرجن رہتا تھا۔ وہ ہمارا دوست تھا۔ اس نے خاموشی سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ دے دیا۔ ورنہ تو پولیس کیس تھا۔

اور بات مجھ پر آئی کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔ حالانکہ اسکی کوئی جائیداد یا لائف انشورنس تو تھی نہیں۔ میرے بچے ابھی سکول میں تھے۔ پلے گئے، بہت گئے، سب ہو گیا سیم"۔ وہ کہتی ہے کہ اسکی ایک بیٹی اسی شہر میں رہتی ہے۔ اور اسکا بہت خیال رکھتی ہے۔ مگر اس نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔ سوزین نے اپنی کسی مشکل یا تنہائی کا بھی ذکر نہیں کیا۔ اسے کسی سے کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ دو ماہ پہلے وہ اپنی عمر بانوے سال کی رہی تھی۔ "زندگی کتنی خوبصورت ہے سیم"۔ اس نے کہا تھا۔

مگر آج اسکی غیر معمولی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ آج صبح کے قریب اس نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی تو سوزین کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کور تھا اور چہرے پر خلاف معمول اداسی تھی۔ اس نے حسب عادت مسکرانے کی کوشش کی، مگر اسکی آنکھیں اداس ہی رہیں۔ اس نے کور کچن کاؤنٹر پر رکھ دیا اور خود وہ کاؤنٹر سے ٹک کر کھڑی ہو گئی۔ سمن اپنے لئے سینڈوچ بنا رہی تھی۔ ایک سینڈوچ تمہارے لئے بھی بنا دوں، اس نے سوزین سے پوچھا۔ مگر اسکے جواب نہ دینے پر پلٹ کر اسے دیکھا اور حیرت سے دیکھتی ہی رہ گئی۔ سوزین آہستہ آہستہ دھندلاتی جا رہی تھی شفاف ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس شفاف سوزین کے اندر بالکل اس کے جیسی ایک چھوٹی سی بچی نے مسکرا کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ پھر وہ بھی دھندلا گئی اور سوزین ہلکی ہو کر ایک پری کی طرح اڑنے لگی۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کور کھولا کہ شاید کوئی سراغ ملے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس میں صرف ایک کاغذی کشتی تھی جو جھیک کر ڈوبنے والی تھی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب تو خواب ہوتے ہیں اس نے خود کو تسلی دینا چاہی مگر گھبراہٹ کم نہ ہوئی۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ ابھی صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔ جوں توں کر کے اس نے نو بجنے کا انتظار کیا اور اس سے ملنے چلی گئی۔ دروازہ اگرچہ غیر مقفل تھا مگر گھنٹی بجانے پر کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دن میں کئی چکر لگائے مگر صورت حال وہی رہی۔ آخر وہ دروازے پر نوٹ لگا کر چلی آئی کہ وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ لوٹنے پر اس سے رابطہ کرے گی۔ پھر وہ اپنی فیملی کے ساتھ باہر کھانے پر چلی گئی۔ واپس لوٹنے پر اس نے دیکھا کہ اس کا نوٹ ابھی تک اسی طرح دروازے پر لگا ہوا ہے۔ اپنا خواب اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ اسکی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور آخر اس نے پولیس طلب کر ہی لی۔ اور جب پولیس والے باہر آگئے۔ "وہ ٹھیک ہے نا، وہ گھر ہی میں ہے نا؟" سمن نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں" آفیسر نے رسان سے کہا۔ "اچھا اب آپ لوگ گھر جائیں"۔ "کیا وہ سو رہی ہے"؟ سمن نے پوچھا۔ "رات کے دو بج رہے ہیں بیٹا"۔ ماں نے یاد دلایا۔ "ٹھیک ہے میں اس سے صبح مل لوں گی"۔ اور وہ دونوں بغیر کچھ کہے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ اور اندر سوزین وہ ہوا دار فراک پہنے، جو سمن اسکے لئے پچھلی بار لائی تھی۔ اسکے اپنے باغیچے کا گلدستہ جو گلابی ربن سے بندھا ہوا تھا اور جس کے ساتھ بندھے کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ "میری تنہائیوں کی ساتھی۔ میری ننھی دوست سمن کے لئے۔ دل و جان کی پوری محبتوں کے ساتھ"۔ گلدستہ ذرا دور پڑا تھا۔ جیسے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا ہو۔ وہ فرش پر چت پڑی تھی۔ "اسے مرے ہوئے بارہ گھنٹے ہو چکے ہیں"۔ ڈاکٹر نے چیک کر کے بتایا۔ لڑکی کی چھٹی حس ٹھیک تھی۔ پولیس آفیسر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سمن بے دلی سے چلتی ہوئی جا رہی تھی۔ اسکا دل نہ جانے کیوں ابھی بھی بے چین تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے پر اسکی نظر سلور جیلی پر پڑی۔ تو اسکی آنکھیں خواہ مخواہ بھیگ گئیں۔ اس نے سلور جیلی کی شاخ کو احتیاط سے اٹھایا اور پھر آہستگی سے وہیں رکھ دیا۔ کل وہ سوزین کو بتائے گی کہ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے تو وہ کتنی خوش ہوگی۔

◆◆◆

محبت: ایک مفروضہ

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

مختصر تعارف

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال 10 سال کی عمر میں ہی بصارت سے محروم ہو گئے لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ لاہور میں نابینا افراد کے ایک سکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر میٹرک، ایم اے انگلش، ایم اے اردو اور پی ایچ ڈی عام تعلیمی اداروں سے کی۔ انھیں پاکستان کے پہلے نابینا ایم۔ اے انگریزی کرنے والے فرد اور پہلے لیکچرار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اردو، انگلش، پنجابی اور فارسی میں 10 کتب شائع ہو چکی ہیں۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی کئی کتب آ چکی ہیں۔ اب تک 24 سے زائد کتب قارئین کی نذر کر چکے ہیں۔ حکومت پاکستان نے حال ہی میں تمغۂ امتیاز سے نوازا ہے۔

مجھے منطق میں ید طولیٰ حاصل تھا مگر مزاجاً میں بہت نرم خو اور شائستہ تھا۔ میں ہر شے کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ میرے سامنے ہر چیز واضح ہوتی تھی۔ استدلال میری فطرت ثانیہ تھی۔ ہاں ہاں مجھ میں یہ تمام اوصاف تھے۔ میرا دماغ ڈائنمو کی طرح تیز طرار تھا اور ریزر بلیڈ کی طرح تیکھا اور ذرا سوچئے میری عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اس قسم کا دیو قامت ذہن ہوتا ہے کسی کا؟ ذرا پیٹی بیلوز کے بارے میں غور فرمایئے۔ ویسے تو ہم دونوں یونیورسٹی میں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ وہ میرا ہم عمر بھی تھا اور ہمارا خاندانی پس منظر بھی ایک ہی جیسا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ جیسے کہ اس کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ تھا بہت شریف مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں۔ نرا جذباتی، متلون مزاج، دوسروں سے بہت جلد متاثر ہو جانے والا اور اس کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ نرا جذباتی، عقل و خرد سے کوسوں دور۔ وہ ہر نئے فیشن پر مرتا تھا اور وہ ہر وہ کام کرتا تھا جو دوسرے کرتے تھے۔ میری نظر میں یہ حماقت کی انتہا تھی لیکن پیٹی کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایک شام وہ اپنے بستر پر اس طرح سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا کہ مجھے لگا کہ وہ اپنڈیکس کے شدید درد میں مبتلا ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ ٹھہرو، حرکت مت کرو، تمہیں کسی سکون آور دوائی کی حاجت تو نہیں، میں ابھی کسی ڈاکٹر کو بلوائے دیتا ہوں۔ لیکن وہ چیخا ''مجھے ایک ریکون کوٹ چاہیے'' مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا روگ جسمانی نہیں ذہنی ہے۔ ''تمھیں ریکون کوٹ کیوں چاہیے؟'' وہ اپنا سر پیٹنے لگا ''میں ریکون کوٹ لے کر رہوں گا'' ''میں نے دیوانہ وار ساری دولت کتابوں کی نذر کر دی اور اب میں ریکون کوٹ نہیں لے سکتا'' میں نے بے یقینی کی حالت میں کہا تمہارا مطلب کیا ہے۔ وہ بولا یونیورسٹی میں جتنے امیر لوگ ہیں سب کے پاس ریکون کوٹ ہے۔ وہ بستر سے اٹھا اور کمرے میں دیوانہ وار گھومنے لگا۔ ''میں ریکون کوٹ لے کر رہوں گا'' ''پیٹی، ذرا ہوش کے ناخن لو۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ کوٹ بڑے غلیظ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بو آتی ہے۔ یہ بڑے بھاری بھرکم ہوتے ہیں۔ یہ کسی کو ایک نظر نہیں بھاتے۔ وہ

چلا گیا۔۔۔ رنگون کوٹ ہی سب کچھ ہے۔ میں زمانے کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں اور سچ میں کوٹ کے بدلے کچھ بھی قربان کر سکتا ہوں۔'' تم کوٹ کے بدلے کچھ بھی قربان کر سکتے ہو؟''۔ میرا دماغ کچھ سوچنے لگا۔ ''ہاں، کیوں نہیں، ہر چیز ۔۔۔ ہر ایک چیز'' مجھے معلوم تھا کہ رنگون کوٹ کہاں سے ملے گا۔ میرا والد کالج کے دنوں میں یہ کوٹ پہنا کرتا تھا اور اب یہ اس کے کسی صندوق میں پڑا ہوا تھا۔ چیلی کے پاس ایسی شے تھی جو میں لینا چاہتا تھا۔ وہ اس شے کا مالک تو نہیں تھا لیکن اس شے پر اس کا پہلا حق ضرور تھا۔ میں نے اس کی محبوبہ پولی اسمتھ کا نام لے دیا۔ میں ایک عرصے سے پولی اسمتھ کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا لیکن میرا اس سے کوئی جذباتی لگاؤ نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ جذبات کو برانگیختہ کرنے والی حسینہ تھی لیکن میرا خیال یہ تھا کہ میرا دل میرے ذہن پر کبھی غالب نہیں آ سکا تھا۔ میرا تعلق اس سے کوئی جذباتی نہیں تھا بلکہ کچھ ضروریات تھیں جو اس کے ذریعے پوری ہو سکتی تھیں۔ وہ حسین تو تھی ہی لیکن اس کے نین نقش کوئی اتنے تیکھے نہیں تھے لیکن بظاہر وہ بڑی باوقار دکھائی دیتی تھی۔ میں پولی کو کچھ اور وجوہات کے پیش نظر اپنانا چاہتا تھا۔ میں قانون کا طالب علم تھا اور بہت جلد قانون کے پیشے سے منسلک ہونے والا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس پیشے کے لئے کس طرح کی بیوی درکار تھی۔ گو وہ ذہین نہیں تھی لیکن میرا خیال تھا کہ میری راہنمائی میں وہ بہت نکھر جائے گی اس کوشش شرط تھی۔ ایک حسین سیدھی سادی لڑکی کو تیز طرار بنایا جا سکتا ہے۔ چیلی نے سوال داغ دیا کہ کیا تمہیں اس سے محبت ہے؟'' میں نے کہا کہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن میں اپنے جذبے کو محبت نہیں کہہ سکتا۔ میں نے چیلی سے پوچھا کہ کیا وہ پولی اسمتھ سے ازدواجی تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے؟ اس نے کہا نہیں لیکن ہم اکثر و بیشتر ملتے جلتے رہتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا چلو یہ بتاؤ کہ وہ کسی اور شخص سے محبت تو نہیں کرتی؟'' ''جہاں تک مجھے علم ہے۔۔۔ نہیں!''۔ مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ ''دیکھو اگر تم راستے سے ہٹ جاؤ تو میرے لئے میدان خالی ہو جائے گا ٹھیک ہے ناں''۔ اس نے کہا کہ تمہارا مطلب کیا ہے؟ میں نے بڑی معصومیت سے کہا ''کوئی خاص مطلب نہیں''۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا سوٹ کیس نکالا اور کہا کہ میں اختتام ہفتہ پہ گھر جا رہا ہوں اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا سنو! گھر جا کر اپنے ابو سے کچھ روپے میرے لئے لے آنا کہ میں ایک رنگون کوٹ خرید لوں۔ میں نے کہا ''فکر نہ کرو میں کچھ نہ کچھ اس سے بہتر ہی کروں گا''۔ میں نے یہ بات بڑے پراسرار انداز میں کی۔ سوموار کو میں واپس آیا میں نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور بھاری بھرکم بالوں والا اپنے باپ کا رنگون کوٹ اس کے سامنے رکھ دیا اس نے اپنے ہاتھ کوٹ میں دھنسا دیئے اور پھر چہرہ بھی اس میں چھپا لیا۔ اس نے کوئی پندرہ بیس بار واہ واہ کہا ''تمہیں یہ پسند ہے ناں'' میں نے پوچھا ''کیوں نہیں کیوں نہیں'' اس نے خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پولی چاہیے'' وہ سہم سا گیا ''تمہیں پولی چاہیے ٹھیک ہے''۔ اس نے کوٹ پھینک دیا ''ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا'' اس نے بڑی جوانمردی سے کہا۔ ''چلئے ٹھیک ہے'' میں نے کہا۔ ''تم نہیں چاہتے کہ تم بڑے لوگوں جیسے ہو جاؤ'' پھر میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی کتاب پڑھنے لگا مگر وہ کوٹ کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی غریب بچہ بیکری کی کھڑکی سے اندر پڑی ہوئی اشیاء کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس نے پوری کوشش کی کہ وہ اپنے آپ پر قابو پا لے لیکن کوٹ اس کے سامنے پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ کوٹ کی خواہش اسے کھائے جا رہی ہے یا اسے شدید جھٹکا ہوا اور بے تابانہ وہ کوٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس میں کوٹ کی خواہش جاگنے لگی اور پولی کے بارے میں اس کی مستقل مزاجی جواب دے گئی۔ میں نے کہا ''دیکھو مجھے پولی سے کوئی پیار نہیں ہے۔ پولی میری محبت کیا ہے۔ بس میں تو کچھ دیر کے لئے اس کے ساتھ گپ شپ کرنا چاہتا ہوں دل بہلانا چاہتا ہوں، ذرا مسکرانا چاہتا ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم کوٹ پہن کر دیکھو تو'' اور اس نے کوٹ پہن لیا۔ کوٹ اس کے کانوں

اور جوتوں تک پھیلا ہوا تھا لگتا تھا کہ وہ خود ریکون میں داخل کیا ہے، وہاں یہ عین میری جسامت کے مطابق ہے۔ میں اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور کہا لاؤ ہاتھ سودا ہو گیا مان۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

پولی سے میری پہلی ملاقات اگلی ہی شام کو ہوئی دراصل یہ اس کو سمجھنے بوجھنے کی ملاقات تھی مجھے دیکھنا تھا کہ اسے اپنے معیار تک لانے میں مجھے کتنی محنت کرنا ہو گی۔ میں نے اس کے ساتھ کھانا کھایا اور فلم دیکھی۔ جب ہم وہاں سے اٹھے تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ فلم بہت اچھی تھی۔ پھر میں نے اسے اس کے گھر پہنچا دیا۔ اس نے رخصت ہوتے وقت کہا میرا وقت بہت ہی پر جوش گزرا ہے۔ میں اپنے کمرے میں بوجھل دل کے ساتھ داخل ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کتنی بڑی مہم ہے جو مجھے سر کرنا ہو گی۔ پولی کی معلومات صفر کے برابر تھیں۔ مجھے لگا کہ مجھے تو اسے بہت کچھ سکھانا پڑے گا اور یہ کام بہت ہی مشکل دکھائی دیتا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسے پھر پیٹی کے حوالے ہی کر دوں لیکن پھر مجھے اس کی بھرپور جوانی کا خیال آیا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ کس خوبصورتی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور کس نفاست سے اس نے چھری کانٹوں کا استعمال کیا تھا۔ یوں میں نے عہد کر ہی لیا کہ اس مجسمۂ حسن کی تربیت کر ہی لی جائے۔ میں نے یہ کام بڑے قرینے اور سلیقے سے شروع کیا۔ پہلے تو میں نے اسے منطق کے بارے میں تفصیل سے بتایا کیونکہ ان دنوں میں خود قانون کا طالب علم تھا اور منطق کے بارے میں پڑھ رہا تھا اور تمام حقائق مجھے معلوم تھے۔ دوسری ملاقات میں، میں نے اس سے منطق کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ ''یہ تو بہت بڑا وبال ہے'' وہ کہنے لگی۔ اس حسینہ کے بارے میں ایک بات کہہ دوں کہ اس جیسی کوئی اور ملنا مشکل تھی ہم کیمپس میں پہنچے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

اس نے میری طرف مشتاق نگاہوں سے دیکھا ''آج ہمیں کس موضوع پر گفتگو کرنا ہے'' وہ کہنے لگی۔ میں نے بتایا کہ ہم منطق پر بات کریں گے۔ اس نے قدرے سوچا اور پھر سمجھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ منطق سوچنے کے علم کو کہتے ہیں۔ ہمیں درست سوچ پیدا کرنے کے لئے منطق کے عام مغالطوں کو سمجھنا پڑے گا اور ایک ایک کر کے ان پر غور کرنا ہو گا۔ وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی'' آؤ پہلے اس مغالطے پر غور کریں جسے منطق میں ''سادہ اصول'' (Dicto Simpliciter) کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایسی دلیل ہے جو بے بنیاد مغالطے پر مبنی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ'' ورزش بہت اچھی چیز ہے اس لئے ہر ایک کو ورزش کرنی چاہیے''۔ پولی نے کہا ہاں مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن میں نے کہا کہ اس مغالطے میں کوئی وزن نہیں کیونکہ ورزش ہر ایک کے لئے مفید نہیں ہوتی مثلاً اگر کسی کو دل کا عارضہ لاحق ہو تو اس کے لئے ورزش مفید نہیں ہو گی اور طبیب ورزش کا مشورہ نہیں دیں گے اس لئے ضروری ہے کہ عام بیان دیتے وقت اس کے ہر پہلو پر غور کر لیا جائے، یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ورزش عام طور پر اچھی ہوتی ہے یا یہ کہ بہت سوں کے لئے ورزش مفید ہوتی ہے، اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو اسے ''سادہ اصول'' (Dicto Simpliciter) کہا جائے گا۔ کیا تمہیں یہ بات سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کہا'' بالکل نہیں لیکن یہ بے حد مزیدار بات ہے۔ کچھ اور بتاؤ۔ میں نے کہا، کوشش کرو تمہیں سب کچھ سمجھا جائے گا۔ چلو اب ایک اور مغالطے کا ذکر کرتے ہیں اسے ''جلد بازی کا نتیجہ'' (Hasty Generalization) کہتے ہیں۔ دیکھو تم فرانسیسی نہیں بول سکتی مجھے فرانسیسی نہیں آتی، پیٹی بھی فرانسیسی نہیں جانتا اس لئے یہ نتیجہ نکال لینا کہ مینسوٹا کی یونیورسٹی میں کوئی فرانسیسی نہیں بول سکتا'' جلد بازی کا نتیجہ'' (Hasty Generalization) کہلائے گی۔ پولی نے حیرت زدہ ہو کر کہا بالکل ٹھیک ہے۔ میں بہت جھنجھلایا۔ میں نے کہا'' پولی یہ مغالطہ بڑی

جلدی میں قائم کیا گیا ہے" اس نے ہانپتے ہوئے کہا کوئی مفروضہ اور منطق تو رقص سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ میں کچھ دیر پریشان ہوا مجھے لگا کہ میں پولی کو سکھا نہیں سکوں گا۔ لیکن پھر بھی مجھے کوشش کرتے رہنا چاہیے اور میں نے اپنی کوشش جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا کہ اگلا مفروضہ ہے Post Hoc (دلیل باطل)۔ مثال کے طور پر ہم کہیں کہ ہمیں "بل" کو سیر پر اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہیے کیونکہ جب کبھی بھی ہم اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں بارش ہو جاتی ہے اس نے کہا ہاں میں بھی ایک لڑکی کو جانتی ہوں جس کا نام "یولا ایگر" ہے جب بھی ہم اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تو بارش آتی ہے۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ یولا ایگر بارش نہیں برساتی اس کا بارش سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اب ایسا نہیں کہوں گی" اس نے کہا۔ کیا تم پاگل ہو گئی ہو۔ میں نے ایک گہری آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس نے کہا مجھے کچھ اور مفروضے بتاؤ۔ میں نے کہا آؤ ایک اور مفروضے پر گفتگو کرتے ہیں جسے Contradictory Premises (متضاد منطق) کہتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ میں جھنجھلا سا گیا۔ پھر بھی میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ میں نے اس مفروضے کی ایک مثال دی مثلاً "اگر خدا ہر چیز بنا سکتا ہے تو کیا وہ ایسا بھاری پتھر نہیں بنا سکتا جو وہ خود نہ اٹھا سکے" اس نے کہا ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے بتایا کہ" اگر وہ ہر چیز پر قادر ہے تو وہ بھاری سے بھاری پتھر بھی اٹھا سکتا ہے" پھر وہ سنجیدہ ہو گئی جیسے اسے کچھ سمجھ آ گیا ہو۔ وہ اپنا سر کھجلانے لگی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، وہ کہنے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ اگر کسی چیز کو بنایا جا سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سامنے کوئی ایسی چیز نہیں جسے بنایا نہ جا سکتا ہو۔ اس نے کہا" ہاں مجھے سمجھ آ گئی ہے" مجھے کچھ اور بتاؤ۔ میں نے کہا کہ بہت وقت ہو گیا ہے اب میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا تا کہ تم ان اسباق کو دہرا سکو۔ پھر ہم کسی اور دن ان پر گفتگو کریں گے میں نے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس نے مجھے کہا کہ یہ شام بڑی پریشان کن شام تھی پھر میں اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں پیٹی سویا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ ریکون کوٹ اسکے پاؤں میں پڑا تھا میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اسے جگاؤں اور اسے کہوں کہ وہ اپنی محبوبہ کو واپس لے لے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرا سارا منصوبہ خاک میں مل رہا ہے۔ لڑکی کا دماغ منطق سمجھنے سے بالا ہے پھر میں نے سوچا کہ اگر میں نے ایک شام ضائع کر ہی دی ہے تو چلو ایک اور سہی۔ شاید اسے کچھ سمجھ پڑنے لگے اس کے دماغ میں شاید چنگاریاں سوئی ہوں جو شعلہ بن جائیں۔ مجھے امید تو نہیں تھی لیکن میں نے کوشش کرنے کی ٹھان لی۔ ہم پھر اکٹھے ہوئے اور اسے کہا کہ آج کا مفروضہ ہے Admisericodiam (سوال گندم جواب چنا) وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ میں نے کہا غور سے سنو ایک آدمی ملازمت کے لئے درخواست دیتا ہے جب اس کا افسر اس کی تعلیمی استعداد کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ اس کی بیوی اپاہج اور چھ بچے ہیں۔ بچوں کے پاس کھانے کیلئے کچھ بھی نہیں۔ ان کے تن پہ کپڑے نہیں اور نہ پاؤں میں جوتے۔ گھر میں کوئی بستر بھی نہیں۔ سردیاں آنے والی ہیں ہمارے پاس کوئی کوٹ بھی نہیں۔ اس منطقی مفروضے کو سن کر پولی کی آنکھوں میں آنسو آگئے جو اس کے رخساروں تک ڈھلکنے لگے۔ وہ کہنے لگی یہ بس بے چارہ۔ میں نے کہا ہاں یہ خوفناک بات ہے۔ لیکن یہ اس سوال کا جواب نہیں جو افسر نے پوچھا تھا۔ درخواست دہندہ اپنی صلاحیتوں کی تو کوئی بات کرتا ہی نہیں بلکہ اپنے دکھ سنا کر افسر کی ہمدردیاں جیتنا چاہتا ہے۔ اسے کہتے ہیں (Ad Misericodiam) سوال گندم جواب چنا۔ کیا تمہیں کچھ سمجھ آئی۔ وہ سسکتے بولی۔

کہنے لگی تمہارے پاس کوئی رومال ہے میں نے اسے ایک رومال دیا وہ بہت افسردہ ہو گئی تھی۔ یہ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بعد ہم ایک اور منطقی مفروضے پر گفتگو کریں۔ میں نے کہا کہ اگلا مفروضہ False Analogy (قیاس باطل) ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ امتحان میں

طلبا ہوتا ہیں۔ دیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ دیکھو! سرجن بھی تو آپریشن کرتے وقت ایکسرے کی مدد لیتے ہیں۔ اسی طرح معمار مکان بناتے وقت نقشے کی مدد لیتے ہیں تو پھر طلبا کو بھی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ امتحان میں نصابی کتب سے مدد لے سکیں۔ اس نے کہا۔ ''کیا ہی عمدہ خیال ہے'' میں نے کہا پولی مگر تمہیں سوچنا چاہیے۔ یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی۔ ڈاکٹرز اور معمار امتحان نہیں دے رہے ہوتے۔ یہ دونوں صورتیں بالکل مختلف ہیں اور تم ایک دلیل کو دوسری صورت حال میں استعمال نہیں کر سکتی کیونکہ یہ مثال ہی غلط ہے۔ اس نے کہا مجھے تو یہ خیال اچھا لگتا ہے۔ میں نے کہا چلیئے اب کسی اور مفروضے پر گفتگو کر لیتے ہیں۔ جسے Hypothesis Contrary to Fact (حقائق کے برعکس مفروضہ) کہتے ہیں۔ پولی نام سن کر بہت خوش ہوئی۔ سنو اگر میڈم کیوری اپنی پلیٹ میں معدنی یورینیم آکسائیڈ کا ٹکڑا دراز میں رکھ کر بھول جاتی تو آج دنیا ریڈیم سے محروم ہوتی ٹھیک ہے پولی نے کہا۔ ''یہ بیان درست نہیں'' میں نے کہا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میڈم کیوری کبھی بعد میں ریڈیم دریافت کر لیتی یا کوئی اور شخص دریافت کر لیتا۔ چنانچہ آپ ایک مفروضے کو آفاقی حقیقت نہیں کہہ سکتے اور کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ میں نے کہا اسے ایک اور موقع دیا جائے۔ لیکن میری بے صبری کی انتہا ہو رہی تھی۔ کیونکہ میرے خیال میں وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بہر حال میں نے کہا ایک اور مفروضہ ہے جسے Poisoning the Well (کنویں کو زہر آلود کرنا) کہتے ہیں۔ ''بہت عمدہ''۔ اس نے کہا۔ میں نے کہا اس مفروضے کا مطلب یہ ہے کہ دو آدمی آپس میں گفتگو کر رہے ہیں ان میں سے ایک اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا مخالف بد معاش اور جھوٹا ہے اور تمہیں اس کی کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے پولی نے کہا یہ تو بہت بری بات ہوئی۔۔ پھر مجھے یوں لگا کہ اس کی آنکھ میں کوئی ذہانت کی چمک آ گئی ہے اس نے کہا یہ طریقہ کار درست نہیں یہ بالکل غلط ہے دوسرے آدمی کے پاس اب کیا بچے گا جب پہلا شخص اس پر ایسے الزام تھوپ چکا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی میں نے کہا کہ پہلے آدمی نے ماحول ہی خراب کر دیا ہے۔ اور اپنے مخالف کو بولنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ پولی مجھے تم پر فخر ہے۔ میں نے کہا۔ پولی بہت خوش ہوئی۔ اس نے کہا یہ تمام مفروضے مجھے مشکل ہیں۔ پھر میں نے اس کے سامنے ایک ایک کر کے سارے مفروضے دہرائے اور مثالیں دیں۔ میں نے پانچ شامیں خرچ کیں لیکن ٹھیک ہی خرچ کیں۔ اب وہ منطق کو سمجھ چکی تھی میں اسے منطقی بنا چکا تھا۔ میرا کام ختم ہوا اب وہ میرے لئے بہت مناسب تھی۔ وہ میری بیوی بننے کی اہل تھی۔ وہ میرے مہمانوں کی اچھی طرح میزبانی کر سکتی تھی۔ میرے بچوں کی اچھی ماں بن سکتی تھی۔ آپ یہ سمجھتے کہ مجھے اس سے کوئی محبت نہ تھی بلکہ میرا حال پگ ملین جیسا تھا جسے اپنے مجسمے سے ٹوٹ کر محبت ہو گئی تھی۔ میں نے کہا پولی اب ہم مزید مفروضوں کی بات نہیں کریں گے وہ بولی آ سو وہی ہو گئی میں نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔ دیکھو ہم نے پانچ شامیں خرچ کر لی ہیں اور ہم نے یہ سب کچھ نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ دیکھو ہم اب شادی کر سکتے ہیں۔ پولی نے جواب میں یہ منطقی مفروضہ پیش کیا۔ Hasty Genralization (بہت جلد نتیجہ خیزی) میں نے کہا کیسے؟ اس نے کہا تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ پانچ شاموں میں یہ فیصلہ ممکن ہے کہ ہم ازدواجی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ میں خوشی سے مسکرا دیا۔ میری پیاری پولی نے سبق اچھی طرح یاد کر لیا تھا میں نے اسے تھپکی دی اور کہا پانچ شامیں بڑی ہوتی ہیں دیکھو! کسی کیک کی شناخت کے لئے پورے کیک کو کھا لینا ضروری نہیں ہوتا۔ پولی نے بڑی پھرتی سے اس کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا کہنے لگی۔ (False Analogy) ''غلط تشبیہ''۔ میں کوئی کیک نہیں ہوں۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ میں پھر ہنس دیا اور مجھے بڑی خوشی سی ہوئی۔ بچے تو اسباق یاد کر لیتے ہیں بلکہ بڑی اچھی طرح یاد کر لیتے ہیں۔ میں نے طریقہ کار بدلنے کا فیصلہ کیا میں نے سیدھے سادے انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا پولی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم

میرے لیے ایک دنیا ہو، چاند جیسی ہو، چمکتے ہوئے تاروں جیسی ہو، اے میری پیاری محبوبہ کہہ دو کہ تم مجھ سے شادی کرو گی، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میرے لئے جینا حرام ہو جائے گا۔ میں تڑپوں گا، میں نہ کھاؤں گا نہ پیوں گا اور میں بالکل ختم ہو کر رہ جاؤں گا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے باندھ دیے، جواب میں اس نے کہا یہ تو Ad Misericodiam (سوال گندم جواب چنا) ہے۔ میں نے اپنے دانت پیسے، میں کچھ طیش میں تھا، میں فرینک اسٹائن نہیں تھا اور میرا اپنا بھوت مجھے قتل کیا۔ میں نے اپنا درد اور دکھ اور کرب چھپانے کی کوشش کی، دیکھو پولی میں نے جتنے کی کوشش کی تم نے سارے مفروضے یاد کر لیے ہیں اور تم بالکل ٹھیک ہو لیکن دیکھو تمہیں یہ سب کچھ کس نے سکھایا؟'' اس نے کہا ''تم نے''، میں نے کہا ''تو پھر میرا تم پر کچھ حق ہے، اگر میں تمہیں نہ ملتا تو تم یہ سب کچھ نہ سیکھ پاتی''، جواب میں اس نے کہا ''یہ مفروضہ حقائق کے خلاف ہے'' Hypothesis Contrary to Fact۔ مجھے پسینہ آ گیا، دیکھو یہ سب کچھ فقط الفاظ بنانا نہیں چاہئے، دیکھو یہ کلاس روم کی باتیں ہیں، دیکھو جو کچھ ہم سکول میں سیکھتے ہیں اس پر زندگی میں کہاں عمل کرتے ہیں۔ اس نے جوش و خروش سے کہا Dicto Simpliciter'' یہ تو سادہ سا اصول ہوا'' میں نے کہا ''چلو چھوڑو مجھ سے شادی کرو گی یا نہیں'' اس نے کہا ''بالکل نہیں''، میں نے کہا ''اس کی کوئی وجہ'' اس نے جواب میں کہا ''آج ہی شام میں نے پیٹی بلوز سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے اور میں اس پر قائم بھی رہوں گی''، میرا سر چکرا گیا میں نے کہا یہ کیا ہوا تم اس سے شادی نہیں کر سکتی، وہ بھلا ہے، وہ عیاش ہے، وہ ایک چوہا ہے، پولی نے کہا کہ یہ تو ''کنویں کو زہر آلود کرنے'' (Poisoning the Well) والی بات ہوئی۔ میں نے کہا ''خاموش خاموش! تم ایک فلسفے کی طالب علم ہو تمہیں فلسفیانہ انداز سے سوچنا چاہیے تم پیٹی کو مجھ پر کیسے ترجیح دے سکتی ہو دیکھو میں کتنا ذہین فطین ہوں، میرا مستقبل روشن ہے اور پیٹی احمق کچھ بھی نہیں اسے یہ تک معلوم نہیں کہ اس کا اگلا کھانا کہاں سے آئے گا۔ کیا تم کوئی منطقی دلیل دے سکتی ہو کہ تم اسے مجھ پر کیوں ترجیح دے رہی ہو؟'' اس نے کہا ''کیونکہ اس کے پاس ''ریکون کوٹ'' ہے۔

◆◆◆

معروف شاعر، ادیب، تنقید نگار خالد اقبال یاسر کی شاعری کا چھٹا مجموعہ
''آرسی'' زیرِ طبع ہے «قیمت-/900 روپے»
جو تانیثیت پر شاعری کا اُردو میں پہلا مجموعہ ہوگا

معروف شاعر، ادیب، تنقید نگار خالد اقبال یاسر کی شاعری کا پانچواں مجموعہ شائع ہو گیا ہے
نفیری «قیمت-/600 روپے»
دونوں کتب رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، راولپنڈی پر دستیاب ہوں گی۔ (0304-9947149)
بذریعہ(online) خریداری کے لیے ای میل ایڈریس ہے: waseemabbas261@gmail.com

خون آشام۔ایک خوفناک کہانی

احمد صفی

مختصر تعارف

احمد صفی نے سترکی دہائی کے اواخر سے اشعار و مضامین لکھنا شروع کیے۔ پہلی نظم ''ممتا کی لوری'' 1988ء میں ''جنگ لندن'' میں شائع ہوئی۔ نثر میں پہلی شائع ہونے والی مختصر کہانی ''بھاگ گئی کے'' عنوان سے 1990 میں شائع ہوئی۔ احمد صفی کا یہ حوالہ سب حوالوں پر بھاری ہے کہ یہ ابن صفی کے بیٹے ہیں۔

چودھویں کے چاند کا عکس ٹھہرے پانی میں ایک مسحور کن منظر پیش کرتا ہے۔ خصوصاً موسم سرما کے ابتدائی دنوں میں تو ایسا ماحول بنتا ہے کہ شعر کہنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نظارے کے سحر میں اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ٹھہرا ہوا پانی کسی جھیل کا ہو، تالاب کا ہو یا سڑک پر موجود کسی گڑھے میں بارش کے بعد بن جانے والے جوہڑ کا۔ میرے گھر کے سامنے بھی سڑک کی جوہڑ کا منظر ایسا ہی پیش کر رہی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی اور رات کے اس پچھلے پہر میں سڑک پر آ کر نگراں تھا کہ وہ خون آشام نظر آئے تو میں اپنا وار کروں۔ محلے کے کئی لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ شام ہوتے ہی لوگ گھروں میں بند ہو کر رہ جاتے کیونکہ غروب آفتاب تک وہ کسی اچانک حملے کا نشانہ آسانی بن سکتے تھے۔ گرمیوں میں تو سب اپنے اپنے گھروں کے سامنے بنے چھوٹے چھوٹے باغوں ہی میں کرسیوں یا بنچوں پر رات گئے تک محفل جمائے بیٹھے نظر آتے تھے۔ لیکن اب یہ محفلیں بوجوہ موقوف ہو چکی تھیں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب خون آشام کا خاتمہ میرے ہی ہاتھوں ہوگا۔ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کیا اور میں اس وقت جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہوتے میں تمام تر احتیاطی تدابیر اور ایک غیر مرئی موثر ہتھیار کے ساتھ سڑک پر آ جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ آتشیں حربے اور گولہ بارود اس پر اثر نہیں کر سکتے۔ اور تیز دھار آلات اس کی پھرتی کے آگے نہیں چل سکتے۔ روحانی ہتھیار جو روایتی خون آشام مخلوق کو شکست دے سکتے ہوں وہ بھی بس کہانیوں اور فلموں ہی کا حصہ ہیں۔ اگر اصل خون آشام مخلوق کو شکست دے سکتے ہوں وہ بھی بس کہانیوں اور فلموں ہی کا حصہ ہیں۔ اگر اصل خون آشام سامنے آ جائے تو نہ چاندی کی گولی کام کرے گی نہ نشان صلیب یا مذہبی اذکار اسے روک سکیں گے۔ یہ میری تحقیق کا نچوڑ تھا۔

بادل آنے شروع ہو گئے تھے اور چاند کے رخ پر مسلسل پردے ڈال رہے تھے، تیرگی بڑھ رہی تھی۔ موسم خنک مگر خوشگوار تھا۔ گھروں کے سامنے دم دم کی احاطہ کرتی ہوئی باڑھوں میں گھرے چھوٹے چھوٹے پائیں باغ رات کی رانی، بیلے اور چنبیلی کی خوشبوؤں سے مہک رہے تھے۔ تبھی سڑک پر موجود رہنا آسان تھا ورنہ بارش کے پانی کی مزاحمت میں وہاں رکنا مشکل ہو جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ آج رات میری مڈبھیڑ خون آشام یا شاید خون آشاموں سے ہو ہی جائے۔ کئی خون آشاموں۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جس

اندازمیں محلے میں اموات ہوئی تھیں یہ کسی منظر کے روشن کا کام ہو سکتا تھا۔ اچانک ایک کھٹکا ہوا۔ برابر والے گھر کا گیٹ کھلا تھا اور یہ تو برے دشمنوں کی لڑکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پائیں باغ میں پڑی بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا اس نے موبائل کی اسکرین روشن کی اور تیزی سے انگلیاں اسکرین پر چلانا شروع کر دیں۔ شاید کسی سے راز و نیاز ہو رہے تھے جو کبھی کبھی چار دیواری میں مشکل سے ہو پاتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک تھا۔ روشن اسکرین اندھیرے میں دور سے حملہ آور کو اس کی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ اندھیرے کے باعث اس نے میری موجودگی محسوس نہیں کی میں اپنے گھر کے پائیں باغ میں بینچ کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اور تاریک پس منظر کا حصہ بن چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری احتیاطی تدابیر کے باعث خون آشام مخلوق میرے قریب نہ پھٹک سکے گی مگر یہ بے وقوف لڑکی۔ تمام واردات کا علم ہونے کے باوجود اس طرح بے دھڑک رات کو باہر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسی لمحے میرے کانوں نے ایک مانوس آہٹ محسوس کی جیسے کان میں کوئی سیٹی سی بجی ہو۔ یہ خون آشام مخلوق کی آمد کا اشارہ تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی حملہ آور اڑتے ہوئے اس پر حملہ آور ہو گئے۔ مجھے اسی کا ڈر تھا۔ میں نے اپنا ہتھیار ہاتھ میں تولا اور لپک کر باہر کو نکلا۔ آواز دی بی بی بچو۔ مگر یہ کیا اس کے ہاتھ میں بھی وہی اسپرے کین تھا اور اس نے اور میں نے ساتھ ہی ساتھ اپنے اپنے کین کا بٹن دبایا اور حملہ آور ڈینگی مچھروں کو نشانے پر لے لیا۔ کم بخت مچھر مارا اسپرے سے کہاں بچ کر جاتے۔ بڑی تعداد میں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ہم نے تھوڑے سے پانی پر بھی اچھی طرح اسپرے کیا۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا بعد میں والے ڈینگی سپرے نہیں کروائیں گے اور ہمیں خود ہی ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہر اس جگہ پر اپنے قریب سے اسپرے کرنا پڑے گا جہاں ڈینگی نظر آئے گا۔ خدا غارت کرے اس خون آشام مخلوق کو!

◆◆◆

تخلیق تقریب 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

یہ تخلیق کے حوالے سے یادگار اور شاندار تقریب ہے۔ اس تقریب کا سہرا سونان اظہر جاوید کو جاتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف ''تخلیق'' کو جاری رکھا بلکہ ایک سالانہ تقریب منعقد کر کے تمام ادیبوں اور شاعروں کو یکجا کرتے ہیں، یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔ سونان اظہر ہم سب کی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(پروفیسر منور عثمانی)

لوگ ہم سے سپوت اور کپوت کا فرق پوچھتے ہیں تو ہم انھیں کہتے ہیں کہ سونان اظہر جاوید کو دیکھ لیں تو معلوم ہو جائے گا سپوت کیا ہوتا ہے۔ اس سپوت نے اظہر جاوید اور تخلیق کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ ڈھیروں دعائیں۔

(ڈاکٹر محسن مگھیانہ)

شفق کے رنگوں کی دھنک

بلقیس ریاض

مختصر تعارف

باقاعدہ لکھنے کا آغاز 1980ء میں کیا۔ افسانہ نگار، سفرنامہ نگار اور کالم نگار ہیں۔ اب تک 45 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ دو کالموں کی بھی دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ''سرگوشیاں'' کے نام سے کالم آتا ہے۔ دو کتابیں زیر طبع ہیں۔

وہ دلکش، دبلی پتلی سمارٹ سی لڑکی، جو کوئی بھی اس کو دیکھتا تو اسے یوں لگتا کہ یہ عام سی لڑکی نہیں ہے۔ یہ خاص لڑکی جس کو قدرت نے اپنی پہلی فرصت میں بنایا ہے۔ اس قدر نازک مزاج تھی کہ کسی تلخی رویے کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی اپنی ہی خوبصورت الگ تھلگ دنیا تھی۔ والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو چکا تھا۔ اور دادا ہاشم نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ ہر کوئی اسے پیار کرتا تھا۔ دادا کی دلاری آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ ایم اے فائنل میں جب پہنچی تو دادا کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ جب اسے کوئی رشتہ دکھایا جاتا تو دادا سے کہتی میں شادی نہیں کروں گی۔ اگر مجبور کریں گے تو میری پسند کا لڑکا ڈھونڈیں۔ جو دنیا کے تمام لڑکوں سے افضل اور لائق ہو۔ بس کہہ دیا سو کہہ دیا۔ ہاشم صاحب نے کہا، بس لڑکا سمجھو مل گیا۔ آج جس کھانے میں مدعو ہیں وہاں بہت سے دوستوں کی بیٹیاں آ رہی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے دوست تنویر کا بیٹا امریکہ سے نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے بلکہ کئی امریکی سٹوڈنٹس سے برتری حاصل کر کے اپنا لوہا منوا چکا ہے۔ اس کیلئے کئی گھرانے آنکھ لگا کر بیٹھے ہیں۔ بہت سی بیماریوں پر ریسرچ (Research) کیا ہے۔ اور بتا رہا ہے کہ کرونا وائرس پر پوری تحقیق کر رہا ہوں۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ تمہارے لئے موزوں نہیں ہے۔

تمام دوستوں کی بیٹیاں بھی آ رہی ہیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ شباب تمہیں پسند کر لے۔ جانتی ہو، اس کے چرچے دور دور تک پھیلے ہیں۔ اتنا ہونہار نوجوان ہے۔'' ''دادا ابو'' سحر نے کہا۔ ''کیا چرچوں سے کیا ہوتا ہے بس میری پسند بھی تو مختلف ہے۔ میرے بارے میں وہ سوچیں اور ریسرچ کرتے کرتے صرف میں اور صرف مجھے افضل جانے''۔ ''اتنی سوچتی ہی میری پوتی ہے۔ وہ ضرور ایسا ہی ہوگا بلکہ جب میں نے دیکھا تو یوں لگا قدرت نے تمہارے لئے تخلیق کیا ہے۔ یہی وہ لڑکا ہے جس کی تمہیں تلاش ہے۔'' ''میرے پیارے دادا ابو'' وہ ہاشم صاحب کے گلے لگ گئی۔ رات کو تنویر میاں کے گھر خوب گہما گہمی تھی۔ نوجوان لڑکیاں پارلروں سے میک اپ کروا کر گھڑی دو گھڑی کیلئے حسین دکھائی دے رہی تھیں۔ سحر نے ہلکا پھلکا سا میک اپ اور سادا سا خالص لباس پہنا ہوا تھا۔ دراز بال اس کے شانوں میں لہرا رہے تھے۔ شباب اس محفل میں لڑکیوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر دکھائی دے رہا تھا۔ پھر سب سے مل کر سحر سے ہاتھ ملایا تو اس نے اپنی حسین

روشن آنکھوں سے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کو یوں لگا جیسے یہ وہی ہے... جس کی مجھے تلاش تھی۔ پھر شہاب نے اسی رات اپنے باپ سے کہا وہ سحر سے شادی کرے گا... اور ہاشم میاں کی جیسے مراد پوری ہوگئی... اور سحر شہاب کے گھر دلہن بن کر آ گئی۔ ہنی مون کیلئے وہ کوہ مری چلے گئے... پورا دن شہاب کا سحر کے ساتھ اچھا گزرا دونوں نے پہاڑوں کے دامنوں بیچ خوب سیر کی... اور سحر سے باتیں کرتے کرتے کچھ سوچتا اور خاموش ہو جاتا۔ سحر نے اسے کہا، کہاں کھو گئے ہو۔ دیکھیں آسمان کتنا روشن ہے اور پورا تاروں کی روشنی سے لبریز ہے... کہکشاں اتنی نزدیک نظر آ رہی ہے... آس پاس کے پودے اور کیاریاں پھولوں سے بھری ہیں... ان پر نظر دوڑائیں۔ مگر... شہاب کی آنکھوں میں بیزاری ٹپک رہی تھی... اور یہ بیزاری سحر کا وجود چھلنی کر گئی تھی۔ شادی کے دوسرے روز ہی نا خوشگوار زندگی کی ابتدا ہو گئی تھی۔ پھر اس نے سوچا بہت بڑی بھول ہوئی مجھے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی... اور شہاب اپنے مشن کو مکمل کرنے کیلئے چار دن کے بعد ہی جانے کیلئے تیار ہو گیا تھا... سحر کو ساتھ نہیں لیجا سکتا تھا وہاں اور ڈاکٹرز بھی اسی کام میں آ رہے تھے۔ جب بیٹھک ہو گئی تو غروب آفتاب کا وقت نا قابل بیان حد تک دلکش لگتا تھا اور حسین منظر تھا آسمان میں شفق کے کئی رنگ نظر آ رہے تھے... دلفریب منظر کو دیکھ کر وہ اس کے بازوؤں میں سماتے ہوئے بولی۔ مجھے محبت... اور محبت کی ضرورت ہے... بہت سال میں نے انتظار کیا تم ملے اور مجھے منجدھار میں چھوڑ کر جانے لگے ہو... اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے... ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں... تو بولا میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں... مگر اپنے اور کام میں انتظار رہنے کی لگن ہے... یہ خوبصورت آرام دہ گھر... صرف تمہارے لیے ہے... دوسرے جو دن رات کی کمائی سے اکٹھی کی ہے... وہ بھی تمہارے نام کر کے تم آرام سے رہو... مجھے بھی تمہاری طرح کی بیوی چاہیے تھی جو اس گھر میں سج جائے۔ سحر کی آنکھوں میں نفرت چھلکنے لگی۔ اور وہ چلا گیا۔ وہ اپنے بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تیز ہوا سے کھڑکی کے پٹ پھڑ پھڑانے لگے... ہواؤں کی تیزی سے موسلا دھار بارش کے قطروں کی بھی گونج تھی۔ آسمان پر بجلی چمکی اور پہاڑوں کی چوٹیاں... تاریکی میں ڈوب گئی تھیں... زوردار طوفان آ گیا تھا اس نے کھڑکی بند کی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ کمرہ میں بھی آسمانی بجلی گر جائے گی۔ شروع سے ہی بجلی سے ڈرتی تھی۔ ابھی اپنے آپ کو سنبھال ہی نہیں پائی تھی کہ شہاب کا فون آ گیا۔ گھنٹی کی آواز سے اس کا دل لرز گیا۔ "کیسی ہو"... شہاب نے پوچھا۔ "بہت ڈر لگ رہا ہے... بہت زوردار طوفان ہے"۔

"اچھا میں ایان کو بھیج دوں گا۔ وہ ایجنسی میں رہے گا اور تمہارا پورا خیال رکھے گا"۔ "ایان کون"۔ "میرا جونیئر ڈاکٹر ہے"۔

ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے... بہادر بنو... اور ان شاء اللہ کل پہنچ جائے گا۔" اور تم "میں جب تک ریسرچ مکمل نہیں ہوتی میں نہیں آ سکتا۔ فون پر بات ہوتی رہے گی اور فون بند ہو گیا۔ سحر ایک بار پھر بستر پر گر گئی... درختوں کے پتوں کی وجہ سے سرسراہٹ اور طوفان کی وجہ سے ماحول کی وحشت میں اضافہ ہو گیا تھا... اور پھر اٹھی اور کھڑکی کو بند کر دیا۔ دوسرے دن آسمان سیاہ بادلوں کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا... کہیں کہیں سورج کی کوئی کرن زمین کو ہلکا سا روشن کرتی اور دوبارہ گم ہو جاتی... اس نے اتنا حسین منظر دیکھ کر بھی رونا شروع کر دیا تھا۔ کھلی کھڑکی سے سارا باغ ضرورت سے زیادہ نکھرا ہوا تھا... بارش نے پودوں اور درختوں میں نکھار پیدا کر دیا تھا۔ پھر ناشتہ کی میز پر ملازم ایان کو اندر لے کر آیا تو سحر نے اس کی جانب دیکھا... اونچا لمبا ہینڈسم لڑکا... اس کے سامنے کھڑا تھا۔ میڈم گڈ مارننگ... میں... وہ اپنے بارے میں بتانے ہی والا تھا کہ سحر نے کہا۔ "ہاں ایان" "میں سلام کرنے آیا تھا... اب آ گیا ہوں تو... آپ کو کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" "ٹھیک ہے... ایجنسی میں جا سکتے ہو... ناشتہ وہیں پہنچ جائے گا"۔

ناشتہ کا تکلف نہ کریں... میں کر کے آیا ہوں... اور وہ باہر نکل گیا۔ سحر بے اختیار دل ہی دل میں کہہ اٹھی... کتنا ہینڈسم ہے۔ جب تیار ہو کر باہر برآمدے میں آئی تو ہر سو سبزہ ہی سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایان انیکسی سے سیدھا اس کی جانب آیا۔ ''میڈم'' ''کہو'' شہاب صاحب کو جب معلوم ہوا کہ آپ کو رائڈنگ کا بہت شوق ہے تو دو گھوڑے اچھی نسل کے فارم ہاؤس کے اصطبل میں بھیج دیے ہیں... آج تو بہت تھک گئی ہوں گی کل انشاءاللہ دور فارم ہاؤس کی میلوں لمبی سڑک پر رائڈنگ کریں گے۔ سحر ایک دم سے مسکرائی وہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ''او شیور (oh sure)'' ایسی جگہ پر رائڈنگ کرواؤں گا جہاں قدرت کے حسین مناظر سے آپ لطف اندوز ہوں گی۔

تو تمہیں بھی نیچر کا حسن پسند ہے۔'' بہت میڈم... سارا دن خوش رہتا ہوں... رنگا رنگ کے پھول دیکھ کر۔''

سحر بچوں کی طرح خوش ہو گئی... اس ویرانے میں ایان کے آنے سے اسے بہت ڈھارس بندھی... اور حیرت میں مبتلا تھی... اور سوچ رہی تھی... کہ اپنے پیشے کے علاوہ وہ قدرتی حسن کو بھی پسند کرتا ہے۔ شہاب کو بس ایک ہی بات ذہن میں تھی... بہت آرام دہ گھر اور ہر طرح کی سہولتیں دی ہیں وہ بہت خوش رہے گی اور وہ اطمینان سے اپنا کام کرتا رہے گا۔ اول تو اس نے سوچا تھا کہ شادی نہیں کرے گا جب تک اپنا پروجیکٹ مکمل نہ ہو گا مگر پھر خیال آیا... اس حسین گھر میں ایک حسین لڑکی کا ہونا بہت ضروری ہے... اس کے ہونے سے گھر میں چار چاند لگ جائیں گے۔ روز وہ ایان کے ساتھ رائڈنگ کر رہی تھی۔ پہاڑوں کے بیچوں بیچ، کھیتوں اور کھلیانوں پر ایک حسن تھا... رائڈنگ کرتے ہوئے اس نے ایان سے پوچھا۔ تمہارے آباؤ اجداد کہاں کے ہیں کیا تم بھی اسی شہر کے رہنے والوں میں سے ایک ہو۔ میں ایک متوسط گھر کا چشم و چراغ ہوں... ہم لوگ بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ مگر جب تک شہاب صاحب نہیں آتے میں انیکسی میں ہی رہوں گا۔'' ''شکریہ'' سحر نے اس کی جانب دیکھا۔ تو ایان نے اپنی روشن اور چمکتی آنکھیں سحر کی طرف مبذول کر دیں... نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا جادو تھا کہ سحر کچھ دنوں میں ہی اس کی عادی ہو گئی۔ میڈم بڑی مشکل سے میں نے ڈگری پاس کی ہے... قدم قدم پر شہاب صاحب نے میری مدد کی ہے۔

''بے چارہ''... سحر نے دل ہی دل میں کہا... اور رائڈنگ کے بعد اس نے ایان کو بھی لنچ ساتھ کروایا... وہ کہنے لگا۔ میڈم شام کو میں جھیل ہی حسین جگہ پر لے کر جاؤں گا۔ باہر کے ملکوں میں ایسا حسن نہیں دیکھا ہو گا جو یہاں پر ہے۔ خدا اور اس کی خدائی یاد آتی ہے۔ سحر نے اس کی جانب دیکھا... وہ گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ شام کے وقت سحر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر خوبصورت مناظر کا جائزہ لے رہی تھی... اور ایان کو دل ہی دل میں سراہ رہی تھی... کس قدر لاجواب شخصیت کا مالک ہے... یہ مجھ سے کتنی مطابقت رکھتا ہے۔ ایک شہاب ہے جو اتنا خشک مزاج ہے۔ دوسروں کا نازک دل روند دیتا ہے۔ ایک جگہ گاڑی کھڑی کر کے وہ پھولوں سے بھرے درختوں سے گزرتے ہوئے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ایان سرخ اور سفید گلاب کے پھول توڑ کر سحر کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ ان کی خوشبو سے سارا گھر مہک جائے گا۔ سحر کے دل میں... ایک خاص جگہ بنتی گئی... سوچنے لگی کہ یہ بھی تو ڈاکٹر ہے۔ پھولوں کو سونگھا تو اس میں دلفریب خوشبو اٹھ رہی تھی اور پھول جب گھر میں لا کر پھول دانوں میں لگائے تو خوشبو سے واقعی سارا گھر معطر رہا۔ پھر ایک روز وہ ماں کو ملنے کیلئے گیا تو سحر اس کی کمی سے اداسی محسوس کرنے لگی... بے اختیار فون کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم آئے نہیں'' ''بس... میڈم آن کر تا ہوں گا ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے... بہت پریشان ہوں'' ''ٹھیک ہے''

سحر اس کی اس بات سے پریشان ہو گئی تھی۔ فون پر پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ صبح ناشتے کی میز پر پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا تھا... اور

ایان میز کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ سحر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ یہ پھول کون لایا ہے؟ میں لایا ہوں۔۔۔ وہ تھوڑا سا فکرمند لگ رہا تھا۔ "کیا ہوا ہے" میڈم۔ چھوڑیں۔۔۔ روز اس طرح کے حالات سے گزرتا ہوں۔ آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔" سحر۔۔۔ بے چین ہو گئی۔۔۔ بتاؤ تو سہی"۔ میرے فلیٹ کی آخری قسط رہ گئی تھی۔ مالکان تنگ کر رہے تھے کہ فوراً ادا کرو۔" کیا" سحر نے ایک دم سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ یہ کوئی بات نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ دے کر اس کا فی الحال منہ بند کر دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ باقی رقم بھی جلد دے دوں گا۔ معاملہ حل کیا ہے۔" سحر خیالوں میں کھو گئی"۔ میڈم پلیز آپ فکر مند نہ ہوں۔ مسئلہ حل کر دیا ہے۔" "کیسے" وہ امی نے میری دلہن کیلئے جو زیور بنایا تھا۔ اس میں سے ایک سیٹ نکال کر دے دیا ہے۔ اس نے سحر کی جانب دیکھا تو دکھی ہو رہی تھی۔" میڈم"" کہو" آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے شہاب صاحب کو اس وقت آپ کے پاس ہونا چاہیے تھا۔۔۔ ایک کام کیلئے وہ اتنی محنت کرتے ہیں۔ جب ہو جاتا ہے تو دوسرا کام پکڑ لیتے ہیں۔۔۔ جب سے میں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے ان کو بے حد مصروف پایا ہے۔ سحر کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔۔۔ اور ایان سے کہنے لگی۔۔۔ ایک بار تو فلیٹ کے سارے پیسے ادا کر دو۔ میڈم۔۔۔ وہ اداسی سے کہنے لگا۔۔۔ لاکھوں روپے کی آخری قسط ہے۔۔۔ اتنا انتظام نہیں ہے میرے پاس۔ پھر سحر نے دل میں سوچا۔ اس کی شخصیت میں نکھار ہے۔۔۔ ہر وقت تر و تازہ پھولوں کا گلدستہ لاتا ہے۔۔۔ کاش یہ پہلے مل جاتا تو اس سے شادی کر لیتی۔۔۔ زندگی کتنی حسین ہو جاتی ہے۔ جلد بازی میں ایک بے حس انسان سے شادی کر بیٹھی۔۔۔ ابھی زندگی گزارنے کا میرا بنیادی حق ہے۔ "کیا سوچ رہی ہیں میڈم۔۔۔ اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں"۔" کہو"" آپ بہت خوبصورت ہیں۔۔۔ شہاب صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔ میں نے جب پہلی مرتبہ دیکھا تو۔۔۔ یقین جانئیں"۔ وہ آگے خاموش ہو گیا۔۔۔" کہو ایان۔۔۔ کہہ سکتے ہو میں برا نہیں مانوں گی۔ وہ جی۔۔۔ سب دوستوں کی بیویوں سے آپ بہت حسین ہیں۔۔۔ مگر شہاب صاحب۔ وہ آگے خاموش ہو گیا۔ سحر نے دل ہی دل میں کہا۔ کاش۔۔۔ تم میرے لائف پارٹنر ہوتے۔۔۔ اس وقت وہ شہاب کو بھول گئی۔۔۔ اندر سے چیک بک لا کر بھاری رقم کا چیک اس کے حوالے کیا۔۔۔ اور کہا۔ تم اپنے فلیٹ کی آخری قسط ادا کرو۔۔۔ مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا ہے تم نے۔۔۔ اس وقت میں بہت پریشان تھی۔" چیک دیکھ کر اس نے کہا نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ہرگز نہیں لوں گا۔۔۔ میں آپ کی دلجوئی کرنے آیا تھا روپے لینے تھوڑی"۔" میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں"۔ جھجکتے ہوئے ایان نے روپے لے لئے اور کہا۔ کل شاید شہاب صاحب آ جائیں ان کا کام ختم ہو گیا ہے۔" میڈم۔۔۔ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا"۔ سحر نے اس کی جانب دیکھا اور سوچا۔۔۔ وہ شہاب سے خلع لے کر ایان سے شادی کر لے گی۔ اس سے بہتر لائف پارٹنر نہیں ملے گا۔ وہ ایک دم سے پوچھنے لگی۔" ایان۔۔۔ اگر میں تمہارے لئے کوئی لڑکی پسند کروں تو اس سے شادی کر لو گے"۔" مگر ایک شرط ہے""وہ کیا"

"لڑکی آپ جیسی ہونی چاہیے"۔ سحر نے محبت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں کی تپش بتا رہی تھی وہ اسے پسند کرتا ہے۔۔۔ اور سحر چند لمحوں کیلئے جذباتی ہو گئی۔۔۔ ایک قسم کا اسے جواب مل گیا کہ وہ بھی اسے چاہتا ہے۔ شہاب کام ختم کر کے شام کو اپنے گھر پہنچ گیا۔ سحر نے بجھے سے دل سے اس کا خیر مقدم کیا۔ شہاب والہانہ طور پر اس کو گلے سے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ یقین جانو۔ سحر ہر وقت تمہارا خیال دامن گیر رہتا تھا۔ اور بار بار دھیان تمہاری طرف لگا رہتا تھا۔ اور سوچتا تھا اس خوبصورت گھر میں صرف تمہیں نہیں بلکہ مجھے بھی ساتھ رہنا چاہیے تھا۔۔۔ چلو۔۔۔ تمہاری تنہائی دیکھ کر میں نے ایان کو بھیج دیا تھا۔۔۔ اسے بتایا تھا کہ تمہیں ہر جگہ کی سیر کروائے اور روزانہ میری طرف سے پھولوں کا گلدستہ تمہیں پیش کرے۔ تمہیں منظر کشی کا بہت شوق ہے۔ شکر ہے میرا کام ختم ہوا ہے۔ اس کی صبح

خلاصہ یہ ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے باہر کے ملک جا رہا ہے۔ کئی سالوں سے ایک لڑکی کے چکر میں ملوث تھا... وہ امریکہ میں رہتی ہے اس نے sponsor کیا ہے۔ اس سے شادی کر کے گرین کارڈ بھی حاصل کرے گا... اور اس سے آگے سحر کچھ نہ سن سکی۔ تمہاری خدمت کرنے کے عوض کافی رقم دی ہے... اس کے علاج کی قسطیں بھی ادا کر کے تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔ سحر ایک دم سے چونکی۔ جیسے کسی بچھو نے اسے کاٹ لیا ہو... اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کا علاج کا مسئلہ تھا اور شباب سے وہ پیسے لے چکا تھا سحر کا سر گھوم گیا.... اور؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ ماتھے پر ان گنت ننھے ننھے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا... وہ شباب کے ساتھ باغ میں بیٹھی تھی۔ شام کے وقت ستارے مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان کا گہرا نیلا رنگ دیکھ کر اس کے سینے میں درد کی لہر اٹھی۔ وہ بے اختیار گوشہ عافیت کھو کر کرسی سے اٹھ کر شباب کے گلے لگ گئی۔ "تو کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔" "بہت... سچی محبت کرتا ہوں"... جو لازوال ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے... میں نے بے لوث محبت محسوس کی ہے۔ یہ کام ادھورا چھوڑ کر شادی کی تھی... مگر... اب میں فارغ ہوں اور... میں تمہیں شادی ہوتے ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا اس کی معذرت چاہتا ہوں... مگر مجھے یقین تھا ایان تمہارا خیال رکھے گا... اب جو کام کرنے کے لیے بھی جاؤں گا... تم میرے ساتھ ہوگی۔ بہت کمی محسوس کی ہے۔ تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ سحر دھڑکتے دل کے ساتھ شباب کی باتیں سن رہی تھی... اور ایان... اس کے بارے میں آگے نہ سوچ سکی اور شباب کی بانہوں میں سما گئی۔ عشق کے سارے رنگوں کی دھنک اس کے چہرے پر بکھر رہی تھی اس کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ سچی محبت کیا ہوتی ہے۔

◆◆◆

گھسی پٹی خبریں

محمد اسلم

مختصر تعارف

محمد اسلم 6 جنوری 1943ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ ''مرزی کا ریا'' پنجابی ناول کا اُردو ترجمہ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' میں اشاعت پذیر ہوا۔ انگریزی کے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اُردو ترجمہ کر چکے ہیں۔ ترجمہ کے فن پر عبور حاصل ہے۔

اکمل زندگی کا آٹھواں عشرہ مکمل کرنے والا تھا۔ عمر کے اس حصے میں اکثر عمر رسیدہ لوگوں کی طرح وہ مختلف عوارض کا شکار ہو چکا تھا جس میں بے خوابی اور پیشاب کا مرض پیش پیش تھا۔ رات کا آخری پہر تھا اور وہ پانچ بار غسل خانے سے ہو کر آیا تھا۔ بار بار جاگنے اور غسل خانے کے چکر لگانے سے وہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اس بار وہ سیدھا لیٹنے کی بجائے سر کو بیڈ کی ٹیک سے لگا کر دائیں پہلو پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر یونہی لیٹنے کے بعد وہ سیدھا ہوا۔ بیڈ کی ٹیک میں پڑے موبائل فون کو ٹٹول کر اٹھایا اور مندی آنکھوں سے اس میں وقت دیکھنے لگا۔ پونے چار بجنے والے تھے۔ اکمل نے موبائل فون واپس ٹیک میں رکھا اور ٹانگیں بستر پر پھیلا دیں۔ پورے چار بجے موبائل میں الارم بجا۔ اس نے الارم بند کیا اور ایک بار پھر غسل خانے کی طرف چلا۔ وضو کیا اور کمرے میں آ کر نوافل کیلئے مصلے پر کھڑا ہو گیا۔ دس نوافل کے بعد ساتھ والی مسجد سے صبح کی اذان بلند ہوئی۔ وہ اذان سننے کیلئے دو زانو ہو کر مصلے پر بیٹھا رہا اور اذان ختم ہونے کے ساتھ صبح کی نماز کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس عرصے میں اس کی بیوی بھی جاگ گئی اور نماز کی تیاری کرنے لگی۔

نماز اور اس کے بعد وظائف سے فارغ ہو کر اکمل باورچی خانے میں گیا۔ چائے کی کیتلی میں دو پیالی چائے کیلئے پانی ڈالا اور اوون کے برنروں سے ایک برنر کو گھما دیا لیکن —— گیس بند تھی۔ اس نے دل ہی دل میں گیس کمپنی کو کوسا کیتلی کو سنک میں رکھا اور واپس کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ ''کہاں گئے تھے؟'' بیوی نے سلام پھیر کر پوچھا۔ ''چائے رکھنے گیا تھا'' اکمل نے مختصر جواب دیا۔ ''تمہیں پتہ ہے صبح سات بجے تک گیس کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے۔'' کچھ دیر وہ بے چینی سے بستر پر پڑا رہا۔ پھر ساتھ پڑے ٹی وی ریموٹ پر دھیان گیا اور اسے قدرے سکون سا ہو گیا اور اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ بیوی کو نماز پڑھتے اور اذکار کرتے تقریباً پونے آٹھ بج گئے۔ وہ مصلے سے اٹھی۔ گھر کے چھوٹے سے لان میں پرندوں کیلئے باجرہ اور پانی رکھا اور لان میں کھلنے والی بڑی کھڑکی کے پاس رکھے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ مختلف پرندے جن میں چڑیاں، بلبلیں، شارکیں، فاختائیں اور ہد ہد تھے دانا چگنے اور پیاس بجھانے کیلئے لان میں اترتے رہے۔ وہ انہیں دیکھ کر عجیب سا اطمینان اور شادمانی محسوس کر رہی تھی۔ ''اچھم دیکھو گیس آ گئی ہوگی'' تقریباً سات بجے اکمل نے کمرے سے بیوی کو آواز دی۔ وہ چائے کی

ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ "دیکھتی ہوں" بیوی نے کہا اور باورچی خانے کو چلی گئی۔ ناشتہ کر لیا تو اکمل کو پھر بے کلی سی محسوس ہونے لگی "یہ اخبار والا آج کہاں رہ گیا؟"۔۔۔ "آ جائے گا، آ جائے گا۔ ذرا صبر کرو" بیوی نے سرزنش کی۔ اور پھر جب دس پندرہ منٹ کے بعد ہاکر نے اخبار گیٹ سے اندر لڑھکائی تو اکمل یوں اخبار کی طرف لپکا جیسے وہ آج پہلی مرتبہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ بڑھاپے نے اس کی نزدیک کی نگاہ کو کمزور کر دیا تھا۔ اس نے اخبار کی موٹی موٹی خبریں پڑھیں۔ ایڈیٹر کو لکھی گئی ایک یا دو چٹھیوں پر نظر ڈالی اور پھر جیسے اس نے تھک کر اخبار ایک طرف رکھ دی۔ وہ ایک بار پھر بے چینی محسوس کرنے لگا۔ "آج بازار کا کچھ نہیں کرنا؟" اس کی بیوی نے جیسے دور سے آواز نکالی ہو۔ "کیا کرنا ہے۔۔۔؟" اس نے جواباً سوال کیا۔ "مجھے کیا معلوم جو مرضی آئے لے آؤ"۔ "یہ کیا بات ہوئی، جو کہو لے آتا ہوں"۔ "جا کر کچھ لو سبزی جو پسند آئے لے آؤ۔۔۔ گوشت کا ایک پیکٹ پڑا ہے۔"

اکمل گھبرا کر کرسی سے اٹھا، سبزی والا تھیلا پکڑا اور سبزی والی دکان کی طرف چل پڑا۔ گو نقاہت کی وجہ سے اب اس کا چلنا تکلیف دہ ہو چلا تھا تاہم اس عمل سے اسے ایک نامعلوم سی راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنے گھر کے سامنے والی بڑی سڑک پار کر کے جب وہ محلے کی ذیلی سڑک پر چلتے ہوئے پارک کے پاس پہنچا تو وہاں شیشم کے بڑے بڑے درختوں کی چھاؤں میں جمعی مائیاں اپنے پاس کھیلتے بچوں کے ساتھ بیٹھیں۔ یہ مائیاں روزانہ اپنے گھروں سے نکل کر یہاں آ کر بیٹھتیں اور اپنی ڈیوٹیوں کے جاگنے کے انتظار میں یہاں دکھ سکھ بانٹتیں۔ ان کے بچے پارک میں لگے جھولے جھولتے یا ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھرتے۔ اس پارک سے ذرا آگے کارنر والے گھر کے گیٹ کے اوپر بوگن ویلیا (Bougain Vaillia) کی جھاڑی اپنے بے شمار سرخ رنگ کے پھولوں سے سایہ فگن تھی۔ اکمل کو یہ گھر بہت اچھا لگتا تھا اور وہ اسے دیکھ کر ایک فرحت محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کے رخ پر افسوس کرتا کیونکہ شمال اوپن ہونے کی وجہ سے اس کا گھر تقریباً چھ ماہ دھوپ سے محروم رہتا اور یوں دھوپ میں پھلنے پھولنے اور رنگ و بہار دینے والا یہ پودا وہ اپنے گھر میں نہ لگا سکتا تھا۔

اکمل نے سبزی لا کر بیوی کے حوالے کی اور خود ٹانگیں پھیلا کر ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ اب اس پر پھر وہی بیزاری کی کیفیت چھانے لگی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اسے سائڈ ٹیبل کی شیلف میں پڑا بچوں کا اخبار دکھائی دیا۔ اس نے اخبار کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ایک صفحے پر جغرافیے سے متعلق کچھ سوالات تھے اس نے اپنا امتحان لینا چاہا لیکن دس سوالوں میں صرف دو کے جواب دے پایا۔ آخری صفحے پر بارہ سال کی عمر تک کے بچوں کی بنائی گئی تصویریں چھپیں ہوئی تھیں۔ اکمل بچوں کی ان معصومانہ کاوشوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ایک ملائم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیکن اب اس پر رت جگے نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بچوں کا اخبار شیلف میں رکھا اور صوفے کی ٹیک سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ غنودگی میں اس کا سر دائیں بائیں لڑھک رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کونے سے رال کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی تھی اور وہ گہری نیند میں چلا گیا۔

سبزی چھیلتی ہوئی انجم نے جب اسے یوں دیکھا تو آواز نکالی "یوں کیوں پڑے ہو، کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ"۔ اکمل ایک فرمانبردار بچے کی طرح وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ بیگم نے جب اسے دوپہر کے کھانے کیلئے جگایا تو دوپہر کے دو بج چکے تھے۔ اس نے غسل کیا، کھانا کھایا اور نماز پڑھتے پڑھتے تین بج گئے۔ اس نے ٹی وی آن کیا اور خبریں سننے لگا۔ لیکن ٹی وی پر آنے والی اکثر

خبریں وہ صبح کے اخبار میں دیکھ چکا تھا۔ یوں ان خبروں میں اس کی دلچسپی کیلئے کچھ نہ تھا۔ تاہم وہ نظریں جمائے خبریں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب اس کی خبروں میں عدم توجہی سے وہ ایک بار پھر اونگھنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کی بیگم بھنا گئی۔ ''کیا بات ہے۔ سارا دن سوئے رہتے ہو اور رات کو جاگتے ہو'' ''بی بی ایسی بات نہیں۔ میں دن میں اس لئے سوتا ہوں کہ رات کو نیند نہیں آتی'' اکمل نے اسے توجیہہ دی۔ ''یوں کرو دن میں نہ سوؤ۔ پھر دیکھو رات کو نیند آتی ہے یا نہیں'' بیگم نے استدلال کیا۔ ''تمہیں معلوم ہے میں یہ بھی کر چکا ہوں'' ۔۔۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں کی بات میں وزن تھا۔ اکمل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ایک بار پھر ٹی وی کی سکرین پر نگاہیں لگا دیں۔ شام کے پانچ بجے اور اکمل کو لگا جیسے ابھی کرنے کو بہت کچھ باقی ہے۔ وہ باورچی خانے میں گیا۔ اس نے دو کپ چائے بنائی اور میاں بیوی چھوٹی چھوٹی چسکیوں سے چائے پینے لگے۔ دن اب قدرے چھوٹے ہونے لگ گئے تھے۔ یوں چھ بجے مغرب ہو گئی۔ دن کا اختتام ہو گیا اور رات کی ابتداء۔ گھنٹی بجی۔ اکمل دروازے پر گیا۔ مسز شفیق وہاں موجود تھی۔ ''باجی گھر پر ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''جی آئیں'' اکمل نے جواب دیا اور ایک طرف ہو کر اسے آنے کی دعوت دی۔

مسز شفیق ان کی ہمسائی تھی اور اکثر اس کی بیوی سے گپ شپ کیلئے آتی تھی۔ یوں تو وہ ایک مستعد خاتون تھی جو ایسے کاموں میں مصروف رہتی تھی جو مردوں کیلئے مخصوص ہوتے ہیں۔ مثلاً تعمیراتی کام، لکڑی، ٹھیکے کا کام وغیرہ تاہم اس کا پسندیدہ موضوع اس کے خاوند کے ساتھ ہونے والے تنازعات تھے اور وہ مکمل انجم کو یہ معاملات بڑی تفصیل سے بتاتی تھی اور وہ اس کی آپ بیتی بڑے اطمینان سے سنتی تھی۔ مسز شفیق رخصت ہوئی تو اکمل نے شریر سی مسکراہٹ سے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آج تو تمہاری سہیلی تم سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی ۔۔۔'' ''شرم کرو۔ اس عمر میں ایسی باتیں کرتے ہو ۔۔۔'' انجم نے سرزنش کرتے ہوئے کہا اور اکمل فرمانبردار بچے کی طرح جھینپ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر تقریباً رات کے نو بجے انجم کھانا لے آئی۔ کھانے کے دوران میاں بیوی نے خبریں سنیں۔ خبریں ختم ہوتے ہوتے دونوں کھانا کھا چکے تھے۔ ''چلو اٹھو اور نماز پڑھ کر سو جاؤ'' انجم نے اکمل سے کہا۔ ''ابھی دس ہی تو بجے ہیں ۔۔۔ سو جاؤں گا'' اکمل نے دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم روزانہ ایسے ہی کرتے ہو ۔۔۔ سونے کا وقت گزار دیتے ہو اور بعد میں ساری رات الٹک بیٹھک میں گزارتے ہو ۔۔۔'' ''سو جاؤں گا۔ سو جاؤں گا'' اکمل نے جیسے بیوی کی تشفی کیلئے کہا اور پھر بلا مقصد صبح کا اخبار اٹھا کر الٹ پلٹ کرنے لگا۔ انجم نے عشاء کی نماز پڑھ لی تو اس نے بیڈ پر جاتے جاتے اکمل کو ایک بار پھر نماز پڑھنے اور سونے کیلئے کہا لیکن اکمل اس کی بات سنی ان سنی کر کے صوفے پر بیٹھا رہا۔ انجم کروٹ لے کر سو گئی۔ یہ روزانہ کا قصہ تھا۔ اصل بات کا انجم کو بھی علم نہیں تھا۔ اکمل رات کے بارہ بجے کی خبروں کا انتظار کرتا رہا۔ اس بلیٹن میں سارا دن کی خبروں کا اعادہ کیا جاتا اور کوئی نئی بات سننے کو نہیں ملتی تھی۔ تاہم اکمل کے بوڑھے ذہن کے پردے پر نیوز اینکر کی تصویر چپکی رہتی تھی۔ اور وہ یہ پورا گھنٹہ نیوز اینکر کی ستارہ آنکھوں اور عنابی رسیلے ہونٹوں میں ڈوبا بے حرکت بیٹھا رہتا۔ بلیٹن ختم ہوا۔ اکمل نے ایک گہری سانس لے کر ٹی وی بند کیا۔ کمرے کی بتی بجھائی اور بستر پر جا لیٹا۔ انجم نے کروٹ بدلی۔ ''نہ جانے تمہیں بارہ بجے کی خبروں کا کیا چسکا پڑا ہے۔ سارا دن کی گھسی پٹی خبریں سننے میں تمہیں کیا ملتا ہے ۔۔۔'' اس نے خواب آلود آواز میں کہا اور کمبل چہرے پر کھینچ لیا۔

◆◆◆

پیپر اسپرے۔ Pepper spray

شائستہ مفتی

مختصر تعارف

شائستہ مفتی 21 ستمبر کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ''ہوا کے ہاتھ'' کے نام سے پہلا شعری مجموعہ 2009ء میں جبکہ 2018ء میں دوسرا شعری مجموعہ ''محبتوں کے شہر میں'' شائع ہوا۔ افسانوں کی کتاب پر کام کر رہی ہیں جو کہ ''رات کی کتاب'' کے نام سے جلد شائع ہو رہی ہے۔ شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ مصوری بھی کرتی ہیں۔

ہر کہانی کا ایک سرا ہوتا ہے اور اسی سرے کو پکڑ کر انسان اپنی کہانی بنتا ہے۔ ثمیر کی کہانی کا کوئی سرا نہیں تھا۔ وہ جہاں سے اپنی کہانی شروع کرتا، کہانی کی گتھی اور الجھ جاتی، سرا کہیں گم ہو جاتا۔ ڈاؤن ٹاؤن کے اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے ثمیر بہت دیر سے اپنی گزشتہ زندگی کی گتھیوں میں الجھا ہوا تھا۔ جانے کون سا کپ ختم کر چکا تھا۔ ریسٹورنٹ کا مالک ثمیر کو بڑی بے زاری سے دیکھ رہا تھا۔ شاید ریسٹورنٹ بند کرنے کا وقت ہو چلا تھا۔ ''کچھ اور چاہیے؟ آئسکریم وغیرہ دوں؟؟'' ریسٹورنٹ کے مالک نے ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے ثمیر سے پوچھا۔ ثمیر نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ثمیر کے چہرے پر ایک بے بسی سے بھی جلی مسکراہٹ آئی اور اس نے کندھے اچکا کر کہا ''میں بس اب جانے ہی والا ہوں''۔ ثمیر اپنی زندگی کے بکھرے بکھرے اوراق پر نظر ڈال رہا تھا کہ کس ورق کو اٹھائے اور کسے رکھ دے۔۔۔ ہر ورق پر ایک مختلف کہانی لکھی تھی۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ سب کچھ ایک اکیلے شخص پر بیتا ہے۔ اتنا جانتے یاد کے کس کنکر سے ثمیر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سوچیں یادداشت کے ساحل پر سرپٹ دوڑ رہی تھیں۔ ساحل پر جا بجا ٹوٹی ہوئی سیپیاں بکھری تھیں۔۔۔ بھاگتے بھاگتے ثمیر کے پاؤں لہولہان ہو چکے تھے۔ وہ کہیں رک نہیں سکتا تھا۔ پیچھے مڑنا ناممکنات میں سے تھا۔ اور آگے کا راستہ دھند میں گم تھا۔ یہ زخم پر چپ سادھنے کی عادت اسے زندگی کے اس بیابان میں لے آئے گی، ثمیر نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ کچھ منظر آنکھوں سے یوں اوجھل ہو جاتے ہیں گویا جاگتی دیکھنا ہی نہ چاہ رہی ہو۔ آنکھیں بغاوت پر بند ہو جاتی ہیں۔ بچپن سے کچھ ایسی ہی عادت تھی ثمیر کی۔۔۔ جب بھی ابا غصے سے گھر میں دھاڑتے وہ جلدی سے اسٹور میں چھپ جاتا اور کسی بہت ہی فضول کام میں اپنے آپ کو مصروف کر لیتا۔ اپنے آپ کو سمجھاتا کہ جو کچھ ابھی ابھی دیکھا ہے وہ محض ایک وہم ہے۔ درحقیقت کچھ ہوا ہی نہیں۔۔۔ آنکھوں کو اتنی زور سے بھینچتا کہ آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ کوئی پوچھتا تو کہہ دیتا ''آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے۔'' اور پھر سچ آنکھیں جلنے لگتیں۔

ثمیر کچھ بڑا ہوا تو سب نے اندازہ لگا لیا کہ وہ جذباتی طور پر ایک کمزور انسان ہے۔ کوئی بھی مشکل اس سے سنبھل ہی نہ پاتی۔ مشکل حالات پر اس کا ردعمل محض فرار ہی ہوتا۔۔۔ فرار۔۔۔ کتنا آسان لگتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ آگے گلی بند ملی تو کیا ہوگا؟؟

بڑی سوچ بچار کے بعد ثمیر نے اپنی زندگی کا پہلا ورق اٹھایا۔ اس ورق پر پہلا لفظ ہی بہت شیریں اور جاں فزا تھا۔۔۔ ''ماں!'' ماں کا سفید دوپٹہ آنکھوں کے آگے لہرا گیا۔ زندگی سے بھرپور ایک معصوم چہرہ۔۔۔ بڑی بڑی اداس آنکھیں۔۔۔ تھکی تھکی اداس۔۔۔ ثمیر ماں کا

لاڈلا تھا۔ ماں کے ان کہے اور ان سنے دکھوں کا ساتھی ..... ساتوں کو بند دروازوں کے پیچھے سے آنے والی فریادوں کی آوازوں نے نمیر کو وقت سے بہت پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ بچپن میں دل کا کنول بھرپور کھلنے سے پہلے ہی سہم گیا ..... ماں اپنے دکھ اپنے تک ہی رکھنا چاہتی تھی، مگر ایسا ہوتا ہے کہ ..... ماں کے دکھ بہت غیر محسوس طریقے سے نمیر کے وجود کا حصہ بن گئے ..... اور وہ یہ کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ زندگی کے اس ورق پہ تتلیوں کے رنگ ہونے چاہیے تھے، سادہ وہ تھے اس ورق پہ مختصر سی تحریر کے ساتھ ہی نمیر کے بچپن کی کہانی ختم ہوگئی۔ فرار!! فرار ہی ایک آسان راستہ تھا۔ زندگی کا دوسرا ورق اٹھایا تو وہ حیران ہی رہ گیا! زندگی میں دکھ کے بعد سکھ ہے۔ اگر صرف دکھ ہی دکھ لکھے ہیں تو دنیا میں خوش و خرم کس بات پہ ہوتے ہیں ..... بچپن کا پہلا پہلا پیار ..... ! کچھ دنوں کے لئے تو نمیر کو بھی اپنی زندگی حسین لگنے لگی۔ اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر اپنے اندر کھلنے والے اس بہار موسم کو محسوس کیا ..... زندگی اس قدر خوبصورت بھی ہو سکتی ہے ..... یہ شاید نمیر کے گمان میں نہ تھا ..... نمیر اور نغمہ ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے، گھر بھی قریب تھے ..... چار دن کی چاندنی کے بعد اماوس کی رات آ ہی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نغمہ نمیر سے بدل ہوگئی۔ وہی نمیر جس سے نغمہ اپنے دل کی ہر بات کہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ نمیر حیران تھا کہ ایسا بھی کیا ہوگیا؟؟ اور پھر نمیر کو جلد ہی پتا چل گیا کہ نغمہ نے کہیں اور ہی دل لگا لیا ہے۔ بے وفائی کا زخم بھی اس نے خاموشی سے سہہ لیا ..... آنکھوں میں پھر سرخ ڈورے پڑ گئے۔ ماں جو نمیر کا ہر دکھ بغیر کہے ہی سمجھ جاتی تھی۔ اور پھر ماں سمجھ گئی کہ نمیر کے لئے اس گھٹن زدہ ماحول سے نکلنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ ماں اس سے اکثر کہنے لگی "نمیر تو میری فکر چھوڑ، اپنی زندگی بچا لے ..... ورنہ یہ گھٹن تجھے بھی کہیں کا نہ چھوڑے گی" اور پھر وہ دن آگیا جب ماں نے نمیر کو اداس آنکھوں سے رخصت کیا اور گھر کے اندھیروں میں لوٹ گئی۔ وہ سرخ آنکھیں لئے سات سمندر پار آگیا۔ نمیر ایک ذہین اور محنتی لڑکا تھا۔ جلد ہی تعلیم مکمل کر کے ایک نوکری سے لگ گیا۔ وقت کی چکی چلتی رہی۔ اس نے وہیں شادی بھی کر لی۔ ماں کو صرف شادی کی ایک تصویر بھیج دی۔ ماں اب بھی نمیر کو یاد آتی تھی۔ ماں نے خود ہی اس کو واپس آنے سے منع کر دیا۔ "کیا کرو گے یہاں آ کر نمیر؟؟ یہاں اب کچھ نہیں تمھارے لئے" نمیر کو پتا بھی نہ چلا اور زندگی کے بہت سے باب اس کے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پہ بکھر گئے۔ اس نے جلدی جلدی سارے ورق اٹھانے کی کوشش کی مگر سب ترتیب الٹ پلٹ ہوگئی۔ ایک ورق پہ لکھا تھا "ڈیڈ آپ کو بالکل تمیز نہیں" دوسرے ورق پہ لکھا تھا "آپ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے"۔ ایک اور ورق پہ لکھا تھا "میں آپ کو اپنے دوستوں سے نہیں ملا سکتی۔" اسی لمحے اس کو اپنی ماں کا شدید درد یاد آ گیا۔ دل میں ایک آہ تیر کی مانند چبھ گئی۔ ہمیشہ چپ رہنے والے نمیر کے ہونٹوں سے ایک سسکی سی نکل گئی۔ ریسٹورنٹ کا مالک گھومتا ہوا اس کی میز پہ آگیا۔ اور قدرے بے رخی سے اسے جانے کو کہا۔ نمیر کے پاس چائے کا بل ادا کرنے کو پیسے نہیں تھے، وہ جاتا بھی تو کہاں؟؟ نمیر نے قدرے مایوسی سے مالک کو کہا "میں ایک بے گھر مسافر ہوں، کیا مجھے رات گزارنے کے لیے جگہ مل جائے گی؟؟" یہ سنتے ہی مالک نے سیکورٹی گارڈ کو بلایا اور کہا کہ وہ اس کو دھکے مار کر باہر کر دے۔ اس کا جسم جیسے جامد ہو گیا۔ وہ کچھ کہنے سننے کے قابل نہ رہا۔ سیکورٹی گارڈ نے اسے دو دفعہ کھڑے ہونے کو کہا اور آخر کار اپنی جیب سے سپرے نکال کر نمیر کی آنکھوں پہ ایک چبھتی ہوئی پھوار ڈال دی۔ اس کی آنکھیں یکدم انگارہ جیسے بن گئیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر باہر کی جانب بھاگا۔ اور پھر اس کو جیسے ہوش ہی آ گیا۔ سالہا سال کی دبی دبی چیخیں اس کے سینے سے یوں باہر نکلیں جیسے سیلاب ہی آ گیا ہو۔ نمیر چیخ چیخ کر اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کا ذکر کرنے لگا۔ ماں کے ساتھ ہونے والے حادثات کا رونا رونے لگا۔ آج وہ سب کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ چیخ چیخ کر اس نے آسمان سر پہ اٹھا لیا، کوئی سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ اس سے ڈر کر دور دور بھاگنے لگے۔

◆◆◆

وہ رات

وسیم جبران

مختصر تعارف

وسیم جبران 2002ء سے مری میں مقیم ہیں۔ شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار وسیم جبران کے دو شعری مجموعے "تم سے کہنا تھا" اور "تمام دکھ ہے" شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوی مجموعہ "رتی گلی کی لڑکی" اور کالموں کا انتخاب "اپنا نام آپ سے کہا" کے نام سے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ آرمی پبلک کالج جینار کیمپس مری میں تعینات ہیں جہاں وہ تدریس کے ساتھ ساتھ صدر شعبہ اردو کے فرائض بھی ادا کر رہے ہیں۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "تیلی" زیر اشاعت ہے۔

بارش اس قدر تیز تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے بادلوں میں سوراخ ہو گئے ہوں اور پانی آبشاروں کی طرح برس رہا ہو۔ شام کا وقت تھا مگر گہرے کالے بادلوں کی وجہ سے رات کا گمان ہوتا تھا۔ ایسے میں دور تک دیکھنا بھی ممکن نہ تھا۔ اچانک بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجا۔ اس ایک لمحے میں مجھے سامنے ایک مکان نظر آیا جس کے دروازے پر شیڈ گویا دوپٹے کو ٹکنے کا سہارا تھا۔ میں لپک کر اس شیڈ کے نیچے آ گیا مگر یہ شیڈ مجھے بارش کے پانی سے بچانے سے قاصر تھا۔ ہوا تیز تھی اور میں شیڈ کے نیچے ہونے کے باوجود بری طرح بھیگ رہا تھا۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر فوراً دروازے پر زور دار دستک دے ڈالی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ دروازہ فوراً کھل جائے گا۔ ایسا لگتا تھا کہ دروازہ کھولنے والا بالکل دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کی عمر انیس بیس برس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ دیدہ زیب لباس میں ملبوس تھی۔ لمبے سیاہ بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ میں ایک لمحے کے لیے اس کے حسین چہرے کو دیکھ کر کھو سا گیا۔ وہ میری طرف خالی خالی آنکھوں سے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کچھ نہ پا کر کیا کیے۔ "سعدیہ! کیا دروازے میں کھڑی رہو گی، ان کو جلدی اندر لے آؤ۔" ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ لڑکی ایسے چونکی جیسے اچانک نیند سے جاگی ہو۔ "ابا وہ نہیں ہیں، کوئی اور ہے۔" اس نے اندر کی طرف رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

تب ایک شخص دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ اس کی عمر پچپن کے لگ بھگ ہوگی۔ داڑھی کے بال آدھے سے زیادہ سفید تھے۔ شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ "براہ کرم مجھے اندر آنے دیجیے۔ میں بری طرح بھیگ رہا ہوں"۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا میں نے جلدی سے کہا۔ اس نے میری طرف قدرے غصے سے دیکھا۔ "برخوردار! اس وقت میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، کوئی اور دروازہ کھٹکھٹایے۔" "جناب! بارش بہت تیز ہے، میں بارش کم ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔" "آپ کو سمجھ نہیں آئی کہ میں نے کیا کہا ہے۔ ہم اس وقت پریشانی میں ہیں اور میری بیوی۔" اس نے تیز لہجے میں کہا مگر بات ادھوری چھوڑ دی۔ "ابو ابو۔ امی کی حالت بگڑ رہی ہے۔" لڑکی گھبرائی ہوئی آواز گونجی۔ "میں دیکھتا ہوں"۔ اس نے پلٹ کر کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے دروازہ بند کرنے لگا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ مجھے بتائیے، میں ایک ڈاکٹر ہوں۔" میں نے فوراً صورتِ حال کا اندازہ لگاتے ہوئے تقریباً چیختے ہوئے کہا لیکن اس شخص پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے مایوسی سے بند دروازے کو دیکھا پھر سڑک کی طرف دیکھا۔ اندھیرا بڑھ گیا اور بارش کی تیزی میں کمی کے کوئی آثار نہ تھے۔ یک دم دروازہ کھلا۔ "تم ڈاکٹر ہو؟" اس شخص نے تیزی سے سوال کیا۔ "میں آپ کو بتا چکا ہوں" میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اندر آ جاؤ" اس نے جلدی سے کہا اور میں ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا مکان تھا۔ میں اس شخص کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بیڈ روم میں داخل ہوا۔ بیڈ پر اس کی بیوی ساکت لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "خالدہ یہ ڈاکٹر ہیں۔" میں نے فوراً آگے بڑھ کر عورت کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض کی رفتار بہت تیز تھی۔ بلڈ پریشر چیک کیا تو کافی ہائی تھا۔ "کیا یہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں؟" "جی نہیں" وہ شخص بڑبڑایا۔ "بہرحال فکر نہ کریں، میں نے ایمرجنسی کے لیے کچھ دوائیں رکھی ہوتی ہیں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ایک بیگ سے ایک ٹیبلٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ "انہیں یہ گولی فوری طور پر کھلا دیں۔" دوسری لڑکی جس کا نام سدرہ تھا فوراً پانی کا گلاس لے کر آگے بڑھی۔ عورت نے بمشکل گولی نگلی اور پھر کراہنے لگی۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "میرا خیال ہے وہ لوگ آ گئے ہیں۔ سدرہ دروازہ کھولو۔" اس شخص نے چونک کر کہا۔ "جی ابو" سدرہ نے قدم بڑھائے۔

وہ شخص میری موجودگی سے بے نیاز اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں تو وہ مڑا اور لاؤنج کی طرف بڑھا۔ میں بھی چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑا۔ لاؤنج میں ایک جوڑا موجود تھا۔ ایک خوبرو نوجوان سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والی لڑکی سدرہ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے چمک دار قیمتی لباس پہنا ہوا تھا۔ بدن پر سونے کے زیورات بھی تھے۔ وہ نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی۔ جب وہ سدرہ سے الگ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ "شاہدہ بیٹی۔" اس شخص نے پیار سے کہا۔ لڑکی نے بھیگی ہوئی پلکیں اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا اور سسکنے لگی۔ وہ شخص فوراً آگے بڑھا اور اسے گلے لگا لیا۔ شاہدہ کے شفاف گالوں پر آنسو موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ کچھ ساعتوں کے بعد اس شخص نے شاہدہ کو خود سے الگ کیا۔ "آؤ بیٹا! میرے گلے لگ جاؤ۔" وہ نوجوان تھوڑا جھجکتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس شخص نے خود آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ میں یہ جذباتی منظر دیکھ کر دم بخود تھا اور اس کی نوعیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "امی کہاں ہیں؟" شاہدہ نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "بیٹے تمہاری امی کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دوا دے دی ہے۔" اس شخص نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شاہدہ نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور تقریباً بھاگتے ہوئے اپنی امی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ "امی، امی کیا ہوا آپ کو؟" اس کی ماں نے بازو پھیلا دیے۔ وہ ماں سے لپٹ گئی۔ "بس بیٹا اب میں ٹھیک ہوں" بولی اور ایک بار پھر رونے لگی۔ "امی آپ تو چپ رہیں" شاہدہ بولی۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر خالدہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ "جناب واقعی یہ بخار میں مبتلا ہیں۔" اس شخص کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "میرا نام قوی ہے۔" "قوی صاحب! میں انہیں کچھ دوا دے دیتا ہوں۔ امید ہے کچھ دیر میں بخار اتر جائے گا۔" "میں اب ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب۔" خالدہ نے کہا مگر اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "آپ دوا لیں ڈاکٹر صاحب۔"

قوی نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ اسے دوا دینے کے بعد سب اسی کمرے میں بیٹھ گئے۔ مجھ سمیت سب افراد گم صم بیٹھے تھے۔ کمرے کی فضا میں ایک عجیب سی پراسراریت تھی۔ نوجوان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ قوی صاحب جیسے خلا میں گھور رہے تھے۔ شاہدہ

کی نگاہ اپنی ماں پر جمی تھی اور سدرہ سر جھکائے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ اسی کیفیت میں کئی منٹ گزر گئے۔ میں دونوں بہنوں کا موازنہ کر رہا تھا۔ دونوں بلا کی حسین تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ قدرت نے شاید کسی خاص مقصد سے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ میں نے کئی بار چوری چوری سدرہ کی طرف دیکھا تھا۔ جسے کسی اور نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن سدرہ محسوس کر چکی تھی۔ اس نے ایک بار بڑی گہری نگاہ سے مجھے دیکھا پھر سر کو دھیرے سے جنبش دی جیسے منع کر رہی ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک تھی شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ کمرے میں موجود کوئی فرد اس بات کا نوٹس لے۔ ''ابو کھانا لگاؤں؟'' آخر سدرہ کی آواز گونجی۔ قوی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اپنی بیوی خالدہ پر نگاہ ڈالی۔ گولیوں کے اثر سے اس پر غنودگی سی طاری تھی۔ ''فکر مت کیجئے۔ یہ دواؤں کے اثر میں ہیں۔ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔'' میرا ہاتھ خالدہ کی نبض پر تھا۔ ''ہوں۔ سدرہ بیٹی کھانا لگاؤ'' قوی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ سدرہ اٹھی اور کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم ڈائننگ ٹیبل پر تھے۔ ہم سدرہ کی ماں اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ کھانا خاصا پرتکلف تھا جس میں مرغ کا سالن، کوفتے، روسٹ، تکے، کباب، چاول، نان، کھیر سمیت کئی اور لوازمات بھی شامل تھے۔ جب قوی نے سدرہ سے کھانا سرو کرنے کو کہا تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میرے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ ''دھیان سے بیٹی''

سدرہ کا ہاتھ کپکپایا تو قوی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کسی قدر غصے سے کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے میری موجودگی بہت بری لگ رہی تھی۔ لیکن اس نے مجھے خود ہی کھانے کے لیے روکا تھا۔ شاید وہ اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھا۔ مجھے بھیجنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ''ابو اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی میں تو آپ کی بیٹی ہوں۔'' شاہدہ نے باپ کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے داماد کے ساتھ تم پہلی بار آئی ہو۔ اچھا اب کھانا کھاؤ'' قوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی مسکراہٹ مصنوعی لگی۔ سدرہ کے چہرے کا رنگ یک دم متغیر ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ کسی شدید خوف میں مبتلا ہے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے گلاس پکڑا اور دو تین گھونٹ بھرے جیسے اپنے خشک حلق کو تر کر رہی ہو۔ شاہدہ اور اس کا میاں چپ چاپ کھانا کھانے لگے۔ قوی بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ میں نے بھی کھانا شروع کیا لیکن سدرہ نے ابھی تک ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔ کئی لمحوں کے بعد اچانک قوی کی نگاہ اس پر پڑی۔ ''سدرہ بیٹی کس سوچ میں گم ہو؟ کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟'' ''ابو مجھے بھوک نہیں ہے۔'' سدرہ بولی۔ ''تھوڑا سا تو کھا لو'' قوی نے کہا۔ ''جی ابو کھاتی ہوں'' اس نے کہا۔

لیکن میں نے دیکھا اس نے جیسے سلو موشن میں لقمہ بنایا پھر منہ تک لے جا کر واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ اس نے دو تین بار میری طرف دیکھا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اچانک خالدہ کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی۔ سدرہ فوراً اٹھ کر اندر کی طرف بھاگی۔ میں بھی لپک کر پیچھے گیا۔ خالدہ جاگ گئی تھی۔ میں نے بخار کا جائزہ لیا۔ اور بلڈ پریشر چیک کیا۔ بخار ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا مگر بلڈ پریشر بہتر تھا۔ دیگر افراد بھی کھانا چھوڑ کر آ گئے تھے میں نے انہیں تسلی دی کہ اب ان کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ ہم ایک بار پھر ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے۔ بادلوں کی گھن گرج میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایسی طوفانی بارش میں گھر کیسے جاؤں گا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ موسم اس قدر خراب ہو جائے گا۔ شام کو میں ہاسپٹل کی ڈیوٹی آف ہونے کے بعد ایک ٹیکسی میں گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ جگہ ایسی تھی کہ کوئی اور سواری مل نہیں رہی تھی۔ میں پیدل ہی آگے بڑھنے لگا

کہ شاید کوئی ٹیکسی یا رکشہ مل جائے۔ لیکن کالے بادلوں نے برسنا شروع کر دیا اور میں یہاں تک پہنچ گیا تھا۔" ڈاکٹر صاحب اور کہا ہے ناں" قوی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "جی شکریہ میں کہاں تھا" "آپ کا بھی شکریہ۔ آپ کی فیس کتنی ہوگی؟" "میں کیا آپ سے فیس لوں گا۔ میں تو آپ کا شکر گزار ہوں آپ نے مجھے اس طوفانی بارش میں بھیگنے سے بچایا۔"

"بہت شکریہ! مجھے امید ہے اب آپ اپنے گھر جا سکیں گے" قوی نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہاں مزید رکنا مشکل ہے۔ بادل نخواستہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا، دروازہ کھولا تو تیز ہوا سے پانی کی بوچھاڑ آ گری۔ "قوی صاحب! ابھی حالات کچھ ٹھیک نہیں، اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دیر رک جاتا ہوں۔ ابھی آپ کی مسز کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ انہیں دیکھ لوں گا"۔ میں نے پلٹتے ہوئے۔ "ہاں آپ رک جائیں تو اچھا ہے" شاید وہ شاید ماں کی بیماری سے پریشان تھی۔ "پلیز ابو! انہیں روک لیں" سعدیہ نے بھی ملتجی نظروں سے باپ کو دیکھا۔ "ٹھیک ہے! آپ مہمان خانے میں رک جائیں۔ شاید ایک آدھ گھنٹے میں بارش رک جائے اور میری بیوی کی طبیعت بھی سنبھل جائے۔" قوی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم۔ میں آپ کو مہمان خانے تک لے چلتی ہوں" سعدیہ بولی اور آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور کے ایک کمرے تک پہنچے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک سادہ سا بیڈروم تھا۔ اس نے اشارہ کیا تو میں اندر داخل ہوا تو وہ بھی لپک کر میرے پیچھے آ گئی۔ میں نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ بہت تیز تیز سانسیں لے رہی تھی۔ میں ذرا سہم سے الجھ رہا تھا۔ "پلیز آپ کسی صورت یہاں سے جایئے گا نہیں۔ میں موقع ملتے ہی آپ کے پاس آؤں گی۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

اس نے میرے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کی اور پھر تیزی سے واپس چلی گئی۔ میں کئی لمحوں تک ساکت کھڑا رہا۔ بادلوں کی گھن گرج مسلسل جاری تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آج کی رات بارش تمام گزشتہ ریکارڈ توڑ دے گی۔ اچانک زوردار دھماکا ہوا جیسے بجلی نزدیک ہی کہیں گری ہو اس کے ساتھ ہی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ان حالات میں بجلی کا بریک ڈاؤن حتمی تھا گو کہ گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور میرے پاس کوئی لائٹر وغیرہ بھی نہیں تھا کہ روشنی کا کوئی ذریعہ ملتا۔ کئی منٹ گزر گئے پھر ہلکی سی روشنی ہوئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی شخص کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ روشنی بڑھی تو میں نے دیکھا کہ قوی ہاتھ میں موم بتی لیے دروازے میں کھڑا تھا۔ موم بتی کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ اس کی روشنی میں قوی کا سپاٹ چہرہ خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی مردہ ہو۔ "یہ موم بتی رکھ لیں۔ بجلی نہ جانے کب آئے گی۔" اس نے موم بتی میری طرف بڑھائی۔ میں نے سر جھٹک کر موم بتی پکڑی تو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی موم بتی کو اس موم بتی سے روشن کیا۔ "تھوڑی دیر بعد میری مسز کو چیک کر لیجئے گا۔" اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ "جی ضرور۔ فکر مت کیجئے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور ایک مناسب جگہ پر موم بتی لگا دی۔ کچھ دیر کے بعد اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے پر آیا ہے۔ میں نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا وہ سعدیہ تھی اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ حیرت یہ تھی کہ مجھے اس کے قدموں کی آواز سنائی نہ دی تھی۔ شاید وہ دبے پاؤں آئی تھی۔ "کیا ہوا؟ آپ کی والدہ تو ٹھیک ہیں؟" "جی پہلے سے تو بہتر ہیں۔ میں کچھ اور کہنے آئی ہوں" اس نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی۔ "فرمائیے" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پلیز آہستہ بولیں۔" اس نے پھر سرگوشی کی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس تاریک رات میں باہر زوروں کی بارش جاری

تھی۔ میں اس اجنبی مکان میں تھا اور ایک خوبصورت نوجوان لڑکی میرے کمرے میں تنہا آئی تھی۔ وہ لڑکی جسے میں اس شام سے پہلے جانتا بھی نہیں تھا۔ ''مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔'' لڑکی کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس خوف میں مبتلا ہیں لیکن آپ عمل کر رہے ہیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' ''کھانا کھانے کے بعد آپ کو کچھ عجیب تو محسوس نہیں ہو رہا۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟ کیا ایسا ہونا چاہیے تھا؟'' ''ہم۔ میں کیا کہوں۔ میں نے کل چھپ کر اپنے ماں باپ کی باتیں سن لی تھیں۔ مجھے شبہ ہے کہ کھانے میں زہر ملا تھا۔'' لڑکی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ شاید اسی لیے تم کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ لیکن تمہارے ماں باپ ایسا کیوں کریں گے؟'' میں نے الجھ کر کہا۔ ''ماں باپ نہیں صرف میرا باپ۔ مگر ابھی تک کسی کو کچھ نہیں ہوا۔ شاید میرا خیال غلط ہے۔ پتا نہیں مجھے آپ سے یہ بات کہنی چاہیے تھی یا نہیں۔'' ''کہیں تم کسی نفسیاتی عارضے میں تو مبتلا نہیں۔ کوئی فوبیا؟ یا ایسا ہی کوئی اور مسئلہ؟'' ''دیکھیے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ براہِ کرم میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' لڑکی کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن دور سے اس کے باپ کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔ ''مجھے جانا ہوگا۔'' لڑکی نے بے حد پریشانی سے کہا اور تیزی سے باہر نکل چلی گئی۔

میں سر تھام کر رہ گیا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے موم بتی اٹھائی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تو دیکھا کہ سب لوگ لاؤنج میں اکٹھے تھے۔ سدرہ کی ماں بھی وہیں موجود تھی۔ وہ باتیں کر رہے تھے۔ ''ڈاکٹر صاحب! میری بیوی کی طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے۔ آپ براہِ کرم تشریف لے جائیے۔'' قوی نے آہٹ سن کر میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''ابو! شاید ابھی امی کی طبیعت اتنی اچھی نہیں ہے۔'' شاہدہ بولی۔ ''بارش ابھی تک رکی نہیں۔'' میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر قوی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''ڈاکٹر صاحب بارش اگر صبح تک جاری رہی تو کیا رات بھر یہیں قیام کریں گے۔'' قوی کا لہجہ تلخ تھا۔ ''جی اگر آپ اجازت دیں تو۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''بہت شکریہ۔ میں ایسا ارادہ نہیں رکھتا۔'' قوی نے روکھے پھیکے لہجے میں کہا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ وہاں سے رخصت ہو جاتا۔ میں نے مرے قدموں سے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔ قوی میرے پیچھے تھا۔ جیسے ہی میں باہر نکلا، قوی نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ میں برآمدے کے نیچے کھڑا تھا۔ ہر طرف تاریکی تھی اور بارش کی رفتار میں کمی کے آثار تھے۔ کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی آہستگی سے دروازہ کھول رہا ہے۔ میرا شک صحیح تھا۔ دروازہ ذرا سا کھلا کسی نے جھانک کر باہر دیکھا عین اسی وقت بجلی چمکی اور پھر اس نے اسی آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اندازہ لگا چکا تھا کہ دروازہ کھولنے والی سدرہ تھی۔ اس کی لمبی زلفوں اور اداس چہرے کو میں نے اسی ایک سیکنڈ میں دیکھ لیا تھا۔ میرے دل میں خیالات کا تیز بہاؤ جاری تھا۔ کیا اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے۔ کیا مجھے اندر جانا چاہیے۔ کہیں میں کسی مصیبت میں تو گرفتار نہیں ہونے والا۔ بالآخر میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ واقعی کھلا تھا۔ میں آہستگی سے اندر داخل ہوا۔ اندر موم بتیوں کی روشنی میں مجھے دیکھا جا سکتا تھا۔ میں محتاط انداز میں لاؤنج کی طرف بڑھا۔ اب ان سب کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ انداز سے ایسا لگتا تھا کہ معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔ ''بس اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیے'' قوی نے اس بار تیز لہجے میں کہا۔ ''ابو''۔ سدرہ چیخی۔ تب میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ قوی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ شاید مجھے الٹے قدموں بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں سدرہ کا خوب صورت چہرہ یکدم میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً اندر داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر

وہ سب چونک اٹھے۔ "ڈاکٹر صاحب آپ تو چلے گئے تھے۔" قوی گرج اٹھا۔ "آپ یہ ریوالور نیچے رکھ دیں۔" نہ جانے اس وقت اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میری آواز خاصی بلند تھی۔ "آپ کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ ہمارے معاملے میں ٹانگ نہ اڑائیں۔" قوی نے سنبھلتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔ میں نے ان سب کی طرف دیکھا۔ قوی کے سوا باقی سب کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ سدرہ تو باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ "میں نہیں جاؤں گا۔" "ٹھیک ہے تو پھر بھگتو" قوی نے ریوالور کا رخ میری طرف کیا۔

"ابو قصوروار تو میں ہوں ناں۔ میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں مجھے گولی مار دیں لیکن کسی اور کا کوئی قصور نہیں، ان کو تو بخش دیں۔" شاہدہ روتے ہوئے چیخی۔ "ہاں ہاں تم قصوروار ہو، تمھیں نہیں چھوڑوں گا لیکن اس سے پہلے اس مردود کو ماروں گا۔" قوی ایسے چیخا جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ اس نے اپنے داماد کی طرف انتہائی نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ شاہدہ نے اس کا ارادہ بھانپ لیا وہ فوراً اپنے شوہر کے آگے آ گئی۔ اس کی ماں اور سدرہ بھی روتے ہوئے ان کی طرف لپکیں۔ "ہٹو سامنے سے" قوی دھاڑا۔ اس کے بعد جیسے وہ مکمل پاگل ہو گیا۔ اس نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ کمرہ گولیوں کی خوفناک آواز کے ساتھ انسانی چیخوں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ قوی نے اپنے داماد ہی کو نشانہ بنایا تھا لیکن پہلی گولی شاہدہ کو لگی۔ اس کے بعد اس کی ماں خون میں نہا گئی۔ میں شاید قوی کی طرف بڑھا تھا جب مجھے سدرہ اور اس کے شوہر کی آخری چیخیں سنائی دیں اس کے ساتھ ہی میرے دماغ پر بھی اندھیرا چھا گیا۔

میرے کانوں میں کسی پرندے کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میں کسی ٹھنڈی جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ پھر ایک جھٹکے سے میں نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے ایک چھت دکھائی دی۔ میں نے فوراً ادھر ادھر دیکھا۔ میں کسی کمرے کے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ خالی تھا اور گرد سے بھرا ہوا تھا۔ فرش پر پڑے رہنے کی وجہ سے میرے کپڑے بھی گرد سے بھرے ہوئے تھے۔ رات کے واقعات کسی فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے پر چل رہے تھے۔ میں تیزی سے اٹھا اور تقریباً بھاگتے ہوئے گھر چھان مارا۔ سارا گھر خالی پڑا تھا۔ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ "آخر ہوا کیا ہے؟" میں نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ دروازہ کھلا تھا۔ باہر نکل کر دیکھا۔ وہی پیچھے والا مکان تھا۔ یہ لوگ کہاں چلے گئے؟ بارش رک چکی تھی۔ بادل رخصت ہو چکے تھے اور نیلا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر پڑوس کے مکان پر دستک دی۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھولا۔ میری حالت دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔ "برائے کرم میری حالت پر غور کیے بغیر بتائیے کہ اس مکان میں کون رہتا ہے؟ میں رات بارش سے بچنے کے لیے ان کے ہاں رکا تھا اور پھر۔" حیرت سے اس شخص کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"آپ اس مکان میں ٹھہرے تھے۔ مگر یہ تو پانچ سال سے بند پڑا ہے۔ ہاں کبھی کبھی عجیب سی آوازیں آتی ہیں۔ اسی لیے تو کوئی اس مکان کو خریدتا نہیں۔ ہم تو نئے آئے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ اس مکان میں ایک شخص اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی نے اپنی مرضی سے بھاگ کر شادی کر لی تھی۔ اس شخص نے اپنے داماد اور بیٹی سے صلح کر کے اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا۔ تین چار دن بعد اس گھر سے ان سب کی لاشیں ملی تھیں۔ کسی نے ان سب کو گولیاں مار دی تھیں۔" "کس نے گولیاں ماری تھیں؟" میری آواز لرز رہی تھی۔ "پتا نہیں جی۔ ہمیں بھی کسی نے بتایا ہے۔ ہمیں تو اس مکان کے آگے سے گزرتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔" اس شخص نے کہا اور جیسے ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

◆◆◆

وبا

نشاط یاسمین خان

مختصر تعارف

کافی ادبی جرائد اور اخبارات میں کام بھی لکھ چکی ہیں۔ 3 ناول اور 3 افسانوں کے مجموعے شائع ہونے کے علاوہ ایک سفر نامہ اور ایک طنز و مزاح پر مضامین کی کتاب منظر عام پر آ چکی ہے۔

ایک نیوز چینل سے مجھے تقرر نامہ کیا ملا — گھر میں طوفان سا آ گیا۔ اماں نے صاف اعلان کر دیا کہ جب تک تمہاری شادی یا کم از کم منگنی نہیں ہو جاتی، کہیں نوکری نہیں کرو گے۔ میرے لیے لڑکی کی تلاش شروع ہو گئی۔ ادھر بھابھی نے، بہن اور بھائی نے رشتہ داروں اور دوستوں میں یہ دھوتیں اڑانا شروع کر دیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ چینل میں لڑکیاں نہیں، ڈائنیں بیٹھی ہیں جو جاتے ہی مجھ سے چمٹ جائیں گی۔ بھائی جان نے وقت اور حالات کا ادراک کرتے ہوئے فوری طور پر مجھے نوکری جوائن کرنے کا مشورہ دے دیا۔ شروع دنوں میں پبلک ٹرانسپورٹ کی کمی کی وجہ سے آنے جانے میں مجھے بہت مشکل پیش آتی تھی۔ کبھی کسی کولیگ سے لفٹ لے لیا کرتا تھا اور کبھی ٹیکسی پر آنا ہوتا۔ پھر میں نے بھی موٹر سائیکل لے لی جس سے آنے جانے میں آسانی ہو گئی۔ دو تین مہینے نیوز چینل میں کام کرنے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں لڑکے اور لڑکی میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ جس طرح پاپڑ والے کرتے ہیں، جو کام لڑکوں کو دیا جاتا ہے ویسے ہی لڑکیوں کو دے جاتے ہیں۔ ہم سب یہاں صرف کولیگ ہیں۔ وہاں کام کرنے والی لڑکیاں زیادہ تر مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھیں اور اپنے کنبوں کا بوجھ اٹھائے صبح سے شام کرنے میں مصروف تھیں۔ کسی کو بھی فضول وقت ضائع کرنے کی فرصت نہ تھی۔ اکثر تو عشق محبت کو بالکل فارغ لوگوں کا کام اور مشغلہ سمجھتی تھیں اور عاقب کے لیے عشق و محبت ایک مشغلہ ہی تھا۔ عاقب کئی سال سے یہاں نوکری کر رہا تھا مگر ترقی نہیں کر سکا تھا۔ یہاں آتے ہی لڑکیوں کے خلاف کان بھرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا "ان چڑیلوں سے بچ کر رہنا۔ ایک ایک بات اوپر پہنچاتی ہیں —— پکی جاسوس ہیں۔" مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ لڑکیاں اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کرتیں بلکہ ان سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ خاصی پر اعتماد تھیں۔ عاقب ہر لڑکی کو لفٹ دینے کا شوقین تھا جب کہ وہ اس کو مدد بھی نہیں لگاتی تھیں۔ اکثر کے پاس تو اپنی موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ جب بھی وہ ان سے ایسی ویسی بات کرتا تو وہ اوپر شکایت لگا دیتی تھیں۔ پھر بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا اور موقع ملتے ہی کسی نہ کسی لڑکی کو نیچا دکھانے کی تاک میں رہتا تھا۔ میں اسے منع کرتا تو وہ قہقہہ لگا کر کہتا "یار کبھی تو قسمت یاوری کرے گی۔"

ساری دنیا وبا کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ لاک ڈاؤن شروع ہو چکا تھا۔ لڑکیوں کی تو چھٹی کر دی گئی تھی۔ لڑکوں کو شفٹوں میں آنا ہوتا تھا۔ میں اور عاقب ایک ہی شفٹ میں تھے اور ہماری شفٹ کا آج آخری دن تھا۔ پھر ایک ہفتے کی چھٹی تھی۔ میں جب آفس بند کر کے نکل رہا تھا تو اسٹوک روم میں بیٹھا وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ موٹر سائیکل لے کر میں بس اسٹاپ تک پہنچا ہی تھا کہ اس کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔

موٹر سائیکل سے اتر کر میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ سنسان سڑک ۔۔۔ آدم نہ آدم زاد ۔۔۔ عجب ہُو کا عالم تھا۔ رات کے دس بجے ہوں گے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہو۔ ابھی سردی ختم نہیں ہوئی تھی۔ موسم میں ایک خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ اچانک میری نظر بس اسٹاپ پر کھڑی لڑکی پر پڑی تو میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر اتر گئی۔ وہ تنہا تھی۔ اس وقت اور ایسے حالات میں کوئی بھی لڑکی اکیلی کھڑی ہونے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے جھرجھری لی۔ ہو سکتا ہے انسانی شکل میں کوئی بلا ہو ۔۔۔ مگر بلا اتنی موڈرن نہیں ہو سکتی۔ شلوار کرتا، شولڈر کٹ بال اور کاندھے سے لٹکتا ہوا بیگ ۔۔۔ پہلی نظر میں مجھے کوئی کالج گرل ہی لگی تھی۔ میں نے دل کو تسلی دی۔ پھر بھی میرے لیے ادھر کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ میں ہمت کر کے موٹر سائیکل گھسیٹتے ہوئے سڑک کے دوسرے کنارے تک لے آیا۔ میں اسی وقت جانے کو تھا کہ تیزی سے ایک موٹر سائیکل قریب سے گزری۔ اس کی پچھلی سیٹ پر وہی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اور موٹر سائیکل عاقب کی تھی۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ نہ جانے اس کی نظروں میں کیا تھا کہ میں سر سے پیر تک لرز کر رہ گیا۔ پھر میں کس طرح گھر پہنچا؟ ۔۔۔ وہ ناقابل بیان ہے۔ ہفتہ بھر تک وہ نظریں میرے سامنے رہیں۔ تیسرے دن جب میں دفتر پہنچا تو عاقب موجود نہیں تھا۔ پورا ہفتہ ہی وہ دفتر سے غائب رہا۔ کسی کو اس کے متعلق کچھ خبر نہ تھی۔ پھر ایک دن ہمارے دفتر کو شفٹ کر دیا گیا اور ہم سب کو [illegible] میں جانا پڑا۔ کیوں کہ عاقب کو وہاں لے آیا تھا۔

◆◆◆

مختصر افسانہ

خمار کے کنارے

پروفیسر عاصم بخاری

محمود الدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ماں باپ نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے آوارہ مزاج تھا۔ یہ شعر اس پر صادق آتا تھا۔

آغاز جوانی ہے ذرا جھوم کے چلتے ہیں ۔۔۔ دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہم پی کے نکلتے ہیں

نوجوانی کا نشہ اور [illegible]

[illegible]

غزلیں

اسلم انصاری

○

تصویر کو خوابوں کے شبستاں سے نکالا
اک یوسفِ گم گشتہ کو زنداں سے نکالا

کچھ شعبدے جب جادو بیانوں نے دکھائے
اک چاند تو ہم نے بھی گریباں سے نکالا

پل بھر کا وہ اک خواب سا تھا اور کسی نے
یہ خواب نہ پھر دیدۂ حیراں سے نکالا

اب شہر کی آنکھوں سے بھی بھاگ رہی ہے
وحشت کو بھلا کس نے بیاباں سے نکالا

حیران ہوئے سب دیکھ کے جب ہم نے یکدم
اک عالم تو چاکِ گریباں سے نکالا

تعمیر جہانِ عشق سے کیا خوب کرالی
یہ کام بھی اس بے سر و ساماں سے نکالا

اب ذکرِ تعلق پہ وہ کہتے ہیں کہ دیکھیں
ہم نے ہی اسے خوابِ پریشاں سے نکالا

جنت سے نکالا ہوا شاکی ہے کہ آخر
اک بھول پہ کیوں گل کو گلستاں سے نکالا

○○○

سلیم کوثر

○

خوشی سے بڑا تعارف ہوا اوائلِ غم
پھر اس کے بعد تو دنیا تھی اور مسائلِ غم

مجھے پناہ پڑا خواہشوں کے جنگل سے
میں خود پہ خود ہی ہوا جا رہا تھا مائلِ غم

کبھی کہیں کوئی ایسا جریدہ تھا شاید
گھروں سے اب تو نکلنے لگے رسائلِ غم

میں اس کے سامنے خوشیاں اٹھا کے لے آیا
وہ دے رہا تھا مسلسل مجھے دلائلِ غم

کبھی کیا ہی نہیں دل کی الجھنوں کا بیاں
کبھی دکھائی نہیں ہے کسی کو حائلِ غم

تو دیکھتا ہے مسرت کی بے کرانی کو
یہاں کسی کو میسر نہیں وسائلِ غم

میں اس کے کانٹے کو پھولوں سے ڈھانپ لیتا ہوں
قریب خانے پہ جب آیا کوئی سائلِ غم

بڑے کٹھن تھے بڑے دشوار راستے تھے مگر
خدا کے فضل سے طے ہو گئے مراحلِ غم

سلیم میں کسی ظالم سے اب نہیں ڈرتا
غمِ حسین سے مجھ پر کھلے فضائلِ غم

○○○

سحر انصاری

○

حالتِ حال نے اب یہ بھی فراموش کیا
کون تھا جس نے ہمیں گرمِ خروش کیا

کچھ نہ کچھ ہوتا ہے احباب کے ملنے کا سبب
جس طرح کرنوں نے ذروں کو ہم آغوش کیا

خیر تو ہوتے ہی رہتے ہیں یہ ظلمِ سلطان
دیکھنا یہ ہے کہ آواز کو خاموش کیا

التفات اتنا بھی اچھا نہیں ہوتا ساقی
پہلے ہی جام نے رندوں کو بلا نوش کیا

فرق پڑتا ہے تو اس بات سے پڑتا ہے سحر
کس نے چاہا ہے تمہیں کس نے فراموش کیا

○○○

آصف ثاقب

O

ادا ہے کیا زمانہ جانتا ہے
مجھے سارا زمانہ جانتا ہے

بظاہر چھپ کے میں بیٹھا ہوا ہوں
مگر رستہ زمانہ جانتا ہے

ہوا ہے مہرباں کیسے کہ اس کو
جتا [illegible] زمانہ جانتا ہے

مرا دل، جو گزرتا ساتھ ہو
اسے اپنا زمانہ جانتا ہے

مرے یاروں کو مجھ سے [illegible]
بہت اچھا زمانہ جانتا ہے

کہانی سر بسر سچی ہے مجھ کو
مگر پورا زمانہ جانتا ہے

ہمارا عشق پوشیدہ نہیں تو
زمانے کو زمانہ جانتا ہے

بنا ہے تیر کا [illegible] وہ ثاقب
اسے میرا زمانہ جانتا ہے

OOO

خالد اقبال یاسر

O

رفاقتیں ہیں کئی برس سے
لگے تھے پہلے بھلی تو کس سے

نکلنا چاہوں قفس سے باہر
دبی صداؤں کی دسترس سے

پلٹ کر آئے ہو میری جانب
اگرچہ باہر ہو میرے بس سے

مجھے ہی عقدہ [illegible] پڑے گی
نہیں ہوئے تم ہوس کے بس سے

ہزار سمجھوتے کرنے پر بھی
بڑی نہیں قدر [illegible] سے

ارادہ کرتا ہوں توڑتا ہوں
گزر [illegible] سے

جدائی ممکن نہیں ہے یاسر
نکل کس طرح رہے قفس سے

OOO

گلزار بخاری

O

سمندر میں ہے یہاں نہ موجوں میں جوش ہے
طوفان کے بعد جیسا دریا خموش ہے

جب خاک سے کسی نے اٹھایا نہ پھول کو
پھر اس پہ کیا ملال کہ محبت فروش ہے

مانگے کوئی کبھی کی دعا اس نگر میں کیوں
سب جانتے ہیں شب کی خطا پردہ پوش ہے

شاخیں جھکی ہوئی ہیں بہاروں کے بوجھ سے
حد سے زیادہ برگ و ثمر بار دوش ہے

مقصود اس کا ہاتھ تھامنا تھا اس لیے
کہنے گئی ہوا کہ شجر [illegible] ہے

لگتا ہے آسمان پہ مہتاب دیکھ کر
سارا جہان حسن کا حلقہ بگوش ہے

گلزار نے ضمیر کا سودا نہیں کیا
دیوانگی میں بھی اسے اتنا تو ہوش ہے

OOO

مسلم شمیم

O

چاند کو خوفِ تیرگی ہے بہت
شب کو احساسِ بے رخی ہے بہت

حکم جاری ہے، ان کو گل کر دو
جن چراغوں سے روشنی ہے بہت

جام سے ہو کہ جامِ زہر آب
کچھ بھی لا دے کہ تشنگی ہے بہت

دور کا چاند ہی نکل آئے
دل کے صحرا میں تیرگی ہے بہت

کم نہ تھا ہجر کا عذاب، شمیم!
اور اب کربِ آگہی ہے بہت

OOO

صفدر صدیق رضی

O

حرف حرف میں تحریر خلق کرتا ہوں
فقط نگاہ سے تصویر خلق کرتا ہوں

میں قتل کرتا ہوں خود اپنے دست و بازو کو
اور بھی کوئی زنجیر خلق کرتا ہوں

نہ جانے پھر بھی آنکھیں مری رہیں نہ رہیں
میں پہلے خواب سے تعبیر خلق کرتا ہوں

کئی ہدف اسے اپنی طرف بلاتے ہیں
ہدف بھلا کے جو میں تیر خلق کرتا ہوں

جو ظلم و جبر یوں دیکھوں میں زیر دستوں کو
تو پھر کبھی کبھی شمشیر خلق کرتا ہوں

جہانِ عشق میں عجلت سے میں نے کام لیا
وہ جلد باز ہوں تاخیر خلق کرتا ہوں

OOO

اقتدار جاوید

O

یہ رنگ اٹھا کے کسی کارخانے سے آیا ہوں
میں جیسے آنے والے زمانے سے آیا ہوں

ایسی دعا ہوں جو نہیں ہوئی کبھی قبول
اک تیر ہوں پلٹ کے نشانے سے آیا ہوں

پھیلی قدیم درخت کی چاروں طرف مہک
پھل لے کے کتنے پیڑ پرانے سے آیا ہوں

ظاہر کہاں پہ ہوا تھا یہ خاکداں سرشت
تیرے جہاں میں تیرے بہانے سے آیا ہوں

آئے نہیں تھے دل سے کبھی ایسے تو واقعات
کچھ یاد اس کو پہلے بتانے سے آیا ہوں

مجھ کو بھرے جہاں میں کوئی پوچھتا نہ تھا
اب تو میں نظر ترے آنے سے آیا ہوں

میں نے کہاں نکالا تھا ان پانیوں کے بیچ
خود کو نظر میں شیشہ بنانے سے آیا ہوں

پانوں میں پل، پل پہ پل، پل میں اقتدار
پا کر یہ تجھے ایک گھرانے سے آیا ہوں

اک اور شکل میں ادا اک اور طرح میں
اک دوسرے میں رنگ ملانے سے آیا ہوں

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

○

کب آئیں گے چمن کے لیے اور زمانے کتنے ہیں
جانے ہم کو تڑپانے کے اور بہانے کتنے ہیں

جو خاموش نگاہ دیکھے، وہ کیا بات ابھی سمجھے گا
یاں تو کہنے کو ہر لب پر پیار ترانے کتنے ہیں

ایک وہ کا لمس ہے جو خوشبو کو پھول بناتا ہے
ہم تو ان کو سمجھتے ہیں وہ انجانے کتنے ہیں

مدت بعد جو لوٹا ہوں تو دیکھ رہا ہوں محفل میں
کتنے ہیں انجانے چہرے، یار پرانے کتنے ہیں

ایک شگوفہ یادِ خزاں اور کانٹے اور بہت
کتنے ہیں دھڑکتے دل میں خوف دیوانے کتنے ہیں

چپ بیٹھے ہیں اہلِ چمن سے بول رہی ہیں تصویریں
جانے ان میں قتل ہے کتنا اور افسانے کتنے ہیں

سوچ تو کوسوں سے دور دنیا کی چادر اوڑھ کے بیٹھا ہے
پھر بھی اوڑھ کے ٹوٹی آنکھوں میں خواب سہانے کتنے ہیں

ہم کو رونے کی عادت تب ہے آپ خفا کیجیے ایوب
دردِ دل کی آنکھوں میں اب بھی مے خانے کتنے ہیں

○○○

قمر رضا شہزاد

○

اک دعا میں نے سر سے فلک کو بنا دیا
عاشق کی سمت جانے کا رستہ بنا دیا

یہ کون لوگ ہیں مرے اطراف کیا خبر
میں نے تو اپنا آپ بھی کب کا بھلا دیا

تھک ہار کر لپیٹ دی میں نے تری زمین
لمحے میں آسمان بھی نیچے گرا دیا

شہوت کی حکایت بدن میں اتر گئی
میں نے لبوں کو کس کے لبوں سے ملا دیا

یہ پھول جو کسی نے دیا تھا کبھی مجھے
میں نے اسے بھی ایک ندی میں بہا دیا

○○○

حسن عباسی

○

میری چارہ گری سے بنتی نہیں
شکل وہ شاعری سے بنتی نہیں

مجھی دیوار سے لگا دیا ہے
پہلے دن سے گھڑی سے بنتی نہیں

وہ اُدھر موت کے بجتی ہے
اور اُدھر زندگی سے بنتی نہیں

دینے والی ہے صرف اس سے مری
اور بھی صرف اسی سے بنتی نہیں

حسن کو عاشقی کی توفیق ہے
بات کچھ نوکری سے بنتی نہیں

اس کے اندر جو باقی لڑکی ہے
میری اس سرپھری سے بنتی نہیں

جانے اچھی ہے تو نہیں ہوں
جب وہ آئے خوشی سے بنتی نہیں

اتنی پیاری ہے وہ کہ اس کی حسن
ٹھیک فوٹو کسی سے بنتی نہیں

○○○

شاہین عباس

O

اس نے باندھا تھا تماشا جو مرے اندر آ کر
مجھ تک آیا ہی نہیں اس کا یہ پیکر آ کر

بار دنیا کی ہو رہتا ہے نہ بار ہستی
ایک ہو جاتے ہیں دونوں مرے سر پہ آ کر

زندگی آ کے گئی تیر کی مانند جیسے
ویسے لگ سکتا تھا کچھ اس سے بھی بہتر آ کر

پہلے یہ گردش دوراں میں بھی چلتا تھا
اب مرے سر ہی رہ جاتا ہے چکر آ کر

یاں کوئی ہے جو اٹھا کر اسے وہیں رکھ دے
یہ ستارہ جو گرا ہے مرے اندر آ کر

مشت خاک سے ہم آپ ہی اٹھ جاتے ہیں
خود اٹھا دے نہ کہیں صاحب بستر آ کر

خواب آغاز کیا سلسلے والوں میں
اور پھر پورا کیا خواب سے باہر آ کر

شعر یہ میری ملکیت مری حسرت میری
کچھ تو کرتی ہے یہ مٹی مرے سر پہ آ کر

پھر کوئی تیرے بدن سے اٹھا ہے کیا کیا؟
پھر کوئی ڈوب گیا میرے برابر آ کر

OOO

ڈاکٹر فرحت عباس

O

اتفاقاً ادھر بھی آیا کر
بات میری بھی مان جایا کر

پہلے منظر پہ خود کو لایا کر
اور منظر سے پھر ہٹایا کر

جب مقدر بنے آیا کر
اتنی خواہش ہے آ تو جایا کر

مجھ سے ملنے کبھی تو آیا کر
اور وہ غم آ کے سب بتایا کر

ایک عالم تھا جس سے ملا
وہ مجھے واقعہ سنایا کر

حکم حاکم ہے ظلم کھایا کر
اور بیٹھے ہوئے چھپایا کر

جس میں کوئی عروج ہو نہ زوال
شعر ایسا بھی اک بنایا کر

آسمانی ترا ضمیر تھا
خود کو مٹی میں بس ملایا کر

کیا کوئی عذاب ہے فرحت
اپنی عادت سے باز آیا کر

OOO

محمد سلیم ساگر

O

نہ عزیز جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
نہ مہرباں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

بصد یقین کوئی خوش گمان دیکھے تو
بہ گماں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

لہو میں دوڑتے اک سرخ اضطراب کے ساتھ
یہاں وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

کہیں ضمیر سے ملتی تو ہو ضمیر کوئی
کہوں کہ ہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

بہار آنے ہی کا اہتمام کیا
کہ جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

مجھے قسم ہے یہاں کوئی بھی نہیں تم سا
سو رائیگاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

جہاں ہے داغ عداوت سر جبین تمام
وہیں نشاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

OOO

ڈاکٹر محمد رفیق خان

O

کس کو معلوم کہ ہم عہد میں کیا دیتے ہیں
ہم زمانے کو سدا درسِ وفا دیتے ہیں

اپنا پیغام محبت ہے زمانے والو
ہم سرِ عام محبت کی صدا دیتے ہیں

درد اٹھتا ہے تو سلگتے ہوئے دل کے ارماں
سوز کے بکھرے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

دردِ دل اور فقیری ہے اثاثہ اپنا
ہم سرِ راہ خزانوں کو لٹا دیتے ہیں

جابجا بانٹتے پھرتے ہیں محبت اپنی
جب کہ لوگ ہمیں ہر گام دغا دیتے ہیں

ہم مظفر ہیں جو پروازِ تخیل کا سہارا لے کر
بستیاں چاند ستاروں کی بسا دیتے ہیں

ہم ہیں ہر حال میں فرحت کے پجاری لوگو
جو بھی مل جائے وہ رستے میں گنوا دیتے ہیں

سادہ دل کی [illegible] تو سدا چپ رہتو
ہونے لگے سو وہ الزام کو زرہ دیتے ہیں

OOO

شہباز انور خان

O

پیار کی قیمت چکانی پڑ گئی
ہم کو دنیا بھی گنوانی پڑ گئی

آپ ہی سے پیار تھا مجھ کو بہت
آپ ہی سے جاں چھڑانی پڑ گئی

وہ کہا اپنی سناتا تھا مجھے
اور مجھے میری کہانی پڑ گئی

جس کو خوں دے کر اسارا تھا کبھی
آج وہ دیوار ڈھانی پڑ گئی

مجھ کو تو معلوم تھا انجام بھی
پھر بھی قسمت آزمانی پڑ گئی

خود کو صادق کہلوانے کے لیے
مجھ کو جھوٹی قسم کھانی پڑ گئی

اپنی بستی چھوڑنے کے واسطے
اک الگ بستی بسانی پڑ گئی

خواہشوں کو زیر کرنے کے لیے
مجھ کو طاقت آزمانی پڑ گئی

OOO

سرفراز تبسم (انگلستان)

O

اس دشت میں گھر بنانے والے
تو کون ہے دل میں آنے والے

حسن اور خیال و خواب میرے
تو اور ترے زمانے والے

ہم جائیں گے قلم کئی دن
یہ ہاتھ قلم بنانے والے

ہوتے ہیں مسافروں میں کچھ لوگ
اک دوسرے کا بوجھ اٹھانے والے

تاریکی بڑھاتے جا رہے ہیں
سورج کے دیے جلانے والے

آباد ہیں جگہ گلی محلے
کچھ لوگ ہیں بیٹھے گانے والے

دروازہ تو بند کیجئے گا
ہم لوگ ہیں آنے جانے والے

OOO

غلام شبیر اسد

O

حقیقت سے روانہ ہو رہے تھے
ابھی ہم فسانہ ہو رہے تھے

وہ جس کو آج بھی تھا کل کے ایسا
وہی صاحب زمانہ ہو رہے تھے

دریچے میں ہوا کے پاؤں لرزے
کہ طوفاں ناگہانہ ہو رہے تھے

ورائے وقت کیسے کیسے ورثا
بھلا کیوں معجزانہ ہو رہے تھے

ترے دیوار کو چھوتے جو گھر سے
وہ آنکھوں کا گھرانہ ہو رہے تھے

یہ دل جاگیر جس کی تھی وہی تو
صداقت سے بہانہ ہو رہے تھے

OOO

شمیلہ سعید

O

کاش گلشن میں یاس ہی نہ رہے
کوئی بلبل اداس ہی نہ رہے

دیکھ کے جس کو دل دھڑک اٹھے
وہ محبت شناس ہی نہ رہے

اس قدر طویل زندگی کر لے
لب جلیں خشک اور پیاس ہی نہ رہے

جا چلا جا تو اتنی دور کہ پھر
تیرے آنے کی آس ہی نہ رہے

ہم کتابوں میں یوں رہیں ایسے
سوکھے پھولوں میں باس ہی نہ رہے

تجھ کو رہنا ہی اب تو ملنا ہے
خاص لمحات خاص ہی نہ رہے

کوئی پھول اتنے دیکھے ہیں
مجھ کو موسم کبھی راس ہی نہ رہے

OOO

احمد سبحانی آکاش

O

غیر ممکن ہی سہی بات اگر ہو جائے
عکس در عکس ملاقات اگر ہو جائے

دیکھتا ایک نظر بھر کے کبھی جائے تو
باعث کشف و کرامات اگر ہو جائے

جذب ہو جائے ترے حسن کی خوشبو میں کہیں
اشک بھی آپ عبادات اگر ہو جائے

آئینہ حد دیکھتا رہ جائے طلب کی لو کو
تیغ طرار سے بھی ہاتھ اگر ہو جائے

شام کے سائے ابھی ڈھل جائیں کہیں رستے میں
صبح کے بھولے تجھے رات اگر ہو جائے

سوچتا کون ہے آفاق کا تحیّرزدہ سے
جیت پر آ کے ہوئے مات اگر ہو جائے

رقص کرتے ہوئے اک روز اچانک آکاش
منجمد ارض و سماوات اگر ہو جائے

OOO

دلشاد احمد

O

میانِ لالہ زاراں زخم تو جدا سا ہے
کلام شعلہ بیاں میں بھی تو جدا سا ہے

ہر ایک بات تری انجمن سے الجھے میں
ہر ایک نکتہ لب گفتگو جدا سا ہے

جدا جدا سا میں ہر کارواں سے رہتا ہوں
یہ اس لیے ہے کہ میرا لہو جدا سا ہے

خدائے پاک یہ کس ذوالجلال کا در ہے
جہاں کا اب کے یہ ہاؤ ہو جدا سا ہے

ہر ایک شعر ہے گوشہ و شام سا میرا
کلام تو ہے ترا ہاں بیاں تو جدا سا ہے

تمام عشق ہم آنکھوں سے پڑھتے رہتے ہیں
قیام اس کا الگ ہے یہ جستجو جدا سا ہے

بجا بجا سا جو جاتا ہے جانب مقتل
یہ سارے شہر میں اک خوبرو جدا سا ہے

اداس دل یہ کئی دوستوں کے تحفے ہیں
اسی لیے تو ہر اک رفو جدا سا ہے

OOO

طاہر منظور

O

ابھی نہ کبھی دل کی طرف نظرِ عنایات
ہیجانِ جسم رہی عرضِ ملاقات

چاہت شب و روز یہاں اہلِ وفا پہ
اس عہدِ بیداد کے دیکھے ہیں کمالات

بیدار کیے سارے تری کج روی نے
چپ چاپ رہے پیار کے لیے جتنے مناجات

لکھی کے رسومات و روایات پرانے
اذہان کے زمانے میں نئی اچھی روایات

اب میری تبسم سے لگے دل کے پارے
کرتے ہیں ہر شام سوالات و جوابات

ترتیب نئی دے کر چہرے کی لکیروں کو
لکھی ہے کوئی پڑھ لے مرے گردشِ حالات

بے مثل احساسات و خیالات کے باعث
گھر گھر میں پڑھی جاتی ہیں طاہر کی غزلیات

OOO

کلیم احسان بٹ

O

غبار پائے عدم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے
اثاثۂ درد و الم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے

کوئی تو بچ کے اٹھا ہے یہاں پہ پہلے بھی
کوئی تو پیچ کہ خم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے

ترے کرم کے بھروسے یہاں پہ بھرتے ہیں
شکستہ عہد و قسم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے

کتاب شعر و ادب ہے خیال کی دنیا
کمال کلکِ قلم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے

ترے بغیر کسی کام کا نہیں کچھ بھی
تمہارے سر کی قسم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے

خرابۂ یاد و تماشۂ خیال رونق ہو
تو رشکِ باغِ ارم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے

ادا ہے جو بیابان و دشت و صحرا سے
سفر تو چار قدم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے

OOO

ڈاکٹر شیخ اقبال

O

بڑی مشکل سے دنیا سے نبھایا اور کیا کرتے
کھرا کھوٹا جو اک سکہ چلایا اور کیا کرتے

غمِ ایام کے تیروں سے چھلنی جان تھی لیکن
ہر اک زخمِ جگر کو گنگنایا اور کیا کرتے

وہ اک دو لفظ جو میں نے کتابِ زیست سے سیکھے
انہی کو الٹا سیدھا لکھ دکھایا اور کیا کرتے

شکستہ بام و در، دیواریں ساری گرنے والی تھیں
اسی کو عمر بھر مسکن بنایا اور کیا کرتے

جو اک در پہ کھڑا تھا کوئی درباں دل وہ حیراں تھا
میں اٹھ کر اپنے گھر ہی لوٹ آیا اور کیا کرتے

تمہاری بات کوئی بات ہوتی بات بن جاتی
سنا میں نے جو تم نے کہہ سنایا اور کیا کرتے

OOO

راحیل عباس

O

عجب ہے یہ بہار ناگہانی
خزاں آثار غم کی رُت سہانی

بڑی یادوں اور بادلوں نے
نہیں دیکھی یہ اشکوں کی روانی

نہیں تھا ذکر اس کا داستاں میں
اسی سے بن گئی تھی اک کہانی

ترے رخسار پہ چمکے ستارے
جو گرتا تھا مری آنکھوں کا پانی

پھولوں کی قباؤں سے مہک رہی ہے
چمکتے جگنوؤں کی شادمانی

جدائی کا سبب راحیل وہ ہے
جوانی کھا گئی جس کی جوانی

OOO

شفقت حسین شفق

O

وہ اپنے ساتھ آنکھوں کی دعا لے گیا ہے
مقدر محبت صدا لے گیا ہے

شکاری اڑانوں کا اندازہ لگا کر
یوں تکریمِ طائر اڑا لے گیا ہے

یہ آنکھوں میں شامل سہانا سا منظر
گئی راتوں کو پیا لے گیا ہے

ترے سامنے میں دیا گھر کے جلا کر
کوئی میرے جیسے وفا لے گیا ہے

پہاڑوں کے دامن سے لپٹی اک ندی
کوئی مجھ سے دامن چھڑا لے گیا ہے

یہ کس سے مروت کی یہ آرزو ہے
کوئی میرا لہجہ چرا لے گیا ہے

OOO

سرائیکی توشہ

ناول ''تانگھ''

……7……

بشریٰ رحمٰن

''کون ہے بھئی!'' علی اپنے آپ ٹوں آکھیا۔ بھا گھراں وچ ریہاں۔ تے کوئی تیز مینہ وچ اور آون لگا۔ بجلی چمکی تاں اوں ڈٹھا۔ سکھو پانی وچ بھجیاں وی اوہدے سر دے وال تِج چکے ہن۔ ''سکھو توں ایں……'' ''جیا سائیں'' ''ایں ویلھے کیا کر یندی پئی ایں؟'' ''میں بکریاں تے ہوش نہ آئی ہم'' اتلے مینہ وچ تہاڈے آگھر باہر کھڑے رہیندن؟'' ''جیا سائیں!'' ''اساڈے کنوں آکھی جگہ کائی کئی وانہاں کوں اندر چا سکوں۔ تے ویلے کڈاں ایں کڈاں ایں واپس مینہ وسدے۔ مینہ نال اساڈے کیتے ہک نعمت اے انہیں کوں اساں ایں نعمت کنوں کیوں وانجھیا رکھوں۔'' ''سکھو اندر آ گئی ہئی۔ سر علی دے نیڑے آ گئی ہئی۔'' ''میں تاں ایویں ڈھمن آئی ہم علی سئیں۔ تھاہیں ایں بجلی توں تساں ڈردے تاں نہ پئے۔'' ''بھئی ویلے ڈر وی لگدا ہا۔ تے بجلی دی لات سارے جھوکیں کوں کہاں کر ایں ہک ہک کر سو جھل کر گئی۔''

ایں سوچھلے وچ اکھیں چاڑ ہیا تے علی سکھو ودیکھا۔ سکھو اوہدے سامنے کھڑی ہئی۔ اوہدی بھگی چولی اوہدے پنڈے نال جھمی ہوئی ہئی۔ سکھو اکھیں نال ہتھوا اوپیا۔ چاندی دے گانے پئے ہوئے ہن۔ والیں وچوں بھینگاں دے دھاریں ڈھاندے پئے ہن۔ گورا مکھڑا بھجیا ہویا پیا ہا تے …… نینے دے سارے پھیراں نکھر تھیاں ہوئیاں ہن۔ علی ہک سراں کپ گیا۔ اجنبی چیتی اوکوں اے احساس تھیا ہووے بجلی جیہی کوئی چیز ہتھاں وچ اے چنڈ تے کھڑی اے۔ اوں آسمانی بجلی توں وی کتھا ہیں ڈھیر خطرے آئی اے۔ ساڈے تے سوا کر دیون آئی اے۔ آسمانی بجلی صرف جھوکیں کوں کیا ڈیندی ہئی۔ تے ایہہ بجلی اوہدا تن من کھوہندی پئی ہئی۔ اوکوں ڈسیندی پئی ہئی۔ تے اوکوں پتہ ہا جو ا گھر وچ کوئی بندہ کائی۔ او انہاں دا محرمان اے۔ اوہدا پیو انہاں کوں علی دے سونپا کر گیا اے۔ پر دل کہیں گالھوں تی سمجھیندا۔ کہیں ڈراوے کنوں کھمیں ڈردا۔ دل پاگل اے۔ جاگھی اے…… اعتبار نہ کرنیں آ آکھیا اے۔ علی ڈر گیا۔ اپنے آپ توں ڈر گیا۔ آ پاہد نال بولیا۔

سکھو توں آپنی جھوک وچ گئی وینج۔ وینج…… وینج…… جلدی وینج…… جلدی نال گئی وینج۔ اتھاں نہ کھڑی ہو!'' سکھو نے ہک سادہ کھلاں اُتار وہ ماریا۔ ''سکھو! اساں ریہڑے دے لوک جدلاں دی بجلی توں نئے ڈردے…… ایہہ تاں اساڈے آکھی پا بن آ لے ہن۔ ''سکھو! میں جو آکھیا ایں جوتوں گئی وینج'' علی اوکوں ایویں ہولیش ولی جو سکھو کوں آپنی ہتک محسوس تھئی۔ وت بجلی لسکی تاں اوں سکھو دے اکھیں وچ ہر یا گئی تے ناراضگی ڈٹھی کھڑی ہئی پر بھاوی نہ موڑ کر ایں کھڑا تھی گیا۔ ''سکھو ہوئے ہوئے لڑدی ہوئی باہر نکل گئی۔ اوہدے گھنگھروں دی آواز ہوئے ہوئے مینہ دی کن مِن نال رل گئی۔ ہو کڈاں علی وحوم کر آپنے بستر تے ڈھیہ پیا۔ مار سیلا دے پن تے

اوں لکھے تقریباً تے لیے کنڈ صید سے بیٹھے ڈٹھے ہن۔ سمندر دے مچھیاں دے اندر وی تے باہر وی۔

پر او ڈٹھا پیا سی۔ پب اوں اج پہلی واری ڈٹھا۔ اللہ سئیں کیڈا وڈا کھرت کار اے ــــ اوں سوچیا ــــ کیجے کیجے بندے تے کتھاں کتھاں بوکھوہ ویندے ــــ تے تخلی ویلے نال بولے بندے تے تیز ہجے سب بے پروہ وی ہووی دے نیاز وی ہووے جلوے کھنڈاون آلا وی ہووے۔ تاں دل کوں کتھاں کھچے سکیندے۔ علی مرتضیٰ آپنے جذبیاں دے پل صراط تے کھڑا ایک پاسے دوزخ تے بئے پاسے جنت۔ جیھی پلیز آ ونج۔ آ اوں اکھیں لوٹ تے کوکدیں ہوئیں آ کھیا۔ سکوں ایں گل توں بچا گھن۔ تلوار دی کار تیز دھار رستہ اے جیں تے میں کھڑا ہاں!! علی مرتضیٰ کوں باقی چاردا۔ ایہ رہ گئے ہن۔ اج اوکھوں وقت دے اندر رو پئیاں ہا۔ کیوں جو پاکستان دے ہتھ نال تھیے ہوئے کم تے ہنرمندی دے نمونے ڈیکھن چاندا ہا۔ سکھو اوکوں 1 سال پا جو اتھاں باقاعدہ ہتھ نال کم تھیندے ــــ سکول یا کارخانے کا کی۔ غریب تے رلڑ زنانیاں آپنے گھریں وچ ای کم کریندن ایں طراحویں غریب بندیاں نمیں آپنے گھراں وچ کھڈیاں لایاں ہویاں ہن۔ تے اتھوں دی کھل دے والاں توں دھاگا بنا کراہیں اوندے وچ ریشم ملا کراہیں ہک خاص کپڑا بنیندن۔ جیڑا اتھوں دے زنانیں دے جوائیں کوں بھاندے تے او پیندن۔ زنانیں گلی دے بجوڑیں تے ٹریاں ٹوکریاں تے تھیلیاں بنیندن۔ پر علی آ کھیا جو او انہاں دی حیاتی ایہ رنگ دی ڈیکھسی ایں کیتے او جیں سوٹے لوں دے بد دے تیز دے گھر ول ٹر پے۔ علی خشدا ہی تو پابند ہا تے سکھو اپنے گھر او دے اندر تے ایہ انتظام علی نے کیتا ہا۔ اوکوں سکھو دے اتا تیز دے بہہ کراہیں ہک ڈر لگدا ہا۔ جیویں بجلے یالاں وچوں ہک آ سائی ہک آ ندی اے تے اکھیں کوں بے قابو تھی تے چین کوں ول کریندے۔ ایں طراحویں ہک ہک سکھو دے بیٹھے وچوں واو اتھدی راہندی جی۔ تے علی ''ہجرم'' دا مطلب ہتھی طراحویں جاندا ہا۔ اکوں اکوں سکھو دا اتھ۔ تے ہکھوں ہکھوں علی دی ڈاہپی تھولی ویونج تے علی نے سکھو کوں وار دتی۔

او آپناں اُتھ اوندے برابر گھن آئی۔ سکھو: ہک کاہ بجھ وچ تھیں آئی۔ علی آ کھیا میں رکنے دے وچ جیڑھے پاسے وی ویندا ہاں۔ سکوں ریت تے انسانی ہڈیاں دے کئی ٹوٹے ڈسدن۔ کتھائیں سر دی پئی ہوندی ہے۔ کتھائیں پاویں لساں ہڈیاں۔ کتھائیں سعل دی ہڈی ایہ کیا قصہ ہے۔ کیا ایہ او لوک ہن جیہاں جنگلی جانور جیڑ پھاڑ کھاندن؟'' ''جیا سیں!'' سکھو نے کجھ سوچیندے ہوئیں آ کھیا۔ ''جانگلی ز دہ ور وی کھا سگدیں۔ پر انہاں وچوں اجہے او بے پیسے لوک ہن۔ جیڑھے تریپ پاروں سا مرد وڈیندن!'' ''واقعی'' علی حیرانگی نال پچھیا۔ ''جیا سیں! اتھے واسطے رکنے وچ رلدا ایہا ای تھیندے راہندن۔ کوئی بد بجھ رستہ ور ویندے یا تریپ کوں بے آرام تھیندے۔ تے تیز جلے او دی جند جیہاں تے آندی اے تاں؟ ــــ او آپنے کپڑے لاہ کراہیں ہک ایجی جھیں پولی تے لڑکا ڈیندے۔ تے آپ ریت تے لیٹ ویندے۔'' کیوں؟'' علی ایں نال پچھیا۔ ایں کیتے جو کوئی ٹولی آ سوں پاسوں ویندی پئی ہووے یا کوئی بندہ اتھ تے ویندا پیا ہووے۔ تاں اوندے کپڑے ڈیکھ تے اوئے لگوے۔ ایہ کپڑے اوں کایہ دی نشانی ہوندن جو کوئی بندہ تریپ کوں ہندا پیا ہے۔'' تاں کیا ایں طراحویں لوک اتھاں بچ ویندن؟''

علی مرکوں گھن کراہیں بچ ان تا ئیں گپ گیا۔ ''زیادہ تر مدد کرن آلے اتھاں بچ ویندن۔ پر کئی بے پیسے انہاں دے تیک توں پہلے ان مر ویندن!'' ''اوہ میڈا اللہ! ایڈا وڈا ظلم ہے۔'' علی دے اکھیں وچ ہنجوں آ گئے۔ ''اتھاں واقعہ تاں کڈاہیں کڈاہیں تھیندا ہوی۔''

اوس کہیا ''ساڈے وچ اکثر ایتھے واقفے تھیندے رہندے نیں۔ تے ایہہ بڈیاں ہوئیاں ہیاں دکاں وچ پچھلاں دی کارکٹھ لے پئے ہن۔ انہاں بے بیٹھے لوکاں دے ہن۔ تھوڑی دیر پہلوں انہاں بڈیاں توں علی کوں ڈرلگدا پیا ہا۔ ہک رک اوگوں انہاں بڈیاں نال عقیدت تھی۔ تریہ دے شہیداں دے حالات دے کتھیں حقی آئے ہن۔ ایہہ پیارے لوگ جیہڑے ولی رضا اعدی نال موت دے اکوں جتھیا رسنے ڈیندن فقط ہک پیچنگ پانی کیتے۔ پانی۔ ھلا دھلا!! پانی۔ جنگوں اساں ستا معمولی جاندے ہیں۔ اساں کوکا کولا اسوا تے تہجاں کیا کیا پیندے ہیں۔ تے ایہہ تحقیق لوک صبر دے گھٹ پیندن!! علی چپ تھی گیا۔ گم صم تھی گیا۔ جہاں کتھاں گم تھی گیا۔ وت سکھو نے اوندا اتھ ہویا ہتھ ڈھاتاں بولی۔ ''علی ستیں اتھوں تے لوک رستہ بھل ویندن۔ اوہ دی آپنے کپڑے لہا کراہیں ہک دن تے ترکا ڈیندن۔ ایہہ میں پہلوں ڈسیندی پئی ہاں۔ ہن جداں تساں آوو۔ اللہ نہ کرے جو رستہ بھل ونجو تاں ـــ علی سوکراہیں تھیم اتھی اوندہ ڈٹھا کے وت زور ہیں ریتی ستیا۔ ''ہن جداں میں آساں رستہ کا نہاں بھلساں۔'' ''میڈے بھولے میں ایہہ داری اتھاں رستہ بھل ویندن۔ جنہاں دا کھوج صرف رتیڑے دے لوک ائی لا سکدن۔'' ''اچھا! وت تاں میڈے دل وچوں وادور ہے!'' ''ہے کر رات پئے وتے وت ـــ'' سکھو نے ایناں الفاکوں کر تے آکھیا۔ ''تاں قلب ستارے توں رستے دا اندازہ کرید ے۔ اتھاں عام طور تے لوک متی تھوڑے دی رستے دا اندازہ ولیدن۔''

''اچھا۔ کیا وکھرے پاسیاں دی بو وکھری ہوندی اے۔'' ''میڈا اتیال ہے تہاڈے علاقے دی متی سب توں وکھری خوشبو آلی ہوی۔'' اوس شرارت نال آکھیا۔ تے سکھو دو وکھاں سکھو شرم کر گئی۔'' وت بولی۔ ''اتھوں وچ تے کدائیں وی نہ کریسو۔'' تکلاں تاں میں بہوں یاد کریساں سکھو'' ''او کیویں!؟'' ''اکھیاں ساریاں تاں ہوڈیاں مورتاں گھندی ویندی ہاں!'' ''میں ـــ مورتاں یاروں یاد رکھسو سکھو سنجھی تھی گئی!'' ''تاں توں میڈی واری کتی اے۔ اکھیاں ساریاں گالھیں ڈساہن۔ میڈے گیت میڈے کولہوں ہن۔ (اللہ کریندا جو تیھدا جو ایہہ گیت میں کیندے کیتے گاں۔ سکھو دل وچ سوچیا!) اوتوں کتیں خیال نے تجھیر اکر ڈتا۔ تے اوہ چپ تھی گئی علی محسوس کیتا پر اوں وی چپ رہن مناسب سمجھیا۔ اتے وردوسوں دے نشان ڈسن لگے۔ پیرے توں تہاڈے دے رہن آئیاں دے گنبد وی کارچھے تے جھوکاں ڈسن شروع تھی گیاں۔ پیرے توں ایہہ گھر بہوں سوہنے لگدے ہن۔ علی نے کیمرے دا سکیل ٹھیک کیتا تے اتھ تے بیٹھے بیٹھے ہک مورت گھن گھدی۔ وت سکھو نے ہک پاسے اتھ روک ڈتے۔ ڈوجھیں زنا وریں توں لہہ کے انہاں کوں تہہ تن کیتے چھوڑ ڈتے۔ تے آپ پیریں رتی دو اسپے۔ رستے وچ جتھیں کوئی اکا دکا پاندھی ملدا اوں انہیں کوں سلام ضرور ولیندا۔ علی ڈٹھا سب بچے دراتی ہوندے پئے۔'' ''کیا کاہم ہے، ایہہ لوک تھکی کیوں نہیں پیندے؟'' ''انہاں وچوں اکثر کوں تھکی نہیں ہوندی۔'' سکھو تے گل کراہیں آکھیا۔ پر ساڈے وچ تاں ایہہ رسمت بہوں جیب ویندی ہوی!'' علی نے پچھیا۔ اتھوں سکھو اوگوں ہک پئے گھر دے وچ گھن گئی۔ ''ایہہ چاچی کرموں دا گھر ہے۔ ایندا پتے اتحا تھی گئے پہلے اوہ گھی دے جوڑیاں نال گھیں تیندا ہا۔ ہن ایندی ڈال لیندی اے۔'' علی ڈٹھا۔ بہوں سوجیاں جھیاں تے تمہایاں ہن۔ تے ہلکے ہلکے تھیے تاں بہوں ای سوہنے ہن۔ جداں تے موتی لا کراہیں اوں گھیاں کوں بہوں ٹچی نال سجایا ہویا۔ اتھوں دی علی بہوں ساریاں گھیں مل گھدیاں تے وت اوہ اوگوں کائے رضوو دے گھر گھن گئی۔ اوں کنڈ ملایاں ہوئیاں ہن۔ ٹکیاں تے گھیں بنیدا ہا۔ اتھوں کجھ سوہنے ٹکیاں تے گھیں علی نے مل گھدے ساہورؤں تل تے سکھو آکھیا۔ ''علی تیں ڈیکے تساں انہاں دی غریبی تے ترس کھا کراہیں اے ہی طراحویں دیاں گھیں گھدے رہیے تاں تہاکوں آپنی حیاتی دی پکی کمدی سوڑی سکا وتی پوسی۔'' ''اللہ کرے میں اویں کر سگاں سکھو۔ تاں

ایہہ کتلا نیکی دا کم ہوسی!'' ''میڈا خیال ہے جو میں تیاکوں سمجھ گھران وچ نہ گھن ونجاں۔ تساں ہر ہفتہ وار دل رکھن کیتے کجھ نہ کجھ ضرور گھن گھنسو!'' علی کھلن لگا۔ ''سکھو! میکوں ایہہ ڈسا جو توں اتنی چالاک کیویں تھی گئی ایں!'' سکھو زور زور دی کھلن لگی۔ ''ڈیکھو نی میکوں ایویں آہدی اے۔ اوں آہدی اے جو توں بہوں چالاک ایں۔'' ''علی میں اچالاک لوک گندے ہن!'' ''کوئیاں! اصل وچ عقلمنداں کوں لوک چالاک آہدن۔'' ''میں وی عقلمند ہوساں۔ اُنہاں زیدہ میکوں روز آہدی اے توں کملی ایں۔'' ''کیوں۔ بھئی!'' ''اصل سچ...... اوہو...!!'' ''بھئی ڈس وی ہن تاں!'' ''اوہو جیہا جے ڈہبہ تساں میکوں سستی آکھیا ہا تاں اوں ڈہبہ توں او میکوں لاگو ڈاندی تو کیندی راہندی اے۔ تے آہدی اے سستی تاں کملی ہئی۔ کتھا میں توں وی کملی نہ تھی ونجیں۔'' ''بھئی! میکوں ہن بھجکدی پئی اے'' علی نے اپنا ہنسی کا اظہار کیتا!'' ''آج توں کھاواں وی نال توں وی گھن آئی۔ کیا کھاسو؟'' ''اتھاں میڈی ہک سکتاں راہندی ہے زرینہ۔ میں انہاں کوں آکھا ہا۔ آج ڈھیر سی دی روٹی آج اساں۔ اوہ نے گھر کھاسوں۔ اوہ شہر دے وچ وسے بہوں چنگیاں روٹیاں لہندی اے۔ نال کھیر تے لسی وی ہوسی۔ اوندے کوں چلوں!'' ''ضرور چلو!'' ڈوہیں ہن گھٹے ہیر چاتے!! ''ریت دے لسکدے ذرے ہے تو تھیں اکھ ویندی گھندے ہوئے ہن۔ اتے کھلا تے صاف آسمان چندر دا گول گول تھال ایں طرح ہا۔ چیویں او ویں دی رات کوں آپنی بھرپور تے ٹھنڈے دے آتے رکھوا ہووے۔ علی دے جیڑیں دے تلوں کولی ریت کھسکدی ویندی ہئی اوندے نال سکھو وی آہدی ہئی۔

علی کجھ سوچیندا پیا ہا۔ سکھو کجھ پیا سوچیندی پئی ہئی۔ علی چپتے کوں سلاح ملدا پیا ہا۔ سکھو عشق دی سکتا نیندی پئی ہئی۔ تے علی کوں کاوڑ آون لگی۔ پچھل اوہ ہیر دی سکھو دی گالھ کیوں من گھدے؟ اج اوہ بہوں تھکیا ہویا ہا۔ لکا استقبال کوں نال لاتے آپنا سامان چا چھوڑ ریہا ہا۔ اج اتھاں اتھاں وا چھوڑی ڈیہدہا۔ چھکیوی رات ہئی۔ اوندا ایہ دورہ بہوں کامیاب تے خوش کن ہا...... اوہ آپنے دوھاے کم جلتی توں جلتی وچ تے پچھے اخبار کوں سوتھا کرن چاہندا ہا۔ ریڈیو تے ٹی وی تے نشر کرن چاہندا ہا۔ تاں کیا کیا سوچیندا پیا ہا جو سکھو اوندے ہو ہے تے ظاہر تھی سکھو اج بہوں موجھی تے زری ودی لگدی پئی ہئی!'' ''کیا گالھ ہے سکھو؟ کیوں جو کچھے وچ ڈرائیو دی ہا۔ ایں کچھے اوہ سکھو نال باہر نکل آیا۔ ''میں اتھاں نکل کے ویہداں؟'' ''ہا!'' ''ہت آ ڈ اج رات ریت تے وی سیر کروں؟'' ''آج رات! ہمیں ایں ویلے!!'' علی چیک کرائیں آکھیا۔ ''ہا آج رات ڈیکھو کیا سوہناں چندر آسمان تے چمکدا پے۔ اج چندر دی چودھویں اے۔ اج سارا ریتھا تھلے وی کارڈ سدا پیا ہئی۔

''میں تیاکوں ہر جا دی سیل کھولی ہے۔ اج دل منگدے تیاکوں ریت تے دی چانی رات ڈکھاواں۔'' ''پر میڈا ایں حالی کم!'' ''چھوڑو کم کوں!'' اوں موڈھا تھی تے آکھیا۔ ساری حیاتی کم ای کرنے ہن!! اج میڈی خاطر آ ونجو۔ تھکو وی وا ری سی!'' ''چنگیاں۔'' علی زکھدیں ہوئیں آکھیا۔ ''میں جیپ دی کنجی گھن آواں!'' ''کوئیاں جیپ وچ تے جلد ۔۔۔ پیریں ویسوں تے پیریں پیروں ٹرسوں!'' ''چنگیاں!'' علی اندر گیا اوں چا گھن پایا تے چپلی باہر تے لیا آئی۔ اختیاط دے طور تے ویزی ہتھ وچ سپ گھدی۔ ''بھئی ایندی کیا لوڑ ہاے سکھو پچھیا۔ ''لوڑ تے پے سگدی اے۔ اوں نال ڈریں ہوئیں آکھیا۔ ''تہاڈا خیال اے علی کئیں جوایہہ چندر دی شاہ ہر وی جگل آلی کاڑ کیا پتہ اچانک جو دم دیلے۔'' ''تھی سگدے!'' ''پیا ہے اتھاں ریت تے اچندا اے ذری ڈیکھو ایندو۔۔۔ ایہے ڈے نیڑے کوئی جملی

کاٹی...... ایہہ کیہ اوہ نے تھیں لکھدا۔ رات نوں جنگل تھیندے دیندا۔ ''علی غور کیتا۔ اوکھوں ریتڑے دی چاٹی واقعی وکھری جاپی۔ اوہو جھیل، اوہو اوا چیندا اوں کنڈا ایں ہنڈ تھابا۔ جاماں جو ہیں دی گزرگوں سو جھیل کر جیندا ہیا...... ایویں لگدا یا جو اسمان تے چن تے کنے تھنڈے دالب بلدا ہے۔ اوکھوں سکھو دامن تے گانے صاف صاف دسدے پئے ہن۔ ریت دے پیئے ہوئے نشان صاف دسدے پئے ہن۔ چاٹی وچ ٹھاڈاں بی۔ ریت وچ ٹھنڈ جاتی۔ ننگے پیراں تے کول کول ریت پال دے انگھیں دی کار گدڑیاں کدھیدی ہی۔ ننگے سراں وچ اوکھوں وس آندی پئی ہی۔ اوہ سوچن لگا۔ انھماں ای چاٹیاں راتاں ہوسن۔ جنہاں دے شاعر شعر آہدن: ''سوہنیاں اوہ آلے سوکنا ہیدن ایچندیا کھیپ ـــ تے ـــ تیج ـــ تے ـــ چندروی شکل آئی۔ علی دا دل ہک دردے احساس نال دھڑکن لگا۔ ''جھل سکھو دل جلوں۔'' اوں کھا ہیچ تے آ کھیا۔ کتھا ہیں اے ہنڈ تھیوے جویے اکل وچیں تے وت وت گل جھل وچوں!'' ''میں تہاڈے نال ہاں۔ تے منی تھکے تے ایں شکدی جو اساں کتھاں ہیں!'' ''جیل وہیہ وچوں، میں تھک گیاں، اوہ دو ہیں بہہ گئے۔ ریت تے پاہندے ای علی کوں ایویں لگیا۔ جیویں ہیں تی ہی اوہدا جوڑ جوڑ دکھدا پیا ہوئے۔'' اوہ آپی ہاتھ دا دو ہاہاں سنادے کجھیں تے لیٹن لگا۔'' ''ہا میں ایہہ کیا کرپیندے پیئے او علی میں'' ''بھی، لسادریاں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت تے لیٹن دا مزا آندے پیئے۔'' ''اتھاں تاں رہاہاں دی کا ہیگی۔'' ''ناں۔ میں ایویں ای تھیک آں۔ اتھاں دی تاں لوک ریت تے ای سمدن!'' ''تہاکوں پتہ اے علی میں، اتھاں ہک خطرے آل وی دانا تک ہوندے!'' ''ناں، کیا تیں توں دی خطرے آن کوئی پئی تھے اے'' علی سوچیا۔'' ہا۔ ان کیا کر یندے اوہ دانگ، سوتی کجھو برین تے عاشق تھی ویندے!'' ''سکھو کھلکھڑا آں ویکار کھل پئی۔'' ''پتہ اے تے بندے دا ساہ ولی ویندے!'' ''ہا میں! علی ہک سرداں آہی بیٹھا۔'' ''کیا آکھی!'' ''تیں آ ہدی پئی آں۔ اتھاں ریتڑے وچ تھکے ترلے لوک جھتیاں وچ سم پیدن۔ ہک وانگ آ ندے تے انہاں دے منہ تے منہ رکھ تے انہاں دا ساہ پی ویندے اتے سویل کوں اوں بندے دی لاش ملدی اے!'' ''اوہو، وت ایہہ لوک کیا کر یندن!'' ''عام طور تے رات کوں ہمے ویلے وس کھا گھندن!!'' ''وسل۔ وسل کیا ہوندے؟'' ''بھئی وسل۔ پیاز ہوندے پیاز!'' ''اچھا۔ علی بولیا۔ تاں ایندا مطلب اے جو ناگ کوں وسل دی بو نال چنگی تھیسی لگدی!'' ''لطیفہ ایویں ای اے!'' ''جئی نال میکوں ڈرا لاتے۔ بن میں نہ دساں۔ علی واقعی اٹھی کراہیں بہہ گیا۔'' ''چنگاں ایہہ تاں ڈس۔ ناگ تریمتیں دا ساہ پیندے یا صرف مرداں دا۔'' ''اوہدے کیتے تریمتیں، مرد سب برابر ہن۔'' ''وت اوہ تہاڈے تیڑے دی نال آسکدے۔ توں تاں ذری وی او جیں ڈردی۔'' ''تہاڈے ہوندے ہوئیں میکوں کیہیں ڈے داڈر کا ہیگی۔ بس ایہو احساس اے جو تساں اتھاں ہو۔ ایں ریتڑے وچ صرف تساں ای تساں نظر آندے پیئے او۔'' ''فرض کرو۔ اگر میکوں ناگ ڈنگ گھنے تاں توں کیا کر یسیں؟'' ''سکھو تھولی دیر چپ رہی۔ وت بولی۔'' ''میں تساں صادق دوست ڈھیں۔'' ''صادق دوست۔ کتھاں راہندن اوہ اتے کون ہن؟'' ''اتھاں ریتڑے وچ ہک مشہور کہانی اے جیکوں تساں شیت جس آکھدے ہو۔ دریا دے کنڈے تے راہندے ہن تے اوہ کٹھے راہندن۔ انھیں کوں ہک پئے نال اصلا پیار ہوندے۔ جو ہنگر انہاں وچوں ہک شکاری دی گولی نال ٹیج ویندے۔ یا مرونجے تاں ڈوجھا اوہدی لاش کنوں ہوتے آپنی ہینڈ پٹی لمی تیج نال کھل کر گھندے تے ہاں دا ماس ٹپ ٹپ تے آتھائیں مر ویندے۔ علاقے دے دوست لوک انہاں کوں صادق دوست آہدن۔ ریتڑے وچ تہاکوں ہر جا ہو سرتاں وچ انہاں دے نشان ڈسن ....!!

(جاری ہے)

◆◆◆

سفر نامہ

سفرنامہ تھائی لینڈ

......2......

ڈاکٹر محمد رفیق خان

لوبی اسیں گھروں تقریباً ساڈھے اٹھ وجے رات لاہور سکول آف اکنامکس دی گڈی تے گھروں نکل پئے تے ایئر پورٹ ول رخ کرلیا۔ گڈی بشارت چلا رہیا سی تے اوہدے نال اوہدا اک یار وی سی جہناں نال میں گلاں چلیاں واں۔ رستے وچ گلاں باتاں شروع کرو جیں گلاں صرف ایس لئی میرے توں چوکھا سٹاف ایہدا نہ سمجھے کہ ڈاکٹر صاحب کوئی وڈی شے نیں تے ایہ اوہناں دے سامنے کجھ وی نہیں۔ گلیں گلیں میں بشارت دے یار نوں پچھیا کہ توں کیہ کردا ایں تے اوہنے دسیا کہ میں لاہور سکول آف اکنامکس وچ ای بطور ریلیف ٹیم کم کر رہیا واں تے میرا ناں ابرار اے۔ ای تقریباً پونے دس وجے رات لاہور ایئر پورٹ تے پہنچ گئے۔ میں بشارت نوں کہیا کہ توں تھوڑی دیر ایتھے کدھرے گڈی کھڑی کر لے تے اوہنیں ویر نہ جائیں جناں چر میں تیجی ٹیسٹ نال ایئر پورٹ دی مسافر لاؤنج وچ نہ پہنچ جاواں۔ بشارت نے اگوں ایہ گل کہہ کے معذرت کر لئی کہ سر ایتھے بڑی سختی اے تے ساہنوں کے نے قریب گڈی کھڑی کرن نہیں دینی۔ بہتر اے ای اے کہ تسی اندر چلے جاؤ۔ فیر وی تھوڑی دیر لئی بشارت ہوراں میرا انتظار کیتا تے اپنے یار نوں کہیا کہ توں سامان چک تے ڈاکٹر صاحب نوں اندر تک چھڈ آ۔

سب توں پہلاں سیکورٹی والیاں نے سامان دی تلاشی لئی جیہڑی کہ خاصی سخت سی۔ فیر وی اوہناں کولوں اک شے چیک نہ ہو سکی۔ ساہنوں بڑی عزت نال رخصت کر دتا گیا تے ای امیگریشن دے پاسپورٹ کنٹرول تے تعینات افسراں دے ساہمنے پیش ہو گئے۔ اوہناں کوئی ویزہ نکالی صرف ایناں پچھیا کہ کون او تے تسی تھائی لینڈ کیوں جا رہے او؟ بھلا اک پروفیسر تے اوہدی وڈے سامان ختم دے اواریاں گورنمنٹ کالج تے ایل ایس ای دا اوہناں وچاریاں نے کیہ وی کی سی۔ میرا الی تے اگے ٹور دتا۔ اوہدے بعد سختی سیکورٹی دا پھیرا سی۔ کمر گھڑی بیگ دے علاوہ تسیں ہینڈ بیگ تے ہتھ وچ پھڑیا ہویا خوبصورت سوٹ وی سکین کرواؤنا ہووے گا۔ لہذا سکین کرایا گیا۔ جدوں سکیننگ دے بعد باہر آیا تے آخر تے بیٹھے سیکورٹی افسر ہوراں فرمایا کہ تہاڈے ایس بیگ وچ اک شیشی اے جہدے وچ کوئی سپرے دے۔ کڈھ کے ویکھیا تے اک کولون دی شیشی اسیں پچھلے وی بدبوں ختم کرن لئی استعمال کردا واں سی۔ ہویا ایہ کہ ایہ گھروں نکلن لگیاں آیا تے ساڈی ملازمہ دے فرمان تے کہ جو دوبارہ وڈا بیگ کھول کے وچ کیہ رکھنا اے ایس نوں ہینڈ بیگ وچ ای پا لو۔ بس ای وی اوس ویلے اوہ ایہ مواد لیں ویکھیا تے وچ پا لیا۔ بہر حال جدوں میں ایس سپرے دی تفصیلی تاریخ افسر نوں دی اوہ اک شریف آدمی سی جلدی ای سمجھ گیا تے ساہنوں کہن لگا کہ کوئی گل نہیں لے جاؤ۔ کوئی اوہ جیا ہوندا تے آکھدا تسی ایہ نال نہیں

لے جا سکدا اے کیوں جے ایہہ پتہ اے جے وچ کوئی خطرناک کیمیکل اے یا کوئی ہور چیز۔ رکھن دے بعد اوہ وتھوں تے اودھی فیملی ساری چیک کرے۔ اندر جا کے پچھیا کہ تھائی ایئرلائن دا کاؤنٹر کتھے وے۔ جیہڑا اسی سمجھے بیٹھے ساں کہ تھائی لینڈ بہت تھوڑے لوک جاندے ہون گے تے رش والا مکان نہیں ہو سکدا۔ اوس دن پتہ چلیا کہ معاملہ خالی تھائی لینڈ دا نہیں۔ بہت سارے دوجے ملکاں نوں جان والے تھائی ایئرویز دے ذریعے سفر کردے نیں تے اوہ اکثر بنکاک توں جہاز تبدیل کردے نیں تے زیادہ تر لوک چین جان والے سن۔ جنھوں وی پچھیا اوس ایہو ای کیہا کہ قطاراں تھائی جا رہیاں واں۔ کاؤنٹر دے ساہمنے دو لائناں لگیاں ہویاں سن تے دوواں کاؤنٹراں اتے پاکستانی کڑیاں ڈیوٹیاں اُتے کھلوتیاں مسافراں نوں چیک ان کر رہیاں سان۔ اک پتلی دبلی سی تے دوجی بھرے ہوئے جسم والی اُچے قد والی سی۔ ایہناں دوواں وچوں اک دا ناں سعدیہ سی۔ پہلاں تے ایہہ گل نہیں سی پتہ چلدی کہ کہیڑی لائن وچ لگیے۔ پہلے اک لائن وچ لگے تے پتہ چلیا کہ اوہ صرف ایئر کرافٹ کم کر رہی۔ اشارہ ہویا کہ دوجی لائن وچ آ جاؤ۔ اسی دوجی لائن وچ لگے تے پتہ چلیا کہ اوس لئی دے پرت دے وی کم ہندا اے۔ نال ای پی آئی اے دے کاؤنٹر سان۔ اشارہ ہویا کہ تسی نال دے پی آئی اے دے کاؤنٹر تے چلے جاؤ ایئر بلیو وچ اوہناں دا عملہ مدد کرے گا۔ فیر اسی پی آئی اے دے کاؤنٹر تے لائن وچ کھلوتی بھیڑ دے لگ گئے۔ بعد وچ پتہ چلیا کہ ساڈے میرے اگے تھوڑے اک صاحب کھلوتے سن جہیڑے جا رہے سن تے اوہناں دے صرف چوہتر پاسپورٹ سن۔ کیہ ویکھیا کہ نال دے پی آئی اے دے کاؤنٹر تے کوئی مسافر نہیں پر بندہ بیٹھا ہویا اے۔ اسی اودھر چلے گئے۔ اوہنے جدوں ٹکٹ چیک کیتے تے کہن لگا کہ پی اے میں نہیں کر سکدا کیوں جے تہاڈے نال دے اک ہور مسافر وی نیں۔ دوواں دا نام محمد خان اے۔ لہٰذا میرے لئی ایہہ ممکن نہیں کہ میں تہاڈا کیس کراں۔ نال ای اوہنیں دوواں وچوں اک کڑی نوں آواز دتی تے ساہنوں اودھر بھیج دتا۔ اسی اوس کول گئے تے نال ای جلال وچ آ گئے تے دھیاڑی نوں کجھ گھڑیاں سنا دتیاں۔ انھوں تک وی کیہ دتا کہ تہانوں ایہہ اندازہ وی خیال نہیں کہ اک سٹیزن تقریباً اک گھنٹہ دا لائن وچ لگیا ہویا اے۔ فیر اوہ کڑی چونکہ کسے چنگے خاندان دی سی اوہنیں مودبانہ معذرت کیتی تے ساہنوں کیہا کہ محترم تسی ساہمنے کرسی تے بیٹھو تے میں تہاڈی کلیرنس لے کے تہانوں اطلاع دیندی آں۔ غصے نال لال پیلے تے کھلوتے ہوئے اسی اک کرسی تے بیٹھ کے انتظار کرن لگ پئے۔ تقریباً ادھے گھنٹے بعد کڑی ہتھ وچ ساڈا پاسپورٹ تے ٹکٹ لے کے ساڈے کول آ گئی تے معذرتانہ انداز وچ بڑے پیار نال ایہہ کہن لگی کہ تہاڈا بیگ اک واری فیر سکین ہووے گا۔ لہٰذا اوہ لڑکا لے کے آیا اے تسی سکین کروا کے فیر جانا اے۔

فیر اوہ لڑکا سکین کروا کے چلا گیا تے سامان وی اندر چلا گیا۔ سعدیہ نے اک ہور وی اچھی گل کیتی۔ اوہ ایہہ کہ ساہنوں جدوں اوس پچھیا کہ تسی بنکاک توں بیجنگ شاٹ مائی جا رہے او تے تسی کتھے سامان وصول کرنا پسند کرو گے؟ مشورہ وی دے دتا کہ بہتر اے کہ تسی اپنی آخری منزل یعنی شاٹ مائی جا کے ای سامان وصول کرو۔ اسی من گئے جیہڑا کہ بہت اچھا فیصلہ ہویا۔ ایہدے بعد تقریباً پون گھنٹہ سی ہیدا سی۔ کول ای غسل خانہ سی اوتھے جا کے وضو کیتا تے باہر بیٹھے اک بندے کولوں قبلہ رخ پچھیا۔ کہن لگا کہ اندر مسیت اے تسی اندر چلے جاؤ تے نماز پڑھ لو۔ میں اوہنوں کیہا کہ میں نماز کرسی تے بیٹھ کے پڑھنی اے۔ اوہنیں اگوں دسیا کہ کرسی وی اندر موجود اے۔ وضو چونکہ پہلے ای کر چکے ساں اسی مسیت دے اندر داخل ہوئے تے ویکھیا کہ کرسی وی اوتھے موجود اے تے سجدہ کردیاں

متا تکین دی جگہ دی بنی ہوئی سی۔ لہٰذا اسی نماز عشاء ادا کیتی تے جا کے مخصوص گیٹ دے ساہمنے والیاں کرسیاں وچوں اک تے بیٹھ گئے تے باقی احمد چوہدری تحفۂ حجاز اک کتاب "دوریاں دے دل" کھول کے پڑھنا شروع کر دتی۔ آواز دتی گئی کہ "بنکاک جان والی پرواز پی کے 346 بنکاک جان لئی تیار اے تے مسافراں نوں التماس اے کہ اوہ جہاز تے تشریف لے جان۔"

لوکی اسی جہاز تے سوار ہون لئی جدوں گئے تے اگے کیہ ویکھیا دو ایر ہوسٹساں سلامی دین نوں کھلوتیاں سن۔ انداز ہندوستانیاں نوں ذرا وکھرا سی۔ ہتھ جوڑے ہوئے سن تے متھے دے نال لگے ہوئے سن۔ ہندوستان دے وچ ایس نوں پہلے میں جو ویکھیا سی اوہ ایہہ سی کہ ہتھ جسم دے اندر وچ ہوندے سن تے ہتھ جوڑ کے جھکدے وچ کھول کے تھلے کر لئے جاندے سن۔ ساڈا اجتھوں تک خیال اے کہ اندر آون والے ویر دا استقبال اے تے جیہڑیاں دو کڑیاں کھلوتیاں سن اوہناں نے ہتھ جوڑ کے جھکدے لگیاں سن تے متھے نال لائے ہوئے سن تاں جو ٹھیک سارے مسافر اندر داخل نہ ہو جان۔ اندر گئے تے اک مرد تھائی دی اک کونے وچ ایس روپ وچ ویکھیا۔ اوس نے ساہنوں اشارہ کیتا تے اگے چلا گیا۔ سیٹ نمبر F-33 سی۔ اسی جدوں کچھ پاسے ویکھ رہے ساں۔ اودھر سیٹاں صرف A تے B سن۔ اک خوبصورت نوجوان تھائی سٹیورڈ نے ساہنوں ویکھیا کہ ساہنوں سیٹ دا پتہ نئیں چل رہیا تے اوہ اگے ودھیا تے سب توں پہلاں ہتھ جوڑ کے سلام کیتا۔ بعد دے وچ فوراً میرے ہتھ وچوں میرا سوٹ کیس پلاسٹک دے بیگ وچ سی پھڑ لیا تے اوہدے اتے میرا سیٹ نمبر لکھیا تے جا کے سوٹاں دی رکھن لئی مخصوص جگہ تے رکھ دتا۔ اخباراں دا اک ڈھیر اندر داخل ہون والے دروازے دے نال سجایا ہویا سی۔ اسی اوہدے وچوں "ڈان" اخبار چک لیا تے اوساڈے ہتھ وچ سی۔ اسی اخبار دیاں سرخیاں وغیرہ ویکھیاں تے اوہدے بعد "دوریاں دے دل" نوں پڑھنا شروع کر دتا۔ ختم طریقی اے سی کہ ساہنوں پتہ وی نئیں چل رہیا کہ کتھوں بتی جلائی جاندی اے۔ اسی اک ایر ہوسٹس نوں پچھیا تے اوس نے سیٹ دے پچھوں کوئی بٹن دبایا تے بتی جلا دتی۔ تیجا پڑھن دی اک حد سی۔ تھوڑی دیر بعد اسی تھک گئے تے کتاب دی جلد بیگ وچ پا دتی۔

اوہدن مسئلہ سی کہ ڈنر تے ایر لائن نے دینا ای اے۔ جیہڑا سوال پریشان کر رہیا سی اوہ ایہہ سی کہ کیہ کھادا جائے تے کیہ نہ کھادا جائے۔ صرف اک گل سی کہ کیہ کیتا جائے کہ اسی تے صرف سبزی خور آں لہٰذا ایہا کھانا دتا جائے جیہدے وچ گوشت سرے توں ہووے ای ناں۔ فیر ٹرالیاں آئے پاسے چلنیاں شروع ہوگئیاں۔ جدوں ساڈے کولوں ساڈا اپنا ڈنر پچھیا گیا تے اسی اوہناں نوں اپنا مدعا بیان کر دتا۔ جواب ایہہ سی کہ دال مکس سبزی یا چکن تے یا بیف بلکہ چکن ختم ہو گیا اے تے صرف بیف ای اے۔ فیر وی اسی سوچیا کہ کجھ نہ کجھ کھا لینا ای مناسب اے۔ اسی بیف والے پیکٹ وچوں صرف چاول تے تھوڑی دال کڈھ کے کھا لئے تے باقی چھڈ دتا۔ بعد دے وچ کافی چائے تے اللہ دا شکر ادا کیتا۔ اوہدے بعد اسی کمبل اوڑھ کے سوں گئے۔ اکھ کھلی تے لگیا کہ جہاز ہوا وچ معلق اے۔ اسی اک ایر ہوسٹس نوں پچھیا کہ اسی کتھے آں؟ جواب ایہہ سی کہ پنج منٹ بعد اسی بنکاک دے ہوائی اڈے تے لینڈ کرن والے آں۔ تھوڑی دیر بعد گنتری دی ہو گئی تے نال اک ایر ہوسٹس ہتھ وچ ساڈا سوٹ کیس لے کے آ گئی تے لبھ دی پئی کہ کیہدا اے۔ اسی اوہنوں دسیا کہ ایہہ ساڈا ای مال اے۔ لہٰذا اسی سوٹ کیس تے جلد بیگ چکیا تے جہاز وچوں نکل کے دوجے مسافراں دے پچھے پچھے ٹر پئے۔ پیدل چل کے یا ایسکلیٹرز تے سوار ہو کے چلنا شروع کر دتا۔ پہلاں تے اسی سوچیا کہ سدھا امیگریشن چلے جائیے تے چیک آؤٹ ہون دے بعد دوبارہ آ جاواں

گے۔ فیر وی اسی انفارمیشن ڈیسک تے جا کے بیٹھی اک خاتون نال اُس کُس کیتی تے اوہ ساہنوں کہن لگی کہ سامنے قطر ائیر لائنز دے کاؤنٹر نیں، اوہناں وچوں کسے اک تے چلے جاؤ اوہ تہانوں دس دین گے۔ لائن وچ لگے ہوئے اک مسافر جیہڑا کہ پاکستانی سی تے کہن جا رہیا سی نوں اسی پچھیا کہ ساڈے لئی کیہ مناسب اے؟ اوس نے جواب دتا کہ ایہہ تے تہاڈے تے اے۔ جا ہو تے چیک آؤٹ ہو جاؤ تے ٹیکسی لے کے سدھے کسے کمرشل ہوٹل بنکاک چلے جاؤ۔ دوجا طریقہ ایہہ اے مسلم ریسٹورنٹ وچ کر دے تے ساڈے نال واپس آ جاؤ۔ دوجی صورت ایہہ وے کہ تسی ائیر لائنز دا بورڈنگ پاس ہوا لو تے ائیر پورٹ تے ای انتظار کرو۔ اسی سوچیا کہ سفر تے دے کھلاری؟ گو تیرا دل تے بنکاک وچ رہن تے واپس آ جان تے کر رہیا اے پر تھکاوٹ دی وجہ توں بہتر اے کہ توں ائیر پورٹ تے ای انتظار کرے۔ بس اسی وی اک لائن وچ لگ گئے۔ لائن بڑا لمی ہوئی پر اک اک مسافر لاتعداد پاسپورٹ لے کے کھلوتا سی۔ اک پاکستانی صاحب نوں پچھیا تے پتہ چلیا کہ جناب دے صرف چھ پاسپورٹ نیں۔ اک ہور کاؤنٹر تے اک خاتون فارغ ہو گئی تے اوہنے پچھلے لوکاں نوں اشارہ کیتا کہ تسی ایدھر آ جاؤ۔ اگلے اودھر چلے گئے پر اسی سمجھیا کہ ہن تے اگے کوئی لمی واری ایتھے جلدی آ جائے گی۔ ساہنوں نہیں سی پتہ کہ ساڈے اگے جیہڑے اک صاحب کھلوتے نیں اوہناں دے وی چھ پاسپورٹ نیں۔ فیر واری آئی تے کاؤنٹر تے بیٹھی ہوئی خاتون نے ساہنوں شاکنگ مالی ایڈ بورڈنگ پاس دے دتا تے اسی اوتھوں نکل کے اوس گیٹ دی تلاش شروع کر دتی جیہڑا کہ A8 سی۔ ایہہ وی اک مشکل مرحلہ سی، کیونکہ بنکاک ائیر پورٹ ایڈا وڈا اے کہ ربّ دے لال تھک گئیاں۔ پتہ نہیں کتنے ای کلومیٹر پیدل ٹرے ہو گئے صرف امیگریشن دی تے سامان دی تلاش وچ تے بعد وچ گیٹ دی تلاش وچ۔

انتظار خاصا لماں کرنا سی، ایدا ای فیر دوویاں نے دل کھول لئی تے پڑھنی شروع کر دتی۔ جہاز تے سوار ہون دے اعلان تک تقریباً ادھی پڑھ لئی گئی۔ اعلان دے بعد اسی وی تھائی فلائیٹ نمبر 106 لئی مخصوص گیٹ وچوں گزر کے مسافراں دے پچھے پچھے جا کے جہاز دے اندر چلے گئے۔ اوہ ای ائیر ہوسٹساں دا اندازی جیہڑا کہ ایس توں پہلاں بیان کر دتا گیا اے۔ ہن تے تویں ہوائی جہاز آ گئے نیں۔ چھوٹی دیر بعد کھانا شروع کیتا اے تے پہلاں تے سانوں دیا جاسکدا الیتہ اوہ جا نے ڈی سی۔ 10 ٹیار دے وی طرح ہوائی۔ اک قطار وچ 9 سیٹاں سن۔ دو کھبے دو سجے تے چار وچکار۔ شکر اے ساہنوں چیک ان کرن والی کڑی نے پچھ لیا کہ تسی کیہڑی سیٹ پسند کرو گے۔ فوراً ایہو ای پچھیا کہ کیا روشندان دے نال والی مل سکے گی۔ اسی فوراً ہاں کر دتی تے اسی درمیان وچ پھنسن دے عذاب توں بچ گئے۔ ساہنوں ایس توں پہلاں وی درمیان دیاں سیٹاں اتے پھنسن دا اتفاق ہو چکیا سی بلکہ لاہور توں بنکاک والے ہوائی جہاز وچ وی سیٹ درمیان والی سی۔ ایس فلائیٹ وچ اک عجیب جیہا واقعہ وی پیش آ چکیا اے۔ اوہ ایہہ کہ ساڈی غلطی نال اپنی سیٹ توں اک اگلی سیٹ تے بیٹھ گیا۔ دو اشخاص جیہڑے شکلوں پاکستانی لگدے سن اوہناں ووہاں دیاں سیٹاں سن۔ اک بڑے ای تکھمانہ انداز وچ کہن لگا کہ "تہانوں ایہہ سیٹ چھڈنی پئے گی" اک قریب پروفیسر نے اوہنوں کجھ کہنا سی اوہ اوہنوں اے کہہ کے کہ "ضرور بالضرور" اسی اپنی سیٹ تے چلا گیا۔ جہاز اڈن دے بعد دوویں حضرات ای غائب ہو گئے تے چار دیاں چار سیٹاں ای خالی ہو گئیاں۔ پروفیسر نے سیٹاں دے درمیان دے بازو اُتے چک دتے تے چاراں نوں ملا کے پورا بیڈ بنا لیا تے لیٹ گیا۔ ساڈے خیال وچ اللہ تعالیٰ نے اوہدی شرافت تے دکھاں دا بدلہ اوہنوں دے دتا۔ کتاب ہینڈ بیگ وچ پائی تے کمبل لے کے ہو گیا جیہڑا کہ وچ کھڑی دی تھکن سی اوہنوں نیندر

آ گئی تے اوہ ایہاں ہتھاں کی اکھ اوہدوں کھلی جدوں طیارہ شانگ مائی دے ہوائی اڈے اترن لئی تیاری کر رہیا سی تے ہوا وچ معلق سی۔ صرف 1 گھنٹہ تے 20 منٹ دی فلائیٹ سی۔ ایس طیارہ ہوا وچ اڈیا تے کوئی اوہدے نے گھنٹے تھاں وچ لینڈنگ لئی تیاریاں وچ آ گیا۔ اسی پنج سوا دن بنکاک توں چلے تے 11:30 شانگ مائی لینڈ کر گئے۔ بنکاک توں شانگ مائی جان دی کھیڈ وچ اک دلچسپ دا واقعہ پیش آیا۔ ایہ ایئرپورٹ تے کافی دیر امیگریشن تے بلاآخر تھائی ایئرویز دے کاؤنٹر تے پہنچ گئے۔ بورڈنگ پاس لے لیا تے گیٹ A-1 تک پہنچن لئی رستے وچ پچھیا کہ ایہی اندر جانا چاہیدا اے تاکہ جہاز تے سوار ہو سکیے۔ اک خاتون نے اشارہ کیتا کہ جتھے اوہ دو کڑیاں ڈیسکاں ہوئیاں سن اوہناں کول چلا جا۔ میرا خیال سی کہ تھائی سرحد واخلہ ہووے گا۔ اوہناں وچوں اک نے میرے کولوں پاسپورٹ منگیا تے وچ میرے اوہ فارم سن جیہڑے امیگریشن کول پیش کرنے ہوندے نے۔ اک داخل ہون والے تے دوسرا خارج ہون وال اک کڑی نے ساہنوں ایہہ پتہ چلیا کہ کیہڑے ویلے مہر لگائی اے جیہڑا کہ داخلے دا سی تے دوجے نوں ساڈے پاسپورٹ دے نال نتھی کر دتا۔ ساہنوں فیر وی سمجھ نہ آئی۔ کیونکہ اک بزرگ مسافر نے ساہنوں ایہہ کیا ہویا سی کہ ہوں چیک آؤٹ شانگ توں ہو وڈے گے۔ لہٰذا شانگ مائی جا کے ایدھر اودھر ویکھنا شروع کر دیں امیگریشن والے کدھرے وی نظر نہیں آئے۔ دل وچ خیال آیا کہ کسے نوں پچھیا جائے کیونکہ مسافر سامان لے کے باہر جا رہے سن تے پاسپورٹ وچ کوئی مسئلہ نہ رہ جائے۔ اک کارندے نوں پچھیا تے اوس نے ساڈا پاسپورٹ ویکھ کے دسیا کہ امیگریشن توں سی چیک آؤٹ بنکاک توں ای ہو کے آرہے او۔ ویکھیا ہیں کہ اک فارم تھائی لینڈ چھڈن والا ہویا اے تے پاسپورٹ اتے داخلے دی مہر وی لگی ہوئی اے۔ اوس ویلے ساہنوں یاد آیا کہ اک کڑی نے مہر لگائی تے دوجی نے ساڈی ٹکٹاں تے اک گولڈن ٹیگ لگایا سی جیہڑا ایہہ شو کر رہیا سی کہ بندہ امیگریشن توں فارغ ہو گیا اے۔

ایئرپورٹ دے باہر جان والے دروازے تے پہنچے تے اگے کجھ ٹیکسی ڈرائیور بیٹھے سن تے کجھ مسافراں نوں گھیرن لئی ایدھر اودھر پھر رہے سن۔ ساہنوں وی اک نے پچھیا۔ اوہنوں ساڈا جواب ایہہ سی کہ جس ہوٹل وچ ساڈا قیام ہووے گا اوہناں دی گڈی ساہنوں آ کے لے جائے گی۔ لہٰذا تسی چنتا نہ کرو تے گھبراؤ۔ ڈرائیور نے اصرار کیتا کہ اوہناں نے کوئی نہیں آونا تسی سامنے کاؤنٹر تے جا کے بک کرواؤ تے تشریف لے جاؤ۔ ساڈا جواب ایہہ سی کہ ایتھاں پر شلوہ ہوٹل اوہنوں جنی حرکت نہیں کر سکدا کہ وعدہ کر کے مکر جائے تے لاپرواہی دا مظاہرہ کرے۔ اسی ڈرائیوراں نوں دسیا کہ میں اوہناں نوں فلائیٹ ٹائم 11-35 دا لکھیا ہویا اے لہٰذا ای اوس وقت ہر قیمت تے انتظار کرن گے۔ کرایہ پچھیا تے پتہ چلیا کہ آون جان دا کرایہ چارج کیتا جائے گا جیہڑا تقریباً 120 بھات ہووے گا۔ ہوٹل دی گڈی دا کرایہ ساہنوں 90 بھات دسیا گیا سی۔ فیر 30 بھات دی کوئی گل نہیں سی۔ ساڈے نزدیک ایہہ زیادہ اہم سی کہ جو ٹائم ساہنوں ہوٹل والیاں نے دتا ہویا اے اوس توں وی 5 منٹ ودھ ٹائم تک ساہنوں انتظار کرنا چاہیدا اے۔ فیر 11 وج کے 34 منٹ تے گڈی آ گئی۔ ڈرائیور نے آ کے سامان چک کے گڈی وچ رکھیا۔ دو مسافر ساڈے توں پہلاں سوار سن۔ اسی وی گڈی وچ بیٹھ گئے تے 20 منٹاں دے وچ ای ایمرین ہوٹل دے دروازے اگے پہنچ گئے۔ اوتھے بعد وچ ساڈے سارے ای مسئلے حل ہو گئے کیونکہ ایمرین ہوٹل واقعی نظارے دی گلدا سی کہ مسافراں نوں پورا آرام ملے تے اوہناں نوں کسے قسم دی تکلیف نہ ہووے۔ ساڈے کولوں اک فارم بھروا کے چابی ساڈے حوالے کر دتی گئی تے اسی کمرہ نمبر 105 وچ چلے گئے۔

(جاری ہے)

◆◆◆

سفر نامہ ساحلِ اقبال (Iqbal Ufer)

ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی

یہ 1986ء کی بات ہے جب آتش نہیں بلکہ میں جوان تھا عنفوانِ شباب نہ سہی مگر عمر عزیز کے 40 سال گزار کر میرے اندر اتنی ذہنی بالیدگی ضرور پیدا ہو گئی کہ علامہ اقبال کے خودی کے اسرار کھلنے لگے تھے۔

مستنصر حسین تارڑ کی کتاب 'نکلے تیری تلاش میں' اور جناب ممتاز مسعود کی کتاب 'سفر نصیب' پڑھنے کے بعد ہم بھی نکل کھڑے ہوئے کسی کی تلاش میں۔ بفضلِ تعالیٰ سفر نصیب ہوا اور ایک لمبی سیاحت حاصل کی۔ سفر کا پہلا پڑاؤ جرمنی کا شہر فرینکفرٹ تھا۔ اسلم صدیقی میرے میزبان تھے۔ علم دوست بذلہ سنج شخصیت کے مالک اقبالیات سے خاص لگاؤ تھا۔ شکوہ سنانے کے بعد جواب شکوہ بھی دیتے تھے۔ PIA میں کارگزاری نے انہیں ایک عالم کی سیر کرائی تھی ایک روز وہ مجھے فرینکفرٹ سے ہیڈل برگ لے گئے ایک پرسکون علاقے میں انہوں نے گاڑی روکی اور کہنے لگے آیئے کچھ دور پیدل سیر کرتے ہیں۔ ساحلِ دریا خاموش فضا ہر سو ہریالی۔ جس جگہ ہم چہل قدمی کر رہے تھے وہ اس وقت سنسان تھی۔ چند قدموں کے بعد وہ جگہ نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام عاشقانِ اقبال کے لیے ایک یادگاری مقام ہے۔ جس خاص مقصد کے لیے اسلم مجھے وہاں لے کر آئے تھے وہ عیاں ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لبِ ساحل ایک بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر جلی حروف میں Iqbal Ufer لکھا تھا یہی وہ جگہ تھی جہاں 1907ء میں ہیڈل برگ کے مقام جرمنی میں علامہ اقبال زیرِ تعلیم تھے اس بورڈ کے پاس کھڑے ہو کر ہمارے سوچ کا دھارا علامہ اقبال کی جانب ہو گیا۔ اسلم کہنے لگے کہ مغربی تنقید نگاروں کا خیال ہے کہ علامہ اقبال جرمن مفکر نطشے سے بہت متاثر تھے اس نظریہ کے ثبوت میں وہ علامہ اقبال کے مردِ مومن کا نطشے کے سپر مین سے موازنہ کرتے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے یکساں معلوم ہوتے ہیں اس تصور نے خاص طور پر اس وقت جنم لیا جب علامہ اقبال کی تمام اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ منظر عام پر آیا۔ مغربی تنقید نگاروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اقبال نطشے کی ترجمانی کر رہے ہیں اس سوچ کی تردید میں علامہ اقبال نے خود ڈاکٹر نکلسن کو اپنے ایک خط میں تحریر کیا۔ کچھ تنقید نگار میری تخلیق کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے یہی وجہ ہے کہ وہ غلط بحث کر کے میرے مردِ مومن اور جرمن مفکر نطشے کے فوق الانسان کو ایک ہی تصور کر بیٹھے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے انسانِ کامل کے صوفیانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا اور نہ ہی اس کی کتابیں میری نظر سے گزری تھیں سوچ کی مماثلت کبھی کبھی کہیں بھی اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔

علامہ اقبال نے فارسی ادب اور ثقافت کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا اس کا ثبوت ان کی فارسی شاعری ہے اقبال کی مصر، فلسطین، ہسپانیہ، اٹلی اور افغانستان جیسے ممالک کی سیاحت جن سے اسلامی عظمتیں وابستہ ہیں، ان کی طبیعت کے ترقی عنصر کو ابھار کرنے میں ان ممالک کی تاریخ اور سیر نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ جب ہم ایرانی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اسلام سے پہلے ایک

زبردست شخصیت زرتشت کا پتہ چلتا ہے۔ ایرانی لوگ اسلام سے پہلے اس کے پیروکار تھے۔ آج بھی اس کے ماننے والوں (پارسی قوم) کے عقیدے کے مطابق وہ شخص ایک پیغمبر تھا۔ زرتشت نے ایک نظریہ پیش کیا کہ انسان اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں کا خود ذمہ دار ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں میں خوش خبری دی۔ ''اے لوگو! ایک ایسا انسان آنے والا ہے جس کا اونچا ستارہ دنیا کو بدل دے گا وہ فوق الانسان ایک مستقل انقلاب برپا کرے گا پست خیالوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانے والا ایک طوفان نظام کہنہ کے عظیم عمارتوں کے لیے ایک تباہ کن زلزلہ ہوگا۔ وہ شخص دنیا کو ایک نئی رونق اور وحدت بخشے گا۔'' علامہ اقبال کے کلام اور خیالات اور فلسفے کے بغور مطالعے سے یہ بات عیاں ہے کہ علامہ اقبال کا مرد مومن کون ہے۔ الحمدللہ ہم صاحب ایمان کو اس کامل ہستی کو سمجھنے کے لیے کسی نطشے یا زرتشت کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمدؐ سے بڑھ کر کوئی کامل ہستی تھا نہ ہوگا لاکھوں درود و سلام اس رحمت اللعالمین پر جس نے ہمیں انسانیت کا سبق پڑھایا۔ ہیڈل برگ سے واپسی کے بعد میں گویا اقبال کے نقش قدم پر اپنی سیاحت کرتا رہا۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی　　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اس شعر نے مجھے اندلس کی فضاؤں میں پہنچا دیا جہاں آج سے صدیوں پہلے ایک عظیم قوم کے عظیم فرزند طارق بن زیاد نے ساحل پر اپنی کشتیاں جلائی تھیں۔ جی ہاں میں اندلس پہنچ جاتا ہوں۔ جہاں کی وادیاں رشک گلزار ہیں جہاں غرناطہ اور قرطبہ ہیں جہاں اشبیلیہ ہے۔ جہاں الحمرا اور مدینۃ الزہرا ہیں۔ آہ میری روح شاید ازل سے یہاں آنے کو بے چین تھی۔ یہاں ایک عظیم قوم کی عظمت کی داستان ہے اور پھر عاقبت نااندیشی سے زوال کی شرمناک کہانی ہے۔ یہاں غرناطہ کے عالیشان محلات ہیں۔ اب ان کے در و دیوار کھڑے درس عبرت دے رہے ہیں وہ زمانہ خواب و خیال ہو گیا جب یہاں پتھر پتھر خوشی کے ترانے سناتا تھا۔ اے الحمرا کہاں ہے تیری وہ رعنائی، کہاں گیا تیرا وہ بانکپن۔ دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو تو اندلس کی سرزمین پر کتنی دلفریب داستانیں پوشیدہ ہیں عبدالحلیم شرر کے ناول کی طور اطور یاد'' کون بھول سکتا ہے۔ کون جانے تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے اور مستقبل عظمت رفتہ کی واپسی کا پیغام بن کر آئے۔'' گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را''

قرطبہ پہنچ کر کون ہے جسے علامہ اقبال کی مشہور نظم مسجد قرطبہ یاد نہ آئے۔ سلسلہ روز و شب ۔۔۔ علامہ کی نظم مسجد قرطبہ کا یہ سلسلہ روز و شب بہت طویل ہے۔ پھر مطالعہ کیجیے۔ سر دھنیے۔ میں آپ کی خدمت میں پہلا اور آخری شعر پیش کر کے اجازت چاہتا ہوں!

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات　　　سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر　　　نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

◆◆◆

انشائیہ

غلطیاں

ممتاز راشد لاہوری

غلطیاں مختلف طرح کی ہوتی ہیں مثلاً عام غلطیاں، خاص غلطیاں، معصوم نوعیت کی غلطیاں، فاش غلطیاں، فحش غلطیاں، مہلک غلطیاں اور مضحکہ خیز غلطیاں وغیرہ وغیرہ۔ زبان و بیان کے حوالے سے دو (آ) ایک عام طور پہ استعمال ہوتی ہیں — غلط العوام اور غلط الخواص — مرزا غالب نے کہا تھا ۔ غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

کچھ لوگ اعراب کی نافہمی کے سبب "غلط" کو "غلط" کہتے بھی نظر آتے ہیں — اس حوالے سے یہ مصرع بھی عام سننے کو ملتا ہے — ع غلط کہا جو غلط کو تو کیا کیا ہے غلط — جس طرح کہا جاتا ہے کہ پہلا عشق کبھی نہیں بھولتا، اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی بڑی غلطی بھی کبھی نہیں بھولتی۔ یہ غلطی گرم غلطی بھی ہو سکتی ہے اور نرم غلطی بھی۔ غلطی کرنے کے بعد اگلا ایک مرحلہ معافی مانگنے یا معاف کرنے کا بھی ہوتا ہے۔ رومان کے دونوں محب و محبوب کے درمیان بھی غلطیاں کرنے اور غلطیاں معاف کرنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ معاف کرنے یا درگزر کا سلسلہ رک جائے تو دوریاں بڑھتی چلی جاتی ہیں — 1970ء کے عشرے کا ملکہ ترنم نور جہاں اور احمد رشدی کا ایک فلمی دوگانا یاد آ گیا ۔ کوئی یوں بھی روٹھتا ہے — ماما مری خطا ہے — مگر اب معاف کر دو

اس رومانی رنگ میں رنگا ہوا ایک پنجابی مطلع 2014ء میں سننے کو ملا جو معروف شاعرہ طاہرہ سرا ہی سے سنا ۔

پہلی گل اے کہ ساری غلطی میری نئیں — ہے کہ میری وی اے، کیہ میں تیری نئیں

کچھ غلطیاں غلط فہمی کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہیں ان میں ازدواجی غلطیوں کی شرح زیادہ ہے۔ پڑھے لکھے بلکہ عالم فاضل افراد کی غلطیاں بھی عام ہیں مثلاً فقہی معاملات کی غلطیاں تو زبان زد عام ہیں۔ املا کی غلطیوں کی بوالعجبیاں بھی بے تحاشا ہیں۔ اس سلسلے کا تبوں یا کمپوزروں کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ کاتب یا کمپوزر سے "پروف خوانی" کے بعد "غلطیاں لگوانا" یعنی کمپوزنگ کی غلطیاں درست کروانا بھی خاصا مشکل مرحلہ ہے کیونکہ بعض اوقات وہ غلطی درست کرتے ہوئے ساتھ والے کسی لفظ کو غلط کر دیتا ہے۔ کمپوزر سے غلطیاں درست کرانے والے کو اس پہلو پر بھی نظر رکھنا پڑتی ہے۔ "غلطی" کے قریب قریب الفاظ میں عصیاں، گناہ، لغزش اور خطا وغیرہ شامل ہیں۔ انفرادی فرد واحد یا انفرادی غلطیوں کی بہ نسبت ملی، قومی، گروہی یا اجتماعی غلطیاں یقیناً زیادہ ہلاکت خیز ہوتی ہیں۔ 1980ء کے لگ بھگ کا میرا ایک شعر کچھ یوں ہے ۔

فرد کی لغزش بھی ہوتی ہے مضر، راشد مگر — اجتماعی غلطیاں لاتی ہیں قوموں کا زوال

اس کے کچھ سال بعد اسی مضمون کا میرا ایک قطعہ کچھ یوں تھا

کام دشمن پہ نہ کیوں ہو ماہری جب نتائج غلط سلط غلطیں

کاش ایسا نظام ہو جس میں — جو غلط ہوں وہی غلط ٹھہریں

''غلط ملط'' کو رواں پنجابی زبان میں ''غلط ملط'' بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اگرچہ معاشرتی اور مذہبی و مسلکی لحاظ سے ''شرعی عیوب'' پر بھی کئی قدغنیں ہیں مگر حضرت گیر شعراء ''شعری عیوب'' کے معاملے میں دو قدم اور بھی آگے ہیں (بلکہ ''دو چوتھے'' آگے ہیں)۔ ان کے ہاں ایطائے جلی، ایطائے خفی، تنافر، قریب المخارج، ابتذال، ثقل، روانی، اشاعت، اقواء، اکفاء، شتر گربہ، تعقید اور حروف زائد وغیرہ کے شعری عیوب زیادہ قابل گرفت ہیں۔ شعراء کے ہاں ''غلطی'' کے موضوع پر کئی اشعار مل جاتے ہیں اسی طرح غلطیوں کا حساب کرنے یا درگزر کرنے کے موضوع پر بھی اشعار کہے گئے ہیں۔ 2015ء کی میری ایک غزل میں بھی ایسا ایک شعر آ گیا تھا

جب تک اس کا دل چاہا درگزر کیا اس نے — جب حساب کرتا تھا بے حساب کرتا تھا

غلطیوں، لغزشوں، خطاؤں اور گناہوں کی مختلف شکلوں میں قانونی غلطی، شعوری غلطی اور غیر شعوری غلطی بھی شامل ہیں، ان میں کسی حد تک روایتی غلطی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ غلطیوں کا احساس ہو جائے اور پھر غلطیوں کو دہرایا نہ جائے تو اس روش کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ بعض غلطی ماننے والوں کے بارے میں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ دل سے نہیں مان رہا۔ ایسے ہی ایک بندے نے جب یہ مانا کہ ہاں یہ میری غلطی ہے تو ایک جہاندیدہ بزرگ نے کہا کہ ''نہیں، یہ تیری غلطی نہیں، بلکہ تیرے والدین کی غلطی ہے جنھوں نے تجھ جیسے کو پیدا کیا''۔

◆◆◆

فردیات

ممتاز راشد لاہوری

زیست میں زہر ہے یہ کس کے سبب
کس کے کارن ہے یہ جہان خراب

یہ بھی اک امید ہے، پوری بھی ہوں گی
آنے والے کل سے جو امیدیں ہیں

ہم بے آس ہیں بے مایہ ہیں
ہم ہیں اپنوں کا سرمایہ

راستوں کا سراغ ملتا ہے
تیری ٹھوکروں کے جھٹکانے سے

آپ الگ سے لے آتے ہیں محفل میں
ہم پھولوں کے تحفے دینے والے ہیں

چھوٹ جاتا ہے ساتھ ہر کوئی
صرف یادیں ہی ساتھ رہتی ہیں

کیا سنے گا وہ کسی طور بھی سب کی باتیں
کسی کے پاس اگر گوش ہوش ہی نہ رہے

مفلس باپ نے ایک غبارہ خریدا ہے
سب بچوں میں کیسے پورا آئے گا

ان اندام کو دنیا میں کس سے تشبیہیں
سب تشبیہیں پہلے ہی سے عریاں ہیں

عیاں ہیں ہر سو اس کے ''کارنامے''
کتنی اداؤں کا اس کے عیب گنے؟

طنز و مزاح

کہ صابن بھی میرا اٹھا کر چلے.......

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

"یہ تم نے بھلا بچوں والی بب (Bib) گلے میں کیوں لٹکائی ہوئی ہے؟" ہمارا ایک دوست جو کہ کلینک میں ہمارے کمرے میں داخل ہوا اور ہم پر پہلی نظر پڑتے ہی تو یوں گویا ہوا۔ "کون سی بب؟" "یہی جو تم نے گلے میں لٹکائی ہوئی ہے"۔ جواباً ہمارا بھی "ہاسا" نکل گیا۔ ہم نے جو ماسک پہنا ہوا تھا اس کی اوپر والی "تنکیں" ہم نے کھلی چھوڑ دی تھیں جو اب نیچے لٹک رہی تھیں البتہ نیچے والی "تنکیں" یا تسمے ابھی گلے میں فٹ تھیں۔ دوست واقعی ایسا ہی لگ رہا تھا کہ جیسے چھوٹے بچوں کے رال ٹپکنے کے ڈر سے اور دودھ یا کوئی اور شے پلاتے ہوئے قمیض یا شرٹ پر گرنے اور لیک جانے کے ڈر سے مائیں حفاظتی تدبیر کے طور پر ان کے گلے میں بب لٹکا دیتی ہیں۔ تاہم ہماری یہ بب نہیں تھی بلکہ ماسک تھا۔ وہ تو ہمارے دوست کو بھی معلوم تھا مگر ازراہ تفنن اس نے کہہ ڈالا تھا۔ دراصل ہم مریض کے معائنے اور اس کے کمرے سے اخراج کے بعد ماسک کی اوپر والی تنکیاں یا تسمے اتار کر کچھ دیر سکون کا سانس لینے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلے پہل جب کورونا کی وبا چین میں پھیلی تو پوری دنیا میں تشویش کی لہر دوڑ گئی مگر یہاں پاکستان میں کورونا کی سوشل میڈیا پر رج کے بے عزتی کی گئی۔ سب سمجھے کہ اس بے عزتی کے ڈر سے وہ پاکستان کا رخ نہیں کرے گا مگر وہ بڑا ڈھیٹ قسم کا وائرس نکلا کہ یہاں بھی آدھمکا۔ تاہم ہماری سوشل میڈیا کی دھمکیوں کا اس پہ اتنا اثر تو ہوا کہ یہاں آکر "وختہ وکھ" اس میں نہ رہی جتنی دوسرے ملکوں میں تھی۔ اور تو اور اس کے نام کا بھی بہت مذاق اڑایا گیا۔ پہلے پہل اردو کی املا میں اخبار والوں نے اسے "کرونا" لکھا تو پھر مجبوراً اس کو املا تبدیل کرنا پڑی۔ پہلے تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ پنجابی کے ہر لفظ کے (کم از کم) دو مطلب نکلتے ہیں مگر اب تو اردو کے لفظوں سے بھی دو مطلب نکلنے لگے ہیں اور لوگوں نے کرونا کے کچھ اور مطلب نکالنے شروع کر دیے جیسے "کچھ کرو نا" اس سے پیشتر کہ بات زیادہ فحاشی کی طرف جاتی اس کے نام کو مہذب بنا کر "کورونا" لکھنے پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ (چونکہ یہ اردو زبان کا لفظ نہیں سوائے اپنی مرضی سے کسی طرح بھی لکھا جا سکتا ہے) سوشل میڈیا کی کارستانیاں اپنی جگہ مگر اب یہ کورونا شاعروں کے ہتھے بھی چڑھ گیا ہے حالانکہ جس بیچارے کو کورونا وائرس چمٹ جاتا اسے معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ کتنا سنگین ہے ایسے میں وہ مریض شاعروں کو اس پہ شاعری کرتے دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ۔ تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

ساتھ ہی اردو املا کا بھی رونا پڑ گیا۔ حکومت کو اسی سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر کی پڑی ہوئی تھی اور ادھر ادیب لوگ کہنے لگے یہ "کرنطینہ" ہوتا ہے "قرنطینہ" نہیں تاہم ان کی کسی ایک نے نہ سنی اور یہ "قرنطینہ" ہی رائج ہو گیا۔ یار لوگوں نے تو اس کو بھی مذاق میں لیا اور جس کو حکومت پکڑ کر لے جاتی تھی تو کہتے تھے "دیکھو یہ "کترینہ" کی طرف جا رہا ہے۔" پکڑا جانے والا بھی حسرت سے کہتا کاش کترینہ کیف کی طرف ہی لے جاتے اور قرنطینہ سے نہیں۔

ادھر شاعروں نے بھی اس موضوع کی طرف توجہ دی تو ہم جیسوں نے بھی ایک آدھ نظم کورونا کے اعزاز میں لکھ ڈالی۔ اب جو شاعروں کے حصے کورونا چڑھ گیا تو اس پہ ادبی ادبیات بھی خاموش نہ بیٹھی اور ہزاروں کورونائی نظمیں انٹرنیٹ پہ پہنچ گئیں تاہم ''مزاق تپ ہے گرتوں کو تھام لے ساقی'' کے مصداق اگر بیماری کو بھی ہم ہلکی پھلکی موسیقی کی طرز پر لیں تو زیادہ اچھے نتائج ہوتے ہیں (علاج کے ساتھ ساتھ)۔ یوں کرونائی شاعری میں طنز و مزاح پہلی شاعری مریضوں کی نفسیاتی الجھنوں کو کم کرنے کے لیے میدان میں آ گئی۔ پھر طنز و مزاح کا میدان ہو تو ڈاکٹر عمران ظفر جیسے معروف مزاحیہ شاعر کیسے پیچھے بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے کورونا کے اعزاز میں ایسی دل کو چھونے والی اور ہونٹوں پر مسکان لانے والی نظمیں لکھیں کہ خود کورونا بھی مسکرا دیا ہوگا۔ ڈاکٹر عمران ظفر تو کورونا کی محبت میں ایسے مبتلا ہوئے کہ پوری کتاب ہی لکھ ڈالی۔ ڈاکٹر عمران ظفر کے مشہور اور کئی مرحوم شاعروں کی زمین میں پیروڈی لکھی تو وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو کر اس ''خصوصی آفت'' سے آگاہ ہو رہے ہوں گے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن انہوں نے ایسی کمال کورونا شاعری کی کھیل کھیل میں داغ بیل ڈالی ہے کہ اب یہ بیل تاریخی عمل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ میر تقی میر کو کورونا زدہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مریضانہ آ کے یہ کیا کر چلے ۔۔۔ کرونا میں سب مبتلا کر چلے
کرونا ایسی نحوست ہے جو ۔۔۔ ''ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے''
کرونا سے لڑنا ہے ڈرنا نہیں ۔۔۔ وہ یہ کہہ کے سب کو ڈرا کر چلے

آپ شیخوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کوئی شیخ جی سا کمینہ نہیں ۔۔۔ کہ صابن بھی میرا اٹھا کر چلے

دنیا میں یہ بھی چرچے ہو رہے ہیں کہ یہ کورونا کوئی اصلی وبا ہے بھی سہی یا پھر کوئی عالمی سازش؟ چین امریکہ اور امریکہ چین پر الزام تراشی کر رہا ہے کہ اس نے مصنوعی طور پر پھیلایا ہے۔ غالب کی زمین میں ڈاکٹر عمران ظفر کیا خوب فرماتے ہیں:

یہ کرونا کا ماجرا کیا ہے؟ ۔۔۔ کوئی سازش ہے یا وبا کیا ہے؟
عالمی طاقتیں ہی جانتی ہیں ۔۔۔ اصل میں ان کا مدعا کیا ہے؟

ہمارے ہاں موبائل فون کے ''ایزی لوڈ'' کی اصطلاح اتنی عام ہوئی ہے کہ یہ ''ایزی'' easy ہماری گفتگو میں ہی آ گیا ہے۔ ہم تو بحیثیت قوم ہر شے اور مسئلے کو ''ایزی'' لیتے ہیں تو بھلا کورونا کی اوقات ہی کیا ہے؟ ہم سے زیادہ تو اٹلی والوں نے اسے ایزی لیا تبھی تو ڈاکٹر عمران طاہر کہتے ہیں:

ایزی لینے پہ اٹلی والوں سے ۔۔۔ کوئی پوچھے وہاں ہوا کیا ہے؟

الحمد للہ ماشاءاللہ کو یوں کورونائی خراج عقیدت پیش کیا ہے:

لگا ہے کہ قید اور لاک ڈاؤن ہر علاقے میں ۔۔۔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں
ظفر اس لاک ڈاؤن نے تو مت ہی مار کے رکھ دی ۔۔۔ جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں

ڈاکٹر عمران ظفر نے کورونائی عہد کے معاشرے پر اثرات کو نہایت خوبصورتی سے ساغر صدیقی کی شعری زمین میں ڈھالا ہے:

ہے وبا یاد مگر ربِ خدا یاد نہیں ۔۔۔ ہائے مخلوق کو خالق کی رضا یاد نہیں

اس قرنطینہ نے مت مار کے رکھ دی میری — میں وہ افسر ہوں کہ دفتر کا پتہ یاد نہیں
میرے شاگردوں کی حالت بھی ہوئی ہے پتلی — اب تلک جو بھی پڑھا، ان کو ذرا یاد نہیں

اکبر الٰہ آبادی کو یاد رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہنگامہ ہے کیوں برپا امداد جو مانگی ہے — ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

ہندوستان کے کچھ لوگوں کی کم عقلی کی طرف کیا خوب اشارہ کیا ہے:

اس موذی مرض کا حل بس گائے کا گوبر ہے — بھارت کے حکیموں نے تحقیق بتا دی ہے

ہم لوگ جو موقع دیکھتے ہی منافع خور بن جاتے ہیں ان کی کیا خوب عکاسی کی ہے:

ڈیٹول ہے بہت تو مہنگا ہے بہت ماسک — نایاب ہوئی اب تو ڈیٹول کی شیشی ہے

ڈاکٹر عمران ظفر گو پی ایچ ڈی والے ڈاکٹر ہیں لیکن پھر بھی لفظ "ڈاکٹر" کی تاثیر کی وجہ سے مشورہ دیتے ہیں:

اس سے کا نہیں مطلب، ہو تجھ کو کرونا بھی — ہلکی سی حرارت ہے تھوڑی سی جو کھانسی ہے

ڈاکٹر صاحب نے بہادر شاہ ظفر کو دوبارہ زندہ کر کے اور احتجاج پر لگا دیا ہے:

کیسی ہے یہ وبا کوئی پوچھتا نہیں — پگلے ہو کے رہ گئے اپنے دیار میں
میں چھینکنے لگا تو کرونا کے خوف سے — غیروں نے بیٹھنے نہ دیا بزم یار میں

مرزا داغ دہلوی کو کرونا وائرس کے داغ دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

وائرس ساتھ کرونا کا یہ لانا تیرا — "اپنے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا"
مجھ کو تنگ جانے نہ لوگوں سے وبا کہتا ہے — دور رہنے کا نیا دیکھا بہانہ تیرا

اسی کرونائی نظم میں چالیس روزہ کرونائی قید کے اثرات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عمران ظفر لکھتے ہیں:

گھر میں رہ رہ کے ترا دل جو بجھا ہے اتنا — "اک قیامت کا اٹھانا ہے، اٹھانا تیرا"

ڈاکٹر عمران ظفر فیض شناسی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے اس محبوب شاعر سے کرونا کی محبت کا اظہار نہ کرتے۔ فرماتے ہیں:

وبا یہ ختم ہو اور خوف کا غبار چلے — چلے بھی جاؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
کرونا اور محبت میں ایک نسبت ہے — کہ ان کے آگے کسی کا نہ اختیار چلے

جب ڈاکٹر عمران ظفر، ادا جعفری کی طرف رخ کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں:

ممکن ہے وبا تھم سے، گئی ہو کہیں، آخر — دو چار قدم ہم بھی ترے ساتھ چلے ہیں
مت ڈھونڈ کے کئی بار ملے جان جہاں سے — اس بار رقیبوں سے بڑی چال چلے ہیں

علاوہ ازیں ڈاکٹر عمران ظفر نے قطعات میں بھی کیا خوب کرونائی رنگ جمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں

یہ کرونا کہیں نہ لگ جائے — سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
خود کو کرتا ہوں تنگ تابہ نظر — "جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں"

واہ رے کرونا

محکمہ بہبود آبادی کو اندازہ نہ تھا — ہر طرف ہو جائیں گے بچے وبا آنے کے بعد
شرح پیدائش کہاں تھی اور کہاں آ گئی — "اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد"

ایک تو یہ بھی افواہ تھی کہ یہ وائرس دنیا کی آبادی کو کم کرنے کے لئے جان بوجھ کر پھیلایا گیا ہے لیکن انہیں یہ امر بھی مدنظر رکھنا چاہیے تھا کہ میاں بیوی کو لاک ڈاؤن کرنے کی وجہ سے جو گھر میں "کھلا چھوڑا" گیا ہے تو ہو سکتا ہے اتنے مریں وہاں جتنے نئے آ جائیں۔۔۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے اپنی لطیف شاعری میں جس طرح سے اس کورونائی وبا کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور خاص طور پر اس کے سماجی اثرات سے بھلے چنگے انداز سے آگاہ کیا ہے تو یہ انہی کا کمال ہے۔ بہت کم لوگوں نے اس طرح سے طنز و مزاح میں شاعری کر کے ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہوگا۔ طنز و مزاح نثر یا شاعری میں لکھنا آسان نہیں ہے۔ یہ ایک قدرتی صلاحیت ہے کہ سنجیدہ لکھنے والے لاکھ کوشش کریں مزاح نہیں لکھ سکتے یا لکھیں گے تو یوں لگے گا زبردستی لکھ کے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر فطری طور پر طنز و مزاح کے شاعر ہیں۔ انہیں ان کی اس کتاب کی اشاعت پر ڈھیروں مبارکیں۔ امید ہے ان کی شاعری قارئین میں بہت جلد خوب پذیرائی حاصل کرے گی۔

◆◆◆

ڈاکٹر بدر منیر

قطعات

کمزوری

بیگم مجھ پہ اتنا غصہ ٹھیک نہیں
بتاتا رہا ہوں جس میں آپ وہ ادائیں ہیں
آپ کی لات سے مجھ کو طاقت ملتی ہے
باقی لڑکیاں تو میری کمزوری ہیں

بہو

فرشتوں کی ان میں خوبو رکھتی ہے
جو خدمت کو بس روزانہ رکھتی ہے
کبھی ساس کو جس نے پوچھا نہ اپنی
وہ عورت بھی اچھی بہو رکھتی ہے

وڈلوک

لڑکی بولی میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟
لڑکا بولا جاں دے دوں اگر تم فرماؤ
لڑکی بولی جان کوئی بھی دے سکتا ہے
مزا تو تب ہے ساتھ مرے جی کر دکھلاؤ

چکر

چلا گیا ہے آج بیگم نے جاتے کیسا چکر
طبیعت عاشقانہ تھی آج ٹھیک ہو گئی ہے
سے بیٹھے وہ اپنے گھر میں ایسے بجلی بلی
یہ لگتا ہے تمہاری آئی ڈی لیک ہو گئی ہے

تعریف

میں نے کہا کہ رات سے ہے یہ تو وگ سی
کاٹا کرو نہ زلفوں کو ایسے سنوار کے
تعریف کی جو میں نے مسلسل تو ایک دن
وگ اس نے میرے ہاتھ پہ رکھ دی اتار کے

شک

پہلے ان سے بیگم مجھ پہ شک کرتی ہے
لیکن بھی ہے کام جو وہ ان تھک کرتی ہے
بیٹے میں بھی کوئی حسین چہرہ نہ دیکھوں
سو جاؤں تو کمرے میں تک تک کرتی ہے

جاناں

یہ حسن تیرا ہے جیسے کوئی اور جاناں
ہے تیرے جلووں کی قیمت یہ بہار جاناں
مجھے پہ راز ہے کھلا نہ جو تیری آنکھ کھلی
کبھی تو آنکھوں سے کالا چشمہ اتار جاناں

حل

وہ بولی میں کچی بچی ہوں
مہنگائی بہت ہے زمانے میں
وہاں چیزیں سستی ملتی ہیں
مجھے لے چل توشہ خانے میں

احتجاج

کیا ان پہ ترا حق کا بتا نہیں اثر
خاطر میں ان کو کس لیے لاتے نہیں جناب
عوام کے اشتہار میں ہوتی ہیں لڑکیاں
کیا جرم ان زمیں پہ بہاتے نہیں جناب

حسب توقع

اس کے گھر میں بچی ہوئی، حسب توقع
اسے بولی ایک نہ بکھی، حسب توقع
ڈائٹنگ کی کوشش تو اس نے کی ہے لیکن
وزن ہے اس کا تو سو K.G، حسب توقع

مدت سے

بھلا نہیں ہے آج تک وہ منظر وصال
دلہن وہ بن کے سامنے بیٹھی تھی تخت پر
اک گھر میں رہتے رہتے زمانہ گزر گیا
مدت سے ہم نہیں ہیں مگر ایک پیج پر

وہ منظر

جو یہ کھانا تناول کر رہے ہیں
کچھ تو قلفیاں قل کر رہے ہیں
اسی کا یہ جشن دیکھیے تو
بڑے بچے جہاں قل کر رہے ہیں

ہوتی ہیں

کاٹیں جو ان ٹون ہوتی ہیں
خوشی خوشی وہ ان ٹون ہوتی ہیں
قہقہے اونچے اونچے لیکن
باتیں اندر ٹون ہوتی ہیں

لیکن

ہے حسن بھی بے مثل تو سیل فون بھی مہنگا
سہانی جو بناتی ہو تو تیر نہیں کھلتے
میں خوب اسے ذہن کے جاتا ہوں جاناں
لیکن تیری تصویر کے پکسل نہیں چھپتے

OOO

یاد رفتگاں

چند یادیں چند باتیں

پروفیسر قیصر نجفی

انسانی زندگی میں ایسے کچھ واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جن کا ذکر کرنا از بس ضروری ہے۔ میں بھی زندگی میں پیش آنے والے بعض واقعات کے ذکر سے مفر نہیں کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے چند باتیں یا چند واقعات میرے عرصہ حیات کے دوران میں کسی نہ کسی حوالے سے اس نوعیت کے ہیں کہ جن کا ذکر نہ کرنا اپنے ساتھ زیادتی ہوگی۔ میری زندگی کا خمیر ڈیرہ اسماعیل خان (خیبر پختون خواہ) کی خاک سے اٹھا ہے۔ پشاور کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان ایک ایسا خطہ ہے جو علم و ادب کے حوالے سے دوسرا لکھنو کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ سرزمین اور بھی کئی حوالوں سے منفرد ہے۔ البتہ ایک شعبہ زندگی کی رو سے یہ یقیناً تشنگی کا شکار رہی ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان 1549 عیسوی میں معرض وجود میں آیا۔ دراصل اس شہر کے قیام کی تاریخ کے حوالوں کی توجیہ یہ ہے کہ میرے آباؤ اجداد بلوچ سردار ملک سہراب خان کے ساتھ کیچ مکران سے علاقہ دامان میں آئے تھے۔ ملک سہراب خان نے جب اپنے دو بیٹوں کے نام سے دو شہر ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ فتح خان آباد کئے تو میرے اجداد نے ڈیرہ فتح خان میں بود و باش اختیار کر لی۔ پھر جب ڈیرہ فتح خان ایک سیلاب کے نتیجے میں تباہ ہوا تو وہ وہاں سے ڈیرہ اسماعیل خان منتقل ہو گئے اور یہاں پر رہائش اختیار کر لی۔

مقام حیرت یہ ہے کہ صدیوں سے آباد اس شہر میں ملکی سطح پر کسی مشاعرے کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ اتفاقاً 1960 عیسوی میں ایک ممتاز شاعر مرتضیٰ برلاس کا تبادلہ بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر ڈیرہ اسماعیل خان ہوا۔ تو اس وقت کے ڈپٹی کمشنر فخر الزماں صاحب اور مرتضیٰ برلاس کے ایما پر میرے برادرم بزرگوار عطا الحق نازش ایڈووکیٹ کے زیر اہتمام ایک ملکی سطح کے مشاعرے کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں برادرم نازش صاحب نے شعراء کا اہتمام کرنے کے لئے لاہور جانے کا عزم کیا اور مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ یوں مجھے پاکستان کے بڑے بڑے شعراء سے ملنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ برادرم نازش صاحب نے ایک معروف و مقبول شاعر عبدالحمید عدم کو سب سے پہلے دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ ہم جب عدم صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے تو وہاں ایک سوگواری کا عالم دیکھا۔ پتہ چلا کہ ایک روز پہلے عدم صاحب کی ایک نہایت معصوم لاڈلی بچی کا انتقال ہو گیا ہے۔ نازش بھائی نے فوراً دعوت دینے کے بجائے صرف تعزیت کرنے کا ارادہ باندھ لیا۔ دوران گفتگو عدم صاحب نے ہم سے لاہور آنے کی وجہ دریافت کی تو معذرت کے ساتھ مشاعرے کا ذکر تو کیا لیکن انہیں شریک ہونے کی زحمت دینے سے گریز کیا۔ مگر عدم صاحب مشاعرے میں شرکت کرنے پر بضد رہے بلکہ تمام شعراء کے ہاں خود کو ہمراہ رکھنے کا اصرار کیا۔ عین اسی وقت عدم صاحب کے ایک عزیز آ گئے اور انہوں نے قبر کے تعویذ پر شعر لکھنے کی درخواست کی جو عدم صاحب نے ارتجالاً شعر کہہ کر فرمائش پوری کر دی۔

قیامت ہے کہ ننھی سی لحد میں   عدم کی زندگی سوئی ہوئی ہے

اچانک عدم صاحب نے ڈیرہ اسماعیل خان کے اپنے ایک دوست شہزادہ فضل داد خان سدوزئی کا ذکر چھیڑ دیا جن کی بیٹی کا چند دن قبل انتقال ہو چکا تھا۔ عدم صاحب بے حد غمزدہ ہوئے اور اسی عالم میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا میں جو کہہ رہا ہوں لکھو لو ساتھ ہی انہوں نے لڑکی کا نام پوچھا۔ ہم نے بتایا "گلشن نگار شبنم"۔ عدم صاحب نے آنکھیں بند کر لیں اور درج ذیل اشعار فی البدیہہ طور پر کہے:

قدرت کی آنکھ کا تم تھیں نگار شبنم	اشکوں کی اک لڑی ہے بہتی رہے گی پیہم
دنیا کی شے نہیں تھی دنیا سے اٹھ گئی ہے	ایسی حسین شے کا کرتا ہے کون ماتم
کہہ دے یہ کوئی فضل سے اے مرد خوبصورت	تقدیر بھی مسلم تدبیر بھی مسلم
اک نازش کراچی اور اک عدم بیانی	ان کے سوا نہیں ہے کوئی بھی تیرا محرم

مشاعرہ رات کے ۸ بجے شروع ہوا جس میں جوش کے علاوہ پاکستان کے تقریباً تمام شعراء نے شرکت کی اور اپنا کلام پیش کیا۔ مہمانوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی اور جن میں بطور خاص عدم صاحب اور جعفر طاہر کی مہمان داری کا اعزاز مجھے بخشا گیا۔ دوران گفتگو عدم صاحب نے مجھے اپنے چند اشعار سنانے کی فرمائش کر دی میں نے اتنے بڑے شعراء کے سامنے شعر سنانے میں جھجک محسوس کی مگر عدم صاحب اور جعفر طاہر صاحب کی حوصلہ افزائی کی بدولت یہ شعر سنا دیا:

حضور حسن کے طاقت سوال و جواب	ترے کرم نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں

شعر سنتے ہی عدم صاحب اچھل گئے۔ انہیں یہ شعر بہت پسند آیا اور کہنے لگے اس عمر میں تم نے ایک بڑا شعر کہا ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس شعر کو مرکز بنا کر میں بہ طور دادا آپ کی شاعری پر تبصرہ کروں گا۔ میں نے نیشنل بینک میں ملازمت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو بینکنگ کی ملازمت سے ہم آہنگ نہ کر سکا اس لئے چند سال بعد ملازمت سے مستعفی ہو گیا۔ ان دنوں میرے بڑے بھائی الٰہی بخش پرویز لاہور میں قیام پذیر تھے لہٰذا معاش کی جدوجہد کرنے کی خاطر ان کے پاس لاہور چلا گیا۔ لاہور میں قیام کے دوران مجھے پرویز بھائی نے FilmsDelight کے مالک سے متعارف کرایا اور مجھے فلمی دنیا سے بحیثیت رائٹر وابستہ ہونے کا مشورہ دیا۔ ان کے ایماء پر اور بھی کئی ان کے احباب نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے ایک فلم "طوطا چشم" کی کہانی کو از سر نو لکھنے کا موقع ملا۔ میں نے فلمی دنیا سے منسلک ہو جانے کے بعد پہلے ہی سیٹ پر بحیثیت ایک رائٹر اپنی حیثیت مستحکم کر لی۔ طوطا چشم کی کہانی قبل ازیں معروف پنجابی مصنف حزیں قادری لکھ چکے تھے۔ مگر جب اس فلم کے ایک عظیم اداکار بابا علاؤالدین کو ڈائریکٹر نے مکالمے پڑھنے کو دیے تو وہ ششدر رہ گئے کیونکہ وہ میرے لکھے ہوئے مکالموں سے بے حد متاثر ہوئے اور ڈائریکٹر سے کہنے لگے کہ یہ مکالمے حزیں قادری صاحب کے لکھے ہوئے محسوس نہیں ہوتے کیونکہ ان مکالموں کا انداز اور مزاج دیگر مکالمہ نگاروں سے بے حد مختلف ہے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ یہ مکالمے میں نے لکھے ہیں تو انہوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا کہ میاں صاحب زادے میں مستقبل میں تمہیں ایک بڑے فلمی رائٹر کی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں۔ اتفاق سے آغا طالش اور محمد قوی خان بھی سیٹ پر موجود تھے انہوں نے بھی تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے اور ساتھ ہی اپنے اپنے دفتر میں مجھے ملنے کو کہا۔ آغا طالش نے میری ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا کہ اس شوٹنگ کے اختتام کے بعد مجھ سے ضرور ملیے گا۔ جبکہ قوی خان نے دوسرے دن مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

آغا طالش نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اپنے ایک واقعہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ فلمی دنیا نہایت سفاک ہے۔

یہاں Talent کی قدر نہیں کی جاتی ۔ دوست نوازی اور کنبہ پروری کا رجحان بہت زیادہ ہے آپ شروع شروع میں دل برداشتہ ہو گئے مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کا بحیثیت ایک رائٹر مستقبل تابناک ہے آپ نے صرف حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک ایسا ہی مجھ پر وقت آیا کہ میں فلمی دنیا ترک کرنے پر مجبور ہو گیا مگر میری ایک فلم سپر ہٹ ہو گئی اور میرے دفتر میں فلمسازوں کا تانتا بندھ گیا۔ دوسرے روز میں قوی خان سے ان کے گھر پر ملنے چلا گیا۔ وہ شاید میرے انتظار میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی فلمی دنیا میں اپنے آغاز کی کہانی مجھے سنائی اور کہا۔ یہاں آپ کو خوش آمدید کوئی نہیں کہے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی تحریر میں وہ قوت ہے کہ آپ اچھی سے اچھی کہانی لکھ سکتے ہیں۔ آپ کو زحمت دینے کا میں نے اس لیے ارادہ کیا کہ آپ میرے لیے "ہائے میاں دیوانے" کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھیں جسے میں پروڈیوس کروں گا۔ لیکن میرے نصیب میں کاتب تقدیر نے کچھ اور لکھ رکھا تھا۔ کراچی سے تعلق رکھنے والی ایک اداکارہ کو کاسٹ کیا گیا تو اس نے ہماری دعوت قبول نہ کی کیونکہ وہ پنجابی نہیں بول سکتی تھی لیکن ہمارے کردار کے لیے وہ نہایت مناسب تھی اس لیے میں نے اسے پنجابی کے مکالمے یاد کرانے کی ذمہ داری لے لی اور وہ آمادہ ہو گئی۔ ایورنیو سٹوڈیو میں رات کا منظر فلمایا جانا تھا جس میں مذکورہ اداکارہ نے پرفارم کرنا تھا مگر افسوس کہ اداکاری کے دوران ہیرو نے کچھ ایسی بدتمیزی کی کہ اداکارہ سیٹ چھوڑ کر چلی گئی۔ ہر چند میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکی۔ کچھ دنوں کے بعد اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ اس اداکارہ نے فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ جبکہ اس واقعے کے بعد میں نے بھی ایسی دنیا کو چھوڑ دیا جس میں عزت کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔

ایک عجیب و غریب واقعہ قارئین کی نذر ہے جس سے بادی النظر میں شاید کوئی تسلیم نہ کرے لیکن یہ واقعہ ایک ایسی شخصیت کے حوالے سے بیان کر رہا ہوں جن کی صداقت بیانی پر شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسماعیل خان سے جب میں لاہور منتقل ہونے لگا تھا اس وقت دانش صاحب نے مجھے احسان دانش صاحب سے وقتاً فوقتاً ملتے رہنے کی تاکید کی اس خیال سے کہ شاید وہ روزگار کی تلاش میں معاون ثابت ہوں۔ لاہور پہنچنے کے بعد میں نے سب سے پہلے دانش صاحب سے ملاقات کی اور روزگار کے سلسلے میں ان کی معاونت کا خواستگار ہوا۔ دانش صاحب نہایت محبت سے پیش آئے اور روزی کی تلاش میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ انہوں نے ہی مجھے نواب مصطفی خان شیفتہ پر ڈاکٹریٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ اور ایک الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ ساری کتابیں PhD کے حوالے سے آپ کے لیے خاصی مددگار ثابت ہوں گی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ دانش صاحب کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ میاں آج ہم ایک خاص دعوت میں شریک ہونے کے لیے جا رہے ہیں ان شاء اللہ کل آپ سے تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ دوسرے روز جب میں ان سے ملا تو انہوں نے ایک واقعہ سنا کر نہایت حیرت و استعجاب کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ کہنے لگے کہ کل ہم ایک ایسی محفل میں شریک ہوئے جو آپ کے لیے ناقابل یقین ہو سکتی ہے مگر ہم اس کے عینی شاہد ہیں۔ دراصل کل محفل میں ایک صاحب نے جنگ عظیم میں مرنے والے ایک فوجی کی روح کو حاضر کیا اور اس سے سوال کیا کہ اس کی موت کا سبب کیا تھا۔ روح نے آواز دی کہ میں زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے طبعی موت مرا تھا۔ اس موقع پر وہ تمام بیگمات جو وہاں موجود تھیں خوفزدہ ہو گئیں اور مرنے والے کے لواحقین تو دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ نتیجے کے طور پر عامل نے روح کو بلانے کا سلسلہ روک دیا۔

◆◆◆

شوکت علی۔ایک آواز جو خاموش ہوگئی

علی رضا

صوفیانہ کلام اور غزل کو سوز اور گداز کے دلفریب سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے والے شوکت علی بھی رفتگاں کا حصہ بن گئے۔ فطرت کی خوبصورتیوں سے بچے شوکت علی نے تمام عمر اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھی۔ ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنے والے اس عظیم فنکار کی فنی زندگی کامیابیوں سے عبارت رہی جو کلام ان کے ہونٹوں کی زینت بنا اسے عوامی پذیرائی نے چار چاند لگا دیے انھوں نے غزل گائی تو لاجواب عارفانہ کلام ادا کیا تو بے مثال۔

کچھ برس پہلے کی بات ہے روزنامہ خبریں لاہور کے تحت ایک محفل نعت کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں میری بھی حاضری ہوئی میرے علاوہ اس پروگرام میں شوکت علی اور معروف نعت خواں محمد رفیق ضیا بھی موجود تھے میں نے اس محفل میں اپنی ایک مشہور نعت مفلس زندگی اب نہ سمجھے کوئی مجھ کو عشق نبی اس قدر مل گیا پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جسے بہت سراہا گیا اتفاق سے میرے فوراً بعد شوکت علی کو نذرانہ عقیدت اور عارفانہ کلام پیش کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے میں سوچ رہا ہوں کہ اب علی رضا کے بعد کیا پڑھوں اتنے بڑے فنکار اور اعلیٰ انسان کا یہ اظہار محبت جہاں میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے وہاں ان کی اعلیٰ ظرفی اور بڑے پن کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے ۔۔۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے
میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت ۔۔۔ جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کر دے

ان کی علالت کے دنوں میں فیس بک پر شوکت علی کی آواز میں افتخار عارف کی لکھی مذکورہ بالا غزل کا کلپ دیکھا اور سن کر ان کا دور یاد آ گیا جب وہ اپنی بارعب اور گرجدار آواز سے ہر جگہ کمال سماں باندھ دیتے تھے اس عظیم فنکار نے پاکستان ٹیلی ویژن سمیت دنیا بھر میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور پاکستان کا نام روشن کیا۔ دوسروں کو عزت اور احترام دینے والا ان جیسا اخلاص کار اور وضع داری نبھانے والا شخص مجھے کم کم ہی کہیں نظر آیا وہ گانے کے دوران ہمیشہ جذب و کیف اور وارفتگی کی کیفیات کو ساتھ لے کر چلتے۔

شوکت علی ایک درویش منش قلندر صفت انسان تھا وہ لاہور کا بے مثل فنکار تھا جس نے ظاہری مال و دولت کی بجائے عوام سے محبتیں کمائیں اور ان کے دلوں میں گھر کرنے کی رمز سے آشنا ہوئے۔ شوکت علی وہ خوش فطرت انسان تھے جن کے ہاں مجھے کہیں بھی تصنع اور بناوٹ نظر نہیں آئی مزاج کا دھیما پن اور نہایت سادہ انداز ان کی شخصیت کی پہچان بنا انسانوں سے محبت اور پیار سے پیش آنے کا عمل اللہ رب العزت کو بہت پسند ہے اللہ پاک کے اس پسندیدہ عمل کو شوکت علی نے مکمل زندگی میں خوب نبھایا اور انسانوں میں آسانیوں کے ساتھ ساتھ محبتیں بانٹنے کا سلسلہ جاری و ساری رکھا۔ شوکت علی ایک زندہ دل اور مٹے ہوئے ایک درویش مزاج آدمی تھے عجز و انکساری کی جیتی

خوبیاں ان کے صاحبزادوں میں پائی جاتی ہیں دنیا بھر میں اپنے فن کے ذریعے پاکستان کی نیک نامی میں اضافہ کرنے والے شوکت علی وہ عظیم فنکار تھے جنہوں نے دولت اکٹھی کرنے کے لیے نہیں گایا بلکہ عزت و وقار کے حصول کے لئے گایا یہی سبب ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے چاہنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بنے رہے انھوں نے ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج کے لیے بے پناہ گایا ان کی آواز میں اپنا سوز اور درد تھا کہ سننے والوں کی آنکھیں بے ساختہ چھلک پڑتی تھیں۔

کیوں دور دور رہندے او حضور میرے کولوں   مینوں دس دیو ہویا کی قصور میرے کولوں

بہت سارے لوگ شوکت علی کو ایک معروف گلوکار کے طور پر جانتے تھے حالانکہ وہ ایک بہت عمدہ پنجابی شاعر کے طور پر تخلیقی صلاحیتوں سے بھی مالا مال رہے کئی سال پہلے انھوں نے مجھے اپنا خوبصورت شعری مجموعہ گوراں بھی اپنے دستخط کے ساتھ عنایت کیا تھا اس مجموعہ کلام میں عہد ساز ادیب اور دانشور احمد ندیم قاسمی سمیت بڑی بڑی دو آوردہ ادبی شخصیات نے ان کے فن شعر پر بات کی ہے اور ان کی اس صلاحیت کو سراہا ہے۔ تمام عمر میدان علم و فن کی اپنے خون جگر سے آبیاری کرنے والا یہ باہنر شوکر، عارضہ قلب اور دیگر امراض میں مبتلا رہنے کے بعد 2 اپریل 2020ء کو اس جہان فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے اور ہمارے لئے ورثے میں اپنی اولاد کے روپ میں اپنے قابل فخر بیٹے امیر شوکت علی اور محسن شوکت علی چھوڑ گئے جو باپ کے نام کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ ایسی اولاد سب کو نصیب فرمائے۔ عالمی سطح پر اپنے فن کے ذریعے وطن عزیز کی نیک نامی کا باعث بننے والے اس خوش فطرت فنکار کے درجات کی بلندی کے لئے میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہوں۔

◆◆◆

مختصر تعارف

شوکت علی۔ ایک گلوکار ایک شاعر

شوکت علی 3 مئی 1944ء کو بھاٹی گیٹ لاہور میں پیدا ہوئے۔ 1963ء میں فلم "ماں کے آنسو" سے کیریئر کا آغاز کیا۔ عنایت علی خان بڑے بھائی تھے اور شوکت علی صاحب ان کو استاد سمجھتے تھے۔ شوکت علی نے اپنے کیریئر میں تقریباً دس سے بارہ ہزار سے زیادہ گیت ریکارڈ کروائے جو ایک ریکارڈ ہے۔ صوفیانہ کلام زیادہ گانا پسند کرتے تھے۔ انھیں 1976ء میں Voice of Punjab کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ قومی ترانوں کی وجہ سے ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ 1965 اور 1970 کی جنگوں میں ان کے گائے گیت زبان عام میں مقبول ہو گئے۔ 2017ء میں کینیڈا کی ایک کمپنی نے ایک گھنٹے کی ڈاکومنٹری فلم شوکت علی پر بنائی جسے عوام میں بہت پذیرائی ملی۔ 1981ء میں پہلا PTV ایوارڈ شو ہوا جس میں شوکت علی صاحب کو بیسٹ سنگر کا ایوارڈ ملا۔ 1990ء میں انھیں Pride of Performance ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 60 سال اپنی آواز کا جادو جگانے کے بعد 2 اپریل 2021ء کو جہان فانی سے کوچ کر گئے اور مسانی قبرستان جوہر ٹاؤن میں مدفون ہیں۔

(ادارہ تخلیق)

ڈر تھا تیری جدائی کا...... بشریٰ رحمٰن

سونان اظہر جاوید

حضرت علیؓ ابن ابی طالب کا فرمان ہے!

"لوگوں سے اس طرح ملو کہ اگر تم دنیا سے چلے جاؤ تو تم پر روئیں اور زندہ رہو تو تمہارے مشتاق رہیں!"

اس دنیائے فانی سے ایک روز ہم سب نے جانا ہے۔ وہ ایسی ہی تو عزیز از جاں ہر دل عزیز تھیں۔ دوستوں کے دلوں کی دھڑکن تھیں مرضِ دل کے باعث اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ میرے لیے ایک ساتھ دو دکھوں کا مداوا کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک تو یہ کہ بشریٰ رحمٰن سے شناسائی بہت دیر میں ہوئی اور دوسرا یہ کہ ان سے جدائی بہت جلد ہو گئی۔

بشریٰ رحمٰن نے بڑی بہترین زندگی گزاری اور بڑی پرسکون اس دنیا سے رخصت بھی ہو گئیں یہ خوش نصیبی ہم میں سے کتنوں کی قسمت میں ہے؟ ان کی موت نے مجھے سب سے بڑا دکھ یہ دیا کہ ان کے ہاتھوں کا لکھا جو پیام اور محبت سے بھرپور مراسلہ ڈاک سے آتا تو میں خط کا لفافہ دیکھتے ہی جان لیتا کہ یہ خوش خط میری ماں بشریٰ رحمٰن کا ہے۔ ان کی محبت ان کی اپنائیت کی خوشبو مجھے خط کا لفافہ چاک کرنے سے پہلے ہی محسوس ہو جاتی تھی۔ اب یہ سلسلہ معطل ہو جائے گا! میں ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں سب سے بڑا اور مضبوط رشتہ احساس کا ہے خون کے رشتے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں مگر احساس کا رشتہ آپ کو کبھی تنہا نہیں ہونے دیتا۔ بشریٰ رحمٰن سے میرا ایسا ہی رشتہ تھا جس میں رشتہ خون کا نہ تھا مگر محبت، قدر اور احساس ماں اور بیٹے کے رشتے جیسا ہی تھا۔ یوں تو پچھلے کچھ سالوں میں کووڈ 19 کی وجہ سے نظامِ زندگی درہم برہم ہو گیا ہے۔ دوستوں سے میل ملاقات اور ادبی محافل کا سلسلہ معطل رہا مگر سوشل میڈیا اور ٹیلی فون رابطے کا ذریعہ بنے رہے لیکن میں جب بھی لاہور ہوتا تو ان کے یہاں چلا جاتا ہمیشہ کھلی بانہوں اور کھلے دل سے استقبال کرتیں۔

میں یہاں برملا کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر انور سدید اور بشریٰ رحمٰن وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے مجھے ہمیشہ محبت دی اور ہمیشہ اپنی شفقت کا ہاتھ میرے سر پر رکھا میری ادبی پرورش بھی کی اور مجھے اجازت دی کہ میں اپنے دل کی ہر بات ان سے کر سکتا ہوں۔ بشریٰ رحمٰن کے یہاں اگر کوئی جاتا تو وہ اسے اپنے ذاتی کمرہ میں نہیں بلاتی تھیں۔ خرابی صحت کے باوجود سب سے مہمان خانے میں ہی ملتی تھیں۔ لیکن میں جب بھی گیا مجھے اپنے کمرے میں بلا لیتیں اور پھر ہم ماں بیٹا خوب باتیں کرتے۔ کبھی کہتیں میرے بچوں نے محبت سے مجھے جکڑ لیا ہے کووڈ کے دنوں میں سختی سے کہیں آنے جانے سے منع کیا ہوا ہے۔ میں باہر نہیں جا سکتی۔ ان کے دل کی کیفیت میں خوب سمجھ سکتا تھا وہ محافل کی رونق اپنی ذات کی انجمن میں کتنی تنہا تھی کوئی نہ جان سکا۔ جس بچی نے 12 سال کی عمر میں گڑیوں کو چھوڑ کر قلم تھاما ہو، کتاب کے اوراق کی خوشبو کو عطر کی خوشبو سمجھ کر سینے سے لگایا ہو۔ 40 سے زائد کتب اور 24 سے زیادہ ممالک کی ثقافت کو قریب سے دیکھا ہو اس پر عمر کے آخری تنہائی میں دیکھ کر میرا دل بھی قابو میں نہ رہتا۔ میں پلٹ کر ہر بار یہی کہتا آنٹی! ان شاء اللہ آپ جلد صحت یاب ہو کر ادبی حلقوں میں واپس لوٹ آئیں گی۔ دل کی باتوں کو دل میں رکھنے پر انہیں کمال حاصل تھا۔ بہت سے دکھ پی جاتیں خوشگوار موڈ کو قائم رکھتیں۔ ہم ڈھیروں باتیں کرتے وہ مجھ سے اخلاقی قدروں کے ارزاں ہونے کی بات کرتیں تو کبھی سیاسی بیوپاریوں کی داستانیں، ادبی دوستوں کی ریاکاریوں کا کچا چٹھا کھولتیں

اور کبھی ادبی تخلیہ داروں کی گروہ بندیوں کی باتیں سناتیں۔ ان کے الفاظ ان کا انداز اس قدر مسحور کن ہوتا کہ پہروں انھیں سنتے رہو اور لطف لیتے رہو۔ ایسا ادب کی چاشنی میں ڈوبا لہجہ آج تک کسی اور کا نہ سنا ہے اور اب تو اس ملفوف بہار رس کا لہجہ بھی نہ سن پاؤں گا۔ ان کی حس لطافت بھی کمال تھی۔ مجال ہے کہ کوئی ان پر جملہ کسے اور جوابی کارروائی سے بچ جائے ایسا عمدہ انداز کہ محفل کشت زعفران ہو جائے۔ وہ ادبی دنیا میں خواتین کی سردار تھیں۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ دسمبر 2021ء کا شمارہ انھیں پوسٹ کیا تو حسب روایت جب ان کی تصدیقی کال موصول نہ ہوئی تو انھیں فون ملایا بولیں "بیٹا بیمار ہوں طبیعت ٹھیک نہیں۔" میں فوراً ان کے گھر حاضر ہوا بڑی شفقت سے اپنے پاس بلایا۔ میرے آگے فرائڈ فش رکھ کر حکم صادر کیا کہ حسن لایا ہے میرے لیے لیکن تم اسے کھاؤ ان کے حکم کو ٹال نہ سکا اور اس ان کے احترام میں کھانا شروع کر دیا۔ پھر بڑے فخر سے اپنے کمرے سے ملحقہ سٹڈی روم میں لے گئیں، کہا دیکھو سونان! میرے بچوں نے کتنا پیارا سٹڈی روم میرے لیے ترتیب دیا ہے۔ میں نے شرارتاً کہا آپ سٹڈی ٹیبل پر بیٹھی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ میں یہ لمحہ قید کرنا چاہتا ہوں۔ ہنس کر کہنے لگیں میرا حلیہ دیکھو لیکن تمھاری محبت میں انکار بھی نہیں کر سکتی۔ میں وہ لمحہ اپنے موبائل کیمرہ کی آنکھ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔

میں نے پھر شرارت کے سے انداز میں کہا آپ اپنا خیال تو کرتیں نہیں، خوراک کا دھیان رکھیں۔ کہنے لگیں سونان جسم پر لگی چوٹ تو نظر آ جاتی ہے دل پر لگی چوٹ کسی کو نظر نہیں آتی۔ اور تو زیادہ استاد نہ بن۔ ان کا یہ جملہ ہمیشہ میری سماعتوں میں رہے گا۔ "تو زیادہ چالاکیاں نہ لگایا کر میرے ساتھ" میرے بیٹے میرا بہت خیال رکھتے ہیں مجھے بستر سے پاؤں زمین پر نہیں رکھنے دیتے۔ کتنی خوش قسمت ہے ان کی اولاد جو ماں کی سانسوں میں بسی ہوئی ہے۔ لیکن ان کے اس جملے نے پریشان کر دیا کہ سونان اس دفعہ کے بخار کی سمجھ نہیں آ رہی تمام ٹیسٹ کلیئر ہیں۔ لیکن بخار ہے کہ اترتا ہی نہیں۔ میں تسلیاں ہی دے سکتا تھا دیتا رہا اور نکلتے ہوئے انھیں دعوت بھی دے دی کہ جنوری 2022ء میں میں اپنے نئے گھر شفٹ ہوا تو آپ کو آنا ہوگا۔ کہنے لگیں میرا وعدہ ہے میں کیوں نہیں آؤں گی اپنے بیٹے اور اپنی بیٹی سعدیہ کے گھر۔ پھر کہنے لگیں سونان تخلیق کی ادبی برادری کو زندہ رکھنا تمھارا کارنامہ نہیں ہے یہ اظہر جاوید کا حسن عمل ہے جو وہ تمھارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ جس کی روشنی میں تم چل رہے ہو ان کے نام پر صرف دوست آ جاتے تھے اب تمھارے نام پر سب لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ جو مجلسیں تم تشکیل کر رہے ہو یہ روایت ان شاء اللہ تمھاری آنے والی نسلوں تک چلے گی تم سمندر بن چکے ہو جس کے کنارے پر سیر کرنے والے لوگ اپنی ہر فالتو اور ناپسندیدہ چیز اس کے اندر پھینکتے جاتے ہیں مگر سمندر کو کیا فرق پڑتا ہے وہ اپنی پوری آب و تاب سے بہتا رہتا ہے۔ اس کا ثبوت تمھاری تخلیق ایوارڈ کی تمام تقریبات ہیں جو تم ہر سال منعقد کرتے ہو میں ایک عرصے سے ادبی تقریبات میں جا رہی ہوں لیکن اتنی بھرپور تقریبات صرف "تخلیق" کے پلیٹ فارم پر دیکھی ہیں۔ اور تم نے مجھے "تخلیق ایوارڈ" دے کر پاکستان کی سب سے بڑی ادیب بنا دیا ہے۔ میں عقیدت سے فوراً ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مجھے وہ لمحہ یاد آیا جب کسی تقریب میں احمد ندیم قاسمی نے اظہر جاوید کو کہا کہ آپ میرے ہم منصب اور ہم پلہ ادیب ہیں تو اظہر جاوید ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور بھری محفل میں قاسمی صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا دیا۔

اتنی طویل نشست کے بعد میں ان سے اجازت لی اور پھر دنیا کی رونق میں گم ہو گیا۔ جنوری میں گھر شفٹ کرنے کے بعد تھوڑا سکون ملا تو فون پر رابطہ کیا اور ان کا وعدہ یاد دلایا۔ کہنے لگیں طبیعت کا حال خراب ہے بخار جان ہی نہیں چھوڑ رہا۔ جنوری کے دوسرے ہفتے تک تو بارشیں متوقع ہیں اس کے بعد آؤں گی پھر ہم سب مل کر بہت خوشی منائیں گے۔ میں ضرور آؤں گی اپنے بیٹے کے نئے گھر۔

پھر جنوری کے آخری ہفتے میں رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ تو کووڈ کا شکار ہو چکی ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں۔ یہ کیسا مرض ہے خدایا! ایسے پیارا تکلیف میں ہو اور اس کے پاس بھی نہ جا سکیں۔ فون پر ان کے گھر والوں سے مسلسل رابطے کی کوشش میں رہا دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا۔ پھر خود کو یہ سوچ کر تسلی دیتا کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا میرے گھر آنے کا اور وہ تو وعدے نبھانے والی خاتون ہیں۔ مسلسل ان کے سیل فون پر فون کرتا رہا مگر جواب نہ ملا۔ ایک دن ان کا فون ان کے بیٹے حسن نے اٹھایا پتہ چلا کہ ان کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ ان کو دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ دھیان ہر وقت ان کی طرف رہنے لگا یہ سوچتا کہ میں سمجھ نہ سکا کہ ان کی اور میری آخری ملاقات اصل میں آخری ہی تھی تبھی تو انھوں نے خلاف معمول بہت سی باتیں کیں تھیں میرے بار بار کہنے کے باوجود کہ آنٹی آپ تھک جائیں گی آرام کریں لیکن وہ بہت کچھ کہتی رہیں دل کی بہت سی باتیں اپنے بچپن کی اپنے بچوں کی کاش میں سمجھ جاتا! آخر وہ قیامت جس کا خدشہ تھا آ گئی 7 فروری 2022ء کو حسب معمول دیر سے اٹھا بیڈ پر لیٹے لیٹے فون پکڑا تو پتہ چلا بشریٰ رحمٰن میری ماں، میری ہمدرد، میری استاد اور میری دوست اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ 4 بجے بعد نماز عصر ان کا جنازہ ہے۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سعدیہ نے پوچھا کیا ہوا جب اسے اس لرزہ خیز خبر کا پتہ چلا وہ بھی سکتے میں آ گئی کہنے لگی ہو سکتا ہے یہ غلط ہو اور اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ سوشل میڈیا پر یہ خبر گردش کرنے لگی اور لوگ ان کے ساتھ اپنی تصویریں اپ لوڈ کرنے لگے۔ ان کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی غرض سے ہر انسان بڑھ چڑھ کر بات کرنے لگا۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں کرسی پر گر گیا تھا۔ علی بخاری صاحب کی پوسٹ پر یقین نہ آیا تو چند لمحوں بعد عرفان اطہر نے پوسٹ لگا دی فوراً انھیں فون کیا اور خبر کی تصدیق چاہی اور پوچھا آپ کو کس نے اطلاع دی کہنے لگے علی بخاری صاحب نے فیس بک پر پوسٹ ڈالی تو میں نے بھی ڈال دی۔ میں نے فوراً بخاری صاحب کو فون کیا تو انھوں نے تصدیق کی کہ حسن نے مجھے میسج کیا تھا۔ اب اس خبر کے جھوٹی ہونے کی آخری آس آخری امید بھی دم توڑ گئی آ وہ سچ تھا میں فوراً اٹھا وضو کیا اور اپنی ماں، دختر پاکستان، بلبل پاکستان، ستارہ امتیاز، ''تخلیق ایوارڈ یافتہ'' 2017ء، ایڈیٹر وطن دوست، تین بار صوبائی اسمبلی اور ایک بار قومی اسمبلی کی ممبر، بہترین پارلیمنٹیرین، گولڈ میڈلسٹ، عندلیب پاکستان، ساحر لدھیانوی ایوارڈ یافتہ، بے شمار سیریل ڈراموں کی مصنفہ، لیجنڈ افسانہ نگار، بے شمار سماجی، ثقافتی اور معاشی بہبود کے کاموں کی رکن کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں کبھی کسی کے جنازے میں اتنی جلدی نہیں گیا نہ اتنی دیر تک رکا ہوں۔ ان کے گھر گارڈن ٹاؤن پہنچا تو ٹی وی چینل اور رپورٹرز کی لمبی قطار تھی ایک ہجوم تھا جو امڈ آیا تھا۔ پہلا قدم وطن دوست میں رکھا تو ماضی کی بہت سی یادیں ایک فلم کی صورت آنکھوں کے آگے چلنے لگیں اور دامن دل سے لپٹ لپٹ جا رہی تھیں۔

آنسو دل پر گرنے لگے آہیں ایک طوفان کی مانند جسم میں گردش کرنے لگیں ایسا لگ رہا تھا دل بند ہو جائے گا میرا! یہ دکھ تو ناقابل برداشت ہے۔ میں کیسے اندر جاؤں جہاں میری ماں سفید چادر میں لپٹی بے جان پڑی تھی۔ وہ ماں جو کھلی باہوں سے میرا استقبال کرتی تھی آج تو میں اس کے گلے بھی نہ لگ سکوں گا۔ اندر نہ جا سکا کیوں کہ ڈرائنگ روم میں صرف خواتین ہی بیٹھیں تھیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں آخری دیدار کر سکوں گا! میں ان مٹی کے چہرے کو دیکھنے کے لئے اس لئے بھی بے تاب تھا کہ اس بچھڑنے والے چہرے کو اس دائمی جدائی کے لمحے کو ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھوں میں منتقل کر لوں۔ ان سوچوں میں گم باہر لان میں بیٹھے مردوں پر نظر ڈالی تو شناسا سا ادبی چہروں میں سے سوائے چند ایک کے کوئی چہرہ نظر نہ آیا وہ جو زندگی میں ان کے دم بھرنے کا دعویٰ کرتے

تھے آج ان کی آخری رسومات میں بھی نہ آئے جو موجود تھے وہ اس انتظار میں تھے کہ کب نماز جنازہ ادا کی جائے اور کب وہ اپنے گھروں کو روانہ ہوں۔ یہی وہ تلخ حقیقت تھی جسے بشریٰ رحمن بھی جانتی تھیں۔

کون ہوتا ہے بُرے وقت کی حالت کا شریک مرتے دم آنکھوں کو بھی دیکھا ہے کہ پھر جاتی ہیں

میں سوچوں میں گم تھا ماں! آپ نے تو کبھی میرے ساتھ وعدہ خلافی نہ کی تھی اتنا بڑا دھوکا اور ایسا سرپرائز؟ اتنی کوڑی بھی چپ کیا آپ کو خبر نہیں کتنے دلوں میں آج کہرام برپا ہے؟ آپ کی جدائی کتنے دل اداس کر گئی ہے؟ مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا اے خدا کاش یہ خواب ہو۔ سوچوں کے اس بھنور کو اللہ اکبر کی صدا نے توڑا۔ بشریٰ رحمن اپنے دنیاوی گھر سے اپنے دائمی گھر کی طرف کا عزم تھیں فوراً اٹھا اور اپنی ماں کی میت کو سہارا دیا اور بوجھل قدموں سے جنازہ گاہ کی طرف چلنے لگا سامنے گارڈن ٹاؤن کے پارک میں نماز جنازہ کا اہتمام ہوا اور تنگ لوگوں کا ہجوم تھا۔ نماز جنازہ کی پہلی صف میں ان کے چاروں بیٹوں کے ساتھ کھڑا میں یہ فخر محسوس کر رہا تھا کہ ماں نے مجھے اپنا پانچواں بیٹا تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ مجھے وہ حق بھی دلوایا۔ نماز جنازہ کے بعد میت کو ایمبولینس میں قبرستان کی طرف لے جایا گیا تو ان کا پانچواں بیٹا ایمبولینس میں بھی ان کے ساتھ رہا۔ سب سے پہلے قبرستان پہنچنے والوں میں ایمبولینس ڈرائیور، اس کا ہیلپر اور تیسرا شخص میں تھا۔ بار بار دل چاہا کفن ہٹا کر اپنی ماں کے چہرے کا دیدار کروں میت کا اکیلا پن میرے دل میں درد کی طرح سما رہا تھا ابھی تک کوئی بھی قبرستان نہ پہنچا تھا۔ میں اس چہرے کو مٹی کے سپرد کرنے کی ہمت نہ پا رہا تھا اور دیکھنے بن پڑی تو انہیں سپرد خاک کرنے سے پہلے ان کے دونوں پاؤں کو پکڑ کر خوب رویا۔ سب سے پہلے میں قبر میں اترا اور قبر کے اندر سے چھوٹے چھوٹے کنکر بھی چننے لگا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابھی کچھ ہی لمحوں میں اپنے ہاتھوں سے اپنی ماں کو لحد میں اتاروں گا اور منوں مٹی تلے دفن کر دوں گا۔ ان کے بیٹوں کے ساتھ مل کر ان کو ان کی آخری قیام گاہ میں منتقل کیا۔ ان کی قبر پھولوں کی چادر سے ڈھک دی گئی۔ دنیا میں یہ کام کیوں اتنی جلدی ہونے لگتے ہیں؟ مثلاً فوتیدگی کے بعد تجہیز و تکفین، انسان کا اچانک سب سے جدا ہو جانا؟

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

بہت سے ادبی دوستوں نے ان سے عقیدت اور محبت کے اظہار کے طور پر ٹیلی فون پر مجھ سے افسوس کیا۔ انسان کو زندگی کس قدر عزیز ہے جب کہ اگلے لمحے کی خبر نہیں بہت سے دوست احباب نے جنازے میں اس وجہ سے شرکت نہ کی کہ بشریٰ رحمن کو کرونا تھا۔ کہیں یہ لوگ بھی اس کا شکار نہ ہو جائیں۔ کیا خبر کہ سات پردوں میں رہ کر بھی یہ بیماری اگر مقدر میں ہے تو کوئی نہ بچا سکے گا تم سوچ اپنی اپنی ادبی دوست لوگ جو ان کی راہ میں پھول نچھاور کرتے تھے ان کی قبر پر پھول نچھاور کرنے سے ڈر رہے تھے۔ ابھی اس دنیا کے رویوں کو سوچ رہا تھا کہ خیال آیا کہ کل قل والے دن تو سب ادبی دوست جوق در جوق آئیں گے کیونکہ وہ مدفون ہو گئیں مگر جانے سے پہلے صرف ایک آواز، ایک سہارا میسر آیا۔ بشریٰ اعجاز صاحبہ کا فون آیا۔ سوال میں نے بہت سی ادبی خواتین کو فون کیا ہے مگر سب نے اپنی اپنی ذاتی مصروفیات کا بہانہ کیا۔ مجھے بھی بشریٰ رحمن کی قل خوانی پر لئے جانا۔ خواتین مردوں کے ہجوم غفیر میں آج بھی صرف تین سے چار ادبی لوگ تھے۔ یہ ہے وہ کڑوا سچ جس کو میری ماں بہت پہلے جان گئی تھیں۔ وہ مجھے ہمیشہ سمجھاتی کہ یہ سب آنکھوں کا دھوکہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کون کون میرے ساتھ ہے۔ قل خوانی کے لیے میں اور سعدیہ جب ان کی یادوں کو دلوں میں بسائے ان کے گھر پہنچے تو یہ دیکھ کر دل خون کے آنسو رویا کہ آج بھی کوئی ادبی دنیا کا چہرہ وہاں موجود نہ تھا۔ ان کے رشتے داروں کے علاوہ دیگر شعبوں سے وابستہ لوگوں کی کثیر تعداد وہاں موجود تھی اور وہ کہ جس نے ادب کی آبیاری میں ساری عمر گزار دی ان کے ادبی حلقے کے لوگ ہی وہاں موجود ہی نہ تھے۔ ادب تو محبت سکھاتا ہے اور ہم کتنے بے حس

ہو گئے ہیں اور خود کو ہم ادب شناس کہتے ہیں۔ ہم زندہ ادیب کی تو پوجا کرتے ہیں اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے دنوں اس کے گھر کے چکر بھی لگا لیتے ہیں ٹیلی فون پر رابطے میں رہتے ہیں لیکن اس کے دنیا سے جانے پر اس کی آخری رسومات میں شریک ہونا مشکل لگتا ہے۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

بشریٰ رحمٰن امین دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کی دائمی و ابدی زندگی کو خوشگوار بنائے آپ کے درجات بلند ہوں۔ آپ کی محبت میں مرتے دم تک دل میں قائم رکھوں گا لیکن یہ فروری جو محبتوں سے منسوب ہے کیسے صدمے دے گیا۔ 7 فروری بشریٰ رحمٰن 14 فروری اظہر جاوید میں کیسے کہوں کہ فروری محبتوں کا مہینہ ہے یہ تو میرے لیے قیامت کا مہینہ ہے دکھوں کا مہینہ۔ دل اور آنکھیں اس دنیا کے رویے سے بوجھل ہیں۔ خود پسندی کے جراثیم یوں تو ہر انسان کے خون میں ہیں۔ روزِ اول سے ——— ہیں لیکن ہم اہلِ قلم یہاں بھی خود پسندی میں سب مکتبہ فکر کے لوگوں پر سبقت لے گئے۔ میں ہر جمعہ آپ کی زیارت کے لیے آتا ہوں آپ روزِ قیامت گواہ رہنا۔ ماں اب تو سب پھول بھی مرجھا گئے ہیں پہلے تو ایسے دن تھے ماں کے کسی کو دفن چھوڑنے جاتے تو آنکھیں نم ہو جاتی تھیں مگر اب تو قبرستان میں بھی قہقہے گونجتے ہیں۔ میری باقاعدہ حاضری سے آج قبرستان کا گورکن میرے پاس آیا۔ آپ کی یہ عزیز ہیں کون سا رشتہ ہے آپ کا ان کے ساتھ؟ میں نے کہا میری ماں ہے۔ گورکن نے کہا بہت اچھی تھی باجی۔ ہمیشہ کہتی مجھے میرے شوہر کے قدموں میں مدفون کرنا اور پیچھے جو میاں صاحب کی قبر کے سامنے ہے باجی نے بنوایا یہاں بیٹھ کر وہ اپنے شوہر کے لئے گھنٹوں پڑھائی کرتیں اور مجھے خصوصی طور پہ کہا میری بہن شمع ابھرو کے قبرستان میں مدفون ہے اس کی قبر کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ ایک دن باجی مجھے گاڑی میں اٹھا کر بہن کی قبر پہ لے گئیں اور ہم نے اس کو مکمل ٹھیک کیا۔ پھر ہر ماہ باقاعدگی سے راشن اور کپڑے بھجواتیں بلکہ جب میاں صاحب فوت ہوئے تو مجھے ایک کتبے پر لکھائی کے لئے شاعری دی جو میں لکھوا کے لایا!

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
عشق کو محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

(دعا گو: زبیدہ میاں رحمٰن)

یہ پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو چھلک گئے اور میں نے دل میں وہی عہد کیا کہ جب تک میری سانسیں بحال ہیں۔ میں اظہر جاوید، ڈاکٹر انور سدید اور آپ کی یادوں کا چراغ اپنے خونِ جگر سے جلاتا رہوں گا۔ کبھی بھی آپ کی یادوں سے اس ادبی دنیا کو غافل نہیں ہونے دوں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ تمام کی مغفرت کرے۔ آمین!

◆◆◆

مجھے ایک "شریف عورت" سے نفرت ہے جو چار دیواری کے اندر بیٹھ کر ظلم پالتی ہے۔ بظاہر کسی شریف آدمی کی بیوی ہوتی ہے مگر شرافت اس کے سامنے شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔ اس سے تو ہزار درجے بہتر وہ عورت ہے جو کھلا بیوپار کرتی ہے جو کھلم کھلا کہتی ہے کہ میں ہرجائی ہوں۔ جو کھلم کھلا اداکاری کرتی ہے، لڑتی ہے، دونوں ہاتھوں سے برباد کرتی ہے مگر نہیں کہتی کہ میں شریف عورت ہوں۔ اپنے ماتھے پر جیسا لکھا ہوتا ہے کیونکہ وہ جیسی ہوتی ہے۔ سات پردوں میں چھپا کر نہیں رکھتی۔ (بشریٰ رحمٰن)

جائزے

ماہنامہ ''تخلیق'' کا شمارہ مارچ 2023ء

(1969ء سے باقاعدہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ)

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور اس وقت برِعظیم پاک و ہند کا مقبول ترین ادبی جریدہ ہے۔ 53 سال سے باقاعدہ ادبی افق پر نظر آنے والے اس ادبی جریدہ کو اس کے بانی مدیر اظہر جاوید نے خونِ جگر کی نمو عطا کی۔ اظہر جاوید چوں کہ ہمہ صفت انسان تھے اس لیے اس جریدہ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اظہر جاوید نے صحافت، شاعری، نثر، اور تنقید میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ کہانی، افسانہ، کالم، تبصرہ اور شعر و سخن میں انھوں نے مسلسل ریاضت جاری رکھی۔ حق دوستی ادا کرنا ان پر فرض کی طرح ضروری تھا۔ نامساعد مالی حالات کے باوجود پرچے کو باقاعدگی سے جاری رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ 1969ء سے 2012ء تک ''تخلیق'' کی اپنے بچوں کی طرح پرورش کرتے رہے۔ 14 فروری 2012ء کو اظہر جاوید راہی ملک عدم ہو گئے۔ ان کے فرزند سونان اظہر جاوید نے جواں جذبوں سے ماہنامہ ''تخلیق'' کو حیات نو بخشی۔ تخلیق کے کئی خاص شمارے اور خاص گوشہ جات اس ادبی جریدہ کی پہچان ہے۔ مارچ 2023ء کا ماہنامہ ''تخلیق'' 11ویں تخلیق ایوارڈ کی سرگرمیوں کے علاوہ ادبی خصوصی تحریروں کا آئینہ دار ہے۔ سونان اظہر نے ''پہلی بات'' میں ایک فکر انگیز معاشرتی مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

> ''افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی ایسی حرکتیں ٹاپ ٹرینڈ بن جاتے ہیں۔ ہم کس قسم کی نسل کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ہمارا میڈیا بھی صرف TPR کے چکر میں ان کرداروں کو بار بار ہیرو بنا کر پیش کر کے کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟ کیا یہ چیز بھی حقیقت کے قریب نہیں کہ ان ٹک ٹاک کرنے والیوں اور لڑکوں نے بند کمروں سے نکل کر سرعام مجرے شروع کر دیے ہیں۔ بند کمروں میں بیٹھ کر یہ پابندیاں بھی تھیں اور کمائی کی بھی ایک حد مقرر تھی مگر سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم نے ان کو یہ آسان راستہ دے دیا کہ جتنا بے لباس ہوتے جائیں اتنا ہی چاہنے والے فالورز کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا، اتنا ہی RPM بڑھے گا اور جتنی ویور شپ ہو گی اتنے ہی پیسے زیادہ ملتے جائیں گے۔ مگر ہم اس کلچر کو زیادہ دیر فروغ نہیں دے سکتے۔ ہم اس کو آئیڈیلائز نہیں کر سکتے اور نہ اس طرح شارٹ راستے کے فارمولے کو اپنی آنے والی نسل پر فٹ کر سکتے ہیں۔''

''پہلی بات'' میں سوشل میڈیا کی منفی سرگرمیوں کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ 11ویں تخلیق ایوارڈ کی کامیابی میں ان تمام دوستوں

کو ہدیۂ تحسین پیش کیا گیا ہے جنھوں نے سوہان اظہر کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا۔ تقریب میں شریک نہ ہونے والوں کا تذکرہ بھی اس اداریے کا حصہ ہے۔ مارچ 2023ء میں شائع نظم و نثر کے جو پھول گلستان تخلیق کی زینت ہیں ان کی کیاریوں میں حمد و نعت (مسلم تبسم، ریاض حسین زیدی، صفدر صدیق رضی)۔ ☆ رپورتاژ (تخلیق کی 11ویں سالانہ تقریب، ادارہ ''تخلیق'')۔ ☆ گوشۂ حنیف باوا (محمد حنیف باوا۔ نئے دور کا 'داستان گو'! سرفراز سید۔ محمد حنیف باوا کی ادبی خدمات: ہارون الرشید تبسم، دائروں سے باہر کا آدمی: تسنیم سحر)۔ ☆ مضامین (گرجے یا موسموں کی خوشبو: محمود شام۔ زمرد ملک۔ شخصیت اور تخلیقات: غلام حسین ساجد۔ دھنک کا آٹھواں رنگ: پروفیسر قیصر نجفی۔ اردو، سرائیکی اور پاکستانی زبانوں: ڈاکٹر نجیب جمال۔ عمارت کی سرگزشت: ڈاکٹر جواز جعفری۔ ہولا تھا رنگ کا ناول "آواز": ڈاکٹر عاقر شہزاد۔ رنگ بدلتے موسم کا ناول: ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ۔ اصحاب یاسین: بیروز بخت قاضی)۔ ☆ منظومات (کون ہیں وہ: بخت، ایوب خاور۔ ویلنٹائن ڈے: صفدر صدیق رضی۔ بچھڑا سا باغ: افتخار بخاری۔ پینٹے کی جھیل: شہزاد نیر۔ آخری جنگ: نصرت یاسمین۔ احساس: قیصر نجفی۔ قطعات: ممتاز راشد لاہوری۔ نظم: شازیہ رباب۔ ریکتے آدمی: صادقہ قیصر (کینیڈا)۔ نظم: ندیم فراز۔ مجھے سنبھالو: ڈاکٹر فوقی مشتاق (امریکہ)۔ حمد: اظہر جاوید)۔ ☆ افسانے (ہم: محمود احمد قاضی۔ لاڈلی: عطیہ سید۔ خوف: فرحت پروین۔ گلاب کے آنسو: محمد طارق علی۔ آرٹس ہاؤس کا ماس: اقبال فیروز۔ بند گلی کا مسافر: آصف عمران۔ گیان کا لمحہ: طلعت منیر۔ تیجی: فاروق سید (آسٹریلیا)۔ ازالہ: الطاف حسین تبسم۔ ساگر کا سیابانی: ممتاز راشد لاہوری)۔ ☆ غزلیں (نذیر قیصر، اسلم انصاری، تسنیم سحر، انور جمال، شاہد اعجاز، حسن عباس رضا، قمر رضا شہزاد، اقتدار جاوید، ڈاکٹر ایوب ندیم، شہزاد نیر، حسن عباسی، طلعت منیر، اشرف ذکی اعوان، ندیم جیران، ذوالفقار علی اسد، شازیہ رباب، شمسہ سعید، امجد بابر، سرفراز تبسم، دلشاد احمد، اظہر رشید، شفقت حسین شفق، اقبال ندیم، اظہر جاوید)۔ ☆ موسیقی (منیر حسین: ایک سریلا گلوکار: ڈاکٹر امجد پرویز)۔ ☆ سرائیکی گوشہ (ناول "کانگھ": بشریٰ رحمن)۔ ☆ سفرنامے (اطالوی صنم خانے میں اردو کی اذان: ڈاکٹر زاہد منیر عامر۔ سفرنامہ تھائی لینڈ: ڈاکٹر محمد رفیق خان)۔ ☆ طنز و مزاح (گدھے کے کرتوت: نور کمال شاہ)۔ ☆ جائزے (''فلسفۂ مغرب'' کا جائزہ: سلیم الرحمن۔ آ قا قا: فرحت عباس شاہ۔ اور چاند سرخ ہو گیا: شہزاد نیر۔ خواجہ دل محمد اور صد پارہ دل: خالد عبداللہ ونس)۔ ☆ پنجاب رنگ (دو بگھی، دیہاتی والے پیلڈ: حنیف باوا۔ نظم: سلیم شہزاد۔ بڑ: محمود احمد قاضی۔ سوکھا پینڈا (پنجابی افسانہ): تسنیم کوثر۔ کشکول / دوری: انور ندیم علوی)۔ ☆ تبصرے آفتاب خان کے (ایاے: ڈاکٹر محسن مگھیانہ۔ ماں ری: یاسمین خان۔ ہم ازلیں ملتا: انور ندیم علوی)۔ ☆ انجمن خیال (سلطان سکون، انور شعور، تسنیم سحر، حنیف باوا، تسنیم کوثر، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، ایم اے ملک، شازیہ رباب، ممتاز راشد لاہوری، ماجدہ وقا جابری، خالد عبداللہ ونس، طارق علی سیال، شہزاد نیر، قیصر نجفی)۔ ☆ تخلیق کو موصول رسائل و کتب (ملکی اور غیر ملکی) شامل ہیں۔

چوں کہ 11واں تخلیق ایوارڈ ممتاز افسانہ نویس حنیف باوا کو دیا گیا اس لیے اس تقریب کا حال اس شمارہ میں کئی حوالوں سے موجود ہے۔ خصوصاً حنیف باوا کی شخصیت اور فکروفن کے حوالے سے سرفراز سید، راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) اور تسنیم سحر کے مضامین کو خصوصی گوشہ میں شامل کیا گیا ہے۔ سوہان اظہر کی ذاتی کاوشوں سے 11 مارچ 2023ء تخلیق ایوارڈ کی تقریب تاریخی لمحات کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ چوں کہ خود محبت شناسی کے خوگر ہیں اس لیے دوستوں نے محبت کا قرض سمجھ کر یہ فریضہ ادا کیا ہے۔ ممتاز کالم نویس شہباز انور (نوائے وقت) کا کالم بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ محترمہ بشریٰ رحمن آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی یاد زندہ رکھنے کے لیے ان کے ناول "کانگھ"

کی پچھلی قسط قارئین کے انتظار کی گھڑیوں کو پورا کر رہی ہے۔ نور کمال شاہ کا مضمون ''کدو کے کرتوت'' زیرِ لب تبسم رکھتا ہے۔ ''جس طرح مینی سائٹ سے بھاگ آیا تھا بالکل اسی طرح مجھے کدو سے بھاگنا ہے 180 کی سپیڈ سے۔'' افسانہ ''آرفن ہاؤس کا ماس'' میں اقبال فہیم جوزر نے آرفن ہاؤس کے شب و روز بیان کیے ہیں۔ دیگر افسانے بھی ہماری روزمرہ زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ گنجِ ادب محترم محمود شام کا مضمون ''گریزپا موسموں کی خوشبو'' بہت دلچسپ ہے۔ شعروسخن کے حوالے سے ان کی تجزیاتی تحریر میں تحقیق اور مطالعہ کے عناصر شامل ہیں۔ چند سطور ملاحظہ ہوں:

''پاکستان میں ہر ذی شعور کی جوانی میں ایک بار مارشل لا ضرور لگتا ہے اور ہم جیسے عمر رسیدہ لوگوں کو صرف جوانی میں ہی نہیں بڑھاپے میں بھی مارشل لا بھگتنے پڑتے ہیں۔ کبھی وردی والے خود سامنے آ کر جبر کرتے ہیں۔ کبھی جبتوں اور اچکنوں کے پیچھے چھپ کر وار کرواتے ہیں۔ عرفان صدیقی صاحب نے کئی سال اپنی شاعری کو چھپائے رہے۔ مگر سے عشق کو پار لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ شاعری تو قدرت کی طرف سے ایک عظیم تحفہ بھی ہے۔ اظہار کی طاقت بھی۔''

افسانوں کا معیار قابلِ ستائش ہے۔ ہر افسانہ اپنا جداگانہ انداز رکھتا ہے۔ ''اولگا تکارچک کا ناول Flights (پرواز)'' کے بارے میں ڈاکٹر عافیہ شہزاد نے خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ وہ یوں کہ خود بہت بڑے ادبی شاہین ہیں اس لیے عرق ریزی ان کا خاصا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اگر اسے خود ستائی نہ سمجھا جائے تو اولگا تکارچک کا ناول ''پرواز'' اور راقم کے تین ناول کہیں نہ کہیں، کسی سطح پر اسلوب کے تناظر میں اشتراک لیے ہوئے ہیں۔ روایتی ناول سے اسلوب کی سطح پر یہ انحراف ناول نگار سے وسیع مطالعہ، گہرے مشاہدے اور زبان و بیان پر مضبوط گرفت کا متقاضی ہے۔ ہمارا آج کے ناول کا اسلوب بھی ایسی ہی صورتِ حال سے گزر رہا ہے اور اپنے ہیرو اور ہیروئن کو منہدم کر چکا ہے اور عام انسانوں کی بات کرتا ہے۔ ان کی کیفیات اور معاشرے کے بڑے کینوس پر ان کے کردار کی ادائیگی کے بارے میں نئے سے نئے اسلوب اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ ''پرواز'' پڑھنے والا الجھ بھی پاتا ہے اور بکھر بھی جاتا۔ اس بات پر سوال ہے کہ اکیسویں صدی میں نئے ناول کا یہی اسلوب آگے بڑھے گا۔ جو اسے اختیار نہیں کریں گے، وہ اگر قاری ہے تو اپنا سفر معکوس شروع کرے گا اور اگر ناول نگار ہے تو محض لکیر کا فقیر بن کر کہیں پیچھے رہتا چلا جائے گا۔''

افشین تبسم کا افسانہ ''ازل الفت'' نوجوانوں کی پسند ناپسند اور عشق و محبت کے گرد گھوم رہا ہے۔ دونوں کے درمیان حائل ہونے والی رکاوٹوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے اپنے سفرنامہ ''اناطولی ختم خانے میں اردو کی اذان'' کو خاص موضوع بنایا ہے۔ معروف تجزیہ نگار، محقق، نقاد اور کالم نگار ڈاکٹر امجد پرویز نے معروف کالم نگار منیر حسین کی خدمات کا ہدیہ تحسین پیش کیا ہے۔ محترمہ تسنیم کوثر کا پنجابی افسانہ ''سوکھا پینڈا'' زندگی کے زیر و بم کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس افسانے کا اسلوب جدید لکھنے کا آئینہ دار ہے۔ مارچ 2023ء کا ''تخلیق'' تخلیق کاروں کے حسنِ تخیل کا آئینہ دار ہے۔ اس خوبصورت گلدستۂ ادب کی ترتیب و تدوین اور اشاعت پر مدیر سونان اظہر جاوید اور ان کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔

◆◆◆

راولپنڈی کی ادبی روایت (اجمالی جائزہ)

جبار مرزا

جناب فرزند علی سرور ہاشمی کی نئی تحقیقی تخلیق ''راولپنڈی کی ادبی روایت'' کا مسودہ دیکھنے کا اعزاز پایا، یہ بہت خلوص سے لکھی گئی تاریخ ہے۔ اس کھوج میں روانی ہے، برجستگی اور تدبر کی جھلک بھی۔ یہ ایک ایسا تشخص اور ادبی جھنڈا ہے جو سب کے لئے ایک ساتھ ہونا ہمیں لازم تھا لیکن فرزند علی سرور ہاشمی کی محبت بالکل فطرت کے مزاج ایسی ہے۔ کسی پر اس قدر مہربان کہ اسے راولپنڈی کے ادب و ثقافت کے ہر دور میں ساتھ لئے لئے پھرے اور کسی کو اس کے دور میں ہی سرسری انداز میں چلتا کیا۔ بقول انور مسعود کہ

قدرت دا وی بندیاں دے نال ماواں والا لیکھا اے
کجھ چاڑھ کے تے کجھ چھڈ کے نوں گھتی اے

تحقیق عرق ریزی کا کام ہے، ہر کسی کے بس کا مشغلہ بھی نہیں۔ ایک بار جناب عطاء الحق قاسمی نے مجھ سے کہا کہ "جبار مرزا صاحب یار تم تحقیق کس طرح کر لیتے ہو، اس میں تو بڑی کوفت ہوتی ہے"۔ میں نے جواب دیا "جناب والا! مجھے تو مزہ آتا ہے!" یہی بات ہے مجھے تو راولپنڈی کا یہ ادبی ورثہ پڑھ کے بھی مزہ آگیا۔ ادبی ورثہ میں نے اس لئے کہا کہ اس میں شہر کی رہائش، رہن سہن، آثار، بازار، گلی محلے اور سڑکوں کا ذکر بھی ایسا لکھا ہے جو اس ادبی روایت کا اضافی حسن ہے۔

جناب فرزند علی سرور ہاشمی کی زیر نظر تحقیق میں پڑھ کر ہم سے ان کی عقیدت کا غلبہ اور محبت کا عنصر فراواں ہے۔ شوق کسی بھی چیز میں خلوص اور لگن کا استعارہ ہوتا ہے۔ راولپنڈی کی ادبی روایت کی اس پھلواڑی میں تجربے کی آنچ اور مشاہدے کے نتائج میں مطالعاتی عنصر غالب ہے۔ ہر چند کہ تحقیق کا عمل جاری رہتا ہے۔ فرزند علی سرور ہاشمی جوں جوں عملی زندگی میں آگے بڑھیں گے ان پر ایسی صورتیں نئے جہان کھلتے چلے جائیں گے اور ابھی کئی گوشے وا ہوں گے، ہر چند کہ جائزے کے دھندلکے بہار میں چھپتے ہیں لیکن جناب فرزند علی سرور ہاشمی کی اٹھان ہی مہان ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی کوشش سے زیادہ سے زیادہ واقعات کی رونمائی کی ہے جو اس کتاب کا خاصہ ہے۔

جناب فرزند علی سرور ہاشمی کا قاری ہونے کے ناطے ان کا ایم فل کا مقالہ ''تبسم سحر'' (حیات و ادبی خدمات) بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ جناب ایوب محسن کی شخصیت کا احوال بھی کتابی صورت میں پڑھا۔ فرزند علی سرور ہاشمی ایک بیدار صفت جوان اور متحرک روح ہے، جو قائد اعظم کے فرمان کی روشنی میں ''کام، کام اور صرف کام'' پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ ادبی شہد کے حصول کے لئے کہیں پھولوں سے رس کشید کرتے دکھائی پڑتے ہیں اور کبھی تتلیوں کی طرح ڈالیوں سے سوا تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ پھول جھڑ کے پانی جان کے ایک بار جناب فرزند علی سرور ہاشمی میرے پاس بھی تشریف لائے تھے "آپ پر ایم فل کا مقالہ لکھنا چاہتا ہوں"۔ پوچھا کس نے بھیجا ہاشمی صاحب نے؟ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سرپرست پروفیسر ڈاکٹر عزیز ساحر کا نام لیا تو میں نے عزیز ساحر صاحب کو فون کیا اور کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر کوئی ادبی علمی تحقیق ہو کیونکہ میں ابھی تک کوئی ایسا ادبی کام کر نہیں سکا جس پر تحقیق ہو۔ تو ڈاکٹر عزیز ساحر بولے کہ "لوگ تو خود پر ایم فل کرانے کو ہم پر زور دیتے ہیں اور آپ اس کے برعکس کہہ رہے ہیں" پھر کہا کہ اچھا اپنی

جگہ کوئی بتا دیں، جس پر ہم کام کر آئیں۔ میں نے "چکور پینے" کے خالق ظفر خان نیازی کا نام دیا۔۔۔ نہیں معلوم کہ ظفر خان نیازی پر کام ہوا کہ نہیں بہر طور جناب فرزند علی سرور ہاشمی کا زیرِ نظر اور گراں قدر مقالہ" راولپنڈی کی ادبی روایت" ایک ایسی تحقیق ہے کہ آنے والے زمانوں کا محقق اس مرقعے سے استفادہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ جس طرح کائنات کی کئی کہکشائیں ابھی تک انسان پر نہیں کھلیں اسی طرح جناب فرزند علی سرور ہاشمی کی زیرِ نظر تحقیق" راولپنڈی کی ادبی روایت" کے بعض ایسے گوشے جہاں ابھی تک نہیں پہنچا جا سکا، یا مقالے کی طوالت سے احتراز کے سبب اجتناب برتا گیا تو تاریخ کے طالب علم اور قاری کی تشنگی محسوس کرتے ہوئے زیرِ نظر سطور میں کسی حد تک اضافے یا واقعات کا احاطہ کرنے سے یقیناً مثبت نتائج کی امید شمار ہوگی۔ مثلاً۔۔۔ راولپنڈی کے دو ڈھوکوں کا ذکر نہیں ملا، ایک قاسم آباد اور دوسرا مغل آباد، ان دونوں بستیوں کا پرانا نام اسلام آباد تھا۔۔۔ جب 1959ء میں راولپنڈی تحصیل کے شمالی دیہاتوں پر مشتمل علاقے کو پاکستان کا وفاقی دارالحکومت بنا کر اس کا نام اسلام آباد رکھا تو پھر بیچ بچاؤ کے قریبی محلے اسلام آباد کو۔۔۔ مغل آباد اور ڈھوک کھبہ کے شمالی محلے اسلام آباد کو قاسم آباد کر دیا گیا۔ قاسم آباد والے اسلام آباد میں ولادت کا شرف پانے والے معروف صحافی اور قلم کار، ادیب اور درجن بھر کتابوں کے مصنف ڈاکٹر عبدالودود قریشی کا ذکر بھی کتاب میں ہونا چاہیے۔

گنج منڈی سے جڑے آریہ محلہ اور نیری موتی کا نظمی ڈھوک سیداں بھی اہم ہیں۔ پھر دیگر محلوں اور مضافاتی ڈھوکوں کا ذکر جو اب شہر کا انتہائی اہم حصہ ہیں مثلاً محلہ سید محمود علی شاہ، ڈھوک کشمیریاں، راولپنڈی میں دو ڈھوک کشمیریاں ہیں ایک چکلالہ سکیم تھری کے پاس اور دوسری کالا کالج، پاور اس کے مشرق میں حشمت علی گورنمنٹ ڈگری کالج والی، اس کے علاوہ چشتی آباد یاد رہے کہ چشتی آباد ویسٹریج سے ملحقہ وہ علاقہ ہے جہاں معروف دفاعی تجزیہ کار بریگیڈیئر شمس الحق قاضی کے دادا اور والد فضل الٰہی قاضی کے مزارات ہیں۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں تکمیل پانے والی راولپنڈی کی مرکزی جامع مسجد کے پہلے امام بریگیڈیئر شمس الحق قاضی کے والد فضل الٰہی قاضی تھے جب کہ راولپنڈی کی ثقافتی ڈائری کا مصنف جناب افضل پرویز کا دعویٰ ہے کہ راولپنڈی کی اس مرکزی جامع مسجد کے پہلے امام ان کے والد گرامی تھے اس سلسلے میں راولپنڈی کے بیانیے قیاس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قاضی گھرانے کا گھریلو ماحول نماز روزے والا تھا جب کہ افضل پرویز کا گھرانہ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس لیے اکثریت فضل الٰہی قاضی کے حق میں دلائل کرتے ہیں۔

راولپنڈی کے پرانے نقشے پر ایک ڈھوک پیر فتح ابھی تھی جس پر بعد میں چکلالہ ائیر بیس بن گئی تھی اور ایک ڈھوک تھیال تھی جو ائیر فورس کی فالکن سوسائٹی بن گئی تھی، راولپنڈی کی دیگر بستیوں میں قاضی آباد، الہ آباد، نصیر آباد، اور حافظ آباد کا ذکر بھی ضروری ہے۔۔۔ حافظ آباد راولپنڈی کی ڈھوک حسو سے متصل وہ بستی ہے جسے راولپنڈی کے صوفی درویش حافظ عبدالکریم نے 1920ء کی دہائی میں گولڑہ گاؤں اور راولپنڈی کچہری کے درمیان پیدل سفر کرنے والوں کی سہولت اور پڑاؤ کے لیے مسجد، کنواں، مسافر خانہ کافی سارے درخت لگوائے تھے وہ علاقہ آج کل کنٹونمنٹ بورڈ کی عمل داری میں ہے۔۔۔ کچھ اور محلے بھی ہیں جن کا ذکر باقی ہے۔۔۔ انگت پورہ، کرتار پورہ، تیلی محلہ، محلہ کلاس کیلڈری، محلہ بیاریاں۔

ڈھوک الٰہی بخش، ویسٹریج بھاٹہ سنگھ سٹیٹ، حسن آباد، ڈھوک کالا خان، ڈھوک پراچہ، وارڈ 7 کی گاؤں جو بعد میں جب آزاد کشمیر رعارضی سیکرٹریٹ بنا تو۔۔۔ اولڈ ٹرک کیمپ کہلایا۔۔۔ مقامی پوٹھوہاری زبان میں اسے "اوڈیاں" کہتے تھے اور پھر محلہ اکال گڑھ (گلشن آباد) ڈھوک

وراں، محلہ عید گاہ، پنڈوڑہ، محلہ راجہ سلطان، ڈھوک ٹیک، جامع بستی — اس کے علاوہ راولپنڈی کی تین ڈھوکوں پر مشتمل 1973ء میں ایک کالونی بنی جس کا نام خیابان سرسید رکھا گیا۔ اس کالونی میں آنے والی ڈھوکوں میں ڈھوک بابا، ڈھوک جمو اور لعل آباد شامل ہیں اور دو بازار اور نکوڑاں بازار دو الگ الگ بازار ہیں — ان کے بیچ تیسرا بازار ہے یا بازار سے بازار آیا۔ راولپنڈی شہر کا ایک دھرمی اور تاریخی بازار بھی ہے جس کا نام ''نرنکاری'' بازار ہے۔ نرنکاری سکھوں کا ایک ایسا فرقہ ہے جو سکھوں کے بانی گرو نانک کے عقیدے کے پیروکار ہیں۔ نرنکار کا لفظ سکھوں کی مذہبی کتاب ''گرنتھ صاحب'' میں رب تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے ہاں یہ لفظ آریا بنس کی زبان سنسکرت سے آیا ہے۔ نرنکار کا لغوی مطلب بغیر صورت کے ہے یا بے وجود۔ جیسے مسلمان ان دیکھے خدا کو مانتے ہیں، اسی طرح نرنکاری بھی اپنے نرنکار کو فرضی صورتوں کے بغیر مانتے ہیں۔ نرنکاری فرقے کا بانی گرو دیال سنگھ تھا — جو 1783ء میں پشاور میں پیدا ہوا۔ والد کا نام رام سہائے تھا اور والدہ جو سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ کے قریبی ''بھائی وساکھا سنگھ'' کی بیٹی تھی کا نام ''بی بی لاڈکی'' تھا۔

لاڈکی کے بیٹے گرو دیال سنگھ جس کی وفات 1855ء میں راولپنڈی میں ہوئی اور جس کی سمادھی راولپنڈی کی تنک منڈی کے شمسہ ہائی سکول میں ایک میناری صورت اب بھی موجود ہے۔ وہ اکثر تنہائی میں سکھوں ''دھن نرنکار'' کا ورد (جاپ) کیا کرتا تھا، یعنی رزق دینے والا رب یا عظیم خدا — یوں دیال سنگھ کو پجاریوں نے نرنکاری کہنا شروع کر دیا۔ راولپنڈی کا نرنکاری بازار سکھوں کے اسی فرقے کے نام پر ہے۔ نرنکاری گرو دیال سنگھ نے ایک گرجا بھی بنوایا تھا، جس میں قیام پاکستان کے بعد گورنمنٹ راولپنڈی شمسہ ہائی سکول قائم کر دیا گیا تھا۔ جس طرح گورداسپور میں مسلمانوں میں سے ایک ملعون فرقہ قادیانی کہلایا، اسی طرح بھارت کی سکھ کمیونٹی نرنکاریوں کو بھی سکھوں کا قادیانی فرقہ کہتے ہیں۔ سکھوں کے اس متنازعہ فرقے ''نرنکاری'' کی بنیاد راولپنڈی میں پڑی تھی۔ ''دیال سنگھ'' صاحب تصنیف بھی تھا۔

بات راولپنڈی کی بستیوں اور محلوں کی ہو رہی تھی، تو محلہ چاہ سلطان اور ڈھوک ہاتھیاں دونوں الگ الگ آبادیاں ہیں — آفندی کالونی، صادق آباد اور رسول نگر بھی الگ الگ بستیاں ہیں — محلہ سید پوری گیٹ، امر پورہ، موہن پورہ، آریا محلہ، کشمیری محلہ، محلہ لنڈا بازار، چھاچھی محلہ، کرشن نگر، نیو سلطان پورہ، نیو امر پورہ، محلہ احاطہ کوہلیاں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ڈھوک چوہدری عبداللہ، بابو محلہ، چھپیاں جیاں، علی آباد، محلہ ماسٹر مرزا اور راولپنڈی کے چار وہ گمشدہ محلے جو متاثرین اسلام آباد نے آباد کئے ان میں ایک نیو کٹاریاں ہے جس کا اصل کٹاریاں گاؤں موجودہ وزارت خارجہ آفس اور سرینا ہوٹل والا علاقہ تھا۔ دوسرا محلہ نیو پھگواڑی جہاں راولپنڈی — کا مرکزی کالج قائم ہے۔ جب کہ اصل پھگواڑی اسلام آباد کا سیکٹر جی تین وہی موجودہ اسلام آباد ہائی کورٹ والا علاقہ تھا — تیسرا نیو ملپور سکسٹھ روڈ اور مری روڈ کے سنگم پر ہے جب کہ اصل ملپور وہ گاؤں ہے جو راول ڈیم سے تھوڑا پہلے مری روڈ پر بری امام شاہ عبداللطیف کے مزار اور قائد اعظم یونیورسٹی کو جانے والی سڑک کے بالمقابل ہے۔

''اسلام آباد'' نامی کتاب کے مصنف جناب اسماعیل ذبیح نے لکھا ہے کہ ملپور وہ گاؤں ہے جہاں قیام پاکستان سے تھوڑا پہلے کشمیر سے واپسی پر قائد اعظم محمد علی جناح نے کچھ دیر رک کر ملپور کے شمال کے پہاڑی سلسلے بارے فرمایا تھا کہ — پاکستان کے وفاقی دارالحکومت کے لئے یہ جگہ انتہائی موزوں رہے گی۔ راولپنڈی کی چوتھی متاثرین اسلام آباد کی بسائی بستی نیو سید پور سکیم ہے، جو صفر بال سکیم سے متصل ہے۔ اصل سید پور گاؤں اسلام آباد کے پہاڑی سلسلے دامن کوہ سے جڑا ہوا ہے۔ سید پور کی تاریخ بہت پرانی زمانہ قدیم کی ہے۔

پوٹھوہار میں ہندومت کی تین معروف عبادت گاہیں (تیرتھ) ہیں ایک ـــ ٹلہ جوگیاں ـــ دوسری ـــ راج کٹاس اور تیسری ـــ سید پور میں۔ 1530 عیسوی میں خاندان مغلیہ کے ایک صوفی درویش مرزا فتح علی بیگ سے عقیدت اور نسبت سے سید پور کا نام فتح پور باؤلی تھا۔ چونکہ یہ علاقہ معروف گکھڑ راجہ سلطان سارنگ خان کے بیٹے سید خان گکھڑ کی ملکیت تھا اس لئے سید پور کہلایا۔ راولپنڈی کی ادبی روایت میں جناب فرزند علی سرور ہاشمی نے یوں تو متعدد بار حوالہ دیے ہیں۔ آثار و واقعات کی بھی کمی نہیں۔ باوجود اس کے ایک معاون کار کے طور بعض باتیں از بس ضروری ہیں۔

جناب حسین عارف نقوی کا ذکر بھی بہت ضروری ہے جو نامور ماہر تعلیم، محقق، مورخ اور دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ''تذکرہ امامیہ مصنفین'' کے خالق ہیں۔ ڈاکٹر بشریٰ خاور اور ممتاز صحافی بشارت علی سید کا ذکر بھی بہت لازم ہے جو ستر کی دہائی میں راولپنڈی کے مشاعروں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ بشارت علی سید تو The Bleeding Vale ـــ اور ''ایک لپ سرسے دری'' جیسی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، تحصیل میں کنکر مجموعے کے مشترکہ دو شاعر بھائی، عثمان خاور اور سلمان باسط کی محسوس ہوئی۔ ''جھنگ'' ایک لاجواب شعری مجموعہ ہے جو 1964ء میں جناب احمد ندیم قاسمی کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا تھا اس مجموعے ''جھنگ'' کے شاعر کا نام نور بجنوری ہے جن کے ساتھ ہم نے راولپنڈی کے بیشتر مشاعرے پڑھے۔ ''لوح سفال'' راولپنڈی سے 1980 کی دہائی میں شائع ہونے والا ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس میں تین شاعر، راحت ندیم، شاہد ملک اور زمان ملک کی شراکت ہے۔ راولپنڈی گورڈن کالج کے ترقی پسند قلم کار راجہ انور کا ذکر بھی ضرور ہونا چاہئے جس کی محبت کی داستان ''جھوٹے روپ کے درشن'' بہت مقبول ہوئی تھی، پروفیسر راشد حسن رانا اور ان کے شعری مجموعے ''سیپ خوابوں کی شام'' کا ذکر بھی لازم ہے، پروفیسر افتخار ساجد نے بھی ملازمت کے دوران راولپنڈی کے ادبی حلقوں کو زندہ اور رواں رکھا، طاہر پرواز کے بڑے بھائی اور الطاف پرواز کے بڑے بیٹے کیپٹن پرواز ہارون کی ازدواجی سوانح ''تنہا کر گئی مجھ کو'' کا حوالہ بھی مجھ پر لازم ہے۔ ''شیشہ دل'' کے شاعر محمد عثمان خان عثمان جیسا استاد شاعر کا حوالہ ضروری تھا، اسرار اشفاق بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے، پروفیسر ڈاکٹر وسیم عارف کے سفرنامہ ''تو پھر مجھے بلا رہا ہے'' کا ذکر ہونا چاہئے۔ سید فیضی کا شگفتہ لو، راجہ محمد خالد جنجوعہ کی ''راولپنڈی اور نیٹن کی تاریخ''، مولانا محمد اسماعیل ذبیح کی دو کتابیں ''اسلام آباد منزل مراد'' اور ''اسلام آباد، تاریخ اور شمالی علاقے''، صفدر شاہد کی ''تحریک پاکستان میں خطہ پوٹھوہار کا کردار''، جناب عطا الحق کبریا جو ادبی تنظیم ''دائرہ'' کے بانی تھے ان کی کتاب ''انقلاب'' ہمیں یاد ہے کہ عطا الحق کبریا کے انتقال کے بعد وہ عظیم ادبی پلیٹ فارم جناب احسان کبریا اور جناب غضنفر مہدی نے بھرپور انداز میں سنبھالے رکھا، کتب کی تعارفی تقریبات کرانے کے حوالے سے انتہائی اہم حوالے کے طور یاد رکھا جائے گا۔

مری روڈ راولپنڈی کے محلہ وارث خان کے جناب احسان حبیب کا ذکر اس حوالے سے ضروری ہے کہ ان کے شاپنگ سینٹر میں تواتر سے طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں مسلسل شرکت کرنے والوں میں پروفیسر مقصود جعفری، ثریا شہاب، بیدل جونپوری ان کے چھوٹے بھائی بیدل جونپوری، سید عارف، احمد ہاشمی، فضل الٰہی بہار، سلطان صبروانی، ایڈووکیٹ رشید قمر اور حکیم عبدالمجید خطا شامل تھے۔ ایڈووکیٹ رشید قمر کی خود نوشت سوانح کا نام ''میری ذات میرا ماضی'' ہے، منصور قیصر کی بیگم افشاں ملک اور معروف قلم کار صحافی سوانح نگار لیاقت ممتاز کا حوالہ، بشیر سوہاوی کی تحقیقی خدمات۔ الغرض اس طرح کے بہت سے علمی ادبی ستارے ہیں جنہوں نے راولپنڈی کی

علمی اور ثقافتی زندگی میں حصہ ڈالا۔ راولپنڈی ریڈیو کا پوٹھوہاری کردار "دوست" کا سکرپٹ رائٹر سید تصدق اعجاز کے ثقافتی کردار کے موقع کی شہادت اب ہمارے پاس اُن ایک شریف شادی بچے ہیں۔ — ایک ادبی بیٹھک بھابڑا بازار میں عبدالباری رانا کے ہاں اور ایک طرحی مشاعروں کا آستانہ ڈی اے وی کالج روڈ المنزل ہوٹل سے متصل جناب نسیم سیرحی کا بھی تھا جہاں ناصر زیدی، عطا حسین کلیم، فوق لدھیانوی، تابش صدیقی، بشیر سیفی، اور قمر صدیقی کو کئی بار کلام پڑھتے دیکھا اور سنا — تابش صدیقی ہمارے ایک ایسے بزرگ دوست اور پشتو کے کلاس فیلو تھے جن کی صدارت میں ہوشیار پور میں 1943ء میں اختر ہوشیار پوری کے گھر "حلقہ ارباب ذوق" کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس سے پہلے حلقے کا نام "بزم داستان گویاں" رکھا گیا تھا جو آگے چل کے حلقہ ارباب ذوق ہو گیا۔ جناب قمر صدیقی ہمارا ایک ایسا ساتھی تھا جس کا ایک شعر انارکلی لاہور میں جناب احسان دانش نے اپنے دانش کدہ میں مجھے سنایا تھا کہ وہ معروف شعر ہمارے علم میں نہ تھا کہ

افلاس نے بچوں کو بھی تہذیب سکھا دی — سہمے ہوئے رہتے ہیں شرارت نہیں کرتے

قمر صدیقی کا نعتیہ مجموعہ "حرف حرف روشنی" جناب زاہد ملک نے اپنا اعزاز سمجھ کے شائع کیا تھا۔ جناب شرف الدین شامی کا ذکر تو راولپنڈی کے اس مقالے میں موجود ہے لیکن اس قبیل کے ڈاکٹر کرنل حامد کا ذکر بھی بنتا ہے جو معروف ماہر تعلیم مترجم محقق، مورخ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ چکوال کے پروفیسر غازی احمد (کرشن لعل) کے خانوادے سے تھے جنہوں نے اسلام کے لئے خاندان چھوڑا اور پاکستان کے ہو گئے۔

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد زمان چشتی (ایس ایم زمان) کے ذکر کے بغیر بھی راولپنڈی کی ادبی علمی تاریخ ادھوری ہے۔ ہمارے نوجوان قلم کار رضا مسعود کی تین کتابیں محبت کا نیلا رنگ، افسانے اور "آپ" کے عنوان سے کالم۔ جب کہ جوش ملیح آبادی کے نواسے فرخ جمال کی کتاب "ملیح آباد سے اسلام آباد تک" شہناز نازلی کا سفرنامہ "سرزمین معجزات" سلطانہ فاؤنڈیشن والے معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر نعیم غنی کی کتاب "فکری نقوش" میجر محمد رفیق شاعر ادیب، مورخ سوانح نگار اور 8 کتابوں کے مصنف کا ذکر بھی ضروری ہے — جناب احمد داؤد کی کتاب "دشمن دار آدمی" "تاریخ گوجر خان" نامی ڈاکٹر اکرام الحق رانجھا کی کتاب 1994ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اہمیت اس لئے دو چند ہے کہ وہ خطہ پوٹھوہار کے ابتدا عہد قدیم سے 1947ء تک کے واقعات پر محیط ہے۔

جناب ناصر وقار المعروف شاہ مسلم کی کتاب یاد نگر: 36 کردار اور بریگیڈیئر شمس الحق قاضی کے ذکر کے بغیر راولپنڈی کی ادبی اور پاکستان کی فکری تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ آپ نصف درجن کے لگ بھگ کتابوں کے مصنف ہیں۔ مجیب عزمی اور ڈاکٹر انور نسیم کا ذکر بھی ضروری ہے۔ رشید الزماں خلش کلکتوی کا مجموعہ سچائیاں بھی سنگ بند شاعری ہے۔ جناب فوق لدھیانوی کے مجموعے زخم جاں کا ذکر تو شاعر ہو گھران کے ماہانہ ادبی مجلے "ہمسفر" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اسی طرح سید ضمیر جعفری کے روزنامے "بادِ شمال" کا احوال تو ملتا ہے مگر اس کے تیز ذیلک پر محترم جمیل ملک اور جناب احمد ظفر بطور سب ایڈیٹر کا ذکر بھی تاریخ سے پوشیدہ ہے — پروفیسر جمیل ملک کے بیٹے انجینئر نوید جمیل کا شعری مجموعہ "تری تلاش کا موسم" اپریل 1994ء میں شائع ہوا تھا جس میں 1981ء سے 1993ء تک کا کلام شامل ہے۔ اس کا دیباچہ 13 صفحات کو محیط ہے جو احمد ظفر نے لکھا تھا۔ بیگم کرنل زری ظفر بھی ذات میں انجمن، ایک ادبی بیٹھک اور کمال کی شاعرہ و ذہین شاعرہ تھیں ان کا دستر خوان بھی کسی ولیمے کی تقریب سے کم نہ ہوتا تھا وہ ویسٹریج میں رہیں۔ شیلنٹ روڈ پر یا اسلام آباد کے سیکٹر ایف سکس میں

مشاعروں اور موسیقی کا انعقاد باقاعدگی سے کیا کرتی تھیں ان کے مشاعروں اور دیگر علمی تقریبات میں احمد فراز، مسعود مفتی، منصور جعفری، جمیل یوسف، سرور انبالوی کو سننے اور ملنے کے مواقع ملتے رہے۔

ہمارے ایک اور ساتھی جو راولپنڈی کے محلہ امام باڑہ سے قیام پاکستان کے وقت ہجرت کر کے بھارت کے شہر دہلی چلے گئے تھے جناب سربجیت سنگھ لامبہ جو حافظ اقبال، حافظ قرآن اور نعت کے خوبصورت شاعر ہیں جنہیں حکومت پاکستان اقبال ڈے پر اقبال اکیڈمی کی دعوت پر ہر سال مدعو کرتی رہی ہے ان لامبہ جی کے اعزاز میں بیگم ارشل زری ظفر کی تقریب کافی دنوں تک موضوع بحث رہی تھی اس تقریب کی نظامت ممتاز قلم کار، استاد اور مفکر دلدار پرویز بھٹی نے کی تھی سربجیت سنگھ لامبہ کی شخصیت راولپنڈی کے لئے اس لئے فخر کی بات ہے کہ پاکستان اور بھارت میں کسی قسم کا کوئی ثقافتی اور ادبی معاہدہ نہ ہونے کے باوجود سربجیت سنگھ لامبہ کی تالیف "نذر اقبال" کو اقبال اکیڈمی نے شائع کیا جس کے لئے مجھے (ہمایوں مرزا) پاکستان میں سکھوں کا ادبی وارث قرار دیا گیا پھر بھارت سے سربجیت سنگھ لامبہ جی نے میرے نام ادبی، اخلاقی اجازت نامہ بھجوایا۔ میں نے یوں اقبال اکیڈمی کو تحریری اجازت دی تو نذر اقبال اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ سربجیت سنگھ لامبہ کی نعتیہ تخلیق "عاشق قرآن" اور اقبال کا شکوہ جواب شکوہ کا انگریزی اور ہندی ترجمہ بھی خاصا مقبول ہوا تھا۔

محترمہ زری ظفر کے مجموعہ کلام کا نام "متاع زری" ہے جو 1982ء میں طبع ہوا۔ جناب احمد ظفر جن کا روزنامہ پاکستان کے ذیل میں ذکر ہو چکا تمیں سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی آزادی کے لئے ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ ریڈیو آزاد کشمیر (پنڈی تحریر) سے اپنے ادبی اور تحریکی پروگرام "چنار پینار" سے انہوں نے مشاعرے اور فکری مضامین نشر کر کے تحریک آزادی کشمیر کو فعال رکھا۔ ان کے ریڈیو پروگراموں کے مہمانوں میں اکثر پروفیسر منصور جعفری کے والد محترم تحسین جعفری اور میں ہوا کرتا تھے۔ معروف شاعر قتیل شفائی کی پشتو فلم عجب خان میں جناب احمد ظفر نے اداکاری بھی کی تھی۔ منظور عارف پنڈی ون (راولپنڈی ریڈیو ٹیشن) پر ادبی پروگرام کیا کرتے تھے۔ وہ بھی اکثر مشاعروں پر مدعو کرتے ان کا مجموعہ کلام کا نام "لہر لہر دریا" ہے جس کا ذکر راولپنڈی کی ادبی تاریخ میں ضروری تھا۔ محترمہ فریدہ حفیظ جن کو راولپنڈی میں قومی اسمبلی کی کوریج کے لئے پہلی خاتون رپورٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ تین چار کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ان کا احوال اور مولانا غلام رسول مہر کی نواسی اور کئی کتابوں کی مصنفہ نجم فاطمہ علوی کا احوال بھی ضروری تھا۔

افضل پرویز جو راولپنڈی جنگ میں ثقافتی ڈائری لکھتے تھے ان کے علاوہ ایک افضل پرویز نوائے وقت کے خطاط اور قلم کار بھی تھے جو پروین شاکر کی شاعری کے خطاط تھے۔ جن کی سوانح "سٹاپ پریس" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ مشتاق علوی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جنہوں نے "فنکار و ادب ڈائری" لکھی تھی۔ تاریخ قبیلہ دھنیال کے مصنف پروفیسر رفیق نواز دھنیال کا ذکر بھی کسی سبب رہ گیا تھا۔ دادا امیر حیدر خان کا ذکر اس حوالے سے اہم ہے ان کی بین الاقوامی شہرت یافتہ سوانح CHAINS TO LOSE کے علاوہ راولپنڈی کے امام باڑہ محلہ جامع مسجد روڈ پر ڈاکٹر ایوب مرزا کا مطب دراصل دادا امیر حیدر اور فیض احمد فیض کی ادبی بیٹھک تھی جس کی روداد ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں موجود ہے۔ بیگم سرفراز اقبال بھی کئی کتابوں کی مصنفہ تھیں اور انہیں ادب میں میزبان فیض احمد فیض کہا جاتا تھا۔ اسلام آباد میں جناب تحسین کاظمی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو طرحی مشاعروں کے حوالے سے مشہور تھے۔

راولپنڈی بعض قلم کاروں کی کچھ کتابیں جو قریب قریب اکثر محققین سے صرف نظر ہوئیں یا کسی سبب قرطاس تک نہ پہنچ سکیں۔ ان میں کتاب نظر

رحمان شاہ عزیزی کی نومبر 1975ء میں شائع ہونے والے افسانوں کے مجموعے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ جس کا تعلیف جناب رشید امجد کا لکھا ہوا ہے۔ محترمہ عفت چودھری کے 378 صفحات کے ناول ''نجی'' کا تذکرہ بھی نہیں ملتا جو راولپنڈی سے ڈاکٹر عبدالجبار راہی نے جنوری 1981ء میں شائع کیا تھا۔ راولپنڈی مائی ویرو کی بی سے متصل جامع مسجد روڈ سے شائع ہونے والا تغزل وتصوف کا خوبصورت امتزاج ماہنامہ جلال و جمال کا ذکر بھی کہیں نہیں ملتا جو 1975ء میں حکیم فضل الرحمن چشتی کی ادارت میں بڑی آب وتاب سے شائع ہوتا رہا ہے۔

کرنل سید افتخار حسین شاہ کی سوانح عمری ''وردی کا سفر'' کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جو دلی پہلو کے علاوہ مشرقی پاکستان کا بچھڑ جانے تک کی چشم دید تاریخ ہے۔ اسلام آباد کی بزم شعر وادب کے جناب محمد ایوب صابر کا سکھوی کی تالیف ''نغمۂ شب'' جو 1979ء میں شائع ہوئی اس کا دورانیہ جون 1974ء سے مئی 1975ء تک ایک سال کو محیط ہے اس کا ذکر اس مناسبت سے بھی ضروری ہے کہ اس میں مصرع طرح پر راولپنڈی اور اسلام آباد، دونوں شہروں کے شاعر شرکت کیا کرتے تھے، جن میں جام نوائی، عطش کلکتوی، عبدالرحمن ریاض، حبیب بدایونی، انوار حسن رخشاں، ایوب محی، عزیز ہاشمی، ابرار بدایونی، رمضان ساگری، ظہیر زیدی، صابر کا سکھوی، رضا واسطی، شفیق احمد، مسرور جالندھری، جلیل حسن، شمیم متھراوی، حبیب ظفر، شرافت چشتی، نثار رزمی، محمد انور سلیم محمود، اختر صنم، اسد اللہ اطہر، اسلم ساگر، خاور نقوی، محمد صابر مظفر، پرویز اختر شاہ، قاضی عارف، بیدل چوہدری، محسن الجاعزیزی، بیدل چوہدری اور اقبال بٹ چشتی شامل تھے۔

جناب سرور انبالوی کے گھر قذیری حسن آباد میں بھی ہر مہینے کی پہلی چھٹی والے روز طرحی مشاعرہ 33 برس تک ہوتا رہا جس کی مستقل صدارت سرجن جنرل افواج پاکستان، ڈاکٹر جنرل محمود الحسن کے حصے میں رہی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ محمود الحسن جب لیفٹیننٹ کرنل تھے تو بزم نگار ادب کے مشاعروں میں آنے لگے اور جرنیلی تک وہ روایت برقرار رکھی ۔۔۔۔ جناب سرور انبالوی اور جنرل محمود الحسن میں دوستی کا یہ عالم تھا کہ دونوں کی وفات میں مستقل ایک ہفتے کا وقفہ پڑا تھا۔ اکتوبر 1979ء میں جناب سرور انبالوی نے 23 شعراء کے کلام اور تعارف پر مشتمل ایک تذکرہ شائع کیا تھا ''ایوان غزل'' سید ضمیر جعفری نے روزنامہ جنگ کے اپنے کالم میں لکھا تھا کہ ۔۔۔ ''ایوان غزل'' 23 دروازوں والا ایک ایسا شہر ہے جس میں ایک دروازے کا نام ''جہار گیٹ'' ہے۔۔۔

اس تذکرے ''ایوان غزل'' میں زیادہ تر وہ شاعر شامل تھے جو اکثر و بیشتر اور بعض گاہے گاہے جناب سرور انبالوی کے ماہانہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے تھے، جن میں ڈاکٹر عبدالرشید تبسم، محمد عباس اثر، ابو الخطرت میر زیدی، ڈاکٹر تبسم رضوانی، رشید وسیلم سیمی، سلطان صبر وانی، زبیر کنجاہی، عبدالحمید نیرش عوامی، عیاں سرحدی، سید ورابعہ نہاں، اکرم باجوہ، جبار مرزا، خاور نقوی، اسرار اشفاق، سیدہ حنا، ابو المعانی عصری، امتیاز احمد ہاشمی، جاوید اختر سوہتروا، قمر سرحدی، سرور انبالوی، رساور بغلی، میجر فضل حسین افضل، اور شوکت مرادآبادی شامل تھے۔ چونکہ بات راولپنڈی کی ادبی روایت کی ہورہی ہے، زراعل اور ثقافت اس کا ایک اضافی حسن ہے۔ لیکن راولپنڈی کی مرکزی جامع مسجد، گوالیاں والی مسجد الگ ایک تاریخ ہے ان کا اس مقالے سے میل بنتا نہیں۔ جیسے محلہ شاہ چن چراغ کی مسجد منگلال ہے جہاں 27 برس تک آستانہ عالیہ عیدگاہ شریف کے بانی، پیر حافظ عبدالکریم نے 27 مصلے لگاکر تراویح پڑھائی اور ان کے بعد تین مصلے آستانہ عالیہ گولڑہ شریف کے پیر مہر علی شاہ نے نماز تراویح پڑھائی۔ ہرچند کہ پیر مہر علی شاہ صاحب نے باقاعدہ قرآن پاک حفظ نہیں کیا تھا مگر ان کی ولایت کا اعجاز تھا کہ رب تعالیٰ نے انہیں حفظ کی نعمت سے نواز دیا تھا۔ راولپنڈی کے ایک فلاحی اور انسان دوست ادارے فیض الاسلام کے ذکر کے

خطہ راولپنڈی کی تہ تو ادبی تاریخ تشکیل پاتی ہے اور تہ ہی دوسری عالمی جنگ کی راکھ میں دبی چنگاریوں کا اور نہ ہی 1965ء کی جنگ میں خاموش مجاہدوں کا پتہ چلتا ہے۔ جس طرح قیام پاکستان کے وقت سب سے زیادہ جانی نقصان پنجاب کا ہوا تھا 54 فیصد پنجاب جو پاکستان کے حصے میں آیا وہ پایا وہ جو 46 فیصد بھارت میں رہ گیا وہ دونوں فرنٹ لائن پر تھے اسی طرح پوٹھوہار چونکہ مارشل خطہ ہے اسی لئے دوسری جنگ عظیم میں سات سمندر پار جانے کے پوٹھوہاری اکثریت کا کردار ایک تاریخ ہے۔ جنگ کی ہولناکیاں خاص طور سے ایٹمی جنگ کے اثرات تو آنے والی نسلیں ابھی تک بھگت رہی ہیں۔ بہت سارے فوجیوں کی زندگیاں تمام ہوگئیں، کئی گھر اجڑے عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے۔ پوٹھوہار چونکہ بارانی اور پسماندہ علاقہ تھا مسائل زیادہ اور وسائل کم تھے اس لئے بے سہارا اور یتیم بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت کے راولپنڈی کے ایک مرد درویش جنہیں پوٹھوہار کا سرسید بھی کہا گیا۔ جناب میاں حیات بخش نے ایک ادارہ فیض الاسلام بنایا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ابھی دنوں مغربی جرمنی میں ''ایس او ایس ولیجز'' کی بنیاد رکھی گئی تھی جو اب بین الاقوامی ادارہ ہے اس کی تین برانچیں تو پاکستان کے میں ایک ہزارہ ڈویژن میں ڈھوڈیال، دوسری لاہور اور تیسری راولپنڈی میں ہے۔ بات میاں حیات بخش کے ادارے فیض الاسلام کی ہو رہی ہے۔ فیض الاسلام نے علمی ادبی، سماجی اور تعلیمی اعتبار سے کمال کردار نبھایا۔ جس کے یتیم خانے کا نام بعد کے جنرل ضیاء الحق نے ''اپنا گھر'' کردیا تھا وہ گھر جیسے ماحول میں نہ صرف خدمات انجام دے رہا ہے بلکہ کئی اہل قلم کو بھی سنبھالا دیے چل رہا ہے، جن میں چند ایک جناب فاضل خیار، قمر رعینی، منصور شاہد، رشید نثار اور ڈاکٹر ریاض شامل ہیں۔ میاں حیات بخش کے چھوٹے بھائی میاں کریم بخش پیشے کے اعتبار سے انجینئر اور راولپنڈی بلدیہ کے پہلے چیف انجینئر تھے راولپنڈی سید پور روڈ پر ایک بہت بڑی پانی کی ٹینکی ان کی مہارت کا شاہکار ہے۔ جب 1965ء کی جنگ کے دوران راولپنڈی میں پانی کی سپلائی جاری رکھنے کی ذمہ داری میاں کریم بخش کو دی گئی تو انہوں نے دشمن کے حملے سے بچانے کے پانی کی اس ٹینکی کو کاموفلیج کرتے ہوئے اسے کالا رنگ کروا کے اس کے اوپر پودوں کے بڑے بڑے گملے رکھوا دیے وہ ٹینکی بعد میں ''کالی ٹینکی'' کے نام سے راولپنڈی کی شناخت بن گئی

میاں کریم بخش کے بڑے بیٹے جسٹس میاں نذیر اختر بیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف، محقق، مورخ اور شاعر ہیں۔ میاں کریم بخش کے چھوٹے بیٹے کا نام لیفٹیننٹ کرنل میاں محمد جمیل اطہر ہے۔ وہ بھی صاحب دیوان شاعر ہیں، ان کے مجموعے کا نام ''چشم بینا'' ہے۔ جسٹس نذیر اختر اور کرنل جمیل اطہر دونوں بھائیوں نے ایک مسلسل نظم ''حویلی نامہ'' لکھی جو 50 صفحے کو محیط ہے یہ حویلی راولپنڈی مری روڈ پر ''سائیں کالو'' کے نام سے منسوب ہے۔ سائیں کالو کا اصل نام میاں حق داد تھا، وہ جسٹس نذیر اختر کے پردادا اور صاحب ولایت تھے۔ 1850ء کے لگ بھگ راولپنڈی آ بسے تھے راولپنڈی گزیٹیئر میں میاں دیدار بخش کا ذکر ملتا ہے جو سائیں کالو کے دادا تھے۔ حضرت شاہ سلیمان تونسوی کے ملفوظات میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے۔

میاں دیدار بخش میاں عبداللہ طائی سے بیعت تھے راولپنڈی کی لال حویلی اگر ہندوانہ روایات میں معروف تھی تو حویلی سائیں کالو ایک روحانی آستانہ تھا۔ جسٹس میاں نذیر اختر بیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں ''موج گمان'' ان کا نعتیہ اور ''شمع خیال'' غزلیہ مجموعہ ہے جب کہ ''فکر فروزاں'' متفرق کلام کو محیط ہے اور ''مظہر احوال'' ان کی وہ نثری شاہکار ہے جس میں عید میلاد النبی ﷺ کی حقیقت اور اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے ''سابق الحکام کی تخریب کا نیا قانون'' نامی اس کتاب میں اسلام آباد میں رائج گھریلو تشدد کے قانون، مجریہ 2021ء کا

جاتا دلیا گیا ہے، اور "حاضری سے حضوری تک" سپریم کورٹ میں ممتاز قادری کے اس مقدمے کی روداد ہے جس کی پیروی میاں میاں نذیر اختر نے کی تھی۔ اس میں عدالت کے دائرہ اختیار، دفعہ 302 ت پ کی تشریح اور دفعہ الف 338 ت پ کا تقاضا واضح کیا گیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق کا ذکر بھی راولپنڈی کی ادبی روایت کا حصہ ہے۔ وہ راولپنڈی مریڑ حسن کی محلّہ آبادی ڈھوک چراغ دین میں مقیم تھے۔ ہمارا ان کا دوستانہ اوائل عمری کا تھا۔ وہ خود کو ہمارا عقیدت مند کہلواتے تھے حالانکہ وہ خود ایک ممتاز مذہبی سکالر اور ہمارے محسن استاد تھے۔

پروفیسر عبدالحق شاعر، خطیب، ماہر تعلیم، اور روشن خیال تھے۔ ان کے شعری مجموعے کا نام "برگ و ثمر" ہے۔ تین سے زیادہ ان کے خصوصی خطابات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ بہت کم عمری سے مطالعے کے رسیا تھے۔ تصوف اور روحانی علوم ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ سلاسل اربعہ میں سلوک کی تکمیل کے بعد انہوں نے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ، قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ میں صاحبِ اجازت تھے۔ ان کے طلباء اور عقیدت مندوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ انہوں نے جب ایم اے کی پہلی ڈگری لی تو میں نے انہیں "علامہ" کا خطاب دیا تو اس پر وہ بے اختیار ہنسے اور کہا کہ اچھا آپ نے ہمیں ہار گفٹ دے دیا ہے تو اب ہم آپ کو علامہ بن کے دکھائیں گے اور پھر واقعی علامہ عبدالحق نے علامہ بن کے دکھایا۔ مسلسل پانچ چھ ایم اے کر گئے۔ یونیورسٹی سے جا کے "ریکی" میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے آئے۔ پھر بھی اطمینان نہ ہوا تو اسلام آباد سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے علامہ اقبال پر پی ایچ ڈی کر لی۔ جس دن ڈگری ملی تھی مجھ سے کہا اگر آپ کانووکیشن میں نہ آئے تو میں ڈگری نہیں لوں گا۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق اردو، فارسی، عربی، پنجابی، سنسکرت اور پوٹھوہاری کے ماہر تھے البتہ پروفیسر انگریزی کے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج مری اور گورنمنٹ کالج کہوٹہ میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ راولپنڈی میں فوج کی عملداری میں ہونے والے دو مشاعرے بھی ایک تاریخ ہیں جن کے بارے بہت کم کسی کو آگاہی ہے۔ وہ دونوں مشاعرے محمد ضیاء الحق نے منعقد کرائے تھے۔ پہلے مشاعرے کے وقت ضیاء الحق میجر تھے اور دوسرے میں فور سٹار جنرل ہو چکے تھے۔ یکم مارچ 1976ء کو جب ضیاءالحق افواج پاکستان کے آٹھویں آرمی چیف بنے تو میجر ضمیر جعفری سے کہا، ضمیر ویار مشاعرہ کراؤ۔ افواج پاکستان کا سربراہ ہوتے ہوئے مشاعرے کی صدارت انہوں نے ضمیر کی خواہش پر مزاح نگار ڈاکٹر جنرل شفیق الرحمن سے کرائی۔ اس مشاعرے کا انسان دوستی کا ایک جملہ قابلِ ستائش ہے وہ یہ تھا کہ جب یہ طے پا چکا تھا کہ ہر شاعر کو 15 سو روپے اعزازیہ دیا جائے گا لیکن مشاعرہ شروع ہونے لگا تو ضیاءالحق نے سید ضمیر جعفری سے کہا کہ احسان دانش کے کپڑے پرانے ہیں انہیں تین ہزار روپے دیجئے گا تاکہ کپڑوں کا نیا جوڑا سلوا لیں۔ اس پر سید ضمیر جعفری نے جواب دیا یہ جو بھی شاعر آپ کو لش پش دکھائی دیتا ہے وہاں۔۔۔ اندر سے سارے احسان دانش ہی ہیں۔ پس میں سب کو تین تین ہزار روپے ہی دوں گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔

راولپنڈی کی تاریخ کا وہ پہلا مشاعرہ جس میں دس ہزار لوگوں نے شرکت کی اور آج تک اس سے بڑا مشاعرہ پاکستان کی تاریخ میں پھر نہ ہو سکا وہ 6 اکتوبر 1956ء کی شب راولپنڈی کے آرمی سپورٹس سٹیڈیم میں ہوا جس کا اہتمام فوج کے تھرڈ آرمڈ بریگیڈ نے کیا تھا ضیاءالحق اس بریگیڈ میں بریگیڈ میجر تھے جب کہ بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر سرفراز خان تھے۔ جو 1965ء کی جنگ میں لاہور میں فوج کا ڈویژن کمان کر رہے تھے اور "محافظ لاہور" کے لقب سے معروف ہوئے تھے۔ اس مشاعرے کی صدارت اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے کی۔ نظامت سید ضمیر جعفری اور عبدالعزیز فطرت نے کی تھی۔ احمد ظفر اور جمیل ملک نے شعرا میں اور سرفراز شاہد

سامع کے طور مشاعرے میں موجود تھے ان دنوں ایوب محسن شاعری میں اس قدر نمایاں تو نہ تھے مگر زبان و بیان اور عروض کے حوالے سے ان کا طوطی بولتا تھا۔ کراچی کی عائشہ یوسف اور لاہور سے سلمیٰ ماجد، بزم یک شب کی نمایاں شاعرات تھیں زہرہ نگاہ پہلی دفعہ باقاعدہ اس مشاعرے سے متعارف ہوئی تھیں۔ مشاعرے کے ماحول کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا شاعرانہ حصہ کیپٹن ضمیر جعفری کے سپرد تھا اور اس کے انتظامی امور میجر ضیا الحق نے سنبھال رکھے تھے مشاعرے کا آئیڈیا اس کی پلاننگ ساری کی ساری ضیا الحق کی تھی مشاعرہ بزم یک شب یہ نام بھی ضیا الحق کا دیا ہوا تھا۔ پہلے کرنل یوسف ظفر کی تجویز تھی کہ اس کا نام مشاعرہ ہو جانا چاہئے سید ضمیر جعفری نے کہا عظیم الشان مشاعرہ کسی نے تاریخی مشاعرہ تجویز کیا شاد امرتسری نے بھی کوئی نام دیا مگر پھر ضیا الحق کے تجویز کردہ نام مشاعرہ بزم یک شب پر اتفاق کر لیا گیا۔

پاکستان ہجرت کے بعد جوش ملیح آبادی نے پہلی بار کسی کل پاکستان مشاعرے بزم یک شب میں شرکت کی تھی جوش صاحب کی خاطر داری نسیم الظفر کے سپرد تھی انہیں ہوٹل فلیشمین میں ٹھہرایا گیا تھا مگر انہیں ان کی بھانجی صفیہ شمیم ملیح آبادی اپنے ہاں ۱۴ اگست کے دن میں لے گئی تھیں۔ حفیظ جالندھری کو اس لئے مدعو کیا گیا تھا جوش صاحب سے ان کا پہلے کون بعد میں کون والا معاملہ تھا۔ شوکت واسطی شریک نہ ہو سکے تھے کہ اگلے روز ۱۴ اگست کو انہوں نے ایبٹ آباد میں مشاعرے کا اعلان کر رکھا تھا۔ منظور عارف اور ضیا جالندھری کو بھی دعوت تھی مگر وہ دونوں کراچی میں کسی مصروفیت کے باعث نہ پہنچ پائے تھے۔ مشاعرہ ''بزم یک شب'' کے دیگر شعراء کرام میں احسان دانش، سراج الدین ظفر، احمد فراز، محسن احسان، خاطر غزنوی، باقی صدیقی، قتیل شفائی، تابش صدیقی، مرزا محمود سرحدی، اللہ دتہ جلیس، تنویر سپرا، کاوش بٹ، افضل منہاس، صفدر ہمدانی، شوکت تھانوی، روشن نگینوی اور سحاب قزلباش شامل تھے۔

راولپنڈی آرمی اسٹیڈیم کو کچھ اس طرح آراستہ کیا گیا تھا کہ وہ لاہور کا شالیمار باغ دکھائی دے رہا تھا۔ مشاعرے کی منظوری کے لئے میجر ضیا الحق کو بہت محنت کرنی پڑی تھی جو انہی سے روز دھوپ شروع کر دی تھی اسٹیڈیم کی زینہ دار نشستوں کے علاوہ دو ہزار کرسیاں اور سٹیج کے اطراف میں دور تک قالین بچھائے گئے تھے۔ ساؤنڈ سسٹم کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مشاعرہ پڑھنے والے شاعر کو اپنے قریب محسوس کر رہا تھا۔ ان دنوں مشاعرے بھی فلم کی طرح ٹکٹ لے کے دیکھے اور سنے جاتے تھے۔ مشاعرہ بزم یک شب کے ٹکٹوں کی فروخت کے لئے شہر میں چند مقامات پر بکنگ کاؤنٹر بنائے گئے تھے، جن میں راجہ بازار کا فوارہ چوک، کینٹ میں، شاہ جی کا باغ، ضلع کچہری اور لیاقت باغ شامل تھے۔ مشاعرہ شروع کرنے سے پہلے سید ضمیر جعفری نے اعلان کیا کہ اس مشاعرے سے ہونے والی آمدنی ٹی بی فنڈ میں دی جائے گی اور پھر بعد میں باقاعدہ اس مشاعرے کا آڈٹ کرایا گیا۔ شعراء کا اعزازیہ آمد و رفت کے اخراجات، قیام و طعام کی ضرورتوں کے بعد باقی بچ جانے والے ساڑھے تین ہزار روپے کی تھیلی ۔ٹی بی کے علاج معالجے کے لئے آرمڈ فورسز کے میڈیکل سروسز کے اس وقت کے ڈائریکٹر لیفٹیننٹ جنرل ڈاکٹر واجد علی برکی کو۔ گیڈیئر سرفراز خان نے ایک خصوصی تقریب میں پیش کر دی تھی!! اور ہاں افضل منہاس کے دو منہ بولے شاگرد تھے۔ منہ بولے اس طرح کہ وہ کوئی باقاعدہ شاگرد نہ تھے عقیدت مند تھے۔ منہاس صاحب ان سے بیگار لیتے رہتے۔ کبھی کسی کو کسی آفس اور کبھی کسی کو مارکیٹوں میں دوڑائے رکھتے تھے۔ ان میں ایک کا نام افضل شیرازی تھا جو اسلام آباد میں سعودی سفارت خانے کا سیکورٹی چیف تھا اور دوسرا امجد عید گاہ والا افضل منہاس صاحب کی ڈھوک والا کے درمیان قائم ٹی بی ہسپتال میں ملازم تھا۔ افضل شیرازی کی ''دیوار'' نامی طویل نظم جو مشاعروں میں فرمائش کر کے سنی جاتی تھی.... اس کا پہلا شعر تھا:

دیوار جسے کہتے ہیں اس شہر کے باسی　　　دیتی ہے دلوں کو وہ تنہائی اداسی

اور دوسرا منہ بولا شاگرد الطاف تھا ـــ جس کا ایک شعر کمال کا شاہکار تھا کہ

دھڑکن سے جدا پیار کا آہنگ نہ کرنا　　　فطرت کے تقاضوں سے کبھی جنگ نہ کرنا

ان دو شعرا کا ذکر ان کے ذخیرہ رہ جانے والے کلام کے سبب لازم تھا۔ ویسے تو کئی لوگوں کا ذکر ابھی نہیں ہو سکا۔ جیسے ممتاز استاد، طنز نگار اور کالم نویس ساجد ملک جو باقی صدیقی کے ہم جولیوں اور ملنے والوں میں ہوتا ہے۔ ساجد ملک رشید نثار کی طرح پوٹھوہاری علاقے کی تاریخ اور انسائکلوپیڈیا ہیں۔ اسی طرح بریگیڈیئر صولت رضا کی کتاب ''کاکولیات'' جو 1975ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے 31 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ راولپنڈی کی ادبی روایت کا یہ بھی اعزاز ہے۔ راولپنڈی کی ادبی روایت کا ایک اور کتاب مجموعہ نعت جس کی نسبت علامہ محمد اقبال سے ملتی ہے وہ مجموعہ عبدالحق قریشی کا ''لاالہ طور'' ہے۔ قریشی صاحب کا تعلق راولپنڈی کے تھانہ چونترہ کے علاقے ادھوال سے تھا لیکن کینٹ ایریا راولپنڈی کے بارے سٹریٹ پر رہے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خوشنویس اور خطاط بھی تھے۔ آپ ممتاز خوشنویس عبدالمجید پروین رقم کے شاگرد خاص تھے۔ علامہ اقبال کا سارا کلام پروین رقم نے لکھا۔ وہ چونکہ علامہ کے دوست بھی تھے تو ایک بار پروین رقم نے علامہ سے کہا کہ میں لکھنا چھوڑ رہا ہوں۔ علامہ اقبال نے جواب دیا میں پھر شاعری چھوڑ دوں گا۔

پروین رقم کے جانشین خطاط عبدالحق قریشی کی زوجہ بھی شاعرہ تھیں اور ان کی ساس فاطمہ بی بی بھی شاعرہ تھیں ـــ جن کا بیٹا بریگیڈیئر آئی آر صدیقی جو کئی کتابوں کے مصنف، محقق، مورخ اور ماہر تعلیم جو ملٹری کالج جہلم، کالج آف آرمی ایجوکیشن مری، آرمی برن ہال ایبٹ آباد، اور روٹس سکول اینڈ کالج لاہور کے پرنسپل اور کمانڈنٹ رہے ـــ یہ خانوادہ پوٹھوہار میں بالخصوص راولپنڈی میں شعر و ادب اور صحافت کی آبرو ہے۔ بریگیڈیئر آئی آر صدیقی کا 31 واسطوں سے نسبی سلسلہ ایشیاء میں موجود اسلام کے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی ان دو شاخوں میں سے ایک شاخ ترکی میں جو مولانا جلال الدین رومی تک اور دوسری شاخ جو پھالیہ کے بزرگ صوفی شاعر شاہ مراد سے جا ملتا ہے ـــ معروف مصنف بریگیڈیئر گلزار اور جسٹس لہراسب کے قبیلے بابا شاہ مراد کے عقیدت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔

شاہ مراد جنہیں اردو کے معروف شاعر ولی دکنی پر زمانی سبقت حاصل تھی جو مغلیہ دور میں عہد عالمگیری کے ممتاز صوفی شعراء میں شامل تھے۔ ان کی چونکہ نرینہ اولاد نہیں تھی صرف دو بیٹیاں تھیں اسی لئے اس خانوادے کا سلسلہ نسب عورت سے چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بریگیڈیئر آئی آر صدیقی (عنایت الرحمن صدیقی) اپنے نام کے ساتھ قریشی کے بجائے صدیقی لکھتے ہیں۔

بریگیڈیئر صدیقی کے بھانجے، معروف نقاد، کالم نگار، میر جنت، شاعر اور ماہر تعلیم عرفان صدیقی اور شاہد صدیقی بھی نام کے ساتھ قریشی نہیں صدیقی لکھتے ہیں۔ ''جماعت اسلامی کے ممتاز سکالر مولانا نعیم صدیقی جو 10 کتابوں کے مصنف تھے ـــ وہ عرفان و شاہد صدیقی کے ماموں تھے ـــ گویا پوٹھوہار اور خاص طور سے راولپنڈی کی ادبی تاریخ صدیقیوں کے اس گھرانے کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی! ـــ وما علینا الا البلاغ المبین

◆◆◆

دبستانِ فلم کے نعت نگار: اعتقاد اور انتقاد کا سنگم

جمیل احمد عدیل

جناب اکرم کنجاہی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ موضوع چنتے ہوئے انفرادیت سے اکثر و بیشتر دست بردار نہیں ہوتے۔ اس طرح اپنے تحقیقی و تنقیدی دوائر کو بھی روایتی مضامین سے مناسب فاصلے پر رکھنا ان کا امتیازی وصف ٹھہرا۔ دراصل یہی طبعی گریز انہیں تقلیدی اقداری اثاثے پر اکتفا، تسوید میں توقف، ندرت کی جانب جھکاؤ اور فوری مقبولیت سے بے نیازی سمیت چیدہ و نادر نکات کی کھوج کو مشہور کرنے کی بجائے ممتاز کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مذکورہ مصنف کی تازہ تصنیف ''دبستانِ فلم کے نعت نگار'' اس لیے بھی توجہ کا مرکز بنے گی کہ فلم ایسے 'کمرشل کم پاپولر میڈیم' کے ذخیرے سے کسی سنجیدہ و معتبر ادبی جہت کی دریافت بادی النظر میں جوئے شیر لانے کا کام ہے۔ کم و بیش پون صدی کو محیط متذکرہ مواد کی چھان بین کے دوران اکرم کنجاہی صاحب نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ اصنافِ نثر میں ڈراما اور اصنافِ نظم میں گیت اپنے مجرد متن کے ساتھ تاثر کو ادھورا یقین کرنے پر مجبور ہیں۔ واقعتاً یہاں 'ٹیکسٹ' محض ایک آدھے بدن سے قائم بالغیر کیسے۔ جب تک ڈرامے یا فلم کا اسکرپٹ دیگر متعدد لوازم کے ساتھ 'عمل پیش کش' میں مبدل نہ ہو جائے، وہ 'معلق' رہتا ہے۔ جب تک ملفوظ گیت، ساز و آواز کی شمولیت سے محروم رہے اسے جسد کی متلاشی روح کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب قضیہ یہ ہے کہ 'فلمی شاعر' ہونا ہی ایک 'تہمت' بن گئی ہے کہ باقاعدہ شاعر اپنے شہرت یافتہ کوچے سے دوری میں اپنی تخلیقی عظمت مضمر گمان کرتے ہیں۔ بصد اختصار! اسے ماضی کی رسمیت کہا جاتا ہوگا۔ تسلیم کہ مجموعی انحطاط نے فلمی شاعری کو بھی خاصی زک پہنچائی ہے لیکن اس بنیاد پر فلم کے لیے لکھنے والوں ہی کو سرے سے مسترد کر دیا جائے، معقول طرزِ احساس نہیں ___ ضمناً عرض ہے کہ حال ہی میں آفتاب خان: ''اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ'' کے عنوان سے اپنی ایک وقیع کتاب منظرِ عام پر لائے ہیں، جس میں موثق تحسین قدر اس سرمائے کے اثبات کے لیے کافی ہے ___ اگر Defecto صورت حال کو مدنظر رکھا جائے تو فلموں کے لیے گیت لکھنے والوں کی نعتیہ شاعری اور وہ بھی فلمی ضرورت کے تحت، یکسر دینی تقاضوں کو بجا لانے کا موجب تو حق ہے، لیکن اس گنجائش کو نظر انداز نہیں ہونا چاہیے کہ کہانی کے فطری بہاؤ یا Situation کے حساب سے نعتیہ کلام اپنا جواز فراہم کر بھی سکتا ہے کہ آپ سے استمداد عقیدے کا حصہ مانا جاتا ہے۔ ایک تجزیے کے مطابق: ''فلم بینوں کی طرف سے فلموں میں حمد و نعت کے ساتھ قوالیوں کو بھی بہت سراہا گیا۔ کردار جب کسی مشکل صورت حال سے گزرتا تو اس پر قوالی کو فلمایا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔'' قوالی میں نعتیہ کلام کی پیش کاری کافی مرغوب صورت ہے۔ اکرم کنجاہی کا میلان وسعتِ نظری کی طرف واضح ہے۔ سو وہ ان نعتوں سے صرف اس لیے دوری اختیار کرنے کے حق میں ہرگز نہیں کہ انھیں فلموں کی وساطت سے پسندیدگی ملی۔ بے شک فلموں کے لیے کہی گئیں بعض نعوت ایسی ہیں جو سننے والے کو بے خود کر دیتی ہیں۔ شاعری،

ترنم ریزی اور ساز بیٹے نے متحد ہو کر کیا قیامت برپا کی ہے؟ "ذوقِ سماع" سے عاری کیا سمجھ پائے گا؟!

اس طرف سے لیا ہوا یہ نکتہ بھی بیان کا مطالبہ کرتا ہے کہ کئی نعتیں ایسی ہیں جنھیں وسیع پذیرائی پہلے مل چکی تھی۔ ان کے خالق بھی فلمی Lyricists نہیں تھے۔ ایسی نعتوں کو فلموں کا حصہ بعد میں بنایا گیا۔ کیا یہ عمل ان نعوت کی مرتبت کو متاثر کرنے کا سبب بنا؟ یہ سوال ایسا سادہ نہیں ہے۔ مقام کی تبدیلی ایک حد تک اثر انداز ہو سکتی ہے۔ حکمت کی بات کس زبان سے ادا ہو رہی ہے؟ مخصوص اخلاقیات سے وابستگان میں یہ استفہام نظر انداز نہیں ہو سکتا۔ نعت نگاروں کا نگار خانے میں قدم رکھنا خاص سماج کی آنکھ اور طرح سے دیکھے گی۔ لوگ پاک عملی لحاظ سے کیسے بھی ہوں مگر کسی فلمی گانے کی دھن پر نعت کی کمپوزیشن انھیں مضطرب کرتی ہے۔ خاص سوچ رکھنے والے اسی لیے نعت خوانی کو 'پروفیشن' بنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان محافل کو محض کمائی کا ذریعہ بنانے والے زرق برق نعت خوانوں ہی نے مشہور ساحر کو سامنے رکھ کر نعتوں کی طرزیں بنا لیں۔ مارکیٹ میں ایسی نعتوں کے انتخابی مجموعے بھی دستیاب ہیں جن میں ہر نعت کے اوپر فلمی گانے کا شعر درج ہے جس کی طرز پر اس نعت کو گایا جا سکتا ہے۔ اصولی طور پر تو نعت کے لیے خوش نوائی ممنوع ہے نہ تغنیت اس کے لیے لازم ہے مگر کسی گانے کی لے پر جب نعت گائی جائے گی تو پہلا دھیان مشہور دھن کی جانب ہی منتقل ہوگا، یوں منزہ احساسات کو جھٹکا تو لگے گا۔ جس میں جا کر ذہن ارادت / پذیرائی کو گزند پہنچنے کا احتمال ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے منفی جذبات کو Provoke کرنے کے لیے ٹھمری اور دادرا ایجاد ہوئے۔ اب اس روایت سے بول بنانے کی یہ کشش کا آزمائی تو جا سکتی ہے مگر اس ذریعے پر انحصار کرتے ہوئے حمد یا نعتیہ رجحان کا استعمال مثبت قرینہ شاید ہی مہیا کر سکے۔ گویا بعض تقاضے ایسے ہیں جن سے چشم پوشی نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح دوسری انتہا سے اجتناب بھی ضروری ہے۔ ثقافتی حیات کے بغیر صحتمند معاشرہ ہی وجود میں آتا ہے۔ جس میں ایمان کا مقصد تقیہ ہے۔ آرٹ کا گلا گھونٹ دیا جائے گا تو تعصبات کی دیواریں اونچی ہی ہوتی چلی جائیں گی۔ دین بے شک "آسمان" سے اترتا ہے مگر وہ 'زمین' کی نفی نہیں کرتا۔ جانے کیوں ہم آہنگ اور سر تال والے کو تفریق کر کے روحوں کو مجبور کرنے کے در پے ہو گئے ہیں! کہیں پڑھا تھا "ہمارے ہاں نعت کی گائیکی کو 'نعت خوانی' کہا جاتا ہے یعنی نعت گائی نہیں پڑھی جاتی ہے۔ یقیناً ایسا صرف مذہبی حلقوں کے خوف سے کیا جاتا ہے کہ جو گائے جانے کو حرام قرار دیتے ہیں ورنہ ایک عام شخص بھی جانتا ہے کہ گانے اور پڑھنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ تحت اللفظ اور خوش الحانی سے آپ پڑھ سکتے ہیں لیکن ہر وہ کلام جو ترنم اور سر تال میں ہوگا، وہ گیت یا گانا ہی ہوگا چاہے اس کے مندرجات کچھ بھی ہوں۔" حقیقت یہ ہے کہ حمد، نعت، سلام، منقبت، مرثیہ کوئی بھی مقدس کلام ہو اصواتِ الموسیقی میں جذب ہو کر وہ یقیناً زیادہ پُرتاثیر، زیادہ مقدس ہو جائے گا لیکن اس کے لیے پہلے سے موجود گانے کی طرز سے فاصلہ اختیار کرنا لازم ہے۔ اکرم کنجاہی نے ان مسائل سے اغماض نہیں برتا چنانچہ انھوں نے تاکیدی تنبیہات پیش کر دی ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ اس کتاب کے مقدس موضوع اور آداب کے پیش نظر دبستانِ فلم کے صرف ایسے شعرا کی فلمی مصروفیات کے ساتھ ان کے نعتیہ کلام کا جائزہ لیا ہے، جنھوں نے امام الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور نہایت عجز و انکسار اور جذب و کیف کے ساتھ نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ کتاب کے بالاستیعاب مطالعے سے معلوم ہوتا ہے، اکرم کنجاہی کشادگی کے مطلعے میں کشش کا سامان دیکھنے کے خوگر ہیں۔ یوں سمیا کو حل کرنے میں انھوں نے مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے مختلف اردو فلموں کا حصہ بننے والے نعتیہ متون کو ایک

ورثے میں جو اختراز کر دیا ہے۔ اگر وہ سوچ سمجھ کر یہ انتخاب نہ کرتے یعنی چھانٹی عمل میں نہ لاتے تو بہت امکان تھا کہ فنی کمزوری کے باعث شکست طاری ہو کہ اس کتاب کو گویوں، سازندوں اور پیروڈی کمپوزروں کی تاریخ بنا دیتے۔ مصنف ایک زیرک نقاد ہیں، بھلا وہ اس فروگزاشت کے مرتکب کیسے ہو سکتے تھے! اس نئی Hierarchy نے کتاب کی قدر میں اضافہ کیا ہے۔ اکرم کنجاہی نے اس نازک جادے کا راہی ہو کر اس تقدیس کے زجاج کی نگہداشت کا حق ادا کر دیا ہے جو اس کا اساسی تقاضا تھا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو نقد کے جوہر نے "سیاق وسباق" کو اپنی متعین حدود سے متجاوز نہیں ہونے دیا۔ اب نعت اور نعت علی الترتیب پہلے درجے میں ہیں۔ باقی جو کچھ ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں مگر وہ مقدار میں زیادہ ہونے کے باوجود مقرر کردہ درجے ہی میں رہتے ہوئے قاری کے ذہنی افق کو وسعت آشنا کرنے کی ذمہ داری ادا کر رہا ہے۔ اس طرح معلومات کے عدد میں بہت کچھ نیا جذب ہوتا چلا جاتا ہے لیکن مقدس فضا پر غالب نہیں آتا۔

نعت کی روحانیت کو اس کتاب میں مرکزی اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس کے مصنف اکرم کنجاہی خود شاعر اور نقاد ہیں، سو ان کا شعورِ نعت تربیت یافتہ اور بالیدہ ہے۔ وہ قاری تک تفصیلات ضرور پہنچاتے ہیں لیکن انھوں نے ہر قدم پر یہ بھی باور کرایا ہے کہ ان کی Domain کہیں تک نہیں۔ آپ اس دستاویز کا مطالعہ کرتے جائیے، آپ کی مدرکہ خود گواہی دیتی جائے گی کہ لطیف تر تجربے کا مقیاس متواتر فعال ہے۔ یعنی مصنف لزوم و احتیاط کے ساتھ نعوت کو تعبیرات کے عمل سے برابر گزار رہے ہیں: "ہمارے ہاں نعت کو بکاؤ مضمون یا چونکا دینے کے لیے بعض حیران کن مضامین باندھتے ہیں، خاص طور پر واقعہ معراج کے حوالے سے ہماری نعت میں عجیب عجیب مضامین ملتے ہیں۔۔۔ معراج کے موقع پر تصوراتی وخیالی منظر کشی۔۔۔ خلافِ حقیقت ہے۔" انھوں نے یہ رائے دیتے ہوئے قرآن کو کسوٹی بنا کر اپنے فہمِ دین کی سرفرازی خوبی سے ظاہر کر دی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اکرم کنجاہی نے نظموں میں شامل منظوم توصیفِ پیمبر کو ایک اور طرح کی Contextualization سے ہمکنار کر دیا ہے۔ یہ غیر محسوس قدم اس لیے ضروری تھا کہ انھیں نعتیہ ابیات کا تقدس سب سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان نعتیہ زمزموں سے منسوب محاضرات کی جاذبیت ہی نے ان صفحات کو نئی معنویت بخشی ہے کہ اب سیاق فنی کم علمی زیادہ ہو چکا ہے۔ بخصوص سوانح نگاری کے بعد تجزیہ و تنقید کے پیمانے سرگرم ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔ بلاشبہ نعت جوہری سطح پر عقیدت کی مظہر صنفِ سخن ہے۔ یہاں مدحت کی پاکیزہ ذات کے ساتھ وابستگی جذبۂ احساس کو دوام تسلیم کرتی ہے۔ بقول مصنف "نعت حضورؐ کی ذاتِ ستودہ صفات سے قلبی تعلق کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔" عین اسی مقام پر ایک ہوشمند یاد رکھا ہے "عشق" کو نشان زد کر کے گویا قبلے کو درست کر دیتا ہے۔ اکرم کنجاہی کے پیہم تفحص اور مطالعے نے انھیں جو فکری ترفع عطا کیا ہے، اسی کو وہ یہاں بروئے کار لا کر سرخرو ہوئے ہیں۔ اس مناسبت سے "صہبا اختر کا مدحِ نعت" بار بار پڑھے جانے کے لائق مضمون ہے۔ اس اعلا تحریر میں اعتقاد اور انتقاد کا امتزاج قاری کے لیے دل کشائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھنے والے نے زمامِ شوق ثقافتی تھامنے کی بجائے اعتدال و توازن سے مضمون الضمار کو مستحکم بنا دیا ہے۔ نعت نگاری کرتے ہوئے صہبا اختر اپنی سادگی میں آگہی کے دام سے دامن نہ بچا سکے تو اکرم کنجاہی بھی گرفت میں نہیں آئے۔ ان کی بصیرت نے غایت بے ساختگی کے ساتھ نعت کے معیارات کو دو ان تعین ہی نہیں جزوِ شعور بنا دیا ہے: "انکسار اور کم مائیگی کا اظہار تقدیسی ادب کی شرطِ اولیں ہے۔ (صہبا) نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یکتائی اور انفرادیت کو اپنی تنہائی کے ساتھ ملا رہے ہیں۔ یہ غور کا

مقام ہے (یہ دعا نہیں کر) اپنی ہی انفرادیت سے اپنی تنہائی کا مداوا کیا جائے۔"

اس دیباچے میں کچھ نہیں، کو ملتا ہے۔ یوں اخلاص مجسم ہو کر رہنما ہو جاتا ہے۔ یہ محض ایک نمونہ ہے ورنہ پوری کتاب اسی محبت آمیز اور شائستہ اسلوب میں ڈھلی ہوئی ہے۔ دوران مطالعہ وہی یاد آتے رہے: "علم را برتن زنی مارے بود، علم را بر دل زنی یارے بود۔"

یوں تو زیرِ نظر کتاب کی ساری تبویب ہی دانائی کی ترجمان ہے لیکن پہلے باب کی علمی اہمیت علاحدہ اختصاص رکھتی ہے۔ اس تمہیدی تحریر کا عنوان ہے: "گیت اور گیت نگاری کا ارتقا" یہ مبسوط نگارش گیت سے وابستہ فنی و تحقیقی مباحث کی روایت کا ذخیرہ ہے۔ Etymological Study سے لے کر دیگر قسموں: خیال، ٹھمری، دادرا، قول، ترانہ، ترووٹ، قوالی، چترنگ، سادرا، ہوری ___ قلبانہ، منقبت، نیا دھر، چترانہ، سہرے، زیر و بک، لنکا، مستک، جنگل، سوت، واڑنگ، لیلا، لوری۔۔۔ کی ترتیب میں اشارت اپنی جگہ: اس کی تدریجی مسافرت کا مفصل بیان بھی اپنے مقام پر: غنائی لہجوں کی اہمیت راگ راگنیوں سے سنگت کی بدولت یہ داستان چلنے کی داستان بھی اپنے محل پر۔ اس کے ساتھ ساتھ میراثی کا یہ کہنا: "پہلے آوازیں، آواز کا اتار چڑھاؤ سُر کہلایا، سُروں کے ملاپ سے بول نے جنم لیا اور پھر راگ ڈوری میں بندھ کر بول گیت بن گئے۔" لیکن جو مضمون ان اوراق میں تشکیل ہوا ہے وہ فی الاصل اگلے باب کے ساتھ بلاواسطہ انسلاک قائم کرتا ہے، جس کا سرنامہ ہے: "بگلی اتساہی کی تقدیسی گیت نگاری" مصنف کے الفاظ میں: "ان کے گیتوں کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ گیت نگاری کے عمل نے بھی یہ اعزاز پایا کہ وہ بھی تقدیسی ہو گیا کیونکہ ان کے بہت سارے گیت مذہبی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔" یہ تصریح جواز سے تہی نہیں ہوئی کہ مذکورہ مقدس گیت کی قرأت میں مقامی روایت کا پیش کار ہے، ورنہ عہد نامہ عتیق میں داؤد کے نغمے اور غزل الغزلات کا حصہ بھی اسی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ ماضی کے مزمور / مناجات تو اپنی جگہ، جہاں قرون میں 'مشتہر مزامیر' کی ترغیب بھی ہمارے ہاں کوئی اجنبی وعدہ نہیں۔ موسیقی اور مذہب میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شاہ احمد دہلوی کے مطابق: "دینی امور میں سب سے زیادہ جوش اظہار عبادت میں ہوتا ہے اور دنیوی امور میں عشق و محبت میں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گانے کی ابتدا عبادت اور عشق سے ہوئی۔" بہر صورت بگلی اتساہی کی بارگاہِ رسالت میں عرض کی گئی ثنا خوانی نے نعت کو آہنگ فراہم کر کے اسے 'گیت' کے زمرے میں داخل کیا۔ اب لحن اور دُھن کے ملن سے وجود پایا ہوا جادو کب گریزاں ہونے دیتا ہے کہ روح 'بلودای' سے قطرہ قطرہ لذت کشید کرتی ہے: "موسیقی حسن سمع کے ذریعہ روح کو اس وجہ متاثر کرتی ہے کہ خود فراموشی اور وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔" ڈاکٹر عاصی کرنالی کے الفاظ میں: "ہماری شعری روایت میں غنائیت کا ایک خاص مقام ہے۔ لفظوں کا حسنِ انتخاب اور شعر میں ان کی تنظیم، نیز بحور کا چناؤ اور مختلف مصرعوں کے اختصار و طوالت میں ایک خاص حسنِ توازن، یہ ساری باتیں مل کر غنائی التزام قائم کرتی ہیں۔" اس طرح نعت میں موجود صادق احساسات الاپ میں جذب ہو کر رفتہ رفتہ سامعین کو مسحور کرتے چلے گئے۔ کتاب کے باقی تمام ابواب اسی پس منظر میں اپنی وقعت کے لیے فضا مہیا کرتے ہیں۔ تحقیق کو اس منہاج کے توسط سے مضبوط تحقیقی، فنی، اسلوبیاتی اور موضوعاتی بنیادیں دے کر مصنف نے اسے تذکرہ نگاری کی سطحیت سے صاف بچا لیا ہے۔ اب یہ کاوش ایک موقر تحقیقی تجدیدی حوالہ ہے۔

کتاب کے مندرجات پڑھتے ہوئے فراخی کا احساس ہوتا ہے۔ اکرم کنجاہی نے ان غیر مسلم شاعروں، مغنیوں اور موسیقاروں

کا بے تعصبی سے ذکر کیا ہے جنھیں فروغِ نعت کی سعادت میسر آئی۔ اس پس منظر میں: ثنا شگفتہ، آشا جوزف، حلیم رضا (Noel Dias) آئرین پروین (Irene Perveen)، روبن گھوش کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ترقی پسند شعرائے کرام کی تحسین سے بھی اعراض نہیں برتا گیا۔ گویا کتاب اپنے موضوع کی مرکزیت سے بندھ کر رقم ہوئی ہے۔ مصنف نے کسی روایتی مسلک کو تحت الشعور میں بھی فوقیت نہیں دی۔ صرف اور صرف صداقت کی پیامبر نعت سے والہانہ شیفتگی اور لگاؤ کو ترجیح دیا گیا ہے۔

یہ کتاب ایک مستند ادیب نے لکھی ہے۔ اس لیے وہ جمالیات کہیں منہا نہیں ہوئی جو پہلے تو دل کو موہتے شبدوں کی ڈور سے باندھتی ہے پھر قواعد و کے دھیان کو گرویدہ رکھتی ہے۔ ایک قاری کی حیثیت سے یہ ذاتی سا تاثر ہے کہ چوبیس (24) شعراء کے لیے الگ الگ جاذب عنوان تادیر راقم کی وادیٔ خیال کو مہکاتا رہا۔ ان دلکش نگینوں کی ایک جھلک آپ کے آئینہ ابصار کی نذر: کرم گستری کا حتمی آرزو، اکسیرِ آبیاری، یزدانی جالندھری کا چمن زارِ نعت، عقیل بدایونی کا عطرِ فردوس، بندۂ بے دام محسن کا شمیری، سرور بارہ بنکوی کی چشمِ شوق۔۔۔ باقی آخر میں صرف یہ کہنا ہے کہ اس مقالے کا موضوع اپنے بطن الطون میں ہم آہنگ کشش و گریز کی صورت حال لیے ہوئے ہے۔ یوں اصولی سطح پر اس سے عہدہ برآ ہونا کارے دارد تھا کہ بہر حال یہاں دو متضاد قطب یکجا کیے گئے ہیں۔ مکرم اکرم کنجاہی نے اس عاجز کی دانست میں بروقت اور درست فیصلہ کیا جنھیں گرے ایریا میں رہ کر یہ کتاب لکھی۔ اسی لیے قارئین سے بھی توقع ہے کہ وہ بلیک اینڈ وائٹ میں سے کسی ایک پر بھی اصرار نہیں کریں گے۔ بامستثنٰی ماسوا واجبی مکرر اختلاف حاصل ہونے کا تو اس میں ہر فرد آزاد ہے۔ اختلافیت کے مصائب سے اور ان کو وسعت عطا کی ہے۔ اکرم کنجاہی صاحب! لکھتے رہیے کہ آپ کو پڑھنے سے وجود میں نشاط و طرب ہوا پاتا ہے!!

◆◆◆

تخلیق تقریب 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات قلم بند

سونان اظہر ایک محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔ ان میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتیں ہیں۔ جس باوقار طریقے اور محبت کے ساتھ تخلیق ایوارڈ کی سالانہ تقریب کا انعقاد کیا گیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ تخلیق ایوارڈ کی یہ تقریب خالص ادبی تقریب ہے جس میں ادیبوں، شاعروں اور علمی و ادبی شخصیات کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ شوبز کی دنیا اور صحافت کے میدان کے شہسوار بھی یہاں موجود ہیں۔ اس وجہ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ عرصہ بعد ایک خالص ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا ہے۔ "فنون" اور "اوراق" کے بعد ماہنامہ "تخلیق" واحد ادبی جریدہ ہے جو باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ جس میں اعلیٰ ادبی معیار کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ میں تمام شاعر، ادیب برادری کی جانب سے اس پُرمسرت موقع پر اظہر جاوید کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اتنی بھرپور تقریب منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر عاقر شیخ)

ڈاکٹر خرم الطاف کا شعری مجموعہ "جانِ شوریدہ"

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

"جانِ شوریدہ" فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر خرم الطاف کا شعری مجموعہ ہے۔ ان کے تخلیقی سفر کی عمر اگرچہ طویل نہیں لیکن اسلوب، فکر و فن کے لیے رجحانات کی ترویج کا اعلان عام ہے۔ ان کی شاعری قدیم اور جدید رویوں میں گندھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے لفظوں کو اپنی ذات کے غار حرا میں لے جا کر یا معاشرتی زندگی کے چوراہے میں کھڑے سخن کی دنیا سے فن کی دنیا آباد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خرم الطاف مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل ہیں۔ عمومی طور پر ان کے لبوں پر خاموشی کا پہرہ محسوس ہوتا ہے لیکن محفل دوستاں میں وہ صرف لب کشائی کرتے ہیں بلکہ دوستوں کو متبسم ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے ہی ان کا تخلیقی شعور چھوٹے بڑے رسائل میں نکھر آیا جاتا تھا۔ پنجاب میڈیکل کالج کے در و دیوار ان کی خوبیوں کے گواہ ہیں۔ ڈاکٹر خرم ایسے مزاج کے قلمکار ہیں جنھیں شہرت و ناموری کا شوق نہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں قلم تو دوسرے ہاتھ میں نشتر ہوتا ہے۔ وہ قلم سے معاشرتی تصویر کشی کرتے ہیں اور نشتر سے ارد گرد پھیلے ہوئے ناسور ختم کرتے ہیں۔ ان کے لفظوں سے یہ بات عیاں ہے کہ وہ غم دوراں اور غم جاناں کا ایکسرے کرنے کے علاوہ الٹرا ساؤنڈ بھی کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ مشاہدے اور تجربے کی بنا پر وہ معاشرتی ناہمواریوں کی وجوہات تلاش کر کے انھیں دور کرنے کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔ انھوں نے انسانی رشتوں کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔ جذبۂ احساس اور حسن تخلیق سے اپنے سامنے ہونے والے واقعات بیان کرنے کی جسارت کی ہے۔ ان کا صاف ستھرا اور پرکشش اسلوب ان کی غزل اور نظم میں نمایاں ہے۔ ماحول کی آشفتہ سری یقیناً جانِ شوریدہ سے ہی ممکن ہے۔ 160 صفحات پر مشتمل ان کا دوسرا شعری مجموعہ 10 نومبر 2022ء کو منصۂ شہود پر آیا ہے۔ ثمر ادبیک اور ڈاکٹر شبیر احمد قادری کی محنت شاقہ سے معروف ادارہ مثال فیصل آباد/لاہور نے اسے زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ قارئین ایک ہزار روپے کے عوض خوبصورت غزلوں اور نظموں کا گلدستہ حاصل کر سکتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ 2017ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "چشم نم" مثال پبلشرز فیصل آباد کے محمد عابد نے شائع کیا تھا۔ 168 صفحات پر پھیلی ہوئی غزلیں ڈاکٹر خرم الطاف کی فنی ریاضت کا اظہار ہیں۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، ڈاکٹر ظفر حسین تسکین، ڈاکٹر عارف مسعود راے اور طاہر جیلانی کی تجزیاتی سطور کے ساتھ "چشم نم" نے ادبی حلقوں کو ایک تحفے سے سرفراز کیا۔ پانچ سال بعد دوسرا شعری مجموعہ "جانِ شوریدہ" ہمارے سامنے ہے۔ میرے ہمدم دیرینہ ڈاکٹر افتخار فیصل کی وجہ سے 2023ء کے پہلے دن جم خانہ سرگودھا میں "جانِ شوریدہ" کے خالق ڈاکٹر خرم الطاف سے روبرو ملاقات ہوئی۔ انھیں گفتگو کرتے اور شعر پڑھتے سنا تو احساس ہوا کہ ڈاکٹر خرم الطاف جس موضوع پر چاہیں اسے تخلیقی پیرہن عطا کر سکتے ہیں۔ شاعری ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہوتی، وہ وقت کے پروں پر اڑتی ہے۔ غزل ادب کے ماتھے کا جھومر ہے اور شاعری کی پہچان کا استعارہ بن کر قاری کی سماعتوں تک پہنچ جاتی ہے۔ "جانِ شوریدہ" میں غزلیں اور نظمیں بہار دکھا رہی ہیں۔ حمد و نعت، سلام اور ماں کی نذر پڑھتے ہی ڈاکٹر خرم الطاف کے شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لفظوں کے بے تاج بادشاہ ناقد اور محقق طاہر جیلانی فیصل آباد کے ادبی افق پر نمایاں ہیں۔ "جانِ شوریدہ"

کے بارے میں ان کا یہ محبت ملاحظہ ہو: ''جانِ شوریدہ'' کی شاعری غیر روایتی ہونے کے باوجود روایت سے منحرف نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب مختلف زبانوں کی مخصوص شعری روایات اور مخصوص طرزِ اظہار کا نہ صرف ادراک رکھتے ہیں بلکہ تخلیقی طور پر اسے ملحوظ رکھنے کی سعی کرتے بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اس امر کی مثال مجموعہ ہذا میں شامل ان کی پنجابی اور اردو تخلیقات کے طرزِ احساس، اظہاری رویے اور اندازِ پیشکش کے امتیازات بروئے کار لانے سے دی جا سکتی ہے۔ ان کی پنجابی شاعری کلاسیک پنجابی شاعری کے تجریدی رجحانات نمایاں کرتی نظر آتی ہے جب کہ اردو شاعری سے عصرِ حاضر کی شعری جدلیات کا عکس نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ ''جانِ شوریدہ'' کی لسانی تخصیص کے اعتبار سے پنجابی اور اردو تخلیقات جب کہ باعتبار صنفی تخصیص نظم اور غزل کا باہم دگر تجزیاتی موازنہ اپنے شاعر کی دونوں زبانوں کی لسانی و صنفی مقدرت پر یکساں دسترس کا اثبات فراہم کرتا ہے۔'' خاور جیلانی کی ان سطور کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کا مظاہرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور پھر شاعر دونوں احساس ہمدردی جمع ہو جائیں تو ڈاکٹر خرم الطاف کی شخصیت میں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ذوقِ شعری کو اپنے فرائضِ منصبی پر ترجیح نہیں دی۔ اردو، پنجابی شاعری کو ذوقِ ادب کا اظہار بنایا۔ انھیں نام و نمود کا شوق نہیں لیکن پھر بھی ڈاکٹر خرم الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے ملک بھر میں اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خرم الطاف کی اپنے بارے میں کیا رائے ہے۔ ملاحظہ ہو: ''مجھے شاعر ہونے کا ہرگز کوئی دعویٰ نہیں ہے البتہ میں ایک رومانیت پسند بندہ ضرور ہوں میں اپنے اندر سے اٹھتی ہوئی صداؤں کو اشعار کے لفظوں میں ڈھالتا تو شاعر لوگوں کا زیر بن جاتیں۔ میں نے جب یہ ساری خود کلامی جمع کی تو یہ جمع آوری دوسری کتاب کے مطلوبہ مواد کے لیے کافی محسوس ہوئی اس مواد کو کتابی شکل میں سامنے لانے کے محرک میرے دوست اور شاعر شہزاد بیگ ہیں جن کی خواہش تھی کہ اس کلام کو بھی کتابی شکل میں سامنے آنا چاہیے۔ سو میں ان کا بہت ممنون ہوں ورنہ میں کبھی دیباچہ کر پاتا۔ میں جناب خاور جیلانی کا بھی دل سے بہت ممنون ہوں جن کی رہنمائی ہمیشہ میرے شاملِ حال رہی ہے اللہ پاک انھیں سلامت رکھے۔''

ڈاکٹر خرم الطاف کو شاعری سے گہرا شغف ہے۔ وہ اپنی ذات کے کتھارسس کے لیے شعر کہتے ہیں اور دوسروں کو تحلیلِ نفسی کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔ جدید و قدیم رومانوی جذبوں کا اظہار ان کے ہاں ایک نئے پن کی صورت میں عیاں ہے۔ فیض احمد فیض سے بہت متاثر ہیں۔ کہتے ہیں: چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں / تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں / آج بازار میں پابجولاں چلو!!! ''عرضِ ناشر'' میں شہزاد بیگ لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر خرم الطاف کا اس سے پہلے بھی ایک شعری مجموعہ ''چشمِ نم'' کے عنوان سے چھپ کر اہلِ فن سے داد و تحسین پا چکا ہے جو آج سے کم و بیش پانچ سال قبل چھپا تھا۔ ''جانِ شوریدہ'' حالیہ زمانے کی وہ شعری روداد ہے جس کو ایک حساس شاعر نے اپنے اظہار کی سہولت عطا کی ہے۔ فکری اعتبار سے وہ ان ترقی پسندانہ رومانی شعری روایت کے علمبردار ہیں جس کے سرخیل فیض اور فراز رہے ہیں۔''

جمال پسندی، ترقی پسندی اور محبت پسندی ڈاکٹر خرم الطاف کی شاعری میں رنگ بھرتی ہیں۔ ان کا مذاقِ عشق کی صورتوں میں نمایاں ہے۔ حُسن ان کے قلب و روح کا حصہ ہے۔ فنِ شعری سے آگہی اور ریاضت کا ذخیرہ کر کے ہی ایک شاعر کامیابی کی منازل طے کرتا ہے۔ ممتاز شاعر اور سینئر صحافی ڈاکٹر افتخار فیصل نے یادش بخیر کے طور پر ''جانِ شوریدہ'' کے بارے میں لکھا ہے: ''ڈاکٹر خرم الطاف ہمارے عہد کی گزری کہانی اور شاعرانہ ذوق کا وہ حوالہ ہیں جو پنجاب میڈیکل کالج لائلپور کے ماضی کا اثاثہ ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ انھوں نے ادبی مجلسی زندگی کو بعد از زمانہ طالب علمی جاری و ساری رکھا۔ ان کا تخلیقی واردات اور عصرِ رواں کے درد کے حوالے سے سلیقہ

اظہار سادہ، سہل اور اثر انگیز ہے۔ ان کا بے ساختہ پن اختصار پسند ہے اس لیے چھوٹی بحر کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا شعری رچاؤ تشبیہ ایہامات سے۔ ان کی شعری کائنات کی حد بندی غزل اور نظم سے عبارت ہے جو قاری سے مکالمہ اور دکھ کا مکالمہ کرتی ہے۔" ڈاکٹر ثاقب ندیم لفظوں سے دل تسخیر کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ صحت لفظی اور شعر میں ڈوبنے کا سلیقہ تو کوئی ان سے پوچھے۔ وہ سب کے ندیم ہیں۔ ڈاکٹر خرم الطاف کی خوش بختی ہے کہ وہ ایک عرصے سے ان سے محو کلام رہتے ہیں۔ وہ لفظوں کے ماہر ہیں جن سے وہ دوستی کشید کرتے ہیں۔ وہ "جان شوریدہ" کے بارے میں بعنوان "ایک شرمیلا تخلیق کار" میں رقم طراز ہیں "ان کی شاعری وقت کے ساتھ اپنی منزلیں طے کرتی جاتی ہے۔ ڈاکٹر خرم کا سفر جاری ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ میرے لیے کہیں زیادہ متاثر کن بات یہ ہے کہ ان کی طبع آزمائی کا علاقہ وسیع دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ نظم، نعت، سلام بھی بہت کہہ ڈالا ہے۔ یہ یقیناً عام بات نہیں ہے۔ یہ کلاسیکی روایت سے جڑی ہوئی شاعری ہے لیکن مضامین میں تازگی ہے۔"

ڈاکٹر وحید احمد تو مجھے بھول چکے ہیں لیکن مجھے ان کی کتاب "شفافیاں" پر تبصرہ کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ ڈاکٹر وحید احمد ادب کے اسی کارواں میں شامل ہیں جس میں ڈاکٹر خرم الطاف "چشم نم" اور "جان شوریدہ" کا علم لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر وحید احمد اس کتاب کے حوالے سے رقم طراز ہیں "خرم غزل اور نظم دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ خوبصورت غزلوں کے ساتھ ساتھ متنوع موضوعات پر نظمیں کہتے ہیں جن میں روح عصر نمایاں ہوتی ہے۔ شاعر پر لازم ہے کہ وہ اپنی واردات لکھے، عصر حاضر کی داستان لکھے جس میں وہ زندہ ہے۔ خرم الطاف سخن ور ہونے کی حیثیت سے یہ فرض ادا کرتے ہیں۔ وہ حالات حاضرہ پر شاعرانہ تبصرہ کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں "وبا کے دنوں میں"، "کرونا کے موسم میں ایک غزل جو دوست کی" اور پنجابی نظم "کرونا دے موسم دی عید" اور دیگر نظمیں اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ یہ کتاب اس لیے بھی خاص ہے کہ فیض احمد فیض کو نذرانہ عقیدت ہے۔" ڈاکٹر خرم الطاف جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہیں۔ وہ جہاں بھی گئے اپنی شخصی عظمت اور پیشہ ورانہ مہارت کے انمٹ نقوش چھوڑ آئے۔ کرونا کے حملے کے دوران انھوں نے دکھی انسانیت کی جس طرح خدمت انجام دی ہے، اس کے تذکرے ہر جگہ جاری و ساری ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ذاتی طور پر کرونا وائرس کا مقابلہ کیا بلکہ ہزاروں احباب کو کرونا کے جال سے محفوظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ اشعار کرونا کے منہ پر دے مارے۔ ہسپتال کی گیلری سے ان کی نظریں ضرورت مندوں پر پڑتی ہیں تو الفاظ ان کے شعور سے ہوتے ہوئے لفظوں کی دہلیز تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں وطن سے محبت عیاں ہے۔ چھوٹی بڑی بحر میں شعر کہنے کا یکساں ہنر ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بحری نظموں میں نغمگی اور موسیقی محسوس ہوتی ہے۔ عشق ان کی غزل کا محور و مرکز ہے۔ یہی عشق انھیں زندگی کے آئینے میں نظر آتا ہے۔ وہ درخشندہ مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیریں پوری کرنے کے لیے عذابوں کی رت سے گزرنا پڑتا ہے۔ "جان شوریدہ" کے خواب بڑے حسین ہیں۔ خواب وہ نہیں ہوتے جو نیند میں آتے ہیں، خواب تو وہ ہیں جو سونے نہ دیں اور کام کرنے پر مجبور کریں۔ ڈاکٹر خرم الطاف نے جمالیات کے تمام در کھول دیے ہیں اور قاری اپنا ذوق مقصود اس میں تلاش کر سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ محبت کا چرچا عام کرنے کو ڈاکٹر خرم الطاف کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے۔ "جان شوریدہ" کی اشاعت پر ڈاکٹر خرم الطاف خصوصی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ناشر: بزم ادب، ڈاکٹر شبیر احمد قادری۔ اشاعت: 10 نومبر 2022ء۔ طباعت: سلیم نواز پرنٹرز۔ صفحات: 160۔ قیمت: 1000 روپے۔

◆◆◆

شہزاد نیرّ کی تازہ غزل کا تجزیاتی مطالعہ

مرید عباس خاور

اردو ادب میں نظم و غزل کا تجزیہ کرنے کی روایت مستحکم ہے۔ ہاں، ان دنوں اس نوع کے تجزیاتی مطالعے کم کم سامنے آ رہے ہیں۔ ایسے تجزیہ ادب پارے کی گہری اور کثیر الجہتی تفہیم میں معاونت کرتے ہیں۔ مرید عباس خاور نے ایک غزل کا تجزیہ قلم فرمایا ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔ (مدیر)

غزل

سامان وہ رکھا ہے قرینے سے ہمارا
اب کوچ ضروری ہے مدینے سے ہمارا

اس نے ہمیں تاریخ کے تہ خانے میں رکھا
ہر رزق اترتا رہا زینے سے ہمارا

اک یاد کے شیشے پہ کھنڈر کھود رہے ہیں
اک خواب نکلتا ہے دفینے سے ہمارا

جس دن سے وہ بچھڑا ہے یہ جاتے ہیں سینہ
جی بھرتا نہیں پینے کے جینے سے ہمارا

برداشت کیے جائیں ترے عہد ستم کو
ایسا بھی تعلق نہیں جینے سے ہمارا

کٹتا ہے تری ڈور کہیں اور بندھی ہے
جو رابطہ ٹوٹا ہے سفینے سے ہمارا

حیران کیے جاتے ہیں ہم یاروں کے چہرے
جڑتا ہے عجب واسطہ کینے سے ہمارا

وہ آنکھ اٹھے یا نہ اٹھے اپنی بلا سے
اب ربط بہت خاص ہے پینے سے ہمارا

جناب شہزاد نیرّ ملک کے معروف غزل و نظم کو تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ان اصناف کے ناقدین میں بھی شامل ہیں۔ اردو ادب کا قاری کئی حوالوں سے انہیں جانتا ہے۔ اس مختصر شاعری کی تازہ غزل، قلت قسمت سے مجھے خزانے کی طرح ملی ہے جس پر تم کوئی کا ایک تجزیہ پیش کر رہا ہوں۔ ادب آج سے پہلے ایسا نہ تھا۔ عربی، فارسی، اردو شاعری کے شارحین اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی لسانی تشکیلات کے بعد ثانوی لسانی تشکیلات بھی ہوئیں۔ کلاقلب — یہ اعتراض کرتے جائیں مگر جناب محمد اقبال کی تخلیقی توانائی کے اس کتاب کے ذریعے منکشف ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے جس نے ادب کو نیا عہد دیا۔ خیال تو ثانوی ہو تو تشکیل لسانی تو پابند کے خانے میں آتی ہے۔ اس کتاب سے کیا کچھ ہوا مگر اس کا خیال تو کتنا کنڈل سا گول تھا، وہ گھڑی کینوس پر تلاش کرنے سے مل جاتا ہے کہ اصل میں تخلیق کی محبت کسی کو نامحرم کہنے کی اجازت نہیں دیتی۔

سائنسی تشکیلات لوٹے جس طرح ٹیڈو نے عہد کو ختم کیا اسی طرح تو نہیں مگر اردو کی فسردگی کے اثرات ضرور کم ہوئے۔ جو ہم یہ اس غزل کے بارے تازہ بہ رفتار تشکیل، خیال و انتخاب تراکیب و الفاظ کے حوالے سے افق تازہ کے طور پر احساساتی قوس ہے۔ اسے

گا۔ آفتاب کے شعری فنی محاسن کا تقلیدی اسلوب قرار دینا غزل سے ٹھیک طرح سے لطف اندوز ہونے سے ہمیں اور آپ کو دور کر دے گا۔ ہاں زیرِ نظر غزل بھی تجدید اور نئے پن کی متلاشی ہے جسے سمجھنے کے لیے سرسری تجزیہ کیا جا رہا ہے اور ایک ایک شعر کے حوالے سے یوں ضروری ہے کہ غزل مسلسل خیال کی روادار ہوتی ہی نہیں اور اس کے محاسن میں ہر شعر اکائی ہوتا ہے مطلع یوں ہے:

سامان وہ رکھا ہے قرینے سے ہمارا | اب کوچ ضروری ہے مدینے سے ہمارا

پہلے شعر میں معاشرت کو وقعتِ احترامِ شخصی تو اُسوۂ رسول یاد دلایا جا رہا ہے جس میں کربلا و شام کے سانحات کی علامت کافی حد تک موجود ہے اور یہ عہد کے جبر کو جتلا رہا ہے کہ قافلہ حجاز میں نہ ہو قافلہ عجم ہی میں روایت احترامِ شخصی کا جذبہ بشرط جبر موجود ہے کہ عدل و جبر کے تقاضا است قیامِ معاشرہ کے اسباب علی الترتیب ہیں اور یہی اخلاقی اقدار کی پاسداری کی تمنا ہے۔

اس نے ہمیں تاریخ کے تہ خانے میں رکھا | سو رزق اترتا رہا زینے سے ہمارا

اگلے خوب صورت شعر میں مرکزی خیال اور تکمیلِ شعری حُسن میں نیا پن ہے۔ رزق کے پیچھے پھرنے کی بجائے شاعر وسیلۂ کرم شمار کر رہا ہے یا اساطیری / تاریخی کتب کا وہ ہیرو جو زنجیرِ ملوکیت میں قید زندان ہے پر اسے زینے اترنے والے کی جانب سے اللہ کی جانب سے رزق ملنے کی امید کی تکمیل دیکھنے کو ملتی ہے۔ جبر دو قیدیوں کو تہ خانوں کے زندانوں میں زندگی گزارنا پڑتی رہی اور ہمیں شہنشاہان زمانہ یہ سمجھ کر رزق دیتے کہ وہ دے رہے ہیں مگر قسمت کا تسلسلی عمل ایسا کرتا اور ہر وقت آنے پر ایک موقع ملے پر وہ جبر شخصی کا مشکل امر نبھاتے رہے۔

اک یاد کے تختے پہ کھڑے کھو رہے ہیں | اک خواب نکلتا ہے دفینے سے ہمارا

اگلے شعر میں کراماتی اساطیریت ہے۔ خواب ہمارا وطن ہے ہماری یادیں اس کے آغاز تک پہنچ کر اس خزانے کو ڈھونڈ لاتی ہیں۔ یہ اس ملک کے لیے دی گئی قربانیاں ہیں جو شروع سے اب تک جاری ہیں اور یوں پچھلی یادگی وجہ سے خواب زندہ کی تعبیر مل رہی ہے۔ ناامیدی کے عہد میں امید کی لو ماری وجود رکھتی ہے۔ گویا سائنسی شعور بھی اسے رد نہیں کر سکتا۔ ملک کو کس کس نے اور کیسے کھنڈر بنا دیا کہ لوگوں کو جنہوں نے آزادی کے لیے ہجرت کی، کے اسلاف کو یہ دن دیکھنا پڑا کہ ہجرت کر کے دیگر ممالک سے رزق کمانا پڑا کہ وقت کے شاہان نے ان کے لیے اسے ویران جنگل دے دیا۔ مگر کچھ ایسے محبِ وطن بھی ہیں جو امید کے فولادی ربط سے خوابِ ارضی کو شان سے ظاہر کرنے میں مصروف ہیں۔

جس دن سے وہ بچھڑا ہے بجھاتے ہیں سینہ | بس بھرتا نہیں سینے کے سینے سے ہمارا

اگلے شعر میں میری روایت تغزل کا اندازہ ہے۔ شاعر نے روایت ترک نہیں کی، دکھ کی کمی بھی اپنے اسلوب کی معنویت سے پڑھنے والوں کو محسوس کر سکتا ایک اصول کرامتِ شعری ہے جو یہاں موجود محسوس ہوتی ہے۔ فراق میں سینہ چھلنی ہے جسے سیا جا رہا ہے اور یہ سانس کا عمل بن گیا ہے اور امید و ناامیدی کے مابین یہ عمل سوزن جاری ہے۔ دکھ کا اظہار یہاں بے حد گہرا ہے اور روایت اس کی پختگی کا ثبوت دیتی ہے۔ صنعتِ تکرار نے ظاہری حُسن کو دوچند کیا ہے۔

برداشت کیے جائیں ترے عہدِ ستم کو | ایسا بھی تعلق نہیں جینے سے ہمارا

اگر میں اسے حاصلِ غزل شعر کہوں تو دل کو یک گونہ طمانیت میسر آتی ہے۔ کھلے لفظوں کا بیان غزل نہیں کہلاتا۔ یہاں روایت شہادت کی راہ ہے اور ناروا جبر سے ٹکرانے کا حوصلہ۔ جابر کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا روایتِ اقدار ہے اور فرمانِ آقا بھی۔ یہ شعر پہلودار ہے اگر گذشتہ شعر سے جوڑیں ورنہ اس میں فیض و فراز کا رنگ و اسلوب شہزاد نیّر کے اسلوب میں مہک رہا ہے کہ جس میں زندگی ایک دن کی جا سکتی ہے مگر عزت کی۔ جبر کے لیے راہِ برداشت موجود نہیں مزاحمتی یا تمہ انقلابی رویے وطن کی عوام / قوم کے لیے ہیں۔ پاکستانیت کے فن میں اظہار کے عظیم دھارے سے مرا ہیں گے۔

کٹتا ہے تری ڈور کہیں اور بندھی ہے   جو رابطہ ٹوٹا ہے میسنجر سے ہمارا

اگلا شعر ڈوری کے ٹوٹنے کی لسانی تفہیم کا حسن لو پڑھ ہے۔ رابطہ اور ڈور ایک سے مقام پر نہیں۔ شعری جواز بتاتا ہے کہ دراصل عہد ایسا ہے جس میں یقین و گمان پہلو بہ پہلو ہیں۔ سہل ممتنع ہے۔ اس عہد میں لمحات میں رابطہ کو سمجھا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ ہو یا موبائل، رابطہ محبت والوں میں بھی نہیں ٹوٹتا اور قربت میں تو یہ موجود ہے۔ اس لیے اسے وقت کے ادراک سے محسوس کیا گیا ہے۔ رابطہ کی ڈوری محبوں کی زنجیر ہے۔ ڈور ٹوٹا ہے جس کے آخری سرے کا کہیں اور بندھ جانے کا خوف ہے۔ جہاں محبت نہیں روایات ہیں۔ وہ روایات جو ہر عہد میں سماج بن کر محبت پر شب خون مارتی ہیں تو یہ طرز نہیں المیہ اظہار ہے۔

حیران کے جاتے ہیں ہم یاروں کے چہرے   پڑتا ہے عجب واسطہ کینے سے ہمارا

اگلا شعر یاروں کے چہروں پر خلوص کا نقشہ ہے جیسی ریلیف۔ ایک روایتی عمل ہے جس پر کینہ واضح ہو جانا فطری بات ہے مگر آنکھوں میں چھپے خنجر کی روایت ان دونوں چہروں کی لطافت اور حسن کی کثافت کی صورت میں نمودار ہو رہی ہے۔ اس لیے جدت مضمون میں دلوں کے کینے پر حیرانی کا رویہ ظاہر ہوا۔

وہ آنکھ اٹھے یا نہ اٹھے اپنی بلا سے   اب ربط بہت خاص ہے چشمے سے ہمارا

آخری شعر لطف چشمِ یار کی تشبیہ سے نوشی کا ہے مگر چشمے کا لفظ اس میں صنعت لا رہا ہے۔ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں، روایتی اور شعری معنی مراد ہیں۔ اس شعر میں آنکھوں سے عاشق کی کمٹمنٹ ایسی ہو گئی ہے کہ دورِ حق میں بھی یہ لطف موجود ہے۔ دیکھا جائے تو غزل ہر موضوع کے لیے نیا پن لیے ہوئے ہے یا روایت میں موضوع کا اظہار نیا پن لیے ہوئے ہے۔ یوں یہ جناب شہزاد نیّر کی ایک اور خوبصورت غزل ہے۔

◆◆◆

ضروری اعلان

تمام تخلیق قارئین اور لکھاریوں کو ادارے کی طرف سے یہ اطلاع دینا ضروری ہے کہ پرچے کی رکنیت لینے کا مطلب ہے کہ آپ کو سالانہ باقاعدگی سے پرچہ بھیجا جائے گا۔ پرچے کی رکنیت لے کر ممبر بننے کا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ آپ کی تحریروں کو شامل کرنا ادارے پر فرض ہے کہ وہ رکنیت لینے پر لازمی شائع کریں۔ پرچے کے معیار کے مطابق تحریروں کو شامل کرنے کا اختیار صرف مقررہ کمیٹی کی صوابدید پر ہے اور ادارہ اس سلسلے میں کسی کو جواب دہ نہیں۔

(ادارۂ تخلیق)

پنجاب رنگ

بیت کیہ اے؟

محمد عباس مرزا

میں ہن تیکر اٹھاراں ہزار توں ودھ بیت لکھ چکیا واں اور ایہناں دے لکھن دا سلسلہ زور وشور نال جاری اے۔ اکثر میرے سنیہی تے پڑھیار مینوں پچھدے نیں کہ بیت ہے کیہ؟ ظاہرا ہے تہاڈے ذہن وچ وی سوال اٹھیا ہووے گا کہ ایہ کجھ کجھ تے ہن شے اصل وچ ہے کیہ اے۔ ایس دی تفصیل بڑی دلچسپ اے۔ سرکاری نوکری دے دوران میری پوسٹنگ گورنمنٹ کالج آف کامرس گوجرانوالہ وی رہی۔ اوتھے دن بڑے خوشگوار لنگھے۔ ایہدے بارے وچ میرا اک بیت وی اے۔

لاہوراں دے کیا کہنے پر سجناں توں   گوجرانوالہ وی اے مینوں لہور جیہا

فیر ایہ ہویا کہ پہلاں میرا تبادلہ حافظ آباد، پرنسپل دے طور تے ہویا تے مڑ میں حاصل پور تے سیالکوٹ، تھوڑا تھوڑا چر ایتھاں گزار کے لہور، گورنمنٹ کالج آف کامرس (حال گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج آف کامرس) علامہ اقبال ٹاؤن وچ آ گیا۔ لاہور میری رہائش اعوان ٹاؤن وچ سی۔ دن بڑے چنگے لنگھ رہے سن۔ رب کریم دے کرم نال میں اک کار وی لے لئی۔

اک دن دی گل اے کہ میں اپنے گھر وچ بیٹھا ساں کہ بیل ہوئی۔ میں دروازہ کھولیا تے اگے میرے گوجرانوالہ دے کھوجڑے محترم جناب اشرف فیاض تے جناب محمد صدیق صدیقی کھلوتے سن۔ جنھاں تے چاء چڑھ گیا۔ ایہ میرے بڑے ای پیارے پروفیسر دوست سن۔ گلے ملے، اندر آئے۔ چاہ وغیرہ دا دور چلیا۔ گپ شپ ہوئی۔ دوویں بڑے ای مزاحیہ مزاج دے سن۔ کجھ دیر بعد اشرف فیاض جی آکھیا کہ ہن سانوں اجازت دوو۔ ہن میں دھرم پورے اپنی بھین ول جاناں ایں۔ میں اوہناں نوں آکھیا کہ تہانوں میں ڈراپ کر آواں؟ اوہناں وی دوستی توں اجیہوں نویں نویں کار دا وی شوق سی۔ اوہناں نوں ہور کیہ چاہیدا سی۔ دوواں نے جھٹ ہاں کر دتی۔ میں تھوڑا اوہ چر لیا تے اسیں تنوں دھرم پورے نوں نکل پئے۔ اعوان ٹاؤن توں نہر دے نال نال اگے جا کے دھرم پورہ وی نکل ای جاندا سی۔ میں کار دوں ایک ساتھ تے کھلا ہریا۔ اوتھے کھلا ہری ہی دا اس لئی کہ نیڑے تیڑے کوئی درخت یاں چھاں نظر نہ آئی۔ میں وی نال ای اتر پیا تے اسیں فیاض صاحب دی ہمشیرہ دے گھر اپڑ گئے۔ اوتھے فیر چاء پانی دا بندوبست تے گپ شپ۔ میں کوئی ادھے گھنٹے مگروں اجازت منگی تے مین روڈ تے کار دے قریب اپڑیا۔ کار نوں دھپ لگی وچھل نوں ہتھ لایا تے اوہ اگ وانگوں تپیا سی۔ دروازہ کھولیا، سیٹ دا حال نہ ای پچھو بڑے تہاڈی پئی سی۔ اچانک میرے منہ چوں نکلیا ایہ کیہ مصیبت اے۔ ایہ موٹر سائیکل تے اوہدے سوار بے پناہ اوازاریاں سن۔ دھپ، گرمی، دھواں، لو تے گرم ہوا دا پیٹر تے بے کار اے تے

میں فوراً سوچ نوں بریک لائی۔ بھیڑے آ نا شکری کرنا ایں؟ ایہ کیہ گل ہوئی۔ رب نے کرم کیتا اے تے توں ایہ کیہ آکھ رہیا

ایہہ تاں توبہ کیتی تے نال ای اک شعر ہو گیا۔

میں ناظر اپنا جیہوں نظر دیاں توقیراں دے — اُج تے ساری دنیا جھولی پا دِن وی میں رہندا نہیں

میں شعر دے کنڈے تے کنڈ تے چل پیا۔ میں ایسے دوران کوشش کیتی کہ ایہہ دے دو شعر ہو جاون تاں بے غزل پوری ہووے پر کوئی شعر ولی نہ ہویا۔ گھر ٹیک بڑی کوشش کیتی پر ایک وی ہور شعر نہ ہو سکیا۔ میں ایکا فکر مند نہیں ساں، ایس لئی کہ میرے شاعر دوست ایہہ گل چنگی طرح جاندے نیں کہ غزل دا پہلا شعر جے بہت چنگا ہو جاوے تے اوہ عام طور تے پوری غزل لے کے آوندا اے۔ میں فکر مند نہیں ساں، اگے ویلے وی ایہہ سلسلہ شروع ہو جاوے گا۔ گھر آ کے وی توجہ دتی پر ایک مصرعہ وی نہ ہویا۔ میں آکھیا کوئی گل نہیں۔ جن نیں تے فیر کسے دا جانا کیتے نہ۔ ایہہ آپے غزل وچ داخل جاوے گا۔ اک دن، دو دن، پنج دن، دس دن۔ ایہہ غزل تے نہ ہوئی سگوں لگے لگے شعر ہور ہو گئے۔ فیر ارادہ کیتا تے کہ لگے شعر توں غزل نہ لڑی۔ سگوں ہور لگے شعر ہو گئے۔ دس، ویہہ، پنجاہ، سو۔ میں کجھ مشاعریاں وچ گیا۔ اوتھے لگے لگے شعر سنائے۔ پسند کیتے گئے تے دوستاں بڑی حوصلہ افزائی دتی۔ ہن اک باقاعدہ لڑی صورت بن گئی۔ جدوں وی شعر کہن دی کیفیت بندی اے، کسے وی صنف سخن وچ شعر آکھے بند ہو گئے تے لگے شعر شروع ہو جایا کرن۔ میں ایہدے تے کجھ پریشان وی ہویا پر لگے شعراں دل جھات ماری تے اج آپ قاری نے ناقد بن کے جائزہ لیا تے اوہ بڑے ای سوادی جاپے۔ مشاعریاں وچ سنائے تے بڑے ای پسند کیتے گئے۔ ہن لگے شعر کہن دی تعداد دو ہزار توں ودھ گئی تے میں اوہناں وچ سواد وی آون لگ پیا اے۔

ہر مہینے دے دوسرے ہفتے نوں اک مشاعرہ ہوندا۔ آرٹ ٹاؤن ٹاؤل روڈ تے ہوندا اے۔ ایہہ پروفیسر عاشق رحیل ہوراں دا گھر اے۔ اوتھے معروف تے غیر معروف شاعر اپنے ای آوندے نیں۔ ایہہ گل 1994 دی اے۔ شیخوپورے توں استاد شاعر جناب بشیر باوا جی (مرحوم) ضرور آوندے سن۔ میں اوہناں نوں گھر لے آوندا۔ باوا جی شیخوپورے دا غم کردے سن۔ باوا جی چھ تے لکھے پڑھے ای زور تو ہن نے زبان دے شاعر سن۔ ہوئی ہوئی اوہ میرے گھر دے ای بن گئے۔ باوا جی دی قادر الکلامی تے زور تو ہن کے تسی حیران رہ جاؤ گے۔ اوہناں اک مصرعے تے 360 توں بہتیاں گرہ لائیاں تے مڑ کے بڑی مشکلاں نال تنگ پے کے ایہہ سلسلہ روکیا۔ تسی مصرع سن کے ہکے بکے رہ جاؤ گے۔ پہلا ایہہ جواب معلوم ہوندا اے تے بندہ سوچدا اے کہ ایہہ کیہ فضول شے دے۔ ذرا مصرع ویکھو:

اج فر تکی تے اوٹھے چاہڑ کیا اے مرنا

کوئی گل اے کرن والی۔ اپنے بے کار مصرع تے ایجیاں گرہاں تے اکثر بے حد زبردست تے سوادیاں۔ کجھ تہاڈے نوں میں سنانا۔ ایہہ اوہناں دے پنجابی دے 850 صفحیاں دے دیوان وچوں۔ ایہناں نال تسی گرو آپ لائی آں۔

اج فر چیت دے مہینے چپہ ٹوپی کوئی کڈھی — اج فر کانواں دے منہ وچوں مہراں دے کھب اگئے

اج فر گھر دے کونیاں اتے چھٹک شالا دی لگی — اج فر کوئی ہمیرے تسی اکھراں دے ٹکائے

اج فر پھلاں پکھڑیاں چوں تک جھلکے چپے — اج فیر سوہنا حسین جان دی پچ کھلائے ہوئی

اج فر سوچ دے سانگل اتے کالے بھٹیں جاواں — اج فیر ہوئے لکھے بیری گھی نوں نور سکھائی

اج فر تاؤ کڈھدے ہوتے نوں اوہنے تھ پانی — اج فر گل انعام عشق دی اکھ لعمد تے چوں تکے

اوہ ہر مہینے کوئی 35، چالیھی غزلاں لکھ کے لیاوندے تے سندے سناوندے بعض ویلے ساری رات لنگھ جاندی۔ ایسے طرحاں ای یادوی اتواراں نوں میرے کول بیٹھے سن کہ پروفیسر خوشی محمد شارب تے پروفیسر جنید اکرم (سہیل احمد المعروف عزیزی دے نکے بھرا) وی آ گئے۔ پروفیسر شارب ایف سی کالج وچ پنجابی دے استاد سن تے ایہ اوہناں کافی کالم تے جدید انقلابی آکھاں لکھن والا اے۔ پنجابی ادب وچ نہیں دسنا۔ خاص طور تے کافی تے بہت نویکلی تے وڈھیا لکھدے سن۔ اک کافی دے کجھ بول ویکھو۔

وے ماہی ساتھوں اینویں اج نہیں بہنا / ایہدی ڈولی پا کے لے جا جے توں ماہی منہ / ساتھوں اینویں اج نہیں بہنا اپنے چاچڑہ تکھیے سٹیں / گھر جا کے نہ ماریں تھیں / ماں رکھیں آ ونگن دا / ساتھوں اینویں اج نہیں بہنا /

چاچا جی ہوراں دے بعد میں اپنے کلے کلے شعر سنانے تے نال ای ایہہ گل اگے دھری کہ میں ایہ کلے کلے شعر بیج سوچاں پیتے لکھ بیٹھا واں۔ تے ایہناں نوں کیہہ آکھیا جاوے۔ ایس لئی کہ کلا کلا شعر کہنا تے کوئی گل نہ ہوئی۔ چناںچہ اساں چوہاں نے ایہدے تے غور شروع کیتا۔ شعر، فرد، اشلوک، ماہیا، سیا، بولی۔ سارے نال مسترد ایس لئی ایہناں تے پنجابی دیاں ہور شعراں دا صرف اپنا فارمیٹ اے۔ جگوں اپنا موقع محل تے مضامین۔ ایہناں نوں کسے طرح وی کلا شعر یا ہور کجھ نہیں آکھیاں جا سکدا۔ اچانک میری ای منہ چوں نکلیا بیت۔ ایہدے تے غور شروع ہویا۔ ایہ عربی زبان دا لفظ اے۔ ایہدا اک مطلب تے گھر اے تے دوجا -- کلا شعر۔ چوہاں نے ای اتفاق کیتا کہ ایہ ناں ورسعدا اے۔ پنجابی وچ بیت ناں دی اک صنف دی گلے گلے وسدی اے پرنہ ہون دے برابر۔ میرے نیڑے کلے شعر دا ناں بیت بہت مناسب اے۔ ایہدے وچ بڑیاں کھلاں نیں۔ مطلع مقطع دی کوئی پابندی نہیں۔ قافیہ ردیف دا کوئی جھگڑا نہیں تے بحر وی اپنی مرضی دی استعمال کیتی جا سکدی اے۔ جتھوں تیکر بحر دا مسئلہ اے میرے زیادہ تر بیت ساڈے پنج فعلن وچ نیں۔ شروع شروع وچ میں ہور بحراں وچ وی بیت لکھے۔ پر اوہدے بعد ایسے بحر دا ہو گیا۔ بحر ویسے وی میرا مسئلہ نہیں۔ گزارے جوگا عروض مینوں آندا اے۔ تے میرے لئی ایہو کافی اے۔ ایس لئی کہ میں زیادہ دھیان دے نال خیال نوں بہتی اہمیت دینا واں۔ بیت لکھن تے پڑھن وچ شاعر تے پڑھیار نوں بڑیاں سہولتاں نیں۔ شاعر دا جے موڈ اکو شعر دے بعد نہیں بن رہیا تے کوئی گل نہیں۔ اکو شعر ای سہی۔ ایسے طرحاں قاری وی اکو شعر پڑھنا چاہندا اے تے چلو ٹھیک اے۔ شاعر تے غزل، نظم دیاں کسے وی ہور فارمیٹ دیاں مجبوریاں نے دبا نہیں ہوندا تے اوہ کھلاں مان سکدا اے۔ ہن حیاتی تے بڑیاں رفتاراں پھڑ لئیاں نیں۔ کسے کول ویہل ای نہیں۔ کئی ملاں وچ کتاب دال تعلق ٹٹا جا رہیا اے۔ کمال کاراں نوں اپنی ویہل ای نہیں کہ کوئی شاعری لئی ٹائم کڈھ سکے۔ ایس موقع تے بیت دی جگہ بندی اے۔ جے پوری غزل یاں نظم پڑھن دی فرصت نہیں تے اکو سہی۔ بیت جے تواڈا اے تے اوہ ویلا کرواندا اے۔ کتاب نوں الیر دی۔ تے اپنی اکھر اوہدے وی پیدا ال کجھ دل جپ گلاں وی سنن نوں ملیاں۔ فقیر بھائی حکیم ارشد شہزاد شکر گڑھ دے جوہے زبردست حکیم تے شاعر نیں۔ اوہناں دسیا کہ میں اک گلی چوں لنگھ رہیا ساں کہ اک گھر وچ جھگڑے دی آواز سنی۔ اک بندا آکھن لگا کہ تہاڈا تے عباس مرزا والا حال اے۔ اگوں پچھیا گیا کہ اوہ کیہہ تے اوہنے ایہہ بیت سنایا۔

خوشی جے آگئی اے تے کج منا نئیں ساڈے گھر تے ایہ وی رونا پے جاندا اے

میں انڈیا کئی واری گیا۔ آخری واری 2014ء وچ مالیر کوٹلہ جانا ہویا جیہڑا بھارت دا اک معروف شہر اے۔ اوتھے میں اپنے

گھنو بڑے دوست بھائی نور محمد نور کول رہیا۔ اوہ آپ پنجابی دے چنگے شاعر، کھوج کار تے نثر نگار نیں۔ اوہناں پڑھن جوگ کئی وادھیا کتاباں چھپ چکیاں نیں۔ میں اوہناں نال جدوں وی بازار وچ نکلیا تے اوہناں میرا تعارف کرایا کہ بھائی محمد عباس مرزا پاکستان توں نیں تے ایہہ ہویا ای نہیں کہ اگلے نے میرا بیت نہ سنیا ہووے۔ اچھا لاہور توں عباس مرزا جنہاں دا ایہہ بیت اے۔ ایہدی اک وجہ تے ایہہ کہ میں کوئی چوہدری اٹھایا چکیا واں۔ تے اوتھے ہزاراں لوکاں نے مشاعرے وچ بیت سنے۔ تے دوجی ایہہ وے کہ میری پنجاں وی اک کتاب میر کولہ وچ ترکش پبلیکیشنز نے چھاپی وی۔ اوہدا ان پتا سے اے۔ تے اک مہینے وچ ای ہزاراں توں ودھ کتاب نکل گئی۔ میں پچھلے دناں کاموں کی ساں۔ تعقیہ مشاعرہ سی۔ مشاعرے دے گروں چاہ پی رہے ساں کہ مشاعرے دے منتظم حاجی شفیق خرم دا کوئی یاراں سالاں دا پتر وی کول ای کھلوتا سی۔ گل چھڑی تے اوہ بولیا کہ ایہہ اوہو عباس انکل نیں جنہاں دا اوہ بیت اے۔ چیراں دن میں چنہ وچ ای کول رہیا۔ مینوں تے انج محسوس ہوندا اے کہ جے شاعر توجہ دین تے اگلا دور بیت دا اے۔ تے ایہہ تے فر پنجابی زبان دی وی بڑی خدمت ہوئی ہاں کہ جدوں لوکاں دیاں زبھاں دے ودھ چڑھ گیاں تے بیت پڑھن تے سنن دا ناتم اوہناں کول اوہدوں وی ہووے گا۔

خوشی دی گل ایہہ وے کہ ہور شاعراں وی بیت لکھنے شروع کیتے نیں۔ جنہاں وچ سب توں اگے حکیم ارشد شہزاد نیں۔ اوہ بڑی کوہاں ایس صنف ول جھٹ پئے نیں۔ ایہناں دے علاوہ جناب ممتاز راشد لاہوری، جناب عاصم توحید، جناب افضل ساجد، جناب عاصم بخاری تے جناب بشیر باوری نے وی بیت لکھے نیں۔ باوری ہوراں ایس توں باز آ گئے۔ اوہناں دی گل اوہ سی کے آکھن لگے ''مضمون نہیں لبھے جاندے۔ میں بیت لکھن بیٹھاں تے اوہ سے تے پوری غزل ہو جاندی اے۔''

◆◆◆

پنجابی — **تازہ کلام** — **محمد عباس مرزا**

لبھا تے توں وی وی پر اک بندہ توں
انج دسیاں کہ ہر اک توں اہمن وسنا ایں

حقدوں بتا سوہنیا! تیرے صدقے میں
کوجا ہوں وی بہت مشقت جھل بیٹھاں

سب حاقاں گن گو قید وی بندے نے
ایس دنیا تے بہت زیادہ کم کمائے

مینوں سوگ چ دازن دا مچھا اے
توں کیوں لبھ توں نال ای گلی پھرنا ایں

عام قلم چوں وگدے نیلے پانی نوں
میں سنہری رنگ ہوائے کر دتیاں

یاری لئی جس دی ادا کافی نہیں
ایہدے اندر وی تے توں کی بھریاں ایں

ایہہ ہتھ میں کجے ہتھ نال چک سکاں
پر ایہہ مینوں کاغذ اتے لیک دتا

اپنے گھر میں جاہ چاہنا پر عباس
جتھے وچ شاید نہیں تے رستہ کھل بیٹھاں

تبصرے

تبصرے نسیمِ سحر کے

مختصر تعارف

نسیم سحر 15 فروری ۱۹۳۲ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے ہے۔ زیادہ تر اصناف نظم و نثر میں ان کا قلم سحر کی روانی سے رواں دواں ہے۔ حمد، نعت، غزل، پابند نظم، مزاحیہ شاعری میں ان کے کم و بیش ۱۹ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جبکہ حمد و نعت اور دیگر کتابوں پر ان کے دیباچوں، مضامین اور تبصروں پر مشتمل ۶ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھیں بیشمار ادبی اداروں اور تنظیموں کی طرف سے شیلڈز، میڈلز اور ایوارڈ مل چکے ہیں جن میں تحریک پاکستان ورکرز ٹرسٹ، اسلام آباد کی جانب سے تاحیات ادبی خدمات کے اعتراف میں ملنے والا گولڈ میڈل انھیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے دست مبارک سے ملا تھا۔ ان دنوں وہ نعت اور عقیدت پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ جن پر ان کی مزید کئی کتابیں تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔

آرفن ہاؤس اور دوسرے افسانے

مصنف : اقبال فیروز

صفحات 128 قیمت -/500 روپے ناشر : ورق ویلی پبلشرز، چکوال

''آرفن ہاؤس'' ایک ایسے صاحبِ طرز افسانہ نگار کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس کا تعارف اہلِ علم و ادب یا قارئین سے کرانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنے دلچسپ اور تخلیقی انداز کے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقۂ احباب قائم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ۲۰۲۲ء میں ورق ویلی پبلشرز چکوال کے زیرِ نگرانی شائع ہونے والے اس مجموعے سے پہلے ان کے دو ناول ''پس سلاسل'' اور ''ناہموار زمین'' علی الترتیب ۲۰۱۶ء اور ۲۰۲۱ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''پس سلاسل'' کا انگریزی میں ترجمہ بھی Beyond the Wire کے نام سے ہو چکا ہے۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہونے سے پہلے بھی ناول نگاری کے علاوہ افسانہ نگاری کے حوالے سے ان کا نام معروف ہو چکا تھا کہ ان کے افسانے ''تخلیق'' کے علاوہ کچھ دیگر ادبی جرائد میں اور ڈائجسٹوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں ان کے سترہ افسانوں میں سے بعض قبل ازیں بھی ''تخلیق''، ''الحمرا''، اردو ڈائجسٹ اور قومی ڈائجسٹ میں راقم السطور کے مطالعے میں آ چکے ہیں۔ خود مصنف اقبال فیروز کا کہنا ہے کہ ''آرفن ہاؤس افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں اکثر کہانیوں کا خمیر حقیقی واقعات اور کرداروں سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ واقعات راقم الحروف کو اپنی زندگی کے دوران پیش آئے ہیں اور انھیں افسانوی رنگ دے کر

قاری کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے"۔

ان کے یہ تمام افسانے بار اول یا قند مکرر کے طور پر پڑھنے کے بعد کتاب میں شامل جناب شاہد آزاد کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "ان کے افسانے تجریدیت کی بھول بھلیوں میں نہیں بھٹکتے بلکہ بہتر اور براہ راست ابلاغ کے وسیع میدان میں اپنے پڑھنے والوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں گزرے زمانوں کا ناسٹلجیا، تجربوں کی کسک اور مشاہدے کی گیرائی مل کر ایک دل پذیر منظر نامہ تخلیق کرتے ہیں جسے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی مروجہ اشکال سے بچا کر حقیقت نگاری کے سادہ مگر پُرکشش انداز میں قاری تک پہنچایا گیا ہے۔" خود مصنف اپنی افسانہ نگاری کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "پریم چند، منٹو، کرشن چندر، اشفاق احمد، رام لعل اور راجندر سنگھ بیدی جیسے عظیم لکھاریوں کے شاہپاروں کی تخلیق کے باوجود ابھی ایک وسیع میدان موجود ہے جس کی وسعت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔" ان کے یہ افسانے پڑھ کر واقعی محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ان تمام بڑے افسانہ نگاروں کے اسلوب، کردار نگاری اور موضوعات سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ یہ افسانے تکنیک سے زیادہ انسانی احساسات کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں اور ان میں مقامی، قومی اور بین الاقوامی حقائق کو کردار نگاری، مکالمہ نگاری کے ہنر کے ذریعے ایک افسانوی لڑی میں بخوبی پرو دیا گیا ہے۔ ان کی دو تین کہانیوں میں ایک تارکِ وطن کے مسائل کے علاوہ یورپی ممالک کے معاشروں کی عکاسی بھی کی گئی ہے جس کے سبب ان کی افسانہ نگاری کا کینوس عالمی ادب تک پھیلتا ہوا اور "گلوبل ویلج" کے ماحول کا احاطہ کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے افسانے پاکستان کے گاؤں سے لے کر سکاٹ لینڈ کے "آرفن ہاؤس"، جرمنی کے کافی ہاؤس اور شراب خانوں کے کرداروں تک کو موضوع بناتے ہیں اور کردار نگاری بھی ایسی کہ بابا دینا، فضلو موچی، بابا بیرا، گوگا ذکیا، بوبکا، بہادر، ڈیمیلا، لاسن، سردار گل بہار سنگھ، فرولائن ماریا جیسے کردار گویا زندہ ہو کر ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ویسے تو تمام افسانے ہی ایک الگ موضوع اور انداز منفرد سے آراستہ ہونے کے سبب قابل مطالعہ ہیں لیکن راقم السطور نے ان سترہ افسانوں کو پڑھنے کے بعد پہلا پتھر، آرفن ہاؤس، احساس کی کڑی دھوپ، بابے دینے کی ریڑھی، گل بہار سنگھ اور جمیل کے آنسو خاص طور پر مجھے دلچسپ اور ندرت تحریر کا شاہکار نظر آئے۔ ان کے کچھ افسانوں کے دل ہلا دینے والے اقتباسات: "کچھ تحریریں صرف اپنے لیے لکھی جاتی ہیں اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے۔ وہ ان کے جس گوشے سے تخلیق ہو کر ابھرتی ہیں پھر وہیں دفن ہو جاتی ہیں (افسانہ احساس کی کڑی دھوپ)" "اس جنگل میں پھول بھی کھلتے ہیں، ہر رنگ کے پھول، جب برف ہٹ جاتی ہے تو ہر طرف پھول اگ آتے ہیں۔ لیکن یہ پھول مر کر پھر زندہ کیسے ہو جاتے ہیں؟ کیا مرے ہوئے لوگ بھی دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں؟" (افسانہ آرفن ہاؤس) "میں تمہیں بھولی نہیں ہوں مجھے سب یاد ہے۔ دیوار برلن تو ٹوٹ چکی ہے لیکن اس سے بہت پہلے ہی ایک دیوار میرے اور رونالڈ کے درمیان کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے کسی اور سے شادی کر لی تھی"۔ (افسانہ پیشین گوئی)

جاتک کہانیاں 2022

مصنف : محمود احمد قاضی

صفحات: 112 قیمت: /400 روپے ناشر: حسن قلم پبلی کیشنز، لاہور

23 کہانیوں پر مشتمل یہ مجموعہ صرف اپنے عنوان "جاتک کہانیاں 2022'' سے توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے بلکہ ان کہانیوں کا موضوع بھی عام کہانیوں یا افسانوں سے یکسر الگ تھلگ ہے اور موضوع بھی ایسا جس پر محمود احمد قاضی سے پہلے افسانہ نگار سید رفیق حسین کے علاوہ شاید ہی کسی اور فنکار نے قلم اٹھایا ہو۔ محمود احمد قاضی کہتے ہیں کہ یہ کہانیاں ذرا مختلف قسم کی ہیں۔ یہ ان بچوں کے لیے ہیں جنھوں نے ہمارے کل کو سنبھالنا ہے۔ مگر ان کا مطالعہ کرنے کے بعد راقم السطور کا خیال ہے کہ یہ "ذرا مختلف'' نہیں بلکہ "بہت مختلف'' کہانیاں ہیں، اور یہ ہمارے کل کو سنبھالنے والے بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ گزرے کل کے ان بچوں کے لیے بھی ہیں جو اب جوان ہو چکے ہیں۔ جاتک کہانیوں کا پس منظر یہ ہے کہ مہاتما بدھ نے اپنے اپدیشوں کو عام فہم اور پر تاثیر بنانے کے لیے جو سبق آموز اور دلچسپ کہانیاں آپ بیتی کی صورت میں کہیں انھیں "جاتک'' کا نام دیا گیا اور یہ "جاتک کہانیاں'' بدھ ادب کی اہم دستاویز کے ساتھ ساتھ ہندوستانی لوک کہانیوں کا ایک عمدہ ذخیرہ بھی ہیں جن میں زیادہ تر کہانیوں کے کرداروں کو جانوروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "جاتک'' کا لفظ پالی زبان کا ہے جو اس زمانے میں ہندوستان کی عوامی زبان تھی۔ اس لفظ کا مطلب "زندگی سے تعلق رکھنے والی چیز'' ہے۔

تاہم زیرِ نظر کتاب سے مہاتما بدھ کی جاتک کہانیوں کی ہم نامی یہیں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ محمود احمد قاضی کی یہ جاتک کہانیاں بدھا کی کہانیوں اور جنوں، دیووں اور پریوں کی کہانیوں سے یکسر مختلف ہیں۔ انھوں نے 2022ء کا سن عنوان کے ساتھ درج کر کے کتاب کو ایک زمانی اہمیت بھی دے دی ہے۔ انھوں نے یہ دلچسپ اور مثبت پیغام دینے والی کہانیاں پالتو جانوروں اور پرندوں کے متعلق لکھی ہیں اور ان میں پالتو جانوروں کی نفسیات اور ان کی خوبیوں کی عکاسی کرتے ہوئے اپنا اور ہمارا بچپن بھی آج کے بچوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ جانوروں اور پرندوں کی خوبی وفاداری کو اجاگر کرتے ہوئے انھوں نے ان کی انسانوں یا انھیں پالنے والوں کے ساتھ فطری انسیت کا تعمیری پہلو سامنے لاتے ہوئے ان کے ساتھ انسانی محبت کے ساتھ ساتھ خود غرضی اور ظالمانہ سلوک کے رویے بھی سامنے لائے ہیں۔

محمود احمد قاضی کوئی نئے لکھنے والے نہیں ہیں، ۱۹۷۴ء سے دنیائے ادب سے وابستہ ہیں اور تب سے اب تک ان کے پانچ افسانوں کے مجموعے اردو میں اور ایک پنجابی میں آ چکا ہے جبکہ ایک "شارٹ ناول'' کے علاوہ منتخب عالمی کہانیوں کا ایک مجموعہ، لاطینی امریکی کہانیوں کا ایک مجموعہ اور "یہ گوجرانوالہ ہے'' کے عنوان سے ایک شہر نامہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ جاتک کہانیوں پر رانا عارف علی اپنے دیباچے میں بجا طور پر لکھتے ہیں کہ ان جاتک کہانیوں میں اساطیری کم اور موجودہ دور کا تخلیقی رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔ وہ ان کہانیوں کے ذریعے بچوں کو بہت کچھ سکھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ دیباچہ نگار ثاقب تبسم ثاقب نے اس کتاب کو مثبت روایت سے جڑا رہنے اور تہذیب کو زندہ رکھنے کی ایک زندہ کوشش قرار دیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ محمود احمد قاضی باریک بین ہیں اور معاشرے کے نازک ترین موضوعات پر لکھنا ان کا محبوب شغل ہے۔ وہ مقدار کو معیار پر ترجیح دیتے ہیں۔

ہمیں یہ جاتک کہانیاں بڑی دلچسپ لگیں کہ جانوروں کی نفسیات کے ساتھ انسانوں کی نفسیات کا تجزیہ بھی ان کہانیوں میں بڑا واضح ملتا ہے۔ مالو بلی، شیرو، بھوری، میاں مٹھو، سرکس کا ہاتھی، موتی، خرگوش، فاختہ، باز، مرغی اور کبوتر جیسے معصوم پرندوں اور چوپایوں کے کرداروں کے بارے میں لکھنا گہرے مشاہدے کے بغیر ممکن ہی نہیں، اور محمود احمد قاضی کی باریک بینی نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ انسانی فطرت کی ترجمانی، بچوں کی محبت اور بڑوں کی فطرت ان کی کہانی "مرغیوں والا گھر'' کے آخری حصے میں یوں ظاہر ہوتی ہے جب وہ بے

میں پالی ہوئی مرغیاں سردی کے موسم میں مناسب نگہداشت نہ ہونے پر ایک ایک کر کے مرتی گئیں اور ایک روز سردی جاتے جاتے آخری مرغے اور مرغی کو بھی لے گئی تو محمود احمد قاضی اس کا منظر نامہ یوں پیش کرتے ہیں: "اس رات کو اس گھر میں یوں سوگ منایا گیا جیسے کہ وہاں کسی انسان کی، اپنے پیارے کی موت ہوئی ہو۔ بیٹے کا بہت برا حال تھا۔ وہ کئی دنوں تک چپ چاپ رہا۔ اس کی غذا بھی کم ہو گئی۔ گھر بھر کی حالت سنبھلنے لگی۔ سب ہی اپنی اپنی ڈگر پر واپس آ گئے۔ شوہر نے کہا۔ اب چونکہ مرغیاں نہیں رہیں تو ڈربے کا کیا کام۔ اسے ختم کرو۔ بیٹے نے روتے ہوئے کہا۔ نہیں پاپا۔ کسی کا گھر نہیں توڑنا چاہیے۔ اسے یوں ہی رہنے دیں۔ چنانچہ مرغیوں کے گھر یعنی ڈربہ ہمیشہ کے لیے اس گھر میں رہ گیا۔"

ہمراز نہیں ملتا

مصنف : انور ندیم علوی

صفحات: 144 قیمت: -/500 روپے ناشر: زربفت پبلی کیشنز، لاہور

یہ ایک معروف شاعر انور ندیم علوی کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے جس کے مصنف کے ذہنی اور تخلیقی رجحان کا اندازہ کتاب کا انتساب "حضرت گل سرمست کے نام" ہونے سے ملتا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہیں جو ایڈووکیٹ بھی ہیں اور زمیندار بھی۔ "ندیم ادب" انٹرنیشنل تنظیم کے بانی چیئرمین ہیں اور اردو کے علاوہ سندھی اور پنجابی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ جبکہ اردو اور پنجابی میں ان کے کالم، مضامین اور منظوم تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ان کے تینتالیس اردو غزلیں، آٹھ سندھی سے اردو میں منظوم تراجم، سات سندھی سے پنجابی منظوم تراجم، دو سندھی منظومات، اور گیارہ پنجابی غزلوں کے علاوہ "زمین زعفران" کے عنوان سے تیرہ مزاحیہ منظومات بھی شامل ہیں، اور اس تمام تخلیقی تنوع پر کسی اور شاعر یا نقاد کی رائے کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ اس کتاب کا ذیلی عنوان "منتخب غزلیں" اور 144 صفحات پر ان کی تخلیقات و تصانیف کی تعداد دیکھ کر اپنا جواز پیش کرتا ہے۔ حالانکہ ان کی سولہ کتب شائع ہو چکی ہیں جبکہ زیر ترتیب نظم و نثر کی کتب کی تعداد سات ہے۔ اتنی تخلیقی توفیقات کے ساتھ ساتھ ان کی مشاعروں اور دوسری ادبی محافل میں شرکت کی بے تحاشا سرگرمیاں دیکھ کر ان پر رشک کیوں نہ آئے۔ معروف شاعر باقی احمد پوری نے ان کی شعری توفیقات پر رائے دیتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے "انور ندیم علوی نے اپنے گونا گوں خیالات و جذبات کو اپنے عصری اور نجی معاملات کو جدید طرزِ احساس کے ساتھ لفظوں کے پیکر میں ڈھالا ہے۔" ایک مختصر سے فلیپ پر باقی احمد پوری کی اس رائے کے سوا کتاب میں کوئی دوسرا دیباچہ یا پیش لفظ شامل نہیں جو اس ہمہ جہت شاعر کی خود اعتمادی کا مظہر ہے کہ "آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے" کے مصداق ان کا کلام خود ہی اپنا دیباچہ بھی ہے اور پیش لفظ بھی۔ ان کے چند اشعار میرے اس دعوے کی دلیل کے طور پر پیش خدمت ہیں:

پھول زلفوں کے ستائے کانٹوں کا / باغباں کی بڑی عنایت ہے / بے وفا محبوب جیسی زندگی (انور ندیم) روٹھ
کر چل دی اچانک۔ کیا ہوا، کیسے کیوں / ایک عجیب الاؤ سے دیکھا اب تک خوشبو آتی ہے / رات کو آیا سپنے

میں وہ گھر میرا گھر رہا / ذات عقیدے مسلک کی تقسیم تو ہوتی جاتی ہے / کھنچتی جاتی ہیں دیواریں آنگن
گھر گویا دیوار ہوا / دشمن بن کے میرے عقب میں / چلتا ہے کوئی سایہ سا میں

سندھی غزل کے ایک منظوم ترجمے سے شعر ملاحظہ ہو:

تو زندگی کے پیار میں، تو موت کے اسرار میں
تو ساز میں موجود ہے، لرزے صدا ہر تار میں

پنجابی زبان میں غزل کے کچھ شعر دیکھیے:

اوہدی عرشاں تک پرواز ہوئی
جس دی سچی عشق نماز ہوئی
سانجھ کے وتیں سانبھواں توں
جد جڑی ہرجائی اے
اوہدا لیوے نہ نشہ عدیم
جس دی سچی عشق دی جھنگ

ان کی شاعری میں بھی ابرار آبادی اور سید ضمیر جعفری کی طرح مزاح کے عنصر پر طنز کا عنصر زیادہ ہے جو کسی بھی شاعر کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ خوش خوراکی، خوش پوشاکی ریزہ ریزہ ہیں اچھی دانش کے ـــــ اس لیے اکثر ملتے ہیں اب دانشور بازاروں میں۔

انور ندیم علوی کی تخلیقی زرخیزی اور زود نویسی سے اردو کی نثری و شعری دنیا کو مستقبل میں بہت سی امیدیں ہیں، اور اسی دنیا کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے میں بھی ان کے لیے دعا گو ہوں۔

ٹونباں (بیت)

مصنف : محمد عباس مرزا

صفحات 192 قیمت -/1,000 روپے ناشر: سانجھاں تحریک، لاہور

جناب محمد عباس مرزا کی جائے پیدائش نارووال کا ایک مضافاتی علاقہ ہے جس سے ان کی پنجابی زبان پر دسترس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ۱۹۶۵ء سے شعر کہہ رہے ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ایک پوسٹ گریجویٹ کالج سے بطور پرنسپل ریٹائر ہوئے ہیں۔ زیر نظر شعری مجموعہ ان کے پنجابی زبان میں ابیات پر مشتمل ہے جنہیں پنجابی زبان میں ''ٹونباں'' یعنی زیور جیسا خوبصورت عنوان دیا گیا ہے۔ محمد عباس مرزا ادبی دنیا میں غیر متعارف نہیں ہیں کہ تا حال ان کے دو نعتیہ مجموعوں اور دو غزلوں سمیت تقریباً دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ابیات پر مشتمل اس مجموعے ''ٹونباں'' سے پہلے بھی ان کے مجموعے بیتا بیتا بکھانے اور بیت سے کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں یہ سرحد پار گورمکھی رسم الخط میں شائع ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مشرقی پنجاب میں بھی کس قدر مقبول و معروف ہوں گے۔

اردو میں تو شعری فردیات کے مجموعے کئی شعراء کے شائع ہو چکے ہیں مگر میری معلومات کی حد تک پنجابی میں محمد عباس مرزا کے سوا کسی اور شاعر کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اپنے پیش لفظ ''گلاں باتاں'' میں وہ یہ لکھ کر حیرت زدہ کر دیتے ہیں کہ اب تک وہ کوئی سترہ ہزار سے زیادہ بیت لکھ چکے ہیں۔ انہوں نے پیش لفظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ سترہ ہزار بیت لکھنے کے بعد کئی دوستوں کا اصرار ہے کہ مرزا صاحب اب

غزلوں کی طرف آ گئیں مگر انھوں نے جواب میں کچھ یوں کہا ''میرے بھائی غزلیں تو سارے لوگ لکھ رہے ہیں مگر یہ صرف محمد عباس مرزا اور حکیم ارشد شہزاد لکھ رہے ہیں''۔ اسی دیباچے میں انھوں نے فردیات لکھنے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ فردیات لکھتے ہوئے نہ مطلع، مقطع، قافیہ یا ردیف کی کوئی پابندی آڑے نہیں آتی، اور فردیات میں وہ ایسے مضامین بھی باندھ سکتے ہیں جن کی غزل میں گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کا یہ دیباچہ مجموعی طور پر فردیات کے حق میں ایک مضبوط جواز پیش کرتا ہے خاص طور پر یہ بات کہ جب شاعر کا تخلیقی مواد ایک ہی شعر کا ہو تو وہ زبردستی کے شعر کہہ کر پوری غزل کیوں کہے۔ راقم الحروف اس سے متفق ہوتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ محمد عباس مرزا نے یہ کہہ کر اپنے سامعین اور قارئین پر بھی احسان کیا ہے کہ انھیں ایک اچھا شعر پڑھنے یا سننے کی خاطر پوری غزل پڑھنی یا سننی نہیں پڑتی۔ ان کے دیباچے میں بیان کردہ نظریہ شعر کی روشنی میں جب میں نے محمد عباس مرزا کی کتاب کا مطالعہ کیا تو ایک نشاطیہ کیفیت میں ڈوب گیا۔ ان کے کچھ چیدہ پنجابی ابیات ملاحظہ فرمائیں: رو رو رب مناون والیا، ایہہ وی تکیں / ہسدا ہسدا رب توں چنگا لگدا نہیں؟/ خالی گھر دے وچ انگڑائیاں لیندی نے / کناں سوہنا منظر ضائع کردا اے / میرے ہاں نے جوت تو توں آ کدا ہیں تے / اپنا رنگ مرنا پہلاں گل چھڈیں / اونہوں رنگ پسند نہیں اس کیوں دا / ایہدے لئی او گھر لے کے آوے گا / رب نے بندیاں کولوں ای کم کرانے نیں / کلی قبر میں ناں میرے دل دیاں سدھراں نوں / کجھ وی نہیں ہوندا تے تاں وی ہو جاندا اے / بندا وی کل ایہنا اے، اکو تانے نوں۔ تقریباً دو سو ابیات کی یہ جمالیاتی اور کیفیاتی ہمہ رنگی اور متنوع کیفیات دیکھ کر میں دعا گو ہوں کہ ان کے باقی ہزاروں ابیات پر مشتمل اہم ادبی سرمایہ بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر یقیناً پنجابی شاعری کے دامن کو مزید زرخیز و شاداب کرنے کا باعث بنے گا۔

مسافر شب (جلد اوّل)

مصنف : سیّد مبارک علی شمسی

صفحات: 184 قیمت: 1000/- روپے ناشر: ارسلان پبلشرز، ملتان، لاہور، فیصل آباد

''مسافر شب'' کے مصنف سید مبارک علی شمسی ایک سینئر کالم نگار ہیں جو گزشتہ چوبیس سال سے بہ جہت موضوعات پر کالم لکھ رہے ہیں۔ ان کی بین الاقوامی حالات کے علاوہ معاشرتی مسائل پر بھی ایک گہری نظر ہے۔ ان کے کالموں کا مطالعہ کر کے نہ صرف ان کی وسعت مطالعہ بلکہ ان کی موضوعاتی گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا اصلی نام سید مبارک علی ہلالی اور قلمی نام سید مبارک علی شمسی ہے۔ ان کی شناخت محض ایک کالم نگار کی نہیں بلکہ وہ شاعر، ادیب، صحافی اور دانشور بھی ہیں۔ ان کے تخلیقی سرمائے میں نعت، غزل، نثری نظموں پر مشتمل کتابیں بھی ہیں اور افسانوں کا ایک مجموعہ بھی۔ یہ تمام تخلیقی جہات ان کی کالم نگاری میں نہ جھلکیں ایسا ممکن ہی نہیں۔ ان کی اس کتاب میں جن معروف ادیبوں اور کالم نگاروں کے تعارفی مضامین ہیں ان میں پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین، صابر انصاری، صفدر علی حیدری، عظمت عظیم، راحت امیر خان نیازی، تیموری، اور سیدہ وفا شاہ شامل ہیں۔ اس کتاب میں ان کے پچاس کالم شامل ہیں جو ان کی مذہبی اور عقیدتی رجحانات کی عکاسی کر رہے ہیں۔ وہ خود اپنے کالموں کے بارے میں اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''میرے اس مجموعہ کالمز میں شامل

تمام کالم میری تحقیقات اور میرے ذاتی حوالوں کی روشنی میں لکھے گئے ہیں جس میں میں نے مذہبی و سیاسی زنجیروں سے آزاد ہو کر غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے اپنے ذہنی افکار کو سپردِ قلم کیا ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین نے ان کی کالم نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی تحریریں مضمون اور کالم کا حسین امتزاج ہیں اور ان کے اسالیب اور لفظیات میں تکرار یا عامیانہ انداز نہیں ہے۔ ان کی فکر میں جہاں ان کا سماجی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی شعور سامنے آتا ہے وہاں ان کی مستعمل لفظیات ان کے منفرد ذاکشن کی تعبیر بھی دیتی ہیں۔ ان کے کالموں کے مضامین بھی اچھوتے ہیں، اور ان کے عنوانات اور لفظیات ان کے موضوعات سے کلی طور پر ہم آہنگی پیدا کر کے قاری کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ ایک اور سینئر کالم نگار صفدر علی حیدری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ شمسی صاحب جس موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں اسے خاص بنا دیتے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ اگرچہ یہ کالم طوالت کے حامل ہوتے ہیں مگر انہیں پڑھتے ہوئے بوریت کا احساس قریب تک نہیں گزرتا۔ واضح رہے کہ زیر تبصرہ کتاب مصنف کے ان کالموں پر مشتمل پہلی کتاب ہے جو روزنامہ خبریں، لاہور، ملتان اور روزنامہ آفتاب ملتان میں شائع ہوئے جبکہ ان کے دیگر دو مجموعے بھی زیر ترتیب ہیں۔ معروف صحافی راشد امیر خان ترین بلوچ نے ان کی اسلامی موضوعات پر کالم نگاری کو موضوع بناتے ہوئے خوب لکھا ہے کہ ''اسلامی کالم نگاری انتہائی مشکل اور حساس کام ہے جس میں قلمکار کو بہت زیادہ احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ انہوں نے اپنے ہر کالم میں اس نکتے (نکتہ) کو سامنے رکھتے ہوئے کہیں بھی احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنے ہر کالم میں عقیدت و احترام کو بھی انتہائی مقدم جانا ہے۔''

مصنف کے ان قریبی احباب اہلِ قلم کی آرا کی روشنی میں جب راقم السطور نے ان کی کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو انتہائی مسرت کے ساتھ احساس ہوا کہ ان احباب نے شمسی صاحب کی بے جا تعریف نہیں کی۔ ان کے اسلامی کالموں کے چند موضوعات سے ہی ان کے انداز فکر اور مذہبی و عقیدتی توضیحات کا اندازہ ہو جاتا ہے، ملاحظہ ہوں: اے رسول آخریں تجھ پر سلام، حضرت علی کردار کے آئینے میں، فلسفۂ ماہِ رمضان، نکاح اور اس کی قانونی حیثیت، توبہ ذریعہ نجات۔ یہ تمام کالم نہ صرف معلوماتی ہیں بلکہ قارئین کو اسلام اور اس کی تعلیمات کی جانب بھی راغب کرتے ہیں جس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ شمسی صاحب قلم کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں اور اسے مثبت انداز میں استعمال کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں شامل کچھ کالم سیاسی موضوعات اور پاکستان کے بین الاقوامی تعلقات کے علاوہ مسئلہ کشمیر پر بھی ہیں جن کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس تبصرے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان کے کالموں میں سے کچھ انتہائی تحقیقی اور فکر انگیز تحریروں کے طویل اقتباس پیش کیے جا سکیں کہ اقتباس اس مجموعی کیفیت کی ترجمانی نہیں کر سکتا جس کے تحت یہ کالم لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ قارئین کو یہ مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب حاصل کریں اور ان کالموں کی پختگی، تاثیر اور ان کے مثبت پیغام سے لطف اندوز ہو کر اپنی زندگیوں کو سنوارنے کی کوشش کریں۔ خاص طور پر بزرگانِ دین کی مناسبت سے لکھے گئے ان کے کالم اپنا قبلہ درست کرنے کے لیے انتہائی توجہ طلب ہیں۔ تاہم یہاں ان کے چند فکر انگیز جملے ان کے اسلوب اور انداز تحریر کی چاشنی دکھانے کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں:

☆ حضرت علی علیہ السلام کی عظمت، حکمت، طہارت، منزلت، تقدس، عصمت اور مطلق احساسات کے رب الارض کی حیثیت کے حامل ہیں۔ (ولادت باسعادت امیر المومنین)

☆ توبہ اور مغفرت کی طلب مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کے لیے خالقِ حقیقی کا بے مثال تحفہ ہے۔ توبہ کی مثال اس دھوبی کی سی ہے جو

کپڑوں پہ لگے داغ اور دھبے دور کر دیتا ہے۔ (توبہ: بعد نجات)

☆ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں پر لعنت کی ہے ان میں جھوٹے لوگ بھی شامل ہیں۔ جھوٹ ایک ایسی بداخلاقی ہے جس پر اللہ نے واضح لعنت کی ہے۔۔۔۔ یہ دنیا کی ترقی ہے کہ ہم آئے روز کوئی نہ کوئی دن منا رہے ہوتے ہیں اور ہم سوچتے تک نہیں کہ ہم یہ دن کیوں منا رہے ہیں جن میں یوم محبت (ویلنٹائن ڈے) اور یوم جھوٹ (اپریل فول) سرفہرست ہیں جو کہ ہماری ثقافت اور اسلامی تہذیب کے برعکس ہیں۔ (یوم جھوٹ)

☆ پاکستان میں گزشتہ چند برس سے دہشتگردی کی وارداتوں میں اضافہ ہوا ہے جس سے حکومت کو ہوش کے ناخن لینے ہوں گے۔۔۔ حکمران ملکی سلامتی کے لئے آپس کی رنجشوں کو بھلا کر ایک پیج پر اکٹھے ہوں۔۔۔ برتری کا یہ عالمی کھیل نہ جانے اور کتنی زندگیوں کے چراغ گل کر دے گا۔ (اک کائنات کتنے خداؤں کی زد میں ہے)

☆ عوام اب کسی مسیحا کی منتظر ہے اور تبدیلی کی خواہاں ہے۔ اسی وجہ سے تحریک انصاف نے غیر معروف اور نوجوان لوگوں کو سامنے لا کر کھڑا کیا ہے۔ عمران خان جانتا ہے کہ تبدیلی اب یوتھ ہی لے کر آئے گی۔ تو کیوں نہ ہم سب مل کر ان کے ہاتھ مضبوط کریں کہ وہ اقتدار میں آ کر پاکستان کو خوشحال بنائیں اور تبدیلی کو یقینی بنائیں۔ (فیصلہ کن تبدیلی) (نوٹ: یہ کالم روزنامہ خبریں ملتان کی ۱۰ مئی ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا)

☆ پردہ حیا کو زائل نہیں ہونے دیتا اور روح کو پاک رکھتا ہے۔۔۔ قوم کی ماؤں اور بہنوں کو چاہیے کہ خود حجاب کی پابندی کریں تا کہ جو بچیاں ان کی گود میں پل رہی ہیں ان کے ذہن بھی حجاب کو بلا تامل قبول کر لیں۔ یاد رکھیں انفرادی عمل سے ہی معاشرے کا عمل بنتا ہے۔ (پردہ)

دائرہ در دائرہ

مصنف : اقبال ندیم

صفحات: 112   قیمت: -/400 روپے   ناشر: مکتبہ اسالیب سرگودھا

اس شعری مجموعے کے مصنف اقبال ندیم کا تعلق سرگودھا سے ہے اور ان کا یہ پہلا شعری مجموعہ تقریباً چالیس سال کی ریاضت کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس لیے کوئی حیرت کی بات نہیں کہ کتاب میں شامل تینوں دیباچے پروفیسر یوسف خالد، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اور شاکر کنڈان جیسی سرگودھے کی ممتاز ادبی شخصیات نے لکھے ہیں جبکہ دونوں فلیپ بھی وہیں سے تعلق رکھنے والی ادبی و تنقیدی شخصیات ڈاکٹر شفیق آصف اور ذوالفقار احسن کے تحریر کردہ ہیں۔ ڈاکٹر شفیق آصف کہتے ہیں کہ اقبال ندیم کی شاعری میں عصری سچائیوں کو شدت اظہار اور فنی معیار کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال ندیم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غزل جیسے مشکل صنفِ سخن کے پیرائے میں ہر طرح کے مضامین کو فنی چابکدستی کے ساتھ منصہ شہود پر لانے کی کاوش کی ہے۔ پروفیسر یوسف خالد کے مطابق اقبال ندیم اس نسل کا نمائندہ ہے جس

کے سامنے پرانی اقدار کا عکس بھی ہے اور نئے ماحول کی بے اعتدالیاں بھی ہیں۔۔۔۔ وہ شدید یوں دو ثقافتوں کے سنگم پر کھڑا ایک شاعر جب قلم اٹھاتا ہے تو اس کا سارا دکھ لفظوں میں اتر آتا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ان کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ان کی شاعری میں شعور سے ٹکراتے ہوئے حالات کسی نہ کسی طور موجود ہیں۔ وہ ظلمتِ شب کا امکان سحر کی نوید دیتے ہیں۔ اقبال ندیم لفظوں میں چھپے اندھیروں کو دیدہ و بینا کا حامل دیکھنے کے متمنی ہیں۔

اقبال ندیم کی اس کتاب کا عنوان "دائرہ در دائرہ" ایک شعری ریاضت اور فکری تسلسل کے نتیجے میں تخلیقی عمل کا سمت نما قرار دیا جا سکتا ہے کہ انسان کی زندگی بھی ہمیشہ کسی نہ کسی دائرے کی قید میں رہتی ہے۔ یوں جانیے کہ ایک موہوم نقطے سے جنم لینے والا محدود دائرہ جب پھیلتا ہے تو کائنات کو بھی حصار میں لے لیتا ہے۔ چنانچہ اس کائنات کے بڑے دائرے کے اندر بننے والے کئی دائروں کی جھلک اقبال ندیم کی شاعری میں آراستہ و پیراستہ ہو کر سامنے آتی ہے اور انہوں نے ان دائروں میں موجود حقیقتِ ابدی کے ساتھ ساتھ دنیائے مجازی کے دائروں کو بھی بکمال خوبی اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کی شاعری میں جلال کی کیفیات ہیں وہیں انہیں اپنی تخلیقی ہنر کاری سے جمالیات کے رنگوں میں رنگ کر بھی پیش کیا ہے۔ ان کی غزلیں کچھ معروف زمینوں کی ردیفوں کے ساتھ ساتھ کچھ اچھوتی ردیفوں میں بھی ان کی تخلیقی زرخیزی کا ثبوت دے رہی ہیں۔ چنانچہ سرگودھا کے معروف تنقید نگار اور مدیر "اسالیب" ذوالفقار احسن یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اقبال ندیم غزل جیسے پابندیوں کی حامل صنفِ سخن میں بھی اپنا ایک الگ تشخص قائم کرنے میں کامیاب و کامران ٹھہرے ہیں۔۔۔ ان کے ہاں ہمیں حیات و کائنات کے تمام رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے شعری اور فنی مزاج میں جمود کے بجائے تغیرات کے خواہاں ہیں اسی لیے تو وہ شاعروں کی بھیڑ میں سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ ان کی پوری کتاب کا مطالعہ کرنے اور بہت سے اچھے اشعار منتخب کرنے کے بعد ان میں سے بھی ان کی حمد و نعت اور غزلوں کے چند نمائندہ اشعار ان کے تعارف کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں:

حمد : لیتا ہے جب پیار سے کوئی اس کا نام بھی — کیسے کیسے رنگ دھنک کے اندر کھلتے ہیں
نعت : نور سا پھیل گیا اسمِ محمدؐ کے طفیل — ہم نے ظلمت کو بھی امکانِ سحر میں رکھا

غزلوں کے اشعار:

ع آسماں کی وسعتیں اور ہے لا حاصل میں گم — پر بریدہ اک پرندہ دائرہ در دائرہ
ع راستے مسدود تھے لیکن رہا عزمِ سفر — میں نے حرفِ شوق لکھا دائرہ در دائرہ
ع نمی کے لمس کو ترسا ہوا ہوں — کوئی کر دے مجھے سیراب پھر سے
ع نہاں وحدت میں پوشیدہ خط و خال پہچانے — آئینے کے اندر بھی آئینہ ضروری ہے
ع ہوئے ہیں مالک و مختار میرے — جو کل تک تھے کرایہ دار میرے
ع یہ جو مصنوعی شرافت ہے میاں — پسِ پردہ تو خباثت ہے میاں
ع میرے منہ میں بلا ضرورت تھی — میں نے کوزے میں پھینک دی آواز

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ محترم مدیر، سلام مسنون۔ ماہ مارچ کا "تخلیق" قریباً بروقت ملا۔ اپنی معمول کی دھج لیے ہوئے۔ اولین صفحات میں اداریہ پڑھا اس میں دلسوز انداز کے ساتھ اہم قومی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً پاکستان کا بدترین معاشی بحران اور اس کے علاوہ بے لگام میڈیا کی کارستانیاں۔ ان مسائل نے قوم کے دل و دماغ کو متاثر کر کے رکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم اپنے روزمرہ کے ضروری ذاتی کاموں کے علاوہ دیگر قومی امور سے بھی بیگانہ ہو چکے۔ اداریے میں مدیر محترم نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ مارچ میں کینیڈا میں مقیم ادیب حنیف باوا کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں عطائے ایوارڈ کی تقریب بخوبی انجام پائی۔ مدیر محترم نے لکھا کہ اسے کامیاب بنانے کا سہرا شریک ہونے والے اہلِ قلم کاروں کے سر ہے تاہم جن اصحاب نے دانستہ یا نادانستہ طور پر شرکت نہیں کی، ان کی کمی کو محسوس کیا گیا۔ پرچے کے اگلے صفحات میں حنیف باوا پر ایک وقیع گوشہ بھی ہے جو ان کی شخصیت و فن کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور قلم کاروں پر بھی عمدہ مضامین موجود ہیں۔ مثلاً "زمرد ملک۔ شخصیت و تخلیقات" (غلام حسین ساجد) اور "دھنک کا آٹھواں رنگ" (پروفیسر قیصر نجفی)۔

دراصل فخر زمان نے ایک بھولے بسرے مرحوم پنجابی شاعر زمرد ملک کو وقت کی گرد جھاڑ کر دوبارہ نکالا اور حال ہی میں اس پر اپنی ایک کتاب بعنوان "زمرد ملک۔ شخصیت و تخلیقات" شائع کی ہے۔ زمرد ملک (1929-75ء) نے کم عمر پائی یعنی صرف 46 سال کی عمر میں فوت ہو گئے تھے۔ مرحوم صاحب بصیرت و صاحب علم تھے۔ انھوں نے لاہور میں اعلیٰ تعلیم پائی اور مقامی علمی و ادبی حلقوں میں اپنی اچھی شناخت پیدا کی۔ زیادہ تر پنجابی زبان میں لکھا۔ وفات کے بعد ان کا واحد شعری مجموعہ "رُت کلّھاں" شائع ہوا۔ اسی کی بنیاد پر فخر زمان نے مذکورہ کتاب مرتب کی اور کہا کہ زمرد ملک کی شاعری پنجابی نظم کی روایت ایک سنگ میل کی سی اہمیت رکھتی ہے اور غلام حسین ساجد نے بھی اپنے مضمون میں اسی بات کو اجالا ہے۔ پروفیسر قیصر نجفی نے مذکورہ بالا مضمون میں معروف افسانہ نگار ڈاکٹر نیر زاہد عالم کے فن کو اپنا موضوع بنایا اور یہ دلچسپ جملہ لکھا کہ طب ڈاکٹر موصوف کا اکتسابی علم اور پیشہ ہے جبکہ کہانی کاری ان کی جبلت ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ جو کہانی بھی لکھتے ہیں، اپنے پیشہ ورانہ تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر لکھتے ہیں۔ سو درحقیقت وہ ایک جنوں کہانی کار ہیں جو یکسو لکھتے ہیں تخلیقی لحاظ سے عمدہ اور قاری کے لیے فکر انگیز ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون کا عنوان وہی رکھا ہے جو ڈاکٹر موصوف کی کتاب کا ہے۔

داستان سرائے میں اقبال فیروز کا افسانہ "آرٹ ہاؤس کا ماسی" خوب صورت و دلکش اور اپنے انوکھے انجام میں قاری کے لیے "پنچ" رکھتا ہے۔ حصہ شعر میں قیصر نجفی کی "احساس" ایک اچھی اور سچی نثری نظم ہے۔ اس میں عورت کے ریاشعار سے اس کی زبانی "یہ پوچھتی ہے" "مگر میرے لیے / تمھاری محبت جاگتی ہے / اور تم مجھے / تم اپنی پہلی خواہش کہتے ہو / کیا میں عورت نہیں ہوں؟" موجودہ گرے حالات کے مارے لوگوں کے لیے اقبال عدیم کے دو خوبصورت شعر۔ پہلے ان کا مطلع: تمام شہر نے جھوٹا شمار کر لیا تھا / ہم نے پھر بھی اڑا

اختیار کر لیا تھا۔ اور دوسرا شعر: ہر ایک شے کو وہ نیلام کر کے چھوڑے گا / کیوں سود خور سے تم نے ادھار کر لیا تھا۔

محمد طارق علی (راول پنڈی، کینٹ)

﴿3﴾ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے اور آپ عید الفطر کی مسرتوں اور برکتوں سے بہرہ ور ہوئے ہوں گے۔ عید کی مصروفیات کے باعث بروقت خط نہیں لکھ سکا معذرت۔ ماہنامہ "تخلیق" کی 54 ویں سالگرہ کی یادگار اور پروقار تقریب رمضان سے پہلے منعقد ہوئی لیکن اس میں شمولیت کا حظ اور اثر اب تک کم نہیں ہوا۔ آپ نے جتنی عزت، مان اور پیار دیا، جس گرم جوشی اور خلوص کا مظاہرہ کیا، اس کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ تقریب کے حوالے سے آپ کے حسن انتظام کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ آغاز سے اختتام تک آپ کی ہنر مندی برابر دکھائی دیتی رہی اور حاضرین سے داد وصول کرتی رہی۔ "تخلیق" کی ادب کے لیے خدمات نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔ گزشتہ صدی کی آخری دہائیوں میں جن ادبی جریدوں نے شعر و ادب کی خدمت کی، ان میں تخلیق کا نام بہت نمایاں ہے۔ اظہر جاوید مرحوم نے بے شمار تخلیق کاروں کی تربیت کا فریضہ پورے خلوص اور انہماک سے انجام دیا۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے ایک سعادت مند بیٹا ہونے کے ناطے اس چراغ کو بجھنے نہ دیا بلکہ اس کی لو میں اور اضافہ کیا ہے۔ اپنے عظیم والد کے ادبی ورثے کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اس میں بیش بہا اضافے کیے۔ مجھے اظہر جاوید مرحوم سے صرف ایک بار ملنے کا موقع ملا، جب میں اپنی تحریفی شاعری کی کتاب "اتارا دے" پیش کرنے ان کے دفتر گیا۔ بہت محبت سے ملے اور میری کتاب پر حوصلہ افزا تبصرہ "تخلیق" کے پرچے میں شائع کیا لیکن میری ان سے اصل ملاقات اس وقت ہوئی، جب میں ان کے بیٹے سونان اظہر سے ملا۔ سونان نے پورے ملک کے شعرا اور ادبا سے جس توجہ اور گرم جوشی سے رابطہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ امسال تخلیق ایوارڈ محترم انتظام حنیف باوا کو دیا گیا، ان کو مبارک باد اور نیک خواہشات کا اظہار۔ ایوارڈ کے لیے شخصیت کے انتخاب میں آپ اور ایوارڈ جیوری جس غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اللہ آپ کو توفیقات مزید دے اور تخلیق دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا رہے۔ آمین!

ڈاکٹر بدر منیر (خوشاب)

﴿3﴾ ایک عجیب سے ادبی اطمینان قلب کا احساس ہو رہا ہے آپ کے عظیم علمی و ادبی جریدہ "تخلیق" کا سالانہ خریدار بن کر۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی آپ کا موقر رسالہ زیر مطالعہ رہا تھا۔ یہ میرا آپ سے پہلا تعلق قائم ہوا ہے جو ان شاءاللہ تادیر قائم رہے گا بشرط زندگی۔ محترم سونان بھائی میں کون ہوں کیا ہوں بس یہی کہتا ہوں کہ من آنم کہ من دانم۔ کچھ عرصہ پہلے روزنامہ ایکسپریس میں میرا ایک انٹرویو اس کا تراشہ پیش خدمت ہے۔ آٹھ ناول ہیں، مثلاً افسانے، مضامین اور ریڈیو ڈرامے تحریر کر چکا ہوں۔ حضور والا اس سے پہلے بھی ایک خط اور ایک غیر مطبوعہ مضمون ارسال کیا تھا۔ مگر افسوس وہ ڈاک کی نذر ہو گیا۔ اس خط کے ساتھ بھی ایک مختصر سا مضمون تخلیق میں شرکت کے شوق اور خواہش کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ امید ہے آپ پسند فرمائیں گے اور تخلیق میں جگہ پائے گا۔ نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ۔

ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی (کراچی)

﴿4﴾ عزیزم سوہان اظہر جی! آپ کی جانب سے عطا کیا ہوا اعزاز "تخلیق" نظر نواز ہوا۔ آپ جس محنت اور عزم و استقامت سے یہ جریدہ جاری رکھے ہوئے ہیں اس کے لیے آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس ہمت و استقامت میں مزید اضافہ کرے جس سے آپ اسے خوب سے خوب تر بناتے چلے جائیں۔ خاص طور پر آپ نے جو "تخلیق ایوارڈ" کی صورت میں ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اس کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسا سول ایوارڈ ہے جس کی پاکستان میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں دنیا بھر کے ادبی حلقوں میں اسے نوبل انعام کی طرح دیکھا جانے لگے۔ اس ایوارڈ کو اس کے حق داروں تک پہنچتے ہوئے گیارہ برس بیت چکے ہیں۔ ان گیارہ برسوں میں ایک برس میرے حصے میں بھی آیا ہے۔ یہ برس میری دانست میں میری عمر کے ستاسی سالوں میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ سال 2022ء کا سال ہے۔ مجھے تخلیق ایوارڈ سے نوازنے کا سال، مجھے ایک چھوٹے سے گھر سے اٹھا کر ادبی حلقوں میں پذیرائی بخشنے کا سال۔ مجھے جناب سوہان اظہر جاوید کی جانب سے عطا کیے گئے ایک اہم تحفے کا سال جس کی خوشگوار یاد ہمیشہ میری زندگی سے جڑی رہے گی۔

آخر میں جناب سرفراز سید صاحب نے ایک نہایت ہی اہم مضمون کے ذریعے مجھے گمنامی سے روشناس کرا دیا ہے، ان کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جناب ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے میری ادبی زندگی کا احاطہ کرنے کے لیے قلم اٹھایا۔ میرے لیے نہایت ہی قابلِ فخر بات ہے۔ محترم نسیم سحر نے اپنی تحریر میں میرے افسانوں کو موضوع بنا کر ادبی حلقوں میں مجھے بطور افسانہ نگار متعارف کرایا۔ اس پہلے کی کوئی توفیق نہیں ہوئی۔ نسیم سحر صاحب اس پر بے حد شکریہ۔ اس کے علاوہ جن قلم کاروں نے میرے کام اور مجھے تخلیق ایوارڈ ملنے کو سراہا ہے ان کی شخصیتوں میں سرفہرست ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: جناب ایم۔ ڈی ملک، محترم ڈاکٹر ایوب ندیم، محترم شہباز انور خان، انگلستان سے محترم سردار تبسم، محترم نسیم سحر، محترم قیصر نجفی، محترم ممتاز راشد لاہوری اور محترمہ تسنیم کوثر صاحبہ۔ ان تمام قلم کاروں کا میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ قدرت کاملہ ان تمام قلم کاروں کو جنھوں نے خواہ مضمون کی شکل میں یا خطوط کے ذریعے میرے ادبی کام کو میری طرف سے نوازا، سدا خوش و خرم رکھے۔ آمین ثم آمین! "تخلیق اکسی لینس ایوارڈ یافتہ"

حنیف باوا (جھنگ)

﴿5﴾ سوہان بیٹے! درازیٔ عمر، صحت و سلامتی!! یاد کرتے آنے کے بعد پہلی ڈاک میں جناب حسن عسکری کاظمی صاحب کی تین تازہ ترین کتابیں "شہر بے نام" (مجموعہ غزل)، "برقدم کربلا" اور "تحفہ" کے علاوہ "تخلیق" مارچ 2023ء موصول ہوا۔ ڈاک ہاتھ میں آنے سے پہلے میرے نام کی تحقیق ہوئی۔ میرا دل زم زم ہوا کا آیا۔ "کی مقدار اصغر کون ہیں؟" تصدیق کے بعد ڈاک ہاتھ میں آئی۔ سچی خوشی ہوئی۔ طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ "تخلیق" کا سرورق "گیارہواں تخلیق ایوارڈ" سے آراستہ ہے۔ پہلے ہی صفحے پر "تخلیق ایوارڈ" کی رنگین تصاویر نظر نواز ہوئیں۔ حسبِ معمول "پہلی بات" کا مطالعہ کیا۔ اداریے میں تم بڑی کھری کھری باتیں کہتے ہو۔ "حنیف باوا سے دو ردکا واسطہ" جناب سرفراز سید کا تحریر کردہ مضمون ہے باوا صاحب کے حالاتِ زندگی کو دلکش بنا کر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے باوا صاحب کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید ماشاءاللہ وہ نفیس تخلیق کار ہیں۔ "دائروں سے باہر کا آدمی — حنیف باوا" نسیم سحر کی اثر انگیز تحریر ہے۔ انھوں

نے باوا صاحب کی انشائیہ نگاری کو موضوع بنایا ہے لیکن انہوں نے باوا صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

''گریز پا موسموں کی خوشبو'' محمود شام صاحب کا معلوماتی اور دل خوش کن مضمون نظر نواز ہوا۔ ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کا مضمون ''رنگ بدلنے کا موسم کا ایک جھونکا'' اپنے عنوانات کے لحاظ سے ایک ہی قبیل کے مضامین ہیں۔ البتہ طرزِ نگارش جدا جدا ہے۔ محمود شام کہنہ مشق ادیب و شاعر ہیں یعنی ''عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔'' ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ ادب میں اپنی پہچان بنا چکی ہیں۔ ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' پر پروفیسر قیصر نجفی صاحب کا تبصرہ پسند آیا۔ ڈاکٹر فیروز عالم کے فن افسانہ نگاری پر ابھی تک توجہ نہیں دی گئی۔ افسانوی ادب میں ڈاکٹر موصوف اہم مقام رکھتے ہیں۔ میرے تو وہ پسندیدہ تخلیق کاروں میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی برکتوں سے نوازتا رہے۔ آمین۔ پیروز بخت قاضی اپنی علالت کے باوجود ایمان افروز تحریروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ رب العالمین انہیں شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ ماہنامہ تخلیق میں سفرنامے دو ہیں ''اطالوی حمام خانے میں اذان'' از ڈاکٹر زاہد منیر، دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیق خان کا سفرنامہ ''تھائی لینڈ'' پنجابی زبان میں ہے۔ میں پنجابی پڑھ لیتی ہوں مگر اردو زبان جیسی روانی میسر نہیں ہے۔ اسی سبب سے محترمہ تسنیم کوثر کے افسانے کا بھی مطالعہ کرنے سے قاصر رہی۔ اس مرتبہ افسانے تخلیق میں دس عدد ہیں۔ پہلا افسانہ محمود قاضی صاحب کا ''ہم'' ہے۔ قاضی صاحب سینئر افسانہ نگار ہیں لیکن ''ہم'' کچھ جاندار تاثر نہیں ہوا۔ محمد طارق علی کا افسانہ ''گلاب کے آنسو'' اور اقبال فیروز کا افسانہ ''آرفن ہاؤس کا ماس'' شمارے کے بہترین افسانے ہیں۔ محمد طارق علی فکشن میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''مجھے تعبیر پسند ہے'' کے نام سے منصۂ شہود پر آ کر داد و تحسین پا چکا ہے۔ ''آرفن ہاؤس کا ماس'' اول تا آخر تجسس برقرار رکھتا ہے اور انجام کار اپنے قاری کو تا دیر ملول رکھتا ہے۔ اقبال فیروز میرے مطالعے میں نہیں آ سکے، اور اب انہیں پڑھا تو ان کا ناول ''بس سلاسل'' پڑھنے کی خواہش ہوئی۔ کیا اس کے پبلشر کا پتہ معلوم ہو سکتا ہے؟ عطیہ سید کا ''الشریٰ'' دلگداز افسانہ ہے۔ دیا او دیکھنے کی آرزو مند طوبیٰ بی بالآخر عالم بالا کی سیر کو روانہ ہو گئی۔ فرحت پروین کا ''خوف'' خوف کو واضح نہیں کر سکا، یا میں سمجھ نہیں پائی۔ افسانے میں کرداروں کا ہجوم ہے۔ اختتام بھی مبہم سا ہے۔ آصف عمران نے ''بندگی کا مسافر'' میں شاعرانہ غیر ضروری لفاظی سے افسانے کو طول دیا ہے۔ موضوع عام سا ہے۔ کوئی نئی بات یا ندرت نہیں۔ ''انجمن خیال'' اپنے مخصوص رنگ میں رنگی ہوئی۔ شاعری کا حصہ معیاری اور جاندار ہے۔ نامی گرامی شعراء کے ساتھ کچھ نئے شاعروں کا کلام بھی لائق مطالعہ ہے۔ تمہاری محنتیں قابل تحسین ہیں۔ ''تخلیق'' کو تم نے معیار سے گرنے نہیں دیا بلکہ اونچا ہی کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم نے اظہر جاوید کو بھلا دیا بلکہ تخلیق کا ہر شمارہ ان کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ تمہاری حسن کارکردگی پہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ تم نے وہ کر دکھایا جو وہ نہیں کر سکے تھے۔ خاص طور پر ''سالانہ ایوارڈ'' کی اختراع نے ''تخلیق'' کو مزید شہرتوں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ اظہر صاحب کی مغفرت فرمائے اور تمہیں اپنی بہترین نعمتوں اور توفیقات سے نوازے آمین۔ سلامت رہو۔ پھلو پھولو اور گلشن ادب کو ماہنامہ تخلیق کے مسلسل اجراء سے ہمیشہ مہکاتے رہو۔ معاف کرنا بیٹے خط کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے مگر لکھتی بھی تو کبھی کبھار ہوں نا۔ خدا حافظ۔

عذرا اصغر (بالاکوٹ)

﴿6﴾ پیارے اور ہر دلعزیز ماہنامہ "تخلیق" کا ماہ مارچ 2023ء کا شمارہ آپ کے شکریہ کے ساتھ موصول پایا۔ اگرچہ خلاف روایت تھوڑی سی تاخیر سے ملا لیکن ظاہر ہے ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ مذکورہ شمارہ میں "تخلیق ایوارڈ 2023ء" کی گیارہویں تقریب کا احوال بھی درج ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ ایوارڈ کی تقسیم مقامی سطح پر ہو صوبائی یا قومی سطح پر، سو فیصد میرٹ اور شفافیت کے مطابق کبھی بھی نہیں ہوتی۔ ہمارے سرکاری اعزازات جو سال میں دو مرتبہ تقسیم کیے جاتے ہیں ان کی تقسیم اندھے کی ریوڑیوں کی طرح ہوتی ہے اور برسوں سے یہ سلسلہ یوں ہی جاری ہے کہ پچاس فیصد ایوارڈز محض ذاتی پسند کی بنیاد پر ہی دیے جاتے ہیں۔ اس لیے ان پر انگلیاں بھی اٹھتی ہیں۔ لیکن "تخلیق ایوارڈ" وہ واحد ایوارڈ ہے جو سو فیصد میرٹ پر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے اس کا آغاز ہوا کوئی ایک بھی ایسا ایوارڈ نہیں ہے جس پر کوئی بھی حلقے کی طرف سے کسی بھی نوع کا اعتراض وارد ہوا ہو۔ چنانچہ سرکاری ایوارڈ کے مقابلے میں "تخلیق ایوارڈ" کی اہمیت اور حیثیت کے مسلمہ قرار دیے جانے کے پیچھے بھی یہی حقیقت کارفرما ہے۔ اس مرتبہ جھنگ کے بزرگ ادیب، مترجم اور محقق جناب حنیف باوا کو دیا گیا اور اس پر بھی ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ حق بہ حقدار رسید۔ اس عظیم خدمت پر سونان اظہر اور ان کی ٹیم یقینی طور پر مبارکباد اور تحسین کی حقدار ہے۔ مارچ 2023ء کے زیر نظر شمارے کے سرورق سے لے کر اس میں شامل مضامین نظم و نثر حسب روایت معیاری اور ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ پہلی بات میں آپ نے سوشل میڈیا کی حشر سامانیوں کے حوالے سے ہماری اجتماعی سوچ اور رویوں پر جس جس خوبصورتی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ہمارے خوابیدہ قومی ضمیر کو جگانے کی کوشش کی ہے وہ بھی لائق تحسین ہے۔ طوالت کے خوف سے مضامین اور شاعری پر تفصیلی نقد و تبصرہ نہیں کر رہا۔ دعا ہے اللہ کریم آپ کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھے اور تخلیق پھلے پھولے اور ادب کی یوں ہی خدمت انجام دیتی رہے۔

شہباز انور خان (لاہور)

﴿7﴾ عزیزم سونان! تخلیق مارچ 2023ء موصول ہوا۔ ماشاءاللہ خوب ہے۔ تخلیق ایوارڈ کی رنگا رنگ تقریب کی تصویروں سے سجا ہوا۔ بہت مبارک تمہیں جتنی محنت اور لگن سے تم نے اس تقریب کا انتظام و انصرام کیا، اس پر داد تو حق ہے۔ یہ مدتوں نہ بھولنے والی تقریب تھی۔ پاکستان بھر سے تم نے تخلیق کار اکٹھے کر لیے۔ ہر کام کام سب کو عزت و توقیر دی۔ مہمان نوازی کے بھی تقاضے پورے کئے۔ یہ عجز و انکسار، یہ محبت کے تقاضے نبھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ تمہارا شکریہ! انتظامی امور کمیٹی میں شامل کیا۔ ذمہ داری سونپی۔ صد شکر اپنے تئیں ہم نے نبھانے کی پوری کوشش کی۔ سلامت رہو، یونہی رونقیں لگائے رہو۔ شازیہ رباب اور فوزیہ تاج سے ملاقات یادگار رہی۔ ادب کی مقبول و معروف ہستیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہر طرف تمہاری توصیف اور اظہر صاحب کی کاوشوں کا ذکر تھا۔ حنیف باوا کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ ایک سچے اور کھرے تخلیق کار ہیں۔ سادگی کا پیکر، عاجزی کا نمونہ، تصنع سے دور۔ اس انتخاب کے لئے تخلیق ایوارڈ کمیٹی مبارکباد کی مستحق ہے۔ گوشہ حنیف باوا بھی خوبصورت تحریروں سے جگمگا رہا ہے۔

گوشہ حنیف باوا میں تینوں مضامین بہت اعلیٰ پائے کے ہیں۔ تینوں نامور ہستیوں نے حنیف باوا کے بارے میں مستند رائے پیش کی ہے گویا حق بہ حقدار رسید۔ سرفراز سید صاحب نے تانے بانے میں حنیف باوا کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے قارئین کو

روشناس کروایا ہے۔ بہت مدت بعد سرفراز تبسم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ غالباً وہ کم کم ہی گھر سے نکلتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم وہ نابغہ روزگار شخصیت جو ادب کی بے لوث خدمت میں پیش پیش ہیں۔ وقتاً فوقتاً اپنی تخلیقات سے نوازتے رہتے ہیں۔ میری خوش بختی میری ایک مکمل تالیف میں ان کی کتب موجود ہیں۔ نسیم سحر نے بھی اپنے قلم کی جولانی اور روانی سے حنیف باوا کو دائروں سے باہر کا آدمی قرار دیا ہے۔ تخلیق میں شامل مضامین اور افسانے خوب ہیں۔ اب کے توجہ شاعری کی طرف رہی۔ غزلیں بھرپور حسن لئے ہوئے ہیں۔ چند چیدہ اشعار جو اچھے لگے اور دل داری کی زینت بنے ان کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گی۔

- بیل محراب سے لپٹی ہے — پانیوں پہ دیا جلتا ہے (نذیر قیصر)
- زندگی اک داستانِ شوق ہے سمجھیں اگر — گر نہ ہو ذکرِ محبت داستاں میں کیا رہا (اسلم انصاری)
- ایک گوٹا لگا دوپٹہ تھا — جس کی جھلمل نے کر دیا پاگل (نسیم سحر)
- کہیں پہ گھومتا پھرتا مرے قریں نکلا — وہ شخص دل کی زمینوں سے پھر نہیں نکلا (شبیر ناقد)
- تیری یادوں کی کھلتی گئیں پنکھڑیاں — جب بھی بارش ہوئی اجنبی شہر میں (حسن عباسی)
- تجھی شہباز یہ آواز ہے داتا کی نگری سے — سے دوری لگے اب خود سے حجاب مل جائے (اظہر جاوید)
- وہاں بھی کوئی میرا منتظر ہے — میں دریا پار جاتا جا رہا ہوں (ڈاکٹر ایوب ندیم)
- یادیں جھٹک کے دیکھ چکا ہوں ہزار بار — خوشبو گئی نہیں ہے تمہارے رومال سے (سرفراز تبسم)
- کبھی کا ختم ہو جاتا تعلق — رکاوٹ ہے رواداری ہماری (ذوالفقار علی اسد)
- ستم تو یہ ہے کنارے پہ آ کے ڈوب گئے — بڑے سکون سے دریا تو پار کر لیا تھا (اقبال ندیم)
- ہم کو پردیس میں یاد اس کی بہت آتی تھی — ہم وطن کے خس و خاشاک اٹھا لائے ہیں (وسیم جبران)
- اک شخص کے حصار میں زندگی رہی — اک شخص میری عمر کا سارا نصاب ہے (طلعت حسین)
- یہ عشق داستاں سے آگے کا کھیل ہے — دریا ہے جس کا کوئی کنارہ بھی تو نہیں (امجد بابر)
- مٹی کے بیچتا ہے کھلونے تمام دن — افلاس کی ڈسی ہوئی عورت کی تم ہو (شازیہ رباب)
- خدا کا شکر کہ اپنا پتہ چلا شہزاد — ہوئے ہیں جب سے الگ عام اور سب سے ہم (قمر رضا شہزاد)
- جا چلا جا تو اتنی دور کہ پھر — تیرے آنے کی آس بھی نہ رہے (شہلا سعید)

تخلیق کے توسط سے شہزاد نیر کا شکریہ کہ ہماری محبت کے تین لوگ نے انہیں بھا گئے۔ ایم ذکی ملک نے انجمن خیال کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ انجمن خیال میں ارجمند شاہین کا انٹرویو میں ان کی علالت کے بارے میں بتایا گیا۔ ہماری دعائیں ان کے لئے۔ وہ سلامت رہیں جلد روبصحت ہوں۔

تسنیم کوثر (لاہور)

﴿8﴾ آداب و تسلیمات! تخلیق (مارچ 2023ء) بصد تفاخر نواز ہوا۔ سرورق گیارھویں تخلیق ایوارڈ کے حوالے سے بانی تخلیق اظہر جاوید اور ایوارڈ یافتہ کہانی کار حنیف باوا کی رنگین تصاویر سے آراستہ تھا۔ اداریے میں آپ نے یوٹیوب وغیرہ کی ڈیپ ریڈ والی اخلاق باختہ روش اور پھر ملک کی بدترین معاشی صورتحال پر دردمندانہ اظہار کرنے کے بعد "تخلیق ایوارڈ" ہی کو موضوع بنایا ہے اور Aflnos کلب میں اس کی شاندار تقریب کی عکاسی کی ہے۔ سونے پہ سہاگہ ڈاکٹر ہارون رشید تبسم کی مفصل رپورٹ نے اس یادگار تقریب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ رنگین تصاویر بھی بہت خوب تھیں۔ ڈاکٹر ہارون رشید تبسم اور سرفراز سید کے حنیف باوا کے بارے میں مضامین بھی اس تقریب کو سند بخشنے والے ہی تھے۔ اس بے حد کامیاب تقریب پر آپ اور آپ کی پوری ٹیم بلاشبہ بے پناہ مبارکباد کی حقدار ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس تقریب میں شرکت کے کئی اشارے ملے۔ کئی جید اہل قلم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ سابقہ مدیرہ تخلیق اور مشہور افسانہ نگار محترمہ عذرا اصغر اور ان کی افسانہ و سفرنامہ نگار بیٹی طاہرہ اقبال کے تو بالکل ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا۔ کچھ مکالمہ بھی ہوا اور ان سے کتب کا تحفہ بھی ملا۔ کچھ دیر کے لیے جید افسانہ نگار تسنیم کوثر بھی ساتھ بیٹھیں۔ تقریب میں آپ کا حسن انتظام اور صوفیہ بیدار کی باکمال نظامت بھی لائق تحسین رہی۔ انجمن خیال (خطوط) میں تسنیم کوثر نے "تخلیق دفتر" میں ہونے والے ایک مشاعرے اور عشائیے کی یادیں بھی لکھی ہیں۔ میں بھی اس محفل میں موجود تھا۔ اس روز بھی آپ کی میزبانی لاجواب رہی تھی۔ مذکورہ شمارے میں شامل تحریروں کے عنوانات دیکھے ہیں۔ اب باری باری انہیں پڑھوں گا اور حظ اٹھاؤں گا۔ اس شمارے میں آپ نے میرے پانچ قطعات شامل کیے اور میرا افسانہ "سالگرہ کا تحفہ" بھی۔ آپ کا اس کرم فرمائی پر دلی شکریہ۔ خطوط میں کچھ قلمکاروں نے شائع شدہ تحریروں میں پروف خوانی بہتر بنانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ میری بھی آپ سے یہی گزارش ہے۔ "تخلیق" کا 1969ء سے باقاعدگی سے جاری سفر قابل تحسین ہے۔ "تخلیق" کے بہی خواہوں کے لیے نیک تمنائیں۔

ممتاز راشد لاہوری (لاہور)

﴿9﴾ عزیزم سونان اظہر سدا سلامت رہو۔ میں اپنی بات کا آغاز تخلیق کی سالانہ ایوارڈ تقریب میں شرکت کی اس دیرینہ خواہش سے کروں گا جو بالآخر ۱۱ مارچ ۲۳ کو پوری ہو ہی گئی۔ اس دن آغوش کلب لاہور کے ہال میں تخلیق کے پرستاروں کے جھرمٹ میں بیٹھنا راقم کے لیے ایک اعزاز تھا۔ تقریب کی انتظامی کمیٹی کے اراکین جناب غلام حسین ساجد، حکیم سلیم مجوکہ، آفتاب خان، جعفر بلتی، تسنیم کوثر، سحر حفیظ اور آپ کے اہل خانہ نے جس خوش دلی اور تپاک سے مہمانوں کو خوش آمدید کہا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ماشاء اللہ آپ اور آپ کی ہونہار ٹیم کا ہال کو تقریب کے شایان شان سجانا، مہمانوں کو انتہائی اپنائیت اور خلوص سے خوش آمدید کہنا، صوفیہ بیدار کی عمدہ نظامت کے جلو میں ملک بھر سے ادبی شخصیات اور باہر سے آئے ہوئے شرکائے محفل سے اظہار خیال کے ذریعے بانی تخلیق جناب اظہر جاوید سے وابستہ یادیں تازہ کروانا، اعلیٰ ادبی شخصیات کے دست مبارک سے ایوارڈ اور یادگاری شیلڈیں دلوانا اور پرتکلف انداز میں خاطر مدارت کرنا، اس تقریب کے وہ وصف خاص تھے جن کی تعریف میں تقریباً سبھی حاضرین محفل رطب اللسان تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ تقریب کے اختتام پر مجھے بہت جلد واپس آنا پڑا اور یوں میں بہت سے شرکائے محفل سے ملاقات بھی نہ کر سکا۔ تاہم اس قلیل وقت میں سٹیج پر براجمان اہل ادب شخصیات کے علاوہ جن معتبر لکھاریوں سے مجھے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا ان میں جناب تواجہ

محمد زکریا، سرفراز سید، ہارون الرشید تبسم، عذرا اصغر، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، ڈاکٹر شاہ فرشتہ اور ڈاکٹر بیدار عطیہ، شیر طراز، الحمرا کے شاہد علی خان اور آصف عمران قابل ذکر ہیں۔ بلاشبہ اس تقریب کے بہترین انتظامات آپ کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ اس تقریب کے کامیاب انعقاد پر ہم آپ اور آپ کی مستعد ٹیم کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اب آتے ہیں مارچ 23 کے تخلیق کے سرسری جائزے کی طرف۔ یہ شمارہ رمضان کریم کی بابرکت ساعتوں میں بدست وصول ہوا تاہم اس کا مطالعہ بعد از عید الفطر ہی ممکن ہو سکا۔ اسد فاطمی کا جاذب نظر سرورق پسند آیا۔ آپ نے "پہلی بات" میں سوشل میڈیا کی جن قباحتوں کا ذکر کیا ہے، سچ پوچھیں تو ہم سب ہی اس طوفان بدتمیزی سے عاجز آئے ہوئے ہیں مگر سر دست کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ پہلی بات کے دوسرے حصے میں آپ نے مذکورہ بالا "اولین تحقیقی ایوارڈ" کے انعقاد کی کتھا اور محبت بھرا اظہار تشکر کا تذکرہ بڑے دلنشیں انداز سے کیا ہے۔ اس شمارے میں اس تقریب کی تصویری جھلکیاں اور بڑی عمدہ نثر میں لکھی رپورتاژ بھی پڑھنے کو ملی۔ اس مرتبہ عید کی چھٹیوں میں تخلیق کی دھنک رنگ منظومات، غزلیات، اور حمد و نعت سے خوب حظ اٹھایا۔ گوشہ حنیف باوا میں سرفراز سید، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اور نسیم سحر نے باوا جی کے فکر و فن کو بڑے موثر پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔ اگرچہ آٹھ کے آٹھ مضامین خاصے معلوماتی تھے لیکن غلام حسین ساجد، ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر جواز جعفری کے مضامین میں عنوان کی پرتیں قدرے تفصیل سے کھلتی دکھائی دیں۔ سبھی افسانے روایتی مگر پرکشش کہانیوں پر مبنی تھے۔ عطیہ سید کے افسانے کا عنوان شاید کاتب کی غلطی سے لاٹری کی بجائے لالری بن گیا۔ اس میں اس کا بھی کیا قصور ہو سکتا ہے کیونکہ اس نے لاٹری شاید کبھی دیکھی بھی نہ ہو۔ آصف عمران کا افسانہ بندگی کا مسافر ہمیں تو اپنے جیسے کئی سالوں کی داستان حیات کی جھلکیوں سے مرصع دکھائی دیا۔ محمد طارق علی کا افسانہ گلاب کے آنسو اور انجم نیلم کے افسانے ازل الست کی کہانیاں خاصی جاندار نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے معروف گلوکار مہدی حسن کے فن موسیقی اور گائیکی کو بہت ہی عمدہ انداز سے اجاگر کیا ہے۔ ایوارڈ کی تقریب میں ان کی آواز میں کلام اختر جاوید سننے کا موقع ملا۔ ماشاءاللہ ان کا اپنا انداز گائیکی بھی بڑا رسیلا اور سریلا ہے۔ سفرنامے دونوں دلچسپ تھے۔ ڈاکٹر محمد رفیق کی رنگلی پنجابی کا من موہنا انداز بہت پسند آیا۔ سلیم الرحمٰن، فرحت عباس شاہ، شہزاد نیئر اور خالد عبداللہ وینس کے جائزے بھی بصیرت افروز تھے۔ پنجاب رنگ کی تحریریں نرالے ڈھنگ سے میری ماں جائی بولی کی ترویج کا حق ادا کرتے نظر آئے۔ انجمن خیال میں سلطان سکون، نسیم سحر، شازیہ رباب، حنیف باوا، تسنیم کوثر، ممتاز راشد لاہوری، قیصر تجمل اور خالد عبداللہ وینس کے خطوط میں گزشتہ شمارے کی تحریروں کے اچھے تجزیے پڑھنے کو ملے۔ جناب خالد عبداللہ صاحب نے اپنے خط میں اختر جاوید کی کتاب بڑی دیر ہوگئی پر لکھے میرے مضمون کو پسند کیا میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

آخر میں ذکر ہو جائے اس نئی روایت کا جس کی اطلاع آپ نے فون پر راقم کو دی تھی۔ ہم اکثر لاہور میں آپ سے ملنے والے تخلیق کے پرستاروں کے ملن کا احوال تو پڑھتے رہتے تھے۔ اب آپ نے اس روایت کو دوسرے شہروں میں تخلیقی برادری کے باہمی روابط کے لیے رائج کرنے کا جو صائب مشورہ دیا تھا اس سلسلے کی ایک چھوٹی سی ملن تقریب ہم نے اس وقت منعقد کی جب آپ نے ہمیں محترمہ تسنیم کوثر کی راولپنڈی شہر میں موجودگی کی اطلاع دی۔ میری خوش نصیبی کہ وہ راقم کے دفتر میں کرم نوازی کو تشریف لائیں اور پھر جناب نسیم سحر کی مساعی سے تخلیق کے پرستار اور ممتاز شاعر جناب خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر فرحت عباس، نسیم سحر، طلعت صبح اور تسنیم کوثر

کی پرستار، چند خواتین کی اس نشست میں شرکت میرے لیے باعث مسرت تھی۔ پہلے تو چائے سنیکس پر گپ شپ کا دور چلا پھر وہ ہوا جو شاعروں کے اکٹھ میں ہوتا ہے یعنی ہم سب کلام شاعر بزبان شاعر سے خوب محظوظ ہوئے۔ امید ہے اس یادگار نشست کا مزید احوال اس محفل کے کھیا نسیم سحر اپنے مکتوب میں لکھیں گے۔

ایم ڈی ملک (راولپنڈی)

﴿10﴾ امید ہے آپ اہل خانہ اور اہل ادب بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ہر طرف ماہنامہ تخلیق کے "تخلیق ایوارڈ" کی دھوم ہے اور یہ سب آپ کی محنتوں، محبتوں اور خلوص کی وجہ سے ممکن ہوا بلکہ مسلسل ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں ہمارے عزیز دوست اختر جاوید کی زندگی جائیداد تھی مگر یہ جو ادبی جائیداد "تخلیق" کی صورت میں آپ کے حوالے ہوں۔ (اس جائیداد کو انہوں نے پلاٹ بیچ کر خرید اتھا) بلکہ یوں کہیے کہ آپ نے یہ خود اپنے سر خوشی لی۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ ادبی جائیداد کو اولاد ورثہ سمجھے تو کر سرورد۔ آپ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے مختلف شہروں سے دوست اکٹھے ہوتے ہوئے۔ باقیوں کا تو علم نہیں مگر آپ نے مجھ جیسے ناچیز کو درجنوں فون کروا لیے۔ سو آپ کی محبت میں ہم اس بار کے ایوارڈ کے دولہا حنیف باوا کو عامر عبداللہ اور ڈاکٹر محمد عمر ساحل کی قراءت میں نہایت محبت سے لے کر کوئل کی خوبصورت آواز والی خاتون کی رہنمائی میں نوشی کلب پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ وہی کوئل والی دوشیزہ ہیں جو ایک لمحہ دوست کو فون پر راستہ بتا رہی تھی تو ان کے ساتھ بیٹھی ان کی ماں کہنے لگی "یہ لڑکی تو بہت اچھی ہے۔ بڑی نیک ہے کہ سیدھا سیدھا راستہ بھی بتا رہی ہے۔ بیٹا اس کا پتہ بتا میں تمہارے لئے اس کا رشتہ مانگنے جاؤں گی"۔

11 مارچ 2023ء کو لاہور نوشی کلب میں پہنچ کر آپ کے ہمراہ ڈاکٹر قیصر رفیق سے بھی ملاقات ہوگی جو آج کل مشہور چینل ڈسکوور پاکستان (Discover pakistan) چلا رہے ہیں۔ انتظامیہ ٹیم میں شامل غلام حسین ساجد، ظفر سپل، منیر سلیم مجوکہ، آفتاب خان سب سے زیادہ عزت دی جا رہی ہے۔ بہت عرصے بعد امجد سلیم سید سے اسی بہانے کھل کر گپ شپ ہوگی۔ کہاں 1995 کا سال جہاں ہماری کتاب "الف کا لالا" کا انہوں نے دیباچہ لکھا اور پھر مارچ 1995ء میں شیزان ہال روڈ لاہور پر تقریب رونمائی میں بھرپور حصہ لیا جس میں ظفر اقبال کی صدارت تھی اور شہزاد احمد، خواجہ زکریا، اے جی جوش، ڈاکٹر اختر شمار، علی اکبر منصور، فرحت عباس شاہ، سجاد بخاری، ڈاکٹر مبشر شاہ نے بھرپور اظہار رائے فرمایا اور بشریٰ اعجاز وغیرہ دوستوں نے خصوصی شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر سعادت سعید کا بھی ساتھ بہت پرانا ہے۔ ہماری "بیگم خانی" ہر اخبار کے پورے رنگین صفحے پر مضمون لکھ کر دعا میں لیں۔ خالد اقبال یاسر سے بھی لاہور اور اسلام آباد کی تقاریب کے بعد یہاں ملاقات ہوئی۔ منیر قیصر اور ان کی بیگم سے ملاقات بھی تجدید وفا کا وجد رکھتی ہے کہ جھنگ میں برادری کلب کے مشاعرے کے ساتھ ساتھ نوبہ میں تو بہی کی جی یار یگانہ قمر (مقیم امریکہ) کے ہاں بھی ملاقات رہی۔ محمود احمد قاضی کے ساتھ ہم نے بہت عرصہ پہلے اکادمی ادبیات کے تیرہ پاٹی کا دورہ میں بین الاصوبائی تور کیا تھا اور اب تجدید وفا ہوئی۔ اسی بہانے نشاط قاضی کی بھی زیارت ہوئی جنہوں نے تلاوت کلام پاک سے اس محفل کا آغاز فرمایا۔ ایسے میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم بھی ہمارے ساتھ بیٹھے تقریب کا ایک ایک لفظ نوٹ کرتے رہے کہ کہیں کوئی اہل ادب گنتی میں رہ نہ جائے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر خرم

الطاف کی غزلوں کی دوسری کتاب کی رونمائی پر سرگودھا جمخانہ کلب میں ہم اکٹھے تھے۔ سوہان اظہر جاوید کی آپ تو اپنی فیملی کے ساتھ یوں پھر رہے تھے کہ جیسے یہ آپ کی شادی کی ولیمے کی تقریب ہے۔ ویسے بھی خوشی آپ کے چہرے پر نمایاں تھی۔ ڈاکٹر خولہ ذکریا نے تو ہمیں مل کر ایسے پیار کیا جیسے بچوں کو کرتے ہیں۔ یہ وہی عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے دنیا کو بتایا کہ مجید امجد کتنا عظیم شاعر تھا۔ ہمارے جھنگ کے نوجوان شاعر مدثر حبیب جانی بھی آن ملے۔ خوشی کی بات یہ ہوئی کہ سرفراز سید نے محض فیس بک فرینڈ ہونے پر ہی ہمیں پہچان لیا اور بڑی محبت سے ملے۔ ویسے ہم اس بات پہ حیران ہو رہے تھے کہ ہم کئی بار صوفیہ بیدار سے مل چکے تھے مگر وہ تو ہمیں پہچان نہیں رہی تھیں البتہ ان کے ساتھ بیٹھی خوبصورت خاتون ہمیں مسلسل تکے جا رہی تھی۔ ہمیں لگا کہ کہیں انہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی تو ہم خود اٹھ کر انہیں سلام کرنے پہنچے جو افسانہ نگار فرحت پروین نے خوشی سے قبول فرمایا اور کہنے لگیں کہ میں آپ کو پہچان رہی تھی تب ہم نے انہیں پہلی بار اور صوفیہ بیدار کو چوتھی پانچویں بار بتایا کہ ہم ڈاکٹر محسن مگھیانہ اصل میں تو سرجن ہیں پر لکھنے لکھانے کا بھی شوق ہے۔ جہاں شعیب بن عزیز، عطا الاصغر، شاہد علی خان (مدیر الحمراء)، وجاہت مسعود، ڈاکٹر امجد پرویز، احمد صفی سے ملاقاتیں ہوئیں وہیں میجر شہزاد نیر سے تجدید وفا بھی ہوئی کہ وہ جھنگ بھی تشریف لائے تھے اور بعد میں ہم عاصمہ طاہر کی معیت میں ان کی انگریزی کتاب پہ تبصرہ کرنے کے لیے تقریب کے بعد بھی مل بیٹھے۔ ناصر علی سید سے تو پشاور میں بھی رابطہ رہتا تھا یہاں ملے تو بین الصوبائی ادبی ٹوری باتیں آتے رہے۔ وہیں طلعت منیر (اسلام آباد) جو ہمارے فیس بک فرینڈ بھی ہیں سے بھی گپ شپ رہی۔ ڈاکٹر نجیب جمال سے تو پرانی ملاقاتیں ہیں سو مرحوم صفدر سلیم سیال کو بھی مل کر یاد کر لیا۔ شبہ طراز، فوزیہ تاج اور کئی دوسری شاعرات کو دور دور سے ہی دیکھنے پہ اکتفا کیا۔ سفرنامہ نگار سلمیٰ اعوان کو بھی دور سے دیکھا کہ وہ بھی صوفیہ بیدار کی طرف کئی بار ملنے کے باوجود انہیں ہمیں پہچاننے میں مشکل ہوتی ہے حالانکہ ایک دن وہ جھنگ میں ہمارے گھر بھی رہیں۔ ویسے لوگ تو کہتے ہیں کہ ہماری مونچھیں منفرد ہیں اور ہم اس وجہ سے فوراً پہچان لیے جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کوئی پہچاننے کی کوشش کرے تبھی نا۔ [illegible] فرشیزاد اور شاہدہ دلاور سے ملاقات ہوئی تو پرانی باتیں یاد کرتے رہے۔ دونوں جھنگ مشاعرے کے لیے تشریف لائے تو ہمارے فیصل مگھیانہ میموریل ہسپتال بھی آئے تھے۔ اس بار ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ نے بالکل کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہمیں نہایت دریادلی سے اپنا نیا ناول (لوگوں کی نظروں سے چھپا کے [illegible] کہ کوئی اور نہ مانگ لے) زندگی ایک ناراض متن عنایت فرمایا۔ ہمیں پیارے دوست اسلم ملک اور ان کی جیون ساتھی مسرت کلانچوی سے بھی گرم جوشی سے ملاقات رہی۔ اسلم ملک آج کل اپنا خاص واٹس ایپ گروپ بڑے دھڑلے سے چلا رہے ہیں۔ جبکہ مسرت کلانچوی اور ہم پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے بہت پرانے ممبر ہیں (وہ تو 1996ء سے ممبر چلا آ رہا ہے) محمد عباس مرزا تو ہمارے بڑے پیارے دوست ہیں اور ہم دونوں دھڑا دھڑ فیس بک پر ہر وقت ایسے موجود ہوتے ہیں جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔

اس تقریب کا ہمارے لیے نہایت یادگار لمحہ وہ تھا جب ہمیں "سفیر تخلیق" کی شیلڈ سوہان اظہر جاوید نے اپنی نگرانی میں ایس ایس پی مطاع محمد کے ہاتھوں دلوائی۔ ہم جو آج کی تقریب کے دولہا حنیف باوا کو جھنگ سے جو گاڑی میں اٹھا کے لائے تھے۔ سفیر کا ایوارڈ تو بنتا ہی تھا۔ ہمیں ہم نے فرخ رضوی صاحب کو خالد محمود صاحب کو ایوارڈ دیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خیر سے یہ گیارہواں تخلیق ایوارڈ کی تقریب محمود کا سفر۔ تقریب کی تفصیلی روداد تو آپ نے مارچ 2023 کے شمارے میں پڑھ لی ہوگی تاہم

''نثر نگر'' کے طور پر ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا حال لکھ دیا ہے ہو سکتا ہے کئی دوستوں (اور ''دوستیوں'' کے نام رہ گئے ہوں — معذرت) یہاں ہمیں آفتاب خان کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے ہماری افسانچوں کی کتاب ''اپاٹے'' پر نہایت محبت سے تبصرہ فرمایا جو اس شمارے میں شائع ہوا۔ دراصل ہم نے پہلا افسانچہ جس کا عنوان تھا ''بغیر عنوان کے'' 70-1969 میں لکھا تھا جو جھنگ سے مولانا یونس حسن شہید کی یاد میں شائع ہونے والے ''شہید'' میں شائع ہوا تھا۔ یہ بالکل ننھا سا افسانچہ تھا۔ پھر جب ہم گورنمنٹ کالج جھنگ کے کاروان کے مدیر تھے تو تب دونوں سالوں میں چھپنے والے میگزین میں ہمارے افسانے شائع ہوئے۔ جیسے جیسے لوگوں کی مصروفیات بڑھ رہی ہیں اسی طرح سے مختلف چیزوں میں تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ اس کی واضح مثال ہمیں کرکٹ سے ملے گی۔ صدیوں سے ٹیسٹ میچ کھیلا جا رہا ہے جو بنیادی طور پر پانچ دن سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ پھر ایک دن آرام کا بھی ہوتا تھا جو کسی مجبوری کی وجہ سے ختم کر دیا۔ جب بھی محسوس ہوا کہ یہ پانچ دن بھی زیادہ ہیں گو روایت کو قائم رکھا گیا لیکن ون ڈے یعنی ایک روزہ کرکٹ کا آغاز ہوا تو یہ مقبول ہو گئی۔ وقت آگے بڑھا تو ہمیں ٹی ٹونٹی (T20) پر آنا پڑا۔ اب لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ T10 تک بات پہنچ جائے۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ ٹیسٹ میچ ایسے ہی ہے جیسے ناول ہو ون ڈے میچ ایسے ہی ہے جیسے افسانہ ہو اور T20 جیسے افسانچہ ہو۔ اب T10 کی طرز سو لفظوں کی کہانی میدان میں آن کھڑی ہوئی ہے۔ کوئی اسے کہانی کہہ رہا ہے تو کوئی افسانچہ۔ پھر ہر ایک کا لکھنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے بعض لوگ افسانہ یا افسانچہ ایسے لکھتے ہیں کہ اسے آٹھ دس بار پڑھنے پر بھی جا کر اس کا لب لباب سمجھ آتا ہے۔ ایسا افسانہ لکھ کر ادیب بہت خوش ہوتا ہے کہ دیکھو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا اس لیے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ کچھ کا انداز زیادہ افسانوی ہوتا ہے جسے سمجھنا آسان ہوتا ہے اور کچھ ہم جیسے لکھاری ہوتے ہیں جو سہل ممتنع میں لکھتے ہیں اور وہ اتنا آسان ہوتا ہے کہ پڑھنے والا یہ کہتا ہے کہ یہ تو شاید اس نے خود آپ بیتی لکھی ہے۔ اتنے آسان کوئی ادب لکھتے ہیں اور کچھ بے ادبی ۔۔۔ بہر حال اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اگر کوئی مصنوعی طور پر انداز تبدیل کرتا ہے تو وہ اتنا کامیاب نہیں ہوتا۔ ویسے تو ہم تو ہمیشہ دوستوں کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں کیا کہ ایک کان سے سنا دوسرے سے نکال دیا۔ ہم تو ایک کان سے سن کر وہیں رکھتے ہیں اور اسی حساب سے جب لکھتے ہیں تو قلم خود بخود ہی رہنمائی کرتا ہے۔ ویسے افسانچے کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا کوئی کہتا ہے یہ 300 الفاظ ہوں کوئی کہتا ہے کہ۔۔۔ فی الحال ہر ایک کی اپنی اپنی رائے! ماہنامہ ''تخلیق'' جیسے رسائل ہمارے لیے ادبی اثاثے سے کم نہیں ہیں اور خود سونان اظہر جاوید کا باقی کا دیا ہوا بڑا چمن اور تخلیق کا تخلیق کار ہونا سب سے بڑھ کر۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ ہمیں جانتا اور پہچانتا بھی ہے کہ ہم بھی سلطان باہو اور ہیر کی دھرتی کے چھوٹے موٹے ادیب ہیں جو 24 کتابیں لکھ کر ابھی سیکھنے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

﴿11﴾ برادرم و محترم سونان اظہر جاوید صاحب! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے؟ ''تخلیق'' کی مسلسل اشاعت اور بروقت ترسیل دیکھ کر دلی مسرت ہوتی ہے۔ مشمولات کے باب میں آپ اور آپ کے معاونین جس قدر عرق ریزی اور جانچ پرکھ کے خوگر ہیں، وہ ہر شمارے کو خاص شمارہ بنا دیتی ہے۔ ''تخلیق'' (مارچ 2023) ہنوز زیر مطالعہ ہے۔ جو تخلیقات پڑھ چکا ہوں، ان پر میری رائے کچھ یوں ہے!

''پہلی بات'' کی ایک ایک سطر چشم کشا ہے اور ادیب، ہست و نشاد کو سوچ اور عمل کا سامان مہیا کرتی ہے۔ مگر انہیں اقتدار اور اختیار کی جنگ لڑنے سے فرصت ملے تو اس جانب توجہ دیں۔ مسلم شمیم کی لکھی ہوئی حمد خوبصورت ہے اور ریاض حسین زیدی اور صفدر صدیق کی کہی ہوئی نعتیں دل افروز۔ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ تخلیق کی 11 ویں سالانہ تقریب کی رپورتاژ پڑھتے ہوئے اس محفل میں شرکت سے محرومی کا احساس دوچند ہو گیا۔ جیسا کہ میں نے فون پر آپ کی دعوت کے جواب میں گزارش کی تھی، عین اسی روز میں شادی کی ایک تقریب میں مدعو تھا۔ بچپن کے دوست اور کورس میٹ کرنل حافظ کبیل کی صاحب زادی کی اس روز رخصتی تھی۔ اس موقع پر میرا احباب ہمدم دیرینہ کو اور خود مجھے گوارا نہ ہوتا۔ آپ نے میرا عذر قبول کیا۔ یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ آپ کے عمدہ اخلاق اور کشادہ دلی دیکھ کر آپ کے والد محترم جنت مکانی اظہر جاوید صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ان سطور کے ذریعے میں محمد حنیف باوا کو تخلیق ایوارڈ ملنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ گوشہ حنیف باوا میں شامل تینوں تحریریں لائق مطالعہ ہیں۔ تاہم سرفراز سید کا موصوف سے مکالمہ زیادہ دلچسپی سے پڑھا۔ ان کا معصومانہ عشق بلکہ محبت کی یک طرفہ واردات انہیں دانتے کے برابر لاکھڑا کرے گی، یہ بات محمد حنیف باوا کے سان گمان میں بھی نہ ہوگی۔ سرفراز سید کی دور رسی اور دور کی کوڑی لانے کی صلاحیت کے ہم قائل ہو گئے بھیا! محمد حنیف باوا کے انشائیوں کے حوالے سے تسنیم سحر کی تحریر سحر آفریں ہے۔ محمود شام کا مضمون ''کرچیاں موسموں کی خوشبو'' بھی پسند آیا۔ پروفیسر قیصر نجفی نے ڈاکٹر فیروز عالم کی کتاب ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' پر اچھا اور نہایت متوازن تبصرہ کیا ہے۔ منظومات میں ایوب خاور، شہزاد نیر، قیصر نجفی، نشاد، یار ادیب، صادق نسیم اور اظہر جاوید کی نظموں نے متاثر کیا۔ غزلوں میں اسلم انصاری، تسنیم سحر، انور جمال، خاور اعجاز، شہزاد نیر، طلعت منیر، ذوالفقار علی اسد اور شفقت حسین شفق کی غزلیں اچھی لگیں۔ ان غزلوں کے یہ اشعار بطور خاص پسند آئے:

زندگی اک داستاں شوق ہے سمجھیں اگر — گر نہ ہو ذکر محبت داستاں میں کیا رہا (اسلم انصاری)
اس کی باتیں عجیب باتیں تھیں — مرد کامل نے کر دیا پاگل (تسنیم سحر)
یہ میرا رزق ہے حرف و خیال و صورت و رنگ — اڑائے پھرتا ہے مجھ کو یہ آب و دانہ مرا (انور جمال)
ہم ہیں اور سامنے اک آگ کا دریا خاور — کشتیاں پھونک کے ملاح کنارے ہوئے ہیں (خاور اعجاز)
نکل گیا تو میں سمجھا کہ جا چکا ہے کہیں — پلٹ کے دل میں جو دیکھا تو وہ وہیں نکلا (شہزاد نیر)
اک شخص کے محاصرے میں زندگی رہی — اک شخص میری عمر کا سارا نصاب ہے (طلعت منیر)
اسیر لذت گریہ ہیں ہم تو — کرے گا کیا کوئی غم خواری ہماری (ذوالفقار علی اسد)
یہاں چہرہ نمائی ہے سراسر آنکھ کا دھوکا — جو من میں جھانک لیتا ہو کوئی وہ آئینہ لائے (دلشاد احمد)
زمانے میں نہیں ہوتی فراوانی محبت کی — مری خستہ محبت پر اگر وہ یار ہو جائے (شفقت حسین شفق)

میں افسانے لکھنے اور پڑھنے کا رسیا ہوں۔ لفظیات تحریر کیا ہوں، دیسی بدیسی ادب کے افسانے زیادہ شوق سے پڑھتا ہوں۔ اسی لیے کسی بھی جریدے میں افسانوں کا سیکشن مجھے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ''تخلیق'' میں ہر ماہ دس بارہ افسانے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں بھی دس افسانے دعوتِ مطالعہ دیتے دکھائی دے رہے ہیں۔ سب سے پہلے محمود قاضی کا ''افسانہ'' پڑھا۔ ''ہم'' کے عنوان سے ان کی اس تحریک کا افسانہ تسلیم کرنے میں اس طالب علم کو تامل ہے۔ امریکی ادیب ایڈگر ایلن پو نے جو Short story یا افسانے کی صنف کا بانی گردانا جاتا ہے، افسانے کے جو بنیادی عناصر بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں۔ وحدتِ تاثر، وحدتِ مکاں، وحدتِ زماں اور اختصار۔ بعد میں اس میدان میں اپنا لوہا منوانے والے عالمی شہرت یافتہ افسانہ نویسوں (Old Masters) نے جن میں گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف، موپساں، ہیمنگوے، ہنری جیمز اور سمرسٹ کے نام شامل ہیں، چند دیگر عناصر کو بھی اہمیت دی ہے۔ ان میں سرفہرست کہانی پن ہے۔ ایک واضح ابتدا اور اختتام، تنازع (conflict) جو ظاہر ہے کرداروں کے درمیان جنم لیتا ہے، کلائمکس جو ظاہر ہے کہانی سے وابستہ ہوتا ہے اور تحلیلِ تنازع (Conflict Resolution) کو بھی بعض مشاہیر ادب نے افسانے کا لازمہ قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم جب ''ہم'' کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہمیں افسانے کی نسبت ایک مضمون یا انشائیہ کے قریب تر دکھائی دیتا ہے۔ باحترامات اور قبولِ تسلیم!

عطیہ سید، فرحت پروین اور محمد طارق علی نے اچھے افسانے تخلیق کیے ہیں۔ پڑھ کر متاثر ہوا ہوں۔ ''آرفن ہاؤس کا ماس'' جسے اقبال فیروز نے لفظوں کا جامہ پہنایا ہے ایک دردانگیز افسانہ ہے۔ اقبال فیروز کہانی لکھنے کا فن جانتے ہیں۔ انہیں انسانی جذبات و احساسات کے تار چھیڑنے خوب آتے ہیں۔ آصف عمران نے ''زندگی کا مسافر'' میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی ہے جو شریکِ حیات کی وفات کے بعد تنہا رہ جاتا ہے۔ اگرچہ موضوع پامال ہے مگر فاضل افسانہ نگار نے اسے خوبی سے نبھایا ہے۔ افسانے کا انجام مثبت ہے۔ تاہم متن میں جا بجا discussion افسانے کی روانی میں سپیڈ بریکر کا کام دینے کے سوا کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہی۔ افسانے میں ایسے جملے زوائد میں شمار ہوتے ہیں جنہیں قلم زد کرنے سے افسانے کی عمارت اپنی بنیادوں پر قائم ہے۔ احترام سے ذہن نشین نہ ہو جائے۔ طلعت منیر، فائزہ سید اور رخشین تبسم کے افسانے لائق مطالعہ ہیں۔ دلی مبارک باد۔ ممتاز راشد کا مختصر افسانہ ''سالگرہ کا تحفہ'' محض ایک واقعہ ہے۔ افسانہ کیا ہوتا ہے اس کا ذکر اوپر کر چکا۔ افسانوں سے آگے چل ''انجمن خیال'' کسی تحریر کا مطالعہ نہیں کر پایا اس لیے ان پر تبصرے سے قاصر ہوں۔ بحیثیت مجموعی یہ پرچہ بہترین ہے۔ ایک بات البتہ ہر بار کھٹکتی ہے۔ اس مرتبہ بھی کھل رہی ہے۔ پروف ریڈنگ پر مامور صاحب (یا صاحبہ) اس اہم فریضے کی انجام دہی میں غفلت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ صفحہ 57، 58 پر مندرجہ ذیل اغلاط مشاہدہ میں آئی ہیں: الهین (ہلن)، تیور (تھور)، دی (رہی)، ہیلیکن (ہیلی کن)، واقع (واقعہ)، ایاں (یا)، ہیں (ہی)۔ اب رخصت چاہتا ہوں۔

خاقان ساجد (راول پنڈی)

﴿12﴾ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ مارچ 2023 کا "تخلیق" اپنی روایتی آب و تاب لئے ملا۔ تخلیق ایوارڈ کیلئے حنیف باوا کا انتخاب ایک مستحسن اقدام ہے۔ حنیف باوا اس ایوارڈ کے صحیح حقدار ہیں۔ انہیں یہ ایوارڈ دے کر آپ نے نہ صرف ان کی ہمت افزائی کی ہے بلکہ اس امر سے "تخلیق" کے وقار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ نے معتبر لکھاریوں کے ان کے بارے میں خیالات کو الگ گوشہ دے کر ان کی مزید عزت افزائی کی ہے۔ حمد و نعت حسب معمول روح کی بالیدگی کا باعث ہے۔ اس حصے کے مندرجہ ذیل اشعار توجہ کھینچتے ہیں:

یا رب تیرا ذکر کی رت مختصر نہ ہو — یا رب تیرا فکر کی قبر معتبر نہ ہو (مسلم شمیم)
بے ساختہ زبان پہ آتا گیا درود — بعد از خدا بس آپ ہی کا احترام ہے (ریاض حسین زیدی)
وہ خالی ہاتھ اور کون و مکاں اس کے تصرف میں — چٹائی پہ شہ ارض و سما جس نے لقب پایا (مظفر صدیقی رضی)

حصہ نظم بھی خوب ہے۔ تمام شعرا لائق تحسین ہیں۔ افسانوں کے حصے میں محمد احمد قاضی نے "ہم" میں محبت اور نفرت کی پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ تحریر افسانے سے زیادہ انشائیہ لگتی ہے (یہ میری حقیر رائے ہے)۔ عطیہ سید کی "لا ادری" ان کے طرز تحریر کی نمائندہ ہے۔ "خوف" (فرحت پروین) "گلاب کے آنسو" (محمد طارق جمیل) اپنے اپنے موضوعاتی رنگ میں خوب ہیں۔ اقبال فیروز، آصف عمران، فاخرہ سید اور المعین نسیم نے بھی خوب رنگ جمایا ہے۔ حصہ غزل میں جید شعرا کا کلام شامل ہے۔ جس میں نذیر قیصر، اسلم انصاری اور نسیم سحر جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر نے بھی خوب رنگ جمایا ہے۔ دامن دل کھینچنے والے چند اشعار درج ذیل ہیں:

سیر کرتی ہے وہ حویلی میں — چاند بھی کھڑکیاں بدلتا ہے (نذیر قیصر)
جز غبار ناقہ لیلیٰ نہیں ہے دشت میں — اور لیلیٰ بھی نہ ہو تو کارواں میں کیا رہا (اسلم انصاری)
جڑی جاتی ہے مستی سے بڑی مہکار کوئی — مسافر آپ ہے گلزار اپنے راستے کا (اقتدار جاوید)
مجھے آنکھوں سے دل میں بھی اتارو — میں کوئی آشیانہ چاہتا ہوں (ڈاکٹر ایوب ندیم)
منزل تو سامنے ہے یہ رستہ کوئی نہیں — ہم رہ روان عشق پہ کیسا عذاب ہے (طلعت میر)

ڈاکٹر امجد پرویز کا "شیخ حسین ایک سرمد گلوکار" خوب ہے۔ ڈاکٹر صاحب جب بھی لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ فرحت عباس شاہ کا منصور آفاق کے ناول "آ قا قا قا" کا تجزیہ قابل مطالعہ ہے۔ جس میں مصنف کے تصوف، سری علوم اور فلسفہ کا پتہ ملتا ہے۔ آپ کی صحت و توانائی کیلئے دعاؤں کے ساتھ۔

محمد اسلم (لاہور)

﴿13﴾ ماہنامہ تخلیق مارچ کا رسالہ فاروقی کے نام سے میرے گھر میں آیا تو مصروفیت کے باوجود میں نے اس کا مطالعہ کیا تو ہر لحاظ سے مجھے بہت معیاری لگا۔ تھوڑے وقت کیلئے مجھے کالم، افسانے اور سچی کہانیاں ہفتہ وار لکھنی پڑتی ہیں۔ ایک افسانہ زندگی کا مسافر جو آصف عمران صاحب کا افسانہ ہے۔ پڑھ کر اس قدر دل پر اثر ہوا ان کی تحریر آپ بیتی درد دل سے لکھی تھی کہ میرے دل کے نہاں خانے میں کئی دن اثر کرتی رہی۔ اکثر کسی عورت کا شوہر وفات پا جائے تو بہت ہی دکھ ہوتا ہے اور انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک اکیلی عورت بیچاری اس دنیا میں بچے کیسے پالے گی۔ مگر مرد کے بارے میں کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا کہ وہ بیوی کے بغیر کیسے زندگی کے دن گزارے گا۔ آصف صاحب نے دل کی دکھی باتیں اس انداز سے لکھی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ دل سے لکھی ہیں۔ اور دلوں میں ہی اتر جانے کیلئے لکھی ہیں۔ اسی شمارے میں خواجہ محمد زکریا صاحب کی فصیح و بلیغ تحریریں پڑھی تھیں جو ادبی معیار کو بلند کرتی ہیں۔ ویسے بھی میں ان کی ایم اے میں شاگرد تھی۔ استاد ہونے کی وجہ سے میں ان کا بہت احترام کرتی ہوں۔ ان کا مضمون "اظہر جاوید!!! ابھی وہ نہیں ہوگی" کے عنوان سے لکھا گیا ہے جو ڈاکٹر زکریا صاحب کی خوبصورت تخلیق ہے۔ غرض اس شمارے میں ہر کسی کی تحریر بہت معیاری ہے۔

بلقیس ریاض (لاہور)

﴿14﴾ ماہنامہ 'تخلیق' کا شمارہ مارچ 2023 قدرے تاخیر سے ملا۔ انتظار ہی کر رہا تھا۔ شمارہ کھولا تو "پہلی بات" پر نظر جم گئی بلکہ تھم گئی۔ قلب و نظر کی پاکیزگی اخلاص نیت کے خمیر میں گندھ کر قوت مشاہدہ میں زبردست اضافہ کر دیتی ہے اور یہ بصیرت افروز مشاہدہ تحریر کو جاندار، موثر، اجلا اور دل پذیر بنا دیتا ہے۔ جب بھی کوئی تحریر سوچ و فکر کے سوتے سے نکھر کر سچائی کے سانچے میں ڈھل کر قرطاس ابیض کی زینت بنتی ہے تو اپنا فوری اثر دکھا کر سچائی پسند لوگوں کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ پہلی بات کا بھی یہی رنگ ڈھنگ ہے۔ "کیا ہمارا معاشرہ اخلاقی پستی کے عروج پر ہے؟" یقیناً ہے۔ بدعنوانی، بدتہذیبی، بے راہ روی، بد اخلاقی، بے ایمانی، بد دیانتی، بے غیرتی، بے شرمی، خود غرضی اپنی انتہا پر ہے۔ سوشل میڈیا پر لوگ بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی سے گندے آلودہ بے ہودہ، انسانیت سوز اور اپنی مرضی کے حیا سوز دھندے میں جتے ہوئے ہیں۔ وہ ناجائز دولت کے حصول میں اندھے ہو چکے ہیں۔ 'پہلی بات' حمد و نعت کے بعد پورے ادبی جریدے 'تخلیق' میں شائع شدہ تخلیقات پر بھاری ہے کہ اس میں ایک واضح تعمیری اور اصلاحی پیغام ہے۔

سونان صاحب! گناہوں میں لتھڑی ہوئی اور کھڑ کھڑ کرتے نوٹوں کے بستر میں اپنی حیا کو نیلام کرنے والی ماڈرن سیاہ کاریوں کو آشکارا کرنا جہاد ہے تاکہ شریف اور حیادار لوگ ان کے شر سے محفوظ رہیں۔ برائیوں کے خلاف جدوجہد کرنے میں عظمت ہے اور یہ انسانیت کی معراج ہے۔ اپنی بساط کے مطابق ہر وقت ان شیطان صفت لوگوں کے خلاف برسر پیکار رہنا چاہیے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین! چلتے چلتے بابا محمد حنیف بابا کو "تخلیق ایوارڈ" ملنے پر بہت بہت مبارک باد۔ اللہ کریم بابا جی کو سلامت رکھے۔ آمین!

محمد اقبال صمصام (مردان)

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اسی لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ تیرے خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی ایڈیٹر: محمود شام 0300-8210636	سہ ماہی ادب لطیف لاہور مدیر: مظہر سلیم مجوکہ 0333-4377794
سہ ماہی ادبی ڈائجسٹ کراچی مدیر: ضیاء الرحمٰن ضیا 0300-2211187	سہ ماہی بک ڈائجسٹ لاہور مدیر: مظہر سلیم مجوکہ 0333-4377794	سہ ماہی ارژنگ لاہور مدیر: عامر بن علی 0300-4489310
ماہنامہ حکایت لاہور مدیر: طارق محمود 0323-4329344	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8430043

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	جاپان آرزو	عامر بن علی	0300-4489310	تخلیق مطبوعات، اردو بازار لاہور	400/-
2	زوربا (انٹرویو)	عامر بن علی	0300-4489310	تخلیق مطبوعات، اردو بازار لاہور	600/-
3	گھر گھر اک نگر	عامر بن علی	0300-4489310	تخلیق مطبوعات، اردو بازار لاہور	500/-
4	آج کا جاپان	عامر بن علی	0300-4489310	تخلیق مطبوعات، اردو بازار لاہور	500/-
5	صاحب	حسن عباسی	0300-4489310	تخلیق مطبوعات، اردو بازار لاہور	300/-
6	بانسری میں چاند	محمد اورنگزیب	0345-2610434	رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی	300/-
7	آرگن ہاؤس	اقبال فہیم جوزی	0333-5900103	ورق پبلی کیشنز، چکوال	500/-
8	ابہام آرزو	آصف عمران	042-37231518	بک ہوم مزنگ روڈ لاہور	700/-
9	نوجوان (ریسرچ)	محمد عباس مرزا	0300-4375871	یکتا مطبوعات، سہ ماہی تحریک لاہور	1,000/-
10	تماشۂ خیال	نصرت نسیم	0946-729448	شعیب سنز پبلشرز سوات مارکیٹ سوات	400/-
11	ثاقب سرائی	کلیم احسان بٹ	0345-2610434	رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی	1,000/-
12	کارزیاں	کلیم احسان بٹ	0345-2610434	کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ لاہور	700/-
13	اقبال اور اصحاب رسولؐ	شاہد محمود گوندل	0300-4489310	تخلیق لاہور	1000/-
14	شب گزیدہ	شاہین	0331-4489310	تخلیق لاہور	500/-
15	نوجوان	محمد عباس مرزا	0300-4375871	ویکنی شہباز	1000/-
16	دبستان 2022ء	ڈاکٹر تحسین رزاقی	0334-9737112	گورنمنٹ سائنس کالج لاہور	

نوٹ: ادارہ "تخلیق" اپنی تمام پالیسیاں مجلسِ عاملہ کی باہمی رضا مندی سے مرتب کرتا ہے۔ ادارے کو بغرض تبصرہ کے لئے دو کتابیں ارسال کریں۔ کسی بھی وصول ہونے والی ایک کتاب پر ادارہ تبصرہ نہیں کروا سکتا۔ کوئی مصنف، شاعر یا ادیب، تبصرہ نگار سے تبصرہ کروا کر ادارے کو بھیجے گا تو وہ قابلِ قبول ہو گا اور ادارہ خود تبصرہ کرواتا ہے۔
(ادارہ تخلیق)

مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ کے زیر اہتمام مطبوعاتِ مولانا ظفر علی خاں

تمام کتب 30% رعایت پر دستیاب ہیں۔ رابطہ مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ 21 نون ایونیو مسلم ٹاؤن لاہور

فون نمبر +92-42-35846676 ای میل info@maulanazafar.pk ویب سائٹ www.maulanazafar.pk

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE

JUNE 2023

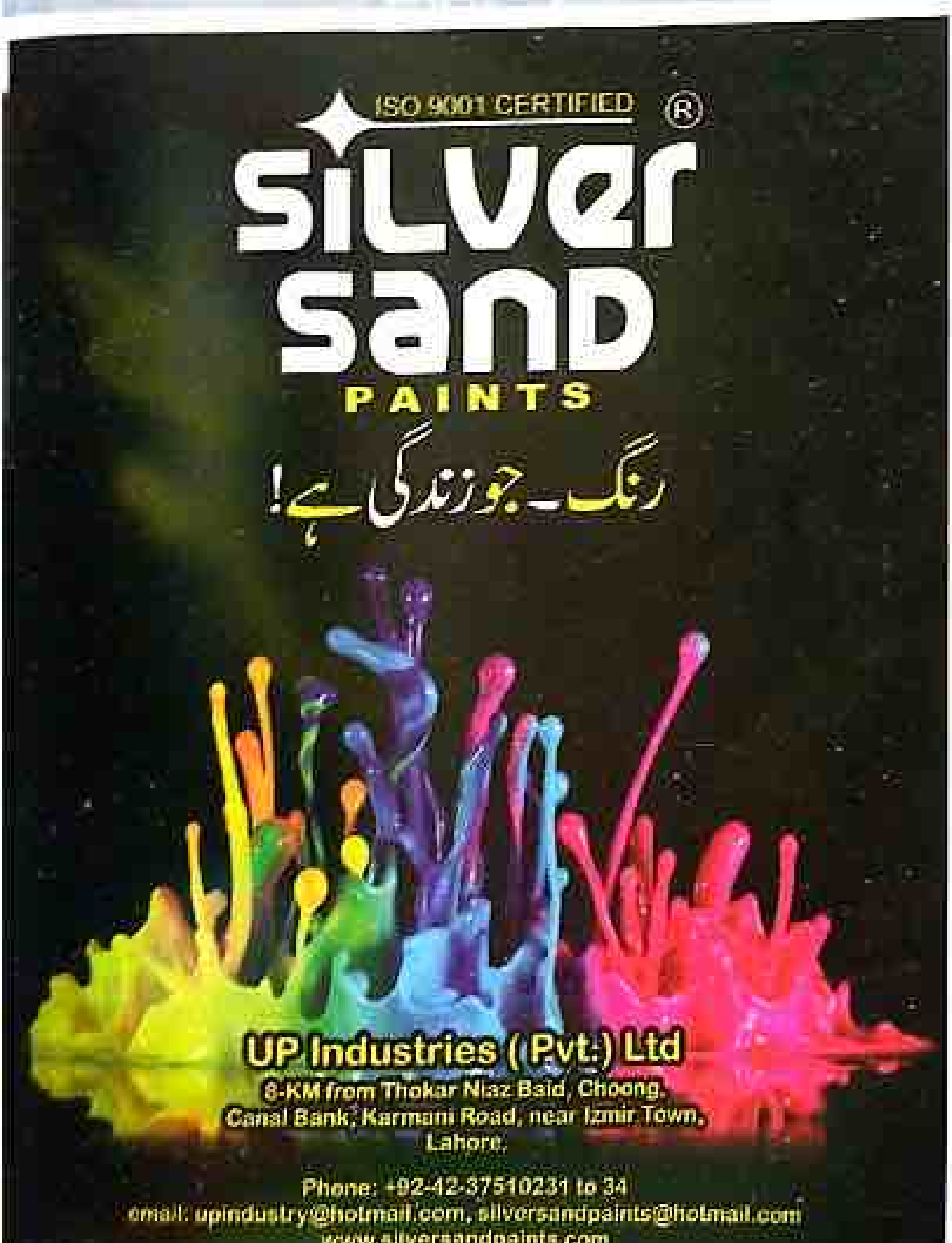

CamScanner

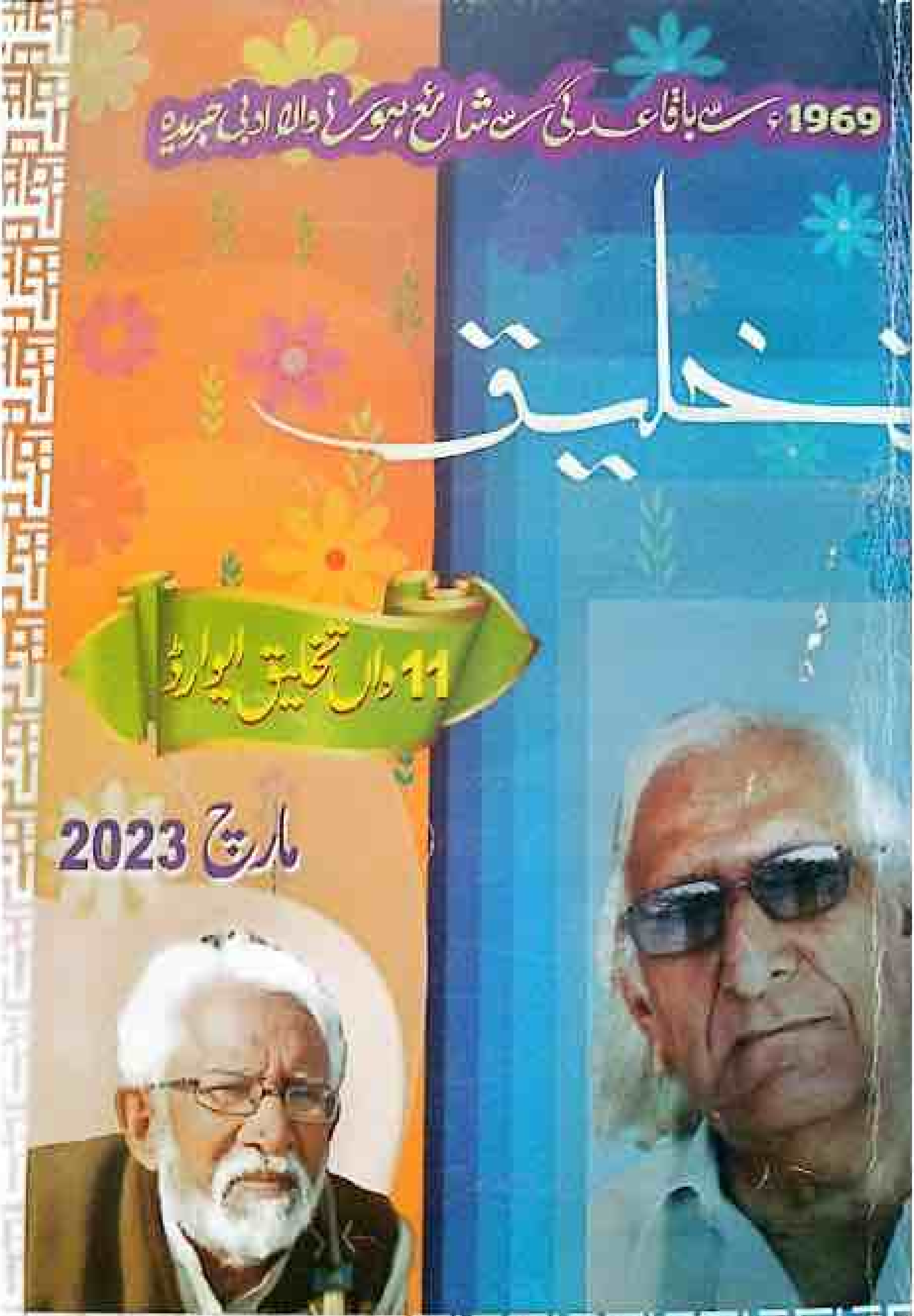

CS CamScanner

ماہنامہ تخلیق کی 11ویں سالانہ تقریب 2022

مہمانانِ خصوصی: محمود احمد قاضی، منذر قیصر، ... (صدارت) ... [illegible]

[illegible] 2022 [illegible]

[illegible]

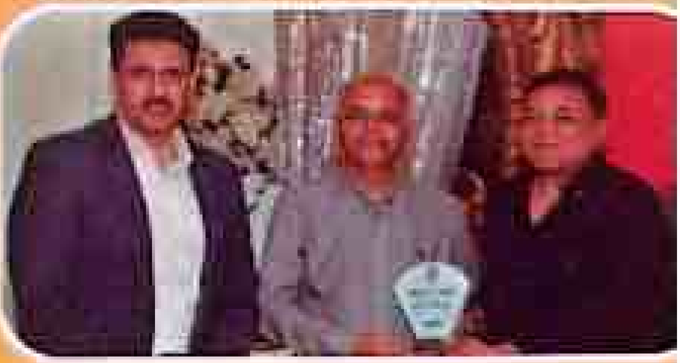

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

CamScanner

مسلسل اشاعت کا 55 واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصۂ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 55 | مارچ 2023ء | شمارہ : 1 | CPL نمبر 96

قیمت : -/500 روپے —— 2,500 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر —— ہندوستان کے لیے 3,500 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

ماہنامہ "تخلیق" بینک اکاؤنٹ نمبر : 202-777-434 یو بی ایل واحدت روڈ لاہور برانچ کوڈ 1236

ماہنامہ "تخلیق" ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر : 0323-9526505

موبائل فون : 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

تنویر جہاں (امریکہ) —— ڈاکٹر فوقیہ مشتاق (امریکہ) —— نارنگ ساقی (انڈیا) —— جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جانِ آفریں کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو "تخلیق" پیہم رواں رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "عصریہ"، "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (ان شاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

55 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ "تخلیق" کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر "تخلیق" کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کے مضامین کے انتخاب کے لیے "تخلیق پینل" تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں "تخلیق" کے امور کی ذمہ داری محترمہ تنویر جہاں، ڈاکٹر فوقیہ مشتاق، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف -/3,500 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Opposite (Toyota Cantt Motors), Main Chowk, Walton Road, Lahore-Cantt. (04237187500 - 04236671007)

U.S.A.	U.S.A.	INDIA	PAKISTAN
[illegible]	[illegible]	K.L. Narang Saqi	Javed Manzoor
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	Delhi-110001, India	Multan Road, Lahore
C.A. USA	[illegible]	Ph: [illegible]	Ph: [illegible]
Ph: [illegible]	Ph: [illegible]	Email: [illegible]	Cell: [illegible]
Email: [illegible]	Email: [illegible]		Email: [illegible]
[illegible]			

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — مسلم فہیم — 7
نعت رسول مقبولؐ — روش حسین زیدی
نعت رسول مقبولؐ — صفدر صدیق رضی — 7

رپورتاژ

"تخلیق" کی 11ویں سالانہ تقریب — ادارہ "تخلیق" — 8

گوشۂ حنیف باوا

محمد حنیف باوا: نئے دور کا داستان گو — سرفراز تبسم — 13
محمد حنیف باوا کی ادبی خدمات — ہارون الرشید تبسم — 16
اقدار سے وابستہ ادیب: حنیف باوا — نسیم سحر — 19

مضامین

گرد یا سوسنوں کی خوشبو — محمود شام — 22
زہرہ ملک: شخصیت اور تخلیقات — غلام حسین ساجد — 26
دھنک کا آٹھواں رنگ — پروفیسر قیصر نجفی — 28
اردو، مراٹھی اور پاکستانی زبانوں — ڈاکٹر نجیب جمال — 32
عمارت کی سرگزشت — ڈاکٹر جواز جعفری — 37
اوکاڑہ کا تاریخی ناول "پرواز" — ڈاکٹر ناصر شہزاد — 43
رنگ بدلتے موسم کا ایک — ڈاکٹر شاہد ودود شاہ — 46
اصحاب کہف — وحید الحق ہاشمی — 50

منظومات

کون ہیں وہ لوگ — ایوب خاور — 52
وطن کا دامن — صفدر صدیق رضی
چھوٹا سا باغ — اظہر نیازی
سپنے کی پہیلی — شہزاد نیر
آخری جنگ — نصرت یاسمین
احساس — قیصر نجفی
قطعات — ممتاز راشد لاہوری
نظم — شازیہ رباب
ریشمی آدمی — صادق قیصر (کینیڈا)
نظم — ندیم افزا
مجھے سنبھالو — ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ)
ضد — اظہر جاوید — 55

افسانے

ہم — محمود احمد قاضی — 57
لاری — عطیہ سید — 59
خوف — فرحت پروین — 62
گلاب کے آنسو — محمد طارق علی — 65
آرٹس ہاؤس کا واقعہ — اقبال فیروز — 72
جنگل کا مسافر — آصف عمران — 78
شیشے کا گھر — طلعت صبیح — 85
بچی — فائزہ محمود (آسٹریلیا) — 87
ازرق القمر — انجم سلیم — 91
ساگر وہ محبت — ممتاز راشد لاہوری — 98

غزلیں

ذکی قیصر، اعظم انصاری، نجم امر، انور جمال، خاور اعجاز، حسن عباس رضا، قمر رضا شہزاد، افتخار جاوید، ڈاکٹر ایوب ندیم، شہزاد نیر، حسن عباسی، طلعت شبیر، اشرف زکی زعفران، ناصر بشیر، ذوالفقار علی اسد، شازیہ رباب، شہلا سعید، امجد بابر، سرفراز تبسم، ارشاد احمد، اظہر شیر، شفقت حسین شفق، اقبال ساجد، اظہر جاوید — 99–106

موسیقی

منیر حسین: ایک سریلا گلوکار — ڈاکٹر امجد پرویز — 107

سرائیکی نوشتہ

ہوئی "بہ گلو" — بشریٰ رحمٰن — 112

سفرنامے

اندلس کے صنم خانے میں اردو کی اذان — ڈاکٹر زاہد منیر عامر — 117

سفر چہرہ تھائی لینڈ — ڈاکٹر محمد شفیق خان — 121

طنز و مزاح

کدو کے کرتوت — نور کمال شاہ — 125

جائزے

"فلسفہ مغرب" کا جائزہ — سلیم الرحمٰن — 129

آغا بابا — فرحت عباس شاہ — 131

اور چاند سرخ ہو گیا — شہزاد نیّر — 134

خواجہ دل محمد اور صحرا پر دل — خالد عبداللہ وڑائچ — 136

پنجاب رنگ

دوستی دی ریتی دلے پنڈے دے — حنیف باوا — 139

نظم — سلیم شہزاد

نثر — محمود احمد قاضی

سوکھا پینڈا (پنجابی افسانہ) — تسنیم کوثر

"سکی روٹی" — انور زاہد علوی — 140

تبصرے آفتاب خان کے

اُپسکے — ڈاکٹر محسن مگھیانہ — 145

ماں بولی — یٰسین خان — 146

ہم زاد نہیں بتا — انور زاہد علوی — 147

انجمنِ خیال

سلطان سکون، انور شعور، نسیم سحر، حنیف باوا، تسنیم کوثر، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، اکرم ذکی ملک، شہزاد نیر، رباب، ممتاز راشد لاہوری، ماجد وفا عابدی، خالد عبداللہ وڑائچ، عارف چیمہ، نیاز علی پیال، شہزاد نیّر، قیصر گل — 148–159

تخلیق کو موصول رسائل و کتب

ملکی اور غیر ملکی — 160

بانی مدیر "تخلیق" 1969-2012

سرورق

اسعد قاسمی

ناشر: سوہان اختر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

مطبع: [illegible] گلشن راوی، لاہور

مقامِ اشاعت

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I,

Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt.

E-mail : ajavedtakhleeq@gmail.com

(اوپننگ کے حقوق محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

پہلی بات

کیا ہمارا معاشرہ اخلاقی پستی کے عروج پر ہے؟ سوشل میڈیا کے طوفان نے ہماری آنے والی نئی نسل کو کس راہ پہ لگا دیا ہے۔ ٹک ٹاک، انسٹاگرام، واٹس ایپ، یوٹیوب، فیس بک اور جانے کتنی ایپس پر شہرت کے نشے اور دولت کے حصول کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ریٹنگ لینے کی کوشش میں لباس کو مختصر کرنے کی جنگ نئی نسل الگ ہی انداز سے لڑ رہی ہے اور ان کو ریٹنگ ملتی بھی ہے، شہرت اور دولت بھی۔ "میرا دل یہ پکارے آجا" گرل نے "صرف ایک گانے پہ ٹھمکے لگا کر نہ صرف شہرت حاصل کی بلکہ ویڈیو کے وائرل ہوتے ہی اشتہارات دینے والی کمپنیوں نے راتوں رات اسے دولت مند بھی بنا دیا۔ تین دن میں 2 کروڑ روپیہ کمالیا۔ اسی طرح حریم شاہ کی ننگی ویڈیو "پارٹی ہو رہا گرل" جیسی بے شمار بے مقصد ویڈیو وائرل ہونے کی بلندی کو چھو چکی ہیں۔ ان کے ملین فالوور ہیں جو ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی ایسی حرکتیں ٹاپ ٹرینڈ بن جاتے ہیں۔ ہم کس نئی نسل کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ہمارا میڈیا بھی صرف TPR کے چکر میں ان کرداروں کو بار بار ہیرو بنا کر پیش کر کے کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟ کیا یہ چیز بھی حقیقت کے قریب نہیں کہ ان ٹک ٹاک گرلز لڑکیوں اور لڑکوں نے بند کمروں سے نکل کر سرعام مجرے شروع کر دیے ہیں۔ بند کمروں میں یقیناً کچھ پابندیاں بھی تھیں اور کمائی کی بھی ایک حد مقرر تھی مگر سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم نے ان کو یہ آسان راستہ بتا دیا کہ جتنا بے لباس ہوتے جائیں گے اتنا ہی چاہنے والے فالوورز کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی RPM بڑھے گا اور جتنی ویور شپ ہوگی اتنے ہی پیسے زیادہ ملتے جائیں گے۔ اگر ہم اس کچھ کو زیادہ دیر فروغ نہیں دے سکتے۔ ہم ان کو اگنور نہیں کر سکتے اور نہ اس طرح شارٹ راستے کے فارمولے کو اپنی آنے والی نسل پر فٹ کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید جیسے ذہین لوگ 27 گولڈ میڈل ہاتھ میں لئے ڈگریوں کے بوجھ کے نیچے دب، اس معاشرے کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے کہ لاکھوں روپے تعلیم پر لگا کر بھی دو سال سے ان کا مستقبل تاریک ہے وہ جگہ جگہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہے اسی طرح ڈاکٹر عباس جنھوں نے 7 گولڈ میڈل حاصل کئے پچھلے کئی سال سے نوکری حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا، الیکٹرانک میڈیا نے کبھی ان لوگوں کی آواز کو ٹاپ ٹرینڈ نہیں بنایا، کبھی ملین فالوورز نے ان کے زخموں پر نمک رکھا، نہ کسی اینکر نے ان کے حق میں آواز بلند کی۔ تو کیا کتابوں کو آگ لگا دینی چاہیے؟ کیونکہ ہم لوگ جس معاشرے کا حصہ ہیں وہ معاشرہ دیکھنا ہی یہ چاہتا ہے کہ جنت مرزا کا بریک اپ اس کے منگیتر کے ساتھ کب اور کیسے ہوا؟ حریم شاہ اور مولوی قوی مفتی کی نئی ویڈیو کب وائرل ہوگی، دو دیا باجی کا نیا اسکینڈل کب آئے گا؟ اپنی اپنی پسند کے اداکار، اداکارہ اور گلوکار کب اور کیسے دن گزارتے ہیں؟ معاشرہ وقت گزاری ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ ہم اب بھی ہوش کے ناخن لینے کے بجائے ذاتی عناد، ذاتی مفادات، ذاتی اختلافات پر ملکی مفادات کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے مسائل آٹا، پیٹرول، ضروریات زندگی کی اشیاء اور بے روزگاری ہیں۔ پاکستان بدترین معاشی بحران سے گزر رہا ہے بلکہ دیوالیہ ہونے کے قریب ہے مگر افسوس یہ سب ٹاپ ٹرینڈ نہیں بن پاتا۔

ان تمام ہیجانی کیفیت کے باوجود "تخلیق" ہر سال کی طرح اس سال بھی سب سے بڑے جینوئن "تخلیق ایوارڈ" کو اس کے صحیح حقدار تک پہنچانے میں کامیاب رہا ہے بلکہ دوسرے بڑے جینوئن سالانہ "تخلیق ایوارڈ" کی تقریب کا انعقاد کرانے میں بھی کامیاب رہا ہے۔ اس سلسلے کو

کامیاب اور خوب سے خوب تر بنانے میں میری پوری انتظامیہ جو محترم غلام حسین ساجد، محترم مظفر بیلی، محترم مظہر سلیم مجوکہ، محترم آفتاب خان، محترمہ تسلیم کوثر اور محترمہ عمر حنیفہ پر مشتمل تھی مبارک باد کی مستحق ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے دوستوں نے پس پردہ نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ مفید مشوروں سے بھی نوازتے رہے ہیں۔ میں ان سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ میں نے "تخلیق" کو جاری رکھ کر کسی پر کوئی احسان نہیں کیا کیونکہ "تخلیق" زندہ ہے تو میرے والد کا نام زندہ ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ ادب کا مورخ ماضی یا مستقبل قریب میں جب جب ادب کی تاریخ لکھے گا اس میں "تخلیق" کی ادبی خدمات کا ذکر یقیناً ہوگا۔ "تخلیق" نے صرف 54 سال سے مسلسل اشاعت کو جاری رکھے بلکہ بیرون ممالک سے تمام ادبی دوستوں کو ایک خاندان کی طرح آپس میں جوڑے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ممالک میں تخلیق کے چاہنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور بیرون ملک سے آنے والا ادبی دوست دفتر "تخلیق" میں حاضری دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

خیر خدا خدا کرکے 11 مارچ 2023ء کو تقریب کا دن قریب آیا۔ AFOHS کلب میں اظہر جاوید کی یادوں کو تازہ کرنا، تخلیق کو مسلسل 54 سال اشاعت پر خراج تحسین اور حنیف باوا کو "تخلیق ایوارڈ" دینے کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ تقریب کا آغاز کلام سے ہوا۔ آج کی تقریب میں ہجوم غیر معمولی تھا۔ میں نے 136 دوستوں کو دعوت نامے بھیجے جس میں سے 123 دوستوں نے شرکت کرکے اس تقریب کو چار چاند لگا دیے۔ آنے والے دوستوں میں اصغر ندیم سید (صدارت)، سعادت سعید، حنیف باوا (جھنگ)، محمود احمد قاضی (گوجرانوالہ)، نذیر قیصر، خالد اقبال یاسر (راولپنڈی)، ڈاکٹر خواجہ زکریا، غلام حسین ساجد، سرفراز سید، شعیب بن عزیز، ڈاکٹر قیصر رفیق، ساجدہ حبیب، احمد عطی، پروین حکیم، ڈاکٹر بدر منیر (خوشاب)، ڈاکٹر عمر ساحل (سرگودھا)، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم (سرگودھا)، ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)، طلعت منیر (اسلام آباد)، ناصر علی سید (پشاور)، بیگم شہزادہ نیئر، محمد عباس مرزا، شاہد نعیم ہاشمی، ڈاکٹر شہزاد قمر، اصغر، تسلیم کوثر، فرحت پروین، نجیب جمال، طارق شریف پیرزادہ، ڈاکٹر محمد رفیق صوفی، بیدار، فوزیہ تاج (ایس۔ پی)، مسرت کلانچوی، اسلم ملک، شہباز انور، ڈاکٹر امجد پرویز، فرخ رضوی، خالد محمود، امیر بہادر ہوتی، عطا محمد (ایس۔ پی)، ڈاکٹر ایوب ندیم، ڈاکٹر افتخار بخاری اور بہت سے دوستوں نے شرکت کی۔ باقی تمام مہمانوں کے ناموں کی تفصیل تقریب کی رپورٹ میں موجود ہے۔ لیکن کچھ دوستوں نے شرکت نہ کرکے مایوس کیا جس میں ڈاکٹر امجد طفیل، ڈاکٹر جواز جعفری، ڈاکٹر اشفاق ورک، ڈاکٹر ضیاء الحسن، گلزار بخاری، فراست بخاری، گل صابری، منصور آفاق، اور یا مقبول جان، ناصر عباس نیئر کے نام شامل ہیں۔ ان کی کمی کو محسوس کیا گیا۔ ان میں سے کچھ نام تو ایسے ہیں جو مسلسل کئی سالوں سے اپنے نہ آنے کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ میرا ان پر کوئی زور نہیں مگر کیا پڑھے لکھے طبقے (دانشوروں) کا اخلاقیات کا درس صرف دوسروں کو دیے جانے کی حد تک ہے؟ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہر کسی کو یہ حق ہے کہ وہ کسی تقریب میں شرکت کرے یا نہ کرے مگر زبان کی پاسداری نہ کرنا یا کسی ادبی دوست کی خوشی میں دانستہ شامل نہ ہونا یا بلا جواز غیر حاضر رہنا ان بلند قامت شخصیات کو زیب نہیں دیتا۔ میں آخر میں یہاں ان چند دوستوں کا ذکر خیر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو دور دراز علاقوں سے طویل مسافت طے کرکے صرف اظہر جاوید کی محبت میں تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور بالخصوص آفوس کلب کے ڈاکٹر قیصر رفیق (C.E.O.) جو ہمیشہ کی طرح ہر قدم میں میرے رفیق اور ہمدرد رہے۔ میں ان کی تمام انتظامیہ کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں اور اس امید کے ساتھ یہ بات ختم کرتا ہوں کہ 12 واں تخلیق ایوارڈ بھی اس کے صحیح حق دار کو دلوانے میں اپنا مثبت کردار ہم سب مل کر ادا کریں گے۔

رب راکھا!

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

حمد و نعت

حمد

یا ربِ خیر!

مطلوب روحِ عصرِ ازل سے ہے آج تک
حق پہ جبر و جور کا کب اختتام ہو
صدیوں سے اُن دعاؤں پہ تکیہ کیے ہیں ہم
مفہوم اُن دعاؤں کا اب سب پہ عام ہو

یا ربِ خیر! خیر کی رت مختصر نہ ہو
یا ربِ خیر! شر کی تو معتبر نہ ہو
مظلوم سربلند ہو ستم شرمسار ہو
یہ سرزمیں دکھوں کی، سکھوں کا دیار ہو
صدیوں کی بے مراد دعا ہوں قبول ہو
دھرتی پہ رحمتوں کا مسلسل نزول ہو

آواز روحِ عصرِ حق کی ہو آئینہ
تفسیرِ خیر، لوح و قلم کی ہو آرزو
ہر لب پہ ہو شریعتِ الفت کی گفتگو
یا ربِ کائنات! محبت ہو سرخ رو
نوعِ بشر سے پیار کی، یا رب! ہوا چلے
یا ربِ خیر! دور کا رشتہ بنا رہے

مسلم شمیم

OOO

نعت

کیا رفیع شان محمدؐ کا نام ہے
سب کچھ خدا کا فیض ہے اور اہتمام ہے

سب خوشیں ترے لب کی بارش میں ہو گئیں
ان کے لقب کو سارے جہاں کا سلام ہے

احسان رب کی اس کو بشارت نصیب ہے
جن آپؐ کے جو گئے وہ عالی مقام ہے

بے ساختہ زباں پہ آتا گیا درود
بعد از خدا بس آپؐ ہی کا احترام ہے

اسوہ حضور پاکؐ کا میزانِ عدل ہے
جو ماسوا ہے ہر طرح ہم پر حرام ہے

یا رب! مرا عقیدہ محکم یہی تو ہے
تجھ کو بقا ہے، تیرے نبیؐ کو دوام ہے

جب بھی میاں حسن کو رعنائیاں ملیں
احسانِ مصطفیٰؐ پہ ہوا اختتام ہے

ہم کو ریاض کام ہے بس نعت ہی سے کام
دونوں جہاں میں کام یہی ایک نام ہے

ریاض حسین زیدی

OOO

نعت

اسی کے فیض سے ہوں میں قلم بہ دست رواں ملے
کہ جس نے پیٹ پہ پتھر کے عمر بھر کھانا نہیں کھایا

سوا اس کے خاک پا ہونے کا انساں کو شرف آخر
جو بچھاتا تھا زمیں پر اور تھا اللہ کا ہمسایا

وہ خالی ہاتھ اور کون و مکاں اس کے تصرف میں
چٹائی پر تھا ارض و سما جس نے لقب پایا

سو اب دن رات رہتا ہے خدا اور خدا رہتا
اسے عرشِ بریں سے وہ دلِ انساں میں لے آیا

جو کہتے ہیں کہ صدیق کا کہیں سایہ نہیں ہوتا
میں کہتا ہوں وہ عالم پہ ہے اس خورشید کا سایا

صفدر صدیق رضی

OOO

رپورتاژ

تخلیق کی 11 ویں سالانہ تقریب

(ادارۂ تخلیق)

ماہنامہ "تخلیق" کی اشاعت کے 54 سال...... اظہر جاوید کی یادوں اور گیارہویں تخلیق ایوارڈ کی عظیم الشان تقریب

ہمارے جسم کا حسن وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلتا رہتا ہے اور ایک دن یہ جسد خاکی خاک کا پیوند ہو جاتا ہے۔ حسن اخلاق اور حسن تخلیق ایسی خداداد صلاحیتیں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ خوشبو کے دوش پر چہار سو پھیلتی رہتی ہیں۔ ہمدردی، خلوص، محبت، دوستی، ایثار، قربانی یا دوسروں کی رہنمائی کوئی ایسی نشانی آپ کو اپنے پیچھے ضرور چھوڑ دینی چاہیے جس سے اندازہ ہو کہ آپ اس راہ سے گزرے ہیں۔ ادب کے افق پر زندہ و جاوید رہنے کے لیے حسن تخلیق کے ساتھ حسن اخلاق اور تخلیق کار کی مسلسل ریاضت کارگر رہتی ہے۔ معروف شاعر، ادیب، صحافی، محقق، مدیر، کالم نگار اظہر جاوید (1938-2012) نے نامساعد حالات میں قلم و قرطاس کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے رکھا۔ مختلف اخبارات و جرائد میں تخلیقی جوہر کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے 1969ء کو ماہنامہ "تخلیق" جاری کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے سرگودھا سے صحافتی و ادبی خدمات کا آغاز کیا۔ "ضرب مجاہد"، "رفیق"، "خلوص" اور "امروز" میں بڑی سرگرمی سے خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ 14 فروری 2012ء کو آسودۂ خاک ہو گئے لیکن 42 سال تک ادبی جریدے "تخلیق" کو بچوں کی طرح پالتے رہے۔ وہ منکسار، خلیق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان کے اپنے اصول تھے لیکن غرور اور تکبر سے بالاتر تھے۔ اظہر جاوید روشن دماغ اور روشن خیال تھے۔ ان کی ادبی، سماجی اور سیاسی بصیرت بہت منفرد تھی۔ حسن تدبر اور انتظامی امور میں ان کا اپنا زاویہ نظر رہا۔ میں نے انھیں ہمیشہ متحرک دیکھا۔ ان کے قابل قدر فرزند سونان اظہر جاوید نے "تخلیق" کی باگ ڈور سنبھال کر اسے زندگی کا نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ سونان اظہر جاوید نے عام لوگوں کی طرح حاصل اور لاحاصل کے دائرے میں گھومنے کے بجائے حاصل کی قدر کی اور لاحاصل کی تلاش کے لیے سرفروشی کا مظاہرہ کیا۔ اظہر جاوید کے تمام دوستوں اور کرم فرماؤں کو "تخلیق" کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دکھایا۔ جو تخلیق کے دلدادہ ہوتے ہیں انھیں پلکوں پر بٹھاتے ہیں۔ سونان اظہر جاوید نے لفظوں کی مٹھاس سے احباب کے دل تسخیر کر لیے۔ اپنے والد کے نام اور "تخلیق" کے کام کو پذیرائی بخشنے کے لیے "تخلیق ایوارڈ" کا اجرا کیا۔ 2012ء سے اب 2023ء تک "تخلیق" کی مسلسل اشاعت کے 54 سال مکمل ہو چکے ہیں۔ گیارہویں تخلیق ایوارڈ اور اظہر جاوید کی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ایک تقریب 11 مارچ 2023ء بروز ہفتہ آفیسرز کلب لاہور میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر قیصر رفیق (پی۔ ای۔ او، پاکستان ڈسکور چینل، آفیسرز کلب)، سونان اظہر جاوید (مدیر ماہنامہ "تخلیق"، سی۔ ای۔ او ایس ایس پلاسٹک انڈسٹری) کی دعوت پر ملک کے کونے کونے سے صاحبان تخلیق تقریب میں آئے۔ استقبالیہ ٹیم میں غلام حسین ساجد،

ظفر سیال، مظہر سلیم مجوکہ، آفتاب خان، تسنیم کوثر اور سحر حفیظ شامل تھے۔ انھوں نے اپنی مسکراہٹوں اور استقامت کے پھولوں سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ روٹری کلب میں فیلوشپ کا مرحلہ قابل ستائش سمجھا جاتا ہے لیکن سوہان اظہر جاوید نے تخلیق کاروں کے لیے اس تقریب کا اہتمام کر کے فیلوشپ کا موقع فراہم کیا۔ منتظمین کے گلوں میں ہار اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ استقبالیہ ٹیم کی آنکھیں فرش راہ تھیں۔ وہ معزز مہمانوں پر یوں پتیاں نچھاور کر رہے تھے کہ جیسے دولہا کی مہندی کے موقع پر مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ روشنیوں نے آغوش قلب کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ دودھیا قمقموں کی پرکشش روشنی میں مہمانوں کو اپنا سایہ تلاش کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

تخلیق ایوارڈ کی اس تقریب میں بھی شاعروں اور ادیبوں کو مل کر گھل مل جانے کا موقع ملا۔ نامور مصنفہ، شاعرہ، محترمہ صوفیہ بیدار نے اسٹیج کا عنان اقتدار سنبھالتے ہی خوبصورت لفظوں سے حاضرین کا استقبال کیا۔ ان کے لہجے سے یہ بات عیاں تھی کہ وہ صحت لفظی کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ خارزار شعر و ادب میں شب محفل ہونا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ صوفیہ بیدار نے پورے وقت حاضرین محفل کو بیدار رکھا۔ اصغر ندیم سید، ڈاکٹر سعادت سعید، نذیر قیصر، خالد اقبال یاسر، محمد حنیف باوا اور محمود احمد قاضی نے اسٹیج پر جلوہ افروز ہو کر کرسیوں کی توقیر میں اضافہ کیا۔ محمد حنیف باوا بڑھاپے کے باوجود تقریب کے دولہا تھے۔ منشا قاضی نے تلاوت قرآن حکیم کی سعادت حاصل کی۔ صوفیہ بیدار نے تقریب کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو ادب کے فروغ میں تخلیق کے 54 برسوں کی کارگزاری پر اظہار اطمینان کیا۔ تخلیق کی غیر جانبدارانہ حکمت عملی کو سراہتے ہوئے اظہر جاوید کی علمی و ادبی رفعت پر روشنی ڈالی۔ ''کمال فن ایوارڈ'' کے علاوہ ''سفیر تخلیق'' اور ''ادب دوست'' ایوارڈز کا تعارف بھی کروایا۔ اسٹیج کے سامنے بہت سے حاضرین بڑی محبت سے مہمانان خصوصی کے علاوہ پینافلیکس کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اظہر جاوید کی خوبصورت تصویر اپنے دوستوں پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم)، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ زکریا، شعیب بن عزیز، ڈاکٹر قیصر رفیق، سرفراز سید، عذرا اصغر، محسن مگھیانہ، شاہد علی خان (مدیر الحمرا)، وجاہت مسعود، ملک اسلم، محترمہ مسرت کلانچوی، محترمہ فرحت پروین، احمد صفی، ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)، ناصر علی سید (پشاور)، طلعت منیر (اسلام آباد)، ڈاکٹر بدر منیر (خوشاب)، محمد عباس مرزا، ڈاکٹر عمر ساحل، آفتاب خان، ڈاکٹر افتخار بخاری، شہزاد نیر، پرویز کلیم، ڈاکٹر امجد پرویز، ڈاکٹر ثنا فرشتہ، ڈاکٹر شاہدہ دلاور، خالد محمود امیر، بہادر جوئی، جاوید منظور، آصف عمران، محمد اشرف خان، ممتاز راشد لاہوری، ظہور ندیم (امریکہ)، وحید رضا بھٹی، ماڈرن جاپانی، علی محسن، رضا محمد، ڈاکٹر رفیق خان، میجر شہزاد نیر، نواز کھرل، منشا قاضی، مناظر علی، سید قلیل گیلانی، شاہ میر بٹ، حفیظ سوہان، وجاہت مسعود، محمد عطا، خاور نعیم ہاشمی، محترمہ شبہ طراز، ڈاکٹر نجیب جمال، ممتاز راشد، طارق شریف پیرزادہ، ساجد حبیب (ر) ایئر مارشل شہزاد انور خان، ایم ڈی ملک، منور عثمانی، محترمہ فوزیہ تاج، فردوس کھوکھر، سعدیہ سوہان، عطیلہ سعید، فرح رضوی، عابدہ قیصر، تنزیلہ مغل، شازیہ رباب اور صباحت خالق کے علاوہ بہت سے اہل قلم اور ادب دوست بھی موجود تھے۔

تقریب کے روح رواں مدیر تخلیق سوہان اظہر جاوید نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ماہنامہ تخلیق ایک فیملی کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بالخصوص تمام لکھاریوں کو ان کی نگارشات قلم کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے جو شمع اظہر جاوید نے جلائی تھی اسے منور رکھنے کے لیے

تمام ممکنہ اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ "گیارہواں تخلیق ایوارڈ" درحقیقت صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ ایک پینل کے ذریعے ناموں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ قبل ازیں اُن دس تخلیق کاروں کو ایوارڈ دیے جا چکے ہیں ان میں محترم شفیق عقیل، محترم ڈاکٹر انور سدید، محترمہ بانو قدسیہ، محترمہ نثر جہاں (امریکہ)، محترمہ عذرا اصغر، محترم پروفیسر حسن عسکری کاظمی، محترم سرفراز سید، محترمہ بشریٰ رحمن، محترم رشید امجد اور محترم آغا گل شامل ہیں۔ گیارہویں ایوارڈ کے لیے بزرگ تخلیق کار محمد حنیف باوا (جھنگ) کا نام متفقہ طور پر چنا گیا ہے۔ یوں تو شاعری ہر ادبی جریدے کا لازمی جزو ہے لیکن تخلیق میں شائع ہونے والے کلام کے لیے ایک پینل تشکیل دیا جاتا ہے جو کڑی جانچ پڑتال کے بعد اس کی اشاعت کا فیصلہ کرتا ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ اہلِ قلم اظہر جاوید کے مشن کی تکمیل میں ہمارے ساتھ ہوں گے۔ تقریب کے دیگر مقررین نے اظہر جاوید کی شخصی عظمت اور ان کی خدمات کو بہترین الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مقررین نے کہا اظہر جاوید صرف لکھاری ہی نہیں تھے بلکہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ انھوں نے افسانہ نویسی کے تمام مروجہ اسلوب اپنا کر انھیں حیاتِ نو بخشی۔ سو ان اظہر نے تخلیقات کا معیار بلند کرتے ہوئے تخلیق کو ادب و دانش کا خزینہ بنا دیا ہے۔ اُن کا جنون اور انہماک قابلِ رشک ہے۔ ادبی گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر تخلیق نے ادبی روایات کو زندہ رکھا ہے۔ ذاتی پسند اور ناپسند کو بالائے طاق رکھ کر ادب کی خدمت میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔

تخلیق نے پاکستانی سرحدیں عبور کر کے دنیا کے مختلف ممالک میں ادبی روشنی اور پاکستانی ادب متعارف کروا دیا ہے۔ بعض تخلیق کاروں کا تخلیق سے قلبی رشتہ بن چکا ہے وہ احساس کے جذبے سے تخلیق سے جڑے ہوئے ہیں۔ اظہر جاوید کی زندگی، طرزِ فکر، اعلیٰ انسانی سادگی، اقدار کا احترام آج بھی زندہ ہے۔ تخلیق نے اردو کے علاوہ پنجابی زبان کے لکھاریوں کو بھی اپنے صفحات کی زینت بنایا ہے۔ سرائیکی لکھنے والے بھی تخلیق میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ ماہنامہ تخلیق نے تنقید، تحقیق، ترجمہ کے علاوہ افسانے اور شاعری کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس کے علاوہ خاکے اور انشائیے بھی تخلیق میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تخلیق گویا ایسے گلدستے کی طرح ہے جس میں ہر رنگ اور خوشبو کے پھول سجے ہوئے ہیں۔ ماہنامہ "تخلیق" نے اردو افسانے کے فروغ میں جو کام کیا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ انھوں نے ممتاز افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی بھرپور انداز میں حوصلہ افزائی کی ہے۔ دیارِ غیر میں بسنے والے بعض افسانہ نگاروں کے افسانوں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو تخلیق نے اردو افسانے کو وقار بخشا ہے کیوں کہ اظہر جاوید خود بھی پنجابی اور اردو کے بہترین افسانہ نویس تھے۔ اسی طرح پنجابی کہانیوں کو بھی تخلیق نے شائع کر کے پنجابی زبان و ادب کے فروغ میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ ماہنامہ "تخلیق" میں ڈاکٹر انور سدید کے سالانہ جائزوں نے بھی اسے بے حد پذیرائی بخشی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید سال بھر کے تخلیق کے شماروں پر جب سالانہ جائزہ لکھتے تھے تو کمال کر دیا کرتے تھے۔ وہ نوآموز لکھاریوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کر کے تخلیق کو تخلیق کاروں کا نمائندہ جریدہ بنانے کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ماہنامہ "تخلیق" میں دیگر تحریروں کے علاوہ اس کے خطوط نے بھی خوب شہرت پائی ہے۔ اس میں ہر ادیب کو تنقید کا پورا پورا حق دیا جاتا اور وہ گزشتہ شمارے کے مندرجات پر بے خوف تنقید کر سکتا تھا اور یہ سلسلہ کئی کئی شماروں تک

چلتا رہتا۔ ماہنامہ ”تخلیق“ کے خطوط نے بھی خوب شہرت پائی ہے۔ اس میں ہر ادیب کو تنقید کا پورا پورا حق دیا جاتا اور وہ گزشتہ شمارے کے مندرجات پر بے خوف تنقید کر سکتا تھا اور یہ سلسلہ کئی کئی شماروں تک چلتا رہتا۔ ماہنامہ ”تخلیق“ کے خطوط نے علمی و ادبی مباحث کے سلسلوں کو شروع کیا جو ادبا و شعرا کے علاوہ قارئین میں بھی دلچسپی کا باعث بنے۔ ماہنامہ ”تخلیق“ نے خلیجی ریاستوں میں فروغِ اردو کے حوالے سے جو کام کیا ہے وہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ اظہر جاوید نے کمال جرأت مندی کے ساتھ خلیجی ریاستوں میں اردو کے فروغ میں ہونے والے کام کے حوالے سے خصوصی اشاعت کر کے سفیرِ اردو کا کردار ادا کیا ہے۔ ماہنامہ ”تخلیق“ کے اداریوں نے بھی خوب شہرت پائی ہے۔ اظہر جاوید کے تحریر کردہ اداریوں کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ اس سلسلے کو سونان اظہر نے بڑی کامیابی کے ساتھ جاری و ساری رکھا ہوا ہے۔ ماہنامہ ”تخلیق“ نے بعض اہلِ قلم کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کے خصوصی نمبر شائع کر کے انھیں خوب پذیرائی بخشی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔ ماہنامہ ”تخلیق“ میں دیگر اصنافِ ادب کے علاوہ ”خاکے“ بھی اس کی زینت بنتے رہے ہیں۔ اردو کے بہترین خاکے تخلیق کی پرانی فائلوں میں موجود ہیں۔ اظہر جاوید کا کلام پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر احمد پرویز اور احمد شوکت علی نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا۔ ان کے لبوں کی حرکت لفظوں کے ذریعے مہمان اظہر جاوید کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مہمانوں کے لیے لطفِ دہن اور لطفِ شکم کا اہتمام بھی تھا۔ جس سے سونان اظہر جاوید کی دریادلی اور مہمان نوازی ظاہر ہو رہی تھی۔ تقریب میں اظہارِ خیال کرنے والے دوستوں نے ”تخلیق“ کی ادبی خدمات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ اس دفعہ مجلس کی مشاورت سے صرف لاہور کے باہر سے آنے والے دوستوں کو اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا۔ ناصر علی سید پشاور سے اپنی اہلیہ کے ساتھ تشریف لائے۔ انھوں نے اظہار کرتے ہوئے کہا: ”میں سونان اظہر صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس تقریب میں آنے کا موقع دیا۔ سونان نے اپنے باپ کی میراث کو جس طرح آگے بڑھایا ان کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر قیصر رفیق (سی۔ای۔او۔ ڈاسکو ہوٹل اور آٹوز کلب) نے کہا کہ سونان بھائی کا مشکور ہوں ہر سال ان کی وجہ سے ادب کے درخشاں ستاروں سے ملنے کا موقع مل جاتا ہے۔ انھوں نے تمام دوستوں کو ڈاسکو ہوٹل میں اپنے ادبی شاہکاروں کو پیش کرنے کی بھی دعوت دی اور حنیف باوا کو تخلیق ایوارڈ کی مبارک باد دی۔ ذوالفقار کاگلی نے کہا جب وہ سیالکوٹ سے لاہور آئے تو لاہور کے ایک ادبی مکتب میں داخلہ لیا جو بھگوان سٹریٹ میں تھا۔ اس مکتب کا نام دفتر تخلیق تھا اور وہاں کے استاد اظہر جاوید تھے۔ سونان اظہر اپنے والد کے پھیلائے ہوئے پیار، محبت اور روایات کا امین ہے۔ ایم۔ ایم۔ علوی راولپنڈی سے تشریف لائے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ 35 برس سے ”تخلیق“ کے قاری ہیں۔ جب وہ فوج میں کیپٹن تھے تو جیسے ہی ڈیوٹی سے فراغت ملتی وہ لاہور دفتر تخلیق اظہر جاوید کو ملنے حاضر ہو جاتے۔ فوزیہ تاج (ہری پور، ہزارہ) سے تشریف لائیں۔ انھوں نے کہا سونان سے رابطہ ”تخلیق“ کے ذریعے ہوا اور تحریریں چھپ کر اندازہ ہوا کہ اظہر جاوید محبتیں بکھیرنے والے انسان تھے۔ ڈاکٹر عمر منیر (خوشاب) سے تقریب میں شرکت کرنے آئے۔ انھوں نے کہا کہ تخلیق اور اظہر جاوید کو اعزاز حاصل ہے کہ گزشتہ 5 دہائیوں سے اس پرچے نے بہت سے بڑے بڑے ادبی نامور ستاروں کو ادبی دنیا میں متعارف کروایا۔ جناب محسن مگھیانہ جھنگ سے تشریف لائے۔ انھوں نے کہا سونان جیسے بیٹے ہر ادیب کی خواہش ہوتی ہے انھیں نصیب ہوں میں

خوش ہوں اس نے اظہر جاوید کے دوستوں اور اپنے والد کی میراث کی حفاظت کی۔

جناب سرفراز سید نے کہا کہ آج کی دنیا میں جہاں ڈھونڈنے سے بھی سکون نہیں مل رہا وہاں اتنے علمی و ادبی ستاروں کو اکٹھا کرنا بہت بڑی بات ہے اور یہ خوبی تخلیق اور سونان کو حاصل ہے۔ طلعت شبیر جو اسلام آباد سے خصوصی طور پر تشریف لائے انھوں نے کہا سونان کا وصف ہے کہ وہ اظہر جاوید کے دوستوں سے بھی محبت کرتا ہے اور اس محبت کا اظہار وہ میری شاعری اور دیگر تصانیف کو تخلیق میں جگہ دے کر کرتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر ظہور احمد نے کہا میں جب لاہور آیا تو میری دوستی اور رابطہ جن دو لوگوں سے سب سے پہلے ہوا ان میں ایک اظہر جاوید تھے اور دوسرے یونس جاوید تھے۔ انھوں نے بھی حنیف باوا کو تخلیق ایوارڈ 2022ء وصول پانے پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد سٹیج کے مہمانوں کو اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ محمود احمد قاضی گوجرانوالہ سے خصوصی طور پر تشریف لائے انھوں نے کہا اظہر جاوید سے اتنی ملاقاتیں تو نہیں تھیں لیکن وہ میرے واقف ضرور تھے۔ تقریبات میں ملاقات ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیتے۔ غلام قیصر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اظہر جاوید اور میرے روابط ۶۳ سے ٹھہرے ٹھہرے ہیں۔ ہم اظہر رسالے کو مل کر ترتیب دیتے۔ دوستوں کی زندگی کو ترتیب دیتے۔ وہ ایک مددگار دوست تھے جو دوستوں کے ساتھ مخلص تھے۔ سعادت سعید نے کہا کہ اظہر اور میرے مراسم 1967ء سے قائم ہوئے جو آخری سانس تک رہے۔ انھوں نے کہا "تخلیق" کے 1969ء سے اب تک کے تمام جلدیں PDF کی شکل میں کسی ویب سائٹ پر موجود ہونی چاہئیں۔ خالد اقبال یاسر نے کہا کہ آج کی تقریب میں سونان اظہر (مدیر تخلیق) اور شاہد علی خان (مدیر الحمرا) موجود ہیں۔ یہ وہ سعادت مند اولادیں ہیں جنھوں نے اپنے والد کے جلائے ہوئے چراغ کو نہ صرف جلایا بلکہ اس کی لو کو مزید بڑھایا۔ اصغر ندیم سید نے پروگرام کی صدارت کی۔ انھوں نے فرمایا میرے لئے یہ لمحہ بہت بڑا اعزاز ہے جس کا باعث دو وجوہات ہیں۔ ایک تو میرے دوست اظہر جاوید کی تقریب، دوسرا تخلیق ایوارڈ حنیف باوا کو دیا گیا۔ آخر میں حنیف باوا نے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا اس ایوارڈ کی اہمیت تمام حکومتی ایوارڈوں سے زیادہ اہم ہے کیونکہ حکومتی ایوارڈ پسند ناپسند کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔ "تخلیق ایوارڈ" ہمیشہ میرٹ پر دیا جاتا ہے۔ تقریب کے آخر میں سونان اظہر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سب سے پہلے جو دوست بیمار ہیں، اسلم کمال اور عطاء الحق قاسمی ان کی صحت کے لئے دعا کریں کہ انھیں اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے۔ پھر میری تمام دوستوں سے ہاتھ باندھ کر گزارش ہے کہ لاہور سے آنے والے دوستوں کو اس دفعہ اظہار خیال کا موقع نہ مل سکا۔ انھوں نے باہر سے آنے والے دوستوں کے لئے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انتظامیہ نے بہت اچھا کام کیا اور دو سے ڈھائی گھنٹے میں تقریب کو سمیٹنے کا انتظام کیا۔ خصوصی طور پر بیرون شہر سے آنے والے تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ وہ ایک فون کال پر تشریف لے آئے۔ ایوارڈ کے انتخاب کے سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میں نے کبھی اس میں مداخلت نہیں کی جو انتظامیہ فیصلہ کرتی ہے میں سر تسلیم خم کر لیتا ہوں۔ پھر صوفیہ بیدار کی خوب صورت نظامت پر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ آخر میں تمام مہمانوں کا دل سے شکریہ ادا کیا اور ہائی ٹی سے مہمانوں کی خاطر تواضع کی گئی۔

◆◆◆

گوشۂ حنیف باوا

محمد حنیف باوا۔ نئے دور کا 'دانتے'!

سرفراز سیّد

11ویں تخلیق ایوارڈ یافتہ حنیف باوا سے مکالمہ —— سرفراز سید نے بہت سی نئی جہتوں سے روشناس کروایا

باوا جی! 'تخلیق' کا سالانہ ادب ایوارڈ نہایت مبارک ہو! آپ کی عمر 87 سال سے زیادہ ہو گئی۔ ماشاءاللہ! ہمیشہ کی طرح فعال زندگی گزار رہے ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں۔ یہ بتائیں، اس طویل زندگی میں کبھی عشق ہوا؟'' ''ہاں جی ہوا، بالکل ہوا!'' ''کب کہاں، کیسے، کس عمر میں؟'' ''بھارت میں لدھیانہ کے نزدیک اپنے گاؤں چک سرائے میں!'' ''پاکستان کے قیام سے پہلے! کیا عمر تھی آپ کی؟'' ''13 سال'' ''13 سال! دوسری طرف عمر کتنی تھی؟'' ''وہ بھی 13 سال کی تھی، بہت خوبصورت تھی۔'' ''دونوں 13 سال کے! نام کیا تھا؟'' ''پتہ نہیں، پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔'' ''کیوں؟'' ''سکھوں کی لڑکی تھی۔'' ''کبھی ملاقات ہوئی؟''

''نہیں، دور سے دیکھتا تھا۔ وہ سکول جاتی تھی تو اس کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر چلتا تھا۔ وہ سکول میں داخل ہو جاتی تو میں اپنے خالصہ سکول میں چلا جاتا تھا۔'' یونہی یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا، پھر پاکستان بن گیا۔''

کبھی اس سے کوئی بات کی، کوئی خط و کتابت؟ اسے معلوم تھا کہ آپ اس سے عشق کرتے ہیں؟'' ''پتہ نہیں، یہ بھی پتہ نہ چلا۔ ایک دو بار اس نے مڑ کر میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا، بس یہی اس عشق کا حاصل تھا، پھر پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ ہجرت کر کے جھنگ آ گئے، ساری زندگی یہیں گزر گئی!'' ''وہ اب بھی یاد آتی ہے؟'' ''کبھی بھولی نہیں، اسی عمر کا عشق نہایت شدید ہوتا ہے۔ یہ میرا پہلا اور آخری عشق تھا۔'' ''باوا جی! آپ کی داستانِ عشق سے تو مجھے اٹلی کے معروف شاعر 'دانتے' کی مشہور نظم ''ڈیوائن کامیڈی'' (Divine Comedy) یاد آ رہی ہے۔ بالکل اسی طرح کے واقعات ہیں۔ آپ نے یہ کہانی پڑھی ہے؟''

''نہیں، میں نے پڑھی نہیں مگر اس کا تذکرہ بہت سنا ہے۔!''

''بس آپ ہی کی کہانی ہے جو 700 سال پہلے بھی وقوع پذیر ہوئی۔ دانتے نے ایک 10 سال کی خوبصورت کم سن لڑکی بیٹرس (Bearice) کو خوبصورت سفید لباس میں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ کم سن لڑکی اپنی دھن میں آگے گزر گئی اور پھر غائب ہو گئی۔ دانتے نے اس لڑکی کے حسن اور اس کی چال ڈھال کے بارے میں نظم لکھنی شروع کی۔ تقریباً دس سال بعد وہ لڑکی پھر دکھائی دی۔ اب وہ مکمل جوان اور زیادہ خوبصورت ہو چکی تھی۔ دانتے نے اسے دیکھا، بات کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ لڑکی دانتے کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائی اور بس! کچھ دنوں بعد خبر آئی کہ اس لڑکی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس پر دانتے کو زبردست صدمہ پہنچا۔ اس نے اس کا اظہار 14213 سطروں کی ایک طویل نظم میں کیا۔ یہ نظم 1308ء میں شروع ہوئی اور 1321ء کو مکمل ہوئی۔ اس کے بعد جلد ہی دانتے کا

انتقال ہو گیا۔ اصل میں دانتے بیان کرتا ہے کہ عالم تخیل میں بیٹرس اسے اپنے ساتھ آسمانوں پر لے جاتی ہے اور دوزخ، بہشت اور دوسرے مقامات کی سیر کراتی ہے۔ حنیف باوا کی کہانی بھی دانتے کی کہانی اور کیفیت سے بہت ملتی ہے۔ دانتے نے 10 برس کی عمر والی بیٹرس کو دیکھا، باوا صاحب کو 13 سال کی لڑکی نے حصار میں لے لیا، دونوں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا، دونوں نے "دیکھنے والوں" کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ان سے کوئی بات نہیں کی۔ دانتے نے بیٹرس کے عشق میں طویل نظم لکھی جو اٹلی اور دنیا کی ادبیات عالیہ میں ممتاز مقام حاصل کر چکی ہے۔ حنیف باوا کو پھر کبھی وہ لڑکی دکھائی نہ دی مگر اس کی یاد نے باوا صاحب کو افسانہ نگار بنا دیا جس طرح وارث شاہ نے بھاگ بھری کے عشق میں "ہیر وارث شاہ" لکھ دی۔ غالب نے ایک ڈومنی کے عشق میں لازوال غزلیں لکھ دیں۔ ہمارے حنیف باوا صاحب نے اس پراسرار لڑکی کو یاد کرتے کرتے بالآخر 1950ء میں شادی کر لی۔

س: باوا جی جھنگ میں زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟"

ج: "1952ء میں جھنگ سے میٹرک کیا، گورنمنٹ نارمل سکول چنیوٹ سے جے وی سند لے کر ایک پرائمری سکول میں پڑھانا شروع کیا۔ ملازمت کے دوران پرائیویٹ طور پر ایف۔اے، بی۔اے اور پنجابی میں ایم۔اے کیا۔ 1992ء میں ریٹائرمنٹ لی اور کہانیاں لکھنے کا کام شروع کیا۔ اردو، پنجابی دو قومی زبانوں میں بہت سی کہانیاں، انشائیے، افسانے لکھے، گورمکھی اور ہندی ناولوں اور افسانوں کے اردو اور پنجابی زبانوں میں ترجمے کئے۔ پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ، میاں محمد بخش شخصیت و فن، پنجابی بولیاں، تحقیق وارث (وارث شاہ کا تذکرہ)، ہیر قریشی، نعتیہ مجموعہ "آمنت واولی" کے علاوہ جرمن ہیسن کے ناول "سدھارتھ" کا پنجابی ترجمہ بھی کیا۔ پنجابی کہانیوں کے دو مجموعے "چپ نے وی سوچ" اور "کہانی" کے علاوہ اردو افسانوں کا ایک مجموعہ "باہر کا آدمی"، انشائیوں کا مجموعہ "دائروں سے باہر" اور پنجابی کہانیوں کا ایک مجموعہ "دھوا کھیا ہویا آدمی" بھی شائع ہوا۔ بہت سے مختلف مضامین اردو اور پنجابی زبان میں شائع ہوئے مگر میرا ان سب سے الگ اور اہم کام اظہر جاوید کی پنجابی کہانیوں "بہت دیر ہو گئی" کا جنوری 2022ء میں اردو ترجمہ تھا۔ یہ کہانیاں "تخلیق" میں مسلسل چھپتی رہیں۔

س: "اظہر جاوید سے رابطہ کب ہوا اور کیسا رہا؟" "یاد نہیں کب اور کیسے رابطہ ہوا" دونوں کی عمر بھر کی بات ہے۔ میں جب بھی لاہور آیا، اظہر سے ضرور ملتا، بڑا شاندار آدمی تھا۔ ہمیشہ خوش باش دکھائی دیتا۔ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتا تھا۔ اسے کبھی رنج و غم کے عالم میں نہ دیکھا۔ جب اس کی کہانیوں کا ترجمہ کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ تو نہایت دکھی انسان تھا۔ میرا اس سے مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ رسالہ "تخلیق" کے پنجابی گوشے کے لئے مواد بھی فراہم کرتا تھا۔ "حنیف صاحب آپ نام کے ساتھ باوا جی کا لاحقہ کوئی خاندانی معاملہ ہے یا کوئی خاص بات ہے؟" "کوئی خاص بات نہیں، خاندانی معاملہ بھی نہیں۔ ادھر بھارت میں ایک گلوکار تھا "مہندر باوا"۔ شاعر تھا اور گاتا بھی تھا۔ اس کی شاعری اور گانے کا انداز مجھے بہت پسند تھا میں نے اپنے نام کے ساتھ باوا لگا لیا جو عمر بھر میری پہچان بنا رہا۔ اکثر لوگ پورے نام کی بجائے باوا جی کہہ کر پکارتے ہیں۔

جھنگ بہت ادب خیز، ادب پرور شہر ہے۔ ہیر رانجھے کے رومان کے حصار میں گھرا ہوا شہر! جھنگ نے بے حد مشہور ادیب و شاعر پیدا کئے۔ مجید امجد، ڈاکٹر طاہر القادری، ڈاکٹر حیدر سلام، شیر افضل جعفری، حنیف باوا، صفدر سیال، رفعت سلطان، ڈاکٹر ناصر

عباس تبسم، ڈاکٹر وزیر آغا، شفیع ہمدم، محسن مگھیانہ، محمود شام، خالد محمود، رام ریاض، ضیاء الدین انصاری، شارب انصاری، خواجہ ڈاکٹر محمد زکریا اور دوسرے متعدد اہم نام۔ حنیف باوا ان ابتدائی دنوں کو یاد کرتے ہیں جب جھنگ میں بڑے پیمانے پر بڑے مختلف ادبی محفلیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے نام باقاعدہ شامل ہوا کرتے تھے۔ باوا جی نے چند محفلوں کے قصے سنائے۔ (چند محفلوں میں میں بھی شریک ہوا)۔ جھنگ کے سالانہ مشاعرہ کی دور دور تک شہرت پھیلی ہوئی تھی مگر یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا۔ کچھ لوگ عمر رسیدہ ہوتے چلے گئے، کچھ دوسری دھرتی میں چلے گئے۔ اب جھنگ میں صرف ڈاکٹر محسن مگھیانہ دکھائی دیتے ہیں۔

باوا جی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اس وقت دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں، کسی کو بھی علم و ادب میں کوئی دلچسپی نہیں بلکہ مجھے کہتے رہتے ہیں کہ آپ نے الماریوں میں بے کار کتابیں اور دوسرا کاٹھ کباڑ جمع کر رکھا ہے اسے فارغ کریں۔ میں نے پوچھا کبھی ہیر کی قبر پر گئے؟ کہنے لگے کہ ہاں اکثر جاتا ہوں۔ ہیر اور رانجھا دونوں ایک ہی قبر میں دفن ہیں۔ قبر کی چار دیواری ہی ہے اوپر چھت کوئی نہیں۔ دیہاتی لوگ، خاص طور پر دیہاتی عورتیں ہیر مائی کو سلام کرنے آتی ہیں اور دعائیں مانگتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔

حنیف باوا نے بابا فرید، سید وارث شاہ، صوفی محمد بخش کی شخصیت اور فن کے بارے میں اہم تحقیقی و تجزیاتی مضامین اور کتابیں شائع کیں۔ ایک سوال پر کہنے لگے کہ وارث شاہ اور استاد دامن کے کلام میں کلام کی چاشنی تو ملتی ہے۔ وارث شاہ ہیر کا بے حد خوبصورت سراپا بیان کیا ہے۔ پوری کتاب میں شخصی مکالمے، باتیں اور مکالمے بہت خوبصورت ملتے ہیں مگر ان میں فکر کی گہرائی اور کوئی فلسفیانہ بیان نہیں ملتا جب کہ بابا فرید، بلھے شاہ، حضرت محمد بخش، شاہ حسینؒ اور حضرت سلطان باہو کے ہاں ہر شعر میں فکر و احساس کی گہرائی پائی جاتی ہے۔ پنجابی ادب میں اردو شعراء سے کہیں زیادہ معرفت اور عارفانہ کلام ملتا ہے۔ باوا جی کا کہنا ہے کہ گورمکھی میں بھی بہت خوبصورت کہانیاں اور انسانی احساسات و جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ پنجابی کی ساری لوک داستانیں ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، مرزا صاحباں اور سسی پنوں وغیرہ ہمارے پاکستانی پنجاب میں ملتے ہیں۔ ادھر بھارتی پنجاب میں کوئی ایسی داستان نہیں ملتی مگر ان لوک داستانوں پر بہت کام ہوا ہے۔ وہاں صرف پنجابی زبان کی یونیورسٹیاں موجود ہیں جن میں اعلیٰ ترین ڈگریاں دی جاتی ہیں۔

اس سوال پر کہ آپ نے اپنی تحقیق میں اندازہ لگایا کہ وارث شاہ کی 'ہیر رانجھا' داستان میں دوسرے لوگوں نے بھی اضافہ کیا ہوا ہے؟'' حنیف باوا نے کہا کہ ہاں یہ بات بالکل درست ہے۔ محقق آصف خان نے بہت تحقیق کے بعد سعید احمد کی کتاب ''ہیر وارث'' کا ایک چھوٹا نسخہ ڈھونڈ لیا۔ وہ کتاب اتنی بڑی نہیں تھی، چھوٹی تھی۔ میں نے وہ اصل کتاب دیکھی ہے۔ آصف خان نے چھاپی ہے۔'' باوا جی آپ کی عمر 87 سال ایک ماہ سے زیادہ ہو رہی ہے، صحت کیسی چل رہی ہے؟'' کہنے لگے کہ صحت ٹھیک ہی ہے، روزانہ سیر کرتا ہوں، ابھی تک لاٹھی نہیں پکڑی۔ چھ سال پہلے بیوی کے چلے جانے کے بعد اکیلا ہی ہوتا ہوں۔ لکھنے پڑھنے میں وقت گزر جاتا ہے۔ نمکین چاول اور گڑ والے میٹھے چاول شوق سے کھاتا ہوں، سفید کپڑے پسند ہیں۔

س: کبھی واپس انڈیا گئے، وہ عشق والی لڑکی پھر دکھائی دی؟

ج: میں انڈیا کبھی نہیں گیا۔ ویسے اب تو اس کی عمر بھی 87 سال ہو گئی ہوگی، پتہ نہیں زندہ بھی ہے کہ نہیں!

◆◆◆

محمد حنیف باوا کی ادبی خدمات

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

گلشنِ ادب پر کچھ تخلیق کار درخشاں ستارے کی طرح نظر آتے ہیں۔ وہ افسانوی دنیا کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ عصری ادب میں جن لوگوں کا نام لوگ عقیدت سے لیتے ہیں۔ اُن میں محمد حنیف باوا بہت نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور انجم نیازی کی وساطت سے حنیف باوا کی قربت حاصل ہوئی۔ تخلیق کاروں کے سپہ سالار اظہر جاوید اور حنیف باوا کی رفاقت بہت پرانی ہے۔ حنیف باوا نے نام و نمود اور شہرت کے بجائے اپنے تحقیقی اور ادبی کام کی طرف توجہ مرکوز رکھی۔ اُن کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے۔ جو اپنے حُسنِ اخلاق کی بدولت لوگوں کے دل تسخیر کر لیتے ہیں۔ انھوں نے جھنگ میں اپنی وسعت آشنا بصیرت سے نو آموز لکھاریوں کی بہت مدد کی۔ صحافتی حلقوں نے انھیں بہت پذیرائی بخشی۔ جھنگ کی ہواؤں سے ملک بھر میں اپنی شناخت رکھتا ہے۔ عمومی طور پر لوگ جھنگ کو مائی ہیر کا شہر کہتے ہیں۔ رانجھا اور ہیر کے قصے یہاں بہت مقبول ہیں۔ افسانوں اور لوک داستانوں میں ہیر اور رانجھے کے تذکروں نے جھنگ کی ادبی و ثقافتی تاریخ کی نقاب کشائی کی ہے۔ عصرِ حاضر میں جھنگ کا اہم حوالہ علم و ادب ہے۔ جھنگ سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری، مجید امجد، ڈاکٹر عبدالسلام، شیر افضل جعفری، حنیف باوا، پروفیسر صفدر سیال، صاحبزادہ رفعت سلطان، مہر محمد بخش نول، انجینئر مختار حسین فاروقی، مولانا حق نواز جھنگوی، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر وزیر آغا، شفیع ہمدم، محسن مگھیانہ، اشتیاق احمد، ڈاکٹر ملا خان حیدری، پیر حبیب احمد، طالب حسین سیال اور ایسے ہی کئی دانشوروں نے قومی سطح پر علم و ادب کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ماہنامہ "تخلیق" پاکستان میں اس کے بانی مدیر اظہر جاوید اور حنیف باوا کے تعلقات نصف صدی پر محیط رہے۔ سونان اظہر جاوید نے اپنے والد کے وصال کے بعد ان تمام اہلِ قلم سے رابطہ رکھا جن سے اظہر جاوید کی یاد اللہ تھی۔ محمد حنیف باوا مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو اور پنجابی کی بہت سی اصناف پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ اردو اور پنجابی کے ممتاز شاعر، افسانہ نویس، محقق، نقاد اور کالم نویس محمد حنیف باوا کی شخصیت یکم جنوری 1936ء کو پائل (بھارت) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انھوں نے 13 برس اپنے آبائی گاؤں چک سرائے ضلع لدھیانہ میں گزارے۔ تعلیم کا سلسلہ آر ایس ایس خالصہ ہائی سکول سے شروع کیا۔ وہ چھٹی جماعت تک اسی ادارہ میں رہے۔ 14 / اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ وہ لوگ جنھوں نے قافلے لٹا کر آزادی کی منزل حاصل کی، اُن میں محمد حنیف باوا کے اہلِ خانہ بھی شامل تھے۔ تقسیم ہند کے بعد انھوں نے 1952ء میں جھنگ سے میٹرک پاس کی۔ اس دور میں جے وی، پی ٹی سی، سی ٹی اور بی ٹی کی پیشہ ورانہ ڈگریاں ہوا کرتی تھیں۔ محمد حنیف باوا نے گورنمنٹ نارمل سکول چنیوٹ سے 1958-59ء میں جے وی پاس کر لیا۔ جے وی کی سند حاصل کرتے ہی انھیں ایم سی پرائمری سکول جھنگ میں بطور پرائمری مدرس ملازمت مل گئی۔ 1960ء سے 1992ء تک انھوں نے مختلف تعلیمی اداروں میں علم کے موتی بانٹے۔ زبان و بیان اور تحریر و تکلم کی دولت سے مالا مال محمد حنیف باوا نے ملازمت کے دوران حصولِ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ آج کے نوجوانوں کے لیے یہ امر باعثِ تقلید ہے کہ تعلیمی سفر میں انھیں محنت سے گریز نہیں کرنا

جا ہے۔ محمد حنیف باوا نے تدریسی مصروفیات کے باوجود پرائیویٹ طور پر ایف اے، بی اے اور ایم اے (پنجابی) مکمل کیا۔ محمد حنیف باوا نے مختلف اخبارات و رسائل میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر خوب دکھائے۔ ماہنامہ ''تخلیق'' اور ماہنامہ ''اوراق'' میں ان کی مختلف تحریریں چھپتی رہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور اظہر جاوید ان کی صلاحیتوں کے معترف رہے۔ وہ ملک بھر کی مختلف تقریبات میں شریک ہوتے رہے۔ پیرانہ سالی کے باوجود انھوں نے تخلیق ادبی ایوارڈ منعقدہ لاہور میں بھی شرکت کی۔ اظہر جاوید کے فرزند ارجمند محترم سونان اظہر کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے والد گرامی کے تمام دوستوں کو تخلیق کے پلیٹ فارم پر یکجا کر لیا ہے۔ آج ماہنامہ ''تخلیق'' اسی آب و تاب کے ساتھ علم و ادب کی آبیاری کر رہا ہے۔ اظہر جاوید 43 سال تک ادبی جریدہ ''تخلیق'' جاری کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد یہ شمع سونان اظہر کے ہاتھ میں ہے جس کی روشنی پورے ملک میں پھیل چکی ہے۔ محمد حنیف باوا اور ماہنامہ ''تخلیق'' لازم و ملزوم ہیں۔ خلیل جبران نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو وفا کے پیکر ہوں اور اپنے اصولوں پر ہمیشہ قائم رہیں، ان کی قبر پر لکھو ''یہ وہ لوگ ہیں، جو مرتے نہیں ہیں۔'' میں سمجھتا ہوں کہ اظہر جاوید اور محمد حنیف باوا ایسی ہی کشتی کے سوار ہیں۔ دونوں کا اٹوٹ رشتہ رہا۔ محمد حنیف باوا کے علمی، ادبی اور تحقیقی سرمایہ میں پنجابی کہانیوں کے دو مجموعے ''چپ دے رنگ موت'' (1981ء) اور ''کہانی'' (1994ء) میں شائع ہوئے۔ اردو افسانوں کا ایک مجموعہ ''باہر کا آدمی'' (1999ء) اور اردو انشائیوں کا مجموعہ ''دائروں سے باہر'' (2006ء) میں منظر پر آیا۔ پنجابی کہانیوں کا ایک اور مجموعہ ''دھوانکھیا ہویا آدمی'' 2008ء میں شائع ہوا۔ ''حقی وارث''، ''پیر فرید''، ''امت دا واقی''، ''پنجابی ادب دی مختصر تاریخ''، ''پنجابی بولیاں''، ''پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ'' اور ''میاں محمد بخش شخصیت و فن'' حنیف باوا نے ہرمن ہیس کے ناول ''سدھارتھ'' کا پنجابی ترجمہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اظہر جاوید کی پنجابی کہانیوں ''بہت دیر ہوگئی'' کا جنوری 2022ء میں اردو ترجمہ بھی کیا۔ اردو اور پنجابی پر ان کی دسترس قابل ستائش ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان کے افسانوں کی بازگشت آج بھی سنی جا چکی ہے۔ ایسے صوفی انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے جو پنجابی کے فروغ میں ہمہ وقت مصروف عمل ہوں۔ ایک عرصہ بیت جانے کے باوجود ان کی ریاضت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ محمد حنیف باوا نے زندگی کا صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ اسے استعمال کرنے کی عملی کوشش کی۔ ان کی تحریروں میں رجائیت اور نیا پن موجود ہے۔ ان کے افسانوں کی دنیا حقیقت کی عکاس ہیں۔ وہ موضوعات کو ایک زاویے سے نہیں دیکھتے بلکہ انسان کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ راست گوئی، تخلیقی قوت اور تنقیدی ابج ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔ ان کی شخصیت کی مٹھاس بلکہ معصومیت اور شرافت کے سب قائل ہیں۔ پھولوں اور محفلوں میں ادب لطافت ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ محمد حنیف باوا نے ممتاز شاعر و ادیب، صحافی، مدیر تخلیق کی پنجابی کہانیوں ''بہت دیر ہوگئی'' کا اردو ترجمہ اس انداز سے کیا ہے کہ کہانیوں کی سادگی اور لطف بیان کا تاثر ٹوٹنے نہ پایا۔

محمد حنیف باوا نے بطور استاد ایک طویل عرصہ گزارا۔ ان کے فارغ التحصیل طالب علم آج ملک بھر میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ استاد ہونا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اگر استاد سخن شناس اور ادب دوست ہو تو وہ اپنے لیکچرز میں جان ڈال دیتا ہے۔ محمد حنیف باوا کا طرز عمل کچھ ایسا ہی رہا۔ پنجابی ماں بولی کے لیے ان کی گراں قدر خدمات سب کے سامنے ہیں۔ وہ پنجابی افسانوی مجموعوں سے انھوں نے پنجابی ادب میں اپنی اہم جگہ بنائی۔ میرے دوست ڈاکٹر افضل راز کا کہنا ہے کہ محمد حنیف باوا واقعی پنجابی کے باوا ہیں۔ تخلیق کار اپنی رشحات قلم سے جو کچھ بھی لکھتا ہے وہ زبان کی ترویج میں اہم حصہ ادا کر لیتا ہے۔ آج ملک بھر میں پنجابی ادب کا فروغ محمد حنیف باوا ایسے تخلیق

کاوشوں کی وجہ سے ہے۔ بحیثیت مترجم ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ محمد حنیف باوا مشاہدہ اور تجربہ رکھتے ہیں۔ یہ کتاب ایف اے، بی اے اور ایم اے پنجابی کے طالب علموں کے لیے یکساں مفید ہے۔ پنجابی مقالات لکھنے والے بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ پنجابی زبان کی ترویج و تفہیم کے باب میں محمد حنیف کا اہم مقام ہے۔

افسانوی مجموعہ ''باہر کا آدمی'' 1999ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ وہ جیون کے زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے رہے اس لیے ان کے افسانے معاشرتی زندگی کے عکاس ہیں۔ غربت، خوشیاں، تمنائیں، استحصال، امارت، سماج اور معاشرتی زیر و بم کے ذکر نے ان کے افسانوں کو لازوال شہرت دی ہے۔ تحریر کا حسن اس کی سادگی میں مضمر ہے۔ بے تکلف انداز اور بے ساختگی حنیف باوا کے اسلوب کا نمایاں انداز ہے۔ وہ کہانی کو پھیلانے اور سمیٹنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمارے قول و فعل کے تضاد ابھر کر آتے ہیں۔ وہ معاشرتی، مذہبی، سیاسی اور ثقافتی ہم آہنگی کے علمبردار ہیں۔ ''دائروں سے باہر'' حنیف باوا کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا شب قدر انشائیہ تھے۔ ملک بھر کے انشائیہ نویس ان سے استفادہ کرتے رہے۔ انشائیہ ایسی صنف نثر ہے جس کا دامن بہت وسیع ہے۔ پیاز چھیلنے کی طرح پرت در پرت موضوعات سامنے آتے ہیں۔ طنز و مزاح کے تڑکے میں لپٹا ہوا انشائیہ جس میں قاری کے لیے اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اگلے مرحلے انشائیہ نگار کون سی دنیا میں پہنچ سکتا ہے۔ محمد حنیف باوا ''دائروں سے باہر'' مجموعے میں خوب انشائیے تحریر کیے ہیں۔ زندگی حالات کی دیواروں میں مقید ہے۔ وقت نے زندگی کے گرد دائرے کھینچ رکھے ہیں۔ دائروں کے اندر ایک طوفان ہے جب کہ دائروں کے باہر زندگی رقص کناں ہے۔ انشائیہ لکھنا ادبی پل صراط پر گزرنے کے مترادف ہے۔ حنیف باوا نے انشائیوں کی دنیا فتح کر کے کامیابی کے تاج محل کا دروازہ کھول لیا ہے۔ اکبر حمیدی، انجم نیازی، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر وزیر آغا کی بزم دوستاں میں رہتے ہوئے حنیف باوا انشائی محاذ کے مجاہد ہیں۔ ان کا قلم چل رہا ہے۔ وہ کسی ایک نکتے پر مرکوز نہیں ہیں وہ لکھتے جا رہے ہیں۔

ان کی پنجابی میں لکھی کہانیوں کی معروف کتاب ''بہت دیر ہوگئی'' کا اردو ترجمہ حنیف باوا نے کیا ہے جو طور بہت اعلیٰ درجے کے تخلیق کار ہیں اور دیگر اصناف ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ہم نے چوں کہ اس کتاب کو پنجابی میں بھی پڑھا ہے اس لیے حنیف باوا کے اس اردو ترجمے کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ویسے ان کہانیوں میں اس دور کی یاد تازہ ہو گئی ہے جب ادبی رسائل کی معاشرے میں بہت قدر ہوا کرتی تھی اور ان کے ایڈیٹر کو بے پناہ عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ اظہر جاوید کی یہ تحریریں اس سنہری دور کی بھی عکاس ہیں۔ اب تو زیادہ تر رسائل کو کمرشل ازم نے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ اظہر جاوید کی کہانیوں پر افسانوی رنگ نمایاں ہے۔ حنیف باوا نے ترجمہ کرتے ہوئے کہانیوں کی اثر پذیری کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔ ان کہانیوں میں مقصدیت قاری کی انگلی تھامے رواں دواں ہے۔ سوہان اظہر نے اہل تخلیق کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے لیے تخلیق ایوارڈ کا آغاز کر کے ادب دوستی کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابل تعریف اور قابل تقلید ہے۔ یہ ادبی ایوارڈ کسی بھی بین الاقوامی ایوارڈ سے کم نہیں ہے۔ 2023ء کے لیے ڈاکٹر خواجہ زکریا، ناصر قیصر، ایوب خاور، غافر شہزاد اور محترم جمیل احمد عدیل، سوہان اظہر پر مشتمل ایک کمیٹی نے محمد حنیف باوا کا نام ''تخلیق ایوارڈ'' کے لیے متفقہ طور پر پیش کر دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ ادب کی بالادستی پر ہمیشہ رواں دواں رہیں۔ عوام الناس اور اہل تخلیق کی تحسین سمیٹتے رہیں۔

◆◆◆

دائروں سے باہر کا آدمی...... حنیف باوا

نسیم سحر

حنیف باوا سے میری صرف ایک ملاقات ہے مگر لگتا یوں ہے کہ میں تو ان سے کبھی جدا ہی نہیں ہوا۔ بالکل جیسے یارِ دلدار اظہر جاوید سے۔ دونوں میں کچھ مشترک اقدار بھی ہیں اور کچھ ''مخالف اقدار'' بھی۔ کہ ہر کٹ ہمیشہ منفی اور مثبت تاروں سے ہی مکمل ہوتا ہے۔ اظہر جاوید جتنا یار باش اور سوشل آدمی تھا، حنیف باوا مجھے اسی قدر اپنے آپ میں سمٹے ہوئے لگے۔ اور یہاں ایک تیسرا کردار ان کے ساتھ قدرِ مشترک کا اظہار کرنے آ داخل ہوتا ہے۔ جس کا نام سدھارتھ ہے۔ ہرمن ہیسے کے اسی نام کے ناول کا پنجابی ترجمہ حنیف باوا نے اسی عمدگی سے کیا ہے جیسے کہ اظہر جاوید کے افسانوں کا۔ ایسا لگتا ہے کہ جس طرح سدھارتھ ناول کے مرکزی کردار سدھارتھ کی تسلی مہاتما بدھ کی رہبانیت کی تعلیمات سے کسی قدر ہٹ کر اظہر جاوید کے افسانوں کے پنجابی میں ترجمہ کرنے کے بعد ان کے چرنوں میں آ بیٹھے۔ اور یوں انہیں بھی ایسا گیان اور نروان نصیب ہو گیا جو سدھارتھ کو بھی میسر تھا اور اظہر جاوید کو بھی۔ اور احمد فراز نے جو کہا تھا کہ ''نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں'' تو یہ نشہ حنیف باوا کی تخلیقی شخصیت میں پوری طرح رچ بس چکا ہے۔

اس وقت میرا موضوع حنیف باوا کے انشائیوں کی کتاب ''دائروں سے باہر'' ہے۔ تخلیق ایوارڈ کی اس تقریب میں باوا جی کی شخصیت و فن پر بے شمار اہلِ دانش اظہار خیال کر چکے ہیں یا میرے بعد بھی کریں گے مگر ابھی تک ان کے انشائیوں کے حوالے سے کسی نے بات نہیں کی اور مجھے امید ہے کہ ان کی اس جہت پر میرا مضمون وحدہ لاشریک ہی ثابت ہوگا۔ میں نے ان کی اس جہت پر اظہار خیال کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ انشائیہ کی صنف کی دروں بینی کی قربت مناسبت باوا کی طبیعت اور مزاج سے بھی ہے۔ اسی لیے ان کے یہ تیس انشائیے بغور پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ حنیف باوا کو دائروں سے باہر کا آدمی نہیں بلکہ دائروں کے اندر کا آدمی کہوں کہ ان کے تمام انشائیے ان کے دروں بین ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اور خواتین و حضرات دروں بین کو ہی حقیقی معنوں میں بروں بینی کی بھی صلاحیت نصیب ہوتی ہے۔ یہ احساس میں نے ان کے انشائیے پڑھتے ہوئے بارہا محسوس کیا ہے۔

انشائیہ کیا ہے اور انشائیہ کسے کہتے ہیں اس پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اسے ادب کی بدقسمتی جانئے کہ ماضی میں کچھ ذاتی اور کچھ نظریاتی اختلافات کی وجہ سے اس انتہائی زرخیز صنفِ ادب کے فروغ میں رکاوٹیں حائل ہوتی گئیں۔ اگرچہ انشائیہ کی اصطلاح ڈاکٹر وزیر آغا سے قبل اختر اورینوی بھی علی اکبر قاصد کی کتاب ''ترنگ'' کے دیباچے میں استعمال کر چکے تھے مگر بعد ازاں اس صنفِ ادب کو صحیح معنوں میں فروغ ڈاکٹر وزیر آغا نے ہی دیا اور انہوں نے اس کی اصطلاح کو عام کرنے کے علاوہ انشائیہ کے خدوخال واضح کیے اور انشائیہ نگاری کو تحریک بنا کر اسے بطور ایک صنفِ ادب اعتبار بخشا۔ چنانچہ اسی زمانے میں ادبی گروہوں کی تفریق کے باعث انشائیہ کی تحریک کو نقصان پہنچا۔ اس کے باوجود اردو کے پیش رو انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر داؤد رہبر، جاوید صدیقی، ممتاز مفتی جیسے نام دکھائی دیتے ہیں جبکہ ڈاکٹر

وزیر آغا، نظیر صدیقی، مشکور حسین یاد، انجم نیازی، مشتاق قمر، جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، حنیف باوا، سلیم آغا قزلباش، اکبر حمیدی، کامل القادری کو جدید انشائیہ نگاروں کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ انشائیہ کی صنف کی انفرادیت یہ ہے کہ اسے بے شمار تنقیدی زاویوں سے متاثر ہو کر ہر انشائیہ نگار نے اپنے انفرادی انداز میں نکھارا یوں اس کے اندر وہ تنوع ابھر کر ہو گیا جو دوسری بہت سی اصناف ادب میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔

حنیف باوا نے بھی اس انفرادی تخلیقی انداز کو اس خوبی سے اختیار کیا کہ ان کے انشائیے دیگر بہت سے انشائیہ نگاروں سے یکسر الگ نظر آنے لگے۔ انہوں نے روزمرہ استعمال کی چیزوں پر بھی جس مختلف زاویے سے لکھا اس سے قاری کو محسوس ہوا کہ حنیف باوا جن نظروں سے اس چیز کو دیکھ رہے اور اسے دکھا رہے ہیں وہ نظر تو اس کے پاس تھی ہی نہیں، اور حنیف باوا کے ذریعے ہی وہ پہلی مرتبہ اس چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ان کا ہر انشائیہ پڑھ کر قاری نئے زاویوں سے آگاہ ہوتا ہے اور وہ اُن کے کچھ نئے چھپے اس کے دامن خشک میں پڑتے ہیں۔ حنیف باوا کتاب کے انتساب میں اعلانیہ اعتراف کرتے ہیں "جن انشائیہ نگاری کو صحیح سمت پر لانے والے مہان انشائیہ نگار، وہ دوان جناب ڈاکٹر وزیر آغا کے نام جنہوں نے مجھے انشائیہ نگاری کے راستے سے بھی بھٹکنے نہیں دیا۔" دیباچہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے نہ صرف حنیف باوا کو اس راستے پر لگایا بلکہ انشائیے کی صنف کے تقاضے سمجھنے میں ان کی رہنمائی بھی کی۔ اور ایک استاد اور مدیر کی حیثیت سے انہوں نے حنیف باوا کا پہلا لکھا ہوا انشائیہ "چاک" واپس کر دیا اور ساتھ انشائیے کی صنف کے بارے میں کچھ ہدایات بھی دیں اور کہا کہ ان کو مدنظر رکھ کر دوبارہ لکھیں تو یہ انشائیہ صحیح معنوں میں انشائیہ کہلانے کا مستحق ہوگا۔

اس وقت حنیف باوا نے بات نہ مانی اور اس پہلے انشائیے میں کوئی تبدیلی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر وہ اس فیصلے پر قائم رہتے تو ان کا یہ پہلا انشائیہ ہی آخری ثابت ہوتا۔ مگر انہوں نے کچھ دن بعد جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اس انشائیے کو بار بار پڑھ کر سمجھ لیا کہ "چاک" میں تو عاشق کے گریبان کی طرح کئی چاک ہیں چنانچہ اپنی رفوگری کا ہنر استعمال کر کے انہوں نے اسے دوبارہ لکھا اور وہ "اوراق" کے اگلے ہی شمارے میں چھپ بھی گیا۔ یہی نہیں، بلکہ یہی انشائیہ ان کی کتاب میں بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ اس چاک کا چاک گریبانی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ دراصل کلاس روم کے بلیک بورڈ پر استعمال ہونے والا چاک ہے۔ جو تختۂ سیاہ پر سفید رنگ میں حروف اور لفظوں کا جادو جگاتا اور رات کی سی سیاہی کو صبح کی سپیدی میں بدل دیتا ہے۔ حنیف باوا کی عمیق نظری کے ثبوت میں اسی انشائیے کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔ "چاک ایک ایسے درویش کے مانند ہے جو اپنے وجود کی نفی کرتے آتشِ عشق میں گم ہو چکا ہو۔ اگر چاک کے وجود پر ذرا غور فرمائیں تو وہ آپ کو خود سپردگی کے عالم میں سرشار دکھائی دے گا۔ یعنی وہ اپنی ہستی کو کلی طور پر استاد کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔۔۔" یعنی اس اسلوب میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے انشائیہ نگار کے طور پر اپنی ہستی کو کلی طور پر استاد کے سپرد کر دیا ہے۔

اب یہ حنیف باوا کی عالی ظرفی ہے کہ دیباچے میں یہ سب کچھ لکھنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "اگر میں اپنی ضد پر اڑا رہتا اور ڈاکٹر وزیر آغا کی ہدایات کو در خورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے 'چاک' میں تبدیلیاں پیدا نہ کرتا تو آج میں انشائیہ نگار نہ ہوتا۔"

خواتین و حضرات! اس اعتبار سے کہ حنیف باوا کے انشائیوں کی طرح مختصر رکھتے ہوئے یہاں میں ایک اور اعتراف کرتا چلوں،

چونکہ میں حنیف باوا جیسا پیدائشی ذہین نہیں تھا (اب بھی نہیں ہوں) اس لیے میرے پہلے انشائیے پر ڈاکٹر وزیر آغا نے مجھے بھی ایسی ہی ہدایات دی تھیں مگر میں بے جا ذہانت پر عمل نہ کر سکا۔ اور آج بھی میرے ریکارڈ میں میرا وہ پہلا انشائیہ اور ڈاکٹر وزیر آغا کا رہنما خط موجود ہے جس کی روشنی میں میں بار دیگر اس پہلے انشائیے پر نظر ثانی نہ کر سکا جس کے نتیجے میں ظاہر ہے کہ وہی میرا آخری انشائیہ بھی ثابت ہوا کہ اس کے بعد "پر طبیعت ادھر نہیں آتی" والا معاملہ ہو گیا۔ اور اب تو پلوں کے نیچے سے بہت سا نہیں، بلکہ سارا ہی پانی بہہ چکا ہے اس لیے یوں جانئے کہ میں نے اپنا وہ واحد تریک انشائیہ داخل دفتر کر دیا ہے۔ اور حنیف باوا کی استقامت اور فنی ریاضت کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے انشائیہ نگاری کے فن پر عبور پا کر دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ ان کے انشائیوں سے میں نے کئی مختصر اقتباسات ان کی فنی جہات کی نشان دہی کرنے کے لیے منتخب کیے تھے مگر تخلیق ایوارڈ کی یہ یادگار تقریب بھی اسی اختصار پسندی کی متقاضی ہے۔ جس کا مظاہرہ حنیف باوا نے اپنے ہر انشائیے میں کیا ہے اور جس کے سبب اسے ایک ہی نشست میں پڑھنا قاری کے لیے آسان ہوتا ہے۔ وہ بے جا طوالت سے گریز کرتے ہیں اور اپنی کم گوئی کی فطرت کے مطابق قلم کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔ اچھے اشعار کی طرح ان کے انشائیوں میں بھی کوئی بھرتی کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ مختصر لکھنا طویل لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح مقررین بھی جانتے ہیں کہ مختصر مضمون لکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر مختصر مضمون کو سماعت کرنا یقیناً آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ میں بھی سامعین کی آسانی کی خاطر اپنا مضمون اس مقطعے پر تمام کرتا ہوں کہ حنیف باوا کی دیگر کتابوں میں اردو افسانوں کا مجموعہ "یار ہوا آدمی" اور اردو کہانیوں کا مجموعہ "باہر کا آدمی" بھی ہے۔ مگر مجھے ان دونوں کتابوں کے عنوانات سے شدید اختلاف ہے اس لیے کہ حنیف باوا کو تو میں "جیتا ہوا آدمی" اور "اندر کا آدمی" ہی سمجھتا ہوں۔ میری طرف سے انہیں تخلیق کا گیارھواں ایوارڈ مبارک ہو۔

◆◆◆

"تخلیق تقریب" 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

اظہر جاوید صاحب میرے رسالے کے قائد تھے۔ وہ ہمیشہ مجھے اچھا مشورہ دیا کرتے۔ ایک دفعہ میں نے ان کا کلام کراچی کے ایک بہت سینئر شاعر سے پہلے شائع کر دیا۔ وہ اس بات پر بہت حیران ہوئے اور مجھے سخت لفظوں میں تنبیہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیشہ سینئر کا خیال رکھا جائے۔ ان کے انتقال سے پہلے میں نے انہیں جمخانہ کلب میں دعوت پر بلایا جس میں ہمارے ایک پیارے دوست جناب سعید اختر کو بلایا گیا تھا۔ اگلی صبح علم ہوا کہ اظہر صاحب رات اس دنیا سے چلے گئے۔ بہت افسوس ہوا۔ میں جناب سونان اظہر صاحب کو مبارک پیش کرتا ہوں کہ وہ اس یادگار کو ہمیشہ اسی جذبے سے منایا کریں گے۔

شاہد علی خان (مدیر "الحمراء" لاہور)

مضامین

گریزپا موسموں کی خوشبو

محمود شام

خلق نے رہنا ہے باقی یا سپاہ جبر نے   کوئی دن میں فیصلہ کن معرکہ ہونے کو ہے

اسلام آباد والے پنڈی سے دو ہاتھ آگے ہیں۔ کراچی کی نسبت پہلے سے جان لیتے ہیں کہ کسے باقی رہنا ہے اور فیصلہ کن معرکہ کب ہوگا۔ ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے اسلام آباد والوں کا کہ اپنے معرکوں میں ہمیں بھی شرکت کا موقع دیتے ہیں۔ خود اس سابق دارالحکومت میں تشریف لے آتے ہیں۔ ورنہ ہم اسلام آباد جائیں تو ہم پر میر تقی میر والی گزرتی ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو   ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب   رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا   ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اسلام آبادیوں سے بھی اکثر ملاقات ہو جاتی ہے۔ آدھی رات کو دروازے توڑے جاتے ہیں۔ ہتھکڑی لگائی جاتی ہے۔

"کچھ مسلح اہلکاروں کے گروہ ہیں/ وردیوں والے بھی/ بے وردی بھی ہیں/ اور ایک فربہ جسم والا شخص/ اتنی سے مجھے یہ حکم دیتا ہے/ چلو جلدی کرو/ میں عرض کرتا ہوں/ کہ میں تو رات کے ملبوس میں ہوں/ ربڑ کی چپل پاؤں میں ہیں/ مجھے کوئی کپڑے بدلنے دو/ وہ ہمیں تو اٹھانے دو/ مگر وہ چار بھاری ہاتھ/ میرے ناتواں شانوں پر پڑتے/ اور کچھ بندوق والے آگے بڑھتے/ مجھ کو دھکے دے کے/ اک گاڑی میں ایسے ڈال دیتے ہیں/ کہ جیسے میں/ بہت ہی کوئی دہشت گرد ہوں/ اور میرا سر لاکھوں کروڑوں ڈالروں کا قرض رکھتا ہے۔"

26 جولائی 2019 کی یہ شب کالم نویس/ ایک سیاسی سربراہ کے تقریر نویس، سینیٹ کے ایک رکن عرفان صدیقی کے لیے بڑی ظالم اور قہر سامان گزری ہوگی۔ لیکن شاعر عرفان صدیقی کو ایک لازوال نظم "میں اکثر سوچتا ہوں" عطا کر گئی۔

"یہ راتیں/ یہ شامیں/ یہ دوپہریں/ ابھی محبوباؤں کی طرح یاد رہتی ہیں/ وہ دیوانی لڑکیاں/ اگر پُر اعتماد و پُر یقیں/ ابھی انصاف کی مالک/ مگر پھر یوں ہوا/ ایک اک کر کے کتنے ہی دن/ اور کہاں کتنے مہینے ہو گئے لیکن/ پلٹ کر وہ نہیں آئی/ مجھے اک رازداں سے دوستوں نے کل یہ بتایا ہے/ کہ اب وہ شہر کی پُرجوش تقریبات میں اکثر نظر آتی ہے/ پہلے کی طرح اب بھی/ بہت ہی پُر اعتماد و پُر یقیں ہے۔"

یہ لڑکیاں بہت جابر۔ بہت ستمگر اور بہت بے وفا ہوتی ہیں۔ مگر بہت گنگناتی غزلیں۔ سوچنے پر مجبور کرتی نظمیں دے جاتی ہیں۔

عشق اور مشک کبھی نہیں چھپتے۔ اسی طرح شاعری بھی نہیں چھپائی جا سکتی۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ بعض عاشق اپنے اوپر ایسی سنجیدگی اور بزرگی طاری کر لیتے ہیں کہ انہیں محبت میں گزرنے والی واردات اس حماقت کی طرح لگتی ہیں۔ حالانکہ یہی باتیں ہیں کہنے کی۔ یہی باتیں ہیں سننے کی۔ حافظ شیرازی یاد آتے ہیں۔

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس ۔۔۔ ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

پاکستان میں ہر ذی شعور کی جوانی میں ایک بار مارشل لاء ضرور لگتا ہے۔ اور ہم جیسے عمر رسیدہ لوگوں کو صرف جوانی میں ہی نہیں بڑھاپے میں بھی مارشل لاء بھگتنے پڑتے ہیں۔ کبھی وردی والے خود سامنے آ کر راج کرتے ہیں۔ کبھی جیلوں اور اچکنوں کے پیچھے چھپ کر وار کرواتے ہیں۔ عرفان صدیقی صاحب نے کئی سال اپنی شاعری کو چھپائے رکھا۔ نثر سے عشق کو پار لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ شاعری تو قدرت کی طرف سے ایک عظیم تحفہ بھی ہے۔ اظہار کی طاقت بھی۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکہ کے ایک بہت ہی مقبول اور جواں مرگ صدر جان ایف کینیڈی کے الفاظ میں شاعری کی عظمت ملاحظہ کیجئے:

> When the power leads man towards arrongance, poetry reminds him of his limitation. When power narrows the areas of man's concern poetry reminds him of the richness and diversity of his existence. when power corrupts, poetry cleanses, for art establishes the basic human trust which must serve as the tonchstones of our judgment. The artists, however faithful to his personal vision of realty becomes the last champion of the individual mind and sensiblity against an intrustive society and an officious state. The great artists is thus a solitary figure. He has as Frost said " a lover's quarrel with the world." in pursuing his perceptions of reality he must often sail against the currents of his time. This is not a popular role.

26 اکتوبر 1963 کو ممتاز امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کے اعزاز میں کی گئی یہ تقریر ایک تاریخی دستاویز ہے۔ ''گریز پا موسموں کی خوشبو'' کی اعلیٰ نظموں نے مجھے کینیڈی کے یہ الفاظ آپ تک پہنچانے کے لیے ایک ولولہ تازہ دیا ہے۔ آرٹ کی عظمت میں پاکستان کی سب سے فعال آرٹس کونسل میں بیان کر رہا ہوں۔ عام طور پر ہمارے شعری مجموعوں میں اولیت غزلوں کو دی جاتی ہے۔ لیکن عرفان صدیقی صاحب نے نظموں کو سبقت دی ہے۔ کیونکہ یہ خود بہت نظم و ضبط کے آدمی ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ ایک ٹیم پر ہونے کا تو اتفاق نہیں ہوا۔ امریکہ کے بعض شہروں میں ایک ہوٹل ایک کمرے میں رہنے کا تجربہ ہوا اور یہ شرکت ڈالر بچانے کے لیے تھی۔ ہمیں زادِ راہ تو پورے کمرے کا ملتا تھا۔ لیکن دیارِ غیر میں ہم نے ڈالر کی وقعت کو ترجیح دی۔ آج کل قحط الرجال کے ساتھ قحط الڈالر بھی ہے۔ عرفان

صدیقی ان دنوں نوائے وقت کے لیے اپنے مرتبح کیتی کا کالم لکھ رہے تھے۔ جنگ گروپ کی خواہش تھی کہ یہ ہمارے صفحات میں جلوہ افروز ہوں۔ ایک وقت آیا کہ ہماری کوششیں رنگ لے آئیں۔ اور "نقش خیال" جنگ کے ادارتی صفحات پر جگمگانے لگے۔ ان کی عمر زیادہ تعلیم و تربیت کے دشت کی سیاحت میں گزری۔ دروغ برگردن وکی پیڈیا۔ جس کے مطابق سابق آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ کہہ نہیں سکتے کہ جن عادات و خصائل کا اظہار انہوں نے چھ سالہ سپہ سالاری میں کیا۔ وہ ان کی تربیت کا نتیجہ ہیں، یا یہ صلاحیتیں ان میں خداداد تھیں۔

کسی سے ایک گھڑی رابطہ بھی چاہوں میں　　　تو اپنے آپ کو صدیوں دور پاتا ہے

غزل کو عام طور پر "حرف بازنان گفتن" کہا جاتا ہے۔ مگر ان کی نظموں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ لڑکیوں سے ہی ہم سخن ہیں۔ اور کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ان کو عدالت بھی زنانہ ہی ملی۔ ان کی منصف بھی ایک خاتون تھیں۔ جنہوں نے انہیں چودہ دن کے لیے زنداں کے حوالے کر دیا۔ نظموں میں رومانس زیادہ ہے۔ نئی نئی تراکیب، استعارے، اور تلمیحات۔ غزلوں میں 'لا حاصلی' کا غلبہ ہے۔

مسند شاہی پہ جا بیٹھے گا میر کارواں　　　ریگزاروں میں بھٹکتے قافلے رہ جائیں گے

تھکے ہارے ہوئے لوگوں کا ریوڑ　　　نہ منزل ہے نہ کوئی راستہ ہے

لا حاصلی کے لیے بڑی طاقتور ردیف "کیا ہوئے" اردو شاعری میں برسوں سے پیرایۂ اظہار بن رہی ہے۔

خانقاہیں رہ گئیں یا کچھ مریدان صفا　　　دل پہ مرہم رکھنے والے آستانے کیا ہوئے
ہانپنے لگتے ہیں ساتھی دو قدم چلنے کے بعد　　　قبر تک چلتے تھے وہ دوستانے کیا ہوئے

لا حاصلی میں حسرتیں قافلہ در قافلہ ہوتی ہیں یا خاک شدہ آرزوئیں آس پاس بکھرتی ہیں۔

فیصلے سب 'بارگاہ ناز' میں ہوتے رہے　　　عدل گاہ میں ایک مشق رائیگاں چلتی رہی

عقوبت خانوں، ستم گاہوں اور مقتلوں کے لیے "بارگاہ ناز" کی ترکیب۔ اردو کے شاہی دور میں لے جاتی ہے۔

لاٹھی تھام کے جو چاہے ہانکنے لگتا ہے　　　بھیڑوں کا اک گلہ ہو گئے اچھے خاصے لوگ

اسلام آباد میں اقتدار کی غلام گردشوں سے جنہیں گزرنے کا تجربہ ہوا ہو وہی یہ کہہ سکتے ہیں۔

نام سلطانی جمہور کا گونجے ہر سو　　　بات کوئی سر دربار نہ ہونے پائے

یہ شعر کئی ایسے مراحل یاد دلا دیتا ہے۔ جب تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

اس بت کو توڑ پھوڑ دو بت تراش نے　　　خود ساز خود کو جان کر جو بولنے لگا

پڑھنے والے اپنے اپنے بت کو، اور اپنے اپنے بت تراش کو یاد کر سکتے ہیں۔ نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاعری سے کیف اٹھایئے:

اے تخت شاہی پہ دیکھ کر بھی شہر حیرت زدہ سا ہے　　　یہ وقت ہے کیا کہ جو بازی گاہوں میں طفل بازی گراں رہا

آپ کی مشکل کچھ آسان کرنے کے لیے میں اسٹیڈیم کا اشارہ دے سکتا ہوں۔

ایک معبود ہی دو زباں مگر ہر شخص اپنا اپنا خدا پوجنے میں ہے

کتنی بڑی سچائی کیسے آسان الفاظ میں۔ اور ہم جو 1988 سے Power Sharing کے تجربے کرتے آ رہے ہیں۔ اس کا اظہار ملاحظہ ہو:

محض دست بستہ سی بادشاہی کی خاطر روز جیتے رہے ہو روز مرتے رہے ہو

بادشاہی اور دست بستہ۔ سبحان اللہ۔ معاف کیجئے۔ حکایت لذیذ ہے۔ دراز ہوتی جا رہی ہے۔ آخر میں شاعری ہجر کے درمیان میں بھی خوش فکری اور پری وشوں کے دل میں سما جانے کی آرزو۔ ہمارے ہاں تو فضائی میزبانوں سے عشق اور معاشقوں کی روایات بھی موجود رہی ہیں۔ ہمارے بعض محترم پی آئی اے کے ان فیئروں سے ربط خاص رکھتے تھے۔ جو فضائی میزبانوں کی ڈیوٹیاں لگاتے تھے۔ یہ شعر ایک شاعر نے کہا یا جیت کے رکن نے یہ فیصلہ قارئین کو کرنے دیں۔ لیکن اس کی معنویت سے سرشار ہوں۔

"فضائی میزبانوں کی طرح سب ہوتے جاتے ہیں دلوں میں کچھ، نگاہ خوش ادا کچھ اور کہتی ہے"

اور بالکل آخر میں ایک تلخ سچائی۔

"جبہ سپاہ و تخت و زر و مال میں بھی قرطاس اور قلم کو بھی عزت ملے گی کیا؟"

◆◆◆

"تخلیق تقریب" 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

ماہنامہ "تخلیق" کا آغاز میرے سامنے ہوا اور پہلے شمارے سے گاہے گاہے میری نظم و نثر بھی شائع ہوتی رہی اور میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ اظہر جاوید نے سالہا سال ادب کی بے پناہ خدمت کی ہے اور کتنے نوجوان اہل قلم کو انھوں نے متعارف کرایا اس کی دوسری مثال شاید ہی ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کے فرزند گرامی کو بھی نادر روایت پر چلنے کی توفیق دے جس پر وہ عمل پیرا ہیں اور دعا ہے کہ خدمت ادب جاری رکھنے کی توفیق اللہ کی طرف سے مسلسل جاری رہے۔ **(ڈاکٹر خواجہ زکریا)**

"تخلیق" سے میرا قلبی رشتہ ہے۔ اس تعلق کا آغاز جناب اظہر جاوید کی زندگی میں ہوا تھا اور سونان جاوید صاحب کی وساطت سے آج بھی قائم ہے۔ ایک درویش منش ادیب کے باصلاحیت فرزند نے جس طرح "تخلیق" کو اردو ادب کے افق پر روشن رکھا ہوا ہے میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور حنیف باوا صاحب کو مبارک ہو کہ وہ ایک اہم ادبی ایوارڈ کے مستحق ٹھہرے۔ **(ڈاکٹر ایوب ندیم)**

"زمرد ملک۔ شخصیت اور تخلیقات" ایک تاثر

غلام حسین ساجد

میں نے لکھنے کا آغاز 1970ء کے شروع میں کیا ہوگا مگر ادبی حلقوں سے ربط 1972ء کے بعد ہی ہوا۔ جب میری کچی پکی تحریریں دوسرے درجے کے ادبی/ساہتی پرچوں میں چھپنا شروع ہوئیں اور ہم عمر احباب کا ایک حلقہ وجود میں آنا شروع ہوا۔ "پنجابی زبان" میں چھپنے کے آغاز سے یہ دائرہ اور وسیع ہوا اور اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی لکھنے والوں سے بھی محبت کا رشتہ استوار ہوا جسے ایم۔ اے (پنجابی) میں داخلے نے اور بڑھاوا دیا۔ زمرد ملک کو میں نے اسی زمانے یعنی 1974ء کے آغاز میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں نجم حسین سید صاحب کے پاس دیکھا۔ پھر وہ وقت ملنے پر "پنجابی ادبی سنگت" کے اجلاس میں بھی آنے لگے کہ جس کا میں سیکرٹری تھا اور جس کے اجلاس ہر منگل کی دوپہر چیئرمین کے کمرے میں ہوتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ صاحب علم، صاحب حلم اور صاحب بصیرت تھے اور نجم حسین سید، فخر زمان، حسین شاہد جیسے زیرک، فطین اور جدید تر ادبی تحریروں اور اسالیب سے آگاہ چند لوگوں میں سے ایک تھے، جس کی مثال اس وقت ہمارے ادب میں کوئی ہے تو شاید ملتان میں خالد سعید اور کراچی میں اجمل کمال ہیں۔ پنجابی ادب کے حوالے سے یہ دور بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اسی زمانے میں فکشن، شاعری اور تنقید کی "نئی پود" نے کلاسیکی اور روایتی اہمیت سے نجات پائی اور انگریزی، امریکی، فرانسیسی اور کلاسیکی ادب سے خط کشید کرنے والے روشن خیال دانشوروں اور تخلیق کاروں، منظور میراں، انیس ناگی، فخر زمان، نجم حسین سید، ڈاکٹر شفیق ہاشمی وغیرہ کی مساعی سے اسلوب اور تجربے کی سطح پر عالمی ادب کے متقابل آ کھڑا ہوا۔ اس مساعی میں زمرد ملک مرحوم کا حصہ دو چند ہے۔ زمرد ملک 24 اکتوبر 1975ء کو صرف 46 برس 10 دن کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کا اکلوتا شعری مجموعہ "کیہ لکھاں" ان کی وفات کے بعد شائع ہوا مگر یہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ پنجابی نظم کی روایت میں اس مجموعے کی ایک سنگ میل کی ہے۔ یہ اپنے عصر سے مکالمہ کرتی ہوئی ایسی کتاب ہے جس کی جڑیں تاریخ، اساطیر اور فکری مزاحمت میں ہیں۔ رمز، تصویریت، استعاروں اور تمثیلات کی سطح پر یہ کتاب علم اور فکر افروزی کے تال میل کا اور شاہکار ہے اور شاعری ذات، فکر اور سماجی رویے کی بھرپور عکاس ہے اور اس حقیقت کا ادراک دلاتی ہے کہ فکری گہرائی اور گیرائی کے لیے مادری زبان پر انحصار کرنا کس قدر سود مند ہو سکتا ہے۔

اب ان کی وفات کے سینتالیس برس بعد جناب فخر زمان نے ان کی "شخصیت اور تخلیقات" کے حوالے سے یہ کتاب "زمرد ملک" ترتیب دی ہے۔ اس تاخیر سے صرف نظر کرتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اپنے مشمولات کے حوالے سے یہ ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ "شخصیت" کے ضمن میں درج کیے گئے سبھی مضامین خصوصاً خالد حسن کا "زمرد ملک" اور شاہد ملک "خوشگوار انکساری کا پیکر۔ زمرد ملک" خاصے کی چیز ہیں اور مرحوم کی ذات، فکری صلاحیت، مزاج کی بوقلمونی، انکساری اور علمی درویشی کا خوب تعارف کراتے ہیں۔ یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ اس کتاب کے آئینے میں زمرد ملک، فخر زمان صاحب کے محبوب محسوس ہوتے ہیں اور یہ ایک ایسی اضافی صفت ہے جس نے کتاب کے باطن کو زندہ تر کر دیا ہے۔ فخر زمان کی نظم "کا تفادا کے" ایک دل گداز نظم ہے اور ان کے ممدوح کی عظمت کو

بخوبی اجاگر کرتی ہے۔ ایک سو ساٹھ صفحوں پر مشتمل یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے ساٹھ صفحے ''شخصیت'' سے متعلق مضامین اور تاثرات پر مبنی ہیں اور باقی سو صفحے تخلیقات پر جن میں ان کی ایک تنقیدی تحریر ''سلیمن وِدی گل'' (جو فخر زمان کے ناول ''ست گواچے لوک'' کا نہایت پر مغز دیباچہ ہے) کے علاوہ تین اردو افسانے 23 نظمیں، ایک پنجابی غزل، دو اردو غزلیں اور ایک انگریزی مضمون "Immortals" شامل ہے۔ جس سے یہ کتاب زمرد ملک کی ذات اور تخلیقی شخصیت کا دلکش امتزاج بن گئی ہے اور ادبی انفرادیت معیار اور فکری ترفع کی بنیاد پر ایک یادگار ادبی حوالہ۔

''زمرد ملک۔ شخصیت اور تخلیقات'' کی نظمیں اور پنجابی غزل کے علاوہ فخر زمان کا تاثر، امین مغل اور خالد حسن کے مضامین بلکہ ان کی بیگم زرینہ زمرد ملک کا پیش لفظ بھی ''کیہ لکھاں'' سے اٹھایا گیا ہے۔ جس کا حوالہ دے دیا جاتا تو اچھا تھا۔ ہاں تین اردو افسانے اور دو غزلیں نئی دریافت ہیں مگر مجموعی طور پر کتاب کا معیار اور غرض اشاعت قابل قدر ہے۔ اس کے باوجود کتاب کی اشاعت کے لیے بیالیس برس تک انتظار کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ زمرد ملک ایک تخلیقی ذہن تھا اور ہر تخلیقی ذہن کی طرح اس کے تخلیقی کام کا بہت کم حصہ اس کی تخلیقات میں منتقل ہو پایا ہے کہ ایسے کسی بھی دانشور کی کلیت اس کی گفتگو، تحریر اور فکر کے ادغام سے ظاہر ہوتی ہے۔ پھر زمرد ملک تو مصور بھی تھے، جس کا ذکر ان کے خاکہ نگاروں نے تواتر کے ساتھ کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ان کی دستیاب ڈرائنگز بھی اس کتاب کا حصہ ہوتیں کہ خطوط اور تصویریں اپنے خالق کے اسرار کی امین ہوتی ہیں۔ اس طرح ہمیں ان کے باطن تک پہنچنا اور آسان ہو جاتا۔

زمرد ملک کے افسانے ''پہلا خواب'' ''دل عجیب شہر تھا خیالوں کا'' اور ''آخری باب'' کا موضوع محبت ہے، جو زبان پر کم کم مگر قلب پر بہت اثر کرتی محسوس ہوتی ہے۔ زبان و بیان اور تاثیر کے لحاظ سے یہ ایک دلگداز تجربہ ہیں اور کم ہی لکھنے والوں کے یہاں اپنی تخیلاتی تخلیق کو اس سہولت سے لکھنے کا ہنر دکھائی دیتا ہے۔ پہلے افسانے کی ہیروئن اور دوسرے افسانے کی کیلی ایسے منفرد کردار ہیں کہ جو قاری کے وجود کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دونوں کی محبت بڑی حد تک کھلونے کھلونے مگر ان میں ایک اسرار بھری شدت ہے جو نگار کو نگن اور جاوید کو عشق کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے، جب کہ تیسرا افسانہ ''آخری باب'' ایک اسرار بھرے واقعے کو بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ زمرد ملک میں افسانہ نگاری کی بے پناہ صلاحیت تھی مگر انہوں نے اسے پروان چڑھانے کی سعی نہیں کی۔

ان کا اکلوتا پنجابی شعری مجموعہ ''کیہ لکھاں'' اپنے اسلوب، موضوعات اور رمز و کنایہ کے اعتبار سے پنجابی شاعری کی فکری روایت سے الگ اور منفرد ہے۔ اس کی بیشتر نظمیں عالمی منظرنامے اور ادبی/سماجی روایت سے سروکار رکھتی ہیں اور ان کا بیانیہ اساطیری/علامتی سطح پر استوار ہے۔ اس لیے ان میں وسیع مطالعے اور گہری وجودی ذاتیت کی مہک ہے۔ اس پر مارکسی نظریے کی چھاپ ان کی فرد سے فرد کی نسبت اور یکجہتی کو دو چند کرتی ہے۔ یہ طے ہے کہ زمرد ملک اکہری رومانیت اور سطحی فکر کے آدمی نہیں تھے اور عشق اور جذبۂ شوق جیسی کیفیت میں بھی اپنے وجودی تشخص اور انفرادیت کو بحال رکھتے تھے مگر اس طرح کہ ان کے بے محابا جنون کی تیغ مجروح نہیں ہوتی تھی اور ان کے احساس کا نیا پن برقرار رہتا تھا۔ زمرد ملک کو زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا یا وہ اپنی ذات میں اس طرح مگن تھے کہ اسے دوسروں کے ساتھ بانٹنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ کچھ بھی ہو، ان کے قلمی آثار بہت قلیل مگر بے حد اہم اور حقیقی ہیں۔ فخر زمان صاحب نے ہم سب پنجابیوں پر احسان کیا ہے کہ ان کی اور تخلیقات کو محفوظ کر دیا ہے اور اسے کلی زمانہ میں غرق ہونے سے بچا لیا ہے۔

◆◆◆

دھنک کا آٹھواں رنگ

پروفیسر قیصر نجفی

کہانی کاری ڈاکٹر فیروز عالم کی جبلت میں ہے جبکہ طبابت ان کا اکتسابی علم ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہانی کاری ان کے وجدان کی پہلی اڑان ہے اور طبابت دوسری — ہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کہانی کاری ڈاکٹر صاحب کی پہلی محبت ہے اور یہ ایک نفسیاتی سچائی ہے کہ پہلی محبت انسان کے دل و دماغ سے کبھی محو نہیں ہوتی۔ ہر چند زندگی کی بھول بھلیوں میں ڈاکٹر صاحب کی پہلی محبت کہیں کھو گئی لیکن وقت کے تیز و تند ریلے میں جونہی اس کا دامن ہاتھ آیا تو انہوں نے پھر اسے خود سے بچھڑنے نہیں دیا تھا اور ایک خوبصورت مکان کا ایک خوبصورت نام ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' رکھ کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں آباد کر دیا۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے اپنی کتاب ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' میں عرض مصنف کے عنوان سے چند کھری کھری باتیں کی ہیں۔ خصوصاً بحیثیت ایک کہانی کار اپنے فنی مسلک کا دو ٹوک الفاظ میں اعلان کر کے ہمیں انہوں نے افسانہ نگاری کے مختلف مسالک کی ریڑھ پر تیں الٹنے کے جوکھم سے بچا لیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''میں افسانہ نویسی میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس میں ''فن قصہ گوئی'' ہونا چاہیے یعنی وہ پرانی روایت کہ جب کارواں سرائے میں رات گزاری کے لیے الاؤ کے چہار طرف بیٹھ کر قصہ سنا کرتے تھے اور قصہ گو اپنی سحر البیانی سے ان کو مسحور کر دیتا تھا۔''

ڈاکٹر صاحب نے شریعت افسانہ نگاری کا اصل اصول کہانی کو قرار دیا ہے اور یوں بالواسطہ طور پر اردو افسانے کے اس پورے دور پر خطِ تنسیخ پھیر دیا ہے۔ جس کے دوران میں علامت نگاری کے نام پر تجرید و ابہام کے مقتلوں میں سالہا سال کہانی کا خون بہایا جاتا رہا۔ کہانی پر اس ظلم ناروا کے خلاف کہانی کے پرستاروں نے صدائے احتجاج بلند کی اور دادرسی کے لیے زنجیر انصاف ہلائی اور انجام کار نقد و نظر کے جہانگیروں نے کہانی کی واپسی کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر فیروز عالم قصہ و داستان کے دور سے متاثر ضرور ہیں مگر تکنیکی اعتبار سے قصہ و داستان کے بعض اجزائے ترکیبی کے زیر اثر نہیں ہیں۔ امر واقعی یہ ہے کہ وہ قصوں اور داستانوں میں کہانی پن کے عنصر، واقعات کی فنکارانہ بنت اور قصہ گویوں کی سحر بیانی پر فریفتگی کا اظہار کرتے ہیں۔ چونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قصے اور داستانیں، مافوق الفطرت کرداروں، شعبدہ بازیوں، جنوں بھوتوں کی باتوں اور من گھڑت واقعات سے عبارت ہوتی ہیں۔ انسان اور زندگی سے قصے یا داستان کا کوئی سروکار محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان میں انسان بھی ایک فرضی اور خیالی کردار کا روپ دھار لیتا ہے۔ مظہر علی جوان کی لکھی ہوئی داستان ''بیتال پچیسی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ''اردو ادب — تاریخ و تنقید'' کے مصنف لکھتے ہیں: ''بیتال پچیسی کے کردار دیکھیے۔ ان میں ایک انسان تو ہے جو زمین پر چلتا ہے۔ انسانوں سے ملتا ہے مگر یہ کبھی کبھی اڑنے بھی لگتا ہے۔ غیر انسانی مخلوق سے باتیں بھی کرتا ہے۔ بقول انتظار حسین چوتھی کھونٹ نکل جاتا ہے۔ ساتوں در کھول لیتا ہے۔''

اس امر میں دو آرا نہیں کہ کہانی کا انسان اور زندگی سے سمبندھ فطری ہے اور یہیں سے یہ لہذا کہانی کاری کے لیے انسان کی معرفت اور زندگی کا شعور از بس ضروری ہے۔ آج ہمارے پیش نظر ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ ہے۔ جس کے مصنف ڈاکٹر فیروز عالم ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ ایک ڈاکٹر سے زیادہ انسان اور زندگی کا شعور اور کسے ہو سکتا ہے؟ انھیں دنوں کسی نے کہا تھا کہ سعادت حسن اور منٹو ایک وجود میں دو وجود ہیں۔ بعینہ اسی طرح ڈاکٹر فیروز عالم اور کہانی کار ایک وجود میں دو وجود ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم انسانوں (مریضوں) کی زندگی کے تلخ حقائق اپنے اندر سمو لیتا ہے اور کہانی کار ان کے روبرو ہونے کا حوصلہ پاتا ہے اور یہ یقیناً ڈاکٹر اور کہانی کار کے درمیان توازن اور ہم آہنگی کا ماحصل ہے کہ ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' ایسا ایک ادبی شہکار منصہ شہود میں آ گیا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کی ادبی دانش میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ افسانے کے محدود کینوس پر کردار کی تمام تر زندگی کی تصویر کاری فنی مہارت اور ادبی شعور کے بغیر محال ہے۔ اسی طرح خالص بیانیے کو اسلوب کی ندرت اور انداز بیان کی دلکشی سے اثر آفرین بنانا روح ادب سے عرفان کی بدولت ممکن ہے اور یہ دونوں فنی مظاہر ڈاکٹر فیروز عالم کے یہاں اپنے بھرپور رنگ میں نظر آتے ہیں۔ ان کے کم و بیش تمام افسانوں میں تخلیقیت ادبی اوصاف کی بغل مارے بیٹھی ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم پر عمومی طور پر یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ ان کے یہاں موضوع میں یکسانیت ہے اور یہ کہ انہوں نے موضوعاتی تنوع پر سرے سے توجہ ہی نہیں دی۔ اس کے دو اسباب بتائے جاتے ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ تجربات و مشاہدات کو بیان کرنے کے شائق ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کا فوکس مرض، مریض اور علاج پر ہی رہتا ہے اور یوں بقول ان کے ڈاکٹر صاحب نے افسانے کے محدود کینوس کو محدود تر کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اول تو ہم اپنے اس ادعا کو جو سطور بالا میں کیا گیا ہے، پھر دہراتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں ڈاکٹر سے زیادہ انسان اور زندگی کا عرفان کسی کو حاصل نہیں۔ دوم تجربات و مشاہدات کے جس قلزم سے ڈاکٹر گزرتا ہے اس کے تھپیڑوں ہی کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مرض، مریض، علاج وغیرہ ڈاکٹر فیروز عالم کی کہانیوں کے عناصر ترکیبی ہیں مگر در حقیقت ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک دنیا ہے اور یہ تینوں دنیا مل کر ایک کائنات بناتی ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' میں ایک کائنات کا احاطہ کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس لحاظ سے یقیناً واحد اور منفرد افسانہ نگار ہیں کہ انہوں نے طب کے پیشہ اس سے متعلق مختلف شعبوں اور ان کے اسرار و رموز کی جس اخلاص و صداقت سے آگہی بخشی ہے اس کی مثال اردو افسانے میں شاید و باید ہی کہیں ملے۔ ڈاکٹر صاحب ایک جینوئن کہانی کار ہیں۔ اگرچہ پلاٹ کے تقاضوں کے مطابق کہانی میں کچھ رد و بدل کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے، لیکن فنی اعتبار سے کوئی کمی در آنے نہیں دی۔ خاص طور پر ان کے یہاں Make believe کا کہیں شائبہ نہیں ہوتا۔ بقول کسے ''جو حاشیے دیتے ہیں سچ زیب داستاں کے لیے'' مگر ڈاکٹر فیروز عالم نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ دراصل وہ ایک پکے مذہبی شخص (Staunch Religious Person) کی طرح ایک خالص کہانی کار ہیں اور کہانی کاری کے اصولوں کی مسلکی اصولوں کی طرح پابندی کرتے ہیں۔ وہ منظر کشی یا پیشہ ورانہ نکات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اس خوبصورتی سے اصل کہانی کی طرف گریز کرتے ہیں کہ قصیدے کے گریز کا لطف آ جاتا ہے۔ ہم نے ابتدا، کشمکش، وحدت تاثر، عروج اور انجام کا جتنا واضح مظاہرہ ڈاکٹر فیروز عالم کے یہاں دیکھا ہے وہ خال خال افسانہ نگاروں کے ہاں

نظر آتا ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک ڈاکٹر فیروز عالم زندگی سے ماپوس لوگوں کی کہانیاں لکھ کر ادب میں قنوطیت کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس اعتراض پر تبصرہ کرنے سے پیشتر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اصل فن کیا ہے؟ اصل فن یہ ہے کہ آپ جس ماحول میں سانس لے رہے ہیں اس میں پروان چڑھتی ہوئی زندگی کی عکاسی کریں لیکن اس کے ہر پہلو کو بقول ممتاز شیریں چیخوف کی طرح معالج کی نظر سے دیکھیں کیونکہ معالج ہر شے کو ایسے دیکھتا ہے جیسی وہ ہے۔ ویسے نہیں دیکھتا جیسے وہ خود دیکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم اپنے کلینک اور ہسپتال سے باہر کی دنیا کو بھی ایک معالج کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی معاشرتی بیماری نظر آتی ہے اس سے صرف نظر نہیں کرتے بلکہ اسے افسانوی رنگ و آہنگ میں پیش کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ معاشرتی کثافتیں بھی زندگی کا حصہ ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے ممتاز شیریں اپنے مضمون "مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر" میں لکھتی ہیں: "ایک معالج کے لیے دنیا میں کوئی چیز گندی نہیں۔ ایک ادیب کو چاہیے کہ اپنی والہانہ، ذاتی نقطہ نظر کو چھوڑ کر ایک معالج کی سی معروضیت برتے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کوڑے کے ڈھیر بھی لینڈ اسکیپ میں اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور انسان کے بُرے، وحشی اور ہیجانی جذبات بھی اتنے ہی فطری ہیں جتنے اچھے اور نیک جذبات۔"

ڈاکٹر فیروز عالم ایک وسیع ذخیرۂ الفاظ کے مالک ہیں۔ اس پر مستزاد وہ لفظوں کے مزاج شناس ہیں۔ کس لفظ کو کہاں استعمال کرنا ہے، اس فن میں وہ طاق ہیں۔ ہم اس وصف کو ان کے اختصاص کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے اس اختصاص کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں مگر ہم ان کی سراپا نگاری کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں: "جس نے بھی اسے دیکھا، دیکھتا ہی رہ گیا۔ قدرت بھی ایسے شاہکار کبھی کبھی تخلیق کرتی ہے۔ بڑی بڑی سبزی مائل بھوری آنکھیں، جن پر سیاہ پلکوں کے سائے جب لرزتے تو لگتا دیکھنے والوں کے دل بھی ان کے ساتھ ساتھ لرزنے لگے ہیں۔ لمبی مرمریں سفید اور پتلی بانہیں جو کنول کے ڈنٹھلوں کی یاد دلاتی تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی نوک پر سرخ ناخن جیسے موم شمعوں پر جلتی سرخ شعلوں کی لو۔ سڈول ٹانگیں جن کا نازک خم خواب کے نگینے کی گرفت سے باہر نکلا پڑتا تھا اور کمر ایسی نازک اور پتلی جیسی کمر کہ جب رقص کرتے ہوئے بل کھاتی تو اس کے ساتھ تمام کائنات بھی گردش میں آ جاتی۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری ہی سے کیا۔ وہ اسکول اور کالج کے زمانے سے افسانے لکھ رہے ہیں لیکن بوجوہ بحیثیت ایک قلمکار وہ ایک طویل تعطل کا شکار رہے چونکہ فکر ادب کے شناور تھے لہٰذا موقع ملتے ہی بارِ دگر قلم اٹھایا اور مضمون نویسی کے میدان میں کود گئے اور علمی مسائل پر نہایت مفید و کارآمد مضامین لکھ کر خدمت انسانیت کی اپنی روایت کو قائم رکھا۔ ان کا افسانوی مجموعہ "دھنک کا آٹھواں رنگ" دو ایک سال پہلے منظر عام پر آیا ہے، جو اس امر کا دستاویزی ثبوت ہے کہ ڈاکٹر صاحب فنِ افسانہ نگاری کے رمز آشنا ہیں۔ انھیں علم ہے کہ مکالمہ اور منظر نگاری نہ صرف افسانے کی فنی جمالیات میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ بیان کو وسعت دینے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ ڈاکٹر فیروز عالم نے معنی آفریں مکالمہ نگاری اور روح پرور فطرت نگاری سے اپنے افسانے کی ادبی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ کتاب کے پہلے علامتی افسانے "دھنک کا آٹھواں رنگ" میں مادیت اور روحانیت ایسے دقیق اور پیچیدہ فلسفہ ہائے حیات کی جس تمثیل سے انھوں نے تفہیم کرائی ہے وہ یقیناً مکالمہ نگاری کی معراج ہے ــــ "اس نے مجھ سے بڑی بے تکلفی سے "بابا" کہا اور پھر اس کی صحت یابی کے امکانات کے متعلق پوچھنے لگی۔ میں پیشہ ورانہ آداب کے تحت اسے

بچہ لانے سے قاصر تھا۔ اس کے اگلے سوال نے چکرا دیا۔ "ڈاکٹر تم دعاؤں پر اعتقاد رکھتے ہو؟" میں نے کہا "یقیناً" "مگر دعائیں بھی میڈیکل امکانات کے تحت ہی کام کرتی ہیں۔ اگر کوئی چیز میڈیکل لحاظ سے ناممکن ہو تو دعائیں اس پر کیا اثر کریں گی۔" اس نے تیز نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو مجھے تم جیسے ڈاکٹروں سے اختلاف ہے۔ جب میڈیکل لحاظ سے بالکل ناامیدی ہو تبھی تو دعائیں اثر کرتی ہیں۔" محولہ بالا مکالمات میں حسن بیان سے رجائیت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور مصنف نے رجائیت کو دھنک کا آٹھواں رنگ قرار دے کر حسن روحانی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایک اچھا افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انشاپرداز ہونا سونے پر سہاگہ کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے خاص کر منظر نگاری میں انشاپردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ جس شدت سے کہانی کاری کا کام بھرتے ہیں اسی شدت سے حسن فطرت کے شیدا ہیں۔ حسن فطرت میں ان کے انہماک کا یہ عالم ہے کہ جب کسی منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں تو اس کی جزئیات تک بیان کر دیتے ہیں۔ ان کا کمال فن یہ ہے کہ قدرتی مناظر کے دلفریب حسن کا اپنے بیان میں ایسا جادو جگاتے ہیں کہ قارئین کو سیتاپال کی وادی اس فضا میں بھی ایک طرح کی خوشگواری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ہم نے "دھنک کا آٹھواں رنگ" کے دریچوں سے ایک ناول نگار کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر ڈاکٹر صاحب ناول نگاری کی طرف توجہ دیں تو ایک کامیاب ناول نگار بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

◆◆◆

طنز و مزاح

ڈاکٹر بدر منیر

سروس

نہیں ہے زندگی میں اب کوئی بھی پیار اور
نہیں دیوار بن سکتا کوئی بھی زور اور
یہ موبائل ہے، انٹرنیٹ ہے اور یہ فیس بک ہے
دلوں کے بیچ سروس ہے نوٹی فور آور

فیور

مسکرا کر اک نظر ہی دیکھ لیں
حسن والوں سے یہ فیور چاہیے
بیویوں کے مرتبے اپنی جگہ
شاعری کو ایک فیور چاہیے

حسرتِ طعام

دعوت میں کھانا کھاتے اک صاحب نے فرمایا
مرغا بھی میری بیگم نے دال کی طرح پکایا
مرنے کی کوئی چیز بنے، ناممکن ہے یہ ہو پایا
جب بھی اچھا کھانا کھایا باہر ہی سے کھایا

تعریف

اتنی سندر اتنی سگھڑ اتنی زیادہ نیک
رشک مجھے خود پہ آتا ہے کرتا ہوں جب غور
بیگم تیری اس سے زیادہ کیا تعریف کروں
کاش تمہارے جیسی مجھ کو مل جاتی اک اور

اُردو، سرائیکی اور پاکستانی زبانوں میں ہم رشتگی کے پہلو

ڈاکٹر نجیب جمال

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے ایک مضمون "قومی عظمت قومی زبان سے" میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ قومی زبانوں سے علاقائی زبانوں کا کیا رشتہ ہے؟" اور اس رشتے کی کیا اہمیت ہے؟" نہ صرف یہ بلکہ قومی زبانوں کا مسئلہ علاقائی زبانوں کے تعلق سے کس طور پر حل کیا جائے تاکہ قومی کلچر کی تشکیل بروئے کار لائی جا سکے؟" یہ سوال حتمی طور پر پاکستانی کلچر اور تہذیب کی نمود سے متعلق ہے جس کی تلاش دانشوروں کے علاوہ ایک عام پاکستانی کو بھی ہے۔ جہاں تک سماجی عمل، تہذیبی اساس اور ثقافتی طرزِ احساس کا تعلق ہے دنیا بھر کی وہ زبانیں جو اس خطے کے اجتماعی لاشعور کی نمائندہ رہی ہیں، کا کردار اس علاقے میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، علمی اور ادبی سطح پر نہ صرف بنیادی بلکہ مرکزی رہا ہے۔ دنیا میں ایسی زبانیں بھی ملتی ہیں جنھوں نے کسی ملک و قوم کے تشخص اور اس کے ظاہری و باطنی اوصاف کو متعین کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور یہی نہیں بلکہ اس خطے کی دیگر علاقائی زبانوں اور بولیوں کے ساتھ مل کر ایک ایسے تال میل کو جنم دیا جس نے تہذیبی وحدت کو پختگی عطا کی۔ اس اعتبار سے اگر ہم زبانِ اردو کی تاریخ، روایت، مزاج اور سماجی عمل کو دیکھیں تو ماضی میں اور پھر اب زمانۂ حال میں اس کے میل ملاپ کی جو صورتیں دکھائی دیتی ہیں ان سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چاہے ہم اسے لشکری زبان سمجھیں، گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ جانیں، سندھ میں عربوں کی آمد سے تین ہزار سال پہلے سے رائج لفظ "اردو" کے معنوں میں روزانہ بول چال میں بہت سی زبانوں کے جمع ہونے کی علامت مانیں، [illegible] کے مطابق اردو بھی دونوں کو ملانے والی گویا ہندو مسلم تہذیب کے ملاپ کی نشانی کہیں، ہر حال ہر اعتبار سے یہ زبان نہ صرف ان سب نقوش رکھتی ہے بلکہ برصغیر کی تاریخ میں کئی مواقع پر اس نے یادگار اور حتمی کردار ادا کیا ہے اس کی حکایت مختصراً کچھ یوں بیان کی جا سکتی ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں محمد بن تغلق نے جب ایک لاکھ لشکریوں کو کوچ کا حکم دے کر دولت آباد (دکن) کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا تو یہ لوگ اپنے ساتھ اس زبان کا تحفہ بھی لے گئے جو قطب الدین ایبک کے زمانے میں پنجاب کے بجائے دلی کو پایۂ تخت قرار دینے کے بعد تیزی سے ایک نئی زبان کے طور پر ظاہر ہو چکی تھی اور پورے برصغیر میں مقامی بولیوں کے زیرِ اثر جدید ہند آریائی کی شکل میں موجود تھی۔ محمد بن تغلق کے لشکری زبان کو سرزمینِ دکن نے فاتحین کی تہذیب، ثقافت، تمدن اور زبان کو قبول کرنے کے اصول کے تحت سر آنکھوں پر بٹھایا اور جب مغل عہدِ حکومت میں دکن میں آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں تو ان ریاستوں میں گولکنڈہ اور بیجاپور کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی ان کے قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں نے اسی زبان کو ترقی دے کر اس کی باقاعدہ سرپرستی کر کے اور اسے علمی و ادبی سطح پر فروغ دے کر ایک وفاقی تہذیبی مسار کی حیثیت دی اور اس زبان میں بطورِ خاص ایسے جنگ نامے لکھوائے جن سے مقامی آبادی میں جذبۂ حب الوطنی کو ابھارا جا سکے اور بوقتِ ضرورت انھیں حملہ آوروں کے خلاف ایک مضبوط فصیل کی طرح کھڑا کیا جا سکے۔ ان کے بعد ہی امر واقعہ

میں دکن کی ریاستوں نے اردو زبان کے ذریعے دیسی کلچر کو ایسی بلندی تک پہنچا دیا کہ پھر کوئی طالع آزما اس تہذیبی وحدت کی یک جہتی کی فصیل میں دراڑ نہ ڈال سکا۔ اسی تہذیبی یک جہتی نے مغلوں کی دکن پالیسی اور ان کے جارحانہ عزائم کو خاک میں ملائے رکھا اور اورنگ زیب جیسا طاقتور حکمران بھی دکن میں خاک چاٹتا ہوا دکھائی دیا اور اس کی سلطنت کی بنیادیں اس کد و کاوش میں ایسی کھوکھلی ہوئیں کہ پوری مغلیہ سلطنت لڑکھڑا گئی اور زوال پذیر ہوگئی۔

انگریزوں کی ہوسِ ملک گیری اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہی جب تک انہوں نے 1800ء میں لارڈ ویلزلی کی پُر زور سفارش کے باعث کلکتہ فورٹ ولیم کی شکل میں ایک ایسا کالج قائم نہیں کر لیا جس میں نو وارد انگریز افسروں کو ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، رسوم و رواج اور علوم و فنون سے واقف کرنے کی تربیت دی جائے گی۔

1857ء کے بعد بھی انگریز یہ سمجھتے تھے کہ برصغیر میں فارسی زبان تہذیبی غلبہ رکھتی ہے اور مسلم حکمرانوں کے دورِ عروج کی یادگار و مددگار رہی ہے جب تک اس زبان کا تہذیبی سکہ رائج رہے گا اس وقت تک لوگوں کے دل و دماغ میں عظمتِ رفتہ کا نقش بھی قائم رہے گا۔ یہاں پر ان کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ فارسی زبان کے تہذیبی تسلط کو ختم کرنے کے لیے اردو کی سرپرستی کی جائے جو اپنی اصل میں دیسی زبان تھی اور ایک نئے تہذیبی شیرازے کو قائم رکھ سکتی تھی اور اردو نے ایسا کر دکھایا۔ 4مارچ 1898ء میں یوپی کے گورنر انٹونی میکڈانل کو عدالتوں اور دفتروں میں ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کے اجرا کے بارے میں عرض داشت پیش کی گئی تو اس نے اردو کی دفتری حیثیت کو ختم کرنے کے علاوہ ناگری رسم الخط کو جاری کرنے سے متعلق 18 اپریل 1900ء کو ایک حکم نامہ جاری کر دیا۔ ان حالات میں ہندو مسلم ایکتا کو سخت جھٹکا لگا یوں برصغیر کے مسلمانوں نے اردو سے عہد وفا باندھا اور اپنے عشق میں ایسے بے باک ہوئے کہ بالآخر آزادی کی محبوبہ نے اپنے آپ کو ان عشاق کے قدموں میں ڈال دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد اردو کو ایک ارضِ وطن میسر آگئی شاید اسی لیے اس کا تعلق خالصتاً پاکستانی علاقوں اور زبانوں سے قائم کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اب تک تو یہی تصور موجود رہا تھا کہ اردو جدید ہند آریائی زبان ہے اور آریاؤں کی آمد کے بعد مختلف ویدک بولیوں اور پراکرتوں کی شکل میں ترقی کر کے پہلے پالی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور پھر جدید ہند آریائی زبانوں میں سے ہریانی اور کھڑی بولی کی کوکھ سے پیدا ہوئی۔ اس نظریے کے حامیوں میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، مسعود حسن خان، شوکت سبزواری، محی الدین قادری زور اور پروفیسر چٹرجی نمایاں ہیں۔ ان محققین کے مطابق قدیم اردو کا آغاز جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ 1000 عیسوی میں اس وقت ہوا جب مسلمان حکمران یہاں فارسی زبان بولتے ہوئے آئے اور متوازی طور پر صوفیائے کرام نے یہاں دین و اخلاق کی تعلیم دی۔ اسی کے متوازی ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا گیا کہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی کی طرح اردو زبان بھی سندھ اور وادیٔ سندھ کی زبان کا تسلسل ہے اور خالصتاً پاکستانی علاقوں کی زبان ہے اور یہ اس کا خود اختیار کردہ وطن نہیں ہے بلکہ اس کی اصل جنم بھومی ہے۔ اس نظریے کو عین الدین فرید کوٹی نے اپنی تصنیف ''اردو زبان کی قدیم تاریخ'' میں بڑے شد و مد سے پیش کیا۔ یہیں سے اردو زبان کے ایک نئے تسلسل اور کردار کی بحث چھڑ جاتی ہے۔ اور ہمارے بہت سے دوستوں کا خیال ہے کہ اب پاکستان ہی اردو کا محور و مرکز ہے اس کے علمی و ادبی سطح پر کردار اور پہچان کا تعین بھی یہیں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دنیا بھر میں اردو کی موجودگی اور اس کے بولے جانے کی صلاحیت کا اردو کی بقا اور اس کے شاندار مستقبل

سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اس کے ہونے کا مثبت پہلو تو ہو سکتا ہے مگر اس کی بجائے علم و ادب کی صورت میں اس کے ذخیرہ ہونے کا معاملہ صرف اور صرف پاکستان کا ہے۔ باقی دنیا اس حوالے سے لاتعلق ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیرون ملک لوگ شاید سو فی صد اردو بولتے ہیں مگر اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کے بجائے وہ اپنے بچوں کو انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور ہسپانوی زبانیں سکھانے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ گویا اس صورت حال میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے اٹھائے ہوئے سوال اور بھی بامعنی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے پاکستان کی چند بڑی علاقائی زبانوں سے اس کا رشتہ اور اس کی نوعیت اور مشترکہ قومی کلچر کی نمو میں اس کے کردار کی بحث زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے کیوں کہ اس اہم رشتے اور اس بندھن کی مضبوطی کے زور پر ہی آنے والے کل میں نہ صرف تہذیبی زندگی میں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا بلکہ یہ بھی کہ کیا یہ زبان علمی و ادبی اظہار اس سطح پر کر سکے گی کہ بیرونی دنیا میں رہنے والے اردو زبان سے آشنا لوگ اسے اپنے بچوں کو علمی سطح پر سکھنے میں دل چسپی لیں گے۔ اس حوالے سے اب ہم اردو اور پاکستانی زبانوں کی اہم رشتے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

(2)

سب جانتے ہیں کہ "پنجاب میں اردو" کے مولف پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے پنجاب کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔ ان کا یہ جملہ بطور خاص توجہ طلب ہے کہ "اردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت رکھتی ہے۔" دسویں صدی کے مورخ مسعودی نے اسے "ملتانی" کے نام سے یاد کیا۔ (پاکستانی زبانیں مشترک لسانی و ادبی ورثہ، مرتبہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید، عبداللہ جان عابد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2001ء، ص 12) اور "ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں جب اس زبان کا تذکرہ کیا تو اس کے لیے "ملتانی" کا لفظ استعمال۔" (ص 13) شاید اسی بنیاد پر سرائیکی زبان کے دانش ور اب پنجابی کے بجائے سرائیکی زبان کو اردو کی اصل قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے ان کے پاس ایک نہیں بہت سی دلیلیں موجود ہیں۔ (1) ڈاکٹر مہر عبدالحق نے "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ اردو کی عمارت سرائیکی زبان کی بنیاد پر استوار ہے۔ (2) محمود غزنوی کی گزرگاہ اور پڑاؤ ملتان رہا۔ (3) محمد تغلق کے لشکر میں (ذکر پہلے آ چکا ہے) ہزاروں کی تعداد میں سرائیکی علاقے کے سپاہی دولت آباد دکن گئے۔ (4) ملتان کے پاس آم اور چمڑے کی مشہور منڈی تھی جہاں افغان یہاں آ کر گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ (5) ملتان دو ہزار سال سے پہلے ایران اور سندھ کا حصہ تھا۔ افغان اور سکھ بھی یہاں حکمران رہے جو کہ لسانی اشتراک کا سبب ہے۔ (6) ملتان اور لکھنو مرثیے کے قدیم مراکز میں ملتانی مرثیے کو اولیت حاصل ہے۔ (7) ملتان صوفیائے کرام کا مرکز رہا۔ (8) ہاکڑا تہذیب کو دنیا کی قدیم تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ موہن جو داڑو کے مشرق میں یہ دریا بہتا تھا جس کے قریب آثار قدیمہ اور مینارے جنھیں ستار کہا جاتا ہے آج بھی موجود ہیں۔ (9) ملتان کی تہذیب ایران و ہند کے درمیان آمد و رفت اور رابطے کا باعث تھی۔ (10) "مہابھارت" کا مصنف بیاس بھی ملتانی تھا۔ مہابھارت میں سرائیکی الفاظ موجود ہیں۔ (11) سکندر اعظم بھی اس خطے میں وارد ہوا تھا۔ اوچ ریاست کی والی اوشا بسنت جو ایرانی دارا خاندان کے حکمران کی بیٹی تھی اپنی فوج کے ساتھ اس نے میدان کارزار میں دو دو ہاتھ کیے۔ (12) محمد تغلق بھی ملتان کے راستے دہلی گیا۔ ملتان میں پٹھان، مغل، کواتی، علی زئی اور سدوزئی اسی وجہ سے آباد ہیں۔ (13) ذکر مثنویوں اور داستانوں پر سرائیکی الفاظ کا غلبہ دکھائی دیتا

ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ احمد کے بقول "ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" دریافت کی ہے جو سرائیکی لفظوں کی کان" اسی طرح ملا وجہی کی ''سب رس'' کا مطالعہ کیا جائے تو سرائیکی کے سینکڑوں الفاظ کی موجودگی کا پتا چلتا ہے صرف ایک جملہ دیکھیے: ''موں بولیا'' آج لگن اس جہان میں اس ہندوستان میں ہندی زبان سوں، اس چندراں سوں اس خوبی سوں، گلا کر ملا کریں بولا۔" ڈاکٹر یحییٰ احمد کے خیال میں ساٹھ فی صد الفاظ سرائیکی اور اردو میں ایک ہی ہیں مثلاً ست، ساجن، ڈھلا، درخت، عزا، مروڑ، ال، مٹھ، پینگھ، لوٹا، کوزا، کپڑا، چتی، قرض، سمیں وغیرہ محاوراتی اشتراک کی مثالیں ایسی جن سے ڈاکٹر یحییٰ احمد کے خیال میں ظاہر ہوتا ہے کہ ''اردو نے محاورات کا خزانہ زیادہ تر سرائیکی سے لیا ہے چند محاورے ملاحظہ ہوں مثلاً پر پچھاڑنا'' پچھاوا س پوون'' پیر بادھنا'' پیر دھن'' پگڑی بولنا'' ٹپک وڈاون'' ٹھوک جانا'' تھک گئن'' تقدیر جاگنا'' مقدر جاگن۔'' اسی طرح ہوا کے الفاظ کھیلوں کے نام دکانوں کے قریب قریب کم وبیش ایک سے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول "امیر خسرو بھی سرائیکی جانتے تھے کیوں کہ ان کی پہیلیوں میں سرائیکی زبان کے الفاظ استعمال ہوئے۔" (ص 278) اپنے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں "اردو زبان کا ماخذ سرائیکی علاقے میں تلاش کیا جائے اس لیے کہ سرائیکی صدیوں پرانی زبان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس نے اردو کی پیدائش کی۔" (279) سطور بالا میں مرثیے کی تخلیق کے حوالے سے لکھنؤ اور ملتان میں اشتراک عمل کا ذکر کیا گیا اسی ذیل میں راقم نے عشرہ محرم کے ایام میں خود مشاہدہ کیا ہے کہ ملتان میں نہ صرف استاد وشاگرد کا تقریبی جو برصغیر میں مشہور ہے اور انفرادیت رکھتا ہے بلکہ اندرون ملتان میں ان دنوں خصوصی طور پر لٹھ گھمانا، گتکا کھیلنا، لکڑی کی تلواروں سے شمشیر زنی کے جوہر دکھانا اور عہد کے فن کا مظاہرہ کرنا اسی طرح باقاعدگی سے ہوتا ہے جس طرح سو سال پہلے تک لکھنؤ میں رائج تھا گویا ایران اور ہند کے درمیان پلنے والی اس تہذیب نے زبان کی سطح پر ہی نہیں فنون کی سطح پر بھی حسن اشتراک پیدا کیے رکھا۔ شیخ محمد اکرم نے آب کوثر میں لکھا ہے "حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری لاہور سے ہندوستان کی طرف جانے لگے تو آپ ملتان تشریف لے گئے جہاں طویل قیام کر کے مقامی زبان میں مہارت حاصل کی اس کے بعد دہلی آئے۔" پروفیسر شوکت مغل نے اپنی کتاب "قدیم اردو لغت اور سرائیکی زبان میں ولی، میر، درد، میر حسن، میر امن، نہال چند لاہوری اور انشاء اللہ خان انشا" کے علاوہ غلطوط غالب سے سرائیکی الفاظ الگ کر دیے ہیں ولی دکنی نے تو لفظ ''سجن'' کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔

اگر آج کے حوالے سے دیکھیں تو تحریک پاکستان، ترقی پسند تحریک، انسان دوستی، تصوف، حمد، نعت، غزل، نظم، منقبت اور مرثیے میں سرائیکی شعراء مسلسل طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق سرائیکی میں لکھا گیا ایک ''نور نامہ'' جس کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چل سکا 1054ھ کی تصنیف ہے۔ موجودہ دور میں'' رفیق خاور جس کا قومی حسن رضا گردیزی مرحوم، اقبال سوکڑی، عاشق بزدار، اشولال، رفعت عباس، ارشاد تونسوی، عزیز شاہد، نصر اللہ خان ناصر، جہانگیر مخلص اور شاکر شجاع آبادی کے ہاں نئے دور کا شعور اور احساس نئے حوالوں سے آتا ہے۔ اساطیری حوالے اور ترقی پسند رجحانات ان کی شاعری کی اساس ہے۔ ان کے ہاں مزاحمتی اور احتجاجی لب ولہجہ بڑے اعتماد سے ابھرتا ہے۔ ''نثری اصناف میں افسانہ اور ناول اگرچہ زیادہ تر اردو کے زیر اثر لکھا گیا ہے تاہم بلوغ ان افسانوں اور ناولوں میں خصوصیت کا حامل ہے۔ عامر فہیم، احسن واگھا، حفیظ خان، مسرت کلانچوی، رفعت رحمانی، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر اسلم عزیز درانی اور حبیب فائق وہ نام ہیں جنھوں نے سرائیکی افسانے کو اعتبار دیا ہے۔ ناولوں میں تاریخ (ظفر لاشاری) پچھوایاں (محمد اسماعیل احمدانی) پہچان (ظفر

(انصاری)، سارے سکھ سہاگ کرے (دلشاد کلانچوی)، بھاگ سہاگ (غلام حسین راہی گیلانی)، ساتوں موز مہاراں (اقبال بانو)، جھوکاں تھیسن آباد ول (جمشید کلانچوی)، ہیڑی وچ دریا (ڈاکٹر اسلم انصاری)، کے ناول میں بھی تکنیک، کہانی بیان کرنے کے انداز اور واقعات کی رو کے اعتبار سے اردو سے متاثر ہیں۔ اردو اور دیگر جیسے سرائیکی ٹی وی ڈراموں کی وجہ سے اب ڈرامہ نگاری کی طرف بھی توجہ ہوئی ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ احمد نے اپنے مضمون میں ایک بہت اہم نکتہ اٹھایا ہے کہ ”لفظوں کی کھوج میں جہاں تہذیبی، تاریخی، معاشرتی اور معاشی گتھیاں سلجھتی ہیں وہاں مشترکہ تہذیبی رشتے بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔“ ص (609) اگر انصاف کے ترازو میں تولا جائے تو عیاں ہوگا کہ اردو سرائیکی کا رشتہ ہو یا اردو پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو کا تعلق یہ سب زبانیں اب مشترکہ تہذیبی رشتے کے بندھن میں بندھ چکی ہیں۔ جدید سرائیکی کے الفاظ جیسے اردو ہی ہو گئے اب اردو کے لسانی مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ اسی طرح پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو کے ہزاروں الفاظ اردو کے دامن میں اپنی اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ یوں اردو کے الفاظ مجموعی طور پر پاکستان کا بند سے عبور کر چکے ہیں دیکھا جائے تو پاکستانی زبانوں نے ہم رشتگی کے عمل میں جو تیزی پیدا کی ہے اس کی وجہ سے ان زبانوں نے صرف لفظی سطح پر اردو کے پاٹ کو وسیع نہیں کیا بلکہ مشترکہ تہذیبی عمل کو پیدا کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم خود اجتماعی طرز عمل اور طرز فکر سے مبرا ہونے کی کاوش مسلسل کر رہے ہیں جس درخت پر آشیانہ ہے ہم اسی کی مضبوط شاخوں پر بے رخی، بے گانگی اور بے اتفاقی کے آرے چلا رہے ہیں اور اس حقیقت سے غافل ہیں کہ اردو اور تمام صوبے کی زبانیں ایک دوسرے میں اس طرح پیوستہ ہو چکی ہیں کہ من تو شدم تو من شدی جیسا معاملہ صورت پکڑ چکا ہے۔ اسی مشترکہ تہذیبی رشتے کو بنیاد بنا کر زندہ رہنے اور ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا جواز پیدا کیا جا سکتا ہے۔

(3)

یہ امر واقعہ ہے کہ اردو زبان نے کبھی اپنی ریاست عالیہ کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہ تو ہمیشہ سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے اور اب صورت یہ ہے کہ یہ اپنے گھر میں خوش تو ہے لیکن ہمارے اجتماعی طرز احساس خصوصاً ہمارے پالیسی سازوں کی سرد مہری کی وجہ سے مطمئن نہیں ہے۔ چناں چہ یہ حقیقت اب تسلیم کر لینی چاہیے کہ اردو کے ساتھ ساتھ دیگر تمام زبانوں کی خود مختاری وقت کی ضرورت ہے۔ ان زبانوں کی طرح پاکستان کے صوبوں کے لوگوں اور ان کی خواہشات اور تقاضوں کو نظر انداز کرنے کی پالیسی تبدیل کرنا بھی ضروری ہے۔ زبانوں کے مزاج کی طرح لوگوں کے مزاج کو سمجھنا بھی لازم ہے۔ انہیں ان کی خواہشات کے مطابق ملکی معاملات میں آزادی اور خود مختاری دینی ہوگی اور انہیں ایک رشتے میں پرونے کے لیے لسانی اور انتظامی حوالے سے کچھ ایسے اقدامات کرنے ہوں گے جس سے یہ زبانیں اور پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر آ سکیں۔ اس کے لیے فوری طور پر مدارس کی سطح پر کسی بھی ایک صوبے میں دوسرے صوبے کی زبان کی تدریس کر کے دوری کو قربت میں بدلنے کا سامان کیا جا سکتا ہے۔ میڈیکل، انجینئرنگ، ایگری کلچر، مینجمنٹ، کامرس، بائیو ٹیکنالوجی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں مختلف صوبوں کے طالب علموں کے لیے یونیورسٹی اور کالجوں میں کوٹہ بڑھا کر ثقافتی وفود کے تبادلے کر کے، صوبوں کی مصنوعات اور دستکاریوں کی پذیرائی کر کے، اردو اور علاقائی زبانوں کے مشترکہ مشاعروں کے ذریعے تہذیبی یک جہتی کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔

◆◆◆

عمارت کی سرگذشت

......1......

ڈاکٹر جواز جعفری

فنِ تعمیر، معماری کا لفظ عربی زبان کے لفظ عمر سے مشتق ہے۔ کثیر الجہات اس لفظ کے ایک معنی رہائش، سکونت یا رہنے کے ہیں۔ اسی لفظ سے عمارت کا لفظ نکلا ہے یعنی وہ جگہ جہاں رہائش اختیار کی جا سکے۔ اسی سے لفظ معمار بنا ہے جس کے معانی ہیں عمارت بنانے والا۔ معماری یا آرکیٹیکچر ایک کثیر المفہوم اصطلاح ہے جس سے مراد عمارت سازی کا عمل یا اسلوب ہے۔ اس سے مراد عمارت کی ساخت اور فنِ تعمیر بطور پیشہ بھی ہے۔ یہ سارے مفاہیم معماری کے قریب تر ہیں۔ اس کا اطلاق کسی شے کی تصوراتی تشکیل و ساخت پر بھی کیا جا سکتا ہے جیسے ریاضیاتی معماری سے مراد علم ریاضیات کا ڈھانچہ یا نظام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح مذہبی ادب میں روح کی معماری سے مراد تزکیۂ نفس ہے جبکہ قوم کی معماری سے مراد معاشرتی اصلاح و ترقی لی جاتی ہے۔ عمارت یا بلڈنگ ایک ایسا ڈھانچہ ہے جس کی چھت اور دیواریں زیادہ سے زیادہ دیر تک ایک جگہ کھڑی رہیں۔ عمارتوں کی اقسام، اشکال اور افعال مختلف ہوتے ہیں اور یہ انسان کی کئی طرح کی ضرورتوں (آرام، تحفظ، رازداری اور رہائش) کو پورا کرتی ہیں۔ بعض مورخین کے مطابق عمارت کا تصور گزشتہ اٹھارہ ہزار سال سے چلا آ رہا ہے۔ نیولیتھک عہد (پتھر کا جدید دور) میں عمارات زندگی کے معمول کا حصہ بن گئی تھیں مگر ان عمارتوں میں جھانکنے سے پہلے ہمیں اپنے ان اجداد کی زندگیوں کا سرسری مطالعہ کرنا ہوگا کہ وہ درختوں سے اتر کر ان عمارتوں تک کیسے پہنچے؟

ماہرینِ حیاتیات کا خیال ہے کہ جدید انسان پچیس لاکھ سال پہلے دوسرے جانوروں کے ساتھ زمین پر پیدا ہوا۔ ہمارے قریبی عزیزوں میں بوزنے، بن مانس اور گوریلے شامل ہیں۔ انہی میں کچھ انسانی گروہ سرزمین چھوڑ کر شمالی افریقہ، شمالی یورپ اور ایشیا کے وسیع میدانوں میں آباد ہونے کے لیے روانہ ہوئے۔ دس سال پہلے تک زمین پر انسانوں کی کم از کم پانچ انواع آباد تھیں جن میں نینڈرتھل، ہومو اریکٹس، ہومو روڈولفینسس، ہومو ارگاسٹر اور ہومو کوہن شامل ہیں۔ ان میں سے آخری انسانی نوع یعنی باقی انواع کا بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا اور پورے سیارے پر پھیل گئے۔ ہم نے ابتدائی اوزار اڑھائی سال پہلے ایجاد کر لیے تھے۔ چار لاکھ سال پہلے انسان نے بڑے جانوروں کا شکار شروع کیا۔ اس عروج کی طرف بڑھنے میں آگ نے نہایت بنیادی کردار ادا کیا۔ ماحولیات کے ماہرین کا کہنا ہے کچھ انسانی انواع آٹھ لاکھ سال پہلے سے آگ کا استعمال کر رہی تھیں البتہ ہمارے اجداد تین لاکھ سال قبل روزانہ کی بنیاد پر آگ سے استفادہ کر رہے تھے۔ ہماری زندگیوں میں ستر سے چالیس ہزار سال کا زمانہ فیصلہ کن سمجھا جاتا ہے کیونکہ جدید انسان اسی عرصے میں وجود میں آیا۔ یہ انسان کشتی، سوئیاں، چراغ اور زبان ایجاد کر چکا تھا۔ جدید انسان کو موجودہ مقام تک پہنچانے میں تین انقلابات نے کلیدی کردار ادا کیا۔ (I) ستر ہزار سال پہلے شروع ہونے والا ادراکی انقلاب (II) بارہ ہزار سال قبل شروع ہونے

والا زرعی انقلاب جس نے اس کے طرزِ زندگی کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ (iii) پانچ سو سال پہلے آغاز کرنے والا سائنسی انقلاب جو اس کی موجودہ طرزِ زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

زرعی انقلاب سے پہلے تک اس سیارے کی کل آبادی آج کے لاہور سے بھی کم تھی۔ انسان نے گھر بنا کر رہنا شروع نہ کیا تھا اس لیے فنِ تعمیر ابھی بہت دور کی بات ہے۔ اس زمانے کے انسان کی زندگی صرف خوراک کی تلاش کے گرد گھومتی تھی اور یہ تلاش بدلتے موسموں، حیوانوں کی سالانہ ہجرت، پودوں اور بیلوں کی نمو کے تسلسل پر منحصر تھی۔ قدرتی آفات، جنگیں، شکار کی ہجرت، وبا یا کسی مقناطیسی شخصیت کا اکسانا، اس نقل مکانی کا محرک ہو سکتا تھا۔ اسی میں انسان مخصوص علاقوں سے نقل کر کے علاقوں میں منتقل ہوا اور یہی دور اس سیارے پر انسانی ترقی کا باعث بنا۔ غذا کی تلاش اسے مختلف علاقوں میں لیے لیے پھرتی اور کسی علاقے میں غذائی بہتات میسر آنے کی صورت میں وہ وہاں مستقل طور پر بھی آباد ہو جاتا۔ غذا کو سکھانے، دھوئیں اور برف میں محفوظ کرنے کے طریقوں کی دریافت نے طویل المدتی قیام میں مدد دی۔ سمندر اور دریاؤں کے کنارے جہاں آبی غذا کی بہتات تھی وہاں انسان نے مستقل آبادیاں قائم کر لیں، یہ زرعی انقلاب سے پہلے کے اولین دیہات تھے۔ انڈونیشیا کے ساحلی علاقوں میں ایسی آبادیاں پینتالیس ہزار سال پہلے قائم ہو چکی تھیں مگر انسان کی زندگی میں اصل انقلاب بارہ ہزار سال پہلے آیا جب اس نے بہت سے پودوں اور جانوروں میں سے چند ایک کا انتخاب کیا اور زمین سے وابستہ ہو گیا۔ زراعت دنیا میں ایک ساتھ شروع ہوئی، پہلی صدی عیسوی آتے آتے بیشتر انسانی آبادی کاشت کار بن چکی تھی۔ زرعی انقلاب مشرقِ وسطیٰ، امریکہ اور چین میں بیک وقت شروع ہوا کیونکہ کھیتی باڑی میں مدد دینے والے جانور انہی علاقوں میں دستیاب تھے۔ گندم جو چند ہزار سال پہلے مشرقِ وسطیٰ کی گھاس کی بہت سی اقسام میں سے ایک تھی آج دنیا بھر میں بائیس لاکھ پچاس ہزار مربع کلومیٹر پر کاشت ہو رہی ہے۔ غذائی فراوانی نے آبادی میں اضافہ کیا تو نئی آبادیوں کا قیام لازمی ٹھہرا۔ اریحا (مشرقِ وسطیٰ) انہی ابتدائی انسانی آبادیوں میں سے ایک ہے۔ آج سے بارہ ہزار سال قبل زراعت کی طرف منتقل ہونے سے پہلے زمین پر اٹھارہ لاکھ خانہ بدوش موجود تھے جو پہلی صدی عیسوی آتے آتے دس لاکھ رہ گئے۔ اب انسان ہجرت کو ترک کر کے مستقل طور پر گھر بنا کر ان میں آباد ہو گیا تھا۔ مگر ٹھہریے ذرا رک کر سوچیے کہ زمین پر مستقل طور پر آباد ہونے سے پہلے انسان کا گھر کے بارے میں تصور کیا تھا؟ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اس سے قبل انسان گھر بنا کر ایک جگہ آباد ہونے کے تصور ہی سے نا آشنا تھا۔ مستقل طور پر آباد ہو جانے کا تصور اس میں خود کفالت اور دوسروں کی محنت پر زندگی بسر کرنے کا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

اس سے قبل انسان نے طاقتور جانوروں کے خوف سے ہزاروں برس تک درختوں پر پناہ لیے رکھی۔ اس کی خوراک، آرام، تحفظ اور رہائش سب کچھ درختوں سے متعلق تھا۔ طویل برف باری کے نتیجے میں وہ درختوں سے اتر کر غاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ زندہ رہنے کے لیے اس نے نباتات کے ساتھ ساتھ جانوروں کا شکار شروع کیا۔ شکار کے دوران وہ سینکڑوں میل روزانہ چلتا اور ہزاروں میل سالانہ سفر کرتا تھا۔ اس نے غار کو اپنے نئے گھر کے طور پر پہچان لیا تھا مگر اس گھر کو بنانے اور اس کی آرائش میں اس کا کوئی کردار نہیں تھا البتہ غار میں منتقل ہونے کے بعد وہ ہزاروں سال کے دوران پہلی بار زمین پر شانہ ٹکا کر سویا تھا۔ جس زمانے میں آج کا جدید انسان غار میں رہائش پذیر تھا اسی عہد میں اس کے قریبی عزیز (بونے) جھونپڑے بنا کر رہتے تھے۔ جانوروں کی کھالوں اور

گھاس پھونس سے بنے یہ جھونپڑے انسانی کاوش سے بنے اولین گھر تھے۔ زرعی عہد آنے تک یہی جھونپڑے دریاؤں کے کنارے اولین آبادیوں میں تبدیل ہو گئے۔ شکار کے عہد کا انسان گھر بناتا تو دور کی بات ہے وہ تو ایک جگہ جم کر بیٹھنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

انسان کی سماجی تاریخ پر نظر رکھنے والے بعض روسی مؤرخین کا کہنا ہے کہ ابتدائی کاشت کاروں کے گھر مٹی اور گارے سے بنائے گئے تھے کیونکہ وادیٔ دجلہ و فرات کے ارد گرد یہ چیز بکثرت موجود تھی۔ انسانوں کے یہ ابتدائی گھر دائروی شکل کے تھے۔ ان کی ہیئت آج سے پچاس سال پہلے تک پنجاب کے دیہاتوں میں بھوسہ محفوظ کرنے کے لیے بنائے جانے والے موسل جیسی تھی۔ یہ گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل ہوتا تھا اور آپ کو ان کر حیرانی ہوگی کہ اس گھر کی چھت تک نہیں ہوتی تھی۔ نیچے کی طرف یہ گھر کافی کشادہ ہوتا مگر اوپر کی جانب یہ تنگ ہوتا چلا جاتا تھا۔ یہاں کر آپ کو ایک اور جھٹکا لگے گا کہ اس گھر کا دروازہ تک نہیں تھا تو کیا اس گھر کے مکین کھڑکی کے راستے اس میں داخل ہوتے تھے؟ نہیں جناب! کھڑکیاں اور روشن دان تو ابھی صدیوں بعد کی باتیں ہیں۔ اس گھر میں دروازہ، کھڑکی، روشن دان اور چھت تک نہ تھی تو اس کے مکین اس میں داخل کیسے ہوتے تھے؟ یہ ایک راز ہے جس کا ہم آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جی ہاں اس گھر میں داخل ہونے کے لیے ایک سیڑھی کے ذریعے اس کے اندر کودنا پڑتا تھا۔ یہ ابتدائی گھر انسان نے اپنے تخیل کی مدد سے ڈیزائن کیا تھا۔ انسان سارا دن کھیتی باڑی کے کاموں میں مصروف رہتا اور رات ہونے سے پہلے اپنے دشمنوں (جن میں انسان اور درندے دونوں شامل تھے) سے بچنے کے لیے اس گھر میں محصور ہو جاتا اور صبح ہونے پر لکڑی کی سیڑھی لگا کر باہر نکل آتا۔ آپ سوچیں گے کہ یہ کیسے گھر تھے؟ لیکن ذرا غور کرنے پر پتہ چلے گا کہ آج سے بارہ چودہ ہزار سال پہلے کے انسان نے گھر کا جو ابتدائی ماڈل دیا تھا ہمارے موجودہ گھر اس سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ آج بھی ہمارے گھر مٹی اور گارے ہی سے تیار کیے جاتے ہیں، البتہ کچی اینٹ کو پکا کر اسے قدرے مضبوط بنا لیا گیا ہے۔ آنے والے دنوں میں قدیم انسانوں نے اس میں دروازے کا اضافہ کر کے اوپر سے خالی مکان پر چھت ڈال دی۔ یہ دونوں کام اس زمانے میں لکڑی کی مدد سے کیے گئے اور آج بھی ہمارے بیشتر مکانوں کے دروازوں اور چھتوں میں لکڑی ہی استعمال ہوتی ہے۔ آنے والے دنوں میں تازہ ہوا اور روشنی کے لیے قدیم انسان نے اپنے گھر میں کھڑکی اور روشن دان کا اضافہ کیا اور مزید آگے چل کر اس گھر میں صحن، چار دیواری اور کمروں کا اضافہ دیکھنے میں آیا اور رہی سیڑھی تو آنے والے دنوں میں اسے بھی تعمیر کا مستقل حصہ بنا دیا گیا۔ دیکھا جائے تو ہم نے گھر کے اس ڈیزائن میں چند سہولتوں کے علاوہ بنیادی نوعیت کا کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں کیا۔ زرعی انقلاب سے پہلے انسان کا گھر فلک بوس پہاڑوں، تازہ پانی کے چشموں، تاحدِ نظر پھیلے سنہری میدانوں، ہرے بھرے جنگلوں اور سر پر پھیلے نیلگوں آسمان پر مشتمل تھا مگر کاشت کار بننے کے بعد اس کا گھر چند کھیتوں اور چھوٹی سی چار دیواری میں سمٹ آیا۔ اس کی نئی گھریلو زندگی کھیتی باڑی کے چند اوزار اور مٹی کی ایک عمارت تھی جس کے آنے والے دنوں میں فنِ تعمیر پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

عمارت سازی دراصل قدرت کی بنائی ہوئی اس وسیع و عریض کائنات کے متوازی اپنی تعمیر کردہ مصنوعی کائنات تعمیر کرنے کی کوشش کا اظہار ہے۔ آپ اسے انسان کا ایک وجودی رویہ کہہ سکتے ہیں (جس کے ذریعے وہ اس بے معنی و بے مقصد کائنات کو بامعنی بنانے کی کوشش کر رہا ہے) مگر خدا کی بنائی اس کائنات کے مقابلے میں انسان کی تعمیر کردہ کائنات کم کشادہ اور زیادہ وقتی ہے لیکن ہر عہد

کا انسان اپنی اس فانی کائنات کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کوششیں کرتا آیا ہے۔ اس نے ہر عہد میں اپنی عمارتوں کے ڈیزائن کو بہتر، کثیر الفوائد اور مضبوط بنایا اور زیادہ سے زیادہ سہولتوں سے انھیں مزین کیا۔ قدیم عراق کے لوگوں نے اینٹوں کو پکانے کا فن ایجاد کیا تو پُر آسائش عمارتوں کی تعمیر کا خواب پورا ہونے لگا مگر یہ عیاشی صرف بادشاہوں اور امرا تک محدود تھی۔ عمارتوں میں سیوریج اور پانی ذخیرہ کرنے کی سہولتوں کا اضافہ ہوا تو قلعوں اور محلوں کے تصورات سامنے آئے۔ ان عمارتوں میں باغات، قید خانوں، سیوریج کے نظام اور زیر زمین کے گھروں کا اضافہ ہونے لگا۔ حملے کی صورت میں پانی اور خوراک کا ذخیرہ کیا جانا بھی اس پروجیکٹ کا حصہ قرار پایا۔ مزید آگے چل کر مضبوط دروازوں اور بلند فصیلوں کے تصورات سامنے آئے اور عمارت کے مرکزی دروازوں پر سازندے بھی بٹھائے جانے لگے جو مقتدر شخصیت کی نقل و حرکت کا اعلان مختلف سازوں کے ذریعے کیا کرتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف عمارتوں کے سٹرکچر اور ڈیزائن میں تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ عمارتوں کی تزئین و آرائش نے بھی نئی نئی شکلیں اختیار کیں۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی اس اولین تہذیب میں ار، اروک، سمیر، بابل، نمرود، اشور اور شوشا جیسے عظیم شہر وجود میں آ گئے۔ ان شہروں کی عمارتیں ایک سے سات منزل تک بلند ہو گئیں اور انھوں نے باغات معلق اور مینار بابل جیسے شہکار تخلیق کر لیے۔

تہذیبی ترقی صرف عراق ہی میں جاری نہیں تھی بلکہ ہندوستان، چین، مصر، یونان، روم، میکسیکو، پیرو، اسرائیل اور دیگر سرزمینوں پر بھی عظیم تہذیبوں کا ظہور ہو رہا تھا اور ان سرزمینوں پر حیرت انگیز تعمیراتی فن پارے تخلیق ہو رہے تھے۔ یہاں ایسی ہی چند شہکار عمارتوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

1۔ Tower of Jericho: نو ہزار سال قبل مسیح میں فلسطین میں تعمیر ہونے والی تین منزلہ عمارت جو آج بھی قابل استعمال ہے۔

2۔ Megalithic Tample of Malta: اس مندر کو دنیا کی قدیم ترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

3۔ La Hougue Bie: جرسی میں واقع پینتیس سو سال پرانی عمارت جو آج بھی درست حالت میں ہے۔

4۔ Tarcien Tample: مالٹا میں واقع دنیا کا قدیم ترین مندر۔

5۔ Treasury of Arteus: 1250 ق م میں تعمیر ہونے والا یونانی مقبرہ۔

6۔ Newgrange: آئرلینڈ میں 5100 قبل مسیح میں تعمیر ہونے والی قدیم ترین عمارت جو اہرام مصر سے بھی زیادہ پرانی ہے۔

7۔ Knap of Howar: یورپ میں پتھروں سے تعمیر کردہ پینتیس سو سال پرانا گھر جو سکاٹ لینڈ میں واقع ہے۔

8۔ Light House of Alexandria: مصر میں سکندر اعظم کا تعمیر کرایا ہوا مینار۔

9۔ Place of Apidana: ایرانی بادشاہ دارا اول کا تعمیر کردہ محل جس کے کھنڈرات اب بھی باقی ہیں۔

عظیم عمارات کے ساتھ ساتھ دنیا میں عظیم شہروں کا بھی ظہور ہو رہا تھا۔ یہ تمام شہر علوم و فنون اور معاشی و سیاسی ترقی کے استعارے تھے مگر یہ شہر قدرتی آفات اور جنگی حملوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بیماریاں، تشدد، وبائیں اور قحط ان کی تباہی کا سبب بنے۔

ایتھنز، سکلہ، بابل، بازنطین، موہنجوداڑو اور ہڑپہ میں جو ترقی ہوئی دنیا بھر کے چھاپہ گھر اس کی عکاسی کرنے سے قاصر ہیں۔ عمارتیں خواہ کتنی ہی مضبوط ہوں، بالآخر فنا ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ اٹلانٹس، بابل، نینوا، ایلام، مرحشی، وردگی، مگان، اروک، اشور، ملوحہ، امرج، یوتو، اوتو، ماپاؤ بیچو، ممفس، الملسر، ارید و، طلائی، کرتک، کنعان اور ہلوس جیسے عظیم شہر صفحہ ہستی سے مٹ گئے مگر تاریخ کی کتابوں میں یہ آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی عظیم الشان عمارات کی جگہ اب صرف کھنڈرات باقی ہیں۔ ان عمارتوں کے عظیم گنبد، مینار اور رنگ و روغن سب خاک ہو گئے۔ آج بھی دنیا میں چند ایسے شہر ہیں جن کی سخت جان عمارتیں ہزاروں سال سے سرد و گرم زمانہ کا مقابلہ کر رہی ہیں اور اپنے ڈیزائن کرنے والوں، اپنے تعمیر کرنے والوں اور میٹریل تیار کرنے والوں کی دانائی اور اخلاص کو خراج تحسین پیش کر رہی ہیں۔ یہاں ہم چند ایسے شہروں کا تذکرہ کریں گے جو ہزاروں سالوں سے آباد چلے آ رہے ہیں۔

1۔ فیّوم: قاہرہ (مصر) کے جنوب مشرق میں واقع دنیا کا قدیم ترین شہر جو چار ہزار سال قبل مسیح میں آباد ہوا اور آج تک آباد چلا آ رہا ہے۔ 2۔ صیدون: آج سے چھ ہزار سال پہلے بیروت (لبنان) کے جنوب میں آباد کیا گیا۔ یہاں کے باشندے فنون میں خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ یہاں شیشہ اور رنگ بنانے والے بہترین کاریگر پائے جاتے ہیں۔ یہ شہر اپنی تین لاکھ آبادی سمیت آج بھی دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ 3۔ ایتھنز: تاریخ، تفریحات اور فنون کے حوالے سے شہرت رکھنے والا یہ شہر گذشتہ کئی ہزار برسوں سے آباد چلا آ رہا ہے اور آج بھی یونان کا دارالحکومت ہے۔ 4۔ یروشلم: چھبیس بار بیرونی حملوں کا سامنا کرنے، چوالیس مرتبہ دشمنوں کے زیر قبضہ رہنے اور کم از کم دو مرتبہ صفحہ ہستی سے مٹ جانے کے باوجود یہ شہر اپنی غیر معمولی تاریخ اور نادر آثار قدیمہ سمیت پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ 5۔ پلوڈیو: سمندر سے دو سو پچاس کلومیٹر کی بلندی پر واقع بلغاریہ کا یہ شہر چھٹی صدی قبل مسیح سے آباد چلا آ رہا ہے۔ 6۔ حلب: شام میں واقع یہ شہر دنیا کی قدیم ترین آبادیوں میں سے ایک ہے۔ 7۔ سوسا: آج سے نو ہزار سال قبل دجلہ کے مشرق میں بسایا جانے والا یہ شہر دنیا کی قدیم ترین آبادیوں میں سے ایک ہے جہاں آج بھی زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ 8۔ جریکو: اسے دنیا کا قدیم ترین شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آج سے گیارہ ہزار سال قبل فلسطین میں آباد کیا جانے والا یہ شہر آج بھی اپنی بنیادوں پر کھڑا ہے۔

آج زمین پر قدیم ترین عمارات کی موجودگی کے ڈیزائنرز، معماروں اور میٹریل تیار کرنے والوں کے لیے خراج تحسین کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے بنانے والوں نے انہیں دو چار برسوں کے لیے نہیں بلکہ آنے والی ہزاروں صدیوں کو سامنے رکھ کر تعمیر کیا تھا۔ مضبوطی اور پائیداری ان کے پیش نظر رہی ہوگی اسی لیے یہ قدیم عمارتیں جدید عہد کے انسان کو رشک اور حیرت میں مبتلا کر رہی ہیں۔ ان عمارتوں کے معمار جانتے تھے کہ کوئی عمارت اگر پائیدار اور مضبوط نہیں تو وہ زیادہ دیر تک قدرتی آفات اور موسمی تبدیلیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انہیں معلوم تھا کہ مضبوط بنیادیں ہی پائیدار چھتوں کی ضامن ہوتی ہیں۔ عمارتیں صرف رہائشی مقصد کے لیے استعمال نہیں ہوتیں بلکہ ایک عمارت اپنے مکینوں کی مذہبی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی حیثیت کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ اپنے مکینوں کی شان و شوکت، رعب داب اور آب و تاب ہی کی گواہی نہیں دیتیں بلکہ یہ اپنے تعمیر کرنے والوں کے تعارف کا بھی دیباچہ ہیں۔ یہ عمارتیں ماضی کی کتابیں ہیں جو نئی نسل کو انسان کے عظیم الشان ماضی کی آگاہی فراہم کرتی ہیں۔ ان کی ایک ایک اینٹ ہماری تاریخ ہے اور تعمیر کرنے

والوں کے اعلیٰ ذوق کی ترجمان تھی۔ ان عمارتوں کے لیے دور دراز کی سرزمینوں سے انجینئرز، معمار اور کاریگر بلائے جاتے جو دنیا بھر میں پائی جانے والی ان قدیم عمارتوں کی تعمیر و آرائش کرتے۔ دور دور سے سامانِ آرائش کے نام پر قیمتی لکڑی، بیش قیمت پتھر اور نفیس جالیاں منگوائی جاتیں۔ ان عمارتوں کو بڑے بڑے پتھروں یا پھر چھوٹی اینٹ سے تیار کیا جاتا پھر دروازوں، روشن دانوں، چوکھٹوں، شہتیروں اور دیواری الماریوں پر نفیس لکڑی کا کام کرایا جاتا۔ تعمیر کے لیے استعمال کیے جانے والے مسالے کو تیار کیا جاتا تھا جسے راکھ اور چونے کے آمیزے سے تیار کیا جاتا تھا جس میں پٹ سن یا روئی بھی شامل ہوتی تھی۔ ان عمارتوں میں تازہ پانی کے حوض بنائے جاتے اور ہر دستیاب سہولت کو عمارت کا حصہ بنایا جاتا تھا۔ قدیم عمارتیں دنیا کے جس بھی خطے میں پائی جاتی ہیں ان کا کشادہ، ہوادار، روشن، دیرپا، مضبوط اور محفوظ ہونا قدرِ مشترک ہے۔

قدیم طرزِ تعمیر میں ایک اور چیز قدرِ مشترک ہے کہ ان عمارتوں کو عموماً اونچی جگہوں (ٹیلوں اور پہاڑوں) پر تعمیر کیا جاتا تھا تاکہ انھیں سیلاب اور حملوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ان کی بیرونی دیواریں مضبوط (دوہری یا تہری) بنائی جاتیں (9 سے 11 میٹر چوڑی) ان دیواروں پر حفاظتی چوکیاں بھی تعمیر کی جاتی تھیں اور ان کے دروازے مضبوط اور بلند رکھے جاتے۔ ان عمارتوں کو عموماً سورج اور ہوا کے رخ پر بنایا جاتا تھا تاکہ انھیں تازہ ہوا اور روشنی میسر آ سکے۔ بعض دروازے نہ صرف تنگ ہوتے بلکہ انھیں پتھروں سے ڈھک دیا جاتا تھا۔ ان دروازوں پر حفاظتی دستے بھی متعین ہوتے تھے۔ ان عمارتوں کے فرش نفیس اینٹوں اور پتھروں سے بنائے جاتے، عمارت کے اندر کنویں اور تالاب کے علاوہ سیوریج کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ امراء کے لیے بنائی گئی یہ عمارتیں نہ صرف کئی منزلہ ہوتیں بلکہ انھیں مجسموں اور تصاویر سے بھی مزین کیا جاتا انھیں پردوں اور قیمتی فرنیچر کے علاوہ ملک ملک سے آئی نادر اشیاء سے سجایا جاتا تھا۔ دنیا بھر میں پائی جانے والی ہزاروں قدیم عمارتیں اگر آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں تو آئیے دیکھتے ہیں کہ قدیم انسانوں کے طرزِ تعمیر میں ایسی کیا بات تھی کہ ان کے فن پارے ہمارے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں؟ اگر ہم ماضی کے طرزِ تعمیر کا تجزیہ کریں تو اس کے پس منظر میں چند اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔

1۔ ماضی کی یہ عظیم عمارتیں قدیم تعمیراتی تکنیکس کا استعمال کرتے ہوئے مقامی مواد سے تعمیر کی گئی تھیں۔ 2۔ کئی علاقوں میں ان عمارتوں کو منفرد ڈھانچوں سے تعمیر کیا گیا۔ ان کے معماروں نے انھیں موسمی شدت، آفات، ریزگی اور بوسیدگی کے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار کیا تھا۔ 3۔ قدیم عمارتوں کے معمار ثقافتی عمارتوں سے زیادہ عملی ڈیزائن بناتے تھے جنھیں مکینوں کی صحت اور سہولت کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ 4۔ ان عمارتوں میں ایسے وسائل (میٹریل) استعمال کیے گئے جو قدرتی ماحول کو محفوظ رکھتے اور ثقافتی زندگی ان کو آسان بناتے ہیں۔ 5۔ قدیم تعمیراتی تکنیکس کی کارکردگی زمین پر موجود انتہائی قدیم ڈھانچوں (کلوزیم یا اہرام مصر) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جنھیں ہزاروں سال قبل منصوبہ بندی سے بنایا گیا تھا۔ 6۔ تمام قدیم عمارتیں، ماحول دوست ہیں جو زمین کی بقا اور قدرتی دنیا کی تائید کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

◆◆◆

(جاری ہے)

اولگا تکارچک کا ناول "پرواز"

ڈاکٹر غافر شہزاد

اولگا تکارچک ایک پولش ناول نگار ہیں۔ یہ پیشے کے اعتبار سے وہ کلینکل سائیکالوجسٹ ہیں مگر اس وقت ان کی تمام توجہ ناول نگاری کی جانب مبذول ہے۔ انھیں 2018ء کا نوبل پرائز اور بکر پرائز مل چکا ہے۔ ان کا ناول FLIGHTS اردو قالب میں "پرواز" کے نام سے عکس پبلی کیشنز کے توسط سے اردو کے قارئین تک پہنچا۔ آئرین سہیل دو سال کی محنت کا نتیجہ تھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ میں نے دو سال اولگا تکارچک کے ساتھ گزارے۔ واقعی ایسا مشکل اور فنی و معنوی ریاضت والا ناول ترجمہ کرنے کے لیے دو سال کا عرصہ بھی بہت کم ہے، جب کہ آئرین سہیل ایک ادارے کی پرنسپل کے طور پر بھی ملازمت میں اپنی ذمہ داریاں نبھا رہی ہیں۔ ناول کا ترجمہ نہایت رواں اور یوں لگتا ہے، جیسے طبع زاد ناول ہے۔ یہ کمال ہے اور اس کی تحسین کی حق دار آئرین سہیل ٹھہرتی ہیں۔ سائنس اور مقامی کلچر کی نہایت مشکل اصطلاحات کو بہت محنت اور توجہ سے اردو کا لبادہ پہنایا گیا ہے۔

ناول کا بنیادی تھیم "سفر" ہے۔ مگر یہ کسی ایک فرد کا یا دنیا کے کسی خاص خطے کا سفر نہیں ہے۔ اس سفر کی کوئی ایک جہت بھی نہیں، بلکہ سینکڑوں جہات ہیں۔ ناول کے ابتدا میں اولگا تکارچک ایک سائیکالوجسٹ کے طور پر بنیادی کردار کا تعارف کراتی ہیں مگر بعد میں وہ ایک سفر نامہ نگار بن جاتی ہیں۔ ان کا یہ سفر وقت کی کسی ایک سمت میں ہے اور نہ ہی کسی ایک سفر کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ پہلی خواندگی میں تو یوں لگتا ہے کہ ہر صفحے پر کوئی الگ سفر کا تجربہ بیان کیا گیا ہے جس کا پچھلے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ سفر کے ان تجربات اور مشاہدات کو کلی طور پر کسی ناول میں پیش کرنا بہت مشکل کام تھا مگر اولگا تکارچک نے اس مقصد کے لیے ایک مختلف اسلوب اختراع کیا۔ یہ اسلوب ناول کے روایتی اسلوب سے یکسر مختلف ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی ماورائیت خواندگی میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ ناول کی جزئیات کو اتنے بڑے کینوس پر کلی طور پر دیکھنا قدرے غیر روایتی کام ہے۔ اس کے لیے اولگا تکارچک نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ آسمان پر ستاروں کا ایک جھرمٹ رات کو دکھائی دیتا ہے، کچھ ستارے کم روشن ہوتے ہیں کچھ زیادہ مگر ان کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ روشن ہوتے ہیں اور دیکھنے والا ان ستاروں کو آسمان پر دیکھتا ہے تو ان کے باہمی تعلق سے اس کے ذہن میں مختلف تصویریں بنتی ہیں۔ ان تصویروں کو اگر ناول کی صورت میں پیش کیا جائے تو ہر تصویر ایک دوسرے سے الگ اور منفرد قرار پاتی ہے مگر زمین سے دیکھنے والوں کو ایک ہی بڑا منظر نامہ دکھائی دیتا ہے۔ "پرواز" میں یہی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ "سفر" قدرِ مشترک ہے اور اس سفر کا بیان کہیں چند سطروں میں، کہیں چند صفحات میں اور کہیں بہت زیادہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر آسمان کی طرح زمین کے گلوب کے بڑے کینوس پر "سفر" کی یہ صورتیں ایک کل کے ساتھ جڑ جاتی ہیں۔ سفر اب پیدل نہیں ہوتا، یہ بحری جہاز، ٹرین، ٹیوب اور ہوائی جہازوں سے ہوتا ہوا دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرنے لگا ہے۔ جب آپ ایئر پورٹ یا ریلوے اسٹیشن پر جاتے ہیں تو ایک جیسا منظر ہی ہر بار دکھائی دیتا ہے۔ جہاں سفر اختتام کرتے ہیں وہاں بھی ہر بار یہی منظر دیکھنے کو ملتا ہے، یوں سفر میں یہ عمارتیں غیر اہم ہو جاتی ہیں۔ اگر آسمان سے ان ایئر پورٹ اور ریلوے اسٹیشن کو پورے گلوب کی سطح پر ایک ہی وقت میں دیکھا

جائے تو باہمی بے ربط اور غیر متعلق کے باوجود ان سب مسافروں میں قدرِ مشترک 'سفر' ہے اور یہ کہ وہ مسافر ہیں۔ ان سب کے تجربے کو ایک ہی وقت میں اگر بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو ناول کا یہی اسلوب بنتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایئرلائن کسی کتابچے میں پورے گلوب میں اپنی فلائٹس کے بارے میں بیان کرتی ہے تو ایک دلچسپ نقشہ بن جاتا ہے۔ یہ فلائٹس مختلف اوقات میں پرواز کر رہی ہوتی ہیں مگر رسالے میں شائع شدہ نقشے میں ایک وقت میں ہی اکٹھی دکھائی دے رہی ہوتی ہیں جیسے وقت منجمد سا ہو گیا ہو۔

''پرواز'' میں اولگا تکارچک نے سفر کی بہت سی کیفیات اور سفر سے جڑی بہت ساری کہانیاں اکٹھی کی ہیں۔ ان کہانیوں کو جانے والے کردار بھی جدا جدا ہیں اور ان کا اسلوب بھی الگ الگ ہے۔ اولگا نے ناول کے موجودہ اسالیب سے بالکل الگ راہ نکالی ہے۔ مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ اسلوب میں اولگا تکارچک کا یہ ناول میرے ناولوں ''مٹی میں مرگ''، ''کرول گھاٹی'' اور ''استغاثہ'' سے ایک حد تک جا ملتا ہے۔ ''مٹی میں مرگ'' میں بڑے کینوس پر مزار کے منظرنامہ کو ناول کا بنیادی تھیم بنایا گیا ہے اور پھر اس حوالے سے ہونے والی ایک کانفرنس کہ جو مٹی قبرستان میں منعقد ہوتی ہے اس کا بیان ہے۔ ناول کا بنیادی کردار مقبرے اور مزار کو ایک جائے تدفین سمجھتے ہوئے ان کے درمیان امتیاز قائم کرتے ہوئے کہانی بیان کرتا ہے۔ اسی طرح ناول میں مرنے کے بعد لوگ جس طرح زندہ رہ جانے والے عزیزوں اور دوستوں کے ذہنوں میں ایک ابدی زندگی پا لیتے ہیں جیسے زندہ لوگ اپنے بعد میں آنے والی نسلوں میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ اس میں ایک بڑا حصہ صوفیا کی شخصیات کا بھی ہے کہ جو کئی صدیاں پہلے مر جانے کے باوجود آنے والی کئی نسلوں تک منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ مزارات پر ہونے والی کرپشن اور وہاں کے کلچر کو ایک صحافی کی نگاہ سے بھی ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''کرول گھاٹی'' میں بنیادی تھیم تو ایک عورت کا ریپ ہے مگر اس سے جڑے ہوئے سوشل اور الیکٹرونک میڈیا کے کردار کو تفصیل سے ناول کے اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح شہر سے جرائم کے خاتمے کے لیے جس طرح سیف سٹی پراجیکٹ اور دیگر متعلق ادارے کردار ادا کر رہے ہیں اور چھوٹے بچوں کو جنسی بدسلوکی سے محفوظ کرنے کے لیے حکومت ''زینب ایپ'' متعارف کراتی ہے۔ اس کے ساتھ جڑی کہانیاں بھی ناول میں در آتی ہیں۔ ''کرول گھاٹی'' ناول میں ''منٹو کے مطابق'' ٹیلی ویژن کا ہفتہ وار پروگرام بھی ناول میں کہانی کے ساتھ ساتھ اپنی الگ شناخت لیے ہوئے چلتا ہے جہاں منٹو اپنے افسانوں اور عورت، پولیس کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کے مطابق تبصرے کرتا ہے۔ ایسی ہی تکنیک نے ناول ''استغاثہ'' میں اختیار کی گئی ہے۔ ''استغاثہ'' میں ایک سرکاری ملازم کی نفسیات، سرکاری ملازمت کو غلامی کی ایک شکل قرار دیتے ہوئے کہانی آگے بیان کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ ایک ریٹائرڈ ہو جانے والے ملازم کی زبان سے ایک جج صاحب کے سامنے ڈائیلاگ کی صورت میں اس کا مقدمہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ زرد صحافت اور بلیک میل کرنے والے عام اور بڑے گروہوں کے مکروہ مخفی کردار کو بھی ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ سرکاری ملازمت میں ''بڑے صاحب'' کا کردار جس طرح چہرے بدل بدل کر آتا ہے، وہ بیوروکریسی کے چہرے سے نقاب ہٹانے کی نمائندگی ہے۔ ایک صالح معاشرے کے لیے جو بنیادی لوازمات ہیں، ان کا تذکرہ بیٹھے کی غلامی کی علامات کے تناظر میں کیا گیا ہے۔

اگر اسے خود ستائی نہ سمجھا جائے تو اولگا تکارچک کا ناول ''پرواز'' اور راقم کے تین ناول کہیں نہ کہیں کسی سطح پر اسلوب کے تناظر میں اشتراک لیے ہوئے ہیں۔ روایتی ناول سے اسلوب کی سطح پر یہ انحراف ناول نگار سے وسیع مطالعہ، گہرے مشاہدے اور زبان و بیان پر

مضبوط گرفت کا متقاضی ہے۔ پہلے پہل وقت کے افقی سفر کو بیان کیا جاتا تھا، بعد میں وقت والروی سفر میں بیان کیا جانے لگا جس میں آواگون کا نظریہ ہندومت میں موجود ہے۔ وقت کو ایک بہتے ہوئے دریا سے تشبیہ دی جاتی رہی کہ وہ ایک سمت میں بہتا چلا جاتا ہے اور دوبارہ کبھی اس مقام سے نہیں گزرتا۔ اسٹیفن ہاکنگ نے ”وقت کی مختصر تاریخ“ میں وقت کے اس قدیم تصور کو مسترد کر دیا اور ٹائم اینڈ سپیس کا نیا نظریہ پیش کیا۔ اسی طرح لیونارڈو ڈاونچی نے جب ”تناظر“ (Perspective) کی تکنیک دریافت کی تو دو سمت میں نظر آنے والا منظر نامہ سہ سمتی اور چہار سمتی ہو گیا جسے پکاسو نے اپنے کیوبزم میں ایسے استعمال کیا کہ تصویر میں جو سامنے تھا وہ تو دکھائی دیتا ہی تھا، جو پس منظر میں چھپا ہوتا تھا اسے بھی منظر کا حصہ بنا دیا گیا اور یوں بصری سطح پر گفتگو بہت تیز اور قدرے پیچیدہ ہو گئیں۔ ایسا ہی ناول کے اسلوب کے ساتھ ہوا ہے۔ پہلے ناول کا مرکزی کردار ایک سمت میں آگے بڑھتا تھا اور باقی کردار اس کی سہولت اور اس کردار کو نمایاں بنانے کے لیے اس کا ساتھ دیتے تھے مگر ایسا تو آمریت کے دور میں ہوتا ہے۔ اب چوں کہ جمہوریت ہے اس لیے طاقت کسی ایک شخصیت میں مرتکز نہیں ہوتی، طاقت کی تقسیم ذیلی کرداروں میں ہو جانے کے سبب حاشیے کے کردار بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں اور طاقت کے بارے میں یہی مشعل فوکو کا نظریہ ہے۔ ہمارا آج کے ناول کا اسلوب بھی ایسی ہی صورت حال سے گزر رہا ہوا اپنے ہیرو اور ہیروئن کو منہدم کر چکا ہے اور عام انسانوں کی بات کرتا ہے۔ ان کی کیفیات اور معاشرے کے جبر سے گھٹن پر ان کے کردار کی آوارگی کے بارے میں نئے سے نئے اسلوب اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ ”پیروڈی“ پر چلنے والا ناول پیرانو اور بکر پرائز اس بات پر سوال ہے کہ اکیسویں صدی میں نئے ناول کا یہی اسلوب آگے بڑھے گا۔ جو اسے اختیار نہیں کریں گے، وہ اگر قاری ہے تو اپنا سفر معکوس شروع کرے گا اور اگر ناول نگار ہے تو محض لکیر کا فقیر بن کر مکھی پہ مکھی مارتا چلا جائے گا۔

◆◆◆

”تخلیق تقریب“ 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

اظہر جاوید صاحب کے لگائے ہوئے پودے کو جس طرح ان کے ہونہار فرزند سونان اظہر نے ایک تناور درخت بنایا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ خدا انہیں سلامت رکھے اور ”تخلیق“ کو جاری و ساری رکھے۔ آمین! (احمد عقیل)

ہمیشہ کی طرح تر و تازہ و دیا اخلاق، خوبصورت محفل منعقد کروانا سونان اظہر کا کمال ہے۔ جو اظہر انکل کو جو لے نہیں دیتا اور وہ ہمارے ساتھ ہی شامل محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں بھی تخلیق کی مرہون احسان ہوں کہ میری پہلی پہلی اشاعتیں ”تخلیق“ ہی میں شائع ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ سونان اظہر آپ کو آپ کے اہل خانہ سمیت خوش و خرم رکھے۔ یہ محفلیں اسی طرح آباد رہیں۔ (طاہرہ طراز)

رنگ بدلے گا موسم کا یہ اک جھونکا ہوا کا

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ

قدرت کی طرف سے ودیعت کی ہوئی زندگی اتنی تیزی سے ادا ہو جاتی ہے۔ اس کا احساس ہمیں ہر جاتے ہوئے سال کے بعد ہوتا ہے۔ گزرتا ہوا سال اپنے پیچھے، اپنے اچھے یا برے اثرات ضرور چھوڑ کر جاتا ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف انسانی جانوں کے زیرِ زمین چلے جانے کی ہوتی ہے۔ یہ وہ نقصان ہے جو فطری ہے۔ آئی ٹی اور سائنس لاکھ ترقی کر لے تو بھی کوئی ہوئی سانس بحال نہیں کر سکتی۔ نئے سال کے آغاز پر بھی لوگ اپنی اپنی پسند کے مطابق محوِ زیست ہیں۔ کوئی گھنٹیاں بجا کر، کوئی پٹاخے چھوڑ کر، کوئی برتن توڑ کر، کوئی اپنے پیاروں کو یاد کر کے اور کچھ سر پھرے ادب کا کاسہ لیے انگشت بدنداں ہوں گے کہ اس میں سے کتنے ہیرے داعیِ اجل کو دوست چلے ہیں اور جو باقی بچے ہیں وہ ادب کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ دو ہزار بائیس کو صحافت کی صدی کا سال بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بات آن دی ریکارڈ ہے کہ 2022ء وہ سال ہے جس میں پاکستانیوں نے گوگل پر سب سے زیادہ سرچ کی۔ خاص کر لٹریچر سے محبت کرنے والوں کے لیے بھی انٹرنیٹ حسبِ توفیق مددگار ثابت ہوا۔ گوگل کا بھلا ہو کہ اس نے بہت سے جعلی اور نقلی بت توڑ کر سچائیاں سامنے رکھ دی ہیں۔ ادب کا عام سا قاری بھی اب حقیقی صورتِ حال جاننے کے لیے کسی شخصیت یا نقاد کا مرہونِ منت نہیں رہا۔ دو ہزار بائیس کا سال اردو ادب پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ انگلش کی طرح اردو والوں کو بھی انٹرنیٹ سے بہت سہارا مل گیا۔ ہمسایہ ملک بھارت جس نے ریختہ جیسی تاریخی اور شاندار ویب سائٹ بنا کر پوری اردو دنیا کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ ان کی تحقیق، تنقید اور تخلیق تک رسائی آسان ہو گئی ہے۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے خاص طور پر ہر تحقیق کار، شاعر اور ادیب کو نہ صرف دیگر ادیبوں کی تخلیقات تک رسائی سے مل جاتی ہیں بلکہ ان کی اپنی تحریر بھی لمحہ بھر میں ان کے چاہنے والوں تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرا ارضی فاصلے بھی سمٹ کر ایک نقطہ پر آ گئے۔ اگرچہ اردو دان یہی کہتے رہے کہ تمہارا گوگل، انسٹاگرام جیسی کھردری زبان سے ہماری پیاری شیریں زبان بچائی جائے۔ ان کے خیال میں اردو میں قاری کے کم ہونے کے اسباب میں سے ایک یہ سبب بھی ہے مگر اس کے باوجود بھی ہمارا موقف یہی ہے کہ گوگل ان لوگوں کی بھی مدد کرتی ہے جو نہ تو سکول کالج یا کسی ادبی محفل میں جا سکتے ہیں بلکہ یہ ادب کو ان لوگوں کی دہلیز پر لے آتی ہے جو ریڑھی پر سبزی بیچتا ہے اور فارغ وقت میں انٹرنیٹ دیکھتا ہے۔ ایک درزی اپنے کام سے فراغت پا کر یوٹیوب دیکھتا ہے۔ ایک دکاندار فری اوقات میں اپنی من پسند غزل گنگنایا سنتا ہے اور ایک مسافر اپنے سفرنامے کا باب کسی ٹرین یا جہاز میں لکھ کر دوستوں کو پہنچانا چاہتا ہے تو وہاں انٹرنیٹ اور گوگل اس کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اردو ادب کے چاہنے والوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ پاکستانی فکر و دانش کے سرچشمے جن علوم، مذاہب، تاریخی، سماجیاتی جدلیات، تہذیبوں اور علاقائی ثقافتوں سے پھوٹتے ہیں وہ معتبر اسکالرز اور شعرا و شخصیات پچھلے پانچ سالوں میں ہم سے بچھڑ گئیں تو ادبی افق خالی خالی سا نظر آنے لگا۔ پوری دنیا پر انگریزی کا جال بچھ جانے سے اردو زبان کو کچھ مشکلات کا سامنا ضرور ہے جو ہر گزرتے ہوئے سال میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ریڈیو

اور ٹیلی ویژن چینل پر پہلے کی طرح اس سال بھی اردو نے اپنے پیر سمیٹے۔ انگریزی زبان میں اردو الفاظ کی جگہ انگریزی کی ترقی رہی اور اردو کے ساتھ سوتن جیسا سلوک جاری رہا۔ شاعری کی کتابوں کی بھرمار رہی فکشن میں چند کتابیں ہی منظر عام پر آسکیں البتہ رکاوٹ پہ رکاوٹ رہی رہے۔ حسین مجروح کی تنظیم سائبان کا اضافہ ہوا ہے۔

جہاں پاکستان میں ہمارے ادبی رتن ہم سے جدا ہوئے ہیں اسی طرح ہمارے ہمسایہ ملک بھارت سے اور دیگر ممالک سے ادبی، ثقافتی، صحافتی اور مذہبی رہنما بھی فانی دنیا کو داغ مفارقت دے گئے جن میں سے یوسف مستی خان، یوسف اختر رضوی، کے پی اے سی للتا، کوئن وجے لے، گرمیت ایلی، دیویندر ناتھ، پیرو پیپ کووم، نسیم اختر شاہ قیصر، ناظم حسین صدیقی، سید افضل خان، تیسے داؤد، حمید لمین ابراہیم، شیخ یہ وفی، شیل ایکوس، میخائل گورباچوف، انیس صادق، میں گل عدنان اورنگ زیب، آفتاب بلوچ، ایمرک کیلیان، آصف احمد علی، آغا سید حامد علی شاہ موسوی، دیپا، ریمنڈ بیمت، ادا کار وسیم، مہدی حسن (صحافی)، منظور حسین (ہاکی کا کھلاڑی)، ملائم سنگھ یادو، افضال احمد، اسماعیل تارا، ارشد شریف، مسعود لونیہ، مسعود اختر، لتا منگیشکر، پال کارلسن، توحید، غلام نور ربانی کھر، محمود اشرف عثمانی، مختار بخش قصوری، محمد رفیع عثمانی، عمران اسلم (صحافی)، طارق نیازی، شین وارن، صوفی تبسم، شہزادہ عالم، پرجو سیارانی، بخت بیدار، انٹرینیو علم، راستن جیک سموری، امداد حسینی، عامر لیاقت حسین، ریون انسیس، رومینہ قریشی، رفیق تارڑ، آیہ سعود کاسپے، رحمن ملک، رابرٹ کرل، حمید اکھانی، خالد بخشی، جیانگ زیمن، عائم کن یونگی، آسکین باجوال، بھوپندر سنگھ، لیری، بلقیس ایدھی، شیخ شیر حواری، بشریٰ رحمن، الطاف احمد شاہ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ابراہیم اشک، شرف استھانوی، ڈاکٹر عمار پانی پتی، ڈاکٹر نادر علی خان، متین اچل پوری، مولانا نسیم شاہ قیصر، احمد علی برقی اعظمی، پروفیسر خورشید سمیع، اسرار گاندھی، پروفیسر اسلم آزاد، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور خالد عابدی قابل ذکر ہیں۔ جریدہ ماہِ نو کے سابقہ مدیر معروف شاعر قائم نقوی، مترجم افسانہ نگار، محقق اور نقاد قیصر نذیر خاور اور معروف کالم نگار، شاعر کیانی کا استاد ڈاکٹر اختر شمار بھی 2022ء میں انتقال کر گئے۔ 2022ء میں نوبل انعام برائے ادب فرانسیسی خاتون آنی ارنو کے حصے میں آیا۔ وہ پہلی فرانسیسی خاتون ہے جسے ادب کے میدان میں اس انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک انوکھی بات ہے کہ اعزاز اسے اس کی جرأت، بہادری اور جراح جیسی فہم و فراست کے لیے دیا گیا۔ اس نے اپنی ذاتی یادداشتوں کی جڑوں، تضادوں اور اجتماعی پابندیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ پاکستان میں نظم کے بڑے دل عزیز معروف شاعر ڈاکٹر وحید احمد کو حکومت پاکستان نے تمغہ امتیاز سے نوازا۔ دوسرا اعزاز پانے والوں میں ہی امجد اسلام امجد جو کہ پاکستان کے معروف دانشور، کالم نگار، شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں انھیں حکومت پاکستان نے ہلال امتیاز کا اعزاز بخشا۔ امسال لاہور میں کوئی بڑی ادبی کانفرنس نہ ہو سکی۔ ایک زمانہ تھا کہ لاہور میں الحمرا آرٹس کونسل ہال میں شاندار اردو کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں جس میں دنیا بھر کے ادیب شرکت کیا کرتے تھے۔ یہ کانفرنسیں عموماً تین چار دن پر مشتمل ہوتی تھیں اور ہر صنف فن پر بات ہوتی۔ جشن ہوتے اور ان میں ادبی ستارے اپنے علمی مقالوں پر روشنی ڈالتے، کئی سیشن کھوئے ہوؤں کی یاد میں منعقد کرتے اور کہیں نامور ادیب اپنی زندگی کی ریاضتوں سے پردہ اٹھاتے۔ یہ ساری کانفرنسیں عطاء الحق قاسمی کے دور میں ہوئیں جب وہ الحمرا آرٹس کونسل کے چیئرمین تھے۔ نہ ان کی قیادت سے قبل اور نہ ہی ان کے بعد کسی نے اس طرف توجہ کی ہے البتہ کراچی والے اس سلسلے میں بازی لے گئے ہیں۔ اکادمی ادبیات اسلام آباد میں ہفتہ وار ادبی نشستوں کے علاوہ کتب اور پرچوں کا تسلسل بھی نہ ٹوٹا اور اس ادارے نے تمام دنیا کے اردو ادبی اداروں، انجمنوں اور دانشوروں سے رابطے

کر کے ان کی زبانوں کا ادب اردو میں اور اردو کا سرمایہ ان کی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی طرف راغب کیا اور کچھ تراجم کروا بھی لیے ہیں۔
یہ اس سال اس ادارے کا اردو زبان، اس کے قاری اور لکھاری پر تاریخ ساز احسان ہے اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی فن تعمیر کے پروجیکٹ پر
کام کیا جا رہا ہے۔ لاہور میں اردو زبان سے پیار کرنے والی خاتون فاطمہ قمر نے اردو کے فروغ کے لیے اپنی کاوشیں تیز کر دیں ملتان سے
رضی الدین رضی نے اس سال اردو ادب کی خدمات کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ اس سال بھی گزشتہ سالوں کی طرح کراچی سے شائع ہونے والا
ماہنامہ قومی زبان، اسلام آباد سے اردو نامہ اور لاہور سے الحمرا، بیاض، تخلیق اور ادب لطیف چھپنے میں تعطل نہیں آیا۔ خالد احمد مرحوم کے
"بیاض" اور اظہر جاوید مرحوم کے پرچے "تخلیق" کی انتظامیہ نے تو سالانہ ایوارڈ اور انعام کا اجرا بھی کر رکھا ہے ان کی یہ خدمت اس سال بھی
جاری رہی۔ مجلس ترقی ادب لاہور میں اس سال جب تک منصور آفاق چیئرمین رہے، ادبی چائے خانہ اور ادبی عجائب گھر بنا کر انہوں نے
اردو ادب سے محبت کرنے والوں کے لیے اس ادبی ادارے کے دروازے کھول دیے۔ بہاول پور میں جواں سال ڈاکٹر رفیق الاسلام اردو
ادب اور اقبالیات پر منفرد خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ لاہور سے ڈاکٹر الماس خانم نے "اردو میں ادبی تحقیق" کے علاوہ "آذربائیجان کا
عظیم المرتبت شاعر نظامی گنجوی" لکھی ہے۔ یاد رہے کہ نظامی گنجوی فارسی خمسہ گوئی کے بانی ہیں۔ محمد نجم الدین احمد نے اکادمی ادبیات
پاکستان کے پلیٹ فارم سے "کتاب ددہ قورقود" آذربائیجان کی مشہور رزمیہ داستان کا ترجمہ کر کے دو ملکوں میں پل کا کام سر انجام
دیا۔ "خفیف مخفی کی خواب بیتی" مرزا اطہر بیگ، "استفادہ" ڈاکٹر غافر شہزاد، "میں بھناں دلی دے کنگرے" پنجابی ناول مستنصر حسین تارڑ کی
اس سال منصۂ شہود پر آنے والی نئی کتابیں ہیں۔ دو ہزار بائیس میں ہی ڈاکٹر غافر شہزاد کے ناول "مکلی میں مرگ" کو یو بی ایل ایوارڈ کے
لیے نامزد کیا گیا ہے۔ نیلوفر اقبال کا افسانوی مجموعہ "[illegible]"، ڈاکٹر اصغر خان کی عالمی و مقامی تناظر میں "نظریۂ قومیت"، اسلم انصاری کا نیا
افسانوی مجموعہ "گمان آباد" اور "کلیات اسلم انصاری" بھی اسی سال کے اواخر میں چھپ گیا۔

عکسی مفتی کی کتاب "محمد" عکس پبلی کیشنز نے لاہور سے شائع کی ہے۔ قیصر نذیر خاور جو کہ انٹرنیشنل زبانوں کے مترجم بھی ہیں
ان کا نیا ناولٹ "ادھ کھلے دریچے" بھی دسمبر کی شاموں میں چھپ کر پڑھنے والوں کے ہاتھ میں پہنچ چکا ہے۔ منفرد لب و لہجے کی شاعرہ
صنوبر الطاف کا مجموعہ "کائنات کے بیک یارڈ سے" بھی ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی "یہ قصہ کیا ہے معنی کا" اور ڈاکٹر
اورنگ زیب نیازی کی "ماحولیاتی تنقید" بھی اسی سال مارکیٹ میں آئی ہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ جب بھی کسی ہوش مند فرد کا پچھلا سال
گزرتا ہے تو وہ زندگی کے صفحات واپس پلٹ کر ضرور دیکھتا ہے۔ وہ اپنے اسی ایک احساس سے لطف اندوز ہوتا ہے جہاں اس نے کچھ
کھویا ہوتا ہے یا کچھ حاصل کیا ہوتا ہے۔ ادبی منظر نامہ، ادیبوں کی راج دھانی ہوتا ہے سو وہ ادیب جنہوں نے رواں سال میں ادبی پنڈال
میں اپنا ڈول ڈال رکھا ہو وہ اس بات پر نازاں ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا یہ سال ضائع ہونے سے بچا لیا ہے۔ ان کے لیے حیات
کا وہی صفحہ حاصل زیست ہوتا ہے۔ باقی سارے سال ان کے لیے آتے جاتے موسموں کی مانند کبھی سرد، کبھی گرم اور کبھی پت جھڑ جیسے ہوتے
ہیں۔ دو ہزار بائیس میں ماہ و سال نے ایک ساتھ جون ایلیا، ساغر صدیقی اور پروین شاکر کے خاص نمبر شائع کیے۔ دنیائے ادب کے ان
معروف شعرا کو پرچے کی صورت میں محفوظ بھی کیا اور ساغر صدیقی اور پروین شاکر کے شایان شان لاہور گورنر ہاؤس میں ان دونوں شعرا
کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ ان پر مقررین نے سیر حاصل گفتگو بھی کی۔ جن طاقتی ایوانوں میں ساغر صدیقی خود بھی نہیں گیا مگر اس کے کلام کو

وہاں خوب سراہا گیا۔ ساغر صدیقی تو ایک درویش صفت شاعر ہے اسے بہت زیادہ نظر انداز کیا گیا تھا۔ سڑکوں، فٹ پاتھوں اور تھڑوں پر بیٹھ کر قوم اور سماج کا المیہ لکھنے والے عظیم شاعر کو ایک قومی پرچے میں زندہ کر کے ماہِ نو نے اس سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں جگہ بنا لی ہے۔ ساغر صدیقی نمبر نکالنے کی تجویز راقم الحروف کی ہی تھی جسے ماہِ نو نے دوام بخشا۔ ماہِ نو نے اس سے قبل بانو قدسیہ اور اشفاق احمد جیسے اردو لکھاریوں پر بھی خاص نمبر طبع کیے اور ان کی شاندار تقریب گورنر ہاؤس میں رکھی جہاں پر ان کے فن اور فکر سے لوگوں کو آگاہی دی گئی۔

لاہور آرٹس کونسل کی طرح احمد شاہ نے کراچی میں اس سال بھی زیادہ ادبی پروگرام رکھے ہیں مگر اس نے ان کا نام فیسٹیول رکھا ہے۔ ادبی دیوانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ ادبی پروگرام کا نام کانفرنس، میلہ یا ادبی بیٹھک ہو۔ ان کی خوشی اس وقت دیدنی ہوتی ہے جب یہ محفلیں سجتی ہیں۔ آرٹس کونسل کراچی کے چار روزہ اردو میلے کا افتتاح جونمدگان ادب کے لیے ایک خوش آئند بات تھی مگر اس میں ایک پہلو جس پر پوری دنیا کے ادیبوں کے بھرپور تحفظات رہے، وہ یہ تھی کہ اس میلے میں نہ پرانے چہرے بدلے گئے نہ نیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا موقع ہے جس میں احمد شاہ اکیلا ہی ادبی وثقافتی میدان میں ڈٹا ہوا ہے، اگر یہ معمولی سا معمول ختم ہو جائے اور وہی چہرے جن کو لوگ دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہیں ان کی جگہ نئے لوگ شامل کیے جائیں جو تازہ فکر اور شاداب خیال کے خالق ہیں تو احمد شاہ کی ریاضت اردو ادب کی خدمات میں تحریر ہو۔ ہر تاریخ کا یہ دو طرح زیر بسر ہوتا ہے کہ آپ کے لائیو پروگرام گھر گھر دیکھے جا رہے ہوتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ درانی کو ایک طرف رہنا ہے تو دنیا والوں کو دو طرف ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر سال دو ہزار بائیس میں ادبی سرگرمیاں کرونا کے دور کے بعد نسبتاً زیادہ ہوئی ہیں۔ لوگ جو گھروں میں بیٹھ بیٹھ کر دو تین سال ایک طرح سے کرونائی کرب میں وقت گزار چکے تھے انہیں جیسے ہی آزادی کا لمحہ میسر آیا انہوں نے ادبی محافل کا رخ کیا۔ اس سال حلقہ ارباب ذوق، ترقی پسند مصنفین، مجلس ترقی ادب، اکادمی ادبیات اور دیگر ذاتی ادبی بیٹھکوں میں بھی ادبی محافل زور و شور سے جاری رہیں۔ اگرچہ اس سال آن لائن ادبی کانفرنسیں، ادبی محفلیں اور مشاعرے تو ہونے کے برابر تھے مگر کچھ جگہوں پر جزوی طور پر آن لائن سلسلہ بحال رہا۔ کئی شہروں میں ادبی پروگرام تو عمارتوں اور مختلف ادبی بیٹھکوں میں ہوتے رہے ہیں مگر ان میں بیک وقت آن لائن بھی لوگ شریک ہو جاتے۔ تحریکی آواز میں آواز ملانے کے لیے اور لوکل زبانوں کو دوام بخشنے کے لیے سندھ میں امر سندھو بی بی نے "ایاز میلہ" سجا کر ثابت کیا ہے کہ مقامی زبانوں سے محبت کرنے والے ابھی بھی زندہ ہیں کیوں کہ وہ بی بی اس "ایاز میلہ" پر اپنی جیب سے خرچ کرتی ہے اور پنجاب سے ہمارے پنجابی شاعر ادیب اپنے خرچ پر "ایاز میلہ" میں اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے شامل ہوتے ہیں۔ اس سال بھی اس نے دسمبر کے مہینے میں خوب ادبی اور ثقافتی رنگ بھرے ہیں۔ اس سال کے شائع ہونے والی شعری، افسانوی، تنقیدی، ترجمہ شدہ کتب اور رسالوں نے ثابت کیا ہے کہ دو ہزار بائیس بھی کتاب سے محبت کرنے والوں کا سال ہے۔

◆◆◆

"تخلیق تقریب" 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

سونان میاں اتنی خوبصورت تقریب کے انعقاد پر بہت مبارک ہو۔ اپنے محترم والد اظہر جاوید صاحب کے "تخلیق" کو زندہ رکھنا اور آگے بڑھانا ثوابِ دارین سے کم نہیں۔ سلامت رہو!

ساجد حبیب (وائس ایڈمرل)

اصحابِ یاسین

پیروز بخت قاضی

رسول خدا نے مکی زندگی میں کفارِ مکہ کو بتایا کہ صرف اللہ کی ہستی ہی عبادت کے لائق ہے نہ کہ ان کے بنائے ہوئے لات و منات۔ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے تاکہ وہ ہدایت پا سکیں۔ اس کے جواب میں کفار ایمان نہ لاتے اور کہتے کہ ان کے باپ دادا انہی بتوں کی پرستش کرتے آئے ہیں وہ بھی انہی کی عبادت کریں گے۔ محمدؐ کو وہ رسول اللہ ماننے پر تیار نہ تھے کیونکہ وہ بھی انہیں جیسے ایک انسان ہیں۔ وہ رسول اللہ کو کبھی شاعر، کبھی کاہن اور کبھی مجنون کہتے تھے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے رسولؐ آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں، سیدھے راستے پر ہیں اور قرآن غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے۔ جو لوگ آپ کی دعوت کے مقابلے میں ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں وہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں، ان کے اوپر خود ان کی شامتِ اعمال مسلط کر دی جاتی ہے اور پھر انہیں توفیقِ ایمان نصیب نہیں ہوتی۔ آپ تو اس شخص کو خبردار کر سکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے۔ ایسے شخص کو مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دے دیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انہیں مثال کے طور پر اس بستی والوں کا قصہ سناؤ جبکہ اس میں رسول آئے تھے۔ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے اور انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے تیسرا مدد کے لئے بھیجا اور ان سب نے کہا "ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں"۔ بستی والوں نے کہا "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان، اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے۔ تم محض جھوٹ بولتے ہو۔" (13:36 تا 15) رسولوں نے کہا "ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔" بستی والے کہنے لگے "ہم تو تمہیں اپنے لئے فالِ بد سمجھتے ہیں۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے۔ اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے۔" رسولوں نے جواب دیا "تمہاری فالِ بد تو تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کیا یہ باتیں تم اس لئے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔"

اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا "اے میری قوم کے لوگو، رسولوں کی پیروی اختیار کر لو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔ آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تم نے پلٹ کر جانا ہے۔ کیا میں اسے چھوڑ کر اور معبود بنا لوں حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا، تم بھی میری بات مان لو۔"

آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور اس شخص سے کہہ دیا کہ "داخل ہو جاؤ جنت میں"۔ اس نے کہا "کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا۔" اس کے بعد اس قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا۔ ہمیں لشکر بھیجنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ بس ایک دھماکہ ہوا اور یکایک وہ بجھ کر رہ گئے۔ افسوس بندوں کے حال پر، جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے۔ ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے۔(36:16 تا 32) یہ تھے اصحاب یاسین جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سورہ یسین میں کیا ہے۔

بعض قدیم مفسرین نے اس بستی سے مراد شام کا شہر انطاکیہ لیا ہے اور جن رسولوں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے انہیں حضرت عیسیٰ نے تبلیغ کے لئے بھیجا تھا۔ اس قصہ کے مطابق اس زمانہ میں انطیخش اس علاقے کا بادشاہ تھا لیکن یہ سارا قصہ عیسائیوں کی غیر مستند روایات سے اخذ کیا گیا ہے اور تاریخی حیثیت سے بالکل بے بنیاد ہے۔ انطاکیہ میں سلوقی خاندان (Seeveid dynasty) کے 13 بادشاہ انٹوکس (Antiochus) کے نام سے گزرے ہیں اور اس نام کے آخری فرمانروا کی حکومت، بلکہ اس خاندان کی حکومت بھی 65 ق م میں ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں انطاکیہ سمیت شام و فلسطین کا پورا علاقہ رومیوں کے زیر نگین تھا۔ پھر عیسائیوں کی کسی مستند روایت سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ خود حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں میں سے کسی کو تبلیغ کے لئے انطاکیہ بھیجا ہو۔ اس کے برعکس بائبل کی کتاب اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ صلیب کے چند سال بعد عیسائی مبلغین پہلی مرتبہ وہاں پہنچے۔ قرآن نے جس بستی کا ذکر کیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے جن کی دعوت رد کرنے کی پاداش میں اس بستی کو عذاب الٰہی کا سامنا کرنا پڑا۔ تاریخ میں اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انطاکیہ پر ایسی کوئی تباہی نازل ہوئی ہو جسے انکار رسالت کی بنا پر عذاب قرار دیا جا سکتا ہو، لہٰذا یہ بات ناقابل قبول ہے کہ اس بستی سے مراد انطاکیہ ہے۔

قرآن یا حدیث میں اس تباہ ہونے والی بستی کا تعین نہیں کیا گیا۔ نہ ہی یہ معلوم ہے کہ یہ رسول کون تھے اور کس زمانے میں بھیجے گئے تھے۔ قرآن جس غرض سے یہ قصہ بیان کرتا ہے اسے سمجھنے کے لئے بستی کا نام اور رسولوں کے نام معلوم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قصے کے بیان کرنے کی غرض قریش کے لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ تم ہٹ دھرمی، تعصب اور انکار حق کی اسی روش پر چل رہے ہو جس پر اس بستی کے لوگ چلے تھے اور اسی انجام سے دوچار ہونے کی تیاری کر رہے ہو جس سے وہ دوچار ہوئے تھے۔

اس بستی کے لوگ اور کفار مکہ دونوں کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو انسان ہے، کھانا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ یہ رسول بشر کے سوا آخر اور کیا ہے۔ پھر تم آنکھوں دیکھتے اس کے جادو کے شکار ہو جاؤ گے۔ یہی استدلال قوم عاد کا حضرت ہودؑ کے متعلق، قوم ثمود کا حضرت صالحؑ کے متعلق اور دیگر اقوام کا تقریباً تمام انبیاء کے متعلق تھا۔ یہی جاہلانہ خیال ہر زمانے میں لوگوں کو ہدایت قبول کرنے سے باز رکھتا تھا اور اسی بنا پر قوموں کی شامت آئی۔ قرآن یہ واضح کرتا ہے کہ "ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے تھے وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔" اس طرح کفار مکہ کو سمجھانے کے لئے اصحاب یاسین کی مثال دی گئی۔

◆◆◆

منظومات

ایوب خاور

کون ہیں وہ بدبخت

کون ہیں وہ بدبخت
جو کلی کو پھول بننے سے پہلے
پتی پتی کر کے
اڑا دیتے ہیں جس بھری فصلوں کی بے بس
مٹی میں
بے آباد مکانوں کی زندگی دیواروں کے بیچ
سسکتے ہوئے سناٹے میں
کون ہیں وہ پتھر دل لوگ؟
جو ہنستے اور بستے کو رو دیتے ہیں
بچپن کی معصومیت کو
جہنم کی اذیت سے زیادہ گہرے دکھ کے
اندھیرے میں
جو دھکیل دیتے ہیں
ایک بے آباد بچپن کے دروازوں کو
کون ہیں وہ پتھر دل انسان نما لوگ
کون ہیں......؟
(اے میرے خدا)
کون ہے تجھ سے بڑا... ایسا کہ وہ
تجھ سے زیادہ وہ کون جانتا ہے
جو ہماری بچیوں کا قتل ہوتے ہوئے دیکھتا
آ رہا ہے
یہاں اس دنیا میں
یہ مظلوم رہیں گے!!

OOO

صفدر صدیق رضی

ویلنٹائن ڈے

دیکھنے کس کے لیے بیٹھے ہیں
کون سے آئے ہیں
نقش رنگ و اشارہ
اس کو اور محبت سے مگر
یہ پھول
کس کی پھول ہیں
یہ کس کی خوشبو سے کھلے پھول ہیں
مجھے محبت کرنے والی
ایک ہاتھ کی
میری محبوبہ
خوشبو رنگ اور اداسی
یہ کھلے پھول
اس کی خوشبو کو چراتے
میری جان
اس کی آواز

OOO

افتخار بخاری

چھوٹا سا باغ

ایک دن کی بہار میں لگایا گیا چھوٹا سا باغ
جو جنگل میں اترا تھا
اس کے ساتھ ہوتے تھے
جیسے وہ اٹھا کئی سال پہلے تھا
ہر گزرتے سال کے ساتھ ان کی ملاقات ہو رہی تھی جا
رہا ہے
اس کے بڑے میں ماں باپ تحریر ہوا وہ
آتے ہیں
کیا ہم بیٹھ کر اسے دیکھنے کے لیے
اور جب رات باغ میں ایک بلبل کی اداس آواز
آتی ہے
دل کے وقت آپ اسے کبھی نہیں سن سکتے

ترجمہ: [illegible] (عراقی)

OOO

شہزاد نیر

پسینے کی جھیل

میں نے پیشانی کی ہتھیلی خالی کر دی
تاکہ وہ اپنے جیب سے رکھ لے
اپنے تمام احترام
اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے
اور مجھ سے فائدہ اٹھایا
پھر کہے ہم دونوں
مقدار سے وہ
اتار دے میں!
بدنصیبی سے بڑا اعتماد
اور دولت سے بڑا اعتماد
کہیں بڑا نہیں ہوتا ناں؟
وہ مجھ سے پسینے سے اپنی طرف بڑھتا ہے
میں جو کبھی آنکھوں تک لگا دیتا ہے
کسی اور کو نیند دینے کے لیے
زمین پر انسان کم ہیں
زخموں کے برتن
یہ وہ جھیل ہے
پسینے کے قطروں سے بنی جھیل
جس کے مالک وہ ہیں
جو خود بیچ نہیں سکتے

OOO

نصرت یاسمین

آخری جنگ

میں چوراہے کے بیچوں بیچ کھڑی ہوں
مجھ پہ چاروں طرف سے وار ہو رہا ہے
مجھے جنگ لڑنی ہے
مارنا ہے یا مر جانا ہے
کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے
مگر
میں تو اکیلی ہوں
ہتھیار اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں
میرے بازو کمزور ہیں اور ہتھیار بھاری
کیونکہ میں صنفِ نازک ہوں
لیکن
میں لڑوں گی
میں اپنی قوتِ ارادی کو دو دھاری تلوار بناؤں گی
اور جنگ لڑوں گی
اس خون کے آخری قطرے کی قسم
جو میرے جسم میں ہے
میں لڑوں گی
اس مقدس دودھ کے آخری قطرے کی قسم
جو میری ماں نے مجھے پلایا تھا
میں لڑوں گی
اس جان دینے والے کی قسم
جو صرف ایک بار ہمارے جسم میں آتا ہے
میں لڑوں گی
اس محبت کی قسم
جو میں نے تمہاری آنکھوں میں اس وقت پہلی
بار دیکھی
جب میں اس جذبے سے آشنا تھی
میں لڑوں گی
اور لڑتے لڑتے جان دے دوں گی
کیونکہ صدیوں سے روایت یہی ہے
سچ ہی قربانی مانگتا ہے
ہمیشہ سچائی سولی چڑھتی ہے
اور اس طرح ہمیشہ زندہ رہتی ہے
ہمیشہ زندہ رہتی ہے

OOO

قیصر نجفی

احساس

میں ایک شاعر ہوں
میری شاعری کا موضوع محبت ہے
محبت جو میری اولین اولاد ہے — جس کی
محبت میرے ضمیر میں رکھ دی گئی ہے
میری بیوی اکثر مجھ سے کہتی ہے
یہ دوسری عورت کے لیے
تمہارے ضمیر میں رکھی ہوئی محبت جاگ اٹھتی ہے
یہ دوسری عورت کو
تم اپنی اولادِ اوّل کہا کرتے ہو
گھر سے لے
تمہاری محبت جاگتی ہے
اور نہ مجھے
تم اپنی کوکھ کی اولاد کہتے ہو
کیا میں عورت نہیں ہوں؟

OOO

ممتاز راشد لاہوری

قطعات

شاعری

خوش نگاہی تھی، کبھی تھی مے کشی
ساتھ رہتی تھی کبھی آوارگی
کھو گئے ہیں اب مرے باقی ہنر
اب حوالہ ہے مرا بس شاعری

ہوا پانی

مریخ میں جو ہیں تماشے
یہ بھی اک شخص کا مراقی ہے
کون جا کر وہاں بسے راشد
جس زمیں پہ ہوا نہ پانی ہے

درویش

سہل گفتار میں ہو گے کتنا
رنگ و آہنگ سمو گے کتنا
کچھ تو دنیا کی رحمتیں سمجھو
اور درویش رہو گے کتنا؟

انا پروری

ظالم سے مجھ میں پہلے ہی جھکنی انا ہے
میرا کوئی قدم دو حق سے ہٹا نہیں
میں تیرے سامنے ہوں بظاہر جھکا ہوا
تو جانتا ہے، سر مرا ہرگز جھکا نہیں

کمینی دنیا

راس آئے نہ شب و مہر و نجوم
راس آئی نہ نکلی دنیا
کچھ کمینوں کے کھیلنے کے لیے
کھل گئی مجھ پہ کمینی دنیا

OOO

شازیہ رباب

نظم

جو عشق سر بلند، محبت کی خیر ہو
دیوانگی کی رسم و روایت کی خیر ہو
اک رب تو جو من پہ سجائی گئی ہے جو
اس دلکشی و حقیقی طلعت کی خیر ہو
مٹی کے تحفظ سے عقلوں نے تمام دن
افلاس کی ماری ہوئی عورت کی خیر ہو
جو بھال آ گیا ہے خدا کی زمین پر
میدان چاہتا ہے کہ بربریت کی خیر ہو
ہے سر بلند میر ارتقیں کے شہر میں
تجھ سے جڑی ہوئی مری نسبت کی خیر ہو
لے آئی مجھ کو تیرے جہانِ شباب میں
میرے بدن میں تیری وحشت کی خیر ہو
دے کر چلا گیا ہے مروت وہ حلیک میں
میرے خلوص و میری محبت کی خیر ہو
ہے بجھی زمین تھکن سے بدن ہے چور
اے آگہی تیری عنایت کی خیر ہو
معصوم ہے فضا سحر سے شدید کی کرن
آشاؤں کی سلامتی، اشرف کی خیر ہو
جاگیروں میں وہ کیل لگاتے ہیں
مرد و زن کی عزت و حرمت کی خیر ہو
بستی کے اس سفر میں دعا کر رہی ہوں میں
تیرے فراز کی ڈری رفعت کی خیر ہو
لفظوں سے رابطہ ہے دراکوں سے کوئی کلام
اے ہجر یار تیری سلطنت کی خیر ہو

OOO

صادق نصیر (کینیڈا)

رینگتے آدمی

بس دیوار
اور آئینہ
اور دروازہ کوئی
جیسے کہ روشنی
کچھ نظر نہیں آتا جب
کان لگا کر
بس دیوار و در
چھپکلیاں، کاکروچ
اور سانپ اس دیوار پر رکا ہوا سانپ کوئی
رینگتے رینگتے رہتے ہیں بہت سے بات کوئی
کچھ نظر نہیں آتا تو وہم سا رہتا ہے
کان لگائے کچھ سنتے ہیں
اور ان جیسے ہی کچھ آدمی اور عورتیں
تیرگی میں لپٹے ہوئے
بند شعوری کوٹھڑی میں
عقل بند لوگ
کچھ آدمی، کچھ عورتیں
اور کچھ چند بچے
عقل بند
بس دیوار
کان لگائے
شعور کی آنکھیں بند کیے
چھپکلیوں، سانپوں اور
کاکروچوں کی طرح رینگتے کچھ جھانکتے ہیں
کوشش میں
سننے کے لیے چاپ چاپ چلتے رینگتے عقل
میں پڑے
عقل بند
سنا کچھ سن لیتے ہیں
سن کر چلتے ہیں
کانوں کے کچے
جن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جو آتا ہے سمجھ میں وہ صرف
زہر ہوتا ہے
جو ان عقل بندوں نے اپنی کیمیا گری سے
امرت پیالی سرگوشیوں سے بنایا ہے
یہ بزدل سے حشرات چھپکلیاں، سانپ اور بچھو
اور ان جیسے کچھ مرد و عورتیں اور کچھ بچے
ہو گئیں کسی عقل مند کے قدموں کی چاپ سنتے
ہیں
اپنی ان کی کی غلاظتی کے زہر سے
عقل بند
عقل مندوں کو ڈنک مار کر
سارا زہر انڈیل کر
دیوار و در میں دیوار
چھپنے لگتے ہیں
کان سن لیتے چپ چاپ
جھانکتے ہیں تم کوشش میں
بے بند تعلق
تیرہ و تاریک
شعور کی بندگلیوں میں
جہاں نہ آئینہ اور نہ کوئی روزن

OOO

ندیم فراز

نظم

وقت کی لکیروں پر
چل رہا ہوں کب سے میں
اور تم نہیں ملتے
عکس جیسے دریا میں
دور ہو کے میرا ہے
تم بھی ایسے میرے ہو
پھر بھی تو سدا سے سا
روح سے لپٹتے ہو
وقت کی گہرائی میں
یاد کی جدائی میں
ساتھ ساتھ چلتے ہو
دھوپ دھوپ جلتے ہو
شام کے کنارے تک
پھر مگر نہیں ملتے

OOO

ڈاکٹر فوقیہ مشتاق (امریکہ)

مجھے سنبھالو

میں وقت سے تیز چل رہی ہوں
مجھے پتا ہے
خلا میں تحلیل ہوتی جاؤں
دھواں دھواں یہ وجود میرا
خلا میں پرواز کر رہا ہے
بکھر رہا ہے
یہ جانتا ہے کہ جا نہ پائے
خلا کہاں تک ہے
آسماں کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں
مجھے سنبھالو
مجھے سنبھالو
وجود میرا
خلا سے آگے نکل رہا ہے
عجیب افلاک میں چل رہا ہے
پگھل رہا ہے

OOO

اظہر جاوید

ضد

تمہیں ضد ہے کہ اقرار وفا تم سے نہیں ہوگا
مری تقدیر میں رنگ حنا تم سے نہیں ہوگا
تمہیں منظور ہے شاید مرا گھٹ گھٹ کے ہی مرنا
تمہارے فیصلے پر اب سر تسلیم خم ہوگا
میں اپنے ہونٹ سی لوں گا
یہ جی ہے یونہی جی لوں گا
تمہارے نام کی تصویر کو دل میں چھپا لوں گا
تمہارے درد اپنے ہجر کو میں آزما لوں گا
مگر اک بات میں پوچھوں ۔۔۔؟
تمہیں اپنی قسم تم سچ بتا دو گے
تمہارے دل میں میرے نام سے ہلچل نہیں ہوتی؟
مرے خط پڑھ کے جذبوں میں کوئی طوفاں نہیں اٹھتا؟
بھری راتوں میں میری یاد کی شمعیں نہیں جلتیں؟
تمہاری دھڑکنوں میں کیا مری سوچیں نہیں چلتیں؟
تو پھر تم نے اداسی کی ردا کیوں اوڑھ رکھی ہے؟
یہ دل میں طوفاں رکھا ہے
بہت ہے بس یہی تم نے مجھے بس یاد رکھا
بھلایا بھی تو اس کے ساتھ کچھ یاد سا رکھا
ہر اک احساس کو اپنے تصور میں بسا رکھا
اگر اس عشق سے تم کو کوئی تسکین ملتی ہے
مرے تم جیسے کا تو کرب ہے کم ہوگا
تمہارے فیصلے پر اب سر تسلیم خم ہوگا
مرے ظلم جیسے کا تو اب کم ہوگا

OOO

تقریب کُچھ بھی سہی!
ہمیشہ شاداب
وشگفتہ رہئیے!
Tibet

افسانے

ہم

محمود احمد قاضی

مختصر تعارف

تاریخ پیدائش یکم ستمبر 1945ء، مقام گوجرانوالہ۔ افسانوں کی پانچ کتابیں، دو ناولٹ آ چکے ہیں۔ اکادمی ادبیات کی طرف سے ایک افسانے کی کتاب اور ایک لاطینی امریکی افسانوں کے ترجمے کی کتاب پر ایوارڈ مل چکا ہے۔ 1967ء سے فکشن لکھنا شروع کیا۔ گوجرانوالہ شہر پر ایک مشہور زمانہ کتاب "یہ ہے گوجرانوالہ" آپ کی تصنیف ہے۔

محبت کو کس نے دیکھا ہے؟ نفرت کو بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاں ان دونوں کو ہم نے ہوتے ہوئے ضرور دیکھا ہے۔ دیکھ رہے ہیں، دیکھتے رہیں گے۔ ہم ان الفاظ کے گواہ ہیں اور ان کے ذائقوں کو چکھنے والے بھی ہیں۔ سب رشتے، قبیح و دلیس کہا۔ لیکن ہم بندوں کا دلیس ہوتا ہے اور پردیس۔ ہم بندے فطرتی اور محبتی بھی۔ محبت، الفت کے دریا کا پانی۔ نفرت، تپتی ریت کا صحرا۔ لیکن یہاں بھی روئیدگی ہو سکتی ہے۔ سرسبز جھاڑیاں نظر آ سکتی ہیں اور کبھی کبھی ہمیں یہاں کالا ہرن بھی دکھائی دے سکتا ہے جس کو شکار کرتے وقت ہم محبت کو بھول جاتے ہیں۔ کیا فطرت کے خلاف یہ ہماری نفرت کا اظہار نہیں؟ محض کھاؤ پیو ہی سب کچھ نہیں۔

محبت، انسان کا عین فطرت کے مطابق ایک مظہر ہے۔ جب ہم اس کے خلاف جاتے ہیں تو وہ جذبہ جنم لیتا ہے جس کا کردار ہمارا ہمارے احساس کے پنجرے کو خنجر کی طرح زخمی کرتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ نفرت محبت کے اندر ہی کہیں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی لئے تو ہم سمندر میں تیرتی مچھلیں اور ان کے دوسرے ہم جنس کو اپنی ہوس کا شکار کرتے ہیں۔ زبان پر ...... شکار اور جا بجا گئی کا ذائقہ محسوس ہوتے ہوئے بھی ہمیں تیسرے کی اور ان جیسی کڑتن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میٹھا امرود پھوگی میں تبدیل ہوتا ہے۔ نرم رسیلا رستہ رطبے پیچے میں بدل جاتا ہے۔ یہاں پاؤں دھنستے ہیں اور چہرہ اکھڑا ہوتا ہے۔ وقت لنگڑی بن جاتا ہے اور ہم بندے، صحت، صندلی مٹی تھلی۔ ہم ویلے کی چکاری کی غذا بنتے ہیں۔ تیر گم ہو جاتا ہمارے ہاتھ نہیں آتا اسے صرف عرب شکاری کھاتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے ہی کچھ ایسے ایسے ہیں کہ وہ بھاولپوری چیلیکن کا روپ دھار لیتے ہیں اور اپنے بچوں کو فاقوں سے بچانے کے لیے اپنے جسموں کا ماس نوچ نوچ کر کھلاتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ لیکن کبھی، جب بارود اور بارود ہم میں شامل ہوتے ہیں تو ذہن پر دسمانی تلذذ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم ہزاروں لاکھوں کا نقصان برداشت کرنے والے لیکن ایک ٹکے کے عوض بک جانے والے۔

نفرت: ایک تلخ حقیقت۔ ادا اور ضد کی ٹولی پر لٹکا بندہ، بندری، جانور، پرندے، جنگل، درخت، یہ سب کچھ ہماری راہ میں آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ ہم ریا کو نفرت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بلیک مومبا اور گرین مومبا کی سرشت اختیار کر لیتے ہیں۔ تب ہمارا اکا کا بھی پانی

تھیں، ماتھا۔ زمین ہماری خونریزیوں سے تھرتھر کانپتی ہے۔ یوں مٹی میں ہماری نیتوں کے فتور اور کرتوتوں کا زہر گھلتا ہے۔ ہم توسیع پسند دوسروں کے کھاتے پر قابض ہو جاتے ہیں کر و میزے، مکر سے، بھیڑیں، نازک ناز کی وجاہیاں اور ہمارے قہر، چولستان اور وہی کی طرف دھکیل دیے جاتے ہیں جہاں بچے اپنی ماؤں کی بے دودھ چھاتیوں سے لپٹے جان دے دیتے ہیں۔ جہاں موز مرتے ہوئے کسی تزئین کا اظہار بھی نہیں کر پاتے۔ ہم جنگل اور صحیفے، ساری خوبو کو ٹوکری میں پھونک دیتے ہیں۔ دوسروں کو اور خود کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ شیر، جنگل، کوئل، کبوتر، تیتر، جنگل کا گھر تک ہمارے فریب کا شکار ہو کر جل بھن جاتے ہیں۔ ان میں سے جو کچھ حلال ہے ہم ان کے تنور بے میں روٹی کے نوالے ڈبو کر کھاتے ہیں۔ ہم ہلاکو، ہم چنگیز، تیمور، بیرون جواہر کے طلب گار سروں کے مینار بنانے والے کتابوں کو دریاؤں میں ڈبو کر ان کے حروف کی سیاہی سے پانی کو سیاہ رنگ کرتے ہیں۔ فرات کے کنارے پر کربلا برپا کرتے ہیں دوسروں کے لئے پانی بند کرتے ہیں (یہ پانی بند کرنے کا دنیا کا واحد واقع ہے) وقت یزید بن کر تخت پر بیٹھا کندھے پر بندر بٹھائے ایک ہاتھ میں تلوار لئے شرفا کے ضمیر کو میلے داموں خرید کر اپنے لئے تاریخ لکھوانے کی بھونڈی کوشش اور کاوش کرتا ہے۔ پھر ایسی قبر میں دفن ہو جاتا ہے جہاں سے گزرتے لوگ اس کی قبر پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ تاریخ اس کی سفاکی کو اس کے دربار میں کی گئی زینب کی تقریر کے ذریعے اجاگر کرتی رہے گی۔ مہلک جذبے کی نارِ دوزخ ہی کی محبت کا پھول تیر چلاتا رہے گا۔

محبت: گلے اگیندے، گلاب اور چنبیلی کے پھول بکھیرتی ہے۔ / نفرت: کانٹے بوتی ہے۔ / محبت: ان کانٹوں کو ہٹاتی ہے۔ زخموں پر پھاہے رکھتی ہے۔ / محبت: ایک الھڑ لڑکی کا وہ چہرہ ہے جو وقت کی کھڑکی سے لگا کبھی نہیں مرتا ہے۔ / نفرت: کیکر کے کانٹوں سے بھری وہ شاخ ہے جس کے ساتھ البتہ نرم پھول بھی ہوتے ہیں۔ یہی درخت صاف و شفاف گوند بھی فراہم کرتا ہے۔

محبت: تلخی کو نرمی میں تبدیل کرتی ہے۔ پھل کی ترشی کو مٹھاس میں بدلتی ہے۔ یہ دونوں جذبے محبت اور نفرت تاریخ کا جھول جھولتے ہمارے دوست اور دشمن بنتے ہیں۔ الجھن، الجھاؤ، کشمکش، قہر اور محبت کا گلاب جامن۔ باز کے پروں پر جنگل اور شیر لمبا سفر طے کرتے ہیں۔ جھوٹے کیا جانیں کہ سفر کے اختتام پر انہیں اسی باز کا ترنوالہ بننا ہے۔ یہ دنیا معصوم لوگوں کی جگہ نہیں۔ ہمیں فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ہمیں ظالم کا ساتھ دینا ہے یا مظلوم کا۔ راستے تو سارے ہی جنگلے کو موجود ہوتے ہیں لیکن ہمیں کڑوے کو تھو تھو اور میٹھے کو ہپ ہپ کرنا ہوتا ہے۔ ہمارا پیار مصلحت، ہمارے وعدے لیاں ... قسم جاپایاں روتا۔

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے   رو پڑا وہ شخص مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے

آنسو والے کے رولے دیتے ہیں۔ شاعر شاعری کرتا رہتا ہے۔ رنگ میں بھنگ، سیلاب، تحرک، ہیر، شیریں، ٹرک، رستم، شیخ، ہلے کی عشقی دھن، ادھر لے سب کچھ ہم ہی تو ہیں۔ ہمارے اپنے ہیں۔ لڑکی آؤ تمہیں محبت کے گر سکھائیں۔ لڑکے آؤ تمہیں نفرت سے دور رہنے کی ترکیب بتائیں۔ گلی میں، محلے میں، ایک ماں باپ اور بچی ڈال کر کس طرح رہا جاتا ہے۔ اور شعلہ، عمیر، سے کی بات تمہیں بتائیں۔ دکھ درد سکھ پاس۔ اس کا جشن کریں۔ محبت: گلی کے آس پاس اپنی من پسند لڑکی کی چاہ میں دیوانگی کے آس پاس منڈلاتا لڑکا ہے۔ نفرت: پڑوس میں کلاس ادا، روٹھے مارنا، لڑکی کو ڈرانا دھمکانا اور احساس ہے۔ محبت اور نفرت ہم ہر وقت اس کی سرحد کے آس پاس ہی تو منڈلاتے ہیں۔ ہم محبت اور نفرت کو جنم دینے والے۔ ہم دنیا ہیں۔

◆◆◆

لاٹری

عطیہ سیّد

مختصر تعارف

عطیہ سید اسی کی دہائی میں ابھرنے والی وہ منفرد اور صاحب اسلوب مصنفہ ہیں جنہوں نے بہت جلد دنیائے ادب میں اپنا مقام بنا لیا۔ 1995 میں شائع ہونے والی ان کی پہلی کتاب ''شہر ہول'' کو Favourite Fiction of the year(Harlod,karachi) نے قرار دیا۔ ''شہر ہول'' کے بعد ان کے ناول ''بگولہ'' اور افسانوں کے مجموعے (حکایات جنوں، وحشت، بارش اور رات، دریا کنارے) مطبوعہ شکل میں سامنے آئے۔ ان کا تازہ ترین ناول ''اور چاند سرخ ہو گیا'' ابھی شائع ہوا ہے۔ ان خدمات کی بنا پر انہیں حکومت پاکستان نے 1916 میں صدارتی اعزاز تمغہ امتیاز سے اور استنبول یونیورسٹی (استنبول ترکی) نے Life Time Achievement Award سے نوازا۔

آج میرے پاس ایک خبر ہے کہانی ہے اور کل مجھے اپنا ہفتہ وار کالم لکھنا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی اتنی اہم خبر نہیں، یہ خبر علیمہ بی بی کی ہے جس کا تعلق ایک دیہاتی علاقے تلخ آباد سے تھا۔ تلخ آباد ایک قصبہ نما گاؤں یا گاؤں نما قصبہ ہے جو دو یا تین سو گھروں پر مشتمل ہے۔ یہاں وقت جوہڑ کے پانی کی صورت ٹھہرا ہوا ہے، تاریخ کی رفتار سے یہاں کی گھڑی کی سوئیوں کا کوئی سروکار نہیں۔ کوئی حکمران آئے جائے، انھیں کیا۔ مغل آئے۔ بس کہیں دور یا کہیں ادھر اُدھر کے چھوٹے میدانوں میں بس گئے۔ انگریز آئے ـــ چلے گئے۔ پاک و ہندوستان آزاد ہوا ـــ پاکستان قائم ہوا ـــ مگر تب ان کے دن بدلے ـــ نہ راتیں۔ وہی پتلی گلیوں میں بنے کچے پکے ـــ خستہ حال مکان، بھینسیں اور ڈھور ان کا کل سرمایہ تھے۔ ہاں انگریزوں کے وقتوں کا بنا ایک تھانہ یا تھانہ نما کوئی چیز یہاں موجود تھی جو اینٹوں کا بنا ہوا ایسا کمرہ تھا جس کے ایک طرف لوہے کی پنجرہ نما حوالات تھی۔ کمرے میں ایک میز تھی۔ ساتھ میں کرسی رکھی تھی۔ جانے وہ کس لیے تھی۔ تھانے دار اور پھر محرر کے لیے! سپاہی غریب تو پنجرہ نما حوالات کے سامنے سٹول پر بیٹھتا تھا۔ ویسے اس قصبے میں جرم شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ ہوتا بھی تو بہت سیدھا سادہ اور غیر پیچیدہ۔

اس قصبہ نما گاؤں کے بیچوں بیچ قدیم برگد کا درخت تھا جس کے نیچے بچے پیڑھیاں ٹاٹوں پر بیٹھے رٹا لگاتے رہتے تھے۔ ''ایک دونی ـــ دو دونی چار۔'' اسی برگد کے نیچے علیمہ بی بی نے پہاڑے اور قرآن کی چند آیات حفظ کی تھیں۔ اس کا گھر بھی قریب ہی تھا۔ اس سکول کے ـــ اگر اسے سکول کہا جا سکتا ہو تو۔

باپ کی وفات کے بعد وہ اور اس کی ماں سکول کے نزدیک ایک گلی میں رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی تیسرا نہ تھا۔ ہاں اس کا ایک بھائی ہوا کرتا تھا۔ جو روزی کی تلاش میں پردیس سدھارا اور کبھی نہ لوٹا۔ وہ اور اس کی ماں جس مکان میں رہائش پذیر تھیں

قصبے کے اکثر گھروں کی طرح پرانے وقتوں کا تھا۔ اس کا صحن لمبوترا تھا جس کے آخری سرے پر دو کمرے تھے — ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ دونوں کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔ بڑے کمرے میں گندم اور باجرہ وغیرہ ذخیرہ کیے جاتے تھے۔ جب سے ملیحہ کا باپ فوت ہوا تھا شریکے ماں بیٹی کے حصے کا اناج ان کے ہاں پہنچا جاتے تھے، اگرچہ کھیتوں پر انہی کا قبضہ تھا اور انہیں یقین تھا کہ وہ انہی کے پاس رہیں گی۔ دوسرا کمرہ چھوٹا سا تھا اور برآمدے کے اس کونے میں تھا جس کے سامنے رسوئی تھی۔ ماں بیٹی اس کمرے میں سوتی تھیں کہ تین اطراف سے بند ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو محصور اور محفوظ پاتی تھیں۔

ملیحہ کو اس کی ماں پیار سے ملو پکارتی تھی۔ ملو صبح سویرے صحن میں جھاڑو لگاتی، آٹا گوندھتی۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیتی۔ اماں کو کندھے سے ہلا کر جگاتی تاکہ دونوں ماں بیٹی مل کر ناشتہ کر سکیں۔ ناشتہ کیا تھا بس رات کی روکھی سوکھی روٹی پانی سے تر کر کے اور ہلکا سا تیل لگا کر تلی جاتی اور گڑ والی چائے۔ یہ سب کچھ ان کے لیے کسی نعمت کبریٰ سے کم نہیں تھا۔ وہ وہ چائے کے ہر گھونٹ اور روٹی کے نوالے کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرتیں۔ اماں صبح صبح اپنی بوڑھی ہڈیوں کے بوجھ تلے دب کر دوبارہ بستر پر جا گرتی۔ البتہ ملو ناشتے سے فارغ ہو کر فرصت کا وقت بڑے کمرے میں اناج کے ذخیرے کے ساتھ گزارتی۔ جانے کیوں اسے اُس کمرے کی دہلیز پر ٹانگیں پسارے چوکھٹ سے ٹیک لگائے، روشندانوں سے باہر نیلے آسمان کو تکتی رہتی اور جانے کیا سوچتی رہتی۔ ویسے کھلا آسمان تو صحن سے بھی دکھائی دیتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب وہ روشن دانوں سے باہر دیکھتی تو ایسے میں اکثر ایک لالڑی اس کے قریب آ کر پھڑ پھڑاتی۔ ملو نے جالے اتارنے کے لیے جو لمبا بانس کمرے میں رکھا تھا وہ اس کی مدد سے ایک روشن دان کھول دیتی۔ لالڑی روشندان کے اندر بنے ہوئے طاق پر آ بیٹھتی۔ پر پھیلا کر اور کبھی انہیں سمیٹ کر پھدکتی رہتی۔ شاید وہ اناج کے دانے چگنے آتی تھی۔

اس وقت وہ ملو کو بہت پیاری لگتی اور اسے اس پر ترس بھی آتا۔ "ہائے! بیچاری بھوکی ہے۔" پھر وہ ہتھیلی پر چند دانے رکھ کر اسے پکارتی اور کھانے کی دعوت کا اشارہ دیتی۔ پہلے پہل تو وہ جھجک محسوس کرتی مگر دانوں کی خوشبو سے وہ ملو کے اشارے کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ پہلی بار تو وہ ایک دانہ چگ کے واپس تیزی سے روشن دان میں جا بیٹھتی۔ پھر وقت نے بے باکی یا ضرورت نے مجبور کر دیا اور وہ بڑے آرام سے ملو بی بی کی ہتھیلی سے دانے چگنے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ ملو بی بی کی سہیلی بن گئی۔ جس دن لالڑی نہ آتی ملو کو کمی سی محسوس ہوتی۔ ملو بی بی کا دوسرا شغل دوپہر سے شام تک سونے والی اماں جب خراٹے لے رہی ہوتی تو اناج والے کمرے کی کھڑکی کھول کر تا حد نظر پھیلے ہوئے کھیتوں کی لہلہاتی ہریالی کو تکنا تھا۔ جب ہری ہری فصلیں ہوا کے ساتھ رقص کرتیں تو اسے عجیب قسم کی فرحت کا احساس ہوتا۔ وہ سورج ڈھلنے تک ان کا نظارہ کرتی۔

ایک رات جب ملو کو نیند نہیں آ رہی تھی، باہر چاندنی کھلی تھی۔ وہ بے قرار سی تھی۔ تھوڑی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھ کر بڑے کمرے میں گئی اور اس کی کھڑکی کھول کر چاندنی میں نہائے کھیتوں اور فصلوں کا نظارہ کرنے لگی۔ جب تازہ و تر ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے تن سے ٹکرایا تو سرور سا محسوس ہوا۔ پھر جانے اس کے جی میں کیا آیا کہ اس نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی اور سرسبز کھڑی فصلوں میں گھس گئی۔ اس رات کے بعد ملو کا یہ معمول بن گیا۔ ایک رات وہ ایسی گئی کہ کبھی واپس نہ آئی۔ صبح کاذب، صبح صادق میں ڈھل گئی، دھوپ سارے صحن میں بکھر گئی، لالڑی آتی اور اسے پکارتی رہی۔ لیکن کہیں سے آواز دوست نہ آئی۔ اماں بھی آدھا دن

اگلے برس ایک انھونی ہوئی۔ اسے گھر میں نہ پایا اور اناج والے کمرے کی کھلی کھڑکی دیکھ کر ایسی لڑکھڑائی کہ دوبارہ نہ سنبھل سکی۔

گاؤں والے اسے کئی دن تلاش کرتے رہے اور آخر تھک ہار کر اسے بھلانے لگے۔ مگر جب وہ بالکل مایوس ہو گئے تو دو میل پرے بہنے والے نالے کے کنارے گھنی جھاڑیوں سے اس کی لاش برآمد ہوئی جس کی شناخت گاؤں کی چند بڑی بوڑھیوں نے کی۔ جب یہ خبر مجھے ملی تو میں شیخ آباد پہنچا جہاں شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ میں اخبار کے لیے رپورٹ تیار کرنا چاہتا تھا۔ سو میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں اسٹیشن کے ایک کمرے والے تھانے میں پہنچا۔ تھانے والوں نے وقوعہ کی بابت تفصیل سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ گاؤں والوں سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس بھی صرف حیرت ہی تھی۔ البتہ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے طوبی بی بی کی بے رنگ سی رومین بیوی اور اس لڑکی کا بھی ذکر کیا جسے بقول ان کے طوبے نے پال رکھا تھا۔ میں نے شہر واپس جانے کا سوچا۔ اس خیال سے تھانے سے نکل کر ساتھ والی گلی میں داخل ہوا جو بڑی سڑک سے جا ملتی تھی۔ اس طرف تھانے کی لوہے کی سلاخوں والی کھڑکیاں بھی کھلتی تھیں۔ میں نے کھلی کھڑکیوں سے دیکھا کہ طوبی بی بی کی لاش میلی سفید چادر میں لپٹی ایک تختے پر رکھی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا اور دھڑ کو جنگلی جانوروں نے اپنے نوکیلے دانتوں سے ادھیڑ رکھا تھا۔ گلی سڑی لاش کے تعفن کو کم کرنے کے لیے اگربتیاں طاقچے میں رکھی تھیں۔ "کیا میلی چادر میں لپٹی تن دریدہ لاش وہ لڑکی طوبی بی بی ہے؟" مجھے اداسی نے گھیر لیا۔ "ایک گمنام لڑکی کی رائیگاں زندگی اور پراسرار موت ... یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے ... ایک ادھوری کہانی۔" شیخ آباد سے نکلتے ہوئے ایک بے تکا سوال ذہن میں ابھرا۔ "کیا لالڑی ابھی روشن دان میں آ کر چہکتی ہوگی ... طوطو پکارتی ہوگی یا انسانوں کی طرح اس کو بھلا دیا ہوگا؟"

◆◆◆

قواعد و ضوابط

تمام قلمی تعاون کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کو ادارہ "تخلیق" کی پالیسیوں سے اتفاق کرنا لازم و ملزوم ہے۔

☆ تحریریں صاف اور نمایاں طور پر واضح ہونی چاہئیں اور صرف Inpage فائل میں تحریر بھیجی جائے۔ ☆ کوئی تحریر واٹس ایپ، ایس ایم ایس کے ذریعے 8 اشعار سے طویل نظم یا غزل نہ بھیجی جائے۔ الفاظ کی روایت کو کفایت سے استعمال کریں۔ ☆ صرف غیر مطبوعہ تحریریں ہی تخلیق میں شائع کی جائیں گی لہٰذا ہر قلمکار اپنی تحریر کے اوپر غیر مطبوعہ کا لفظ لازمی لکھے۔ ☆ تخلیق کسی بھی قاری کو اس کی تحریر شائع ہونے یا نہ ہونے کا پرچہ شائع ہونے سے پہلے بتانے کا پابند نہیں۔ ☆ پرچہ شائع ہونے سے کم از کم ایک ماہ قبل موصول ہونے والی تحریریں ہی قابل اشاعت ہوں گی۔ آخری وقت پر بھیج کر شائع کرنے کا اصرار نہ کیا جائے۔ ☆ کوئی بھی مضمون یا تبصرہ جو مصنف براہ راست تبصرہ نگار سے لکھوائے وہ تخلیق میں قابل قبول نہیں۔ ☆ تبصرہ صرف تخلیق کو بھیجی گئی دو کتابوں کی موصولی پر تخلیق اپنے تبصرہ نگار سے کرائے گا۔ ☆ تمام قلمکار اس بات کو یقینی بنائیں کہ اگر پرچہ شائع ہونے والے ماہ تک نہ ملے تو بروقت ادارے کو اطلاع دیں۔ پرچہ شائع ہونے کے دو یا تین ماہ بعد پرچہ نہ ملنے کی شکایت نہ کریں۔ ☆ تمام تخلیق ممبران پر فرض ہے کہ اگر وہ اپنا گھر تبدیل کریں تو اپنا پتہ ادارے کو فون کر کے ضرور نوٹ کروا دیا جائے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ پرچہ باقاعدگی سے پرانے پتے پر ارسال کیا جاتا ہے اور کافی عرصے بعد بتایا جاتا ہے کہ گھر تبدیل کر لیا گیا تھا۔ آپ کے تعاون سے ہی "تخلیق" آج بین الاقوامی مقام پر ہے۔

(ادارہ "تخلیق")

خوف

فرحت پروین

مختصر تعارف

فرحت پروین معروف فکشن رائٹر ہیں۔ ان کی 5 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ افسانوں کی کتاب ''کانچ کی چٹان''، ''قفس''، ناول ''صندل کا جنگل'' بہت خوبصورت کتابیں ہیں۔

اس روز اسے دیکھ کر تو مجھے رائیڈر ہیگرڈ کی "She" یاد آ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی شعلوں میں نہا کر اور نیا روپ لے کر نکلی ہو۔ ایسی ہی دمک تھی اس کے چہرے پہ بلکہ آگ آگ میں۔ سعید عثمانی بولا۔ ''اور جب وہ فرش سے اٹھی تو یوں لگا جیسے کوئی راگنی دھیرے دھیرے کومل سر سے تیور میں بدل جائے۔'' سرمد خان نے اضافہ کیا۔ ''اسے یوں فرش سے اٹھ کر پورے قد سے کھڑے دیکھ کر سرو کی تشبیہ کا حسن پہلی بار مجھ پر کھلا۔ ویسے یار سرو قامت کو قیامت کیوں کہتے ہیں۔ کیا قیامت اتنی حسین ہوگی؟'' سلیم راہی نے معصومیت سے سوال کیا۔ ''تو یوں تو شاعر بنے بیٹھے ہو اور اتنا بھی نہیں پتا کہ قیامت کو قیامت اس کی فتنہ انگیزی کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ سمجھے؟'' پروفیسر اسعد نے استادانہ انداز میں سرزنش کی۔ ''سمجھا'' سلیم راہی نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں خاموشی سے یہ سب سن رہا تھا گو کہ تجسس مجھے بھی بے چین کیے ہوئے تھا کہ آخر شعلوں میں لپک دمک والی سرو قامت، قیامت جیسی یکتائی راگنی ہے کون؟ مگر خاموش اس لئے تھا کہ میں اس بات کا بھی لطف لے رہا تھا کہ ایک ہی چیز کے لئے ہر شخص کا اس کے ذوق اور رجحان کے مطابق اظہار کتنا مختلف ہوتا ہے۔ تبھی رملہ سکن ٹائٹ جینز کو اوپر اور بلاؤز کو نیچے کھینچتی مگر اس التزام سے کہ پیٹ تھوڑا کھلا ضرور رہے اور ناف میں ڈالی ہوئی رولی کے نگینوں کی چھوٹی سی بالی دکھائی دیتی رہے، گفتگو میں آ شامل ہوئی۔ ''اس روز تو وہ بالکل کوئی ماڈل لگ رہی تھیں۔'' ''کون وہ اور کس روز؟'' اب مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔

رملہ قطعاً کر بیٹھی۔ ''محفل موسیقی والے روز۔'' اس نے میرے تجسس کو دیکھتے ہوئے قصداً ادھورا سا جواب دیا۔ ''کب؟ کس کے ہاں؟'' میرے اس سوال میں کون کا سوال بھی پنہاں تھا جس کا جواب از خود مجھے مل جاتا۔ میری چالاکی کو سمجھتے ہوئے رملہ بولی۔ ''تین ہفتے پہلے اس کے ہاں۔'' سب ہماری نوک جھونک کا مزہ لینے کے لئے خاموش رہے۔ ''ویسے یار تم نے مس کیا ہے۔ ایسی محفل کبھی کبھی ہی جمتی ہے۔ چار سنگر تھے اور ایک سے ایک بڑھ کر اچھا گانے والا۔ پھر نگار کی میزبانی۔ وہ پیچھے سب لوگ یوں جم کر بیٹھے کہ اٹھنے کا نام تک نہ لیا۔'' نوید بولا۔ ''تو نگار کے ہاں تھی محفل موسیقی'' میں نے تقریباً خود کلامی کے انداز میں کہا۔ نگار درمیانے بدن کی خوش شکل اور دلکش خاتون تھی۔ خوش اطوار، زندہ دل اور خوش مزاج جس کی وجہ سے اس کی بلا تفریق عمر و مرتبہ ہر ایک سے بے تکلف دوستی تھی۔ خوش ذوق بھی تھی اور فیاض بھی، مگر پھر بھی یہ سب Superlatives اس کے لئے تو نہیں ہو سکتے۔

"ابھی آپ لوگ کس کا ذکر کر رہے تھے؟" تجسس آخر مجھے براہِ راست سوال پر لے ہی آیا۔ "نگار کا اور کس کا۔" "نگار کا؟" میرے لہجے میں حیرت چھپی نہ رہ سکی۔ "بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے چند ماہ سے ہر کوئی مصروف تھا سو کوئی پارٹی وارٹی نہیں ہوئی، جس میں سب مل بیٹھتے اس لئے نگار کی محفلِ موسیقی میں تقریباً ہر ایک نے پورے دل سے شرکت کی مگر سب اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس روز نگار ویسی لگ رہی تھی جیسی شاید وہ تب ہوگی جب ہم نے اسے نہیں دیکھا تھا۔" کیا ہی بلیغ جواب ہے۔ سبحان اللہ۔ سب ہنسنے لگے۔ میرا مطلب ہے وہ کم از کم پہلے سے تین برس کم عمر لگ رہی تھیں۔ دہرے بدن اور گول مٹول چہرے والی نگار میں سے کیا ہی پیارے تیکھے نقش والی تیکھی سی خاتون نکل آئی تھی۔ چند ہی ماہ میں جانے کیسے اتنا وزن کم کر لیا تھا اس نے۔ ایک دم اتنی بڑی تبدیلی پر حیرت تو ہوتی ہے۔ خیر حیرت تو مجھے اس بات پر زیادہ ہو رہی تھی کہ عورت اور عورت کی تعریف۔ اتنی فراخ دلی سے اور وہ بھی حسن کی۔ تو گویا کچھ بات ضرور تھی۔ میرے دل میں بھی اشتیاق نے کروٹ لی کہ اس معجزے کا انکشاف تو کرنا چاہئے جو میری صرف دو ماہ کی غیر حاضری میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد رملہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ "نظر لگ گئی بیچاری کو۔" میں منہ سے کچھ نہ بولا صرف سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ کیونکہ میرے سوال کرنے پر وہ شرارت پر اتر آتی اور صحیح جواب نہ بتاتی۔

"اس محفلِ موسیقی سے اگلے ہی روز، معلوم نہیں کیسے سیڑھیوں سے گری۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیسے ہوا، حالانکہ نیچے فرش پر کافی موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ نہ صرف گرتے ہی بے ہوش ہو گئی بلکہ کھوپڑی کی ہڈی بھی چٹخ گئی اور اندرونی بلیڈنگ بھی ہوئی۔"

"اوہ۔" ایک صدمے کی کیفیت میں بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "ہاں، امرتا بیچاری ایمبولینس منگوا کر ایمرجنسی میں لے گئی۔" "امرتا؟"

"ہاں، اسی کے گھر تو پارٹی میں گئی ہوئی تھی۔ خوب بنی ٹھنی۔" رملہ کے لہجے میں حسد کی ہلکی سی آمیزش تھی۔ "شکر ہے کھانا ہو چکا تھا ورنہ بدمزگی ہوتی۔ کئی روز وہ آئی سی یو میں رہی اور مزید چند دن ہسپتال میں رہی۔ اب گھر پر تو ہے مگر طبیعت یکسر ابھی نہیں۔ اس کے آرام میں خلل نہ ہونے کے خیال سے کوئی دیکھنے نہیں جا رہا۔ بس اس کے گھر والوں سے فون پر خیر و عافیت دریافت کر لیتے ہیں۔" عائشہ بھابھی نے پوری تفصیل سے سارا واقعہ بتایا۔ "گویا لڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔" سلیم راہی نے اضافہ کیا۔

"نہیں اب تو کافی بہتر ہے، میری آج خود اس سے بات ہوئی ہے۔ بتا رہی تھی کہ بچے واپس اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے ہیں۔ دن میں وہ اکیلی ہوتی ہے سو آرام کرتی رہتی ہے۔ شام کو میاں آ جاتے ہیں۔ دو لوگوں کا کیا کھانا پکانا، آرام سے گزارا ہو جاتا ہے۔" سارا نے تازہ ترین اطلاع ہم تک پہنچائی۔ نگار کمیونٹی کی مقبول اور ہر دل عزیز رکن تھی۔ ہر ایک کے کام آتی تھیں۔ سو کمیونٹی نے بھی ان کا قرض چکانے میں پہل سے کام لیا۔ روزانہ کوئی نہ کوئی اظہارِ محبت کے لئے کچھ نہ کچھ پکا کر بھجوا دیتا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام کر سکے۔

میں اپنی سالانہ چھٹی گزار کر دو ماہ بعد وطن سے واپس آیا تھا۔ تو ویک اینڈ پر میرے دوست شاہد نے مجھے کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ چند اور دوست بھی مدعو تھے۔ جہاں اس وقت موضوعِ سخن نگار کے گرنے کا حادثہ تھا۔ جب میں گھر جانے کے لئے اٹھا تو عائشہ بھابھی نے مجھ سے پوچھا "نگار کا گھر تمہارے راستے میں پڑتا ہے، بھائی یہ کھانا اس کے گھر ڈراپ کرتے جاؤ گے؟" "بصد خوشی بھابھی جان۔" مجھے اپنے تجسس کی تسکین کا بہت اچھا موقع مل رہا تھا۔ مگر میں نے یوں ہی چھیڑنے کو شاہد سے کہا۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تمہاری بیوی کھانا کھلانے کے بعد بیگار ضرور لے گی۔" عائشہ بھابھی نے مسکراتے ہوئے پیکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ دروازہ خود نگار

نے کھولا۔ ایک لمحے کو تو میں ٹھٹکا گیا اور دروازے کے بیچ کھڑا رہ گیا۔ "اندر آجائیے" اس کی آواز نے مجھے تذبذب سے نکالا۔ "یہ عائشہ نے آپ کے لیے کھانا بھیجا ہے۔" "سو نائس آف ہر۔" "آئیے بیٹھیے۔" نگار نے پیکٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ گو ظفر مانع تھا مگر تسنیم، سعید اور رملہ کے کمنٹس میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس لئے میں احوال پرسی کے بہانے ذرا سی دیر کو صوفے پر ٹک گیا۔ کچھ عجیب سا پُراسرار ماحول لگ رہا تھا۔ بے شک وہ بہت مختلف لگ رہی تھی مگر اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ وہ کچھ کیا تھا وہ مجھ پر نہیں کھل رہا تھا۔ نگار صوفے کے بازو کو تھام کر بے حد احتیاط اور آہستگی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اب کیسی ہیں آپ؟ زیادہ کمزوری تو محسوس نہیں ہوتی؟" میں نے بیٹھتے میں اس کی غیر معمولی احتیاط کو کمزوری پر محمول کرتے ہوئے پوچھا۔ "نہیں بالکل نہیں۔" وہ مسکرائی۔ پھر وہ اٹھی تو اسی طرح صوفے کے بازو کا سہارا لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ نپے تلے قدموں سے دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اور آس پاس کی ہر آواز پر چونک اٹھتی تھی۔

نحیف چہرے، کشیدہ قامت اور نازک سراپے کے باوجود رملہ کے کہنے کے برعکس معلوم نہیں مجھے ایسا کیوں لگا جیسے کہ وہ دو ماہ میں دو دہائیاں گزار بیٹھی ہے۔ میں ذرا سی دیر بعد اٹھ بیٹھا۔ وہ مجھے الوداع کہنے کو اٹھی، بڑی طور سے دیکھ کر چپلوں میں پیر گھساتے، صوفے کا سہارا لیا۔ اس کا پیر وسط میں بچھے قالین کے ذرا سے پرے ہوتے کونے پر پڑا تو وہ ایک دم ٹھٹھکی اور اس کے چہرے پر گھبراہٹ سی جھلکنے لگی اور اس لمحے اس پر کئی دہائیاں اور بیت گئیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ مسکرائی۔ اپنی وہی مخصوص دلنشین میٹھی مسکراہٹ اور مجھے اپنی سوچ پر شرمندگی سی ہوئی۔ میں عجیب تذبذب اور الجھن کا شکار ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہیں نگار، سچ مچ کوئی دیومالائی کردار تو نہیں جو پل میں طرح دار اور پرکشش لگتی تو پل میں صدیوں پرانی۔ شاید وہ سچ مچ شعلوں میں نہا کر یا روپ لے کر آئی ہے۔ اور کبھی کبھی لمحاتی طور پر اس کا اصل روپ جھلک جاتا ہے۔ مجھے کچھ روز تک یہ خیال Haunt کرتا رہا اور پھر ذہن سے اتر گیا۔

ہفتے بھر بعد سب لوگ اس کے جشنِ صحت یابی کے صلاح مشورے کر رہے تھے۔ یوں بھی وہ ہر دلعزیز شخصیت تھی مگر اس کی بیماری اور رخصت کے اندیشے نے اس کی قدر و قیمت کو مزید بڑھا دیا تھا۔ کارڈز بنائے جا رہے تھے۔ تحفے پیک کیے جا رہے تھے۔ مختلف ذمہ داریاں آپس میں تقسیم کی جا رہی تھیں۔ اس دوران ایک بار پھر مجھے ان کے پسندیدہ ڈیسرٹ ان کے گھر پہنچانے کو کہا گیا۔ اس بار وہ کافی ترو تازہ نظر آ رہی تھیں۔ "اب تو آپ ٹھیک ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔ اور جواباً اس کے چہرے کے بجھے پن اور گھبراتی ہوئی نظروں نے ایک بار پھر مجھے ہلا دیا۔ وہ تھوڑے وقفے کے بعد سنبھل کر بولیں۔ "ہاں ٹھیک تو ہوں، مگر ایک خوف سا ذہن میں بیٹھ گیا ہے۔"

"کیسا خوف؟" بے ساختہ منہ سے نکل جانے والے اس سوال پر میں پشیمان سا ہو گیا۔ وہ مسکرا دی۔ کوئی خاص بات نہیں۔

"اپنے قویٰ پر کم ہوتا اختیار، اپنی ذات پر کم ہوتا اعتبار، پھر کر بیٹھنے، کچھ ہو جانے کا انکشاف۔" اور اس ایک جملے نے اس کی دیو مالائی شخصیت کو میرے سامنے آئینہ کر دیا تھا۔ وہ مبہم کچھ مجھ پر واضح ہو گیا تھا۔ "آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔" میں نے پورے دل سے تسلی دی۔ اور جواباً اس کی مسکراہٹ ویسی تھی جو کسی گمشدہ معصوم بچے کے چہرے پر آسرے کے لئے کسی بزرگ کو دیکھ کر آتی ہے۔ اااپائی، شوخ اور البیلا پن وہ اس نگار جانے کہاں کھو گئی تھی۔ واپسی میں مجھ پر منکشف ہونے والی ایک سفاک حقیقت نے مجھے دلگرفتہ کر دیا۔ تو کیا ... تو کیا یہی خوف ہوتا ہے جو ... اور باقی الفاظ میری آنکھوں میں جا کر پگھل گئے۔

◆◆◆

گلاب کے آنسو

محمد طارق علی

مختصر تعارف

محمد طارق کے خاندان نے 1947ء میں پاکستان آمد کے بعد راولپنڈی میں قیام کیا۔ انہوں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ صحافت سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ چند افسانے لکھنے کے علاوہ اردو میں درجنوں مضامین انگلش سے ترجمہ کیے۔ 2010ء میں ادب نگاری کا آغاز کیا۔ افسانے، تبصرہ ہائے کتب، مزاح نگاری کی۔ افسانوں کی بڑی تعداد چھپ چکی ہے۔ محمد طارق علی کے افسانے آپ بیتی کے رنگ میں قاری کو اپنے ساتھ جوڑتے ہیں۔ شگفتگی لیے جملوں کی بہترین کاٹ اور اختصار کے عمدہ نمونے ہیں۔

سبھی اسے بدمزاج اور مغرور سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ جانے وہ خود کو کیا سمجھتی ہے۔ ہر وقت اینٹھی رہتی ہے۔ خوب صورت ہے تو کیا، جب دیکھو منہ پھلائے رکھتی ہے، مکھ پر ہنسی کبھی نہیں کھلی۔ لیکن اصل بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ طبیعتاً سادھنا ایسی تھی نہیں۔ گو ہر وقت لیا دیا سا انداز اپنائے رکھتا، کم کم بات کرتا اور خود میں مگن رہتا۔ اس کی عادت قدرے مغرور تھی لیکن وہ ایک اچھا خاصا دھارمک ذہن رکھتی تھی۔ جب بھی موقع ملتا، خاص طور پر منگل یا اتوار کی چھٹی والے دن، وہ رام نام کی مالا جپنے کبھی اس مندر کبھی اُس مندر چلی جاتی تھی۔ چاہے تھوڑے وقت ہی کی سہی، پوجا میں گیان دھیان لگا کر اسے خوب شانتی ملتا۔ لیکن اس کے جوان دھڑکتے من میں کیا ہے، کیا کہنا چاہتا ہے، اس نے کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ بس اپنے کام سے کام رکھنا، گھر بند حصے من میں ہی مگن مصروف رہنا اور یوں ہی دن رات اپنی جیون نیا کو کھینچے رکھنا اسے منظور تھا۔ سادھنا ہر روز تڑکے اٹھ کر اشنان کرتی، تھوڑے سے وقت گیتا کا پاٹھ، اس کے بعد ہلکا سا ناشتا، اگر رکھا ہوتا تو پھر کچھ بھی نہیں، گھڑی دیکھتی اور پھر جلد جلد ایک پبلک اسکول کی طرف لپک جاتی جہاں وہ پرائمری لیول کے بچوں کو انگلش پڑھاتی تھی۔ کیا من موہ لینے والا وجود تھا اس کا، دوہرا سا قد، تیکھے نین نقش، گوری چٹی کہ بہت گوری، جیسے کسی باغ میں کھلا، جسم میں ڈھلا سفید گلاب۔ شریر سڈول، گدرایا ہوا اور عمر بھی پچیس کی۔ سادھنا کسی بھی دھڑکتے دل کی رانی بننے کے قابل تھی۔ اسے دیکھنے والوں کے خاندانوں میں کھلبلیاں مچ جاتیں اور وہ دل تھامے اسے بس دیکھتے رہ جاتے۔ جانے کیا بات تھی، سادھنا نے اپنی جانب بڑھتے والے ہر خواست گار ہاتھ کو بے نیازی سے جھٹک دیا۔ وہ کسی کو بھی اپنے دل دروازے آنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس کے من کا راستہ تاکنے والے کبھی من چلے اپنا سا منہ لیے مایوس لوٹتے رہے اور وہ تھی کہ یوں بے نیاز، بے پروا اور بے گانہ سی رہتی کہ جانے کب سے اپنے من پر منوں مٹی ڈالے بیٹھی ہے۔ بس خود میں اور اپنے من میں مگن رہتی کہ جیسے اسے آس پاس کی کچھ خبر نہ ہو، کسی کا دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جائے۔

لیکن پورے کے پورے اسکول میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ہار مان کر نہیں دے رہا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی اچانک سادھنا سے آ ملتا، اپنا مخصوص

سوال دوہراتا اور جواباً اسے ملتے وہی اکتاہٹ بھرے انکار والے شبد۔ وہ بھی ایک ہی ضدی تھا، زمانے بھر چلا جاتا، چند دن بعد دوبارہ آ ٹپکتا اور وہی سوال پھر دہراتا ـــ لیکن اس کا سوال شادی کے لیے نہ تھا، کوئی اور ہی بات تھی۔ اس بیٹے منش کا نام راجیش تھا، ایسا بیک بھی نہیں کہ من موہی بلا بھرے۔ ادھیڑ بھی نہیں، عمر پچیس کے سال کو چھوتی ہوئی لیکن یہ اور بات کہ وہ اتنی عمر کا لگتا نہیں تھا۔ ویسے خاصا سوبر اور ہارٹ، اچھے پڑھے لکھے انداز میں گفتگو کرتے اور اپنی بات منوانے کا ڈھنگ جانتا تھا۔ وہ جس سے ملتا، جہاں بھی جاتا، خوش مزاج، خوش اطوار اور خوش لباس نظر آتا۔ اور یوں وہ ہر کسی کی توجہ حاصل کر لیتا تھا۔ یہ وقت ایک عجیب چیز ہے گزرتا ہی جاتا ہے، جیسے تیسے بھی اور خوب اچھی طرح بھی۔ ساون، خوشبو دار رُت، موسم آئے اور چلے گئے۔ راجیش اور سادھنا اپنی اپنی جگہ اڑے ہوئے دونوں ہی پکے ضدی، ان میں سے نہ کوئی جھکا، نہ پیچھے ہٹا، دونوں کے دل دھڑکتے ضرور تھے لیکن ایک دوسرے کے لیے نہیں اور رہا وہی سوال، سو وہ بھی معلق کا معلق۔ کافی عرصہ پہلے سادھنا اپنی ماں کو کھو چکی تھی۔ باپ سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ کسی چھوٹی سی سرکاری جاب سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے ذاتی سٹوڈیو گھر میں اداسی زندگی گزار رہا تھا۔ سادھنا روٹین کے کاموں میں سے وقت نکال کر اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ باپ بھی اسے دل و جان سے چاہتا تھا لیکن کوشش کے باوجود نہیں جان سکا تھا کہ وہ کون سا گمبھیر دکھ اپنے من میں چھپائے پھرتی ہے، ہر وقت خاموش خاموش، کچھ بتاتی تو وہ کسی نہ کسی اپائے کا ضرور سوچتا۔ راجیش کے ماں باپ بھی کب کے سورگباش ہو چکے تھے۔ بس ایک بہن تھی، اپنے گھر اور اپنے بچوں میں مگن۔ اکثر اسے گھر بسانے کا کہتی تو وہ کوئی بات بنا کر ٹال دیتا۔ پیشہ ور راجیش تھا۔ قلم چلا کر روزی روٹی کماتا تھا۔ مختلف اشاعتی اداروں کے علاوہ وہ ایک این جی او سے وابستہ تھا، ان کے دیے ہوئے موضوعات پر کام کرتا رہتا تھا جو وہ چاہتا، فکر نہ فاقہ، اچھے موسموں، اچھے ماحول کا منتظر اور من مرضی کے کام میں مگن۔

برہو، پھیلی بہاری رُت والے دن تھے۔ انھی میں سے ایک دن راجیش ٹو دیتا کرا اپنی ہوسٹل سروے رپورٹ لکھنے بیٹھا، کچھ سوچتا اور قلم اٹھاتا تو ایک عجیب سی بات ہو جاتی۔ وہی مانوس، سفید گلاب چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا، بزاوش آنکھوں میں گہری اداسی، سرخ لبوں پر یاسیت بھری موہوم سی مسکراہٹ، وہ خاص چہرہ بے لفظ آواز میں کہتا ''تم ایک پروفیشنل رپورٹر بنے پھرتے ہو، کبھی میرے بارے میں کچھ لکھ کر دکھاؤ نا!'' لہجے میں خاصی بے تکلفی۔ راجیش ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتا اور سر جھٹک کر خیال میں آئے اس چہرے کو اور اس کے سوال کو پرے ہٹانے لگتا لیکن اسی لمحے سوچ کی ایک اور لہر راجیش کے ذہن میں سر اٹھاتی اور پھر وہ اس پھول چہرے کو بے صوتی، بے لفظی جواب دیتا ''سادھنا! لکھنا تو میں کب سے چاہ رہا ہوں، مجھے کوئی انوکھی، عجیب سی داستان تمھارے نازک وجود سے لپٹی نظر آتی ہے، لیکن معاف کرنا! تو خود تم ہی نے مجھے کبھی تھوڑی سی بھی لفٹ دینے کے قابل نہ سمجھا۔''

''تم کوشش کرو، لیکن جان رکھو، ابھی کہانی آسانی سے نہیں ملتی، رہا میری لفٹ کا سوال، تو یہ ممکن ہی نہیں کہ جب تم چاہو، جب بھی آنکھ کا اشارہ کرو، میں کسی مسمریزم زدہ وجود کی طرح تمھارے پیچھے پیچھے چلی آؤں اور جو تم پوچھو بتانے لگ جاؤں۔'' اداس دکھی چہرے کا بے آواز جواب۔ ''میں آٹھ دس مہینے سے تمہارے پیچھے پھر رہا ہوں اور تم ہو کہ ـــ'' ''بس آٹھ دس مہینے؟'' پھول چہرہ مسکرایا۔ ''ارے بھولے داستانی شہزادے، اتنی سی تپیا کو بہت کچھ سمجھے بیٹھے ہو ـــ؟'' ''میں کب تک تمھارے دوارے جاتا رہوں، آخر تم کیا ہو؟ ایسی بھی کیا ذاتی دکھ کی کتھا ہے تمہارے پاس کہ تم ہر وقت اسے چھپائے چھپائے پھرتی ہو!'' ـــ ''رہا میں، تو یہ پورے کا پورا کا ٹھمڈا دہ، یہ میرے

خوابوں کا شہر میرے لیے نت نئی کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ جب حرا نکل جاؤں کوئی نہ کوئی کہانی، مجھے بڑی پیاری معیاری جیسی بھی ہو میرے پیچھے چلی آتی ہے، میں تو بس اسے نوٹ کر کے ایک رپورٹ بنا لیتا ہوں اور رہی تمہاری اپنی "انچھوتی" کہانی تو بے شک رہنے دو، میں اب مایوس ہو چکا ہوں۔" جواب میں پھول چہرے کی مسکراہٹ تھی۔ "مایوسی ٹھیک بات نہیں۔"

"اچھا چلو شاباش، اب تم میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، مجھے یہ ضروری رپورٹ لکھنے دو، اس شام تک ایک این جی او آفس میں پہنچانا ہے، میں وہاں سے ابھی خاصی رقم ایڈوانس لے کر کھا چکا ہوں۔" راجیش اپنے رائٹنگ پیڈ پر جھک گیا۔ "ہونہہ، یہ ساوھنا بھی عجیب ہے، خواہ مخواہ خیالوں میں چلی آتی ہے میرا وقت خراب کرنے۔" اس کا قلم تیزی سے چلا، رپورٹ کا تقریباً آخر آ گئی۔

سورج ڈھلنے کا منظر دہلی شہر شام کے دل فریب رنگوں میں نہا گیا۔ اوپر آسمان پر پرندے اڑتے بادل ارغوانی رنگ کی جھلمل لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ راجیش جب این جی او کے آفس سے نکلا تو آسمانی منظر اسے بے حد بھلا لگا۔ چند لمحے وہ سر اٹھائے رنگوں کے لاجواب کھیل دیکھتا رہا۔ پھر آخر ماروتی اسٹارٹ کی۔ پہلے اس نے سوچا کہ اپنے گھر مہاراج گنج جانے کے لیے قریب ہی کملا دی کے علاقے سے شارٹ کٹ پکڑ کر نکل جائے۔ ابھی بھی دل چاہا کہ مارگ (نومبر) کی اس رنگین شام میں گھر نہیں "رائل پارک" چلنا چاہیے۔ گاڑی کو واپسی لیٹ دیا لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں، پارک تو کسی وقت بھی جایا جا سکتا ہے، مہاراج گنج روڈ پر اسی سفید گلاب چہرے والی کا گھر ہے، سورج چھپنے سے پہلے پہلے اس کے ہاں جانا چاہیے، اس سے بات کرنی چاہیے کہ اچھا خاصا چہرہ ہر وقت اداسیوں میں کیوں بھرا رہتا ہے، لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی ظالم دیوی کی قید میں پڑی ہر وقت پریشان رہتی ہے۔ پر تو ... ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہاں وہ کسی گمبھیر گھٹنا میں ضرور گھری ہوئی ہے اور ہر وقت چپ کی چادر میں خود کو چھپائے رکھتی ہے۔

سرخ ماروتی نے سپیڈ پکڑ لی۔ راجیش سوچنے لگا: نہ معلوم اس سے وہ مجھ سے ملنا چاہے گی یا نہیں، ہو جائے اس کا موڈ کیسا ہو، ہو سکتا ہے کہ اپنی نرسری کے کاموں سے فارغ ہو کر تھکی ماندی لیٹی ہو اور مجھ جیسے بیکار شخص سے ملنا تو ایک طرف، اب کچھ بھی کرنا نہ چاہتی ہو۔ اس کا باپ کہنے کو مالی ہے لیکن ہے فن کار، اس نے اپنے گھر کی دو کھلی ڈلی منزلوں میں سلیقے سے نرسری بنا کر اسے دو منزلہ باغ میں تبدیل کر رکھا ہے۔ عام آم کے علاوہ وہ گلاب، سدا بہار، سرسبز و شاداب بیلوں اور لاتعداد رنگ برنگ پھولوں سے بھرا ہوا۔ جب جاؤ پورے گھر میں خوشبوؤں کی مہکار، باغ بانی کے شوقین لوگ اکثر وہاں آتے ہیں لیکن اس سے تو وہاں کوئی منتظر ہو گا نہیں اور شاید آج کی تاریخ میں کوئی ایسی بھی شبھ گھڑی ہو کہ وہ جان بہار مجھ سے، چند منٹ کے لیے ہی، خوش دلی سے مل لے اور اس کی درد بھری کہانی میرے ہاتھ آ جائے۔"

ساوھنا دھیکاری نے خود دروازہ کھولا۔ وہی چمکتا چہرہ حسب معمول سیاہ لہریے دار بالوں میں سفید پھولوں کا گجرا، آنکھوں میں اداسی کے ٹمٹماتے دیے، ترشے شریر پہ پیازی رنگ کی ساڑھی، گہرے میرون گھیر والا بارڈر اور اسی رنگ کا بلاؤز۔ وہ سیدھی راجیش کی آنکھوں میں آ سمائی جبکہ ساوھنا کی نظریں خالی خالی اور بے پرواہی والا انداز۔

"ہیلو راجیش تم کافی دنوں کے بعد آئے ہو؟" کسی بھی جذبے سے خالی، ایک رسمی سا سوال۔

"ہاں، تمہارے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا اور بریک لگا دی۔" "وہ تو تم روز ہی گزرتے ہو لیکن اس سے "ظلاوہ بادل" کی یاد کیسے آئی؟ کوئی نت نئے پلاٹ والا آنکا چاہیے کیا؟" اس نے فوراً ہی ایک کاروباری سی بات کی، وہی تھکا تھکا اور قدرے اکتاہٹ والا

لہجہ۔ "میرا یہاں آنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں، تم جانتی ہی ہو، میں ایک سوشل رپورٹر ہوں، دکھی مہیلاؤں کی کہانیاں کھوجتا پھرتا ہوں، تم ہر وقت پھولوں سے، پودوں سے کھیلتی ہو اور میں اپنے قلم سے کاغذ پر شبد لکھتا ہوں۔ تمہارے پھول لوگوں کو خوشیاں دیتے ہیں، میں بھی اس کوشش میں لگا رہتا ہوں کہ اپنی سروے رپورٹوں سے تم ایسی مہیلاؤں کے اندر کے دکھوں کو باہر کھینچ لاؤں تا کہ سماج کو جانکاری ملے کہ معصوم مہیلاؤں کو اندر ہی اندر کیا گھن لگ رہا ہے اور اس کا اپائے کیا ہونا چاہیے"۔

"ابھی باتیں کر لیتے ہو؟" "اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی؟" "بابا ابھی باہر گئے ہیں، انہیں اپنی چھوٹی بہن کو پڑھا رہی تھی، اس کے بعد دیگر کام شروع ہونے والے ہیں۔" "مطلب یہ کہ تم اس وقت مصروف ہو، کیوں؟ پھر کسی وقت آ جاؤں؟" "تمہیں پھول چاہئیں تو بتاؤ، وہ کوئی آسان سی نسل کے ہوتے تو ابھی نکال کر دے دوں گی۔" "مجھے آج پھول نہیں لینے، پھول والی سے ملنا ہے۔" "کیوں، اس مالن سے تم ایسے مہان رپورٹر کو کیا کام آن پڑا؟" وہی منطق کا منتک لہجہ۔ "تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو، اتنی سی بات تو سمجھ سکتی ہو کہ رپورٹر کسی سے بھی مل سکتا ہے، ویسے آج میں اپنے من کی ایک بات بتاتا ہوں، جب بھی یہاں آتا ہوں صرف تم ہی سے ملنے آتا ہوں، پھولوں کا تو ایک بہانہ ہے۔" "کیوں آخر ایسا کیا ہے مجھ میں؟" سادھنا ابھی ابھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ "میرے لیے تو تم میں بہت کچھ ہے، اور تم مانو یا نہ مانو، ہر مہیلا کے وجود میں ایک نہ ایک دکھ بھری کہانی مل کر کہانیاں مکمل ہوتی ہیں، میں انہی کو کھوجتا ہوں۔" "میرے پاس اگر کوئی کہانی ہے بھی تو تم سے مطلب؟" اس نے تلک کر پوچھا، لہجہ وہی خاروں جیسی چبھن والا اور وہ بھی گھر کے اندر سے لدی تازہ پھولوں کی مہکاروں کے بیچ۔ "تھوڑا وقت دو تو میں کچھ کہوں، یہاں گھر کے گیٹ پر نہ سہی، کہیں اور سہی۔"

"سوری، میں باہر کسی سے نہیں ملتی، جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ دو۔" "سادھنا تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔" "راجیش جی، میں کوئی عام لڑکی نہیں کہ جس نے جب چاہا، ہاتھ پکڑ لیا"۔ "سادھنا، میں ہر گز تمہیں ایسی لڑکی نہیں سمجھتا اور نہ ہی میں لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہوں۔ تم حقیقت میں ایک خاص لڑکی ہو، اسی لیے کبھی کبھی تم سے ملنے آ جاتا ہوں۔ آج بھی میرے پاس کچھ وقت تھا تو آ گیا۔ لیکن لیکن تم اس وقت مصروف ہو اور مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتیں۔"

"دیدی، باہر کون ہے؟" ۔۔۔ اندر گھر میں سے ایک نو عمر لڑکی کی مسحور کن آواز جیسے قریب ہی کسی مندر میں گھنٹیاں کھنکی ہوں۔

"یہ ہماری نرسری کے پرانے گاہک ہیں، راجیش جی، سوشل رپورٹر، آج کافی دنوں کے بعد آئے ہیں۔" "تو پھر انہیں اندر ڈرائنگ روم لے آئیے نا"۔ مدھر گھنٹیاں پھر بجیں۔ چند سیکنڈ کی خاموشی، اور اسی دم ایک شاداب اور کھلی کھلی ایسے چہرے نے دروازے سے باہر جھانکا۔

"آداب راجیش جی، آئیے، اندر آئیے نا، میں نے ڈرائنگ روم کھول دیا ہے۔" "شیلا، تم ابھی پڑھائی کر رہی تھیں نا؟" سادھنا نے ڈانٹا۔ "ہاں، کافی دیر سے پڑھ رہی تھی اور اب کچھ بوریت محسوس کر رہی تھی، آئیے نا آپ دونوں اندر آئیے نا"۔ گلاب کے سے سرخ پتلے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ کی چھایا، وہ تینوں ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

"راجیش جی، آپ کیا لیں گے، پیپسی (چائے) یا کولڈ کافی؟" "تم بہت پڑھ پڑھ کر بور ہو چکی ہو، اب ان صاحب کے پاس تم ہی بیٹھو، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" سادھنا نے تیوریاں چڑھائیں اور پیر پٹختی اندر گھر میں چلی گئی۔ "تمہاری دیدی بہت غصے والی لگتی ہیں، اپنا سارا غصہ مجھ ہی پر اتارتی ہیں۔ آخر ایسی کیا غلطی کی ہے میں نے؟ ویسے وہ دوسرے لوگوں سے ٹھیک بولتی ہیں، اور یہ بات میں نے اکثر

ٹوٹ گئی ہے۔"

"آپ یا مَنّا نہ دیکھئے،" راجیش جی، "دیدی دل کی بہت اچھی ہیں لیکن اندر سے ٹوٹی ہوئی ہیں، کبھی کبھی وہ مجھ سے بھی اسی طرح بولتی ہیں، بُرا پایا ہے نہیں۔" شیلا مسکرائی۔ "ہاں لگتا ہے کہ انہیں جیون میں کوئی بڑا دکھ ملا ہے، ایک سوشل ریفارمر ہونے کے ناتے میں ان سے انھی کی کہانی سننے آیا تھا۔" "آپ سن کر کیا کریں گے؟" "ایک تو بات کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے، دوسرے سوشل ریفارمر پہلے کہانی کھوجتا ہے لکھتا بعد میں ہے۔ ان کا دکھ بٹانے میں مجھے اپنا شیئر ڈالنا ہے، اسی لیے کہانی سننا چاہتا ہوں۔ من کی یہ اچھا کب پوری ہوگی، دیکھتے ہیں۔"

"دیدی کی کہانی؟ علاوہ آپ کو ان کے منہ سے کبھی سننے کو نہیں ملے گی، وہ اپنا پرسنل دکھ کسی سے شیئر نہیں کرتیں۔ بس اپنے تک رکھتی ہیں۔ ویسے ان کو یہ دکھ ایک ساتھی (مرد) سے ملا تھا، اسی لیے انھیں ساتھی اچھے نہیں لگتے۔" "ہوں، اب سمجھا۔ سادھنا جی کی کہانی کا پہلا سرا مل گیا۔ میں نے اپنی رپورٹ میں ان کی کہانی ضرور لکھنی ہے لیکن ان کے اصلی نام کے ساتھ نہیں۔" "سر، ویسے رپورٹس لکھنے کے علاوہ آپ اور کیا کرتے ہیں؟" "میں ایک فری لانس لکھاری ہوں، دو تین چینلوں اور میگزینوں میں کام لکھتا ہوں اور کچھ بڑے لوگوں کے لیے تقریریں بھی۔" "تم ابھی یہ بتاؤ، کہانی کے لیے اپنی دیدی کو منا سکتی ہو؟"

"وعدہ نہیں، ہاں کوشش کر سکتی ہوں، وہ بھی اپنے اصرار کے بعد۔" شیلا مسکرائی۔ "ویسے قلم کار ہوں یا کوئی بھی اور کلاکار، مجھے اچھے لگتے ہیں۔" "یہ ہوئی نا بات، یہ لو میرا کارڈ، جب بھی چاہو اس چھوٹے سے قلم کار کو یاد کر لینا۔" سادھنا چائے لے آئی اور پیالیوں میں ڈال دی۔ چسکیاں لیتے ہوئے راجیش اس سے مخاطب ہوا:

"تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے پوچھا تھا: اگر کوئی پھول چاہیے تو میں لا کر دے سکتی ہوں، اگر میں پھول کا نام بتا دوں تو کیا ابھی لے آؤ گی؟" "کیا بتا ہے؟" "یہ ہی بات!" وہ مسکرایا۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسری کو دیکھا، کچھ دیر سوچا، سادھنا بولی: "اس سے پہلے بھی اس پھول کی فرمائش ایک آدھ بار ہی ملی۔ یہ ایک خاص مزاج والا پھول ہے، لیا دیا سا، اس کے پودے کو کھلی جگہوں اور کھلے ماحول میں اگنا پسند نہیں، ادھر ادھر دبکے چھپے کونوں میں، بڑے پودوں کے سائے میں اگتا اور پھول دیتا ہے، سو یہ ایک مشکل سا پھول ہے۔"

"ارے مشکل پھول یعنی بالکل تم جیسا، اسی لیے تو میں اسے لینا چاہتا ہوں، اور کسی بھی قیمت پر!" راجیش کا جواب سن کر سادھنا پہلی بار ہولے سے مسکرائی۔ "آج کل اس کا سیزن نہیں ہے۔" کورا جواب۔ "کمال ہے، ایک فلاور ایکسپرٹ یہ بات کہہ رہی ہے، اسے بھی تو کسی گرین شیڈ میں اگایا جا سکتا ہے۔" چائے ختم ہو چکی تھی، سادھنا برتن اٹھانے لگی۔ راجیش نے شیلا کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

"چھوڑیں دیدی!" شیلا برتن لے کر چلی گئی۔ اسی لمحے راجیش چلنے کے لیے اٹھا، سادھنا سے ہاتھ ملایا، ایک بے جان سا نسائی ہاتھ، جوان جذبے کی حرارت سے یکسر خالی۔ "گیٹ تک مجھے چھوڑنے نہ چلو گی؟" وہ روبوٹ کی طرح چل پڑی۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے راجیش نے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی: "بس ایک دن اور، دوسری ملاقات کا سوال ہے، دیدی جی، دکھ مجھ سا یوں نہ کرنا، زیادہ نہیں، بس چند منٹ ہی لوں گا۔" "مسٹر آپ جا سکتے ہیں۔" دروازہ دھڑاک سے بند۔ پتہ نہیں کس اندرونی دکھ نے اس کا رویہ اتنا سخت بنا دیا ہے، راجیش نے ماروتی کو آگے بڑھاتے ہوئے سوچا۔ اکتوبر کے اختتام کے ساتھ ہی جاڑا "گلابی" نہ رہا، کاٹھمنڈو کے گرد حصار باندھے اونچے پہاڑوں سے شہر

میں اتر آنے والی بے حد سرد ہوا کہہ رہی تھی کہ اب ماہ نومبر کے سرما نے آغاز لے لیا ہے۔ انہی دنوں راجیش کو اپنی پسند کا ایک تحریری کام یعنی رومانی ناول لکھنے کا آرڈر مل گیا۔ اس کی مصروفیت بڑھ گئی۔ اب اس کی سوچ کے لیے دھارے تھے۔ قلم تھا اور کاغذ کی شیٹیں تھیں۔ پبلشر کی دی ہوئی ڈیڈ لائن مکمل ڈائری پر سامنے لکھی تھی۔ یاسیت زدہ، گرم مزاج "مالن" کی یاد اب کچھ دھندلی ہو گئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی خالی لمحات میں اس کی شبیہ اچانک راجیش کے ذہن میں جھلکا جاتی تو وہ ہاتھ سے قلم رکھ دیتا۔ "بڑی عجیب لڑکی ہے۔ اکھڑ، بد مزاج، مجھ سے ہرگز بات کرنا نہیں چاہتی لیکن پھر بھی اس کے دماغ میں گھسی رہتی ہے۔ ایسا مزاج تو لیڈی ڈیانا کا بھی نہ ہوگا۔ اس کا نازک سا دل دکھوں سے بھرپور تھا اور پھر اوپر سے شاہی اصولوں اور رواجوں کی جکڑ بندیاں لیکن اس کے لبوں پر مسکراہٹ رہتی اور یہ کم بخت معمولی سی مالن، جانے خود کو کیا سمجھتی ہے۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے مزاج جیسا بھی ہے، وہ اپنی جگہ سادہ سا کردار کی پکی اور خالص مشرقی مزاج کی مالک لگتی ہے۔

" ارے ارے راجیش قلم کار، تو کہیں اس سے پیار تو نہیں کرنے لگا اور اس کی ذاتی کہانی والی بات کہیں تو نے یوں ہی تو ناول میں نہیں ڈال رکھی؟" وہ مسکرایا۔ "نہیں بالکل نہیں میرا اور اس مغرور بد زبان مالن کا بھلا کیا سمبندھ؟ وہ محض پاپجانے والی، میں قلم چلانے والا۔ لیکن دل کی دھڑکنیں راجیش کے خیال کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں!

اگلے دنوں میں ہر ماسوا کو بھول کر راجیش ناول نگاری میں کھو گیا۔ دو ماہ کی ڈیڈ لائن تھی لیکن اس سے چند دن قبل ہی اس کا پہلا ناول مکمل ہو گیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس دوران میں گزرنے والے شب و روز بڑے جاں گسل تھے لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی بھرپور محنت پھل ضرور لائے گی۔ کاٹھمنڈو کے مضافاتی علاقے پالا جو میں واقع "ویلی پبلک سکول" کی پرنسپل مسز ودیا دھیکاری راجیش کی دوست تھی۔ ایک اتوار کی روشن صبح اسکول میں سالانہ فنکشن تھا۔ اسی سلسلے میں وہاں بچوں کا ایک تقریری مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ مقابلے کے چار ججوں میں راجیش بھی شامل تھا۔ ہال میں لگے ایک بڑے سے ڈائس کے کونے میں چاروں جج بیٹھے تھے۔ مختلف کلاسوں کے بچے تقریریں کرتے رہے۔ آٹھویں جماعت کی طالبہ ساوتری، راجیش کی بھانجی، اول انعام کی حقدار ٹھہری۔ وہ ڈائس تک آئی اور انعام لے گئی۔ مختلف چھوٹی بڑی کلاسوں کے چند اور بچوں نے بھی اپنے انعام وصول کیے۔ رنگا رنگ فنکشن کے بعد ٹی پارٹی تھی جس میں اسکول ٹیچرز اور ججوں کے علاوہ ہونہار بچے اور ان کے والدین بھی شریک تھے۔ چائے نوشی کے دوران راجیش نے پرنسپل سے اپنی بہن اور بھانجی کا تعارف کرایا اور ایک بار اس نے یوں ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو سادھنا کھڑی تھی۔ سراپا سفید کپڑوں میں ملبوس۔ اس کا طلوتی حسن خوب لو دے رہا تھا۔ اس نے ایک چھوٹے بچے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ "ارے آپ؟ آپ یہاں کیسے؟ اور یہ بچہ کس کا ہے، ابھی اس نے انعام بھی لیا ہے"

"یہ یہاں تیسری جماعت میں پڑھتا ہے۔" مزید کوئی بات کیے بنا وہ بچے کو ساتھ لے کر ہال روم سے نکل گئی۔ راجیش کو کچھ تجسس ہوا، کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلا تو دیکھا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی بچوں کے ہاسٹل کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں مین گیٹ سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سادھنا باہر آئی اور بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگی۔ سرخ ماروتی بھی دھیمی رفتار سے چلتی اس کے قریب جا رکی۔

"آیئے، بیٹھ جایئے، کاٹھمنڈو واپس چلتے ہیں۔" کچھ پس و پیش کے بعد وہ راجیش کے برابر بیٹھ گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ گاڑی رنگ روڈ پر آئی تو تھوڑے فاصلے کے بعد آکاش ریسٹورنٹ سامنے تھا۔ "میں اکثر یہاں لنچ کرتا ہوں۔ وقت ہو گیا ہے، آیئے اندر چلتے ہیں۔" لنچ گرم تھا اور مزے دار۔ "پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے ساتھ جو بچہ تھا، اب کہاں ہے؟" "وہ ویلی اسکول کے ہوسٹل میں رہتا ہے۔"

"یہ بھی پوچھ سکتا ہوں کہ کس کا ہے؟" "اگر آپ اپنے تک رکھیں، رپورٹ نہ بنائیں تو جواب مل سکتا ہے۔" "تم پہلے مجھے بتاؤ تو سہی۔"
سادھنا نے کہا کہ "چند سال پہلے اس نے لکھنؤ جا کر ایک ٹیچنگ کورس کیا تھا، وہیں ایک کلاس فیلو سے اس کا تعارف ہوا، وہ مجھے اچھا لگا، ملاقاتیں ہوتی رہیں، پھر پیار اور شادی کا اقرار ہوا، میری بھی عمر تھی، بہکاوے میں آ گئی اور یہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے، اب اس غلطی کو سب سے چھپائے ہوئے ہوں، یہاں میری بہن شیلا جانتی ہے لیکن بابو، بھارت کا روگی، وہ نہیں جانتا۔" "تو یہی ہے وہ کہانی جو تم مجھے نہیں سنا رہی تھیں؟" سادھنا نے اقرار کیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی۔ "دیکھو سادھنا تمھاری یہ بات ایک نہ ایک دن تو باہر آئے گی تب کیا کرو گی؟" "یہی سوچ سوچ کر پریشان رہتی ہوں" اس کی آنکھوں میں غم کی شبنم اتر آئی "مر بھی نہیں سکتی، جینا بھی مشکل"۔ "نہیں۔ تمھارا کوئی قصور نہیں، تمھیں دھوکا ملا ہے۔" سادھنا راجش کے کاندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔ "لیکن اب تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج شام تو وہاں دھوکا کے مندر میں ایک منڈپ لگے گا ہم دونوں کے لیے۔ مجھے میرا پیار ملے گا اور بچے کو اس کا باپ اور میرے قلم کو بھی بہت کچھ ملے گا، میں تمھیں اپنے سے دو بول کا سمودر دکھاؤں گا۔ تمھارے لیے اب یہ انجام جانا پہچانا ہوگا۔"

◆◆◆

آرفن ہاؤس کا ٹامس

اقبال فیروز

مختصر تعارف

اقبال فیروز کا تعلق چکوال کے متوسط گھرانے سے ہے۔ افسانہ نگاری میں ایک مخصوص طرزِ تحریر رکھتے ہیں اور باقاعدہ ادبی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے افسانے اردو کے کئی میگزین میں شائع ہو چکے ہیں۔ 2014ء میں جنگِ عظیم اول کے پس منظر میں ان کا لکھا ہوا ناول "پس سراب" بہت مقبول ہوا تھا۔ چکوال میں ایکسپورٹ اور امپورٹ کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ آج کل ایک دوسرے ناول کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو جنگِ عظیم دوم کے پس منظر میں لکھا جا رہا ہے۔

سکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے سے پانچ کلومیٹر دور گھنے درختوں اور پہاڑی تودوں کے درمیان البرٹ جی بی آرفن ہوم کی پرانی سی الگ تھلگ عمارت بہت کم لوگوں کی نگاہ کا مرکز بنتی تھی لیکن یہاں تیس سے زیادہ بچے اپنے اساتذہ اور وارڈن کے سائے تلے زندگی کے اگلے سفر کے لیے تیار کیے جا رہے تھے۔ کہنے کو تو یہ ایک یتیم بچوں کی تربیت اور پناہ گاہ تھی لیکن یہاں آنے والے سارے بچے ایسے نہیں تھے جو ماں باپ کے سائے سے محروم تھے۔ کچھ بچے والدین کی ناچاقی کا شکار ہو کر یہاں پہنچ جاتے تھے۔ کچھ ان والدین کی اولاد تھے جو دن رات شراب کے نشے میں غرق بچوں کی تربیت سے غافل تھے۔ چند ایسے بھی جوڑے تھے جو بچوں کو پالنا اپنے اوپر بوجھ سمجھتے تھے اور وہ انہیں اس آرفن ہاؤس میں پھینک کر زندگی کی رنگینیوں کے خوب مزے لوٹنا چاہتے تھے۔ میں لندن کی ایک رفاہی تنظیم البرٹ سی کیمل کی طرف سے ایسے ہی یتیم گھروں کے بچوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کے لیے کام کر رہی تھی۔ مجھے چھ ماہ کے لیے کسی ایک کے بعد دوسری جگہ بھیج دیا جاتا۔ یتیم خانوں کے بچوں کی نفسیات کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کچھ بچوں کے چہروں پر ہر وقت اداسی چھائی رہتی۔ کلاس میں لطیفے سنانے کے باوجود ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی نہ دیتی۔ کچھ اس قدر شریر اور بدتمیز تھے کہ انہیں چپ کرانے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حربے اختیار کرنے کے باوجود مجھے اپنی ناکامی پر گھنٹوں کڑھنا پڑتا اور مجھے بچوں کی نفسیات کی کتابیں جھوٹ دکھائی دیتیں۔ وہ میری باتوں کو کس حد تک سمجھتے اور اپنے پلے باندھتے تھے مجھے اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا لیکن انہیں اچھی تربیت دینا میرے فرائض میں شامل تھا۔ اس یتیم خانے میں گزارے ہوئے وہ لمحے کبھی نہیں بھولتے جب والدین کسی بچے کو لے کر وہاں آتے اور اسے روتا بلکتا چھوڑ کر واپس چلے جاتے۔ ایک واقعہ تو اس قدر دل خراش تھا کہ مجھے نوکری چھوڑنے کا شدت سے خیال پیدا ہوا اور میں سارا دن اداس اپنے کمرے میں ٹہلتی رہتی۔ ایک چار سال کے بچے کو اس کی ماں چھوڑنے کے لیے آئی تو وہ رو رو کر واپس جانے کی ضد کر

رہا تھا وہ جتنا چیخ سکتا تھا جتنا احتجاج کر سکتا تھا اس نے کیا وہ منحنی لڑکے اس کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور پھر میں نے دیکھا اسے وہ گرڈ وور آرفن ہاؤس کی انچارج کے کمرے کی طرف لے جا رہے تھے۔ وہ بھی درختوں کی اوٹ میں لمحہ بھر کے لیے غائب ہو جاتے اور جب دوبارہ نظر آتے تو ننھا فرشتہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا۔ اس کی ماں کسی پتھر کے بت کی طرح اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی وہ انچارج کے کمرے میں شیشے کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا مگر اس نے ایک مرتبہ بھی واپس مڑ کر ماں کی طرف نہ دیکھا۔

میرا مکان ایک چھوٹے سے پہاڑی تودے کے دامن میں تھا سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا اور تینوں اطراف میں دور دور تک سکاٹ پائن، ایلڈر، سلور اوک اور جونیپر کے درخت قطار در قطار میلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ میرے گھر سے تھوڑے فاصلوں پہ باقی سٹاف کے گھر تھے جن کے درمیان جنگلی جھاڑیاں اور درخت حائل تھے لہٰذا ہم ایک دوسرے کا حال دفتری اوقات میں ہی پوچھ سکتے تھے۔ صبح سویرے آرفن ہاؤس کا ایک ملازم ڈائری پہ روز مرہ اشیاء کے نام لکھ کر لے جاتا اور دن کے کسی وقت وہ انہیں کمرے میں چھوڑ کر چلا جاتا۔ ہم ہر روز چار سے پانچ گھنٹے بچوں کی تربیت اور انہیں مختلف قسم کی ایکسرسائز کرانے میں گزارتے اور بعد دوپہر تین بجے واپس آ کر کمرے میں آرام کے لیے پہنچ جاتے۔ یہ دسمبر کے دن تھے اور ہر طرف پھیلی ہوئی برف نے پورے منظر کو سفید چادر اوڑھا دی تھی درخت اپنی شاخیں کھو بیٹھے تھے اور میرے ارد گرد کا منظر کچھ پراسرار مگر پرکشش لگ رہا تھا باہر بچے ایک دوسرے پہ برف کے گولے پھینک رہے تھے اور میں کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھی باہر کے ماحول سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اچانک ایک دس بارہ سال کا بچہ کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا اور مجھے اس انداز سے دیکھنے لگا جیسے وہ مجھ سے کمرے کے اندر آنے کی اجازت مانگ رہا ہو۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کے لیے کہا تو بغیر کسی جھجک کے دروازہ کھول کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہوا ہو اور میرے چہرے سے کسی دوسرے کو تلاش کر رہا ہو۔ "بیٹھ جاؤ" میں نے اسے پیار سے سامنے بیڈ پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پیار سے پوچھا۔ "تامس" اس نے لمحہ بھر کے لیے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہارے ابو ہیں؟" میرے سوال پہ وہ اس طرح خاموش رہا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو اور بیڈ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ "تمہاری امی ہے؟" اس دفعہ اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے اقرار کا تاثر دیا۔ "تمہاری امی تمہیں ملنے کے لیے یہاں آتی ہے؟" "وہ کبھی یہاں نہیں آئی" "اور کیا تم اس سے ملنے کے لیے وہاں جاتے ہو؟" "میں امی سے ملنے کرسمس کی چھٹیوں میں جاؤں گا" "لیکن کرسمس کے آنے میں تو تین ماہ باقی ہیں تم کب جاؤ گے؟" "شاید اگلے سال اس بار نہیں" "تمہیں یہاں آئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟" "پانچ سال" اس نے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں مجھے دکھاتے ہوئے چپ سادھ لی۔ "تم ان پانچ سالوں میں ایک دفعہ بھی امی سے ملنے نہیں گئے اور نہ وہ تمہیں ملنے آئی ہے وہ کتنی بے حس یا مجبور عورت ہے" اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور بیڈ سے کتابیں اٹھا کر سامنے الماری میں رکھنے لگا پھر اس نے میرے بیڈ پہ بکھری ہوئی چادر کی سلوٹیں درست کیں اور کمرے کے درمیان پڑے جوتوں کو ایک کونے میں رکھ دیا۔ مجھے کچھ شرم سی محسوس ہوئی میں فطرتاً کچھ سست واقع ہوئی ہوں۔ "تامس بیٹھ جاؤ میں تمہارے ساتھ کچھ اور باتیں کرنا چاہتی ہوں" مگر اس نے میری بات کی ان سنی کر دی اور کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا اور پھر دیوار پہ میاں کے ساتھ آویزاں میری تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ "تامس تم کچھ کھاؤ گے میرے پاس سیب کا جوس بھی ہے کیا تم پینا پسند کرو گے؟" "ہاں پی لوں گا" اس نے شرماتے ہوئے میرے

چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ اس نے جوس پیتے ہوئے کئی بار میرے چہرے کی طرف دیکھا ایک معصوم بچے کی طرح جو دودھ پیتے ہوئے بار بار ماں کے چہرے کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ "کیا تم پھر میرے پاس آسکتے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو پہلے ہی میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ "وارڈن ہمیں آپ کے کمروں میں آنے سے روکتا ہے کیا آپ اس سے یہاں آنے کی اجازت لے کر دے سکتی ہیں؟" اس نے اس انداز سے میری طرف دیکھا جیسے میرا جواب یقینا نفی میں ہی ہوگا۔ "تم اس کی فکر مت کرو جب بھی تمہیں فرصت ملے میرے کمرے آجایا کرو لیکن آرفن ہاؤس کے شیڈول کو مت توڑنا تمہیں معلوم ہے میں تین بجے سے پہلے کمرے نہیں آتی" اس کے چہرے پر ایک انجانی سی خوشی سمٹ آئی اور وہ کھڑکی سے باہر ان بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے لگا جو اب آہستہ آہستہ واپسی کا رخ کر رہے تھے۔

"میں چلتا ہوں آج چھٹی ہے ناں ہمیں ہر اتوار کو شام چار بجے ایک سینڈوچ ملتا ہے کل اسی وقت پھر آؤں گا"۔ وہ چلا گیا اور میں کتنی دیر اس کے بارے میں سوچتی رہی وہ کتنے سوالات چھوڑ گیا تھا جن کے جوابات مجھے خود تلاش کرنے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے اس سے زیادہ بتانے کچھ بھی نہیں بتائے گا اور جب وہ اگلے دن دوبارہ اسی وقت میرے کمرے میں آیا تو تھوڑا سا پریشان تھا۔

"ٹامس تم کچھ پریشان سے لگتے ہو کیا کوئی خاص بات ہے ماں تو یاد نہیں آرہی؟" "ہاں مجھے کبھی کبھی یاد آتی ہے وہ کبھی کبھی آلو اور ٹماٹر کا آملیٹ بنا کر دیتی تھیں میں نے بھی وہ بنانا سیکھ لیا تھا بہت آسان ہے میں بنا سکتا ہوں۔" "میں تمہیں کسی دن بنا کر کھلاؤں گی تم کھاؤ گے تو تمہیں امی بہت یاد آئے گی چلو کل بنالیں گے آج تو میرے کمرے میں ٹماٹر نہیں ہیں کیا تم آج کچھ اور کھانا چاہتے ہو۔" "نہیں میں نے دوپہر سب کے ساتھ کھانا کھایا ہے اب میں کل والا جوس ہوں گا مجھے میری امی بھی ایسا ہی جوس پلایا کرتی تھی۔"

"ٹامس تمہیں ماں سے الگ ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں وہ اب تمہیں دیکھے گی تو تم اسے کیسے لگو گے ہاں تمہیں تمہاری امی بھی تو کچھ بدلی بدلی سی نظر آئے گی تم فکر نہ کرو میں یہاں سے جاؤں گی تو تمہاری امی کو تلاش کروں گی" وہ خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور جوس کا گلاس اٹھا کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا جہاں برف کے ڈھیر تھے اور آج وہاں کوئی بچہ کھیلنے نہیں آیا تھا۔ جوس ختم کرنے کے بعد اس نے چھوٹے پڑی ہوئی میل کو کپڑے سے صاف کرنا شروع کر دیا، برتنوں کو ایک ترتیب دی کمرے کے دوسرے کمرے میں بکھرے ہوئے میلے کپڑوں کو اکٹھا کیا میرے اوورکوٹ اور جیکٹ کو عارضی سی بنی ہوئی کھونٹی پر لٹکایا اور اس کے بعد اس نے کمرے کی صفائی شروع کر دی۔ میں اسے دیکھتی رہی سچی بات یہ کہ میں اسے اس طرح کام کرتے ہوئے دیکھ کر ایک انوکھی سی مسرت محسوس کر رہی تھی۔ کام سے فارغ ہو کر وہ اگلے دن آنے کا کہہ کر چلا گیا مگر وہ تین دن کہیں نظر نہ آیا میں اسے شدت سے مس کر رہی تھی۔ ہر روز شام کو اسی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرتی تھی جہاں اس نے پہلے دن میرے کمرے میں جھانکا تھا۔ مجھے وحشت سی محسوس ہونے لگی اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی وارڈن کو فون کر کے ٹامس کے بارے میں پوچھا تو اس کا جواب سن کر مجھے کچھ اور حیرت ہوئی اس نے بتایا کہ وہ کئی کئی دن صبح سے شام تک جنگل میں گھومتا رہتا ہے۔ آرفن ہاؤس کی سارے دن کی کارروائیوں سے دور رہتا ہے اور یہاں تک کہ کھانا بھی کھانے نہیں آتا اپنی اس عادت کی وجہ سے اسے متعدد بار سزا بھی مل چکی ہے لیکن وہ اس حرکت سے باز نہیں آتا میڈم ہمیں خوشی ہے کہ آپ کو آرفن ہاؤس کے ایک بچے کا خیال ہے لیکن ہمیں افسوس بھی ہے کہ آپ کو کچھ پریشانی اٹھانی پڑی وہ آج شام تک یقینا واپس آجائے گا۔ میں شام کا کھانا بنا رہی تھی اور وہ اچانک دروازہ کھول کر میرے سامنے آکھڑا ہوا مجھے ایسے لگا جیسے میری کوئی کھوئی ہوئی چیز مجھے واپس مل گئی ہو اسے دیکھ کر میں

کچھ جذباتی سی ہوگئی وہ مسکرا رہا تھا اور مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ڈاسن تم روز دن کہاں رہتے ہو مجھے سچ سچ بتاؤ تم جنگل میں کیا ڈھونڈتے رہتے ہو؟ ٹرن ہاؤس کے ڈسپلن کی کیوں خلاف ورزی کرتے ہو یہاں یہ بتاؤ دن کا کھانا کہاں سے کھاتے ہو؟" وہ خاموش رہا بس مجھے مسلسل دیکھتا رہا اور پھر یہ کہہ کر واپس جانے لگا کہ وہ کل آئے گا آج بہت دیر ہوگئی ہے۔ "لیکن تم پہلے میرے سوالوں کے جواب تو دو اور پھر اس کے بعد چلے جانا" اس نے سر جھکا لیا اور اس انداز سے مجھے بار بار دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو "مجھ سے یہ سب کچھ نہ پوچھو تو کتنا اچھا ہوگا"۔ "اچھا یہ بتاؤ میں تمہاری پسند کا آملیٹ بنا دوں آج میرے پاس سب کچھ موجود ہے بس تم تھوڑی دیر انتظار کرو" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پلنگ پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا اور پھر جیسے مجھ سے نہیں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا "مجھے آرفن ہاؤس سے ہفتے کے تین پونڈ ملتے ہیں وہ خرچ کروں گا اور اپنی پیاری امی کے لیے کوئی گفٹ خریدوں گا میں جب کرسمس پہ گھر جاؤں گا تو یہ گفٹ امی کو دوں گا لیکن میں اسے رکھوں گا کہاں، ہاں میں اسے آپ کے پاس ہی رکھوا دیا کروں گا میں نے ایک چھوٹا سا گفٹ خرید کر رکھا ہوا ہے وہ میرے سرہانے کے نیچے رکھا ہے کل لے کر آؤں گا تم تو اب ادھر ہی رہو گی ناں" میں اس کی باتیں سنتی رہی ڈاسن کو یہ کہہ کر اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی کہ میں تو تین ماہ کے بعد یہاں سے چلی جاؤں گی۔

"ہاں ہاں تم اپنا گفٹ کل لے کر آ جانا میں اسے سنبھال کر رکھوں گی تم کرسمس پہ گھر جاؤ تو ساتھ لے جانا" "لیکن میں تو ہر ماہ ایک گفٹ خریدوں گا کرسمس تک میرے پاس دس گفٹ ہو جائیں گے یہ سب تم ہی اپنے پاس رکھو گی"۔ "بالکل ٹھیک تمہارا سینڈوچ تیار ہے تم کھاؤ اور چلے جاؤ" اگلے دن اس کے ہاتھ میں اسٹک پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ تھا جو اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا تھا اس نے اسے میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "یہ میں نے وہ پوائنٹ کا خریدا ہے کھلونوں کی دوکان سے لوگ اپنے بچوں کو ملنے کے لیے آتے ہیں تو اسی دوکان سے ان کے لیے تحفے خریدتے ہیں"۔ اگلے دن اس نے مجھے ایک اور تحفہ لا کر دیا یہ ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی جس میں چند چھوٹے سکے تھے اور پھر یہ سلسلہ دو چار دن کے لیے رک گیا، ڈاسن میرے پاس باقاعدہ آتا رہا اس کے جنگل میں گھومنے کی لت کو میں باوجود کوشش کے چھڑا نہ سکی۔ وہ جس دن میرے پاس نہ آتا مجھے اپنا کمرہ سونا سونا سا لگتا اور میں اکثر کھانا کھائے بغیر سو جاتی۔ میری واپسی میں تین ماہ باقی تھے میرے لیے یہ سوچنا کس قدر اذیت ناک تھا کہ مجھے ڈاسن کو یہیں چھوڑ کر چلے جانا تھا وہ میرے سامنے بیٹھا ہوتا تو میری ذہنی کیفیت بدل جاتی اور اس کا پتہ ڈاسن میرے اس دکھ تک پہنچنے کی کوشش سے عاری میرے چہرے کو بس دیکھتا رہتا۔ ایک دن وہ میرے پاس ایک اور تحفہ لے کر آیا یہ ایک لکڑی کا ٹکڑا تھا جسے کسی چاقو کی مدد سے تراش تراش کر ایک عورت کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ "یہ کیا ہے ڈاسن تم نے اس پہ کتنی محنت کی ہوگی کیا تم نے اسے امی کو تحفہ دینے کے لیے تیار کیا ہے" وہ کچھ بھی نہ بولا صرف میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا میرے میاں نے خط میں لکھا کہ "آخر تم اس قدر مصروف کیوں ہوگئی ہو مجھے میرے دوسرے خط کا جواب بھی نہیں دیا" اس دن مجھے احساس ہوا کہ میں مصروف نہیں کچھ بے دھیان سی ہوگئی تھی میں نے ڈاسن کو اتنی اہمیت کیوں دینا شروع کر دی تھی کہ میں اپنے خاوند سے بھی دور ہو رہی تھی اسی شام وہ میرے پاس آیا تو رات ہونے والی تھی۔

"ڈاسن لگتا ہے تم آج پھر جنگل میں گھومتے رہے ہو اب اتنی دیر ہوگئی ہے وارڈن کو کیا جواب دو گے؟" اس نے ایک عجیب سی

ہنسی ہنستے ہوئے میری طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے وہ اس سے پہلے جانتا ہے۔

''بیٹھ جاؤ'' میں نے اسے مصنوعی غصے سے بیڈ پہ بیٹھنے کی تاکید کی اور خود اس کے وجود کو نظر انداز کر کے خاوند کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ معلوم نہیں وہ مجھے کس انداز سے دیکھ رہا تھا میں اسے یہ تاثر دے رہی تھی جیسے میں اس سے روٹھی ہوئی ہوں میں نے اس کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیا لیکن میں ٹامس سے کیا روٹھی خط لکھنے کے لیے جیسے الفاظ اور خیالات بھی مجھ سے روٹھ گئے۔ میں نے کاغذ اور پنسل ایک طرف رکھ دی اور ٹامس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ ''تم جنگل میں کیوں جاتے ہو آج مجھے سچ سچ بتاؤ!'' وہ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔ ''یہ جو درخت ہیں نا یہ باتیں بھی کرتے ہیں'' ''نہیں تو تم نے کبھی کسی درخت کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے؟'' ''ہاں جب تیز ہوا چلتی ہے تو درختوں سے آوازیں آتی ہیں ہر درخت کی اپنی آواز ہوتی ہے میں جنگل میں ان آوازوں کو سنتا ہوں کیا یہ مرے ہوئے لوگوں کی آوازیں ہوتی ہیں'' ''نہیں ٹامس ایسا نہیں ہے جب ہوا درختوں سے ٹکراتی ہے تو پتوں سے آوازیں آتی ہیں'' ''اس جنگل میں پھول بھی کھلتے ہیں ہر رنگ کے پھول جب برف ہٹ جاتی ہے تو ہر طرف پھول اگ آتے ہیں میں تب تمہارے لیے ڈھیروں پھول لایا کروں گا لیکن یہ پھول مر کر پھر زندہ کیسے ہو جاتے ہیں کیا مرے ہوئے لوگ بھی دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں'' ''نہیں ٹامس تم کیسی باتیں کر رہے ہو کبھی مرے ہوئے بھی زندہ ہوتے ہیں۔'' میری اس بات سے وہ کچھ پریشان سا دکھائی دینے لگا اور پھر باہر کھڑکی میں جھانکنے لگا جہاں برف کی سفیدی رات کے اندھیرے کو مات دے رہی تھی۔ ''ٹامس تم اب جاؤ وارڈن سے کہنا کہ تم میرے پاس تھے بس بات ختم ہو جائے گی''۔

آرفن ہاؤس میں کرسمس کا تہوار منایا جا رہا تھا چند ہی بچے ایسے تھے جن کے والدین ان سے ملنے آئے تھے باقی بچوں کو حوصلہ دینے کے لیے سٹاف کے ہر ممبر نے دو تین بچوں کو اپنے ساتھ اٹھایا تھا میرے ساتھ ٹامس کے علاوہ دو بچے اور بھی تھے آج وہ نئے کپڑوں میں بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے بچپن اور لڑکپن میں بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا اس نے بالوں کو ایک الگ سٹائل سے سجا رکھا تھا۔ ہال میں میوزک بج رہا تھا چار بچے کرسمس کے گیت گا رہے تھے لیکن میں سارے ماحول سے بے نیاز صرف ٹامس کے بارے میں سوچ رہی تھی اس کے بالغ ہونے میں چند سال ہی تو رہ گئے ہیں شاید اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہوگا اور اس کی ماں نے اسے آرفن ہاؤس میں ڈال کر کہیں اور اپنی دنیا بسالی ہوگی کل وہ بڑا ہوگا تو کہاں جائے گا۔ مجھے ایسے ہی سوالات پریشان کر رہے تھے مگر وہ اپنے مستقبل سے بے نیاز اس طرح میرے سامنے خوش بیٹھا تھا جیسے اسے میری رفاقت زندگی بھر کے لیے حاصل ہو گئی ہو۔ سردیاں گرمیوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو رہی تھیں زمین نے برف کی چادر اتار کر پھینک دی تھی۔ میرے گھر کے سامنے لان میں کچھ پودے لہلہا رہے تھے ایک دن ٹامس میرے لیے جنگلی پھولوں کی ایک پوٹلی لے کر آیا اور اس نے انہیں گلاس میں ڈال کر الماری کے اوپر رکھ دیا اور پھر یہ سلسلہ اس کا معمول بن گیا وہ پرانے پھول نکال کر ان میں نئے پھول لگا دیتا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ میرے رخصت ہونے میں چند دن ہی باقی تھے میں اپنے اندر وہ حوصلہ کہاں سے لے کر آتی اسے کیسے بتاتی ٹامس میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے اور جب ایک شام وہ بڑا سا گلدستہ لے کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا تو میں نے اپنے ذہن کو دلاسا دیتے ہوئے اسے بتا دیا ''ٹامس میں کل جا رہی ہوں''۔ اس پہ سکتہ طاری ہو گیا پھول اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچے اور وہ ایک معصوم بچے کی طرح مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس سے سب کچھ چھن گیا

ہو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی بس اسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے ذرا سا ہکلاتے ہوئے مجھ سے پوچھا "پھر واپس کب آؤ گی؟"
"کبھی نہیں ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں، مجھے یہ الفاظ کہنے کے لیے کتنی اذیت اور تکلیف سے گزرنا پڑا تھا لیکن یہ حقیقت تھی۔ ہامس کچھ نہ بولا اس نے حسبِ عادت پھول گلدان میں لگانے کی بجائے بیڈ پہ پھینک دیئے اور ایک ہارے ہوئے انسان کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔
یہ مئی کی ایک خوشگوار دوپہر تھی جب میرا سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا اور میں اپنا چھ ماہ کا وقت پورا کرنے کے بعد لندن جا رہی تھی۔ آرفن ہاؤس کی انچارج کیتھرین بچے اور عملے کے افراد مجھے الوداع کہنے کے لیے باہر کھڑے تھے میری آنکھیں ہامس کو ڈھونڈ رہی تھیں جو مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میڈم کیتھرین مجھے ان لڑکوں میں کہیں ہامس نظر نہیں آ رہا؟" "وہ آج صبح سے غائب ہے کہیں جنگل میں ہی گھوم رہا ہو گا شام تک آ جائے گا" کیتھرین نے لاپرواہی سے دونوں شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ہامس نے ایسا کیوں کیا اسے معلوم تھا کہ میں نے آج چلے جانا ہے میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے ہینڈ بیگ سے وہ گفٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا "میڈم یہ ہامس کے حوالے کر دینا اس نے یہ چیزیں ماں کو گفٹ کرنے کے لیے میرے پاس رکھوائی تھیں"۔

"آپ کیا بات کر رہی ہیں اس کی ماں تو مر چکی ہے پانچ سال پہلے" مجھے یوں لگا جیسے میں کسی گہرے کنوئیں میں گر گئی ہوں اور میڈم کیتھرین کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہو۔ ہامس کی ماں نہیں ہے تو پھر یہ گفٹ کس لیے؟ یہ میرے لیے تھے ہامس نے مجھے ماں سمجھنا شروع کر دیا تھا میرا دماغ جیسے مجھ سے ہم کلام تھا میرے اعصاب میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے میں گاڑی میں بیٹھ کر اس قدر شدت سے روئی جیسے میں اپنی حقیقی اولاد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہی تھی۔ دو ہفتے تک میری حالت سنبھل نہ سکی ایک دن میں نے اپنے شوہر کو ساری بات بتائی تو اس نے ہامس کو اڈاپٹ کرنے کا مشورہ دیا یعنی یہ کہ اس نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ شوہر نے بتایا کہ اسے اگلے ماہ گرمیوں کی ایک ہفتے کی چھٹیاں ہو رہی ہیں اور ہم دونوں اسے آرفن ہاؤس سے گھر لے آئیں گے۔ ایک شام کو میں نے میڈم کیتھرین کو فون پہ بتایا کہ میں اپنے میاں کے ساتھ ہامس کو اڈاپٹ کرنے کے لیے آ رہی ہوں وہ تمام کاغذات مکمل کر لے لیکن کیتھرین نے یہ کہہ کر مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ ہامس تو میرے وہاں سے آنے کے اگلے دن ہی آرفن ہاؤس سے کہیں بھاگ گیا تھا اسے ڈھونڈنے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ نہ جانے کیوں میں بے اختیاری طور پہ ہنس دی ایک ایسی ہنسی جس کے پیچھے آنسوؤں کی لڑیاں چھپی ہوئی تھیں۔

◆◆◆

بانو قدسیہ کا خراجِ تحسین

"تخلیق" نے اظہر جاوید کو پہچان بھی دی، نام، عزت اور شہرت بھی، لیکن "تخلیق" کی آبیاری کے لئے اسے کتنی قیمت چکانی پڑی یہ کوئی نہیں جانتا۔ میں نے شروع سے ہی اظہر جاوید کو ایک درویش کے طور پر یاد کیا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ہماری ساری زندگی درویشوں کے ساتھ دوستی میں گزری ہے اس لیے کہ مجھے یہ شخص درویش ہی نظر آتا ہے بلکہ جب آپ حضرت ابو بصری پہ لکھی ہوئی اظہر جاوید کی کتاب پڑھیں گے تو آپ بھی اس میں چھپے ہوئے ایک بچے اور گھر سے درویش کو پہچان لیں گے۔ (بانو قدسیہ کے لکھے مضمون "اظہر جاوید۔ چشمۂ ذات" سے اقتباس)

بند گلی کا مسافر

آصف عمران

مختصر تعارف

19 جولائی 1950ء میں ضلع ساہی وال کے گاؤں سکندر آباد میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنے کا آغاز کر دیا۔ ایف سی کالج کے میگزین ایڈیٹر رہے۔ پہلا افسانوی مجموعہ "سائے کے ناخن" کے نام سے 1981ء میں شائع ہوا۔ دوسرا افسانوی مجموعہ "نوحِ تحیر" 2017ء میں شائع ہوا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میری مصروفیات یکسر بدل گئیں۔ صبح صبح دفتر جانے کی بجائے میں آرام سے اٹھتا اور کچن کا رخ کرتا، چائے اور ناشتہ تیار کر کے اپنی بیوی انجم کو جگاتا۔۔۔ اور ہم دونوں آہستہ آہستہ ناشتہ کرتے اور دن بھر کی چھوٹی چھوٹی مصروفیات پر بات کرتے اور پھر میں اس کی دوائیاں سامنے رکھتا تو وہ بے زاری سے ان کو دیکھتی اور میرے سمجھانے پر دوائی کھانا شروع کر دیتی۔ اس کو سانس کی تکلیف تھی تو بڑی پرانی مگر حالات اور حوادث کے باعث بلڈ پریشر، گردوں کے مہروں میں درد۔۔۔ بلڈ شوگر جیسے موذی امراض نے اس کو نڈھال کر رکھا تھا۔ دراصل بڑے بیٹے کی وفات نے اس کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ ہم نے بڑی بہادری سے اس صدمے کو برداشت کیا تھا۔ اب میری کوشش ہوتی کہ میں زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ ساتھ گزاروں۔ ناشتے کے بعد میں کوئی کتاب یا اخبار لے کر اس کے پاس بیٹھ جاتا۔ یوں میری زندگی سمٹ کر گھر تک محدود ہو گئی۔ بیماری، دکھ اور غم کی شدت کو قریب سے دیکھا تو انسانی بدن کی کمزوریاں اور زندگی کی مجبوریاں میرے سامنے آنے لگیں۔ جب میں نے محسوس کیا کہ جب محبت کے پودوں تلے سے جنت کھینچ کر نفرت کا وزن رکھا دیا جائے تو زندگی میں آنے والے لمحوں کے چہروں پر بدصورتی اگنا شروع ہو جاتی ہے جو اپنی کھردری زبان سے لمحوں کے وجود کو چھیلنا شروع کر دیتی ہے۔ ان کو زخمی کر دیتی ہے اور پھر ان زخموں سے اٹھتا درد مدت تک فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

بیٹے کی اچانک ایک حادثے میں وفات سے ہم دونوں کی زندگی میں اطمینان، سکون اور خوشی کے سرسبز پودوں کو دکھ کا دیمک لگ گیا جو ہمیں اندر سے کھوکھلا کرنے لگا۔ دوسرے دونوں بیٹے تعلیم کے لئے امریکہ گئے تو وہاں کی چکا چوند روشنیوں میں رہنے کے عادی ہو گئے اور واپسی کے راستے ہی بھول گئے بلکہ ہمیشہ کہتے کہ آپ بھی ہمارے پاس ہی آ جاؤ۔ مگر ہم اپنی مٹی کی خوشبو میں خوش ہیں۔ ہم دونوں اپنے آبائی گھر میں ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹ لیتے ہیں۔ گھر میں تقریباً بیس سال سے پرانی نوکرانی موجود ہے جو گھر کی اور ہماری دیکھ بھال کرتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ انجم کی بیماری کی شدت بڑھتی جا رہی ہے۔ اگرچہ اس کو خوش رکھنے کے لئے میں اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو بھی پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ دنیا سے لاتعلق ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے اندر سے جینے کی

خواہش سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ اُسکی زندگی کا مشروب قطرہ قطرہ وجود کے گلاس سے چھلک رہا ہے۔ میں اُس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر وہ خاموشی سے لمحوں کی ادھوان پر پہنچی ہوئی موت کے گہرے سمندر کی طرف بڑھ رہی ہے۔

کئی دنوں سے اُسکی راتیں بے سکونی سے گزر رہی تھیں۔ بے خواب آنکھوں میں شکستہ خواب کی پرچھائیاں بسیرا کر چکی تھیں۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہتی اور میں سوچتا کہ میں کتنا بے بس ہوں کہ اس کے دل کی باتیں سن نہیں سکتا۔ ہم ہزاروں میل دور کسی شخص کی باتیں تو سن سکتے ہیں مگر ساتھ بیٹھا ہوا شخص کیا سوچ رہا ہے دنیا کا حساس ترین آلہ بھی ہمیں بتانے سے قاصر ہے۔ ہم دل کی دھڑکن کی رفتار کو مشین کی مدد سے کاغذ پر منتقل کر سکتے ہیں مگر ساتھ لیٹا ہوا شخص کس خواب سے مضطرب ہو رہا ہے ہم نہیں جان پاتے۔ اور پھر ایک دن بیماری سے لڑتے ہوئے وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ ہونی آخر ہو کر ہی رہتی ہے۔ موت کہیں باہر سے وارد نہیں ہوتی بلکہ وہ تو زندگی کے وجود میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کو اس کے وجود سے باہر دھکیلنے کا عمل شروع کر دیتی ہے۔ جس وجود کی زندگی جتنی طاقتور ہوتی ہے وہ اتنے ہی طویل عرصے تک اپنے وجود میں قیام کرتی ہے۔ اپنے قدم جمائے رکھتی ہے مگر کب تک۔۔۔ آخر ایک دن فتح موت کی ہی ہوتی ہے۔ شاید موت ہی ابدی صداقت ہے۔ شاید یہی وہ سچائی ہے جسے ہم نظر انداز کر کے ادھر اُدھر عمر بھر سرگرداں رہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ لمحہ لمحہ موت کے منہ کی غار میں اتر رہے ہیں۔ زندگی کو رواں رکھنے کے لئے ہماری ساری کوششیں ۔۔۔ تمام کاوشیں بے نتیجہ رہ جاتی ہیں۔ ہم بے بسی کی تصویر بنے سارے واقعات کو ہونے سے روک نہیں سکتے۔ بیوی میرے ساتھ تھی۔۔۔ میں یکدم اکیلا ہو گیا۔ کئی رشتہ دار عزیز دوست آئے تسلی کے چند بول میٹھی آواز میں لپیٹ کر سماعت کی دیوار پر چپکا گئے۔ خدا کی یہی مرضی ہے۔ اُسکی رضا میں ہی ہم کو راضی رہنا ہے۔ چند دن بعد ہی اکیلے پن کے احساس نے وقت میں کڑواہٹ کی لہریں اُتار دیں اور سنسان گھر کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ بچوں نے کہا کہ آپ اکیلے کیسے رہیں گے ہمارے پاس آ جائیں۔ بیوی کے بغیر گھر میں اکیلا رہنے کا تجربہ ناکام ہوتا جا رہا تھا۔ تب حالات نے شدت سے احساس دلایا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ جانے والے تو چلے جاتے ہیں مگر پیچھے رہ جانے والوں کو آنسوؤں، تنہائی اور یادوں کی برسات میں بھیگنے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ بچوں کے اصرار پر اور ان کی خوشی کی خاطر میں ان کے پاس چلا گیا مگر تنہائی میرے اندر تک سے پنجے گاڑ چکی تھی۔ میں اپنے گھر میں اکیلا تھا اور یہاں بچوں کے ہوتے ہوئے بھی اکیلا۔۔۔ بے چین۔ اکثر رات کو بے چینی بڑھتی تو میں کمرے سے نکل کر چھت پر آ جاتا۔ سر پر کھلے آسمان کی گہری نیلی چادر تنی ہے جس پر ننھے منے ستاروں کے جھرمٹ جگمگ کرتے ہیں۔ میں ہر ستارے کو غور سے دیکھتا ہوں کہ شاید کسی ستارے میں میری بیوی کے چہرے کی جھلک نظر آ جائے۔ چھت پر ٹہلتے ہوئے میں نے آسمان پر ڈوبتے چاند کا اداس پیلا چہرہ دیکھا۔ سامنے رات کی تاریکی میں آسیب زدہ فلیٹس کی کئی منزلہ عمارتوں پر ایک نظر ڈالی۔ کسی کسی فلیٹ میں روشنی جھانکتی ہے۔ میرے اندر بے چینی کا شور ہے اور باہر رات کا سناٹا۔ میں تنہائی میں بکھرنے لگا۔ اس کی یاد آنسو بن کر میری گالوں پر لکیریں بناتے ہوئے زمین میں جذب ہو گئی۔ میں اس خاص ستارے کو تلاش کرتا ہوں جو آسمان پر میری چھت پر شمال مغرب کی جانب رات گئے طلوع ہوتا ہے۔ اس کی روشنی مجھے سکون عطا کرتی ہے۔ میں اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوں۔ ڈھیروں باتیں۔۔۔۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف میری سنتا ہے۔ میری باتوں پر مسکراتا ہے۔ کبھی کبھی میری اداسی پر رو بھی پڑتا ہے اور کبھی اس ستارے کی میٹھی آواز میری ہلکی سی سرزنش بھی کرتی ہے۔ وہ آسمان کے کئی راز مجھے بتانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

کچن میں چائے کی پیالی بھر کے ساتھ لگ کر آسمان کی وسعتوں میں کھوئے لیتا رہتا ہوں اور پھر تھک ہار کر اپنے کمرے میں آ جاتا ہوں اور دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو تکتا رہتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک خواب کی مانند ہوں جسے کوئی دیکھتا نہیں۔۔۔ بند گلی کا مسافر ہوں جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ امریکہ میں آئے ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک صبح میرے موبائل کی گھنٹی نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے نمبر دیکھا تو حیران رہ گیا۔۔۔ پاکستان سے یہ تو گلناز کا نمبر تھا جسے میں نے اس کے خاوند کے نام سے محفوظ کیا ہوا تھا۔۔۔ مسرت کی بجلی سی میرے چہرے پر لہرا کر گزر گئی۔ میں نے فون آن کیا تو کہنے لگی " مجھے بھائی شفقت سے پتہ چلا کہ آپ بیٹوں کے پاس امریکہ میں ہیں۔ ایک تو میں آپ کی بیوی کی وفات پر پرسا دینا چاہتی تھی۔ وہ نیک خاتون تھیں انہوں نے اچھی ماں، اچھی دوست اور اچھی بیوی کی حیثیت سے زندگی گزاری ہے۔ خدا ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ خدا نے ان کی زندگی کے اتنے ہی دن مقرر کئے تھے۔ ہاں۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ جو رات قبر میں لکھی گئی ہے وہ باہر نہیں گزاری جا سکتی۔ یہ خدا کا نظام ہے کہ جو بھی شخص اس دنیا میں آتا ہے اسے واپس خاک میں تو جانا ہی ہے۔ ہمارا ساتھ اتنے ہی دنوں کے لئے لکھا گیا تھا۔ ایک کو تو پہلے جانا ہی تھا سو۔۔۔ وہ چلی گئی۔۔۔ اور میں تنہا رہ گیا۔۔۔ میں نے افسردگی سے جواب دیا۔

اب آپ کو حوصلہ کرنا ہے۔ بیٹوں کو بھی تسلی دینی ہے۔۔۔ اور ہاں میں امریکہ کے سفر کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اب کون سی S.O.P پر عمل ہو رہا ہے۔ امریکن ایئر پورٹ پر آفیسر کس طرح کے سوال کرتے ہیں کیونکہ میں بھی بیٹی کے پاس امریکہ آنا چاہتی ہوں اس لئے میں نے سوچا کہ آپ سے معلومات لے لوں۔۔۔ میں نے اپنی معلومات کے مطابق پیش آنے والے حالات سے آگاہ کر دیا۔ چند دن بعد پاکستان میں ایک دوست سے بات کرنے لگا تو سامنے گلناز کا نمبر آ گیا اور میں نے غیر ارادی طور پر نمبر ڈائل کر دیا۔ اس کے فون سے جیسی مسکراتی آواز کی لہر میری سماعت کی غار میں اترنے لگی۔ ہیلو۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟ آج فون کرنے کا خیال کیسے آ گیا۔۔۔ بس ایک دوست کو فون کرنا تھا آپ کا نمبر سامنے آ گیا تو میں نے نمبر ملا دیا۔ میں تو آج کل اپنی زندگی میں تنہائی، دکھ اور ضبط کی آخری حد بندیوں کے جنگل سے گزر رہا ہوں۔ بیوی کی جدائی نے مجھے اکیلے پن کے صحرا میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ جہاں میں لمحہ لمحہ بکھر رہا ہوں۔ ہواؤں میں تحلیل ہو رہا ہوں۔۔۔ اختر صاحب۔۔۔ کیا ہوا، ہمت کریں۔۔۔ آپ کے بچے ہیں، بہن بھائی ہیں۔ ان سب کو آپ کی ضرورت ہے۔ خود کو سنبھالیں۔۔۔ میری طرف دیکھیں میں بھی تو سات سال سے تنہا رہ رہی ہوں ناں۔۔۔ تمہاری بات اور ہے۔ تم اپنی بیٹی کے ساتھ رہ رہی ہو۔۔۔ اور تم تو جانتی ہو کہ میں حساس شخص ہوں۔ اچھا چھوڑو اس بات کو۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تم امریکہ کب آ رہی ہو؟ میں نے ماحول کی اداسی کی چادر کو اتار پھینکا۔ شاید۔۔۔ دو ماہ بعد امریکہ پہنچوں۔۔۔

چلو ٹھیک ہے۔ اس وقت تک میں شاید واپس پاکستان پہنچ جاؤں گا۔۔۔ اچھا۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ امریکہ میں ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔ چلیں جب خدا کو منظور ہوگا۔۔۔ مل لیں گے۔۔۔ میں نے آہستہ سے کہا اور فون بند کر دیا۔ ماضی کے تپتے صحرا میں واقعات کے جھلسے ہوئے پودوں نے ذہن کی شاخوں پر آنکھیں کھولنی شروع کر دیں۔ ماضی میں جھانکتے ہوئے چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں کے سارے منظر سرمئی بے کلی کی چادر اوڑھے ان شاخوں پر پتوں کی مانند لگے کر انہیں ہواؤں میں لہراتے اور سانس لیتے لمبے ظاہری فاصلوں، دوریوں اور محرومیوں کے درمیان ہمارے دکھ شکوہ سا تھے تھے۔ جب میں نے چاہا کہ وقت کے حلق میں ہاتھ ڈال کر سارے منظر نکال لوں

اور دوبارہ ان کو اصلی جگہ پر بولوں اور ہماری گفتگو کے چاروں طرف سے اڑتے ہوئے پرندے آ گئیں اور ان پیڑوں پہ گھونسلے بنا کر مستقل طور پر رہنے لگیں۔۔۔ اور جب بھی ہماری دوبارہ ملاقات ہوتی یہ منظر اسی طرح ہمارے ساتھ سانس لیتا اور ہماری باتوں کی گواہی دیتے۔ اور ایک دن یوں ہوا کہ گرمیوں کی تپتی سہ پہر کو لمحہ لمحہ اترتے ہوئے شام کے سائے چل رہے تھے کہ ہمیں محسوس ہوا کہ تیز ہوا لمحہ بھر کو ہمارے چہروں پر رکی۔۔۔ پھر غضب ناک ہوئی اور اپنی تادیبی انگلیوں سے ہمارے کھردرے چہروں کو نوچتی خراشیں ڈالتی چھیل کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ دور ندی میں سورج پھول کو پانی پر تیرتے ہوئے دیکھ کر گلناز کہنے لگی میرا دل کرتا ہے کہ وقت تھم جائے۔۔۔ اور تمہارے ساتھ گزرے ہوئے یہ لمحے جامد ہو جائیں اور ہم سورج کے ساتھ ہی ندی میں اتر جائیں اور پھر نئے دن میں نئے جہان میں طلوع ہوں۔ شام کے سائے پیچھے سے شرانگیز ریوڑ ہیں ہمارے بدن ٹٹول رہی ہیں اور پیڑوں تلے پرچھائیاں تنہا ہو گئے ہیں۔۔۔ ان بیچوں میں بچھے ہوئے تیز نوکدار پتھر۔۔۔ پیروں کے تلووں میں گھس کر ان کو زخمی کر رہے ہیں۔ محبت کی جنت لہولہو ہے اور سر پہ دہکتے انگاروں کی انگیٹھی۔۔۔

ایک تو تم بولتی بہت ہو۔۔۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ اور تم میری کبھی بھی نہیں سنتے اور نہ جواب دیتے ہو۔ اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ سنتا ہوں بابا۔۔۔ سنتا ہوں۔۔۔ چلو اب اور اچھی طرح سنوں گا۔ تم میری آنکھوں کی زبان کو سمجھا کرو ناں۔ تمہارے ہر سوال کا جواب میری آنکھوں کے آئینے میں ابھرا رہتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا۔ نہیں۔۔۔ محبت یہ نہیں ہوتی۔۔۔ نہیں۔۔۔ محبت وہ بھی نہیں ہوتی جیسے تم سمجھتی ہو۔۔۔ تم نے کون سا کوئی وعدے کا سکہ آج تک میرے دل کی جیب میں ڈالا ہے۔۔۔ لیکن میری ہر ادا تو ایک وعدہ ہی ہوتی ہے۔۔۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔۔۔ میں تو برف کا ایک ٹکڑا ہوں جو تمہارے بدن کے گلاس میں پڑے روح کے مشروب میں تحلیل ہو کر تم میں سما جانا چاہتی ہوں۔ اب تمہاری گرم سانسیں میرے گالوں سے ٹکرا رہی ہیں اور میری آنکھوں میں صدیوں سے کسی سبز آرزوئیں چھلک رہی ہیں۔ اس نے پلکوں کو آنکھوں پر گرایا تو میں دو قدم آگے بڑھا اور وہ میرے بازوؤں کے حصار میں کسمسا کر رہ گئی۔ ہونٹوں پر لگا گرم لمس کا قفل دیر تک نہ کھل سکا۔

اب کہو۔۔۔ محبت کیا ہے؟ میں نے بازو کے حصار کو الگ کر کے اسے اپنی ہتھیلیوں سے لگایا تاکہ وہ میری ہتھیلیوں میں اس جگہ نسب ہو جائے جہاں سے نکل کر اس گمشدہ پسلی نے میرے گوشت کا لباس پہن لیا تھا۔ میں رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کے راستے سے اس کے وجود کے کنوئیں میں اترنے لگا مگر وہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ تیز ہوائیں اور گرد و باد کا طوفان۔۔۔ مٹی۔۔۔ ہر طرف مٹی ہی مٹی۔۔۔

اندھیرا گہرا ہوا تو مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ کہیں ان پیڑوں کے پیچھے ہمارا کوئی دشمن آ جائے اور ہمیں اٹھا کر ندی میں پھینک دے تو ہم کیا کریں گے۔ فضا میں جھینگر کی آواز ارتعاش پیدا کرنے لگی۔۔۔ ہم تیز تیز قدموں سے چل کر گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ سماج کا خوف ابلتے پانی کی طرح ہمارے چاروں اور پھیلنے لگا۔ خوف وہ خوف ناک اژدھا ہے جو زندہ انسانوں کی سانسیں پی کر جیتا ہے۔ گھر سے خوف کے دائرے میں گھر کے اندر رات ہی سب سے محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے تیرگی رات کے دامن میں خود کو گم کرتی جاتی ہیں ویسے ویسے ہی ان سے چپکا ہوا خوف کا لباس بھی تار تار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس خوف کے اندر سے خوابوں کا طلسم جاگنا شروع کر دیتا ہے۔ خوابوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آئے تو سامنے گلناز کے گھر کا دروازہ تھا۔۔۔ اس نے گاڑی سے اتر کر دروازے پر دستک دی۔ میں انتظار کرنے لگا کہ دروازہ کھلے اور وہ اپنے گھر کی پناہ گاہ میں داخل ہو جائے۔ میں آہستہ آہستہ گاڑی کو پیچھے کرتا جا رہا تھا مگر جب

تک وہ گھر میں داخل نہ ہو جاتی میں گلی سے گاڑی نہ موڑتا۔۔۔ میں گزرے وقتوں کے خوشگوار لمحوں کی یادوں میں کھویا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لوگ تو پل بھر میں بچھڑ جاتے ہیں مگر ان کی یادیں نہیں بچھڑتیں۔ وہ اپنے پیچھے محبتوں اور چاہتوں کا وہ بیش قیمت سرمایہ چھوڑ جاتے ہیں کہ انہیں کوئی فراموش کرنا بھی چاہے تو فراموش نہیں کر سکتا۔ یادیں وہ ڈوری ہے جو جدا ہو جانے والوں کو تنہائی میں بھی ایک دوسرے کی قربت کا احساس دلا کر آپس میں جوڑے رکھتی ہے۔ اگرچہ گلناز سے واقفیت خاصی پرانی تھی مگر ملاقات کم کم ہی ہوتی تھی۔ وہ ایک سکول ٹیچر تھی اور اس کے خاوند بھی سکول ٹیچر اور میرے والد کے کولیگ تھے۔۔۔ اس لئے دونوں خاندانوں کا آپس میں ملنا جلنا عام سی بات تھی۔ اور سب سے بڑھ کر ہم ایک رفاہی تنظیم کے رکن تھے جس کی اکثر میٹنگز گلناز کے گھر ہوتی تھیں۔ وہ جب بھی چائے لے کر آتی تو میں پوچھتا ۔۔۔ چینی۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے یاد ہے۔۔۔ وہ ہنستی ہوئی جواب دیتی کیونکہ میں پہلے دن ہی بتا چکا تھا کہ چینی بہت کم لیتا ہوں۔ صرف چینی ہی یاد ہے۔۔۔ میں جملہ ادھورا چھوڑ دیتا۔ نہیں۔۔۔ بسکٹ بھی یاد ہیں۔۔۔ اور سب قہقہہ لگاتے۔

ایک دن میٹنگ کے بعد چائے پر گپ شپ ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ آج ہر کوئی اپنی شادی سے پہلے بیوی سے پہلی ملاقات کی کوئی یادگار بات شیئر کرے۔۔۔ تاکہ معلوم ہو کہ کون کتنا رومینٹک رہا ہے۔ سچ بولنا ہوگا کیونکہ تقریباً سب کی بیگمات یہاں موجود ہیں۔ غلط بیانی کرنے والے کو لاریب دینی پڑے گی۔ اور جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔۔۔ وہ کیا بتائے؟ ایک کنوارے نے وضاحت چاہی۔ وہ کم از کم محبت کے بارے میں رائے تو دے سکتا ہے۔۔۔ ایک رائے سامنے آئی۔ وہ مستقبل میں متوقع ملاقات کے بارے میں اپنے خواب تو بتا سکتا ہے۔۔۔ اور کچھ نہیں تو وہ کسی خیالی محبوب سے تخیلاتی ملاقات کا حال تو بتا سکتا ہے۔ ماحول خاصا رومینٹک ہو رہا تھا۔ جب میزبان ہونے کی حیثیت سے گلناز کے خاوند نے کہا محبت کے اتنے ہی رنگ ہوتے ہیں جتنے کہ ست رنگی قوس قزح کے۔۔۔ محبت کا دائرہ قوس قزح کے اس پار حیرت کے نئے جہان میں کھلتا ہے جہاں خواب ہوتے ہیں۔ خیال ہوتے ہیں۔ نئی دنیا ہوتی ہے۔ ہر کسی نے کچھ نہ کچھ ضرور کہا۔۔۔ کسی نے کہا محبت۔۔۔ وہ کسک ہے جو دو ساتھی روحوں کے ملاپ تک سسکتی رہتی ہے۔ محبت۔۔۔ مرد اور عورت اور کائنات کی مشترکہ میراث ہے۔ محبت۔۔۔ لفظ اور آواز اور ادا کی وہ مثلث ہے جو کبھی ٹوٹتی نہیں۔ محبت۔۔۔ خوشبو اور روح اور لمس کی وہ تکون ہے جس کا دروازہ تحیر کے جہان میں کھلتا ہے۔ محبت۔۔۔ وہ لمحہ ہے جسے صرف محسوس کر سکتے تھے۔ چھو نہیں سکتے تھے۔ مگر اب یہ لمحہ دست طلب کی دسترس میں ہے بلکہ اسے آنکھوں میں مقید بھی کیا جا سکتا ہے اور جب چاہیں تو ان کو آنکھوں کے پردے کے پیچھے کھینچ کر اپنے سامنے لا سکتے ہیں۔ اس کو اصلی جگہ پر کھڑا کر سکتے ہیں۔ اسی لئے میں ماضی کے دبیز پردوں سے اس لمحہ کو کھینچ لایا ہوں جب میری ملاقات اس سے پہلی بار ہوئی تھی۔ ماں جی نے اسے گھر بلایا تھا تاکہ میں اس سے مل لوں کیونکہ وہ اسے اپنی بہو بنانے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ کھانے کے بعد ماں جی نے کہا کہ اسے یونیورسٹی ہوسٹل چھوڑ آؤں۔۔۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ گھر سے نکلے تو میں نے پوچھا۔۔۔ کس طرف سے چلنا ہے۔۔۔ اس نے کہا کیوں نہ ہوسٹل جانے سے پہلے ایک لمبی ڈرائیو پر چلیں۔۔۔ اور پھر یہ لمبی ڈرائیو دن ہفتے، مہینے سالوں پر محیط ہو چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبت کرنا گناہ ہے نہ جرم۔۔۔ بس محبت کے لئے ایک ہی شرط لازم ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کا احترام کریں۔

ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے مگر کیا یہ ممکن ہے کہ کسی سے محبت کی جائے مگر اس جذبے کو صرف اپنی ذات میں چھپائے

رکھو۔۔۔گلناز نے سوال اٹھایا۔ہاں۔۔۔ایسا ظاہری طور پر تو ممکن ہے مگر ایسا کر سکنے والا شخص تو پہاڑ جیسے مضبوط اعصاب کا مالک ہی ہو گا۔ مگر عشق اور تعلق تو ہمیشہ تک چھپ نہیں سکتے ۔۔۔کسی نے آواز اٹھائی۔محبت کا معاملہ روح سے جڑا ہوا ہے۔۔۔گلناز بولنے لگی۔۔۔محبت روح میں ایسی وہ بھوک ہے جو رفتہ رفتہ اتنی بڑھ جاتی ہے کہ یہ پیٹ میں پڑی خوراک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔اور معدے میں تحلیل ہو کر اس کی لہریں معدے سے منہ کی طرف سفر کرتی ہیں۔روح کی زبان پر مٹھاس کی لذت پھیلا کر اپنی جڑ وہاں روح کی تلافی کی طرف بڑھ جاتی ہے۔کیونکہ خالق نے روح کے ساتھ ہی ایک جڑ واں روح تخلیق کی ہوئی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کے سارے خواب بے معنی رہتے۔اور جب محبت خوابوں کی زبان بولتی ہے تو خوشیاں زندگی کی خاموشیوں میں نغمے بن کر اترتی ہیں۔جب نیند میں خواب کے پھول مسکراتے ہیں اور دونوں روحیں آپس میں گفتگو کرنے لگتی ہیں۔۔۔اپنے آپ کو کھوجنا شروع کر دیتی ہیں۔ہزاروں سالوں سے خوابوں کا سلسلہ۔۔۔حیرت اور حیرت۔۔۔تہہ در تہہ۔۔۔ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔۔۔نہ جانے ہم کہاں گم ہو جاتے ہیں۔موجود اور ناموجود کے سارے اسرار چھوٹے چھوٹے لمحوں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔لمحے جو کہ مسلسل سفر میں ہیں۔کسی بھی سفر کی ابتدا اور انتہا ہمیشہ نامعلوم ساعتوں کی گود میں کھیل رہی ہوتی ہیں۔ان کے بطن سے خوشیوں اور لذتوں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔روحیں آپس میں ملتی ہیں۔ان کے جسم منتقل ہوتے ہیں تو محبت سرفراز ہوتی ہے اور خوابوں میں ملاقاتوں کے گلاب کھلتے ہیں۔

میں نے غور سے گلناز کی طرف دیکھا۔وہ کسی اور ہی جہان میں پہنچی ہوئی تھی۔اور پھر بولتے بولتے وہ رکی تو سب ہی خاموش تھے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب باتیں ختم ہو جاتی ہیں تو خاموشی ہی گفتگو بن جاتی ہے۔خاموشی کے سائبان کے اندر ایک دوسرے کی قربت کا احساس ہمیں آئندہ ملاقات کی زنجیر میں باندھ رکھتا ہے۔اور جب بصارت بھی قربت کے لمحوں کے بوجھ سے بوجھل ہونے لگتی ہے تو ہم سب اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیتے ہیں۔میں گزرے وقتوں کے خوبصورت لمحوں کی یادوں میں کھویا ہوا تھا کہ میرا آٹھ سالہ پوتا کمرے میں آیا۔دادا۔۔۔آ جاؤ۔۔۔اس نے ابھی اردو کے چند لفظ ہی سیکھے تھے۔میں نے مسکراتے ہوئے اسے سینے سے لگایا اور پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا تاکہ اپنے کھلونے دکھائے۔تھوڑی دیر بعد وہ کارٹون دیکھنے لگا اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔۔۔میرے لئے جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔

بچوں کی اپنی زندگی۔۔۔اور مسائل۔۔۔وہ سارا سارا دن روزی روٹی کے چکر میں بھاگتے رہتے اور میں گھر میں اکیلا۔۔۔اور پھر میں واپس اپنے گھر لوٹ آیا کہ یہاں کم از کم لوگوں کے پاس وقت تو ہے کہ ایک دوسرے سے مل سکیں۔لیکن میرے اندر کی تنہائی نے مجھے بہت تنہا اور خاموش کر دیا۔زندگی کا یہ نیا موڑ یعنی بیوی بچوں کے بغیر اکیلا رہنا۔مجھ کو مشکل لگنے لگا۔زندگی کے درخت کی جڑوں کو تنہائی کی دیمک لگ گئی۔ان حالات کو دیکھتے ہوئے دوستوں نے رشتوں نے اور دوسرے عزیزوں نے دوسری شادی کے مشورے دینے شروع کر دیئے۔۔۔کچھ دنوں بعد بھائی، بہو بیٹوں، بھتیجے، بھانجوں نے ایک محاذ کھول دیا کہ آپ اکیلے نہیں رہ سکتے اس لئے اس گھر میں آپ کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جس سے میری زندگی میں ایک مثبت تبدیلی کا دروازہ کھل جائے گا۔آوازوں کے اس شور میں کافی غور و خوض کے بعد میں بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا مگر زندگی میں زندوں کے ساتھ ہی رہنا اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ایسا ہو جائے تو اس میں کچھ حرج بھی نہیں ہے۔جب میں نے انجم کے ساتھ زندگی میں گزرے ہوئے واقعات کو وقت کی چھلنی

میں ڈال کر بچوں کے ساتھ کانفرنس میں کچھ معیار مقرر کرنے کی کوشش کی۔۔۔ یعنی کہ پختہ عمر کی غیر شادی شدہ ہو یا بے اولاد بیوہ کو ترجیح دی جائے جس کی کوئی ذمہ داری باقی نہ ہو۔ میرے مزاج کو سمجھ سکے گھر بسانے کی آرزومند بھی ہو جو شوہر اور سائبان کی قدر کرے۔ بے اولاد بیوہ نہ تو صرف کسی بچی کی بیوہ ماں ہو۔۔۔ کم از کم کسی لڑکے کی بیوہ ماں سے تو بالکل ہی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ لڑکا اپنی ماں کو کسی اور شخص کے ساتھ برداشت نہیں کر سکے گا اور سب سے بڑھ کر ایسی خاتون جو مجھ کو میری ساری خوبیوں، خامیوں کے ساتھ سنبھال سکے۔ میرے ساتھ خوش رہ سکے۔ اس فیصلے کے بعد پورا خاندان اپنے طور پر کسی ایسی خاتون کی تلاش میں نکل پڑا جو قائم کردہ معیارات کے قریب تر ہو اور میرا ٹیلی فون بھی بہت مصروف رہنے لگا۔ جب بھائی نے خاموشی سے ایک خاتون تلاش کر لی جس کے خاوند کو فوت ہوئے تقریباً سات سال ہو چکے تھے۔ چار بیٹیاں تھیں جن کی شادی ہو چکی تھی۔ ایک پاکستان میں اور تین امریکہ میں۔۔۔ وہ بے گھر تھی کبھی ایک بیٹی کے پاس کبھی دوسری کے پاس۔ بھائی نے میرے لیے سرپرائز تیار کیا اور کہا کہ کل شام گھر آنا تمہیں ایک خاتون سے ملوانا ہے۔۔۔

اگلے دن میں بڑے اہتمام سے تیار ہوا جب بھائی کے گھر پہنچا تو میرے سامنے ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ میرے سامنے اور کوئی نہیں۔۔۔ گلناز کھڑی تھی۔۔۔ میرے ذہن میں بسا ہوا احترام کا پودا تناور درخت بن گیا جس کی چھاؤں میں دوسری شادی کا فیصلہ قدرتی چشمے کی طرح میرے بچوں تک سے پھوٹ پڑا۔ اس نے کمرے میں کھڑے سب لوگوں کو خوشی سے شرابور کر دیا۔ کمرے میں خوشی کی تیز ہوائیں چلنے لگیں اور بچوں تک سکون کی ٹھنڈی چادر پھیل گئی اور وقت اپنی رفتار سے رینگنے لگا۔

◆◆◆

گیان کا لمحہ

طلعت منیر

مختصر تعارف

صنعت کار: ایم اے سیاسیات، بی ایڈ، ایم ایڈ منٹی۔ شاعری کی دو کتابیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں اور افسانوں کی کتاب زیر طبع ہے۔

سال خوردہ مصور نے ذات کا احساس کینوس اٹھایا اور وجود کے کھردرے برش سے پہچان کے مقدس رنگ بکھیرنے لگا۔ رنگوں نے کینوس کے مساموں پر بھیں سیاہی کی اور رات کے قریب سنانے کو صبح صادق کی پہلی کرن جھکی۔ نوجوان نے فکر کی چڑیا کو اڑایا مگر وہ تصویر پر پھڑ پھڑا کر واپس آ گئی۔ ''تمہارا سایہ نہیں ___؟'' نوجوان نے سوال کی گیند بوڑھے کی سماعت کے گول میں پھینکی۔ بوڑھے نے نوجوان کو آنکھوں کے میزان میں رکھ کر اس کے وزن کی جانچ کی اور رنگ آپس میں ملا کر اس پر پھینک دیے۔ رنگ نوجوان کے سر کے اوپر گزر گئے۔ اس نے فکر کا احرام باندھا اور ذات کا طواف کرنے لگا۔ بوڑھے مصور نے زندگی کی تارنگی عمارت کو اپنے کندھے پر درست کیا اور تاریکی کو کینوس پر پھیلانے لگا۔ ''تاریکی میں وہ مجھ میں حلول کر جاتا ہے اور میری دھڑکن کے آرکسٹرا پر مسلسل رقص کرتا ہے۔'' نوجوان نے آواز کی رال ٹپکائی۔ ''تیرگی گناہ کی مزدوری ہے۔'' بوڑھے نے ریاضت زدہ آواز کی بانسری بجائی۔ نوجوان نے اپنا سر اپنے اندر ڈال لیا۔ پھر اس نے احساس کی ڈکشنری کھولی اور الفاظ تلاش کرنے لگا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ ___ میں سایہ ہوں۔'' ''اور ___ وہ میں ہے۔'' نوجوان نے اپنا سر باہر نکالا اور الفاظ کو زبان کے ترازو میں تولا۔ ''سائے وجود کی علامت ہیں اور ہم سب علامات ہیں۔'' بوڑھے مصور نے فکر کی تصویر پر رنگ تھوپتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں سایہ ہوں تو ___ میں ___ میں کیوں ہوں؟'' نوجوان سوال بن کر بوڑھے کی تحریروں میں لٹک گیا۔ ''ہم وہ نہیں جو ہم ہیں، ہم وسیع کینوس پر پھیلے ہوئے ایسے شوخ رنگ ہیں جو دیکھتے تو ہیں لیکن چمکتے نہیں۔'' بوڑھے مصور نے تصویر میں موت کا رنگ بھرا اور اس کے پیچ غائب ہو گئے۔ نوجوان نے آنکھوں کے لینز (Lenses) سائے کی طرف پھیرے جو اطمینان کی دوشیزہ کی گود میں مہک رہا تھا۔ ''میں اس سے خوفزدہ ہوں۔'' خوف کا ابالوا اس کی نوجوان آنکھوں میں چکرانے لگا۔ ''کبھی کبھی وہ حکم چلاتا ہے اور بے بسی میرے لبوں میں اپنے لب پیوست کر دیتی ہے۔'' نوجوان نے حقارت کو اپنی زبان سے لبوں پر ملا اور اٹھ کر لاشعور کے قبرستانوں میں نکل گیا۔ بھوکی خواہشوں کے مدفون ڈھانچوں پر فاتحہ خوانی کرتے اور کم سن خواہشوں کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ ہزار ہا سنہ سالی کا زیور پہنے خوبصورت لباس والی لڑکی نے اخلاق کو مسکراہٹ کی جیب میں رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔ نوجوان نے اپنی جیبیں ٹٹول کر ایک جیب سے محبت نکالی اور لڑکی کی طرف بڑھا دی۔ خوبصورت لباس والی لڑکی نے اپنا پرس کھولا اور حیا کے موتی نکال کر اپنی آنکھوں میں سجائے، پھر گریبان ٹٹول کر تھوڑی سی معصومیت نکالی اور اپنے چہرے پر اس کا میک اپ کیا۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سایہ اس کے قدموں میں رینگتا ہوا سامنے آ گیا اور لڑکی کو لے کر تاریکی کی طرف لپکا۔ سایہ اس کے وجود میں تحلیل ہو گیا۔ وہ سائے کے پیچھے وجود کے ویرانوں میں

داخل ہو گیا۔ ''کون ہو تم ــــ! مجھے آزاد کر دو۔'' وہ الفاظ کو زور زور سے دیواروں میں پھینکنے لگا۔ اس نے دیواروں کے پیچھے پر کنکروں کا جال پھیلایا مگر وہاں تو کچھ نہ تھا۔ ایک مقدس سی پھڑپھڑاہٹ نے اس کی سماعت پر دستک دی۔ وہ گھبرا کر باہر کی طرف لپکا۔ خوبصورت لباس والی لڑکی جا چکی تھی۔ وہ دوبارہ اسی کے راستے پر بھاگا۔ بوڑھا مصور تصویر کا جسم کھولے اس کے اندر بیٹھا کچھ سنا رہا تھا۔ ''وہ بھی پھڑپھڑاہٹ تھی۔'' نوجوان نے توقف کے ہاتھوں سے الفاظ کو چھپایا۔ بوڑھے مصور نے خشیہ لب ہلائی اور تصویر میں سچائی کے رنگ بھرنے لگا۔

●●●

پانچواں کالم

احوال ایک ادبی تقریب کا

شہباز انور خان

[illegible]

چچی

فائزہ سید (آسٹریلیا)

مختصر تعارف

1993ء میں کنیئرڈ کالج لاہور سے بی۔اے کرنے کے بعد بیشتر زندگی پاکستان سے باہر گزری اور اب آسٹریلیا میں آباد ہیں۔ وہ روسی، انگلش اور اردو زبانوں کی سند یافتہ مترجم ہیں۔ پہلا افسانہ غالباً چودہ سال پہلے "تخلیق" میں شائع ہوا تھا۔

پچیس سالہ ڈاکٹر سارہ صوفے پر اپنی ماں کی گود میں سر رکھے گہری سوچ میں گم تھی۔ ماں اپنی بیٹی کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ جانتی تھی کہ سارہ کی خاموشی صرف تھکن کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے جو وہ خود ہی کچھ دیر میں ماں سے بانٹ لے گی۔ تھوڑا عرصہ پہلے ہی سارہ نے اپنے شہر سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر ہسپتال میں ملازمت شروع کی تھی۔ وہ ہفتہ بھر ہسپتال کے قریب ایک اپارٹمنٹ میں رہتی اور پھر اپنی چند چھٹیوں کے لیے گھر آ جاتی۔ ماں، باپ اور چھوٹی بہن اس کے آنے پر کھل اٹھتے۔ گوروں کے دیس میں بسے اس چھوٹے سے خاندان کے افراد ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ سارہ پچھلا ہفتہ ہسپتال میں نائٹ شفٹ کرتی رہی تھی۔ ایک صبح پانچ بجے اس کی نظر ایمرجنسی وارڈ کے سامنے آ کر رکنے والی بس پر پڑی جس میں صفائی کا عملہ ہسپتال آتا تھا۔ سارہ اس وقت فارغ تھی اس لیے وارڈ کی شیشے کی دیوار سے باہر جھانکنے لگی۔ بس سے اترتے ہوئے کلینرز میں ایک چہرہ اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک جانے پہچانے چہرے کو نچوڑ اور مروڑ کر بنا تھا۔ "چچی!"۔۔۔ سارہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ لیکن چچی تو بہت پیاری گڑیا جیسی تھیں۔ وہ دبلی پتلی کلینر تھکے ہوئے انداز میں داخلی دروازے کی طرف چلی گئی۔ سارہ تذبذب میں رہی۔ وہ دوبارہ بھی چہرہ دیکھنے کے لیے بے چین تھی کیا وہ واقعی چچی تھیں؟" دیر تک وہ اسی الجھن میں رہی۔ اگلی چند نائٹ شفٹوں میں اسے کلینرز کی بس آنے کے وقت باہر دیکھنے کا موقع نہ ملا لیکن ایک صبح جب وہ کینٹین کی طرف گئی تو وہاں صفائی کرنے والی دو کلینرز میں سے ایک وہی تھی۔ تاثرات سے خالی چہرہ، سر کے بال بالکل سفید اور دہانے سے لگتا تھا کہ شاید منہ میں دانت بھی کم تھے۔ خستہ حالی سے انداز میں کام کرتے ہوئے وہ دائیں بائیں کسی کو نہ دیکھ رہی تھی۔ پھر بھی سارہ کو یقین ہو گیا کہ یہ اسی حسین طرح دار لڑکی کی پرچھائیں ہے جو کبھی اس کی چچی ہوا کرتی تھی۔ سارہ نے کروٹ لے کر ماں کی طرف دیکھا اور بولی، "ماما، میں نے ہاسپٹل میں چچی کو دیکھا ہے۔ وہ کلینر ہیں۔"

ماں خاموش رہی۔ ماں اور بیٹی دونوں کے ذہن ماضی کی طرف لوٹ گئے۔ سارہ کو کچھ باتیں تو یاد تھیں اور کچھ باتیں ماں سے سن کر اس کی یادداشت کا حصہ بن چکی تھیں۔ ماں بیٹی کی ذہنی ہم آہنگی حیران کن تھی کہ خود بخود ایک کی سوچوں کا تانا دوسری کی سوچوں میں لگ جاتا۔ کبھی وہ آپس میں بات کرتیں تو کبھی بات کیے بغیر ہی کمیونیکیشن چلتی رہتی۔ کوئی بیس ایک سال پہلے جب انیس احمد اور نفیسہ اپنی دو بچیوں کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ میں رہتے تھے تو انیس نے اپنے بھائی کے ویزے کا انتظام کیا۔ بھائی پاکستان سے آ کر ان کے گھر میں بس گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی نوکری کا بندوبست بھی ہو گیا۔ ان چچا میاں کی رہائش اور کھانا پینا تو سب مفت کا تھا۔ تنخواہ کا استعمال

انہوں نے یہ نکالا کہ زیادہ تنخواہ بینک میں ہی رہنے دیتے اور باقی رنگ رلیوں پر خرچ کرتے۔ شمس احمد کا مزاج اپنے بھائی سے بالکل مختلف تھا۔ بھائی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر پہلے تو انہوں نے اسے سمجھایا بجھایا اور پھر کوئی فائدہ نہ دیکھ کر اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ چچا سارہ اور اس کی بہن کو پیار کرتے اور ان کی ماں کے ساتھ بھی اخلاق سے پیش آتے۔ نفیسہ اس قسم کی عورت نہ تھی جو دیور کے اپنے گھر میں مستقل ٹھکانے پر اعتراض کرتی۔ سب کی آپس میں بنی ہوئی تھی۔ جب سارہ آٹھ سال کی تھی تو چچا پاکستان میں اپنے گھر والوں سے ملنے گئے۔ وہاں رشتہ داروں میں ایک شادی پر انہیں ایک نازک سی لڑکی اتنی بھائی کہ گھر والوں سے جھٹ رشتہ لے جانے کی فرمائش کر دی اور شادی کر کے ہی لوٹے۔ چند مہینے بعد چچی بھی آ کر ان کے گھر کا فرد بن گئیں۔ ان کا نام عروج النسا تھا مگر ان کی شخصیت اس بھاری بھرکم نام سے بالکل مختلف تھی۔ چھوٹے بڑے سب انہیں چچی کہنے لگے۔ کم عمر سی چچی نے ابھی پاکستان میں ایف ایس سی کا امتحان دیا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں اور ایک برس پہلے ہی ماں سے محروم ہوئی تھیں۔ سارہ پر تو چچی فدا ہی ہو گئیں کیونکہ ان کے بقول سارہ بالکل ان کی سب سے چھوٹی بہن جیسی تھی۔ ان ماں کے چھوٹے بہن بھائیوں کو چھوڑ آنے پر وہ بہت دکھی ہوئی تھیں اکیلے میں روتی بھی تھیں لیکن گھر والوں کے ساتھ ہمیشہ ہنستے مسکراتے محبت سے پیش آتیں۔ سارہ کو ان سے خوب توجہ ملی اور دونوں کی دوستی ہو گئی۔ چچی نے اسے بتایا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں لیکن ان کے ابو نے ان کی شادی جلد کرنا بہتر سمجھا۔ وہ رشتہ داری کی وجہ سے عروج النسا کے ابو چچا کے خاندان کو جانتے تھے اور یورپ میں سیٹل کماؤ لڑکے کو انہوں نے اپنی بیٹی کے حق میں بہت اچھا سمجھا۔ یہ الگ بات کہ بیٹی کی شادی کے بعد ابو نے کافی ایک اور قرض بھی ادا کیا اور اپنے محروم بچوں کے لیے نئی ماں لے آئے۔ اس زمانے میں فون پر رابطہ بہت مہنگا ہونے کی وجہ سے خطوں پر ہی زیادہ انحصار ہوتا۔ نہ جانے خط کس کے ہاتھ لگ جائے اس خیال سے چچی خطوں میں نہ تو کھل کر کچھ لکھتیں اور نہ ہی گھر سے آنے والے اکا دکا خط سے ان کی تسلی ہوتی۔ ان کی بے چینی اور پریشانی چھپائے نہ چھپتی تو نفیسہ انہیں تسلی دیتیں اور نئی زندگی پر توجہ دینے کو کہتیں۔ چچی کو ڈاکٹر بننے کا بے حد شوق تھا۔ والد کے فیصلے سے شادی کے باوجود انہوں نے اپنی تمنا نہیں چھوڑی لیکن یہ نیا ملک تھا۔ نئے ملک کی بالکل اجنبی زبان سیکھنے میں ہی کم از کم ایک سال لگ جاتا، پاکستان کا ایف ایس سی یہاں منظور کروانے کی کوشش کرنی پڑتی، اور اگر یہ تعلیم منظور ہو جاتی تو پھر کل سات سال میڈیکل کی تعلیم اور ہاؤس جاب میں لگتے۔ چچا نے نئی نئی شادی کے ولولے میں چچی کے ارادوں کی حمایت تو کی تھی لیکن ان کے ملک میں آ جانے کے بعد کوئی عملی رہنمائی نہ دی۔ چچی کے دل میں تمنا سلگتی رہی اور چچا معاملہ نظر انداز کر کے مطمئن ہو گئے۔

چچا کا اب بھی اپنی الگ رہائش لینے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ شادی کے بعد شروع شروع میں وہ بہت خوش تھے لیکن پہلے ہی سال میں اپنی پرانی روش پر واپس آنے لگے۔ کبھی کبھی وہ چچی سے بڑے برے طریقے سے بات کرتے، بغیر بتائے گھر سے غائب رہتے، جب جی چاہتا پیتے اور جب جی چاہتا تیوری چڑھا کر چچی کے اوسان خطا کر دیتے۔ بڑے بھائی اور بھابی نئے جوڑے کی نئی زندگی میں دخل نہ دینا چاہتے تھے۔ چچی امید سے ہو گئیں مگر چچا کے رویے سے پریشان ہی رہیں۔ اب انہیں شوہر کی دوسری دلچسپیوں کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اکثر وہ صبح چچا کے چلے جانے کے بعد اپنا کمرہ بند کر کے روتی رہیں۔ بمشکل نفیسہ انہیں کچھ کھانے پینے اور اپنا خیال رکھنے پر آمادہ کر پاتیں۔ چچا کی بدلحاظی جلد ہی بدسلوکی میں بدل گئی۔ وہ گھر آتے تو چچی بھی انہیں ناراضگی دکھاتیں۔ بند کمرے سے ان کے جھگڑنے کی آوازیں آتیں۔ چچا ہاتھ اٹھانے لگے اور چچی کی سسکیاں چیخوں میں بدلنے لگیں۔ نفیسہ نے اپنے شوہر سے احتجاج کیا کہ وہ اپنے گھر میں یہ حالات برداشت کرتے

کے لیے تیار نہ تھیں۔ انھیں اپنی بچیوں پر برا اثر پڑنے کی فکر تھی۔ چچا نے صاف لفظوں میں پیغام مل جانے کے بعد الگ گھر کرائے پر لے لیا۔ ایک جوڑے کی زندگی میں تو سکون ہو گیا اور دوسرے جوڑے کے درمیان رہا سہا سکون بھی رخصت ہو گیا۔

سارہ کو چچی کی کمی کاٹ کھاتی۔ وہ چچا چچی کے گھر جانے کی ضد کرتی تو اسے منع کر دیا جاتا۔ نفیسہ جب بھی عروج النسا سے فون پر بات کرتیں تو بس اس روتی بلبلاتی لڑکی کو حوصلہ دینے میں لگی رہتیں۔ انیس احمد نے انھیں منع کر دیا کہ وہ مزید مدد کی کوشش نہ کریں کیونکہ ایسے مسائل صرف کسی دوسرے کی کوشش سے کبھی نہیں سلجھتے۔ دونوں گھروں میں آنا جانا بہت کم تھا۔ پھر چچی نے فون کرنا اور فون اٹھانا بھی چھوڑ دیا۔ آخر ایک روز گھر والوں کو چچا سے پتہ چلا کہ وہ "گھٹیا عورت" ایک روز ان کی غیر موجودگی میں پولیس کو بلا کر گھر سے غائب ہو گئی، اب کسی پناہ گاہ میں جا کر رہ رہی ہے اور امدادی اداروں کے سامنے رو رو کر انھیں بدنام کرنے پر اتری ہوئی ہے۔ بات عدالت تک جا پہنچی کیونکہ یہ گھریلو تشدد کا کیس تھا۔ نفیسہ نے ہاتھ جوڑ کر عروج النسا سے معذرت کر لی کہ وہ گواہوں کے طور پر ان میاں بیوی کو نامزد نہ کرے۔ اس کے حق میں گواہی دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ سسرال والے ساری عمر نفیسہ کو لعن طعن کرتے رہتے۔ اگرچہ عدالت نے عاملہ خاتون پر گھریلو تشدد کا اقرار کرتے ہوئے ملزم پر بعض پابندیاں لگانے کا حکم جاری کیا لیکن کوئی سزا نہ دی۔ مضبوط ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے چچا بڑی سہولت سے کیس سے فارغ ہو گئے۔ اسی دوران چچی ایک بچی کی ماں بھی بن گئیں۔ اس نئی زندگی کو دنیا میں خوش آمدید کہنے والا ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ سارہ کے والدین رنجیدہ تھے۔ چچا ان کے گھر آتے تو بچیوں کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر چچی کے متعلق کری ہوئی باتیں کرنے لگتے اور ٹوکے جانے پر برا مان جاتے۔ عدالت نے چچا کے بچی سے ملنے پر پابندی نہیں لگائی تھی لیکن چچا کو اس اولاد میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انتقاماً انھوں نے بچی کی ولدیت سے بھی انکار کر دیا اور قانونی کارروائی سے بچنے کے لیے چچی کو طلاق دے کر ایک اور ملک میں چلے گئے جہاں وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے تھے۔ ازدواجی رشتہ ختم ہونے کے بعد سے انھوں نے الزام تراشیاں اور پھر ولدیت سے انکار کر کے ایسا سکینڈل کھڑا کیا کہ عروج النسا اپنے ہم وطنوں سے کٹ کر رہ گئی۔ نفیسہ اور انیس احمد کو لوگوں کے سوالات سے نمٹنا پڑتا۔ وہ نپا تلا جواب دیتے تو لوگوں کو کوئی سنسنی خیز جواب ملنے کی طلب ہی رہتی۔ سالوں بعد بھی اگر عروج النسا اور اس کی بچی کسی پاکستانی عورت کو کہیں نظر آ جاتیں تو وہ نفیسہ کو بتانا ضروری سمجھتی اور پھر منہ اٹھا کے جواباً کچھ سننے کے لیے منتظر رہتی۔ جب نفیسہ ان کی معلومات میں قابل قدر اضافہ نہ کر پاتیں تو ایسی عورتیں خود کوئی نہ کوئی اطلاع دے دیتیں۔ اسی طرح نفیسہ کو حالات کا کچھ علم ہوتا رہا۔

وقت گزرتا رہا۔ پھر نفیسہ کو لوگوں سے پتہ چلا کہ کئی سال اکیلے کاٹنے کے بعد عروج النسا نے ایک مقامی گورے سے شادی کر لی ہے۔ اس کے متعلق دیسی لوگوں میں چہ میگوئیاں بڑھ گئیں۔ اس کمیونٹی میں اختلافات اور رنگا میلوں کی کوئی کمی نہ تھی مگر لوگ اپنے مستقل اور مستقل مزاج تھے کہ کسی کی رسوائی کو نہ بھلاتے۔ پورا حساب رکھتے، ایک دوسرے کو مطلع کرتے اور نئی معلومات کی تلاش جاری رکھتے۔

ایک روز اچانک نفیسہ کو عروج النسا کا فون آیا۔ عروج النسا اپنے شوہر کے ساتھ اس کے آبائی شہر جانے والی تھی اور جانے سے پہلے اپنا دکھ بانٹنے والی واحد ہستی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس نے شہر بدلنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس کی بچی کو سکول میں پاکستانی بچے الٹی غلط باتیں کہتے تھے۔ اس واحد رابطے کے دو تین سال بعد نفیسہ کو اپنی ہم وطن خبر رساں عورتوں سے پتہ چلا کہ وہ اپنے ادھیڑ عمر گورے شوہر سے بھی الگ ہو گئی ہے۔ وہ آدمی عادی شرابی اور نکھٹو تھا۔ نشے میں نہ صرف بیوی کو مارتا پیٹتا بلکہ بچی کو بھی گالیاں دیتا اور خوفزدہ کرتا۔ بچوں کے تحفظ کے ادارے کو ہمسایوں اور سکول سے اطلاعات ملیں اور ادارے نے چھان بین کی۔ گھرانے کو کاؤنسلنگ اور نشے کے علاج کی پیشکش کی لیکن

بیٹی کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے گھر سے نکال کر فوسٹر ہوم کے سپرد کر دیا۔ عروج النساء اس بیٹی کو نحوست سمجھتی جسے بچانے کی خاطر دوسرے شہر جا کر رہی تھی۔ خالی ہاتھ ہو کر اس نے ان حالات کے ذمہ دار شوہر کو بھی چھوڑ دیا۔ کاش شوہر کو چھوڑنے کے بعد اسے اپنی بیٹی واپس مل گئی ہوتی نجیبہ نے دکھ سے سوچا۔ "ماما" ۔ نجیبہ چونکیں۔ "ماما چچی شادی کے وقت کتنی عمر کی تھیں؟" "ہاں چندا" ۔ "انہیں اپنے سے چودہ سال بڑے آدمی سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ابھی تو وہ دس سال اگلے پروپوزل کا انتظار کر سکتی تھیں۔" "ہاں جانتی لیکن ان کے ابا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ان کی ماں زندہ ہوتی تو بھی یہی ہوتا"۔ "ماما مجھے وہ بالکل کم اور دیر سے لگتیں۔ چچی ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں لیکن بالکل میں کلینز ہیں۔ ان کے ساتھ سب نے برا کیا۔ میں سوچتی ہوں وہ چچا کے چھوڑ کر نے پر اپنے گھر واپس کیوں نہیں چلی گئیں"۔

"سارہ جان، وہ سوسائٹی ہی ایسی ہے کہ بیٹی کی شادی ناکام ہونے کے بعد ماں باپ اسے نہیں سنبھال سکتے۔ پاکستان میں بہت برا اثر ہوتے ہیں جو تم نہیں جانتی"۔ سارہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ "ماما اگر ہم پاکستان میں رہتے ہوتے تو کیا آپ اور بابا میرے ساتھ ایسا کرتے؟ مجھے مارنے والے، بری عادتوں والے آدمی سے نہ بچاتے؟ دنیا میں اکیلی، لوگوں سے بے عزت ہونے کے لیے چھوڑ دیتے؟" نجیبہ کے کلیجے پر گھونسا پڑا۔ "نہیں گڑیا، بالکل نہیں"۔ وہ اپنی بچیوں کے ایسے حالات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ سارہ ماں کے اس طرح تڑپ اٹھنے پر بے اختیار ان کی طرف دیکھنے لگی تو اس کے جی میں آیا۔ کاش میرے ماں باپ نے اس بے سہارا لڑکی کو بھی اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھا ہوتا۔ جو سوچ بیٹی زبان پر نہ لائی تھی، وہ خود بخود ماں کے شعور میں جا پہنچی اور اسے زخمی کر گئی۔ سارہ نے آہستگی سے ماں کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ دونوں گم سم بیٹھی رہیں۔

◆◆◆

کالم

یو۔ کے کی خبریں

سرفراز تبسم (انگلستان)

[illegible]

...رہنے والی شام اختتام پذیر ہوئی۔

(انگلینڈ سے روزنامہ "اصناف" لندن) ... (15-03-2023)

ازالہ اُلفت

افشین نسیم

مختصر تعارف

مختلف رسائل اور اخبارات میں لکھتی ہیں۔ ایک جاسوسی کتاب زیر طبع ہے اور ''تخلیق'' میں یہ ان کا پہلا افسانہ ہے جو شائع ہو رہا ہے۔

مؤذن کی اذان کی آواز پر شہریز نے پان کی چٹائی پر کراہ کر کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گیا پھر اس نے سلاخوں کے دوسری جانب دیوار پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے پونے چار بجے تھے اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ کل صبح کا سورج دیکھنا تو اس کے نصیب میں نہیں ہے وہ سر جھٹک کر اٹھا اور نماز پڑھنے لگا نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر وہ اپنے ماں باپ بہن بھائی اور چھوٹی سی بچی اپنی محبوب بیوی کو یاد کر کے بے تحاشا رو پڑا۔۔۔۔۔ کچھ فاصلے پر مسند بنا کر بیٹھے ہوئے ایاز نائیک نے ہنکارا بھر کے کہا " کیوں بھائی تیرے گھر والے خون بہا میں کروڑ دو کروڑ دے کے تجھے بچا نہیں سکتے ہیں۔"" شہریز نے شدت گریہ سے سرخ آنکھیں اس پر مرکوز کیں اور مسکرا کر کہا " نہیں میں بچنا چاہتا بھی نہیں ہوں" ایاز نے اسکی طرف چند لمحے غور سے دیکھا۔ شہریز 35 سال کا خوبرو جوان تھا بے ترتیب بال اور داڑھی کے باوجود اس کی وجاہت نمایاں تھی۔ ایاز نے اسکی طرف کھسک آتے ہوئے رازداری سے پوچھا۔

""اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہے اور کوئی تمہاری طرف سے اپیل کرنے والا نہیں ہے تو میں کوشش کروں؟"۔۔۔۔ شہریز نے ایاز کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایاز ان نظروں کے معنی سمجھنے سے قاصر رہا لیکن اس نے اپنا سوال پھر سے دہرایا۔۔۔ شہریز نے ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے جواب دیا" نہیں مجھے اپیل کی ضرورت نہیں ہے میں چاہتا ہوں مجھے میرے جرم کی سزا ملے" ایاز نے اس کو حیرت سے دیکھا۔۔۔ پھر اٹھ کر اسکے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اس سے پوچھا۔۔۔۔ "یار تین دن سے ہم ساتھ بند ہیں لیکن تم نے بتایا نہیں کہ تم کو پھانسی کیوں ہو رہی ہے"۔۔۔ شہریز نے تحمل بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا" تم نے بھی تو نہیں بتایا کہ تمہیں پھانسی کی سزا کیوں سنائی گئی تھی؟!
"مجھے۔۔۔ ایاز نے بلند سا قہقہہ لگایا اور پھر بولا " مجھے تو اپنے مزارعے شیدا کی لڑکی پسند آ گئی تھی میں نے اس کے باپ کو دو لاکھ روپے دینے کے بعد کہا کہ لڑکی کو دو دن کے لیے میرے پاس بھیج دے""وہ گڑگڑانے لگا صاحب آپ نکاح کر لیں میری بچی سے پیسے واپس لے لیں وہ ساری زندگی غلامی کرے گی آپ اپنی عزت بنا لیں۔۔۔ ہم۔۔۔۔ ایاز نے غصے سے ہنکارا بھرا""میں ایک مزارعے کی بچی کو حویلی کی عزت بنا دوں۔۔۔۔۔۔ اس وقت تو جانے دیا لیکن اپنے بندے اس پر نظر رکھنے کے لیے بھیج دیے رات میں اپنی دونوں بیٹیوں اور بیوی کو لے کر کھسک رہا تھا سالا میرے آدمیوں نے دھر لیا اور روزینہ کو اٹھا کر میرے پاس لے آئے۔۔۔۔ لیکن وہ بھی اس جاہل کی بچی اس نے خوابگاہ میں رکھے گلدان سے مجھ پر حملہ کر دیا میں نے جھنجھلاہٹ میں اسکا گلا پکڑ لیا۔۔۔۔۔۔""اندازہ نہیں تھا کہ وہ کانچ کی گڑیا مر ہی

جائے گی۔ صبح میں نے بابا سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ وہ لڑکی کی لاش اس کے گھر بھجوا دے میں دے دلا کر معاملہ برابر کر دوں گا"""

""" اور گاؤں میں تو معاملہ برابر ہو بھی جاتا لیکن پتہ نہیں اسی دن وہاں فوج کے کچھ افسر آ گئے لڑکی کے باپ نے ان کے سامنے فریاد کی اور مجھے گرفتار کر کے شہر لے آئے۔۔۔ بڑے کی قسمت اچھی تھی جو وکیل بھی بڑا اچھا مل گیا مجھے پھانسی کے پھندے تک لے آیا""" ایاز نے مسکرا کر کہا """ پھر۔۔۔ پھر تمہاری سزا معاف کیسے ہو رہی ہے تم آج رہا کیسے ہو جاؤ گے۔۔۔؟؟""" شہریز نے بے قراری اور اذیت بھری خاموشی کو توڑ کر مضطربانہ انداز میں سوال کیا۔۔۔۔۔ """ہاہاہا۔۔۔ ایاز نے قہقہہ لگایا""" ارے بڑا حاجی ہو رہا ہے اور چالیس سال کی تقریباً جوان بیوی کو تو بھول ہی گیا تھا""" بس بابا نے اغوا کی دھمکی دی ساتھ چھ کروڑ روپے دینے کا اعلان کیا خون بہا میں فیصلہ ہو گیا۔ اب آج میں چھوٹ جاؤں گا"""۔۔۔۔ """اب تم بتاؤ تم نے کس کا خون کیا ہے کیوں بھری جوانی میں مرنے کی سوجھی ہے میں آج ہی باہر نکل کر اپنے وکیل سے تمہارے لیے اپیل دائر کر سکتا ہوں۔۔۔""

"نہیں شکریہ۔ شہریز نے تلخ لہجے میں جواب دیا" میں اپنے گناہ کی سزا پانے کے لیے راضی ہوں۔۔۔۔ تاکہ میری آگے کی زندگی آخرت کی زندگی بہتر ہو سکے۔۔۔۔۔ """آگے کی زندگی۔۔۔۔۔ آخرت؟""" ایاز نے اچنبھے کی نظر سے دیکھا "ہاں۔۔ شہریز نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا" میری آخرت کی زندگی۔۔۔ "کمال ہے یار۔۔ ایاز کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ جیلر کمرے کے پاس آیا اور اس کے ساتھ موجود سپاہی نے دروازہ کھولا اور ناشتے کی ٹرے رکھ کر خاموشی سے واپس مڑ گئے۔ ایاز نے آگے بڑھ کر پلیٹوں میں جھانکا اور شہریز کی طرف دیکھ کر بولا آج تو تمہارے لیے اچھا ناشتہ آیا ہے۔ پلیٹوں میں حلوہ پوری کا ناشتہ تھا۔ ایاز نے باہر کھڑے سنتری کو للکار کر کہا: "کیوں بھئی بادشاہو آج کیا خاص بات ہے"؟ "سنتری کمرے کے قریب آ کر بولا پھانسی کے مجرم کو پھانسی پانے سے پہلے دنیا کی لذت کا دیدار کرواتے ہیں تاکہ وہ اور زیادہ اپنی موت کا غم کرے۔ شہریز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی اور اس نے کہا: "میری آخری خواہش پوری کر دیں پلیز مجھے موت کا اور اپنے گناہ کا کوئی ڈر نہیں ہے۔" سپاہی خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ایاز نے ناشتہ شہریز کے سامنے رکھ کر کہا۔۔۔ "ناشتہ کر لے یار۔۔۔۔۔ پھر مجھے بتا کہ آخر کون سا ایسا گناہ کیا ہے کہ موت کا بھی خوف نہیں تجھ کو؟؟؟""

شہریز نے جواب دیے بغیر ناشتے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دونوں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ میں گم تھے۔ ناشتہ ختم کر کے شہریز کونے میں رکھے گھڑے سے پانی پینے لگا اسی وقت سپاہی نے دروازہ کھولا اور شہریز کے ہاتھ سے اسٹیل کا گلاس گر گیا۔ "ابا جان" شہریز کے ہونٹوں سے نکلا وہ کانپتے قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا اور وہ قدم پر لڑکھڑا کر گرنے لگا تھا کہ حاجی شفیق الرحمن نے بڑھ کر تھام لیا اور اس کو بھینچ کر گلے لگا لیا۔ "ابا۔۔ مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔ مجھے معاف کر دیں پلیز۔۔؟" روتے روتے شہریز کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ حاجی صاحب بھی بے تحاشا رو رہے تھے۔ ایاز کچھ فاصلے پر خاموشی سے کھڑا ہوا تھا اور اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ان دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کرے گا تو اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو جائے گا۔ آخر کار دونوں تھک کر خود ہی خاموش ہو گئے۔ ایاز آگے بڑھا اور دونوں کو پانی پلایا دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے تھے۔ حاجی شفیق نے نظر اٹھا کر اپنے لاڈلے بیٹے کا چہرہ دیکھا اور کرب کے عالم میں آنکھیں بھینچ لیں ان کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو گرنے لگے۔ شہریز نے بڑے صبر سے خود پر قابو پانے کے بعد زبردستی مسکراتے ہوئے پوچھا "۔۔ ابا۔۔۔ اماں۔۔۔۔ اور سب کیسے ہیں؟" "سب ٹھیک ہیں اچھے ہیں۔۔۔"" شفیق صاحب نے آہستہ سے کہا اور سر

جھکا لیا۔ تبریز نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ ایاز نے آگے بڑھ کر شفیق صاحب سے کہا: "انکل میرا نام ایاز نواز ہے وزیری وٹی کا رہنے والا بلکہ زمیندار ہوں" شفیق صاحب نے چونک کر دیکھا جیسے اس کی موجودگی کا احساس ہی ابھی ہوا ہو اور مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایاز نے بے تابی سے پوچھا: "انکل آپ اس کو بچانے کے لیے کوئی وکیل کیوں نہیں کر رہے پیسوں کا مسئلہ ہے تو کوئی بات نہیں میرے بابا سائیں مدد کر سکتے ہیں" شفیق صاحب نے تبریز کی طرف دیکھا اور بے بسی بھرے انداز میں پوچھا" گھر سے جانے کے بعد تو کوئی خبر ہی نہیں ملی تمھاری۔۔۔۔۔ مجھے تو علم ہی نہیں کہ ہوا کیا ہے؟" ایاز نے بھی بے چینی سے تبریز کو دیکھا اور پھر اس کو جھنجھوڑ کر کہا" مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

تبریز نظریں جھکا کر خاموش بیٹھا رہا تو ایاز نے ملتجی نظروں سے شفیق صاحب کو دیکھا۔ شفیق الرحمن نے۔۔ کہا

"میں تو بس اتنا جانتا ہوں یہ میرا سب سے پیارا لاڈلا بیٹا ہے۔ بچپن سے اسکی ہر ضد اور خوشی پوری کی جو مانگا وہ دیا میرا اور اپنی ماں کا فرمانبردار بیٹا اور بھائی تینوں بچے میری زندگی اور جان تھے اپنی پسند کی شادی کی تھی اس نے پھر نہ جانے کیوں اپنی محبوب بیوی کو چھوڑ کر اس غلط عورت کے ساتھ فرار ہو گیا۔۔۔ کل ایک سال بعد مجھے اس کی خبر ملی تو اس طرح کہ اپنے بیٹے سے اسکی آخری خواہش کے تحت آپ اس سے پھانسی سے پہلے جیل میں مل لیں۔۔۔" اتنا کہہ کر شفیق صاحب پھر رونے لگے۔ ایاز نے آگے بڑھ کر تبریز کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور چلا کر بولا۔۔۔ "جلدی بکواس کر کے کیا کیا ہے تو نے کیوں یہاں پر ہے تو کیوں تجھے سزائے موت دی گئی ہے بول"۔۔۔۔ تبریز نے گویا تھک کر کہا سنو"۔۔۔ میں خود بھی سننا چاہتا ہوں کہ میں نے کیا کیا ہے"

یونیورسٹی میں تبریز کا دوسرا سال تھا خوبصورت سی فرنچ کٹ داڑھی میں وہ سنجیدہ سا نوجوان کئی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز رہا تھا لیکن اپنے گھر کے مذہبی ماحول اور پانچ وقت کا نمازی ہونے کی وجہ سے اس نے کبھی کسی بھی لڑکی کو غلط نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اپنی کلاس فیلو سے بھی اس انداز میں پیش آیا کرتا تھا جیسے وہ بھی اس کی طرح مرد ہوں۔ انہی میں ایک لڑکی جو پہلے دن سے اسکو اپنے دل میں بسا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ درشہوار۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی تبریز کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ عفت مسعود راولپنڈی سے ٹرانسفر ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ کراچی یونیورسٹی میں نئی نئی آئی تھی۔ تعارف کے بارے میں اسکا چہرہ نورانی لگتا تھا اسکے معصوم حسن نے پہلے ہی دن تبریز کو اپنی طرف متوجہ کر لیا لیکن اسکی تربیت اور شرافت اسے ہر قسم کی پیش رفت سے روکے رکھتی تھی۔ یونیورسٹی کی فیرول پارٹی میں اس نے بہت ہمت کر کے عفت سے پوچھا کہ "کیا وہ اس کی زندگی کی ساتھی بننا پسند کرے گی؟" اس کے قریب اس وقت درشہوار بھی موجود تھی۔ وہ ناگن کی طرح بل کھا کر رہ گئی۔ عفت نے بہت سکون سے اسکی بات سنی اور برآمدے کے ستون کی سمت اشارہ کر کے بولی: "اگر آپ سچے ہیں تو میرے ماں باپ سے بات چیت کر لیں وہ اگر اس ستون سے بھی میری شادی کرنا چاہیں گے تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا" میں خوشی سے سرشار ہو گیا اور گھر میں بات کی ماں باپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا چلتا کاروبار تھا جو مجھے اور بھائی کو سنبھالنا تھا اس لیے نوکری کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ عفت حقیقت میں بہت اچھی شریک حیات اور بہو ثابت ہوئی تھی۔ مجھے اپنی زندگی میں کہیں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی جتنا بھی خدا کا شکر ادا کرتا کم تھا۔ پھر میری بیٹی ہوئی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ دو سال ہو گئے تھے شادی کو جب ایک دن بازار میں درشہوار اپنے بھائی کے ساتھ ملی۔ میں اسکے جذبات سے واقف تھا کہ وہ مجھے چاہتی تھی۔ وہ میری طرف بہت پیاسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے اسکی شادی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بے باکی سے کہا: "تمھارے جیسا کوئی ملا ہی نہیں" "پتہ نہیں

کیوں لیکن مجھے یہ اشارہ اچھا لگا اور میں نے اس کو اپنا واٹس ایپ نمبر دے دیا۔ وہ مجھے فون کرنے لگی میسج کرنے لگی اور آہستہ آہستہ ہماری دوستی آگے بڑھنے لگی میری گھر اور بچی پر توجہ کم ہوئی تو فضہ نے محسوس کر لیا۔ وہ مجھ سے شکوے اور شکایت کرنے لگی ہم دونوں میں تلخی اور تیز کلامی بڑھنے لگی۔ ادھر ورشہوار نے مجھے اپنے باپ کے مرنے کی خبر سنائی اور کہا کہ وہ اور اس کے تین بھائی اکیلے رہ گئے ہیں ماں تو پہلے ہی مر چکی تھی اور بڑے دونوں بھائی ملک سے باہر تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے دوسری شادی کر لوں اسکے بھائیوں کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا۔ میں کشمکش میں مبتلا تھا کہ چھوٹی اور اکلوتی بہن کا رشتہ طے ہو گیا ساتھ میں وٹے سٹے میں بھائی کا بھی۔ گھر میں دو شادیاں ایک ساتھ تھیں میں بہت مصروف ہو گیا ورشہوار سے بھی رابطہ کم ہو گیا لیکن اس کا جنون کم نہیں ہوا۔ وہ اور زیادہ میرے پیچھے پڑنے لگی دونوں شادیوں سے فارغ ہو کر میں اس سے ملا تو اس نے پھر شادی پر زور دیا۔ میری شادی کو چار سال ہو گئے تھے بھائی کو اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے ہوئے دیکھ کر میرے بھی دل میں نئی دنیا بسانے کا خیال آ گیا اور پھر اسلام میں بھی تو اجازت ہے۔

میں نے سب سے پہلے فضہ سے بات کی لیکن توقع کے خلاف فضہ مجھ سے الجھ گئی اور اس نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اپنے باپ بھائی کو اور خاندان کو جمع کر لیا۔ میں رات کے اندھیرے میں کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر شہوار کے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن میں نے فضہ کو فون کیا تو اس نے بولا تم نے جہاں رات گزاری ہے اب پوری زندگی وہیں گزارو اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ مجھے غصہ آ گیا اور پھر میں نے اسی غصے میں ورشہوار سے نکاح کر لیا نکاح کرتے ہوئے بھی میرے دل میں ملال تھا لیکن فضہ کے الفاظ اور اپنے خاندان میں کی گئی میری ذلت مجھے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر گئی۔ ورشہوار نے یہ بول کر کے کراچی میں مجھے اپنے گھر والوں کی یاد ستاتی رہے گی ہم لاہور چلتے ہیں اور ہم لاہور آ گئے یہاں آ کر پہلا جھٹکا مجھے لگا کہ ورشہوار نے اپنے دو بھائیوں کو ملک سے باہر بتایا تھا وہ لاہور میں ایک عالیشان کوٹھی میں رہتے تھے اور ان کی کوئی بیویاں بھی نہیں تھیں بلکہ وہ روز ہی ایک نئی عورت کو وہاں لاتے تھے۔

میں روز ورشہوار سے دریافت کرتا کہ یہ سب کچھ کیا ہے وہ مجھے ٹال دیتی آہستہ آہستہ وہ بھی مجھ سے دور ہو رہی تھی میں اس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے لئے کام ڈھونڈنے لگا کہ کب وہ پوری طرح بدل جاتی اور مجھے گھر سے نکل جانے کا کہتی۔ واپس اپنے گھر لوٹنے کا خیال کئی بار آیا لیکن میری ہمت نہیں پڑی کہ گھر والوں کو فون ہی کر لیتا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں انٹرویو دینے گیا تو وہاں میں نے ورشہوار کے بڑے بھائی کو دیکھا اس نے مجھے اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے مجھے جانتا نہیں ہو۔ گھر واپس آیا تو ورشہوار نے ایک فساد برپا کر دیا تھا اس کا کہنا تھا کہ میں کمانا چاہتا ہوں تو اسکے بھائیوں کے ساتھ مل کر کماؤں میں خاموش ہو گیا۔ چند دن بعد میرا بڑا سالا جہانگیر ایک بہت خوبصورت لڑکی کو ساتھ لے کر آیا اور ورشہوار کو اکیلے میں بلا کر ہدایت دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد ورشہوار میرے پاس آئی اور بولی "بھائی آج ایک نیا شکار لایا ہے اس کو تم راوی لے جاؤ گے" "کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا "مطلب میرے بھائی لڑکیوں کا دھندہ کرتے ہیں" شہوار نے کہا میں سن رہ گیا۔۔۔کافی دیر بعد میرے منہ سے جملہ نکلا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"تو۔۔تم کیا کر لیتے" "میں۔۔میں تمہارے جیسی گھٹیا عورت کے ساتھ کبھی نہیں رہتا"۔۔لیکن یہ الفاظ بولتے ہوئے مجھے بھی اپنے لہجے اور آواز کی کمزوری کا شدت سے احساس تھا۔ "ہاہاہا۔۔ورشہوار استہزائیہ انداز میں ہنسی اور بولی۔۔۔۔"نہیں شہریز صاحب آپ کو میرے پاس آپکی من چاہی بیوی کی بے حسی اور بے توجہی نے لا کر دی تھی آپ خود بھی تو جوانوں کی سیر میں نکلنا چاہتے تھے"

"تم۔۔تم مجھے خود کسی اور عورت کے پاس جانے کے لیے بول رہی ہو۔؟؟" مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تو میں نے صدمے کے عالم میں اس سے پوچھا۔ اس نے مسکرا کر کہا: "ایک ہی ڈش روز روز کھاؤ کہاں اچھا لگتا ہے جاؤ ذرا لائف انجوائے کرو" پھر وہ پلٹ کر تحسینی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی: "خوشی سے نہیں تو اجرت والا سمجھ کر کرو اس کام کی اجرت ملے گی تمہیں" اور وہ ایڑی کی ٹھک ٹھک کرتی ہوئی باہر نکل گئی میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا میں پیچھا چھڑانے کا راستہ سوچنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت دوسرے نمبر کا سالا۔۔۔ اب تو مجھے اس پر بھی شک تھا کہ وہ یا یہ میرے سالے ہیں بھی یا نہیں۔۔ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر کمرے میں داخل ہوا اور مجھ سے بولا: "چلو تیار ہو جاؤ نئے مال پر آج تمہارا حق ہے" میں نے اس کو شرم دلانے کے لیے کہا: "میں تمہاری بہن کا شوہر ہوں" وہ خباثت سے ہنسا اور بولا: "بہن تو وہ ہے میری کیوں کہ ہم چھ ایک ماں کی اولاد ہیں باپ پتہ نہیں اس کا کون تھا اور میرا کون ہے" میرے اوپر بجلی گر پڑی جب سے گھر چھوڑا تھا میں احساس ندامت سے پیچھا نہیں چھڑا پایا تھا اس خیال اور گھٹن کی موجودگی میں اردگرد کی کچھ خبر ہی نہیں رکھی تھی میں نے ہیجانی جذباتی کیفیت میں۔۔ میں بہت بری طرح سے بہت برے لوگوں میں پھنس گیا تھا۔ گردن چھڑانی دشوار نظر آ رہی تھی بے شک لیکن ناممکن نہیں۔۔ وہ مجھے ساتھ لے جانے پر مصر تھا میں مجبوراً اس کی بات مان گیا لیکن میرے دل میں بھی گناہ کا خیال نہیں تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا اور اس نے پیچھے سے دروازہ بند کر دیا ساتھ ہی لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور جاتے ہوئے قدموں کی چاپ۔ میں چند لمحوں تک ساکت کھڑا رہا پھر آگے بڑھا سامنے بیڈ پر ایک سولہ سالہ لڑکی بیٹھی بہت خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی میں اس کے قریب ایک کرسی گھسیٹ کر چپ چاپ بیٹھ گیا میرا سر جھکا ہوا تھا وہ بھی بالکل خاموش تھی۔ میں نے کافی دیر بعد اس کی طرف دیکھا وہ اب بھی مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ کچھ درست کی تھی۔ میں نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا: "تم کو بیچنے آئی ہو؟ ڈر کیوں رہی ہو؟" اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور کہا: "میں تو خود کو بیچنے نہیں آئی تھی میرے چچا نے مجھے جہانگیر نامی شخص کے ہاتھ فروخت کیا ہے"

"اچھا اور تم آ گئی؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "ہاں جی تو اور کیا کرتی وہ جہانگیر چچا پہلے تو میری بیوہ ماں اور بہن کا سہارا بنا رہا پھر ایک دن اپنا حق جتا کر اپنے تمام احسانوں کا بدلہ مانگنے لگا" "کیا مطلب ہے؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ" میں نے نرمی سے کہا۔ وہ پھر کچھ حیران نظر آئی شاید وہ مجھے ان جیسا سمجھ رہی تھی یا یہ سوچ رہی تھی کہ میں پہلے سے سب جانتا ہوں۔ کچھ دیر بعد اس نے بتایا کہ: "جہانگیر کی چھوٹی چھوٹی کئی ملوں میں پارٹنرشپ ہے اور وہ وہاں پر کام کرنے والے مرد اور عورتوں کی تمام معلومات فراہم کر کے رکھتا ہے ایسی ہی ایک مل میں اس کا یعنی صدف عثمانی کا چچا ملازمت کرتا تھا اور جہانگیر اس کے گھر آتا جاتا تھا۔ صدف عثمانی کا چچا ملازمت کے دوران بیمار ہوا اور پھر اس قدر بیماری بڑھتی گئی کہ گھر میں فاقوں تک نوبت آ گئی صدف اور اس کی ماں بھی کام کرتی تھیں صدف ٹیوشن پڑھاتی تھی اور اس کی ماں کپڑے سیتی تھی لیکن چچا کی ملازمت ختم ہو جانے کے بعد اور ان کی دوائیوں کے خرچ کی وجہ سے بہت مشکل سے دو وقت کی روٹی چل رہی تھی وہ تو شکر تھا کہ بھلے وقتوں میں دونوں بھائیوں نے گھر بنا رکھا تھا تو کرائے سے جان بچی ہوئی تھی لیکن بجلی گیس اور پانی کا بل ایسے میں جہانگیر رحمت کے فرشتے کی طرح زندگی میں آیا اس کی ماں کا بیٹا اور اس کا بھائی بن کر چچا کا علاج کروایا بجلی کا بل ادا کیا اور بھی بہت کچھ۔ پھر تین دن پہلے آ کر اس نے اپنے تمام احسانوں کا بدلہ طلب کیا اور وہ بھی فوراً چچا کی ملازمت بھی اس نے بحال کروا دی تھی اس کے دھمکیاں دینے پر

ماں نے چچا سے کہا کہ مکان بیچ کر اسکا پیسہ واپس کر دیں لیکن چچا نہیں مانا آخر اس بھائی نے چچا سے اسکا سودا کر لیا" یہ کہانی ہے میری ... صدف خاموش ہو گئی۔ میں ایک بار پھر سناٹے میں رہ گیا۔ کچھ دیر بعد صدف نے میری طرف دیکھا اور پوچھا "اب میرا کیا ہوگا؟"

میں چپ رہا کیا جواب دیتا کہ میں تو خود سب کچھ لٹا کر ایک جزباتی فیصلے کی سزا بھگت رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد میں نے اس سے کہا کہ "وہ سو جائے میں اسکو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا" وہ طنزیہ مسکرائی اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھا کر شتہ واقعات اور موجودہ حالات سے فرار کے بارے میں سوچتا رہا۔ صدف کچھ دیر بعد اٹھی اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کو اپنے بارے میں کچھ بتاؤں اور یہ کہ اسکی مدد کیسے کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا لیکن اسکی مدد کیسے کر سکتا ہوں یہ نہیں بتا سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے میری کرسی پر ہی آنکھ لگ گئی تھی اچانک میں نے ایک چھنا کا سنا میں چونک کر اٹھا اور صدف کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ میں تیزی سے باتھ روم میں داخل ہوا تو اس نے واش بیسن پر لگے ہوئے آئینے سے اپنی دونوں کلائیاں کاٹ لیں تھیں پورا فرش خون سے رنگین تھا میں نے چیخ کر کہا "پاگل یہ کیا کیا تم نے؟" اس نے خون بھرے ہاتھ میرے آگے جوڑتے ہوئے کہا "آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے لیکن ہو سکے تو میرے بعد میری ماں اور بہن بھائیوں کی مدد کر دیں وہ چھوٹے ہیں ابھی" اور اس نے دم توڑ دیا۔

میں اسکی لاش کو باتھ روم میں چھوڑ کر واپس کمرے میں آ گیا اور ایک عجیب سا کرب اپنی رگ رگ میں سرایت کرتا ہوا محسوس کرتا رہا۔ صبح دروشہوار کمرے کو کھول کر اندر آئی مجھے اکیلا دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ "کو کیسی رہی؟" میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا وہ باتھ روم میں داخل ہوئی اور پھر "اوہ وہ شٹ یہ کیا کیا اتنی محنت اور خرچہ کیا تھا بھائی جان نے" وہ باہر آ کر دھاڑی۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی کہ اسے بجھی ایک معصوم عورت کی موت اس کے لئے خرچہ اور نقصان کی بات ہے۔ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا کچھ دیر بعد وہاں جہانگیر دندناتے ہوئے داخل ہوا اور چنگھاڑ کر بولا۔ "یہ تم نے کیا کیا تو اس کو روک نہیں سکتا تھا؟" میں اس کو قتل کا کیس بنا کر تجھے پھانسی چڑھا دوں گا" پھر شہوار کی طرف مڑ کر بولا۔ "تجھے بھی یہی کام کا کہا تھا"۔

میری نظریں جہانگیر کے کوٹ کے پیچھے سے نظر آتے ریوالور کے ہولسٹر پر تھیں اور کانوں میں صرف صدف عثمانی کی آواز کہ میرے لئے آپ کچھ نہیں کر سکتے لیکن میرے بہن بھائیوں اور ماں کو بچانے کی کوشش کرنا۔ میں اچانک آگے بڑھا اور جہانگیر کے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر دونوں پر ایک ایک فائر جھونک مارا دونوں کو گولی لگ گئی تھی۔ میں تیزی سے باہر نکلا سامنے سے شہوار کے دو اور بھائی دو نوکروں کے ساتھ دوڑتے ہوئے آ رہے تھے میں نے ان چاروں پر بھی اندھا دھند گولیاں چلا دیں کس کو گولی لگی اور کون بچا مجھے نہیں پتہ لیکن میں وہاں سے باہر نہیں نکل سکا کیونکہ ریوالور میں گولیاں ختم ہو گئی تھیں اور مجھے باہر موجود چوکیداروں نے جکڑ لیا تھا۔ پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا عدالت میں مجھے علم ہوا کہ مجھ پر پانچ قتل کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ میں نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا اس لیے آج میں یہاں ہوں اور میں کیا وعدہ کر رہوں مجھے سزائے موت ہی چاہیے ہے۔ ایاز نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ کچھ دیر بعد سپاہی نے آ کر کہا کہ

"ایاز کا باپ لڑکی کے باپ کے ساتھ راضی نامے کر آیا ہے وہ باہر چلے ایاز ایک بار پھر دونوں باپ بیٹے سے گلے لگ کر باہر چلا گیا کچھ دیر تک شبیر یہ اور شفیق صاحب گھر والوں کی باتیں کرتے رہے پھر دوپہر کے تقریباً 2 بجے سپاہی نے آ کر شفیق صاحب سے باہر نکل جانے کا کہا۔ شبیر نے آخری بار نظر بھر کر باپ کو دیکھا اور باپ نے اپنے لاڈلے بیٹے کو۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر شدت

سے رو پڑے۔ سپاہی کے دوبارہ پکارنے پر شفیق صاحب نے فرط جذبات اور محبت سے تبریز کو چوما اور اللہ تعالیٰ کی امان میں دیا تجھے میرے بچے کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔ جاتے جاتے بھی وہ مڑ مڑ کر تبریز کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے آنکھوں میں بسا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہوں یہی حالت تبریز کی بھی تھی وہ بھی اپنے باپ کو ایسی ہی پیاسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جب تک وہ اوجھل نہیں ہو گئے۔ شفیق صاحب کے جانے کے بعد اس نے ظہر کی نماز ادا کی اور نگرانی کرنے والے سپاہی سے سورت یسین طلب کی سپاہی کچھ بولے بغیر چلا گیا چند منٹ بعد واپس آیا اور سورت یسین اسکی طرف بڑھا دی وہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کو یاد کر کے معافی مانگتا رہا۔ رات کو اس کے حلق سے کھانے کے نوالے نہیں اتر رہے تھے۔ اس نے کھانا واپس کر دیا۔ کھانا اٹھانے جو سپاہی آیا اس نے مصنوعی ہمدردی سے کہا

"صبح تمھیں ناشتہ نہیں دیا جائے گا اسلئے کھا لیتے" تبریز خاموش رہا تو سپاہی ترحم آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا "بس؟ گھنٹے اور ہیں تمھارے پاس" بولتا ہوا چلا گیا۔ تبریز نے وہ رات ایک ایک لمحہ جاگ کر اور اللہ تعالیٰ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کر کے گزاری۔ بار بار وہ گلے پر ہاتھ پھیرتا جیسے گلے میں پھندا پڑ گیا ہو۔ آخر مؤذن کی اذان کی آواز بلند ہوئی اور وہ گھبرا کر سجدے میں چلا گیا ایک بار پھر شدت سے خدا کو یاد کیا لیکن کچھ عجیب بات ہوئی اس کا دل اچانک تھم گیا اضطرابی کیفیت میں سکون آ گیا اسکو اپنی بدلتی کیفیت پر حیرت ہوئی لیکن وہ پھر سجدہ و دعا میں مشغول رہا۔ وقت گزرتا گیا اور صبح کے آٹھ بج گئے اس کی نظر گھڑی کی طرف غیر ارادی طور پر ہی گئی ورنہ تو وہ گھڑی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ پہلے اس کو خیال آیا کیا اسکو پھانسی لگانا بھول گئے ہیں۔ پھر خود ہی خیال کر کے انکار کرنے لگا سلاخوں والا دروازہ کھولنے کی آواز پر اس کا دل بہت زور سے دھڑکا اور پھر ساکت ہو گیا اسے لگا جیسے وہ مر بھی چکا ہے۔ اٹھو تبریز! اسکی سماعت سے ایک نرم آواز ٹکرائی۔ تبریز نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو آپس میں جکڑ کر سر اٹھایا۔ سامنے بے داغ یونیفارم میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر لیکن توانا شخص کھڑا ہوا تھا کہ شانوں پر ڈی ایس پی افسرانہ رینک لگا ہوا تھا وہ ملائم سی مسکراہٹ کے ساتھ تبریز کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ تبریز لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس کو ایسے دیکھنے لگا جیسے شاید بکری قصائی کو دیکھتی ہوگی۔ اسکی مسکراہٹ گہری ہوگئی اور اچانک اس نے کرخت آواز میں غرا کر بولا "سپاہی کرم دین دیکھ کیا رہے ہو لے چلو" تبریز نے دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا اور کرم دین کے دھکیلنے پر آگے بڑھ گیا۔ اس کو کھلی آنکھوں سے بھی کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا لڑکھڑاتے قدموں سے کچھ دور چلنے کے بعد کرم دین نے اسکا بازو دبا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ تبریز پھانسی گھاٹ کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ "آنکھوں کو کھولیں برخوردار" اسکی سماعت سے وہی آواز ٹکرائی لیکن اس بار آواز میں بھی مسکراہٹ شامل تھی اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیرت سے پھیلتی چلی گئیں کیونکہ وہ پھانسی گھاٹ پر نہیں ڈی ایس پی کے آفس میں موجود تھا اور سامنے اسکے والد اور۔۔۔ ایاز۔۔۔ انسپکٹر کی وردی میں ملبوس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "ایاز تم؟ تو کل رہا ہو گئے تھے یہ سب کچھ کیا ہے؟" تبریز نے کہا اور ساتھ ہی وہ بری طرح سے چکرا گیا۔ ایاز نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور ڈی ایس پی کی کرسی کے سامنے اس کو بٹھا دیا۔ تبریز نے سب کو دوبارہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو ڈی ایس پی صاحب ہنس پڑے اور ایاز کی طرف دیکھ کر بولے "یار اسکی کہیں ویسے ہی موت نہ ہو جائے بتا دو اسکو یہ سب کیا ہے"

ایاز صادق اسکے نزدیک بیٹھ گیا اور پیار سے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا: "میں انسپکٹر ایاز صادق ہوں تمھارے کیس کی تفتیش میرے حوالے تھی"۔ "میرے ماتحت آفیسروں نے جب تم سے جرم کی وجہ معلوم کرنا چاہی تم نے ایک ہی جواب دیا میں گنہگار ہوں

میں نے قتل کیا ہے مجھے سزا دو اور بس تم یہ بھی بتانے پر راضی نہیں تھے کہ جس کو مارا ہے ان سے رشتہ کیا تھا تم وہاں موجود کیوں تھے۔ مجھے تمھاری صورت سے اندازہ تھا تم کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے تمھیں موت ہی راستہ نظر آ رہی ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اور ڈی ایس پی صاحب نے یہ حل نکالا کہ تم سے اس طرح سچ اگلوایا جائے کل کا دن اور پوری رات میں نے اس گینگ کو گرفتار کرنے میں صرف کی ہے اور اب تمھاری رہائی کے لیے میرے پاس کافی ثبوت ہیں اس وقت تم کو ضمانت پر رہا کیا جا رہا ہے لیکن عدالت سے بری ہونے تک تم لاہور سے کہیں نہیں جا سکتے ہو" شہریر پتھر کی طرح ساکت بیٹھا سب سن رہا تھا ایاز صادق کے خاموش ہوتے ہی چیخ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا اور بے تحاشا رو دیا اور وہ شفیق صاحب بھی رو رہے تھے لیکن ان کے آنسو خوشی کے آنسو تھے۔

◆◆◆

افسانہ

سالگرہ کا جھانسہ

ممتاز راشد لاہوری

نومبر کی ایک قدرے خنک شام تھی۔ شام کے ساڑھے آٹھ ہی بجے تھے۔ برکت مارکیٹ اور مسلم اعظم میرج ہال والے چوک سے ایک چمکتی دمکتی مہنگی بڑی کار، جناح ہسپتال لاہور کی طرف فراٹے بھرتی رواں دواں تھی۔ اسے ایک چالیس سالہ خوش پوش چلا رہا تھا۔ ان کے علاوہ کار میں کوئی نہ تھا۔ پورے سلور سے چکوال گے بس اسٹاپ پر ایک ادھیڑ عمر خاتون ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔ روز کے معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ بس اسٹاپ پر بھی کوئی اور نہیں تھا۔ ان کے سامنے پنجاب یونیورسٹی کیمپس کی طویل دیوار کے پیچھے کے اکلوتوں پر بیٹھے ہوئے سرسبز میدان تھی اس معتدل شام میں خاموشی کو بڑھا رہے تھے۔ بس اسٹاپ کے قریب آ کر کار کی رفتار کم ہوئی اور خاتون کے پاس آ کر رک گئی۔ خاتون کی سمت والے شیشے کو نیچے کر کے کار والے نے ادھیڑ عمر خاتون سے کہا "چلو گی؟" "نہیں" خاتون نے مختصر جواب دیا۔ "کیوں؟" مرد نے آہستگی سے پوچھا "میں بال بچوں والی ہوں" خاتون نے خشکی سے لہجے میں جواب دیا۔ مرد نے کوٹ کی جیب سے پانچ پانچ ہزار کے کچھ نوٹ نکال کر دکھائے اور گویا ہوا "کہ" یہ بھی لے لو۔ صرف ایک گھنٹے کے لیے قریب ہی میری کوٹھی میں جانا ہے۔ میری سالگرہ ہے۔ اکیلا ہوں، سالگرہ میں آپ کا ساتھ درکار ہے۔ پھر آپ کو یہیں لا کر اور چھوڑ جائیں گے" خاتون نے لرزتے ہوئے نوٹ دیکھے۔ اپنے ذہن میں اس نے اپنے مہینے بھر کے اخراجات کا حساب لگایا۔ مکان کا کرایہ، بچوں کے سکولوں کی فیس، بیمار شوہر کی دوائیاں، گھر میں مہینے بھر کا راشن۔ اخراجات کا یہ اندازہ اس نے چند لمحوں ہی میں لگا لیا اور کار کا دروازہ کھول کر آہستگی سے بیٹھ گئی۔ لرزتے ہاتھوں نوٹ پکڑ کر اس نے اپنے بیگ میں رکھ لیے۔ سفر کے دوران کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ پانچ چھ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ کار فیصل ٹاؤن کی ایک چھوٹی سڑک پر واقع کوٹھی کے پورچ میں رکی۔ دونوں کار سے اتر کر گھر کے لاؤنج میں داخل ہوئے۔ وہاں کوئی سات آٹھ مشٹنڈے بیٹھے تھے۔ عورت گھبرا کر واپس بیرونی دروازے کی طرف لپکی تو ساتھ والے مرد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرا دیا۔ پھر آیا تو اس عورت کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ ظلم اور بربریت کا ناچ شروع ہوا۔ کوئی دو گھنٹے بعد اسی کار میں دو مرد اگلی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور دو پچھلی سیٹوں۔ پچھلی سیٹ کے مردوں کے درمیان وہی خاتون بے سدھ بیٹھی تھی۔ کار ساتھ والی بستی کے ایک ویران سے جلو ٹاؤن پارک کے پاس جا کر رکی۔ پارک کے پاس ایک بینچ تھا۔ اس خاتون کو گھسیٹ کر اس بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ مرد تیزی کے ساتھ دوبارہ گاڑی میں سوار ہو کر رفوچکر ہو گئے۔ وہ خاتون کچھ لمحے خاموشی سے بیٹھی رہی اور پھر نڈھال ہو کر بینچ پر ایک طرف کو لڑھک گئی۔ پارک اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ قریبی مکانوں کے لوگ اس صورت حال سے بے خبر گھروں میں بند تھے۔ پارک کی واک کرنے والی کسی راہ داری پر واک کرنے والا ایک بڈھا اس بینچ کے پاس سے گزرا۔ صورت حال کا کچھ جائزہ لیا۔ جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور مدد کے لیے ون ون ٹو ٹو (1122) ڈائل کرنے لگا۔ اس جلو ٹاؤن پارک اور اس کے مکانوں کی خاموشی رات کے اندھیرے اور خاموشی میں اور بھی مہیب ہو گئی تھی۔

غزلیں

نذیر قیصر

O

وحشت سے واقف لگتا ہے
اک ستارہ بھی ساتھ چلتا ہے
لہلہاتی ہے شام کھیتوں میں
آسماں رنگ بدلتا ہے
بھیگتے ہیں درخت بارش میں
جگنوؤں سے اجالا لگتا ہے
دل محراب سے نکلتا ہے
بادلوں کو دیا نگلتا ہے
رات صبح شفق سے ڈھلتی ہے
آسماں بوجھ سے پگھلتا ہے
سیر کرتی ہے وہ حویلی میں
چاند بھی کھڑکیاں بدلتا ہے
خواب میں پھول بن رہے ہیں لوگ
جاگنے والا آنکھ ملتا ہے
گنگ چڑیاں مجھے جگاتی ہیں
دن ترے بعد بھی نکلتا ہے
ہجر پھیلا ہے گھر میں ہجر کا یہ
اور یہ پھیلا ہوا سے چلتا ہے
روز کھلتے ہیں پھول بیلے کے
روز اک تعویذ لگتا ہے
میرے جامِ سفال میں قیصر
رات کا آسماں پگھلتا ہے

OOO

اسلم انصاری

O

جز انتہائے غم مرے طرزِ بیاں میں کیا رہا؟
یہ بھی اب کہنا ہے اے غم کے نشاں میں کیا رہا؟

تہ غبار بلا تک بھی نہیں ہے دشت میں
اور تلی بھی نہ ہو تو کارواں میں کیا رہا؟

کوئی زیاں وفا چھلکا نہیں اس جام سے
ساقی کلام کے حسیں بیاں میں کیا رہا؟

گر خدا کا گروہ مجھ چاہے زمیں کی تو کبھی
سوچئے، پھر کائنات کے گماں میں کیا رہا؟

زندگی اک داستانِ عشق ہے سمجھیں اگر
گر نہ ہو ذکرِ محبت، داستاں میں کیا رہا؟

اب بھی دامن پاکیوں میں ہیں ہزاروں گلستاں
یہ نہ کہیے گا کہ دامن پاکیوں میں کیا رہا!

OOO

نسیم سحر

O

کتنا اس دل نے کر دیا پاگل!
اس کے اک پل نے کر دیا پاگل
اک نظر اس کی میری سمت اٹھی
چشمِ قاتل نے کر دیا پاگل
اس کی باتیں عجیب باتیں تھیں
مردِ کامل نے کر دیا پاگل
میری تنہائی ہو گئی غارت
رنگِ محفل نے کر دیا پاگل
ایک گوٹا لگا ہوا تھا
جس کی جھلمل نے کر دیا پاگل
دیر تک کیسے اس کو دیکھیں ہم
اس مقابل نے کر دیا پاگل
حالِ دل اس سے کہہ نہ پائے تھے
دلِ بزدل نے کر دیا پاگل
آئنے میں جو میرے سامنے تھا
اس مقابل نے کر دیا پاگل
راستے اس کے ٹوٹے پھوٹے ہیں
جس کو منزل نے کر دیا پاگل
میں تو ہوش و حواس میں تھا مگر
ان مسائل نے کر دیا پاگل
کتنی مشکل میں تھی وہ ناؤ نسیم!
تھے ساحل نے کر دیا پاگل

OOO

انور جمال

O

کبھی ہجرت، کبھی کانچ و تو فسانہ مرا
زمیں کہانی مری، آسماں فسانہ مرا

یہ میرا ارتقا ہے حرف و خیال و صوت و رنگ
اڑائے پھرتا ہے مجھ کو یہ آب و دانہ مرا

تو گوشِ دل کا منتظر، میں چشم و دل کا ہوں
ترے گماں سے آگے ہے آستانہ مرا

وہ میرے عہد کے شجرے وہ میرے دور کے گیت
کہاں گیا ہے مجھے چھوڑ کر زمانہ مرا

مجھے نصیب ہیں فطرت کے لمحے سکوت
کہ خامشی سے تعلق ہے گھرانہ مرا

میں روز اوڑھتا ہوں روشنی کے ذرے میں
کہ ماہ و سال پہ قائم نہیں زمانہ مرا

مرے جنوں مری وحشت سے پیار ہے اس کو
اسے پسند ہے انداز والہانہ مرا

کبھی وہم تمنا کبھی یہ فیضِ فراق
لگا رہا ترے کوچے میں آنا جانا مرا

میں ایک چراغ ہوں روشن ہوا پہ جلتا ہوا
یہی ہے میری حقیقت یہی فسانہ مرا

OOO

خاور اعجاز

O

زر میں کھنکتی ہوئی خود اتارے ہوئے ہیں
جیسے ہم لوگ بیچارگی کے مارے ہوئے ہیں
زندگی! اک سنہری سی تھی میں تری چاہ سے
ہم تو دنیا کو اسی شرط پہ ہارے ہوئے ہیں
سہل ہو جائیں گے اب کام ترے دنیا میں
ہم تو اے زندگی اللہ کو پیارے ہوئے ہیں
تیرگی ہو رہی ہے ان کے ابھر آنے سے
کیا ستم ہے کہ وہی آنکھ کے تارے ہوئے ہیں
کچھ سمجھتے ہی نہیں قربِ قمار کی چالیں
عقل والے تری رفتار کے مارے ہوئے ہیں
ہاں ابھی تیرے فرمان، زمانے کا وجود
بوجھ دنیا کا مرے شانوں نے سہارے ہوئے ہیں
منتظر ہے جہاں کچھ دور تلک گرداب
کیا غضب ہے کہ اسی سمت کے دھارے ہوئے ہیں
مرحلہ وار الجھتے ہیں کہ یہ راز ہی نہیں
ان کے پاؤں کبھی دریا کے کنارے ہوئے ہیں
آگے جو چاہے وہ کر سکتا ہے ان کی مرضی
ہم معافی کے لیے عرض گزارے ہوئے ہیں
زندگی! ہم ترے احسانوں سے شرمندہ نہیں
ساتھ کے ساتھ ترے بوجھ اتارے ہوئے ہیں
ہم ہیں اور سامنے اک آگ کا دریا خاور
کشتیاں بیچ کے ملاح کنارے ہوئے ہیں

OOO

حسن عباس رضا

O

تھا مجھے مان بہت جس پہ وہ پندار گیا
اب کے ہمزاد مقابل تھا سو میں ہار گیا

آ گئے ہیں ترے احباب زر و مال لیے
اس کا مطلب ہے کہ بازار کا بازار گیا

اب کہاں جائیں تمنا کی خریداری کو
کیسے دل میں تھا جو آخری دیدار گیا

پھر تو باقی نہ رہا ایک تماشائی بھی
دکھ کی تمثیل سے جب مرکزی کردار گیا

رات کے سارے سفر دشت و در و دالان تلے
منزلِ جاں پہ کبھی میں صعوبت پار گیا

نیند میں چلتے ہوئے پہنچا میں جس راستے وہاں
اک دریچے پہ لکھا تھا کہ قدم خوار گیا

یہ تو اچھا ہوا بالکل خلاؤں میں حسن
تھا جو دیوار پہ آئینہ اتار گیا

OOO

قمر رضا شہزاد

O

بھرے ہوئے ہیں یہ کس طرح کے غضب سے ہم
کہاں ہوئے ہیں اپنی ہی صحت کسب سے ہم

جو اس کے حسن کے اطراف میں دہکتی ہے
وہ آگ چوم بھی سکتے ہیں چشم و لب سے ہم

یہ چاندنی سے ڈرے لوگ جان سکتے ہیں
بچاتے رہتے ہیں اب تک کس سبب سے ہم

اور اب تو خود سے ملاقات بھی نہیں ہوتی
اپنے حجرۂ تنہائی میں ہیں جب سے ہم

خدا کا شکر کہ اب یہ چلا شہزاد
ہوئے ہیں جب سے الگ نام اور نسب سے ہم

OOO

اقتدار جاوید

O

لیے پھرتا ہے یہ آزار اپنے راستے کا
ندی پانی ہے واقف کار اپنے راستے کا

میں دیکھے جا رہا ہوں ساری چیزوں کو دوبارہ
ہوا تھا خواب میں دیدار اپنے راستے کا

کوئی مجھ سے سفر پر دور جانا چاہتا ہے
کہ ہر کوئی ہے خودمختار اپنے راستے کا

کئی اک اور بھی تھے میں ہمراہی ہماری
مرے ساتھ آ گیا دیوار اپنے راستے کا

سفر کو لوگ جو اکٹھے ہوئے چلتے ہیں ان کو
ملا ہوتا ہے اہل زار اپنے راستے کا

بچھڑ جاتی ہے مستی سے بھری ہو کر کوئی
مسافر آپ ہے گلزار اپنے راستے کا

پہنچنے ہی نہیں دیتے کسی کو بھی کہیں پر
کہ ہونے کا نقش گفتار اپنے راستے کا

کئی قرنوں کے بعد اپنے لیے مجھ پہ ظاہر
کیا میں نے آشکار اپنے راستے کا

بناتا ہوں گھنیری چھاؤں اور خود دیکھتا ہوں
شجر ہوں کوئی سایہ دار اپنے راستے کا

مجھے تو دو ابھی چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے
کروں گا ایک دن اظہار اپنے راستے کا

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

O

ترا احساں اٹھانا چاہتا ہوں
تعلق کا بہانہ چاہتا ہوں

مجھے ہے آرزو تو اس تمھاری
میں اب سارا زمانہ چاہتا ہوں

ترقی سے یہ آرزو کا سفر ہے
ترے دل میں سمانا چاہتا ہوں

ترے دشمن سے کیا لینا ہے مجھ کو
میں بس تجھ کو اب دانہ چاہتا ہوں

مجھے آنکھوں سے دل میں بھی اتر کر
میں کوئی آشیانہ چاہتا ہوں

وفاؤں سے یقیں اپنا اٹھا ہے
تجھے بھی آزمانا چاہتا ہوں

بھلانے کی سعی ناکام ٹھہری
تجھے دل سے مٹانا چاہتا ہوں

کسی کا قرض کا مقروض نہیں ہوں
میں بوجھ اپنا اٹھانا چاہتا ہوں

وہاں بھی کوئی میرا منتظر ہے
میں دریا پار جانا چاہتا ہوں

OOO

شہزاد نیّر

O

کہیں پہ گھومتا پھرتا مرے قریں نکلا
وہ شخص دل کی زمینوں سے پھر کہیں نکلا

وہ چاند ایسا حسیں تھا کہ ہر نگاہ میں وہ
جہاں نکلا تھا اس کو فقط وہیں نکلا

غلط تھا میں کہ مری ہی نظر درست نہ تھی
جو دل کی آنکھ سے دیکھا تو وہ مکیں نکلا

دکھائی دیتا رہا تھا جو دور پار کہیں
بغور دیکھا تو وہ روح کا مکیں نکلا

وطن کی دھول میں پلتے ہوئے وہ خوش تھا بہت
میں آسماں سمجھتا تھا وہ زمیں نکلا

نکل گیا تو میں سمجھا کہ جا چکا ہے کہیں
پلٹ کے دل میں جو دیکھا تو وہ وہیں نکلا

وہ خوب سوچ سمجھ کر گیا تھا نیّر
جو بے تحاشہ نظر آ گیا تھا، وہیں نکلا

OOO

حسن عباسی

O

رونقیں ہیں بپا اجنبی شہر میں
اک ہے تیری کمی اجنبی شہر میں

ہے بپا جشن سب پھر بھی جانِ غزل
کب ہے تجھ سا کوئی اجنبی شہر میں

تیرے ہونے کا احساس ہے جا بجا
کتنی ہے دل کشی اجنبی شہر میں

تیری یادوں کی کھلنے لگیں پتیاں
جب بھی بارش ہوئی اجنبی شہر میں

کچھ گھروں، رونقوں، عمارات سے
ہو گئی دوستی اجنبی شہر میں

اجنبی شہر بھی اجنبی ہی رہا
ہم تو تھے اجنبی، اجنبی شہر میں

جب بھی سوچا تجھے آ گئی خود بخود
میرے لب پر ہنسی اجنبی شہر میں

OOO

طلعت منیر

O

ظاہر میں جو ہے سامنے باطن میں خواب ہے
دیکھا ترے حصار میں سب کچھ سراب ہے

منزل تو سامنے ہے پہ رستہ کوئی نہیں
ہم راہروانِ عشق پہ کیسا عذاب ہے

اک سایہ ہم سفر تھا جسے رات کھا گئی
تنہائیوں میں تیری اب ہم رکاب ہے

اک شخص کے حصار میں زندگی رہی
اک شخص میری عمر کا سارا نصاب ہے

امید وصل نے مجھے مرنے نہیں دیا
ورنہ تو زندگی میں بڑا اضطراب ہے

میں خواب دیکھتا ہوں یہ ہے مختصر مرا
تعبیر دان کہتا ہے یہ انقلاب ہے

OOO

اشرف ذکی اعوان

O

جو غم و آلام کی شدت سے گھبرایا نہ ہو
سرخرو ہوتا ہے جو مشکل میں گھبرایا نہ ہو

میں جہاں جاؤں تمہاری یاد آتی ہے
میں کہاں جاؤں، کدھر جاؤں کہ رسوا نہ ہو

اپنے افکار و خیالات کو پھیلاؤں کب تلک
وہ حریم ذات ہے جس سے کوئی پردہ نہ ہو

کچھ وہی کہتا ہے سچائی کا جس کو پاس ہو
ذہن و دل میں جس کے کوئی خوف کا سایہ نہ ہو

ایسے قائد کی ضرورت ارض پاکستان کو ہے
خوف اور لالچ کبھی جس کے قریب آیا نہ ہو

اے مرے مالک! مجھے وہ جرأت اظہار دے
سچ لکھوں وہ بات جس کو کوئی کہہ پایا نہ ہو

اشرف ایسے شخص کے ہمراہ چل سکتا ہوں میں
شہرت و شوکت و دولت کی جسے پروا نہ ہو

OOO

وسیم جبرانؔ

O

ہم سجدۂ افلاک اٹھا لائے ہیں
الفت تیرے جور و ستم خاک اٹھا لائے ہیں

ہم بھی کسی سے کوئی تعلق نبھا لیں گے
کوزہ گر ہم تو ترا چاک اٹھا لائے ہیں

ہم کو پردیس میں یاد اس کی بہت آتی تھی
ہم وطن کے خس و خاشاک اٹھا لائے ہیں

اس میں خوشبوئے بدن تیری بھی شامل ہوگی
ہم ترے شہر کی جو خاک اٹھا لائے ہیں

تیری آہوں کا تو پیغام سو پہنچا ہے ابھی
چشم بھر کے ہیں یہ نمناک اٹھا لائے ہیں

طعنہ شاہی تو جبرانؔ بہت سستی ہے
ہم فقیروں کی سی پوشاک اٹھا لائے ہیں

OOO

ذوالفقار علی اسدؔ

O

انہیں سے ہے وفاداری ہماری
جو کرتے ہیں دل آزاری ہماری

کبھی کا ختم ہو جاتا تعلق
بچالے ہے رواداری ہماری

یہ دل اپنا غلامی میں ہے ان کی
کرے کیسے طرف داری ہماری

ہمیں لذت ترے غم میں ہیں ہم تو
کرے کیا کوئی غمخواری ہماری

ابھی ہارے ہیں ہم قسمت سے اپنی
ابھی قسمت نہیں ہاری ہماری

دکھوں سے بس یاری ہے اب تو
ہماری خیر بیماری ہماری

سمجھتے ہیں یہاں یہ لوگ شاید
نہ آئے گی کبھی باری ہماری

کرم کی اک نگہ سے دب سکے گی
سر محشر خطا کاری ہماری

ہماری جان لے کر ہی رہے گی
اسدؔ خود سے یہ بیزاری ہماری

OOO

شازیہ رباب

O

جو عشق سر بلند محبت کی خبر ہو
دیوانگی کی رسم و روایت کی خبر ہو
اک پل بدن پہ تجلی گری ہے جو
اس روشنی و تجلی ظلمت کی خبر ہو
مٹی کے بچھڑنے سے کھلے تمام ان
افلاس کی ڈری ہوئی عورت کی خبر ہو
بھونچال آ گیا ہے خدا کی زمین پہ
میدان جانتا ہے کہ ہجرت کی خبر ہو
ہے سر پلٹ پھرا رقیبوں کے شہر میں
تجھ سے جڑی ہوئی مری نسبت کی خبر ہو
لے آئی مجھ کو تیرے جہان خراب میں
میرے لہو میں تیرگی وحشت کی خبر ہو
وہ کر چلا گیا ہے مروت وہ جیب میں
میرے خلوص و مہر و محبت کی خبر ہو
ہے اجنبی زمین تھکن سے بدن ہے چور
اے ہجر یار تیری ہدایت کی خبر ہو
معصوم ہے فضا سو مرے شہر کیا کریں
آشناؤں کی سلامتی، شہرت کی خبر ہو
جنت میں وہ گل لگانے کو آتے ہیں
مزدور بدن کی عزت و حرمت کی خبر ہو
چاہت کے اس سفر میں دعا کر رہی ہوں میں
تیرے فراز کی، تری رفعت کی خبر ہو
لفظوں سے واسطہ ہے نہ رنگوں سے کوئی کام
اے ہجر یار تیری خلوت کی خبر ہو

OOO

شمیلہ سعید

O

کاش گلشن میں یاس ہی نہ رہے
کوئی بلبل اداس ہی نہ رہے

دیکھ کے جن کو دل دھڑک اٹھے
وہ محبت شناس ہی نہ رہے

اس قدر طے زندگی کر لے
لب جلیں خشک اور پیاس ہی نہ رہے

جا چلا جا تو اتنی دور کہ پھر
تیرے آنے کی آس ہی نہ رہے

ہم کتابوں میں گم ہوں ایسے
سوکھے پھولوں میں باس ہی نہ رہے

تجھ کو رہنا ہی اب تو تنہا ہے
خاص لمحات خاص ہی نہ رہے

زرد پھول اتنے دیکھے ہیں
مجھ کو موسم بھی راس ہی نہ رہے

OOO

امجد بابر

O

میرا نہیں ہے اب وہ تمہارا بھی تو نہیں
جس کے بغیر دل کا سہارا بھی تو نہیں

کیوں آ گئے ہو خواب کے کچے مکان میں
سورج نہیں یہاں پہ ستارا بھی تو نہیں

یہ عشق داستان سے آگے کا کھیل ہے
دریا ہے جس کا کوئی کنارا بھی تو نہیں

رونا مرے مزاج کا حصہ نہیں رہا
تجھ کو کسی طرح سے پکارا بھی تو نہیں

کچھ تھا درون ذات کے اندر ہی چھپ گیا
پھر میں نے کوئی نقش ابھارا بھی تو نہیں

کوتاہیوں کی مجھ کو سزا مل رہی تو ہے
آئینہ ہے جس کو خود کو سنوارا بھی تو نہیں

امجد یہ جو وصال کا غلبہ ہے ناروا
اس کے بغیر عمر گزارا بھی تو نہیں

OOO

سرفراز تبسم (یو کے)

O

دریا چھلکتا جاتا ہے کرنوں کے جال سے
روشن ہے یادوں کی تیغ جمال سے

ایسا دیا جواب اُسے میں نے ایک دن
نکلا نہیں وہ آج بھی اپنے سوال سے

یادیں جھٹک کے دیکھ چکا ہوں ہزار بار
خوشبو گئی نہیں ہے تمہارے رومال سے

شدت سے یاد آنے لگا مجھ کو میرا گھر
پتہ گرا ہے جب بھی کوئی سوکھی ڈال سے

ملتا کوئی خوشی سا آتا ہے وجد میں
پھر اس کے بعد ہی نہیں ابھرا دھمال سے

اے میرے کوزہ گر مجھے رہنے دے چاک پر
میں اور ٹوٹ جاؤں گا اس دیکھ بھال سے

OOO

دلشاد احمد

O

ترے قاتل جو ہم سمجھے تو اپنا دل اٹھا لائے
اور اس پہ تم یہ کہتے ہو کہ لائے بھی تو کیا لائے!!

یہاں چہرہ شناسی ہے سراسر آنکھ کا دھوکہ
جو من میں جھانک لیتے ہو کوئی وہ آئینہ لائے

کبھی جب مقدر سے گئے جب روٹھ دنیا
بچی تھی ایک ویرانی سو ہم وہ ہی اٹھا لائے

ابھی اک آس پہ دل کے دریچے کھول رکھے ہیں
تمہارے لمس کی خوشبو کبھی جو وہ ہوا لائے

کبھی تتلی، جگنو، ریشم و اطلس پہ نازاں تھے
تری خاطر فقط ہم تھے جو بس وحشت و چھالا لائے

تماشا کر کے بے ثباتی پھر ہمیں دنیا میں لا پھینکا
بلا کر پاس پھر کہتے ہو کہ دنیا سے کیا لائے!!

عجب رنجش سی ہے جو کھلے چہروں کو کملائے
کوئی مہر و محبت کی کہیں سے بھی ہوا لائے

یہاں تقسیم کرنے کو بڑی فیاض ہے دنیا
مگر تھوڑا، بہت سا دکھ، مرے اپنے اٹھا لائے

مجھے دعویٰ ہے دلشاد اک پہچان اپنی بھی
کوئی پیدا ہو وہ مجھ میں کہ جو میرا پتہ لائے

OOO

افضل رشید

O

تو جو چاہے تو ترا درد مٹا سکتا ہوں
تیرا دل تیری ہتھیلی پہ بھی لا سکتا ہوں

اتنا آساں تو نہیں تم کو بھلانا لیکن
خون لوں دل میں تو خود کو بھی بھلا سکتا ہوں

یہ ضروری تو نہیں تم سے ہی میں عشق کروں
جب جہاں چاہوں نظر اپنی لگا سکتا ہوں

میری خود ساختہ درویشی تماشا نہیں ہے
تم کو جب چاہوں تماشا میں بنا سکتا ہوں

یہ جو خاموشی ہے کمزوری نہ سمجھو اس کو
اس خاموشی سے میں حشر اٹھا سکتا ہوں

آؤ چاہو تو چلے آؤ مگر دھیان رہے
میں کہ ہر بار تمہیں تم سے ملا سکتا ہوں

میں کیا یاری کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن
اک چراغ اپنی گلی میں تو جلا سکتا ہوں

تجھ کو آتا ہے بھلے شوخ بیانی کا ہنر
میں اگر چاہوں ترے ہوش اڑا سکتا ہوں

لذت وصل سے سرشار رہا ہوں اتنا
ہجر کو چاہوں میں افضل تو بھلا سکتا ہوں

OOO

شفقت حسین شفیق

O

کہانی میں مرا اپنا بھی کوئی کردار ہو جائے
جسے چاہوں وہی آخر مرا دلدار ہو جائے

دھنک رنگوں میں ڈھل جائے اسی شاعر کا ہر مصرع
وہ جس کا دل عوامی رنگ سے بیدار ہو جائے

فروزاں غم سے پہلے بھی رہِ وہم سے ساحل
ترے ہونٹوں کی جنبش پر الم بیزار ہو جائے

فلک تک عظمتیں جس کی اسی پہ جاں نثار اپنی
فقط جلووں پہ دل میرا سرِ بازار ہو جائے

تری صورت کے رنگوں پہ لٹا دوں یہ جہاں سارا
متاعِ دل مجھے بھی اب ترا دیدار ہو جائے

زمانے میں نہیں ملتی فراوانی محبت کی
مری الفت محبت پہ نگاہِ یار ہو جائے

شفیق اس بات پہ لگتا ہے ترے دل کا پیمانہ اب
میاں یوں ہو گئی دل کا گلی گلزار ہو جائے

OOO

اقبال ندیم

O

تمام شہر نے جیسا شمار کر لیا تھا
ہم نے پھر بھی ترا اعتبار کر لیا تھا

وہ لوگ جو مری دیوانگی سے خائف تھے
انہوں نے بھی تو جنوں اختیار کر لیا تھا

وہ ہجر کاٹنا مشکل سہی مگر تم نے
ذرا سی بات کو سر پہ سوار کر لیا تھا

ہر ایک شے کو وہ نیلام کر کے چھوڑے گا
کیوں سو شہر سے تم نے ادھار کر لیا تھا

تمہیں تو یہ ہے کنارے پہ آ کے ڈوب گئے
ترے سکون سے دریا تو پار کر لیا تھا

OOO

اظہر جاوید

O

میں اس خواہش میں ہوں ہوں کوئی تو خواب مل جائے
مری بے خواب آنکھوں کو حسیں مہتاب مل جائے

میں اس کو چاہتا ہوں اور یہ سوچا کبھی میں نے
کہاں ممکن ہے قصے کی کم خواب مل جائے

میں اس راستے کو بھی عشق کا قصہ نہیں کہتا
کہیں ایسا نہ ہو آنکھوں کو پھر سیلاب مل جائے

کبھی شہد پہ آواز ہے دادا کی گلی سے
بڑے دولی مجھے اب شہد سے ملاب مل جائے

اسے میری جا ملی ہوتی زمیں کی ساحلوں کی حسرت ہے
مرے چاروں طرف اشکوں کا گرداب مل جائے

کبھی ایسا بھی ہو تھوڑی مرے شعروں کی صورت سے
وہ پچھلے دور کے اس کے شاداب مل جائے

OOO

موسیقی

مُنیر حسین: ایک سُریلا گلوکار

......2......

ڈاکٹر امجد پرویز

خلاصہ: منیر حسین موسیقی کے نقاد اور میری ریسرچ کے مطابق مندرجہ ذیل مندرجات حاضر ہیں۔ 1957ء میں منیر حسین کے فلم انڈسٹری میں داخلے کے وقت منیر حسین نے سات نغمے ریکارڈ کئے تھے۔ پانچ پنجابی فلموں کے لئے اور دو اردو فلموں کے لئے۔ اردو فلمیں 'سات لاکھ' اور 'باپ کا گناہ' تھیں۔ 1958ء میں مجموعی طور پر منیر حسین نے بارہ نغمے ریکارڈ کئے۔ ان نغموں میں آٹھ نغمے پانچ اردو فلموں کے لئے تھے اور دو دو نغمے دو پنجابی فلموں کے لئے تھے۔ ان نغموں میں سب سے مقبول نغمہ فلم 'مکھڑا' کے لئے "دلا ٹھہر جا یار دا نظارہ لین دے" تھا۔ فلم 'جھروکے' کے لئے منیر حسین نے جو نغمہ ریکارڈ کیا، اس کے بول تھے 'اک بھول ہوئی ہم سے ہم دل کی الفت کا زمانہ بھول گئے'۔

موسیقار صفدر حسین نے منیر حسین کو فلم 'نیا زمانہ' کے لئے ایک نغمہ "ہمیں سے سوئے تھے تو نے ہمیں جگا دیا" ریکارڈ کروایا۔ اسی برس موسیقار جی۔ اے۔ چشتی نے فلم "دل میں تو" کے لئے زبیدہ خانم کے ساتھ ایک دوگانا 'یہ غم تو دیتی ہے شریک غم نہیں ہوتی' ریکارڈ کیا۔ اس دوران منیر حسین نے فلموں 'یہ دنیا'، 'بے گناہ' اور 'آخری نشان' کے لئے بھی نغمے ریکارڈ کئے۔

1959ء میں منیر حسین اور نور جہاں کا خواجہ خورشید انور کی فلم 'کوئل' کا دوگانا 'رم جھم رم جھم پڑے پھوار' بہت مقبول ہوا۔ یہ گیت تنویر نقوی نے لکھا تھا۔ اس کے علاوہ بابا جی۔ اے۔ چشتی نے منیر حسین کی آواز اپنی فلم "شعلہ دل" کے لئے بھی ریکارڈ کی۔ گانے تھے 'جاگ سوز عشق جاگ' اور 'اس دل کو دل میں رکھنا'۔ موسیقار طفیل فاروقی نے منیر حسین سے منفرد طریقے پر گلوایا ایک گانا 'ایس دیوا چکر ہو دی' ریکارڈ کیا۔ 1958ء کی دیگر فلمیں جن میں منیر حسین کے گانے شامل تھے، ان کے نام تھے: عالم آرا، دادی، ریشماں، جھومر، ساتھی، شمع اور سچے موتی۔ 1960ء تک منیر حسین ایک پاپولر فلمی بیک گراؤنڈ آواز بن گئے تھے۔ اس برس انہوں نے گیارہ فلموں کے لئے پندرہ گیت ریکارڈ کئے، جن میں دو گانے پنجابی میں فلم سوہنی کمہارن کے لئے اور باقی اردو فلموں کے لئے تھے۔

◆ اٹھائے آپ ہی خنجر اٹھائے (دو پہن کی فلم 'گلفام'، موسیقار رشید عطرے، کیلئے اونچے سروں میں گایا گیت) ◆ میری زندگی محبت کا تماشا دیکھ لے دنیا (موسیقار منظور اشرف کی فلم 'گلبدن'، اعجاز پر فلمایا ہوا گیت، نام فلم) ◆ دیکھ کے چلو راستے میں، مع ناہید نیازی (رتن کمار اور نیلو پر فلمایا گیا گیت، موسیقار جی۔ اے۔ چشتی) ◆ مست نظروں سے میرا دل دیکھتی آگ (رشید عطرے کی فلم سلمیٰ۔ مع زبیدہ خانم)

اس سال جن دیگر فلموں کے لئے منیر حسین نغمہ سرا ہوئے ان میں فلمیں کلرک، شام ڈھلے، بھابی، دل والا، نوکری اور ٹیلی فون

شامل ہیں۔ 1961ء کا برس منیر حسین کی بس پردہ گائیکی کے اعتبار سے قدرے کمزور سال تھا۔ اس برس کی منیر حسین نے چار فلموں کے لئے صرف چھ عدد گانے ریکارڈ کروائے۔ اگرچہ 1961ء میں پاکستانی پس پردہ گلوکاری میں احمد رشدی اور مالا داخل ہوئے لیکن منیر حسین اور زبیدہ خانم کی آوازوں میں فلم 'ثریا' کے لئے ایک دوگانہ 'بچپن بیت آئی جوانی' اداکار حبیب اور اداکارہ نیر سلطانہ پر فلمایا گیا۔ یہ دوگانہ بہت مقبول ہوا۔ جب کسی موسیقار کو اس کی فلم میں قوالی ریکارڈ کرنا ہوتی تو منیر حسین کی شمولیت لازمی قرار پاتی۔ جیسا کہ موسیقار رشید عطرے نے فلم 'اولاد' کے لئے منیر حسین کو ہمراہ گلوکار سلیم رضا اور ساتھیوں اختر حسین قوالی 'حق لا الہ الا اللہ' کے لئے شامل کیا گیا۔ اس فلم میں منیر حسین اور گلوکارہ نسیم بیگم کا دوگانہ 'تم ملے پیار ملا' آج بھی بہت مقبول ہے۔ 1962ء میں منیر حسین کی دیگر فلمیں چھلیل بلند، ایک منزل دو راہیں، حسن و عشق اور شہید کا سپاہی تھیں۔ اسی برس فلمی موسیقی میں مہدی حسن کی بحیثیت گلوکار شمولیت ہوئی لیکن منیر حسین کی فلمی موسیقی میں مقبولیت برقرار رہی۔ اسی برس مسعود رانا بھی بحیثیت گلوکار، پاکستانی فلم موسیقی میں داخل ہوئے۔ منیر حسین نے 1963ء میں آٹھ فلموں کے لئے نو گانے ریکارڈ کروائے۔ بدقسمتی سے کوئی بھی گانا مقبول نہ ہوا۔ فلموں کے نام بارات، قانون، تیری، میں نے کیا جرم کیا اور دامن تھیں۔ پنجابی فلموں کے نام چاچا خوامخواہ، مہندی والے ہتھ اور چوڑیاں تھے۔ اس آخر الذکر فلم 'چوڑیاں' میں طفیل فاروقی کی موسیقی میں ملکہ ترنم نور جہاں کے ہمراہ دوگانے 'وے کل سن ہانیا' کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

1964ء کا برس منیر حسین کے لئے بہتر ثابت ہوا کیونکہ اس برس فلمیں توبہ اور اولاد ریلیز ہوئیں۔ فلم 'توبہ' کی قوالی 'نہ ملتا گر یہ توبہ کا سہارا ہم کہاں جاتے' بہت مقبول ہوئی۔ دیگر دو عدد گانے 'اے میری زندگی' اور 'زندگی کی راہ میں' بھی مقبول ہوئے۔ اس برس جن فلموں کے لئے منیر حسین نغمہ سرا ہوئے ان کے نام تھے شطرنج، خیبر پاس، ممتاز، آزاد، اللہ یار، پیغام اور گہرا داغ۔ اس برس صرف ایک پنجابی فلم 'پائی' کے لئے منیر حسین نغمہ سرا ہوئے۔ فلم 'پیغام' کے لئے منیر حسین اور آئرین پروین کا دوگانہ 'پیار کیا ہے تو ستم' قابل ذکر نغمہ ہے۔ 1965ء میں بھارت کے ساتھ جنگ کی وجہ سے دیگر گلوکاروں کی طرح منیر حسین بھی ریڈیو پاکستان لاہور کی عمارت میں موجود پائے جاتے رہے۔ ان کے گلوکار سلیم رضا کے ساتھ گائے ہوئے کئی ملی نغمے مقبول ہوئے لیکن فلمی گانوں کی تعداد کہیں کم تھی۔ انہوں نے بارہ فلموں کے لئے گیارہ گانے ریکارڈ کروائے۔ آٹھ گانے اردو فلموں کے لئے تھے اور چار پنجابی فلموں کے لئے تھے۔ ان گانوں میں مندرجہ ذیل نغمے قابل ذکر ہیں: ◆ جو مانگنا ہے مانگو فلم ساز و آواز کے لئے حسن لطیف کی کمپوز کی گئی قوالی ◆ ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا فلم عید مبارک کے لئے گلوکارہ مالا کے ہمراہ دوگانہ ◆ بول میرے انمول۔ موسیقار منظور اشرف کی موسیقی میں فلم 'دل' کے لئے دوگانہ ہمراہ نسیم بیگم ◆ آ کہاں رنج ہو رہے نگاہیں رنج ہو، اداکار رنگیلا کی فلم میں حسن لطیف کی موسیقی میں گلوکارہ مالا کے ہمراہ موسیقار حسن لطیف کی موسیقی میں دوگانہ۔ دو عدد گانے موسیقار رشید عطرے کی کاوش میں خوبصورت پیش کش تھی۔ ''عرش ہے یہ تمہیں'' اور ''اپنا محبوب ملا''۔

منیر حسین ہر نوعیت کے نغمے بآسانی گا لیتے تھے۔ انہوں نے وحید مراد اور اقبال یوسف کے لئے ایک مزاحیہ گیت 'ایک چھیف' گایا تھا۔ اس برس دیگر فلمیں تھیں: عورت، بہانہ، چوکیدار، یہ جہاں والے اور رقاصہ۔ 1966ء کا برس منیر حسین کے لئے مزید کامیابیاں لئے نو عدد گانے، آٹھ فلموں کی شکل میں موجود رہا۔ ان کے چند گانے تھے ◆ دم مست قلندر علی علی۔ موسیقار ناشاد کی فلم جلوہ۔ ہمراہ احمد رشدی ◆ محفل محفل ہے فضا، وزین کی فلم جلوہ کے لئے ◆ ہو جائے تو محبت چھپائی نہیں جاتی، وحید مراد کی فلم 'ہونہار' کے لئے۔ موسیقی

اے حمید نے دی ◆ تمہارے پیار میں ہمیں، رشید عطرے کی فلم 'سوال'۔ یہ گانا اداکار اعجاز پر فلمایا گیا ◆ بڑا ستم ہے ظالم موسم رے چھوٹے سے گاؤں میں۔ موسیقار صفدر حسین کی فلم پردہ کیلئے آئرین پروین کے ہمراہ دوگانا۔

1966ء میں جن دیگر فلموں کے لئے گانے گائے ان کے نام ہیں: گھر کی لاج، میرا اسلام، معجزہ اور تابعدار۔ ایک نئے گلوکار مجیب عالم کی فلم انڈسٹری میں آمد کی وجہ سے منیر حسین کو اب اس پرو گلوکاری میں ایک مقابلے سے ہمکنار کیا۔ اسی برس گلوکار روشن علی بھی گلوکاروں کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ پھر بھی 1967ء میں منیر حسین نے آٹھ فلموں کے لئے دس گانے گائے۔ اس برس پنجابی فلم 'دل دا جانی' کے لئے منیر حسین نے احمد رشدی اور آئرین پروین کے ساتھ مل کر ایک گانا گایا۔ منیر حسین کی، رشید عطرے کی موسیقی میں فلم 'شمع اور پروانہ' کے لئے دو عدد مندرجہ ذیل گانے اداکار حبیب پر فلمائے گئے، گائے تھے: ◆ ہم نے تو پیار کیا ہے اک دلربا سے ◆ مجھے تصویر بنالی ہے کوئی راز دکھا دو گانے تھے: ◆ تمہیں قبول کریں بھی دیکھا سکیں گے، اداکار کمال۔ موسیقار اے حمید ہمراہ مالا، فلم 'سہاگن'۔ ◆ ظالم نے ہنس کر جو دیوانہ کر دیا، ہمراہ آئرین پروین، فلم 'رشتہ ہے پیار کا'، اداکار وحید مراد پر فلمایا گیا تھا ◆ اے رات بتا کیا ان سے کہیں، ہمراہ آئرین پروین، موسیقار ماسٹر عنایت حسین، فلم 'دیور بھابی'، وحید مراد پر فلمایا گیا تھا ◆ جب سے دکھائیں تو نے الفت کی راہیں، ہمراہ مالا، اداکار محمد علی پر فلمایا گیا، فلم '[illegible]' کے لئے صفدر حسین کی موسیقی۔

1967ء میں منیر حسین نے فلموں 'رِم ماروا' اور 'المیلا' کے لئے نغمے گائے۔ 1968ء بھی منیر حسین کے لئے کامیابیوں کی نوید لایا۔ موسیقار اے حمید کی کمپوزیشن میں فلم 'اک تم ملے تو سارا جہاں مل گیا' فلم شریک حیات کے لئے ایک کامیاب کاوش ثابت ہوئی۔ اسی طرح موسیقار ایم۔ جاوید نے خواجہ پرویز کا گیت 'وے چھیڑ رکھیں وے سوہنیا' گلوکارہ نسیم بیگم کے ہمراہ ایک کامیاب کاوش تھی۔ فلم کا نام 'موج بہار' تھا۔ یہ نغمہ اداکار اعجاز پر فلمایا گیا تھا۔ 1968ء میں گلوکار منیر حسین نے نو عدد فلموں کے لئے دس عدد نغمے گائے۔ ان فلموں میں 'تاج محل' اور 'شریک حیات' اردو فلمیں تھیں اور بدلہ، باؤری، ڈاھڈا جانی، جھونگا، موج بہار اور یار دوست پنجابی زبان کی فلمیں تھیں۔

منیر حسین کا کامیاب برس: 1969ء میں منیر حسین نے بارہ فلموں کے لئے انیس گانے گائے۔ فلموں کے نام تھے: زرقا، دوری، آواز، تم ملے پیار ملا (اردو) چن پتر، پنجن دیر حیاتو، عشق نہ پچھے ذات، تیرے عشق نچایا، پیار دا پلڑا، چھڑتے تیغ، شیراں دے شیر پتر اور دریام، پنجابی زبان کی فلمیں تھیں۔ ان فلموں کے گانے تقریباً پاپولر ہو گئے تھے حالانکہ اس سے گذشتہ برس منیر حسین کے گانوں نے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی تھی مثلاً ایک گانا 'ماں پیاری ماں، ساڈی بلیاں ٹل کنوں کمال کر دے نیں، حد لئے آن تیرا اناں'، ہمراہ مسعود رانا، فلم 'دریام' کیلئے ایک جذباتی کاوش تھی۔ یہ گانا والدہ سلطانی ممتاز اور ان کے بیٹوں حبیب اور سدھیر پر فلمایا گیا تھا۔ فلم 'دریام' کا گانا 'کل سانگ بولال موری پت، میں بھلا بھولے لالن' منیر حسین نے ساتھی اختر حسین کے ہمراہ گایا تھا، دیگر گانے تھے:

◆ اے حسین چلمن، تم ہو صبح کی کرن، اداکار حبیب پر فلمایا گیا۔ موسیقار اے حمید کی فلم 'دوری' آواز کے لئے کاوش ◆ 'پی ہو تو کہاں دل لے چلے'، ہمراہ مالا، فلم دوری، آواز، موسیقار اے حمید ◆ آ جا ہم چلے، عشق دی گلی گلی چڑھ چلے، ہمراہ نسیم بیگم، موسیقار بابا جی۔ اے چشتی، فلم چن پتر، اداکار یوسف خان ◆ منیر حسین بالم کے لئے ایک نغمہ، تیرے پیار دا رنگ چڑھ گیا وے ◆ سوہنیے مکھیاں والے تیرا میرا ساتھ ہو جا، موسیقار طفیل فاروقی کی فلم 'جگو' کے لئے اداکار اعجاز پر فلمایا گیا تھا۔

1970ء کا برس منیر حسین کیلئے موسیقار خواجہ خورشید انور کی فلم ہیر رانجھا کیلئے اس کا گایا ہوا گیت 'ونجلی والڑیے نی' ایک بار پھر کامیابی کی نوید لایا۔ اس برس دیگر پنجابی فلموں جن تے پھول، اک سوال اک تی، غیرت شان جواناں دی کے لئے منیر حسین نے گیت گائے۔ بدقسمتی سے یہ گیت پاپولر نہ ہو سکے، ماسوائے فلم 'کردار' کا ایک اردو گیت 'مجھے خودی میں قرار آ گیا ہے' جسے طارق عزیز پہ فلمایا گیا تھا جس کی موسیقی نذر صابر نے دی تھی۔ فلم ہیر رانجھا کی کامیابی کی وجہ سے زیادہ توقعات یہ تھیں کہ منیر حسین کو بہت گانے ملیں گے لیکن 1971ء میں ان کو صرف پانچ عدد گیت گانے کے لئے بلوایا گیا۔ موسیقار بابا چشتی نے منیر حسین کو مندرجہ ذیل گیت دیے۔ ◆ ہتھ جوڑا اکھیاں دا ◆ تلیاں توڑ نبھائیں۔ فلم 'چن اکھیاں دا' کے لئے یہ دونوں گیت نسیم بیگم کے ہمراہ گائے ہوئے دوگانے تھے۔ منیر حسین اور سلیم رضا کی آپس میں بہت رفاقت تھی اور سلیم رضا کا آخری گانا ایک قوالی کی شکل میں تھا۔ بول تھے 'عاشق عاشق تے ہر کوئی بندا'۔ اب پس پردہ گلوکاری کے میدان میں مقابلے کا رجحان بڑھ گیا کیونکہ فلم انڈسٹری میں گلوکار رجب علی کی انٹری ہوئی۔

<u>زوال</u>: منیر حسین کی آواز زوال کا شکار تھی۔ ان کی کامیابی زوال پذیر ہوتی اگر فلموں کا رجحان سماجی و ایکشن فلموں سے کلاسیکی کی طرف جھکاؤ نہ اختیار کرتا، حالانکہ منیر حسین versatile گلوکار تھے۔ اس کے علاوہ موسیقار روبن گھوش، ایم اشرف اور نثار بزمی نے نئی آوازیں بھی متعارف کروانا شروع کر دی تھیں۔ منیر حسین کو اب اخلاق احمد، اے نیر اور مجیب عالم کا مقابلہ کرنا تھا۔ مہدی حسن، احمد رشدی اور مسعود رانا پہلے ہی موجود تھے۔ اب منیر حسین کو دوگانوں اور کورس کی آواز سمجھا جانے لگا۔ (1972ء میں چھ فلموں کے لئے آٹھ گانے: تین اردو فلمیں کون اپنا کون پرایا، زندگی کے میلے اور میری زندگی ہے نغمہ۔ تین پنجابی فلمیں تھا، اصول، جوانیاں مانے اور یار) منیر حسین کے گانوں میں تین دوگانے شامل تھے مثلاً ایسے نہ شرما، ہمراہ مالا، فلم کون اپنا کون پرایا۔ بقیہ گانے قوالی کی شکل میں یا کورس کی شکل میں گائے مثلاً موسیقار صفدر حسین کی کمپوز کی گئی قوالی 'اکو شکر دی تے جھنڈری شکر دی' ہمراہ مالا اور استاد فتح علی خاں۔

1973ء کا برس بھی منیر حسین کے لئے زوال پذیری کی طرف گامزن رہا۔ صرف تین عدد گانے گائے، جن میں اداکار حبیب کیلئے رونا لیلیٰ اور مسعود رانا کے ہمراہ بابا چشتی کی موسیقی میں ایک قوالی 'اب تو گئے تھان ودے تیرا میرا دور آ گیا' میں منیر حسین نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ فلموں غیرت دا نشان اور ماں تے قانون میں بھی منیر حسین کی کارکردگی نمایاں نہیں رہی۔ 1974ء منیر حسین کے لئے ایک بہتر برس تھا۔ انہوں نے آٹھ فلموں کے لئے آٹھ گانے گائے۔ ان میں 'پیار خود جینے کے انداز سکھا دیتا ہے' موسیقار اے حمید کی فلم سماج کیلئے اداکار ندیم پر فلمایا گیا۔ موسیقار اے حمید ہی کی فلم 'جواب دو' کے لئے منیر حسین نے اداکار رنگیلا کے لئے گیت 'وفا کا وعدہ کس نے توڑا' ہمراہ مجیب عالم اور مالا پیش کیا۔ اس کے علاوہ موسیقار نثار بزمی کی فلم لیلیٰ مجنوں کے لئے منیر حسین کی کاوش کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ ان کا ایک اور گیت 'اپنے پہ بھروسہ ہے' ہمراہ گلوکار احمد رشدی مشہور ہوا کیونکہ یہ فلم 'نمک حرام' کیلئے منور ظریف اور ان کے بھائی رشید ظریف پر فلمایا گیا تھا۔ منیر حسین کی پنجابی فلموں میں سونا چاندی اور سیدھی میرا ماہی قابل ذکر فلمیں تھیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا منیر حسین کے لئے مقابلے میں نئے اور نوجوان گلوکار بھی پس پردہ گائیکی کے میدان میں آنا شروع ہو گئے۔ 1975ء میں گلوکار اے نیر نے اس میدان میں قدم رکھا۔ منیر حسین کی جدوجہد جاری رہی اور موسیقار نثار بزمی کی موسیقی میں ان کا گایا ہوا نغمہ "دلدارا پیارا اک اشارہ" ہمراہ گلوکارہ مالا کے پسند کیا گیا۔ یہ گانا اس وقت کی مشہور جوڑی حبیب اور نغمہ پر فلمایا گیا تھا۔ اب وقت آن پہنچا تھا کہ گلوکار غلام عباس بھی بحیثیت پس پردہ آواز کے،

گلوکاری کے میدان میں آن اترے۔ فلمی موسیقاروں نے اب منیر حسین سے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ ان کو اب مشکل تا ہی لگانے کے کسی قوالی یا کورس میں استعمال کیا جانے لگا تھا۔ یہ وہ مصرعوں کے مرتب تھے جو خاص طور سے اونچے سُروں میں مہدی حسن خاں سے ادا نہ کئے جاتے تھے۔ موسیقاروں کی سرد مہری اب منیر حسین کو مزید کھلنے لگی تھی مثلاً وہی موسیقار رشید عطرے جس نے اپنی ماضی کی فلموں میں منیر حسین کو نمایاں طور پر استعمال کیا تھا، انہوں نے اپنی فلم 'ثریا بھوپالی' کیلئے منیر حسین کو صرف ایک قوالی 'شیخ سے کہتا تھا پروانا' اک حقیقت اک فسانہ میں کورس طور پر استعمال کیا۔ ان کے نمایاں گلوکار اب ناہید اختر اور مہدی حسن تھے۔ فلم کا نام تھا ثریا بھوپالی۔ وحید مراد کو اب بیک وقت دو گلوکاروں کی آوازیں بھانا پڑیں۔ یہ کافی مشکل تیز معاملات تھے۔ 1979ء سے 1990ء کی دہائی تک منیر حسین کو صرف، سالانہ ایک یا دو فلموں میں کام ملتا۔

<u>پی ٹی وی میں کام</u>: ان حالات میں منیر حسین نے دیگر گلوکاروں اور موسیقاروں کی طرح پی ٹی وی کا رخ کیا اور پروڈیوسر رفیق احمد وڑائچ کے پروگراموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اب بھی ان کے نغمے قدر لوٹنے والے۔ "وہ پیار کو ترسے" کو منیر حسین نے پیانو بجاتے ہوئے اور گاتے ہوئے ایک عمدہ پیشکش کی تھی۔

<u>منیر حسین کی فلمیں</u>: منیر حسین کے گائے ہوئے لاتعداد نغمے جن فلموں کی زینت بنے ان کے نام ہیں: سات لاکھ، عشق لیلیٰ، نوراں، ہیر، فلمو، ایاز، ماں، یوسف شاہ، عالم آرا، بچہ جمہورا، نائلہ، جھومر، ساتھی، شیخ، سوہنی کمہارن، سچے موتی، گلفام، گلبدن، سلمیٰ، آنچل، شہید، اولاد، دامن، چوڑیاں اور آشیانہ۔ منیر حسین کے حوالے سے اب بھی بہت سے ناقدین فن یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مہدی حسن خاں اپنی جدوجہد کے ابتدائی ایام میں منیر حسین کے گانوں میں معاون کورس کی آوازوں میں کھڑے ہو کر آواز ملانے کو معیوب نہیں رکھتے تھے۔

<u>وفات</u>: منیر حسین کی ستائیسویں برسی 27 ستمبر 2022ء کو خاموشی سے گزر گئی۔ حالانکہ منیر حسین نے بحیثیت گلوکار کے ایک طویل اور کامیاب دور گزارا ہے لیکن 27 ستمبر 1995ء کو جب ان کی بیگم نے گلہ کیا کہ اس کے شوہر ان کے اور ان کے بچوں کے لئے کوئی اثاثہ چھوڑ کر نہیں گئے۔ (ختم شد)

◆◆◆

''تخلیق تقریب'' 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

☆ اظہر صاحب سے مجھے شرف ملاقات نہیں ہوا لیکن اس کمی یوں محسوس ہوئی کہ جناب سلمان اظہر جاوید نے اس کمی کو پورا کر دی۔ نہایت مخلص ملنسار اور محبتی فرد ہیں اور ''تخلیق'' کو آگے بڑھانے میں ان کی خدمات لاجواب ہیں۔ (محمد عباس مرزا)

....

☆ میرا اور ''تخلیق'' کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ اظہر جاوید نے خون جگر سے اسے سینچا اور اب سلمان جاوید اسے سنوار رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ''تخلیق'' اور سلمان کو سلامت اور شاد و آباد رکھے۔ آمین ثم آمین! (عذرا اصغر ـــ سیالکوٹ)

سرائیکی توشہ

ناول "تانگھ"

......6......

بشریٰ رحمٰن

ایندا مطلب ایہ تھیا جو حکومت تہاڈا ایہ آکھیا منیندی اے سائیں ۔۔۔ اڑی کا ہیں پاگل! میڈا کم اے جو کئیں گالھ تے حکومت کوں توجہ ڈیواواں ۔ تو کئیں گول ڈسائیں جو ایہ محترمے اتھاں وچ آلی پیارے پیارے لوکی وسدن ۔ ایہ گل وے سوچنے آلی ہن کیوں والے ہوئے ہن ۔ جیہڑے اُنہاں شاہروں وی جاہلی ہن بچے ہن ۔ اساں اخبار لکھن آلیاں دا کم ڈسن ہوندے ۔ پچھا ڈیوان ہوندے ۔۔۔ میں تاں ایہ کم وڈے خلوص تے لگن نال کریندا پیاں ۔ تاں تہاڈے خیال وچ اتھاں کیا تھی سگدے؟" اتھاں پانی وا بندوبست تھی سگدے ۔ ٹیوب ویل لگ سگدن ۔ بھوہ کھوائے وچ سکیندن ۔ سڑکاں بن سگدن ۔ زرعی ادارے وی شہر آ کے وچ سکیندن ۔ تریں نسل کوں پڑھاون کیتے سکول کھولے ونج سکیندن ۔ گھر گھر بجلی پہنچائی ونج سکیندی اے ۔" بس بس علی سائیں بس ۔۔۔ اتنے کالمیں ہن تے میں بے ہوش تھی ویساں ۔ میکوں پتہ اے اتھاں کجھ ڈیں تھیسی ۔ وہ حالوں وہ ہک بیان چھپسی اخبار وچ ۔۔۔ " ہیں ۔۔۔ "علی ہمیں سگریٹ پی تے ٹھکا سٹیا۔ "میکوں ایہ گالھ کیں ڈسائی اے ۔ چھتی تئیں ایہ گالھ کیویں آ گئی اے ۔" "میڈا الا اے تے پیڈا میندا اودے ڈیرے تے بہہ تے اٹھیے کالمیں گریندن تاں میں اتن گھندی ہاں ۔ اچھا تو ڈیکھیں ۔ ات واری ضرور کجھ نال گھے تھیسی ۔ میں اتھاں زور اچھی لکھے تے اتھیے کئیں سن تے اے لفظاں وچ ہیں گریں ۔

اتھاں ہک ڈینہہ سویرے تھیسی ۔۔۔ بالکل تھیں ۔۔۔ سکھو وریاں تھی تے اوندا اوندا ڈیکھن گئی ۔" تے میکوں ایہ ہکیں خبر سناون میں آ ساں ۔۔۔ " کیا کیا ۔۔۔ سکھو چپ پئی ۔ کجھ ڈیہاں تئیں میں تیکوں ہک بہوں وڈی خوشی دی خبر سناون آ ساں ۔ کیہڑی خبر سائیں ۔۔۔ سکھو تھی دی الا تھیدے ہوئے پچھیا ۔ ہک خبر ۔۔۔ آ تے توں اوہ خبر ہن تے بچی ہیں ۔ بھر جیسیں ۔" "جی سائیں" "بالکل جی ۔۔۔" "وت شہر دا وسن ۔ لوک کاہن وکسن ۔ میڈی دھرتی تجلی تھیسی ۔ پر سکھو جھکاوی گالھ تاں ہئی ۔ ہک البیلے احساس نال اوندے شرابی نیں ترسن لگے ۔۔۔ آپ ای آپ اوندے منہ توں نکلے بہت پچھے ۔" سکھو توں گادن ، بہوں چنگاں گادیں ، ہے کہ توں شاہر گی چلیں تاں؟" "تاں کیا ۔۔۔ " اوہ آپو نفت بولی ۔ "تاں لوک میڈی آواز تے مرسن ۔" ہیں ۔۔۔ شاہریں وچ لوک مرن کیتے ہوندن ۔" بالکل آہدن ۔ اوتھی کوں ڈیکھ کراہیں جو مردوں بجھو سے کافر تے دم لگے ۔

کافر ۔۔۔ ؟ کون کافر اے ۔۔۔ سکھو معصوم بن بولی ۔ " جھتی توں میکوں چنگاں جیہاں گادن سنوا ۔۔۔ " علی اتنا تھیدے ہوئیں

آکھیا۔" پہلے آ دریا دے کنڈے تے گل کر اپیں با جدے ہیں۔ وقت میں تینوں اک کہانی سنویاں۔ اچھا اجن کوئی کہانی باقی اے ۔۔۔؟ "ہاں ۔۔۔ شہزادی تے جرنیل دی کہانی ۔۔۔""علی میں آپے تینوں جا تیاں تے شکھو میں کہانوں دے ہو گئے تھاں جاتے تے اوہ تے دریا دے کنڈے آ گئے۔ ایہہ اتھوں دا کلم کلا دریا اے۔ تہانوں پتہ اے ساہیں ۔۔۔ شکھو پانی وچ پیر لٹکا کے بہہ گئی۔"اچھا اوہ شہزادی تے جرنیل دی گل سناؤ۔ پرانے زمانے وچ اک قلعے وچ اک شہزادی راہندی سی۔""شہزادیاں ہمیش قلعے وچ ای راہندیاں نیں۔ علی وچ بولیا۔"بہوں سوہنی، بہوں ملوک، بہوں سندر، بہوں البیلی ۔۔۔" ہاں ۔۔۔ شہزادیاں ہمیش سوہنیاں ہوندیاں نیں اوہ وت بولیا۔

"علی ساہیں ۔۔۔ جے کرتساں ایں طراحویں وچ ٹوکسو تاں میں کہانی کائی نہیں سنویاں۔ تُوں کیا سنو جسیں آ باقی کہانی میں سنویندیاں۔"اک سندر سوہنی شہزادی ہیں اک اوہ قلعے دے کوٹ توں باہر جھاتی پاتی تاں اوہنوں اک اچا لمبا گبرو جرنیل دسیا۔ اوہ ویاں اکھیں ملیاں، شہزادی دے دل وچ وردا گھیا تے اوہ جرنیل دی محبت وچ وگنج گئی ۔۔۔ ہے؟ ۔۔۔؟""ہائے علی ساہیں تہانوں کیویں پتہ اے ۔۔۔؟""میں اکھیاں دے حال تاں کائی لبھاں، پر میکوں پتہ اے۔ کنڈھیں دے پکھوں راہیں آ گیاں شہزادیاں دے حال بچھتا اویں تھیندا اے۔ تے اے پیار وی تیکوں دس سکدا ایں ۔۔۔ جادو لگ کر ایں ملدے ہن۔ وعدے وعید کریندے ہن۔ نال جیون مرن دیاں قسماں کھاندے ہن۔ کاغذ تے ہن، کھلدے ہن۔ شکھوں کجھ شرمسار جیہی تھی گئی۔"ہانکیاں ایہہ تاں نی پتہ تاں جو تدیں دایہ قاں تھی سکیا تے وت اوہ ایں اں دریا وچ ڈبو سوئے۔"علی نے اک ہنکارا مارا۔ کافی دیر تک کھلدا رہیا۔"ایہہ پتہ تاں ۔۔۔ چنگاں کیتے جو تیں دسا دتے۔ ویسے میکوں اعلا پتہ اے جو ظالم کو کوئی انجان دے آ دعل ضرور تی ہوسی۔""ظالم لوکائی۔ کیوں؟""اچھا چھوڑ ایں قصے کوں میں آکھے اک چنگاں جیہاں گاون۔ اج میں اپنا ٹیپ ریکارڈ نال گھن آیاں۔ اج میڈی آواز بھر تے تیکوں سنویساں ۔۔۔""ہائے میڈی آواز ۔۔۔""ہاں ۔۔۔""شکھی سنویسو ۔۔۔""ہاں""ہائے ایہہ وی کوئی جادو دی پٹاری اے""ہاہا، آکھ جوڑ تے ۔۔۔""میں میں نی سنویندی۔ میڈی آواز گھن تے تساں لگے ویسو تے وت تاں آسو ۔۔۔""اکڑی میں وعدہ جو کیتم جو ضرور آساں تے میڈے کیتے خوشخبری گھن آساں۔ میڈی آواز نال گھن ویساں۔ ایہہ میکوں آپنا وعدہ یاد ڈیویندی راہسی۔" تے جے کرتساں ناں آئے علی ساہیں، وت میں تہاڈے کیوں ڈس ویساں ۔۔۔ نہ تساں ۔۔۔""کجھی میں ضرور آساں۔ آکھیں تاں میڈے سر دی قسم کھانواں۔""اوہ اک دم رتی لال تھی گئی۔"میکوں اعتبار آ گئے۔""شکھو ۔۔۔ کھانون آئی یاری کلہی ۔۔۔ تے آپے اکھیں دے مجھلے اون تے جادو جاتے ورد پے الا وچ گاون گی۔ علی میں آپنا ٹیپ ریکارڈ آن کر تے مائک ولوں اوندو کر رکھیا۔ ڈھے یار اڈا تھے او گئے میڈیاں لکھاں کریندن زاریاں کریندن، تواے ہنجر دے ڈیوے بلیندن ہتھ بنھ گزریندن ۔۔۔ ڈھے یار اڈا تھے او گئے میڈیاں۔

شکھو پئی کراہیں آپی دل سار آواز وچ گاندی رہی ۔۔۔ گاندی رہی ۔۔۔ علی چپ چیتا بیٹھا رہیا تے گاون مک گیا۔ جھوڑ دے ولیے ٹیپ بند تھئی تاں علی کوں ہوش آ گیا۔ اوہ بحر کیا تے بولیا"شکھو تیں میکوں مو تھا کر ڈتے۔ اتلا ورد کیوں اے میڈے الا وچ؟""الا وچ ورد نہیں ہوندا ساہیں، ورد تاں دل وچ ہوندے ۔۔۔ واہ ۔۔۔ علی چونک تے شکھوں دے اکھیں وچ اتھا ہنڈے ورد دریا گئی تھیندی اے رہتر دے وسمن آئی بچھو بریکوئیں جے تیں دی گالھ آ کھندی اے۔ کاش توں شاہر وچ ہوندی تے میڈی لیاقت اوہ ایں تاں وجیندی۔"میکوں تاں کجھ سمجھ نی آندی ۔۔۔""اچھا چھوڑ ۔۔۔ میڈا الا ساتوں تیکوں ۔۔۔""میڈا الا ۔۔۔""ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ میں ایں جادو دی ڈبی وچ بند کر

گھر ے۔" "جی ـــ !" ـــ سکھو اپنے جنگلی اکھیں کھولے بیٹھی سی جو علی نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دتا ـــ "اللہ اچا کر دا" ـــ سکھو دی ٹیپ تھی آواز رتھڑے وچ کھنڈ گئی تے گونجن لگی۔ "ہائے میں مر وجاں ـــ" آکھ تے سکھو کھل ویلے کرکے تصیدری تے کھل ویلے ہو وہندی۔ تے کدی ایں ٹیپ ریکارڈ دے نال گل لاؤ دیندی ـــ تیوں اوہدے تاثرات بدلے اوہدے چہرے تے وہلی وہلی ہریاں تھیں دی خوش دی تے علی نوں اوہدی شکل ویکھ تے مزہ آ جاندا پیا ہا۔ "والیت بند کر۔ اتھی گھر جلوں۔" "سائیں، یک واری وت سنواؤ سکوں تاں یقین تی یا آ جاندا۔" "کیا یقین تی پیا آ جاندا۔" "جاوو میڈا اللہ" "تے وت او گیندا اللہ" "ہائے اللہ ـــ اوو میڈا اللہ ـــ سائیں اللہ کیتے یک واری وت سنواؤ ـــ" "ناں ـــ" "علی ٹیپ بند کرن لگا ـــ چار روز گھمن۔ جن گھر کیتے نکلدے ہیں۔ گھر جل تے چا وچائیوں۔ ایں توں بعد میں میڈے بے بہوں سارے گانوے بھریاں۔" "کیا کریسو ـــ؟" "میڈی آواز بھریاں" "اچھا اچھا ـــ" "اوہ خوشی خوشی کھڑی تھی گئی ـــ میں ڈیڈو کوں وی سنویسیاں" "ضرور سنواویں۔" "علی سائیں کیا ولیلاں لکھدے راہو یا کوئی کم ایہوی کریسو۔" "مشکل سکھو تک آ تے یک ولد اوہدو سلیا۔ جیڑھا سدھا اوہدی کال تے وچ لگیا۔ علی سرچا تے سکوں ووڑ تھا۔" اوہ کھالی جتھیں ہوئی وے اتے بیٹھی سی۔ تے اوس اڑاے اٹھاوں آپنے جتھو وچ ایڈے ہوئے ہیں۔ علی دی آپی گی دووڑ تھا۔ یک وچھا یا پائے اوہ دا اوہ دے توں لکھدا پیا ہا۔ سوچیاں دوں وچے اوہ قلعہ مروٹ وچ پہنچ گئے ہن۔ قلعہ مروٹ بارے اوں بہوں کجھ پڑھیا ہا۔ اوہدی تاریخ دا میں دا خیال ہا جو اے قلعہ امر کوٹ اے۔ جتھاں کتیں زمانے وچ اکبر بادشاہ آ کرایں جیا ہا۔ قلعہ شہنشاہ ہویں دے رعب داب داوس ڈیندا۔ تے علی اوکوں ڈیکھ کرایں سوچیا ہا۔ "کیمجے دی آئے ہوندے ہن پرانے وقتیں دے بادشاہ جتھاں دیندے ہن آپنے سوہنے نقش چھوڑ آندے ہن۔ ایہ اللہ دی ایہی وڈی جہوئیں کئی صدیاں توں ہیں دیندی پئی اے۔ دسائی دیندی پئی، مثالی دیندی پئی اے۔

ایں جھوگیں دے ہاں تے لکھاں کہانیاں ہوریاں ہن۔ ایہہ پرانے ون پینگھڑیاں واہلیاں نال لدے کھڑن۔ ایہا آسان پرانا ٹوٹو کر اٹھا اے۔ ایں تے کجل قلیل کن دکار چھندی اے۔ ایں اکھ دی پکی وچ بینگڑے منظر گھوم دا ہن۔ اللہ سئیں آ۔ ایہ دنیا کیا اے؟؟" "ایڈی پرانی، ایڈی ارتیل۔ ایڈی ای تویں؟؟" ہر نسل کیتے ہر واری ایہ نویں تھی ویندی اے۔ نویں تے سوہنی نظر آندی اے۔ جنگوں انکھاں ہر صدی وچ کو جھاکا ڈیندن۔ ایہ وت جلدی رت دے نال اپنا مکھڑا بدل تے سامنے آ ویندا اے۔ پر ایں دھرتی اتے پرانیاں جٹھائیاں ہمیش رہ ویندن جیویں پیلاں دے ٹیلے دا رنگ کدی ایں گھسیں ڈیندا۔ علی اتھاں آتے قلعی بن گیا۔ کھسپ کے کچ وچ سوچن داہوں ملدے ہاں تے وت شاہری حیاتی وچ تاں آن کھڑا پریشانی ہوندن۔ اساکوں کجھیں دے زمانے وچ ایویں دھا ڈیندی جو اساں یک لفظ دی آپنے بارے لکھنے سوچ سکدے۔ اتھاں آ کرایں اولاکو امے سوچیندا پیا ہا۔ تے وت جداں اوں رتڑے وچ پیر پاتا تاں اوکوں ایویں لگیا۔ ایہ رتڑ اوں پہلی واری گوٹے۔ اوہ ایں وتڑے دا گولس اے۔ پر اتھاں آ تے ڈیٹھا جوان کیں پیریں دے نشان ہن۔ جو رتج آپنے نشان چھوڑ گئی ہن۔ زمانہ دی اکھوں لکھ لیا۔ اتھاں انسان وسدے ہن۔ جیڑھے مرتے ہن۔ جنگیں عشق آلے تے من بھانوں نکلاں آلے ہن۔ دل رکھدے ہن۔ دل وچ جذبے تے احساس رکھدے ہن۔ تے وت ایہ عشق امر اقبال بولی وچ جا تھی ہوئی سکھو دا گیا۔

سوڈوں دے دو سکھو دے نال ڈاچی تے بہہ کرایں اتھاں پہنچیا ہا۔ قلعے دے اندر اوں بہوں ساری قلم بنائی سی۔ ایں قلعے نے اوکوں تحریک ڈتی۔ تے اوہ سکھو کوں سمجھا کرایں یک پاسے لکھن بہہ گیا۔ "ڈیکھو سکھو! میکوں کجھ ضروری کم اہیں لکھن۔ جتنڑا ایں ویلے تد

لکھیاں ہاں میں خلل دیساں۔ تو مینوں اک گھنٹہ دے چا۔" "چنگاں" "سکھو نکھر اجیہا یے ہٹ گئی۔ وت او آپنی ڈائری کوں اکلی تے اک پاسے سجیں ڈتا۔ علی لکھن وچ رجھ گیا۔۔۔۔ ہن ڈلھ مارکے سکھو دھارت تھیون مکا ڈتا۔" "توں اگی در لکھاں بائوں سکھو۔" "واہ جی واہ! میں تاں اوں ویلے دی اتھائیں بیٹھی تہاکوں ڈیہندی پئی آں۔ تے تساں سمجھدے وے۔ میں کتھاں ہاں؟ شاعری لوکاں دی نظر کریں، ڈٹھی ہوندی اے۔" "سکھو نیا جھوک کراہیں تے لیا آئی" علی آپنا ہیں بند کر تے فائل وچ لاتے۔ وت فائل کوں بند کر تے اک پاسے رکھ ڈتا۔ "سکھو! انہاں نظر تکیں۔۔۔ ول ٹھے ہوندن!" "کی کی گی۔ سکھو کھل پئی۔" "کیڑے مردان دے ول تکھے ہوندن؟"

"چنگاں ڈس! آج میڈے کیتے کیا پکا کراہیں گھن آئی ہیں؟" "سن! اج میں تہاڈے کیتے اک خاص شے پکا کے آئیں گھن آئی ہاں!" اوہ کھا لو تیں آئی کنڈھڑی کھولن لگی۔ "توں تاں روز ای کوں خاص شے پکا کراہیں گھن آندی ہیں۔" "او جیڑھا بھوں پیا مزمان ہوندے تاں! او کوں اساں اے شمیں کھویندے ہیں۔" "اوں ڈھاکوں وادھک لیاکے اوہ دے آگوں کر ڈتا!" "علی اک دم ہتھوں ہٹ گیا۔" "ایہہ۔۔۔ ایہہ۔۔۔ ایہہ کیا ہے سکھو!" "واہ!" "سکھو کھلن لگی۔ تساں تاں ڈردے پئے وے!" "تو ڈرداتاں نئیں پیا۔ پر توں اے ڈھا ہوائیں ڈھاکوں وچ کیا اے؟" "تہاکوں کیا ڈسے سائیں؟" "مینوں۔ توں نئیں آ کھیا ہادی جو شاعریاں دی نظر تکی ہوندی اے۔" "وت وی ذری غور نال ڈیکھو تے ڈسو جو ایہہ کیا ہے؟" "ایہہ تاں کیڑے پکے ہوئے ہن۔ اصول والا اوں جہ جھگر کھدا۔" "علی ہیں! ایہہ کیڑے کا گل ایہہ تاں اتھوں دا خاص کھاجا اے۔" "ایہہ کیا؟" "ایہہ ٹڈیاں ہن؟" "ٹڈیاں" علی زور نال ہسیا۔ "جی ہن توں مینوں تمرہ ٹڈیاں کھواون چاہندی ہیں!" علی کوں آجہ آ گیا۔ انڈونیشیا، ملائیشیا تے ہانگ کانگ وچ اوں چنگی ریسٹوراں وچ عجیب و غریب شیہیں کھیاں ہویاں اہیاں ہن۔ جڈے دیں ویکھوں رکھاں!" "تھیے تیسی کوں اوویں سلام کریندا ہا۔ اوکھاں بس پنج تے چنگی ہوٹلاں دے کھا نوریں ای چنگیں لگدے ہن۔ کیوں جو او وسمروں پاکستان دے مزاج موجب ہوندے ہن۔ تے ہن اے سجھوں ٹڈیاں پکا کراہیں گھن آئی ہوئی۔" "زوداں، سکھو کھل کراہیں آ کھیا۔" "ایہہ اوہ ڈاہڈوں لگ گئی۔ جیڑھی شاعریں وچ ہوندی اے۔ تساں ٹکڑی دا ناں سنیا ہوسی۔" "ٹکڑی!" "اوہ جیڑھی اسماناں تے اڈدی ہے۔ جنکوں ٹڈی دل آہدن!" "ہا اوہا۔ جیڑھی فصلاں کوں برباد کرن کیتے آندی اے!" "او وتاں آفت ہوندی اے۔ اساڈے پاسے اخباراں وچ اوکھوں مکاون تے روز ڈاہڈ دیندے۔" "ہا سانگیں اتھاڈے پاسے ہر گم اخبار وچ چھپدے۔" "پر اساں رتھڑے دے لوکیں ایں ٹکڑی فوج کوں اک نعمت سمجھدے ہیں۔ جیڑھے ٹکڑی آندی اے تاں کئی طرحیاں دال وت توں وت کئیاں اپ کھدے ہیں۔ وت انہاں کوں تھوم تے لون لا تے پیچھے دے ہیچے جم کھدے ہیں۔ خاص ہوٹلاں وچ ایہہ مزمانیاں کوں پیش کیتی ویندی اے۔" "تے تساں ڈیکوں صاف وی تاں نئیں کریندے!" "ایہہ وچ صاف کرن آلا کیا ہوندے! ایہہ تاں آسانی شے ہے۔ البتہ انہاں دے پنکھاں کے پر آپوں کر دیندن!" علی نے وت غور نال ڈھاکوں وچ ڈٹھا۔ "پر جھتاں اوں ایں!" علی ہسیں! "ویکھو کے تاں ڈیکھو۔" "کوئیاں! میں نئیں کھا سکدا۔" اوہ ایہہ آکھ نال بولیا۔ "اک واری کھا کے تاں ڈیکھو۔ ہتھیں چکل جھاتیاں اونیں آہدن۔ تے ایں توں بعد والا منگدن!" "کوئیاں! میں والا منگساں!" "چنگاں! میڈی خاطر تھوڑا جیہاں چکھ گھنو۔" اوہ عاجزی نال بولی۔ "ہمیں! جیڑھا کجھ دی میں ڈیہدا ہاں، او کوئی کھا سکدا۔ ڈیکھاں ایہہ تاں عادت دی بات ٹکڑی اے۔ اکھیں دی اوویں کھیاں ہویاں ہن۔۔۔ تاں تاں!"

چنگاں تساں اکھیں بند کر کے میں تہانوں ہک گل دسیندی آں۔" "ہاں!" "تہانوں میڈی قسم"۔ علی مجبور تھی گیا۔ اوں آپنے ارادے دی طاقت کوں کٹھا کیتا۔ تے اکھیں گھٹ گھدیاں۔ اوہدا خیال ہا جو شکر اوندا ہتھ ساکوں ہتھ لگدا ہوسی!" "ٹھکو تے وڈے گھر نے تے پچھ تاں ہک گراں اوندے منہ وچ رکھ ڈتا۔ ذرا ذرا اوں چکھیا۔ کھادے تے وت کھاندا گیا۔ ہک گراں، رچھولی تے لون جیہیں شے اوہدے اندر تے آ گئی ہئی۔ اوں ڈوجھا گراں منہ وچ پاتا۔ وت ترے تھیا۔ علی ہن اکھیں کھول ڈتیاں۔ "جیہڑی اتوں مینوں گڑی تاں توں کھیڈدی پئی؟" "تاں کیا کھیڈدی پئی آں؟" علی تے ڈٹھا تاں آدھا کھادا کوں خالی تھی گیا ہا۔ "تاں ایندا مطلب اے میں کھا گیا ہاں!" "ایہو تاں میں آکھیا ہا!" "ٹکھوں ہک بیا گراں اوندے منہ وچ ڈتا۔" "بس ہن میں آپ کھا گھنساں!" "توں تھوڑا تھوڑا جیہا ہن دی کوشش ذرا کر!" "واہ میں وا" ٹکھو شرمیں پئی کھاوندی تاں بعد علی اتھاہیں، رت تے لمبا تھی پیا۔ تے سگریٹ پیون لگا۔

علی آپنے کمرے وچ لیٹیا ہوئیا تاں ریکارڈ کیتے ہوئے ٹیپ سنڑا پیا ہا۔ اوں اج سارا دن گھر رہ تے گزاریا ہا۔ ٹکھو تے ڈیڈ دے بہوں سارے گیت ٹیپ کیتے ہن تے انہاں دی گائیکی جادو دی ٹیپ کر تے انہاں کوں سنوائی ہس۔ عقیل اج جیپ گھن تے کہیں بندے نال شاہر گیا ہا۔ ہک تاں اوکوں قلم تے کاغذ دا ورقہ پیا ہا۔ ڈوجھا علی کوں کجھ ضروری چٹھیاں سنوا دیاں ہن ــــ اللہ وسائے کوں دی شاہروں کجھ سودا منگوانا ہا۔ ایں کیتے اوں آپنا ہک مزارع دی نال بھیج ڈتا ــــ تے اوں ویلے علی اکلا آپنے کمرے وچ لیٹیا پیا ہا۔ علی ایویں چھپ گیا۔ جیویں اوں اسرائیل دا صور سن گھدا ہووے۔ رستے دے وچ بدلاں دا گجکار تے ایں رت وچ ــــ !!! اتھاں تاں ساون دی رت دی ڈری گھٹن دیندی اے۔ دعائیں منگ منگ تے آئے مینہ گزر گزر تے لوک مینہ منگدن تے مینہ بدل کجھ دے پئے ہن ــــ اجن کچی ایویں لگیا ہوائیں ٹھڈیاں تھی گئیں تے جھکڑ جھلی شروع تھی گئیں۔ تے رت گزگار تے کھیکار رہے نال مینہ دسن لگا۔

روہی دے لوک اج کیڈے خوش ہوسن اوں دل وچ سوچیا۔ اللہ کرے جھڑ مینہ ہووے تاں انہاں دی خوشی آ ونڑ دیکھ سگدا ہاں۔ مینہ ودھدا گیا۔ تے کمرے دی چھت تے ڈھاون آنے اواجاں ساز وجاون لگے بجلی چمکی تاں سارا کمرا روشن تھی گیا۔ علی ہک سراہوں ہتھ تے اٹھی کھڑا تھیا۔ اوندا دل منگیا جو اوہا باہروں دا منظر ڈیکھے۔ بوہا کھلیا، اوہ اوہدے وچ سر لاتے کھڑا گیا تے ڈیکھن لگا۔ مینہ وسدا پیا ہا۔ ہوا آپنیں زور مریندی پئی ہئی۔ تے تھوڑی تھوڑی دیر بعد بجلی چمکدی تے بجلی چمکن دا منظر لکھیا گھنڈ ڈسیندا ہا۔ اوکوں ٹھڈی واری احساس تھیا۔ کھلے تے بھر وچ جتھاں کوئی ادامت ہئی۔ بجلی آئی پوری لوک مارتے لشکدی۔ تے ایویں لگدا ہا جو بھاوی ہک اگھن آسمان تے لہراندی اے۔ دل گھاندی اے تے رت دل گھاندی ہوئی آپنی جھتاں۔ جھومیاں دیاں جٹ کراہیاں تے دوچوندی اے۔

لکھن کیتے ساری بھوئیں بھوا ہک تھال بن ویندی تے ایویں لگدا ہا۔ جو بھوئیں دے تکے ہک دیہہ کھڑے جڑ جڑا بھا وتال بھرے ہوئے ایں تھال کوں ڈوہاں ہتھاں نال پھڑدا ہے۔ بھوئیں یا قاعدہ ولدی ــــ ہوئی محسوس تھیندی۔ اوہ نظارہ جیہا دا راکلا ہا۔ آکلا ای سوہناں دی ہا۔ علی کوں آپنے کمرے وچ ڈرگن لگا۔ فرض کرو ایویں کیتے چھپا کریندی ہوئی بجلی اکر اوکوں لگ ونجے تاں تھئی ــــ اوکوں ہک تھر کات جیہاں تھیا۔ تے اوہ پچھوں ہٹ گیا۔ ایں بجلی اسکی تاں اوکوں کریاں دے کولیوں ہک چھپا لوا ڈتا ــــ اوہ پھر ک گیا ــــ ڈوجھی واری بجلی دے لگن دی تا گھر گھیوں۔ کیتے گھر ڈھو مالی تو میں باہروں ای گھرے ایں شیشے کوئی اجیں کوں کھول آیا۔

(جاری ہے)

سفرنامے

اطالوی صنم خانے میں اُردو کی اذان

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

محبت کی حرارت، تمنا اور نمود و جمود جوانوں کو سوز آرزو سے سینہ تاب کر دیتی ہے۔ کسی زخمہ ور کو دست کمال فطرت کے باب کو چھیڑتا ہے تو اس سے نغمہ ہائے شوق جنم لیتے ہیں۔ یہ وہ مناظر ہیں جو مسولینی کو اطالوی مسیحا کی شکل میں دیکھنے پر اقبال کی نگاہوں پر ابھرے تھے جو افسوس کہ بعد کے زمانے میں برقرار نہ رہ سکے لیکن اس وقت جذبات کی رفعت کا یہ عالم تھا کہ اقبال نے سواد رومۃ الکبریٰ کے ضمیر کو دگرگوں ہوتے دیکھا اور جدت فکر و عمل کے اس انقلاب پر مسرت آمیز حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ع

اینکہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب

یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یا اللہ یہ عالم بیداری ہے یا خواب؟ یہ انوری کا شعر ہے جس کا پہلا مصرع "خویشتن را در چنین نعمت پس از چندین عذاب" ہے۔ میں اب سرزمین اطالیہ میں ہوں یہ حقیقت ہے یا خواب؟ اطالیہ پہنچ جانے کا خیال بہت ہیجان انگیز تھا لیکن طبیعت مسلسل زوال پذیر تھی۔ طبیعت میں تازگی نہ ہو تو مناظر کا حسن بھی دھندلا جاتا ہے۔ زوال طبیعت کے باعث سوچتا ہوں ظاہر و باطن میں یہ کیسا تضاد تھا، "کہیں منظر ہے اور کہیں اداسی دل میں ہے" کی کیفیت تھی۔ بیداری اور خواب کی حدیں ایک دوسرے میں گم ہو رہی تھیں۔ ہوٹل پہنچتے ہی میں نے "فرنٹ" کا کچھ حصہ لیا اور بیداری اور خواب کے دھندلکے سے مکمل خواب میں چلا گیا۔ اشفاق احمد نے روم میں آنے والے خوابوں کا تذکرہ کیا تھا لیکن ساتھ ہی ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ روم عجیب بستی ہے۔ وہ چار دن دھوپ تو پانچ سات دن بارش سے یہاں کی مخلوق قرینے سے کوئی کام کرتی ہے نہ خالق۔ ناسازی طبع کے باعث خواب گھر میں پناہ لینے والا مسافر دھوپ اور بارش سے بے نیاز ہو چکا تھا لیکن نیند تھی کہ بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ نیند کا سلسلہ جس بدن بھی بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ گلے کی خرابی بخار کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ فراق گورکھپوری کا شعر اس کیفیت کی ترجمانی کر سکتا ہے جس میں روم نے ہمارا استقبال کیا: "اس دور میں زندگی بشر کی - بیمار کی رات ہو گئی ہے" رات کی تاریکی میں بیداری میسر ہو تو روشنیوں کے خالق سے مکالمہ کرنا چاہیے۔ جسم میں جتنی ہمت تھی اسے مجتمع کر کے اس راہ میں کوشش کی۔ اذکار و ادعیہ کی جو کتابیں سفر میں ساتھ رہتی ہیں وہ بھی پڑھ ڈالیں لیکن اندھیرا تھا کہ اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی، چاہتا تھا کہ دوبارہ سونے کی کوشش کروں لیکن ایسا کرنے میں فجر ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ یہاں کی صبح صادق و کاذب کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ فجر کا آغاز معلوم ہوتا۔ جرمنی کے ایک ایسے ہی تجربے سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ ریسپشن والوں سے ایسا استفسار کرنا محض پریشانی کا باعث بنا کرتا ہے اس لیے چاہتا تھا کہ اٹلی میں کسی مسلمان کو فون کر کے پوچھا جائے لیکن ابھی رات ہے تب بھی فون کیا جائے اس کی نیند خراب ہو گی۔ بہرحال جیسے تیسے کسی سے پوچھنے کے خیال کو مؤخر کرتا رہا۔ صبح چھ بجے، پاکستان میں حرم کو فون کر کے اٹلی میں فجر کا وقت دریافت کیا۔ حذیفہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا معلوم نہیں ہوٹل کی دریافت کے سفر میں رات وہ کب جاگا تھا! اس لیے اب میرے ارادے کرانے سے بے خبر تھا۔ میں چاہتا تھا کہ صبح جلد ناشتہ کر کے بخار کی دوائی جائے۔ ناشتے کے لیے حذیفہ کا ساتھ ہونا ضروری تھا لیکن وہ نو بجے

تک سویا رہا۔ اس کے بعد بیداری کے مراحل طے پاتے رہے۔ بہ قول ضمیر جعفری "کھلتے کھلتے آنکھ کھلنے میں کہیں مسئلہ کھلا" —— دس بجے ناشتے کا وقت ختم ہو رہا تھا اس لیے جلد ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔

ادھر یونان میں سفیر پاکستان جناب خالد عثمان قیصر کو میری علالت کی اطلاع ہو چکی تھی۔ پرسش احوال کے لیے ان کا فون آیا اور انھوں نے روم کی سفارت پاکستان کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ہم پہنچے اترے تو ہم سے پہلے سفارت خانہ پاکستان سے قائم مقام سفیر پاکستان (چارج ڈی افیئرز Cda) تنویر صاحب بہ نفس نفیس ہمارے ہوٹل میں تشریف لا چکے تھے۔ تنویر صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ پہلی ہی ملاقات اچھی رہی۔ یہ جان کر انجانی سی خوشی ہوئی کہ ان کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ تنویر آج کل سارک کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے نیپال میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کسی دوا یا ڈاکٹر کی ضرورت کا پوچھا میں نے ان سے ایسی صورت حال میں عام طور سے لی جانے والی اینٹی بائیوٹک ادویہ کا ذکر کیا لیکن یہ یورپ تھا کوئی ایشیائی ملک نہیں جہاں جو دوا چاہیں جا کر میڈیکل اسٹور سے خرید لیں۔ یہاں بغیر ڈاکٹری تجویز کے بازار سے دوا نہیں ملتی تاہم تنویر صاحب مہربان تھے انھوں نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ کچھ ہی دیر بعد سفارت پاکستان سے عثمان صاحب میری مطلوبہ اینٹی بائیوٹک ہاتھ میں لیے تشریف لے آئے —— تنویر صاحب نے کہا تھا جب طبیعت بہتر ہو تو سفارت خانے تشریف لے آئیں۔ ہمارا سفارت خانہ ہوٹل سے قریب ہی ہے لیکن ابھی تو ہمیں ناشتے کا مرحلہ درپیش تھا۔ میں اور حذیفہ ناشتے کے کمرے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شب باشی کے بعد بہت سے اطالویوں اور خاص طور پر اطالوی جوڑوں کی صبح بھی ابھی ہوئی ہے۔ میں نے تو اپنے لیے پھلوں کا جوس پسند کیا۔ حذیفہ نے بیکری سے انصاف کرنے کا فیصلہ کیا لیکن میری نشست جس جگہ پر تھی اس کے عین سامنے اطالوی حسن کا ایک ایسا مجسم نمونہ آ کر فروکش ہو گیا کہ جس کے بال، رنگت اور آنکھیں دیکھ کر اکرم شاہ صاحب کا شعر میرے دور احساس پر دستکیں دینے لگا۔

کئی ماہ رو ستارہ رویائی کیسی　　　دلدار، دل نواز دلربائی کیسی

روم کی پہلی رات اگر تاریک تر تھی تو روم کی پہلی صبح نہایت روشن اور تابناک —— ناشتے کے بعد ہم نے کچھ وقت لابی میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے میں گزارا۔ یہاں روم کی سیر کے لیے طرح طرح کی گائیڈیں اور نقشے پڑے تھے۔ میں اور حذیفہ انھیں دیکھتے رہے لیکن تمام معلومات کی زبان اطالوی تھی۔ رات جب میں سو گیا تھا تو حذیفہ ہوٹل میں شب گردی کرتا رہا تھا اور اس دوران اس نے ہوٹل کے کچھ لوگوں سے موانست پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ اس کے استفسار پر استقبالیہ کلرک نے روم کی سیر کے سلسلے میں ہماری کچھ راہنمائی کی۔ مجھے سرسید یاد آئے وہ جب یورپ کے سفر پر نکلے تھے تو اٹلی ان کا سب سے پہلا پڑاؤ تھا۔ یہاں ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خود ان کے بقول یہ یورپ کا پہلا شہر تھا جو انھوں نے دیکھا۔ وہ شیشوں کے دروازے اور شیشے کی بنی ہوئی دیواریں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ جب ان کی لوٹی اس بازار میں پہنچی تو وہ "دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کبھی ایسا آراستہ بازار اور اس قدر روشنی شیشہ آلات میں انھوں نے نہ دیکھی تھی"۔ ایک مکان نہایت آراستہ دیکھا جیسا کوئی دولت خانہ بھی انھوں نے ہندوستان میں نہیں دیکھا تھا۔ انھیں "یقین ہوا کہ کوئی بہت بڑی شادی ہے اور لوگ جمع ہیں اور مکان آراستہ ہے مگر جب صبح کو دیکھا اور تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ عام لوگوں کے شراب پینے کے لیے شراب خانے ہیں" اور تو اور جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ہوٹل کے کمرے میں گھنٹی لگی ہے جسے بجانے پر بیرا چلا آتا ہے تو وہ اس انتظام پر بھی حیران ہوئے اور رات بھر اس خلجان میں مبتلا رہے کہ گھنٹی کی آواز کا ملازمین کے کمرے تک جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ گھنٹی کس کمرے سے بجائی گئی ہے؟ سرسید کی معصومانہ حیرت کی یہ داستان انھی کے الفاظ میں پڑھیے "مجھ کو خلجان رہا کہ اس نے یہ کیوں کر جانا کہ

فلاں کمرے میں بلایا ہے؟ خیر رات کو سو رہے۔ صبح اٹھ کر میں اس کمرے میں گیا جہاں خدمت گار ہوٹل کے بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک گھنٹہ لگ رہا ہے اور گھنٹے کے نیچے ایک تختہ لگا ہوا ہے اور اس میں بہت سے خانے بنے ہوئے ہیں۔ جس کمرے میں مسافر نے اس گھنٹی کو دبایا اسی وقت وہ گھنٹہ بجا اور فی الفور ایک خانہ میں وہ نمبر دکھائی دیا۔ پس خدمت گار لے جاتا کہ فلاں نمبر کے کمرے میں بلایا ہے" جدید دور کا انسان مختلف ملکوں اور جدید تمدن کے چند در چند مناظر دیکھ لینے کے باعث سرسید ایسی حیرت سے محروم ہو چکا ہے۔ باقی رہیں گھنٹیاں تو ان پر احمد فراز کا شعر سن لیجیے

جب بھی اس غیرت مریم کا خیال آتا ہے　　　　گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

گورنمنٹ کالج سرگودھا میں، جو خیر سے اب یونی ورسٹی آف سرگودھا بن چکا ہے، ایم اے کی کلاسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے تاریخ میں ایم اے کی تدریس شروع ہوئی۔ راقم اگرچہ ان دنوں بی اے کا طالب علم تھا لیکن تاریخ سے دلچسپی اور پرنسپل صاحبزادہ عبدالرسول صاحب کی شفقت کے باعث اسے ایم اے تاریخ کی کلاسوں میں بیٹھنے کی بھی اجازت تھی۔ یہ آغاز تھا بعد کے زمانے میں اس شعبے کے اساتذہ سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ان میں اطالیہ میں ہمیں خوش آمدید کہنے والے تنویر احمد صاحب بھی شامل تھے۔ ہمارے دورۂ اطالیہ کے وقت وہ اٹلی میں پاکستان کے چارج ڈی افیئرز یعنی قائم مقام سفیر تھے۔ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ جب وہ ہمیں ملنے کے لیے ہوٹل تشریف لائے تو انھوں نے ہمیں سفارت خانے میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اطالوی پروفیسر میسی مو بون Massimo Bon سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان کا نام بتاتے ہوئے میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے سفارتی عملے سے کہہ کر ان کا اتا پتا دریافت کروائیں۔ انھوں نے بتایا کہ سفارت خانہ آپ کے ہوٹل سے قریب ہی واقع ہے۔ جب آپ کی طبیعت آمادہ ہو تو تشریف لائیں۔ اس دوران ہم ان صاحب کا اتا پتا بھی دریافت کر لیتے ہیں۔ ہم جب ہوٹل سے نکلے تو خیال تھا کہ یہاں سے کوئی گاڑی لے کر ہم سفارت خانے پہنچیں گے لیکن یہ کیا ہوٹل سے باہر نکلے تو جہاں ہوٹل کا بورڈ لگا تھا اس کے روبرو سفارت خانہ پاکستان کا نشان ثبت تھا یعنی ہمارے ہوٹل کے سامنے سفارت خانے کا دروازہ تھا جس کے لیے کسی گاڑی یا کسی راہنما کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ حذیفہ نے ہوٹل سے نکلتے ہوئے فوٹو گرافی کا شوق پورا کیا اور سڑک کے دوسری جانب سفارت خانے کی گھنٹی بجا دی۔ سفارت خانے کے عملے کو پہلے سے ہماری آمد کی اطلاع تھی اس لیے دروازے کھلتے چلے گئے اور ہم چند ہی لمحوں میں تنویر احمد صاحب کے کمرے میں تھے۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا تنویر صاحب کی مادر علمی تھی یہی کالج راقم الحروف کی بھی مادر علمی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ راقم جب لاہور میں اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کر چکا تھا تو تنویر صاحب یہاں انٹرمیڈیٹ میں داخل ہوئے تھے۔ بہر حال ہم نے اپنے محبوب پرنسپل پروفیسر چودھری عبدالحمید صاحب کو یاد کیا اور گورنمنٹ کالج سرگودھا کے تصور میں جا کر خوش وقت ہوئے۔ میں نے تنویر صاحب سے روم میں اپنے پہلے شوق کا اظہار کیا۔ روم میں راقم کا پہلا شوق اس رومی سے ملاقات تھی جس نے کمال شوق سے اردو سیکھی اور اردو سیکھ کر عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کی طرف مائل ہوا۔ اٹلی اور روم میں اردو کی کہانی بہت لمبی ہے اس کی تفصیل تو ہم کسی اور موقع پر نذر قارئین کریں گے۔ سردست ہم جس اطالوی اردو دان سے ملنا چاہتے تھے اس نے نیپلز یونی ورسٹی اور روم یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ نیپلز یونی ورسٹی سے مولانا ابوالکلام آزاد کی "کاروان خیال" پر تحقیق کر کے السنہ شرقی کی ڈگری حاصل کی۔ "پاکستان، امن اور تصادم کے درمیان" کے موضوع پر تحقیق کر کے ایم اے کیا اور روم یونی ورسٹی سے "پاکستان کی معاصر تاریخ میں سنی علما کا کردار" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

صرف یہی نہیں اس نے اطالویوں کو اردو پڑھانے سے بھی دریغ نہ کیا اور غالب، پطرس بخاری، امتیاز علی تاج، انتظار حسین،

سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، پریم چند اور میراجی جیسے لکھنے والوں کے متعدد اردو متون کو اطالوی زبان میں ڈھالا۔ جب اس کے ایک دوست نے ایک نظامِ زندگی کے طور پر اسلام کو اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے اہلِ اسلام کے عمومی تعارف کے باعث اسے اس "خطرناک ارادے" سے باز رہنے کا مشورہ دیا لیکن جب اپنے ہی مشورے کی حقیقت جاننے کے لیے اس نے اسلام کا مطالعہ کیا تو رفتہ رفتہ وہ نہ صرف اسلام بلکہ اردو سے بھی اتنا قریب ہو گیا کہ اسلام اور اردو اس کی زندگی بن گئے۔ اس وقت اس کی عمر صرف سترہ برس تھی۔ اس نے اپنا نام رسولِ کریمؐ کے لقب کی مناسبت سے امین اور نام ور مسلم سپہ سالار اور فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی کی رعایت سے صلاح الدین رکھا۔ قرآن کریم کے اردو ترجمے کی عبارت دیکھ کر وہ اس رسم الخط کی جانب مائل ہوا۔ رسم الخط سے زبان تک لایا۔ رسم الخط کے حسن اور زبان کی موسیقیت نے اسے اردو کا مخلص بنا دیا۔ اس نے کئی بار پاکستان کا دورہ کیا۔ وہ لاہور، اسلام آباد اور کراچی کے اداروں میں گھوما پھرا۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی پر عزیز احمد کے ترجمے پر کام ہو رہا ہے۔ مختصراً اس مغربی کی سلامتی طبع نے اس پر منکشف کر دیا کہ

اردو جسے کہتے ہیں تہذیب کا چشمہ ہے　　وہ شخص مہذب ہے جس کو یہ زبان آئی

اب میں اٹلی آیا تو اس سے ملنے کا مشتاق تھا لیکن افسوس کہ سفارت خانے کے کارکن اس سے میری ملاقات کا انتظام نہ کر سکے۔

پروفیسر امین صلاح الدین کے بارے میں میری معلومات کا ماخذ ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب تھے۔ جب سفارت خانے کے ارکان نے اس تلاش کے سفر میں ہاتھ کھڑے کر دیے تو میں نے روم سے ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب کو کراچی میں فون کیا۔ رؤف پاریکھ صاحب آج کل ادارۂ فروغِ قومی زبان اسلام آباد کے سربراہ ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ دو برس پہلے صلاح الدین صاحب سے ملے تھے اور ان کے بارے میں ایک کالم ضرور لکھا تھا لیکن وہ اب کہاں ہیں اور ان سے کیسے رابطہ ہو سکتا ہے وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔ اربابِ سفارت نے ہمیں پروفیسر امین صلاح الدین کی ملاقات سے مایوس کر دیا جس سے مجھے اداسی ہوئی بلکہ "بقول خود" اداسی کو بہانہ مل گیا" کہ اٹلی تک دور آنے کے باوجود یہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ میری افسردگی کو دیکھتے ہوئے تنویر احمد صاحب نے کہا کہ کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ آیئے کھانا کھاتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گئے جہاں ہماری تواضع کے لیے اٹلی کے پراٹھے اور گرما گرم پاکستانی چائے رکھی گئی تھی۔ آپ دوپہر کے کھانے میں پراٹھوں کے ذکر سے گھبرائیں نہیں، یہ وہی موٹے موٹے آراستہ پراٹھے تھے جنھیں اٹلی والے اور اٹلی والوں کی تقلید میں ہمارے نوجوان پیزا کہتے ہیں۔ کھانے کے بعد تنویر صاحب نے ہمیں سفارت خانے کی سیر کروائی۔ انھوں نے بتایا کہ سفارت خانے میں سائلین کی آمد پر ان کے بیٹھنے کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لیے ہم نے ایک نیا ہال تعمیر کروایا ہے۔ انھوں نے ہمیں وہ ہال دکھایا جس میں بیک وقت ایک سو لوگوں کی سمائی تھی۔ ان دنوں اٹلی میں پاکستان کے سفیر ندیم ریاض صاحب تھے لیکن ان کی عدم موجودگی کے باعث ڈپٹی ہیڈ آف مشن تنویر احمد صاحب قائم مقام سفیر کی ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے۔ تنویر صاحب نے ہمیں سفارت خانے کی مسجد بھی دکھائی جو محل کے پیچھے باقی عمارت سے الگ تھلگ واقع تھی۔ یہ امر مسرت کا باعث ہے کہ روم کا پاکستانی سفارت خانہ کرائے کی عمارت میں واقع نہیں بلکہ جس عمارت میں ہے وہ اس کی اپنی ملکیت ہے اسی لیے تو یہاں مسجد کی تعمیر بھی ممکن ہو گئی۔ میں نے اور طارق نے اسی مسجد میں نماز ادا کی اور اس کے بعد ہم تنویر صاحب سے رخصت کے خواہاں ہوئے انھوں نے ازرہِ کرم اپنی سفارتی کار اور ڈرائیور ہمارے ہمراہ کیے تا کہ وہ ہمیں روم کی سیر کروا سکیں۔

◆◆◆

سفرنامہ تھائی لینڈ

(......1......)

ڈاکٹر محمد رفیق خان

سفرنامے دا پس منظر تے مقصد

اسی 31 جنوری 1999ء نوں گورنمنٹ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ دی نوکری توں ریٹائر ہو کے امریکہ چلے گئے تے امریکہ دے تیسرے سفر دے تقریباً دو سال گزار کے پاکستان آ گئے۔ چونکہ استاد تے محقق کدی ریٹائر نہیں ہوندا اسی وی فیصلہ کر لیا کہ اپنے ایس وصف دے بوٹے نوں پانی دئی رکھیے۔ ایس لئی اسی پڑھان تے تحقیق نوں جاری رکھن لئی کجھ عرصہ آئی ایل ایم (Institute of Leadership and Management) وچ پڑھان توں بعد دے وچ تقریباً اک سال یونیورسٹی آف ساؤتھ ایشیا وچ بطور پروجیکٹ ڈائریکٹر کم کیتا تے نال اک کورس پڑھایا جیہدا ناں سی (An Introduction to Management Sciences) چونکہ ہر شخص اپنی زندگی دی بہتری لئی سوچدا اے تے نویاں موقعاں دی تلاش وچ رہندا اے کہ اک دفعہ گورنمنٹ کالج آف سائنس وچ گپ شپ کر رہے ساں کہ اوتھے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ کالج لاہور دے اک پرانے رفیق کار ڈاکٹر سلطان احمد نال ملاقات ہوگئی تے اوہناں پچھیا کہ اجکل کیہ کر رہے او۔ میں لاہور سکول آف اکنامکس المعروف ایل ایس ای وچ پڑھا رہیا واں تے ریسرچ وی کر رہیا واں۔ جدوں اوہناں اپنی مہارت دے بارے دسیا کہ اسی اقتصادیات تے ٹیکنالوجی دے آپس دے تعلق موزوں ٹیکنالوجی وچ دو سال دی ٹریننگ لے کے آئے آں تے اپنے کئی ہور اوصاف وی دسے۔ اوہدے دل وچ ساڈے لئی محسوس کیتے جذبیاں نے جنم لیا۔ چونکہ اسی اوہدے نال پہلاں اے وی گل کر چکے ساں کہ اجکل کسے مناسب ملازمت دی تلاش وچ آں تے ملازمت دی اوہ چیز ساڈے دوواں جیاں دی لوڑ ہوندی اے۔ اوہ تے کجھ ویر سوچیا تے میلوں کیا کہ میں اپنے سکول دے ریکٹر جناب شاہد امجد نال گل کر کے تہانوں دساں گا کہ اوہ تہاڈا انٹرویو کر لین۔ اگلے دن اسی ساہنوں اے پیغام دے دتا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے تہانوں سکول بلایا اے تاکہ تہاڈا انٹرویو کر سکن۔ گل بات ہوئی تے اسی ڈاکٹر شاہد امجد چوہدری صاحب دے دل وچ آ گئے کیونکہ اوہ پہلاں ورلڈ بینک وچ ملازمت کر چکے ہن۔

اوہناں نے اوسے دن اسی ساہنوں پروفیسر آف مینجمنٹ سائنسز لگن واسطے دعوت دتا تے شرط ایہ لگائی کہ ساہنوں ملازمت دا آخری مرحلہ دی توں پہلاں اک فائنل لیکچر دینا ہووے گا۔ لیکچر ہویا جیہدے وچ ساہنوں حالی تک یاد اے کہ مسلم لیگ دے سیکرٹری محترم اقبال احسن اقبال، احمد مجتبیٰ احمد دی موجودگی۔ اوہ تے ساہنوں ایس طراں لگا اسی کہ جیویں ایل ایس ای دا خاص امتحان سنکرا اے۔ اوہناں نے لاتعداد سوال پچھے تے ٹالے اوہدے تے ٹالے دوستاں تے ہاتھیاں نے دی۔ اسی ساریاں دے جواب بڑے اعتماد نال دتے تے ساڈا رستہ صاف ہو گیا۔ اگلے دن اسی 30 اگست 2004ء نوں ایل ایس ای نوں بطور پروفیسر جائن کر لیا۔ پہلی تقرری دی بطور پروفیسر آف مینجمنٹ

ساہمنے ہوئی پر صرف تن مہینیاں لئی تاں جے ایہدے نتیجے نوں ٹھوک وجا کے ویکھ لیا جاوے۔ کجھ لوکاں نوں تشویش ہوئی تے ڈاکٹر شاہد صاحب نے ساہنوں آکھیا کہ کسی وقتی طور تے ساڈے سنٹر فار ریسرچ ان اکنامکس اینڈ بزنس (Center of Research in Economic and Business - CREB) وچ بطور سینئر ریسرچ فیلو آ جاؤ۔ انشاءاللہ شعبہ ماحولیات مکمل دیا اے جدے وچ تہانوں جلدی پروفیسر آف انوائرمنٹ منتخب کر دتا جاوے گا۔ اوہ ریسرچ وچ بڑی محنت تے لگن نال کم کردے تے تناں مہینیاں وچ تن ورکنگ پیپر تصنیف کیتے جیہڑے ایل ایس ای سیریز آف ورکنگ پیپرز دی زینت بن گئے۔ جناں لوکاں نے ساڈا بھر پور ساتھ دتا اوہناں دے وچ بزنس ایڈمنسٹریشن دے پروفیسر فرید فریدی ساڈیاں نظراں وچ اول مقام رکھدے نیں۔ اوہناں نے اپنی کلاس نوں تھیسس (Thesis) دے فارمیٹ (Format) تے گفتگو کرن لئی ساہنوں دعوت دتی۔ ایس لیکچر دتا تے کلاس دے طلبا تے طالبات تے فریدی صاحب وی بہت متاثر ہوئے۔ لیکچر ختم ہویا تے ساہنوں دسیا گیا کہ "ڈاکٹر صاحب اس کلاس دے وچ بارہ لڑکیاں تے اٹھ لڑکے نیں" "ایہناں دے پروجیکٹس وچوں جیہناں وچ تہاڈی دلچسپی ہووے تے طلبا تے طالبات دی وی خواہش ہووے تسی ریسرچ کراؤ۔ ساہنوں یاد اے کہ اوس ویلے چھ کڑیاں تے منڈیاں نے ریسرچ لئی تے ساڈا انتخاب کر لیا۔ اک طالبہ بشریٰ رشیدہ نوں اک موضوع دتا ہویا سی جیدا مقصد ایہہ سی کہ لاہور دے ہسپتالاں دے کوڑے نوں کیویں ٹھکانے لگایا جاوے تے کوڑے نوں ٹھکانے لگان اتے جیہڑے ملازمین کم کردے نیں اوہناں دی صحت تے ایہدے کیہ اثرات نیں؟ اس ریسرچ پروجیکٹ نوں مکمل کرن تے ساڈا انتخاب تے فریدی صاحب دا اے مقالہ پاکستان جرنل آف میڈیکل ریسرچ وچ شائع ہو گیا۔ جیہڑا کہ اپنی مثال آپ سی کیونکہ ایہہ اوہ پہلا مقالہ سی جیہڑا کہ بزنس ایجوکیشن کمیشن دے منے پرمنے جرنل وچ شائع ہویا۔ اوہدے نال ساڈے ورکنگ پیپر دیوں تصور جیہڑا اسلامی دے گندے پانی نوں ٹھکانے لگان دا منصوبہ سرگرم عمل سی اوہ سی اتے ایس نکتہ نظر نال کم کیتا کہ ایہہ منصوبہ کناں کو فائدے مند اے۔ ایس ورکنگ پیپر وچوں اک کیس سٹڈی تیار کیتا گیا جیہڑا اسی انڈیا دے ایمٹی بزنس سکول (Amity Business School) دے کیس دے مقابلے وچ بھیجیا تے ایہہ کیس اوتھے پیش کرن لئی منظور ہو گیا۔ ایتھے یاد رکھیا جاوے کہ ایس مقابلے وچ ساری دنیا توں ہزاراں دی تعداد وچ کیس آئے ہوئے سن تے اوہناں وچوں بہترین 30 تے 40 کیس چن لئے گئے سن تے جیہناں وچوں بہترین کیساں نوں اول، دوم تے سوم انعام دتا جانا سی۔ وقت بہت گھٹ ملیا۔ ڈاکٹر شاہد صاحب نے ساہنوں لکھ روپیہ خرچ کر کے بھیجیا۔ اسی کیس بڑی محنت نال تیار کیتا تے اچھا پیش کیتا پر بدقسمتی نال اسی انعام جیت نہ کر سکے۔ کجھ اس طراں دی ہوا کہ صرف دس منٹ دتے گئے تے وقت دے ججز نیں ایس گل اتے اعتراض وی کیتا کہ پروفیسر نے اپنے تھوڑے وقت وچ مشکل نال کم ہونا سی تے ایہہ اوہدے نال زیادتی اے۔ پر ساہنوں سمجھ آ گئی کہ ایہہ مقابلہ کس طراں جیتیا جا سکدا اے۔ فیر وی ایہہ اعزاز دے ملیا کہ ڈی جی بزنس سکول نے دلی خواہش دا اظہار کیتا کہ اسی تہاڈے تے فیکلٹی تے طلبا و طالبات دا اک انٹرایکشن چاہندے آں۔ ایس دوران لیکچرز دتے جناں دے بارے وچ ڈاکٹر [illegible] نے ساہنوں تحسینی سرٹیفیکیٹ وی عنایت کیتا۔

بہرحال ایس انڈیا توں واپسی تے ایس شدید خواہش نال کہ اپنے طلبا نوں سمجھاواں گے تے اوہناں نوں ٹریننگ دیواں کہ اوکھے کیساں وچ انعام کس طراں لیا جا سکدا اے۔ ایم بی اے دی اوس کلاس نوں خود ورکنگ نوں تیار کیتا اوہ کم کراچی دے سمندر وچ تسمان سپرٹ (Tasma Spirit) بحری جہاز دے پاش پاش ہون نال سارے سمندر وچ تیل پھیل گیا سی تے اوس توں پہلاں امریکہ دے اک

جہاز والدیز (Valdez) نال وی اک حادثہ پیش آچکا سی جدا اقتصادی تخمینہ لگایا گیا تے آپس وچ موازنہ کیتا گیا۔ فواد نے کیس پیش کیتا تے اول انعام لے کے آیا۔ ساڈے حوصلے ودھ گئے تے ایس توں اگلے سال اک ہور کیس بھیجیا جیہڑا احمد نے پیش کیتا تے اوہ وی اول انعام لے کے آیا۔ ساڈا فائدہ ایہہ ہویا کہ ساڈا بطور محقق مقبولیت دا سامان بن گیا۔ 2006ء توں 2008ء دے درمیان اک بہت وڈی تبدیلی آئی۔ اوہ ایہہ سی کہ اک منصوبہ بندیاں جدے تحت انڈر گریجوایشن نوں ایہہ ہدایات دتیاں گیاں کہ اوہ اپنی مرضی دا ایریا اور تحقیق بغیر اینی تخصیص دے کہ باہر ریسرچ کرن گے میدان والے بچے طلبا تے طالبات دے گروپ بنائے گئے۔ ساڈے کول اپنے ماحولیات دے فیکلٹی ممبران نے کوئی وی گروپ نہ لیا تے ساہنوں چونکہ ریسرچ دا شوق سی ایس دو گروپ قبول کر لئے۔ ایہناں ساریاں نوں کم شروع کروا دتا۔ ہر طالب علم نے اپنا اپنا پروجیکٹ چنیا۔ ساڈی بجلی کمپنی وچ کل دس طلبا سن جنہاں دے وچوں چاراں نوں اک تھیم تے ارضی سطح دا کم ہونا گیا جیہڑا ایس ملک وچ تے لوکل سطح تے بجلی دی کمی نوں کس طراں پورا کیتا جا سکے۔ ایہہ سی اتے چار طلبا تے طالبات نوں کم شروع کرن لئی ہدایات دے دتیاں گیاں۔ جنہاں دی بنیاد ایہہ سی کہ ملک وچ کوڑے توں بجلی بنان دا مالی تے اقتصادی تخمینہ لگایا جاوے تے ویکھیا جاوے کہ کیا ایس سرچشمے توں کوڑا جلا کے بجلی پیدا کیتی جا سکدی اے جد کہ ایہہ دو قسم دے فائدے ہو سکدے نیں کہ کوڑا وی ٹھکانے لگ جاوے تے اوہدے نال جڑیاں کئی بیماریاں پھیلن دیاں نے اوہناں لوکاں نوں نجات وی مل جاوے تے ایسے کوڑے نوں جلا کے بجلی پیدا کر کے اقتصادی فائدہ وی چکیا جا سکے۔ ایس کم نوں ایس طراں ترتیب دتا تے فیصلہ کیتا کہ شروع دے وچ ایہہ مشق اپنے گھر یعنی لاہور سکول آف اکنامکس توں ای شروع کیتی جاوے کیونکہ ایتھوں ساہنوں ڈیٹا حاصل کرن وچ کوئی مشکل پیش نہیں آوے گی تے نال ای اسی ایہہ فیصلہ کر لیا کہ ایتھوں ایتھوں ڈیٹا آسانی نال مل سکدا اے اوہناں تعلیمی اداریاں نوں اپنے پروگرام وچ شامل کر لیا جاوے۔ ایس لئی میرا پہلا گھر چونکہ گورنمنٹ کالج لاہور ہی بندا اسی اوہدے کوڑے توں وی بجلی بنان دا پروگرام بنا لیا۔ ساڈی پیاری بیگم مرحومہ چونکہ کنیئرڈ کالج وچ سینئر پروفیسر دی حیثیت نال کافی سال گزارے ہوئے سن تے ایتھوں بڑے احترام تے باعزت طریقے نال فارغ ہوئے سن ایس لئی کنیئرڈ کالج نوں وی اپنے پروگرام وچ رکھ لیا۔ آخر تے ساڈی نظر لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ سائنسز تے پئی تے ایہہ سمجھ کے ایہہ تے اپنا سینئر انسٹیٹیوشن اے ایہدے توں ساہنوں ضرور مدد ملے گی ایس لئی اپنا ایہہ پروجیکٹ دا ناں ایہہ ہویا کہ ''میونسپل کوڑے نوں جلا کے بجلی پیدا کرنا'' تے سب توں پہلا ''لاہور دے کجھ اعلیٰ تعلیمی اداریاں دے کوڑے توں بجلی دی پیداوار'' طے ہویا۔ ایہہ ساڈے کم دا پہلا مرحلہ سی۔ نال ای اسی ایہہ وی فیصلہ کر لیا کہ اگلے مرحلے وچ لاہور دیاں کجھ کالونیاں تے کم کرواواں گے تے نال ای کجھ پنڈ تے کوڑے توں بجلی بنان دا تخمینہ لگاواں گے تے تیسرے مرحلے اتے پورے لاہور دے کوڑے توں بجلی بنان دا کم پروگرام وچ لیاواں گے۔ خیر ایہہ تے اگلیاں سالاں دی گل سی۔

شروع دے وچ ایل ایس ای تے ریسرچ اپنی ہونہار شاگرد وثاق شیخ دے سپرد کر دتی گئی جدوں کہ گورنمنٹ کالج دا پروجیکٹ شیریں، کنیئرڈ کالج دا فقانوں تے کجھ واصرین کمال دے سپرد کر دتا گیا۔ ایس دوران دو گئے جدوں کالجاں منڈیاں نے ڈیٹا اکٹھا کیتا اور جد تک اوہ لکھاں روپے خرچ کر کے ڈیٹا اکٹھا کیتا جاندا اے ساڈے ریسرچ دے گروپ نے بغیر کسے خرچے دے ای اکٹھا کر لیا۔ ایس سلسلے وچ ٹیکنیکل مدد یونی کوڑھ ال نے کیتی اوہ وی جد ایہہ سی کہ ایس ال وچ ساڈے کجھ شاگرد گئے دے بوہے توں بجلی بنان دے

شعبے وچ ملازم سن۔ ذینا آیا پروجیکٹ بنے تے سب لوکاں نے بڑی محنت تے ریاضت نال کم کیتا۔ ایتھوں تک کہ کئی کانفرنساں تے جرنلاں وچ شائع ہون لئی مقالے وی تیار ہو گئے۔ ساہنوں یاد اے کہ شاہد شیخ مغرب وچ اوہناں تک ساڈے نال بیٹھ کے کم کردے سی۔ اوہ جد تھیسس تیار ہو چکیا سی ای اوہناں کیہا کہ بیٹا ایس دے وچوں اک تحقیقی ریسرچ پیپر تیار کرو تاں کہ ایس نوں انٹرنیشنل ازبی جرنل جیہڑا اک بنکاک توں شائع ہوندا اے نوں بھیجیئے۔ پیپر بھیجیا گیا تے اوہدے تے ای دیواں دے ریمارکس سن "ایہہ کم ایہناں کو اہم اے کہ ایہہ دے نتائج ساری دنیا وچ جانے چاہیدے نیں بالخصوص افریقی تے ایشیائی ملکاں وچ" ایس ای پیپر منظور ہو گیا تے انٹرنیشنل ازبی جرنل وچ شائع ہو گیا۔ ایس سلسلے دا ایہہ ساڈا پہلا پیپر سی جیہڑا اک دیاں دے مٹے پدھ تے جرنل وچ شائع ہویا۔ نال ای اک ادارے میرین کمال دے تھیسس وچوں پیپر بنا کے میرین نوں ملائیشیا بھیجیا گیا تے اوہ موناش (Monash) یونیورسٹی وچ بین الاقوامی کانفرنس وچ شرکت کر کے آئی تے اوتھے بہت زیادہ پذیرائی ہوئی۔ اوتھے ماہرین نے ایہہ کیہا کہ ای وی واپس جا کے ایس کم نوں ملک دے تعلیمی اداریاں تے وی لاگو کراں گے۔ وقت دے نال نال تقریباً سارے بچیاں دے کم وچوں ریسرچ پیپرز شائع ہو گئے مثلاً حمزہ دا پیپر انوائرمنٹ مانیٹر وچ شائع ہویا تے شیریں عباسی دا انٹرنیشنل جرنل وچ شائع ہو گیا لہٰذا ایہہ ایس حوالے تے کامیابی دا کرن نکلی سی۔ شاہد شیخ ہوراں جے ریسرچ پیپر نوں آغاز ہویا اوہ شادی دے بعد بیلجیئم چلی گئی۔ واپس لاہور آئی تے ساہنوں آ کے ملی تے اوس نے دسیا کہ بیلجیئم دے ماہرین دا ایہہ کہنا سی کہ "ایہہ کم کسی کس طراں کر لیا تے کہیں نوں واپس کروایا۔" باقی کم زیادہ تر ہسپتالاں دے کوڑے تے بی وائیو چڑا سازی دے کارخانیاں دے گندے پانی دی دیکھ بھال دے کمپنیاں تے سی۔ اوہناں وچوں وی پیپر نکل رہے نیں تے اللہ تعالیٰ دی طرفوں رحمتاں دا نزول ہوندا رہیا۔ ساڈی بحیثیت ماہر ریسرچ اینی کو شہرت ہو گئی کہ اگلے سال ساڈے نال 31 طلبا تے طالبات نے ریسرچ ورک کرن دا فیصلہ کیتا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت ورتی تے ای سارے تھیسس (Theses) بڑی کامیابی نال پیر دا کیتے جد کہ وچ نہ صرف میرے ڈیپارٹمنٹ دے سن بلکہ اکنامکس تے مینجمنٹ سائنس دے وی سن۔ آساں ایہہ مطلب ای کوڑے توں بجلی بنان دے منصوبے ول ہون دوبارہ آ گئے آں۔ جس کہ دوسرے مرحلے ول جد کہ وچ اینی پانچ کلو کوڑی کینال دیوے تے بجلی پیدا تے تجربہ کر کے کم ہویا تے نال ای پورے لاہور شہر تے تے لاہور دے ہسپتالاں دے کوڑے توں بجلی بنان دا کم ہویا۔ اجکل سب توں وڈا مسئلہ ای بے ودیاں ادارے جیہڑا اجکل دے بین الاقوامی مسائل نوں حل کرن وچ لگا ہویا اے اوہ انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹریکل تے الیکٹرانک انجینئرز (IEEE) اے۔ اوہناں دیاں 2010 توں لے کے 2012 دیاں کانفرنساں شروع ہوئیاں جیہڑیاں کہ ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بنکاک نے تھائی لینڈ دے مختلف شہراں وچ منعقد کیتیاں۔ ای ایہناں ساریاں کانفرنساں وچ ودھ چڑھ کے حصہ لیا تے تناں وچ ای دو دو پیپر پیش کیتے تے تیسرے وچ اک تیجی کل تے پیپر کانفرنساں دیاں کارروائیاں وچ شائع ہوئے۔ سب توں وڈی کامیابی ایہہ وی ہوئی کہ ایہناں انٹرویو ملک وچ سیر وی کر لئی۔

پہلی کانفرنس لئی دو پرچیاں دے مقالے بھیجے گئے جیہڑے دوویں پورے دے پورے منظور ہو گئے۔ ڈاکٹر شاہد صاحب نوں پتہ چلیا تے اوہ بہت خوش ہو گئے تے نال ایہہ ساڈی کانفرنس وچ شامل ہون دی تے تھائی لینڈ جان دی منظوری وی دے دتی تے ای تھائی لینڈ جان لئی پوری طراں تیار ہو گئے۔ ایس دی ساڈا سفر شروع ہو گیا۔

(جاری اے)

◆◆◆

طنز و مزاح

کدو کے کرتوت

نور کمال شاہ

ہم شروع ہی سے اس راسخ عقیدے کے قائل رہے ہیں کہ کھانے اور پکانے والی سبزیاں واقعی بہت مفید ہوتی ہیں جو نہ صرف یہ کہ انسانی جسم کا دفاعی نظام مضبوط رکھتی ہیں بلکہ ساتھ ہی انسانی بدن (مویشیوں کا بھی) کو خوبصورت، توانا اور طاقتور بھی بناتی ہیں۔ یہ صرف حکیم و عطاری کا قول نہیں بلکہ اس بات کی سچائی اور صداقت پہ ہمیں خود پورا اعتبار بلکہ صد بہ صد یقین بھی ہے مگر جیسے وہ کسی مرد دانش مند کا قول ہے کہ میٹھا اگر حد سے بڑھ جائے تو وہ میٹھا نہیں رہتا بلکہ زہر کا درجہ اختیار کر لیتا ہے بالکل اسی طرح سبزیوں کا زیادہ اور بے تحاشا استعمال بھی اگر صحت کو نہیں تو کم از کم ہمارے ذہن کو تو ضرور خراب کر لیتا ہے۔ استاد وزیر خان ایسے موقع پر اپنا گنگنایا پشتو کا ضرب المثل ضرور دہراتے ہیں کہ: "کہ چاړه د سرو شوه خو په خېټه د منډلو نه ده" (چھری اگر سونے کی بھی ہو تو اسے کم از کم اپنے پیٹ میں تو نہیں گھونپا جا سکتا)۔ بعینہ اسی طرح آج کل سبزیوں نے عموماً اور ان میں "کدو" نے خصوصاً ہماری معصوم سی زندگی کو ایک طرح سے جہنم بنا رکھا ہے اور ہماری تمام خوشیوں کا گویا رس چوس لیا ہے۔ اس صورت حال میں ہم پریشان اور حیران و سرگرداں کھڑے یہ سوچ رہے ہیں کہ اب اپنی چار دن کی مختصری زندگی کو "کدو" کے عزیز ترے اور مہلک اثرات سے آخر کیوں کر محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ سیدی اکبر الہ آبادی نے خوش رہنے کا جو فارمولا وضع کیا تھا کہ:

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ — کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

اس اصول کے مطابق ہم لاکھ کوششیں کر کے بھی خود کو بہلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں!!!

یاد دہانی کے لئے عرض کرتے چلیں کہ ہم سبزیوں کے دقیانوس یا مخالف کبھی بھی نہیں رہے۔ اپنے زرّیں مشرقی خیالات کے زیر سایہ ہم اس قسم کے کسی تصور کی پیدائش کو بھی قطعی حرام سمجھتے ہیں کہ یہ رزق کا معاملہ ہے اور اس میں کوئی چھیڑ چھاڑ کسی طور بھی مناسب نہیں۔ مزید براں یہ کہ پورا محلہ شاہد اور قریبی سبزی فروش بھائی اس امر کی تصدیق کے لئے باقاعدہ قسم اٹھانے کو تیار ہیں کہ ہم حقیقتاً کم سبزی خور واقع ہوئے ہیں (اگرچہ ہمارا لاغر و ناتواں جسم چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دیتا دکھائی دیتا ہے)۔ مگر کیا کریں کہ یہاں ہمیں معاملہ ہی عجیب قسم کا درپیش ہے۔ اس لئے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مودبانہ التماس ہے کہ سبزیوں اور خصوصاً "کدو" کی مخالفت اور مذمت میں ہماری کسی زبانی گستاخی یا بے ادبی کو سنجیدہ یا قابل گرفت بھی نہ لیا جائے۔ بلکہ اسے تنگی کام و دہن اور آسائش معدہ کا شاخسانہ سمجھ کر فوراً سے پیشتر ہی نظر انداز کر دیا جائے تاکہ ہمارے ساتھ ساتھ مفتی "کدو" کا بھی کچھ بھلا ہو.........!!! دوستو، ساتھیو، بس جو ہوا اور جو ہوا کیا بتائیں کہ ہم کس ذہنی و دلی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ پچھلے چار پانچ مہینوں سے مسلسل "کدو" کے ساتھ گزران ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے گویا

ہم آج کل "عہدِ کدو" میں جی رہے ہوں۔ الحمدللہ صحت اور سوجھ بوجھ کا سب کچھ "کدو" ہی کے ساتھ ہے۔ صبح کا ناشتہ اگر کدو کے آملیٹ کے ساتھ ہو رہا ہے تو دوپہر کو "کدو" کا شوربا سامنے موجود رہتا ہے۔ سہ پہر کو اگر "کدو" کا حلوہ پکتا ہے تو شام کو "کدو گوشت" کا سامنا ہے۔ "کدو" کے جوس کو صحت افزا اور طبیعت آزما جان کر ہماری ان دنوں یہ طرح طرح کے نئے تجربے ہو رہے ہیں گھر میں۔ ہم بے چارے تختۂ مشق بنے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جناب مصحفی کے شعر کو تو ہم روز کرا کثر گنگناتے رہتے ہیں کہ:

گر قلقل کب گیا کدو خوری سے یا اخی ۔۔۔ گر صبح کو وہ تھا تو لو شام آ گیا

بہتیری کوششوں کے باوجود "کدو" سے بچنے کی کوئی بھی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو رہی ہے۔

چلئے آپ کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کر ہی لیتے ہیں تاکہ آپ کو حقیقت جان کر حق اور سچ پر منصفانہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو اور سارا الزام مجھ ناتواں کے کندھوں پہ بھی نہ آئے۔ اس دکھ بھری داستان کا آغاز ہمارے چچا محترم کے عرب امارات سے مستقل پر واپسی کے بعد سے ہوا۔ ہمارے منجھلے چچا عرصہ پندرہ سال سے عرب امارات کی ریت چھان کر رزق تلاش کر رہے ہیں اور یہ چھانا ہوا رزق وہ درہموں کی شکل میں بڑی جوانمردی سے ہم تک منتقل کرتے رہے ہیں۔ موصوف کی تعریف و تعارف کے ضمن میں فقط اتنا عرض کرتے چلیں کہ وہ گاؤں میں اپنے تین بھائیوں میں سے سب سے نالائق اور نکمے ثابت ہوئے ہیں۔ سکول سے بھگوڑے بن کر نکلنے کے بعد وہ آوارہ گردی کرنے لگے۔ جب حضرت پورے گاؤں کے لئے نقصِ امن اور محلے کے پڑوسیوں کے لئے بدنامی و رسوائی کا باعث بننے لگے اور دادا جان کے صبر اور گالیوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو انہوں نے مجبوراً ان کا عرب امارات کا ٹکٹ کٹوا ہی دیا۔ دادا جان کے لعن طعن اور انتہائی مقامی زبان میں نہایت فحش کلام گالم گلوچ سے دلبرداشتہ چچا نے اسے تقدیر کا لکھا جان کر رخصتی ہی میں عافیت سمجھی۔ تقدیر کے کھیل دیکھیے کہ وہاں جا کر گویا قسمت کی دیوی نہ صرف ان پر دل کھول کے مہربان ہو گئی بلکہ ان کے لئے خوش قسمتی کے پورے دروازے ہی کھول کر بیٹھ گئی۔ چنانچہ ہزاروں روپے کمانے لگے۔ امارات میں ان کو کھیتوں اور چمن زاروں میں کام کا ذریعہ ملا تھا۔ عربی شیخوں نے ان کی مہارت و جانفشانی سے کوئی فائدہ اٹھایا یا نہیں، یہ تو نہیں معلوم مگر گھر اور دادا جان کو ان سے واقعی بے حد فائدہ پہنچا۔ واپس لوٹے تو تھیلوں درہم اور "کدو بینی" یا "کدو شناسی" کا علم ساتھ لے کر آئے۔ ان کے کمائے ہوئے درہموں سے ہم حال ہی میں ایک شاندار بنگلہ نما مکان تعمیر کرا چکے تھے۔ نئے مکان میں چار دیواری کے اندر چودہ فٹ بائی تیرہ فٹ مستطیل خالی غیر آباد قطعہ بھی موجود تھا جو ہمارے لئے آزمائشوں کا باعث بن گیا۔ مستقبل میں گھر کے اندر مزید کمروں کی تعمیر کے خاطر اسے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ چچا نے تین مہینے کی چھٹیوں میں مشغلہ بیکاری کو دفع کرنے کی غرض سے اس قطعے میں مقامی سبزیاں اگانے کا بنگالی منصوبہ بنایا اور اپنے پندرہ سالہ اماراتی تجربے کے ذریعے ہماری ذاتی عافیت اور گلی محلے سنبھالنے کی ٹھان لی۔ مرچ، ٹماٹر اور بینگن کی پنیری لگانے کے ساتھ ساتھ ایک طرف دیوار کے ساتھ کدو کے چند بیج بھی گاڑ دیے زمین میں۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان چند بیجوں سے پھوٹنے والے پودے گھر تو کیا پورے محلے کے لئے کافی سے بھی کچھ زیادہ ہی ثابت ہوئے۔ پورے آنگن میں پھیلتی بیلوں میں پھول پھوٹنے لگے اور چند دن بعد ان کی جگہ معصوم سے چھوٹے چھوٹے کدو بھی نظر آنے لگے۔ چچا کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کدو جسامت میں بڑھتے اور پھلتے پھولتے رہے اور ڈیڑھ دو مہینے میں ہم "کدو" کی پیداوار میں خود کفیل بن چکے تھے۔ الماریوں میں ضخیم اور موٹے تازے کدوؤں کا ذخیرہ سٹور روم میں پہنچ چکا تھا اور کچن تک رسائی کے انتظار میں

تیار پڑا تھا۔ اب ہمارے کام و دہن کے لئے امتحان کا دورانیہ شاید شروع ہو چکا تھا۔ آٹھ دس کلو سے لیکر چودہ پندرہ کلو وزن کے حامل بھاری ''کدو'' اور ہمارا آٹھ دس افراد پر مشتمل مختصر سا کنبہ۔ کہنے کو تو یہ ہمارے ''کدو'' ہمیں سال بھر کے لئے کافی تھے مگر ہماری اماں حضور ہیں سدا کی فضول خرچ۔ سو تین چار ہی مہینے میں کدوؤں کا صفایا ہو گیا مگر اس بھاری ذخیرے کو ختم کرتے کرتے ہم پہ جو گزری اس کیفیت سے فقط ہم ہی واقف ہیں۔ ہمارے مسلسل بہتے اشک ہی آخر ہم کی عاقبت سنوارتے چلے گئے:

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں ہمارے اشک تیری عاقبت سنوار چلے

دستر خوان پر ''کدو'' کی شان میں کی گئی چچا کی تقریریں سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل تھیں۔ ان کی جادو بیانی دیکھ کر رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ انہیں تو کسی کالج میں پروفیسر ہونا چاہئے تھا۔ یہ شخص ایک تہذیبی بیانیہ تھا۔ وہ تعارفی اور تعریفی تقریر بھی کرتے پھر بھی ہمیں ''کدو'' ہی تو کھانا تھا۔ دستر خوان پر ''کدو'' کی وہ وہ فضیلتیں اور خواص بیان ہوئے کہ ہمارے طبیب بھی دانتوں تلے انگلیاں چبا کر رہ جائیں۔ بیان میں وہ تاثیر کہ شعلہ بیان مقرر بھی ان کے سامنے دنگ رہ جائیں۔ میں حیران تھا کہ اتنی معلومات اس ظالم کے پاس کہاں سے آ گئیں۔ ''کدو'' کو ام الغذا قرار دیا گیا۔ اسے تمام سبزیوں کا سرتاج قرار دیا گیا۔ شرعی لحاظ سے اس کا متعین کردہ مقام ہمیں سمجھایا گیا۔ کدو کھانے کو باعث ثواب گردانا گیا اور دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی کو اسی سے منسوب کیا گیا۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس ہونے لگا جو ابھی تک ''کدو'' کے جلووں اور کرامات سے ناواقف اور نابلد تھے۔ مگر قارئین کرام مجموعاً ''کدو'' نے ہم پر کچھ الٹا ہی اثر ڈالا۔ ہفتے بھر میں ''کدو'' کھاتے کھاتے اپنی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اب تو فقط اسے دیکھ کر ہی ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔ نظام انہضام عجیب قسم کے ناقابل بیان تغیر سے دوچار ہو چکا ہے۔ بسا اوقات حوائج ضروریہ کے لئے مخصوص مقام تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ معدہ اور حلق سے ''کدو'' کے علاوہ تمام ذائقے رخصت ہو چکے ہیں۔ فقط ''کدو'' ہی کا ذائقہ ہر وقت منہ کے اندر بسا رہتا ہے۔ کدو کا سرد مزاج اندرونی گرمی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکا ہے۔ ہم نے دفع شر کی خاطر سٹور سے دو تین دانے ہمسایوں اور عزیزوں کے گھر سرکا بھی دئیے کہ کسی طرح یہ ذخیرہ تمام ہو مگر اس سے زیادہ ہم نہ کر سکے کہ ساری چوری پکڑی گئی اور ہماری شرافت اور معصومیت کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چور، دغاباز اور بد دیانت کے خطابات بھی ہمیں عطا ہوئے۔ اتنی قلیل تعداد کی سرقت سے ہم ''کدو'' کے بھاری ذخیرے کو کوئی خاص نقصان بھی نہ پہنچا سکے۔ دن میں ایک آدھ بار ضرور یہ دیکھنے کے لئے سٹور کا چکر لگاتے کہ ابھی عشق کے کتنے امتحان سر کرنا باقی ہیں۔ یہ امید بھی ہوتی کہ شاید چوہوں اور چوہے وغیرہ اپنا حصہ نکال کر ہماری مشکلات میں خاطر خواہ کمی لا چکے ہوں گے مگر افسوس کہ ان مخلوقات نے ''ذخیرے'' کو چھوا تک بھی نہیں۔ استاد یار محمد خان سے جب اپنی اس مشکل کا ذکر کیا تو موصوف پہلے تو ہمارا منہ دیکھ کے خوب ہنسے پھر فرمایا۔ ''وہ لطیفہ تم نے نہیں سنا کہ کسی محلے کے مولوی صاحب جب ساگ کھاتے کھاتے انتہائی تنگ آ گئے تو ایک دن لاؤڈ سپیکر نکال کے سارے گاؤں میں یہ اعلان کر دیا کہ ''ظالمو! ہر وقت کے ساگ کھلانے سے تو بہتر ہے کہ سامنے کھیت کی پگڈنڈی پہ اگی سبز گھاس پہ نمک مرچ چھڑکو، میں خود ہی جا کر کھانا شروع کر دوں گا۔ آپ بھی ناحق تکلیف سے بچ جائیں گے''۔ ہمارے بالائی کوہستانی علاقوں میں ساگ شوق سے پکایا اور کھایا جاتا ہے اور اس کی وجہ ان لوگوں کا ''ذوق ساگ خوری'' ہرگز نہیں بلکہ دراصل وہاں پر گوشت، چاول، دال وغیرہ کی دستیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب بھلا ساٹھ ستر کلومیٹر کے فاصلے سے کون دال، چاول، گوشت وغیرہ اپنی پیٹھ پر لاد کر وہاں لے جائے۔ سو یہ لوگ چاہتے یا

نہ چاہتے ہوئے بھی ساگ کھانے پر مجبور ہیں۔ اپنے کیریئر کے ابتدائی سالوں میں ایک دفعہ میرا تبادلہ بھی ان پہاڑی علاقوں کو ہو چکا تھا اور میں وہاں کے عوام اور ساگ کے بیچ کچھ عرصہ گزار چکا ہوں۔ تین چار دن کی مسلسل "ساگ خوری" کے بعد ایک دوپہر کو ساگ کی پلیٹ سے لقمہ اٹھاتے ہوئے میں نے اپنے میزبان سے پوچھا" میاں جی! یہ جو "ساگ" آپ لوگ مسلسل پکا اور کھا رہے ہیں، اس کی فصل کب تک موجود رہتی ہے پہاڑوں پر؟" اس سوال سے دراصل میرا مقصد اپنے عرصہ صعوبت کا تعین تھا کہ ساگ کو برداشت کرنے کی خاطر کتنے ہی عرصے معدے و ذہن کو اس پر آمادہ کیا جا سکے۔ میزبان نے مسکراتے ہوئے پیار سے میری طرف دیکھا، شکرانے کے انداز میں نگاہیں اوپر آسمان کی جانب اٹھائیں اور یوں گویا ہوئے: "پروفیسر صاحب! ہم لوگ بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ اس نعمت خاص کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ یہ اس وقت جو "ساگ" آپ کھا رہے ہیں اسے "کولے" کہا جاتا ہے اور وہ اوپر بلند پہاڑی کی چوٹیاں ہیں (ہاتھ سے اوپر اشارہ کرتے ہوئے) یہ وہاں خود بخود بغیر کاشت کے اگ آتا ہے۔ چار پانچ مہینے تک یہ وافر مقدار میں موجود رہتا ہے پھر ختم ہو جاتا ہے"۔ میں نے اطمینان کا سانس لینے کی کوشش کی تو موصوف اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید بولے، "مگر پروفیسر صاحب! ہم واقعی بڑے خوش قسمت لوگ ہیں۔ "کولے" کے ختم ہونے کے باوجود ہم پھر بھی "ساگ" سے محروم نہیں رہتے بلکہ "کولے" کے ختم ہونے سے پہلے ہی "تیلے" تیار ہو چکا ہوتا ہے سو ہم اس کا آغاز کر لیتے ہیں، اللہ کا بڑا کرم ہے جی"۔

"یہ "تیلے" کیا ہوتا ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو میزبان صاحب فخریہ انداز میں سینہ پھلا کے بولے، "ساگ ہوتا ہے جی اور ذائقے میں "کولے" سے کسی طرح کم تر نہیں ہوتا، بس ہمارے اگلے تین چار ماہ بھی آسانی سے گزر جاتے ہیں"۔ اور میرے ہاتھ سے نوالہ گویا گرتے گرتے بچا ہو۔ سو میرے بھائی! ایسے علاقے سے ہجرت ہی اس مسئلے کا واحد حل ہوتا ہے۔ جس طرح میں "ساگ" سے بھاگ آیا تھا بالکل اسی طرح تجھے "کدو" سے بھاگنا ہے، ایک سو اسی کی سپیڈ سے"۔

◆◆◆

"تخلیق تقریب" 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

☆ آپ کی قابل قدر خدمات پر امریکہ میں اردو بولنے، جاننے، رکھنے والے لوگوں کی جانب سے سپاس گزار ہوں۔ "تخلیق" کی مسلسل اشاعت کے 50 سال دراصل پاکستانی ادب کی تاریخ اور کہانی ہے۔ خصوصی ایوارڈ کے لئے شکر گزار ہوں۔ (ذوالفقار کاظمی، امریکہ)

☆ حسین ادبی ستاروں سے جگمگاتی تقریب میں بلاوے پر سپاس گزار ہوں۔ دعا ہے کہ یہ گلدستہ یونہی مہکتا رہے۔
(شازیہ رباب — ملتان)

☆ تخلیق لازوال ہے اور لازوال رہے گا۔ (شاہدہ دلاور شاہ — لاہور)

☆ اظہر جاوید سے آج میری ملاقات ہو گئی۔ آپ بہت یاد آتے ہیں اظہر! آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ سونان کو خدا اتفاقی تا دیر رکھے آپ سے ملاقاتیں کراتا رہتا ہے۔ (سرفراز سید...... لاہور)

جائزے

''فلسفۂ مغرب'' کا جائزہ

سلیم الرحمٰن

ظفر سپل نے خود کو فلسفے کی ترجمانی کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ''فلسفۂ مغرب'' ان کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے وہ ''ورثۂ دانش یونان اور مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقا'' کے عنوانوں سے دو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ یہ تین کتابیں ان کی بیس سال کی محنت کا ثمر ہیں۔ شاید کوئی کہے کہ بیس برس میں صرف تین کتابیں: رفتار بہت سست ہے۔ اس طرح کے اعتراض کرنے والے ہمارے ملک میں ادبی اور علمی تصانیف کے سیاق و سباق کو مدنظر نہیں رکھتے۔ ہمارے یہاں شاعر اور ادیب صرف کتابیں لکھ کر زندگی ٹھیک طرح بسر نہیں کر سکتے۔ چند شاعروں اور فکشن نگاروں سے قطع نظر، جو کسی نہ کسی وجہ سے مقبول ہو جاتے ہیں، باقی شعرا اور مصنفین کو گزر بسر کرنے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ان کی توانائی منفعت بخش مگر غیر تخلیقی مصروفیات کی نذر ہوتی رہتی ہے۔ جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے اس میں وہ لکھنے لکھانے کا شوق پورا کرتے ہیں۔ جو لکھتے ہیں بالعموم اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ اس صورت حال میں ظفر سپل کی رفتار قلم کم معلوم نہیں ہوتی۔ یہ بھی خیال رہے کہ فلسفے سے دل چسپی رکھنے والے حضرات ملک میں بہت کم ہیں۔ خود کو ایک ایسے علم کی شرح کے لیے وقف کر دینا، جس کے پڑھنے والے تھوڑے ہیں اور داد دینے والے اور بھی کم، جرأت کا کام ہے۔ جنھیں فلسفے کے اس جائزے کی اہمیت کا احساس تھا انھوں نے ظفر صاحب کی کاوش کو سراہنے میں بخل نہیں برتا۔ محمد ارشاد صاحب اور قاضی جاوید سے انھیں داد ملتی رہی۔ احمد ندیم قاسمی نے ان کے مضامین ''فنون'' میں باقاعدگی سے شائع کیے۔ محمد کاظم ان کے مداح تھے۔ اس تناظر میں ظفر صاحب کی مساعی کو دیکھا جائے تو وہ لائق تحسین معلوم ہوتی ہے۔ ''فلسفۂ مغرب'' کو چھ حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلے حصے میں متکلمین کا ذکر ہے۔ ان میں سینٹ آگسٹین اور سینٹ اکوی ناس سر فہرست ہیں۔ ان کے بعد دس صفحے فرانسس بیکن کے لیے مختص ہیں۔ عقلیت پسند فلسفیوں میں دیکارت، سپی نوزا اور لیب نز کا تذکرہ ہے۔ برطانوی تجربیت پسند فلسفیوں کی نمائندگی کے لیے لاک اور ہیوم موجود ہیں۔ جدید مغربی فلسفیوں کا باب سب سے طویل ہے اور تقریباً سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جن لوگوں کا ذکر ہے انھیں بجا طور پر آسمان فلسفہ کے تابندہ ستارے قرار دیا جا سکتا ہے۔ فہرست ہی مرعوب کن ہے۔ والٹیر، روسو، کانٹ، ہیگل، شوپنہار، نطشے، مارکس، برگساں اور رسل۔ مارکس، نطشے اور رسل کے احوال و آثار پر زیادہ توجہ دی ہے۔ ہیگل پر، تعجب ہے، صرف چھ صفحے لکھے ہیں۔ آخر میں کرکے گارڈ اور سارتر پر بات کی ہے۔ سب سے دل چسپ مضامین والٹیر اور روسو پر ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فکر کا احاطہ کرنے کے لیے پندرہ بیس صفحے بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ کاش ظفر صاحب کو اتنی فرصت بھی مل جائے کہ وہ الگ الگ کتابوں

میں، جو کم و بیش تین چار سو صفحوں پر مشتمل ہوں، ان کی عجیب و غریب اور متضاد زندگیوں کا احوال قلم بند کر دیں۔ فلسفے کا بنیادی مقصد بظاہر یہ معلوم کرنا ہے کہ انسانی زندگی کے کیا معنی ہیں اور وہ کون سی راہِ عمل ہے جسے اپنا کر زندگی قرینے سے گزاری جا سکتی ہے اور اس دنیا یا کائنات میں (کائنات کا جو بھی تصور ان کے سامنے رہا ہو) انسان کا مقام کیا ہے اور گرد و پیش کو سمجھنے کا طریقہ کیا ہے؟ مذہب کیا معنی رکھتا ہے۔ اخلاقیات ہم سے کیا تقاضے کرتی ہے۔ ان نامور فلسفیوں نے جو لکھا اور جو سوچا وہ قابلِ قدر ہے۔ البتہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عملی طور پر ان کی زندگیاں خوشگوار نہیں رہیں اور قول و فعل کے تضادات صاف نظر آتے ہیں۔ کیا کیا جائے! دنیوی زندگی جس طرح کے جبر سے عبارت ہے اور جتنی غیر معقول آزمائشوں سے مملو ہے کہ راہِ راست پر چلنا مقصود ہی، اس پر چل نہیں سکتے۔ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ ہم نامور شخصیتوں کے حالات کو مکبر کرنے والے شیشے سے ملاحظہ کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ ان کی خوبیاں اور خامیاں بہت نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اگر ہر آدمی کی زندگی کا اتنی ہی گہری توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو وہ چند ایک باکمال ہستیوں کو چھوڑ کر، داغ دار ہی نظر آئے گا۔ بعض ادوکمیں اور بعض اکوئی ناس پر نسبتاً تفصیل سے لکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ یہ بات قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے (گو مظفر صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا) کہ اکوئی ناس نے آج سے سات سو سال پہلے اپنے ایک رسالے میں بتا دیا تھا کہ یہودیوں کا یہی منصوبہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح پوری دنیا پر قبضہ کر لیا جائے۔ افلاطون اپنی ''جمہوریہ'' میں شاعروں کو جگہ دینے کو تیار نہ تھا۔ اسی طرح کی بے تکی باتیں کانٹ نے بھی کہیں۔ کہا کہ ''ناول کا مطالعہ خیالات کو منتشر کر دیتا ہے بلکہ اس سے یادداشت بھی متاثر ہوتی ہے۔'' لطف یہ کہ خود تو کنسرٹ سننے جاتا تھا لیکن طالب علموں سے کہا کہ ''موسیقی نہیں سننی چاہیے۔ یہ نسائیت کی ترویج کرتی ہے۔'' مختصر یہ کہ فلسفیوں کے خیالات میں اونچ نیچ بہت ہے۔ اگر حکومت کی باگ ڈور بھی فلسفیوں کے ہاتھ آ گئی اور افلاطون کی دلی خواہش یہی تھی تو خدا جانے ادب اور فنونِ لطیفہ پر کیا گزرے۔

◆◆◆

مندرجہ ذیل مسودے کمپوز شدہ ''تخلیق'' ادارے کے پاس محفوظ ہیں

(1) راولپنڈی کی ادبی روایت۔ اجمالی جائزہ (جبار مرزا) (2) تخلیق از خالد فتح محمد۔ ایک ابتدائی مطالعہ (خالد اقبال یاسر) (3) کہ صبا بھی میرا اٹھا کر چلے (ڈاکٹر محسن مگھیانہ) (4) احمد ضیا (انور ندیم علوی) (5) شبنم اوچہ کی تازہ غزل کا تجزیاتی مطالعہ (مریم عباسی ناور) (6) معنی و مفہوم کے انوار سے روشن تجزیہ (عراق مرزا انڈیا) (7) چوراسی سال کا تارڑ (ڈاکٹر اشفاق ورک) (8) باقر نقوی۔ تخلیق و تہذیب (مسلم شمیم) (9) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بحیثیت ''مدون'' (تسنیم کوثر) (10) حسین الحق سے گلشن پر مکالمہ (نثار احمد صدیقی، انڈیا)

غزلوں، منظومات اور آنے والی تمام تخلیقات کو ایک پرچے میں شامل کرنا ناممکن ہے۔ امید ہے شائع ہونے والے پرچوں میں ان تخلیقات سے استفادہ حاصل کیا جائے گا۔ آپ سب کے قلمی تعاون پر ''تخلیق'' آپ کا شکر گزار ہے۔ (ادارہ ''تخلیق'')

آ قا قافا

(ایک آفاقی ناول)

فرحت عباس شاہ

اگرچہ میں منصور آفاق کے زیرِ نظر ناول کو اشفاق احمد کے کچھ افسانوں یا بابا محمد یحییٰ خان کی طویل تحریروں میں لے آ جاتا تھا لیکن نہ تو یہ ناول طویل افسانہ ہے نہ ہی ان قصیدوں اور جنات کے موضوع پر لکھی گئی طویل روداد۔ دوسری زبانوں میں بھی اس نوع کا کوئی ناول میری نظروں سے نہیں گزرا کہ میں منصور آفاق کے زیرِ نظر ناول کو اس کیٹیگری میں لے آؤں۔ لے دے کے میرے لیے اس سے بہت پہلے بنائی گئی فلم ''بدھا'' اور پیرا سائیکالوجی پر بنائی گئی ہالی وڈ کی ماڈرن فلموں کے نزدیک رکھنے کے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں بچتی۔ اگرچہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر تخلیق کو پہلے سے موجود کسی فریم میں فٹ کیا جائے لیکن کئی دفعہ کسی نئے زاویے سے لکھے گئے ادب پارے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے روایت یا کوئی ریفرنس مل جائے تو اس کی پرتیں کھولنے میں ناقد کو آسانی میسر آ جاتی ہے۔ جس طرح دنیا کے بڑے ناولوں پر بنائی گئی فلمیں ناول اور فلم کے باہمی اور قریبی رشتے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں اسی طرح ایک فلم رائٹر اور ڈرامہ نگار کا لکھا ہوا ناول بھی اپنی فطری نوعیت کا ادراک دیتا قاری کو کئی طرح کی لذتِ مطالعہ سے روشناس کراتا ہے۔

منصور آفاق بنیادی طور پر صوفیانہ اور شاعرانہ نثر کے ایک قطعی منفرد اسلوب کا حامل تخلیق کار ہے جس کی نثر کو نثر نگاروں کے ہجوم میں بھی بڑی سہولت سے پہچان کر الگ کیا جا سکتا ہے۔ صاحبِ اسلوب شاعر یا نثر نگار ہونا ادب میں ایک غیر معمولی صفت کا حامل ہونا ہے کہ آپ شعوری کوشش سے شعر بھی بنا سکتے ہیں اور کہانی بھی لکھ سکتے ہیں لیکن اسلوب صرف اسی وقت تشکیل پائے گا جب وہ تخلیق کار کی ذات کا حصہ ہوگا بصورتِ دیگر کوشش سے اختیار کیا جانے والا اسلوب آدھے صفحے کے بعد ہی اپنی شکل برقرار رکھتے ہوئے آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بن کر ایک تو تخلیق کار کو بھی ایکسپوز کر دے گا اور دوسرا قاری کے لیے مطالعہ جاری رکھنا بھی ناممکن بنا دے گا۔ منصور آفاق صاحبِ اسلوب تخلیق کار ہی نہیں بلکہ شخصی سطح پر بھی صاحبِ اسلوب ہے جس کے بولنے چالنے، اٹھنے بیٹھنے اور لکھنے لکھانے میں ایک نمایاں اور یکساں رنگ ڈھنگ خود بولتا صاف نظر آتا ہے۔ تصوف، سری علوم اور فلسفہ اس کے نہ صرف پسندیدہ موضوعات ہیں بلکہ اس کی تحریروں اور تقریروں کے ساتھ ساتھ اس کی تصویروں کے گرد بھی اتنا مضبوط حصار قائم کیے ہوئے ہیں کہ اسے ان دائروں سے باہر نکال کے نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

منصور آفاق کے زیرِ نظر ناول آ قا قافا کو سمجھنے کے لیے اس کے طرزِ حیات کو سمجھنا بہت ضروری ہے ورنہ کسی بھی دور بیٹھے ناقد کے لیے یہ ناول ایک پیچیدہ معمّہ بن کے رہ جائے گا۔ شعور کو باطنی شعور اور لاشعور کو باطنی لاشعور لکھنا، معروضیت کو خارجی معروضیت بتانا یا اپنی سے آگہی بننے کے عمل کو طبیعاتی عمل قرار دینا دراصل اس کے مروجہ تدریسی ضابطوں کی نسبت فوک اور فطری ذریعہ ہائے علوم پر زیادہ

اضطراب اور ان سے زیادہ وہ انتشار کی نشانی ہے۔ ناول کا دوسرا حصہ جسے پہلا حصہ بھی کہا جا سکتا ہے کی کہانی ناول کے مرکزی کردار آقا قافا کے اس باطنی سفر کی کہانی ہے جسے متوازی زندگی یا پیرالل سٹیٹ آف مائنڈ بھی کہا جا سکتا ہے۔

میرے اپنے ذاتی خیال کے مطابق ہر انسان اپنی طبعی عمر میں ایک سے زیادہ زندگیاں بسر کرتا ہے۔ وہ دفتر میں ایک اور انسان ہوسکتا ہے جو گھر میں رہنے والے انسان سے بالکل مختلف ہو لیکن مصنف نے یہاں جس باطنی سفر کی کہانی لکھی ہے وہ کسی بالکل ہی مختلف دنیا اور ماحول کی کہانی ہے جسے ناول نگار نے اپنی باطنی کہانی قرار دیا ہے۔ مرکزی کردار آقا قافا کی اس کہانی کو سمجھنے کے لیے ہمیں ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کے نظریہ ذہن کی مدد لینا ہوگی۔ فرائیڈ کے مطابق انسانی ذہن کے تین بنیادی حصے ہیں 1۔ شعور، 2۔ تحت الشعور اور 3۔ لاشعور وہ کہتا ہے کہ انسانی ذہن کا سب سے گہرا، وسیع، عریض اور پراسرار ترین حصہ لاشعور ہے جس میں انسان کی وہ تمام خواہشات، خوف، خدشات اور ناپسندیدہ خیالات جن کا سامنا کرنا انسان کے لیے مشکل، تکلیف دہ یا کسی طرح بھی ناقابل قبول ہو وہ تمام لاشعور میں چلے جاتے ہیں۔ تحت الشعور۔۔۔ شعور اور لاشعور کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کونسے خیالات شعور میں داخل ہونے دیئے ہیں اور کونسے لاشعور میں واپس بھیج دیئے ہیں۔

لہٰذا یہ سمجھ میں آنا بہت آسان ہے کہ ناول کا مرکزی کردار اپنے جن خیالات، احساسات، خواہشات یا جذبات کو کسی بھی وجہ سے اپنے لاشعور میں دفن کر چکا وہ زندگی کے کسی حصے میں تخلیقی پیراہن اوڑھ کر ذہن کے نفسیاتی نظام کے زیر اثر تحت الشعور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ اگر وہ لاشعور تک محدود رہتے تو ہرگز ہرگز ایک مربوط کہانی بن کر مصنف کی گرفت میں نہ آتے۔ جب وہ تحت الشعور تک آئے تو قابل قبول شکل اختیار کر چکے تھے سو شعور میں آئے اور نہ صرف ایک مربوط بلکہ اتنی طاقتور کہانی بن کر صفحہ قرطاس پر نمودار ہوئے کہ قاری کے دل و دماغ کو تھام کر ساتھ لے چلنے کی طاقت کے حامل بھی نظر آئے۔ انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیے جانے والی تخلیقی قابلیت اور تخلیقی نظام ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو لاشعور کے مشکل سے مشکل مواد کو حسن دے کر نہ صرف شعور میں لانے کی قدرت رکھتا ہے بلکہ منصۂ شہود پر بھی لے آتا ہے۔

منصور آفاق کا کمال فن یہ ہے کہ اس نے پیرالل سٹیٹ آف مائنڈ کو نہ صرف گرفت میں لیا بلکہ اسے سمجھا اور ایسے تخلیقی انداز میں پیش کر دیا کہ ایک زندگی اور ایک کہانی متوازی رہتے ہوئے بھی خارج سے یوں جڑ گئی جیسے وہ متوازی نہ ہو بلکہ اسی ظاہری اور خارجی زندگی کی ایکسٹینشن ہو۔ اتنا غیر معمولی کام کوئی بڑا اور عظیم تخلیق کار ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ اس ناول کا ایک اور منفرد پہلو یہ ہے کہ اس کہانی کے دونوں حصوں میں ناول نگار اپنے نام سمیت مرکزی کردار کے طور پر موجود ہے۔ پہلے حصے میں منصور آفاق کے نام سے اور دوسرے حصے میں آقا قافا کے نام سے جسے الٹ پلٹ کر کے دیکھیں تو اس میں سے بھی آفاق برآمد ہوتا ہے۔ ایک بات تو طے ہے کہ کہانی کے بہت سے واقعات، مقامات یا کردار کہیں نہ کہیں ناول نگار کی زندگی میں حقیقی طور پر موجود رہے یا آئے گئے ہوں گے لیکن اس ناول کی افسانوی حیثیت پھر بھی برقرار رہتی ہے۔ ورنہ ناول نگار اسے خود نوشت سوانح حیات بھی قرار دے سکتا تھا۔ مجھے اس کہانی میں بہت سارا کانٹینٹ ناول نگار کی ان نا آسودہ تمناؤں کا تخلیقی اظہار لگتا ہے جو ہم جیسے بہت سارے بلکہ تمام کے تمام انسانوں اظہار نہ پا سکنے والی کہانیوں کی طرح دل کے نہاں خانوں اور اجڑے بکھرے نیم تاریک زاویوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند پڑی رہتی ہیں۔

میرے ذاتی نظریے کے مطابق ان کی جتنی پذیرائی ہونی چاہیے تھی اگر یہاں ہو پائے تو ہمیشہ انکا ہی بڑا اثر کا تجسیم رہتا ہے کیونکہ ان ہی کا تخلیق کے پیراہن میں ڈھلا دنیا کے ہر ادب کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ ناول کا پلاٹ روایتی اور کہانی ڈرامائی ہے لیکن کہانی پن انتہائی مضبوط بھی ہے اور قاری سے تاثیر بھی ٹکڑوں میں تقسیم ارکیس اتنی مہارت کے ساتھ اپنی اپنی سمت سے آ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں کہ ناول کی اکائی غیر محسوس طور پر نمایاں ہوتی ہوئی اپنا احساس دلاتی ہے۔ کثیر الثقافتی اور کثیر المذاہب ممالک کی حکومتی پالیسی اپنی ریاستی ضرورت کے تحت ہمیشہ انسانی سطح پر پر امن معاشرے کی تشکیل اور پھر تقلیل کی بنیادوں پر تشکیل کی جاتی ہے۔ اور یہی اس ناول کا بنیادی موضوع بھی ہے۔ جس کے ثبوت کے طور پر ناول سے ایک کوٹ ملاحظہ فرمائیں۔

''ایک اور شخص نے اٹھ کر سوال کیا۔۔۔۔ کیا میں آپ سے آپ کی قومیت اور مذہب سے متعلق پوچھ سکتا ہوں؟

آقا قاقا بولے۔۔۔۔ کیوں نہیں، میرا وطن کائنات ہے، میری قومیت آدمیت ہے، میرا مذہب انسانیت ہے، میری زبان محبت ہے۔ میں ایک انسان ہوں صرف انسان اور ہر انسان کو آسودہ دیکھنا چاہتا ہوں''۔

اگرچہ ناول میں۔۔۔۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اس تضاد کو بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے کہ یہی ممالک جو اپنے اندر گلوبل انسانی نظریے پر مبنی ڈھانچے اور سیاسی نظام کو استوار کیے ہوئے ہیں دوسرے خصوصاً ترقی پذیر ممالک کے لیے ان کی پالیسیاں ڈیوائیڈ اینڈ رول سے کبھی باہر نہیں آ سکیں۔۔۔۔ لیکن یہ ایسے بین السطور ناول میں جگہ جگہ معصوم اور بے ضرر بیانیے کی شکل میں خود بخود ابھر کر ایک سوالیہ نشان کی طرح سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ آزادی اظہار کا دعویٰ کرتے ان ممالک میں سیکنڈ یا تھرڈ لیول سٹیزن رائٹرز کو اپنی تخلیق کرنے کے لیے ان کی بقا کی مستوری اور منافقانہ پالیسیوں کی مکمل فکری پیروی کرنا پڑتی ہے۔

جوگ، تصوف، روحانیت اور مذاہب کے درمیان اشتراک کی پیرامیٹرز کی نشاندہی اور انسانی ہم آہنگی کی بنیادوں کی فراہمی اس ناول میں ایک نئے فکری اشتراکی نظریے کو جنم دیتی ہے جو مختلف النظریہ و مختلف انسانوں کی طرف سے گلوبل ریاستوں کو بطور پر امن شہری دی جانے والی گارنٹی یا ضمانت قرار دی جا سکتی ہے۔ یوں یہ ناول محض روحانی، متصوفانہ یا جوگیانہ موضوعات و واقعات کے گرد گھومنے کے باوجود ایک گلوبل سیاسی، سماجی اور شہری بنیاد بنتا نظر آتا ہے جو اس وقت امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا اور جرمنی جیسے ملٹی کلچرل ممالک اور معاشروں کی اشد ضرورت بھی ہے اور ترجیح بھی۔ با الفاظ دیگر اپنے موضوع کے اعتبار سے منصور آفاق کا ناول آقا قاقا انسان کے باطن اور خارج کے درمیان ایک ایسے آفاقی پل کی تعمیر کا ایک ایسا فکری نظام اور نظریہ فراہم کرتا ہے جو مختلف مذاہب اور مختلف نظریہ ہائے حیات رکھنے والے انسانوں کو ایک سماج میں رہتے ہوئے کسی کے لیے باعث آزار بننے کی بجائے خالص انسانی بنیادوں پر ایک دوسرے کو قبول کرنے اور مل جل کر پر امن شہریت کی تعمیر کے قابل بناتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب میں کسی بڑے آفاقی نظریے کی تشکیل کرتا ادب پارہ ہی بڑے ادب کا قابل بننے کا حقدار ہوا کرتا ہے۔

میرے خیال میں جتنا اہم یہ ناول اردو زبان و ادب کے لیے قرار دیا جا سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی اہمیت دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے ادب کے لیے ثابت شدہ اور مسلّم ہے۔

◆◆◆

اور چاند سرخ ہو گیا

(عطیہ سید کے ناول پر چند تاثرات)

شہزاد نیر

اب جبکہ دنیا کرونا کے ہلاکت خیز حملے سے کچھ نہ کچھ سنبھل گئی ہے، پیچھے مڑ کر ان وحشت ناک دنوں پر نظر ڈالنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ کسی کو انکار ہے کہ جس طرح اس خوف ناک وبا نے دنیا کے ہر انسان کو متاثر کیا، اس سے پہلے کوئی آفت نہ کر سکی۔ عالمگیر خوف کا سبب اطلاعات کی فراوانی بھی تھی۔ خوف کو شمار کیا جائے تو گویا کرۂ ارض کا ہر باشندہ کرونا میں مبتلا ہوا۔

اس عالمی وبا پر برابر ادب بھی تخلیق ہوتا رہا کہ انسان کو درپیش ہر صورتِ حال، ادب کا سروکار ہوتی ہے۔ اب بھی یہ قاتل وائرس شکلیں بدل بدل کر بستیوں پر حملہ آور ہوتا رہتا ہے۔ یعنی یہ موضوع حالیہ بھی ہے اور متعلق بہ انسان بھی۔ ہاں ہنگامی صورتِ حال سے ہٹ کر اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے واقعے سے زمانی دوری درکار ہوتی ہے۔ اب کسی حد تک یہ دوری ہمیں میسر ہے۔

عطیہ سید نے ''اور چاند سرخ ہو گیا'' کے عنوان سے ایسا ناول لکھا ہے جو کرونا وبا کے آغاز، پھیلاؤ اور اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ اس موضوع پر اس سے قبل کوئی مکمل اردو ناول لکھا گیا ہو۔ ناول کا کینوس پوری دنیا ہے۔ عطیہ سید نے باب در باب مختلف ممالک میں کرونائی ہلاکت خیزی کو ناول کا جزو بنایا ہے۔ یہ ناول اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جب یہ ابواب کھلتے ہیں تو ہم ملک در ملک گھوم کر کرونائی تباہ کاریاں دیکھتے ہیں یعنی چین، ایران، امریکہ، اٹلی، پاکستان وغیرہ کے منظر نامے ناول کا حصہ ہیں۔ اس خاصیت نے ناول کو ایک بین الاقوامی کینوس مہیا کیا ہے۔ چند ابواب کے عنوانات دیکھیے: ڈیوڈ کی ای میل، عباس اور رطاء، ویٹی کن کا محقق، گلوریا، رچرڈ سن، مس ڈیلیلی، نرگس، حبیب شاہ اور تمینہ۔ تمینہ مرکزی کردار ہے۔

ناول کی خوبی یہ ہے کہ قاری جس ملک بھی جاتا ہے اس کی فضا بندی میں گم ہو جاتا ہے۔ جزئیات نگاری سے سفر نامے کا سا گمان ہوتا ہے۔ ناول نگار کا مضبوط تخیل وہاں کے کردار تخلیق کر کے ہمیں ان سے ملواتا ہے۔ مرکزی کردار تمینہ پاکستانی اور یونیورسٹی پروفیسر ہے جس کے دوست کئی ملکوں میں ہیں۔ کچھ ایسے کردار ہیں جن کا رابطہ تمینہ سے تحقیق کے سلسلے میں ہوا تھا۔ انٹرنیٹ کے ذریعے تمینہ کا ان سے مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ انہی غیر ملکی کرداروں کے توسط سے ناول کی کہانی تلاش در تلاش آگے بڑھتی ہے۔ یعنی ہر باب ایک نئے ملک کی نئی کہانی لے کر کھلتا ہے۔ کرونا وہ مرکزی دھاگا ہے جو ان سب حصوں کو جوڑے رکھتا ہے۔ ناول کے آغاز ہی میں تمینہ کے گھر پر مینڈک اور چوہے یلغار کر دیتے ہیں اس سے ناول نگار نے مستقبل کے ساتھ پیش آمدہ مصیبت کی طرف اشارہ کیا ہے اسی طرح آخری باب میں دیمک حملہ آور ہوتی ہے۔ یوں ناول اپنا معنوی دائرہ مکمل کرتا ہے۔

چند فلسفیانہ مباحث ناول کا قابلِ قدر حصہ ہیں۔ فنا، بقا، وقت، کائنات اور ہستی کے تصورات پر گفتگو سے ناول کی فکری سطح بلند ہوتی ہے کرونا وائرس کی خود کلامی بھی خاصے کی چیز ہے۔ میری رائے میں ادبی تخلیق کا اہم ترین جزو زبان ہے۔ ادب پارے کی زبان محض ادائے مطالب کا ذریعہ نہیں بلکہ اپنی جگہ پر اس کا مقصود بالذات حصہ ہوتی ہے۔ عطیہ سید نے رواں، تخلیقی اور دلکش نثر لکھی ہے۔ اطلاع رسانی کرنے والی نثر کی بجائے ہیں۔ فیض و اقبال کی تراکیب (اے مہر تحسین، سلسلۂ روز و شب وغیرہ) بے تکلفی سے استعمال کی گئی ہیں جس سے ناول کی نثر میں شاعرانہ شان پیدا ہوگئی ہے۔ معاصر ناول نگاری میں "اور چاند سرخ ہوگیا" کی اہمیت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ اس کی فضا مابعد جدید عہد کی ہے۔ کردار اور ان کے رویے، میسنجر اور واٹس ایپ، ٹیکسٹ اور فیس بک، عجلت میں رہائش اور لیپ ٹاپ میں سکونت، ایک ایسی بین الاقوامیت جس میں سرحدوں یا حکومتوں کی روک ٹوک کے بغیر روابط وجود پاتے ہیں۔ یہ سب احساسات اور آلات مابعد جدید عہد کا اشاریہ ہیں۔ ایسے حصوں میں ناول کی زبان بھی انگریزی زدہ یا فارسی آمیز ہو جاتی ہے۔ تیز رفتار اطلاعاتی انقلاب کے باعث دنیا کے عالمی گاؤں میں بدلنے کی تصویر کشی ناول میں موجود ہے۔ اسی باعث میں نے اسے مابعد جدید بیانیے کا نام دیا۔

کرونا کی وبا کے پس منظر میں لکھا جانا اور عالمی صورتِ حال سے منسلک ہونا اس ناول کی اہمیت کا دوسرا نکتہ ہے۔ جس سے اس کی انفرادیت بھی متعین ہوتی ہے۔ ناول کا نصفِ اول، نصفِ ثانی سے بہتر ہے۔ یوں لگتا ہے نصفِ اول محنت اور لگن سے لکھا گیا۔ آخر تک پہنچتے پہنچتے شاید جلدی میں ناول کا اختتام کیا گیا ہے۔ اس حصے میں کئی جگہوں پر صحافتی انداز ادبی انداز پر غالب آتا دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کئی بین الاقوامی تجربوں کو بغیر ادبی پیچ دیے، ناول میں شامل کر دیا گیا ہے۔ حسیب شاہ والا باب غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح ناول کا مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہونا، سفرنامے اور خود نوشت سوانح کے انداز کا در آنا، طویل تر فلسفیانہ مباحث اس ناول کے کمزور پہلو محسوس ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ، عالمی وبا کرونا اور اس کے اثرات کے تعلق سے عطیہ سید نے اردو دنیا کو اچھا ناول دیا ہے۔ شاید ہم اسے بڑے ناولوں میں تو شمار نہ کر سکیں لیکن یہ اہم ناول ضرور ہے۔

◆◆◆

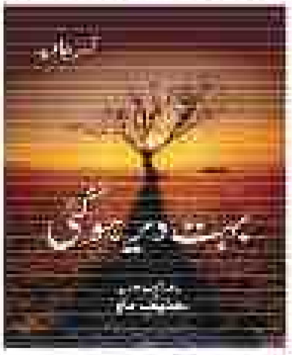
حنیف باوا کا ماہنامہ "تخلیق" کے بانی مدیر اظہر جاوید کی پنجابی افسانوں کی کتاب

بہت دیر ہو گئی

کا پنجابی سے اردو ترجمہ شائع ہو گیا ہے — قیمت : -/500 روپے

ملنے کا پتہ : دفتر "تخلیق" سے آج ہی کاپی بک کرائیں اور حاصل کریں

(0423 6671007, 0423 7187500) ڈسکاؤنٹ 350-50%

خواجہ دل محمد اور صد پارۂ دل

''طلسماتی رباعیات کے حوالے سے''

خالد عبداللہ ونیس

خواجہ دل محمد کی رباعیات میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جسے مافوق الفطرت کہتے ہیں۔ آپ اسے محسوس کرتے ہیں۔ لیکن بیان نہیں کر سکتے۔ رباعیات کا یہ عنصر بہت طاقتور ہے۔ قاری کے دل اور حالات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے ان رباعیات کا مطالعہ کیا ہے ان کا بھی خیال ہے۔ خواجہ دل محمد بنیادی طور پر ایک ریاضی دان تھے وہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے۔ انہوں نے سکولوں اور کالجوں کے طلبہ کیلئے حساب کی کتابیں بھی مرتب کیں جو اپنی شہرت کے حوالے سے آج بھی یکتا ہیں۔ ''دل کا حساب'' ''دل کی جیومیٹری'' اور ''دل کا الجبرا'' یہ اسے لوگوں کو آج بھی یاد ہیں۔ لیکن وہ شاعر بھی تھے اور اردو کی اخلاقی شاعری میں ان کا ایک معتد بہ حصہ ہے۔ انہوں نے اعلےٰ پایہ کی نظمیں لکھی ہیں۔ مثنویاں اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ ''آئینہ اخلاق'' ان کی مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ اور ''صد پارۂ دل'' ان کی رباعیات کی کتاب ہے۔ جو پانچ سو رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان کی تمام تر شاعری اخلاقیات سے تعلق رکھتی ہے وطنیت کا جذبہ بھی اجاگر کرتی ہے۔ ان کی ایک مثنوی کے دو اشعار لکھتے ہیں جن میں ایک قیدی کی زبان سے وطنیت کے جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔

وطن سے کہیں دور بے کس اسیر — نگہباں سے کہتا تھا وقتِ اخیر
ذرا چیر کر دیکھ میرا بدن — ہے لکھا ہوا دل پہ میرے وطن

ان اشعار سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ اپنے اشعار میں انتہائی سادہ زبان استعمال کرتے تھے۔ اس کے باوصف اخلاقیات سے متعلق ان کے اشعار ایک خاص رنگ رکھتے تھے۔ جو لہجہ وہ اختیار کرتے ہیں، اور جو زبان وہ استعمال کرتے ہیں ان سے سچائی عمل نمایاں رہتا ہے۔ خواجہ صاحب اخلاقیات کے ساتھ ساتھ فلسفہ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور تجربہ کے حوالے سے ان کی رباعیات کی ایسی کثرت موجود ہے۔ جن میں قدرت کے مظاہر کو خدائے واحد کی ذات کا مظہر بتایا گیا ہے۔ اور مسئلہ وحدت الوجود ان کے عقیدہ میں پیوست ہے۔ ان کے تصورات میں یہ گہرا رنگ ہندو فلسفہ کا بھی موجود ہے۔ انہوں نے ''گیتا'' کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ جس کی بدولت ان کے اپنے عقائد اور خیالات بھی متاثر ہوئے۔ فلسفہ وحدت الوجود کا یہ رنگ بھی ان کی رباعیات میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو کہیں کہیں وہ شنکر اور داراشکوہ سے بھی متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ داراشکوہ نے بھی ہندوؤں کی اس مذہبی کتاب ''گیتا'' کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا اور ایک پنڈت چندر بھان برہمن سے اس ضمن میں رہنمائی حاصل کرتا رہا۔ دربار میں مسلمان علماء کے علاوہ داراشکوہ کے بھائی بھی اسے مرتد خیال کرتے تھے۔ ان کی تمام شاعری مسئلہ وحدت الوجود کے گرد گھومتی ہے۔

ہم اس کی ایک رباعی پیش کرتے ہیں۔

دریاست وجود صرف ذات وہاب ارواح و نقوش ہم چو نقش اندر آب
دریاست کہ موج می زند اندر خود گہ قطرہ گہ است موج گاہیست حباب

ترجمہ: ذات حق کا وجود سمندر ہے۔ روحیں اور اجسام نقش بر آب ہیں۔ سمندر اپنے اندر موجیں مارتا ہے۔ کبھی قطرہ کبھی موج اور کبھی بلبلہ بن جاتا ہے۔ خواجہ دل محمد کی رباعیات میں بھی وحدت الوجود اپنی پوری آب و تاب سے نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن ہم ان کے فلسفیانہ خیالات کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے۔ ایک رباعی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جو دارا شکوہ کے خیالات سے ملتی جلتی ہے۔

شاہد بھی وہی ہے عین مشہود وہی مطلوب وہی، کعبہ مقصود وہی
ہے غیر کہاں صنم کدے میں موجود معبود بھی خود وہی ہے، مسجود وہی

اسی طرح وہ تمام مظاہر قدرت اور مناظر فطرت کو انسان کی چشم بینا کا محتاج سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو ان مناظر کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔

نظارہ فطرت ہے بشر کا محتاج جلووں کا جہاں نور بصر کا محتاج
عاشق کو ذلیل جانتے ہو کب تک حسن آپ کا ہے حسن نظر کا محتاج

صوفیاء کے نزدیک انسانی دل ایک ایسا مرکز نور ہے۔ جہاں قدرت کے تمام راز و خفایا خود کو عیاں کرتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ انسان اسی دل کے ذریعے کائنات کے اندر خالق حقیقی کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کی تجلیات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

انوار تجلی کا نشیمن دل ہے تاریک ہیں شش جہات روشن دل ہے
اقلیم بقا کو جھانکتا ہوں اس میں دیوار ہے کائنات، روزن دل ہے

جن دنوں خواجہ صاحب اپنی رباعیوں کے ذریعے وحدت الوجود کا پرچار کر رہے تھے۔ اسی دور میں علامہ اقبال اس مسئلے کی تردید کر رہے تھے۔ اس کے باوجود خواجہ صاحب اپنی دھن میں مصروف رہے۔ یہ ان کی اپنی داخلی کیفیات پر منحصر تھا۔ تاہم یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ترغیبات ابن عربی سے حاصل کی تھیں۔ اور وہ ان سے ذہنی آسودگی حاصل کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس مسئلے پر کوئی نثری کام نہیں کیا۔ خواجہ دل محمد سے قبل حافظ شیرازی اور عمر خیام نے بھی رباعیات لکھی ہیں۔ ابو سعید ابوالخیر کی رباعیات بھی فارسی شاعری کا گرانقدر اثاثہ ہیں۔ اردو میں مولانا حالی اور علامہ اقبال کے علاوہ تلوک چند محروم اور عبدالحمید عدم نے بھی رباعیات لکھی ہیں۔ لیکن سب کا رنگ ان کے اپنے اپنے مزاج کے مطابق ہے۔ اور موضوعات بھی بے ساختہ اور حالات و واقعات کے حوالے سے بڑے متنوع ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کی رباعیات کی سطح اس قدر ہموار ہے کہ موضوعات کی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ سب کی سب ایک لَے میں بندھی ہیں۔ پھر بھی ان کی ایک رباعی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ رباعی ایٹم بم کی ایجاد سے متعلق ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ رباعی بھی وحدت الوجود کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور اس پر لطف حقیقت کا بیان زبان شعر میں یوں کیا ہے۔

ہر خار سے گلستاں اگتے دیکھا ہر قطرے میں آسماں جھکتے دیکھا
ہر ذرے میں ہے نظام شمسی بیتاب ہر کاہ کو کہکشاں اگلتے دیکھا

تاہم خواجہ صاحب کی رباعیات سراسر مسئلہ وحدت الوجود سے متعلق نہیں ہیں۔ ان میں دیگر اخلاقی موضوعات بھی ہیں۔ اور

صوفیاء کے قلبی واردات کے مظاہر بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ایسی رباعیات کی زبان بڑی مربوط اور مخصوص قسم کی ہوتی ہے۔ اور اپنے متن کے ساتھ اردو شاعری میں یقیناً ایک قابل توجہ اضافہ ہے۔ ایسی ہی رباعیات میں انہوں نے اپنے ترجمہ" گیتا" کو خاص طور پر مدنظر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ان رباعیات میں" گیتا" کی آتما بھی سرایت کر گئی ہے۔ تاریخ ادب اردو میں شاید اسی وجہ سے خواجہ صاحب کا ذکر نہیں ملتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے" اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں لکھا ہے کہ" تلوک چند محروم نے قدیم ہندو تہذیب اور ہندوستانی تمدن کے تذکروں سے عظمت رفتہ کے نقوش اجاگر کئے۔" ایسا ہی کچھ کام خواجہ صاحب بھی کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں کہ" خواجہ صاحب نے اپنی تہذیب کے روحانی فضائل کا احیاء کیا ہے۔ میں ان کو ان نامور شاعروں میں شمار کرتا ہوں جن کے کلام سے پاکستانی قومیت کے اولین راستے متعین ہوتے ہیں۔" صد پارہ دل کی رباعیات لکھیں جن سے روحانی زندگی کے اسرار بے نقاب ہوئے۔ تاہم خواجہ صاحب کی رباعیات میں روحانی زندگی کے تمام اسرار مسئلہ وحدت الوجود تک محدود ہیں۔ اور یہ مسئلہ ہمارے صوفی شعراء کا مرغوب مسئلہ اور موضوع رہا ہے۔ اس مسئلہ کے پس منظر میں خدا کو بے حجاب دیکھنے کی خواہش موجود ہے۔

"ذوق حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد"

ذات مطلق کی چونکہ کوئی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ذوق حضور نے خدا کے وجود کو پیکر محسوس میں تلاش کیا۔ تخلیق کائنات سے قبل خدا کی ذات تو ازل سے موجود تھی۔ لیکن اس ذات پر گواہ خود ذات حق تھی۔ کائنات کی تخلیق اس کی ذات پر شہادت دیتی ہے۔ کائنات اور ذات حق کا ربط تقاضا اور حق کا سایہ ہے۔ کائنات خود خدا نہیں ہے جیسا کہ صوفیاء نے اسے سمجھا ہے۔ کائنات خدا سے ہے۔ خدا کائنات سے نہیں۔ یہ الفاظ پروفیسر اشرف اروی کے ہیں۔ جو خواجہ دل محمد کے عقیدہ وحدت الوجود کو سمجھنے کے لئے ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی طبیعت میں مذہبی رجحان بے پایاں تھا۔ اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں اپنا کلام شوق سے پڑھتے تھے۔ ان کے عام خیالات ان کے فلسفہ وحدت الوجود سے متعلق نہ تھے۔ لہٰذا خواجہ صاحب کی رباعیات ایک مخصوص حلقہ کے ذوق سے مطابقت رکھتی ہیں۔ وہ عوامی مزاج سے میل نہیں کھاتی ہیں۔ ان میں دلچسپی اور رنگینی کا عنصر مفقود ہے۔ خواجہ صاحب کو ایسے حلقہ کی ضرورت تھی جو ان کے کلام کو سمجھتا اور اس کا ادراک کرتا۔ شاعر کیلئے عوامی دلچسپی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کی رباعیات ایک ایسا حسابی کھیل ہیں جو ایک مخصوص حس کے بغیر سمجھ نہیں آتا۔ ایسا ذوق بڑی محنت اور لگن سے تیار ہوتا ہے۔ صد پارہ دل کی ان پانچ سو رباعیات کو ایک مستحکم ارادے اور ذوق مسلسل کے بغیر پڑھنا دشوار ہے۔ الفاظ کے معنی بالکل محدود ہیں۔ ان میں ایک قسم کا بیان زبان کی مربوطی اور قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بڑی حسابی مہارت کا اظہار ہے۔

خواجہ صاحب نے درحقیقت کائنات سے متعلق بعض روحانی تصورات کو یکجا کرنے کا فریضہ ادبی ذوق تفہیم کے ذریعے ادا کیا۔ ان کی رباعیات نے اہل علم کو خوب متاثر کیا۔ اور وحدت الوجود کے مخصوص الہامی مسائل کا ذریعہ بنایا۔ لیکن خواجہ صاحب تو صوفی نہیں تھے۔ وہ صوفیانہ عقائد سے علمی حد تک متاثر تھے۔ وہ صوفیانہ عقائد کی وجہ سے ایک خوشنما ذوق دیدار کے ترجمان تھے۔ اور اس کائنات کو ذات حق کا پرتو سمجھتے تھے۔ تاہم ان رباعیات میں شاعری کا کمال تو کچھ زیادہ نہ تھا۔ ان کی مقبولیت میں ان فطری تصورات کا کمال زیادہ ہے جو ان رباعیات کی وجہ تخلیق بنے تھے۔ حتمی بات یہ ہے کہ یہ رباعیات ان کے روحانی تجربات کا ماحصل بھی نہیں ہیں۔

◆◆◆

پنجاب رنگ

حنیف باوا

دونگی، حیاتی والے پینڈے دے

میں اک تھلا
توں اک تھل وی
[illegible]
[illegible]
اک دوجے دے کھڑے پھول
[illegible]
تاں
[illegible]
ساڈا سارا جھل
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ساری حیاتی
[illegible]

OOO

سلیم شہزاد

نظم

[illegible]
[illegible]
[illegible]
دھرتی تھاں تے
[illegible]
[illegible]
اپنے گھر دا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

OOO

سلیم شہزاد

نظم

اماں جی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اماں جی
[illegible]
[illegible]
اماں جی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اماں جی
[illegible]
[illegible]

OOO

محمود احمد قاضی

ہڑ

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اپنے دل
[illegible]
[illegible]
[illegible]

OOO

پنجابی افسانہ

سوکھا پینڈا

تسنیم کوثر

مختصر تعارف

تسنیم کوثر 18 فروری کو ساہی وال میں پیدا ہوئیں۔ جہاں سے شادی کے بعد مستقل لاہور منتقل ہو گئیں۔ ان کی اب تک 4 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں "سرگوشی" شعری مجموعہ، پنجابی افسانوں کی کتاب "دو سفرنامے" "کہانی اُن توں کی" اور "جہاں رحمت برستی ہے" شامل ہیں۔

کالے رنگ دی چم چم کردی وڈی جی گڈی ایچ شوں شوں میرے کولوں لنگھی کہ میں بڑی مشکل نال پچھے ہٹ کے بہادروں تے اپنے آپ نوں بچایا۔ گڈی بڑی تیزی نال میرے کولوں لنگھی سی تے میں کار چلان والی تے مساں اک نظر ہی پائی سی پر ــــ فیر وی میں اوہنوں پچھان لیا سی۔ اوہ عذرا سی! اوہ عذرا ہی سی ــــ ساتھن تے میں مولوی عذرا ــــ ساڈا دوواں دا بچپن اکٹھے ہی گزریا سی۔ اسی اکٹھیاں سکول جاندیاں سی، اکٹھے ہی سپارے دا سبق پڑھن جاندیاں سی اسی دوواں نے اکو سکول توں دسویں پاس کیتی سی۔ فیر بھلا میں عذرا نوں کیویں نہ سیان دی پر اوہ عذرا ــــ جنہوں میں جان دی ساں اوہ بجلی تے اصلوں ہی غریب گھر وچ رہندی سی۔ اوہدا پیو مزدوری کردا سی، ماں لوکاں دے گھراں دا کم کردی تے ڈھیر سارے بچیاں نوں پال دی سی۔ پر فیر وی عمروں رجواں نکر گئیں لبھدا سی تے فیر ایہہ عذرا دی ایڈی شان کیویں؟

میرے دل تے دماغ وچ گھمبیر ہون لگ پئی کہ ــــ جس عذرا نوں میں جان دی ساں اوہدے گھر دے بوہے تے گندا ہویا بوری دا پڑدہ ہوندا سی جو اوہدے گھر دی غربت دے بھید کھولدا سی تے عذرا نوں دکھ دے بلاوے دیندا سی۔ عذرا نوں اپنی ایسے غریبی بڑا ڈکھ دیندی سی۔ اوہ ہر ویلے گم صم رہندی تے اپنی غریبی تے سڑدی بلدی رہندی سی۔ اوہنوں امیر ہون دا بڑا چاء سی پر غریبی تے امیری دے سلیاں وچ گواچی رہندی سی کہ غریبی وچ امیری دے سپنے ہی اوہدے دل وچ سی ہور تے اوہ کجھ کر وی نہیں سکدی سی۔ سکول وچ کوئی پروگرام ہوندا یا کسے دا شادی ویاہ عذرا دا برا حال ہو جاندا نویاں کپڑیاں دی فرمائش کردیندی۔ اوہدی ماں تھکوں اوہدیاں فرمائشاں پوریاں کردی۔ ماں اوہنوں جھڑکدی تے اوہ رُس جاندی ــــ اپنی غریبی دا ماتم کرن لگ جاندی۔ اوہنوں نویاں کپڑیاں دا مہندی چوڑیاں لین دا بڑا چاء سی۔ نوں پالش لان دا بڑا شوق سی پر اوہدے ایہہ شوق اپنی غریبی وچ پورے ہونے بہت مشکل سن تاں ای ہر ویلے اوہ اپنی قسمت دا رونا روندی رہندی سی۔

حالات تے میرے گھر دے وی کج چنگے نہیں سن پر میرے ماں پیو نے اپنی سفید پوشی سانبھی ہوئی سی تے ساہنوں بھین بھراواں نوں وی صبر وقناعت دی گڑھتی دتی ہوئی سی۔ اسی ہر حال وچ خوش رہندے ساں۔ میں آپ بڑی صبر والی ساں میری بچپن دی عادت سی جو لبھ گیا کھا لیا۔ ماں نے جیہوں جیہے کپڑے بنا دتے، میں پا لئے کدی ضد ای نہیں کیتی۔ میں تے نکے وی کدی اپنی اوقاتوں باہر ہو کے نہیں ویکھے سن۔ میں عذراتوں وی ایہو گل سمجھاندی ساں پر میرا سمجھانا اوہنوں پسند نہیں آؤندا سی۔ میں جدوں اوہنوں کج سمجھاندا اوہنے میرے نال رس جانا تے کہنا۔ تیرا اندازہ بندے نوں اک واری ای مل دی اے تے اوہ وی بے غرضی وچ تھلے۔ ہر شے نوں ترس دیاں ہوئے گزر دے تے فیر دکھ تے ہوندا اے نا۔ کہندی تے اوہ وی ٹھیک سی پر بندے دے اختیار وچ کج نہیں۔ جُل والوی اے جو نصیب وچ لکھیا ہوندا اے کہ ساری کھیڈ ای نصیباں دی اے تے میں عذراتوں ایہو ای سمجھاندی ساں کہ توں ناشکری نہ ہویا کر۔ تیرے کول تے حسن دی دولت اے توں تے سانوں ساریاں توں امیر ایں پر اوہ کج نہیں سن دی سی نہ میریاں گلاں نے ہی — ماں دیاں نصیحتاں۔ دیہاڑے اٹھ ای لنگھدے جارہے سی کہ اسی دسویں کر کے سکول چھڈ دتا تے ایہدے نال ای سانوں اوہ دا ساتھ وی چھٹ گیا۔ دسویں کرن توں بعد میرا اگے پڑھن دا بڑا دل سی پر میری داجی بابی اپنے بھتیجے دا رشتہ لے آئی تے میری ماں اپنی بھرجائی نوں ناں نہ کر سکی۔ اوہ تے خوشی نال بے حال ہوئی ہوئی سی کہ دھیاں اوہدی دی وار رشتہ منگ کے اوہدا بوجھ لا لیا اے۔

سادے گھراں وچ دھیاں ہیے وی بوجھ ہی سمجھیاں جاندیاں نیں۔ رشتے ہونے مشکل ہو گئے نیں۔ درمیانے گھراں دیاں کڑیاں چنگیاں تے ویاہ دے ہتھے ویکھدیاں ویکھدیاں سر وچ چاندی لہ جاندی اے تے اوہ چنگے رشتیاں دی اڈیک وچ ای بڈھیاں ہو جاندیاں نیں۔ میں تے جتھاں والی ساں نکی عمرے ہی رشتہ آ گیا سی۔ میری ماں دی خوشی ویکھن والی سی — خوش تے میں وی ساں۔ اپنا گھر وسان دا خیال ای بڑا سوہنا لگدا۔ دیاں کرن لگ پئی سی۔ ماں نے چنگا منڈا ویکھیا تے ہاں کر دتی۔ احمد نال میری چھیتی منگنی پیتے ویاہ ہو گیا۔ میں مڈل کلاس وچوں نکل کے مڈل کلاس وچ ای آ گئی ساں۔ احمد پرائیویٹ نوکری کردا سی۔ ویاہ توں مگروں وی فیر اوور ٹائم لا کے وی چنگا کما لیندا سی۔ طبیعت دا وی اچھا سی، خلق تے ذمہ دار وی سی۔ اوہدے وچ کوئی برائی نہیں سی پر اوہدے وچ کوئی چنگیائی وی نہیں سی۔ اوہنوں کوئی شوق نہیں سی تے نہ کوئی چاہ اریجاں دے تے فلماں دا شوقین ای نہیں سی تے نہ ای اوہدا کوئی حس بیلی سی۔ اوہ تے بس اک رنگ، اکو جہے ڈھنگ نال دیہاڑے لنگھا رہیا سی۔ احمد سویرے تڑکے اٹھدا ای چاہ مگروں بابو بازار ٹرجاندا تے پچھلی کاری دے کے دفتر جاندا سی۔ رات دیر نال گھر واپس آؤندا تے روٹی کھا کے سون دی تیاری کردا۔ اوہنوں گھمن پھرن دا کوئی شوق نہیں سی لوکاں دا یا دوستاں دی کوئی نہیں سی۔ اوہنے کدی میری تعریف کیتی تے نہ برائی۔ میرے اوہدی زندگی وچ آن نال وی ایہدیاں عادتاں نہ بدلیاں اوہ تے بس رٹو طوطے وانگ اوہی سبق پڑھدا پیا سی جیہڑا بچپن توں پڑھدا آرہیا سی۔ کولہو دا بیل بن کے اوہ دے وانگ گھمی جا رہیا سی۔ کدی کدی میں سوچدی پئی جاندی ساں کہ کدی بے رونقی جئی گزر رہی اے حیاتی۔ میرے ماپیاں دے گھر تے بڑیاں رونقاں ہوندیاں سی۔ حالات بھاویں چنگے نہیں سی پر اوہدے وچ خوشیاں دیاں رمکاں ضرور ہوندیاں سی۔ میری ماں نوں فلماں ویکھن دا شوق سی تے ابے نوں نہیں سی پر ماں دا دل رکھن نوں ابا ماں نوں سینما وکھاون لے جاندا سی۔ ماں دی پسند دیاں چیزاں لے دے تے اوہنوں ویکھدا رہندا سی۔ میری ماں نے وی ابے نوں سر دا تاج بنا کے رکھیا ہویا سی اوہدیاں داگوں اوہدا دھیان کردی سی۔ اوہدی پسند ناپسند دا خیال

رکھ دی۔ ہر گل وچ اوہ دی پسند ناپسند نوں ساہمنے رکھ دی سی۔ ماں نے میری ہر گل وچ وی ایہو چیز اں رکھیاں سی۔ تد ے ای میری زندگی چنگی گزر رہی سی۔ میں کدی سوچیا ای نہیں کہ میری اپنی پسند کی اے، میں کی کرنا اے، میں کتھے جانا اے۔ میں ایس پاسے دھیان ای نہیں دتا سی۔ ہر گل وچ احمد دی پسند نوں ساہمنے رکھیا، جو احمد دا دل کردا سی اوہو لیا دیندا سی، جتھے او کہندا سی میں چپ چپیتا اوہدے نال ٹر پیندی ساں۔ احمد نوں میرا کلے وچ ایدھر اودھر جانا پسند نہیں سی۔ میں اوہدی غیر موجودگی وچ وی کدی گھروں باہر جھاتی نہیں پائی سی۔ جدوں اوہدا دل کردا میں نوں ماں نال ملان لے جاندا تے کدی کج دناں لئی ماں نوں اپنے نال لے آندا سی۔ میں کدی احمد نال کوئی ضد نہیں کیتی تے نہ فرمائش۔ ایس بخشش ماں دی ایس نصیحت نوں پلے بنھ کے رکھیا کہ مرد نوں مانگاں کرن آلی زنانی پسند نہیں کردا۔

ایسے راہواں تے ٹردیاں کنے ای ورھے لنگھ گئے سی۔ ہن تے بہادر وی دس ورھیاں دا ہو گیا سی۔ ساڈی جوڑی دی سوہنی سلسلی تھ رہی سی۔ احمد اک روایتی مرد سی۔ اوہنوں بڑھی دے جا وچ ملے کرنا پسند ای نہیں سی تے نہ ای اوہ بے پڑھ دے ناز نخرے تے ضداں من دی کوشش کیتی۔ میں تے اپنے خاندان دے وڈے تے سوہنیاں نوں بڑھی تے نیاں ساہمنے کوڈے ٹھڈے دے ویکھیا سی۔ پر احمد چھوڑ نہیں بدلیا سی۔ اوہنوں گھر دے کماں وچ دخل دینا، بیٹے نوں کجھ وی نہیں پسند نہیں سی تے میں وی اوہدے کولوں ایہہ کماں دی کدی آس نہیں رکھی سی کہ گھر دے کماں دی ذمے واری تے میری ای سی۔ احمد دا کم تے کما کے لیانا سی۔ تے گھر چلانا میری ذمے واری۔ کمائی اوہدی سی تے وچ میرا۔ ایسے وجہ نال میرا گھر پوری برادری وچ اک مثالی گھر بن گیا سی۔ میں اپنے گھر نوں جنت بنان لئی اپنی کی ہوئی ساں کے ہور پاسے جان آن دا ویلا ای نہیں لبھدا سی۔ محلے دیاں بڑھیاں کے گھر تی تے ملدیاں تے گلاں کردے ہوئے آکھدیاں۔ بختی بہادر دی ای تے سارے ساریاں نوں بوہتی کیری اے تد ے ای ہر ویلے گھر وچ وڑی رہندی اے۔ میں اس کے اوہناں نوں ہال دیاں ہو گیا آکھدی۔ کہندیاں نے تسی ٹھیک او۔ گھر دے کم ہر ویلے مینوں گھیر یا ہی رکھ دے نیں۔ جدوں دی احمد نوں بلڈ پریشر دی شکایت ہوئی اوہدوں دا ہیزی ساری بھن لگ گئی آں۔ اوہدے آرام دا خیال رکھنا پیندا اے تے فیر میں کہیا کوئی کم والی ماسی لائی ہوئی اے سارے کم آپے ای کرنے پیندے نیں کہ احمد نوں کسے دا کم پسند ای نہیں آوندا۔ گل وی ایہو ای سی کہ میں گھن چکر بنی ہوئی ساں۔ سویرے سارجھرے احمد نوں دفتر لئی روٹی تے پھیکا سالن بنا دیندی ساں۔ فیر بہادر نوں سکول گھلنا۔ سکولوں مڑ دے روٹی کھوان توں ٹیوشن تے پیارے چڑھن لئی بھیجنا۔ گھر دی صفائی ستھرائی ہانڈی روٹی کردیاں شام لے پیندی سی۔ میں تے کدی ماں کول وی جا کے رہن دا خیال دل وچ کدی آن دتا سی۔ جدوں کدی ماں نوں ملن جاندی تے ماں کہندی ایدکی بہادر نوں چھٹیاں ہون تے دو چار دن آ کے میرے کول رہ جاویں میں انکار کر دیندی ساں کدی ای۔ احمد دی طبیعت ٹھیک نہیں رہندی اج کل۔ تے میری ماں بڑے فخر نال احمد نوں تکدی ویہڑے آکھدی ہووے کہ ویکھیا میں دھی دی کیسی تربیت کیتی اے۔ کدی پتی ورتا اے میری دھی۔ کج دناں تو بہادر جیلانی پارک دی آئیڈیا دھی دی ضد تھم ای بیٹھا سی۔ اک واری سکول والوں پارک دی سیر کرایا تے اوہدوں دا ای ایہی اوہنوں چسکا ای لگ گیا سی۔ روز کہندا امی میں پارک جانا اے۔ آئیڈیا دیکھنی اے پر میں اوہنوں ٹال دیندی ساں کہ احمد کول وقت ای نہیں ہوندا سی اوہ صبح دا گھروں نکل دا تے رات نیں ویلے گھر آوندا سی۔ اک اتوار دی چھٹی ہوندی سی جہیڑی گھر دے اوہناں کماں وچ لنگھ جاندی سی جو احمد دے ای کرن والے ہوندے سن۔ فیر مینوں احمد دی عادت دا وی پتہ سی کہ اوہ رش والے تھاواں توں بچ دا شوقین نہیں پر میں ای

وی جاندی سال کہ بچے تفریح کرن جاندے سن۔ اوہناں وی کر دے سن تے بچے ایناں دی جاگدے نوں پورا تنگ جاندے تے اوہ جاندے سن تے اپنے آپ نوں قیدی وانگ محسوس کر جاندے سن۔ چڑچڑے جئے ہو جاندے سن۔ ایسی سوچیاں ہویا رات نوں جدوں احمد کم توں گھر آیا تے میں روٹی پانی ورتان توں بعد جاندا کے احمد نوں دسیا اور روٹی کھان توں بعد جا ضرور پچھیا سی۔ تن چھٹیاں ہوئیاں وچ ہووی ٹی آکھیا بہاور تیاں نوں اوڈیک کے ٹی دکھاوے۔

کیوں؟ کی گل اے؟ کیوں اوڈیک رہیا ای؟ احمد نے چاہ دا گھٹ بھریا تے پچھیا میں چپ رہی میتھوں کجھ وی نہیں آئی کہ کیویں بہاور دی فرمائش دساں۔ میتھوں چپ ویکھ کے احمد بولیا کوئی مسئلہ اے انہیں نہیں مسئلہ تے کوئی نہیں بس بہاور جدوں دا پارک ویکھ آیا اوہدوں دا آبشار والی وی ضد لائی بیٹھا اے۔ میں آکھیا تے احمد ہسیا فیر بولیا ٹھیک اے ایس اتوار کم توں چھٹی ہووے تے ہو آواں گے۔ وکھا لیاواں گے اوہنوں آبشار۔ احمد دی گل سن کے میں خوش ہوئی تے تیر دن وی ہوئی۔ میتھوں لگیا کہ جیویں ساری غلطی میری ای سی جو کدی کجھ آکھیا نہ کجھ منگیا کجھ بندے ایسی طبیعت دے ہوندے نیں کہ اوہناں نوں اپنے آپ کے چیز دا خیال ای نہیں آؤندا۔ بس ایویں وقت لنگھ جاندا اے کوئی کہہ دیوے تے اوہ کر دیندے ہوون دی نہیں سکدے۔ احمد وی ایسی ای طبیعت دا اے گل میتھوں کم عقل نوں کئی ورھیاں بعد پتہ لگی سی۔

ایس اتوار ای پارک دی سیر نوں ٹر پئے۔ میں تے بہاور سائیڈ تے کھڑے ہو گئے تے احمد ٹکٹ لین چلا گیا۔ اوہدوں ای کالی گڈی سامنے کولوں لنگھی دی تیزی نال لنگھی تے خوف دی لہر دوڑ گئی سی۔ احمد ٹکٹ لے آیا۔ ای پارک دا گیٹ لنگھ کے آبشار والے پاسے ٹر پئے کہ اک آواز نے میرے وَدھدے ہوئے قدم روک لئے۔ زہرا میں ایہاں سن کے تیر انی دال پچھے مڑ کے گیا۔ میرے سامنے عذرا سی۔ میں تے اوہدی شکل ای ویکھی سی پر اوہنے وی میتھوں سیان لیا سی۔ اسی کنیاں ورھیاں بعد ملیاں سی۔ ساڈیاں اکھیاں ہنجواں نال بھر گئیاں۔ پچھلے ویلے یاد آ گئے۔ میں احمد نال اوہنوں ملوایا سلام دعا توں بعد دوویں بیچ تے جا کے ٹر پئے تے اسیں دوویں بیٹھیاں دے درخت تھلے پئے سنگ مرمر دے بیچ تے جا بیٹھیاں۔ ماضی دی پٹاری کھل گئی تے سکول دے ویلے تے بچپن دے دن یاد آ گئے۔ عذرا اج وی اوسے ای سوہنی سی پہلاں ورگی۔ اوہ اسی ہری بھری۔ میں اوہدی تعریف کردیاں کیہا ای اوہنا۔ اٹھ نے توں ذرا نہیں بدلی۔ اوہ ہسا تھا پاسا ہسدی رہی فیر بولی۔ بدلی تے توں وی نہیں زہرا اوہ وچ ہی ایس ورلیک، وقتاً توں جیویں پہلے ہوندی سی۔ اوہ ساد گی، اوہ بھولی چہرہ وچ دی گل وچ اپنا آپ وکھیندے ہوئی پاں ماں تا، اوہ سو ہنا سجرا آ گیا ہویا اے تیرے تے۔

میں اوہدے اسے گل تے ہس کر دیاں ہویاں پچھیا۔ اچھا دس ویاہ کتھے ہویا تیرا؟'' اوہنے کہہ ''میری گل سن کے اوہدی زور دار ہسی کہ ہسدیاں ہسدیاں اوہدیاں اکھیاں وچ اتھرو آ گئے فیر اوہنے اکھیاں اکھاں نال اوہنے میتھوں اینج تکیا جیویں میں کوئی غلط گل آکھ دتی ہووے۔ فیر اوہ اکتاں نوں ہتھ لا کے بولی۔ شادی تے میں؟ نہ بابا نہ میں ایس سیاپے وچ نہیں پئی تے نہ ای پیناں چاہندی آں۔ میری اکھیاں وچ سوالاں دیاں لہراں اٹھن لگیاں۔ میں پائیاں آئیاں دے نال اوہنوں ویکھدے ہویاں آکھیا اے تیر اے گڈی ای اے زہرا اے تے رنگ؟ اے سب میں ویاہ کر کے نہیں بنایا زہرا اوہ اتنا چیا ہوکا بھر کے بولی۔ سے میں ویاہ کر لیندی زہرا تے تیرے وانگوں چودری اکل مار کے کسے وقتاں توں مردے پچھے پچھے ٹردی تھکر آؤندی۔ تینوں میں پتہ ہے۔ میرے گھر دے حالات کنج

اے سی۔ اپنے گھر تے ایسے رہن سہن توں وکھریاں ہویاں میرا رشتہ کنے لینا سی۔ جے کوئی رشتہ آوندا وی تے کسے مزدور، کسی فیکٹری ملازم دا ہوندا سی او کتاں نوں کھا لینا بھلا۔ اوہ ایہدے روٹی پانی بڑا۔ ویاہ کر کے وی میرے حالات کنیں بدلنے سی۔ سب کج پہلے ورگا ای رہنا سی۔ میں ایچ تے سدیاں ہویاں زندگی کیوں گزاراں چالی ورھیاں سال۔ عذرا دی آواز درد وچ ڈُب گئی تے فیر؟ توں کوئی کاروبار کر لیا یا نوکری۔ میں پچھیا۔ جے او میری گل پوری ہون تو پہلے ای بول پئی۔

میٹرک پاس نوں نوکری کون دیندا زہرا۔ بس ایسے لئی میں کج نہیں کیتا بس جیون دا ول سکھ لیا۔ ہائے! اوہ کیہ ہے؟ میں بڑی حیرانی نال اوہنوں تکدیاں ہویاں پچھیا۔ تینوں پتہ اے زہرا۔ مینوں سڑی ہوئی غریبی دی حیاتی پسند نہیں سی۔ میں اپنی زندگی اپنی مرضی نال گزارنا چاہندی سی۔ اپنے چاء پورے کرنا چاہندی سی۔ بس تے ایہہ میں اک فیصلہ کیتا تے اپنے چاء پورے کرن لئی اک سوکھے پینڈے تے ٹُر پئی۔ اوہ ول فریب والی گل کر دیاں ہویاں نہ اوکھی تے نہ رنجیدہ ہوئی۔ عجیب جیہا شیطانی ہاسا ہسدیاں کہن لگی: زہرا اس سوکھے پینڈے نے تے میری زندگی دا پاسا ای بدل دتا۔ میں عذرا نوں ہس اوہی بن گئی آں اوہنے تے حیاتی دے سارے ای رنگ آپوں آپ میری جھولی وچ ڈال کر گئے۔ اوہ مینوں اپنی کہانی سنان لگ پئی تے میں ایس ویلے اوس قرطبی عذرا نوں لبھدی رئی جیہڑی نویں سوٹ دی اڑی لا کے رون لگ جاندی ہوندی سی۔

◆◆◆

کرنگل

انور ندیم علوی

کھڈل جی تھیاں لوں لکھیا
بچے گئی پڑوں ڈھولی
ماڑے پچھڑیاں گھوڑے چلے
ڈبی بچے گئے سنگل
گھر نہ بوسکے نہ کھسے چلے
ملک گئے سارے کرنگل

دوری

اکلی تکیا اوڑ
ساتوں ٹٹھوں دور
درد وچھوڑا ڈنگر وساں
کنکاں ہالاں مجبور
اکھاں تک تک ہنجو رون
اتھرا جاڑا تور
ساتوں پیٹھوں دور

تقسیم کاپی (اعزازی) تخلیق دسمبر 2022ء

(1) این۔ اے۔ ناز، ادیب (پاکپتن شریف) (2) ایم۔ اے۔ راجپوت، شاعر، مصنف، بزنس مین (نواب شاہ) (3) یو۔ اے۔ واثق، شاعر، ہیکار (حافظ آباد) (4) ڈاکٹر ایم۔ اے۔ راجپوت (گوجرانوالہ) (5) این۔ اے۔ نقوی، شاعر، مصنف، ہیکار (سکھر) (6) ایم۔ این۔ راجپوت، شاعر، ٹیچر (نواب شاہ) (7) زیڈ۔ آئی۔ شاہد، ٹیچر، آئی ٹی ماہر (حافظ آباد) (8) ایم۔ اے۔ کنول، شاعر، ادیب (گوجرہ)۔ (انور ندیم علوی)

تبصرے آفتاب خان

اپانے

مصنف : ڈاکٹر محسن مگھیانہ

صفحات: 128   قیمت -/400 روپے   ناشر : سنگریز پبلی کیشنز، کوتوالی روڈ، فیصل آباد

محسن مگھیانہ ویسے تو طنز و مزاح لکھنے کے حوالے سے معروف ہیں مگر سنجیدہ ادب میں افسانے بھی لکھ چکے ہیں اور شاعری بھی کر چکے ہیں مگر یہ زیر نظر کتاب ''اپانے'' (حل) افسانچوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو صفحات کے اتنے افسانچے ہیں جتنے ایک سال میں ہفتے ہوتے ہیں یعنی باون (52)۔ افسانچہ کو پانچ سات سطروں سے زائد کا نہیں ہونا اور اسی میں بات کو سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر محسن مگھیانہ تھوڑا سا طویل افسانچہ بنا گئے ہیں جسے ''مختصر افسانہ'' کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ افسانچے ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی کہانیوں سے کشید کر کے تخلیق کیے گئے ہیں۔ ان میں معاشرتی اقدار، رسم و رواج، انسانی رویوں، شعر و ادب، سچائی، عدل و انصاف، تاریخ اور جبر کے موضوعات پیش کیے گئے ہیں اور اس کے لیے سادہ، عام فہم اور کسی حد تک عوامی زبان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو تخلیقیت سے قدرے دور اور صحافت کے قریب تر محسوس ہوتے ہیں مگر عام قاری ان افسانچوں کی قرأت سے یقیناً محظوظ ہوگا کہ ان میں عوام کے دل کی بات کی گئی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مسائل سامنے لائے گئے ہیں جن سے ہر آدمی کا سامنا ہوتا ہے۔

محسن مگھیانہ ڈاکٹری صلاحیت کی حامل شخصیت ہیں۔ وہ مریض کی نبض پر تو ہاتھ نہیں رکھتے کہ وہ سرجن ہیں لیکن اپنے قلم کی تیز دھار سے معاشرے کے ناسوروں کو کاٹنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ انہوں نے ان افسانچوں میں بہت سے ایسے مسائل پر بات کی ہے جن پر قبل ازیں قلم نہیں اٹھایا گیا مثلاً افسانچہ ''کل کائنات'' ایک جعلی ڈاکٹر کی کہانی ہے جس کے پاس ایم۔ بی۔ بی۔ ایس یا کوئی اور ڈگری نہیں اور اس کا کلینک خوب چل رہا ہے مگر جب اس کا اپنا بیٹا بیمار ہوتا ہے تو وہ اس کا علاج نہیں کر پاتا اور اپنے ایک اصلی ڈاکٹر دوست کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ افسانچہ ''تحقیقی لائبریری'' کا مرکزی کردار جب اپنا مکان تعمیر کرتا ہے تو اس میں ایک تحقیقی لائبریری بھی بناتا ہے۔ اس کا دوست مکان دیکھنے آتا ہے تو لائبریری دیکھ کر کہتا ہے: ''اگر تم نے تحقیقی لائبریری کے انہیں پیسوں کا پلاٹ خریدا ہوتا تو تمہارے بچے ساری عمر تمہیں دعائیں دیتے۔'' ایک اور افسانچہ ''پانچ ہزار'' کا مرکزی کردار ایک رائٹر ہے جو ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس میں شریک ہونے بیرون ملک گیا ہوا ہے۔ وہاں غیر ملکی ادیب اپنے اپنے ملک کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ کتاب ایک لاکھ پچاس ہزار کی تعداد میں چھپتی ہے۔ پاکستانی ادیب ملک کی عزت کا خیال کرتے ہوئے پانچ سو کی بجائے تعداد پانچ ہزار بتا دیتا ہے۔

یہ اور اسی طرح کے دیگر بھی افسانچے کسی نہ کسی اہم مسئلے کی نشاندہی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ محسن مگھیانہ نے سماج میں سرایت

کیے ہوئے درد و غم اور مشکلات کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اپنے افسانچوں کے ذریعے ان کا "ازالہ" تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جس پر وہ تحسین کے مستحق ہیں۔

ماں ری

مصنفہ : یاسمین خان

صفحات: 240 قیمت: -/660 روپے پبلشر: سانجھ پبلی کیشنز، لاہور

نگہت یاسمین خان گزشتہ ڈیڑھ دہائی سے کہانیاں لکھ رہی ہیں جن کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں اور ان کا ناول بھی طبع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے میں سولہ کہانیاں ہیں جن میں بعض قدرے طویل ہیں جس کی وجہ سے ان میں اضافی جزئیات بھی شامل ہو چکی ہیں۔ بہر کیف یہ ایک دردمندانہ دل رکھنے والی خاتون کی لکھی ہوئی ایسی کہانیاں ہیں جن میں صرف خواتین پر ہی بات کی گئی ہے۔ ان میں ایسی عورت کی کتھائیں بیان کی گئی ہیں جن پر مرد و معاشرے نے یہ زمین تنگ کر دی ہے یا جو خود ہی حالات کی چکی میں پس کر ڈپریشن کا شکار ہو چکی ہیں جو زندگی گزارنے کے لیے کڑے امتحانوں کے پل صراط پر کھڑی کسی انہونی یا معجزے کی منتظر ہیں۔ یہ کہانیاں انتہائی حقیقت نگاری پر مبنی ہیں جن میں معاشرے کے تلخ حقائق کو بے دردی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ کتاب کی ٹائٹل سٹوری "ماں ری" خانہ بدوشوں کی زندگی کے گرد گھومتی ہے جس کے کرداروں میں قمر شاہ، وسیم شاہ اور نوری نمایاں ہیں جبکہ صابرہ اور مینا رانی بھی کہانی کے اہم کردار ہیں۔ قدرے طویل کہانی میں انسانی جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور رشتوں کا احوال بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ "شہید" ایک مختصر کہانی ہے جس میں گنگا پانی نامی ہندو عورت اپنے بیٹے موتی لال کو خودکش دھماکے میں مسلمان دوستوں کے ساتھ ہلاک ہونے پر شہید گردانتی ہے اور اسے نذر آتش کرنے کی بجائے قبرستان میں دفن کر دیتی ہے۔ "نن بادشاہ اور چڑیل" ایک ایسے گاؤں کی کہانی ہے جہاں مذموم رسومات کا چلن ہے اور جاگیرداروں کے بچوں کے ظلم و زیادتی کو بھی جنوں اور چڑیلوں کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ روایتی موضوع پر یہ ایک مناسب سی کہانی ہے۔ اس مجموعے کی سب سے اہم کہانی "میری ادھوری کہانیاں" ہے جو ایک ڈائجسٹ رائٹر حبا کے گرد گھومتی ہے۔ حبا ایک ایسی رائٹر ہے جو کہانیوں کو ان کی اصل جزئیات اور سیاق و سباق سے پیش کرتی اور حقیقت کے قریب دکھاتی ہے مگر جب اسے ٹی وی ڈرامہ لکھنے کی پیشکش ہوتی ہے تو مجبوراً اسے ڈراموں کی روایتی چکا چوند، دام جھام، ملمع کاری اور گلیمر پر مبنی ڈرامے لکھنے ہوتے ہیں مگر اس کا دل ایسی کہانیوں سے خوش نہیں۔ اس کی تسلی اسے واپس حقیقی کہانیوں کی طرف لے جاتی ہے تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے کہتی ہے "ہاں میری لکھی ہوئی کہانیاں قابل احترام ہو سکتی ہیں اور ابھی تک ہوتی آئی ہیں۔ ہاں میں ایسی محبت بھری کہانیاں لکھتی رہوں گی جب تک یہ معاشرہ محبت کرنا سیکھ جائے اور دل دکھانے والی ادھوری کہانیاں جنم لینے سے پہلے ختم نہ ہو جائیں۔ نگہت یاسمین خان کی یہ کہانیاں گو زیادہ تر روایتی موضوعات پر مبنی ہیں لیکن انہوں نے ان میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دیا ہے۔ ان کا یہ اقدام اصلاح معاشرہ کی طرف اٹھنے والا ایک اہم موڑ ہے۔ اس سے آگے افسانے کا سفر شروع ہوتا ہے اور افسانے میں کہانی کی طرح ساری پرتیں کھول کر نہیں بلکہ بند کر کے کہانی کو آگے بڑھایا جاتا ہے جس میں زیادہ لطف ہے اور قاری اپنی مرضی کا اختتام فرض کر کے زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔

ہم راز نہیں ملتا

شاعر : انور ندیم علوی

صفحات: 144 قیمت: 1,000/- روپے ناشر: زرہاب پبلی کیشنز، لاہور

انور ندیم علوی ایک قدیم شاعر ہیں جن کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ ان کے منتخب اردو پنجابی اور سندھی کلام پر مشتمل ہے اور یہ سب غزلیہ شاعری ہے۔ انور ندیم علوی کی غزل اپنے معاشرے اور سماج کی غلط کاریوں کے خلاف ایک دبی دبی چیخ کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ وہ زمین پر پھیلے ناخداؤں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اپنی شاعری کو مزاحمتی طرز اظہار عطا کرتے ہیں اور ایسے ٹھوس پیرائے میں شعر کہتے ہیں کہ تیر کی طرح سے سیدھا دل میں اتر جاتے ہیں۔ یہ احتجاجی رنگ ان کی متعدد غزلوں میں نمایاں ہے اور قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس انداز کے چند اشعار دیکھیے:

ظلم و استبداد سے نفرت ازل سے ہے اصول — سامنے باطل کے جھک جائے وہ سر میرا نہیں

ڈھیل اور مہلت ملی تو ظلم کرنے کے لیے — دل خدا کے خوف سے خالی ہوا نادان کا

سچ اس کی سزا ہے، یہ بتا کیوں نہیں دیتے — منصور کو سولی پہ چڑھا کیوں نہیں دیتے

انور ندیم علوی کے سینے میں ایک نازک سا پیار بھرا دل بھی دھڑکتا ہے اس لیے ان کی غزلوں میں عشق و محبت اور حسن و جمال کا اظہار در آنا ایک فطری عمل ہے لہٰذا ان کے ہاں ایسے کئی اشعار مل جاتے ہیں جو محبوب کا سراپا بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کی زیبائی کی منظر کشی بھی کرتے ہیں اور ہجر و وصال کے قصے بھی دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ دو چار اشعار دیکھیے گا:

صرف تصویر کو دیکھوں میں گلے مل نہ سکوں — وصل میں ہجر کی یہ ریت نہ ڈالے کوئی

جھیل آنکھوں سے جب ملیں آنکھیں — ہم نے سیکھا غزل وہیں لکھنا

پیاروں سا ندیم انور مظہر نام ہے اس کا — وہ جب خوشبو مرے شعروں میں بھرتا ہے تو لکھتا ہوں

حسن تیرا اے شعلہ رو گویا — آگ سی لگ گئی بہاروں میں

''ہم راز نہیں ملتا'' میں عصر حاضر سے جڑے مسائل کا نوحہ بھی ہے اور سماج کے دکھوں کی کہانی بھی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ شاعر کے کچھ داخلی معاملات بھی ہوتے ہیں۔ کچھ ایسی ان کہی باتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں شاعر شعروں کا روپ عطا کرتا ہے تو اس میں اس کا عصری شعور بھی داخل ہو جاتا ہے۔ انور ندیم علوی کے ہاں بھی کرب کی مختلف شکلیں ہیں جو غزلوں میں داخل کر عجیب سی کیفیات طاری کر دیتی ہیں۔

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ عزیز القدر سید ان اطہر جاوید! سلامت رہیں! آمین یارب کریم! خوبصورت اور فکر انگیز سرورق، ''پہلی بات'' (سب کی باتیں)، ایمان و عقیدت افروز، حمد و نعتیہ کلام، دل گداز نظمیں، غزلیں، یادگار نثری تحقیقات اور محترم تسنیم سحر کے ایک قلم آخر کتابوں پر تبصرے اور بہت محترم ہارون الرشید تبسم اور دوسرے محترم حضرات کی نثری تحریروں پر مشتمل ادبی مجلہ ''تخلیق'' دسمبر 2022ء چند روز ہوئے موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ اور دعائیں۔ عزیز محترم پروفیسر ناصر علی سید نے ہمارے پیارے اور محترم ڈاکٹر اشرف عدیل کی شاعری اور مجموعہ کلام پر خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہزارہ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر رہے اور اپنی سرپرستی میں یونیورسٹی کا پہلا مشاعرہ منعقد کروایا۔ اس مشاعرہ میں ناچیز کو بھی شرکت کا موقع ملا۔ عزیزہ محترمہ نصرت یاسمین نے ہم سب کے پیارے احمد فراز جن کو مرحوم لکھتے ہوئے دل کٹتا ہے کے بہت خوبصورت شعری مجموعہ ''نایافت'' پر عمدہ مضمون لکھا ہے۔ ''نایافت'' کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایبٹ آباد کے صدر بازار میں واقع بک سنٹر کے نام سے ایک بہت اچھی دکان ہوا کرتی تھی جس میں ہر قسم کی کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ میں بھی کبھی اس دکان پر اس لیے جایا کرتا کہ اگر کوئی نئی پسندیدہ کتاب یا رسالہ وغیرہ آیا ہو تو خرید کر لے آؤں۔ اس کے منیجر یعقوب صاحب ہوتے تھے۔ ایک شام گیا تو ''نایافت'' پر نظر پڑی اس کو کھول کر قیمت دیکھی تو دس روپے تھے اور میرے پاس پیسے نہیں تھے البتہ 10 روپے والا ایک انعامی بانڈ موجود تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے یعقوب صاحب سے کہا کہ نایافت لینا چاہتا ہوں مگر میرے پاس نقد پیسے موجود نہیں 10 روپے والا بانڈ ہے۔ اگر آپ یہ لے کر مجھے ''نایافت'' عنایت فرمائیں تو مہربانی ہوگی۔ اگرچہ موصوف نے کہا بھی کہ اس بانڈ کی عنقریب قرعہ اندازی ہونے والی ہے آپ کچھ انتظار کر لیں مگر میں نے کہا بس آپ مہربانی فرمائیں مجھے ''نایافت'' عنایت فرما دیں۔ چنانچہ میں نایافت لے کر خوشی خوشی واپس گھر آ گیا پھر کچھ عرصہ بعد ایک مشاعرہ میں میں نے فراز صاحب سے اس مجموعہ پر آٹوگراف بھی لیا جو ایک جملے پر مشتمل تھا ''بہت پیار کے ساتھ سکون کے لئے''۔ یہ مجموعہ فراز صاحب کے دوسرے بہت سے مجموعوں کے ساتھ میرے کتابوں کے ذخیرہ میں موجود ہے۔ میرے بہت پیارے دوست پروفیسر آصف ثاقب نے ''پسندیدہ شعر'' کے زیر عنوان اپنی تحریر میں ناچیز کا بہت محبت سے ذکر کیا۔ آپ کی یہ محبت نہ تو وقتی ہے نہ ہنگامی بلکہ یہ گذشتہ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ موصوف کی حوصلہ افزائیوں اور سید عبدالرشید کے شعری مجموعوں کے مطالعے نے شاعری کا شوق پیدا کیا۔ اطہر جاوید مظفری کی کتاب ''بہت دیر ہو گئی'' پر بہت سے عمدہ تبصرے پڑھ کر یہ کتاب حاصل کرنے کی خواہش ہے۔

اعتذار: قارئین کرام مجھے اپنی کم علمی کی وجہ سے بھی اور نثر لکھنے کی طرف رجحان نہ ہونے کی وجہ سے نثر لکھنے کا نہ تجربہ ہے نہ سلیقہ اس لئے اگر میری یہ تحریر آپ کی طبع پر گراں گزری ہو تو بہت معذرت خواہ ہوں۔

سلطان سکون (ایبٹ آباد)

﴿2﴾ سلطان خوش رہو! اچھا ماہ انگلینڈ میں گزارنے کے بعد جب واپس کراچی آئی تو "تخلیق" دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ستمبر، دسمبر کے "تخلیق" کا سرورق دیکھ کر بے اختیار داد دینی پڑی۔ حسبِ معمول پڑھنے کا بہت سا مواد ملا اور منفرد موضوعات سے علم میں اضافہ ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ اظہر جاوید صاحب کے جانے کے بعد آپ نے "تخلیق" کا معیار برقرار رکھا۔ سارے ہی سلسلے معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ دعا ہے کہ نئے سال میں آپ کا نہیں بلکہ ہم سب کا "تخلیق" دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت و استقامت عطا کرے اور محنت کا بہترین ثمر آپ کو ملے۔ گر گئی تھی جس کی وجہ سے پاؤں کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا۔ پلاسٹر لگا ہوا ہے۔ زندگی خاصی دشوار ہو گئی ہے مگر شکر ہے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ اب اندازہ ہوا کہ معذوری کتنی بری چیز ہے۔ پورے سلطان عالی کی خدمت میں سلام، نیک تمنائیں اور دعائیں۔

ارجمند شاہین (کراچی)

﴿3﴾ بہت ہی پیارے سلطان اظہر! اچھے رہو، پڑھتے کاڑھتے رہو۔ اردو مطبوعات میں پروف کی غلطی کوئی انوکھی بات نہیں، اتفاق سے اپنے کسی رسالے میں یہ غلطی نہ ہو تو وہ اردو کا رسالہ ہی معلوم نہیں ہوتا۔ "تخلیق" بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے کیوں رہے۔ دسمبر کے پرچے میں میری غزل کا مطلع کچھ کا کچھ شائع ہو گیا ہے۔ درست مطلع یوں ہے۔

یہ کھلا راز ہے مگر ہے راز　　　کائنات اب بھی بیشتر ہے راز

اسی شمارے میں اپنے متعلق برادرم صفدر صدیق رضی کا ایک منفرد تبصرہ بھی نظر سے گزرا کہ "انور شعور کی غزل پڑھی، ان کے بارے میں میری رائے ہے کہ وہ نہایت سنجیدگی سے مزاح لکھتے ہیں" اس تبصرے میں انھوں نے نہایت سنجیدگی سے مزاحیہ رائے دی ہے۔ خوب!

انور شعور (کراچی)

﴿4﴾ پیارے سلطان اظہر، سلام مسنون۔ "تخلیق" کا شمارہ جنوری میں ہی موصول ہو گیا تھا اور اس کا مطالعہ بھی کر لیا تھا، لیکن خط لکھتے لکھتے وہی مہینہ آ گیا جس کے عین وسط میں یار دلدار اظہر جاوید ہم سے جدا ہو گیا تھا۔ عین وسط اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ فروری کے مہینے کے 28 دن ہوتے ہیں، مگر شاید میں نے غلط کہا کہ وہ ہم سے جدا ہو گیا تھا، کہ ہر شمارہ آتا ہے تو سلطان اظہر جاوید کی صورت میں اظہر جاوید "تخلیق" کے ہر صفحے پر موجود ہوتا ہے۔ 2012ء سے اب تک ہر سال 14 فروری آتے ہی دل اتنا اداس ہو جاتا ہے کہ اگلے ہی روز 15 فروری کو اپنی سالگرہ منانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ میری طرف سے آپ کو بھی اور جناب حنیف باوا کو بھی گیارھواں تخلیق ایوارڈ جیتنے کی دلی مبارکباد۔ یہ ایک انتہائی اہم اور بروقت فیصلہ تھا۔ حنیف باوا جی نے اردو اور پنجابی میں افسانوں، انشائیوں اور تراجم کے میدانوں میں اتنا اہم کام کیا ہے کہ اس حوالے سے "تخلیق" کے گزشتہ شمارے کی تقریباً تمام تخلیقات پر میں اپنے ایک مضمون میں تفصیلی تبصرہ کر چکا ہوں جو آج ہی کے روزنامہ "پاکستان" اسلام آباد میں شائع ہوا ہے۔ یہ اخبار آپ کی خدمت میں رجسٹری ڈاک سے روانہ کر رہا ہوں تا کہ آپ اس کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں کریں۔ کچھ چیزیں چھوٹے فونٹ میں شائع ہوئی تھیں جو اب پڑھ سکا ہوں، ان میں قابل ذکر تو یہ ہیں ڈاکٹر غافر

شہزادی'' شاعروں، ادیبوں کی اولاد کس حال میں ہے'' کے موضوع پر بڑی معلوماتی ہے۔ نگل صابری کا مختصر تعارف بھی دیکھا اور ان سطور کے ذریعے انہیں ان کی 85ویں سالگرہ پر تہنیت پیش کرتا ہوں۔ اگلے صفحوں پر پروفیسر غازی علم الدین کا مختصر تعارف بھی پڑھا تو بتاتا چلوں شاید بہت سے قارئین کے علم میں نہ ہو کہ وہ چند ماہ سے شدید علیل ہیں اور ان کی صحت کی مکمل بحالی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ نوید چوہدری کا کالم ''تخلیق کا سفر'' بھی تخلیق کے طویل ادبی سفر کی روداد عمدہ لہجے میں بیان کرتا ہے۔ صفحہ 149 پر ایک بہت ماہرانہ تحریر ''قصے کی کیمسٹری'' کے عنوان سے ہے جسے پڑھ کر اپنے قصے پر قلم وہ پانے کا فیصلہ کیا مگر اس سے پہلے تھوڑا سا قصہ بھی بتاتا چلوں کہ اتنی عمدہ تحریر پر مصنف کا نام کسی سبب سے رہ گیا ہے، بہرحال مصنف کو بہت سی داد۔ پروفیسر عاصم بخاری بھی ایک افسانچے ''قطرہ قطرہ'' کے ساتھ جلوہ افروز ہیں اور اس میں وہ ایک مثبت انداز کا سماجی سبق سکھا رہے ہیں۔ خط کا اختتام کرنے سے پہلے میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ اس شمارے میں مختلف کتابوں پر میرے آٹھ تبصرے آپ نے شائع کیے اور ان میں سے کچھ صاحبانِ کتب نے مجھے باقاعدہ ''فیڈ بیک'' بھی دیا جس سے ''تخلیق'' کے وسیع حلقے کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب اپنے ایک دیرینہ دوست کو میں نے خود فون کر کے پوچھا کہ یار آپ نے اپنی کتاب پر میرا تبصرہ پڑھا ہے تو موصوف کا جواب تھا کہ ''تخلیق آیا تو تھا مگر کہیں کتابوں میں گم ہو گیا ہے اب تلاش کر کے دیکھوں گا۔ ہائے رے بے نیازی۔ اور ہاں ان تبصروں کی ایک سزا مجھے آپ سے بھی ملی ہے جسے میں اس لیے خوش ہو کر قبول کر رہا ہوں (قصے کی کیمسٹری والا مضمون جو پڑھ چکا ہوں) کہ اس شمارے میں بھی میری کوئی غزل شائع نہ کر کے آپ نے مسلسل تین شماروں میں میری غزل شامل نہ کر کے مجھے ''عدم اشاعت غزل'' کی ہیٹ ٹرک مکمل کرنے کا موقع دیا ہے۔ غزلیں شائع نہ ہونے کی پیش گوئی میں نے اپنے دسمبر 2022ء کے شمارے میں شائع ہونے والے خط میں ہی کر دی تھی۔ ویسے تو غزل شائع نہ ہونے کا کوئی افسوس نہیں لیکن گذشتہ دونوں شماروں کے لیے غیر مطبوعہ غزلیں بھیجنے کے بعد آپ سے جب فون پر بات ہوئی تو آپ نے کنفرم بھی کیا تھا کہ جی، غزلیں مل گئی ہیں۔ اب اگر ملی ہیں اور شائع نہیں ہوئیں تو ظاہر ہے کہ شاعری کے اربابِ بست و کشاد نے انہیں غیر معیاری سمجھا ہوگا، اسی لیے میں اس خط کے ساتھ بھی کوئی غزل روانہ نہیں کر رہا۔ سلامت رہیں

نسیم سحر (راولپنڈی)

---

(5) عزیز محترم سونان اظہر، سدا سلامت رہیں! دسمبر کا ''تخلیق'' دل کے قریب ہے جاذبِ نظر ٹائٹل سے مزین ملا۔ اس مرتبہ ''اپنی بات'' میں آپ نے کئی موضوعات زیر بحث لائے تاہم تخلیق ایوارڈ کی خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ حنیف باوا کی تخلیق ایوارڈ 2022 کی نامزدگی بڑی خوش آئند ہے۔ کمیٹی نے اچھا اور اصابت فیصلہ کیا ہے۔ انہیں فون پر مبارک پیش کر دی گئی ہے۔ جہاں تک بیٹی کی شادی کے اظہارِ تشکر میں راقم کے خصوصی ذکر کا تعلق ہے تو میرے خیال میں آپ کے والد محترم اور آپ سے تخلیق کی محبت کا تقاضا تھا کہ ہم آپ کی خوشی میں شامل ہوتے۔ بحیثیت ایک سابقہ منتظم شادی ہال اگر میں یہ کہوں کہ ''ماشاءاللہ آپ کی دختر نیک اختر کی شادی کے پُرمسرت موقع پر آپ کے چاہنے والے باذوق لوگوں کا اکٹھ دیکھ کر نہ صرف بڑی خوشی ہوئی بلکہ اس تقریب کے شاندار انتظام و انصرام اور عمدہ طعام بھی آپ کے اعلیٰ ذوق کے آئینہ دار

تھے۔ تو شاید یہ بات بے جا نہ ہو۔ دعا ہے کہ رب کریم جوڑی کو خوشیوں اور مسرتوں بھری خوشگوار زندگی سے نوازے۔ آمین۔ میرے لیے اس تقریب میں جناب خواجہ محمد زکریا، منشا یاد قیصر، ڈاکٹر محمد ایوب ندیم، غلام حسین ساجد، اظفر کیلی اور آفتاب خان ایسی کئی محترم ہستیوں سے ملاقات بھی ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ اس مرتبہ مجلس یک پرداز کے تخلیق پر بڑے بھرپور تبصرے پہلے ہی نظر سے گزر چکے ہیں لہٰذا میں اختصار کے ساتھ چند ہی تحریروں پر رائے دوں گا۔ "گوشہ اظہر جاوید" میں ان کی کتاب "ہاں ہی وہ ہو گی" یہ ماسوائے راقم کے بڑے دید ادیب کے مضمون پڑھنے کو ملے اور سبھی لکھاریوں نے اظہر جاوید صاحب اور حنیف باوا کے فنی محاسن کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ علی بن مرتقی تو ویسے خاص تحریر تھی۔ مضامین بھی معلوماتی تھے۔ اسی طرح سبھی افسانے بھی پڑھنے کے لائق تھے مگر "خواب کی کھڑکی سے جھانکتی لڑکی" اور "عشق تجلیاں خاکر دیں" کی کہانیوں نے خوب رنگ جمایا۔ موسیقی کی مد میں لکھے دونوں مضامین چوٹی کی لکھاریوں کے تھے اور واقعی دونوں تحریریں بڑی معلوماتی تھیں۔ تجزیوں میں محترم آصف ثاقب کا "پسندیدہ شعر" میں کئی من پسند شعر پڑھنے کو ملے۔ ڈاکٹر عافر شہزاد نے ناول "رات کا سیاہ خون" کا بڑا زبردست تعارف نامہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے "پہلے نام کی موت" اور "تعمیر کے تخلیق" کے بڑے خوبصورت تجزیے لکھے ہیں۔ جناب نسیم سحر کے تبصرہ کتب قاری کو مطالعے کی مہمیز لگاتے ہیں۔ حمد، نعت، نظم و غزل میں شعراء کے اچھوتے خیالات سے خوب حظ اٹھایا۔ کئی اشعار پسند آئے مگر وعدہ اختصار آڑے آ رہا ہے۔ انجمن خیال کے تقریباً 22 خطوط میں گزشتہ شمارے پر بھرپور آراء پڑھنے کو ملیں۔ ان میں سے محمد طارق علی، قیصر تمکین، مسعود صدیقی رضی، نسیم سحر، خالد عبداللہ، ونس، تسنیم کوثر، ایم جبران، نصرت یاسمین، فوزیہ تاج، تصور اقبال، اور شازیہ باب کے تفصیلی خطوط حق تنقید ادا کرتے نظر آئے۔ دعاؤں کے ساتھ اجازت!

ایم ڈی ملک (راولپنڈی)

(6) معزز سونان اظہر صاحب! کچھ دن پہلے آپ کا غائبانہ تعارف ہوا اور "تخلیق" کے حوالے سے ایک قریبی جاننے والے کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ ان کی رائے میں یہ موجودہ دور کا بہترین ادبی رسالہ ہے جس میں بہترین لکھاری اور شعراء کی کاوشیں شامل ہوتی ہیں اور سونان اظہر صاحب شبانہ روز محنت سے اس کے معیار کو نہ صرف برقرار رکھے ہوئے ہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بہتری لانے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ اس تعارف کے بعد میں نے آپ سے رابطہ کیا اور "تخلیق" کے قوانین و ضوابط پر گفتگو ہوئی تو اس کے معیار پر میرا بھروسہ مزید بڑھ گیا۔ دسمبر 2022 کا شمارہ اپنے خوبصورت تخلیقی سرورق کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے جسے پڑھتے ہوئے سب سے زیادہ خوش کن احساس یہ ہوا کہ یہ رسالہ پاکستان کے علاوہ یو ایس اے اور انڈیا میں بھی شائع ہو رہا ہے جو اس کی کامیابی اور معیار کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ بانی مدیر جناب اظہر جاوید صاحب اس حوالے سے ایک خوش قسمت انسان ٹھہرے کہ ان کے بعد بھی یہ رسالہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دنیائے ادب میں اپنی پہچان بنائے ہوئے ہے۔ "پہلی بات" نے بہت دیر اپنی گرفت میں رکھا اور اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا کہ ادب شناس لوگ کم ہیں لیکن جو ہیں وہ دل و جان سے نہ صرف ادب سے وابستہ ہیں بلکہ اس کی ترویج و ترقی کے لیے بھی ہمہ وقت کوشاں ہیں۔ ایسے ہی کچھ مضامین سے "پہلی بات" میں شناسائی ہوئی اور دل کی ڈھارس بندھی کہ ادب لاوارث نہیں ہے۔

حمد و نعت کے ایمان افروز سلسلے نے دل خوش کر دیا۔ محترم اختر شمار کی وفات پر دل پہلے ہی اداس تھا مگر ان کے حوالے سے خواجہ محمد زکریا، سرفراز سید، حسین مجروح، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اور ڈاکٹر ایوب ندیم کے لکھے گئے مضامین نے بہت شدت سے نقصان کا احساس دلایا جو ان کی رحلت سے دنیائے ادب کو ہوا۔ یقیناً یہ خلا کبھی پر نہیں ہو سکے گا۔ "اظہر جاوید ابدی دید ہو گئی" نے میری معلومات میں اضافہ کیا کہ اظہر جاوید صاحب پنجابی افسانہ نگار بھی تھے اور مجھے حیرت ہوئی کہ میں اس بات سے بے خبر کیسے رہ گئی۔ مضامین میں ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون "یہودی مسئلے کا تجزیہ"، ڈاکٹر طاہرہ اقبال کا "اردو ادب میں عورت کا کردار" اور ڈاکٹر عاقر شہزادکا "کیوں اب واقعی شاعری کریں گے" نہایت بہترین اور دلچسپ ہیں۔ شجاعت علی راہی کے مضمون "اردو ادب کی ترقی اور زبان کا شکارہ" اپنی نوعیت کا ایک منفرد مضمون ہے۔ مختلف ادیبوں کے چیدہ چیدہ خطے ایک الگ دنیا کی خبر لاتے ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "وہ سانچے ہی ٹوٹ گئے جن میں آشفتہ مزاج کردار ڈھلتے تھے"۔ ادارے کے مشاورتی جنّش نے معیار پر سمجھوتے کے بغیر اور "تخلیق" کے ساتھ اپنا مخلصانہ تعلق نبھاتے ہوئے اچھے معیاری کلیس شامل کیں۔ شعری دنیا اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ آباد ہے جس میں کئی نامور شعراء کا کلام پڑھنے کو ملا۔ واجد میر، غلام حسین ساجد اور قمر رضا شہزاد کی غزلیں بھرپور تازگی اور جدت کے ساتھ منفرد ہیں۔

افسانوں میں نجمہ عثمان کا افسانہ "اللہ مغفرت کرے"، انجم رضوی کا "احساس کی قربان گاہ" اور فائزہ سعید کا "وطن" اچھے لگے جو نہ صرف احساس میں گندھے ہوئے ہیں بلکہ عمومی رویوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ "انجمن خیال" ایک بہترین سلسلہ ہے جس میں شائع ہونے والے خطوط کافی دلچسپ ہیں۔ میری ناقص رائے کے مطابق یہ انداز بھی صرف تخلیق کے حصے میں آتا ہے کہ ایک اہم توڑتی روایت کو سانس مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے خطوط کو نہ صرف جگہ دی ہے بلکہ تنقیدی اور تعریفی خطوط یکساں طور پر شامل کئے ہیں۔ آخر میں آپ سمیت دیگر رفیقان ادب کے لئے ڈھیروں دعائیں۔

شازیہ رباب (ملتان)

﴿7﴾ پیارے سونان اظہر جی جگ جگ جیو تے سدا خوش رہو۔ تے میری دعا اے جو "تخلیق" نوں جیویں پیو اُہدے نال چلاؤندے آرہے او اوسے طراں چلاؤندے رہوو۔ "تخلیق" دا ایہہ گھن چھاواں تے سنجیا ہویا جیہڑا اک ایک وڈے ادیب، شاعر، کھوج کار تے کہانی کار جناب اظہر جاوید ہوراں لایا سی اوہنوں تساں اپنی پوری لگن، پیار تے محنت نال سنجیا اے۔ اللہ کرے ایہہ بوٹا اک لمی عمر تائیں لہلہاوے۔

اج توں "تخلیق" چ چھپیاں ایہہ ساریاں لکھتاں اپنے اپنے ڈھنگ تے فنی تجربے نال رنگیاں ہویاں ہوندیاں نیں۔ ایتھے ایہہ لکھاریاں دیاں بھرویاں سوچاں واضح ہوندیاں نیں، اوہ تھاں "تخلیق" چ آکے ہور نکھر کے ساڈے ساہمنے آجاندیاں نیں۔ میں سمجھنی آں جو ایہہ سارا کمال جناب سونان اظہر دی مکمل بصیرت دا اے۔ "تخلیق" دے پچھلے کئی پچھلے شمارے اٹھ کے ویکھو تے شمارے چ جنہاں مہان ساہت کاراں نیں جناب اظہر جاوید ہوراں دیاں پنجابی کہانیاں اُتے "بڑی دیر ہو گئی" دے اردو ترجمے "بہت دیر ہو گئی" بارے اپنے سوہنے تے ڈونگھے وچاراں دا اپنے مضموناں اچ اظہار کیتا اے۔ میں سمجھنی آں لکھتاں نیں میں ٹھاٹے توں کیڑی توں اران دا

اے۔ اتے میں نوں اپنے اک اپنے گھر دے وچ پتھر چوں کڈھ کے چانن وچ لے آندا اے۔ ایتھوں نہایت ای مان نال آکھ سکدی آں کہ لکھاریاں دے نال کجھ ایڈ دے ہین۔ محترم ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب، محترمہ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ صاحبہ، محترم آصف ثاقب صاحب، محترم فرحت عباس شاہ جی، محترم ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم جی، محترم ایم۔ اے۔ ملک جی اتے محترم آفتاب خان جی۔ ایہہ سارے وڈے لکھاری اپنے اپنے ادبی کھیتر اچ اپنی الگ پچھان رکھدے نیں۔ ایہناں دی ایس پچھان بارے لکھنا میرے جیہے نمانے لکھاری دی وس دی گل نہیں۔ کیوں جو میں سمجھدی آں جو میرا قلم ایہناں اگے جوایاں وڈیاں ہستیاں دے صدقے ڈگیاں لائق ایناں جوں کجھ لکھدے سوچ کڈھ دیا وے۔ میں ایہناں وڈے لوکاں دا دل دی ڈونگھیائی نال شکریہ ادا کرنا چاہنی آں جنہاں میرے جہے نویں دی حوصلہ افزائی کر کے میرا مان ودھایا۔ میں دوبارا جناب ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب دا شکریہ ادا کرنا چاہنی آں جو اک تے اوہناں دا ادبی قد کاٹھ بہت وڈا اے دوجے ایہناں نیں سب توں پہلاں میں ایہہ خوش خبری دتی سی جو ایس ورھے یعنی 2022 دا تخلیق ایوارڈ میرے حصے چ آیا اے۔ دوجے مہان لکھاری محترم ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ہوراں دا ذکر کرنا ضروری سمجھدی آں جو ایہناں میری اک کتاب "بہت دیر ہوگئی" دا دیباچہ تحریر کر کے ایس کتاب نوں وڈملی کتاب بنا دتا اے۔ دوجا ایہناں "تخلیق" دے تازہ شمارے اک ہور مضمون لکھ کے میرا مان ودھایا۔ ایتھے میں محترم آصف ثاقب ہوراں نوں دوبارا یاد کرنا ضروری سمجھدی ہاں جو اک تے اردو ادب دے اوچے استھان تے بیٹھے ہوئے نیں دوجے ایہناں دی لمی حیاتی دا بہت وڈا حصہ ادب دی خدمت کردیاں گزریا تے اجے وی کم کر رہے نیں۔

حنیف باوا (جھنگ)

٭٭ عزیزم سونان اظہر! آپ نے "تخلیق" دیتی وصول کیا کرتم نے نہ تکلف ایوارڈ لینے کی دعوت دی تھی۔ "تخلیق" کے دفتر میں اس شام خوب رونقیں اتری ہوئی تھیں۔ دھند آلود موسم میں گرما گرم مچھلی، معدے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے خصوصاً ساگ۔ دوستوں کی باتیں، فردوس نازی مرحوم کی، ممتاز راشد کی گفتگو اور منشا قاضی صاحب کے موتیوں جیسے اچھے لفظوں کی ادائیگی نے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ ڈاکٹر تبسم بھی ناسازی طبع کے باوجود شریک گفتگو رہے اور پریس کلب کے نئے عہدیدار رضا صاحب اپنی مسکراہٹ سے محفل میں رونق لگاتے رہے۔ پھر ایک چھوٹی سی محفل مشاعرہ برپا کی اور اس کی صدارت مجھے سونپ دی۔ ممتاز راشد بہتر شاعر ہیں بصد اصرار انہوں نے یہ ذمہ داری میرے کاندھوں پہ ڈال دی۔ یہ ان کا بڑا پن ہے۔ پھر تمہاری محبت اور دوستوں کی شفقت نے محفل کو بہت جاندار بنا دیا۔ تبادلہ کتب ہوا اپنا سفرنامہ میں نے بھی پیش کیا۔ اس شام بہت سی محبتیں سمیٹے واپسی ہوئی۔ اب آتے ہیں "تخلیق" کی طرف —— جس کے ہر صفحے پر قاری کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ حمد و نعت سے لے کر معروضات، بہترین افسانے، تبصرے، اور جاندار تحریر کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور پھر ان سب سے بڑھ کر انجمن خیال جہاں "تخلیق" کے قاری اپنی آراء پیش کرتے ہیں اور تمہاری لگن اور محنت کو سراہتے ہیں۔ سونان تمہاری اپنی بات ہمیشہ کی طرح حساسیت سے جھلکتی ہوئی، دکھ میں بھیگی ہوئی اور تلخ حقیقتوں کی ترجمانی کرتی ہوئی۔ اگلے صفحے پر "تخلیق ایوارڈ یافتہ 2022ء حنیف باوا" کا تعارف پڑھا۔ حنیف باوا کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں مگر محترم ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے اس تعارف میں ان کی علمی، ادبی شخصیت کے بہت سے در وا کر دیے ہیں۔ حنیف باوا صاحب کو "تخلیق" کے توسط سے "تخلیق ایوارڈ" کے لیے نامزد ہونے پر

مبارک باد۔

گوشۂ اظہر جاوید لکھنے والوں کی محبتوں سے روشن ہے۔ نامور ادبی شخصیات نے اظہر صاحب سے اپنی محبت بھری خوبصورت تحریروں سے اس گوشے کو سجا رکھا ہے۔ بھی مضمون قابلِ تعریف ہیں کہ لکھنے والوں نے لکھا بھی تو خاص الخاص ہستی کے لئے ہے۔ رب کریم اظہر صاحب کے درجات بلند فرمائے۔ آمین! گوشۂ خاص میں خاور نعیم ہاشمی کی شگفتہ بیانی زوروں پہ ہے بھرپور انگی گوشہ میں ہماری سب کی پیاری بشریٰ رحمن اپنی "تاکّو" کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ رب ان کی مغفرت کرے۔ آمین! موسیقی میں ڈاکٹر امجد پرویز ایک نامور گلوکار کا تفصیلی تعارف پیش کر رہے ہیں۔ منیر حسین کے مقبول گانوں نے ہم اہلِ زبان گھروں میں بھی پنجابی فلموں اور گانوں کا اشتیاق بڑھا دیا تھا۔ منیر حسین کا گانا "ذرا ٹھہر جا یار دا نظارہ لین دے" اب بھی یادوں میں سنائی دیتا ہے۔ پنجابی فلموں اور گانوں کی للک تو ہمیں اب تک ہے۔ پرویز کلیم صاحب نے "رنگ عشقے دا" کے پریمیئر شو میں ہم لکھنے والوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ وہاں فلمی اور ادبی دنیا کے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ کئی لوگوں سے تم نے بھی ہمیں ملوایا۔ فلم دیکھتے ہوئے ہمیں اپنا پرانا زمانہ یاد آ گیا۔ اداکار رونق کو دیکھا تو ان کی مقبول ترین فلم "انورا" یاد آ گئی۔ 70-80 کا دور ایسا تھا اور ہم "انورا" کے گانے "مُنّی دے بلوری اکھ والیا" سُن کے فلم دیکھنے کی رٹ لگائے ہوئے تھے۔ ہم سب لڑکیوں کی ضد پہ فلم کا پروگرام بن جاتا تھا تانگے میں سوار جب ہم سینما ابکاڑ و پہنچے تو فلم شروع ہو چکی تھی۔ ہم جس شوق سے فلم دیکھنے آئے تھے آتی ہی بے دلی سے فلم دیکھی گر دل کو یہ ملال رہا کہ ہم ابتدائی منظر کیوں نہ دیکھ پائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وی سی آر، کیبل، یو ٹیوب اور نیٹ فلیکس کا طوفان نہیں آیا تھا کہ فلم روک لیتے، دوبارہ دیکھ لیتے لہٰذا افسوس تمام گئی اور فلم دوبارہ دیکھی گئی ہائے کیا دور تھا! جب سینما میں فلم دیکھنا زندگی کا لازمی جزو ہوا کرتا تھا۔ مہمانوں کی خاطر داری میں فلم دیکھنا بھی شامل کیا جاتا تھا۔ اب تو گھر ہی سینما بن گئے ہیں مگر وہ لطف نہیں ہے جو پوری کمسوئی کے ساتھ سینما ہال میں فلم دیکھنے میں آیا کرتا تھا۔

اس وی سی آر، کیبل اور سوشل میڈیا نے لوگوں کو گھروں تک محدود کر دیا ہے لیکن ہم جیسے دیوانوں کا سینما میں جا کر فلم دیکھنے کا شوق اب بھی قائم ہے۔ پرویز کلیم صاحب کا شکریہ ہمیں "رنگ عشقے دا" دکھا دیا۔ بہت مہربان نفیس شخصیت ہیں پرویز کلیم۔ ان کی کہانیوں کی کتاب "رنگ" میں انہوں نے بہت سے خوبصورت رنگ بکھیرے ہیں۔ پرویز کلیم کی فلم "رنگ عشقے دا" کے ڈائیلاگ بہت عمدہ ہیں۔ اس فلم میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے بھرپور جوہر دکھائے ہیں اور فلم بینوں نے بہ عمدہ ڈائیلاگ پہ کھل کے پرویز کلیم کو داد دی ہے۔ میری دعا ہے کہ پرویز کلیم کی "رنگ عشقے دا" خوب پھلے پھولے، اچھا بزنس کرے۔ آمین! ڈاکٹر جواز جعفری نے اس شمارے میں ہمیں جدہ سے بجنے والے سازوں کی مفصل داستان سنائی ہے۔ نظمیں غزلیں بھی خوب ہیں۔ تسنیم سحر نے آٹھ کتابوں پر تبصرے کئے ہیں اور بڑے بھرپور انداز میں کئے ہیں۔ ان کا قلم ماشاءاللہ خوب رواں ہے۔ افسانے بھی پڑھ لئے ہیں۔ تجزیوں تک ابھی نہیں پہنچ سکی البتہ ڈاکٹر محسن مگھیانہ نے "بعض" کی قسمیں بتا کے ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ بعض کی ہر قسم نے مسکراہٹیں بکھیر دیں اور خوب محظوظ کیا۔ گوپی چند نارنگ کا تفصیلی انٹرویو بھی خاصے کی چیز ہے۔ نثار احمد صدیقی نے بہت سلیقے سے انہیں کریدا اور انٹرویو کو جاندار بنا دیا ہے۔ پنجاب رنگ بہت ہی مختصر ہے۔ تم

نے بھی اس کے بارے میں اظہار کیا تھا تو اب کے ایک پنجابی کہانی تخلیق کے لئے لکھی ہے۔ ایک مضمون محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے حوالے سے بھی بھیج چکی ہوں۔ ''تخلیق'' دسمبر میں اپنے سفرنامے کی تشہیری سطور کے لئے ممنون ہوں۔ انجمن خیال میں بھی موجود ہوں۔

تسنیم کوثر (لاہور)

---

9) محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

کوئی پوچھے تو پھر گلے ہیں بہت   لطف بھی سہہ لیے گئے ہیں بہت

احمد ہمدانی

ماہنامہ ''تخلیق'' کا شمارہ دسمبر 2022ء موصول ہوا۔ صد حیف 2022ء کا شمارہ الفاظ سے عاری تھا۔ ایسا لگا ہے صرف کمپوزنگ کو مدِنظر رکھا گیا۔ پروف کا باقی کام قارئین پر چھوڑ دیا گیا حالانکہ ادبی نگارشات واقعی اوج پر تھیں۔ اب دیکھتے ہیں 2023ء کا شمارہ کیا رنگ لائے گا۔ ''گوشۂ اظہر جاوید'' کی تحریریں دل کو چھو گئیں۔ تمام مضامین ''تخلیق'' کا نہ بکنے والا اثاثہ ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی، سحر انصاری، نصرت بخاری، افشاں تسنیم قابلِ ستائش لوگ ہیں۔ افسانوں میں برف کے پیچھے دبی آگ، دکھتی رگ، تعلق، خوبصورت انتخاب ہے۔ موسیقی پر ڈاکٹر امجد پرویز کی تحریر قسط نمبر 1 ''ضمیر حسین ایک سریلا گلوکار'' ان کی دن رات کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ تار سے بجنے والے سازوں کی معلومات ڈاکٹر جواد جعفری کی تحریر، موسیقی کے شوقین کے لئے گراں قدر اضافہ ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا پرانا انٹرویو شائع کر کے آپ نے ادب کے قاری کو ادبی غذا فراہم کی ہے۔ حصہ غزلیات میں غزلیں جدید اور قدیم روایات کا خوبصورت سنگم ہے۔ نسیم سحر کے کتابوں پر تبصرے بہت خوب رہے۔ نسیم سحر شاعر ہیں ادیب ہیں، باریک بینی میں کمال حاصل ہے۔ واقعی انہوں نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ لکھا ہے خلوص اور محنت کے ساتھ۔ اللہ کرے حسنِ قلم اور زیادہ۔ محترم سونان اظہر جاوید اپنے والد مرحوم کے پودے کو خزاں اور آندھیوں سے بچا کر رکھنا۔

ماجد وفا عابدی (گوجر خان)

---

10) محترم سونان اظہر جاوید! ''تخلیق'' دسمبر 2022ء بدستِ ڈاک باصرہ نواز ہوا۔ سرورق کی انفرادیت پر مبارک قبول فرمائیں۔ اداریہ سے پتہ چلا کہ آپ بیٹی کی رخصتی کے فرض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری بیٹی کو نئے گھر کی بھی مسرتیں نصیب فرمائے۔ انہی سطور میں آپ کے دفتر کے ساتھ والے برسوں پرانے آپ کے بھائیوں جیسے چوہدری میاں شعیب اور نامور ناول نگار سالار ہاشمی کی رحلت کی خبروں نے آزردہ کر دیا۔ اللہ رب العزت ان کی روحوں کو آسودہ رکھے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اداریے ہی سے پنجابی کے نامور کہانی کار اور مترجم حنیف باوا کو اگلا سالانہ ''تخلیق ایوارڈ'' ملنے کی نوید بھی ملی۔ دل سے نکلی آواز یہی ابھری ع حق بحقدار رسید۔۔۔ اگلے صفحات پر حنیف باوا کے کوائفی تعارف نے ان سے اور بھی قربت بڑھا دی۔ ڈاکٹر غافر شہزاد کا مضمون ''شاعروں، ادیبوں کی اولاد کس حال میں ہے؟'' عمدہ مضمون تھا مگر بہت باریک فونٹ میں تھا۔ ہو سکے تو اگلے کسی شمارے میں ان سے یہ مضمون اپ ڈیٹ کرا کے

دراصوتی کیفیات میں دہرا دیں۔ محمد وقت کے صفحے پر سید ریاض الدین بگلار بخاری اور ڈاکٹر فرحت عباس کی تخلیقات روح کو معطر کر گئیں۔ محترم اظہر جاوید مرحوم کے پنجابی افسانوں کے اردو تراجم پر مشتمل کتاب ''بہت دیر ہو گئی'' پر آصف ثاقب کا مضمون بہت پُر مغز تھا بلکہ ''گوشۂ اظہر جاوید'' کی باقی تحریریں بھی لاجواب تھیں۔ خاور نعیم ہاشمی نے پی ٹی وی اور ان کی والدہ ادا کارہ نور جہاں کے بارے میں عمدہ یادنگاری پیش کی ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز موسیقی کی دنیا کا انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ اس بار انھوں نے سریلے گلوکار منیر حسین کی یادیں دہرائی ہیں۔ منیر حسین ایک بار قطر آئے تو ان کو روبرو دیکھنے کا موقع ملا اور جب کی آزادانہ گلوکاری نے ان کا مزید تعارف بھی کرایا۔ ڈاکٹر جواز جعفری کے مضمون میں ''تار'' سے بجنے والے سازوں کی داستان پڑھی تو گہرائی اور گیرائی کے نئے زاویے سامنے آئے۔ اشرف رحمٰن مرحوم کے ناول ''جاگو'' کی پانچویں قسط بھی نتیجے سے بھرپور رہی۔ آنجہانی گوپی چند نارنگ کے پرانے انٹرویو سے ادبیات و لسانیات کے کئی پہلو دیکھنے کو ملے۔ ڈاکٹر محسن مگھیانہ کے مزاحیہ مضمون ''بطن'' نے خوب محظوظ کیا۔ تبصرۂ کتب کے صفحات بھی سیراب کر گئے اور ''انجمن خیال'' کے مکتوبات بھی۔ دیگر مضامین ابھی نہیں پڑھے۔ شاعری کے بھی کچھ صفحات ہی ابھی دیکھ سکا ہوں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی گرانقدر تحفہ ہی ثابت ہوا۔ آپ نے میری ایک غزل بھی اس شمارے میں دی، آپ کا دلی شکریہ۔ بھی احباب ''تخلیق'' کے لیے نیک تمنائیں!

ممتاز راشد لاہوری (لاہور)

---

۱۱ ۔۔ محترم جناب سونان اظہر صاحب! ماہنامہ ''تخلیق'' سلامتی کے ساتھ ملا ہے۔ لذت مطالعہ میں اضافہ کا باعث ہے۔ تمام مشمولات اپنے اپنے رنگ ڈھنگ میں نہایت اعلیٰ ہیں اور اظہر جاوید کے معاملات سے مشہور ہیں۔ محترم آصف ثاقب نے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مضمون میں محمد رفیع کا گانا بھی سمو دیا ہے لیکن اس بارے میں جناب ایم۔ ڈی ملک صاحب کا مضمون پوری کتاب کا احاطہ کرتا ہے۔ تمام تحریروں پر نظر ڈالی گئی ہے اور بہت کچھ یاد دلایا ہے۔ ایم۔ ڈی ملک صاحب نے بڑی محنت سے پوری کتاب ''بہت دیر ہو گئی'' کا مطالعہ کر لیا ہے اور اس پر ایک پُر لطف ''ریویو'' لکھ کر قارئین کی نذر کر دیا ہے۔ جناب عالی! یہ پُر لطف تحریر پڑھ لینے کے بعد اصل کتاب ''بڑی دیر ہو گئی'' کو دیکھنے اور پڑھنے کی تمنا غالب آ رہی ہے۔ دوسرا مضمون ''درباری کلچر'' جس مقصد کے لئے لکھا گیا ہے وہ مقصد ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے درباروں کا ماحول سازشی بیان کیا گیا ہے۔ دربار تو سب دنیا کے ملکوں میں ایسے ہی ہوا کرتے تھے تاہم اب ڈاکٹر صاحب کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ پاکستان میں اگرچہ شاہی خاندان تو نہیں رہے مگر ''درباری کلچر'' یعنی مسلمان بادشاہوں کا سازشی کلچر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے جو پسند کی چیز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر سحر انصاری صاحب نے اپنے مختصر مضمون ''اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ'' میں مہ لقا بائی چندا کا خوبصورت تعارف پیش کیا ہے۔ مہ لقا بائی چندا کا کلام ان کے عقائد، محسوسات اور جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور ان کے کلام میں ایک عورت کے سچے جذبات اکثر و بیشتر بیان ہوتے تھے۔ یہ مضمون اپنی ادبی علامات کے ساتھ بہت دلچسپ اور خاص پسند کی چیز ہے۔ آغا علی رضا کا مضمون ''انتقادِ فسانۂ عجائب'' بھرپور علمی شواہد سے مرتب کیا گیا ہے۔ افشاں نسیم کا ''ابنِ صفی ایک عہد ساز شخصیت'' بھی بہت خوب ہے۔ اس میں ابن صفی کا شاندار تعارف ایک بہترین پیش کش ہے۔ کل ہی خبر پڑھی تھی کہ امجد اسلام امجد قضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے اور جنت الفردوس

میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ جاتے جاتے وہ خود فرما گئے ہیں

میلے میں زندگانی کے تنہا ہے جو بھی ہم ــــــ اس میں دکھائی دوں بھی تو ہوتا تو میں نہیں (امجد اسلام امجد)

لیکن آصف ثاقب صاحب کا کہنا ہے:

گھر چھوڑ کے جاؤ تو جائیں گے ہم کہاں ــــــ ثاقب جہاں میں اور ہزارہ نہیں کوئی (آصف ثاقب)

آخر میں محترم حنیف باوا کو 11 واں تخلیق ایوارڈ ملنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ زندگی میں ایسے ایوارڈ کا حصول بڑی کامیابی اور لذت آفرینی سے عبارت ہے۔ انہیں زندگی اور ترقی مبارک ہو۔

خالد عبداللہ ویمس (راولپنڈی)

﴿12﴾ محترم جناب سونان اظہر صاحب! امید ہے کہ آپ اہل خانہ، اہل ادب و احباب بالکل خیریت سے ہوں گے۔ پہلے تو استاد ناواقف طالب علم کو کہا کرتے تھے "تمہارے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے" یا "تم بھوسا بھرا ہوا" تاثر انہیں تھا جتنا اب تقریباً ہر ایک کے دماغ میں پیسہ بھرا ہوا ہے اور معاشرے کی بہت سی بیماریوں کی یہی جڑ ہے۔ یہ بات ہمیں دسمبر 22ء کے 'تخلیق' کے سرورق کو دیکھ کر یاد آئی جس میں کسی نے بھوسہ بھر کے مارا تو وہاں سے سکے نکلے۔ ویسے خدانخواستہ کسی غریب آدمی نے یہ ناٹک دیکھا یا اور سر پر ہتھوڑا مار بیٹھا تو اندر سے پیسہ تو نہیں بھیجا نکلے گا اور اس کا قصور وار وہ اس "ناٹک کے مصور" کو ٹھہرائے گا۔ (اگر وہ زندہ رہا) حسب معمول تخلیق کا اس بار کا ہر گوشہ بھرپور تھا۔ طنز و مزاح میں ماہیر کی "بچنی" کو جگہ دینے کا شکریہ اور ہماری دونوں کی کتاب "ہنسی کیا" پر نسیم سحر کا سیر حاصل تبصرہ شائع کرنے پر ممنون ہوں کہ یہ مہربانی پہلے دوست آفتاب احمد صاحب بھی کر چکے ہیں۔ سرگودھا خانقاہ میں ہمارے دوست ڈاکٹر اکرام الطاف جو عزیز ناظم ہیڈ کمال کے ایم ایس بھی ہیں کی شاعری کی دوسری کتاب 'جان شوریدہ' کی رونمائی پر بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ خاص طور پر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم سے 'تخلیق'، آپ اور اظہر جاوید کے حوالے سے بات چیت رہی۔ اس اسٹیج نے اپنے صدارتی خطبے میں خاص طور پر ڈاکٹر وزیر آغا، اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید کو یاد کیا۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی محبتوں کا شکریہ کہ جھنگ کے ذکر کے ساتھ ہم جیسوں کا نام ضرور لیتے ہیں۔ ہماری افسانچوں کی کتاب حال ہی میں شائع ہو کر آئی ہے اس میں 152 افسانچے ہیں جو مختلف معاشرتی موضوعات پر ہیں۔ اس کی "پیدائش" سے ہی لوگوں نے اسے پسند کرنا شروع کر دیا ہے۔ سو آپ کے لئے بھی حاضر ہے۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

﴿13﴾ ماہنامہ 'تخلیق' کا تازہ شمارہ ملا تو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا کیونکہ میرے پاس ماہنامہ 'تخلیق' کا یہ پہلا شمارہ موصول ہوا۔ حسب حال جیسے ہی فہرست پر نظر پڑی تو کئی نامور شخصیات کے نام دیکھنے کو ملے جنہوں نے ادب کی خدمت کے لئے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ یقیناً یہ اعلیٰ مقام رکھنے والی شخصیات ماہنامہ 'تخلیق' اور ہماری ادبی دنیا کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر فرحت عباس،

بشریٰ رحمٰن، احسن عباس رضا کے نام سرفہرست تھے۔ ماہنامہ "تخلیق" کا پہلا حصہ "سرائیکی توشہ" میں ناول "ساگھ" پڑھا جس میں انتظار کی کیفیت کو خوب صورت عکاسی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ حصہ "طنز و مزاح" میں ڈاکٹر محسن کی تخلیق "جعلی" نے تو صرف ہی کر دیا۔ سلیم شہزاد کی نظم نے تو دل ہی جیت لیے۔ نظم بہت پسند آئی۔ افسانہ اردو ادب میں ایک حسین نثر صنف ہے جو کہ قارئین ہمیشہ افسانے کے دل دادہ ہوتے ہیں۔ افسانہ دورِ جدید میں بہت جدیدیت سے لکھا اور پڑھا جا رہا ہے۔ مجھے پڑھ کر بہت پسند آئے۔ افسانہ "نقش" "مختیارین اور شخف کے پیچھے ولی" "آگ جیسے دل" افسانے پڑھنے کو ملے۔ ماہنامہ "تخلیق" کا ہر شمارہ ادبی قدر آنے کی اہمیت رکھتا ہے۔ میرے خیال میں ہر فرد کو ماہنامہ "تخلیق" کو مطالعے میں شامل کرنا چاہیے۔ اللہ پاک اس ادبی خدمت کو مزید بلند اقبالی عطا فرمائے۔ آمین!

فاریہ علی سیال (کراچی)

﴿14﴾ برادرِ مکرم سونان اظہر! "تخلیق" کا مسلسل دل شاد کرتا ہے۔ آپ اور آپ کے معاونین قلمی و انتظامی لائق تحسین ہیں۔ اداریہ (شمارہ مارچ 2022ء) گوشہ بشریٰ رحمٰن کے ساتھ ملا کر پڑھا۔ آپ نے درد دل سے جو باتیں لکھیں وہ دل پر نقش ہو گئیں۔ رفتارِ زمانہ اس قدر سریع ہے کہ اب بقول آپ کے قریبی دوستوں کو یاد کرنے کی فرصت نہیں۔ ایسے میں گوشہ بھرپور سجا اور کئی مقامات پر گوشہ ہائے جنت نظم کر گیا۔ قرۃ العین طاہرہ، نیلما ناہید درانی، ہارون الرشید تبسم اور آپ کے مضامین میں مرحومہ کے فن اور شخصیت کو بھرپور اجاگر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب ندیم کا مضمون پڑھ کر وہ تصویر آنکھوں میں آ گئی جو "تخلیق" کی سالانہ تقریب میں بنی تھی اور جس میں بشریٰ رحمٰن، ایوب ندیم اور خاکسار ایک فریم میں یک جا ہیں۔ "شمورا ناہید کی نوٹ بک" از ڈاکٹر انور سدید ان کے اپنے مخصوص زاویے سے لکھا گیا خوب صورت مضمون ہے۔ کیول دھیر (وہ شیریں دہن، دل دار قلم کار جس سے ملاقاتیں دل کو تازہ و روشن رکھتی ہیں) اور عذرا اصغر نے دلچسپ و دلربا پیرائے میں اظہر جاوید صاحب کو یاد کیا ہے۔ شجاعت علی راہی کا مضمون بھی دلچسپی سے پڑھا۔ یہ ایک ایسا زاویہ ہے کہ اشیائے خورد و نوش کا ادب میں سراغ لگایا جائے۔ مختصر مکتوب میں سب تحریروں پر بات مشکل ہے تاہم اتنا کہوں گا کہ اس شمارے کی غزلیں، نظمیں بہتر ہیں۔ ہاں تسنیم کوثر کی یادنگاری بعنوان "محبت کے تین کونے" امرتا، ساحر اور امروز کی حیثیت پر بے حد خوشی سے روشنی ڈالتا ہے۔ لطف لے لے کر پڑھا۔ آپ کی ہمہ وقت ہمت کو سلام۔

شہزاد نیر (لاہور)

﴿15﴾ "تخلیق" اب محتاجِ تعارف نہیں رہا ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ہم جس قلم کار سے ملنے جاتے ہیں وہاں آس پاس پڑا ہوا "تخلیق" کا کوئی شمارہ بھی ضرور دکھائی دیتا ہے۔ اس شہادت سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آ جاتی ہیں کہ عزیزم سونان جاوید کی غیر مترقبہ جاں فشانی اب اس منزل پر ہے جہاں ان کے سر پر دستارِ فضیلت باندھنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری بات ان کی قلم کاری خاص حد تک سزاوار تحسین ہو چکی ہے۔ پیشِ نظر شمارے سے قبل بھی ہم ستمبر 2021ء کے شمارے میں معروف افسانہ نگار رشید امجد کے گوشے میں شامل مضامین پر تبصرہ آرائی کر چکے ہیں لیکن ناسازیٔ طبیعت کے باعث پورے شمارے پر ہم خیال آرائی کرنے سے قاصر رہے۔ موجودہ شمارہ اس شمارے کی توسیع ہے چناں چہ اب ہم اللہ کے فضل و کرم سے تندرست و عافیت ہیں اور ستمبر 2022ء کے شمارے پر تبصرہ آرائی کا شرف حاصل کرنے کی سعی کر

رہے ہیں۔ اس شمارے کا آغاز دعائیہ حمد سے کیا گیا ہے جو اشرف ذکی اعوان کی تخلیق ہے۔ جو بیشک اللہ کی ذاتِ باری پر خوبصورت خیالات سے مزین ہے۔ اس کے بعد صفدر صدیق رضی اور نسیم سحر کی نعتیں شاملِ اشاعت ہیں جن کو سرکارِ ستودہ صفات کی شان میں نعت گوئی میں اضافے کے طور پر شمار نہ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی۔

خواجہ محمد زکریا کی فصیح و بلیغ تحریریں تخلیق کے ادبی معیار کو دوچند کرنے کا موجب ہیں۔ دورِ حاضر میں موصوف ہمارے پسندیدہ تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے مرحوم اظہر شمار کو صبحِ اظہر سے موسوم کیا ہے۔ ہم ان کی اس رائے پر صاد کرتے ہیں۔ (اپنے مضمون میں بارِ دگر خواجہ صاحب کا ذکر اپنی روح کی بالیدگی کی خاطر کیا ہے)۔ شمارے میں "تخلیق" کے بانی اور ہمارے یارِ جانی اظہر جاوید کے حوالے سے تین مضامین زیورِ اشاعت سے آراستہ ہیں۔ پہلا مضمون "اظہر جاوید ابھی دیر نہیں ہوئی" کے عنوان سے سپردِ قلم کیا گیا ہے جو ڈاکٹر محمد زکریا کی تخلیق ہے۔ اس تخلیق کا خاص وصف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اظہر صاحب کی شخصیت کا نہ صرف نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے بلکہ ان حالات و واقعات سے بھی آگاہی بخشی ہے جو شاید کبھی منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں۔ ان تمام اوصاف کے بین السطور ڈاکٹر صاحب کی صداقت بیانی اور اظہر جاوید کی ذات و شخصیت سے محبت کے جذبات کا احساس ہوتا ہے۔ اظہر جاوید کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں ان کی افسانہ نگاری بھی ایک روشن پہلو کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے اس پہلو پر ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحبہ نے پنجابی کے ایک بڑے کہانی کار حنیف باوا کے پنجابی میں لکھے ہوئے افسانوں کا "بہت دیر ہوگئی" کے عنوان سے ترجمے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ترجمہ کو حقیقت کا رنگ دے دیا ہے اور ایسا کرنا ان جیسی ممتاز انشاپرداز ہی کرسکتی تھی۔

محمود شام نہ صرف ایک بڑے صحافی ہیں بلکہ ایک بڑے انسان بھی ہیں۔ ان کی حب الوطنی ایک سیر حاصل تجزیہ کاری کے متقاضی ہے۔ فی زمانہ ان جیسے متنوع اسلوبِ تحریر کے حامل کم کم نظر آتے ہیں۔ آج کل وہ ایک رسالہ بھی شائع کر رہے ہیں جو پاکستانیت کا نظریۂ احسن پرچار کر رہا ہے۔ مضامین میں خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر ناظر شہزاد، شجاعت علی راہی وغیرہ کے مضامین بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ انور ندیم علوی نے صابر ظفر کو "سہلِ ممتنع" کا بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ ہم ان کی رائے پر صاد کرتے ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ حنیف باوا پنجابی کے ایک بڑے مصنف ہیں۔ انہوں نے پچھتاوے کی انجانی کے عنوان سے گوربخش سنگھ کے ایک افسانے کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ خاقان ساجد نے ایک نہایت خوبصورت افسانہ "شجرہ" کے عنوان سے تحریر کیا ہے جو آثارِ قدیمہ کے اعتبار سے ایک نادر تحریر ہے۔ ہزاروں سال پہلے کی تہذیب و معاشرت کا جائزہ لینا ایک کارِ دشوار ہے جس کا تجزیہ افسانہ نگار نے اس انداز سے کیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اسی دور میں محسوس کرنے لگے۔ ہزاروں سال قبل کی عمارات، مندر، گردوارے وغیرہ وغیرہ کا انہوں نے بہت خوبصورتی سے تجزیہ پیش کیا ہے اور آخر میں پختون قبائل میں جاری رہنے والی رنجش اور انتقامی جذبات کی عکاسی کی ہے۔ محمد طارق علی کا افسانہ "دبے پاؤں" بھی قابلِ ذکر ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے تبسم حجازی کی تحریر بطور محقق ایک اچھی تحریر ہے۔ پرویز کلیم نے شہرۂ آفاق اداکار دلیپ کمار (یوسف خان) پر یادنگاری کا ایک موثر نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے ہر لفظ سے دلیپ کمار سے ان کی محبت عیاں ہوتی ہے۔ ایسے بڑے لوگوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ایک اچھی روایت ہے۔

قیصر نجفی (کراچی)

●●●

ماھنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ نیرنگِ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی ایڈیٹر: محمود شام 0300-8210636	سہ ماہی ادبِ لطیف لاہور مدیر: مظہر سلیم مجوکہ 0333-4377794
سہ ماہی ادبی ڈائجسٹ کراچی مدیر: ضیاء الرحمن ضیا 0300-2211187	سہ ماہی بک ڈائجسٹ لاہور مدیر: مظہر سلیم مجوکہ 0333-4377794	سہ ماہی ارژنگ لاہور مدیر: عامر بن علی 0300-4489310
ماہنامہ حکایت لاہور مدیر: طارق محمود 0323-4329344	ماہنامہ الحمراء لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8430043

ماھنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	اُڑیا ہے	ڈاکٹر محسن مگھیانہ	0333-6732291	نگری پبلشرز	400/-
2	جہاں آئینہ تھا	انور زاہدہ علوی	0344-7448084	زر لفظ پبلی کیشنز	500/-
3	مال رنگ	شگفتہ یاسمین خان	034-62673113	سانجھ پبلی کیشنز	660/-
4	جمال کتب	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0345-8626076	مثال پبلی کیشنز	800/-
5	رہ نوردِ شوق	نسیم سحر	0333-5415091	دنیائے اردو پبلی کیشنز	—
6	راز قفس	مریم عرفان	0334-4299740	ادبستان پبلی کیشنز	500/-
7	ادھوری آرزو	آصف عمران	0345-8488505	بک ہوم	700/-
8	ماحاصل	اسلام عظمی	0321-4044197	عظمی پبلی کیشنز	—
9	اعتبار	ڈاکٹر عزیز تابور	03405301179	دستاویز	600/-
10	زبان زدِ عام	ڈاکٹر زاہد منیر	0300-6073071	مجلس بک فاؤنڈیشن	200/-
11	پاکستانی ادب کے معمار	ڈاکٹر سعادت سعید	0333-4667134	اکادمی ادبیات	300/-
12	چاند کی کہانیاں	محمود احمد قاضی	0301-6479439	حسن قلم	400/-
13	جانِ شعور	ڈاکٹر فرزانہ الطاف	0300-6669817	اکادمی فیصل آباد	1000/-
14	متفرقات	ڈاکٹر زاہد منیر	0300-6073071	مکتبہ اسالیب سرگودھا	500/-

نوٹ: ادارہ "تخلیق" اپنی تمام پالیسیاں تخلیقی معیار کی باہمی رضامندی سے مرتب کرتا ہے۔ ادارے کو بھجوائی تبصرے کے لئے دو کتابیں ارسال کریں۔ کسی بھی وصول ہونے والی ایک کتاب پر ادارہ تبصرہ نہیں کر سکتا۔ کوئی مصنف / شاعر یا ادارہ سے تبصرہ نگار سے تبصرہ کروا کر ادارے کو بھیجے گا تو وہ قابلِ قبول نہ ہوگا۔ ادارہ خود تبصرہ کرواتا ہے۔ (ادارہ تخلیق)

ماہنامہ تخلیق کی 11ویں سالانہ تقریب 2022

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE
MARCH 2023

CamScanner

"ماہنامہ تخلیق" کی ادبی سرگرمیوں کی تصویری جھلکیاں

[illegible]

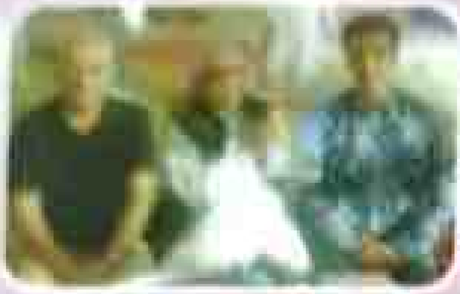

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

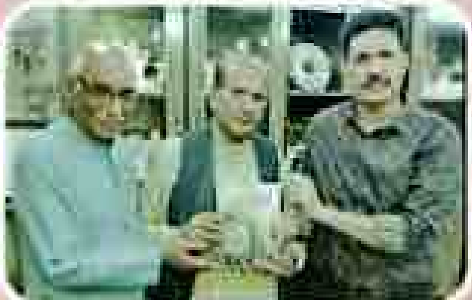

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

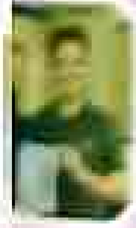

[illegible]

مسلسل اشاعت کا 55 واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 55 — ستمبر 2023ء — شمارہ : 3 — CPL نمبر 96

قیمت : -/500 روپے ——— 2,500 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)
(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر ——— ہندوستان کے لیے 3,500 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)
ماہنامہ "تخلیق" بینک اکاؤنٹ نمبر : 434-777-202 یو بی ایل واحدت روڈ لاہور، برانچ کوڈ 1236

ماہنامہ "تخلیق" ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر : 0323-9526505
موبائل فون: 0321-8899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

تنویر جہاں (امریکہ) ——— ڈاکٹر فوقیہ مشتاق (امریکہ) ——— نارنگ ساقی (انڈیا) ——— جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 رفروری 2012ء کو اپنی جان — جانِ آفریں کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو "تخلیق" پیہم رواں رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "معریٰ"، "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (ان شاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

55 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ "تخلیق" کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر "تخلیق" کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کے مضامین کے انتخاب کے لیے "تخلیق پینل" تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں "تخلیق" کے امور کی ذمہ داری محترمہ نفیس جہاں، ڈاکٹر فوقیہ مشتاق، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف -/3,500 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Opposite (Toyota Cantt Motor), Main Chowk, Walton Road, Lahore-Cantt. (04237187500 - 04236671007)

U.S.A.	U.K.	INDIA	PAKISTAN
[illegible]	[illegible]	K.L. Narang Saqi	Javed Manzoor
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	Delhi-110001, India	[illegible] Road, Lahore
C.A. USA	[illegible]	Ph: [illegible]	Ph: [illegible]
Ph: [illegible]	Ph: [illegible]	Email: [illegible]	Cell: [illegible]
Email: [illegible]	Email: [illegible]		Email: [illegible]
[illegible]			

○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

ترتیب

پہلی بات	سونان اظہر جاوید	5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ	ڈاکٹر زاہد منیر	7
حمد باری تعالیٰ	نسیم سحر	
حمد باری تعالیٰ	ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ)	
نعت رسول مقبولؐ	سید ریاض حسین زیدی	7

مضامین

خانہ بدوش بچے	ڈاکٹر مبارک علی	8
ظفر اقبال کالم نگاری کی حیثیت سے	ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ	11
اردو میں ایک نئے شاعر کی آمد	فرحت عباس شاہ	15
پروفیسر گوپی چند نارنگ — مشاہیر	کملی سروش (انڈیا)	20
تحریک فکر اسلامی فی الہند	ظفر سیال	29
صبح دوام ادب — محمود شام	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	39
صنف تذکرہ اور ادب	شجاعت علی راہی	43
فیض اور حقیقی تخلص	شہباز انور خان	47
احمد فیاض	انور ندیم علوی	50
عدم کے کلام میں تلمیحات	خالد عبداللہ قاضی	52
ابلیس	وزیر بخت قاضی	55

گوشۂ خاص

عاشق اور گیر — اظہر جاوید	ڈاکٹر عبدالکریم خالد	58
اظہر جاوید اور سرگودھا	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	63

منظومات

بہت مصروف ہو شاید	گلزار بخاری	74
میں تمہیں دیکھتا ہوں	افتخار بخاری	
نظم	صفدر صدیق رضی	
یوم آزادی پر	شاہین عباس	
ہمارے اشفاق احمد خان	شہباز انور خان	
سوچ کے سائے	انور ندیم علوی	
خیر کم ہے	شائستہ مفتی	
اے پیاری شاعرہ	ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ)	
مداخلت	اشفاق احمد	
محبت	انجم فراز	76

افسانے

دروازہ	محمود احمد قاضی	77
کیا نام دیا جائے	حنیف باوا	79
جھوٹا ہوا کتا	ڈاکٹر حسن منظر	81
کاسہ	صوفیہ بیدار	82
بھوک میں بچے	محمد اعظم	87
نیاز	ڈاکٹر عبداللہ	89
امیر خان اور بخت گور	اقبال فیروز	90
گشت زار محبت	نورین طاہر	93

غزلیں

انجم انصاری، انجم کوثر، محمود شام، انور شعور، قمر انصاری، ڈاکٹر عاصف ثاقب، خالد اقبال یاسر، صفدر صدیق رضی، ڈاکٹر ابو بکر، مسلم تبسم، عامر بیگ، افتخار جاوید، فرحت عباس شاہ، تبسم احمد، طاہر اقبال، بیدار سرمدی، احمد علی، شاہین عباس، حسن عباسی، حکیم جبران، قیوم احسان بٹ، ڈاکٹر افتخار احمد بخاری، ظفر محمود ... 99–100

یادیں

شہر کی چاندنی یادیں — طارق اصغر — 107

سرائیکی گوشہ

بول "تانگا" — بشریٰ رحمٰن — 111

سفرنامہ

سفرنامہ تھائی لینڈ — ڈاکٹر محمد شفیق خان — 117

انشائیہ

قربانی — عمر اد خان — 121

پنجاب رنگ

ناچ — حنیف باوا — 123

دوہے — محمد عباس مرزا

پنجابی دوہے — ممتاز راشد لاہوری — 123

جائزے

نصیر پہ نصیر: ابوالعجم عامر — ڈاکٹر اشفاق احمد ورک — 125

کتاب "رشید تبسم" — ڈاکٹر مسعود ریاست عکس — 129

آدھا آسمان — عابد شمیم (ابن عطایا) — 134

تبصرے ڈاکٹر شبیر احمد قادری کے

تغیری — خالد اقبال یاسر — 137

پنجتن دی گل — تحریر قیصر (مترجم: خالد حماد لوائی)

حقیقت نامہ — ڈاکٹر بدر منیر

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی — مرتب: ممتاز عاطف

باتیں گجری — شہریار احمد خاں — 143

انجمن خیال

آصف ثاقب، محمد طارق علی، کیپٹن عمر، ڈاکٹر بدر منیر، حنیف صدیق رحمی، خاور اعجاز، شہزاد انور خان، بیدار سرمدی، حسن عباسی، تسلیم اکرام، عمر خان، شاہین عباس، ممتاز راشد لاہوری، ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی، محمد اقبال صمصام، شبیر احمد قادری، شاہد بیباب، انور ندیم علوی، نورین عامر، رضا قرآن ساجد — 144–159

تخلیق کو موصول رسائل و کتب

ملکی اور غیر ملکی — 160

بانی مدیر "تخلیق" 1969-2012

سرورق

اسد قاسمی

طابع: بیدار سرمدی

مطبع: محسن پرنٹرز گلشن راوی، لاہور

دفتر "تخلیق"

H. No. E-12, Sheraz Villas, Phase-I,
Mian Chowk, Madina Colony, Walton Road,
Lahore -Cantt.

0321-8899007, 042-37187500

E-mail : ajavedtakhleeq@gmail.com

(ایڈیٹنگ کے حقوق محفوظ ہیں)

○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

پہلی بات

مجھ جیسے طالب علم کے لیے ہر بار اپنے احساسات کو سپردِ قرطاس کرنا مشکل تر ہوتا ہے۔ ہر بار یہ سوچتا ہوں کہ جو کہنا چاہتا ہوں اس کا اظہار موثر انداز میں پیش بھی کر پاتا ہوں یا نہیں۔ ہر بار ایک کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے مگر یہ احساس تقویت بخشتا ہے کہ ''تخلیق'' کو میری ادارت میں شائع ہوتے ہوئے 13 سال مکمل ہو گئے اور ''تخلیق'' نے الحمدللہ اپنے سفر کی مسلسل اشاعت کے 54 سال بھی مکمل کر لئے ہیں اگر یہ ادبی پرچہ بلاناغہ مراحل طے کرنے کا سہرا ہے۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ میں نے کبھی کوئی احسان نہیں کیا۔ ''تخلیق'' جب تک زندہ ہے میرے والد کا نام زندہ ہے اور ''تخلیق'' کا اجرا بھی آپ ہی نے کیا تھا یہ 42 سال تک والد محترم کی زندگی میں آباد رہا۔ آج بھی بیرون ممالک اور اندرون ملک سے آنے والے دانشور اور ادیب پہلی فرصت میں ''تخلیق'' اجرا سے کوئی وقت نکال کر چلے آتے ہیں۔ ان 54 برسوں میں نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کے بڑے بڑے ادبی جرائد بھی بند ہو گئے مگر ''تخلیق'' کی مسلسل اشاعت کا سہرا ان تمام احباب کے سر جاتا ہے جو اندرون و بیرون ملک اپنی محبتوں کے دامن میں سے ''تخلیق'' کو ہر جگہ لیے پھرتے ہیں اور ادب کی دنیا میں نئے قاری سے اسے متعارف کرواتے ہیں اور باقاعدہ مطالعہ کرتے ہوئے ایک تصویر ہو کر تخلیق ادب کے پیار کی رحمت بھی بنا تے ہیں۔ بیرون ملک محترم [illegible] مشتاق نہ صرف ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں بلکہ ''تخلیق'' کے خریداروں میں بھی مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح اندرون ملک میں محترم جاوید منظور، محترم خالد محمود نے ذاتی کاوشوں سے اشتہارات کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ اس سفر میں نوید اللہ تبسم صاحب، آزاد تبسم اور عاصم طوطی نے راولپنڈی میں ذمہ داری اٹھائی کہ وہ ہر دفعہ پانچ پرچے منگوا کر دوستوں میں اعزازی طور پر تقسیم کرتے ہیں اس کے علاوہ لاتعداد بیشتر لکھاری ہیں کہ خود سالانہ خریدار بننا اپنا فرض سمجھا جس کی طویل فہرست ہے۔ قلمی تعاون میں بہت سے دوست پیش پیش رہتے ہیں۔ خصوصاً یہاں محترم ہارون الرشید تبسم کے قلمی تعاون کو ادارہ بہت قدر کی نظر سے دیکھتا ہے جو ہر وقت خود بھی رابطے میں رہتے ہیں اور پرچے کی ضرورت کے مطابق تحریریں بھیجتے رہتے ہیں۔ شاید یہی وہ محبت بھرا پہلو ہے جس نے ''تخلیق'' کو اپنے قدموں پر کھڑا کیا ورنہ ادبی رسائل کے خریدار اور ان کے لئے اشتہارات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اپنے وقت کے اچھے اور معیاری رسائل بھی اپنے قاری اور قلمکاروں کے باوجود اشتہارات اور خریداروں سے محروم رہے اور آخرکار بند ہو گئے۔ آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ اچھے خاصے خوش حال ادیب شاعر بھی مفت پرچہ لینا فخر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کا اعلیٰ ذہن کی تصدیق اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انھیں تمام کتابیں، جرائد، اخبارات مفت ان کے پتے پر وصول ہوتے رہیں جنہیں شاید وہ کھول کر پڑھنے کی زحمت بھی نہ کرتے ہوں اور جس کتاب یا جریدے کو وہ کھول کر پڑھ بھی لیں تو یہ اس کتاب یا جریدے کے مصنف اور مدیر پر ان کا ''احسانِ عظیم'' ہوتا ہے۔ یہ سوچ انفرادی طور پر ہمیں تبدیل کرنا ہوگی۔ بیشتر معزز لکھاریوں کو میں جانتا ہوں جو اپنی تحریروں میں اخلاقیات کا درس دیتے نہیں تھکتے مگر خود یہ زحمت بھی نہیں کرتے کہ اگر پرچہ وقت پر مل جائے تو اس کی اطلاع بذریعہ فون ہی دے دیں بلکہ اس سے بھی آگے کی ایک بات یہ ہے کہ اگر گھر کا پتہ تبدیل ہو جائے تو کسی ادارہ کو گھر کا نیا پتہ تک بتانا بھی ضروری تصور نہیں کرتے۔ پھر کئی ماہ پرچہ مسلسل پرانے پتے پر جانے کے بعد اچانک سامنا ہونے پر شکایت کی صورت میں ایک اعتراض کرتے ہیں کہ پرچہ کافی عرصہ سے نہیں وصول ہو رہا۔ یہاں اس امر کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ اب کی بار ادارہ ''تخلیق'' نے تمام پرچوں کو بھجوانے کا انتظام بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک کر دیا ہے۔ کوئی پرچہ اگر متعلقہ پتہ پر وصول نہ ہوا تو اس کو واپس ادارہ ''تخلیق'' بھجوانا محکمہ ڈاک کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ایک اور ضروری امر جس کی وضاحت یہاں انتہائی ضروری ہے کہ کچھ لکھاری پرچے کی رکنیت لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کی تحریروں کو شامل کرنا پرچے کے مدیر پر فرض ہے۔ سالانہ رکنیت لینے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس ممبر کو ادارہ پورا سال ''تخلیق'' اس کے مستقل پتے پر بھیجنے کا پابند ہے۔ تحریروں کی شمولیت کا طریقہ کار واضح ہے۔ مدیر جس لکھاری کی تحریر کو معیاری سمجھتا ہے اس کو ادارہ شامل کرتا ہے مگر یہاں ضروری امر یہ ہے کہ پانچ سے سات اشعار کی غزل، مختصر نظم اور مختصر افسانہ ادارہ ''تخلیق'' کو بھجوایا جائے۔ الفاظ کی دولت کو بے جا الفاظ سے استعمال کریں۔ ہمیں یہاں وہ وقت یاد آتا ہے جب جناب اظہر جاوید شاعری کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہمیشہ سات اشعار کی غزل کہتے۔ نظم اور

افسانہ بھی مختصر سمجھتے۔ "تخلیق" نے ادب اور ادیب دونوں کو سربلند کرنے کے لئے غیر مطبوعہ مواد قبول کرنے کی شرط عائد کر رکھی ہے۔ ادبی رسائل انگلیوں کی تعداد میں رہ گئے ہیں یہ انھیں لوگوں کو متاثر ضرور کرتا ہے اور اس میں مطبوعہ مضمون قارئین کو کھٹکتا ہے۔ ادارہ پہلے بھی ایسے کتنے لکھاریوں کا "تخلیق" میں بائیکاٹ کر چکا ہے۔ "تخلیق" کو بھجوانے والی تحریر شائع ہونے پر ادارے سے پوچھ کر کسی اور ادبی جریدے کو بھجوائی جائے۔ "تخلیق" قلمی معاونین کی دیانت پر ہمیشہ اعتبار کرتا ہے۔ تحریر بھجواتے وقت اس پر غیر مطبوعہ ضرور لکھیں۔ ایک سوال جو مجھے تکلیف پہنچاتا ہے کہ نئے لکھنے والے لکھاری کدھر کا رخ کریں؟ یہ سوال غور طلب ہے۔ اگر ہم انھیں "تخلیق" میں نرم ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں تا کہ ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور ان کی تحریروں میں نکھار آ سکے۔ زیادہ تر ادارہ "تخلیق" صرف ان کے لئے یہ تجویز کرتا ہے کہ ان کی منظومات اور غزلوں میں بہتری پیدا کرتے ہیں مگر چند سینئر لکھاری "تخلیق" کے شاعری اور منظومات کے شعبہ کو وقت تنقید بناتے ہیں۔ اب آپ بتائیں اگر لکھنے والی نئی نسل کو ہم مواقع نہیں دیتے یا ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تو نوجوان لکھاریوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ "تخلیق" ایک ادبی درس گاہ ہے۔ آج کا لکھاری کل کا کلاسیک ثابت ہوگا۔ چند سال پہلے تک "تخلیق" سے لکھنے کا آغاز کرنے والے بیشتر لکھاریوں کی ادبی حیثیت کو کوئی مستند لکھاری تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ آپ بتائیں ہم نے لکھنے والوں کو کون سے پلیٹ فارم دیں؟ "تخلیق" سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کرنے والوں کے چند نام یہاں بتانا ضروری ہیں کہ آخر انھوں نے اسی "تخلیق" کے پلیٹ فارم سے آغاز کیا اور اپنے زور قلم کی طاقت کو تمام ادبی حلقوں میں منوایا۔ ڈاکٹر اختر شمار، نیلم احمد بشیر، تسلیم کوثر، تسلیم منظور، ایم اے راحت، افتخار مجاز، اعزاز احمد آذر، الطاف شاہد، اعجاز تحریمی، ریحان اظہر، عابد بٹ، زمان کنجاہی، عاشق [illegible]، سیما پیروز، [illegible]، اشفاق نقوی، اے بی جوش، احمد رضی، نسیم ولی الرحمٰن، [illegible]، شہزاد احمد، عبدالکریم خالد، نوید محمود اور دیگر شامل ہیں۔ انھیں خود پرستی اور ادبی شہرت کے سحر کو توڑنے کے بجائے نئے لکھاریوں پر تنقید کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

اب تو ادب میں "کچھ لو اور کچھ دو" کی رسم تو عام ہو چکی ہے کہ ہم سب [illegible] سوچ کو پوچھتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے لکھاری ہیں انھوں نے پچھلے کئی سالوں میں جانے والے مشاہیر ڈاکٹر انور سدید، شفیع عقیل، احمد عبدالحق، منیر نیازی، افتخار مجاز، اعزاز احمد آذر، حامد سراج، پروفیسر جمیل آذر، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، نجم الحسن رضوی، اظہر جاوید، جمیل الدین عالی، زرین کاظمی، [illegible]، رشیدہ عیاں، تحسین حسن جاوید، ملک مقبول احمد، اعجاز حسین، عبداللہ حسین، شہزاد احمد، احمد حسین عابدی، امین راحت چغتائی، [illegible] اشفاق احمد [illegible] بھی ان مرحومین کے فن و شخصیت پر مضامین لکھے۔ یہ سب ان ادیبوں کی فہرست ہے جو 2012ء سے 2023ء تک میری آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اب ایک کمرشل [illegible] کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ "کچھ دو اور کچھ لو" کی پالیسی نے معروف اور غیر معروف ادیب کے امتیاز کو ختم کر دیا ہے۔ غیر معروف لوگ مستند اور معروف ادبی شخصیات پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے اپنی کتابوں کے تبصرے شامل اشاعت کرانے کے لیے سفارشیں کراتے نظر آتے ہیں۔ ہر طرف تبصروں کی بھرمار ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس کتاب کا کیا معیار ہے ہر کوئی [illegible] مصنف کی کتاب پر تبصرہ لکھنے کے لئے بے چین ہے۔ اب کتاب کے معیار کو کم تعلقات اور [illegible] خوب صورتی کو زیادہ اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ کوئی ادبی ادارہ [illegible] ان بے ربط لکھاریوں کی تحریروں کو شائع ہونے سے روکنے کو تیار نہیں۔ گروپ بندی، ذاتی مفادات نے ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ میں پوچھوں گا [illegible] اصل لکھاریوں کو ان کا مقام کون دلائے گا؟ انسانی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کو کسی پل چین نہیں وہ ہر وقت تبدیلی کا منتظر رہتا ہے۔ [illegible] پر اعتراض ہوتا ہے جو اس کے حق میں نہ ہو یا پھر اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔ مجھے بھی اس پل تک سکون نہیں جب تک ادب کے لئے علم بلند نہ کروں۔ پہلے [illegible] لیکن اب میں مزاج آشنا ہو گیا ہوں۔ اب اعتراضات کو [illegible] کی عادت اپنائی ہے مگر اپنے اداریوں میں بار بار ادب کے ان اداروں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ پہلے ہی سیاست دانوں نے ملک کو بے توقیر کیا ہے۔ ادیبوں نے ادب کو [illegible] ایوارڈز کی [illegible] نے اداروں کی حرمت لیر لیر کر دی۔ اب صرف فوج ایک ادارہ بچا ہے جو نظم و ضبط اور اصولوں پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان اور اس کے ادارے کو قائم رکھے جس پر ملک کی سالمیت قائم ہے۔

رب راکھا!

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

حمد و نعت

حمد

کہیں پیڑوں پہ ہے مسکان، تیری دین مولا
دلوں کو جو ہے اطمینان، تیری دین مولا

یہ کیسی الجھنیں ہیں اسرارِ سربستہ سے پہلے
شعور و آگہی اور وجدان، تیری دین مولا

عبادت ہو تری یا تیرے بندوں سے محبت
مری بخشش کے یہ سامان، تیری دین مولا

ادھر سے بھی تو بن سکتے تھے اس دل کا مقدر
جو ہوں میں صاحبِ ایمان، تیری دین مولا

طلب کرتی ہے جب تری ہوئی مٹی نمو کی
رواں ہے ابر اور باراں، تیری دین مولا

کہیں رستے میں ہو جاتی ہے جب دیوار حائل
جو کھلتا ہے وہ امکان، تیری دین مولا

کیا ہے مجھ کو مخلوقات میں جو تو نے افضل
مرا یہ فخر اور یہ مان، تیری دین مولا

ڈاکٹر بدر منیر

OOO

حمد نما

بہ صدق دیکھ کے میری مجھے محمود کرے
وہی نماز ہے، جو بھی مرا معبود کرے
دل کو یہ تاب کہاں، شعور بے سود کرے
مرے ماتھے کو وہ جتنا غبار آلود کرے
اس کی مرضی ہے بلا کو بھی بلا میں بدلے
پست کو نیست کرے، بود کو نابود کرے
کاش محبوبؐ کا دیدار کرائے وہ مجھے
میری قسمت میں کوئی ساعتِ مسعود کرے
جب بھی چاہے وہ موجود کو اوجھل کر دے
کبھی موجود نہ ہو جو اسے موجود کرے
میری محدود سی ہستی میں بھلا کیسے خدا
مجھ پہ وا فلسفۂ شاہد و مشہود کرے

نسیم سحر

OOO

حمدیہ نظم

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے
ہاتھوں سے سب کچھ چھوٹ گیا ہو
آس کی ڈوری ٹوٹ گئی ہو
دل کی دنیا ڈوب گئی ہو
لیکن پھر لگتے ہی لگتے
اس کی رحمت آ جاتی ہے
کشتی پار اتر جاتی ہے

ڈاکٹر فوقیہ مشتاق (امریکہ)

OOO

نعت

آپؐ نے رکھی جہاں میں رہبری کی آبرو
تھی سارے انبیا میں برتری کی آبرو

پیکرِ انسانیت کی ہیں ادائیں تابناک
آپؐ کا حسنِ عمل ہے بندگی کی آبرو

جیسے مرنے کی اور آہ، راہیں کھل گئیں
گمرہوں کو مل گئی ہے راستی کی آبرو

آپؐ آئے تو ہجوم بے اثر ہے دم بخود
آپؐ کے آنے سے بچی تازگی کی آبرو

مسئلہ کوئی نہیں ابہام میں رکھا گیا
آپؐ نے رکھی شعور و آگہی کی آبرو

بے زبانوں کو ملا ہے آپؐ سے اذنِ کلام
ایک امّی نے کے تو نے ان کہی کی آبرو

آپؐ کا لطف و کرم ہو گا تو ہو گی سرخرو
ہر ندامت، آنکھ میں چھلکی نمی کی آبرو

آپؐ ہی کے نور سے ہے ضوفشاں سارا جہاں
آپؐ ہی کے نور سے ہے روشنی کی آبرو

ہے تمنا یہ اسی فکر میں ہو بسر اب زندگی
مدحتِ خیر الورا ہے شاعری کی آبرو

اب ریاضؔ نعت گوئی ہی رہے گا تا ابد
آپؐ نے رکھی ہماری سرخوشی کی آبرو

سید ریاض حسین زیدی

OOO

مضامین

خانہ بدوش کلچر

ڈاکٹر مبارک علی

کلچر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جو اپنے ماحول اور حالات کے تحت تشکیل پاتی ہیں۔ قبائل اور برادریاں جو بڑی بڑی تہذیبوں سے کٹ کر علیحدہ ہو جاتی ہیں وہ اپنے محدود دائرے میں ضرورتوں کے تحت رسم و رواج کی پابندی کرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔ شکار اور شکار کے عہد کے بعد جب کچھ قبائل نے زراعت اختیار کرتے ہوئے آبادیاں بسائیں اور مستقل رہائش اختیار کر لی لیکن ایسے بہت سے قبائل تھے جنہوں نے خانہ بدوشی کی زندگی کو ترک نہیں کیا۔ انہوں نے نہ تو آبادیوں میں رہنا پسند کیا اور نہ ہی اپنا خانہ بدوشی کا کلچر چھوڑ کر خود کو بڑی تہذیبوں میں ضم کیا اس وجہ سے ان میں اور آبادیوں میں رہنے والوں میں ہمیشہ سے کلچر اور تہذیب کے درمیان تصادم رہا۔ آباد ہونے والے قبائل نے ان خانہ بدوشوں کو باربیرین کہا۔ لیکن ان کے بارے میں آرا بدلتی رہی ہیں۔ ابتداء میں باربیرین کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا یہ سخت جنگجو اور خوفناک لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان میں اور مہذب لوگوں میں فرق ہے۔ مہذب قوموں کے مقابلے میں ان کا کلچر کم تر اور پست ہے۔ جب قوموں نے بڑے مذاہب کو اختیار کیا جن میں عیسائیت اور اسلام قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں انہیں Pagan کہہ کر تہذیب سے خارج کر دیا۔ لیکن 17ویں صدی میں جب روشن خیالی کا دور آیا تو ان خانہ بدوش لوگوں کے بارے میں دانش وروں کی رومانوی آراء قائم ہوئیں اور انہیں SavageNobal (یعنی شریف وحشی) کہا جانے لگا۔

تاریخ میں ایک تو وہ خانہ بدوش لوگ ہیں جو چین، وسطی ایشیا، خراسان اور کوہ قاف تک پھیلے ہوئے تھے۔ دوسرے وہ قبائل تھے جو فرانس، اٹلی، سپین اور جرمنی میں بکھرے ہوئے تھے۔ یہ قبائل بڑی سلطنتوں کے لئے خطرے کا باعث ہوتے تھے، کیونکہ یہ بڑی سلطنتوں کی سرحدوں پر لوٹ مار اور قتل و غارت کرتے تھے۔ اس لئے جب ہندوستان میں موریہ سلطنت قائم ہوئی تو چندر گپت کے مشیر کوٹلیا نے اسے مشورہ دیا کہ ہر صورت میں چاہے دھوکہ ہو یا فریب ان قبائل کو جو سلطنتوں میں شامل نہیں ہیں انہیں اپنی حکومت کا حصہ بنائے۔ رومی سلطنت میں بھی مسلسل جرمن قبائل گال، کیلٹ اور وینڈز سے جنگیں لڑیں تاکہ ان کی آزادی ختم کر کے ان کو سلطنت میں شامل کیا جائے۔ چین کے ہان خاندان نے ژین نو اور دوسرے قبائل کے حملوں کو روکنے کے لئے تین طریقوں کو استعمال کیا۔ دیوار چین کو مکمل کرایا تاکہ ان کے حملوں کو روکا جا سکے۔ ان کے ساتھ جنگیں لڑیں اور آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ چونکہ جنگوں کے اخراجات بہت ہوتے ہیں، اس لئے انہیں تحفے تحائف دے کر اور شاہی خاندان کی شہزادیوں سے شادیاں کر کے دوست بنایا جائے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود چین اور خانہ بدوش قبائل کے تعلقات میں مصلحت نہیں ہو سکی۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خانہ بدوش قبائل کیوں اپنی آزادی پر قائم رہے اور اپنے کلچر کی بنیاد پر طاقتور اور جارح بنے

رہے۔ ان قبائل نے جس کلچر کو فروغ دیا ایک تو مسلسل ان کا سفر کرنا ہے جو ان کو متحرک رکھتا تھا۔ نئی چراگاہوں کی تلاش تجربے کے بارے میں نئے نئے تجربات ہوتے تھے۔ ان کے قبیلے کی تعداد بھی محدود ہوتی تھی اور یہ زیادہ بچے پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ زراعت کے بجائے یہ مویشی پالتے تھے۔ ان ہی قبائل نے سب سے پہلے گھوڑے کو سدھایا تھا اور بعد میں انہوں نے گھوڑے کی باگ اور زین ایجاد کی تھی۔ اسی وجہ سے یہ گھوڑے سواری میں ماہر ہو گئے تھے۔ گھوڑ سواری کے ساتھ ساتھ انہوں نے مہلک تیر کمان بھی ایجاد کئے تھے اور گھوڑے کی پشت پر رہتے ہوئے دشمن پر تیروں کی بارش کرتے تھے۔ یہ گھوڑے کا گوشت بھی کھاتے تھے اور گھوڑی کے دودھ کی بنی شراب بھی پیتے تھے جو کومش کہلاتی تھی۔ ان کی عورتیں بھی ان کے ساتھ نہ صرف جنگ میں شریک ہوتی تھیں، بلکہ سفر کرنے کے لئے گاڑیوں میں سامان بھی لادتی تھیں۔ انہیں قبائل نے آگے چل کر رتھ کی ایجاد کی تھی۔ جس کی وجہ سے جنگوں میں رتھ کے استعمال نے انہیں جنگوں میں فوقیت دی تھی۔

چونکہ یہ نہ تو ایک جگہ آباد رہتے تھے نہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اس لئے روزمرہ کی غذا میں دودھ دہی وغیرہ شامل تھا اور جب ان کا گزارا نہیں ہوتا تھا تو یہ آبادیوں میں لوٹ مار کر کے لوگوں کا قتل عام بھی کرتے۔ ان میں سے وہ قبائل جو شاہراہ ریشم کے راستے پر آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ چین جانے والے تاجروں سے پرامن رہنے کے لئے معاوضہ طلب کرتے تھے۔ ازبکستان کے خانہ بدوشوں نے مشہور دو کوہان والے اونٹ کو سدھایا تھا جو سامان تجارت لے کر چین تک جاتا تھا۔ لیکن وہ قبائل جو کسی بڑی سلطنت کا حصہ ہو گئے یا انہوں نے خود بڑی حکومتیں قائم کر لیں تو وہ اپنے خانہ بدوشی کے کلچر سے نکل کر مہذب دنیا میں شامل ہو گئے۔ جیسے کشن قبیلہ جو چین سے آیا تھا اس نے ازبکستان، افغانستان اور ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی۔ اسی طرح سے سلجوقوں اور عثمانی ترکوں نے فتوحات کے ذریعے بڑی سلطنتوں کی بنیاد ڈالی۔ منگولوں نے جو 12 ویں صدی عیسوی میں چنگیز خان کی راہنمائی میں متحد ہوئے تھے۔ چین، وسطی ایشیا، ایران اور عراق تک اپنے اقتدار کو پھیلایا اور بالآخر ان کی یہ پھیلی ہوئی سلطنت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوتی چلی گئی اور یہ خود بڑی تہذیبوں میں ضم ہو گئے جیسے اسلام اور بدھ مت۔ رومی سلطنت کی جنگیں فرانس، جرمنی، اٹلی، سپین اور شمالی افریقہ کے خانہ بدوشوں سے مسلسل ہوتی رہیں اور بالآخر اس نے جرمن قبائل کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ ایک اہم خانہ بدوش قبیلہ جپسیوں کا ہے جو تاریخ کے تمام نشیب و فراز کے باوجود اپنی آزادانہ شناخت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان سے نکل کر مشرقی یورپ گئے اور رومانیہ میں طویل قیام کی وجہ سے ان کی زبان کو روما کہا جاتا ہے۔ ابتدا میں یہ بیل گاڑیوں میں سفر کرتے تھے لیکن اب کاروان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ یہ تقریباً یورپ کے ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن حکومتوں کی کوششوں کے باوجود مستقل رہائش اختیار نہیں کی۔ چونکہ یہ عام لوگوں سے علیحدہ رہتے ہیں اس لئے ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں شامل ہیں اور انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پروشیا کے حکمران IIFredrick نے یہ حکم دیا تھا کہ ہر سولہ سال کے جپسی کو پھانسی دے دی جائے۔ جب جرمنی میں نازی پارٹی اقتدار میں آئی تو اس نے بھی انہیں آریا نسل کی پاکیزگی کے لئے خطرہ سمجھا اور انہیں کنسنٹریشن (Concentration) کیمپ میں گیس چیمبر میں قتل کر دیا۔

جپسی لوگ پرامن خانہ بدوش ہیں۔ یہ لڑائی اور جنگوں سے دور رہتے ہیں۔ ان کی روزی کا ذریعہ یہ ہے کہ جہاں کہیں ان کا میلہ لگتا ہے وہاں یہ لوگوں کی قسمت کا حال بتاتے ہیں اور اپنی بنائی ہوئی چیزیں جیسے ٹوکریاں یا نقش و نگار والے کپڑے فروخت کرتے ہیں۔ یہ جپسی امریکہ تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ لیکن وہاں بھی خانہ بدوش ہی ہیں۔ خانہ بدوشوں کا ایک اور اہم طبقہ بنجاروں کا تھا۔ یہ گاؤں دیہاتوں سے

اناج لے کر قصبوں اور شہروں میں اس کی سپلائی کرتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم "بنجارہ نامہ" میں ان اشیا کی مکمل تفصیل ہے، جن کی یہ تجارت کرتے تھے۔ ان کی تجارت کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ہندوستان میں ریلوے آئی اور اب گڈز ٹرین کے ذریعے سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے لگا۔ اگرچہ اب خانہ بدوشوں کی وہ قسمیں تو نہیں رہیں جو عہدِ مغلیہ میں تھیں لیکن اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں خانہ بدوش موجود ہیں جو شہروں کے حاشیوں پر رہتے ہیں۔ ہندوستان میں ادی واسی ہیں جو جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے ہیں اور اپنے کلچر کی حفاظت کیے ہوئے ہیں، لیکن وقت کے ساتھ ان کا کلچر بھی ختم ہو رہا ہے اور یہ خود بھی یا تو آبادیوں میں گھل مل رہے ہیں یا علیحدہ رہتے ہوئے اپنی حیثیت اور شناخت کو کھو رہے ہیں۔

◆◆◆

صبح ازل سے ہوں میں گیتی میں مشکل روح ——— مجھ کو نہیں یہ آس فن جاوداں ہوں میں (حامد علی خاں)

معروف ادبی جریدہ ماہنامہ **الحمرا** بانی مدیر مولانا حامد علی خاں کی یادوں کو زندہ رکھتے ہوئے، زیرِ سرپرستی مدیرِ اعلیٰ شاہد علی خاں کی ادارت میں مسلسل اشاعت کے 28 سال مکمل کر چکا ہے۔۔۔۔ مبارک ہو!

قیمت فی پرچہ -/300 روپے اور زرِ سالانہ -/2,500 روپے
غیر ممالک سالانہ 150 (ڈالر امریکی) انگلینڈ 80 پاؤنڈ
ملنے کا پتہ 24۔بے بلاک، "المروت" ماڈل ٹاؤن، لاہور (پاکستان) فون نمبر: 0333-4001844

معروف ادبی جریدہ ماہنامہ **ارژنگ** مدیرِ اعلیٰ عامر بن علی اور مدیران حسن عباسی، الجلی صفدر کی زیرِ نگرانی اپنی اشاعت کے مسلسل 24 سال مکمل کر چکا ہے۔۔۔۔ مبارک ہو!

قیمت فی پرچہ -/100 روپے زرِ سالانہ -/1000 روپے
ملنے کا پتہ F-3، الفخر ورلڈ شاپنگ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور (پاکستان) فون نمبر: 0300-4489310

عذرا اصغر: کالم نگاری کی حیثیت سے

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

عذرا اصغر ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ نثر کی دیگر اصناف سے بھی اجتناب نہیں ہے۔ کالم لکھنے کی فرمائش لاہور میں قیام کے دوران بھی ہوتی رہی اور اسلام آباد منتقل ہونے کے بعد بھی مختلف اخبارات و جرائد کے لیے کالم لکھتی رہیں۔ کالم لکھنے کی ابتدا تو ان کے تخلیقی میدان میں قدم دھرتے ہی ہو گئی تھی لاہور سے عالم علی سید "شب تاب" کے نام سے ایک ہفت روزہ شائع کیا کرتے تھے جس میں ادبی، علمی، سماجی، اخلاقی اور دیگر موضوعات پر تحریریں شائع ہوا کرتیں۔ عالم علی سید اس رسالے کے مالک بھی تھے اور ایڈیٹر ان چیف بھی، عذرا کا نام مدیران کی فہرست میں بھی شامل تھا۔ عذرا نے اس رسالے کے لیے مختلف النوع مضامین لکھے اور اہم شخصیات جن کا تعلق ادب، صحافت اور فلم وغیرہ سے تھا، کے انٹرویو کیے۔ خواتین کے مسائل کو بھی موضوع بنایا، غرض عذرا اس رسالے کی ایک اہم لکھاری تھیں جو مبارک شاہی بیگم، عذرا مبارک اور عذرا اصغر کے ناموں سے کالم لکھتی رہیں جو پڑھنے والوں میں پسند کیے جاتے تھے۔ رسالے نے ایک سال کی عمر پائی لیکن عذرا کا قلم رواں ہو گیا اور وہ کسی بھی رونما ہونے والے اہم واقعے کو، سیاست و معاشرت کی سطح پر ابھرنے والے مسائل کو، عوام کی زبان عطا کرنے کی ہمت کرتی رہیں۔ انھوں نے لاہور اور اسلام آباد سے نکلنے والے مختلف اخبارات و رسائل میں کالم لکھے جن میں روزنامہ تحریریں، روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ مغربی پاکستان، روزنامہ مشرق، ہفت روزہ لیل و نہار، ہفت روزہ پنجاب، ہفت روزہ تیسرا رخ، شامل ہیں۔ ریڈیو پر کالم پڑھنے کی ابتدا اسلام آباد سے ہوئی۔ جی سی یونیورسٹی سے ممتاز وحید "عذرا اصغر کی ادبی جہات" پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں، ان کی نگران ڈاکٹر صدف نقوی نے دوران نگرانی اپنے ذوق تحقیق کا سامان یوں کیا کہ عذرا کے کالم جو مختلف مقامات پر بکھرے پڑے تھے انھیں یکجا کر دیا۔ "عذرا اصغر اپنے ان کالموں کو چھپانے کے حق میں نہ تھیں، میری گزارش پر انھوں نے اپنی تمام بیاضیں، اخبارات و رسائل میرے حوالے کیے۔ میں نے بڑی ایمان داری کے ساتھ ان کو ترتیب دیا ہے۔ عذرا اصغر سے اس سلسلے میں مشاورت بھی ہوتی رہی۔ کتاب کا نام "قلم پارے" بھی انھی کا تجویز کردہ ہے۔ کتاب کا ٹائٹل ان کی بیٹی معروف مصنفہ عطرا کا بنایا ہوا ہے۔"(1)

"قلم پارے" کا انتساب خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہرا کے نام ہے۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے کا عنوان "ہوا کے دوش پر" منتخب کیا گیا ہے۔ اس میں عذرا کے ریڈیو کالم ہیں جو انھوں نے ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے خود پڑھے۔ ہلکے پھلکے موضوعات جو روزمرہ زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں انھیں سیدھے سچے انداز میں یوں بیان کر دیا ہے کہ سامع کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ نصیحت بھی کرتی ہیں لیکن انداز بزرگانہ نہیں دوستانہ ہے۔ طنز کے تیر نہیں چلاتیں۔ بات ایسے طریقے سے کرتی ہیں کہ فرد اصلاح کی طرف راغب ہو جائے۔ حتمی انداز زیست کو مثبت اطوار کی جانب لے جانا ان کا مطمح نظر ہے۔ کیا ان تحریروں سے معاشرے کی اصلاح ہو سکتی ہے؟ یہ سوال بے حد قدیم ہے۔ لکھاری اس منصب پر فائز نہیں کہ جہاں وہ معاشرے میں پنپتی ہوئی اخلاقی گراوٹ، تعلیمی زوال، مذہبی اقدار کی پامالی اور بے روزگاری کے تدارک کے لیے کوئی عملی قدم اٹھائے۔ لیکن ان تمام مسائل کی نشاندہی وہ اپنا فرض

جاتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ اس کی کلمات سے اربابِ اقتدار و اختیار کے کانوں پر جوں رینگ جائے۔ عذرا کے کالموں کے عنوانات بظاہر ہلکے پھلکے ہیں لیکن ہر کالم اپنے اندر ایک سوال چھوڑ جاتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ''کو عید آئی'' کا اختتامیہ دیکھیے: ''سوچنے والی بات یہ ہے کہ ہم کس کو دھوکہ دیتے ہیں؟ خود کو یا... ؟ نماز، قرآن پڑھتے ہیں اور کم تولتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ حج کرتے ہیں اور دلوں کی کدورت دور نہیں کرتے۔ منافقت، حسد، غیبت، نفرت اور احساسِ رقابت سے چھٹکارا پانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ تکبر ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ کیا وہ قومیں ہم سے بہتر نہیں ہیں جو خوش رہ کر جیتی ہیں اور دوسروں کے جینے کا حق بھی نہیں چھینتیں۔'' (24)

''سو ہے وہ بھی آدمی'' ان دو بھائیوں کا تذکرہ ہے جو باپ کی ان کے کام میں مدد کرتے ہیں اور تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مختلف گھروں سے دھونے والے کپڑے لانا، لے جانا ان کے ذمہ تھا۔ باپ کے پیشے سے شرماتے نہیں تھے اور اسی بل بوتے پر دونوں بھائی اعلیٰ سرکاری عہدوں تک پہنچے۔ عذرا اس امر پر شاکی ہیں کہ ہمارے ہم وطن بیرونِ ملک جا کر ہر کام کر لیتے ہیں جو اپنے ملک میں باعثِ شرم سمجھتے ہیں۔ رشید، حمید نے اپنے ملک میں رہ کر محنت کی اور عزت پائی... وہ ان کی محنت، ان کے جذبے کو سلام کرتی ہیں۔ اگر کبھی ہمیں یہ شعور بیدار ہو جائے تو کیا اپنے ساتھ اپنے ملک کا وقار بلند نہیں کر سکتے؟ ''حروف پیچے اور نئی ایجادات'' عذرا کا یہ کالم انتہائی دلچسپ ہے۔ ماضی کو بھلانے میں ہم نے بہت تیزی دکھائی اور مستقبل کی جانب دوڑنے لگے۔ عذرا نے اس کالم میں ماضی کی خوبصورت یادیں بچائی ہیں جنھیں حال و مستقبل کا اژدہا نگلتا جا رہا ہے بلکہ نگل چکا ہے۔ آج کی نسل کیا جانے کہ دھنیا (لحافوں، رضائیوں کی روئی دھننے والا) سقہ، بہشتی اور بہت سے پیشے وقت کی دھند میں غائب ہو چکے ہیں۔ یہ افراد پچھلے وقتوں میں کس قدر اہم ہوا کرتے تھے۔

ریڈیو کے دیگر کالموں کے عنوانات: فرض کو پہچانیے، برگد کی چھاؤں، ڈاکیہ ڈاک لایا، برسات کی بہاریں، نقشِ قدم، شجر بار سال، نئی تخلیق، میرا پیغام محبت ہے، رشتوں کی پاسداری، سیل کا موسم، حتمی اذان، سفید جھوٹ، دوپٹہ عورت کا نصف بہتر، گفتگو ایک فن، آپ سے کنٹرول ہوتا ہیں، جنریشن گیپ، گلی، سبھی کلام میں، ایک تاریخ ساز دن، مجھے کچھ کہنا ہے، الحمد، غریب بستے ہیں، عید آئی ہے تو ہم پر بھی، مجھے یقین ہے، بچپن کے دن، ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا، خوش رہیے... خوش رکھیے، ذرا سوچیے... عذرا کے ریڈیو کالم نئی نسل کو انسانیت، پاکستانیت اور ماضی کی حسین یادوں، اقدار و روایت سے متعارف کرواتے ہیں۔ ہر کالم میں ان کا وجود، ان کی سوچ اور نظریات جھلکتے ہیں اور سامع غیر محسوس طور پر ان سے متفق ہوتا چلا جاتا ہے۔

''قلم پارے'' میں اخباری کالم کا انتخاب ''حرفِ شگوفے'' کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صدف نے مختلف اخبارات میں شائع شدہ کالموں کو یکجا کر دیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ ان اخبارات کے نام کے ساتھ ساتھ کالموں کی تاریخ اشاعت بھی درج کر دیتیں۔ کالم ایک فرد لکھتا ہے لیکن وہ اجتماع کی آواز بن کر ابھرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ لکھنے والا دلِ درد مند رکھتا ہو، اس کا مقصد صفحے کالے کرنا نہ ہو بلکہ اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات کی نشان دہی یوں کرے کہ اندھیرے میں امید کی کوئی نہ کوئی کرن بھی دکھا سکے۔ مثبت سے منفی انداز فکر کی جانب تو بہت آسانی کے ساتھ سفر کیا جا سکتا ہے کالم نگار پہلے سے دکھی، مصیبت زدہ، غمِ روزگار کے مارے ہوئے عوام کو حرفِ تسلی دیتے ہوئے اربابِ اختیار تک روز بروز بڑھتے ہوئے مسائل کی طرف توجہ دلاتے۔ عذرا کے افسانے ہوں یا کالم ان کی پاکستانیت سے انکار ممکن نہیں۔ وہ ایک محبِ وطن پاکستانی ہیں۔ ملک کا عدالتی نظام اصلاح کا طلب گار ہے۔ اردو زبان ہماری قومی زبان ہے لیکن اسے کب وہ افتخار نصیب ہوگا جو اس کا حق ہے۔ پاکستانی قوم جو قبیلوں، خاندانوں اور زبانوں میں منقسم ہے اسے ایک پلیٹ فارم پاکستان پر متحد ہوتے میں اور کتنا وقت لگے گا۔ ایک غریب اور قرض دار ملک کے قومی اسمبلی کے ممبر کے لیے نئی مرسڈیز گاڑی کی خریداری

کے لیے حکومت اور حزبِ اختلاف نے متفقہ طور پر بل کی منظوری دے دی کہ اس غریب ملک کی غربت صرف عوام کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔ مخصوص سکولوں میں داخلہ ماں باپ بلکہ دادا دادی کی قابلیت (انگریزی بولنے کی حد تک) کو کیو کر دیا جائے گا۔ ادبی جرائد، ادبی محفلیں اور مشاعرے وقت کی گرد میں گم ہوتے جا رہے ہیں کیا حکومتی سرپرستی انھیں زندہ نہیں کر سکتی۔ عذرا نے اپنے کالموں میں سامنے آنے والے مسائل کی نشاندہی اپنے علمی و ادبی انداز میں کی ہے۔ مخصوص صحافیانہ رویے سے قطع نظر ان کے کالموں میں انشائیے کے قرینے، ادبیت کی چاشنی اور الفاظ کا بہترمندانہ استعمال، قابلِ مطالعہ بناتا ہے۔ ''کالم فرد کی شخصی فکری رسائی کا ایک وسیلہ ہے، سائنس، مذہب، اخلاقیات، فلسفہ، ادب، آرٹ، سماجی تغیرات، معیشت، عسکریت اور دوسرے موضوعات پر کالم نگار اپنی رائے، تجزیہ، خدشات و جذبات پیش کرتا ہے۔ میں جب عذرا اصغر صاحبہ کی کالم نگاری دیکھتا ہوں تو مجھے ان کے ہاں دو رنگ دکھائی دیتے ہیں، ایک سماجی اقدار و روایات کی ٹوٹ پھوٹ پر ہمدردانہ انداز نظر اور دوسرا ادبی مسائل و امکانات کی پیش کش۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے کالم لکھنے کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا کے لیے بھی لکھے ہیں دونوں ابلاغی وسیلوں تک ان کی موثر رسائی واضح نظر آتی ہے، اگرچہ دونوں کی فضا، ماحول اور تقاضے مختلف ہیں لیکن ہر دو وسیلوں سے سامنے آنے والے ان کے کالم فکری و فنی سطح پر ان کی جداگانہ شناخت قائم کرتے ہیں۔ ان کی فکر واضح اور دوٹوک ہے۔''(3)

''جشن بہاراں ... خوش ہونا سیکھ لیں'' چھوٹی چھوٹی خوشیاں جینے کا جواز فراہم کرتی ہیں۔ بسنت کا تہوار بہار کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔ بسنت کا استقبال لڑکیاں بالیاں دھانی پیلے رنگ کے دوپٹوں، پکوانوں سے کرتی ہیں۔ بچوں اور جوانوں کی پتنگ بازی سے آسمان رنگین ہو جاتا ہے۔ مسائل سے بھری دنیا میں عوام سکون و راحت کے مواقع تلاش کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسا تاثر دیا جاتا ہے کہ خوش ہونا، زندہ دلی کا مظاہرہ کرنا، مذہب میں ناپسندیدہ ہے... بسنت ایک ایسا تہوار تھا جس کا سبھی انتظار کیا کرتے تھے لیکن پھر دھاتی اور کیمیکل ڈور بنانے والوں کا کہ جن کی طمع نے معصوم شہریوں کو زندگی سے محروم کیا اور حکومت کو اس پر پابندی لگانا پڑی۔ پھر عوام کے اصرار پر اس کا نام جشن بہاراں کر دیا گیا۔ دھاتی اور کیمیکل ڈور پر مکمل پابندی لگا کر سخت سزا مقرر کی گئی لیکن سزا پر عمل درآمد کم ہی ہوتا ہے۔ اس سماجی و ثقافتی تہوار کو اسلامی روایات سے متصادم قرار دے کر اس پر پابندی کی سفارش کی گئی، پھر عوام کے اصرار پر اس تہوار کو منانے کی اجازت تو دے دی گئی لیکن اس کا نام جشن بہاراں کر دیا گیا۔ ''بہار کی آمد پر پڑوسی ملک اسلامی جمہوریہ ایران میں جشن نوروز کا تہوار صدیوں سے منایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تہوار زرتشتیوں کے وقت سے چلا آ رہا ہے مگر وہاں کسی عالم دین نے جشن نوروز پر غیر اسلامی ہونے کی مہر ثبت نہیں کی۔ آپ کیوں بسنت کو ہندوؤں کی جھولی میں ڈالے دے رہے ہیں؟ جب کھیتوں میں سرسوں پھولتی ہے موسم بدلتا ہے تو انسان کا دل خوش ہونے کو مچلتا ہے۔''(4) عذرا کے کالم ملکی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ ادب، مذہب، تعلیم، زبان، ڈاکٹر، پی ایچ ڈی، ٹی وی پر پیش کیے جانے والے ناقص گھریلو موضوعات، حسد، غیبت، شادی بیاہ و طلاق پر مشتمل ڈرامے، ڈاکٹروں پر مشتمل ڈرامے، بے ہودہ و فحش نشریات، سرکاری سکولوں میں سہولیات کا فقدان بلکہ اساتذہ کی عدم موجودگی، فرنیچر، چھت، سایہ دار اور پانی کی تنگی سے محروم خستہ ترعمارت، جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ نوجوان نسل پر آسائش زندگی کے لیے ہجرت پر کیوں تلی بیٹھی ہے، اپنے ملک میں باعزت روزگار کے مواقع کیوں فراہم نہیں کیے جا سکتے۔ طبقاتی برتری اور کمتری کے فرق کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ کیا اردو مختصر زبان ہے۔ کیا ہماری زبان، ہماری تہذیب، ہماری ثقافت ہمیں احساسِ ندامت بخشتی ہیں۔ ترقی مادی وسائل کی بہتاتی سے ممکن ہے یا تعلیم کے پھیلاؤ سے۔ سوال یہ بھی سامنے آتا ہے۔ بے مصرف تعلیم یا کارآمد تعلیم وغیرہ۔ الغرض عذرا کے کالم معاشرتی بے حسی، تعلیمی، اخلاقی، ثقافتی، معاشی، مذہبی، ادبی انحطاط دور

وال کو پیشِ نظر رکھ کر لکھے جاتے ہیں مصلحت ان کا شیوہ نہیں جہاں جس ادارے میں کمی و خامی دکھائی دیتی ہے اس کی نشان دہی اپنا فرض جانتی ہیں۔ انھیں ایک گلہ البتہ ہے اپنے ہی قلم کار کالم نگاروں سے "ہمیں اپنے کالم نگاروں کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ صرف اور صرف سیاسی کالم لکھنے پر ہی کیوں زور دیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اخبارات میں مختلف النوع موضوعات پر کالم پڑھنے کو ملتے تھے..... اخبار کے کالم نگاروں کے نزدیک یوں لگتا ہے کہ عوام الناس کا ہر مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ ملک میں معاشرتی قومی کوئی بھی مسئلہ موجود نہیں ہے۔ آپ صبح کے ایک ہی اخبار میں دو تین چار جتنے بھی کالم چھپے ہوں سب باری باری پڑھ ڈالیے سیاسی بصیرت سے آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ اکثر کالم نویس اپنی گذشتہ پیش گوئیوں کے حوالے سے اپنے کالم کا آغاز کرتے ہیں: فلاں وقت ہم نے کہا تھا۔ گویا مستند ہے میرا فرمایا ہوا...... اے ہمارے عزیز کالم نگارو! اپنے لیے اپنے جیسوں کے لیے لکھو اس گھر کے، گھر سے باہر کے معاشرے کے لیے لکھو، اس نوجوان نسل کے لیے لکھو جو درآمد شدہ اقدار کے پیچھے آنکھیں موندے دوڑ رہی ہے۔"(5)

شام رات سات آٹھ بجے سے گیارہ بارہ بجے تک ہر ٹی وی چینل پر گنے چنے سیاست دانوں کو بٹھا کر اہم ترین سیاسی موضوعات: فلاں سیاسی شخصیت ملک سے باہر علاج کے بہانے رخصت ہوئی۔ اس میں کن کن اداروں کا ہاتھ تھا۔ پاپڑ والے کے اکاؤنٹ میں آج اتنی رقم کہاں سے آئی۔ کون سیاست دان اپنی وفاداریاں بدل رہا ہے۔ آج فلاں سیاست دان فلاں سیاست دان یا قومی عہدے داران سے ملاقات کے لیے گیا، اس کے پیچھے کیا معاملات ہیں۔ آج ہونے والے جلسے جلوس میں عوام کی کتنی تعداد شریک ہوئی۔ کتنی کرسیاں خالی تھیں۔ پولیس عوام کی مددگار ہے یا حکومت کی آلہ کار۔ ملکی معیشت کی تباہی کے ذمہ دار گذشتہ حکمران ہیں..... غرض سیاسی بحران ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور حکومتی اور اپوزیشن کے نمائندے کف اڑاتے اپنے اپنے موقف پر اڑے رہتے ہیں۔ اگر ان کے پاس موضوعات کی کمی ہے تو عام فرد بھی بتا سکتا ہے کہ ان موضوعات پر پروگرام کر کے ارباب اختیار کی توجہ دلائیے۔

بات تو درست کی گئی ہے۔ ہمارے ملک میں صحت، تعلیم کی ناکافی سہولیات، معیاری فنی تعلیم کی طرف عدم توجہی۔ نظامِ تعلیم میں مادری اور قومی زبان سے اجتناب، بے روزگاری کا عفریت، افراطِ زر، غربت، پس ماندگی، سماجی و معاشی مسائل، دولت کا غیر پیداواری استعمال، مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک میں گئے پاکستانی محنت کشوں کے مسائل، بیرونی ثقافتی یلغار، کھیل و سیاحت پر عدم توجہی، بڑھتی ہوئی آبادی، ہر شعبے میں بدعنوانی، رشوت ستانی، ترقی، سائنس، جدید ٹیکنالوجی، درآمدات و برآمدات میں عدم توازن، پاکستان زرعی ملک لیکن پیاز، ٹماٹر، چینی، آٹا اور دالیں درآمد کرنا اس کی ناقص منصوبہ بندی کو ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ ہر شعبے میں منصوبہ بندی کے فقدان وغیرہ وغیرہ پر بحث کر کے ان شعبے کے ماہرین کو بلا کر ان سے سفارشات طلب کی جائیں..... لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد ہمارے اینکر ہوں یا کالم نگار ان کی توجہ ان مسائل کی جانب کم ہی ہوتی ہے۔ جس کی نشان دہی عذرا نے مذکورہ کالم میں کی ہے۔

حوالہ جات:

(1) ڈاکٹر صدف نقوی، مرتب، عذرا خاص نمبر قلم پارے، کراچی، جنوری تا مارچ 2020ء، صفحہ 12۔ (2) عذرا اصغر، ابو عبید آزاد، مشمولہ قلم پارے، ص 17۔ (3) خاور چودھری، قلم پارے، بیرونی سرورق۔ (4) قلم پارے، ص 140۔ (5) اخبار اور کالم نویسی، قلم پارے، ص 174۔

◆◆◆

اُردو میں ایک بڑے شاعر کی آمد

فرحت عباس شاہ

اگرچہ زمانے کے ساتھ ساتھ ادبی رجحانات اور اظہار کے قرینوں میں بھی تبدیلیاں آتی رہی ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ شاعر ادیب کی جگہ غیر شاعر ادیب لے لے گا اور تخلیقی ادب کی جگہ مصنوعی ادب۔ میری مجبوری ہے کہ مجھے بار بار بتانا ہے کہ شعری احساس اور فکری تشکیل پر ملازمت کاری وغیرہ اور صنائع بدائع کو فوقیت دینا یا تخلیق کار پر متن کو ترجیح دینا دراصل ان کمزور شاعر، ادیب، ناقدین اور عام نیم محققین کی مجبوری ہے جن کو اپنی تخلیقی محرومی کا شدید احساس ہے اور وہ اسے قبول کرنے کی بجائے خود کو تخلیق کار سے افضل دیکھنے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلسل تخلیقی عمل اور تخلیق کار کی نفی کرنے پر لگے رہتے ہیں کیونکہ انہیں ہر وقت یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ان کی موت لازم ہے جبکہ حقیقی تخلیق کار کے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ وہ خود کو نمایاں کرنے اور دوسروں کو پیچھے دھکیلنے کی منصوبہ بندیاں کرتا پھرے، بلکہ اس کے پاس تو دورانِ عمل تخلیق فنی لوازمات پر توجہ مرکوز کرنے کی بھی مہلت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ درست ہے کہ تخلیق کے بعد اسے نظر ثانی کر کے کمی بیشی دیکھ لینی چاہیے اور عام طور پر بڑے تخلیق کار ایسا کرتے بھی ہیں۔ احمد نواز کی شاعری پر بات کرتے ہوئے مجھے ایسی تمہید اس لیے باندھنا پڑی کہ احمد نواز شاعر پیدا ہوا ہے۔ وہ ماحول صحبت یا شوق کی بنیاد پر شاعر بننے والوں سے مختلف ہے۔ احمد نواز کائنات کو ایک شاعر کے دل سے محسوس کرتا ہے اور ایک فلسفی کے دماغ سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ وہ ایک فلسفی کے طور پر سوچنے کے باوجود اپنی شاعری میں کہیں بھی اپنے اندر کے فلسفی کو حاوی نہیں ہونے دیتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر پیدا ہونے والے سوالات یا غور و فکر کے نتیجے میں حاصل ہونے والے جوابات جب شعری صورت میں ڈھلتے ہیں تو جذبے اور احساس کی جمالیات پوری شعری آب و تاب کے ساتھ غالب نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ذات کے ذریعے قدرت مطلق اور مظاہر فطرت سے ہمکلام ہونے کی صفت اسے عہد حاضر کے ان تمام شعراء سے مختلف بنا دیتی ہے جو شعر کے ظاہری سٹرکچر پر محنت کرتے رہتے ہیں اور صرف لسانی و فنی خوبیوں کی بنیاد پر اسے اچھی یا اعلیٰ شاعری قرار دے دیتے ہیں۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک شاعر کے لیے پہلے سے موجود کسی فلسفیانہ نظریے کی بنیاد پر عمارت کھڑی کرنا اگرچہ بہت قابل قدر بات ہے لیکن شاعر کا کائنات کے اسرار کو سمجھنے اور وجدانی بنیادوں پر اس کے جواب تلاش کرنے کا عمل اس کے بڑے شاعر ہونے کی دلیل مہیا کرتا ہے اور ایسے میں اگر شاعر اپنے وجدان، ادراک اور کائناتی شعور کی بنیاد پر کوئی نظریہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس نظریہ سازی کی بنیاد پر اس کے عظیم اور بڑے شاعر ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ اب تک میں احمد نواز کی شاعری کا جتنا مطالعہ کر چکا ہوں اس میں وہ حیرت انگیز طور پر شعریت کے عنصر کو ساتھ رکھتے ہوئے ایسے سوالات اٹھاتا ہے جو پڑھنے والے کو بڑے غیر محسوس طریقے سے سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کبھی کبھی مجھے تیرا گمان ہوتا ہے — کبھی کبھی مجھے اپنا یقین نہیں رہتا
تو کون ہے مجھے چلمن سے جھانکنے والا — اگر مکان میں کوئی مکیں نہیں رہتا
یہاں وہاں مری پرچھائیوں کے مسکن ہیں — وگرنہ میں کہیں اپنے تئیں نہیں رہتا

دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ وہ حقیقتِ مطلق کی تلاش کے سفر میں آرزو کی ریاضت اور دریافت کے جس عمل سے گزرتا ہے اس سے بخوبی آگاہ بھی ہے۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ عام طور پر وجدانی واردات سے گزرنے والے صوفیا اور بعض جب روحانی یا قلبی واردات کے عمل سے باہر آتے ہیں تو واردات کے بیان سے قاصر ہوتے ہیں جبکہ احمد نواز اپنے وجدانی تجربے کے تمام مراحل سے آگاہ رہتا ہے۔ جس کی جو وجہ مجھے سمجھ آئی ہے وہ یہ ہے کہ احمد نواز ایک صاحبِ ایمان، عقیدہ و انسان اور ایک سائنسی تجسس رکھنے والا ایسا شاعر ہے جو پس کائنات سرگرمِ عمل قوتوں کے انکشاف کی جستجو کو علم اور ایمان کے درمیان توازن کے ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے اور اس پورے فکری اور احساساتی بیانیے کو ایک مربوط شعری سانچے میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ شعر دیکھیے:

ازل سے پردہ نشیں کی تلاش جاری ہے — گماں کے ہاتھوں یقیں کی تلاش جاری ہے

تشکیک، مابعد الطبیعاتی فلسفے کا بنیادی جزو اور گمان سے یقین تک پہنچنے کے عمل میں ناگزیر ہے۔ احمد نواز کی شاعری میں بہت اہم بات یہ ہے کہ ایک صاحبِ ایمان شاعر ہونے کے باعث اس کا گمان اس کے عقیدے سے متعلق شکوک و شبہات کا نام نہیں بلکہ ایک صاحبِ فکر و نظر انسان کا ایمان کی حقانیت کے مشاہدے اور تجربے سے خود گزرنے کا عمل ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی کو یقین ہو کہ خدا ہے لیکن وہ خدا کو خود دیکھنا محسوس کرنا اور پانا چاہتا ہو۔ یقینِ کامل کے حصول کی تمنا شاعر کے اندر انسانی آنکھ سے اور کسی ایسی آنکھ کے حصول کے لیے مضطرب ہے جو وہ کچھ دکھا دے جو ظاہری آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں۔

آٹھواں رنگ دیکھنے کے لیے — تیری آنکھ ڈھونڈتا ہوں میں

احمد نواز کے تخلیقی نظام میں تشکیک اور غور و فکر کا عمل احساس کی صداقت اور جذبے کی معاونت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہی امتیاز اسے فلسفی شاعری بجائے شاعرِ فلسفی کے درجے پر فائز کرتا ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

سوز کو ساز کیا، وجد کو وجدان کیا — دل کو دالان کیا، یار کو مہمان کیا
حجرۂ جسم میں معمول کا سناٹا تھا — پھر کسی لمس کی آواز نے حیران کیا
دے دیا تیرے تصور کے تصرف میں یہ دل — شمع فانوس ہوئی، گل کو گلستان کیا

ندرتِ خیال کی کیا ہی نایاب مثال دیکھیے کہ ایک صدائے کن اس کے باطن میں گونجنا اور لمس کی آواز کو منتقل کرنا ایک ایسے حیرت کدہ کی کائنات کو تشکیل دیتا ہے جو اس کی اپنی ریاضت کا ثمر ہے۔ اس ریاضت کا ثمر جو اس کے اندر کن کی صدا گونجنے سے پہلے جاری و ساری تھی۔

حجرۂ جسم میں معمول کا سناٹا تھا — پھر کسی لمس کی آواز نے حیران کیا

یہ بالکل ماں کے پیٹ میں بچے کے بیج سے وجود کی شکل میں آنے جیسا ہے۔ بطور قاری یہ میرے لیے عملِ تخلیق کو سمجھنے اور

سمجھانے کے لیے یہ بہت اہم بات ہے کیونکہ شعری تخلیق، تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ انسان سے ملتا جلتا عمل ہے۔ جس میں آسانی یہ ہے کہ انسانی ذہن پیچ کی تخلیق کے عمل اور شعری تخلیق کے عمل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے لیکن تخلیقِ کائنات کے عمل احمد اور گن یا بگ بینگ سے پہلے کی اسرار تک پہنچنا ابھی اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ خالقِ کائنات تک۔ اگر یہ کہیں ممکن نظر بھی آیا ہے تو فقط ان الہامی ہستیوں کے ہاں جن کو انبیاء، اولیا، صوفیا یا شعراء کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ان کے الہامات کو مفروضہ قرار دیں تو پھر بھی ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ فلسفہ اور سائنس دونوں کی اپنی بنیاد بھی hypothesis یعنی مفروضے پر قائم ہے۔ احمد نواز کی شاعری میں روحانیت واردات کے شواہد جگہ جگہ ملتے ہیں اور خوش آئند بات یہ ہے کہ وہ اپنی روحانی واردات کے تجربے سے گزرنے کی حالت کو یاد رکھتا ہے بلکہ انہیں پوری شدتِ احساس کے ساتھ شعر کرنے کے ہنر سے مالا مال بھی ہے۔ اشعار دیکھیے:

خرد کے زینے پہ چڑھ رہا ہوں   خود اپنی جانب کو بڑھ رہا ہوں
میں حیرت حال میں اتر کر   خدا کی تاریخ پڑھ رہا ہوں

پتہ نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ موت نظامِ فطرت کا ایک ایسا پراسرار معمہ ہے جسے ابھی تک ٹھیک سے سمجھا نہیں جا سکا۔ یہی موت جس کے خوف سے شاہ و شہدا و پانی ہوتے اور خواص و عوام بھاگتے پھرتے ہیں عاشق اسے آگے بڑھ کر گلے سے لگانے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ موت کے حوالے سے احمد نواز کی شاعری میں چہار رنگی احساسات کے اظہار کے ساتھ ساتھ ایک مربوط فکر بھی نظر آتی ہے۔

کچھ نہ ملا جو ماورائے نظر   آنکھ بے موت مر گئی ہوتی

جب چاہا اک بزرخ رہے آباد مگر   اک اسی شخص کے ہونے سے تھی دنیا میری

احمد نواز کی مربوط فکر دراصل اس کے مربوط احساساتی اور روحانی تجربے سے جنم لیتی ہے۔ وہ عاشق ہے۔ جس کی واردات عشق مجاز سے حقیقت تک پھیلی ہوئی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ ہجر اس کی ریاضت اور آنسو اس کے لیے شفاعت کے وسیلے کا باعث ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لیے اس کی محرومیاں اور دکھ بھی قابلِ احترام اور دولت کی طرح ہیں۔ اسے مشکلوں کی آسانی اور آسانیوں کی مشکلوں کا ادراک ہے۔ وہ ایسا تارک الدنیا ہے جو دنیا میں رہ کر اسے مسلسل ٹھکراتے چلے جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

میں ترکِ آرزو سے بچ گیا ہوں   بڑی مشکل سے آسانی ملی ہے

ہم سے معمول کی حاجات نہ روکی جائیں   مانگنے پہ بھی آئیں تو خدا مانگتے ہیں

تو کبھی دے نہ سکا مجھ کو خوشی کے آنسو   میں نے سب کچھ تری مسکان پہ قربان کیا
زندہ رہنے کا ہنر آ گیا آتے آتے   کیا ... درد کو درمان کیا

اب ذرا درج ذیل شعر دیکھیے:

کچھ نہ ہوتا جو ماورائے نظر　　　آنکھ بے صوت مر گئی ہوتی

یہ ایسا شعر ہے جو ہمیں احمد نواز کی فکری اساس کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ہمارے ہاں کمزور اور سرقہ باز شاعروں نے ایک دوسرے کے اشعار کے مضامین چوری کرنے کے عمل کو درست قرار دینے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں گھڑ کے جہالت پھیلانے کی بہت کوشش کی اور مثالیں نکال نکال کر استاد شعرا کی پیش کرتے ہیں۔ کسی تجربے کی مماثلت سے اور زبان کی تنگ دامانی سے کہیں کہیں شعرا کے ہاں خیالات کا مل جانا ایک فطری عمل ہے لیکن کسی کے شعر کو سامنے رکھ کے شعر گھڑنا تو صریحاً غیر اخلاقی، غیر ادبی عمل ہے بلکہ باقاعدہ جرم ہے۔ چہ جائیکہ اسے پوری ڈھٹائی سے درست بھی قرار دیا جائے۔ ایسے جاہل اور مصنوعی شعرا عموماً کہتے بھی پائے گئے ہیں کہ دنیا میں کوئی خیال نیا خیال نہیں ہوتا۔ یہ علم دشمنی پر مبنی ایسا جاہلانہ مذاق ہے جسے اگر مان لیا جائے تو ارسطو سے ایلیٹ اور ہومر سے اقبال تک کی تکذیب کرنا پڑ جائے گی۔ اسی ضمن میں ہمارے آج کے تازہ فکر اور منفرد اسلوب کے شاعر احمد نواز کے ہاں قدم قدم پر مضامین نو کے انبار لگے ہیں۔

مضامین دراصل انسان کے جذباتی عمل کی گہرائی، ذہن کی بوقلمونی اور علمی وسعت کی دین ہوا کرتے ہیں اور ایک خاص شاعر کے لیے یا کسی بھی تخلیقی انسان اور فنکار کے لیے دنیاوی آلائشوں سے دوری اور اپنے من کی کائنات میں ڈوبے رہنے پر راضی ہونے کا کردار اسے دوسروں سے خیال سے لے کر اظہار رنگ کی ہر سطح پر مختلف بھی بناتا ہے اور نئے سے نئے مضامین کی دولت سے بھی نوازتا چلا جاتا ہے۔ یعنی۔۔۔۔

کچھ نہ ہوتا جو ماورائے نظر　　　آنکھ بے صوت مر گئی ہوتی

کسی بھی دیدہ و بینا کے لیے قابل توجہ ہے ہی وہی جو ماورائے نظر ہے اور جسے دیکھنے کے لیے اسے عشق کی بیقراری اور ہجر کے دکھ سے بھرے ہوئے دل کی آنکھ درکار ہے۔ کائنات اور خالق کائنات کا ماورائے نظر رنگ دیکھنے کے لیے دو آنکھوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اس شعر کو اس کے تخلیقی ادراک کی کلید اس لیے قرار دیا ہے کہ واردات قلبی و روحانی احمد نواز کے ہاں صرف احساسات اور جذبات کے بیان تک رک نہیں جاتی بلکہ حقیقت مطلق کے مشاہدے کی آرزو کے لیے ذریعے کی تلاش پر مسلسل مصر نظر آتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ احمد نواز تلاش کے اس سفر کو خارجی اور باطنی تجسس کے توازن سے لے کر چلتا ہے جو اسے محض صوفی یا محض فلسفی نہیں رہنے دیتا۔

احمد نواز کی شاعری میں عصری شعور کا بیان، سیاسی و سماجی زوال اور انسان کے غیر ذمہ دارانہ کردار پر اظہار بھی اتفاق و اختلاف سے بچتا کہ داخلی ذہنوں کا توجہ۔ درج ذیل غزلوں کا ایک ایک شعر مختلف مضمون کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ایک ہی غزل میں تصوف بھی ہے، انسان اور معاشرے کے درمیان پیدا ہونے والے عدم توازن کی نفسیاتی تعبیر بھی ہے اور طبقاتی تفریق سے بھرا سیاسی شعور بھی لیکن کسی بھی شعر میں شعریت کی شدت میں کمی نہیں آئی۔ احمد نواز کی شاعری میں سب سے زیادہ متاثر کن عمل یہی ہے کہ اس کی شاعری سائنسی موضوع پر اظہار میں کہیں بھی ثقیل ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ میرا ہمیشہ سے یہ نقطہ نظر رہا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی بھی جینوئن تخلیق کار ترقی پسند نہ ہو۔ ہر صاحب جمال اسی لیے صاحب جمال ہوتا ہے کہ وہ خارجی کثافتوں سے خود کو آلودہ نہیں ہونے دیتا۔ خارج اور باطن کے درمیان جذباتی و

فکری تصادم ہی تخلیق کار کی فکر و نظر کے دروازے کھولتا ہے۔ تخلیق کار جتنا بڑا تصادم جھیلنے کی ہمت رکھتا ہوگا اتنا بڑا تخلیق کار ہوگا۔ احمد نواز کی شاعری میں معاشرتی ناہمواری اور انسانی بے توقیری کے بین سنائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسے اپنے اردگرد برپا ہونے والے المیے اپنے المیے محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری کو کسی ایک خانے میں فٹ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ آفاقیت اور ہمہ گیریت اس کی شاعری کے ایسے اوصاف ہیں جو اس کے کینوس کے پھیلاؤ کو ستاروں کی اونچائی سے صاف بچا کے لے جاتے ہیں۔

ہجر کو یاد کا اوتار بنا رکھا ہے
اس کی ہر یاد کو تہوار بنا رکھا ہے

مجھ میں اک خوف زدہ شخص ہے ایسا جس نے
میرے ہر کام کو دشوار بنا رکھا ہے

اس کو بتلاؤ قیامت کی دوائی کھائے
جس کو حالات نے بیمار بنا رکھا ہے

جب سے کم مائیگی لفظ کھلی ہے مجھ پر
خامشی کو رہِ گفتار بنا رکھا ہے

بے نیازی بھی ادا اس کی ہے جس نے اپنا
اک زمانے کو طلب گار بنا رکھا ہے

اپنے پاؤں سے کچلتے ہیں وہی سر ان کے
جن کو جمہور نے سرکار بنا رکھا ہے

دیکھنے والے کو فن کار بنا دے احمد
تم نے ایسا کوئی شہکار بنا رکھا ہے؟

خلقت کی اذیت کو مٹا کیوں نہیں دیتے
اس کھیل پہ اب پردہ گرا کیوں نہیں دیتے

زردار سے نفرت ہے مگر زر سے محبت
سچے ہو تو یہ فرق مٹا کیوں نہیں دیتے

اک بوند کو جسموں سے ترستے ہوئے پیاسو!
دریاؤں کو اب آگ لگا کیوں نہیں دیتے

لازم ہے فلک نیلا نظر آئے ہمیشہ؟
منظر کو کوئی رنگ نیا کیوں نہیں دیتے

انسان کا اکرام ہے اکرامِ الٰہی
اس بات کو تم دل میں بٹھا کیوں نہیں دیتے

کیوں رسم کی ڈوری سے انہیں باندھ رکھا ہے
بے زار پرندوں کو اڑا کیوں نہیں دیتے

لوٹانے ہیں تم نے مرے ایامِ جوانی
یہ قرض مری جان چکا کیوں نہیں دیتے

جز حسرت و آزار نہیں کچھ بھی مرے پاس
لاچار کو مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

کچھ آنکھوں سے کچھ اور عیاں ہے
جو بات ہے دراصل بتا کیوں نہیں دیتے

غزل کے اتنے طویل اور جاندار سفر کے باوجود بھی نئے امکانات کے در کبھی بند نہیں ہوتے۔ آج بھی جب ہر طرف سے ایک جیسی شاعری کا شور برپا ہے اس میں احمد نواز کی شاعری غزل کو امتیاز بخشتی نظر آتی ہے۔ اردو ادب کو مبارک ہو کہ اسے ایک مربوط فکر، جذبوں کی آنچ میں سلگتا اور احساس کی شدت سے دمکتا ایک ایسا ہمہ گیر شاعر نصیب ہوا ہے جو اردو ادب کے معتبر آنگن کی نوید ہے۔

◆◆◆

پروفیسر گوپی چند نارنگ: مشاہیر کی نظر میں

سیفی سرونجی (انڈیا)

جیسا کہ میں پہلے کئی بار لکھ چکا ہوں کہ نارنگ صاحب کی زندگی کے کئی ایسے مختلف پہلو ہیں کہ ہر پہلو پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے کچھ لکھی بھی جا چکی ہیں، کچھ لکھی جا رہی ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا مثلاً ''نارنگ صاحب بحیثیت محقق و نقاد''، ''نارنگ صاحب کے بیرونی سفر''، ''نارنگ صاحب کی تقریریں''، ''نارنگ صاحب کی تصانیف و تالیفات''، ''نارنگ صاحب کے خطبات'' اس طرح کے عنوانات کی فہرست میں نے تیار کی ہے جو پچاس عنوانات پر مشتمل ہے اور ہر پہلو پر ایک کتاب ہونا چاہیے۔ اسی سلسلے کا ایک عنوان ''پروفیسر گوپی چند نارنگ: مشاہیر کی نظر میں'' ہے، حالانکہ مشاہیر کی تمام آراء چھپ چکی ہیں اور چھپتی رہیں گی لیکن انھیں سلسلے سے لکھنا اور کتابی شکل میں پیش کرنا الگ بات ہوگی۔ میں اس کی شروعات تو دنیائے ادب کی مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر کی اس رائے سے کرنا چاہتا تھا جو انھوں نے بیماری کی حالت میں بھجوائی تھی۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ وہ خود گوپی چند نارنگ صاحب کو پڑھ کر سنائیں، لیکن ان کی صحت نے اجازت نہ دی اور مجبوری میں ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے وہ تاثرات پڑھ کر سنائے۔ افسوس! وہ ایک تحریری دستیاب نہیں ہو سکی ہے ہم آئندہ بھی پیش کر سکیں گے۔ سچائی تو یہ ہے کہ نارنگ صاحب کی شخصیت اور ان کے فن پر، ان کی تقریروں پر، تصانیف و تالیفات پر، اردو زبان اور لسانیات پر، ان کی تھیوری پر، ان کی تنقید اور دیگر مضامین پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ انھیں الگ الگ پیش کیا جائے تو کئی کتابیں ہو سکتی ہیں۔ مشاہیر کی نظر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کیا اہمیت رکھتے ہیں، ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے یہ مشاہیر کی آراء سے ہم خوب سمجھ سکتے ہیں۔ نارنگ صاحب جب بھی لکھتے ہیں ان کی کتاب کا ایک موضوع ہوتی ہے اور اس میں ایک مرکزی thesis ہوتا ہے جس پر مختلف ابواب مختلف نکات کو مربوط طور پر پیش کرتا ہے تاکہ thesis آسانی سے ذہن نشین ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ کئی رسائل نے ان پر خاص نمبر شائع کیے ہیں، کئی کتابیں ان کی تقریروں، تحریروں پر مشتمل ہیں خاص طور پر انشاء (کلکتہ)، اصناف ادب (پٹنہ)، رنگ (دھنباد)، انتساب عالمی (سرونج)، چہار سو (راولپنڈی)، کاروان ادب (بھوپال)، کتاب نما (دہلی)، عالمی زبان (سرونج)، سبق اردو (الہ آباد) جیسے کئی رسائل ہیں جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ اگر ہم غالب کی بات کریں تو یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ گوپی چند نارنگ نے غالب کو از سر نو دریافت کیا ہے اور ایسی کتاب لکھ ڈالی ہے کہ ماہر غالبیات حیرت زدہ رہ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی نئی بستیوں میں اردو کی اہمیت کو، اردو کے مستقبل کو روشن کرنے میں گوپی چند نارنگ نے کیا کچھ نہیں کیا۔ بیرونی ممالک میں آج جو اردو کا چراغ روشن ہے اس میں گوپی چند نارنگ کا رول سب سے بڑا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی تقریریں تقریریں تو اپنی جگہ ہیں میں نے اردو کا ایسا سچا عاشق آج تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھا کہ جس کے ذہن و دل میں اردو اس طرح رچی بسی ہے کہ آج تک کوئی تقریر ایسی نہیں جس میں لفظ اردو نہ آیا ہو۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے ہر لمحہ اردو کے لئے سوچتے ہیں، اردو کے لئے جیتے ہیں۔ ایسے محسن اردو کی قربانیوں کو بھلا کون بھلا سکتا ہے جس کی رگ رگ میں اردو سمائی ہوئی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ جس نے اردو سے محبت کی

ہے اردو نے اسے شہرت و عزت سے نوازا ہے۔ یہ بات خود پروفیسر نارنگ نے کہی ہے۔ خدا جب کسی کو کوئی مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے، شہرت اور ہر دلعزیزی بخشتا ہے اس کے دل کو محبت کا سرچشمہ بنا دیتا ہے۔

گوپی چند نارنگ میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ وہ چھوٹوں سے پیار کرتے ہیں اور اپنے سے بڑے استادوں کا احترام کرتے ہیں، دوسروں کے کام آتے ہیں اور اردو سے محبت کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں، اپنے دوستوں پر جان دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کئی قابل دوستوں، شاگردوں کو نوکریاں دلائیں، کئی ایوارڈ دلوائے اور آج کئی اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر بڑی شخصیت کے کچھ حاسد بھی رہے ہیں۔ لوگوں نے پیغمبروں کو نہیں چھوڑا۔ گوپی چند نارنگ تو عام انسان ہیں لیکن خدا جب دیتا ہے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ وہ حاسدوں کو اپنا کام کرنے دیتے ہیں اور جس سے حسد کیا جائے اسے اور اعلیٰ مقام و مرتبے سے نوازتا ہے۔ پروفیسر نارنگ کو یہ مقام و مرتبہ خدا نے بخشا ہے۔ آج ان پر اہل اردو کو فخر ہے حق تو یہ ہے کہ اردو زبان بھی ان پر نازاں ہے۔ اس سے پہلے ہم گوپی چند نارنگ صاحب پر 'انتساب عالمی' کا ضخیم نمبر اور نارنگ صاحب پر دو کتابیں "گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید" اور "مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ" شائع کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم چند مشاہیر کی آرا پیش کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ وہ تمام حضرات ہیں جنھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ پر بہت کچھ لکھا ہے کئی مضامین، کئی کتابیں نارنگ صاحب کی شخصیت اور فن پر لکھ چکے ہیں۔ مشفق خواجہ تو ایک ایسی ہستی تھے کہ جن کا ایک کالم ہی ساری ادبی دنیا میں ہل چل مچا دیتا تھا۔ وہ جس پر کالم لکھ دیں تو شخصیت راتوں رات شہرت کی بلندیوں تک پہنچ جاتی تھی۔ پروفیسر نارنگ صاحب پر مشفق خواجہ نے ایک زبردست مضمون لکھا جو کئی کتابوں رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔ حالانکہ یہاں ہم مشاہیر کی مختصر مختصر رائے پیش کر رہے ہیں لیکن اس مختصر رائے میں بھی لکھنے والوں نے نارنگ صاحب کی پوری شخصیت اور کارناموں کو سمیٹ لیا ہے۔ مشفق خواجہ نے نارنگ صاحب کو ماہر لسانیات ہونے کی سند عطا کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین کا حوالہ دیا ہے کہ گیان چند جین جو کسی کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی نارنگ صاحب کو ماہر لسانیات قرار دے چکے ہیں۔ قمر جمیل پاکستان کی نامور ہستیوں میں شامل کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے نارنگ صاحب کی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' کو بہت اہم قرار دیا ہے بلکہ یہ تک کہہ دیا ہے کہ اب تک ادبی دنیا میں اس سے پہلے اس نوعیت کی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ سچائی تو یہ ہے کہ نارنگ صاحب نے اپنی زندگی کے تمام گہرے مشاہدات اور مطالعات کی روشنی میں جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہی معاملہ پاکستان میں ناصر عباس نیر اور قاضی عابد اور ہندوستان میں بالخصوص شافع قدوائی صاحب کا بھی ہے جن کی کئی کتابیں شائع ہو کر روشنی پھیلا چکی ہیں۔ ویسے پاکستان میں یہ کام بڑے پیمانے پر قمر جمیل اور فہیم اعظمی نے اپنے اپنے رسالوں میں 'نئی دریافت' اور 'صریر' کے ذریعے کیا تھا۔ زبان سے متعلق نارنگ صاحب کے مضامین، تقریریں اور اردو سے محبت کا جنون بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جب وہ کوئی تحقیقی مضمون لکھتے ہیں تو اس میں ان کی علمیت، قابلیت اور مطالعہ کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کوئی بات بغیر دلائل کے نہیں کرتے۔ ہر بات ٹھوس ثبوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری معتبر ادیب و نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کی ادارت میں 'نگار' جیسا پرچہ ہمیشہ پابندی سے نکلتا رہا جس کی ساری ادبی دنیا میں دھاک تھی۔ وہ ایک بڑے محقق نقاد تو تھے ہی ایک بڑے صحافی کی حیثیت سے بھی ان کا نام نمایاں طور پر لیا جاتا ہے۔ وہ نارنگ صاحب کو اس عہد کا صف اول کا ادیب و محقق نقاد قرار دیتے ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ نارنگ صاحب کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جس پر ادبی دنیا میں ہلچل پیدا نہ ہوئی ہو۔ نگار حسین نے نارنگ صاحب کی مابعد جدیدیت کے حوالے

نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ جدید ذہن سماجی و سیاسی مسائل سے غیر وابستہ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی کتنا صحیح لکھا ہے کہ نارنگ صاحب کسی ایک حصار میں بند نہیں کیے جا سکتے بلکہ ہر پل نیا سوچتے ہیں اور صرف سوچتے ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور ہر فیلڈ میں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

نارنگ صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی ان سے اختلاف بھی کرتا ہے تو وہ غصے میں نہیں آتے بلکہ اپنے علم کی روشنی میں اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مابعد جدیدیت نارنگ صاحب کا پیش کردہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس پر بہت سے اعتراض بھی ہوئے اور بہت سے نقادوں نے حمایت بھی کی اور یہ بحث اب تک جاری ہے لیکن اس سے ایک فائدہ نئی نسل کو ہوا کہ جدیدیوں نے لکھے لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دی، اچھے لکھنے والوں کو بھی نظر انداز کیا جب یہ فلسفہ فکر وجود میں آئی اور نارنگ صاحب اس کے بانی اور رہنما کہلائے جبکہ نارنگ صاحب خود کہتے ہیں کہ وہ کسی چیز کے بانی اور رہنما نہیں ہیں وہ صرف اس فکر و فلسفے کو سمجھاتے ہیں اور اس کی تفہیم کرتے ہیں کہ کوئی ادب میں حکم نامہ جاری نہیں کر سکتا۔ سچا اور کھرا ادب ہمیشہ حکم ناموں کو اور اوپر سے لادے ہوئے بے معنی فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ ادب میں پہلی شرط ادیب کی آزادی ہے۔ کئی تحریکیں آئے اور انہوں نے اپنے ہی حکم ناموں سے خود کو شہید کیا۔ مابعد جدیدیت جتنی آج کی سوچ ہر اس نظریے کو نکھارتی ہے جو ادیب کو کسی league پر چلانا چاہے۔ قارئین کو یاد ہوگا جب علی سردار جعفری نے فیض احمد فیض کی نظم "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" جو یوم آزادی پر تھی، پر اعتراض کیا تھا کہ یہ ترقی پسندی کے مطابق ہے۔ فیض اور سجاد ظہیر اس وقت جیل میں تھے فیض صاحب نے اس اعتراض کو کوئی اہمیت نہیں دی اور یہ کہہ کر حکم نامے نافذ کرنے والوں کو رد کر دیا کہ ہمارا تو جو دل ہے گا وہ ہم کہیں گے (جو دل پر گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے)۔ یہ ادب کی آزادی کا کھلا اعلان تھا لیکن ترقی پسندی کے بعد جدیدیت نے بھی کسی طرح کے الٹے سیدھے حکم نامے اپنے رسالے میں جاری کیے اور کئی رنگ چلے۔ آخر جدیدیت کو سماجی اور انسانی مسائل سے الگ تو کیا ہی تھا گلشن آزادی، بھائی چارے، انسانی وحدت اور سماجیت کا گلا بھی گھونٹ دیا اور فقط بدی، ویرانی اور بے معنی جدیت پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جدیدیت نے بھی اپنے ہی حربوں سے خودکشی کی۔ نارنگ صاحب کشادگی، انسان پرستی، محبت، اخوت، وحدت اور سماجیت کے حق میں ہیں۔ ادب کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ نہ صرف زبان و بیان، مختلف جمالیات اور سماجی مسائل کا حق ادا کرے بلکہ ہر ہر قدم پر ادب کی وحدت، آزادی، امن اور بھائی چارے کا دفاع کرے۔ آج اردو ادب میں جو کھلی فضا ہے اس میں نارنگ کی سوچ کا بڑا ہاتھ ہے کہ کوئی نظریہ آخری نظریہ نہیں ہوتا۔ ادب اول و آخر اپنے آپ میں سماجیت اور انسانیت کا نقیب ہے اور ان سب کے دفاع کے لیے جواب دہ ہے۔

اس طرح نئی نسل مایوسی کے دور سے نکل کر خود اعتمادی کے دور میں داخل ہوئی۔ انعام صدیقی جنھوں نے نارنگ صاحب پر کئی مضامین لکھے ہیں۔ انعام صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی تنقید سب سے جدا ہے وہ الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ تنقید میں شناخت قائم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن انعام صدیقی کی ایک لائن پڑھ کر قاری سمجھ لیتا ہے کہ یہ انعام صدیقی کی تنقید ہے۔ محمد ایوب واقف نے پروفیسر گوپی چند نارنگ پر ایک بڑا بہ دست مضمون لکھا کہ جو سات رسالوں میں اور کئی مختلف کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔ تسنیم طارق کی نسل کے ممتاز محقق نقاد ہیں جنھوں نے صوفیانہ تحریکات سے لے کر صوفی ادب پر کئی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ تسنیم طارق نے پروفیسر نارنگ کو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار قرار دیا ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے یوں تو نارنگ صاحب پر کئی مضامین لکھے ہیں لیکن ان کی ایک ضخیم کتاب "دید و دریافت" بھی نارنگ صاحب کی شخصیت اور فن پر شائع ہو چکی ہے۔ شہزاد انجم نے نارنگ صاحب کو ہندو مسلمان اتحاد اور تہذیب

کا بڑا اہم قرار دیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر خالد محمود نے اپنے مضمون کے آخر میں خوبصورت رائے پیش کی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی انسان ہیں ان سے بھی غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں یقیناً ان میں بھی کوئی خامی ہوگی لیکن جو خوبیاں ان میں ہیں وہ کسی دوسرے میں نہیں۔ ڈاکٹر اسد رضا ایک اچھے انشائیہ نگار اور خاکہ نگار ہیں انھوں نے بہت خوبصورت انداز میں نارنگ صاحب کا خاکہ لکھا ہے۔ حقانی القاسمی نئی نسل کے ایک اہم نقاد ہیں۔ انھوں نے نارنگ صاحب کے شخصی کمالات اور ان کی ادبی فتوحات پر گہرائی سے نظر ڈالی ہے۔ ابوذر ہاشمی نے اردو غزل اور ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے نارنگ صاحب کی اس کتاب کو ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی اردو کے علاوہ انگریزی کے بھی ممتاز مصنف ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ نارنگ صاحب نے ثقافتی عوامل اور اساطیر کے تفاعل پر اصرار کر کے تنقید کا ایک نیا محاورہ قائم کیا ہے اور اس نقطۂ نظر کے کئی جہات سے پردہ اٹھایا ہے۔ چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

قمر جمیل : حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ہوئی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' آئی ہے وہ مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد اردو تنقید کا سب سے اہم سنگ میل ہے جب سے اہم موڑ ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات کے مباحث ایک طویل عرصے سے 'اوراق' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فکشن کی شعریات، رد تشکیل، قاری اساس تنقید، سنسکرت شعریات پر نارنگ صاحب کے مضامین اردو میں انتہائی قیمتی اضافہ ہیں۔ مغرب کے ہر اس مفکر کے بارے میں جس نے ساختیات پر کوئی اضافہ کیا ہے، اس کتاب میں بے مثال گفتگو کی جائے گی اور پھر مابعد جدیدیت کے مسائل بھی اٹھائے ہیں۔ تنقید کے نئے ماڈل کی ایسی نشاندہی کی ہے جس کی مثال اردو ہی میں کیا غیر ملکی زبانوں میں بھی کم نظر آتی ہے۔ حالی کی کتاب میں جس مغربی فکر کی تھوڑی سی جھلک ملتی ہے وہی مغربی فکر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نارنگ صاحب کی اس کتاب میں نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ سنسکرت، فارسی اور عربی شعریات پر نارنگ صاحب کو جو عبور حاصل ہے وہ اردو کی شاید ہی کسی کتاب میں نظر آئے، بلکہ یہ انتہائی غلط ہوگا اگر میں یہ نہ لکھوں کہ اردو میں اب تک تنقید تھیوری پر اس سے زیادہ معتبر اور اہم کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ مجھے اس میں شبہ نہیں کہ یہی کتاب اردو کی نظریاتی تنقید کی سب سے بڑی کتاب ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ عہد حاضر کے ان لکھنے والوں میں ہیں جن کا شمار صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ادیب اور صف اول کا ادیب ہونا عمر بھر کی ریاضت قلم کا حاصل و مطالعاتی شغف کا ثمر ہوتا ہے، چنانچہ یہ رتبہ بلند سب کو نہیں کسی کسی کو میسر آتا ہے، بقول شاعر:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس عظیم منصب پر فائز ہونے والے صاحب قلم کو بعض نے اسکالر اور دانشور کا نام دیا ہے، بعض نے نقاد و محقق کے نام سے پکارا ہے اور بعض نے زبان و ادب کے ماہر و مزاج شناس سے موسوم کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر نارنگ کو ان کے علم و فضل اور ان کی لسانی و ادبی خدمات کے حوالے سے خواہ کتنے ہی القاب سے ملقب اور کتنی ہی صفات سے متصف کریں آخر کار یہاں یہی کہنا ہوگا کہ وہ صف اول کے ادیب ہیں۔

مشفق خواجہ : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ظاہری اور باطنی کمالات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کی نقادی کا لوہا فضیل جعفری جیسے تند مزاج نے بھی مانا ہے، جو اپنے علاوہ کسی اور کو نقاد ماننے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے ہیں

اپنے بارے میں اس لیے نہیں سوچتے کہ مسلمات پر بحث کرنا ان کی عادت نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کو ماہر لسانیات ہونے کی سند ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی عطا کی ہے، جو خود اس میدان کے شہسواروں میں سے ہیں اور شہسوار بھی ایسے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری جیسے جید عالم کو بھی اپنے توسن لسانیات کی بھی گرد بنا ڈالا تھا اور بعد میں معذرت بھی کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ کے سلسلے میں وہ معذرت کا ارادہ نہیں رکھتے۔

انتظار حسین : ہندوستان کا ایک نمائندہ یہاں آیا ہے اور وہ ہمیں ایڈریس کر رہا ہے تو پورے ہندوستان کی گویا وہ نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ باقی جو ادیب ہوتے ہیں، ان کی یہ حیثیت نہیں بن پاتی لیکن نارنگ صاحب کی یہ حیثیت ہے کہ جب وہ پاکستان جاتے ہیں اور پاکستان کے کسی اسٹیج پر کھڑے ہوتے ہیں اور خطاب کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ پورا ہندوستان ہم سے خطاب کر رہا ہے۔

انتظار حسین : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی یہ بات نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے کہ جس طرح ترقی پسندوں کی حماقتوں سے سبق سیکھنے کی ضرورت تھی اسی طرح جدیدیت والوں کی حماقتوں سے بھی سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ سچ کی بات یہ ہے کہ ادب آئیڈیالوجی سے بیگانہ محض بھی نہیں۔ یہ وہ حماقت ہے جو جدیدیت والوں نے ترقی پسندوں کی ضد میں کی تھی ڈاکٹر نارنگ بالاصرار کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ مابعد جدیدیت یا پایا ادب سماجی و سیاسی مسائل سے غیر وابستہ نہیں ہو سکتا۔ میں جب اپنے حساب سے دیکھتا ہوں تو مجھے ان کی تین کتابوں کا جو سلسلہ اب جاری ہوا ہے مجھے سب سے زیادہ اہم اور تاریخ ساز کام نظر آتا ہے۔ وہ تین کتابوں کا سلسلہ اس طریقے سے ہے کہ انھوں نے جس طریقے سے اردو زبان پر کام کیا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں، ہندوستان کی فکر میں اور ہندوستان کے احساس کی تہہ میں اردو زبان اور اردو ادب کی جڑیں کس طریقے سے پیوست ہیں۔ پہلی کتاب جو ہے وہ اردو مثنویوں کے حوالے سے ہے۔ انھوں نے جس طریقے سے ہمارے سامنے اس کا تجزیہ کیا اور توضیح کی ہے تو یہ ساری اردو مثنویوں کی جو روایت ہے، پتہ چلتا ہے کہ عجم سے تو اس کا سرسری تعلق ہے اصل میں ہندوستان کی سرزمین میں اس کی جڑیں ہیں، بلکہ وہ قصے بھی جو کہ عجم و عرب سے آئے وہ اردو مثنوی میں آکر Indianize ہو گئے۔

اس کے بعد جو سب سے زیادہ مشکل کام مجھے نظر آیا اور جس کے لیے بڑی گہرائی کی ضرورت تھی وہ ہے ان کا اردو غزل کا مطالعہ۔ اردو غزل کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ عجمی روایت کی پیداوار ہے، فارسی غزل سے اس کا تعلق ہے اور اس کے سارے symbols جو ہیں یعنی تلمیحات وہ سب وہاں سے آئی ہیں اور اس پر اعتراض بھی یہی ہوتا تھا جو اردو کے مخالف تھے وہ کہتے تھے کہ اس صنف کا تعلق تو اس سرزمین سے ہے ہی نہیں، اس کے پیکر جو ہیں وہ بھی وہاں سے آئے ہیں اور اس کے جو استعارے ہیں، تلمیحات ہیں وہ سب عجم اور عرب کی دنیا سے آئی ہیں لیکن جس طریقے سے اس پر نارنگ صاحب نے کام کیا ہے اور انھیں بتایا ہے کہ اس میں جو عشق کا تصور ہے، یا حسن کا تصور اس میں ہے تو اس کا انھوں نے تجزیہ کیا اور کہا کہ یہ وہ تصور ہے ہی نہیں جو فارسی غزل میں آپ کو نظر آئے گا یا عربی کی شاعری میں نظر آئے گا۔ یہاں جو حسن کا تصور ہے، ہندوستان کی جو فکری روایت ہے اور جو جمالیاتی روایت ہے تو Vedic عہد سے وہ چلے ہیں اور وہاں سے تجزیہ کرتے کرتے بتایا ہے کہ حسن اور عشق کا تصور جسے ہندوستان کی فکر نے جنم دیا ہے اور ہندوستان کے جذبات اور احساسات نے جس کی پرورش کی ہے تو وہ تصور جو ہے غزل میں آیا ہے۔ اردو غزل جو ہے ان کا thesis یہ ہے، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ فارسی غزل سے بالکل مختلف چیز ہے۔ میرے خیال سے یہ ایک ایسا تجزیہ ہے جو بالکل تاریخ ساز ہے۔ سارا تصور جو اردو شاعری کے بارے

میں ہے اس تحقیق کے بعد بدل جاتا ہے۔ یہ ساری جدید تاریخ ہے ہندوستان کی، اس میں اردو زبان اور اردو شاعری کا کتنا عمل دخل ہے مثلاً یہاں کی تحریکِ آزادی میں بھی اردو شاعری نے کس طریقے سے حصہ لیا ہے۔ یہ اس سلسلے کی تیسری کتاب ہے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ مثلاً جو مشہور شعر ہیں جو بالکل folk شاعری بن گئے ہیں وہ اردو کے شعر ہیں یا جو نعرے آئے انقلاب زندہ باد اس قسم کے وہ سارے اردو سے مستعار ہیں۔ جب تحریکِ آزادی چلے گئے ہیں اور زیادہ تر بھی ہیں ہندی زبان سے ان کا اپنا کنٹری بیوشن ہے، لیکن جس طریقے سے اردو زبان نے اس تحریک کو فیض پہنچایا ہے اور تقویت دی ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔ یہ تین کتابوں کا سلسلہ ہے وہ اتنا اہم ہے اور اتنا تاریخ ساز ہے کہ اس سے اردو زبان اور اردو شاعری کے بارے میں ہمارا پورا تصور ہی بدل جاتا ہے اور وہ سارے اعتراضات جو ہوتے رہے ہیں اس روایت پر اور اس زبان پر کہ اس کا اس دھرتی سے ناتا نہیں ہے وہ سب بالکل دھوئیں کی طرح اڑ جاتا ہے تو میرے خیال میں یہ بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے اور میں اس کے لئے نارنگ صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ یہ کام کوئی بڑا محقق اور بڑا نقاد ہی کر سکتا تھا چھوٹے قد کے نقاد اور محقق کے بس کی بات نہیں تھی۔

گیان چند جین : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے محقق ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ دعویٰ تو وہ نقاد ہونے، ماہرِ لسانیات ہونے یا مفکر ہونے کا بھی نہیں کرتے۔ اپنے زیادہ تر بیانات میں انھوں نے خود کو 'طالب علم' کہا ہے۔ البتہ انھوں نے ایک جگہ ضرور لکھا ہے کہ "ان کے کام کی ابتدا ادبی تحقیق سے ہوئی"۔ جب میں نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا ہوگا۔ اب تحریر کر رہا ہوں تو خود کو اعتراف کرنے پر مجبور پا رہا ہوں کہ غالباً وہ اردو میں پہلے آدمی تھے جنھوں نے اردو مثنویوں میں ہندوستانی قصوں کی تحقیق اور امیر خسرو کے ہندوی کلام کی تحقیق کو لے کر اردو کی عوامی روایت اور لوک ادب کی بازیافت پر جم کر کام کیا اور اپنے اس کام کے ذریعے اردو تحقیق کی سخت گیر اور بے لچک روش پر بڑا احتجاج بھی کیا۔

پروفیسر قمر رئیس : بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں اردو کی ادبی تنقید کے دھندلے افق پر جو ستارے روشن ہوئے ان میں گوپی چند نارنگ کا نام امتیازِ خاص اس لئے رکھتا ہے کہ اس درخشاں ستارے کی آب و تاب میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ایک منفرد اور معتبر نقاد کی حیثیت سے ان کی مقبولیت میں مسلسل توسیع ہوتی رہی۔ معاصرین پر ان کے اثرات کا گراف بڑھتا رہا۔ بعض دوسرے معاصرین کی طرح ان کے اس شغلے میں جمود و تعطل کے آثار کبھی دکھائی نہیں دیتے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری : یاد رہے کہ اپنے عہد کے حالات کے شعور سے بہرہ مند یا متاثر ہونا ایک بات اور اس کا تابع محض یا تر سیلہ کار ہونا دوسری بات ہے اس میں معاصر صورتِ حال اور اس میں کشادگی اور آزادگی کے تقاضوں کا جن چند لوگوں کو ادراک ہوا ان میں گوپی چند نارنگ پیش پیش ہیں انھوں نے ادیب کی آزادانہ ذاتی ذمہ داری پر زور دار وکالت کرتے ہوئے کسی نظریے میں حصار بند ہونے کو غلط ٹھہرایا۔

جوگندر پال : نارنگ اپنے دور میں ادبی الحکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے تنقیدی لائحہ عمل میں تبدیلیوں کی گنجائش برابر رکھتے رہے۔ جس طرح کوئی شخص واحد چھوٹے سے بڑا ہوتا ہے ہمہ انسانی تحریکیں بھی بڑی اور بالغ نہ ہوتی چلی جائیں اور ان میں مناسب تبدیلیاں ممنوع قرار دی جائیں تو ہوتے ہوتے وہ بے مصرف ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ نارنگ نے نئی صورتِ حال میں اپنی سوچ میں کچھ کمی یا بیجا محسوس کیا تو رائج جدیدیت کی دھاندلیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی ذمہ داری قبول کیے بغیر نہ رہ سکے اور نئے دور کی تخلیقی ضرورتوں

کے ذریعہ نظر ادب کے قارئین کو مابعد جدیدیت سے روشناس کرانے کی ٹھان لی۔

محمود سعیدی : یہ کہنا بار بار کی دہرائی بات کو دہرانا ہوگا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ایک ہشت جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ بالغ نظر ادبی نقاد، ثقافتی دانشور، تہذیبی مفکر، ان کی کئی حیثیتیں ہیں اور یہ سبھی حیثیتیں پوری اردو دنیا میں جانی جاتی ہیں۔ اردو دنیا ہی کیا دوسری کئی زبانوں میں بھی ان کی علمیت کی دھوم ہے لیکن انھوں نے مختلف سطحوں پر اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اردو کی جڑوں کی تلاش و تحقیق کا معاملہ یا اردو کے تہذیبی و تمدنی تفاعل کا، نارنگ صاحب نے جس ذاتی انہماک اور جس تبحر علمی کے ساتھ بہت سے مشکل سوالوں کو آسان کر دکھایا ہے وہ انھیں کا کام ہے۔

گلزار : نارنگ صاحب کی انگلی اور ان کا ہاتھ ہر وقت ادب کی نبض پر رہتا ہے اور وہ صرف اردو اور ہندی کا literature ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں پر بھی ان کی نظر رہتی ہے۔ World literature کے mainstream سے ؟ کا نظر آتے ہیں اس لئے ان کا perspective بہت بڑا ہے۔ مارکسزم بھی، پوسٹ ماڈرنزم پر جب وہ بات کہتے ہیں تو پوری شکل کر واضح ہو کر بات سامنے آتی ہے۔

دو پاؤں پہ ہوتا دیا ایک پاؤں پہ تصویری جمیل　　جمیل کی تابھی یہ رنگی ہے اردو کی روشن قندیل

پروفیسر شافع قدوائی: گوپی چند نارنگ نے ادب کے مطالعہ میں ثقافتی حوالوں اور اساطیر کے تفاعل پر اصرار کر کے ایک نیا تنقیدی محاورہ قائم کرنے کی کوشش کی اور اسلوبیاتی خصائص کو بھی مرکز بنایا۔

نظام صدیقی : پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کئی تھیوری کے نئے رخ کی مزید فکریاتی اور جمالیاتی رعنائی اور توانائی کے لیے سنسکرت شعریات اور عربی و فارسی شعریات کا نہایت عمیق تیز سے طرفہ مکالماتی تھیوری کے دوسرے اردوئی مابعد جدید تناظر میں پہلے ہی ہمیشہ کے لیے قائم و دائم کر دیا ہے۔ اس کا فکریاتی اور حسن یاتی فیضان جاری ہے جو بیحد موثر اور کارگر ثابت ہوگا۔ یہ ہماری اپنی Towards Orient پالیسی کے مطابق ہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی : پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتابیں "اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب" اور "ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری" ان دو کتابوں کے ذریعے اطلاقی نظر اور رویے کو بنیادی اہمیت دی۔ ادب کی آفاقی قدروں کو وسیلہ بنا کر مخصوص تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو نشان زد کیا ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی شناخت کو نشان زد کرتے ہوئے آفاقیت اور مقامیت کی کشاکش کو ادب کے حوالے سے بڑی گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

محمد ایوب واقف : جناب گوپی چند نارنگ صاحب اردو زبان و ادب اور ہم اردو والوں کے لیے ایک ایسے متبرک اور عطیہ خدا وندی ہیں کہ جس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ دو چار سال سے نہیں بلکہ گزشتہ ساٹھ سال سے عالمی سطح پر اردو کے ایسے معرکۃ الآرا، عظیم الشان اور پائیدار ذخیرے ہیں کہ جس کی زبان پر حرف اردو کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ وہ اردو کی شان و عظمت کے نشان اور اس کی علامت (Insignia) ہیں۔ ان پر یہ رشک کرنا کہ وہ اردو زبان اور مسلم قوم کے لیے دشنام آمیز (Opprobrium) کلمات استعمال کرنے والے کسی شخص کے حامی و طرفدار ہوں گے محل نظر ہے ہم ایسے تمام شکوک و شبہات کو بیک قلم خارج کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ جناب گوپی چند نارنگ اپنی زندگی کے ہر دور میں اردو زبان، اس کے رسم الخط اور اس کے شعر و ادب کے

ترجمان اور نگہبان رہے ہیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی: گوپی چند نارنگ حسن و عشق، جمال و شباب کے ہر عمل کو تہذیب کے مظاہر مانتے ہوئے اس میں ارضیت، مقامیت، ثقافت اور زندگی کی معنویت تلاش کر لیتے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب تصور واضح ہو، نقطۂ نظر صاف اور فکر گہری اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت ہو۔ فکر کا ارتباط، تسلسل بیان اور معنیاتی انسلاک پر حرف نہ آنے پائے۔ نارنگ ایک نہایت گٹھے ہوئے انداز میں اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں کہ فکر و معنی خوشبو کی طرح رچتے بستے چلے جاتے ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پینتالیس برس قبل ذہن و ضمیر کی آزادی کا جو تصور قائم کیا تھا اسے انھوں نے آج تک قائم رکھا ہے جو بھی نیا رجحان، نئی تحریک یا نیا رویہ سامنے آیا اس کا تعارف انھوں نے نئی نسل سے کرایا اور یہ سلسلہ لگاتار جاری ہے۔

پروفیسر صادق: گزشتہ برسوں میں جن جدید نقادوں نے اردو فکشن کی تنقید کو اعتبار کا درجہ عطا کیا ہے ان میں گوپی چند نارنگ کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ گوپی چند نارنگ بنیادی طور پر فکشن ہی کے نقاد ہیں مگر بعد ازاں لسانیات کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ لسانیات سے ایک رابطۂ خاص کے باوجود انھوں نے فکشن کی تنقید سے منہ نہیں موڑا۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویوں کا مطالعہ ایک تحقیقی مطالعہ تھا جس کے توسط سے وہ کلاسیکی مشرقی ادب کے ان سلسلوں تک پہنچے تھے جن پر ہماری نظر بہت کم گئی تھی بلکہ یہ وہ سلسلے تھے جو آہستہ آہستہ ہماری یادداشتوں سے مٹتے جا رہے تھے۔

شمیم طارق: اردو رسم الخط ہندوستانی ہے اور اس کو تبدیل کرنا صرف اردو کی انفرادیت سے محروم ہو جانے کے مترادف ہے بلکہ قومی یکجہتی، لسانیاتی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے بھی ناقابلِ قبول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو رسم الخط سے متعلق نارنگ کا موقف اردو بولنے لکھنے والوں کے اجتماعی شعور و لاشعور کو سائنسی بنیاد دینے کی آواز ہے۔

پروفیسر شہزاد انجم: پروفیسر گوپی چند نارنگ کے علمی و فکری سفر کی نصف صدی سے زیادہ مدت مکمل ہو چکی ہے۔ انھوں نے اردو تنقید کو فلسفۂ ادب کی نئی بصیرتوں سے مالا مال کیا ہے اور نظریہ سازی پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کی پوری شخصیت اس عظیم ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی روح کا حسین امتزاج ہے جو ہمارا تہذیبی و ثقافتی ورثہ ہے۔ پروفیسر نارنگ نے ہمیشہ اپنی تحریروں و تقریروں میں مشترک تہذیب اور اردو ادب کی ان بنیادی قدروں پر گفتگو کی ہے جو ہندوؤں مسلمانوں کے ارتباط سے وجود میں آئیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے جس ادارے میں قدم رکھا اس کی رہنمائی و سربراہی کی وہ ادارہ اپنی قسمت پر نازاں ہوا اور رشک کرنے لگا۔

پروفیسر خالد محمود: نارنگ صاحب کے عہد میں مکمل کیے گئے اور آغاز کیے گئے تمام کاموں کا تفصیلی جائزہ اور ان کے انٹرویوز جو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں جن کی روشنی میں ان کاموں کی وسعت و اہمیت اور مقدار و معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھیں بھی اس بات کا ادراک و احساس ہے اور وہ کھلے دل سے اس حقیقت کا والہانہ انداز میں اعتراف کرتے ہیں۔ اردو نارنگ صاحب کا عشق ہے یہ عشق انھیں کسی وراثت کے تحت یا ترکے میں نہیں ملا بلکہ اردو کی زلف گرہ گیر نے انھیں خود اسیر کیا ہے۔ ان کی تقریر و تحریر کے ایک ایک جملے اور ایک ایک سطر سے ان کے عشق کا اظہار ہوتا ہے اور اسی عشق کی وجہ سے آج وہ اردو دنیا کی مقبول ترین ہستیوں میں شامل ہیں۔

حقانی القاسمی : گوپی چند نارنگ حسنِ شمیم، شمائل حمیدہ، حسنِ کلام سے متصف ہیں۔ وہ معدنِ صدق و صفا ہیں۔ ان کے شخصی کمالات اور فتوحات کی داستان "شبِ ہجراں" سے زیادہ دراز ہے۔ ان کے حسود و اعدا بھی ان کے شخصی اور تخلیقی وجود میں لطافت، نفاست اور نفوست سے انکار نہیں کرتے۔ ان کے معارض مابعد جدیدیت کو مسترد کرتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ نارنگ غیر معمولی ذہن کے ساتھ تخلیق شناسی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور تکلف سے کام نہیں لیتے۔ آج جبکہ ادب میں معاصرانہ گروہی روایت اپنی شدت کو پہنچ چکی ہے انھیں حقائق تک پہنچنے نہیں جہاں ذی حس کے ہجوم ہم نوا اور واقعہ نظریے کے داغ بنتے پھرتے ہیں وہیں نارنگ اپنے تقیص کو نکھارتے ہوئے بھی ملاطفت اور تمکنت کا ثبوت دیتے ہیں۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی : پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات پر بھی کھل کر لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں ساختیاتی مارکسیت اور نئی مارکسیت کا تنقیدی تعارف بھی باضابطہ طور پر تھیوری کی پوری آگہی کے ساتھ سب سے پہلے گوپی چند نارنگ نے دیا۔ تعجب یہ ہے کہ یہ توفیق نئے پرانے ترقی پسندوں میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور اس راہ میں پہلا قدم نارنگ ہی کو اٹھانا پڑا۔

کوثر صدیقی : نارنگ صاحب اجتہادی فکر و عمل کے انسان ہیں۔ انھوں نے زبان اور علم زبان سے متعلق بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ ان کا تازہ معرکہ مابعد جدیدیت کی کشادگی آموز تحریک ہے۔ اس تاریخی تحریک کے وہ قائد بھی ہیں اور شارح بھی۔ یہ ان کی شخصیت کا ایسا پہلو ہے جس پر آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا اور نارنگ صاحب کو بھی اردو کی جھولی میں اپنے تحقیقی خیالات و افکار کی کتنی دولت انڈیلنی ہے یہ بھی آنے والا وقت بتائے گا۔

ابوذر ہاشمی : اگر ہم یہ کہیں کہ 'غزل رنگ نارنگ' نے پہلی بار اردو غزل کا مبسوط اور مربوط مطالعہ ہندوستانی ذہن اور تہذیب کے پس منظر میں ناقابلِ تردید دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے تو بیجا نہ ہوگا لیکن اس دعوے کی دلیل 'آفتاب آمد دلیلِ آفتاب' کے مصداق نارنگ کی وقیع و عظیم کتاب "اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب" اس دعوے کی وہ تنقیدی و تحقیقی دلیل ہے جو مطالعہ غزل کو ایک نیا سیاق فراہم کرتی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل کا کوئی مورخ اس سیاق کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔

یہ چند اقتباسات پیش کرکے ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ نارنگ صاحب کی شخصیت، ان کی علمیت اور قابلیت کا ایک ایک پہلو ہمارے سامنے آجائے کیونکہ طویل طویل مضامین ہر شخص پڑھ نہیں سکتا اس لیے مشاہیر کی مختصر اور جامع رائے پیش کرکے ہم نارنگ صاحب کی قابلیت اور علمیت سے خود بھی واقف ہونا چاہتے ہیں اور عام قاری کو بھی بتانا چاہتے ہیں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی عظیم ہستیاں دنیا میں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ ایسی ہستیاں ہمارے لیے، ہمارے وطن کے لیے فخر کی چیز ہیں۔ اگر ہم ان کی تقریروں تحریروں سے استفادہ نہ کر سکیں تو یہ ہماری بڑی کمی ہوگی۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا کے تمام معتبر ادیبوں نقادوں کی رائے پیش کرسکیں۔ ابھی سیکڑوں مشاہیر ایسے ہیں جن پر لکھنا باقی ہے جسے ہم آئندہ پیش کرسکیں گے۔

◆◆◆

حرکتِ فکرِ اسلامی فی الہند [1]

محمد بن قاسم (711ء) سے تغلق خاندان (1412ء) تک

ظفر سپل

پیغمبرِ مستقبل کا صورتی ہوتا ہے؟ حضرت محمدؐ نے جب یہ کہا کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے (حدیث نبوی) تو یہ محض آج کے سیاست دان کا پایا ہوا بیان نہیں تھا۔ ختم الرسلؐ کے پیغمبرانہ وجدان کی آنکھ کے سامنے ایک نقشہ دھرا تھا جو قیامت تک کے زمانوں کا احاطہ کرتا تھا، پھیلتا تھا اور سکڑتا تھا، بنتا تھا اور بگڑتا تھا اور اس میں عظیم ہندوستان تھا، جس کی طرف پیغمبرِ خداؐ دیکھتے تھے اور یہ انہیں بھلا لگتا تھا اور اس طرف سے انہیں خوشبوئے ربانی آتی تھی۔ تو عظیم جغرافیائی پھیلاؤ پر مشتمل ہندوستان کے دروازے پر آ کر اگر اسلام نے وقت کی دی زمانوں کے پھیلاؤں کے ساتھ چلا پھولا تو یہ محض ایک تجارتی، سیاسی، عسکری اتفاق نہیں تھا بلکہ یہ اس عظیم کائناتی منصوبے کا ایک حصہ ہے جس نے اپنے اغراض و مقاصد ابھی تک مکمل واضح نہیں کیے۔

اور یہ جو مذہبی روایت بیان کی جاتی ہے کہ جنت سے نکالے جانے کے بعد حضرت آدم ہندوستان کے جنوبی جزیرے سری لنکا میں اترے تو کیا یہ محض ایک اتفاق تھا؟ آزاد بلگرامی ایک قدم اور آگے جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں

> ''جب آدم سب سے پہلے ہندوستان اترے تو یہاں پر وحی آئی۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی اور چونکہ نورِ محمدؐ حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہؐ کا ابتدائی ظہور اسی سرزمین میں ہوا اسی لیے آپ نے فرمایا کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے۔'' (ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر۔ سید صباح الدین)

اگر نقشے کو اپنے سامنے میز پر پھیلا لیں اور عرب کے جنوبی ساحل پر کھڑے ہوں تو سامنے ہندوستان ہے، جہاں سندھ کے ساحل نظر آتے ہیں اور بیچوں بیچ بحیرہ عرب بہتا ہے۔ اب یہ ایک ایسا فطری جغرافیائی تعلق ہے کہ طلوعِ اسلام سے پہلے ہی ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی رابطے بن چکے تھے اور ہندوستان کے مصالحے، پھل اور دوسری چیزیں اولاً بحری راستے سے یمن اور پھر خشکی کے راستے مصر، شام اور اس سے پرے مغرب تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ عظیم، قدیم اور پراسرار ہندوستان جہاں ویدوں کی تخلیق کا زمانہ 2000 ق م بتایا جاتا ہے، لگ بھگ اسی زمانے میں آریائی نسل کے لوگ وسط ایشیا سے اٹھے اور ہندوستان میں داخل ہو گئے۔ یہ یہاں کے مقامی لوگوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور تھے۔ اس سرزمین پر ذات پات کا نظام پہلے ہی موجود تھا سو انہوں نے یہاں کی آبادی کو شودر قرار دیا اور خود حاکم بن گئے۔ 300 ق م میں بدھ نے پہلی بار اس برہمنی طاغوتی نظام پر ضرب کاری لگائی۔

اس نے ویدوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور چنڈالوں کی اجارہ داری کو ایک دفعہ تو ختم ہی کر دیا۔ یہ اسی نظام کے تحت ممکن ہوا کہ چندر گپت موریہ نامی (وفات 296 ق م) ایک شودر ہندوستان کا فرماں روا بن گیا۔ مگر چنڈالوں اور برہمنوں کے باطل نظام کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ چنانچہ گپت خاندان سے تعلق رکھنے والے بکرماجیت (375۔414ء) کے بعد اور خصوصاً چھٹی صدی عیسوی میں برہمنی تصورات نے دوبارہ زور پکڑ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ گپت دور کو، جو ہندو سامراج کا دور ہے، ہندومت کی نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اب 711ء میں — اور یہ مسلم عرب میں بنو امیہ کا زمانہ ہے — جب حجاج بن یوسف کے داماد محمد بن قاسم نے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھا تو اسے ایسے ہندوستان سے واسطہ پڑا جہاں آریائی برہمنی نظام، بدھ مت اور مہاویر جین کے تصورات کی باہمی آویزش نے ایک ایسے قلعے کو جنم دیا تھا جو پیچیدہ، اپنے ہی وجود میں سمٹا ہوا، پھیلا ہوا اور کسی حد تک خطرناک تھا۔

پانچویں اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں جب محمد بن قاسم سندھ کے ساحل پر اترا اور پھر اس نے سندھ کو فتح کر لیا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے پاس کوئی بڑا فوجی لشکر تھا یا وہ جسمانی طور پر زیادہ مضبوط تھے بلکہ اس کی وجہ وہ زندگی بخش نظریہ تھا جو پرجوش، سادہ اور مستحکم تھا اور ان گنت زندگی عداوتوں کا انکار کرنے کی وجہ سے زندگی کی توانائی سے لبریز تھا۔۔۔ مگر اب اللہ جانے اس میں قدرت کی کیا مشیت ہے کہ محمد بن قاسم کو جلد ہی سب کچھ چھوڑ کر واپس جانا پڑا اور پھر ہمیں اگلے تین سو سال تک خطہ ہند میں کسی مسلمان سرمست یا کسی قابلِ ذکر مسلم فکری تحریک کی خبر نہیں ملتی۔ گو محمد بن قاسم کے بعد بھی سندھ کے علاقوں میں عرب حکومت کرتے رہے (شمالی ہند میں راجپوتوں کا بلا شرکت غیرے راج رہا) مگر اشاعت اسلام کی کسی منصوبہ بند کوشش کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ سید قاسم محمود (انسائیکلو پیڈیا مسلم انڈیا) حضرت امام حسن بصری کے دو شاگردوں حضرت امام ابو حفص ربیع بصری اور حضرت امام ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری کا ذکر کرتے ہیں جو ہندوستان تشریف لائے لیکن وہ غالباً جہادی لشکر کے ساتھ ہوں گے۔ اسی طرح شیخ محمد اکرام نے "آبِ کوثر" میں تبع تابعی شیخ ابو تراب کے مزار (تاریخ بنا 788ء) کا ذکر کیا ہے جو ٹھٹھہ سے دس میل کے فاصلے پر میرپور ساکرو میں ہے۔ یہ بزرگ بھی عباسی عہد میں سیاسی فرائض کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے تھے اور کسی اصلاحی تبلیغی مشن سے ان کا تعلق جوڑنا نامناسب ہوگا۔ مگر پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ عظیم اسلامی تمدن جس کا جوہر ہی اخوت، مساوات اور رواداری ہے، اس دوران میں سندھ کے ساحلوں سے ملتان کے ریگزاروں تک اپنے ان مٹ نقوش یادگار چھوڑ چکا تھا۔۔۔ مگر اب اس سرزمین کو اگلی تین صدیوں تک تلوار کے دھنی محمود غزنوی کا انتظار کرنا تھا جو عربوں کی طرح سندھ کے ساحلوں کی طرف سے نہیں، افغانستان کے پہاڑوں سے درہ خیبر کے راستے سے آیا اور اس کے اثرات زیادہ دیرپا تھے اور زیادہ دور رس۔۔۔ پنجاب اور بعد میں شمالی ہند کے دور دراز علاقوں تک۔

خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد جب اسلامی سلطنت کی وحدت کا خاتمہ ہوا تو مرکزی حکومت کی بجائے کئی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ جن میں سے تین قابلِ ذکر ہیں ایک تو سامانی حکومت ہے جو ماوراء النہر میں قائم ہوئی۔ اس کا دارالحکومت بخارا تھا اور اس سلطنت میں افغانستان اور خراسان شامل تھے۔ دوسری حکومت کا نام بنی بویہ ہے۔ یہ حکومت بھی سامانیوں کی طرح ایک ایرانی خاندان نے قائم کی تھی اور خراسان کو چھوڑ کر باقی ایران اور عراق اس کے قبضے میں تھا۔ اصفہان اور بغداد اس کے مشہور شہر تھے۔ بنی بویہ مسلکاً شیعہ تھے۔ تیسری حکومت شمالی افریقہ کے شہر قیروان میں قائم ہوئی۔ اس سلطنت کا بانی عبیداللہ با اختلاف رائے چونکہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد

میں سے تھا اس لیے یہ حکومت سلطنت فاطمیہ کہلائی۔ فاطمی خلفاء شیعہ مذہب کی ایک شاخ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔۔۔۔ ہمارے ممدوح اور عظیم فاتح ہند محمود غزنوی کے ذکر کا حوالہ سامانی سلطنت ہے!!

ہوا یوں کہ جب سامانی تخت کمزور ہوا اور مختلف صوبہ داروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تو ان بغاوت کرنے والوں میں ایک محمود غزنوی کا دادا الپتگین بھی تھا جو بلخ کا گورنر تھا۔ الپتگین نے سامانی لشکر کو شکست دی اور غزنی پر قبضہ کر کے ایک مستقل حکومت، تخت غزنی کی بنیاد رکھی۔ الپتگین کے بعد اس کے داماد امیر سبکتگین نے آگے بڑھ کر قرداسان اور جلال آباد پر قبضہ کر لیا۔ اسی سبکتگین کے زمانے میں مسلمان پہلی بار درہ خیبر کے راستے پاکستان میں داخل ہوئے اور وہ اس طرح کہ اس زمانے میں تخت لاہور پر ایک ہندو راجہ جے پال براجمان تھا اور اس کی حکومت پشاور سے آگے کابل تک پھیلی ہوئی تھی۔ جے پال کو غزنویوں کی کشور کشائی پسند نہیں آئی اور اس نے غزنی پر حملہ کر دیا مگر شکست کھائی، گرفتار ہوا اور طوق اطاعت گلے میں ڈال کر جان بچائی۔ مگر واپس آ کر اس نے شمالی ہند کے تمام مہاراجوں کو غیرت دلا کر ایک بڑی مشترکہ فوج بنائی اور ایک بار پھر حملہ آور ہوا مگر اس دفعہ پھر اسے شکست ہوئی اور سبکتگین نے وادی پشاور پر قبضہ کر لیا۔ محمود غزنوی (وفات 1030ء) 997ء میں برسر اقتدار آیا اور اس کی فتوحات خصوصاً ہندوستان پر 17 حملوں کا تذکرہ وقت چاہتا ہے مگر کم از کم یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا کہ ہندوستان کے راجاؤں کے بار بار کے حملوں سے تنگ آ کر اس نے ہندوستان پر بار بار حملے کیے اور لاہور کو براہ راست اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بعد اسے ایاز کے حوالے کر دیا۔۔۔۔ وہی لاہور، جہاں ایک اور سلطنت، ایک اور حکومت قائم ہونے والی تھی، سرزمین ہند میں پہلے صوفی درویش کی حکومت۔۔۔۔ سید علی ہجویری کی حکومت، ایک ایسی حکومت جس کے چشمہ فیض نے تمام خطہ ہند کو جلد یا بدیر سیراب کرنا تھا۔

سید علی بن عثمان ہجویری 1009ء (400 ہجری) کے آس پاس غزنی میں پیدا ہوئے۔ ایام جوانی میں ان کا محمود غزنوی کے دربار میں آنا جانا ثابت ہے۔ آپ 35۔40 سال کی عمر میں مسعود غزنوی کے دور کے آخری دنوں میں مسعود غزنوی کے ساتھ لاہور آئے۔۔۔۔ میں اسے تاریخ ہند کا ایک اہم موڑ قرار دیتا ہوں۔ ایک ایسا موڑ جب قدرت تاریخ کے سب سے صحت مند اور جدید سماجی سیاسی نظام کے خدوخال کو پوری وضاحت کے ساتھ ہندوستان کے گلے سڑے سماج میں متعارف کرانے کی منصوبہ بندی کر رہی تھی اور اس کے لیے سید علی ہجویری کا انتخاب کیا گیا۔ علی ہجویری اپنے مشن میں کامیاب رہے۔ آغاز کار ہی میں مسعود غزنوی کے نائب اور لاہور کے صوبے دار راجے راجو نے اسلام قبول کر لیا جو ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ غزالی کے ہمعصر سید علی ہجویری تصوف کی تاریخ کے دوسرے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ تصوف کی تاریخ کے پہلے دور کی دوسری پرت میں منصور حلاج، ذوالنون مصری اور بایزید بسطامی جیسے سرمستوں کے بلند آہنگ اور غیر محتاط صوفیانہ نعروں نے راسخ العقیدہ عناصر کو چونکا کر اپنے مورچوں میں مضطرب کر دیا تھا۔ سو علی ہجویری اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں غزالی ہی کی طرح انسان دوستی کے مسلک پر مبنی تصوف کو اسلامی شریعت سے ہم آہنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ ابھی شیخ شہاب الدین سہروردی کی ''عوارف المعارف'' اور ابن عربی کی ''فصوص الحکم'' وجود میں نہیں آئی تھیں اور نہ ہی صاحب کرامت صوفیا کے محیر العقول واقعات پر مشتمل ملفوظات کے ان مجموعوں کی بھرمار ہوئی تھی، جن کی قسمت میں آج کے عقلی دور کے میزان پر مسترد کر دیا جانا تھا۔ کشف المحجوب ایک متوازن صوفیانہ نظام پیش کرنے کا چیلنج قبول کرتی ہے اور حیران کن بات ہے کہ اسے

ہندوستان میں فکرِ اسلامی کی حرکت کے تحت ایک اہم موڑ پر تصوف اسلامی کی اولین کتاب کے طور پر پیش کر دیا گیا۔

سید علی ہجویری نے 1072ء (465 ہجری) میں لاہور ہی میں وفات پائی۔ مگر اس وقت تک وہ اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ اگرچہ سید علی ہجویری اپنے کام میں اکیلے نہیں تھے۔ اس عہد کی قریبی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں لاہور ہی میں شیخ اسماعیل لاہوری (1005ء) میں لاہور تشریف لائے اور ان کا نام واعظین اسلام میں اولین بزرگ کے طور پر لیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی مجلس وعظ میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا) سرزمین ہند میں اسلام کے تدریجی پھیلاؤ سے سندھ اور ملتان کے علاقے اچ (ریاست بہاولپور) میں شیخ صفی الدین گازرونی (پ 962ء وفات 1007ء) ملتان میں شاہ محمد یوسف گردیزی (پ۔ 1969ء، وفات 1152ء) ڈیرہ غازی خان (گاؤں کری کوٹ) میں سلطان سخی سرور (شہادت 1181ء) نظر آتے ہیں۔ مگر سید علی ہجویری کو بجا طور پر اپنے کام کے اثرات کے حوالے سے اپنے عہد کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔

تاریخ انسانی کے عظیم جرنیل محمود غزنوی کے دامن پر ایک ہی داغ ہے کہ اس نے لاہور کے علاوہ کسی مفتوحہ علاقے میں اپنی حکومت قائم نہیں کی۔ یہ تمغہ قدرت نے ایک پٹھان شہاب الدین غوری کے سینے پر سجانے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ شہاب الدین کے بڑے بھائی غیاث الدین غوری نے 1172ء میں غزنی کو باقاعدہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اس طرح محمود کے 17 ویں حملے (1027ء) اور غوریوں کی آمد اور سلسلہ فتوحات میں ڈیڑھ سو سال کا وقفہ بنتا ہے۔ یہ وہ وقفہ ہے جب راجپوتوں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو مستحکم اور منظم کرنے کی کوشش کی۔ کابل اور ہرات کے درمیان غور کے پہاڑی سلسلوں پر حکومت کرنے والے غوری نسلاً پٹھان تھے اور غزنوی تخت کے باجگذار۔ مگر انہوں نے بغاوت کی اور غزنی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ غیاث الدین غوری خود تو ہرات ہی میں مقیم رہا مگر اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین کو محمود غوری کے تخت غزنی پر بٹھا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ شہاب الدین غوری محمود غزنوی جتنا بڑا جرنیل نہیں تھا مگر اس سے کہیں بڑا سیاسی مدبر تھا۔ بعد میں اس نے آگے بڑھ کر لاہور، اچ اور ملتان پر بھی قبضہ کر لیا اور جب وہ بھٹنڈا فتح کر کے واپس جا رہا تھا تو تلاوڑی کے میدان میں بھٹنڈا کو واپس لینے کا عزم لے کر آنے والے دلیر پرتھوی راج سے اس کا آمنا سامنا ہوا اور مختصر سی فوج کے ساتھ لڑنے والے شہاب الدین غوری کو مات ہوئی۔ غیرت مند پٹھان پورے ایک سال راتوں میں کانٹوں کی سیج پر سویا اور دنوں کو جنگی تیاریاں کرتا رہا۔ 1193ء میں ایک بار پھر تلاوڑی کا میدان جنگ تھا اور پورے ہندی قوت کے ساتھ آنے والے بہادر پرتھوی راج کا سامنا۔ تلاوڑی کا میدان اس دفعہ غوری کے ہاتھ رہا جس نے آگے بڑھ کر دہلی اور اجمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف اس کے سپہ سالار بختیار خلجی نے بہار اور مشرقی پاکستان کو فتح کر لیا۔ یہ خطہ ہند کی تاریخ کا انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے کہ غور کے پہاڑوں سے اترنے والے پٹھانوں نے شمالی ہند اور آج کے پاکستان اور بنگلہ دیش پر مشتمل علاقوں پر پہلی بار اسلامی پرچم پوری آب و تاب کے ساتھ لہرا دیا۔

ذرا معاصر مسلم تاریخ پر نظر ڈالنے کی بھی ضرورت ہے کہ یہ وہ اہم دن ہیں جب غزنویوں سے خراسان چھیننے والے سلجوقی ترکوں کو خوارزم شاہی خاندانوں نے خراسان اور ترکستان سے بیدخل کر دیا تھا اور وہ برابر غوریوں سے پنجہ آزما رہتے تھے۔ ایک اسماعیلی فدائی کے ہاتھوں شہاب الدین غوری کی شہادت (1206ء) کے بعد خوارزم شاہ نے غزنی اور ہرات میں غوری سلطنت کا

خاتمہ کر دیا۔ مگر اس سے پہلے شہاب الدین غوری اپنا تاریخی کردار مکمل کر چکا تھا۔

بے حد معمولی شکل وصورت والے ذرخرید غلام قطب الدین ایبک کو شہاب الدین نے 1192ء میں دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا جو 1206ء میں اس کی شہادت کے بعد دہلی کا پہلا خودمختار مسلمان حکمران بن گیا۔ یہ مشہور خاندان غلاماں کی حکومت کی ابتدا تھی۔ قطب الدین ایبک کے بعد اس کا ایک غلام التمش تخت پر بیٹھا اور اس نے 1211ء سے 1236ء تک حکومت کی۔ التمش ہی کے زمانے میں چنگیز خان نے وسط ایشیا اور ایران پر حملہ کیا لیکن اس نے دہلی پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ التمش کے بعد اس کی بیٹی رضیہ سلطانہ نے اسلامی تاریخ کی پہلی عورت کے طور پر 3 سال حکمرانی کی۔ رضیہ کے بعد باری باری اس کے دو بھائی بہرام اور مسعود تخت نشین ہوئے مگر بالآخر تیسرے بھائی اور شریف النفس ناصر الدین محمود کو منتخب کیا گیا اب بھی اصل حکمرانی التمش کے ایک غلام غیاث الدین بلبن کی تھی جسے ناصر الدین محمود نے اپنا وزیر اعظم بنایا تھا اور جو بعد میں خودمختار حکمران بن گیا۔ بلبن کے بعد اس کا نالائق بیٹا کیقباد آیا اور دہلی کے حالات بگڑ گئے۔ ان حالات میں پنجاب کے گورنر جلال الدین فیروز خلجی (1290ء۔ 1296ء) نے دہلی کے تخت پر قبضہ کر کے خاندان خلجی کی حکومت (1290ء۔ 1320ء) قائم کر دی۔ وہ اپنے جاہ پسند عیش پرست مگر بعد ازاں منتظم بھتیجے علاؤ الدین خلجی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ علاؤ الدین خلجی کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ ہر طرح سے نااہل بلکہ گھٹیا بادشاہ ہے جس کو اس کے ہتھیار بند ہندو درباری اور دوست خسرو خان نے قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اب ملتان اور دیپالپور کا صوبیدار غازی ملک آگے بڑھا اور اس نے خسرو خان کو شکست دے کر غیاث الدین تغلق کے نام سے تغلق خاندان (1321ء۔ 1413ء) کی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد انتہائی متضاد شہرت رکھنے والا اس کا بیٹا محمد تغلق تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوا اور اس کے بعد اس کا بھتیجا فیروز شاہ تغلق۔ فیروز تغلق کے انتقال کے بعد ملک خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ چھ سال کی مدت میں تین افراد تخت پر بیٹھے۔ چوتھا حکمران محمود تغلق تھا۔ اب خانہ جنگی نے سلطنت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ ایسے میں 1398ء میں تیمور لنگ نے ہندوستان پر حملہ کر کے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور آخر کار مختلف حصوں میں مختلف صوبیداروں نے آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔ 1412ء میں محمود تغلق کے بعد خضر خان نے دہلی پر قبضہ کر کے سید خاندان کی حکومت قائم کی جو 1451ء تک قائم رہی۔ آخری سید حکمران عالم شاہ صرف دہلی کا حکمران تھا۔ 1451ء ہی میں ایک پٹھان سردار بہلول لودھی نے دہلی پر قبضہ کر کے لودھی خاندان کی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

یہ تذکرہ تھا اس سیاسی حکومت کا جو شہاب الدین غوری کی فتوحات اور پھر اس کے غلام قطب الدین ایبک کے تخت دہلی پر جلوہ افروز ہونے سے شروع ہوئی اور دراصل فیروز شاہ تغلق کے زوال کے ساتھ دہلی کی گلیوں میں بکھر گئی۔ مگر ایک اور سلطنت تھی، سلطنت روحانی جو ناقابل یقین حیران کن حد تک بالکل انہی ایام اور انہی ماہ و سال میں دہلی کے قریب اجمیر میں شروع ہوئی، دہلی میں مستحکم ہوئی اور دہلی کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی زوال پذیر ہو گئی —— یہ تاریخ تصوف کے سب سے پرشکوہ سلسلے، سلسلہ چشت کی حکومت تھی۔

کہنا چاہیے کہ یہ دریا کے دو کنارے تھے جو ساتھ ساتھ چلے۔ ایک طرف شجاع جرنیل تھے جو نہ صرف میدان جنگ میں ہند کے جغرافیے کو تسخیر کر رہے تھے بلکہ محلوں میں امور سیاست کو بخوبی انجام دے رہے تھے اور دوسری طرف وہ بے تاج بادشاہ تھے جو جھونپڑوں اور خانقاہوں میں بیٹھے روح کی خوبصورتی کی طاقت سے دلوں کو مسخر کر رہے تھے۔ ایک افسوں تھا کہ دائرہ در دائرہ پھیلتا تھا اور کسی

جغرافیے کو نہیں مانتا تھا۔ ان صوفیا، اور درویشوں کو ایک طاقتور چیلنج کا سامنا تھا۔۔۔ اسلامی ثقافت کو ایک نہایت گہری جڑیں رکھنے والی ہندی ثقافت سے مقابلہ کرنا اور یہ فریضہ احسن طریقے سے انجام دینے کے لیے وہ ہندی مٹی کی خوشبو سے ہم آہنگ ہوئے اور ادبیات سے انس رکھتے تھے۔ سماع سے لگاؤ کی وجہ سے لوک موسیقی کے لیے راستہ کھلا چھوڑتے تھے اور ضابطہ شعوری تبلیغ سے انحراف اور غیر معمولی رواداری سے دلوں میں سرایت کر جاتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اسلامی راسخ الاعتقادی کو دھچکا لگایا اور یہ ٹھیک بھی ہے مگر یہ اس ملک اور اس وقت کا تقاضا تھا۔ راسخ الاعتقادی اور روشن خیالی کا اپنا اپنا عہد ہوتا ہے۔ جب ہر لحاظ سے حریف اور مد مقابل دل کو تسخیر کرنا ہو تو روشن خیالی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس دور کا حکمران صوفی درویش ہوتا ہے اور جب مسخر کیا ہوا عمل مطلع دل وقت کی گرد کے ہاتھوں ذرا آمیز حاصل اختیار کرنے لگے تو پھر یہ فقیہہ اور عالم کا دور ہوتا ہے۔ تو اس تخت روحانی کا پہلا بے تاج بادشاہ، برصغیر میں چشتیہ مکتبہ فکر کا اولین صوفی دانش ور سلطان الہند حضرت غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہے! خواجہ معین الدین چشتی 1142ء میں سجستان میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم خراسان میں حاصل کی۔ ترک وطن کرنے کے بعد جب وہ غزنی کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے تصوف کی اولین درسگاہ لاہور آئے اور سید علی ہجویری کے مزار پر چلہ کش ہوئے جہاں ان کی چلہ گاہ سید علی ہجویری کی قبر مبارک کے نزدیک آج بھی محفوظ ہے۔ یہاں سے آپ ملتان آئے اور پانچ سال قیام کیا۔ اس کے بعد دہلی تشریف لائے اور کچھ عرصہ قیام کے بعد اجمیر چلے گئے جو ان دنوں دہلی سے کہیں زیادہ اہم ثقافتی مرکز تھا۔ یہ پرتھوی راج کا زمانہ ہے جو ان دنوں اجمیر کو دارالخلافہ بنائے ہوئے تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ پرتھوی راج حضرت کی بددعا سے ہی شہاب الدین کے ہاتھوں زندہ گرفتار ہوا۔ مختلف روایات پر غور کرنے کے بعد شیخ محمد اکرام خیال کرتے ہیں کہ آپ کی تاریخ وفات 1236ء ہے۔ یہی ان کے مرید باصفا قطب الدین بختیار کاکی کا سن وفات بھی ہے جنہوں نے اپنے مرشد سے کچھ عرصہ قبل اس دنیا کو خیر باد کہا اور حیرانی کی بات ہے کہ دہلی کے دوسرے سلطان التمش نے بھی اسی سال دنیا سے کوچ کیا۔ آپ کے دو ہی مرید مشہور ہوئے۔ ایک تو صوفی حمید الدین ناگوری ہیں اور دوسرے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی مگر حقیقی معنوں میں ترکستان کے شہر اوش میں پیدا ہونے والے خواجہ قطب الدین ہی تھے جنہوں نے آپ کے بعد سلسلہ چشت کی خلافت سنبھالی۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد اجمیر اپنی سیاسی اہمیت کھو بیٹھا تھا مگر حضرت معین الدین چشتی نے اجمیر ہی میں قیام کیا اور دہلی میں حضرت قطب الدین کو متعین کر دیا جہاں انہوں نے عوام میں مقبولیت اور بے پناہ اثر حاصل کر لیا۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار جب حضرت معین الدین چشتی نے اپنے عقیدت مند اور شیخ الاسلام نجم الدین صغرا کے قطب الدین بختیار سے اختلافات کی وجہ سے انہیں اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کی کوشش کی تو سلطان التمش عوام کے جم غفیر کے ساتھ آپ کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا اور حضرت قطب الدین بختیار کو واپس دہلی لے گیا۔

اپنی وفات سے قبل خواجہ بختیار نے ہانسی میں موجود اپنے مرید فرید الدین مسعود کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس طرح روحانی مرکز دہلی سے ملتان کی طرف منتقل ہو گیا۔ خواجہ فرید الدین ملتان ہی کے ایک قصبے کھوتوال میں 1175ء میں پیدا ہوئے اور یہیں پر خواجہ بختیار کاکی کے مرید ہوئے۔ خواجہ فرید الدین نے خلافت ملنے کے بعد کچھ عرصہ تو دہلی میں ہی گزارا، مگر اب ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ سلسلہ چشت نے بے پناہ عوامی عقیدت و احترام حاصل کر لیا تھا اور التمش کے بعد آنے والے حکمران سلسلہ چشت کے مرکزی

نظام کی طاقت کو تشویش کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ خواجہ فریدالدین ویسے بھی سیاسی کشمکش سے دور رہنے والے بزرگ تھے۔ سو وہ واپس پلٹ آئے اور کچھ عرصہ بعد پاک پتن، جو اس وقت اجودھن کہلاتا تھا، کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا۔ یہ سلطان ناصرالدین محمود کا زمانہ ہے۔ درشت، بدلحاظ اور بدمزاج لوگوں کے شہر اجودھن میں خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر کی انسان دوستی اور رواداری کے مسلک نے انقلاب برپا کر دیا اور تصوف نے پہلی بار عوامی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ کہا جاسکتا ہے کہ اشاعت اسلام کے سلسلے میں آپ کو اپنے مرشد کی نسبت کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور مغربی پنجاب کے کئی قبیلے مثلاً سیال، وٹو اور راجپوت آپ کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ گو راسخ الاعتقادی کے کڑے معیاروں پر یہ بات سوالیہ نشان کا درجہ رکھتی ہے مگر حضرت فریدالدین مسعود کے "مقامی دانش" سے کامیاب ابلاغ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے کئی ہندو دانشوروں سے دوستانہ تعلقات تھے اور انسان دوستی کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار جب ان کے ایک مرید نے انہیں ایک قینچی ہدیہ کرنا چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے سوئی دو، میں کاٹنے والا نہیں، جوڑنے والا ہوں۔ حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر نے 1265ء میں پاکپتن میں انتقال کیا۔

خواجہ فریدالدین مسعود نے خرقہ خلافت خواجہ نظام الدین اولیا کے سپرد کیا — حضرت خواجہ نظام الدین 19 اکتوبر 1238ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے جہاں ان کے آبا و اجداد بخارا سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تو آپ کی والدہ زلیخا بی بی نے بڑی توجہ کے ساتھ آپ کو تعلیم دلوائی اور اپنے لخت جگر کو دہلی لے آئیں۔ یہاں پر آپ کو ان کا تذکرہ سننے کے بعد خواجہ فریدالدین مسعود سے قلبی تعلق محسوس ہوا اور آپ نے 1275ء میں پاک پتن میں آ کر خواجہ مسعود کی بیعت کر لی۔ اس کے چار سال بعد آپ کو خرقہ خلافت سے نواز دیا گیا۔ اب آپ دہلی تشریف لے آئے اور شروع کے ایام نہایت تنگدستی میں گزارے۔ 1271ء میں آپ نے شہر دہلی کو خیر آباد کہا اور نزدیکی موضع غیاث پور میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں پر غیاث الدین بلبن کے جانشین کیقباد کے دور میں آپ کے دروازے پر وہ ہجوم عقیدت منداں اکٹھا ہوا کہ آپ نے جلد ہی قابل رشک اثر و نفوذ حاصل کر لیا۔ رعب و دبدبہ رکھنے والی وجیہ شخصیت کے مالک خواجہ نظام الدین سلسلہ چشت کے وہ پہلے اہم بزرگ ہیں، جن کے یہاں روحانی اور سیاسی اثر و اقتدار کی سرحدیں بہت واضح طور پر ایک دوسرے سے ملنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس سے پہلے خواجہ فرید ہی کے ایک مرید سیدی مولا کے سیاسی بے احتیاطی نے اس دلدوز واقعے کو جنم دیا تھا، جس میں سیدی مولا کو جلال الدین خلجی کے ہاتھوں بے رحم موت کا شکار ہونا پڑا تھا — سو انتہائی تشویشناک صورت حال تھی، جس میں سلاطین دہلی صوفیائے چشت کے مرکزی روحانی اقتدار کو اپنے لیے خطرہ سمجھنا شروع ہو گئے تھے اور تصادم ناگزیر ہو گیا تھا مگر نظام الدین اولیا اپنے ذاتی تدبر کے جوہر سے کشتی کو بحفاظت کنارے تک لے گئے۔

پہلی ہی تدبیر کے مطابق وہ ساری عمر سلاطین کے درباروں سے کنارہ کش رہے — جلال الدین خلجی سے وہ کبھی نہیں ملے۔ علاؤالدین خلجی نے جب خود آ کر ملنے پر اصرار کیا تو انہوں نے تاریخی جملہ کہا کہ فقیر کے مکان کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔ قطب الدین مبارک خلجی ان سے کھلم کھلا عداوت رکھتا تھا۔ اس نے ایک بار حکم دیا کہ قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو جب دوسرے علما و مشائخ دربار میں حاضر ہوں تو نظام الدین اولیا کو بھی زبردستی لایا جائے۔ حضرت خواجہ نے جب یہ حکم نامہ سنا تو فقط اتنا کہا کہ دیکھتے ہیں کیا ظہور میں آتا ہے اور جس دن قطب الدین مبارک شاہ دربار

میں ان کی آمد کا منتظر تھا وہ خسرو خان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ خسرو خان نے آتے ہی دوسرے مشائخ کے علاوہ آپ کی خدمت میں 5 لاکھ ٹکے ہدیہ بھیجے مگر غیاث الدین تغلق برسر اقتدار آیا تو سماع کے معاملے میں تو وہ پہلے ہی حضرت نظام الدین سے اختلافات رکھتا تھا، اس نے آتے ہی خسرو خان کے دیے ہوئے 5 لاکھ ٹکوں کی واپسی کا تقاضا کیا اور حضرت کے معذرت کرنے پر دل میں رنجش لے کر بیٹھ گیا۔ اپنے آخری دنوں میں جب وہ ایک فوجی مہم سے واپس آ رہا تھا تو اس نے خواجہ نظام الدین کو پیغام بھجوایا کہ غیاث پور سے باہر نکل کر میرا استقبال کریں۔ ایک بار پھر خواجہ نظام الدین اولیا کے منہ سے ایک فقرہ نکلا اور تاریخ کی زینت بن گیا "ہنوز دلی دور است"۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ دلی سے تین کوس دور اس مکان کی چھت غیاث الدین تغلق پر گری اور وہ زندگی کی بازی ہار گیا، جہاں وہ دلی میں داخل ہونے سے قبل قیام پذیر تھا۔ خواجہ نظام الدین جنہیں ان کے مرشد نے خلافت عطا کرتے وقت بجا طور پر "نظام الدین و دنیا" کہہ کر پکارا تھا، ایسی زندگی گزاری جو سلاطین دہلی کے مقابل پر شکوہ حیثیت کی عکاسی کرتی تھی۔ ابن عربی کے نظریات کے تحت وہ تصوف کی اس تھیوری کی ترجمانی کرتے تھے، جس کے مطابق دنیا کے ظاہری نظام کے ساتھ ساتھ ایک باطنی نظام بھی کارفرما تھا جو قطبوں، غوثوں، ابدالوں اور قلندروں کے زیر نگرانی چل رہا تھا۔ اب اس کی شرعی تشریح کرنا مشکل ہو گیا مگر اپنے وقت کے قطب ابدال نے واقعتاً ایک پرشکوہ صوفی کا طرز عمل اختیار کیا ـــ وہ غیاث الدین تغلق کی وفات کے ایک دو ماہ بعد ہی اپریل 1325ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور جاتے ہوئے جانشینی حضرت چراغ دہلوی کے حوالے کر گئے جو اپنے مرشد کے برعکس سماع بالمزامیر کے اعلانیہ منکر تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیا کی نگاہ دور رس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آنے والے دن سلسلہ چشت کے بزرگوں کے تعمیر کردہ عالیشان اور منظم نظام تصوف کے لیے زیادہ خوش کن نہیں ہیں۔ سو انہوں نے سجادہ نشینی ایک ایسے بزرگ کے سپرد کی جو زہد و تقویٰ کا نمونہ اور صبر و استقلال کا پیکر تھے اور انہیں جاتے ہوئے نصیحت کی کہ نصیر الدین محمود! تمہیں اب دلی میں رہ کر خلق کا ظلم و ستم برداشت کرنا ہوگا ـــ اور یہی کچھ حضرت مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کے ساتھ ہوا! یہ اس سیکولر، لبرل اور "روشن خیال" حکمران محمد تغلق کا دور تھا جو گنگا کے پانی کو مقدس سمجھ کر پیتا تھا اور مشائخ اسلام کے اثر کو حسد اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ سو اس نے حضرت چراغ دہلوی کو اپنی ذاتی خدمت پر مامور کرتے ہوئے جامہ داری کے فرائض سونپ دیے۔ اس سے دراصل ان کی اہانت مقصود تھی۔ حضرت چراغ دہلوی نے انکار کیا تو ان پر تشدد کیا گیا اور جیل میں بند کر دیا گیا۔ مزید برآں ان کے گلے کی ہڈیوں میں سوراخ کر کے رسیوں سے لٹکانے کا حکم دیا گیا۔ اب حضرت چراغ دہلوی کو اپنے مرشد کے آخری الفاظ یاد آئے اور انہوں نے اس تحقیر آمیز ملازمت کو قبول کر لیا۔

حضرت چراغ دہلوی جو سماع اور تصوف میں در آنے والے دوسرے غیر شرعی رجحانات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، انہوں نے زمانے کی بدلتی ہوا اور اس کے رخ کو بھی محسوس کر لیا تھا اور سمجھ چکے تھے کہ نظام چشت نے جو کردار ادا کرنا تھا، کر لیا۔ اس لیے جب ان کی وفات کے وقت خادمین نے نئے سجادہ نشین کے لیے مریدوں کی فہرست پیش کی تو انہوں نے کہا "ان لوگوں کو اپنے ایمان کا غم کھانا چاہیے۔ اس بات کی اب کہاں گنجائش ہے کہ یہ دوسروں کا بوجھ اٹھائیں۔" پس ان کی وصیت کے مطابق مشائخ کبار کے عطا کردہ تمام تبرکات ان کے ساتھ دفن کر دیے گئے۔ تاہم حضرت سید گیسو دراز نے اس کھاٹ کی رسیاں اتار کر اپنے گلے کا ہار بنا لیں، جس پر حضرت چراغ دہلوی کو غسل دیا گیا تھا کہ میرے لیے میرے مرشد کا یہی خرقہ کافی ہے۔

یہ فیروز شاہ تغلق کا دور تھا، جس کی تخت نشینی میں حضرت چراغ دہلوی نے اہم کردار ادا کیا تھا اور اس وجہ سے ان کے شاہی دربار سے تعلقات بھی بہتر ہو گئے تھے مگر یہ سب کچھ چشتیہ مکتبہ فکر کو دوبارہ زندگی نہ عطا کر سکا۔ دراصل چشتیہ نظام تصوف اپنا بھرپور کردار ادا کر چکا تھا! دوسری طرف شہاب الدین غوری اور قطب الدین ایبک کا بچھایا ہوا اقتدار روزگار تخت دہلی فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد تیمور لنگ کے حملے کی وجہ سے دہلی کی اجڑتی گاہوں میں بکھرنے والا تھا۔ اب ذرا تصوف کی معاصر تاریخ کا مختصر جائزہ لینے کے لیے ملتان چلتے ہیں جہاں شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی (بغداد) کے خلیفہ شیخ بہاؤ الدین زکریا نے تصوف کا ایک اور عظیم تخت، تخت سہروردیہ بچھا رکھا ہے۔ آپ ہی کے زمانے میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے دو اور مشہور خلفا، قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ جلال الدین تبریزی بھی ہندوستان تشریف لائے لیکن سلسلہ چشتیہ کے روماں نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا۔۔۔ دراصل چشتیہ نقطہ نظر اپنے اندر جمالیات کے سارے رنگ سموئے ہوئے تھا جبکہ سہروردی، تصوف کے جلالی رنگ کے عکاس تھے۔ انہوں نے رائج الشکاوی سے یکسر پلہ چھڑانے سے گریز کیا۔ سو وہ سماع کو عمومی طور پر ناپسندیدہ سمجھتے تھے اور دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی ان کا رویہ غیر معمولی رواداری کا نہ تھا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ملتان کے سہروردیوں کو، جو تبلیغ و اشاعت اسلام کے بارے میں چشتیوں سے کہیں زیادہ پر جوش تھے، انھیں وہ شکوہ حاصل نہیں ہوا جو دہلی کے سلسلہ چشت کو حاصل ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سہروردیوں نے بیعت دار الخلافوں کی رنگا رنگی اور ہندوستان کے ثقافتی و سیاسی مرکزوں سے دور رہ کر اسلام کی خدمت کی۔ اس کے علاوہ ان میں امیر خسرو اور ضیاء الدین برنی جیسا کوئی بڑا ادیب و شاعر بھی پیدا نہیں ہوا جو ان کے روحانی کارناموں کی تصویر کو اس توانائی کے ساتھ پیش کرتا جو ان کا حق تھا اور دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جمع اموال اور سلاطین کے درباروں سے تعلق کے الزام کا سہروردیوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہے اگرچہ دربار سے تعلق کو انہوں نے عوام الناس کی فلاح کے لیے استعمال کیا۔

ہندوستان میں سلسلہ سہروردیہ کے موسس اعلیٰ شیخ بہاؤ الدین زکریا 1172ء میں ملتان میں پیدا ہوئے جہاں ان کے دادا مکہ معظمہ سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ خواجہ زکریا نے خراسان اور بخارا میں تعلیم مکمل کرنے اور مدینہ منورہ میں پانچ سال روضہ رسول کی مجاوری کرنے کے بعد بغداد کا رخ کیا اور شیخ شہاب الدین سہروردی کا حلقہ ارادت اختیار کیا۔ انھیں سترہ دن مرشد کی خدمت میں رہنے کے بعد خرقہ خلافت عطا کر دیا گیا جو مریدان قدیم کے شکوہ کا باعث بھی بنا۔ لیکن شیخ شہاب الدین سہروردی نے فرمایا: "تم گیلی لکڑیاں لائے ہو جن میں دیر سے آگ لگتی ہے۔ زکریا چوب خشک لایا تھا، جو ایک ہی بار پھونک مارنے سے بھڑک اٹھی"۔ مرشد نے آپ کو ملتان جا کر مسند شیخ بچھانے کا حکم دیا اور پھر ملتان نے جلد ہی وہ عزت و وقار حاصل کر لیا کہ ملتان کے ساتھ سندھ اور بلوچستان کے علاقے بھی اس روحانی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ آپ بابا فرید الدین مسعود کے ہم عصر ہیں بلکہ بعض تذکرہ نگار تو آپ دونوں کو خالہ زاد بھائی بھی بتاتے ہیں۔ بہر حال یہ شہاب الدین غوری کے غلام ناصر الدین قباچہ کا زمانہ ہے، جو اس وقت ملتان کا گورنر تھا۔ قطب الدین ایبک تک وہ تخت دہلی کا وفادار رہا مگر التمش کے دور میں اس نے خود مختاری کی کوشش کی۔ شیخ زکریا اور ملتان کے قاضی شرف الدین نے ملک التمش کو خبر کرنا چاہی تو اطلاعی خطوط قباچہ کے ہاتھ لگ گئے اور اس نے اپنے قاضی کو قتل کر دیا۔ مگر خواجہ زکریا کے اثر کی وجہ سے کسی غلط اقدام سے باز رہا۔ آخر کار اس نے بغاوت کی اور اس وقت دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا جب التمش اس کا تعاقب

گزر رہا تھا۔ 1257ء میں جب منگول ملتان میں داخل ہو گئے تھے اور قتل عام کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس وقت شیخ بہاؤ الدین زکریا نے ایک لاکھ درہم اقدا دے کر ملتان کو تباہی سے بچایا۔ یہ ان کی زندگی کے آخری دن تھے۔ انہوں نے 1262ء میں انتقال کیا اور اپنے مریدان خاص میں اپنے صاحب زادے صدر الدین عارف اور پوتے رکن الدین ابو الفتح، اوچ کے بخاری سیدوں کو موسس اولی جلال الدین شاہ سرخ بخاری اور سندھ کے لال شہباز قلندر شامل ہیں۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے صدر الدین عارف کو آپ کا جانشین مقرر کیا گیا۔ یہ تصوف کی تاریخ میں موروثی سجادہ نشینی کا آغاز تھا جس پر اوچ کے پیروں نے بھی عمل کیا۔ 1309ء میں شیخ صدر الدین عارف کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے رکن الدین ان کے جانشین ہوئے، جنہیں سلسلہ سہروردیہ کا نظام الدین اولیا کہنا چاہیے جو ان کے ہم عصر اور دوست بھی تھے۔ مگر یہ وہ دن تھے جب مشائخ چشتیہ ارباب حکومت سے تصادم کی حالت میں تھے اور مشائخ سہروردیہ دربار حکومت کے حلیف و مربی۔ سلطان علاؤ الدین خلجی شیخ رکن الدین کا معتقد تھا اور اس دور میں آپ نے دہلی کا دو دفعہ دورہ کیا۔ علاؤ الدین کا جانشین قطب الدین مبارک شاہ نظام الدین اولیا سے پرخاش رکھتا تھا۔ اس حوالے سے اس نے شیخ رکن الدین کو استعمال بھی کرنا چاہا۔ وہ دہلی میں شیخ رکن الدین کی بارگاہ بنانا چاہتا تھا تاکہ نظام الدین اولیا کا اثر اقتدار کچھ ایسا چاہے۔ مگر یہ نہ ہو سکا۔ جب شیخ رکن الدین، مبارک خلجی کے بلاوے پر دہلی آئے تو سلطان المشائخ نظام الدین اولیا نے اپنی اقامت گاہ سے نکل کر حوض علائی پر ان کا استقبال کیا۔

غیاث الدین تغلق سے بھی شیخ رکن الدین کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ حتیٰ کہ جس مکان کی چھت کے نیچے دب کر غیاث الدین ہلاک ہوا، وہاں اس وقت شیخ رکن الدین بھی اس کے ساتھ کھانے میں شریک تھے۔ آپ کھانا ختم کرنے سے قبل ہی مکان سے باہر نکل آئے اور سلطان کو بھی باہر آنے کے لیے کہا مگر اس نے بات نہ مانی۔ کچھ عرصہ بعد سلطان المشائخ کا جب انتقال ہوا تو آپ دہلی ہی میں تھے اور آپ ہی نے نظام الدین اولیا کی نماز جنازہ پڑھائی۔ سلطان محمد تغلق بھی آپ کا خیال رکھتا تھا۔ جب اس وقت کے گورنر ملتان کشلو خان نے بغاوت کی تو محمد تغلق نے اسے شکست دے کر ملتان کو خون میں نہلانے کا حکم دے دیا۔ اس وقت شیخ رکن الدین ہی تھے جو ننگے پاؤں سلطان کے پاس گئے اور سفارش کر کے اس حکم پر عمل درآمد ہونے دیا۔ شیخ رکن الدین نے 1334ء میں انتقال ہوا اور ان کو اس مقبرے میں دفن کیا گیا جو غیاث الدین تغلق نے اپنے لیے بنوایا تھا تاکہ مرنے کے بعد شیخ بہاؤ الدین زکریا کے قرب میں جگہ پا سکے۔ شیخ رکن الدین کے بعد ملتان میں سہروردیہ کا جاہ و حشم اپنے اختتام کو پہنچ گیا اور مغربی پنجاب اور سندھ کا روحانی مرکز بھی ملتان سے اوچ شریف منتقل ہو گیا جہاں رکن الدین عالم کے خلیفہ اعظم مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ان کے بھائی راجو قتال اور پھر قادری بزرگوں نے تصوف کی شمعیں روشن کیں۔ اب ذرا بات سمیٹیں تو کہنا چاہیے کہ ملتان میں شیخ رکن الدین ابو الفتح (وفات 1334ء) اور دہلی میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی (وفات 1354ء) کے انتقال کے بعد ہندوستان میں تصوف کی روحانی سلطنت کا مرکزی نظام بکھر گیا۔ ان کے بعد روحانی بزرگ تو موجود تھے مگر اپنے اپنے حلقوں اور مرکزوں میں اپنی بساط بھر کام کو جاری رکھے ہوئے تھے ۔۔۔ اور ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ جیسے بزرگ کے انتظار میں آسمان کو مزید دو سو سال انتظار کرنا تھا۔

◆◆◆

دوامِ اَدب......محمود شام

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

انجمنِ فن، شناسائے حقائق، اقلیمِ الفاظ و معانی، گنجینۂ علم و آگہی اور تیغِ دوامِ ادب، محترم محمود شام، ادب کے افق پر آفتاب و مہتاب کی طرح چمک دمک رہے ہیں۔ انھوں نے دبستانِ کراچی کو نئی زندگی عطا کرنے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ اخبارات و رسائل ان کی تحریروں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ میرے شفیق، مشفق خواجہ سے روبرو یا فون پر بات ہوئی تو محمود شام کی شخصیت کا تذکرہ ضرور ہوا۔ مجھے ان کی تحریروں سے تو آشنائی تھی لیکن قومی کتاب میلے میں ان سے روبرو ملاقات کا موقع ملا۔ ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے اہلِ قلم اور اہلِ فن محمود شام کو اپنے حصار میں لے کر مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے۔ قومی میلے کی مختلف تقریبات میں انھیں خیالات کے اظہار کا موقع ملتا۔ ایم ڈی نیشنل بک فاؤنڈیشن ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور دیگر دوستوں کے ساتھ ان کی تصاویر تیار ریکارڈ میں موجود ہوں گی۔ ان ملاقاتوں کے علاوہ ادارہ اہلِ جلیس کے حوالے سے مراسلاتی رابطہ بھی رہا۔ ان کی طوفانی مصروفیات کا ادراک رکھتے ہوئے میری کوشش رہی کہ انھیں تنگ نہ کیا جائے۔ محمود شام آج ادبی دنیا کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ میرے طائرِ قلب و احساس میں ان کی شخصی عظمت اور ادبی قدر و منزلت ناقابلِ بیان ہے۔ محمود شام کی جرأت، روشن دماغی، روشن خیالی، راست گوئی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انھوں نے ادب اور صحافت کے فروغ میں ایک تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ وہ علمی و ادبی حریت پسند ہیں۔ ان کے ذہن میں انقلابی روش اور تحرک موجود ہے۔ ان کا استحصالی قوتوں کے خلاف قلم ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ وہ خوش گفتار اور نرم خو ہیں۔ ان کی تحریر میں کوئی دنیاوی لالچ موجود نہیں ہے۔ مختلف موضوعات پر قلم اٹھانا ان کے لیے مشکل نہیں ہے۔ بلکہ ذاتی تجربوں اور گفتار پر عبور کی وجہ سے وہ محافل میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ان کا اصل نام محمد عارف محمود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں "عارف" ہیں۔ مسلسل ریاضت نے انھیں بلند مقام عطا کیا ہے۔ وہ 5 فروری 1940ء کو پٹیالہ بھارت میں پیدا ہوئے۔ مسلمانوں کی تاریخی قربانیوں کے بعد پاکستان 14 / اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آیا۔ اس وقت محمود شام کی عمر صرف 7 سال تھی۔ وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے ہیر کے شہر جھنگ میں قیام پذیر ہوئے۔ بچپن ہی سے ذہانت و فطانت کے حامل تھے۔ انھوں نے پرائمری، مڈل، میٹرک اور ایف اے مکمل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج جھنگ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ جھنگ کے بزرگ دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ بہت کم وقت میں اپنا نام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ جھنگ سے اٹھے اور لاہور پہنچے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے 1964ء میں ایک مشکل مضمون فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور اپنے دامن میں ایک طویل علمی و ادبی تاریخ رکھتا ہے۔ اس کا ادبی جریدہ "راوی" نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کا علم بردار ہے۔ پاکستان کے لاتعداد نامور شاعروں ادیبوں نے "راوی" سے علم و ادب کی روایات حاصل کیں۔ محمود شام کی

ادبی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انھیں ''راوی'' کے حصہ اردو کا مدیر چنا گیا۔ ان کی تحریروں کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ ایک عہد ساز ہفت روزہ ''قندیل'' سے محمود شام نے تصنیف و تالیف اور صحافت میں اپنا نام پیدا کیا۔ دورانِ تعلیم ہی وہ 1962ء تا 1965ء ہفت روزہ قندیل کے نائب مدیر رہے۔ انھوں نے تحریت کے علاوہ مضمون نویسی میں بھی شہرت حاصل کی۔ مجید نظامی صلاحیتوں کے اعتراف میں بہت فراخ دل تھے۔ نوائے وقت اسلامی، ملی اور قومی سرحدوں کے تحفظ کا آئینہ دار روایت جہاں محمود شام نے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں شامل ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ وہ ''نوائے شام'' کے طور پر 1965ء سے 1967ء تک روزنامہ ''نوائے وقت'' کے میگزین ایڈیٹر رہے۔ اگر اس عرصہ میں ان کے تحریر کردہ تجزیوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ایک الگ کتاب ترتیب دی جا سکتی ہے۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور کو خیر باد کہہ کر وہ کراچی تشریف لے آئے۔ یہاں انھوں نے کثیر الاشاعت ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' سے رشتہ جوڑ لیا۔ وہ صحافت اور ادب میں یکساں مقبول ہوئے۔ کراچی کی کوئی تقریب ان کے بغیر مکمل تصور نہیں کی جاتی۔ عمر قائد کراچی میں ایم ایم جلیس کے فرزند ارجمند شہریار جلیس سے جنوری 2000ء کو ملاقات ہوئی۔ پریس کلب کراچی بھی دیکھنے اور جانے کا موقع ملا۔ محترم مشرف احمد اور شہریار جلیس نے محمود شام کی خدمات کو بہت اچھے الفاظ میں سراہا۔ تخلیقی صلاحیتیں خوشبو، روشنی اور ہوا کی طرح اپنا راستہ خود تراشتی ہیں۔ محمود شام عمومی طور پر کسر نفسی سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا لیکن کتابی ضابطے میں وہ اپنا ذخیرہ بہت کم لائے۔ اگر ان کی صحافتی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو مختصر فہرست کچھ یوں ہے: ☆ اسسٹنٹ ایڈیٹر ''قندیل'' (میگزین) لاہور (1962–1964) ☆ میگزین ایڈیٹر روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور (1965–1967) ☆ ایڈیٹر ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی (1967–1970) اور (1972–1975) ☆ روزنامہ ''مساوات'' لاہور کے لیے سندھ کے لیے خصوصی نامہ نگار (جولائی 1970ء تا اپریل 1972ء) ☆ ایڈیٹر / ناشر ہفت روزہ ''معیار'' کراچی (اپریل 1976–1978) اور (1980–1994)۔ جنگ گروپ آف نیوز پیپرز میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ تعطل کا شکار رہا لیکن مجموعی طور پر وہ اپنے محاذ پر قائم رہے۔ بطور صحافی انھوں نے یاسر عرفات، ذوالفقار علی بھٹو، اندرا گاندھی، شیخ مجیب الرحمان، جیرالڈ فورڈ، ہنری کسنجر، تون عبدالرزاق، بے نظیر بھٹو، پرویز مشرف، خان عبدالغفار خان، جی ایم سید، خان عبدالولی خان، مولانا بھاشانی، مفتی محمود، اصغر خان، نظام مصطفیٰ جتوئی اور دیگر عالمی شہرت یافتہ شخصیات کے انٹرویو کیے۔ ان انٹرویوز میں ان کے مشاہدے اور تجربے کی جھلک بہت نمایاں ہیں۔ سچ لکھنا مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں۔ سچ لکھنے والوں کو کانٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ محمود شام نے قلم کی حرمت کا پرچم بلند رکھا۔ اسی لیے انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ وہ اظہارِ رائے کے قائل تھے۔ اس لیے ہر بات بڑی بے خوفی سے کرنے اور لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ یوں تو زندگی مسلسل ایک سفر ہے لیکن انھوں نے سیاسی ساتھیوں کے ساتھ جو سفر کیے وہ ان کی سوچ میں تنوع کا وجہ رکھتے ہیں۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں سے ایک داستان کشید کر لائے۔ ان کے سفرناموں کا مجموعہ ''لاڑکانہ سے پیکنگ تک'' 1972ء میں منظرِ عام پر آیا۔ نیشنل فورم سنٹر کمرشل ایریا PECHS کراچی نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اس سفرنامہ میں ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ کیے گئے اسفار کی داستان ہے۔ یہ کتاب درحقیقت بھٹو دور کی ایک سچی کھری کہانی بھی ہے۔

محمود شام نے متعدد سفرنامے لکھے ہیں جن میں (1) ''لاڑکانہ سے پیکنگ تک''۔ (2) ''کتنا قریب، کتنا دور''۔ (3) ''برطانیہ میں 40 دن'' بہت مقبول ہوئے۔ انھوں نے سیاسی رہنماؤں کے انٹرویو کے مجموعے بھی شائع کیے ہیں جن میں ''روبرو''، ''نئی آوازیں''

خاص ہیں۔ پاکستان کے صدور اور وزرائے اعظم کی اہم تقریروں کا انتخاب "تقدیر بدلتی تقریریں" کے عنوان سے شائع کیا۔ شاعری کے متعدد مجموعے "چہرہ چہرہ مری کہانی"، "آخری رقص"، "قربانیوں کا موسم"، "نوشتۂ دیوار" شائع ہو چکے ہیں۔

ان کا شعری مجموعہ "آخری رقص" 1972ء میں منظر عام پر آیا۔ "چہرہ چہرہ مری کہانی" 1974ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ کتابوں کا بھرپور خیر مقدم کیا گیا۔ بنیادی طور پر محمود شام شہرت کے بجائے ادبی خدمت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "قربانیوں کا موسم" منصۂ شہود پر آیا تو اس کا استقبال بھی دونوں ہاتھوں سے کیا گیا۔ جنگ کراچی کی یہ کاوش ادبی حلقوں میں ایک خوبصورت اضافہ تھا۔ غزلوں اور نظموں کے اس گلدستے کی خوشبو سے کراچی کا ایوان ادب مہک اٹھا۔ محمود شام کی شخصیت اور کلام میں بلا کا تحرک پایا جاتا ہے۔ انھوں نے جدیدیت کی چھری سے روایات کو ذبح نہیں کیا۔ پرانے اور نئے خیالات سے مزین "قربانیوں کا موسم" کے بارے میں ممتاز اور منفرد لہجے کے شاعر محسن بھوپالی رقم طراز ہیں: "اہل نقد و نظر کے نزدیک ہر دور کا ادب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے اور ہر تخلیق اپنے عہد کے میلانات اور رجحانات کی تابع ہوتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک جگہ لکھا ہے" روح عصر کو گرفت میں لینے کی کوشش ہر شاعر کے ہاں ملتی ہے لیکن اس کوشش میں بیشتر شعرا یہ بھول جاتے ہیں کہ عصر حاضر کی روح جسد ماضی میں نہیں سما سکتی اور پرانے الفاظ نئے طرز احساس کا ساتھ نہیں دے سکتے" اس تحریر کی روشنی میں جب ہم محمود شام کے کلام کا مجموعی جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انھیں اس حقیقت کا ادراک بھی ہے اور نئے طرز احساس کے تقاضوں کا پاس بھی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے موضوع کی مطابقت سے لفظوں کو چنا اور انھیں سلیقے سے برتا ہے۔ انھوں نے جذبوں کو روایتی طریق اظہار اور آرائش الفاظ میں زنجیر کرنے کے بجائے اظہار کے تقاضوں اور الفاظ کی بندشوں کو جذبوں کا پابند کیا ہے اور اسی اسلوب اور طرز سخن کی بنا پر وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں غزل ہو یا نظم محمود شام کسی جگہ بھی اپنے اس رویے سے دست کش نہیں ہوئے۔ نئی تراکیب اور نئی تشبیہات کی ذیل میں بعض انگریزی الفاظ کا بلا تکلف استعمال ان کے اسی رجحان کا آئینہ دار ہے۔" محمود شام کی شاعری مقصدیت کا پرتو ہے۔ ان کی نظموں میں مزاحمتی انداز بھی موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں زندگی مسلسل جدوجہد اور ریاضت سے عبارت ہے۔ تو ان کی مکمل تصویر محمود شام کی شخصیت میں موجود ہے۔ محمود شام نے رومانوی انداز اپنانے کے بجائے مقصدیت کو ملحوظ خاطر رکھا۔ زندگی اور اس کے رموز ان کی شاعری کا خاصا ہیں۔ ان کی غزل کا اہم عنصر معصومیت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

محمود شام جھنگ کا پھیرا بھی ہو گیا ... لاہور کی ہوا ہی بہت بھا گئی تجھے

مدتوں بعد وہ گلیاں وہ جھروکے دیکھے ... جسم کی راکھ سے اٹھتے ہوئے شعلے دیکھے

وہی دیوار و در و بام سبھی ہیں مگر ... اپنے بچھڑے ہوئے چہروں کو کہاں سے لاؤں
اجنبی بن کے میں اپنا ہی مکاں تکتا ہوں ... [illegible] بیتے ہوئے لمحوں کو کہاں سے لاؤں

دیکھ کر چاند کو یاد آئے زمانے کیا کیا ... رنگ خوشبوئیں در و بام دریچے کیا کیا

آتے لمحوں سے کوئی خوف، نہ ماضی کا ملال　　　　اپنی تقدیر میں کیا کیا ہے لکھا، جانتے ہیں

چاند تارے جب اس آنگن سے گزرتے ہوں گے　　　　شامؔ وہ لوگ ہمیں یاد تو کرتے ہوں گے

شاعری میں احساس نہ ہو تو وہ کس کام کی؟ محمود شام حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ کم گو ہیں لیکن جب بات کرتے ہیں تو خوب کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب تکلفات سے بالاتر ہے۔ وہ حقیقت کے پیامبر ہیں اور زندگی کی تیرہ دستیوں کے خلاف ہمہ وقت مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ ان کے ہاں خودی کا عنصر بڑی شدومد کے ساتھ موجود ہے۔ اس بات کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب 14 اگست 2009ء کو صدرِ پاکستان جناب آصف علی زرداری نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیات کو مختلف قومی اعزازات دینے کا اعلان کیا تو محمود شام نے اپنا صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ وہ قارئین کی طرف سے حوصلہ افزائی کو اپنا اصل اعزاز سمجھتے ہیں اور انھوں نے کسی قسم کا سرکاری اعزاز پہلے بھی قبول نہیں کیا تھا اور اب بھی اس اعزاز کو قبول نہیں کریں گے۔ وہ اپنے عہد کے شاعروں، ادیبوں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں بڑے فراخ دل ہیں۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر فروغِ اردو کے لیے کام کرنے والوں کی قدردانی ان کی شخصیت کا اہم پہلو ہے۔ ماہنامہ "تخلیق" (اجرا: 1969ء) کے بانی مدیر اظہر جاوید کی شخصیت اور ان کی خدمات کے بارے میں بھی ان کی رائے مثبت خیالات پر مشتمل ہے۔ اظہر جاوید (1938ء - 2012ء) اپنی ذات میں ادبی تحریک تھے۔ یہی وصف محمود شام کی ذات میں موجود ہے۔ وہ مسلسل ادبی تحریک ہیں جس کا مقصد سچائی، انقلاب اور جمہوریت کا فروغ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محمود شام کو ابھی صحت والی لمبی زندگی عطا فرمائے۔

◆◆◆

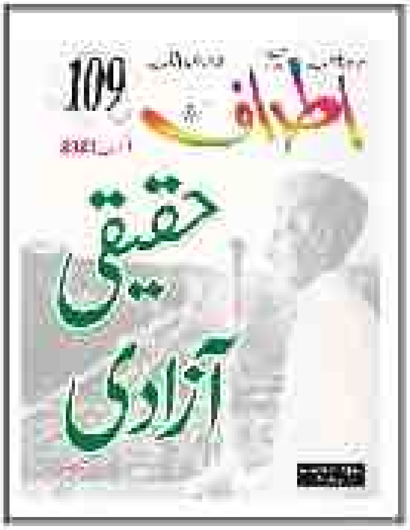

پاکستان کا معروف ادبی جریدہ ماہنامہ **اطراف**

دانشور، سینئر صحافی اور مدیر محمود شام کی سرپرستی میں

کراچی سے شائع ہوتے ہوئے مسلسل اشاعت کے

10 سال مکمل کر چکا ہے ــــ مبارک ہو!

قیمت فی پرچہ -/400 روپے ــــ زرِ سالانہ -/4,000 روپے

بیرونِ ملک 150 ڈالر

ملنے کا پتہ: 262۔ اے، بلاک 3، گلشنِ اقبال کراچی

(0300-8210636)

صنفِ نازک اور ادب

شجاعت علی راہی

زندگی اگر ایک پیڑ ہے تو صنفِ نازک اس کا رس بھرا خوشہ ہے۔ اگر یہ ایک کوہسار ہے تو یہ اس کی بلندیوں سے نیچے بہنے والی آبشار ہے اگر یہ مرغزار ہے تو یہ اس کے بیچوں بیچ بہنے والی سریلی ندی ہے۔ صنفِ نازک ہمیں ماں، بہن، بیوی، بیٹی، بہو، پوتی، نواسی، دادی، نانی، خوش دامن، پھوپھی، خالہ، ممانی اور کئی دوسرے رشتوں کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اس کا سب سے نمایاں اور روشن پہلو اس کا تخلیقی منصب ہے جس کی دراڑوں سے محبت کی کونپلیں پھوٹتی ہیں

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش ا میں نے اک روز کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

ادب بھی ایک تخلیقی عمل ہے اور اگر آپ ادب کی جڑیں محبت سے لبریز بنیادی اور جمالی صفات پر نظر ڈالیں تو یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ ادب میں دوشیزاؤں اور اس قبیل کے دیگر رشتوں کی کتنی اہمیت ہے۔ اگر شعر و ادب سے صنفِ نازک کے جاندار کردار کو منہا کر دیا جائے تو بے رس، تشنگی، بے کیف فضا اور بے رنگ و بے کیفیت کے سوا باقی کیا بچے گا؟ ادب میں دوشیزاؤں کا تذکرہ ایک تو وہ جمالیاتی پہلو ہے جس سے قدرت نے صنفِ نازک کو فراخ دلی سے نوازا ہے۔ امیر خسرو نے کہا تھا:

بہ فراغِ دل زمانے نظرے بہ ماہ روئے بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ عمر و ہاؤ ہوئے

یعنی عمر بھر کی بادشاہی سے اور اس کے تمام تر تام جھام سے کہیں بہتر فراغت کے لمحات میں کسی ماہ رو کا دیدار ہے۔ اور فیض احمد فیض نے کہا کہ

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

شاعرِ مشرق نے بھی وجودِ زن کو بہت بڑی قوت قرار دیا

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اور یہ حقیقت ہے کہ عورت نے نہ صرف اپنے ظاہری حسن و جمال سے تصویرِ کائنات میں دھنک کے رنگ بھرے بلکہ راحت، صلاحت، غیرت، تربیت، رحمت اور جنت کے در بھی وا کئے۔ صنفِ نازک ہمارے حواسِ خمسہ بیدار ہو جاتے ہیں، آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، مشامِ جاں معطر ہو جاتا ہے اور روح میں نغمے رچ بس جاتے ہیں جب ہم شعر و ادب میں اصناف یا کاسنی چنری لہراتی، قوسِ قزح کے رنگ بکھیرتی، کپاس، بیلے یا پھول چنتی، شبنم آلود سبزے پر پاؤں دھرتی، ساون رت میں بھیگتی، دودھ دوہتی، پکوان تیار کرتی، اپلے تھاپتی، ہرن کی طرح قلانچیں بھرتی، پھول کی پنکھڑیوں جیسے لب کھولتی، ڈھول کی تھاپ پر گیت گاتی، ناگن کی طرح بل کھاتی، تبسم کے پھول ٹانکتی، کومل خواب بنتی، لوریاں سناتی، گٹھڑی کی طرح سمٹی ہوئی، سکھیوں سنگ سہاتی، شرماتی لجاتی، نرم و نازک سرگوشیاں کرتی، حسرتوں، البیلی، نکھری نکھری، سانولی سلونی، پری چہرہ، شعلہ عذار، چنچل، نٹ کھٹ، شوخ و شنگ، سادہ و پرکار دوشیزاؤں، بیبیوں، ماؤں، سکھیوں

اور سہیلیوں کا ذکر چلتے اور سلتے ہیں اور تصورات کے کوہ قاف کی سیر کرتے ہیں۔ بقول ریاض خیر آبادی۔

ہم بند کیے آنکھیں تصور میں پڑے ہیں ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو

گیت اور نظمیں حیا کی دیویوں اور رت رنگ گوریوں کے تذکرے سے بھری پڑی ہیں۔ شرم و حیا کے حوالے سے نہایت کومل اور دل آویز اشعار کہے گئے:

آنچل ڈھلکا ڈھلکا جائے حیا سے سمٹی سمٹی جائے
کرے نہ گوری پیارے بتیاں لاج کے مارے جھکیں نہ انکھیاں
بہت نازک ہے اس نوخیز کی آرائش کا فن حیا پہلے سے بڑھ کر اور سر تا پا حنا کم کم

(عزیز حامد مدنی)

پھر پروین شاکر کے الفاظ میں کنہیا کی میٹھی لڑائی اور آرزو لکھنوی کے شعر میں چھیڑ چھاڑ کی کیفیت

گوپیوں سے بھی کھیلیں کنہیا اور ہم سے بھی میٹھی لڑائی

حسن و عشق کی آگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

پنجاب کے صوفی شاعر خواجہ غلام فرید کے کچھ مصرعوں/شعروں کا ترجمہ دیکھئے "ساون کی رت ہے اور میری سہیلیاں برسات میں نہا رہی ہیں" "پیلو پک چکے ہیں۔ اے محبوب آ جا کہ پیلو چنیں۔ پیلو چننے والیوں میں کسی کے گلے میں لڑیاں ہیں اور کسی کے سر پر ٹوکریاں۔ بعض چھجیاں بھر بھر کر لاج کے برابر کر دیتی ہیں۔""" ("ٹوری" گرم اور کچی پیلیوں کی کا دام ٹوکری ہوتی ہے جسے دھاگا یا ازار بند کر گلے میں ڈالا جاتا ہے اور "چھجیاں" کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ٹوکریوں کو کہتے ہیں)۔

اور آئیے اب نثری ادب پر نگاہ دوڑاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے افسانے "گنڈاسا" میں راجو کے حوالے سے جو دل آویز منظر پیش کیا ہے، جس انداز سے ایک دوشیزہ کی رنگین رعنائی کا نقشہ کھینچا ہے اور مولا گنڈاسا والا پر اس فطری حسن کا جو اثر مرتب ہوتا ہے، وہ دیدنی ہے:"۔۔۔۔ اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمان کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھووں کو مس کر لیں گی اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں۔ اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے، سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گلی کے بجائے گلاب سونگھ رہی ہو۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے جو کچھ یوں اچٹتا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بری طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولا گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر یوں ہی چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے"۔

قدرت اللہ شہاب کی خود نوشت "شہاب نامہ" کے دو تین جملے دیکھئے: جلد اس کی باریک ململ کا غلاف تھی جس کے آر پار نگاہ جاتی بھی تھی اور نہیں بھی جاتی تھی۔ جیسے وہ ابھی ابھی بیسن، دہی اور دودھ سے نہا کر نکلی ہو۔ اس نے اخروٹ کی چھال سے دانت صاف

کے ہوئے تھے اور اس کے پتلے ہونٹ سرخی سے گل نار ہو رہے تھے۔ قرۃ العین حیدر کے چند جملے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ رنگیلی برکھا رت میں چاند رنیں ہوا میں لہراتیں، للا ڈنیاں گائی جاتیں، لڑکیاں پکوان بناتیں" (آگ کا دریا) ان کے بال سونے کی رنگت کے دہکتے ہوئے بال تھے، نیلی آنکھیں تھیں اور گلاب کے شبنم آلود شگوفوں کی ایسی رنگت تھی (شیشے کے گھر / میں نے لاکھوں کے بول سہے) عصمت چغتائی نے اپنی تحریروں میں دوشیزاؤں کے رنگ، روپ، خواہشات، محسوسات اور محرومیوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ چند سطریں ملاحظہ کیجئے: نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے جھل جھل کر ریشم یا ساجن مانگے، وہ جھکی جھکی، سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی۔ لڑکی کا کیا ہے، کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جواہرات آ گی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔ جانو کسی کو معلوم نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کس کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے۔

سماجی اور ثقافتی زندگی میں صنف نازک کا کیا حصہ ہے، اس کے لئے قدرت اللہ شہاب کی یہ تصویر کشی دیکھئے: ان کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں تو اپنے برف سے گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں میں ساری ساری رات گرد و تیل جلا کر قالین بنتی تھیں یا شال اور نالیچے کاڑھتی تھیں یا پھول دار نمدے بناتی تھیں یا فروٹ کی لکڑی تراش تراش کر نازک نازک سگریٹ کیس، تپائیوں اور پھول دانوں پر نقش و نگار کھودتی تھیں جنہیں مقامی ساہوکار اونے پونے داموں خرید کر سیاحوں کے ہاتھ بڑی بڑی قیمتوں پر بیچا کرتا تھا۔ اور اب متفرق جملے ملاحظہ فرمایئے جو اے حمید، قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، محمد منشا یاد، ممتاز مفتی، علی باقر، جمیلہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر اور دیگر ادیبوں کی تحریروں سے چنے گئے ہیں اور جو صنف نازک کے تقدس، اس کے سراپا کی دل کشی و رعنائی، ثقافتی اہمیت، احساسات و جذبات، لطافت و نزاکت، جسمانی کشش، دکھ درد اور حقیقت و نفسی پہلوؤں کی عکاسی ہیں: اس شاہکار کو اگر انگلی سے چھوتا تو اس کی انگلی رنگوں سے بھر جاتی تم اس سویرے کا گیت گا رہی ہو جو میری روح میں کھل رہا ہے شرما کر دہری ہو گئی ایک پری جو اپنے ادھ کھلے ہاتھوں سے سفید یاروں میں خوشبو دار ستاروں کی برف چھڑکتی رہی مجھے وہ اجلے دن یاد آتے تھے جب وہ مجھے دیکھتے سے گلابی، عنابی ہو جاتی اور چھو لینے سے اس کے جسم میں برقی رو دوڑ جاتی تھی شرم کی سرسراہٹ جاگے تو احساس کے آنگن میں جاڑے کی دھوپ تو دکھو کھلتی ہے بھیجر کٹ کی طرف دیکھا تو وہ سرخ گٹھڑی یوں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی، مانو جان ہی نہ ہو چاندی کی طرح اجلی اجلی، ایک گھبرائی ہوئی لڑکی بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی اور اس کی گردن سے جھول گئی شرمائی لجائی، سمٹی سی ایک کونے میں بیٹھی تھی دلہن ہوتی تھیں، گھونگھٹ کھولتی نہیں تمہاری نرم و نازک تخیلی جسم سے تم کیوں ہے؟ ہوا اتنی لطیف اور پاکیزہ تھی جیسے کسی دوشیزہ کا چہرہ وشتری کے لبیے نفس پر طلوع جسم ہو رہا ہوا کی آواز میں کوئی مٹھاس یا کرو وہ جھوجھکا ہو گیا اس کے ماتھے کی سرخ بندیا گویا ایک دیا تھا جو ہزاروں سال پرانے کسی شکستہ معبد کی محراب میں روشن تھا اس کی سانس دھیمی دھیمی موسیقی ہے اتنی چکنی تھی کہ دھار کی طرح کاٹ کرتی تھی صنف کے کچے وجود کی خوشبو کمرے میں بھری تھی دیکھو تمہاری آنکھیں سمندر رنگ ہیں تمہاری آنکھیں آسمان رنگ ہیں اے میری روح کو شفا بخشنے والی، تم موسیقی ہو، رنگ ہو، خوشبو ہو، روشنی ہو اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ تو میں بے نقاب ہو جاؤں۔ تم میرے خوابوں کی خوشنما کی جھیل پر رقص کرتی ہو اب جب فصل پک کر تیار ہو گی تو وہ ضرور اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر دیں گے۔

اسے تو معلوم بھی نہیں ہوا، کب بچپن آیا اور کب جوانی آئی۔ جیسے وہ لڑکی نہ ہو، شیشے کا گلاس تھی یہاں کی لڑکیاں تو جیتی نظر آتی ہیں خوشبو لگائے ہوئے جیسے پریاں بیٹھی ہوں اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور بال سیاہ ریشمی دھاگوں کی طرح چمک دار لیا وہ

لڑکی اب بھی کسی کھڑکی پر کہنیاں ٹکائے ہوئے اداسیوں کو سرراتے جھنڈ سے گزرتے ہوئے دیکھتی ہے؟" سطوت آرا جو باریک پردوں والے بیڈروم میں بوڑھی پراسرار قوتوں کی مانند نظر آنے لگی وہ پتھر میں کھدے بوسیدہ نقش کی طرح لگ رہی تھی وہ دوڑ کر دوڑ جیسا چھوڑ کر ایک دم کھنچے کانٹے جاتی تھی زرد گڑھا ان ایک ایسی کمزور ہے اس عورت ہے جس کا آدمی اُسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو جب ننھے منے پرندے سانس لیتے تو وہ بھی ان کے ساتھ سانس لیتی وہ دودھ ماکھوں کی طرح چپ چپے بولتے ہوئے سے امرت چھتی رہی، کوئل تلفی بن کر ڈالی ڈالی کوکتی پھرتی، موم چڑیا کی طرح شاخ شاخ جھولا جھولتی رہی دور کسی پہاڑی راستے پر ایک چادر پوش عورت تیز تیز چلتی ہوئی جا رہی تھی وہ پگلی ایک معصوم ہرنی ہے جو بانس کے جنگل میں کسی پرسکون جھیل کے کنارے قلانچیں بھر رہی ہے میں تمہاری ہرنی تھی، تم میرے ہرن تھے اس وقت وہ ایک ایسی ہرنی لگ رہی تھی جسے اس کا ہرن جنگل میں تنہا چھوڑ گیا۔

کیا تم اس لڑکی کو بھول گئے جو آج سے دو سو سال پہلے دریائے گومتی کے کنارے ایک کچے مکان کے باہر تمہاری راہ دیکھا کرتی تھی پوست کا وہ پھول جسے کھلنے میں دیر لگتی ہے، ہوا کا ایک جھونکا اس کی پتیوں کو کھول دیتا ہے، محبت ایک لڑکی کی روح کو اپنا تک ایک پھول کی طرح کھلا دیتی ہے تم تو مجھے یوں گئیں غضب خدا کا، اتنی مدت کے بعد آج صورت دیکھی تمہارے ہاتھ نے میرے ہاتھ کو چھوا اور زندگی میری انگلیوں میں خون کی طرح دوڑنے لگی اس بار ایک ایسی دوشیزہ ہے جس کی خوشبو پاگل کر دیتی ہے۔

◆◆◆

فارسی کلام : غلام رضا طریقی

اُردو ترجمہ : شجاعت علی راہی

من آں ستم کہ از آتش گذشت و آب نشد
دعائے یک لب مستم کہ مستجاب نشد
من آں گلم کہ در آتش دمید و پر پر شد
بہ شکل اشک در آمد ولی گلاب نشد
نہ گل کہ خوشہ انگور گوز خود شدہ ای
کہ روی شاخ دلش خون شد و شراب نشد
پیامبری کہ بہ شوق رسالتی ابدی
درون غار کلا گشت و انتخاب نشد
بہ خواب رفت جہان آنچناں کہ تا بہ ابد
صدائی ہیچ خروس حریف خواب نشد

میں آگ میں بھی رہا برف، آب ہو نہ سکا
میں اک دعا ہوں مگر مستجاب ہو نہ سکا
میں ایسا پھول ہوں حدت سے جھلسا پر کی طرح
جو آنسو بن کے تو ڈھلا، گلاب ہو نہ سکا
لحد پہ کھل نہ سکا مثل خوشہ انگور
لہو لہو ہوا یہ دل، شراب ہو نہ سکا
دیا بہ شوق رہوں اک مظہر ابدی
فنائے غار ہوا، انتخاب ہو نہ سکا
کچھ ایسے خواب نے گھیرا جہاں کو تا بہ ابد
خروش مرغ بھی کامیاب ہو نہ سکا

فیض اور طبقاتی کشمکش

شہباز انور خان

دیکھا جائے تو طبقات کے درمیان کشمکش اور آویزش شروع ہی سے چلی آ رہی ہے۔ سرمایہ دار اور محنت کش، مالک اور مزدور، کاشتکار اور مزارع کے درمیان ہمیشہ سے ایک غیر محسوس آویزش کبھی زیادہ اور کبھی کم درجے پر رہی ہے۔ ان طبقات کے درمیان پائی جانے والی عدم مساوات ہی دراصل اس کشمکش اور آویزش کا بنیادی محرک ہے۔ ہمارے اپنے اس خطے میں اگر ماضی کی تاریخ کی جانب نگاہ کی جائے تو محسوس ہوگا کہ یہاں ہمیشہ سے ہی ایک طبقاتی آویزش قائم رہی ہے۔ مختلف طبقات میں بٹا ہوا یہ سماج مختلف قسم کے واسطے رکھتا ہے، کہیں ذات پات کی تقسیم ہے اور کہیں رنگ و نسل کا معاملہ ہے۔ جو طبقات زیادہ مضبوط اور مالی طور پر مستحکم ہیں وہ دوسرے طبقے سے ممتاز اور غالب دکھائی دیتے ہیں۔ کم یا چھوٹی ذات والوں پر اعلیٰ ذات کے لوگ حکمرانی کرتے رہے ہیں۔

ایک طبقاتی فاصلہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف مراعات یافتہ یا دوسرے لفظوں میں امیر ترین طبقات ہیں اور دوسری طرف غیر مراعات یافتہ، محروم، غریب و پسماندہ طبقات ہیں۔ یوں یہ تقسیم اس حد تک واضح ہوگئی ہے کہ ایک طبقہ "اشرافیہ" اور دوسرا طبقہ "عوام" کہلایا۔ طبقات میں یہ اونچ نیچ اس قدر نمایاں ہو چکی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہمارے ادب میں بھی یہ تفریق مختلف اصناف میں در آئی ہے۔ ادیب، شاعر اور اہلِ قلم چونکہ سماج ہی کے عکاس ہوتے ہیں اس لیے سماج میں پائی جانے والی ہر تبدیلی کا اثر ان کی تخلیقات میں پایا جاتا ہے اور یہ ایک فطری امر ہے۔ ہمارے شاعروں، ادیبوں اور دیگر اہلِ قلم نے اس طبقاتی تقسیم کو اپنی نثری اور شعری تخلیقات کا موضوع بنایا اور انھیں نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ طبقاتی کشمکش کے اثرات ہمارے اردو ادب میں شعوری اور لاشعوری دونوں طرح سے مرتب ہوئے ہیں۔ فیض احمد فیض بھی ادب کی ان نمایاں شخصیات میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی شاعری کو عوام کی راہنمائی، عوامی فلاح، انسانی عظمت اور حقوقِ انسانی کے حوالے سے ایک ٹول کے طور پر استعمال کیا۔ ان کی تخلیقات میں انسان دوستی، آزادی، مساوات، عدل و انصاف، حقوقِ انسانی کی توانا آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بے انصافی، ظلم، استبداد، جبر و تشدد، استحصال وغیرہ کے خلاف بھی بھرپور احتجاج ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

فیض بلاشبہ بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک انقلابی شاعر بھی ہیں۔ اشتراکی سوچ اور نمایاں فکر کے حامل فیض انسانی زندگی سے جڑے تلخ حقائق سے صرفِ نظر کیسے کر سکتے تھے۔ انھوں نے دکھی انسانوں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھا، وہ ان کے ہمنوا بن گئے اور پھر ان دکھوں کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ اپنی تخلیقات میں اشعار کی صورت میں بیان کیا اور پھر ایک رہنما کے طور پر ان محروم طبقات کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ فیض نے انگریز سامراج کے مظالم، سرمایہ دارانہ نظام کی چیرہ دستیاں، ظلم، ناانصافی، مزدوروں، کسانوں کے استحصال کو بہت قریب سے دیکھا اور اس سے براہِ راست اثر لیا۔ وہ ترقی پسند تحریک

سے وابستہ رہے۔ جس کا ماٹو ہی ادب برائے زندگی تھا۔ ترقی پسند تحریک سے جڑت نے ان میں انسان دوستی کے وہ اوصاف پیدا کر دیے کہ جن کی وجہ سے ان کی ایک الگ شناخت اور پہچان بن گئی۔ خواص کے طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود عوام کے نمائندہ بنے اور انہی کی ترجمانی کی اور اپنی شاعری کو انہوں نے فی الواقع عوامی شاعری بنا دیا۔ انہوں نے روایتی محبوب کے اس بت کو پاش پاش کر دیا جس میں صرف لب و رخسار، گل و بلبل، غمزہ و عشوہ اور ان کی ناز برداریاں ہی حاصل زندگی تصور کی جاتی تھیں۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق کو بھی واضح کیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تلخ حقائق کو بیان کرتے ہوئے زندگی کی رعنائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کے تمام انداز اپنی تمام تر رعنائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ اس خوبصورتی سے ملتے ہیں کہ ایک خوش گوار تازگی کا احساس مشام جاں کو معطر کیے رکھتا ہے۔ لیکن ہجر و وصال کے ساتھ محبوب کی ادائیں، اس کی جفائیں بھی ملتی ہیں تو بھی ایک وقار، ایک شان کے ساتھ۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہونے کے باوجود جدید رنگ تغزل اپنے جملہ لوازمات کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ موسیقی، جمالیات اور رومانیت و بے ساختہ پن بھی اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں اور قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ ان کی نظم:

> مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ / میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات / تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے / تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات / تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے / تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے / یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے / اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا / راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا / ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم / ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے / جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم / خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے / جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے / پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے / لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے / اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے / اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا / راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا / مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

ان کی یہ ساری نظم ایک ایسا پیغام ہے کہ جس میں اثر آفرینی بھی ہے اور جاذبیت اور کشش بھی۔ یہ نظم فیض کی مقبول ترین نظموں میں شامل ہے۔ جس کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں اور آج بھی وسیع پیمانے پر پڑھی اور سنی جاتی ہے۔ جب جب فیض نے یہ نظم پیش کی تو پورے ہندوستان کی سیاسی اور ادبی فضا میں زبردست ارتعاش پیدا ہو گیا۔ غیر رواتی انداز کی حامل اس نظم کی دھوم دور دور تک پھیل گئی۔ وہ جو رجعت پسند سوچ رکھنے والے گویہ روایتی ادبی رجحانات سے مختلف ایک "کمزور سوچ" کی حامل نظم محسوس ہوئی اور اسے انہوں نے پراپیگنڈا شاعری قرار دیتے ہوئے ابتدائی طور پر رد کر دیا۔ لیکن یہ نظم عوام کی جیتی جاگتی زندگی کا بھرپور احاطہ کیے ہوئے ہے اس لیے آخرکار اس نظم کو پذیرائی حاصل ہوئی اور بعد میں آنے والے شعراء نے بھی اس سے اثر لیتے ہوئے اس نہج پر اپنی شعری تخلیقات کو استوار کرنا شروع کر دیا۔ 1947ء کو برصغیر کی تقسیم نے فسادات اور انسانی قتل و غارت گری نے جس انسانی المیے کو جنم دیا اس نے پوری سماجی زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ ان انسان دشمن فسادات و غارت گری نے اہل ادب کو بھی شدید متاثر کیا اور انہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اس انسانیت کش رویے کی مذمت میں نثر و نظم میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ فیض نے بھی اپنے منفرد اسلوب میں یہ عظیم الشان نظم تخلیق کی۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر / وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں / یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر / چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں / فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

اسی طرح وہ لکھتے ہیں: ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی / نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی / چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

پھر کہا کہ سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور / جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن / کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں

فیض کو یقین تھا کہ جس منزل کے لیے قافلہ چلا تھا ابھی وہ منزل دور ہے۔ جبر و استبداد کا سلسلہ ابھی تھما نہیں۔ آزادی کا جو سویرا طلوع ہوا تھا وہ بھی ایسا نوں آشام تھا کہ جس کا تصور ہی محال تھا۔ کیوں کہ فیض جس منزل کے متلاشی تھے وہ طبقاتی کشمکش سے آزاد، انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال سے پاک معاشرہ کا قیام تھا۔ ظاہر اس کے لیے ابھی جدوجہد جاری رکھی جانی تھی۔ چنانچہ انھوں نے جدوجہد کو جاری رکھنے کا اعلان کیا اور کہا کہ: ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی''۔ انھوں نے اپنے اس عزم بالجزم کا اظہار بھی کیا کہ:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مر جائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترکِ روایت نہ کریں گے

فیض کی بعض نظمیں ایک جدوجہد، ایک تحریک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ جنھیں پڑھ کر سیاسی کارکنوں میں ایک تحرک پیدا ہوتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ان کی بعض نظمیں اور اشعار اپنی معنی آفرینی کی بنیاد پر اس قدر مشہور و پیغام کے حامل ہیں کہ ہمارے طبقۂ اشرافیہ اور حکمران طبقہ سے تعلق رکھنے والے وہ سیاسی قائدین بھی جلسہ گاہوں میں بڑے ذوق کے ساتھ پڑھتے ہیں جن کو خود ایک جابر و ظالم کے طور پر اس نظم میں مخاطب کیا گیا ہے۔ فیض فاشزم اور آمرانہ نظام کے تحت قید رہے اور اپنی شاعری میں اس کے خلاف بھی پوری طاقت سے آواز بلند کی۔ جابرانہ اور آمرانہ حکومت کو للکارا۔ ان کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' ایک معرکۃ الآرا نظم ہے۔ جو آزادی اور انصاف کے حوالے سے طاقت ور ترین ہتھیار ہے اور آج پورے پاکستان میں سیاسی جلسوں کا ترانہ بن چکی ہے۔ وہ جو آزادی اور انصاف کے اصل مجرم ہیں وہ بھی اس نظم کو پڑھتے دیکھے گئے ہیں۔ اسی طرح ''صبحِ آزادی'' کے زیرِ عنوان نظم بھی آزادی اور انصاف کے حصول کے لیے اٹھائی جانے والی توانا آواز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض اپنی شاعری سے دلوں پر دستک دیتے ہیں۔ شیرینی، لطافت، تازگی و پرکاری ان کی شاعری کے بنیادی اوصاف ہیں۔ اس اعتبار سے وہ جس معیار پر شاعری کو لے آئے ہیں اس معیار تک کوئی دوسرا اہم معاصر نہیں لا سکا۔ انھوں نے غزل کے علاوہ نظم میں بھی اپنا مافی الضمیر یوں بیان کیا کہ ذاتی مشاہدہ بھی عوامی بن گیا ہے۔ فیض کی کس کس نظم اور کس کس شعر کا حوالہ دیا جائے ان کی بیشتر شاعری ہی انقلاب اور طبقاتی کشمکش کی آئینہ دار اور غریب، محروم اور پسماندہ طبقات کی ترجمان ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے محض چند ایک نظموں کا ہی ذکر کیا گیا ہے کہ پورا کلام بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض کا قلم طبقاتی کشمکش میں جس طاقت اور توانائی کے ساتھ رواں ہوتا ہے۔ اس کی مثال رواں صدی میں کم کم ملتی ہے۔ اس نے بجا طور پر انسان، انسانی زندگی اور انسانی رویوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اس خوبصورتی، ہنرمندی اور سلیقے کے ساتھ انھیں زبان دی اور عام آدمی کی ترجمانی کا جس طرح حق ادا کیا ہے اس نے ان کا نام ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔ ان کا نام ان کی عظیم خدمات کی بدولت ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔

◆◆◆

احمد ضیاء

انور ندیم علوی

ہم نے 1976ء میں وکالت کا آغاز کیا اور 1980ء میں ہمارا پہلا مجموعہ "جاگتی آنکھوں کے خواب" منظرِ عام پر آ چکا تھا۔ نواب شاہ میں ان دنوں ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں اگر اندرونِ سندھ کی بات کی جائے تو احمد ضیاء بہت فعال اور متحرک تھے۔ وہ شاعر تھے، مصنف تھے، پبلشر تھے، ادارہ کا حصہ تھے اور لوگوں میں کتاب سے محبت کیلئے مشاعرے اور ادبی محافل کا اہتمام کرتے۔ ہمارے ذوق کے مطابق ہمارے لئے کئی نایاب کتابیں ہمیں ہماری رہائش گاہ تک پہنچا دیتے۔ ادبی مجالس منعقد کرنے کیلئے ہر وقت کمربستہ رہتے۔ نام ضیاء الانوار تھا، ادبی دنیا میں احمد ضیاء کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا اسم گرامی انوار حسین پاکستانی تھا۔ احمد ضیاء 1949ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد تحریک پاکستان کے سرگرم رکن تھے اور ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ پاکستانی لکھتے۔ پاکستان سے محبت احمد ضیاء کو ورثے میں ملی۔ میٹرک اور انٹر حیدرآباد سے کیا۔ گریجوایشن کیلئے جامعہ سندھ میں داخلہ لیا۔ لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر بی۔ اے فائنل کا امتحان نہ دے سکے اور پھر مستقل قیام نواب شاہ میں رہا۔ 1965ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ حضرت محسن بھوپالی کو اپنا استاد مانتے تھے۔ محسن بھوپالی سے ہماری پہلی ملاقات بھی احمد ضیاء کی وساطت سے نواب شاہ پریس کلب میں ہوئی۔ محسن صاحب نے کارڈ دیا اور رابطہ رکھنے کی تاکید کی۔ اس طرح ہماری شاعری پر محسن بھوپالی کے تبصرہ نے ہماری شاعری کو اعتبار کا منصب دیا۔ احمد ضیاء، محسن بھوپالی، ناصر کاظمی، شکیب جلالی اور منیر نیازی کی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ احمد ضیاء نے "نقش وفا" کے عنوان سے اپنے والد گرامی، تحریک پاکستان کے کارکن انوار حسین پاکستانی کی داستانِ حیات گلشن ہاؤس 18، موچی روڈ لاہور کے تعاون سے شائع کی جس میں "مسلم لیگ نیشنل گارڈ" کی تنظیم اور اس کے دیگر رضا کاروں کے تذکرے بھی شامل ہیں۔ احمد ضیاء نے اپنے مجموعہ کلام "ہوا کی تحریر" کا دوسرا ایڈیشن 1997ء میں شائع کیا اور ہمیں بھی اس کی تقریب پذیرائی میں شامل ہونے اور تبصرہ لکھنے کی تاکید کی چنانچہ ہماری رائے "ہوا کی تحریر خوابوں کی تعبیر" کے عنوان سے روزنامہ "آوازِ نواب شاہ" میں 24 جون 1997ء کو شائع بھی ہوئی۔ (بحوالہ خط سے ... صفحہ 156-157) احمد ضیاء کے شعری مجموعے: (1) شہر صنم (اگست 1968ء) (2) ہوا کی تحریر (اپریل 1973ء) (3) رُت بدلنے دو (مارچ 1990ء) (4) خالی رستہ خالی گھر (جنوری 1992ء) (5) خوابوں میں اک خواب (سال 1999ء)۔ اس کے علاوہ آپ نے 72 شعراء کے کلام میں سے انتخاب کر کے ایک کتاب "وہ اِک موسم سی لڑکی" 1999ء میں آزاد انٹرپرائزز، میکلیوڈ روڈ لاہور کے تعاون سے شائع کی جس میں فیض احمد فیض، احمد فراز، ساحر لدھیانوی، ندیم، منیر نیازی، محسن بھوپالی، سلیم کوثر، امجد اسلام امجد کی منظومات شامل کرنے کے علاوہ ہماری نظم "معطر ریشمی لڑکی" صفحہ نمبر 54 پر شامل کتاب ہے۔

روزنامہ "ریاست" کراچی میں 30 جنوری 2000ء کو احمد ضیاء کی کتاب "خوابوں میں ایک خواب" پر بھرپور تبصرہ کیا گیا جو سید سرور ندیم کا تحریر کردہ ہے۔ انہوں نے "نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر احمد ضیاء" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ احمد ضیاء لوگوں میں خوشیاں

تقسیم کرنے میں حاتم طائی سے بھی آگے نظر آنے کے خواہش مند ہیں۔ خوشیاں تقسیم کرنے والا شاعر احمد ضیاء، دسمبر 2011ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ مورخہ 20 دسمبر 2011ء کے روزنامہ "نوائے وقت" کراچی میں احمد ضیاء کی جنازے کی تصویر کے ساتھ فاتحہ سوئم کی خبر شائع ہوئی نیز لکھا گیا کہ 1971ء کی جنگ میں شہادت پانے والے فضائیہ کے سپوت راشد منہاس کی شہادت پر انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے نغمہ احمد ضیاء نے لکھا: راشد تو نے ایسا کام کیا جو زندہ رہے گا ——— راشد تو پائندہ رہے گا

جو ریڈیو پاکستان سے مدتوں سنایا جاتا رہا۔ آخر میں احمد ضیاء کی شاعری میں سے انتخاب:

- اک شخص کی ضد ہے مجھے کردار بنا کر — افسانہ لکھو اور مرا نام نہ آئے
- اک شخص فاصلے سے سمندر لگا ہمیں — نکلا سراب جب اسے دیکھا قریب سے
- بے کار لئے پھرتی ہے تو کچے گھڑے کو — صحرا کے سفر میں کبھی دریا نہیں آتا
- اے شہرِ ہنر تجھ کو نظر کس کی لگی ہے — اس شہر میں اب خاک بسر کیوں نہیں آتے
- حیران ہوں بہاروں کے مقدر پہ ضیا میں — سرسبز درختوں پہ ثمر کیوں نہیں آتے
- اک نیا سلسلہ خوشبوؤں کا چلا — پھول جب جب کھلے تختۂ دار پر
- کون ہے ضیاء جس نے مجھ کو مار ڈالا ہے — آج اپنے اندر کے آدمی سے پوچھوں گا
- جتنے حسین لوگ تھے شہروں میں بس گئے — اب اس اداس گاؤں میں کیا ڈھونڈتے ہو تم
- مجھ کو مرے وجود سے کوئی نکال دے — تنگ آ چکا ہوں روز کے ان حادثوں سے میں
- حق گوئی اگر جرم ہے اس دور میں لوگو — سقراط کی مانند مجھے زہر پلا دو
- ایک دھڑکن ہے مسلسل دھڑکن — دل تجھے ڈھونڈ رہا ہو جیسے
- میرے غزل سے شام وطن جگمگائے گی — کرنیں بکھیرنا تو ضیاء کا اصول ہے

ایک غزل کا سرقہ: ماہنامہ "فنون" کے شمارے جنوری تا مارچ 1991ء میں جناب احمد ندیم قاسمی مدیر "فنون" لاہور کے نام احمد ضیاء نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "حالیہ شمارے میں صفحہ نمبر 463 پر جو غزل رفعت عباس کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس کا مطلع ہے:

چاہے کچھ ہو آئینہ دکھلا مجھے — تجھ میں گر سچائی ہے جھٹلا مجھے

میری ایک پرانی غزل ہے جو یکم مارچ 1982ء کو روزنامہ "پاسبان" حیدرآباد میں شائع ہو چکی ہے۔ (فوٹو اسٹیٹ شامل ہے) یہ سارا معاملہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس ادبی سرقے کی مکمل واردات کا جائزہ لیں اور فیصلہ فرمائیں کہ رفعت عباس نے یہ کیا گل کھلایا ہے۔" (احمد ضیاء، نواب شاہ)

چلتے چلتے: اسی شمارے (فنون 1991ء) میں احمد ضیاء کے مجموعہ کلام پر سید رشید احمد کا لکھا تبصرہ شامل ہے۔ یاد رہے سید رشید احمد، استاد شاعر حضرت واثق لکھنوی کے فرزند ارجمند تھے۔ نواب شاہ میں ادبی دنیا کے درخشاں ستارے احمد ضیاء مرحوم کیلئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

◆◆◆

عدم کے کلام میں فقیروں کے ڈیرے

خالد عبداللہ ویمس

عدم کا کلام کسی خاص پیغام کی تحریک سے وابستہ ہے۔ اس میں بے شمار مناظر کی روداد ہے۔ جو عدم کی فقیرانہ گزر اوقات کے مظاہر سے متعلق ہے۔ اہل علم کیلئے یہی روداد باعث رغبت ہے۔ عدم کی شاعری میں فقیروں کی بات کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ فقیروں کا ذکر اردو کی تمام کلاسیکی شاعری میں موجود ہے۔ عدم کے کلام میں انوکھی بات فقط یہ ہے کہ عدم نے فقیروں کا ذکر خاص احترام سے کیا ہے۔ یہ فقیر گداگر نہیں ہیں۔ بلکہ یہ فقیر صاحبانِ عزم و استقامت لوگ ہیں۔ عدم تو خود بھی فقیروں کے اس مکتب کا فرد ہے۔ اس نے گداگر فقیروں کا بھیس بدل کر اہلِ کرم کا تماشا نہیں کیا۔ وہ ایسے حربے لینے کا خواہاں نہیں ہے۔ عدم کے کلام پر احترام کی خوبصورت چادر تنی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی موزونیت اور دلکشی قائم ہے۔ اس کا رنگ جذبے کی صداقت کا مظہر ہے۔ اس کی نگاہ فطرت کے مظاہر پر بھی رہتی ہے۔ اس لحاظ سے عدم کی شاعری گہرے مطالب اور معانی کا معدن بن جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم ان فقیروں کو خاص اہمیت کے لوگ سمجھتے ہیں۔ اور ان کی خصوصیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن جب عدم کہتا ہے

جام بھر دے تکلفات نہ کر ہم فقیروں سے ایسی بات نہ کر

تو اس کا مخاطب کون ہو سکتا ہے۔ یہی ایک مشکل باعث اضطراب ہے۔ اور شعر کی داخلی کیفیت پر پردہ ڈالتی ہے۔ تحریر جو بھی ادراک سے ہمکنار ہوتی ہے۔ رفعتِ معنی بیان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہم شاعر سے اتفاق کرتے ہیں اور منظر کی صورت حال کا نظارہ کرتے ہیں۔ تو وہ فقیر بھی سامنے آ جاتے ہیں جن کے ڈیرے پر بڑی رونقیں نظر آتی ہیں۔

ادھر سے گزر کر بھی دیکھو ذرا بڑی رونقیں ہیں فقیروں کے ڈیرے

یہ فقیروں کی شان عظمت آرائی کی خوبصورت تصویر ہے۔ جو ان کی محفل میں دلکش رونقوں کے مسلسل اظہار کا باعث ہے۔ ہم اس کا احترام کرتے ہیں۔ اور عدم کی تحسین کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ عدم تو خود بھی محفل جمانے کا شوق نہیں رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت اس شوق کی خوگر نہیں تھی۔ وہ منکسار اور نرم دل ضرور تھے۔ لیکن ان کا مزاج مخصوص انداز میں کج اور متواضع تھا۔ ایسی کیفیت ان کے ذاتی حالات پر منحصر تھی۔ جبکہ اسی عدم کے بغیر مشاعرے سونے اور محفلیں بے رنگ ہوا کرتی تھیں۔ جگر مراد آبادی عدم کو بھارت کے بڑے مشاعرے میں مدعو ضرور کرتے تھے۔ اور عدم اپنی طبیعت کے دباؤ کی وجہ سے بھارت نہیں جاتے تھے۔ پھر جگر صاحب گلہ کرتے تھے۔ اور مشاعرے کے سونے پن کا ذکر بھی کرتے تھے۔ جگر صاحب اس حقیقت کے آشنا تھے کہ عدم کی موجودگی مشاعرے کی رونق اور کامیابی کا باعث بنتی ہے۔ عدم کبھی یہی کہتے اور بات کا پہلو بدل دیتے تھے۔

فقیروں کا مقصد گھڑی دو گھڑی شرابیں تری بادہ خانے تیرے

لیکن ہم اس فقیر کا تصور نہیں کر سکتے جو مستی کے ساتھ دروں بینی کا عادی ہے۔ قدرے شوخ بھی لگتا ہے لیکن لہجے میں اعتدال اور سنجیدہ ہے۔ ان کی باتوں میں شوخی کے باوجود بے ضابطگی نہیں۔ الفاظ کو ہمیشہ تول کر بیان کرتا ہے۔ یہی سب کچھ عدم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے۔ عدم فقیروں کے اس فلسفے سے باہر نہیں ہے۔ عدم نے فقیروں کے متعلق کچھ ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں ان فقیروں کی داخلی تصاویر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ وہ فقیر ہر وقت اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں ذہنی اور روحانی طور پر حاضر رہتے ہیں۔ اور اس کی شان و عظمت کے ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے فقیر تسلیم و رضا کا مرقع ہوتے ہیں۔ ایسے فقیر عجز و صفا کا مجسمہ ہوتے ہیں اور منفرد شان بے نیازی رکھتے ہیں۔ یہ فقیر بڑے اوصاف اور اعلیٰ خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی صفات کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن عدم نے ان کے متعلق ایک تسلی بخش بات کہہ دی ہے۔ جو انفرادی امتیازی ایک دلکش تصویر پیش کرتی ہے۔

وہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں　　آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
تیری محفل میں بیٹھنے والے　　کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں

ایسے لوگ ہی معاشرے میں انسانیت کے احترام کا باعث ہوتے ہیں۔ عدم کا کلام عجز و صفا کی باتوں سے لبریز ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع ایک اعلیٰ و ارفع مقصد ہے۔ جسے عدم نے جا بجا اپنے اشعار میں سمو دیا ہے۔ جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس میں کچھ ایسے عناصر کے اثرات بھی ہیں جو کائنات میں پھیلے ہوئے مظاہر فطرت سے نمودار ہوتے ہیں۔ اور ہمارے دل اور نظر کو لذت صدق سے آشنا کرتے ہیں۔ اس ماحول کے لوگ اپنے خالق و معبود کی تعریف و مناجات میں مصروف رہتے ہیں۔ اور ہر آن اپنے اس مالک سے عطا و بخشش کی تمنا رکھتے ہیں۔ اس لئے عدم امید کی شمع روشن کرتا ہے اور ان فقیروں سے کہتا ہے۔

فقیرو مناجات کرتے رہو　　کبھی ہو ہی جائیں گی منظوریاں

ایسے لوگوں کی دعائیں بارگاہ شرف قبول ہو جاتی ہیں۔ اور ان پر دنیا و آخرت میں حصول عافیت کا احساس نمایاں ہونے لگتا ہے۔ جو لوگ اپنا تمام علمی اور عقلی اثاثہ اور اپنی جان و مال اپنے مالک کے سپرد کر دیتے ہیں۔ انہیں دنیا کی کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ انسانیت کیلئے انتہائی نقصان دہ عوامل بھی ان کے مددگار بن جاتے ہیں۔ وہ فقیر اسی قسم کے لوگ ہیں۔ جن کی کشتیاں طوفان چلاتا چلا جاتا ہے اور کنارے لگا دیتا ہے۔

طوفاں کے رحم پر تھیں فقیروں کی کشتیاں　　طوفان ہی کشتیوں کو چلاتا چلا گیا

عدم کے ہاں احساسات کی صورت گری کے اور دروں بینی کے بے شمار مناظر سامنے آتے ہیں۔ جبکہ فقیرانہ عجز و وقار اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ عدم نے ایسے ہی لوگوں کو شامل موضوع کیا ہے۔ ان کو ذکر الٰہی کی محفلوں میں شریک دیکھا ہے۔ اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

دم لے ایک لمحہ بیٹھ جائیں گے فقیر　　سن کر تمہارے خلق کی تعریف آ گئے

بڑے شاعروں کے ہاں اس قسم کی کیفیات گزرتی رہتی ہیں۔ عدم کے کلام میں کسی بڑے شاعر کا تتبع تو محسوس نہیں ہوتا۔ ان کا رنگ شاعری خود اپنا رنگ اظہار ہے۔ جو ایک مسلسل مشق سخن کے ذریعے قائم ہوا ہے۔ غزل میں جہاں یہ رنگ ابھرتا ہے۔ وہاں ایک تخلیقی

شانِ اظہار ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز بن جاتی ہے۔ اس نوع کے فقیروں سے متعلق کچھ اور اشعار بھی عدمؔ کے کلام میں موجود ہیں۔ جن کو اس مختصر تحریر میں پیش کرنے کا موقع نہیں بن سکا۔ ان کا ذکر کسی دوسرے موقع پر موقوف رکھتے ہیں۔

کہہ دو یہ عدمؔ سے کہ خرابات میں کل رات — کچھ لوگ فقیروں کی مدارات کریں گے

اس تحریر کو زیادہ وسعت دینے کا ارادہ نہیں۔ عدمؔ کا کلام ایک زرفشاں خطِ شاعری ہے۔ اس میں نایاب جواہر ریزے ہیں۔ ان کی ضوفشانی اور آب و تاب کو بیان کرنا میرے جیسے کم ہمت شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ میری دلچسپی عدمؔ کے کلام سے صرف لطف اندوزی تک محدود ہے۔ میری کوشش بھی اسی کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کلام بڑے لوگوں کیلئے وقف رکھا ہے۔ اس تحریر کو عدمؔ کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں۔

روشنی ہم فقیر سی آخر — عالم اعتبار کو دیں گے

◆◆◆

نعتیہ ماہیے

قیصر نجفی

اللہ کی ربانی لکھے اسے چاند مدینے کے
نعت کے شعر کہاں داغ دکھا میرے
قرآں کی معانی لکھے سرکارؐ کو سینے کے

☆☆☆

جب بود و ہست نہ تھا کیونکر وہ پریشاں ہو
تھے سرکار نبیؐ جو بھی مدینے میں
جب لوگو وقت نہ تھا سرکارؐ کا مہماں ہو

☆☆☆

آنکھوں کی صدائیں سنیں آخر میں ہیں تیوں کے
روضہ سرورؐ پہ شاہد ہیں وہی لیکن
بے حرف دعائیں سنیں خلقت کی گھڑیوں کے

☆☆☆

وہ پارس ہوتے ہیں ایسا نہ کوئی دیکھا
پاؤں سے چھو تیرے جس پہ درود و سلام
مجھ مس ہوتے ہیں اللہ نے ہو بھیجا

☆☆☆

ابولہب

پیروز بخت قاضی

''ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی، لگائی بجھائی کرنے والی۔ اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی۔'' (111:1تا5)

اس شخص کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا اور ابولہب اس لئے کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ بہت چمکتا ہوا سرخ و سفید تھا۔ لہب آگ کے شعلے کو کہتے ہیں اور ابولہب کے معنی ہیں شعلہ رو۔ وہ زیادہ تر اپنے نام کی بجائے اپنی کنیت ہی سے معروف تھا۔ عبدالعزیٰ مشرکانہ نام تھا اس لئے قرآن میں اس نام کو پسند نہ کیا گیا۔ ابولہب نے رسول اللہ کی دعوت کو زک دینے کے لئے اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ لیکن اس سورۃ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ مکہ میں جب اس شکست کی خبر پہنچی تو اس کو اتنا رنج ہوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس کی موت بھی نہایت عبرتناک تھی۔ اسے ایسی بیماری ہو گئی تھی کہ اس کے گھر والوں نے چھوت کے خوف سے اسے چھوڑ دیا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور بدبو پھیلنے لگی۔ جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دیئے تو ایک روایت کے مطابق انہوں نے چند حبشی مزدوروں کو اجرت دے کر لاش اٹھوائی اور دفن کروائی۔ دوسری روایت کے مطابق ایک گڑھا کھود کر لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیلا اور گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی۔ جس دین کی راہ روکنے کے لئے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اس دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی درہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر اس کے دونوں بیٹے عتبہ اور معتب حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضور کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لا کر انہوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔

ابولہب بن عبدالمطلب حضور کا چچا تھا۔ جب حضور کو دعوت عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا ''ہائے صبح کی آفت''۔ عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لئے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضور کی یہ پکار سن کر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے کر پکارا اور کہا کہ اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا تو میں تمہیں خبردار کرتا

ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے۔ قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا "ستیاناس جائے تیرا کیا تو نے اس لئے ہمیں یہاں جمع کیا ہے؟" ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تا کہ رسول اللہ پر کھینچ مارے۔

ابن زید کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسول اللہؐ سے ایک روز پوچھا اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ تو آپ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا میرے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضور نے فرمایا اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پر وہ بولا "ستیاناس جائے اس دین کا جس میں میں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں۔" مکہ میں ابولہب حضور کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں گھروں کے بیچ ایک دیوار واقع تھی۔ اس کے علاوہ اور لوگ بھی آپ کے ہمسائے تھے۔ یہ لوگ گھر میں بھی حضور کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ کبھی نماز کی حالت میں آپ پر بکری کی اوجھڑی پھینک دیتے۔ کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل وتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لا کر ڈال دیتی تا کہ صبح سویرے جب آپ یا آپ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جائے۔

نبوت سے قبل آپ کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ جب حضور نے اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لئے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ عتیبہ جہالت میں اس قدر بڑھ گیا کہ ایک روز حضور کے سامنے آ کر ان کی طرف تھوکا جو آپ پر نہیں پڑا۔ اس پر حضور نے فرمایا "خدایا اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر دے۔" اس کے بعد عتیبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوا۔ دوران سفر قافلے نے ایک ایسی جگہ پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہل قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو کیونکہ مجھے محمد کی بددعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عتیبہ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیئے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اس نے عتیبہ کو چیر پھاڑ کھایا۔

جب رسول اللہ کے صاحبزادے حضرت قاسم کے بعد دوسرے صاحبزادے عبداللہ کا بھی انتقال ہو گیا تو ابولہب اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کی بجائے خوشی خوشی دوڑا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی کہ لو آج محمدؐ بے نام و نشان ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس غم کی حالت میں حضور پر سورۃ کوثر کی تین آیات نازل فرمائیں کہ "(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا۔ پس تم اپنے رب ہی کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔" (108:1 تا 3)

رسول اللہؐ جہاں کہیں اسلام کی دعوت دینے کے لئے تشریف لے جاتے یہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا۔ نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کا معاشرتی اور معاشی بائیکاٹ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ کی حمایت پر ثابت قدم رہے اور شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کی بجائے کفار قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعب ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے جاتا تو ابولہب پکار کر کہتا

کہ ان سے اتنی قیمت مانگو جو یہ ادا نہ کر سکیں۔ تمہیں جو خسارہ بھی ہوگا میں پورا کر دوں گا۔ یہ اس شخص کی حرکات تھیں جس کی بنا پر اس سورۃ میں نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ ابولہب کی بیوی کا نام اروی تھا اور ام جمیل اس کی کنیت تھی۔ یہ ابوسفیان کی بہن تھی اور رسول اللہؐ کے ساتھ عداوت میں اپنے شوہر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی اور ام جمیل نے اس کو سنا تو وہ بپھری ہوئی رسول اللہ کی تلاش میں نکلی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھی بھر پتھر تھے اور وہ حضورؐ کی ہجو میں اپنے ہی کہے اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ حرم میں پہنچی تو وہاں ابوبکرؓ کے ساتھ حضورؐ تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ آ رہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر یہ کوئی بیہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے فرمایا یہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کے موجود ہونے کے باوجود وہ آپ کو نہ دیکھ سکی۔ اور اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ میں نے سنا ہے تمہارے صاحب نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اس گھر کے رب کی قسم انہوں نے تو تمہاری کوئی ہجو نہیں کی۔ اس پر وہ واپس چلی گئی۔ ابوبکرؓ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہجو تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے، رسول اللہ نے نہیں کی۔

◆◆◆

تخلیق تقریب 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

ماہنامہ ''تخلیق'' کا آغاز میرے سامنے ہوا اور پہلے شمارے سے گاہے گاہے میری نظم و نثر شائع ہوتی رہی اور میں اس بات کا بھی شاہد ہوں کہ انھوں نے سالہا سال ادب کی بے پناہ خدمت کی ہے اور کتنے نوجوان اہل قلم کو انھوں نے متعارف کرایا اس کی دوسری مثال شاید ہی ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کے فرزند گرامی کو بھی تا دیر انہی کی روایت پر چلنے کی توفیق دے جس پر وہ عمل پیرا ہیں اور دعا ہے کہ خدمات ادب جاری رکھنے کی توفیق اللہ کی طرف سے مسلسل جاری رہے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)

تخلیق تقریب 11 مارچ 2023ء میں تحریری تاثرات

میں سونان اظہر صاحب کو خوبصورت اور شاندار تقریب کروانے پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جس طرح سونان اظہر دن رات محنت کر کے اظہر جاوید صاحب کے مشن کو لے کر چل رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ دعا ہے کہ ماہنامہ ''تخلیق'' کو اور عزت اور شہرت عطا کرے۔ آمین!

(مدثر حبیب جامی)

توشۂ خاص

عاشقِ دل گیر —— اظہر جاوید

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

اظہر جاوید کو ہر کوئی جانتا ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ اس کی ذات اور شخصیت کا تار و پود کن ریشمیں تاروں اور روپہلی کرنوں سے بنا گیا ہے۔ میں جب بھی اس پر نظریں جمانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ ہر بار ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے اور ہر ملاقات میں اپنی شخصیت کا کوئی نیا سرا ہاتھ میں دے دیتا ہے جسے تھام کر آپ زینہ بہ زینہ قدم رکھتے ہوئے بام تک پہنچیں گے تو وہ ستارہ وار روشن نظر آئے گا۔ جس کے جوار میں چوتھے یا پانچویں روز کا چاند بھی پکھوار کو موجود رہے گا۔ ان گنت خوبیوں کا حامل اظہر جاوید اس زمین پر قدرت کا تحفہ خاص تھا۔ اس نے اپنے وصال کے لیے دن بھی وہ پسند کیا جس میں دنیا دار محبت کی رت مناتے ہیں اور پھول پیش کر کے گلے لگاتے ہیں۔ اس کا خمیر عشق سے اٹھا تھا اور اس نے تمام عمر عشق میں بسر کی۔ صاف ستھرا اجلا اجلا سا شخص، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ لیے وہ جب بھی ملا، کھلی بانہوں، فراخ دامن اور ادائے دل کشا سے ملا۔ ایک آن میں ملنے والے کو تمام دکھوں اور غموں سے آزاد کر دیتا اور اپنی مصروفیت کو طاق پر رکھ کر اس کے لیے فارغ ہو جاتا اور پھر چند لمحوں کے جادو سے ہی میں وہ آنے والے کا احوال جان چکا ہوتا اور خود وہ بھی اس کے پاس بیٹھ کر سہولت محسوس کرتا اور حلقہ گوش تخلیق ہو جاتا۔ جب بھی کسی خوب صورت انسان سے ملنے کی چاہ دل میں پیدا ہوتی تو اس کے قدم خود بخود بھگوان سٹریٹ کی طرف اٹھنے لگتے۔ ادھر اظہر جاوید بھی اس بندے کو ہمیشہ یاد رکھتا، وہ اس کا نام اور پتا ایک رجسٹر میں لکھ لیتا اور ماہ بہ ماہ تخلیق کے ذریعے اسے اپنی زیارت کراتا۔

وہ اپنی ذات میں ایک منفرد شخص تھا۔ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے عجلت اور روا روی میں نام اور پتے کی چٹ لگا کر اپنے چاہنے والے کو تخلیق بھیج دیا ہو یا کسی کاغذ کے ٹکڑے میں اسے لپیٹ کر ارسال کر دیا ہو۔ وہ بڑے سائز کے مضبوط لفافے کا اہتمام کرتا اور اپنے ہاتھ سے نام اور پتا لکھ کر ڈاک ٹکٹ چسپاں کرتا اور لاہور کے سب سے بڑے ڈاک خانے میں جا کر اسے حوالۂ ڈاک کرتا۔ اس مشینی دور میں ہر کام آسان ہو گیا ہے لیکن اظہر جاوید نے اپنے لیے آسانی پسند نہیں کی۔ وہ مشقتوں کا اتنا عادی تھا کہ سہل نگاری اسے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ اصل میں محبت کرنے کا اس کا اپنا انداز تھا جسے اس نے روایت جان کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ حق کی جان سے چاہتا تھا اور اس میں کسی نوع کی غفلت کو گناہ سمجھتا تھا۔ اظہر جاوید ان لوگوں میں شمار ہوتا تھا جن کے دروں کا راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور وہ گلی کی دستک کی زحمت بھی نہیں دیتے۔ کوئی آئے اور چلا آئے اور گوشۂ دل کی پہنائیوں میں سما جائے۔ وہ ایک کھلی کتاب تھا جس کا ورق ورق مس آشنا تھا جس پر انگشت بوسوں کے نشان ثبت ہوتے ہیں کہ گل بھر رنگ کی تصویر نظر میں آ جاتی ہے۔ نہ جانے وہ کون سا لمحۂ مسعود تھا جب اظہر جاوید سے میری شناسائی ہوئی۔ ٹی ہاؤس سے نکل کر ری آفس کا رخ کریں تو مال روڈ کا چوک عبور کرتے ہی بائیں ہاتھ گلی کے

چھجوں والی ایک پرانی عمارت میں "تخلیق" کا دفتر تھا۔ اب وہاں کمرشل بینک کی عمارت بن چکی ہے۔ وہاں میرا زیادہ آنا جانا نہیں رہا، البتہ جان پہچان ہو گئی تھی اور سلام دعا ہوتی رہتی تھی۔ اظہر جاوید تب اچھا بھلا نوجوان تھا۔ گھنے بال، لمبے، قد متناسب، ناک نمایاں، چمکتی ہوئی آنکھیں، بھڑکیلا رنگین قمیص پتلون میں ملبوس، رنگین اسکارف باندھے بظاہر لاابالی سا نظر آتا مگر یہ بانکپن تھا، گہرا تھا اس کا حال اس کی گفتگو میں کھلتا۔ اظہر جاوید سے ملاقاتوں کی اولین ساعتوں میں اس کا جو سراپا میرے ذہن میں قائم ہے، بعد میں عمر کے بڑھنے سے اس میں چند ہی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مجھے یوں لگا کہ بڑھاپے میں وہ زیادہ خوب صورت ہو گیا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے اول اول دل میں جاگنے والی عشق کی آنچ کو زندگی بھر مدھم نہیں ہونے دیا بلکہ اس آنچ کو آگ بنانے میں خود کو پوری طرح صرف کر دیا۔ اس کا عشق کسی ایک پر موقوف نہیں رہا بلکہ یہ زندگی بھر کا سلسلہ تھا جو آخر دم تک جاری رہا اور وہ اس میں اس حد تک ثابت قدم رہا کہ اس نے حسن کی کوئی تہذیب، کوئی بھلک قضا نہیں ہونے دی۔ اس کے عشق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس دائرے میں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں تاہم خواتین کی تعداد زیادہ ہے جو اس کی دل وابستگیوں کا مرکز و محور ہیں۔ وہ بلاتمیز عمر، رنگ اور نسل ہر عورت کا احترام کرتا ہے اور اسے حسینہ کہتا ہے۔ اس میں وہ عورت بھی شامل ہے جو اس کے دفتر کی صفائی کرتی ہے اور اس سے ڈھنگ سے چلا بھی نہیں جاتا۔ تیس سے ستر سال کی عمر تک کی ہر لڑکی اور عورت اس کی محبوبہ ہے اور وہ سب کے ناز نخرے برداشت کرتا اور ان کی اداؤں پر جان دیتا ہے۔ اسے عشق کی اول اول ساعت بھی ہمیشہ یاد رہی۔ ایک روز بے تکلفی میں، میں نے پوچھ لیا تو اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر سرگودھے کی ایک البیلی دوشیزہ کو ایک اعزاز دلربائی سے یاد کیا جسے اظہر جاوید نے اپنے پسندیدہ شاعر ساحر لدھیانوی کی کتاب "تلخیاں" تحفے میں دی تھی۔ کسی نے اس معشوقہ سے پوچھا کہ اظہر نے تمہیں کون سی کتاب تحفے میں دی ہے تو اس کے دوست سلیم مرزا نے جھٹ سے کہہ دیا "تلخیاں"۔ اس پر وہ بولی "ہاں یہ تلخیاں ہی دیتے ہیں۔" کاش اس معشوقہ کو یہ بات معلوم ہوتی کہ اظہر جاوید ساحر کا پرستار تھا۔ اس کے پاس تلخیاں ہی نہیں، ویسے تو تاج محل بھی تھا۔ یقین دلانے کے لیے اس کی نظم "یہ تاج محل" موجود ہے جس میں بیچارا اظہر جاوید اپنی محبوبہ کے لیے جس تاج محل کے خواب دیکھتا ہے وہ سنگ مرمر سے بنا ہوا تاج محل نہیں، سنگ سرخ سے تراشا گیا پہلو میں دھڑکتا تاج محل ہے جو ہر زمانے اور عہد میں سانس لیتا ہے اور دھڑکن کو دھڑکن میں سمو کر اور جسم و جاں کے کیف میں محو کر حیات کو لافانی اور امر کر دیتا ہے۔ اظہر جاوید کا ایک عشق لاہور میں بھی چلا۔ اب کے اس کی معشوقہ ایک فکشن رائٹر تھی۔ اس عشق کو کافی شہرت ملی۔ یہاں تک کہ ٹی ہاؤس کی میزوں پر بھی موضوع گفتگو بنا اور اخباروں کے ادبی صفحوں میں چھپا۔ اس عشق میں معشوقہ کے شوہر سے اس کا جدال بھی ہوا لیکن اس کے حسن سلوک نے شوہر کو رام کر لیا اور وہ اس کے ارادت مندوں میں شامل ہوا۔ اسے ناکام عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ جتنی کے عشق سے فارغ ہوا تو بیچ میں کئی اور محبوباؤں سے سابقہ پڑا لیکن ہر محبوبہ نے واپسی کا راستہ کھلا رکھا۔ ملک سے باہر ایک خاتون شمائلہ سے پالا پڑا جس نے جذباتی رنگ اختیار کرنے میں دیر نہ کی اور خط و کتابت، گہرے عشق میں داخل ہو گئی یہاں تک کہ اظہر جاوید کے غیر ملک میں مستقل قیام کے منصوبے بننے لگے لیکن ان منصوبوں پر عمل نہ ہو سکا اور شمائلہ کا عشق بھی تمام ہوا۔ پھر چھوٹی موٹی کہانیاں لکھنے والی افشاں آئی پھر شکیلہ خان، ساجدہ، وتا کل، سیماب اور پھر نہ جانے کون کون۔ مگر سنبل کے عشق نے اظہر جاوید کو یوں اپنی گرفت میں لیا کہ لگتا ہے اس جو تھا اس کا عشق میں اس کے دل کو قرار آ گیا ہے۔ جتنی نے اس کے دل پر جو زخم لگائے تھے، ان کا تھوڑا بہت مداوا رانی نے کیا تھا مگر رانی ایک ہی زبان جانتی تھی جو روح کے چاک نہ بھر سکتی تھی۔ سندھ سے آنے والی

موبل ہوا کے ایک خوش گوار جھونکے کی طرح آئی اور اس کے حواس پر چھا گئی۔ یہ تعلق 1984ء کے آس پاس قائم ہوا۔ ان دنوں اظہر جاوید ایک عجیب سرشاری کے عالم میں تھا۔ اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ گفتگو میں نرالے راستے ابھر آئے تھے۔ زندگی یک دم خوب صورت نظر آنے لگی تھی۔ وہ لاہور آتی تو وصل کی راتیں اسے بے خود کر دیتیں۔ موبل اپنے صوبے میں ایک بڑی افسر تھی مگر ایک ادیب اور تخلیق کار کے عشق نے اسے افسری بھلا دی تھی۔ زوردار خط کتابت نے اس عشق میں توانائیاں بھر دی تھیں۔ اظہر جاوید خط میں اوپر کونے پر "بسم اللہ" لکھ کر نیچے "جانم" لکھتا اور پھر دل کی بات کہتا۔ اس کی شاعری تازہ دم ہو گئی تھی اور "جانم" کا لفظ مستقل طور پر اس کی نظموں اور غزلوں میں اپنی چھب دکھانے لگا تھا۔ اس نے موبل سے مل کر "تخلیق" کے ایک بڑے منصوبے پر بھی کام کیا اور سندھ کے حوالے سے تخلیق کا ایک یادگار نمبر بھی شائع کیا اور پھر دس برس کے اس معاشقے کا انجام بھی دوسرے معاشقوں سے مختلف نہ تھا۔ اس روز میں نے اظہر جاوید کو انتہائی افسردہ اور ذہنی دباؤ میں دیکھا۔ وہ بھگوان سٹریٹ کے آخری سرے پر دفتر "تخلیق" کے عین سامنے مکان کی دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا اور کاغذوں کے ایک پلندے کو آگ دکھا رہا تھا اور بڑی حسرت سے انھیں راکھ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا۔ میں نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا۔ مگر اس دن اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ چپ تھا اور اداس خاموش۔ اسے محبت کے انجام پر رونا آیا۔ فریق مخالف کو اس بات کا احساس ہوا یا نہ ہو لیکن اظہر جاوید ہر معاشقے کی ناکامی کے بعد ایک چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتا تھا اور پھر وہ ان کرچیوں کو جوڑنے میں لگ جاتا تھا۔ اس نے ساحر پر کتاب لکھی "ناکام محبت"۔ وہ دراصل یہ اس کی اپنی کہانی ہے۔ اس نے ساحر کے بیان میں ایک جملہ لکھا ہے کہ "ساحر ایسی محبوبہ چاہتا تھا جس میں ممتا بھی ہو... ممتا کا مطلب لغت میں صرف پیار لکھا ہوا ہے، جو ہوتے ہوتے ماں کے پیار کے لیے مخصوص ہو گیا۔" اظہر جاوید کے معاشقوں اور محبتوں کے پس منظر میں ایک ایسی ماں کا وجود خاص معنویت رکھتا ہے جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا اور جو اس کی شاعری میں ایک روشن ستارے اور بلیغ استعارے کی طرح موجود ہے۔ وہ تین سال کا تھا جب اس کے والدین ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اس کے والد عبدالغفور ریلوے میں افسر تھے اور راولپنڈی میں ویسٹریج کی آبادی میں رہائش رکھتے تھے۔ والدین میں علیحدگی ہونے کے بعد اظہر جاوید اپنی ماں کے ساتھ گوجرانوالہ اپنے ننھیال آ گیا۔ اس کی والدہ عصمت شیریں کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔ سارا ننھیال ہی تعلیم یافتہ تھا۔ ہوش سنبھالا تو گوجرانوالہ سے ترک سکونت کر کے ماں کے ساتھ سرگودھا کے نواحی گاؤں چک 80 جنوبی میں رہائش پذیر ہوا۔ بچپن اور لڑکپن کا بیشتر حصہ ماں کے ساتھ گزرا تو فطری طور پر ماں کے ساتھ گہری وابستگی پیدا ہوئی۔ وہ ذہنی اور قلبی طور پر اس قدر ماں کے قریب ہو گیا کہ ساری زندگی خود کو ماں کے تصور سے الگ نہیں کر سکا۔ کڑے وقت میں اسے ہمیشہ اپنی ماں اور اس کی ممتا یاد آئی۔ اس وقت بھی جب وہ دل کے عارضے کے سبب ہارٹ [illegible] کے بستر پر پڑا تھا۔ جب اس نے ایک نظم لکھ کر اپنی ماں کو یاد کیا: ماں۔ میری فریاد سنو! جب بھی میں بیمار ہوا ہوں / اکلاپے کے روگ میں پھنس

کر خود سے بھی بے زار ہوا ہوں / ماں۔ پھر تم یاد آتی ہو۔

ماں کے بارے میں اہل دل نے بہت کچھ لکھا ہے مگر جو والہانہ پن اور بے ساختہ جذبات کا اظہار اور دل کو تھام لینے والی کیفیت اس نظم میں ملتی ہے اس کا جواب نہیں۔ اظہر جاوید نے جس عشق سے ناتا جوڑا وہ اس کے بچپن سے لے کر دم آخر تک ایک دھیمی لَے کے ساتھ اور کبھی شعلہ جوالہ بن کر اس کے پہلو میں زندہ رہا۔ اس عشق میں سلگتے اور جلتے رہنا اس کی زندگی کا وتیرہ رہا۔ وہ اپنی عشق بے جواز سے

ماں کی محبت میں سرشار رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی ان معشوقاؤں کے فراق میں جینے کا حوصلہ بخشتا رہا جو اسے زندگی کے جھمیلوں میں تنہا چھوڑ کر اپنے اپنے مسکنوں کو سدھار گئیں۔ ایسے میں اس نے اپنی شاعری کو اپنی طاقت بنایا اور بنام عشق ایسی ایسی شان دار اور شاہکار نظمیں تخلیق کیں، جو اس کے درد و غم کی علامت بھی ٹھہریں اور تہذیب جاں کا استعارہ بھی۔ اظہر جاوید کا واحد شعری مجموعہ "غم عشق گر نہ ہوتا" غم عشق کی داستان ہی بیان نہیں کرتا بلکہ اس عورت کی تحلیل نفسی بھی کرتا ہے جو مرد کے برابر کھڑی ہو کر اسے وصل و ہجر کی منزلوں سے گزارتی ہے۔

اظہر جاوید کو میں نے زندگی میں دو موقعوں پر شدید افسردگی اور یاس کے عالم میں دیکھا ہے۔ ایک تو اپنی معشوقہ کے خط جلاتے ہوئے اور دوسرے اس وقت جب اسے عدالت میں احمد ندیم قاسمی کے مقابل آنا پڑا جب کہ وہ قاسمی صاحب کا بے حد احترام کرتا تھا اور ان سے ہمیشہ ادب سے کلام کرتا تھا۔ لیکن ایک دو موقعوں پر ایسا ہوا کہ قاسمی صاحب اس سے ناراض ہو گئے۔ ایک موقع پر تو معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن دوسری بار اس کے ایک اداریے پر انھوں نے معاف نہیں کیا اور اسے عدالت میں کھینچ لائے۔ اس نے تخلیق اور دیگر ذرائع سے قاسمی صاحب کو منانے اور اپنی صفائی پیش کرنے کی کوششیں کیں لیکن وہ مانے میں نہیں آئے۔ اس موقع پر اظہر جاوید کے دوستوں نے اس کا ساتھ دیا تھا لیکن بعض قریبی دوستوں کی بے اعتنائی کا اسے گلہ بھی تھا۔ ایک بار مجھے اس کے حق میں گواہی دینے کے لیے عدالت جانا پڑا تو میں نے دیکھا کہ کمرہ عدالت کے باہر اس کے حق میں پیش ہونے کے لیے شہر کے اکابرین بینچوں پر بیٹھے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ مقدمے کے دوران میں ایک بار دفتر تخلیق حاضر ہوا۔ 2005ء کا سال تھا اور 13 اگست ہفتے کا روز۔ اظہر جاوید بہت تپاک سے ملا۔ خوش گوار موڈ میں تھا۔ رسمی حال احوال پوچھنے کے بعد میں نے مقدمے کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ جج بہت سخت ہے اور فریق مخالف سے مرعوب نظر آتا ہے۔ خود ظہوری کی تحریر کے تجزیے کے لیے ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کو طلب کیا لیکن جج نے یہ کہا کہ اس کی ضرورت نہیں کیوں کہ مقدمے سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں بنتا۔ ہمارے تمام گواہوں نے شہادت دی کہ تخلیق کے اداریے سے ہتک عزت ثابت نہیں ہوتی۔ اب تک تو ان کا کوئی گواہ ہتک عزت ثابت نہیں کر سکا۔ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ آئندہ پیشی پر وکیلوں کے درمیان بحث ہوگی۔ اظہر جاوید یہ بتاتے ہوئے دکھی ہو گیا کہ قاسمی صاحب کا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ پہلے بھی قاسمی صاحب، تخلیق میں ایک خط کی اشاعت پر اس سے ناراض ہوئے تھے جس میں ان کی ترقی پسندی کے حوالے سے کوئی بات لکھی گئی تھی۔ انھوں نے مجھے فون کر کے اپنے غصے کا اظہار کیا۔ میں نے فون پر ان سے غیر مشروط معافی مانگی بلکہ ایک خط لکھ کر ان سے معذرت کی لیکن انھوں نے مجھے معاف نہیں کیا اور میرا وہ خط سنبھال کر رکھا اور اس مقدمے میں وہ خط اور لفافہ دونوں عدالت میں پیش کر دیے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس شخص کا وتیرہ ہی یہی ہے۔ اس نے بڑے افسوس سے کہا کہ اب ایک طرف عدالت میں پیشیاں بھگتی جا رہی ہیں اور دوسری طرف رسالوں میں مضمون چھپوا کر میری کردار کشی کی جا رہی ہے۔ ایک مزاح نگار کے رسالے میں پورے صفحے کا مضمون میرے خلاف لکھا گیا ہے کہ میں کوئی کام نہیں کرتا مگر تخلیق کے اخراجات کیسے پورے کرتا ہوں؟ اسی طرح کی اور باتیں ہیں جنھیں پڑھ کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ میری بساط ہی کیا تھی کہ میں اظہر جاوید کو تسلی دیتا۔ اس روز وہ دیر تک دل کا حال کہتا رہا اور میں سنتا رہا۔ ضیا ساجد کے آنے پر یہ سلسلہ منقطع ہوا۔ اظہر جاوید میں ایک بات تھی: اسے آپ اس کی خوبی کہیں یا خامی، کہ وہ دل کا حال کہنے میں دیر نہیں لگاتا تھا۔ جو بات دل میں ہوتی، منہ پر کہہ دیتا تھا، جس سے جو گلہ یا شکایت ہوتی، اسے باور کرا دیتا تھا۔

اظہر جاوید کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ اس نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھا۔ اس کی پنجابی کہانیاں اس کی شناخت رہی ہیں۔ ''بڑی دیر ہو گئی'' 25 کہانیوں پر مشتمل ایک پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ کہانی کار سے الگ اس کی اصل پہچان شاعری ہے۔ لیکن اسے مجموعے کی صورت اختیار کرنے میں واقعی بڑی دیر ہو گئی۔ اسے ابتدائے عمری میں ہی گرامی استاد شاعر میسر آ گئے تھے جن کی توجہ اور تربیت نے اسے شعر کہنے کا سلیقہ عطا کیا اور اس نے بھرپور نظم لکھی اور عشق آوارہ خرام کے پاؤں میں قلم کی صدا باندھ کر غزل کا شعر آزمایا۔ اپنی شاعری کے بارے میں اسے ہمیشہ تشنگی کا احساس رہا۔ احباب کے تقاضے بڑھتے تو وہ اپنا کل اثاثہ سامنے رکھ کر بیٹھ جاتا اور کتاب کی نمود کا سامان کرنے لگتا مگر پھر کچھ سوچ کر اسے طاق پر رکھ دیتا۔ ایسا کئی بار ہوا اور ہر بار اسے اپنی شاعری میں کوئی کمی نظر آئی جو انتخاب اور ترتیب سے روکتی رہی۔ آخر ایک صاحبِ دانش نے شاعری کا پلندہ اٹھایا اور اپنی استطاعت بھر وری کے ترازو میں رکھ کر تولا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔ جب اس کا اعتماد بحال ہوا اور ''ہم عشق کرتے ہوئے'' کتاب وجود میں آ گئی۔ ہر طرف سے داد وصول ہوئی۔ تبصروں، تجزیوں اور مضامین میں اچھی خاصی تحسین ہوئی، لے دے بھی ہوئی۔ ہمارے دوست عمر زمان کو بعض عمدہ رومانی نظموں کے رہ جانے پر افسوس تھا۔ کتاب 2003ء میں چھپی اور اسی سال دسمبر کے مہینے میں پرل کانٹی نینٹل لاہور میں ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جسے اظہر جاوید کے چاہنے والوں نے ترتیب دیا تھا۔ اسی تقریب میں بانو قدسیہ نے اظہر جاوید کو ''بھگوان سٹریٹ کا آرٹسٹ کہیا'' کہا۔ بہت سے اکابرین تھے، جنھوں نے اظہر جاوید کی دل کھول کر پذیرائی کی۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی دوستی کا قاعدہ نبھاتے ہوئے ایک بات کی جسے اظہر جاوید نے حوصلے اور صبر کے ساتھ سنا۔ شوکت تھانوی کی صاحبزادی شوکیہ تھانوی کی نظامت اور زرینہ کی آواز میں اظہر جاوید کی قوال تقریب کا حسن تھا۔

نیر آپا اور سید ایاز حسین امریکہ سے پاکستان آتے تو لاہور میں اظہر جاوید ہی کے مہمان تھے۔ وہ ادبی محفلوں اور تقریبات میں انھیں ساتھ لیے لیے پھرا۔ نیر آپا کی جواں مرگ بیٹی کی شاعری کی کتاب پر اس نے الحمرا میں ایک تقریب بھی منعقد کی۔ وہ تین دن اچھا خاصا ہنگامہ رہا۔ وہ دوست احباب کو جمع کر کے پائے پکا کر بہت خوش ہوتا تھا۔ بہت سی تقریبات اس کی مہمان نوازی اور حسن انتظام کی یادگار ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ اور بے مثال شخص تھا۔ اس نے اپنے ڈھب سے زندگی گزاری اور خوب گزاری۔ ہر کسی کے دکھ سکھ میں شریک، ہر ایک کے کام آنے والا۔ اس نے کبھی کسی محتاج یا فقیر کی طلب کو رد نہیں کیا، جو بھی میسر ہوا دے کر رخصت کیا۔ نماز کا وقت ہوتا تو بھری محفل چھوڑ کر اٹھ جاتا اور جا نماز بچھا کر یہ فریضہ ادا کرتا۔ ''رب سچیا'' کے الفاظ ہمیشہ وردِ زبان رہے۔ وہ بہت ہی سچا اور وعدے کی پاسداری کرنے والا شخص تھا۔ وہ عجیب آدمی تھا۔ اس کے سارے عشق ناتمام رہے اور ناکام گئے لیکن ایک عشق نہ تو ناتمام رہا اور نہ ناکام۔ اس عاشق دل گیر نے ''تخلیق'' سے اپنے لازوال عشق کو ناکام نہیں ہونے دیا۔ اپنی زندگی میں بھی، اور اپنے مرنے کے بعد بھی۔ اسے سونان کی صورت میں ایسا سپوت میسر ہوا جس نے باپ کے اس عشق کی لاج رکھ لی۔ ''تخلیق'' کی زندگی، اظہر جاوید کی زندگی ہے۔

◆◆◆

خلیل الرحمٰن قمر: جس کے پاس دو مرتبہ واپس ہوتا ہے وہ آپ کا نہیں ہوتا۔ جس نے آپ کو چھوڑ جانے کا ارادہ کر لیا ہو وہ دروازے کی درز (دراڑ) سے بھی نکل جائے گا اور جو آپ کے قریب آنے کا خواہش مند ہوگا وہ دیوار سے بھی راستہ بنا لے گا۔

اظہر جاوید اور سرگودھا

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ کسی قوم، طلب، معاشرے اور ماحول کے مختلف موضوعات پر وہی شخص قلم اٹھا سکتا ہے جو علم و فضل، تجربے، مشاہدے اور فنِ تحریر پر مکمل دسترس رکھتا ہو۔ پاکستان کی علمی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور صحافتی تاریخ میں ایک ہمہ صفت شخصیت کا نام اظہر جاوید ہے۔ اظہر جاوید کو اللہ تعالیٰ نے لاتعداد خوبیوں سے بہرہ ور فرمایا۔ اظہر جاوید کے تخلیقی سفر کا بنیادی ادارہ سرگودھا ہے۔ انھوں نے صحافتی اور ادبی حلقوں میں اپنی مقبولیت کا ایسا پرچم لہرایا کہ وہ آج بھی ادب کے دوش پر لہراتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ انھوں نے دبستانِ سرگودھا کی آبیاری کے لیے خونِ جگر سے کر ایسے کارہائے انجام دیے جو تاریخ کا حصہ بن گئے۔ سرگودھا ادبی اعتبار سے بہت زرخیز ہے۔ اظہر جاوید کا سرگودھا میں قیام یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنے حسنِ اخلاق سے اہلِ علم و دانش کے دل تسخیر کیے۔ شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور سماجی رہنماؤں میں اظہر جاوید بہت مقبول تھے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کے توازن اور حسنِ تدبر کے بل بوتے پر ہزاروں تخلیق کاروں کو متعارف کروانے کا فریضہ کماحقہٗ ادا کیا۔ علم و ادب کی پیشانی پر جھومر بن کر ستاروں کی طرح جگمگ کرنے والے اظہر جاوید سب کے دوست تھے۔ اظہر جاوید اردو پنجابی کی شاعری کے علاوہ صحافت، افسانہ نویسی حتیٰ کہ تجزیہ نگاری میں کمال رکھتے تھے۔

اظہر جاوید 2 جنوری 1938ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی اور تقریباً 17 برس کی عمر میں عالمِ شباب ہی میں شعر و سخن کا دامن تھام لیا۔ وہ سرگودھا اور بھاگٹانوالہ سے کئی اخبارات کو خبروں کی ترسیل کیا کرتے تھے۔ ان کے دیرینہ دوست کنول فیروز نے جوہر آباد میں منعقدہ مین آف دا سٹی ایوارڈ کی تقریب میں بتایا کہ وہ کئی دفعہ خبر بذریعہ بس لاہور پہنچاتے اور اہلِ سرگودھا کو حیران کر دیتے۔ سرگودھا کے مسائل پر فیچر تحریر کر کے اہلِ سرگودھا کی زبان بن جاتے۔ وہ جب تک سرگودھا میں مستقل قیام پذیر رہے انھوں نے یہاں کی ادبی تقریبات کو رونق بخشی۔

اتوار 11 فروری 2018ء کو پانی والے ان ہوٹل میں ڈاکٹر کنول فیروز (پی ایچ ڈی جرنلزم) سے اظہر جاوید کے بارے میں تفصیلی گفتگو کا موقع ملا۔ اس موقع پر فرزندِ اظہر جاوید سلطان اظہر، علی حسنین گیلانی، محمد صوفی، زاہد ندیم اور حذیفہ سلطان بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر کنول فیروز نے اظہر جاوید کے ساتھ اپنی حسین یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت سے امور افشا کیے۔ ڈاکٹر کنول فیروز نے ایک غیر رسمی ملاقات پر بتایا کہ اظہر جاوید کرکٹ کے شوقین تھے۔ خوش شکل اور خوش مزاج طبیعت کے مالک رہے۔ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں تھے بلکہ اپنے جذبات و احساسات کو شعری سانچے میں ڈھالنے کا ہنر جانتے تھے۔ انھوں نے راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کی بہت سی باتوں سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر کنول فیروز نے مزید بتایا کہ اظہر جاوید کی ملاقاتوں کا دائرہ بہت وسیع رہا۔ خصوصاً ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، ارشد بخش، تاج الدین حقیقت، شاکر کنڈانی، رشک ترابی، اے جی جوہر، مولانا محمد حسین شوق، عصمت طیب، تاج دارہ علوی، مفتی محمد شکیل گوندل، مجید انجم افضل پرواز، ایم ایچ ظفر، سید مسعود زاہدی، یوسف گوندل، میر عبدالرشید اشک، مظفر احسانی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، حکیم محمد صوفی اور ایسے ہی بہت

سے احباب کے ساتھ اظہر جاوید کی ملاقاتوں کا سلسلہ یادگار ہے۔

ڈاکٹر کنول فیروز 1959ء میں سرگودھا سے لاہور چلے گئے اور اظہر جاوید 1962ء میں کوئٹہ پہنچ کر فوج میں بھرتی ہو گئے لیکن 1964ء میں وہ بھی لاہور چلے آئے۔ اظہر جاوید نے اس دوران ہفت روزہ پارس، روزنامہ جمہور اور روزنامہ امروز میں اپنی صحافتی اور ادبی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ چوں کہ روزنامہ امروز "راست" کا اظہار تھا اس لیے روزنامہ امروز میں صحافتی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی وجہ سے انھیں ضیاء الحق حکومت نے روزنامہ امروز سے فارغ کر دیا۔ انھوں نے پہلے "تخلیق نو" اور پھر 1969ء میں "تخلیق" کا آغاز کیا۔

عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب، نقاد، انشائیہ نویس ڈاکٹر وزیر آغا (18 مئی 1922ء ۔ 7 ستمبر 2010ء) کی رہائش 56 جنوبی سرگودھا میں تھی لیکن وہ وزیر کوٹ سے بالالتزام شیخ سینٹر 58 اے ماڈل سول لائنز سرگودھا ہفتے میں دو دن ضرور تشریف لاتے تھے۔ اظہر جاوید ان کی بزم دوستاں میں ضرور شریک ہوتے۔ اظہر جاوید نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے بہت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا۔ ادب و صحافت میں ان کی شہرت بڑی منفرد رہی۔ ان سے محبت کرنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ سرگودھا میں مقیم رہنے اور لاہور منتقل ہونے کے باوجود جن لوگوں سے ان کا رابطہ تادم مرگ قائم رہا ان کی فہرست بہت طویل ہے چند ایک کا ذکر از بس ضروری ہے۔

شیخ محمد انور گوندی (8 ستمبر 1922ء ۔ 11 ستمبر 1974ء)، عصمت علیگ (9 / اپریل 1927ء ۔ 10 جنوری 2004ء)، صوفی فقیر محمد (14 / اکتوبر 1918ء ۔ 3 نومبر 2007ء)، پروفیسر غلام جیلانی اصغر (یکم جون 1918ء ۔ 26 دسمبر 2006ء)، مولانا محمد حسین شوق (14 دسمبر 1904ء ۔ 17 مئی 1971ء)، میر عبدالرشید اشک (26 جولائی 1912ء ۔ 2 جنوری 1986ء)، حافظ یوسف آزاد (1906ء ۔ 30 دسمبر 1979ء)، علامہ رشک ترابی (4 مارچ 1934ء ۔ 17 جنوری 2003ء)، انجم سرحدی (1914ء ۔ 12 مئی 1991ء)، سید مسعود زاہدی (1922ء ۔ 3 / اگست 2012ء)، نذیر شیخ زادہ (21 مئی 1928ء ۔ 21 مارچ 2002ء)، صاحبزادہ عبدالرسول (یکم جون 1932ء ۔ 29 جولائی 2019ء)، ریاض احمد شاد (17 / اگست 1944ء ۔ 17 / اگست 2015ء)، ڈاکٹر انور سدید (4 دسمبر 1928ء ۔ 20 مارچ 2016ء)، سید فیروز شاہ (8 فروری 1965ء ۔ 24 دسمبر 2004ء)، افضل نیازی (16 ستمبر 1946ء ۔ 18 / اکتوبر 2021ء)، شکیب جلالی (یکم اکتوبر 1934ء ۔ 11 نومبر 1966ء)، الحاج میاں محمد انور (یکم جنوری 1924ء ۔ 18 اکتوبر 2010ء)، وزیر حسین شیرازی (1906ء ۔ 27 دسمبر 1970ء)، محسن قریشی (15 فروری 1927ء ۔ 22 نومبر 2014ء)، میر مظاہر حسین (1936ء ۔ فروری 1983ء)، مفتی محمد خلیل گوندی (8 ستمبر 1922ء ۔ 20 دسمبر 2011ء)، جوہر نظامی (1900ء ۔ 18 / اگست 1996ء)، پرویز بزمی (1929ء ۔ 13 / اگست 2015ء)، مرزا ماصول انور (10 / اکتوبر 1910ء ۔ 11 / اپریل 1998ء)، سید اعجاز حسین شاہ (9 / اپریل 1922ء ۔ 2016ء)، بشیر راجن ادیب (1926ء ۔ 12 دسمبر 1994ء)، ڈاکٹر جاوید انور (18 / اپریل 1959ء ۔ 25 نومبر 2011ء)، اشفاق عاطف (10 / اگست 1958ء ۔ 21 جون 2021ء)، میاں ایم اے شاد ایڈووکیٹ (6 مئی 1954ء ۔ 10 ستمبر 2013ء)، محمود اسیر (6 نومبر 1956ء ۔ 12 / اپریل 2018ء)، منصور احمد راہی (3 مئی 1955ء ۔ 22 جون 2000ء)، نسیم اقبال بھٹی (6 جون 1953ء ۔ 21 نومبر 2021ء)، شوکت رانا (25 ستمبر 1941ء ۔ 25 فروری 2007ء)، حنیف ساجد (2 جولائی 1947ء ۔ 24 جولائی 2011ء)، سلیم حسن مرزا (2 / اکتوبر 1938ء ۔ 24 اپریل 2010ء)، شاکر نظامی (یکم

اپریل 1945ء۔ 9 جنوری 2021ء)، پروفیسر منور مرزا (27 مارچ 1923ء۔ 7 فروری 2008ء)، خورشید شاہ پوری (یکم جنوری 1943ء۔ 17 دسمبر 2018ء)، پروفیسر اجمل ہاشمی (8 فروری 1946ء۔ 17 جنوری 2000ء)، واحد حسین شان (15 جنوری 1922ء۔ 17 مئی 2000ء)، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش (22 نومبر 1956ء۔ 4 اکتوبر 2018ء)، مرزا احمد خلیل چکوالی (1938ء۔ 26 دسمبر 1985ء)، خواجہ اویس احمد شبلی پانی پتی (یکم جولائی 1919ء۔ 27 مئی 2007ء)، نصرت چودھری (4 اپریل 1929ء۔ 26 مارچ 2010ء)، عزیز علوی (4 نومبر 1926ء۔ 21 جنوری 2006ء)، صاحبزادہ رفعت سلطان (یکم مارچ 1924ء۔ 28 دسمبر 2007ء)، غلام حسین قیصر (1902ء۔ 14 اگست 1974ء)، شیر افضل جعفری (یکم ستمبر 1919ء۔ 22 جنوری 1989ء)، پروفیسر محمد افضل ملک (15 مئی 1936ء۔ 14 فروری 2008ء)، پروفیسر خلیل بدایونی (3 نومبر 1919ء۔ 9 مئی 2009ء)، ظہیر الدین ظہیر (19 اپریل 1931ء۔ 27 اپریل 2011ء)، پروفیسر چودھری عبدالمجید (25 جون 1933ء۔ 26 نومبر 2007ء)، حکیم بھٹی (یکم جنوری 1913ء۔ 14 فروری 2000ء)، ڈاکٹر انور چودھری (یکم جنوری 1928ء۔ 20 جون 2001ء)، کلیم احیائی (1936ء۔ 19 فروری 1986ء)، مولوی محمد اسلم (6 اگست 1943ء۔ 26 اپریل 2014ء)، سید قاسم علی شاہ (15 اپریل 1965ء۔ 4 مارچ 2023ء)، سید حسن عباس زیدی (20 جنوری 1920ء۔ 1999ء)، چودھری انور علی چیمہ ایم این اے (یکم جنوری 1935ء۔ 31 جولائی 2016ء)، مظفر وحید یوسفی (8 جون 1916ء۔ 31 جنوری 1994ء)، [illegible] (1922ء۔ پ)، محمد افضل پراچہ (28 جنوری 1928ء۔ 8 جولائی 2006ء)، رضا حسن علی حیدر (8 مارچ 1932ء۔ 27 فروری 2012ء)، سیف زلفی (یکم دسمبر 1920ء۔ 24 نومبر 1986ء)، محمد اقبال منظر (11 اگست 1921ء۔ 30 جنوری 2004ء)، بدرالدین بدر (1909ء۔ 11 ستمبر 1988ء)، چودھری اصغر علی کوثر (5 جون 1938ء۔ 2021ء)، افضل [illegible] (5 جنوری 1920ء۔ 13 مئی 1998ء)، صفدر خورشید (1925ء۔ 20 مئی 2014ء)، نظیر احمد حنفی (یکم جنوری 1942ء۔ 6 جون 1986ء)، پروفیسر ضیاء حسین نقوی (3 اگست 1935ء۔ 2 اکتوبر 2021ء)، سید جمیل رضوی (یکم مارچ 1911ء۔ 19 جنوری 1995ء)، محمد شاہد قریشی (یکم جنوری 1951ء۔ 8 جنوری 2001ء)، پروفیسر منظور الحق (1913ء۔ 6 فروری 2003ء)، چودھری کریم داد [illegible] (22 جون 1938ء۔ 29 دسمبر 1994ء)، تاج الدین حقیقت (1942ء۔ 1999ء)، محمد یوسف گوندل (25 اپریل 1946ء۔ 3 جون 1995ء)، انور حیدری (8 جنوری 1926ء۔ 1985ء)، پروفیسر سجاد نقوی (6 جون 1931ء۔ 9 نومبر 2012ء)، پروانہ شاہ پوری (20 دسمبر 1942ء۔ 17 اگست 2010ء)، مظفر احسانی (1911ء۔ 7 جنوری 1984ء)، سید سجاد حیدر (4 اپریل 1925ء۔ 3 مارچ 1996ء)، حافظ محمد سعید ایڈووکیٹ (یکم جنوری 1948ء۔ 19 اپریل 2003ء)، سید رضا جعفری (یکم جولائی 1936ء۔ 2 مارچ 2002ء)، ملک انجم اعوان (21 اکتوبر 1935ء۔ 7 فروری 2002ء)، مرزا ارشاد حسرت (1932ء۔ 2 مئی 1984ء)۔ علاوہ ازیں بھی عاشق جعفری، نذر حسین بھٹی، رفیق خان بابا، کریم مخلص، انجم رومانی، صفدر حسین کاظمی، خلیل احمد قریشی، ایم این اے صوفی، تنویر صہبائی، فخر الدین بے، الہٰی بخش قریشی، بشیر احمد عازر اور ارشد بھٹی ان کے چاہنے والوں میں شامل تھے۔

سرگودھا کی ادبی سرگرمیوں میں اظہر جاوید اپنی شرکت کو اپنے لیے تسکین تصور کیا کرتے تھے۔ لاہور منتقل ہونے کے بعد بھی وہ

ایک دعوت دائرے پر کیے دھاگے کی طرح کھنچے چلے آتے۔ سیکڑوں اہل قلم ایسے ہیں جو آج بھی ان سے ملاقات اور ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ بیدار سرمدی (پ: 11 نومبر 1948ء)، شاہد بخاری (پ: 5/ اپریل 1949ء)، سلطان احمد علوی چیک (پ: 9 مئی 1936ء)، ملک مقبول شاد (پ: 12/ اکتوبر 1956ء)، خالد اقبال یاسر (پ: 13 مارچ 1952ء)، اصغر شاکی (پ: 7 فروری 1952ء)، اقبال عظیم (پ: 10 دسمبر 1952ء)، پروفیسر مظفر حسن منصور (پ: یکم اپریل 1942ء)، ڈاکٹر زاہد منیر عامر (پ: 18 جولائی 1966ء)، ڈاکٹر خورشید رضوی (پ: 19 مئی 1942ء)، پروفیسر یوسف خالد (پ: 20 جون 1954ء)، انجم منصور (پ: 8 نومبر 1967ء)، طارق حبیب (پ: 5/ اگست 1972ء)، عابد خورشید (پ: 11 جنوری 1974ء)؛ عامر سیال (پ: 19 مارچ 1973ء)، ذوالفقار احسن (پ: 4/ اکتوبر 1969ء)، اعتماد رضا صفی (پ: 29 جولائی 1972ء)، حمزہ انور گوندل (پ: 5 جون 1960ء)، وصی شاہ (پ: 21 جون 1972ء)، راشد شکیب (پ: 16 مئی 1950ء)، ذوالفقار تابش (پ: 7/ اپریل 1981ء)، طارق کلیم (پ: 22 فروری 1967ء)، فاروق لودھی (پ: 10/ اپریل 1954ء)، ڈاکٹر بدر منیر (پ: یکم ستمبر 1964ء)، عرفان رشید (پ: 3 مئی 1964ء)، فرخ اعجاز نصیر ایڈووکیٹ (پ: 21 مارچ 1984ء)، عمر فاروق مونس (پ: یکم مارچ 1969ء)، ممتاز عارف (پ: 15 فروری 1954ء)، ڈاکٹر افتخار فیصل (پ: یکم مئی 1954ء)، متین گوہری (پ: یکم فروری 1949ء)، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (پ: 15 مارچ 1945ء)، شاکر کنڈان (پ: 20 جون 1951ء)، انجم آزاد (پ: 30 ستمبر 1952ء)، آصف راز (پ: 10 مارچ 1951ء)، نعیم حسن مرزا (پ: 15 جنوری 1942ء)، سید جواد حسن جواد (پ: 1968ء)، کنول فیروز (پ: 4/ اپریل 1938ء)، عاشر وکیل راؤ (پ: 30 مئی 1977ء)، ڈاکٹر ارشد ملک (پ: یکم نومبر 1957ء)، شاہد اسلام دانش (پ: 26 دسمبر 1968ء)، کامران رشید (پ: 4 مئی 1951ء)، پروفیسر عبدالقیوم راؤ (پ: 27/ اپریل 1946ء)، پروفیسر مقبول ذکی ملک (پ: 12/ اکتوبر 1956ء)، رانا سعید دوشی (پ: 14/ اپریل 1965ء)، افضل گوہر (پ: 2 فروری 1965ء)، سید مرتضیٰ حسن (پ: 16 جولائی 1986ء)، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (یکم اپریل 1942ء)، عبدالحبیب خالد (پ: 4 جولائی 1948ء)، متین گوہری (پ: یکم فروری 1949ء) اور ارشد گوہر، بدرالزماں، پروفیسر بشیر احمد ساجی، محمد ادریس مرزا، قادر عقیل عالم، فاروق سیلی، کرنل صدیق لالی، ڈاکٹر خالد اقبال، امجد الٰہی امجد، محمد عامر رانا، ڈاکٹر شفیق آصف، پروفیسر ولی محمد انجم، میجر محمد یعقوب، رانا ارشاد علی صدیقی، خواجہ اعجاز احمد بٹ، میاں فصیح احمد ایڈووکیٹ، نذیر خالد، پروفیسر ریاض الہدیٰ، حمزہ حامد، ڈاکٹر غلام شبیر گوندل، فرزانہ رمضان، شفیق اختر افغانی، ملک محمد معظم، ملک عبدالحمید آزاد، اشرف چوہان، پروفیسر ملک منور، صلاح الدین حیدر، اعجاز حسین گیلانی، یونس خیال، شکیلہ رفیع، سیما شکیب، فیصل سلیمی، فاروق عادل، آتش کیانی اور نعیم فاروقی ان کے لیے رطب اللسان ہیں۔ انھیں چاہنے والوں کی فہرست میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو محسن ادب ڈاکٹر وزیر آغا کی شام دوستاں کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی شام دوستاں علم و ادب کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کرتی رہی۔ سرگودھا والوں کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا کی شام دوستاں میں عالمی شہرت یافتہ اہل قلم دنیا کے مختلف علاقوں سے اکثر آیا کرتے تھے۔ خصوصی طور پر ہندوستان کے تخلیق کار ماہنامہ "اوراق" اور "تخلیق" میں یکساں چھپتے رہے۔ ان کی A-158 پر حاضری دبستان سرگودھا کے لیے باعث فخر رہی۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک حلیم الطبع انسان تھے۔ وہ اظہر جاوید کی صلاحیتوں کے معترف رہے۔ "اوراق" کے کئی شماروں میں اظہر جاوید کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریریں "تخلیق" کی زینت تھیں۔ وزیر آغا نے انھیں ادبی حلقوں میں متعارف کروانے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی اور پھر وقت آیا کہ اظہر جاوید اہل سرگودھا کی پہچان بن گئے۔ تخلیق کار خواتین نے بھی تخلیق سے اکتسابِ فیض کیا۔ سرگودھا میں پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ عزیزی نجمہ منصور کا کہنا ہے کہ اظہر جاوید کی محبت سب کے لیے یکساں تھی۔ وہ کسی سے بھی نفرت نہیں کیا کرتے تھے، صلاحیتوں کے اعتراف میں ان کا ظرف بہت وسیع تھا۔ تخلیق کی کامیابی ان کے حسنِ اخلاق کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے شعری مجموعہ "محبت کیوں نہیں کرتے" کا فلیپ بھی اظہر جاوید نے بڑی محبت سے لکھا۔

ممتاز شاعر و ادیب، صحافی، کالم نویس، بیدار دل محترم بیدار سرمدی کا اظہر جاوید سے تعلق بڑا قدیم ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے ان دونوں کی مستعدی، محنت اور ادبی لگن کا مشاہدہ کیا۔ سرگودھا کی ثقافتی، علمی، ادبی اور صحافتی سرگرمیوں کو قومی سطح تک پہنچانے میں دونوں کا کردار قابلِ ستائش ہے۔ محترم بیدار سرمدی نے مجھے فون پر بتایا کہ اظہر جاوید کو سرگودھا سے لاہور تک ادب میں استقامت کی روشن مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں نے انھیں امروز میں ادبی ایڈیٹر کے طور پر اور پھر تخلیق کے پبلشر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی بے قراری اور سرشاری دیکھی۔ وہ صحافت اور ادب کی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان ایک تخلیقی جھرنے کی صورت ایک عرصہ تک رواں رہنے میں کامیاب رہے جو اس دور میں کمیاب ہے۔ وہ تخلیقی ادب سے تہذیبی ادب تک ایک رہنما کردار کے حامل تھے۔ تخلیق اور سوغات اس دعوے کی بہترین مثالیں ہیں۔ میں یہ سب بطور قاری کے طور پر لکھ رہا ہوں کیوں کہ ان کے ایک کڑے امتحان کے لحاظ سے آج تک میرا نام تخلیق میں پروموٹر کے طور پر بھی شائع ہو رہا ہے۔ بیدار سرمدی میرے لیے بڑے محترم ہیں جنھوں نے ادبی دنیا میں مجھے فراخ دلی سے متعارف کروایا۔

راقم السطور (ہارون الرشید تبسم) (2 / اکتوبر 1955ء) ان سے یارانے کا اعزاز حاصل رہا۔ انجمن ترقی اردو سرگودھا کے بانی صدر مولانا محمد شریف المعروف اظفر سرمدی کی عزیز داری سے اظہر جاوید سے ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ مولانا اظفر سرمدی اردو منزل بلاک نمبر 10 میں رہا کرتے تھے۔ ان کی دکان اندرون گول چوک سرگودھا تھی وہ ایک ادبی پرچہ "نظامِ نو" شائع کرتے تھے۔ اظہر جاوید کی کئی تحریریں اس پرچے کی زینت بنیں۔ محمد حسین شوق، جوہر نظامی، حافظ یوسف آزاد، شبلی پانی پتی، ظہیر الدین تبسم اور اظہر جاوید اکثر ان کی دکان پر اکٹھے بیٹھتے اور ادب کے موضوعات پر بات چیت کرتے۔ اظفر سرمدی صحافت اور ادب میں یکساں مقبول تھے۔ اظہر جاوید ان سے مشاورت کرتے۔ ان کی خوبی تھی کہ وہ اپنے حسنِ اخلاق سے ہر شخص کو شیشے میں اتار لیا کرتے تھے۔ اویس احمد شبلی بزمِ حالی کے صدر تھے۔ اس اعتبار سے بھی ان کا ادبی ذوق اظہر جاوید سے ملتا تھا۔

مرزا ماسول انور قیامِ پاکستان سے پہلے اور قیامِ پاکستان کے بعد سرگودھا کے ادبی افق پر بہت نمایاں رہے۔ انھیں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سے ملنے کا شرف ہی حاصل نہیں تھا بلکہ وہ ان کی موجودگی میں اپنا کلام بھی سنایا کرتے تھے۔ 1932ء میں انھوں نے سہ ماہی انتخاب جاری کیا جس میں شاعروں، ادیبوں کی بھرپور حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ انھوں نے عبدالغفور جوہر نظامی کے ساتھ مل کر بزمِ ادب تشکیل دی جس کا ایک تاریخی مشاعرہ 26 دسمبر 1936ء کو منعقد ہوا۔ ماسول انور مرزا کے فرزند نعیم حسن مرزا (پ: یکم جنوری 1942ء) نے ایک ملاقات پر بتایا کہ اظہر جاوید کا ان کے گھر اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ انھوں نے میرے بھائی سلیم مرزا کے ساتھ ایک طویل عرصہ تک تعلق قائم رکھا۔ ہمارے

گھر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اظہر جاوید ہمارے گھر قیام کیا کرتے تھے۔

چوہدری اصغر علی کوثر وڑائچ زمیندار گھرانے سے تعلق، اردو اور پنجابی زبان کے شاعر 1978ء میں روزنامہ امروز میں میگزین انچارج رہے۔ ان کا تعلق 87 جنوبی بھاگٹانوالہ سے رہا۔ اسی نسبت سے ان کی اظہر جاوید سے دوستی ہوئی تھی۔ بھاگٹانوالہ میں ادبی محافل کی کامیابی اظہر جاوید اور چوہدری اصغر علی کوثر کی وجہ سے ممکن ہوا کرتی تھیں۔ قلمی صحافت میں انھوں نے اظہر جاوید سے بہت کچھ سیکھا۔

پروفیسر غلام جیلانی اصغر جھنگ سے گورنمنٹ کالج سرگودھا تعینات ہوئے تو پھر سرگودھا کے ہی ہو رہے۔ وزیر آغا کے سب سے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اظہر جاوید کے ساتھ گہرے مراسم رہے۔ غلام جیلانی اصغر کے کئی انشائیے، نظمیں، غزلیں، تحریریں "تخلیق" کی زینت بنتی رہیں۔ اظہر جاوید کی موجودگی میں بھی غلام جیلانی اصغر شام و دستاں کا حصہ بنتے تو محفل کو کشت زعفران بنا دیتے۔ وہ اپنی عالمانہ اور محققانہ گفتگو کے دوران طنز و مزاح کے ایسے شگوفے چھوڑتے کہ سب لوگ چہروں پر مسکراہٹیں سجائے ان کی طرف دیکھنے لگ جاتے۔ اظہر جاوید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی بہت عزت کرتے اور ان کی نگارشات کو ہمیشہ تخلیق میں بڑا اعلیٰ مقام دیتے رہے۔ غلام جیلانی اصغر عمر میں وزیر آغا سے بڑے تھے اس بات سے جیلانی صاحب خوب فائدہ اٹھاتے ایک روز دوران محفل گویا ہوئے "آغا صاحب آپ جتنی مرضی محنت کر لیں، جتنے مرضی انشائیے لکھ لیں، جتنی مرضی نظمیں لکھ لیں آپ ہمیشہ مجھ سے چھوٹے ہی رہیں گے۔" اس پر ساری محفل ہنسنے لگی۔

اسلامی جنتریوں کے عظیم شاعر احمد حسین المعروف علامہ رشک ترابی کے ساتھ اظہر جاوید کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ اظہر جاوید، سید الطاف مشہدی کے بعد علامہ رشک ترابی سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ اظہر جاوید علامہ رشک ترابی کے گھر بلاک 11 میں بھی جاتے رہے۔ جہاں مرزا قاسم بیگ، بابو فضل، شمیم الدین شمیم، ماسٹر عبدالشکور، اظفر سرحدی بھی پہنچ جاتے۔ یہ محفل رات گئے تک جاری رہتی۔ اس دوران چائے کا دور بھی چلتا اور ساتھ ساتھ تازہ کلام بھی ایک دوسرے کو سنایا جاتا۔ اسلامیہ مسلم ہائی سکول کے بالمقابل دہلی ہوٹل میں بھی اظہر جاوید کی زیر صدارت کئی محافل سخن کا اہتمام بھی ہوتا رہا۔ علامہ رشک ترابی اور پرویز بزمی اونچے سُروں کی بات سمجھ پاتے۔ دونوں اونچا سنتے تھے۔ ایک روز پرویز بزمی نے کوئی بات کی تو علامہ رشک ترابی کو سمجھ نہ آئی تو انھوں نے وزیر آغا سے استفسار کیا کہ بزمی صاحب نے کیا کہا ہے؟ "وزیر آغا نے شرارتاً کہا آپ کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔" اس پر علامہ رشک ترابی کا پارہ چڑھ گیا اور کہنے لگے یہ ہے ہی ایسا۔ جب آغا صاحب نے دیکھا کہ معاملہ حد سے بڑھنے لگا ہے تو پھر علامہ رشک ترابی کو سمجھایا کہ میں نے مذاقاً ایسا کہا تھا ایسی کوئی بات نہیں بزمی صاحب تو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ پھر اظہر جاوید نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ علامہ رشک ترابی کو عارضہ قلب لاحق تھا وہ اکثر مشاعروں میں دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھتے کہاں سے شروع کروں۔ عموماً وہ گھنٹہ، دو گھنٹے اور کبھی کبھی تو تین تین گھنٹے مسلسل پڑھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسے ہی علامہ رشک ترابی نے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک لمبی آہ بھری اور پوچھا کہاں سے شروع کروں تو صوفی فقیر محمد نے شرارتاً کہا "آخر سے شروع کرو تا کہ کلام جلد ختم ہو جائے" اس پر علامہ رشک ترابی بھڑک اٹھے۔ ایسی نوک جھونک گہری محبتوں کی علامت ہوا کرتی تھی۔ فوراً ناراضی ختم کر کے ایک دوسرے کو گلے لگانے کی روش عام تھی۔ دلوں میں بغض نہیں پالتے تھے۔ اظہر جاوید کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور اظہر جاوید بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

نظامِ جمہوریت کے مدیر اور کئی اخبارات کے نمائندہ خصوصی ممتاز شاعر و ادیب، ڈاکٹر حضرت شاکر القادری، اظہر جاوید سے گہری

محبت رکھتے تھے۔ وزیر آغا کی شام و دستاں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ دراصل سرگودھا میں ادیبوں اور شاعروں کا ہیڈکوارٹر 58-A سول لائنز وزیر آغا کی رہائش گاہ تھی جہاں تمام احباب شام کو اکٹھے ہوتے اور گپ شپ لگاتے۔ شاکر کنڈانی اُس وقت اسلامیہ مسلم سکول میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ شاکر کنڈانی مرنجان مرنج شخصیت کے حامل تھے اور اظہر جاوید کے ساتھ ان کی دوستی تھی۔ کالج کے ساتھیان تلے رہی۔ شاکر کنڈانی نے مجلس تعمیر ادب کے زیر اہتمام کئی تاریخی مشاعروں کا اہتمام کیا۔ اس تنظیم کے مرکزی صدر قتیل شفائی تھے جب کہ عزیز علوی نائب صدارت کے حامل تھے۔ شاکر کنڈانی نے جنرل سیکرٹری کا عہدہ اپنے پاس رکھا۔ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ مجلس تعمیر ادب کے زیر اہتمام تقریبات کی نظامت میرے حصے میں آیا کرتی تھی۔ اظہر جاوید مشاعروں میں شریک ہوتے۔ کلام جمہوریت میں اظہر جاوید شکایات قلم منظر پر آتیں اور شاکر کنڈانی کا کلام تخلیق میں ہوتا رہا۔

ڈاکٹر زاہد منیر عامر اقبال کے وہ شاہین ہیں جنھوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ وہ وقتاً فوقتاً سے ازاں بھرتے رہے اور آج عالمی سطح پر اپنی صلاحیتوں کو لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کا "تخلیق" سے گہرا تعلق ہے۔ اظہر جاوید باصلاحیت نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ زاہد منیر عامر اس فہرست میں بہت نمایاں ہیں۔ سو ان اظہر بھی زاہد منیر عامر کی تخلیقات کو تخلیق میں جگہ دیتے ہیں۔

پروفیسر یوسف خالد اور اظہر جاوید کئی محافل میں ایک دوسرے سے ملتے رہے ان کی بہت سی نظمیں "تخلیق" کے دامن میں جگہ پاتی رہیں۔ یوسف خالد چوں کہ حلیم و الطبع اور بردبار شخصیت کے حامل ہیں اس لیے انھوں نے اظہر جاوید سے اپنے تعلقات استوار رکھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی محفل میں یوسف خالد کو بہت اہمیت حاصل رہی۔ تخلیق میں ان کی نظمیں ان کی صلاحیتوں کا اظہار ہے۔

میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ کا تعلق ڈاکٹر وزیر آغا سے ٹیلی فون ملازمت کے دوران ہوا۔ انھوں نے محنت کے بل بوتے پر ٹیلی فون ایکسچینج سے وکالت شروع کر کے عدالت تک رسائی حاصل کی۔ ان کی ملاقات اظہر جاوید سے اس وقت ہوئی جب وہ لاہور سے سرگودھا تشریف لاتے۔ سرگودھا اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری تھے اور تادم مرگ اس عہدے پر قائم رہے۔ انھوں نے ماہنامہ "ترجمان" جاری کیا۔ ان کے کئی خطوط "اوراق" اور "تخلیق" میں چھپتے رہے۔ اظہر جاوید کا کمال ہے کہ انھوں نے میاں ایم ڈی شاد (محمد دین شاد) سے بھرپور نبھاہ کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہونہار اکلوتے فرزند ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے ساتھ اظہر جاوید کے مراسم بڑے آغا صاحب کی وجہ سے زیادہ مضبوط ہوئے۔ جب بھی سلیم آغا لاہور قیام کرتے تو اظہر جاوید سے ملاقات کا شرف ضرور حاصل کرتے۔ ان کی کئی نگارشات "تخلیق" کے ذریعے قارئین تک پہنچتی رہیں۔ شعر و سخن اور افسانوں کی وجہ سے "تخلیق" میں انھیں پذیرائی ملتی رہی۔

ممتاز شاعر و ادیب ممتاز عارف دو سعہ ساز انسان ہیں۔ علامہ رشک ترابی، ظہیر الدین ظہیر، قمر رعشی، پروانہ شاہ پوری، ملک محمد معظم، افضل شیرازی، محمد یعقوب اور چند دوسرے دوستوں کے گروپ لیڈر تھے۔ 70 کی دہائی میں ان کا یہ گروپ اظہر جاوید کی محبت کا اسیر رہا۔ لاہور کے وہ اخبارات جن میں اظہر جاوید کسی نہ کسی طور کام کرتے رہے، ممتاز عارف کی تحریریں ان میں شائع ہوتی رہیں۔ اظہر جاوید جب روزنامہ "امروز" کا ادبی صفحہ مرتب کیا کرتے تھے تو انھوں نے سرگودھا سے تعلق رکھنے والے شاعروں ادیبوں کو بہت اہمیت دی۔ ممتاز عارف ان کی وجہ سے تخلیق کے علاوہ دیگر اخبارات میں چھپتے رہے۔ نوجوان تخلیق کاروں کے ساتھ اظہر جاوید کے قلمی تعلقات تھے خصوصاً ذوالفقار احسن، عابد سیال، عابد خورشید، فیصل اطہری، مصور رضا صفی، عمر فاروق مونس اور دیگر کا کلام اظہر جاوید کی وجہ سے "تخلیق" میں چھپتا رہا۔

اظہر جاوید محفلوں کے سفیر تھے۔ انھوں نے دوستوں میں محبتیں تقسیم کر کے خود کو امر کر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ سرگودھا کے ٹیکنیکل سنٹر میں محترمہ عذرا اصغر کے افسانوی مجموعے "پت جھڑ کا آخری پتا" کی تقریبِ رونمائی منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، نذیر خالد، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، فیاض تحسین، راقم الحروف (تبسم) اور دیگر نے خطاب کیا۔ نمازِ مغرب قریب تھی۔ وقت کی تنگ دامنی کے پیشِ نظر جب اظہر جاوید کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو انھوں نے مختصر ترین خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا "عذرا اصغر میری دوست ہیں۔ دوست میں صرف خوبیاں ہوتی ہیں۔ یہ خوبیاں ان کے افسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔"

اظہر جاوید نے سرگودھا میں آخری بار 20 دسمبر 2002 کو سہ ماہی ''کامران'' کی تقریبِ رونمائی اور کامران مشاعرہ میں شرکت کی۔ کرنل مسعود الحق، ڈاکٹر وزیر آغا، مفتی طفیل گوندل ایڈووکیٹ، ممتاز عارف اور راقم السطور ہارون الرشید تبسم کو اسٹیج پر متمکن ہونے کا موقع ملا۔ شیخ انور گوندل کی دخترِ نیک اختر محترمہ عذرا انور گوندل تقریب کی روحِ رواں تھیں۔ اظہر جاوید نے کامران کی دوبارہ اشاعت پر مبارک باد کے ساتھ ساتھ سرگودھا کی ادبی سرگرمیوں پر اظہارِ خیال کیا۔ یہ تقریب مقبول ہال سول ڈیفنس کمپلیکس میں منعقد ہوئی۔ عذرا انور گوندل نے شاعروں ادیبوں خصوصاً اظہر جاوید کا شکریہ ادا کیا۔ خورشیدِ سخن ڈاکٹر خورشید رضوی اور اظہر جاوید کے تعلقات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اظہر جاوید ان کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ سرگودھا کے قیام کے دوران اور پھر لاہور چلے جانے کے بعد بھی یہ تعلقات قائم رہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کی متعدد تخلیقات نے ماہنامہ ''تخلیق'' میں پذیرائی حاصل کی۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کی گورنمنٹ کالج سرگودھا کی تعیناتی کے دوران اظہر جاوید جب بھی سرگودھا تشریف لاتے تو ان سے اکتسابِ فیض کرتے۔

مجھے شاعرِ شباب سید الطاف مشہدی (10 فروری 1914ء۔ 24 جون 1981ء) سے ملنے کا شرف حاصل رہا۔ سیشن جج اعجاز حسین گیلانی، ممتاز حسین گیلانی اور میجر باقر حسین بخاری کے توسط سے ان کی زندگی میں ملاقات رہی اور ان کے وصال کے بعد ''یومِ الطاف مشہدی'' کے زیرِ اہتمام بہت سی تقریبات میں شرکت کا موقع ملا۔ سب جانتے ہیں کہ سید الطاف مشہدی کا اپنا چھاپہ خانہ تھا۔ ان کی رہائش گاہ دو حصوں میں منقسم تھی۔ مرکزی گھر بلاک نمبر 18 سرگودھا میں تھا جب کہ اضافی گھر بلاک ڈی سیٹلائٹ ٹاؤن میں واقع تھا۔

اظہر جاوید ملنسار، مرنجاں مرنج اور رومانی شخصیت کے حامل تھے۔ سید الطاف مشہدی جریدہ ہفت روزہ ''خلوص'' کے مدیر تھے۔ اس سے قبل سید الطاف مشہدی نے ''ہم لوگ'' بھی جاری کیا لیکن وہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ انھوں نے اظہر جاوید کی صلاحیتوں کا ادراک کرتے ہوئے انھیں ہفت روزہ ''خلوص'' کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ بھلوال کے خان میاں خان کے ہفت روزہ ''ضربِ مجاہد'' اور ''رفیق'' کی ادارت بھی اظہر جاوید کی جھولی میں ڈال دی۔ اظہر جاوید نے شاعری کے ضمن میں بھی سید الطاف مشہدی سے اکتسابِ فیض کیا۔ الطاف مشہدی ہندوستان اور پاکستان کے نامور شاعروں، ادیبوں سے تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ ایک عرصہ اظہر جاوید نے الطاف مشہدی کی خدمت میں گزارا لیکن چند وجوہات کی بنا پر الطاف مشہدی سے علیحدگی اختیار کر کے جوہر نظامی کی شاگردی اختیار کر لی۔

اظہر جاوید نے اپنے حسنِ اخلاق سے علمی و ادبی شخصیات کو اپنے دامنِ محبت میں سمیٹ لیا۔ وہ خلوص بانٹتے تو لوگ انھیں محبتوں کے نذرانے پیش کرتے۔ پرویز بخاری چک نمبر 39 شمالی سرگودھا میں رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی شامِ دوستاں کے بعد اظہر جاوید چک 39 شمالی کا رخ کرتے۔ پرویز بخاری ان کے ہم خیال تھے۔ رات گئے تک چک 39 شمالی میں شعر و سخن کی محفل گرم رہتی۔ طعام و قیام کے علاوہ

ادبی منظرنامے پر بحث رہتی۔ "اردو زبان"، "اوراق" اور "تخلیق" کے حوالے سے بات چیت جاری رہتی۔ پرویز بزمی کا اردو اور پنجابی کلام باقاعدگی کے ساتھ "تخلیق" کی زینت بنتا رہا۔ خاص طور پر ان کے پنجابی کی معتبر اصناف ادب "جگنی"، بولی وغیرہ پر مضمون بھی شائع ہوئے۔ پرویز بزمی کی وفات کے بعد "کلیات پرویز بزمی" شائع ہوئی تو اس میں تخلیق کے ساتھ خطوط کا تذکرہ اس میں شامل کیا گیا ہے۔ دوستی کا یہ سلسلہ حسن اظہر جاوید کے وصال تک جاری رہا۔

نصرت چودھری (4 / اپریل 1929ء ۔ 26 مارچ 2010ء) جو اس جدیدیوں کے شاعر تھے۔ ادبی محافل میں ان کی گونج منفرد تھی۔ وہ بھی اظہر جاوید کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ شعر و سخن میں دونوں کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اظہر جاوید کی وساطت سے ان کا کلام تخلیق کے علاوہ دیگر رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوتا رہا۔ نصرت چودھری نے کتاب "مجموعہ" تکمیل دی تو اظہر جاوید کی مشاورت اس میں شامل تھی۔ نصرت چودھری کے انتقال پر اظہر جاوید افسوس کے لیے سرگودھا تشریف لائے۔ نصرت چودھری کا بہت سا کلام "تخلیق" میں شائع ہوتا رہا۔

غلام حسین قیصر انکم ٹیکس کے وکیل تھے۔ ان کا دفتر کچہری بازار سرگودھا کی ایک بالائی منزل پر تھا۔ مفتی محمد خلیل گوندی ایڈووکیٹ کا چیمبر بھی ان کے بالکل قریب ہی تھا۔ غلام حسین قیصر کے دفتر میں مغرب کے بعد شیخ انور گوندی، شاکر نظامی (یکم اپریل 1945ء ۔ 9 جنوری 2021ء) کامران رشید (پ 4 مئی 1951ء)، انجم رومانی، مجید افضل پراچہ (28 فروری 1928ء ۔ 7 جولائی 2007ء) اور کئی دیگر شاعر شعری تخلیق کا ثبوت دیتے۔ شیخ انور گوندی نے "کامران مشاعروں" کی بنیاد رکھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ دبستان ادب سرگودھا کو متعارف کروانے میں ان کی شخصیت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ماہنامہ "کامران" نے لاتعداد شاعروں و ادیبوں کو متعارف کروایا۔ اظہر جاوید نہ صرف کامران میں چھپتے رہے بلکہ کامران مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ کامران رشید یونگ آف یک رائٹرز کے صدر تھے۔ انھوں نے اظہر جاوید کو کئی تقریبات میں شرکت کی دعوت دی۔ رشحات کامران رشید "تخلیق" کا حصہ رہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کا تعلق بھی بنیادی طور پر سرگودھا سے ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اور اظہر جاوید کا تعلق بہت گہرا اور قدیم ہے۔ دونوں قلم کے رسیا تھے۔ اظہر جاوید کے ادبی رسالے "تخلیق" میں ڈاکٹر انور سدید کی نگارشات باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ "تخلیق" میں ان کے خطوط کا بہت چرچا رہا۔ وہ بہت طویل اور علامتی انداز کے خطوط لکھتے جنھیں بہت پسندیدگی سے پڑھا جاتا۔ اظہر جاوید لاہور میں رہنے کے باوجود لاہوری تو تھے ان کے اندر ہمیشہ ایک سرگودھوی موجود رہا۔ وہ سرگودھا کے ادیبوں شاعروں سے مل کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ ماہنامہ "تخلیق" کا دفتر گویا ایک ادبی ڈیرہ بن گیا تھا۔ تخلیق کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کے سالانہ جائزے ایک عرصہ تک جاری رہے۔ تخلیق کی بزم دوستاں میں انور سدید کے خطوط بھی قابل تذکرہ ہیں۔ جب اظہر جاوید سرگودھا کو خیر باد کہہ کر لاہور منتقل ہو گئے تو ان کا دفتر سرگودھوی اہل قلم کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا۔ وہ ان کا نہ صرف گرم جوشی سے استقبال کرتے بلکہ ان کی طبیعت کے مطابق خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھتے۔ دوستوں کو تخلیق کے علاوہ کتابوں کے تحائف بھی پیش کرتے۔ عزیزم ذوالفقار احسن نے ایک ملاقات پر بتایا کہ وہ بھی اظہر جاوید کے دسترخوان سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔ سب خوبیوں کے حامل تھے کہ سب ہی ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید سے ان کی محبت اٹل تھی۔ جب 20 مارچ 2016ء کو انور سدید اللہ کو پیارے ہو گئے تو یہ رشتہ قائم رکھنے کے لیے فرزند اظہر جاوید، سونان اظہر، سرفراز سید اور ملک مقبول احمد کے ہمراہ سرگودھا میں ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ سونان اظہر کا کمال ہے کہ وہ اب بھی اپنے والد کے دوستوں سے رشتہ محبت استوار کیے ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اظہر جاوید کو زندگی کی چکی پر بہت محنت کرنا پڑی۔ زمانہ طالب علمی میں مجھے

جناب شاکر کنڈانی (ہفت روزہ نظامِ جمہوریت)، میر عبدالرشید اشک (روزنامہ شعلہ)، ملک عمر دراز خان اعوان (پیامِ قائد)، تاج الدین حقیقت (پاسبانِ جدید) اور فرید الدین عاقف سے رابطے کا موقع ملا۔ سلطان احمد علوی چک 77 بھاگٹانوالہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہ اظہر جاوید بھی ان کے قریب و جوار میں رہا کرتے تھے۔ بھاگٹانوالہ کی ادبی شاموں میں سلطان احمد علوی اپنے مخصوص انداز میں اظہر جاوید کی شامِ دوستاں کا حصہ بن جاتے۔ تخلیق میں سلطان احمد علوی کا اردو اور پنجابی کلام شائع ہوتا رہا، جب کہ پنجابی کہانیاں بھی شاملِ اشاعت ہوتیں۔ قد آور، بارعب اور دبنگ شخصیت کے حامل ملک عمر دراز کوٹ فرید سرگودھا میں رہائش پذیر تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پریس [illegible] کا گھر بھی ان کے قریب ہی تھا۔ حسنِ اتفاق میری پیدائش مکان نمبر 5 گلی نمبر 2 کوٹ فرید سرگودھا میں ہوئی۔ ملک عمر دراز خان "پیامِ قائد" کے چیف ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار نگار پریس سے شائع ہوا کرتا تھا۔ ان کا دفتر مختلف جگہوں پر منتقل ہوتا رہا۔ ابتدائی ایام میں کچہری بازار کے دین ہوٹل کو ان کے مرکزی دفتر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ ڈاکٹر کنول فیروز "پیامِ قائد" اور ہفت روزہ "شوریٰ" کے ایڈیٹر رہے۔ ملک عمر دراز اور ڈاکٹر کنول فیروز میں گہری دوستی تھی اور کنول فیروز کا اظہر جاوید سے گہرا تعلق تھا۔

دفتر ماہنامہ "تخلیق" بعنوان حریت لاہور ہمیشہ شعرا و ادبا کا مرکز بنا رہتا۔ لاہور کے علاوہ دیگر شہروں سے آنے والے ادیب اور شاعر اظہر جاوید کی زیارت کے لیے ضرور تشریف لاتے۔ ذوالفقار احسن (4 اکتوبر 1960ء) ادیب، شاعر، نقاد، محقق اور مدیر سہ ماہی "اسالیب" جب بھی لاہور جاتے اظہر جاوید سے ملے بغیر واپس نہ آتے۔ اظہر جاوید بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے۔ ذوالفقار احسن کی غزلیں ان دنوں "اوراق"، "ماہِ نو"، "ادبیات" میں شائع ہو رہی تھیں۔ ماہنامہ "تخلیق" نے بھی ذوالفقار احسن کی بہت سی غزلیں اور ماہیے شائع کیے۔ 1998ء کے "تخلیق" کے سالانہ جائزے میں ڈاکٹر انور سدید نے ذوالفقار احسن کا بطورِ خاص ذکر کیا۔ ان کی غزل اور ماہیوں کو خوب سراہا۔ ایک مرتبہ حکیم حسن مرزا اور ذوالفقار احسن، اظہر جاوید کے گھر بھی تشریف لے گئے۔ مرزا ماموں انور کے فرزند حکیم حسن مرزا بہت اچھے شاعر اور مزاح نگار تھے۔ ان کی غزلیں سب سے زیادہ "تخلیق" میں شائع ہوئیں۔ جب ان کی طنز و مزاح پر پہلی کتاب "کمرے کے روبرو" شائع ہوئی تو کتاب کا فلیپ اظہر جاوید نے تحریر کیا۔ یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ گروپ بندی کے باوجود احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا سے تعلق رکھنے والے تخلیق کاروں میں اظہر جاوید بہت مقبول تھے۔ دونوں ادبی ٹیموں کے کھلاڑی اظہر جاوید کو غیر جانبدار امپائر کا درجہ دیا کرتے تھے۔

اظہر جاوید کی تحریریں مقبول جرائد و رسائل کی زینت بنتیں اور تخلیق کی اشاعت کے بعد اپنے ہم عصر تخلیق کاروں کا کلام تخلیق میں قارئین کی توجہ کا باعث بنتا رہا۔ عصمت ملیک اور پرویز بزمی سے اظہر جاوید کی یاد اللہ بہت گہری تھی۔ بگی ہوم آرائی 39 چک میں ہوتی، بگی بلاک 11 میں اور بگی بلاک 18 کا چوک ان کی ملاقاتوں کا مرکز ہوتا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب بھاگٹانوالہ کے مین بازار میں ایک ہوٹل پر نشست ہوتی جس میں اظہر جاوید میزبان ہوتے۔ سردیوں کی شاموں میں اور گرمیوں کی راتوں میں یہ نشستیں طوالت کا شکار رہتیں۔

اظہر جاوید انتھک اور مہمانی سرشت کے حامل تھے۔ انھیں جہاں اپنے قلمی جوہر دکھانے کا موقع ملتا تو وہ وہیں سرِ عمل ہو جاتے۔ انھوں نے ادبی جریدہ "عکسِ نو" کی ادارت میں اہلِ علم و دانش کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ کئی قلمی اخبارات سے وابستہ رہے۔ روزنامہ "امروز" میں ان کی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع رہا۔ ان کے نتائجِ قلم کے کارنامے روزنامہ "جمہور"، روزنامہ "امروز"، روزنامہ "حریت"، روزنامہ "دن"، ہفت روزہ "اخبارِ جہاں" میں چھپتے رہے ہیں۔ سید جاوید علوی (15 ستمبر 1932ء۔ 16 مئی 1985ء) انور [illegible] صحافی اور صحافت

سلطان، میر عبدالرشید اشک، جوہر نظامی، محمد حسین شوق اور سیف زلفی جیسے بزرگ شاعر تھے جنھیں اظہر جاوید کی محفل میں بیٹھنے اور اکتساب فیض کرنے کا موقع ملا۔ اظہر جاوید نے بزرگوں کا احترام کیا اور کامیابی کی منازل طے کیں۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال سرگودھا کی ادبی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ بصارت سے محروم لیکن بصیرت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ محفل سازی اور تقریبات کا اہتمام کرنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ وہ شمعِ محفل جب کہ ان کے چاہنے والے اس محفل کے پروانے ہوتے ہیں۔ انھیں اظہر جاوید کی قربت حاصل رہی۔ اظہر جاوید نے بھی ان کی صلاحیتیں دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیا۔ راغب شکیب کا نام ڈاکٹر وزیر آغا کے خاص خدمت گاروں میں ہوتا ہے۔ کراچی جانے سے پہلے وہ بزمِ وزیر آغا کے روحِ رواں ہوتے۔ اوراق کی ترتیب و تدوین میں بھی راغب شکیب کا نام کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ چوں کہ اظہر جاوید بھی ڈاکٹر وزیر آغا کی محفل کا حصہ تھے۔ اس لیے راغب شکیب کی اظہر جاوید سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پروفیسر سجاد نقوی، پرویز بزمی، راغب شکیب ڈاکٹر وزیر آغا کی رشحاتِ قلم کی حروف خوانی میں معاونت کرتے۔ تخلیق کو جو مواد ارسال کیا جاتا تھا وہ ان تینوں حضرات کے علم میں ہوتا۔

اظہر جاوید سرگودھا کی محافل کا جزو لاینفک ہے۔ خالد اقبال یاسر سے ان کا کئی حوالوں سے تعلق رہا۔ 2023 تخلیق ایوارڈ کی تقریب میں خالد اقبال یاسر نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کر کے اپنے اور اظہر جاوید کے تعلق پر روشنی ڈالی۔ خالد اقبال یاسر فرماتے ہیں۔ 1970ء میں جھال مسلم ہائی سکول میں منعقدہ انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام محفل مشاعرہ میں خالد اقبال یاسر اور جاوید انور سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ان کی تخلیقات تخلیق کے علاوہ بھی مختلف ادبی رسائل و جرائد میں نظر آتی ہیں۔ اظہر جاوید ادبی و صحافتی حلقوں میں اپنی انفرادیت رکھتے تھے۔ انسان دوستی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ وہ وسیع الظرف طبیعت کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت پر عزم اور دوسروں کا دکھ بانٹنے کے لیے ان کا دل بہت بڑا تھا۔ دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہونا ان کا اہم ترین وصف رہا۔ بہ حیثیت صحافی انھوں نے ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی۔ علمی تحریروں اور علمی ایڈیٹنگ کی ترتیب و تدوین میں انھیں کمال حاصل رہا۔ احباب اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ادبی جریدہ شائع کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔

اظہر جاوید نے لاتعداد شاعروں، ادیبوں کو متعارف کروایا۔ وہ بھری انجمن کو محبت بھرے دن "14 فروری 2012ء" کو اداس کر گئے لیکن تخلیق کو اپنے حسنِ تخلیق سونان اظہر جاوید کے سپرد کر گئے۔ سونان اظہر نے "تخلیق" کو نہ صرف سنبھالا دیا بلکہ اس معیار کو بہتر بنانے میں اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دیں۔ اظہر جاوید کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا تھا وہ آج سونان اظہر پُر کرنے کے لیے ہمہ وقت مصروفِ عمل ہیں۔ سونان اظہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے والد گرامی کے دوستوں کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ ان کی تخلیقات کو تخلیق میں جگہ دیتے ہیں۔ اظہر جاوید کی سب سے بڑی خوبی دوستوں کا احترام اور حسنِ اخلاق رہی۔ اظہر جاوید کی محبتیں سب کے لیے رہیں۔ انھوں نے ادبی گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر ادب کی خدمت کی۔ ماہنامہ "تخلیق" کو خالصتاً ادبی جریدہ بنانے میں ان کا ذاتی کردار ہے۔ یادیں دل میں مقید رہتی ہیں۔ انسان اپنا وقت پورا کر کے عالمِ بالا چلا جاتا ہے اور یہ یادیں بھی دم توڑ دیتی ہیں۔ اظہر جاوید اور سرگودھا سے وابستہ ان کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لیے یہ چند سطور تحریر کر دی ہیں جو کہ محققین کے لیے جادۂ تحقیق ثابت ہوں گی۔

◆◆◆

منظومات

گلزار بخاری

بہت مصروف ہو شاید

کبھی سوچا بھی تم نے
گلوں کے لیے
کیوں آنکھیں بے تاب رہتی ہیں
پرندوں کو ہوا کا حق جتاتوں کیوں
چمکتے چاند تک پہنچیں نہ پہنچیں
سلسلے کتنا ہمیں ان کی آزادیوں کا
ہواؤں کی یکجائی میں
کسی چہرے کے آنسو ڈھلتے ہیں
مہکتے پھول خوشبو کی زبانی
کوئی تو پیغام کی ترسیل ہو
معمور ہیں فطرت کی جانب سے
زمیں محور پہ گردش کر رہی ہے
کیا سبب اس کا نہیں کوئی
فلک پہ نظر آتے جہاں سے
بلندی کے ہیں ستارے کس طرح سے
رہا کرتی ہے کیسی گفتگو
موجوں سے ہوا کی
پرندے چاہتے ہیں سارا
تلاش رزق میں بھٹکیں
کشش کوئی تو ہے اس کی
انہیں توڑا ہوا پاکے گھونسلوں کی سمت لوٹتی ہے
تمہارے پاس کم ہے وقت
دینے سوچوں پہ غور کرنے کا
بہت مصروف ہو شاید

OOO

افتخار بخاری

میں تمہیں دیکھتا ہوں

میں تمہیں دیکھتا ہوں
کسی بھولی بسری چھت پر
چڑیوں کے لیے دانے بکھیرتے ہوئے
کسی اجنبی ہجوم میں
سر انجھکی کی چادر اوڑھے
بے تحاشہ چلتے ہوئے
کسی جھیل کنارے پر
چنگاریاں اڑاتے ہوئے
کسی گمنام باغ میں
اداس پھولوں میں مہکتے ہوئے
اور مجھے گھورتی ہے
کسی بے خبری کی حیرت
تمہاری بے امید آنکھوں کے خوبصورت خالی
پن میں
کسی بھولی بسری چھت پر
کسی اجنبی ہجوم میں
کسی جھیل کنارے پر
کسی گمنام باغ میں
ذرا سوچنے سے پہلے اس دنیا میں

OOO

صفدر صدیق رضی

نظم

وہ نظم جو مجھ سے کھو گئی ہے
نہ جانے کس ہاتھ لگ گئی ہو
وہ جس میں تیرا حسین سراپا
اسی طرح میں نے لکھ دیا ہے
کہ جیسا تو ہے
وہ ایک مصرعے میں ہو بہو ہے
تری نظر تیری مسکراہٹ
تری صدا تیرے خرام، تیری خموش آہٹ
مرے شب و روز
جس پہ آ کے حسن کی نذر ہو گئے ہیں
کئی مہ و سال کھو گئے ہیں
جو تجھ پہ گزری گزر گئی ہے
نہ جانے
کیا اس پہ روز و شب گزر رہی ہو
وہ نظم جس ہاتھ لگ گئی ہو

OOO

شاہین عباس

یوم آزادی پر

یوم آزادی پر
ہم آزاد ہیں
قافلوں کی طرح
قافلے جن میں شامل ابھی ہے خلق خدا ابھی
زمیں امید سے پہ چلتے ہوئے تھے
آسماں امید کی سمتوں میں اچھلتے ہوئے تھے

سب سے آباد ہیں، سب سے آزاد ہیں
یہ زمانہ اس آزادی کا دوسرا نام ہے
ہم نے یہ آزادی کیا ہے؟
روایت ہے، کثرت ہے، ہم ہیں
قدامت ہے، وحدت ہے، تم ہو
حمایت ہے اور یادوں کی امانت ہے آزادی
آزادی ہم تم ہیں
ہم تم زم زم ہیں
سنتے ہو، ہم تم آنکھوں کا نور؟ سازوں کا پرتو
رمز ہو اسرار گل و شب و آواز ہیں
سر سے سرشار جہاں کی پرواز ہیں
قرطاس قلم ہیں
ہم ہی ہم ہیں
ہو قلم ہیں قلم ہیں
ورق ہیں، عبارت ہیں، اطراف کے حاشیے،
حاشیوں سے پرے کوئی مشکل ہیں، کوئی حاشیے ہیں
ہم کے چار جانب تنی چادر خاک ہیں
عار و عصر ہیں ازل آزاد کے گھاٹ
رزم آہنگ ہو، قلم فرہنگ ہو
ہم ہیں، تم ہو، بس یہ ہم کون ہیں کہاں
عرق کو زرنگ کے ساتھ پھیلائے ہوئے
ہاتھ ہاتھوں میں ڈالے ہوئے
اپنی باتوں میں باتیں ملاتے ہوئے
آتے جاتے ہوئے
ہر عالم کا دوراں ہیں
یہ ہم اور وہ تم
آج کے دن
ہمیں اور تمہیں جو بھی جاتے گزارے
یہ ہمارے وطن ہیں ہمارے گھرانے

OOO

شہباز انور خان

ہمارے اشفاق احمد خان

لوگ تو کتنے ہی آئے یہاں اہل قلم، لیکن
نہیں اشفاق احمد خان جیسا کوئی دانش ور
کے حیثیت حاصل ہوئی انہیں تھی، ان کی
گرہ کھلا جس کا جذبہ ہی رہا جو رہ علم و فکر
سے ان کو جس لیے ہیں وہ باتیں کرتے تھے
اثر ہوتا تھا جس کا ہاتھوں ہر فرد کے دل پہ
عوامی دل پسند انداز تھا ان کے ڈراموں کا
ڈرامے کا ہر اک کردار تھا اخلاق کا مظہر
دور حاضر ہو یا معیشت ہو سیاست ہو
کسی نے آج تک لکھا نہ اس پر آپ سے بڑھ کر
صدا کاری کے بھی جوہر دکھائے آپ نے ایسے
کہ عشق میں کراتے چھوٹے بڑے کی عبارت پہ
یا انداز تھا آپ نے جو بھی کہا کو
پھیلایا دیا جیسی زباں کا خوش ہو کر
انہیں آسانیاں تقسیم کرنے کی رہی خواہش
محبت و پیار کا پیغام ہی دیتے رہے اکثر
مرے دل کی تمنا ہے دعا بھی ہے مری اکثر
سدا رحمت کی بارش ہو مرے بابا کی مرقد پر

OOO

انور عدیم علوی

سوچ کے سائے

لمبے لمبے سوچ کے سائے
مجھ کو ہر دم فکر یہ کھائے
میں جو ابھی تصویر بناؤں
سوچ کے گہرے سایوں کی
سوچ کی کڑیاں شامل کر کے
میں جو ابھی زنجیر بناؤں
دھرتی اور آکاش کی وسعت
ساری الفت ساری کلفت
میری خواہش تیری چاہت
ان میں تو گر گم ہو چکے
نفرت اور حقارت والے
اونچے ناک شرافت والے
سوچ کے سائے سے گھبرائیں
ظلم کے بھاری جرم لٹوائے
اک ''باغی'' کا ہو ہنگامہ
کس کی سوچ پہ فکر کا غوغا
کس کی سوچ مکمل تبدیلی

OOO

شائستہ مفتی

شہرِ گم گشتہ......

اے مرے شہر کہ دیکھا نہیں میں نے تجھ کو
پھر بھی تو میرے خیالوں میں کہیں بستا ہے
جب کبھی بند میں آنکھوں کو ذرا کرتی ہوں
تو تصور کے جہانوں میں کہیں بستا ہے
میں نے مانا کہ ابھی رات بہت گہری ہے
اور اس ظلمت بیداد کا کچھ انت نہیں
پھر بھی اک دیپ زمانے سے چھپا کر میں نے
اس کے طاق میں رکھ چھوڑا ہے گمنام کہیں
ایک امید کی سترنگ حسیں تھی لے
میرے ادھورے سے ہی رہا تو کیا ہے پھر سے
اور اک گیت جو سنتے میں بھلا لگتا ہے
تیری بادل فضاؤں میں لوٹ آئے پھر سے
اے مرے شہر کہ تو پیار کا ساگر تھا کبھی
تیرے ہر قریہ و بازار میں جلتے تھے چراغ
گھر در گھر ترے کوچہ و بازار تھے وا
تجھ سے پایا تھا بھٹکتے ہوئے لوگوں نے سراغ
اے مرے شہر کہ دیکھا نہیں میں نے تجھ کو
بالیقیں ایک شہر تھی ہے خوابوں میں کہیں
دور ہوتے ہوئے اک لمس کی خوشبو کی طرح
تیری آواز ابھرتی ہے قرابوں میں کہیں

OOO

ڈاکٹر فوقیہ مشتاق (امریکہ)

اے پیاری شاعرہ

میں نے بھی تمہاری طرح
بہت دکھ اٹھائے
بہت راتیں جاگ کر بتائیں اور بہت بکھری
میرا دل بھی زخمی اور روح گھائل ہوئی
عمر بھر میرے ساتھ بھی خوف اور بے دلی آپ ہی آ تمام
سوالیوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی
مگر مجھ میں اور تم میں یہ فرق ہے
کہ تم نے ایک ہی آسرا لگا کے
اپنے اندر لگی آگ سے ہر طرف روشنی کر دی
مگر میں ابھی بے ذات کو رہائی اور ابھی تک
زنجیروں، راستوں اور الجھنوں کی
پھر بھی پکڑ کر اپنی آگ میں جل رہی ہوں
اور شاید ہمیشہ یونہی جلتی رہوں گی

OOO

دلشاد احمد

منافقت

اس نے میرے سامنے
ہاتھ اپنے پھیلائے
اور پکے رنگوں سے
دستخط کر دیا میرا
ساتھ ہی ہواؤں اور
بارشوں کے گناہوں میں
بازاروں کے میں
ساری بات کہہ ڈالی

OOO

ندیم فراز

محبت

محبت تو کرتا ہے یہ رشتوں کا قیدی
لکیروں کی قیدی یہ کاغذ کی کشتی
یہ پھولوں کی دنیا یہ تتلیوں کی جنت
جہاں خاک کی ہے سدا سے خدائی
محبت تو میرے گناہوں میں لکھے
گناہوں سے میرے تو آنکھ پھیرے
یہ سچی خدا کی عبادتوں کا مسکن
جہاں پاک رہتا ہے ان کا ہی دامن
فقیروں کی دنیا ہے آزاد بستی
جہاں ان کا دستور بیچا نہیں ہے
جہاں ان کا قانون نافذ نہیں ہے
محبت تو رشتے کی حاجت نہیں ہے
فرشتہ نہ کوئی محبت کا کاتب
کسی دل کے باہر نہ کھلتی گئی ہے

OOO

افسانے

دروازہ

محمود احمد قاضی

مختصر تعارف

تاریخ پیدائش یکم ستمبر 1945ء، مقام گوجرانوالہ۔ افسانوں کی پانچ کتابیں، دو ناولٹ آ چکے ہیں۔ اکادمی ادبیات کی طرف سے ایک افسانے کی کتاب اور ایک لاطینی امریکی افسانوں کے ترجمے کی کتاب پر ایوارڈ مل چکا ہے۔ 1967ء سے فکشن لکھنا شروع کیا۔ گوجرانوالہ شہر پر ایک مشہور زمانہ کتاب "یہ ہے گوجرانوالہ" آپ کی تصنیف ہے۔

اپنے گھر کے دروازے سے باہر نکلتا ہوں تو ایک ہجوم، ایک دنیا کو اپنے سامنے پاتا ہوں۔ گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے سامنے ہی پہاڑیے سے سامنا ہوتا ہے جس سے جو چیز بھی خریدیں وہ آپ کو اس چیز کے لئے شاپر نہیں دے گا۔ آپ ان سے ناراض ہو جائیں، وہ ٹس سے مس نہیں ہوگا۔ آپ آئندہ اس سے کوئی چیز نہ لیں تو بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عام دکانوں سے اس کا ریٹ بھی زیادہ ہے۔ اس موجودہ شدید مہنگائی کے دور میں وہ سب سے زیادہ مہنگا شخص ہے۔ ساتھ ہی خشمگیں ہے۔ وہ ویسا ہی موجود ہے۔ ریٹ اس کے بھی بلند ہی ہیں لیکن جب وہ ہنسی نکال کر آپ کا سواگت کرتا ہے تو آپ ریٹ کی الجھن کو لمحہ بھر کے لئے بھول ہی جاتے ہیں۔ بائیں طرف اونچائی پر ٹی چوڑے بازار میں کھوکھا بیٹھا ہے۔ اب اس نے بھی فرمنگ کا ریٹ بڑھا دیا ہے۔ ایک مدت سے میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ اس لئے وہ مجھے وارا کھاتا ہے۔ دین مارکیٹ والا مچھلیں اتارنے کا ماہر ہے جو کچھ عرصہ پہلے سلطان مارکیٹ والوں کے پاس ملازم تھا۔ اب اس کے وارے نیارے ہیں۔ سنا ہے وہیں سے بنا ہے یعنی اس نے اپنے آپ کو بنایا ہے۔ سلطان مارکیٹ ایک بڑا اسٹور ہے۔ اس کے پاس میرے بیوی بچوں کا خرچ رہتا ہے دوسرے نہیں رکھتے۔ وجہ معلوم نہیں۔ ہاں اب دوسرے بازار کے نکڑ والا پچھا پہلوان (پہلوان تو نہیں، ویسے ہی اس کی الٹی بڑی ہوئی ہے۔ شاید کبھی اکھاڑے کی مٹی اپنے بدن پر اس نے ملی ہو)۔ اس کے پاس سے بھی یہ ادھار ملنے لگا ہے۔ آگے سیالکوٹ سویٹ والے ہیں۔ بیکری آئٹم اور مٹھائی ان کے پاس سے ملتی ہے۔ کوئی مہمان آ جائے جلدی میں آپ کو ان کے تکے بکھوتے ملے تو یہاں سے چکن کباب ضرور دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کا ایک فروٹ کیک بھی کھانے کی چیز ہے۔ سامنے کی فی رو ڈائمن ہی ہے۔ معروف ترین شاہراہ اس کے آس پاس دو سروس روڈز بھی اب بنا دی گئی ہیں۔ آنے جانے کے سلسلے میں کوئی قاعدہ نہیں۔ کسی بھی قسم کی ٹریفک سینس کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر ہر کوئی آ جا رہا ہے۔ ٹریکٹر ٹرالی، رکشا (چنگ چی) اور یہ حال موٹر سائیکل، کار، منی ٹرک تک آپ کو ٹکر مارتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ پیدل آدمی کے لئے اب کوئی جگہ نہیں رہی۔ وہ کہاں جائے۔ کیا وہ ٹریفک کے پاؤں تلے روندا جائے، کچلا جائے، مر جائے یا زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جائے۔ ہاں سہولت جو موجود ہے ایک بڑا اسپتال تو اب بن ہی چکا ہے۔ زخمی ہوں تو وہاں جائیں۔ اپنے زخموں اور فیس کا مزہ چکھیں۔ شیطان کی آنت کی طرح لمبا دن رات گھومتے ہوئے، ہاتھ لہراتے ہوئے، روتے ہوئے چیختے ہوئے آپ کے سامنے آتا

ہے۔ آپ کو بھی ڈسے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ تھک جائیں تو بیٹھنے کو ستانے کو کوئی بنچ نہیں، سایہ نہیں۔ درخت کٹ چکے جو تھوڑے بہت ہیں سایے کے بغیر ہیں۔ ان کا سایہ کیا ہوا، کیا وہ بھی جل گیا۔ وقت، بغیر رکے چلتا وقت ویسے بھی ایک کڑی دھوپ ہی ہے۔ ٹانگے، چوراہے، بازار (بغل میں سستے کے دام پر مہنگا بازار) گلیاں، بچے، بوڑھے، جوان مرد، عورتیں (اب موٹر سائیکل بھی چلانے لگی ہیں) جینز شرٹ، شلوار قمیض، دوپٹے ہیں تو پنجابی گھر تہبند کے بغیر۔ چوکوں میں ملبوس۔ موبائل فون ہر ایک کے ہاتھ میں یا کان پہ۔ ان چند عورتوں تک کو ساتھ آپریٹ کرنا آتا ہے۔ زندگی کے دوسرے کاموں میں چاہے وہ کتنی کچی ہی کیوں نہ ہو۔ موٹر سائیکل سوار، کار ڈرائیو کرتا رکشہ چلاتا بندہ سب کے کانوں کے ساتھ یہ الہ ابلاغ مشین لگی ہے۔ ڈیسک ٹاپ، لیپ ٹاپ، پام ٹاپ، سب موجود، بندہ معدوم، بندہ، بندے کا پتہ کہاں ہے۔ یہاں اب سب بکتے ہیں۔ کاٹھ کے الو، بھولے، مکار، دغاباز، ٹھگے، چاپلوس، لال بجھکڑ، فنکاری۔ ان کے ساتھ سڑکوں پر منڈلاتے، آوارہ، باؤلے کتے، کتے کے کاٹنے کے علاج میں، سے بچاؤ کے ٹیکے، سے نجات کی دوا ہسپتالوں میں موجود نہیں۔ لوگ مرتے ہیں مرتے رہیں پرواہ کسے ہے۔ دن اپنے ٹھاٹ سمیت موجود رہتا ہے۔

اب رات ڈھلنے لگی اتر رہی ہے، اترنے دو۔ آسمان پر چاند موجود نہیں اور دور تک کالک سی ہے۔ نیچے چوراہوں پر بتیاں گل، لوگ اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے چلے جاتے ہیں۔ ٹریں، ٹریں، ٹریں۔ کوئی کسی کو راستہ نہیں دیتا۔ سب کو آپا دھاپی پڑی ہے۔ ایمبولینس والا ہوا دیے جاتا ہے کوئی نہیں سنتا۔ اور کسی کی زندگی کا چراغ گل ہونے کو ہے تو کیا ایک مرا تو دوسرا جنم بھی تو لے رہا ہے۔ پولیو سے بچاؤ کے قطروں کے بارے میں ابھی تک گوٹھوں اور علاقوں میں ابہام موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر کوئی یہ قطرے پی لے تو پھر وہ بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتا (آبادی اس کے باوجود بڑھتی چلی جا رہی ہے فراٹے بھرتے ہوئے) تعویز، دھاگے، گنڈا، دم، پھونک، چلہ کشی، مزار، پیر۔ ابھی پچھلے دنوں ایک صوبے میں ایک شخص کے مزار کو جانے کے لیے ارد گرد کے سینکڑوں گاؤں کو دودھ بیچ دیا گیا۔ مزار والا آرام سے سویا رہا۔ لس لس کرتی رات، کل بج کرتی رات۔ ایک کف Venum کا اس کی چکنی Fany کی رات، رات آگے بھی جاتی ہے۔ رات، رات، لمبی رات، پاؤں سے لگتی رات، نئی گرم رات، ٹھنڈی ٹھار رات۔ کسی عورت کے زلفوں جیسی، گھنی، تاریک، مشکوک، فسادی، حقیقی، زمرد، بیگی کے تجلی موتی جیسی (سکھ (کاروبار) بیٹا ہے۔ آنکھ ہوا کو زمانہ چال قیامت کی چل گیا کوئی سمجھ سکتا نہیں) شب اٹھلاتے جاتی ہے، اٹھلاتے جاتی ہے، تھکتی جاتی ہے، مرتی جاتی ہے، زندہ ہوتی جاتی ہے۔ میٹھی، ترش، کڑوی، کسیلی، روشن، روکھی، ہوتی جلدی سمن جانے والی، کسی منتظر بھی کے ساتھ لگی محبوبہ بن جانے والی، دشمن بن جانے والی، رات گیلی، خشک، باسی، تیز طرار، روٹھی، کھڑی، سیدھی، ڈگی، مرغابی، جل تھل، چنتر بیر، کونج جیسی رات، رات کے کالے پروں میں چھپی رات، پہلو میں بچی عورت ایسی گہری سانسیں لیتی رات، دور دراز تک رات، زندگی کا تحفہ اس بنی رات، مشکل رات، آسان رات، روٹی بنی رات، بھوک پیاس، اور جوان بنی رات، آگ کا دریا بنی رات، اس کے لبوں سی لالی بنی رات، صبح کی شراب بنی رات، قبر میں لیٹی مردہ رات، رات رات، راتوں کی رات۔ حتیٰ وہ وہ عورت کا چہرہ اس کا جوبن بنی رات۔ بیتے تھے جانے والی مالی زلیخا رات، قسم ہو سوگی ہری کا رجائی رات، زندگی کے کٹر پہ گئی رات، دن کو رات کرتی اور رات کو رات کرتی رات۔ رات ایک پارسائی کی رات، ایک گھڑی، گھڑی۔۔۔۔ کو بھی مردہ رات۔ چابی والا کھلونا بنی رات، میرے گھر کے دروازے کے باہر یہ سب دیکھو ہے۔ آؤ تمہیں اس سارے دیکھے سے ملاؤں۔ جو ہو رہا ہے اس کی تکرار سے ملاؤں تم کو گے!

◆◆◆

کیا حرام، کیا حلال

حنیف باوا

مختصر تعارف

حنیف باوا 1936ء کو اپنے ننھیال پاکل نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ یہ 1959-60ء سے مسلسل پنجابی اور اردو میں ادب تخلیق کرتے آ رہے ہیں ان کی اب تک 12 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ معروف ادیب، صحافی اور شاعر اظہر جاوید کی پنجابی کہانیوں کے اردو تراجم کیے جو پچھلے آٹھ سال سے مسلسل تخلیق میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اب کتابی شکل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ اسی سال سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ''11 واں تخلیق ایوارڈ 2022ء'' بھی ادارہ تخلیق نے انھیں پیش کیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں گورنمنٹ ڈگری کالج جھنگ میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ یہ کالج میرے گھر سے کوئی میں ڈیڑھ میل کے فاصلے پر دو جڑواں شہروں جھنگ اور مگھیانہ کے وسط میں واقع تھا۔ جو سڑک کالج کے مین گیٹ کے پاس سے گزر رہی تھی وہ ادھڑی اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔ یہ سڑک ان دونوں شہروں کو آپس میں ملاتی تھی میں اپنے والدین کے ہمراہ جھنگ شہر میں رہائش پذیر تھا۔ ہم چند ایک دوست اکٹھے ہی کالج آیا جایا کرتے تھے۔ ہم سائیکلوں پر سوار ہوا کرتے تھے۔ جب ہم جھنگ کے تانگوں والے اڈے پر پہنچتے تو وہیں سے اس خستہ حال سڑک سے واسطہ شروع ہو جاتا اور اسی کھائے ہوئے سڑک کا لڑ پکڑ کر ہم کالج آ جاتے۔ جب ہماری سائیکلیں اس ادھڑی ہوئی سڑک کی ناہموار ریت پر اچھل کود کرتیں تو ہم ان پر غصہ اتارنے کی بجائے ان سے لطف اندوز ہو کر ایک دوسرے پر فقرے کسنے کی بجائے آپس میں چھیڑ خانی کرتے ہوئے کالج پہنچ جاتے۔ کالج سے واپسی پر بھی یہی عمل دہرایا جاتا۔ ایسا کرنے سے ایک تو ہماری طبیعت ہشاش بشاش رہتی دوسرے یہ میل ڈیڑھ میل کی مسافت گزرتے دیر نہ لگتی۔ اگر ہم میں سے کوئی دوست گھر سے کسی وجہ سے بیزار ہو کر آتا تو ہم اس کی بیزاری کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے اسے ہلا دوم کرنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھار جب وہ تنگ بھی ہو جاتا تو ہم سے ناراض ہونے کی بجائے وہ دوستی کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ کر ہمارے اور قریب ہو جاتا۔

کبھی کبھار آتے جاتے ہوئے ایک گڈریا مل جاتا تو وہ چند ایک بکریوں، بھیڑوں اور ان کے بچوں اور ایک گائے اور بھینس کو ہانکتا ہوا ہمارے قریب آ کر رک جاتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمزور اور باریک سی چھڑی ہوتی جس سے پہلے وہ اپنی بھیڑوں اور بکریوں کو ٹیک جا کرتا پھر وہ ہم سے محو گفتگو ہو جاتا۔ ایک روز ہم سب نے اس سے پوچھا۔ ''نتھو چاچا (یہی تھا اس کا نام) یہ بتائیں۔ آپ کے ہاتھ میں پتلی اور کمزور سی چھڑی ہے اس سے آپ کے یہ جانور مان جاتے ہیں؟'' ''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' ''مطلب یہ کہ جب آپ اسے جانوروں پر مارتے ہیں تو اس سے تو انھیں ذرا بھر بھی تکلیف نہیں ہوتی ہوگی؟ جب انھیں کوئی تکلیف نہ ہو تو آپ کا یہ ریوڑ کیسے راہ راست پر آتا ہوگا؟'' ''یہ چھڑی جانوروں کو پیٹنے کے لیے نہیں۔ اس سے میں صرف اشارہ کرتا ہوں اور وہ اس اشارے کو بھانپ کر سیدھا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور پھر بے زبان کو مارنا، اسے دکھ پہنچانا کہاں کی عقل مندی ہے۔''

اچھا یہ بتائیں یہ جو بھیڑوں کے بچے ہیں انھیں آپ ادھر ادھر جانے سے کیسے روکتے ہیں؟" مجھے انھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ تو خود ہی اپنی ماؤں کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی بچہ بھٹک جائے تو اس کی ماں اپنی زبان سے سمجھا کر واپس لے آتی ہے۔ میں آپ کو ایک پتے کی بات بتاتا ہوں کہ ماں کی ممتا میں اس قدر کشش ہوتی ہے جو اپنے بچے کو کبھی ادھر ادھر ہونے ہی نہیں دیتی۔" ہم گڈریے کی یہ دانش سے بھری باتیں سن کر بہت خوش ہوتے اور سوچتے کہ ایسی گہری باتیں اس ان پڑھ گڈریے کے ذہن میں کہاں سے آتی ہیں۔ لیکن ان کے پیچھے اس کی زندگی بھر کے تجربے تو نہیں بول رہے ہوتے۔ اس طرح دن گزرتے رہے اور ہم تمام دوست حسب سابق ٹوٹی پھوٹی اور کھابوں والی سڑک پر سائیکلوں کی اچھل کود کے مزے لیتے اور ایک دوسرے سے اٹھکھیلیاں کرتے کالج آتے جاتے رہے۔ ہمیں نہ کبھی گرمیوں کی شدت کا احساس ہوا نہ کبھی سردیوں کی یخ بستگی نے ہم پر لرزہ طاری کیا نہ بارشوں کے موسم میں پانی میں ڈوبی سڑک نے ہمارا کچھ بگاڑا۔ غرض یہ کہ برے سے برے دن بھی ہم سب دوست اچھے دنوں کی طرح گزارتے رہے لیکن ..... ان گزرتے دنوں میں ایک دن ایسا بھی آیا جس نے ہم تمام ہم جولیوں کو انتہائی اذیت میں مبتلا کر دیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ آگ برساتی ہوا چل رہی تھی۔ جس نے ہمارے جسموں کو جھلسا کے رکھ دیا تھا۔ دھوپ کی شدت کے کارن سڑک پر آمدورفت بھی معمول سے بہت کم تھی۔ لیکن ہمیں تو کالج سے فراغت کے بعد بہرصورت باہر آنا تھا۔ اور اس کڑی دھوپ کا سامنا کرنا تھا۔ ابھی ہم کالج کے مرکزی دروازے سے باہر آئے ہی تھے کہ اس ادھڑی ہوئی سڑک کے دائیں جانب سے کچھ دھیمی رفتار سے جو ایک ٹرک آ رہا تھا اس کے پیچھے بڑی ہی تکلیف دہ صورت حال دیکھنے کو ملی۔ جب وہ ہم سے بہ قدرے فاصلے پر تھا تو کچھ چیخیں ہمارے کانوں کو چھیدنے لگیں تھیں۔ جب وہ ٹرک ہمارے بالکل قریب آ گیا تو ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ اس ٹرک کے پیچھے ایک زندہ وجود بندھا ہوا تھا۔ ٹرک کے ساتھ سڑک پر گھسٹتا ہوا آ رہا تھا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی چاروں ٹانگیں ایک مضبوط رسے سے کس کر باندھی ہوئی تھیں اور پھر اس کے دونوں سروں کو ٹرک کے لوہے کے مضبوط کڑوں سے باندھ رکھا تھا۔ اس ٹرک میں کافی تعداد میں بھیڑیں، بکریاں اور ایک دو گائے ہیں اور بھینسیں لدی ہوئی تھیں۔ بکریوں کے بچے جو اپنی ماؤں کے ساتھ کھڑے تھے ان کے تھنوں سے چمٹ کر دودھ پی رہے تھے۔ اور مائیں انھیں پیار سے چاٹ رہی تھیں۔ ہم اس ساری کربناک صورت حال کو دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ لیکن فوراً بعد ہی جب ہم اس سے باہر نکلے تو ہم نے ٹرک کے پیچھے بیٹھے ہوئے کنڈیکٹر کو ہاتھوں کے اشاروں سے ٹرک کو روکنے کو کہا۔ ٹرک روک دیا گیا شاید یہ سمجھ کر کہ ہم ان کے اس عمل کی تائید کرتے ہوئے کہیں گے۔ " آپ نے بہت اچھا کیا اور اس حرام کے بچے کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنے سے آپ کو جنت میں جگہ مل جائے۔" لیکن جب ہم نے ٹرک ڈرائیور کی سیٹ کے پاس جا کر اس کی توقع کے برعکس سوال داغ دیا۔ " ڈرائیور چاچا آپ نے اتنا بڑا ظلم کیوں کیا۔ اس نے آپ کا کیا بگاڑا تھا۔" ڈرائیور نے ہماری غیر متوقع بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور برا سا منہ بنا کر ٹرک سٹارٹ کر کے دیکھتے ہی دیکھتے سڑک کی پہنائیوں میں غائب ہو گیا ہم ششدر کھڑے تکتے رہ گئے۔

ہاں جب ہمارے اشارے پر ٹرک رک گیا تو ہم نے دیکھا کہ مظلوم ستور کے تمام جسم سے چمڑی ادھڑ چکی تھی اور وہ تمام کا تمام لہو سے نہا چکا تھا۔ جب ہماری نظریں اس کے چہرے پر گئیں تو ہم نے دیکھا کہ اس کی دونوں آنکھیں غائب تھیں۔ ہم نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ حادثاتی طور پر ہوا ہو یا پھر اس اذیت دینے والے نے اس کی آنکھیں چھین لی ہوں آخر میں ہمیں یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ نر نہیں مادہ ہے جس کے چاروں تھن دودھ سے لبالب بھرے ہوئے تھے یقیناً یہ دودھ اس نے اپنے بچوں کے لیے سنبھال کے رکھا ہوگا۔ لیکن اب میں

سوچتا ہوں کہ اس کے بھوکے پیاسے بچے دودھ کے انتظار میں کب تک بیٹھے رہے ہوں گے۔ اب ماں نے بھلا کب ان کے پاس آنا تھا۔ وہ تو کب کی ظلم کا شکار ہو کر اس دنیا کو چھوڑ چکی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان لاوارث بچوں پر ترس کھا کر کسی دوسری ماں نے انھیں گود لے لیا ہو اور وہ اس ماں کے بچوں کے دودھ شریک بھائی بن کر ان کے ساتھ خوشی خوشی رہ رہے ہیں اور یہ بھی قوی امکان ہے کہ اس زخمی ماں نے اپنے معصوموں کے لیے دودھ سے بھرے اپنے چاروں کٹوروں کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک سنبھال کے رکھا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دودھ اس کی موت کے بعد بھی کسی بیابان دھرتی کا رزق بن چکا ہو۔

◆◆◆

افسانچہ

جھونکا ہوا کا تھا

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

میں حیرت زدہ ہو کر قدآدم آئینے کی پرلی طرف دیکھ رہا تھا اسے دیکھ کر میں بُت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ دودھ میں نہائی رنگت پر یاقوت جیسے ہونٹ، بلوری آنکھیں، وہ بھی ایسی کہ ان میں مجھے اپنی صورت نظر آ رہی تھی۔ میں مبہوت کھڑا اسے تک رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ میں گھبرا گیا اور ایسے لگا کہ میں نیند سے جاگا ہوں۔ وہ بلا کی خوبصورت تھی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس میں تم نظر نہیں آ رہی۔ بھلا دیکھو اس کے حسن میں کوئی کمی نہیں تھی مگر شاید وہ وہ احساس اور وہ خوشبو نہیں تھا جیسا مجھے تم میں نظر آیا۔ ہاں ہاں وہی منظر جو رات میں نے خواب میں دیکھا ازمنوں بلکہ صدیوں سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ سچ آکئی دنوں سے آنکھ لگتی ہے کہ کبھی نہ کبھی تو مجسم حالت میں تمھیں اپنے پاس پاؤں گا۔ جب تم سامنے آ جاؤ گی تو جانے میری کیا حالت ہوگی۔ کیا تم کہ تحیر کے اس عالم میں میرا وجود میرا دامن ساکت ہو جائے۔ میں نہ بھی پہچان پاؤں تو تم تو مجھے پہچان لینا۔ یہ عنایت ضرور کر دینا تا کہ جب میں اس عالم سے واپس ہوش میں آؤں گا تو پتہ ہو کہ پہلے زندگی انتظار میں گزر رہی تھی اور اب پچھتاوے میں گزرے۔ عجیب بات ہے کہ ہوا کی جب سرسراہٹ ہوتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ تمھارے آنے کا اعلان کر رہی ہے۔ میں گم صم پاگلوں کی طرح چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہوں کہ تمھارے قدموں کی آہٹ سن سکوں۔ ذرا سا پتا کھٹکتا ہوں تو رستوں سے جدا ہوئے زردپتے میرے قدموں سے لپٹ جاتے ہیں۔ میں تو ان کی آواز سے بھی گھبرا جاتا ہوں کہ ایسے میں راستے سے شور سے کہیں ہوا میں تمھاری خوشبو اور آواز میرے شعور سے باہر نہ ہو جائے۔ خواب میں جب میں تمھیں سوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ کوئی حور محو خواب ہے۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ موتیے کا ایک پھول مار کر تمھیں جگاؤں مگر ڈرتا ہوں کہ تمھارے آرام میں خلل نہ پڑے۔ یقین کرو پچھلے ماہ جب تم میرے خواب میں آئی تو کسی شاہی محل میں آرام دہ مسہری پر محو خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ میرے ہاتھوں میں محبت کی نشانی گلاب کا پھول تھا۔ میں نے اسے سونگھا مگر وہ تمھارے بدن کی خوشبو کے نزدیک تر بھی نہ تھا لیکن محبت کی یہ نشانی میں تمھارے بالوں میں سجا دینا چاہتا تھا۔ گلاب کا پھول لے کر میں جب آگے بڑھا تو تم نے خواب میں ہی انگڑائی لی۔ تب نیند کے عالم میں ہی تمھارے ہونٹوں پر مسکراہٹ ایسے آئی کہ ہزاروں حوروں کے لبوں پر بھی ایسا منظر کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ میں جو گلاب کا پھول لے کر تمھارے جوڑے میں سجانے کو آگے بڑھا تھا اس مسکراہٹ کے سحر میں ایسا گھبرایا کہ پھول میرے کانپتے ہاتھوں سے فرش پر آ گرا۔ میں دل دھک دھک کرتا رہ گیا۔ یہ تو بدشگونی ہوگی۔ شاید یہ مسکراہٹ کسی اور کے لیے تھی۔ آج رات بھی خواب میں میں تمھارا منتظر رہا۔ آج تو میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ تمھارے قدموں سے لپٹ کے پوچھوں گا کہ تم میری زندگی میں کب ملنے آؤ گی۔ میں خواب بنتا رہا لیکن تم تو جانے کہاں چلی گئیں میرا خواب بھی ادھورا نہیں ہوا تھا کہ آنچ دیا ہوا۔ اچانک یوں لگا کہ ہوا کی سرسراہٹ محسوس ہوئی مجھے لگا کہ یہ تمھارے آنے کا وقت ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور بھاگ کر دروازہ کھولا کہ تم آئی ہو لیکن یہ کیا کہ ... باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا۔

گامو......

صوفیہ بیدار

مختصر تعارف

صوفیہ بیدار 25 دسمبر کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئیں۔ 4 کتابیں ابھی تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔ 15 سال سے صحافت سے وابستہ ہیں۔ ''خبریں'' اخبار میں باقاعدگی سے کالم لکھتی ہیں۔ نو سال تک پی ٹی وی کی نیوز کاسٹر اور اناؤنسر رہیں۔ افسانے ''ہم فنکار'' کو خالد احمد کی زندگی میں پہلے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

عجیب جشن بھری سی ہنسی تھی اُس کے چہرے پر جس نے اس کے تمام ہجر ہی کو اڑا دیا تھا۔ تو پچھلے پانچ برس کا تاثر کیا محض ایک ہنسی کی جھنکار سے ختم ہو سکتا ہے۔ لوگ کہتے تھے آپ جو میڈیم کا مو کہتی ہیں نہ یہ دیا ہے نہیں اچھا بھلا غلام عباس ان کے نزدیک گامو تھا۔۔۔ پانچ وقت کا نمازی صوم وصلوٰۃ و تبلیغ کا علمبردار سیاسی مائل چہرے پر مشخشی داڑھی میانہ قد مناسب قد وخال غیر مذکور نقوش ایسے جو کبھی تصور میں واضح نہیں ہوتے انسانوں کی قطار میں عام سا نقشہ نہ اچھا نہ برا یاد کے کسی کونے میں گامو کے نام سے آ جھلکتا مگر چہرے کا نقشہ کسی یاد کے پردے پر نہ چھپا ملتا۔۔۔ آواز میں خوشامد کی حد تک سی حضوری گھلی ہوئی اب اس تابعداری نے آواز کو بھی چھپا رکھا تھا جی۔۔۔ جی سرکار۔۔۔ جی میڈیم جی۔۔۔ سر جی۔۔۔ سرگوشی ابھرتی اور ڈوب جاتی ایسے میں صوفی تاثر کہاں تمام رہتا ایک بیہودہ سا خیال میں چھپکا مارتا ایک سرخی سا بندہ رکوع کی حد تک جھک کر بطور خاص زور لگا کر آنکھیں نیچی رکھتا ہوا۔۔۔ تمام اعضا میں شاید اس کی آنکھیں ہی اختیار سے باہر تھیں کبھی کبھی حساسیت کے کسی لمحے میں ضرور آنکھوں کی باقیات سرخی محسوس ہو جاتی مگر دکھائی نہ دیتی۔۔۔

غلام عباس پہلے انکم ٹیکس ہاؤس جاتا پھر مارکیٹ پھر کلب پھر۔۔۔ عقب میں اس کی گھگی آواز جی سر۔۔۔ جی سر۔۔۔ کبھی سنائی دیتی میری ضروری اور غیر ضروری مصروفیات کو وہ قبل سے سنتا ہوا ابھی نکلت لگا رہا فیصل آباد کا تو تھا ہی۔۔۔ اور اور۔۔۔ ثنا صفیانہ نہیں جاتا۔۔۔ جو ایک آدھ مقام رہ گیا ہوتا بجلی کی طرح سے دہرا دیا جاتا۔۔۔ مجھ سے پہلے افسروں کی جب تعریف کرتا تو تمیز جو آرٹ کونسل کا سب سے بڑا مستند تھا کے حوالے سے کیسے کیسے فحاشی کنٹرول ہوئی کس کس نے پیسے کھائے رجسٹر طلب رہیں تو یہ توبہ کرتے بیان کرتا پھر اپنی مجبوری پر رو ہانسا ہوتا شکر ہے آپ خاتون ہیں آرٹسٹ خود ہی پیش کو آ جاتی ہیں ورنہ ایسی جگہوں پر ہمیں بھی جانا پڑتا۔۔۔ ہمارا کام ہے غلام عباس ویسے بھی اب وڈیوز مجھ تک پہنچ جاتی ہیں جب ''میں'' کرتی ہوں یہ ان عورتوں کے باثر پرستاران کو عدالت پہنچا دیتے ہیں میرے کس آنے دن آتے ہیں جانے کی نوبت ہی نہیں آتی وڈیوز کو سنسر کو بحث کر دیتی ہوں۔۔۔ تمہارے سیل یا سر شوق سے بھی جاتے تھے۔۔۔ جی جی۔۔۔

لوگ کہتے ہیں میڈیم کے آنے سے فحاشی ختم ہو گئی ہے۔۔۔ ایسا نہیں یہ صرف کنٹرول ہوتی ہے میں تو محض چلان بلکہ وزراء

آگے گئے اور گارڈز کی پریڈ تعیناتی چیک کرتی ہوں فیصل آباد کے تھیٹرز شہری آبادی کے اندر ہیں یہ تشویش دیتی ہے ڈی سی صاحب بھی اسی سے متعلق رہتے ہیں اندر جو ہوتا ہے روکیں تو مقصد سے پچھڑیاں وزیر اعظم پورٹل ـــ غلام عباس سر مارتا مارتا تو یہ کا ورد کیے جاتا اللہ کی پناہ شیطان سے حفاظت ـــ کبھی جو میٹنگ کے بعد چند ضروری کارکنوں میں بیٹھ کر کام سے تعریف کر دیتی کہ تم لوگ دوستوں کے لیے پاس مانگتے رہتے ہو ایک غلام عباس ہے تھیٹرز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ـــ او جانے دیں میڈیم یہ جو اکھاڑا ہے یہ تو تھیٹرز کا کیڑا ہے سامنے سے دوسرے پر نماز کی ٹوپی والے اصل پکڑے گزر رہا تو باہر وطن سے پوچھتا ہوا میڈیم کو دیر ہے تو میں جا رنگل بھی پڑھ لوں نماز کے بعد ـــ میں کبھی نا خلوات شریف بندے پر کیسے کیسے الزام لگاتے ہو ـــ بس ایک بات عجیب ہے میرے سامنے آنکھیں زور سے میچ کر اتنا جھک جاتا کہ داڑھی سینے کو جا لگتی ہے ـ ڈرتا ہے جی آپ اس کی آنکھ کا بال نہ دیکھ لیں جاؤ جا کو اب میں چلتے ہوئے نشست برخاست کر دیتی ـ ان کی تو عادت ہے ـــ تو دو تو بولتی ہوئی چلے گئی تو بادشاہ میرا بھلا مین خلوص سے بھرا ہوا چھلانگیں مارتا سامان اٹھاتا پکڑا کرتا گاڑی کو بھاگتا ـــ عام روٹین یہ تھی کہ ایڈمن بلاک میں جہاں یہ سارے اکٹھے ہو کر ہال کمرے میں اپنے اپنے کارڈ سے اور دوسروں کے قصے سنانے میں محو ہوتے میں دانستہ قدموں کی آہٹ سے داخل ہوتی کہ جو باتیں بند ہو جائیں سب کھڑے بھی نہ ہونے پائے کہ ضروری بات کر کے اقبال سٹیڈیم میں واک کو چلی جاتی ـــ جا کر رہتے پانی ناول ہمراہ بادشاہ ہوتا اور غلام عباس گاڑی پہ کالی شروع کر دیتا کہ اب کچھ ہی دیر میں خاک چھانتا ہے ـــ زندگی اپنی اسی رفتار پر رواں دواں تھی اس دوران میرا بیگ اور دونوں موبائل غلام عباس کی موجودگی میں یوں گاڑی میں غائب ہوئے کہ یقین سے باہر پہلے مکمل انکار پھر ایک کہانی اور بعد ازاں لاپرواہی پر معمول کروا دیا گیا ـــ دل میں ایک خلش سی پیدا ہوگئی پر افتر بازی پاری افسوس کے بہانے اندر رہتا اور غلام عباس پر شک پکا کر کے چلا جاتا ـــ ڈرائیونگ اور وہ بھی انتہائی جگہ جگہ دفتر دفتر مارکیٹ بازار لاہور فیصل آباد اور اسلام آباد اسی مفروضے سے متعلق ہوتے ہوئے بھی یقین نہ کرنے پر مصر رکھتی تھی طبیعت ـــ پھا گم روز ـــ آرگنگ بہنریاں آ گئیں جی میڈیم جی تا میں بیگ جی میڈیم سب گاڑی میں رکھوا دیا گی گاڑی لمبی چھٹی لاہور پہنچ جاتی ـــ کرایہ بھاڑا اور ویک اینڈ کے بعد واپس آنے کا ہدیہ کر دوں تو چھ جاتا آمد کی آ نے کیا طوفان غلام عباس نے لاہور کا نہیں ہوتا تھا ـــ ویسی بیوی کی بھانجی بھائی کا سمدھی بہن کی ساس
بس بس غلام عباس ـــ جاؤ ـــ اور وہ آندھی طوفان تھی کہ تحریک لبیک کے دھرنے میں بھی راوی کراس کرنے والا پہلا شخص تھا

یہ اندازہ کاموں کے دوران کہیں جو بھانجی بھتیجی کی نوکری سے پک کرنے کا مرحلہ ہوتا یا ہسپتال میں کوئی عزیز تو ہر ایک کہتا رہتا مجھے پہنچنا ہے عورتیں اکیلی ہیں ـــ او جو عورتوں کو اسان سمجھے وہ وہاں ڈرائیونگ تسلسل سے "عورتوں" کے فون آتے رہتے کوئی بچہ چھت سے گر گیا کسی نے ڈی ڈی ایل پی کی بہن کی ناک کو سکوٹر سے مار دیا ـــ مجھے ہی جانا ہوگا آپ خود ڈرائیونگ سیکھ لیں سرکار جاؤ میں جل کہتی صرف راستے بتا جاؤ یہاں کے (فیصل آباد) وہ اپنے پریوار کا اکیلا ہی مرد بنا ہوا تھا ـــ تمہارے دو بھانجے تو میرے پاس ہی نوکری کرتے ہیں ان سے بھی کام لیا کرو ـــ او میڈیم عورتوں کو تو میں نے ہی سنبھالنا نہیں کیا پتہ ـــ میں اتنے بڑے مردانگی کے شاہکار پر ششدر ہو کر رہ جاتی

گھر والے کہتے چلو اچھا ہے تمہارا ڈرائیور بہت گھریلو ہے ایسے لوگ گھر کے لیے ٹھیک رہتے ہیں ضرور کوئی لالچ رکھتا ہے ہاں

ہے تو گھر چلا جاتا ہے سارا دفتر کہتا تین شادیاں کیسی ہیں ان نے تو اس میں کیا برائی ہے ۔ پاپا کہتے اور پھر امی شروع ہو جاتیں غلام عباس کہیں رہ جاتا ۔ عاجزی اور شرافت کے پیکر میں کسی کے کہنے سے کوئی دراڑ نہ پڑی مگر وہ تھی ۔ ہوا محض اتنا کہ بے بی جان نے ادھم مچا رکھا تھا رقص کرتے کرتے کپڑوں سے بے نیاز ہو جاتی ٹی وی والے زاویہ رقص تو پیچھے رہ گئے ٹھکانوں کے اشتہار پر وہ تجلس لیم نے اصرار کیا۔ ''کم ہو وقت گیا'' ''بس کبھی آپ دیکھ لو'' صبح میڈیم کا نام ویڈیو اور کے صبح نو بجے بے بی جان کو پیش کر دو ۔ میڈیم رحم کریں دو بجے تک تو ان کو ہوش نہیں آتا ۔ گیارہ بجے بلا لوں ابوبکر نے کہا ۔ بلالیں بے بی جان کی آمد تھی کہ عملہ قابو میں نہیں آ رہا تھا افسران پچھے پر زیادہ وقتی بنائے بیٹھے تھے وہ تجلس لیم والے درشت لہجے میں اسے مختلف کمرے میں ڈانٹ رہے تھے ۔ میڈیم کوئی ''ویلے'' ہیں ۔ ابھی پیشی کرا دیتے ہیں یا پھر آپ کی ہدایت میں ملک عاجز راموں کا بے تاج بادشاہ اور شیخ نوید بے بی جان نے چھوڑ دیا تھا شیخ پکے تھے۔ میڈیم رش بڑھ جانے کے ہوئے رپورٹر بھی آنے لگے ہیں آپ بے بی جان کو بلا کر بین کریں بس چلو بھیجو ابوبکر کو۔ ابوبکر کا اصل عہدہ اکاؤنٹ آفیسر کا تھا ایمانداری اور عورتوں سے متنفر ہونے کی وجہ سے آج راموں وہ تجلس کی ڈیوٹی دے رکھی تھی ۔

حسبِ معمول اور حسبِ توقع سے پارلر سے اسٹائلنگ شدہ گولڈن بال آنکھوں کے پیچھے رکھتا ہوا کاجل جو پلکوں کی بجائے سوجن اور جھریوں میں گم کیا گیا تھا۔ اتری ہوئی لپ اسٹک کا چڑھا ہوا رنگ پان سگریٹ کے دہن تک اثرات ہیرے کا لونگ مس کریموں کی کرامات سے جعلی گورا رنگ ابھرا ہوا سانولے ہاتھ پاؤں اور گردن ۔ سیاہ وہ جعلی چادر کانوں میں بے شمار چھید اور ان میں بالیاں ہوگی کا کرتا شلوار اور چمکتی چپل ۔ ابوبکر بولو کیا اس خاتون کو وارننگ لیٹر نہیں دیئے ۔ ویسے بی جناب کے دستخطوں سے مگر یہ بکھ گئے تھے ۔ تین لیٹرز کے بعد کارروائی کیوں نہیں کی ۔ بی بی آپ پیشی کے بعد ختم کر دیں ۔ کہ وہ بیچ میں بول پڑی مائی باپ مہربانی کریں آپ بین کر دیں گے تو ہمیں روزے کام کرنے پڑیں گے ۔ تو پہلے کون سا اچھے کام کر رہی ہو میرے سامنے ہی ابوبکر ہمارے لگائے گئے کیمروں کی تازہ ترین واردات کی ویڈیو میرے فون پر سینڈ کر رہا تھا میں بغیر آواز کے سرکاری کرسی پر بیٹھی دیکھ رہی تھی میرے غصے کو دوام دینے کے لئے ابوبکر نے وہ ایک انتہائی متنازعہ ویڈیو سینڈ کر کے ہولے سے کہا سوری میڈیم ۔

اتنے کام جیسے ہی ختم ہو رہا تھا فون اٹھا کر کہا رشید والے کال ملا دو بیوروکی میڈیم ملک عاجز ملنا چاہ رہا شیخ نوید بھی میں سمجھتے ہوئے بولی کہ انتظار کریں ۔ ریسٹ ہاؤس ابوبکر آپ نے چیک کی ہوم ڈیپارٹمنٹ کے بندے کہاں تھے کی موجود تھے ریسٹ ہاؤس بالکل یہ پاک صاف ہی کرتی ہیں ناصر کو بلاؤ۔ تجلس تو دوران ارادہ چھاپہ ہونا ہے ٹی وی تو ویڈیو جناب کو سینڈ کیں ہیں ناصر بولا آپ تو سوالوں کے لیے میں ہی رہ گئے کیوں نہیں ۔ جی ابھی رو کے ہی گئے تھے بے بی جان نے محض اتاری تو لائیں کیوں نہیں بند کروا گئے ہال کی تازہ ترین سوالوں کے جواب دیکھے دکھائے تھے ۔ جی کروا دی تھیں مگر ان ویڈیوز میں تو مکمل روشنی ہے ۔ وہ جی ملک عاجز اور تین بندے اور تھے اٹھوانے کر کھڑے ہو گئے ۔ یہ اب بتا رہے ہو مجھے ۔ ابوبکر ۔ میں قدرے چیخی ۔ وہ جی کوئی چلی تو نہیں جناب کی نیند نہیں خراب کی ۔ جب پتہ ہے جب بھی ڈی سی کا فون آتا تم کون سا تے ہو یا C41 پر گھس گئے ہوں ۔ یہ خود موجود ہوں تو جب نا ۔ ناصر بولا ۔ ہاں جی ناصر کو شوق ہے یہ دس بندے گشت آفس اور دفتر کے لے کر اپنے نمبر بنانے بیٹھا ہوتا ۔ خاموشی واپس ٹاک پر آ دوسری شکایت جو عام درخواست اور ٹل بورڈ پر ہوتے ہیں بعد میں ریسٹ ہاؤس سے غائب ہو جاتے ہیں۔ عوام کو بے

وقوف بناتے ہو ۔۔۔ ووٹی پروڈیوسر گیتا ریبرسل سے جو لڑکیاں اور کامیڈین شادت ہوئے کل شیخ پروڈائریکٹ تک پہنچ جائیں گے بعد میں یہ دھوکہ کریں تو ہمارا کیا قصور؟ تمہارا ہی قصور ہے ریبرسل میں مکمل کاسٹ کا نہ ہونے پر بھی فائل تمہارے دستخط سے مجھ تک پہنچی ایوبگر ۔۔۔ بے بی جان اس سرکاری بکواس سے بور ہو رہی تھی ۔۔۔ ناصر اور ایوبگر کے مابین فرائض کی تقسیم حسب معمول ذاتی حملوں کی طرف پہنچ رہی تھی کہ ملک عاجز عملہ کو دھکیلتا اندر داخل ہوا آپ صرف پانچ منٹ اور انتظار کریں ملک صاحب ملک دیوار سے ملحقہ کرسی پر ٹک گیا میں ادھر ہی انتظار کر لیتا ہوں کہ شیخ نوید بھی کمرے میں داخل ہوا ۔۔۔ کھنکار کر بولا دیکھیں میڈم جی ہم آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں مگر بے بی جان کو میں نے سٹیج پر پاؤں نہیں رکھنے دینا ۔۔۔ شیخ صاحب آپ میری عزت کرتے ہیں کہ آپ کے پاس کوئی اور آپشن نہیں مگر بے بی جان کے فیصلے کا اختیار میرے پاس ہے ۔۔۔ جی بالکل قانون کی رو سے آپ ہی بے بی جان کے حق میں فیصلہ کریں گی ملک عاجز بولا ڈرامائیکٹ 1976 ۔۔۔ بس ملک صاحب آپ دونوں کار سرکار میں مداخلت نہ کریں اور مجھے قانون سے بات کرنے دیں بادشاہ جاؤ ساتھ والے کمرے میں میرے دونوں مہمانوں کو چائے پلاؤ ۔۔۔ چاروناچار دونوں باقرستیاں اٹھیں کہ ملک بولا میڈم جی وہ ذرا جلدی میری نماز کا ٹائم ہو رہا ۔۔۔

تھیٹر کے تاریخ دان ملک عاجز کے دو ہی شوق تھے صوم وصلوٰۃ تسبیح اور فنکاروں کی بہبود کا ٹھیکہ ۔۔۔ صبر کریں ۔۔۔ تو بے بی جان یہ سوال بھی بے کار ہے کہ تم یہ سب کیوں کرتی ہو؟ اس لئے کہ تمہارے لیے کہ تم ایسا کرو گی ۔۔۔ اور یہ لاسٹ وارننگ ہے ۔۔۔ ایوبگر ایک مہینے بعد اس سے اپنی ڈیوٹ لے کر دوبارہ اجازت نامہ سائن کروالینا ۔۔۔ ناؤ فنش ۔۔۔ اوکے وہ دیکھیں ۔۔۔ بادشاہ جاؤ میڈم کو بھی چائے پلاؤ مجھے کمشنر آفس جانا ہے گاڑی لگواؤ میں دانستہ قدرے جلدی میٹنگ کے لئے چل دی ۔۔۔ گاڑی کے پاس شیخ نوید تو یہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا بہت اچھا کیا میڈم جی مہینے کی سزا کم ہے ۔۔۔ میں فنکاروں پر اس ظلم پر خاموش نہیں رہوں گا وزیر اعظم پورٹل پر شکایت ڈالنا میری مجبوری ہے ۔۔۔ ملک عاجز کے پیچھے سے غصہ اور توہین لرز رہی تھی ۔۔۔ جی بسم اللہ ۔۔۔ میں گاڑی میں بیٹھی تو غلام عباس گاڑی دوڑاتا توبہ توبہ کر رہا تھا ۔۔۔ اوئی شہر بھر کا اخلاق بگاڑنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اس بے بی جان نے شیخ نوید کو کھالے کر یہ ملک عاجز کے گروپ میں چلی گئی ہے ۔۔۔ ان کے شعبے کی بھی مجبوریاں ہوتی ہیں غلام عباس جب شعبہ ہی غلط ہے ۔۔۔ تو شکر ہے اس فحاشی سے مہینے کے لیے تو جان چھوٹی ۔۔۔ چلی گئی ہے؟ نہیں جی وہیں تو سے بہا رہی ہے ۔۔۔ کامیڈین ہی اس فحاشی کو ختم کر سکتے تھے مگر وہ زبانی فحاشی میں جسمانی فحاشی کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ماشاءاللہ تو یہ کرتا ہے ۔۔۔ میں کسی وظیفے کا ورد کر رہا تھا اللہ میاں ہمیں اس روزی سے بچا ہمارے رزق کو حلال کر میڈم جی کہیں ہماری پکڑ تو نہیں ہو جائے گی جو ہم اس شعبے کی کمائی کھا رہے ہیں میرا مطلب ہے مصوری، رقص ڈرامے سب حرام ہی تو ہیں گاموا نت ''شاعری'' کو نظر انداز کر گیا ۔۔۔ میری مسکراہٹ کو نوٹ کر کے بولا ویسے جی شاعری میں تو پھر بھی نعت حمد لکھ لیتے ہیں ۔۔۔ ان شعبوں پر تو معافی بالکل نہیں ۔۔۔ توبہ توبہ ۔۔۔ مجھے تو کسی اور محکمے میں شفٹ کروا دیں میرے بچوں کے رشتے کیسے ہوں گے؟ لوگ تو ہی آرٹ کونسل کو ''کنجر خانہ'' کہتے ہیں تو کیا ہم ۔۔۔ بس کرو غلام عباس اللہ سب جانتا ہے ہم تو غلط کاموں کو روکتے ہیں فالتو کرتے ہیں وہ تو ٹھیک ہے جی پھر بھی کہیں سے فتویٰ لے لیں ۔۔۔ اچھا دفتر آگیا ہے مجھے یہیں اتار دو وہ ابھی یہ سیدھے نظر آؤ ۔۔۔ میں کوریڈور سے کمشنر دفتر میں داخل ہوتی سوچ رہی تھی کہ موون رات کا حساب رکھتا ہے اسے اپنی جنت کی فکر کھائے جا

رہی ہے۔۔۔ فیصل آباد میں حبس شام میں ڈھلتے ڈھلتے دن بسر ہو رہے تھے کاموں کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا جب ایک تعلق پر اللہ تو یہ کرتا رہتا۔ سنجیدگی سے سوچتی اسے انفارمیشن کے کسی اور ادارے میں ایڈجسٹ کروا دوں یہ تو احساس گناہ سے مرا جا رہا ہے۔۔۔ ناصر اور ابوبکر کے علاوہ دیگر عملہ بھی میری اس پریشانی پر ہنس دیتا او میڈیم جی آپ اس کو نہیں جانتیں۔۔۔

حیرت ہے جو جانکاری نہ ساتھ سفر کرنے میں ہوئی نہ لوگوں کے کہانیاں سنانے میں تھی کہ اس کے تنگ ساتھیوں کی باتیں الزام تراشی افسانہ سازی اور مخالفت سی لگتیں۔۔۔ وہ جانکاری وہ انکشاف کا لمحہ وہ ماضی جو ایک چشکیری سی راتوں میں چھپے حسین سے تیکھے اور نقشوں کی شکل ہی بگڑ چکی تھی اب جس سے سیاہ پڑتی عنابی رنگت وہ دونوں پاؤں صوفے پر دھرے گھٹنوں کے گرد ایک بازو کا حصار دوسرے ہاتھ سے خلال اور ہونٹوں کے اوپر ابھرتے تکاروں میں کیا احساس بھرا تھا۔۔۔ کیا میڈیم کو نے کرگذاری ازلی ملک ماجد بھی دیکھتا رہ گیا اور شیخ تو یہ بھی شام تک مجھے فون کرتے رہے میں نے کہا اب میں پانچ سو ہزار روپے کی پارٹی تھیں۔۔۔ بے بی جان کو جو تو نے رلایا کاموں تجھے اللہ پوچھے گا اس کے پھٹے اور موجود یار کے قبیلوں سے اسے بھی پکڑ کر کھلا دیا تھا میڈیم کو بھی اللہ تو یہ کروا دی ابھی وہ جیسٹ بھی مکمل کر کے بیٹھے نہ تھی کہ گھروں اوں پڑی میں لوٹ سے سامنے آ گئی۔۔۔ ناصر ابوبکر اصغر بادشاہ ممتاز کی ہنسی بلیوں اچھلنے لگی۔۔۔ میڈیم ہم نہ کہتے تھے کاموں کے سر سے بھی ٹوپی سرکتی بھی اضطراب میں تسبیح کے دانوں پر انگلیوں کی پوریں بے قرار بس چھوڑتیں کبھی تہہ بند پہ کبھی غصہ کبھی بے قراری عنابی جامنی رنگت سیاہ پڑتی ہوئی خیاصت کے جن سے تیور گرا کاموں کے لبادے میں واپس ہوتی نہ پا رہی تھی۔۔۔

◆◆◆

سکالر صبا زاہد کو مبارک باد!

سکالر صبا زاہد نے ''بھارتی مصنفین کے پاکستان کے سفرنامے'' کے موضوع پر اپنا مقالہ رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس سے ڈاکٹر جمیل اصغر کی زیرِ نگرانی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سیر و سیاحت بنی نوع انسان کے قدیم اور پسندیدہ ترین مشاغل میں سے ایک ہے۔ قرآن پاک میں بھی انسان کو سیاحت اور تحقیق کی جانب رغبت دلائی گئی ہے۔ سورۃ العنکبوت میں ارشاد ربانی ہے۔ ''قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدء الخلق'' (ترجمہ) ''کہ زمین پر گھوم پھر کے دیکھو کہ خدا نے کیسے تخلیق کی''۔ صبا زاہد کے مقالے کا موضوع ''بھارتی مصنفین کے پاکستان کے سفرنامے'' تھا۔ مقالے میں گیارہ بھارتی شخصیات شامل تھیں۔ ان اہم ترین مصنفین میں رام لعل، جوگندر پال، مہاراج کول، صالحہ عابد حسین، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، عبدالماجد دریابادی وغیرہ کا انتخاب کیا گیا۔ مذکورہ مصنفین کی اکثریت نے قیام پاکستان کے بعد اپنی جنم بھومی کے مختلف واقعات پاکستانی علاقوں کی تہذیب و ثقافت کا مشاہدہ کر کے وہاں کے حالات و واقعات کے ساتھ اپنے پرانے دوست احباب سے ملاقاتوں کو سفرنامے کی صورت میں قلم بند کیا ہے۔

(ادارہ تخلیق)

بھوک میں چنے......

محمد اسلم

مختصر تعارف

محمد اسلم 6 جنوری 1943ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ ''مرلی کا دیا'' پنجابی ناول کا اردو ترجمہ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' میں اشاعت پذیر ہوا۔ انگریزی کے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اردو ترجمہ کر چکے ہیں۔ ترجمہ کے فن پر عبور حاصل ہے۔

بھوک ایک عالمی، تلخ حقیقت ہے۔ بھوکا انسان اکثر اخلاقیات کو بھول جاتا ہے۔ اسی لئے بھوکا اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ہمارے پیغمبرؐ نے بھوک سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھوک کفر کے نزدیک لے جانے والی شے لگتی تھی۔ بھوک شرافت کو بھی ماند کر دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے رذیل سے ڈرنا چاہیے۔ کسی سیانے کا قول ہے کہ جب تک دنیا میں غربت، بے انصافی اور عدم مساوات ہے، کسی کو بھی چین نہیں ملے گا۔ دنیا کی اکثریتی آبادی یعنی غربت کی مدد یوں ضروری ہے کہ اس کے بغیر امیروں کو بچانا بھی مشکل ہے۔ پاکستان دنیا کے ممالک میں سب سے زیادہ مخیر ملک ہے۔ یہاں بڑے بڑے مخیر افراد اور ادارے روزانہ کی بنیاد پر لوگوں کے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ضروریاتِ زندگی میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ تاہم یہ سب کچھ غربت مٹانے کیلئے کافی نہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے اقدام سے غربت کا خاتمہ ناممکن ہے اس لیے نیلسن منڈیلا (Nelson Mandella) کی رائے ہے کہ غربت مٹانے کیلئے انصاف ضروری ہے۔ اس کے بغیر محض خیرات سے غربت نہیں مٹائی جا سکتی۔

میری پیدائش، آج سے تقریباً اسی (80) سال پہلے جنوبی پنجاب میں جرنیلی سڑک کے کنارے اور شہر کے مضافات میں شامل ایک کچی آبادی، غریب آباد میں ہوئی۔ اس کی حد بندی شمال مشرق اور جنوب میں کھیتوں اور اس سے پرے چمڑا رنگنے کے کارخانوں اور مغرب میں قبرستانوں سے ہوتی تھی۔ یہ بستی تقریباً چالیس پچاس گھروں کے درمیان سے گزرنے والی ٹیڑھی میڑھی گلیوں، ان میں دوڑتے پھرتے ننگ دھڑنگ بچوں اور ان گلیوں کے دونوں اطراف مکانوں کے ساتھ ساتھ بہنے والی متعفن نالیوں پر مشتمل تھی۔ بستی میں دو چار پکے مکانوں کو چھوڑ کر باقی تمام گھر گارے اور سرکنڈوں کی چھتوں سے بنے ہوئے تھے۔

بستی کے مردوں کی اکثریت چمڑا رنگنے کے کارخانوں میں دیہاڑی پر مزدوری کرتے۔ عورتیں گھروں کے چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ سوئی دھاگے سے دوپٹوں اور کرتوں پر کشیدہ کاری کرتیں اور یوں ان گھروں میں دو وقت روٹی کا انتظام ہوتا۔

بھوک آج بھی ایک بڑی حقیقت ہے تاہم آج سے اسی سال پہلے کی بھوک کا آج کی بھوک سے کوئی مقابلہ نہیں۔ جو بچے میرے ساتھ پلے بڑھے وہ مدقوق اور نحیف و نزار تھے۔ ان کے بدن پر ایک کرتا ہوتا اور ان کے پچکے ہوئے گال اور تنگ سکڑی آنکھیں ان کی بھوک اور غربت کی گواہی دیتیں تاہم ان کے جسم اور سانس کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے قدرت نے ان کے لئے کچھ اسباب بھی مہیا کر رکھے تھے۔ بستی کے گردونواح کھیت اور قبرستان انہیں جس انداز میں "الرزق" مہیا کرتے وہ کچھ یوں تھے۔

لاٹے: بستی کے کنارے اُگنے والی فصلوں میں جانوروں کے چارے کیلئے کاشت کی جانے والی ایک فصل جوار کی تھی۔ اس کا تنا لاٹا کہلاتا ہے۔ یہ پودا تقریباً پانچ چھ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ اس کی ساخت گنے سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور قدرت کی عنایت سے یہ میٹھا بھی ہوتا ہے۔ بستی کے بچے کاشتکاروں کی نظر بچا کر یہ گنے توڑتے اور مزے لے لے کر ان کا رس چوستے۔

چبڑ: چبڑ بھی کھیتوں میں خودرو بیلوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ یہ شکل میں ultra mini melon یعنی تربوز کی بہت ننھی منی صورت لگتے ہیں۔ بستی کے بچے ان کاشت کی گئی فصلوں کے درمیان ڈھونڈ لیتے اور انہیں نمک لگا کر کھاتے۔

لسوڑے: لوگ عام طور پر لسوڑوں کا تعلق اچار سے جوڑتے ہیں لیکن شاید یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پکا ہوا لسوڑا کھایا بھی جاتا ہے۔ پکنے پر اس کی گٹھلی لیس سمیت جھٹک دی جاتی ہے اور باقی حصہ کھا لیا جاتا ہے۔ یوں یہ پھل غریبوں کی خوبانی کہلانے کا حقدار ہے۔

مکو: یہ خودرو پودا کھیتوں اور کھالوں کے کناروں پر ہوتا ہے۔ اسے گولیوں کی شکل کا پھل لگتا ہے جو ابتدا میں ہرا لیکن پکنے پر کالا ہو جاتا ہے اور کھانے میں میٹھا ہوتا ہے۔ بستی کے بچے اس پودے اور اس کے پھل کی تلاش میں رہتے۔

گندم کی ادھ پکی بالیاں: بستی کے بچے گندم کی فصل کا یوں انتظار کرتے کہ ان کی ادھ پکی بالیاں بھونتے اور نرم بیج چبائیں اور دانتوں کے درمیان ذائقہ دیتیں۔

پیلو: بستی کے تین اطراف قبرستان تھے اور ان میں پیلو کے خودرو درخت اُگے تھے۔ ان کی جڑوں اور شاخوں کی مسواک کے بارے میں تو لوگ جانتے ہی ہیں لیکن ان کو لگنے والے پھل پیلو کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہوں گے۔ یہ پھل پک کر گلابی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور میٹھا ہوتا ہے۔

مغز: آج تربوز اور خربوزے کا بیج depression کا علاج سمجھا جاتا ہے اور پیکٹوں میں بکتا ہے تاہم میرے وقت میں یہ مفت کی شے تھی البتہ اسے کھانے کے قابل بنانے کیلئے اپلوں کی راکھ میں خربوزے کے بیجوں کو ملایا جاتا تھا۔ یوں ان بیجوں کے ساتھ لگی جھلی علیحدہ ہو جاتی تھی اور بیج کھانے کے قابل ہو جاتے تھے۔

آم کی گٹھلیاں: جب بھی آم چار آنے سیر ہوتے تھے۔ لیکن میرے وقت کے غریبوں کے پاس چار آنے بھی نہیں ہوتے تھے۔ تاہم آموں کی جو گٹھلیاں بے کار سمجھ کر پھینک دی جاتی تھیں وہی گٹھلیاں سوکھنے کے بعد ہماری خوراک بنتی تھیں۔ وہ یوں کہ خشک گٹھلیوں کو اپلوں کی راکھ میں دبا دیا جاتا تھا اور ان کی حرارت سے گٹھلیوں کے اندر گودا بھن جاتا تھا اور بچے اس بھنے ہوئے گودے کو شوق سے کھاتے۔

بیر: بستی کے دو تین گھروں میں بیری کے درخت بھی تھے۔ ان درختوں کا کچھ حصہ گھر کی چار دیواری سے باہر گلی کی طرف بھی نکلا تھا۔ موسم آنے پر جب بیر پکتے تو بستی کے بچے ان کے نیچے جمع ہو کر پتھروں اور روڑوں سے انہیں گراتے۔ اکثر اوقات جب دو تین بچے مل کر ان پر روڑے پھینکتے تو گرنے والے بیروں کی ملکیت پر جھگڑے ہوتے اور معاملہ مار پیٹ تک جاتا۔ یہی روڑے پتھر جب بیری والے گھر میں گرتے تو بچوں کی جو شامت آتی وہ الگ سے تھی۔ آندھی طوفان میں جب ان درختوں سے بے حساب بیر گرتے تو بچوں کی موج ہو جاتی۔ میں کوئی غذائی ماہر تو نہیں ہوں لیکن مندرجہ بالا سطور میں جن بے قیمت چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ قدرت کا عطیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کے پچھلے طبقے سے تعلق رکھنے والے بچوں کو اگر یہ مفت کی اشیا بھی نصیب نہ ہوتیں تو ان میں سے اکثر زندگی کی راہوں میں کہیں گم ہو گئے ہوتے۔

•••

ٹماٹر

ڈاکٹر ندا ایلی

مختصر تعارف

ڈاکٹر ندا ایلی ایف سی پی ایس سکن سپیشلسٹ ہیں۔ آپ بیدار سرمدی کی بیٹی ہیں۔ کنگ ایڈورڈ یونیورسٹی میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی تعلیم کے دوران ان کے افسانوں کی پہلی کتاب ''کتاب سرائے'' شائع ہوئی۔ گزشتہ تین برسوں سے ''نوائے وقت'' میں ہر جمعہ کو ان کی چھوٹی کہانی شائع ہوتی ہے۔ تین تازہ غیر مطبوعہ کہانیاں ''تخلیق'' کے قارئین کی نذر ہیں۔

آج امی نے کیا پکایا ہوگا؟ میں دفتر میں بیٹھی چیک کرتے کرتے اچانک رک کر سوچنے لگی اور پھر خود ہی اپنی دانائی پر ہنس دی۔ وہ جو بھی پکا لیں کھانے میں ٹماٹر کا ذائقہ غالب ہوتا ہے۔ مانا کہ ہمارے آنگن میں ٹماٹر کا گملا ہے لیکن ہر چیز کو ٹماٹر سے کھٹا بنانا ضروری تو نہیں۔ کبھی کبھی انسان لیموں، دہی یا املی دانے کا سہارا بھی لے سکتا ہے لیکن جناب وہی ٹماٹر۔ میں نے رستے سے خستہ اور سموسے خرید لیے تاکہ گھر جا کر کھانا کھانے کا ناٹک کر کے چپکے سے سرک لوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ روٹی سالن چپکے سے میں نے فریج میں رکھ دیا اور جھوٹ موٹ کھانے کی تعریف کر چادر میں دبک کر سو گئی۔ کچھ ساعتیں گزری ہوں گی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ صحن میں چہل قدمی کرنے کا سوچ لیا۔ عجیب تجرایت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ''آج باہر سے پکا کھا آئے ہو تو تجرایت تو ہوگی'' امی کی شرارت بھری آواز آئی۔ میں مسکرا دی۔ تمہیں کیا لگتا ہے بیٹا اگر کبھی بہو بیٹی کہیں اپنے میکے، خالہ یا کسی کے گھر چلی جائے تو کیا چیز تمہیں اس کی طرف کھینچ لے جائے گی۔ محبت؟ میں نے کہا۔ ارے محبت نہیں، محبت تو سب سے پہلے صبر کرنا سکھاتی ہے۔ امی بولیں۔ یہ جو ساتھ رہنے کی عادت ہے نا بیٹا؟ اک دوسرے کے گھر کے کپڑے دیکھ کر کڑھنے کی عادت۔ ٹی وی دیکھنے اور اسی کے نمبر پر اختلاف کی عادت، شام کی چائے ساتھ پینے کی عادت، یہ کمبخت عادت کہیں چین نہیں لینے دیتی۔ یہ جو تمہیں روز ٹماٹر کا ذائقہ چکھنے کی عادت ہو گئی ہے نا۔ یہ تمہیں آج صحن میں چہل قدمی پر مجبور کر رہی ہے۔ کبھی کبھی ان عادت اور محبت میں فرق تلاش کرنا ممکن نہیں رہتا۔ میں اٹھ کر آنگن میں موجود ٹماٹر کا گملا سنوارنے لگی۔

امیر خان اور بخت کور

اقبال فیروز

مختصر تعارف

اقبال فیروز کا تعلق چکوال کے متوسط گھرانے سے ہے۔ افسانہ نگاری میں ایک مخصوص طرزِ تحریر اور اچھوتے پن کے باعث ادبی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے افسانے اردو کے کئی میگزین میں شائع ہو چکے ہیں۔ 2014ء میں جنگ عظیم اول کے پس منظر میں ان کا لکھا ہوا ناول ''پس ساحل'' بہت مقبول ہوا تھا۔ چکوال میں امپورٹ اور ایکسپورٹ کے کاروبار سے منسلک ہیں آج کل ایک دوسرے ناول کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو جنگ عظیم دوم کے پس منظر میں لکھا جا رہا ہے۔

ہوش سنبھالا تو میرے گاؤں کے عین درمیان وہ کھلی جگہ پکی مٹی سے بنے ہوئے بے ہنگم اور پراسرار سے گھر نما کھنڈرات مجھے کچھ سوچنے پر مجبور تو کرتے رہتے تھے لیکن یہ معصوم سی سوچ جہاں سے جنم لیتی وہیں پہ ختم ہو جاتی ہم اتنا ہی جانتے تھے کہ یہ کھنڈرات چھپن چھپائی کھیلنے کے لیے گاؤں کی سب سے موزوں جگہ تھی ہم گھر والوں کی نظروں سے اوجھل چھپ چھپا کر کئی کئی گھنٹے یہاں گولیاں کھیلتے لیکن رات کے وقت منظر بدل جاتا اور ہمارے بڑے ان کھنڈرات کے سامنے سے گزرنے سے منع کرتے ویسے بھی یہ الگ تھلگ کھنڈرات اندھیرے میں جنوں اور بھوتوں کے مسکن دکھائی دیتے تھے ہم نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ کھنڈرات یہاں کس نے بنائے تھے یہاں کون رہتا تھا اس کی چھتیں اور دروازے کون اکھیڑ کر لے گیا تھا لیکن جوں جوں ہمارے شعور نے سر اٹھانا شروع کیا ان کھنڈرات سے جڑی ہوئی داستانیں ہمارے کانوں میں پڑنا شروع ہو گئی کسی کے پاس کہانی کا سر ہوتا اور کسی کے پاس دم اور کوئی کہانی کو دھاگے کی طرح شروع سے پکڑتا اور درمیان میں لے جا کر چھوڑ دیتا کوئی سینئر لڑکا ادھوری باتوں کو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ہمیں سنا کر اپنے کپڑے جھاڑ کر نکل جاتا اور جب ہم نے جوانی کی سرحد پہ پاؤں رکھا تو یہ چھوٹی چھوٹی سی کہانیاں ایک دوسرے سے میل کھاتیں ایک لڑی میں جڑتی گئیں اور مکمل داستانیں بن کر ہمارے سامنے آ گئیں۔ یہ ہندوؤں کی ایک بستی تھی جو پاکستان بننے کے بعد ہندوستان چلے گئے تھے یہاں تیس کے قریب گارے اور پتھروں سے بنے گھر تھے جو اس طرح آپس میں جڑے ہوئے تھے کہ کوئی فرد اپنے گھر سے نکل کر کسی بھی دوسرے صحن کے ہاں آسانی سے پہنچ جاتا یہ لوگ بہت غریب تھے مسلمان زمینداروں کے گھروں میں کام کرتے دوسروں کی بھیڑ بکریاں چراتے شادی بیاہ پہ جھگڑے ڈالتے اور جب پکنے پہ آتیں تو ان کی حفاظت بھی کرتے اور کٹائی میں ہاتھ بٹاتے انہیں گھروں سے تھوڑا ہٹ کر ایک سکھ دلیر سنگھ کا گھر بھی تھا جس کی کریانے کی دوکان تھی وہ ہندوؤں اور بہت سے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال بھی تھا اس کی ایک ہی لڑکی بخت کور تھی جو ہندوؤں کی دبلی دھانی سوکھی کمزور اور سرمئی رنگوں کی لڑکیوں کی نسبت زیادہ صحت مند اور خوش رنگ تھی اس کی ابھرتی بھرتی جوانی کو دیکھنے والا کون تھا۔ گاؤں کے گھروں کو جوان لڑکے تو جوں ہی سر اٹھاتے انگریز سرکار انہیں اپنی آغوش محبت میں لے کر کہیں دور

دوستوں اور جاپانیوں سے کبڈی کھیلنے کے لیے چیلنج دیتی گاؤں کی گلیاں نوجوانوں کے وجود کے لیے ترستی تھیں لیکن امیر علی عرف میرا سارا دن ان گلیوں کی رونق بنا رہتا وہ بظاہر تندرست اور ذہین دکھائی دیتا لیکن گاؤں کے لوگ اسے بدھو بے عقل اور نکھٹو سمجھتے تھے وہ مائی نوراں کے گھر پیدا نہیں ہوا تھا لیکن اس کی پرورش اسی نے کی تھی وہ اسے کہاں سے لائی تھی کسی کو علم نہیں تھا اس کا باپ کوئی ہندو تھا مسلمان تھا یا سکھ وہ کس کی اولاد تھا اس بارے میں نوراں نے کبھی بھی پردہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی پھر بھی گاؤں کے لوگ اسے اسی کا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے نوراں کے دو اور بیٹے بھی تھے جو فوج میں ملازم تھے ایک بیٹی تھی جس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی نوراں نے امیر اور دوسرے بچوں کی پرورش میں نمایاں فرق رکھا ہوا تھا وہ نہ تو اپنے بھائیوں جیسے کپڑے پہنتا تھا اور نہ وہ لوگ اسے اپنے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونے دیتے تھے بہت چھوٹا تھا تو ایک لمبی سی قمیض میں کئی کئی دن گزار دیتا تھا سارا دن گلیوں میں آوارگی کرتا رہتا اس کا باپ تو دور نوراں اسے شدت سے پیٹتا رہتا بعض اوقات تو اس کی جان بخشی کے لیے محلے والوں کو مداخلت کرنی پڑتی نہ صرف یہ بلکہ اکثر گاؤں والے بھی کسی چھوٹی سی غلطی پر اس پہ اپنے ہاتھ صاف کر لیتے تھے۔ میرا جوان تھا اور اس قدر پست حالت میں زندگی گزارنے کے باوجود اپنے اندر جذبات اور احساس کی تپش رکھتا تھا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ امیر کے سینے میں بھی کوئی ایسی چیز ہے جسے دل کہتے ہیں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے اندر لگی ہوئی آگ اسے گاؤں کی گلیوں میں گھومنے پہ مجبور کرتی تھی یا یہ اس کا دیوانہ لاابالی پن تھا۔ گھر میں اس کی ہمدرد صرف اس کی بہن کنیز فاطمہ تھی جو اس کے گندے کپڑے دھو دیتی بھوسے والے کمرے میں اس کی بچھی ہوئی چارپائی سے دھول مٹی جھاڑ دیتی اور کبھی کبھار اسے گھر میں پکی ہوئی کوئی اچھی چیز کھانے کو دے دیتی گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس کا بھی سرور دین کے گھر آنا جانا تھا جنت کور سے اس کی دوستی تھی ایک دن اسے احساس ہوا کہ جنت کور اس سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے مگر الفاظ اس کی زبان تک آتے آتے دم توڑ دیتے ہیں۔ کنیز نے اس کی الجھن کو بھانپ لیا لیکن اس کے دل میں کیا تھا اس کا راز جنت کور کو ہی پتہ تھا۔ کور یہ تم کیا کہنا چاہتی ہو میں تمہاری بات سنوں گی وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی۔ اگر امیر کو عام انسان کی زندگی میسر آ جائے تو وہ کیسا لگے گا۔ جنت کور آنکھیں جھکا کر دھیرے سے مسکرا دی۔ ''وہ تو جیسا ہے بس ویسا ہی ہے اس نے اپنے آپ کو کیسے بدلنا ہے'' کنیز نے لاپروائی سے جنت کی طرف دیکھا جو کچھ سوچتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ ''امیر ایک اچھا لڑکا ہے وہ مجھے بہت پسند ہے'' کور نے کنیز کے قریب آ کر سرگوشی میں بات کی اور پھر زور سے ہنس دی۔ کنیز کے لیے یہ ایک انوکھی بات تھی کور اس سے مذاق ہی تو کر رہی تھی۔ اسی لمحے گلی میں سے کوئی گزرا آدھ کھلے دروازے سے اس کی جھلک دکھائی دی اور جنت کور کی آنکھیں اس طرح دروازے پہ جم گئیں جیسے وہ اسے کوئی خاموش پیغام دے گیا ہو اور وہ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو وہ اسی انداز سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی گزرنے والا واپس مڑا لمحہ بھر کے لیے دروازے کے سامنے رکا اور آگے بڑھ گیا۔ کون تھا'' کنیز نے حیرت زدہ سے لہجے میں کور سے پوچھا ''یہ امیر تھا دن میں چار دفعہ ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتا ہے'' کور کے منہ سے یہ الفاظ اتنی تیزی سے نکلے کہ کنیز کو اپنی سماعت پر شک ہونے لگا۔ ''لیکن وہ تو دن میں کتنے گھروں کے دروازوں کے سامنے سے گزرتا ہے پاگل ہے ناں'' ''کون کہتا ہے وہ پاگل ہے وہ ایک عام نوجوان سے زیادہ عقلمند ہے افسوس گاؤں والے اسے سمجھے ہی نہیں اور کنیز تمہارے گھر والے بھی نہیں'' ''مجھے تمہاری باتیں سمجھ نہیں آ رہی ہیں کور میں یہ کیا سن رہی ہوں''

''تم سمجھو گی بھی نہیں'' کچھ اور سننا چاہتی ہو سنو امیر مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے بھی اس سے محبت ہے وہ خاموش ہو گئی اس کے بجھے سانولے چہرے پہ سرخ رنگ کی لکیریں ابھر رہی تھیں اس نے چند لمحوں کے لیے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھر دھیرے سے مسکرا

دی۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو کور اور میں کیا سن رہی ہوں امیر بھی کبھی کسی سے ''محبت کر سکتا ہے اور تم امیر کو جانتی ہو؟ میرے اللہ میں یہ کیا سن رہی ہوں'' کنیز کے ذہن میں لمحہ بھر کے لیے ایک آندھی سی چلی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اب بھی اسے یقین ہو کہ کور تھوڑی دیر کے بعد اس کے سر کو جھنجھوڑ کر کہے گی کنیز کیوں پریشان ہوگئی ہو میں تو تمہارے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔'' اسے بھی اپنے بھائیوں کے درمیان کھڑا کر کے دیکھنا وہ ان سے زیادہ گورا اور خوبصورت ہے'' کنیز اسے دیکھتی اس کی باتوں کو تکتی رہی ایک پتھر کے بت کی طرح اس کے چہرے کے تاثرات جیسے اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے کور بولتی چلی گئی ''تمہیں معلوم نہیں ہے میں رات کو اپنے گھر کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر اس سے باتیں کرتی ہوں وہ ایک معصوم، بے ضرر اور سادہ سا انسان ہے اس کی باتوں میں صرف سچ ہے اسے نفرت کا علم نہیں ہے وہ بولتا ہے تو اس کے اندر سے ایک درد ایک دکھ اور ایک حسرت دستک دیتی ہے اور یہی مجھے پسند ہے اگر میرے راستے میں دین دھرم کی دیواریں نہ کھڑی ہوتیں تو میں باپو کے پاؤں پکڑ کر اس سے شادی کر لیتی لیکن ـــــ '' وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی کنیز کے دروازے کو گھورنے لگی ''میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں کور میرے پاس تمہاری باتوں کا کوئی جواب نہیں ہے میں تمہاری باتیں سن تو سکتی ہوں مگر ان کا جواب کیا ہے مجھے کچھ پتہ نہیں چلو چپ کر جاؤ زندگی ایسے کھیل ہر ایک سے کھیلتی ہے۔ پاکستان بن چکا تھا پنجاب میں لوگوں کے گھر جل رہے تھے قتل و غارت کا بازار گرم تھا کسی نے افواہ اڑا دی کہ ماجھے کے سکھ علاقے میں تباہی مچاتے ہوئے گاؤں کی طرف آ رہے ہیں اور دوسری طرف ہندوؤں اور سکھوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا کہ مسلمانوں کا ایک مخصوص گروہ انہیں سبق سکھانے کے لیے جلد ہی گاؤں میں داخل ہو جائے گا۔ کنیز چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ قریبی نالے پہ کپڑے دھو رہی تھی ایک بزرگ نے وہاں سے گزرتے ہوئے اسے سختی سے گھر جانے کی تاکید کی ''لڑکیوں تمہیں کچھ خبر ہے ماجھے کے سکھ مسلمانوں کی نوجوان لڑکیوں کو اٹھا اٹھا کر لے جا رہے ہیں وہ جوان مردوں اور بچوں کو قتل کر رہے ہیں کسی وقت بھی گاؤں میں داخل ہو سکتے ہیں فوراً گھر پہنچو'' کنیز ادھے دھلے اور ادھے میلے کپڑے اٹھا کر گھر کی طرف بھاگی تو راستے میں ہندوؤں کی بستی میں افراتفری مچی ہوئی تھی عورتیں بچے اور نوجوان لڑکیاں گھروں سے باہر کھڑی چیخ و پکار کر رہی تھیں کنیز نے دیکھا کہ بخت کور اس کی ماں اور باپو اپنے مکان سے باہر سرکنڈوں سے بنے ہوئے چھپر میں سہمے ہوئے کھڑے تھے بخت کی بغل میں کپڑوں کی گٹھڑی تھی اور اس کا باپو دلیر سنگھ سر پہ کوئی سامان اٹھائے ایک ایک کے چہرے کو دیکھ رہا تھا یہاں کچھ گاؤں کی عورتیں اور مرد بھی موجود تھے کنیز نے دیکھا کہ بخت کور کے عین سامنے دوسری جانب امیر بھی کھڑا تھا کہیں سے آواز آئی بلوائی گاؤں میں پہنچ چکے ہیں اور پھر یہ لوگ ایک دوسرے کی پرواہ کیے بغیر ایک خاص سمت کو دوڑتے چلے جا رہے تھے ان کے پیچھے اگست کی تیز دھوپ میں ننگے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے کنیز نے دیکھا ان لوگوں کے ساتھ امیر بھی بھاگا جا رہا تھا ''امیر رک جاؤ واپس آ جاؤ'' اس نے پورے زور سے چلا کر اسے آواز دی اور سر پہ رکھی ہوئی کپڑوں کی گٹھڑی پھینک کر اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگی فاصلہ بڑھتا رہا اور وہ لوگ مکئی اور باجرے کے کھیتوں سے گزرتے ہوئے دور مٹی کے بلند ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئے اور جب کنیز واپس لوٹی تو لوگوں کا ہجوم وہاں سے جا چکا تھا اور ہندوؤں کی بستی کے ارد گرد ویرانے منڈلا رہے تھے مجھے جب یہ کہانی کنیز نے سنائی تھی اس وقت پاکستان کو بنے چالیس سال ہو چکے تھے اور اس کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر تھی۔ ''تو کیا امیر واپس آ گیا تھا؟'' میرا اس سے یہ آخری سوال تھا ''بھاگنے والوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ان کے ساتھ کیا ہوا لیکن امیر'' آج تک واپس نہیں آیا میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ انہیں دوپٹے کے اندر جذب کر رہی تھی۔

◆◆◆

کشت زار محبت

نورین عامر

مختصر تعارف

باقاعدہ لکھنے کا آغاز 1985ء میں اطفال ادب سے کیا۔ 2023ء میں دو ناول کتابی صورت میں شائع ہوئے جن میں سے ایک ادب اطفال اور دوسرا فکشن پر ہے۔ اس کے علاوہ کئی رسائل اور جرائد میں لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

بیزار کر دینے والے حبس سے تنگ آ کر کروٹوں پر کروٹیں بدلتا ہوا مقصود بالآخر اپنے پلنگ پر اٹھ بیٹھا۔ گرمی اور حبس نے اس کا کرتا پسینے سے بھگو رکھا تھا۔ اس نے کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ فضا میں اداس سا سناٹا تھا جو دل کو کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ رات کے اس پہر مقصود کو اداسی ڈنک بے کلی کھائے جا رہی تھی جیسے کسی نے بستر کی سلوٹوں میں کانٹے پرو رکھے ہوں۔ کسی کروٹ چین ہی آتا تھا نہیں۔ بے کلی تو تھی جو اسے اپنے آسائشوں سے بھرے گھر سے صادق آباد تک لے آئی تھی لیکن مجال ہے جو کم ہوئی ہو۔ آج صادق آباد میں اس کا دوسرا دن گزر گیا تھا لیکن بے کلی اور حالات کا ازالہ زیادہ ہو گئی تھی۔ دراصل یہ گرمی اور حبس کا اثر نہ تھا بات کچھ اور تھی جو بدلی کی اوٹ میں چھپے چاند کی طرح موجود تو تھی لیکن نظر سے اوجھل تھی۔ وہ جتنا سوچتا بات کسی چھوٹے بچے کی ٹھوکر کی گیند کی مانند اچھلتی ہوئی کہیں سے کہیں نکل جاتی اور اس کا پیچھا کرتے ہوئے کئی غیر متعلقہ خیالات ذہن کے پردے پر یوں حملہ آور ہو جاتے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گیند کا پیچھا کرنا بھول کر لایعنی خیالات کے پیچھے چلنا شروع کر دیتا۔ بستر سے نکل کر کچھ دیر تک وہ اپنی بے کلی کو گلے لگائے بالکونی کی دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ اسی دوران اس کی نگاہ جھکتے ہوئے کالے پکی اینٹوں والے صحن کے بیچوں بیچ پھولوں سے لدے پپیا کے گلابی درخت پر جا ٹھہری جس پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ درخت پر نظریں جمائے بے خود سا چوبی زینہ پھلانگتا ہوا نیچے اتر آیا اور درخت کو تکتے تکتے اس کے ساتھ بچھے نواڑی پلنگ پر منتشر سے انداز میں لیٹ گیا۔

بس پھر کیا تھا اس کے لیٹتے ہی پپیا کی خوشبوؤں کے جھونکوں سے جیسے نواڑی پلنگ کوئی اڑن کھٹولا سا بن گیا اور مقصود کو خیالوں کے دوش پر اڑاتے پھراتے اس کے عہد جوانی میں لے گیا جو کم سے کم بھی اس کی موجودہ عمر کے حساب سے چالیس سال پرانا دور تھا جب مقصود مقصود تھا بلکہ ایک ایسا آنکھوں کا تارا تھا جو لوگوں کی آنکھ پا رہی سے ہر ایک کی توجہ حاصل کر کے اپنی گہری چپ سادھ لیتا تھا جیسے رنگین شراروں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو اور پھر وہ رستے میں سرائے والے مارے تجسس کے قریب آ کر کسی آرٹ گیلری میں لگے نایاب فن پارے کی طرح مقصود کا معائنہ کرنے لگتے جو ان معائنہ کرنے والے باریک بینوں کو اپنے مجموعہ مفاہیم تک رسائی دینے میں ہرگز تامل نہ کرتا لیکن دلبرانہ سی بے نیازی اوڑھے اپنی کئی جہات سے تعارف کا راستہ ہموار کر کے انجان بن جایا کرتا اور جب تک تعلق کی ڈور ہاتھ چلتی رہتی وہ ظاہری بے نیازی سے سامنے والے کو زچ کیے رکھتا۔ کوئی اس کی گفتگو کے ذریعے اس کے قریب ہونا چاہتا تو وہ منطقی رنگ میں ایک آدھ جملہ اچھال کر وضاحت دیے بغیر الگ جا کھڑا ہوتا اور جملے کو اپنے مطلب کے معنی پہنانے والوں کا ہجوم نکاح کے چھوہارے لوٹنے کے سے

انداز میں ٹوٹ پڑتا خوب چھین جھپٹ ہوتی اور منصور دور بیٹھا بیزار رہتا قریب نہ پھٹکتا یہاں تک کہ جب کوئی ظاہر بین اس کے لیے چھوڑے قد کاٹھ اور چہروں کی مضبوط ہڈی پر اپنا دل ہار کر قریب آنے کے بجائے دھتکارتی تو وہ اپنی فطرت کے مطابق جاتے ہوئے بیگانہ وار اس سے دور ہونا شروع کر دیتا لیکن بالکل غائب بھی نہ ہوتا بلکہ انجان رہ کر اسے اپنے اوپر غور و فکر کا بھرپور موقع دیا کرتا لیکن جب کوئی دوشیزہ اس کی بیگانگی سے بد دل ہو کر اپنی توجہ کا آنچل منصور پر سے سمیٹنے لگتی تو وہ کالے کوس بھری بھاری بن کر اس آنچل کو ایسے الجھاتا کہ آنچل کے توسط سے آنچل والی بھی الجھ کر رہ جاتی اور یوں منصور کی مقناطیسیت سے فرار ممکن نہ ہوتا۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ کئی رنگین آنچلوں کو اپنے آپ میں الجھائے بھرا بھرا کھڑا تھا راضیہ کالج کی چھٹیوں میں اپنی پھپھو کے ساتھ صادق آباد کے ریلوے اسٹیشن پر اتری۔ اس کی چمپئی رنگت دیکھ کر بظاہر اتفاق سے کھڑے منصور کے اندر خطرے کے کئی سائرن بیک وقت بجنے شروع ہو گئے۔ راضیہ کی سنہری رنگت اس کو اپنے سانولے سراپے کے سامنے یوں لگی جیسے طلوع آفتاب کی اولین کرنیں آسمان کے اندھیروں کو چیرتی چلی آ رہی ہوں اور اندھیرے کا وجود گھلتے گھلتے بالکل ہی مٹ جائے۔ منصور چمپئی رنگت والی راضیہ کی سنہری چکاچوند کے مقابل اپنا آپ کھو بیٹھا لیکن اس کی انا کے انگار میں ابھی کچھ چنگاریاں باقی تھیں جن سے انا کا فتیلہ سلگ گیا اور منصور کے اندر کا آتش فشاں انا بھڑک اٹھا اس بار رنگین شراروں کی آتش باری بھی اس قدر شدت سے ہوئی کہ پلیٹ فارم پر کھڑی چمپئی رنگت والی راضیہ کا چہرہ بھی انگاری ہو گیا۔ اس زندگی کی شاہراہ پر یہ پہلا تصادم تھا جس نے منصور کی انا میں ایک ساتھ کئی دراڑیں ڈال دیں۔ منصور کو چمپئی رنگت والی کے ایک ہی جلوے نے جلا کر بھسم کر دیا تھا اس تجربے نے اس کی انا کے چہرے سرنگوں کر دیے تھے اس پسپائی کے بعد وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھا لہٰذا کئی دن تک بجھا بجھا سا پھرتا رہا اور نہ معلوم کب تک پھرتا رہتا اگر ایک روز چلچلاتی دوپہر میں اس کی راضیہ کے ساتھ مڈبھیڑ نہ ہو جاتی۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لئے کالج کے رجسٹر کا پنکھا بنائے اپنی ہی دھن میں صحن میں داخل ہوا اور فرش دھوتی ہوئی راضیہ کے ہاتھ میں پکڑے پانی کے پائپ کی ایک ہی بوچھاڑ سے شرابور ہو گیا۔ راضیہ نے گھبرا کر پائپ وہیں پھینکا اور الٹے پیروں بھاگنے کے لئے قدم اٹھاتے ہی دھڑام سے گیلے فرش پر پھسل گئی۔ ایک جانب کھڑا منصور بھیگے کوے کی طرح پانی سے نچڑ رہا تھا اور دوسری جانب فرش پر کہنیوں کے بل پڑی راضیہ کے کپڑوں کو پائپ سے نکلنے والا پانی تر بتر کر رہا تھا۔ یوں حساب برابر ہوتے دیکھ کر پہلے منصور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تو اس کی دیکھا دیکھی جاندار قہقہے میں لڑکی کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔ اس طرح منصور کے بھسم شدہ وجود کو راضیہ نام کی چنگاری نے ایک بار پھر بھڑکا دیا لیکن اس بار معاملہ سابقہ حالات کے برعکس بھی تھا اور کسی حد تک سنگین بھی تھا۔ راضیہ اپنے نام کی مناسبت سے عکس راضیہ کی جملہ صفات سے آراستہ و پیراستہ اپنے تمام حالات و واقعات پر راضی برضا صابر و شاکر عبادت گزار اور قناعت پسند لڑکی تھی جس کو اپنے حسن و جمال کا چنداں احساس نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے! راضیہ جیسی یتیم و یسیر لڑکیوں کے حصے میں آنے والی توجہ محض ہتھیلی میں لگی مہندی جتنی ہی ہوتی ہے جس پر وہ شکرانے کے احساس تلے دبی رہتی ہیں۔ مگر یہاں اس کے مدمقابل منصور تھا جس کی توجہ کا مرکز اب صرف اور صرف راضیہ تھی۔ وہ تمام دن کسی نہ کسی بہانے سے اس کے ارد گرد چکر لگاتا رہتا یا اس کو اپنے کاموں کے بہانے آوازیں دے دے کر بلاتے رکھتا۔ کبھی منصور کا تولیہ اچانک الگنی پر لٹکے لٹکے گیلا ہو جاتا تو کبھی اچھی بھلی گرم چائے انتہائی ٹھنڈی ٹھار ہو جاتی گویا فریج سے نکالی ہو اور وہ چچ چچ کر کے پانی ہاتھ میں لئے باورچی خانے میں آ جاتا۔ کبھی بے داغ کرتے پر سیاہی کا دھبہ پڑ جاتا۔ منصور کو وہ مرمریں مورتی سی لگتی جس کے قدموں میں صرف اور صرف چمپا کے پھول نچھاور کیے جانے کے لائق ہوتے اور اس کا اپنا دل بھی مورتی کے قدموں میں چمپا کے پھول نچھاور کرنے کو بے اختیار ہونے لگتا۔ چمپا کے پھول۔۔۔۔ اور ان کا ایک جھٹکے سے ذہن چوں ہو گیا۔ تو لاڈی پلنگ پر

جنگلی چمپا کی شاخیں اس کو راضیہ کے پھیلے ہوئے بازو لگیں جو اس کو اپنی جانب بلا رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں وہ دن پھر گیا جب وہ منصور کے لئے پیالی میں چائے انڈیل رہی تھی اور پیچھے کھڑے منصور کی توجہ اس کی بل کھاتی ہوئی چوٹی پر تھی۔ "کبھی سوچا ہے تمہارے بالوں میں چمپا کے پھول کتنے سجیں گے؟ میرا بس چلے تو چوٹی کے ہر بل میں ایک ایک پھول پرو دوں۔" اس غیر متوقع بات پر راضیہ کا ہاتھ کانپا اور گرم چائے چھلک کر اس کی انگلیوں جھلسا گئی۔ سی کی آواز سنتے ہی منصور کے تصور خیالات کی دنیا مسمار ہو گئی۔ "کیا ہوا؟" وہ گھبرا کر آگے بڑھا۔ "کک کچھ نہیں۔۔۔ بے دھیانی میں ذرا سی چائے چھلک گئی۔" منصور نے دیکھا اس کی انگلیوں کی کھال سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ راضیہ کا ہاتھ پکڑ کر نل کے نیچے کر دیا۔ "دھیان سے کام کیا کرو۔" وہ عجیب سی الجھن لیے اس کا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔ راضیہ نے کب کسی کو اپنے لئے اتنا فکر مند دیکھا تھا وہ خاموشی سے شرر شرر بہتے پانی پر نظریں جمائے آنکھوں میں امڈنے والے آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے بعد کئی دن خاموشی سے گزر گئے نہ منصور نے کسی آنے بہانے سے واویلا کیا اور نہ ہی راضیہ نے اوپر کی منزل پر اس کے کمرے کی جانب رخ کیا لیکن دونوں ہی جانتے تھے کہ اس ظاہری بیگانگی میں کتنی شدید چاہت چھپ رہی ہے۔

ایک سہ پہر پھپھو کی معترض آواز پر امتحان کی تیاری کرتے منصور کے کان کھڑے ہو گئے۔ "ارے راضیہ یہ کیا الٹا لائی ہے؟ ہم نے کون سا یہاں ہمیشہ رہنا ہے جو اس کا خیال رکھیں گے؟" منصور نے دیکھا وہ چھوٹی سی گٹھڑی کے ساتھ صحن کی زمین میں کوئی پودا لگا رہی ہے اور پھپھو کمر پر ہاتھ رکھے ان دونوں کو گھور رہی ہیں۔ وہ ہوا کی رفتار سے سیڑھیاں پھلانگتا نیچے پہنچ گیا۔ "ہائیں دیکھو تو کتنا اچھا پودا ڈھونڈ کر لائی ہے۔" اس نے پودے کے اردگرد کی مٹی کو اپنی لمبی پتلی انگلیوں سے برابر کیا۔ "ایک بالشت کے پودے کی خاطر تو نے صحن کھود ڈالا اور کل کو جب بھائی جان فرش پکا کرائیں گے تو سب سے پہلے تیرا پودا اکھاڑ پھینکیں گے۔" پھپھو کی سنگدلی پر راضیہ نے دکھ کر انہیں دیکھا تو بے ساختہ اس کی نگاہیں ساتھ کھڑے منصور کی سوالیہ نظروں سے الجھ گئیں۔ خاموش نگاہوں کے جوابوں میں اکثر بڑے معاہدے طے پا جاتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ منصور کی تسلی آمیز نگاہیں راضیہ کی ڈھارس بنیں تو اس نے خاموشی سے بکھری ہوئی مٹی کے ساتھ اپنا دکھ بھی سمیٹ لیا اور پھپھو کو وہیں چھوڑ خالی تغاری اٹھا کر وہاں سے چلی گئی۔

دونوں ہی بڑی جانفشانی اور توجہ سے چمپا کا پودا سینچنے میں مگن تھے۔ منصور جب اپنے کمرے سے اتر کر صحن جاتا تو چمپا کے قریب موڑھا ڈال لیتا تو کبھی اس کی گوڈی کرنے لگتا اور کبھی اس کا ایک ایک پتا چمکاتے ہوئے صحن میں چلتی پھرتی راضیہ کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا جو خود کو بظاہر مصروف رکھتے ہوئے مکمل دھیان منصور پر ہی رکھتی تھی۔ "راضیہ جب میں پڑھنے کے لئے باہر چلا جاؤں گا تو وعدہ کرو تم مجھے پابندی سے خط لکھا کرو گی اور خط میں مجھے چمپا کے پھول لپیٹ کر بھیجو گی؟" ایک دن تنہائی ملتے ہی منصور نے اس کا آنچل تھام لیا۔ "منصور اگر اس وقت تک میں یہاں ٹھہری رہی تو مرتے دم تک وعدہ پورا کروں گی لیکن سوچتی ہوں اگر اماں واپس چلا پڑا تو اس پودے کو کون سنبھالے گا۔۔۔ یہ فکر مجھے رات دن کھائے جاتی ہے۔" اداس لمحے راضیہ کی کشادہ پیشانی پر کنڈلی مارے بیٹھ جاتے تو منصور کے دل کو پچھتاوے سے لگ جاتے وہ وقت بدلنے کی غرض سے کہتا "ارے اس بات کو تو بھول ہی جاؤ نہ کبھی تمہارے گھر کا فیصلہ ہو گا نہ ابو کی پھپھو کو واپس در بدر ہونے کے لئے واپس بھیجیں گے۔ تقدیر نے ہمارے لئے کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔" اس وقت تو راضیہ کو منصور کی میٹھی باتوں کی چاشنی جادو کی اڑان کھولے پر اڑائے پھرتی جس پر چمپا کا چھتنار درخت سایہ فگن رہتا لیکن جب بہت ہی جلد حقیقت کی کڑوی گولی راضیہ کے حلق میں اٹک کر جادو کی محبت کا تخت الٹ گئی تو راضیہ کے لئے اپنے دکھوں کا واحد سہارا چمپا کا پودا بن گیا جس کے ہر حصے پر منصور کی محبت کا لمس تازہ تھا۔ اس

کالے لمس قرقت کے بتیس سالوں میں چمپا کے ساتھ بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن گیا اور جڑیں راضیہ کے وجود میں نسوں کا جال بن کر پھیل گئیں۔ پھر ان ملک مقصود کے پیروں پر معاش کی زنجیریں لپٹتی چلی گئیں اور کمر پر بال بچوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ آ پڑا۔ رہی سہی کسر اس کی جرمن نژاد بیوی نے نکال دی جس کی حکمرانی میں وہ مجازی خدا کے بجائے سرکس کے شیر کی سی زندگی گزار رہا تھا جس کا مقصد رنگ ماسٹر کے ہنٹر کی ایک ہی چوٹ سے ہوا ہو جاتا اور وہ جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک میں افسر ہوتے ہوئے بھی صادق آباد کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں بے مروت ہوتے ہوئے یقین کر پھرنے والا ستاسا مقصود بن کر رہ جاتا جس کی کالج کی نیلی قمیض کا رنگ کئی دھلائیوں کے باعث پھیکا پڑ چکا تھا۔ اپنے گزرے ہوئے کل کا ذکر کرنا اسے قطعی منظور نہ تھا لہٰذا پچھلے کئی برسوں سے اس کے اندر کے شیر نے پالتو کتے کی خصلت اپنا کر رنگ ماسٹر کے آگے دم ہلانا سیکھ لیا تھا۔ اب وہ راضیہ کا مقصود نہ رہا تھا بلکہ ایک کھلی ہوئی سوڈے کی بوتل تھا جو گیس نکل جانے سے ٹھس ہو چکی تھی۔ راضیہ کون تھی؟ کیا تھی؟ یہ باتیں دو دہائیوں پہلے صادق آباد کے دو منزلہ مکان کے کسی بوسیدہ چھجان میں اتر سی آیا تھا اور یہ راضیہ کے خطوط تو پرانا گھر چھوڑتے ہوئے ان کھلے لفافوں کا بنڈل ردی سامان بن میں ڈال آیا تھا۔ راضیہ اپنے نام کی مناسبت سے گویا راضیہ کی خصوصیات کا مجموعہ تھی۔ اس کی راتیں مقصود کی درازی عمر کے لیے نفل نمازیں پڑھتے گزرتیں اور دن اس کی صحت و تندرستی کے لیے وظائف کرتے گزرتے لیکن اس میں مقصود کی واپسی کی کوئی التجا نہ ہوتی۔ وہ چاہتی تھی مقصود جہاں رہے اس کی طرح راضی برضا رہے۔ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں بھی وہ ہر مہینے مقصود کے نام خط لکھ کر پھپھو کے حوالے کرنا نہ بھولتی تھی جو اپنے گھٹنوں کے درد سے اکڑی ہوئی ٹانگوں کو گھسیٹتی ہوئی ڈاک خانے جانے سے پہلے اسے نصیحت کرنا یاد رکھتی تھیں۔

"راضیہ میں تو کہتی ہوں اب مقصود کی راہ دیکھنا چھوڑ دے تو نے بھی نجانے کس بے حس سے امیدیں باندھی ہوئی ہیں؟" اس نے تو کبھی پلٹ کر کسی کی خبر ہی نہ لی اور تو ہے کہ آج تک یک طرفہ خط بھیجے سے نہیں تھکی۔ نہ کیا کر اس کا انتظار، یہ انتظار بھائی جان اور بھابھی کو گھن کی طرح کھا گیا۔ تو بھی نہ کر اپنے ساتھ ظلم۔۔۔ اس چھوڑ دے اب اس کو خط لکھنا، پڑھتی نہیں وہ بے حس پڑھتا بھی ہوگا یا نہیں۔" مقصود کی پھپھو اس کی ساری جمع پونجی دیکھ کر دکھی ہو جاتیں۔ "پھپھو امید تو مجھے اپنے اس بجری سے چلنے والے دل سے بھی کوئی نہیں رہی۔ میں تو بس اس سے کیا وعدہ نبھا رہی ہوں اور سچ کہوں تو اس نے مجھ سے وعدہ لیا ضرور تھا یہ نہیں کہا تھا کہ وہ خط کو پڑھے گا یا جوابی خط بھیجے گا۔ بس اب تم دیر نہ کرو کہیں ایسا نہ ہو ڈاک خانہ بند ہو جائے۔" راضیہ کی بات پر تاسف سے گردن ہلاتی مقصود کی پھپھو اپنے سوجے ہوئے پیر قینچی چپل میں پھنسا کر دروازے کی جانب بڑھ جاتی اور راضیہ چمپا کے درخت کے نیچے بچھے ہوئے نواڑی پلنگ پر آ بیٹھتی جیسے خط نے اس کا سارا حوصلہ پی ڈالا ہو۔ وہ درخت ہی اس کا واحد سہارا تھا جس نے اچھے برے حالات میں بھی راضیہ کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ پہلے پہل جب مقصود اپنی پڑھائی کی غرض سے باہر چلا گیا اور اس کی بھابھی کو ابھی مقصود اور راضیہ کے قصے کی خبر نہ ہوئی تھی بس کبھی کبھار کا شک ہی تھا تو وہ راضیہ کے دل کا محرم بن گیا۔ اس وقت سے لے کر مقصود کے ابا اس کی امی اور راضیہ کے بھائی کی یکے بعد دیگرے اموات میں بھی راضیہ کے دکھ درد کا ساتھی بنا رہا۔ دن کا بیشتر وقت اس کی چھتنار کے سائے میں گزرتی اس سے گلے شکوے کرتی ہنسی مذاق بھی کرتی اور جب وہ پھول دینے میں کمی کرتا تو کسی تھانیدارنی کی طرح تفتیش میں جت جاتی تو کبھی لاڈ میں آ کر اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنا کر کھڑی ہو جاتی۔ اب تک جتنے بھی خط اس نے مقصود کے نام لکھے چمپا کا درخت ان سب کا رازدار تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن راضیہ اپنے رب کی رضا سے راضی ہو کر اس جہان فانی سے گزر گئی تب بھی اس کی میت کو اسی درخت نے اپنی چھاؤں تلے رکھا۔ راضیہ نے جس خاموشی سے زندگی بسر کی اسی

خاموشی سے دنیا سے رخصت بھی ہو گئی لیکن مقصود کو کبھی بھول کر بھی وہ مرمریں صورت یاد نہ آئی جس کے قدموں میں چمپا کے پھول نچھاور کرنے کو اس کا دل بے اختیار ہوا کرتا تھا۔ "ارے مقصود کیا ساری رات یہیں کاٹ دی؟" مقصود جانے کب تک آنکھیں موندے تصورات کی حسین دنیا میں کھویا رہتا لیکن پھپھو کی آواز نے اس کو گھسیٹ کر حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ "گرمی اور حبس نے سونے نہیں دیا تو آ کر یہاں لیٹ گیا تھا۔ اس درخت کے قریب ایسی خنکی تھی کہ پتا نہیں کب بے خبری میں آنکھ لگ گئی۔" مقصود جھینپا ہوا سا اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے پھپھو اس کے تصورات کی عینی شاہد ہوں۔ "تم تو سدا کے بے خبر ہو۔ مقصود کبھی کسی کی خبر رکھی اور نہ کبھی اپنی خبر دی۔ میں نے سوچ لیا تھا اگر تم میرے مرنے تک نہ لوٹے تو مرتے وقت وصیت میں یہ گھر مسجد کے لئے بخش کر جاؤں گی لیکن تم کو خبر نہ دوں گی۔ میں کہتی ہوں اب کیا فائدہ جب ہماری زندگیوں کو تمہاری یاد کا گھن لگ گیا۔" عام سی بات کچھ سے کچھ ہو گئی اور سنبھالتے سنبھالتے بھی دکھ کا آرا پھپھو کا سینہ دولخت کرتا ہوا مقصود کے بے حس کلیجے کو چھو گیا۔ تکلیف ایسی شدت کی ہوئی کہ وہ بلبلا اٹھا اور مدتوں بعد اس کی بنجر آنکھوں میں نمی تیر گئی تو آنکھوں سے بے حسی کی گرد بہنے لگی جو نظر آیا تھا اس کو۔۔۔

وہ بچکانہ انداز میں اٹھا اور پھپھو کے سوجن زدہ پیر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "پھپھو مجھے معاف کر دو۔ جانتا ہوں میرا قصور اتنا چھوٹا نہیں کہ معافی مل سکے لیکن تمہارا دل تو بہت بڑا ہے ناں اپنے مقصود کو معاف کر دو۔" وہ پھپھو کے پیروں پر سر رکھ کر بلک پڑا۔ "مجھ سے معافی مانگ کر کیا ملے گا بے خبرے؟ تم نے تو مڑ کر اس کو بھی نہ دیکھا جس کو ارمانوں سے سینچا تھا۔ کبھی سوچا کہ اس کی ٹھنڈی چھاؤں تمہاری منتظر ہوگی؟ میں کہتی ہوں کیا اس کا اتنا حق بھی نہ تھا کہ محبت کی ایک آدھی نگاہ ہی اس کی جھولی میں ڈال جاتے؟ وہ تو۔۔۔ وہ بھی تو۔۔۔" اتنا کہہ کر پھپھو اپنے چہرے کو ململ کے دوپٹے سے ڈھانپ کر زاروقطار رو پڑیں۔ دریچی دالان میں گھٹن اس قدر بڑھ گئی کہ دونوں اٹھ بیٹھے ہوئے مقصود کے جسم کے تمام مساموں سے پانی کی مانند پسینہ بہہ نکلا۔ اسے اپنے سینے میں کوئی پھانس سی اٹکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو پھپھو شاید ظہر پڑھنے جا چکی تھیں۔ وہ بمشکل پلنگ کی پٹی پکڑ کر اٹھا اور اوپر لیٹ کر اپنی اکھڑتی ہوئی سانسیں بحال کرنے لگا۔ ایک بوجھ سا اس کے سینے پر دھرا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے چمپا لہرایا تو اس کے چہرے پر کئی پھول ٹوٹ کر گرے۔۔۔ وہ آنکھیں موندے پڑا ان کی خوشبو محسوس کرتا رہا۔ جب پگلی ہو رہی راضیہ نے چمپا کے پھول دھاگے میں پرو کر کلائیوں میں باندھے تھے وہ جب بھی تو ایسی ہی مہک بکھر رہی تھی۔ مقصود کی بند آنکھوں میں اس کی چمپئی رنگت والا چہرہ دمکنے لگا۔ وہ گھٹنوں پر کاپی رکھے کچھ لکھ رہی تھی اور اس کی بل کھاتی چوٹی کے کنڈل فرش پر پڑے تھے۔ مقصود اس کا تصور ٹوٹنے کے ڈر سے دم سادھے پڑا رہا یہاں تک کہ سورج کی کرنیں اس کے بند پپوٹوں پر دستک دینے لگیں۔ "اٹھو مقصود چلو کر تازہ دم ہو جاؤ نسیماں ناشتہ تیار کر کے لا رہی ہے۔" پھپھو کی آواز سن کر راضیہ نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ وہ مقصود کو آنکھوں کے اشارے سے روک رہی تھی اور دوسری جانب پھپھو دروازے سے سر نکالے اسے ہوا سمجھ کر آوازیں دے رہی تھیں۔ "آ رہا ہوں پھپھو۔" کہنے کو اس نے کہہ دیا مگر حقیقت میں وہ یہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

"مقصود صاحب دھوپ چڑھ گئی ہے اب اٹھ بھی جاؤ۔" پھپھو کی پیاری آواز پر وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ راضیہ کے سامنے سے نکلتے ہی عمر کے ساٹھ سال اس کی پیٹھ پر کسی بوجھ کی طرح لد گئے جیسے کہیں پیچھے کھڑے تھے اور اکہرے بدن والے مقصود کی اچانک توند نکل آئی۔ وہ جھکے کندھوں سے چلتا ہوا کمرے میں چلا آیا جہاں نسیماں تپائی پر چائے رکھ رہی تھی۔ اس نے غور سے نسیماں کے ہاتھوں کو دیکھا اور بے چینی سے دیکھتا ہی چلا گیا۔ راضیہ کے نازک انگلیوں والے ہاتھوں میں چائے کا کپ اور کلائی میں چمپا کا گجرا تھا۔ اس

نے گھبرا کر ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ "ہاں تو منصور مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" پھپھو اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کراہتی ہوئی کرسی پر آ بیٹھیں اور عین اسی وقت تیس برس سال کی دہلیز پر کھڑا منصور واپس پلٹنے پر مجبور ہو گیا۔ "آخر مجھے یہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے جھنجھلا کر اپنا چشمہ پونچھا۔

"کہیں پھپھو میں سن رہا ہوں۔" بیزاری سے کہتے ہوئے منصور نے تو الٹا کرسی سنبھال لی۔ "تمہاری ایک امانت ہے میرے پاس اول تو کہا تھا کہ اپنے پاس ہی رکھوں۔ کیا فائدہ اب گڑے مردے اکھاڑنے کا! لیکن پھر سوچا میرا حق نہیں بنتا کہ درمیان میں آؤں اور پھر لب گور بیٹھی ہوں نامعلوم کب بلاوا آ جائے کیا جواب دوں گی جا کر!" پھپھو کی لمبی تمہید نے منصور کو عجیب تصورات کی جھاڑ کے باہر ہی روک رکھا تھا۔ جزبز ہو کر اس نے سامان کی پلیٹ پیچھے سرکا دی اور کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "یہ تمہارے لئے ہے۔ گو وہ رہتا میں نے امانت تمہیں سونپ دی۔" انہوں نے چادر کی بکل سے نیلگوں لفافہ اس کے سامنے رکھا۔ منصور نے حیرت سے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایسے ہی نیلگوں لفافے اس کا تعاقب کرتے ہوئے جرمنی آیا کرتے تھے۔ "یہ کس نے دیا ہے؟" گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دبے پاؤں سرکتی ہوئی پھپھو نے جھک کر اسے دیکھا! "اسی نے جس کی تم نے کبھی خبر نہ لی۔" منصور کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہوا۔ اس نے جلدی سے لفافہ اٹھایا اور جھکتے ہوئے کندھوں سے چلتا ہوا صحن میں بچھے پلنگ پر آ گیا۔ اس کی نسوں میں خون کی روانی بڑھ گئی تھی اور دل میں امنگوں کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس خوشی میں اسکے ذہن سے یہ خیال ہی محو ہو گیا کہ راضیہ تو کب کی اپنی اولین چاہت کا ہاتھ تھامے رخصت ہو چکی ہے۔ تیس سالہ نوجوان منصور نے جوش جذبات سے کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کر کے پرچہ نکالا تو کئی سوکھے ہوئے پھول اس کی گود میں گر گئے۔ "میرے منصور! جب تمہیں یہ خط ملے گا میں اس کی رضا میں راضی ہو کر رخت سفر باندھ چکی ہوں گی۔ میرے معاملات کی گھڑی تو ہمیشہ سے ہی بندھی پڑی تھی بس ایک حکم کی دیر تھی سو وہ بھی آ ہی گیا۔ تم اس گھڑی میں بھی سامنے ہی نہیں اس لئے میں نے تمہیں بار بار سینچا کہ یہ میری دنیوی زندگی کا امتحان تھا اور خدا گواہ ہے کبھی غفلت نہیں برتی اسی سبب یہ جانتی ہوں کہ یہ تم کو اسی چھاؤں تک لے آئے گا جہاں بیٹھ کر میں نے تم کو دھیان کے پانی سے تر رکھا کبھی سوکھنے نہیں دیا۔ اب تم چچا کے پاس بیٹھ کر اس سے وہ ساری باتیں سننا جو میں تمہاری غیر موجودگی میں اس سے کرتی رہی ہوں۔ ہم دونوں نے کبھی تمہیں بوڑھا نہیں ہونے دیا ہمیشہ سرسبز رکھنے کی سعی کرتے رہے۔ ہمارے لیے تم ہمیشہ ہی صادق آباد کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑے رنگین شرارے بکھیرنے والے آتشیں انار ہی رہے جو ہر ایک کا مرکز نگاہ تھا اور میں واحد خوش نصیب صرف تمہاری توجہ کا مرکز تھی۔ اچھا منصور اب وقت رخصت ہے مجھے کسی کے حضور دست بستہ حاضری دینی ہے تم نے جو کلی عطا کی تھی وہ چچا کے درخت سے کر لینا میرے دل کے راز اس پر پھول بن کر کھلتے رہتے ہیں۔ اب یہ تمہارا اختیار رہے گا اور تمہیں بھی بوڑھا نہیں ہونے دے گا۔

دعا گو ——— تمہاری راضیہ

خط پڑھتے پڑھتے منصور کا نفس بکھر گیا۔ صبح سے دوپہر ہوئی اور پھر تیسرا پہر شروع ہونے کو آیا تو منصور کی پھپھو نے تشویش سے صحن میں قدم رکھا۔ منصور چہرے کو کاغذ سے ڈھانپے گرمی کی شدت سے بے نیاز وہیں لیٹا ہوا تھا۔ وہ دوسری طرف سے سرسراتی ہوئی اس کے قریب آ گئیں۔ "اٹھو منصور گرمی میں کیوں پڑے ہو؟" پھپھو نے جھک کر اس کا کندھا ہلایا تو اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ کاغذ چہرے سے پھسلتا ہوا کہیں دور جا گرا اور اس کی کھلی آنکھیں دیکھ کر پھپھو کی چیخ نکل گئی۔ پلنگ پر تیس سالہ منصور کی لاش پڑی تھی۔

◆◆◆

غزلیں

اسلم انصاری

O

اب تو کچھ اس کے سوا اور نہیں چاہتا ہے
دل تجھے خانۂ خاطر میں کہیں چاہتا ہے

در بدر خاک بسر پھرتے ہیں ارباب وفا
شاید ایسا ہی کوئی اور نہیں چاہتا ہے

ایک مبہم سا اشارہ بھی نہیں تھا اس کے
وہ تو اس طرح کا ملنا بھی نہیں چاہتا ہے

کون ہوگا جو تجھے دل سے نہ رکھے گا عزیز
کیا کوئی ہے جو تجھے دل سے نہیں چاہتا ہے

ہے ابھی جبر و محراب کا ذکر بہت
کوئی آئے نہ ادھر خاک دیں چاہتا ہے

آپ سے دور ہوا اس دل کی ذات سے دور
کوئی پوچھے کوئی ایسا بھی کہیں چاہتا ہے

دل ابھی ناز تمنا ہے عروس اس کا کرام
پھر پہ سیر و سفر ساری زمیں چاہتا ہے

OOO

سلیم کوثر

O

صبح تری بزم سے سوغات اٹھا کر لے آئے
ہم اکیلے ہی تجھے ساتھ اٹھا کر لے آئے

تجھ کو محفل میں بیٹھے تری زلفوں کے اسیر
دن کی سوغات میں رات اٹھا کر لے آئے

اب مجھے یاد نہیں تیری گلی کی جانب
کون چلا آیا کہ عادات اٹھا کر لے آئے

بند ان آنکھوں میں جب سے در کھلا ہوا
لوگ ذہنوں میں خرابات اٹھا کر لے آئے

میں نے پوچھا تھا کہو ارض و سما کیسے ہیں؟
کیا ہوا؟ آپ طبقات اٹھا کر لے آئے

نفع نقصان سے واقف ہی نہیں اہل جنوں
اور تم لوگ حسابات اٹھا کر لے آئے

پہلے افراد کو طبقات میں تقسیم کیا
اس پہ مجبوری مساوات اٹھا کر لے آئے

ختم کرنے کو جو آئے تھے روایتوں کا نظام
اپنے ہمراہ رسومات اٹھا کر لے آئے

کیسی بے حرمتی پانی کی پرندوں کی ہوئی
تم جو شہروں میں مضافات اٹھا کر لے آئے

صرف آواز کی خوشبو ہی نہیں لائے تھے ہم
خامشی کو بھی تیرے ہاتھ اٹھا کر لے آئے

تو نے جو بھی کہا مطلق ترے مان گئے
عقل والے تو سوالات اٹھا کر لے آئے

کوئی تو بات تھی ایسی کہ ترے پہلو سے
خود کو بھی ہم بسر اوقات اٹھا کر لے آئے

منتظر معجزۂ کن تھے اور اہل ہنر
اپنے تخلیق کرامات اٹھا کر لے آئے

کل ہی اس کی تہذیب نمائی میں سلیم
ہم بزرگوں کی روایات اٹھا کر لے آئے

(احمد ندیم میں غزل پہلے سے موجود ہے
میں نے تو پڑھی دوبارہ ہے)

OOO

محمود شام

○

اس طرح جلیہ کیا ہے راستے گم ہو گئے
ملک مٹی میں اٹا ہے راستے گم ہو گئے

گھر سے نکلے تو جواں تھی ترانے اوڑھ کر
حشر یوں برپا ہوا ہے راستے گم ہو گئے

شہر ہوں کہ دشت ہوں ایوان ہوں یا میکدے
محتسبوں کا غلغلہ ہے راستے گم ہو گئے

کیوں زمیں کی گردشیں بے سمت ہونے لگ گئیں
آسماں حیرت زدہ ہے راستے گم ہو گئے

بادہ کش ہیں یا تختِ لب ہیں وطن بکتے ہوئے
اپنا طاقت کا نشہ ہے راستے گم ہو گئے

اب تو سب صیاد ہی ہیں رہزنوں میں پاسباں
لوٹیوں پہ قبضہ ہے راستے گم ہو گئے

ہر آدمی سے آدمی ہے ساتھ سنگِ میل بھی
اپنا ہر قافلہ ہے راستے گم ہو گئے

مارکیٹوں میں ہیں بکھری دھجیاں تہذیب کی
جا بجا ناکا لگا ہے راستے گم ہو گئے

OOO

انور شعور

○

ہم کبھی ذات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی
یعنی اوقات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی

ذہن رکھتے ہیں رسا اہلِ ہوس بھی لیکن
کچھ خیالات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی

ہم رقیبوں کو بٹھاتے ہیں برابر اپنے
اور وہ گھات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی

شیخ صاحب ہمیں دیتے ہیں بڑے درس مگر
خود کرامات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی

جا چکے ہم سب مرے بعد بھی جام بکف
رند عادات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی

ذکرِ حالات ہم اوروں سے کریں یا نہ کریں
فکرِ حالات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی

کچھ نہیں دیکھتے خوابوں کے سوا آپ شعور
ان کو بھی رات سے اوپر نہیں اٹھتے اپنی

OOO

سحر انصاری

○

کہیں میرا نشاں تک بھی نہیں تھا
تو کیا میں رائیگاں تک بھی نہیں تھا

سنا کب کس نے حال میرا
میں شاید داستاں تک بھی نہیں تھا

میں ہوں اس وقت سے تو وقت جب
زمیں پہ آسماں تک بھی نہیں تھا

کوئی حرفِ تسلی ہی تو جاتا
یہ اک آہ و فغاں تک بھی نہیں تھا

کہاں پہنچے کہاں سے لوٹ آئے
قدم اپنا کہاں تک بھی نہیں تھا

محبت ہے مجھے اس سے سحر جب
محبت کا گماں تک بھی نہیں تھا

OOO

آصف ثاقب

○

وہی موسم سہانا آ گیا ہے
ہمیں کو آنا جانا آ گیا ہے

چلے جاتے ہیں ہم آگے ہی آگے
مگر آگے زمانہ آ گیا ہے

نہیں آیا تمہیں نخرے دکھانا
ہمیں آنکھیں ملانا آ گیا ہے

سکھاتے ہیں جدائی کے یہ لمحے
ہمیں آنسو بہانا آ گیا ہے

پرندوں کو پتہ کر واپس لوٹے
اب ان کا آشیانہ آ گیا ہے

کسی تیور نے زخمی کر دیا تھا
ہمیں بھی مسکرانا آ گیا ہے

قدم اٹھتے نہیں جنت کی جانب
کہ وہ گھر پرانا آ گیا ہے

بچانا جو گیا ہے سر کو ثاقب
اسے خنجر اٹھانا آ گیا ہے

OOO

خالد اقبال یاسر

○

گھر میں حاصل تھا اسے بن باس بھی
تھا یہی بن باس اس کو راس بھی

حال اس کا بھی مرے جیسا ہی تھا
وہ بھی تھی اور دل کے پاس بھی

جیسے ہو میرا بھلا اس کا بھلا
کچھ غرض مندی تھی کچھ اخلاص بھی

وقت اس کا گفتگو ہی میں کٹا
کچھ یقیں تھا اور کچھ وسواس بھی

بات بھی لینا نہ آیا ڈھنگ سے
کر لیا پیدا ہی سنیاس بھی

عمر بھر اچھے دنوں کی آس میں
لے وہ کوئی بھی نئی احساس بھی

احتیاط اتنا نہیں یاسر مجھے
ہوں دل میں، ذہن میں خناس بھی

OOO

صفدر صدیق رضی

○

حد موج و ساحل پہ کشتیاں جلا ڈالیں
ہم نے عشق ہوتے ہی کشتیاں جلا ڈالیں

حسن میں وہ آتش تھی حسن تھا وہ آتش میں
بے ارادہ ہم نے بھی انگلیاں جلا ڈالیں

چند خوش جمالوں کے منتظر خیالوں میں
ہم نے ان گنت شمعیں رائیگاں جلا ڈالیں

خواب اپنی آنکھوں کے کس کی نذر کر ڈالے
مشعلیں کہاں کی تھیں اور کہاں جلا ڈالیں

جن رفاقتوں میں ہم جلتے بجھتے رہتے تھے
سیل آب و آتش کے درمیاں جلا ڈالیں

شاخ دار پیڑوں کو کھا گئی تپش آخر
شہر کے الاؤ نے بستیاں جلا ڈالیں

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

O

جانے کن خواہشوں میں جلتا ہوں
میں سمندر ہوں، پھر بھی پیاسا ہوں

وہ جہاں چھوڑ کر گیا تھا مجھے
میں اسی رہ گزر پہ بیٹھا ہوں

مجھ کو دیکھو نہ اتنی حیرت سے
میں کبھی چاند، چاند جیسا ہوں

میرا انکار کرنے والے دیکھ!
میں ترے جسم میں بھی رہتا ہوں

وہ تو دریا نہیں ہے مدت سے
میں وہ دریا کہ پھر بھی بہتا ہوں

موت سے کیا ڈراؤ گے مجھ کو
میں کئی بار جان سے گزرا ہوں

جس نے دیکھا تھا پیار سے ایوبؔ
آج تک اس کی راہ تکتا ہوں

OOO

مسلم شمیم

O

وقت رخصت ڈھلک گیا آنچل
جاتے جاتے برس گیا بادل

سارا ہجر و وصال بیت گیا
ساتھ اس کا رہا تھا پل دو پل

اس کا جانا تھا دھوپ گئی جیسے
ایک پیاسے کے ہاتھ سے چھاگل

چھپتے ہی رہے دکھوں کے بیچ
زندگی ہے کہ درد کا جنگل

صبح ہوتی ہے شام کی صورت
ایک جیسا جہاں ہے آج اور کل

دل سمندر میں کوئی طوفاں ہے
ساحل جاں پہ بھی ہے ہلچل

کچھ ہوا مانگی ہے دلاسہ ہے
دیکھ کر پتھروں کو من پاگل

OOO

عامر بیگ (امریکہ)

O

پس اس نے ساتھ نبھایا نبھا کے چھوڑ دیا
کسی اداسی کے جنگل میں لا کے چھوڑ دیا

اسی نے دل میں جگائی تھی جوت چاہت کی
اسی نے پیار سے اپنا بنا کے چھوڑ دیا

اسے یہ ڈر تھا مری لو سے اس کو کھا جائے
سو رات نے مجھے آگے ہوا کے چھوڑ دیا

نہ پوچھ کیا ہوئی اس کے وصال کی خواہش
کسی نے ہاتھ دبایا دبا کے چھوڑ دیا

زمانے بعد وہ آیا ہے دیکھنے مجھ کو
کہ جس نے عشق جتایا جتا کے چھوڑ دیا

خدا کا شکر کہ میرے حواس قائم ہیں
وگرنہ اس نے تو پاگل بنا کے چھوڑ دیا

OOO

ستارے

اقتدار جاوید

O

دیکھا نہ کسی نے تھا ستارے پہ ستارہ
چمکا ترے قوسِ رنگ غرارے پہ ستارہ

میں کشف کے باعث نہیں دیکھ سکا تھا
اس رنگ سے دریا کے کنارے پہ ستارہ

نکلا ہے اشارے پہ ستارہ سرِ آفاق
آفاق میں اس کے اشارے پہ ستارہ

آتا ہے نظر خواب کے تاریک جہاں میں
عاشق ہے کسی خواب کے مارے پہ ستارہ

یہ اور دیاروں میں محبت نہیں ملتی
ٹھہرا ہے اسی شہر ہمارے پہ ستارہ

چمکے گا یہ رات کے سینے سے نکل کر
اس وقت نہیں میں نظارے پہ ستارہ

خود اپنے ہی محور سے اکھڑتا ہے ہر اک رات
کانپے نہ کسی اور کے بارے پہ ستارہ

OOO

فرحت عباس شاہ

O

(حضرت غالب کی زمین میں ایک غزل)

ہم سے اتنا بھی حق ادا نہ ہوا
چاہیے تھا جو بھلا نہ ہوا
ہم ہوئے تم ہوئے زمانہ ہوا
وہ گھڑی شہر کے روانہ ہوا
مرا تو کوئی اور ہے ہی نہیں
کیا کروں گا اگر خدا نہ ہوا
وہ سے دیکھیں گے ہم ان کو
ان سے ملنا ہوا ہوا نہ ہوا
بے تحاشا بہاریں آ گئیں گئیں
پھر دل بھی ہرا نہ ہوا
تم نے تو کیا سکون دیا تھا
رنج بھی باعثِ شفا نہ ہوا
شاعری نے مری حفاظت کی
یہ جو میں ہی کے بے مزا نہ ہوا
شاعری ہے یا وحشتِ دل ہے
آج تک ہم سے فیصلہ نہ ہوا
چاہتا ہوں مخالفت اس کی
پیچھے بندہ ہوا خدا نہ ہوا
اس قدر اعتماد تھا اس پر
مر کے بھی طالبِ دعا نہ ہوا
اس لیے ڈرتا ہوں غالب ان پر
پر مرا نذرِ کربلا نہ ہوا
ہائے وہ قافلہ قریبوں کا
شام کے وقت جو روانہ ہوا
زندگی دور لے کے چلتی رہی
میں حقیقت سے آشنا نہ ہوا
میرے جیسوں کا کیا بنے گا یہاں
اب اگر کوئی معجزہ نہ ہوا
ہجر سے دل لگا لیا ہم نے
کس بھی کام شاعرانہ ہوا
دل بھی کتنا عجیب ہے فرحت
دور تو ہو گیا جدا نہ ہوا

OOO

نیلم احمد بشیر

O

پیار کے لمحات میں، میں کہاں تھی ساتھ میں
وہ تو کوئی اور تھا بات میرے ہاتھ میں

آج بھی سلور کے میں، سامنے کھڑی رہی
آج بھی کی رہی اس کے التفات میں

بارشیں مچل گئیں، رات بھیگتی ہوئی
حرتی میں رہ گئی، اس بھری برسات میں

دل میں دفن کر دیا، روح میں چھپا لیا
سانس لے رہا ہے کون پھر بھی میری ذات میں

عشق بات نہ کرے تو بات کر کے دیکھ تم
بات ہو رہی بھی ہے تیری میری بات میں

OOO

خاور اعجاز

O

کوئی بھی بچ سکا نہیں ، راہی نہ راہنما
منزل سمیت راستہ سب کو نگل گیا

بجھتا ہوا چراغ تھا ، بھڑکا دیا مجھے
احسان مند ہوں میں ہوائے زمان کا

رکھی ہے اپنی بات انا کی ہم نے لاج
کشتی وہاں ڈبوئی ہے ساحل جہاں نہ تھا

پرچم بدل کے دیکھ رہی ہے جو خلق شہر
پہلے کی بھی رہے گی نہیں اُدھر کے گی کیا

روز ادھر لوٹ آتے تھے لہروں کے خوف سے
پھر ایک دن بھنور ہمیں اس پار لے گیا

کیا غم جو مر کے چھوٹ گئی جانِ بے ثبات
دو گز زمین پر مرا قبضہ تو ہو گیا

کیا کیا اٹھائے پھرتے تھے بازارِ زیست میں
آئے لحد کی سمت تو دامن میں کچھ نہ تھا

OOO

بیدار سرمدی

O

کی بات کی تو آپ نے مانی تو ہے نہیں
اب اپنے پاس کوئی کہانی تو ہے نہیں

شاید کوئی دلیل کرے ہم کو سرخرو
اب اپنے پاس شعلہ بیانی تو ہے نہیں

مجھ کو اٹھا دیا تو سمجھتے ہیں لوگ سب
اب اس کے گھر کی اور نشانی تو ہے نہیں

لے سانس کوئی اب تک شہرِ فریب میں
یہ موت بھی گلے سے لگانی تو ہے نہیں

اچھا ہوا کہ وقت پہ رستے بدل گئے
یہ دوستی کچھ اتنی پرانی تو ہے نہیں

بھڑکائے نہ آتشِ امید عشق اور
تم نے پھر آ کے آگ بجھانی تو ہے نہیں

بیدار کس طرح سے دعائیں قبول ہوں
ہونٹوں پہ سوز آنکھ میں پانی تو ہے نہیں

OOO

احمد صفی

O

پہلے تو اس سے آ کے ملا احتیاط سے
پھر خود کو اس سے دور کیا احتیاط سے

جانے ہے کس گلی میں اجل اپنی گھات میں
گھر سے قدم نکالیں ذرا احتیاط سے

میں جو قریب آیا تو دامن کے پار سے
ہولے سے پیچھے ہٹ کے گیا احتیاط سے

مارے ہوئے ہیں وہ بھی بہت احتیاط کے
ملتا رہا ہوں میں بھی سدا احتیاط سے

رسوائیوں سے ان کو کوئی کام ہی نہ تھا
لیکن وہ کاٹے کام بڑا احتیاط سے

کس کا کیا تھا ذکر سرِ انجمن ابھی
پیغام کس کا آیا ذرا احتیاط سے

OOO

شاہین عباس

O

ہمیں اچھا رُکا دریا نے ، یہاں رہ گئے ہم
تم رواں چھوڑ گئے ہم کو ، رواں رہ گئے ہم

اپنی خلوت کو جو ترتیب بھی خود ہی دی تھی
اپنی خلوت میں خدا جانے کہاں رہ گئے ہم

اتنا رہتا ہو تو کیا کوئی بناتا ہے مکاں "
جتنا رہتا تھا مگر کون و مکاں رہ گئے ہم

ہم پہ جو دا نظر ، ہم سے جدا نہ نظر
اس نظر رہ گئے ہم لوگ ، وہاں رہ گئے ہم

ایسی ہی بات ہے افلاک پہ ہوں خاک پہ ہوں
جب وہاں رہ نہیں پائے تو یہاں رہ گئے ہم

سکے کی طرح ہم تیری زباں پہ آئے
پھر یہاں ہوتے گئے اور یہاں رہ گئے ہم

گھر گیا ، رستہ بھی گیا ، رزم تماشا ، آخر
اک نشاں رہ گئے تم ، ایک نشاں رہ گئے ہم

بات فرقت کی بھی رکھ لی ہے ، رفاقت کی بھی
رات کی رات اندھیرے میں رواں رہ گئے ہم

OOO

حسن عباسی

O

بچھڑا ہے تو اک پل بھی بھلایا نہیں جاتا
وہ پہلی ملاقات کا لمحہ نہیں جاتا

عرصہ ہوا اس آنکھ میں جھانکے ہوئے لیکن
اس آنکھ کی تاثیر کا نشہ نہیں جاتا

اک شخص کی آواز پہ میں دوڑ رہا ہوں
ہر وقت بھی رُک جائے تو ٹھہرا نہیں جاتا

جتنا کہ ہوا پھول کے آ جاتی ہے در کو
اتنا بھی کبھی اس سے تو آیا نہیں جاتا

ہم کو بھی ستانے کا ہنر بھول گیا ہے
پہلے کی طرح اس سے بھی روٹھا نہیں جاتا

جب بات کروں اس سے تو نظریں نہیں اٹھتیں
اور نظر میں اٹھاتا ہوں تو بولا نہیں جاتا

رستوں سے ترے گھر کا پتہ پوچھ رہا ہے
اس دل سے تو رسوائی کا خدشہ نہیں جاتا

کھو جاتی ہیں آنکھیں بھی حسن نیندیں بھی دل بھی
اک اس سے جو مل لوں تو مرا کیا نہیں جاتا

OOO

وسیم جبران

O

پہلی ہی بار ہو گیا میں مبتلائے عشق
دل میں جو آئے تو بھی دل سے نہ جائے عشق

نکلا حصارِ ذات سے ہوں ایک حسرت میں
بے فیض مجھے لگ گئی اب تو ہوائے عشق

دریا تو اپنے زور سے مجھ کو بہا چلا
لہروں کے ساتھ ساتھ اب مجھ کو بہائے عشق

ہوش و خرد قرار و سکوں چھین لے چلا
سب کچھ تو میرا چھین چکی ہے بلائے عشق

جو قافلے ہیں درد کے وہ جا چکے کہاں
کیا جانے کس دیار میں ہو گی سرائے عشق

پھولوں کی سیج اس میں کسی کو نہیں ملی
کانٹوں سے یہ بھرا ہوا رستہ وفائے عشق

اپنے جگر کے خون سے سینچا ذرا کوئی
پھر کس طرح سے کوئی تو دل میں اگائے عشق

نکلا تھا میں تلاش میں جبران حسن کی
مجھ کو ملا جو عشق ، ہوا آشنائے عشق

OOO

کلیم احسان بٹ

O

جیبوں سے سب نکال دیں حصہ فقیر کا
بھر جائے گا مراد سے کاسہ فقیر کا

سائل کسی کے در پہ اگر جھک گئے مرے
دستار سے بتائیں گے جبہ فقیر کا

جب تک چلے چراغِ محبت جلا کے رکھ
مذہب فقیر کا ہے یہ فرقہ فقیر کا

آتے ہیں دور دور سے کچھ لوگ پوچھتے
کم نام سا ہے شہر میں کوچہ فقیر کا

حالات کی خبر کے لیے شاہِ وقت نے
پہنا ہے آج بھیس کے کرتہ فقیر کا

تصویر لے کے پھرتا ہے اب دربدر کلیم
گم ہو گیا ہے شہر میں بچہ فقیر کا

OOO

ذوالفقار احمد زکی

O

جو بھی الفت ہے وجہِ اجاڑ کاٹ دو
حاکمِ بخت کی ہے صدا کاٹ دو

اٹھ ان کے لئے ان کا پیغام ہے
اب خدا سے بھی تم سلسلہ کاٹ دو

بے جہت رابطوں کی ضرورت نہیں
مجھ سے جو جاؤ یہ رابطہ کاٹ دو

اپنا مطلب نکلتے ہی کہنے لگے
تم ابھی راہ و رسمِ وفا کاٹ دو

دل کے رشتے کی آبیاری کرو
جڑ کی بیل چڑھی ہے ہوا کاٹ دو

اپنی عزت سے بڑھ کر نہیں کوئی شے
آرزوؤں کا اٹھتی گلا کاٹ دو

OOO

خضر کھوکھر

O

مرے سپنے ہیں تیرا خوابوں کی کوئی تعبیر تو لکھے
کبھی تقدیر بنے مجھ کوئی تحریر تو لکھے

اسے سب ہی کے قرطاس پہ پڑی اب تو سیاہی ہے
دکھانے اہم کو راہِ حق کوئی تحریر تو لکھے

مقدر تو مرے لوگوں کا سنورے گا کبھی مولا
تمنا تھی کہ ہاتھوں میں بھی تقدیر تو لکھے

گو رہائی کا ہے قصہ اب تمہارے تو غلاموں کی
پڑی لوگوں کی گردن میں مگر زنجیر تو لکھے

مری بستی کے آنگن میں اندھیروں نے ہی ڈیرے ہیں
طلوعِ صبحِ نو کی اب کوئی تدبیر تو لکھے

دلیلیں سب جہالت کی قطعہ پر باندھ چاہیں گی
سیاہی سے ترے بس علم کی شمشیر تو لکھے

OOO

یادیں

سنہری چند یادیں

عذرا اصغر

جانے کون سا سن تھا لیکن موسم گرمیوں کا تھا۔ ہم ان دنوں سمن آباد میں شباب کیرانوی کے عین سامنے والے مکان کے اوپر والے پورشن میں رہتے تھے۔ یہ غالباً سمن آباد کا این بلاک تھا۔ منظور بھائی (منظور حسین یاد) قتیل شفائی صاحب بھی آس پاس ہی رہتے تھے۔ قتیل صاحب کی دونوں بیٹیوں تمینہ اور مسرت سے دوستی تھی لیکن قتیل صاحب سے سلام دعا کے علاوہ کوئی رابطہ نہ تھا وہ بھی جب میں ان کے گھر بھابی سے ملنے گئی ہوں۔ البتہ شام کو عام طور پر منظور بھائی اور ارشاد حسین کاظمی صاحب ہمارے گھر آتے اور شامیں پُر رونق ہو جاتیں۔ ارشاد حسین کاظمی تھے تو وکیل لیکن گورنمنٹ کالج میں داخلہ شاید شوقیہ لیا ہوا تھا جہاں میری چھوٹی نند خضرہ سکول ایم اے سائیکلوجی کی طالبہ تھی۔ وہ شاعرہ تھی، ڈیبیٹر بھی اور بیسٹ سٹوڈنٹ بھی۔ کاظمی صاحب اس کے ہم جماعت تھے اور طلبگار بھی۔ کاظمی صاحب خود بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے دو شعر اب بھی مجھے یاد ہیں۔ سنئے:

رکھتا ہے کون یاد پرانی رفاقتیں — مٹی کا نام تک نہیں مٹی کے تل میں

مجھ سے اہل شہر نے مطلب سمجھ لیا — اتنا تمہیں کو دیکھا رہا تیرے نام سے

ان کا بیان تھا کہ کسی وقت موصوف ساجدہ نامی لڑکی کے عشق میں مبتلا تھے اسی لڑکی کے لئے انہوں نے یہ غزل کہی تھی جس کا مندرجہ بالا یہ شعر ہے۔ کچھ عرصے پہلے کاظمی صاحب نے مجھ سے افسانہ یہ کہہ کر لیا تھا کہ میرا ایک دوست اپنا رسالہ آرگس کے نام سے نکال رہا ہے اس کے لئے افسانہ دیجئے۔ اس واقعہ کو گزرے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے تھے اور میں بھول بھال گئی تھی۔ ایک دن گرمیوں کی شام میں ہم لوگ اپنے مختصر سے گھر کے ٹیرس پر بیٹھے گپ شپ میں مشغول تھے۔ ہمارے ہاں روز کے آنے والوں میں منظور بھائی اور کاظمی صاحب بھی موجود تھے کہ زینے پر ایک صاحب نمودار ہوئے۔ دراز قامت (بظاہر) اجلی رنگت اور لمبے بال۔ میری ہی نظر سب سے پہلے ان پر پڑی اور میں اٹھ کر دروازے پر گئی۔ شاید انہوں نے سلام کیا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، کچھ پوچھتی کہ انہوں نے خاکی لفافے میں بند ایک رسالہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور پیچھے کو پلٹے قدموں زینہ اتر گئے۔ واپس اپنی نشست پر بیٹھ کر میں نے لفافہ کھولا اس میں "تخلیق" تھا۔ کاظمی صاحب بولے۔ "یہ اظہر جاوید تھا"۔

تخلیق کے اس شمارے میں میرا افسانہ چھپا تھا جو "آرگس" کیلئے کاظمی صاحب لے گئے تھے۔ اس کے بعد اظہر صاحب سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ہم نے مکان بدلا علاقہ بھی بدل گیا سمن آباد سے منتقل ہو کر ہم مسلم ٹاؤن آ گئے اور ہماری شام کے مہمانوں میں کاظمی صاحب کے علاوہ ذوالفقار احمد تابش، مقبول جہانگیر، محمود شام شامل ہو گئے اور رحمت جو تو اپنے وقت میں طلاطم تھیں سارا دن کے دوستوں

میں نزہت ایوبی تھیں جو میرے گھر کے سامنے بڑے سے وسیع گھر میں رہتی تھیں۔ ان کا اور میرا گیٹ آمنے سامنے تھا۔ نزہت ایوبی کی امی باجی اختر بڑی وضعدار خاتون تھیں۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھی ٹاٹنگ کرتی رہتی تھیں۔ ایوبی اپنی پانچ بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھیں اور ان کی سب سے چھوٹی بہن عطیہ میری شبہ کی دوست بن گئی۔ ایوبی بڑی سلیقہ مند کڑھائی سلائی کی ماہر اور شوقین تھیں ان کے ساتھ مل کر میرے بھی پرانے سب شوق عود کر آئے۔ کڑھائی بنائی کے علاوہ میں اور ایوبی باغبانی کرتے۔ شام کو نہر کنارے لمبی لمبی سیریں کرتے۔ نہر کے کنارے اگے ہوئے خوش رنگ پھول توڑتے اور انہیں گلدانوں میں سجاتے۔ اصغر کہیں شہر سے باہر جاتے تو باجی اختر کہتیں۔ شبہ! کھانا آج تم ہمارے ساتھ کھانا۔" نفیس گل ہماری مالک مکان تھیں۔ وہ نام کی ہی نفیس عادت کی بھی نفیس تھیں۔ شام کی محفلوں میں ہی نفیس وہ رات کو بھی اپنی دلکش گفتگو سے دلچسپ بناتیں۔ نفیس گل ڈی ایس پی مرحوم کی بیوہ تھیں۔ زندہ دل، پرخلوص اور محبت کرنے والی ہستی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ہمارے بائیں ہاتھ فلسطین ستارہ زبیر سلطانہ اور وہیں رہائش پذیر تھے۔ باجی اختر کے پچھلے گیٹ سے پرے قمر ذوالکفل لقمان رہتے تھے اور ان کی شریک حیات رضیہ بھابھی دوست دار خاتون تھیں۔ روز کا ملنا جلنا اور آنا جانا تھا۔ لقمان بھائی کے ہمسائے میں مشتاق کمار اپنی دونوں بیویوں جمیلہ اور صبیحہ خانم کے ساتھ رہتے تھے۔ مسلم ٹاؤن کے بگیر ہاؤس ارم سینما کا پانچ سالہ ٹھیکہ میرے بہنوئی طاہر زیدی کے پاس تھا اور ''ارم'' کی کینٹین میں اصغر مہدی کے پاس تھی۔ انہوں نے تھوڑا سا تانگہ رکھا ہوا تھا جو بجلی بل کے علاوہ عنبر اور شبہ کو اسکول لاتا اور لے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہی تانگے میں ہمیں اور ایوبی انارکلی خریداری وغیرہ کے لئے جاتی تھیں۔ زندگی کے کئی ماہ و سال انہی مشغلوں میں گزر گئے کہ ایک دن ایک مختصر سا خط ملا جو اظہر جاوید مدیر تخلیق کا تھا۔ تحریر تھا۔

محترمہ شبہ اصغر صاحبہ! آپ کے کالم روزنامہ نوائے وقت میں دیکھتا رہا ہوں اور افسانے بھی مگر اب کافی مدت سے آپ کی طرف سے خاموشی ہے۔ آپ انارکلی تو آتی ہوں گی میں ماہنامہ تخلیق کا باقاعدہ اجرا کر چکا ہوں۔ انارکلی آئیں تو دفتر تخلیق 30، میکلیگن روڈ کو بھی عزت بخشیں۔ خط پڑھ کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور اپنے اوپر حیرت بھی۔ مسلم ٹاؤن میں آ کر جیسے میں نے لکھنے پڑھنے سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ باغبانی، امیر انکاری اور ختک بس یہی مشغلے تھے۔ عنبر اسکول سے آ کر ٹیم کے نیچے ایام بناتا رہتا۔ عبد الغنی کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ شام کو محمود شام اور رفعت آتے۔ ان کے تقاضے پر کچھ لکھتی تو ان کے حوالے کر دیتی۔ رفعت تھیں تو افسانہ نگار مگر ان دنوں وہ خواتین کے صفحے کی انچارج تھیں اور مجھ سے پکوانوں کی ترکیبیں اور خواتین کے مسائل پر لکھنے کو کہا کرتیں۔ محمود شام نئے نئے جھنگ سے آئے تھے اور کمسنی میں ہی شادی شدہ ہو گئے تھے۔ گورنمنٹ کالج میں ایم اے صحافت کے طالب علم تھے اور نوائے وقت ان کی روزی روزگار کا وسیلہ تھا۔ ایک دن باجی اختر کو کچھ شاپنگ کروانی تھی اور ایسے کاموں کے لئے ایوبی منتخب تھیں۔ اور ان کو باجی میرے ساتھ بھیجنا مناسب سمجھتی تھیں۔ تانگہ تو تھا ہی گھر کا اور اس کا کوچوان یوسف جو کہ بذات خود ایک کردار تھا فرمانبرداری میں بھی یکتا تھا۔ ہم میکلیگن روڈ سے گزرے تو مجھے ماہنامہ تخلیق کا بورڈ نظر پڑا۔ تانگہ رکوا کر میں اور ایوبی زینہ چڑھ گئے۔ کسی دفتر میں جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا اس لئے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی۔ آواز آئی۔ تشریف لے آئیے۔

دروازہ کھولا تو سامنے ایک درمیانے سائز کی رائٹنگ ٹیبل کے پیچھے کرسی پر اظہر جاوید صاحب ایستادہ تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں سامنے بچھے صوفے پر ''تشریف'' رکھنے کو کہا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا جو مختصر اور سادہ سا تھا۔ میز پر تازہ

موتیا کے پھولوں کا ڈھیر اور فائلوں کا انبار تھا۔ اس دن تقریباً آدھا گھنٹہ ہم ٹھہرے۔ یاد نہیں کیا کیا باتیں ہوئیں اسی گفتگو کے دوران موصوف نے بجلی کے چولہے پر چائے بنا کر ہمیں پلائی اور ہم ان کے اخلاق اور نفاست طبع نیز شائستگی سے متاثر ہو کر اٹھے۔ گھر آ کر میں نے اصغر کو بتایا۔ اس طرح ایک دن اصغر بھی ان سے جا ملے اور آہستہ آہستہ تعلقات استوار ہونے لگے۔ اسی دوران اصغر کے ایک کلائنٹ (واضح ہو کہ اصغر ان دنوں وکالت کر رہے تھے) امام تھا جن کا اقبال شمیم ہاشمی۔ ان کی ہونے والی خوشدامن کا ایک ماہنامہ "نوروز" اس کی ایڈیٹر شپ ہاشمی نے مجھے آفر کی جو میں نے منظور کر لی۔ اس سے پہلے میں خود چاہ رہی تھی کہ میں ایک رسالہ آج کل کے نام سے نکالنے کی کوشش کر چکی تھی۔ اصغر نے پیڈ بھی چھپوا دیے تھے۔ جن پر ہماری رہائش گاہ طاہرہ منزل کا پتہ درج تھا۔ اصغر کی یہ عادت تھی کہ کسی کام کا آغاز سوچتے ہی پیڈ اور کارڈ چھپوا لیتے تھے۔ "نوروز" خالصتاً خواتین کا پرچہ تھا جسے ایک سال تک میں نے چلایا پھر کیونکہ مالک نوروز امریکہ منتقل ہو گئیں اور پرچہ بند ہو گیا۔ مگر ہاشمی کی فیملی سے ہمارے قریبی گھریلو تعلقات بن گئے۔ ہاشمی کی امی بہت ملنسار خاتون ثابت ہوئیں اور ان کی پیاری پیاری بیٹیاں بھی۔ مابعد ہاشمی بھی اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ بردہ ہوئے ناہید سے ان کی شادی ہو گئی۔ ہاشمی اچھے اور معروف شاعر ہیں۔ یاد آتے ہیں۔ نوروز کے بند ہونے کے بعد عالم علی سید صاحب نے ایک ہفت روزہ "شب تاب" جاری کیا جس میں میں ہی تھیں خضر وسکون اور اصغر مہدی بھی شامل تھے۔ یہ ایک نیم فلمی جریدہ تھا۔

اس وقت تک اظہر جاوید سے تعلقات گھریلو سطح تک پہنچ چکے تھے۔ اظہر صاحب کی امی نے مجھے بیٹی بنا لیا تھا۔ ان کی بیگم مسرت سے بھی میل ہو گئی تھی۔ ان کی بیٹی سلونیہ میری شہر کی ہم عمر تھی اور اکثر ہمارے گھر آ کر رہ بھی لیتی تھی۔ مسرت کینٹ کے ایک اسکول میں استاد تھیں۔ ان کے اور اظہر صاحب کے کچھ زیادہ خوشگوار تعلقات نہیں تھے جس کی وجہ اظہر صاحب کا ادبی ذوق تھا۔ مسرت ان کے کام یعنی "تخلیق" کو کار بیکار تصور کرتی تھیں۔ کسی قدر ان کا خیال تھا تو درست کہ رسالہ اور وہ بھی ادبی رسالہ نکالنا "گھر پھونک تماشا دیکھنے" کے مترادف ہے۔ اظہر صاحب ان دنوں بھی اخبارات میں کالم نگاری کر کے اپنے اخراجات پورے کر لیتے تھے۔ روزنامہ امروز سے منسلک تھے اور تخلیق بھی جاری تھا۔ پھر جانے اظہر صاحب کو کیا سوجھی کہ مجھ ناچیز کو تخلیق کی ادارت میں شامل کر لیا۔ شاید میں نے بھی اسے برضا و رغبت قبول کر لیا۔ میرے ذمے جو کام زیادہ تھے تخلیق کاروں سے تخلیقات حاصل کرنا۔ بل کر یا خط لکھ کر۔ آنے والے مسودات دیکھنا پروف ریڈنگ وغیرہ۔ میں اصغر کے ساتھ بچے کے ٹائم دفتر جاتی تھی اور اپنے حصے کا کام گھر بیٹھ کر کرتی تھی۔ جب پرچے کی پیسٹنگ ہوتی وہ دن بڑا ہنگامہ خیز ہوتا تھا۔ کاتب حامد شاہ صاحب (غالباً یہی نام تھا) زمان کنجاہی برقی کے ساتھ موجود ہوتے۔ امید عزیزین کی ڈیوٹی چائے بنانے پر ہوتی۔ دوپہر کو کھانا بھی انارکلی سے آ جاتا۔

اظہر صاحب کا شوق تھا کہ خواتین کی ادبی دنیا تک شاعری کو درست کر کے بلکہ خود لکھ کر ان کے نام سے چھاپتے انہوں نے اس کام میں اصغر کو بھی شامل کر لیا تھا جبکہ میں اس عمل کی سخت مخالف تھی اور اظہر صاحب سے اس موضوع پر میرا جھگڑا چلتا رہتا تھا۔ بعض دفعہ جھگڑا اتنا بڑھ جاتا کہ ہماری بول چال بھی ایک آدھ دن تک بند رہتی۔ یہ تو خیر دفتری باتیں ہیں۔ گھریلو سطح پر بھی ہمارے مراسم خاصے بڑھ چکے تھے۔ امی سے ملنے ان کے گھر جاتے اور وہ میرے خاندان میں منعقد ہونے والی ہر تقریب میں شریک ہوتے سو ان سے ملنا جلنا تھا۔ سلونیہ ابھی ایف۔ اے کی طالبہ تھی کہ اس کی شادی کر دی گئی۔ کیپٹن مسرت کا تعلق پشاور سے تھا۔ مسرت بڑا اچھا لڑکا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں سلونیہ نے

سسرالی رشتوں کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ میری بی اے ڈاکٹر شگفتہ نے اظہر صاحب کے ماموں (جو کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے) اسے شادی کرلی۔ ممی کی وفات کے بعد اظہر صاحب بے گھر ہو گئے۔ ممی کی دانشمندی نے جس گھر کو جوڑ رکھا تھا وہ بکھر گیا۔ اظہر جاوید ایک حساس اور زود رنج انسان تھے۔ وہ اپنے ملنے والوں سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کو مصیبت میں دیکھتے تو ان کی مدد کو پہنچ جاتے۔ قیوم زاہد کا اگرچہ ایجنسی میں فوٹو گرافی کا اسٹوڈیو تھا، مگر ان کو کام دلاتے رہتے۔ کیونکہ اظہر صاحب کا فلمی دنیا سے بھی تعلق تھا۔ اور سیاستدانوں سے بھی راہ و رسم تھی۔ وہ ہر پروہ اپنے ہر ملنے والے کے کام آتے تھے۔ ہمارا پبلشنگ ہاؤس اگرچہ پانچ سال چھپنے پر تھا مگر اس کی مالکن نے ہمارے حسد کے بس کر دیا اور ادارہ معطل ہو گیا۔ طاہر بھائی اور ہم اچانک بے روزگار ہو گئے۔ آپا کے بچوں نے تو بھاگ دوڑ کر کے نوکریاں حاصل کرلیں۔ اظہر صاحب نے اصغر کو اردو بازار کے پبلشر سید عزیز شاہ بخاری سے ملوایا۔ ان کی کتابوں کی ہم میاں بیوی پروف ریڈنگ کرتے۔ اصغر کتابیں ترجمہ کرتے۔ ان کی آخری کتاب "مشرق و مغرب کے سیاسی افکار" کی تلخیص اصغر کر رہے تھے ابھی ایک یا دو باب ہی لکھے تھے کہ انہیں پولیٹیشن ڈویژن میں جاب مل گیا۔ کتاب کے پیسے پیشگی وصول کئے جا چکے تھے لہٰذا کتاب میں نے مکمل کی مگر اس شرط کے ساتھ کہ کتاب پر میرا نام آئے گا۔ کتاب مکمل ہونے کے بعد عزیز بھائی نے یونیورسٹی کے پروفیسر جناب مسکین حجازی کو دکھائی جنھوں نے ریمارکس دیئے کہ دو چیپٹر کسی پروفیسر کے لکھے ہوئے ہیں جبکہ باقی کتاب کسی افسانہ نویس کی تحریر کردہ ہے۔ لیکن ان دنوں خواتین کی لکھی ہوئی کورس کی کتابیں رائج نہیں تھیں اس لئے اس کتاب پر میرے نام سے پہلے اصغر کا نام درج ہے۔ عزیز بھائی اور ان کی بیگم رضیہ بھی بڑے وضعدار محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمائے۔ آمین!

◆◆◆

قواعد و ضوابط

تمام قلمی تعاون کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کو ادارہ "تخلیق" کی پالیسیوں سے اتفاق کرنا لازم ہے۔

☆ تحریریں صاف اور نمایاں طور پر واضح ہونا چاہئیں اور صرف Inpage فائل میں تحریر بھیجی جائے۔ ☆ کوئی تحریر واٹس ایپ یا فیس بک پر [illegible]

۱۱ اشعار سے طویل نظم یا غزل نہ بھیجی جائے۔ الفاظ کی وضاحت کو

کفایت سے استعمال کریں۔ ☆ صرف غیر مطبوعہ تحریریں ہی تخلیق میں شائع کی جائیں گی لہٰذا قلمکار اپنی تحریر کے اوپر غیر مطبوعہ کا لفظ لازمی لکھے۔ ☆ تخلیق کسی بھی قلمکار کو اس کی تحریر شائع ہونے یا نہ ہونے کا پیشگی شائع ہونے سے پہلے بتانے کا پابند نہیں۔ ☆ پرچہ شائع ہونے سے کم از کم ایک ماہ پیشگی وصول ہونے والی تحریریں ہی قابل اشاعت ہوں گی۔ آخر وقت پر بھیج کر شائع کرنے کا اصرار نہ کیا جائے۔ ☆ کوئی بھی مضمون یا تبصرہ جو مصنف براہ راست تبصرہ نگار سے لکھوائے وہ تخلیق میں قابل قبول نہیں۔ ☆ تبصرہ صرف تخلیق کو بھیجی گئی دو کتابوں کی وصولی پر تخلیق اپنے تبصرہ نگار سے کرائے گا ☆ تمام قلمکار اس بات کو یقینی بنائیں کہ اگر پرچہ شائع ہونے والے مواد میں غلطی ہو تو بروقت ادارے کو اطلاع دیں۔ پرچہ شائع ہونے کے دو یا تین ماہ بعد پرچہ نہ ملنے کی شکایت نہ کریں۔ ☆ تمام تخلیق ممبران پر فرض ہے کہ اگر وہ پتا تبدیل کریں تو پتا ادارے کو فون کر کے ضرور نوٹ کروایا جائے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ پرچہ باقاعدگی سے پرانے پتے پر ارسال کیا جاتا ہے اور کافی عرصے بعد بتایا جاتا ہے کہ گھر تبدیل کر لیا گیا تھا۔ آپ کے تعاون سے ہی "تخلیق" آج بین الاقوامی مقام پر ہے۔ (ادارہ "تخلیق")

سرائیکی توشہ

ناول ''تانگھ''

……8……

بشریٰ رحمٰن

''ہا۔ علی کوں یاد آ گیا۔ بہاولپور وچ وی اوں اے نشان پرانے ماڑیاں تے سرکاری کاغذاں تے ڈٹھے ہن۔ او بس ہک پٹے دے آمنے سامنے بیٹھے ہال سینداتے ڈٹھن اوں ویلے اوں اونکوں پرانے ویلے دا سرکاری نشان ای سمجھیا ہا۔ ''تساں چپ کیوں تھی گئے وے؟'' سنکھو پچھیا۔ ''علی کیا آہدا۔ کیا آہدا بھلا؟ اوکوں اوں پاگل جیہیں چھوہر تے رحم آ گیا ہا۔ ایہہ رتھ دے لوک کتنے بچے تے کھرے ہوندن۔ انہاں وچ ہالی دھتوں آلے شاعری دا رواج تھیا۔ رہا توں تے ہجوں توں پاک عشق تے محبت کوں ای حیاتی دا سب کجھ سمجھدن۔ پر افسوس جو علی کوں آ توں ویہے تے جاچن جوجتن وچ دیر تھی گئی۔ علی دے دل کوں عجیب جیہیں تکلیف تھیون لگی۔ او ہمدا ول کیا جوا او اتھوں نکھڑ ویسے۔ نس ویسے۔ پر اول ہمدا نال ہویا۔ ''کولی چنگاں جیہاں گیت ہا سنکھو۔ تیں میکوں سوہنا کر ڈتے!'' ''سنکھو دیں تانگھ وچ ہئی۔ آ پی اس جیہاں سونجھی تے دردیں آواز وچ گاون لگی۔ جانی! رات دہ پوسا انتظار ای ہے آ ماہی دل نے گھروں ایہہ جندڑی پرائی ہے بھانویں جو او ہندی سمجھ وچ گیت دے بول نہ پئے آندے ہن۔ پر او دا مطلب ذہن وچ پڑھدا ویندا ہا۔ سنکھو دے الا وچ اوں رات ہک تڑپ ہئی ہک اداسی ہئی۔ ہک سیدھ ہئی۔ گیت نے ماحول کوں مزید پیارا تے سوہنا کر ڈتا۔ ''بھئی اینی میکوں مطلب وی سمجھا ایں زبان دا۔'' علی نے گیت مکدے ای جان بجھ تے انجان بندے ہوئیں آکھیا۔ ''او علی صیں! آکھ مہینہ تھی گئے اتھاں کوں اتھاں آ تے ہوئیں۔ تے حالی ای اتھاں کوں اساڈی زبان نی آئی۔'' ''بھائی! گیتاں وچ تاں تساں لوک ڈری اوکھی زبان ورتیندے وے!'' ''ایں گیت وچ تاں ہک وچھوڑے دی، ہک اداسی اے'' سنکھو دی سوہنا تصویر ہوئیں آکھیا۔ ''ہک مجبور جیہیں چھوہر آ پنے ڈھول دے آگوں وچھوڑے تے ڈیندی اے۔ اساڈے علاقے وچ ایہہ گیت اوں ویلے گاویندے جیہڑے کہیں دا محبوب ملکوں دور ہووے!'' ''سنکھو اگر ول ملوں'' علی ہک دم کھڑا تھی گیا۔ ''بہوں دیر تھی گئی اے۔ جنگر سیدالالا آ گیا تاں او دل دے بارے وچ کیا سوچسی؟'' ''تیڈا حاجی چا ہوے سوہے اج سیدا واپس ولسی دا ارادہ کینی!'' ''ہاں۔ سنکھو چل۔'' ''اوا سنکھو کوں زور ڈیں رتی اٹھایا۔ رات ہنر تصویری پئی ہئی۔ چندر کتوں دی تھکن گئی ہئی۔ تیڈا ایکھ ہوئے رنگا پھل بندا ویندا ہا۔ ایہا او وقت ہا جڈاں انسان دی سدھ چندرے کھب مڑ ڈیندن!

علی وی ایہہ چکھڑی رات ہئی۔ تے او چکھڑی رات دی سوچی تے نہ چھن پیندا ہا۔ ''سیدالالا جنگر اساں او ہاں کوں کھاڈ گیہ گھنسی تاں بے سوچے سمجھے گولی مار ڈیسی۔'' ''سنکھو چپ رہی'' ''ول تاں میں ٹھیک آکھے؟'' ''ٹھیک اے تھی سگدے!'' ''پر سیدا اوں کوں

دل نی کریندا۔" "سکھو مسکھری تھی کھل پئی!" "اساں رتیڑے دے لوک جان دین کوں عشق دی معراج آہدے ہیں۔" "تساں رتیڑے دے لوک نادان دوست ہو!" "اساں رتیڑے دے لوک صادق دوست ہیں!" "اڑی اوڈ یکھ سامنے ہک پچھانواں دیہان ڈسدا پئے۔" "سکھو نیں غور کیتا تے بولی "ہا، کوئی ایں پاسے آندا پئے!!" "انگریز تے الا ہویاں تاں۔" علی ڈر گیا تے آپنی موت اوندے اکھیں دے اگوں آ گئی!" "میں تیکوں آ کھیاں۔ بابروں نہ و نجیں۔" "اوندیں آپنی آپنی سوچاں وچ گم اوندے ویندے جیویں جیویں پچھانواں نیڑے آندا ویندا ہا، علی دی رت سکدی ویندی ہئی۔ اوں ہک کھیں بچھو ہرواں اکھیاں تے اپنا سارا تیار قرآب کر گھدے۔ ہس ایہا ہک تاں رات ہئی۔ بیا نیڑے۔ تھوڑے پچھے چند گھنٹ رہ گیا تاں انہیں کوئی احساس تھیا جو او کوئی تریمت اے" ____ کیوں جو اوندے گھگھرے گھیرے دے وال اوندے پچھاں کا نیندی وجہ دے بیٹھے آن!! علی دی جان وچ جان آ گئی۔ سکھو نے آپنے علاقائی انداز وچ زار نال ہک آواز کڈھی۔ ڈو گھے پاسوں وی اوڈیں ای آواز آئی۔ ڈوہیں دا زناں دی گونج رتے وچ رہ گئی۔ تھوڑا دور اتے سکھو نے وت ہک آواز کڈھی تے بولی "زینو کا ئی" ڈوگھے پاسوں اوکھی ای واز آئی تاں سکھوں اطمینان دا ساہ گھدا تے بولی۔" کاکی زینو سیت گولیندی ہوئی آندی پئی اے۔" کتھا ہیں جیڈا بابا یا لا اے۔ آ گیا ہوسے" "اکھیں گالھ کانیاں ہوئی۔ زینت اوڈیں دی اوٹ تھیوے اوں میکوں اتھاں آ نوں کتوں ہکلیا ای ہا۔ آ ہدی پئی ہئی۔ پرو دیہاں دا گیا اجاڑ، رات دا وطعا تے ..." "ہا۔ او ٹھیک آ ہدی اے۔ علی نے آرام ریت آ کھیا۔" رات کوں کیہیں دے نال گھمیں ئی و یکھنا چاہیدا۔" لیکن تساں غیر جن کا نے تو دے گئیں!!" واقعی ہیں ہک خطرے آلا کم کیتے!" "سکیں میں تہاکوں ڈسیا ہا، عشق خطریاں توں نہیں ڈردا" زینو نیڑے آ گئی ہئی، ایں کیتے علی کوں چپ راہوں دا موقع مل گیا۔ اوں شفقت آپنے الا وچ سکھو کوں گلدا ہندا آ ہدی پئی ہئی صرف آواز دی اوہا ئی چ ہیں جاں اوں انگلی لائی ہئی۔ او واقعی ٹھیک آ ہدی پئی ہئی۔ انہاں دے گھر پکن دے ٹھیک 15 منٹ بعد اللہ وسایا آ گیا ہا۔ اوکوں پتہ ہا جو سیٹھ علی کوں و یکھنے ایں کیتے او وی لوکوں نوں آ گیا ہا۔

سویل کول دتی دے کئی لوک اوکوں ملن آئے۔ تے ہر بندہ کوئی نہ کوئی سوغات گھن آیا ہا۔ تھیاں، پنگیراں، جنگیاں، دھوتیاں، کھیس، پگوں، پکھے، ہتھ نال ونیاں ہویاں میاں۔ "علی انہاں دا خلوص تے سوغاتاں ڈیکھ کراہیں دنگ تھیندا ویندا ہا، ایں تھوڑے جیہیں ڈیہاڑیں وچ اوں انہاں کوں کیا ڈتے؟ او تاں اپنے قلم دا نشہ پورا کرن کیتے اتھاں آیا ہا۔ پر من تھیندا ہا جو اوکوں انہاں کیتے کجھ کرنا چاہیدا اے۔ اتھاں رہن سہن دی سوغاتاں تے تیڑے دے سو کھے دی ہک مہک آ ونی چاہیدی اے۔ انگیاں بہوں ساریاں گھمیں جیپ وچ رکھن اوکھا تھی گئی۔ تاں انہاں وچوں کجھ گھمیں اللہ وسائے کوں سو کھڑے دے طور تے ڈے ڈتیاں۔ علی الا دے آ دے ڈٹھا، سکھو کتھا ہیں نہ ڈسدی پئی ہئی۔ شجان سوبلے سوبلے کتھاں گئی ہئی۔ انہاں کوں نوں وت دے ڈرانا۔ پند بہوں لمیا ہا۔ تے ڈوپہر توں پہلے اوں تیڑے توں نکل ویندے تاں چنگیاں تھیندا۔ بہر حال او سب کوں ملا تے جیپ وچ آن بیٹھا۔ تے جیپ سٹارٹ کر ڈتی۔ رتیڑے دے جھگڑی گنڈے تے اتھاں شہر دا سو نے رکھیا ہاں ڈسدا ہا۔ ہک اچے پے تے او کھڑی ہئی۔ او ہدی ڈاچی لیتے دے تک کھڑی آ گل ایندی کھڑی ہئی۔ پیرے کھوں ای اوں جیپ کوں ڈیکھ کراہیں ہتھ ہلاون شروع کر ڈتا ہا۔ جیویں رکن دی اشارت ڈیندی پئی ہووے۔

علی کوں سنبھالن وچ ڈری دی دیر نہ لگی۔ او وہ سکھو ہئی۔ او وہ نیڑے توں کجھ اگوں وبخ کراہیں جیپ روک ڈتی۔ او ہو کدی سا ہندی بھجدا آندی پئی ہئی۔ اہا لھ نال جیپ دے نیڑے آ گئی۔ او وہ لگے علی کا ڈی تو دچلیند ایاہا۔ او وہ سر اندر کیتا تے ہک گنڈ ھڑی علی دی جھولی وچ

سٹ وتی۔ "ایہہ کیہ اے؟" "ایہہ تہاڈے کیتے سوغات ہن، ای سمیں!" "اڑی، میں تاں پہلے ای بہوں سوغاتاں کٹھیاں کر کے تھک گیاں۔ انھوں دے لوک بہوں ای چنگے ہن۔" "تساں وی تاں بہوں چنگے ہو سمیں۔" پر میں تاں کسے کوں کجھ نئیں ڈتا۔" "تہاکوں کیا پتہ، جو تساں اساکوں کیا کیا ڈے کے رہیے او،" "اوہ آپنی جگہ وچ پاتے آلا ڈال آکھیا۔ علی صاف محسوس کیتا جو اوہدے الا وچ کمزوری ہئی۔ غلابی ہوٹھاں ڈکھے پیے ہن۔ تے وڈے وڈے ہرنی دی اکھیں وچ سب آ کراہیں رک گیا ہا۔ "سکھو میں ہنڈے کیتے شاہرواں بہوں ساریاں سوغاتاں انہیاں۔" "علی سمیں!" "سکھو بہوں ہمت کر کے آکھیا۔ "ہک گالھ دا خیال رکھا ہے،" تاگھروں دی موت بہوں ڈکھل تے دردیلی موت ہوندی اے۔ اوتا گھر پانی دی ہووے یا ہوں وی؟" "اڑی، او وجہ اوہ ناں کیویں گئے؟" "تہاڈے آون توں بعد میں اوہدی پرواہ تاں نئیں کیتی ہئی۔ او وی کراہیں یکا گئے تے ہن میں اکلی آں۔" "چنگاں سکھو، اللہ دی امان — ڈعا کرو جو اساڈا ایہہ ٹھیک ٹھکو ہے۔" "اللہ بیلی۔" "سکھو او ڈیکھدا ہویا ڈروا ہویا ایں جوں گھر تے رڑھ آیا۔ تے علی نے سنکلے دے نال جیپ سٹارٹ کر ڈتی۔ ایویں گھانبے تے ڈٹھا، جیویں بندہ دھاں ننیں آ مریاں پیاں ہوون۔ مڑ کراہیں وی ننداں ہئن۔ تھا میں جیاں دے ایں وانس وچ اوکالا تجربہ ہئی ہئے۔ جیپ اڈدی ویندی ہئی تے رستے دے دل پاگل ہو آئیں اوں نال اڈدے آپنی پیاں ہن۔ ہوا وچ ہک کوئی ہئی۔ ہک لمیں گونج جیویں گنبد کوں نکل ہووے۔ گنبد وچ اوا اندری پئی ہووے۔ ایہہ کوک شاہر دی ہوا دے ڈکاریاں توں بھوں وکھری ہئی۔ علی ادایاں ڈہن لا۔ یار، ٹیپ لا۔" اوں طفیل کوں آکھیا۔ طفیل نے ٹیپ ریکارڈ دا بٹن ڈبا ڈتا۔ سکھو دی سریلی آواز کوں گئی: "دل ہا گھوتا گھو اے، اللہ جوڑ سانگ اے، بچھاں دا ماتاں مشکل مہانگ اے۔" "علی یار، میں کیا کر دے؟" علی اپنے آپ نال وکھرا لگا۔ "تھا میں ہنڈے کنوں کوئی ظلم تاں نئیں تھی گیا — میں ہک معصوم چھوکری کوں ستالنے وچ رکھیے۔ سب کجھ اوکوں صاف صاف ڈسا ڈیندا۔ توں اوندے نال کھیڈ دا رہیں۔ توں جانڑ دا ہایں، توں سب جاندا ہایں۔ ایہو گفتار وہ کیویں ادا کر سمیں۔" "ایہہ کیا کردا تے تسیں علی!" "ایہہ کیا کردے؟" بہوں دیر تو تیں علی اپنے آپ کوں بنڈاریہا۔ تے وت تھوڑی دیر بعد اوں اپنے دل کوں تسلا ڈے کے ڈھل ڈتی۔ تھوڑے ڈیہاڑ وچ ای ایں الا تاں اوکوں پرچین آ گئی۔ بھو تکھل ڈتی۔ میسے دی ہرنی دی کار نویں ماحول دا اثر گھنسی۔ بھو ٹھیک تھی ویسی۔ میں ایویں فکر کریندا پیاں۔ پر رستے دے چھکیڑی دے جھولاں تے موتیاں دی کار لسکدی ہوئی ریت سکھو دی آواز دے نال نال وین کریندی رہی ہئی!

تساں بادشاہ ہو اساکوں غریبی — تساں دل نہ ونڈاں اساڈی بدنصیبی
دل تاں ہے تانگ اے — اللہ جوڑ سانگ اے
بچھاں دا ماتاں — مشکل مہانگ اے

اوے علی! کتھاں آ گئی حیدی منزل، میں تاں تھک گئی آں!" سکھی نے بے چسے انداز وچ آکھیا۔ "تھوڑی جیہیں کافی پی گھن، دکاں جیپ!" علی نے پیار نال تے آکھیا۔ "اوں نو" "اوں بیزاری نال آکھیا۔ پچھلے پچھی گھنٹیاں توں، رتوں ملکیں کافی ای پونی آندے ہیں۔" "تاں کیا پوواں سیڈی جان؟" علی نے انگریزی وچ آکھیا تاں جو ڈرائیور نہ سمجھ سکے! علی تے سکھی اگلے سیٹاں تے ہن تے ڈرائیور طفیل پچھوں سامان دے نال بیٹھا ہا۔ اوڈیں دی اوبایر و وعدہ کر کے اگوں اے سگریٹ پیندی آندا ہا۔ "بس ہن اساں ہٹن آئے ہیں۔" علی نے مستی وچ تے آکھیا۔ "ڈیکھیں تاں سہی جو اُتھی سوٹی جاوا ہے جو تیکوں حسن آ ڈیسی۔" "سمی تھن آ ہی!" ہر پاسے رتیلا اتے ریت

ڈسدی پئی اے۔ اتوں میکوں ڈر لگے قسم اے تسیں کتھے سو یندا اہیں۔ میکوں نال اوہیں گلدے جو تساں رستہ وچ بیٹھے ہیں!'' ٹیکسی وچ ہم تھی
گئے۔ کیتھی۔ اوڈیں اج اساں ٹھیک ویلے تے پہنچ گئے ہیں۔ ایں ویلے ڈیڑھ دے بارہ وجدے پئے ہن۔ اساں سو ویلے
چار وجے ٹر پئے ہیں۔ بس یک گھنٹے وچ سکھو دے گھر پج ویسوں۔'' ایہ سکھو کون اے؟'' ''میں تیکوں ڈسیا تاں ہا۔ اوندیاں مورتاں وی
دکھائیاں ہن۔ تے ٹیپ وی سنوائی ہئی۔'' ''تساں ایشیائی لوک بہوں جذباتی ہوندے وے! ایہہ تساکوں کہیں نال عشق تھی ویندے!
''او۔ تو۔ کیتھی پلیز۔ وری خیال کر!'' ''ضرور تساکوں او چھوہر نال عشق تھی گیا ہوسی۔'' کیتھی نے نکل کرائیں آکھیا۔ ''بھلا جیو حادثے نے چال
وچ پا تھا اوہ دے او ہی حیاتی عشق کرن دے قابل رہ ویندے؟'' علی نے یک اکھ کوٹ تے کیتھی ڈو ڈٹھا۔'' کیتھی ڈاڈھے سوہنے انداز
وچ کھلن لگی — ''چھوہر واقعی سوہنی ہئی۔ چنگی ہئی۔ پر اللہ کریندا۔ میں ایڈے ڈکھیں واقعی تے کیتھی بچیا ہوندا۔'' بات پھس گیا ہم!'' ''تاں
وت ہن کیا مشکل آ گئی؟'' ''وعدہ کیوں نبھیندے پئے ہو؟'' ''تیکوں پتہ اے جو اے میڈی بہوں وڈی جت اے۔ حکومت نے چولستان
کیتے بہوں ساریاں سکیماں منظور کر گھدن۔ تے میں انہاں کوں خوشی دی خبر سنواون دا وعدہ کیتا ہا۔'' ''تے او کیتھاں اے؟'' ''تھی
سکدے جو سکھو ویچ گئی ہووے۔ تاں توں او کپڑیاں دا یک اوکوں آپی طرفوں سوغات دے طور تے ڈے ڈیویں!
''چنگاں۔ کئی واری تاں اے آکھیں۔ میڈا حافظہ ویوں تاں کائی۔'' علی نے سگریٹ بھکائی تے بولیا۔ ''کوئی چنگیں
جیہیں کیسٹ لا کیتھی۔'' ''کیڑھی لاواں؟'' ''کوئی ہیں لا۔'' ''جیپ وچ موسیقی وجن لگی۔'' ''علی جیڑھے ویلے یک قوں جرنلزم دی ڈگری
گھن گیا ہا تاں اتھوں دے مقامی اخباراں وچ پارٹ ٹائم جاب کریندا ہا۔ تاں اتھائیں اوندی ملاقات کیتھرین نال تھی گئی ہئی۔ جیڑھی کیس
پے دی وچ توں شہر دا روتی میلہ دیکھن آئی ہئی۔ اوکوں وی اخبار لکھن بھاندا ہا۔ پھر کرائیں حیاتی گذارن چاہندی ہئی — اتھائیں یک
شام اخبار دے دفتر وچ اوندا اتھیں کیتھی نال تھیا۔ کیتھی سوہنی ہئی۔ بے وڈے ہئی۔ سیانی سوادی ہئی۔ پر حالی تئیں اوندے وچوں کیتے چھوردی
خشبو آندی ہئی۔ ایہ گالھ علی کوں بہوں لوکڑی تے دل چھکوین گئی۔ کیتھی دی حیاتی وچ آون آلا پہلا چھوہر علی ہا۔ وت اوں وطن چھوڑ
ایوں داں پکا ارادہ کر گھدا۔ پر علی دی کار کیتھی دی وہماں تعلیم کیتے پارٹ ٹائم جاب کریندی ہئی۔ او وی یونیورسٹی توں جرنلزم دی ڈگری
گھن چاہندی ہئی۔ ڈینہ کوں پڑھدی۔ رات کوں کم کریندی۔ علی دا ترائے سال دا کورس پورا تھی گیا ہا تے کیتھی دے ہالی ڈھیر مہینے باقی ہن۔
ایں کیتے علی نے کیتھی کوں منگنی دی مندری پوائی ہئی۔ تے آون آلے ڈینہاں دے سوہنے بھاتوڑیں وعدیاں تے چھکویں خاباں دے
آسرے ڈوہیں یک بئے توں وکھرے تھی گئے۔ او وی ڈو ڈینہ دا سیاہ ہویا یک لوہاں جیہوں اتھاں لگی آئی ہئی۔ تے ہن ایں لیے پرتوں
ہٹ پئی ہئی۔ بچے کتھیں تے ڈور تے ڈنگ پے گئے ہن۔ گئی کیتھیں کر ڈو دے ڈال تھی ویندی ہئی۔ حقہ دے دی کار لسلہ دے اکھیں وچ
گھیر ایہہ گیا ہا۔ پر علی اوکوں لا کوڑ اھڑ سلے ڈالی آندا ہا۔ تے اوکوں ڈسیندا پیا ہا۔ جتانیاں دے گھنیپ اتوں وی تھیوا چنگاں وتاند را ہن
تے بیا ایہہ جو اساں آپ گھا آپ ڈو ویسوں۔ تے ایں راہوں تے ایں کریسوں۔ کیتھی لا کوڑ اھڑ یاسیاں ڈیندی آئی پئی۔ جیڑھے ویلے پرے
کجھ لوکاں دی بوڑ جھیں ڈسی — ڈرائیور دے دل تے پورا لگا جو اتھاں یک ٹھیرا نے شوت ترجیں جو ان سب کٹھے ہن۔ شوت کوئی
پرتیا سوجھ ہوئی۔ علی نے کیتھی کوں ایہو ڈسایا۔ کیوں جو پرے توں کجھ وی پتہ نہ چلدا پیا ہا۔ جیڑھے او کجھ ڈرائیور دے گھیتے تاں علی نے ڈٹھا
جو تے ون تے یک چھوٹا ٹرک کھڑا ہا۔'' ''اوہ'' علی بولیا۔ ''میڈا خیال اے جو کوئی واقعہ تھی گئے۔'' ''واقعہ کیجھا واقعہ؟'' کیتھی بولی۔ ''اوہا

میں تیکھوں ڈیہاں ہاں ۔۔۔ جو ر تیز ے تیز چلے کوئی تریہے کوں مرن لگدے ناں اوہ ۔۔۔''

ایں مدوچ اوہاں وچ چٹھی پتا تھی تھیندی رہی۔ تے وچھوڑے دے راتاں تے میل دے ڈیہاں دیاں کہانیاں اوہ اک بئے کوں سنویندے ریہے۔ ایں امید تے کہانی اگوں ودھدی رہی۔ ڈو مہینے پہلے چٹھی اپنے وعدے موجب اتھاں آ گئی ہئی۔ علی دے ماپیاں اوکوں قبول کر گھدا ہا۔ اوہا قاعدہ مسلمان تھی گئی ہئی۔ اوہ انہاں نال کٹھے رکھیا گیا ہا۔ پر علی اوکوں بالی تو میں چٹھی ای آہدا ہا۔ چٹھی پڑھدی ہئی جتی مونہہ کیتے یورپ دے پکے کیوں ہا اوہ کوئی پیسے کٹھے کرتے آئی ہئی۔ پر علی آکھیا ہا جو اوہ پتا ہئی مونہ تک ٹہوکڑی تے وکھری جاوے تے منجھن اتھاں واقعی اوہ اپنیت دی بوند ہوی۔ اوڈو ہیں ہے جار کلندی ہوئی چپ کر بیٹھ ہوی۔ لے کھیپ ہوون ووت ڈیکھوں ہوئی تھیندے ۔!

عام طور تے عاشق تے معشوق دنیا توں ہٹ کے اک جہاں وساون دا سوچیندن۔ جیکر اتھاں جہاں پل دے نیں تاں اتھاں وچ کر ایں ڈکھاں چاہیدا اے۔ اوہ تے آ ٹھے نشہ ایوں آلیاں کو کھیں ہن تے چٹھی دا دل دھڑک پیا ہا۔ اوہ جاطبی ہئی جو ایشیائی لوک جذباتی ہوندن۔ محبت دی ترٹ تے کریندن تے انہاں دی محبت رلوں دی کا گلی ہوندی۔ اوکوں علی دا ایہ چنگا انداز تے جوش بہوں بھاندا ہا۔ ''اچھا، اچھا'' چٹھی بولی ۔۔۔ جلدی نال انہاں دے تیز تے پچھے۔ ''اساڈے کوں بہوں پانی اے۔ تے کافی دے اے۔ اساں انہاں دی مدد کریسوں۔'' ''علی تھولے پیندے تے بیپ روک گھدی تے بولیا۔'' توں حالی بہہ میں ڈیکھ کراہیں آندا ہاں۔'''' ایہ پولی تاں گھدی ونج۔'''' چٹھی نے تھرموس اگوں کیتی۔'''' علی نے تھرموس اپڑ گھدی تے اوں بھجڑے دو ڈ ریا۔'' ہیں حیرت تے علی کوں ڈیکھن لگے۔ علی انہاں دے بولی اچ انہاں کوں سلام کیتا تے بولیا۔'' سنگت ! کیا تھیا ہے ؟'''' کہیں ولدا نہ ڈتا۔ بس تر تر اوکوں ڈیہندے ریہے۔'' وت علی ہک ہک شکل ڈیکھن لگیا۔ ہک شکل۔ پلی تک۔ ہک بندہ۔ ڈو بھا بندہ۔ سب دے جہاں دے کھلوتیں ہن۔ سب دے جہاں دے پیلے ہن۔ سب گونگے ہن چپکے ہن۔ سب دیاں اکھیں روندیاں پیاں ہن۔ اچانچیت علی دی دید اللہ وسایے تے ٹک گئی۔ ''اللہ وسایا۔ بھرا اللہ وسایا'' اوہ چیخ کراہیں اوندے کول گیا۔ ''ڈس کیا تھیے بھرا۔ میکوں ڈسا۔ اوں اکھیں تو گھدیاں۔'''' کیا میکوں سنجاپے؟'''' علی تے آکھیا۔'' اللہ وسایے تے ''ہا'' وچ سر ہلا ڈتا۔'' اوہ نہی ویلے ہک تریت دی چیک نکلی۔ تیز اوں بھوں مرداں توں پرے بھری کھڑی ہئی ۔۔۔ علی ڈٹھا اوہ زینت ہئی۔ ''زینت بھین ! کیا تھیے ؟'' اوہ اوندے تیز دے لا گیا۔ ''علی سائیں ۔۔۔ علی سائیں ۔۔۔ اوہ چیکاں مار کراہیں روون لگ گئی۔'' اوا ساڈے کوں رس گئی اے !''

''کون ؟'''' سکھو'' ''سکھو ۔۔۔ سکھو ۔۔۔'' ''کیویں ۔۔۔ کڈاں ۔۔۔ کیوں ؟'' تریہے کوں تریہہ ترپھدتے ۔۔۔ ''تریہے توں ۔۔۔ پر اوہ تاں رتھڑے دے بھوگ جا نڑ دی ہئی۔'' کل رات اوہ آپلی ہک سنگتانی کوں ملن نال دی وتی گئی ہئی۔ سویر تو لی ہاں ولی تاں بھوکوں پتہ تھئی۔ سنگتانی دے گھر دں پتہ کیتا ہاں پتہ لگا جو اوہ اتھاں گئی ای کا ہیں۔ وت گولیندے گولیندے اساڈی اکو دن تے نکلے ہوئے اوندے بوچھن تے گئی۔ اوہدی ٹکالی تے اتھاں پیتے، پر سکھو گئی ہئی۔'''' سکھو گئی گئی ۔۔۔ زینت ہٹکن لگی۔ علی نے بھوں دی طرفوں منہ پھیر گھدا تے جنگل ڈو منہ کر گھدا۔ اوں نہی ویلے زینت بھکو چوں نکل آئی تے الائی '' علی سائیں۔ رکے بئے سکھو ایہ تھیوں لالا پا۔ ترتی نئے تھی گئی ہئی۔ اوہ ہر زینت تہاڈی راہ ولیندی ہئی۔ روز خواب ڈیہدی ہئی ۔۔۔ روز چکھیں دی کا رکھاں ہیں کریندی ۔۔۔ علی سائیں ! ۔۔۔ سکھوں پھیرا ہا سکھو دی تریہہ ہئی۔ علی سائیں ! ۔۔۔ سکھو ملی تھو کراہیں وگ دی سنجیں کر گھدی ہئی۔ علی سائیں ! ۔۔۔ سکھو کوں پتہ پا جو او بٹے تے ملا۔ کتھاں کتھاں ہن ۔۔۔ علی سائیں، میڈی سکھو ۔۔۔ علی سائیں، میڈی سکھو ۔۔۔

علی نے مونہہ کر کے ویکھیا۔ ریحہ دے اُتے اک لاش پئی سی۔ جیہدے تے اوہناں لال چادر سٹ دتی سی ــــ اوہدے تے اک کالی چادر وی سی تے ویہڑے شیشے لگے ہوئے سن۔ اوہ روہی کھڑی سی۔ اوہدے ول کھڑی ہووے اشارے کر دی کھڑی ہووے ــــ علی نوں اک دم پتہ لگا کہ؟؟ اوہ شیخ تے تنبیل دی نال دا ویر ہے جیہڑا اکھاں دے سامنے گزر رہیا سی جیہنوں اوہ بھل گیا سی تے اوہ آکھ رہیا سی ــــ سچ کون اے جیہڑے تکلیف نے آ کے اکھیا "کوئی گل نئیں ــــ میں اوہنوں کوئی نئیں وے لگ کے رو پیا" علی دا دل بے اختیار تیز ہو گیا اوہ بہوں پکڑ کے پکار رہیا اے، پر اوہنوں چیتے آ گیا اوہناں دے سچ وچ سکھ دا پتہ آ گیا "علی سامنے اوہ اک دی موت نوں اپنی اکھیں ویکھ رہیا اے۔ بھاویں اوہ پانی دی تاں تکھ ہووے، بھاویں بھاویں دی ـــ "اوہ اندر آ کے ـــ اوہ سکھ دے ویر نوں تے آپ اوہ رکھدیوے تے آ گئے ـــ اوہ لیٹے دلیں دی دی شانی دا رواجہ اے اکھاں وچ ہر شے گئیاں ـــ توں "صادق روات" بانویں اوہ دیوے دی نال دیاں میں ہونے دے بندیاں دے قابل ہاں ہم۔ مینوں معاف کر دے ـــ مینوں معاف کر دے ـــ میں ایہ ای ودی بھار نوں چا کے ہور اہل رہ سکدا ہاں" اوس ایہ اوہ لال پانی دی بھری ہوئی گلاس نوں بھویں تے رکھ دتی۔ تے چپ دو وجہ دو کڑی لادتی۔ ایہ اوہ نال اندر بیہ کر کے اوہ باہر کر گئی۔ تکھی ہوائے دروازے وچ آندی رہندی پئی سی۔ پر اوہ تیپ دی لاکھ رہی سی۔ سکھ دی وروں پی آواز ـــ اوہ دے چوہان پھیریاں مریندی پئی سی اوہ تے یار آ لاتے اوہ کے مینوں ہتھاں کریندی ڈراں کریندی تواب خطرے دا دیوے بلیندی ہتھ جوڑ کے کریندی ـــ تے یار آ لاتے اوہ کے مینوں ہن۔

(ختم شد)

نوٹ: خدا کا شکر ہے جو ذمہ داری محترمہ بشریٰ رحمٰن اپنی زندگی میں میرے سپرد کر گئیں آج وہ پوری ہو گئی۔ ایک غیر مطبوعہ ناول "[illegible]" اختتام پذیر ہوا۔ ان کی خواہش تھی کہ "تخلیق" میں شائع ہونے کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کریں گی۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" مگر کسے خبر تھی کہ وقت انہیں ہم سے جدا کر دے گا مگر میری ماں میرا عہد برقرار ہے۔ آپ کی یادیں جب تک میری زندگی ہے "تخلیق" میں ہمیشہ شائع ہوتی رہیں گی۔ اللہ آپ کی آگے کی منزلیں آسان فرمائے۔ آمین! (ادارہ تخلیق)

◆◆◆

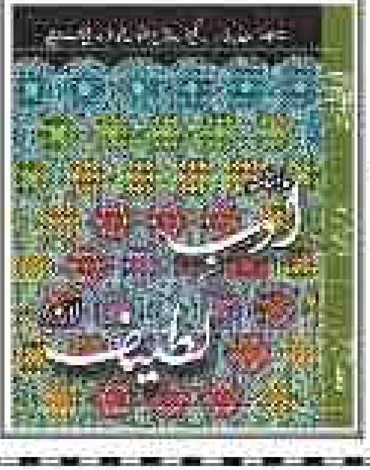

1935ء سے شائع ہونے والا ادبی جریدہ

ماہنامہ **ادب لطیف** لاہور

مدیر مظہر سلیم مجوکہ اور نائب مدیر شہزاد نیر کی سرپرستی میں ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کر چکا ہے۔ مسلسل ادبی خدمات پر ادارہ "تخلیق" کی طرف سے مدیر اور نائب مدیر دونوں کو مبارک باد۔

قیمت -/800 روپے ـــ سالانہ زرِ اعانت مبلغ -/5,000 روپے

ملنے کا پتہ: کتاب مرکز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

(0333-4377794, 0321-8110989)

سفرنامہ

سفرنامہ تھائی لینڈ

.......3.......

ڈاکٹر محمد رفیق خان

ایکسپریس ہوٹل وچ رہائش دی پہلی رات تے شاپنگ مال دی سیر گشت

ایکسپریس ہوٹل دے کمرہ نمبر 105 وچ جا کے ایہہ ویکھیا کہ نہ ای کوئی بتی جل رہی اے تے نہ ای ایئر کنڈیشنر چل رہیا اے۔ ای استقبالیے تے فون کیتا تے اک خاتون تشریف لیائی۔ اوس نے ساہنوں سمجھایا کہ چابی نال جڑی ہوئی پلیٹ لگی ہوئی اے اوس نوں دیوار دے نال لگی ہوئی پلیٹ وچ لگانا ہوندا اے۔ اوہنیں ساہنوں لگا کے وکھائی۔ بس پلیٹ لگان دی دیری کہ ساریاں بتیاں جل گئیاں تے ایئر کنڈیشنر نے وی کم کرنا شروع کر دتا۔ کمرے دے وچ ڈبل بیڈ روم فریج، ٹیلی ویژن، دوسرا بیڈ یعنی کہ ساریاں سہولتاں موجود سن۔ کپڑے ٹنگن والی الماری دے نال اک ریک جیہاں ہویا سی تے اتے لکھ کے رکھیا ہویا سی کہ کافی بالکل مفت اے۔ ریک دے اگے جڑی ہوئی اک میز دے اتے اک الیکٹرک کیتلی پئی ہوئی سی تے نال لکھیا ہویا سی کہ کافی دے علاوہ جیہڑی چیز ان جیہاں کوئی استعمال کرے گا اوہدا بل ادا کرے گا۔ میز دے اتے کافی، کافی میٹ تے چاء دے ٹیگ پئے ہوئے سن تے باقی چیزاں وچ سافٹ ڈرنک مختلف جیہی سیون اپ وغیرہ دے ٹین پئے ہوئے سن۔ ریک دے اتے ایہہ ویکھیا کہ چار بوتلاں جنہاں وچ ہر بوتل دی شکل وکھری وکھری بنیاں ہویاں سن۔ ای سوچیا کہ ہوٹل والے مختلف قسم دے شیمپو پیش کر دے نیں۔ جدوں ای قیمتاں دی تفصیل پڑھی تے پتہ چلیا کہ مختلف قسم دی شراب دیاں بوتلاں نیں۔ کسی کوئی بوتل دی 500 بھات توں گھٹ نہیں سی۔ بھاویں مہنگیاں ہون یا سستیاں ایہہ پتہ چل گیا کہ ایہہ ساڈی دلچسپی دا مال نہیں۔ ساہنوں ایہہ وی پتہ نہیں سی کہ کیتلی نوں کس طراں استعمال کرنا ایں۔ جتھے وی جاؤ نویں قسم دی کیتلی نظر آؤندی اے۔ ای کیتلی نوں پلگ کر کے کئی واری آن آف کیتا پر ایہہ بالکل نہ چلی۔ اس استقبالیے تے ٹیلی فون کر کے نوں سمجھاؤ کہ ساہنوں کیتلی دا استعمال سکھایا جائے۔ تھوڑی دیر نال اک خاتون آ گئی۔ اوہنیں ساہنوں طریقہ سمجھا دتا۔ بس ای کافی بنائی پیتی تے سو گئے۔ نماز ظہر تے عصر ای اکٹھی پڑھ لئی پر جیٹ لاگ دی وجہ توں جدوں اکھ کھلی باہر خاصا ہنیرا ہو گیا سی۔ اوہدے بعد ای تھلے اتر آئے تے استقبالیے تے بیٹھی کڑی کولوں پچھیا کہ کیہ ہوٹل دے قریب کوئی پاکستانی ریسٹورنٹ اے۔ کڑی نے جواب دتا کہ اتھوں کوئی زیادہ دور نہیں۔ شاید اوہدے دماغ وچ کوئی عرب ریسٹورنٹ سی جیہڑا قریب سی۔ ہوٹل توں نکلن دے بعد پیدل چلدے کجھ دور واقع سی۔

جس طراں الیس توں پہلی قسط وچ بیان کیتا جا چکیا اے کہ ایہہ پاکستانی ریسٹورنٹ دے بارے وچ استقبالیے تے تشریف فرما

کڑی نوں پچھیا ای۔ اوس دی نصیحت دے مطابق اسی لگے۔ جدوں ہوٹل توں نکل کے کجھے مڑے تے کی ویکھیا کہ تن چار رکشے کھلوتے سن جناں دی شکل پاکستانی رکشیاں توں بالکل وکھری سی۔ اوہناں دی لمبائی تے چوڑائی بہت زیادہ سی۔ پچھلی سیٹ تے دو مسافراں لئی سی فیر وی اوہ تھاں سی کہ تن مسافر بڑے آرام نال بیٹھ سکدے سن۔ ہوٹل توں باہر آون والی سڑک توں پہلاں ٹو ٹو گرانڈ ڈیپارٹمنٹ اسٹور شکل دیاں دکاناں سن۔ درمیان وچ میرا خیال اے تن دکاناں مالش کرن والیاں دیاں سن۔ اسی گزرے اساں تے دکاناں دے باہر بیٹھیاں کڑیاں تھائی زبان وچ پچھدیاں سن کہ "سر مالش کروانی اے تے تشریف لیاؤ۔ بڑی سکون بخش مالش ہووے گی۔" اسیں اوہناں ول دھیان نہ دتا ایہہ گل کہہ کے "اج کمیں فیر سہی" اگے نکل گئے۔ کجھے پاسے مڑن توں پہلاں اک میوہ جات دی دکان سی جتھے اندر مرداں سوٹ ٹنگے ہوئے نظر آ رہے سن۔ کجھے ہتھ ای مڑے کہ اک رکشے والا جیہڑا کہ 50 سال توں گھٹ اے ای لگدا سی دوڑ دوڑ ای نکل کے ساڈے کول آیا تے ساہتوں پچھیا "سرکار کتھے جانا اے؟" اسی اوہنوں دسیا کہ ملیاں اے کہ ایتھے قریب ای کوئی پاکستانی یا انڈین ریسٹورنٹ اے اوتھے جانا اے۔ اوہ کہن لگا کہ اوہ تے بہت دور اے تسی ساہتوں صرف 40 بھات دے دیو تے میں تہانوں اوتھے لے جانا واں۔ فیر اسی اوہنوں کھانا پایا تے تھوڑی دور اگے جا کے اک نوجوان نوں پچھیا کہ اسی کسے پاکستانی یا انڈین ریسٹورنٹ دی تلاش وچ آں۔ اوہنیں دسیا کہ کون اوہدی گل سجھی۔ اوہدی رکشے والا ای پرکھدا پیا سی۔ کہن لگا کہ تسی 50 بھات دیو تے تہانوں پہنچا آندا واں۔ اسی واپس پہلے والے رکشے ول رجوع کیتا۔ اوہ فوراً ای رکشہ لے کے آ گیا تے ساہتوں بٹھایا۔ اوہ اک مارکیٹ دے اندر آ گیا۔ جدا ناں یاد نہیں رہیا۔ دور وں ای اشارہ کیتا کہ ایس چوڑی قسم دی مارکیٹ دے اوس پاسے کجھ انڈین تے کجھ پاکستانی ریسٹورنٹ نیں۔ جان لگیاں کہن لگا کہ میں انتظار کراں تاکہ واپس وی لے جاواں۔ جدوں اوہ ساڈے نال گل کر رہیا سی تے پولیس دا اک گارڈ آ گیا تے اوہنوں اوتھے ڈانٹ پئی۔ آ ڈن لگیاں ساڈے کن وچ ایہہ گل وی پان دی کوشش کیتی کہ جے کوئی عیش وعشرت لئی خاتون چاہیدی ہووے تے اوہ وی حاضر کیتی جا سکدی اے۔ بہر حال اسی اوہدی گل سنی ان سنی کر دتی تے جدھر اوہنے دسیا سی اودھر چل پئے۔ دوسری طرف پنجن تک کوئی چار پنج دکاناں بن سجیاں کہ جتھیاں والا سی۔ اسی گزردے جاندے ساں تے بڑا دے توں تھائی یا انگریزی زبان وچ مالش لئی بلاوے دیاں آوازاں کناں وچ پے رہیاں سن تے اسی سنی ان سنی کردے اگے گزر رہے ساں۔ شروع دے وچ تے اک دو بار اے جتھے زیادہ تر شراب نال تواضع کیتی جا رہی سی۔ کوئی تن دکاناں چھڈ کے اگے "حسین" ریسٹورنٹ سی۔ اسی اوہناں تے نہ پڑھیا البتہ اک درمیانے جیہے قد دا نوجوان باہر کھلوتا سی جیہڑا ساہتوں شکلوں پچھان گیا کہ ایہہ بندے پاکستانی ریسٹورنٹ دی تلاش وچ اے۔ اوہنیں ساہتوں دسیا کہ جناب تسی صحیح جگہ آ گئے او۔ اسی ریسٹورنٹ وچ گئے تے کی ویکھیا ریسٹورنٹ دا مالک اک نوجوان اے۔ گپ شپ تے پتہ چلیا کہ ایہدا تعلق کراچی نال اے تے انتظامیہ وچ اوہدی بیگم دی برابر دی شریک اے۔ اوس دن اوہناں دا چھوٹا بچہ نال تے پیار اجیہا بچہ وی ایدھر اودھر کھیڈاں کر رہیا سی تے بہت خوش نظر آ رہیا سی۔ مالک نے اپنا ناں باقر دسیا تے بچے دا ناں حسین۔ بعد دے وچ ساہتوں ایہہ گل وی دسی کہ ایہہ ناں دی نسبت نال ریسٹورنٹ دا ناں وی "حسین" اے۔

ساڈے اگے مینیو لیا کے رکھیا گیا۔ جدے وچ مچھلی، چکن دے ناں، بریانی، دال تے شامل سن۔ ساہتوں پچھیا گیا کہ کیہ کھاؤ

گے۔ ساڈا جواب صرف ایہو سی کہ کجھ کھوا دیو۔ تجر پہلا دن سی ای چکن قورمے دی فرمائش کیتی۔ جتھوں دی بیرو جیہن وچ تھائی لڑکیاں کم کردیاں سن جنہاں نوں کھانے پکان دی خوب تربیت دتی گئی ہوئی سی۔ اک پیالے دے وچ چکن قورمہ لیا گیا تے نال چپاتیاں تے اوس توں پہلاں سلاد۔ اسی کھانے ساں تے مسکین ساڈے کول آ گیا تے اوہنیں دی سلاد رکھنا شروع کردتا۔ اوس دیکھے ساہنوں اوہ بہت ای چنگا لگا۔ اوہنوں تک کے ساڈا اول کرریا سی کہ اوہ وی ساڈے نال ای روٹی کھائے پر اوہدی ماں نے اوہنوں اٹھا دتا تے اوہ رون لگ پیا۔ قورمہ تھائی لینڈ دے حساب نال تے بالکل ٹھیک سی کیونکہ اوتھے شوربہ وغیرہ اس طرحاں تیار ہوندا اے کہ چکن الگ اپال لیا تے کری الگ بنائی تے بعد وچ ملا کے پیش کردتا۔ ساہنوں کوئی اس طرحاں دا معاملہ ای لگا۔ فیر وی اسی کھانے توں خاصا لطف اندوز ہوئے۔ گرم روٹی ساڈی کمزوری اے۔ گرم روٹی مل جائے تے نال بھاویں کجھ وی ہووے ساہنوں چنگا لگدا اے۔ کڑی وہ روٹیاں لیائی۔ اسی اک واپس کردتی تے آکھیا ایہہ ختم ہو جائے گی تے دوجی لے کے آئیں۔ بس ایس طرحاں گرم روٹی ملدی گئی تے اسی لطف اندوز ہوندے گئے۔ کھانا کھان دے بعد باقر کہن لگا کہ چاہ نے پینی گے۔ اسی کیہا ضرور۔ فیر اسیں دوواں نے رل کے چاہ پیتی تے ایدھر اودھر دیاں گلاں کردے رہے۔ بل آیا تے کہن لگا 200 توں کجھ زیادہ اے پر تسی 200 باٹ دے دیو تے چاہ میری طرفوں۔ بل ادا کیتا تے 20 باٹ اسی اوس لڑکی نوں ٹپ دتی جیہڑی خدمت گزاری وچ لگی رہی۔" کھانا کھان دے بعد اسی کجھ عام معلومات لین لئی گل بات شروع کیتی۔ پہلی گل ایہہ پچھی کہ ایمپرس ہوٹل ایتھوں کناں دور اے؟ جواب ملیا کہ ایتھوں پیدل صرف چند منٹ دا رستہ اے زیادہ توں زیادہ دس منٹ لگ لو۔ اسی اوہنوں رستہ پچھیا تے کہن لگا کہ مارکیٹ دے گیٹ توں اٹھو تے کھبے مڑن دے بعد سدھے چلدے جاؤ تے 8 یا 10 منٹ پیدل چلن دے بعد ایمپرس ہوٹل آ جائے گا۔ اسی اوہنوں دسیا کہ رکشے والا تے اپنے سیدھے رستے توں ہیں لے کے آیا۔ باقر کہن لگا کہ بس اوہ ایدھر اودھر چکر کٹ کے آیا اے صرف ایہہ دن لئی کہ اوہنیں کرایہ چاہدا لیا اے۔ دوسری گل اوہنیں ایہہ دسی کہ ایتھے سب کجھ حلال ایس لئی مل جاندا اے کہ شانگ مائی دی آبادی وچ کوئی اک تھائی مسلمان شامل نیں۔ تے کل آبادی دا کوئی 36 فیصد نیں۔ ایہہ سے علاوہ مسلمان خاصے اچھے عہدیاں تے وی کم کردے نیں تے اوہناں دی اک ٹھیک ٹھاک اہمیت اے۔ فیر اسی باقر دے دسن دے مطابق چلدے آئے تے واقعی 10 منٹ بعد ہوٹل والی گلی وچ پہنچ گئے۔ اوہدے بعد اوہ رکشے والا کدی وی نہ ملیا تے کیہا اسی رہ گیا کہ 40 باٹ صرف۔ اسی اوہنوں بالکل نظر انداز کر دتا۔ اک دن صاف اسی اوہدے نیڑے آ کے کہن لگا کہ کوئی عورت شورت چاہیدی ہووے تے حاضر آں۔ اوس وقت پہلے دن دی فلم ساڈے سامنے آ گئی۔ سوچیا کہ اوس نوں پولیس گارڈ کیوں نہ بلا لیا گیا سی۔ اوہ گل وی ایہو سی کہ گارڈ نوں اوہدیاں ایہناں غلط کاریاں دا علم سی۔

واپسی دے دوران اسی اک جگہ ٹورسٹ انفارمیشن سروس لکھیا ہویا ویکھیا۔ اسی ایہناں دا لائق دفتر اج تک کسے شہر وچ نئیں سی ویکھیا جناں کہ شانگ مائی وچ ویکھیا گیا۔ رستے دے وچ ایک کمپنی دا دفتر وی سی جیہڑے ٹور تے لے کے جاندے سن۔ اسی اندر جا کے خاتون نوں پچھیا تے اوہ ساہنوں کہن لگی کہ تسی مرے نال آؤ تے میں تہانوں ٹیجر کال دن نال ملواں۔ پچھواڑے لے گئی تے فارغ ایال ٹیجر نال ملایا جیہڑا خود دی گھر جان لئی پر تول رہیا سی۔ کہن لگا کہ چاہ ختم دے ٹور تسی رات نوں فیصلہ کر کے صبح میں نوں ٹیلیفون کر دینا تے اسی تہانوں ہوٹل توں پک اپ کر لاں گے۔ فیر اوہ صبح بالکل نال آئی کیونکہ صبح ٹیلیفون کرن دی کوشش کیتی تے پہلی

فون نہ مل سکیا۔ فیر اسی ایس خیال تے کہ صبح جلدی اٹھنا اے لہٰذا جلدی سوں جانا چاہیدا اے۔ کمرے پہنچے، جلدی نال اک کافی دا کپ پیتا تے سوں گئے۔ صبح استقبالیہ دی طرفوں ٹیلیفون کال آئی جہنوں کہ "ویک اپ کال" کروانا آکھیا جاندا اے۔ چھیتی ای میں اٹینڈ نہ کر سکیا تے دوجی واری ہتھ روم وچ آ گئی۔ اسی جواب دتا کہ اٹھ بیٹھے آں بڑی مہربانی تے بہت بہت شکریہ! کال آؤن دی وجہ ایہہ سی کہ اسی استقبالیہ نوں پابند کیتا سی کہ چونکہ اسی ٹور دا ارادہ رکھدے آں لہٰذا ساہنوں صبح چھ وجے جگا دتا جاوے۔ چنانچہ تعمیل ہوئی۔ ایسے لگ گیا اے کہ اسی تھوڑی دیر ٹیلیفون کیتے تے نال استقبالیہ دیاں کڑیاں نوں وی کروائے پر کسے طرفوں کوئی جواب نہ ملیا۔

صبح اٹھ کے جناب فارغ اقبال صاحب نوں وی ٹیلیفون کردے رہے تے ساہنوں کوئی جواب نہ ملیا۔ سوچیا کہ چلئے آں تے اپنا سارا معاملہ استقبالیہ اگے پیش کریئے آں۔ استقبالیہ تے مخلوطیاں کڑیاں دا ودا مسئلہ اے سی کہ چار دا چار مشکل نال کوئی اک تھوڑی بہت انگریزی جاندی سی۔ اک نوں کیہا تے اوہ وی نوں ہور وی انگریزی بولدی دی لوڑ سی تے لکھ وی سکدی سی نوں بلا لیائی۔ پہلا مرحلہ شکل ہیوزا ساڈے تے آگیا اوہ اے سی کہ اشتہار دیکھدیاں ساری کڑی کہن لگی کہ ایہہ تے موبائل فون نمبر اے۔ ویکھ کے ساہنوں کہن لگی کہ صرف 11 وجے تک گھن گے۔ میں رابطہ کرن دی کوشش کرلئی آں کیا تہانوں منظور اے؟ میں ظاہر اے اگوں کیہ کہنا سی۔ اُس چھیتی ای دیائی جان دی کڑی اہدوں نال دیوتوں مرضی دے خلاف شادی کرن توں اہدوں بھاتویں کالا کرنا رئی ہووے پر زیر دیا ڈ ایہہ ای آکھدی سی کہ قبول اے۔ اساں وی بس کجھ ایس طراں ای "قبول اے" کہہ دتا کیونکہ ہور کوئی چارہ وی نہیں سی۔ مسئلہ صرف ایہہ سی کہ ساڈے کول صرف اک دن سی جہدے وچ میں شانگ ہائی دے مناظر ویکھ سکدے کیونکہ اگلے دن تے چل سو چل کانفرنس ہونی سی۔ ساہنوں خاصی پریشانی ہوئی ایس لئی کہ میں رات گھر اک ٹیلیفون کال کر چکے ساں تے حالاں اک او مشورہ وی کرنی سی۔ پاکستان وچ ٹیلیفون کال حیرت دی حد تک سستی گئی کیونکہ اسی انٹرنیٹ توں امریکہ کال کردے رہے آں جہدی کہ چند روپیاں وچ ہو جاندی سی۔ صرف اک موبائل فون تے اینی مہنگی۔ خیر اوہدی اک وجہ ایہہ وی سی کہ ہوٹل والے اصل قیمت دا تن چار گنا مل چارج کردے نیں۔ ایہہ سے پچھے کیہ فلسفہ اے میرے اج تک پلے نہیں پیا۔ مینوں یاد آ رہیا اے کہ چھوٹاں میں تے ایرک رحیم گڑھی گئے تے ایرک نے اپنی ووہٹی بچیاں نوں ٹیلیفون کال کیتی جدا بل ایرک لئی کے حد تک پریشان کن ثابت ہویا۔ خیر کڑی نے دی کال ملا دتی خیر نال کال کر کے اسی اپنی خیر خیریت دی گھر والیاں نوں اطلاع دے دتی تے ہر لحاظ نال مطمئن ہو کے اسی شانگ ہائی دی سیر دا فیصلہ کر لیا۔ کڑی نے کیہا کہ تہاڈی ٹورسٹ گائیڈ وی گڈی آ گئی اے۔ میں تفصیل پچھی تے اوہنیں دسیا گڈی دے وچ تہاڈے نال دوجے وی مسافر ہون گے۔ ہر اک دے اگے ناں لکھیا ہویا اے۔

ڈرائیور === پنگ (Ping)　　گائیڈ === بین (Ben)

سیاح: 1- مارک (Mark) آسٹریلین 2- وکی (Vicki) آسٹریلین (مارک دی ووہٹی)

3- سونیا (Sonia) آسٹریلین (مارک دے خاندانی دوست)

4- ناگاٹا (Nagata) جاپانی

لو جی! ساڈا قافلہ دو دیے ہوٹل توں چل پیا۔ اگے کیہ ہویا اگلی قسط وچ ملاحظہ فرماؤ۔

(جاری ہے)

◆◆◆

انشائیہ

قربانی

مراد خان

قربانی کی دو یادیں منائی جاتی ہیں ایک ذوالحجہ میں دوسری محرم الحرام میں۔ پہلی قربانی سیدنا ابراہیم خلیل اللہ اور سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ کے حسن عمل کی تمثیل ہے اور دوسری سیدنا حضرت حسینؓ کی صداقت و استقامت کی یاد میں۔ پہلی میں یہ پیغام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے پیاری سے پیاری چیز قربان کی جائے یعنی اپنی چاہت دل کو بھی منشائے الٰہی کے تابع کر دیا جائے۔ اور دوسری قربانی یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے لئے حق کا اعلان کیا جائے اور جبر و زور جو انسانی خواہش ہو تسلیم نہ کیا جائے بلکہ منشائے ربانی کا ساتھ دیا جائے۔ آیئے ہم سوچیں تو سہی کہ ہم کون سی قربانی دے سکتے ہیں؟ ہم کسی عزت دار اور معزز غریب رشتہ دار کی عزت کو بچانے کے لئے کیا کردار ادا کرتے ہیں؟ کیا کبھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟ کسی فاقہ کش کے ہاں دال روٹی کا اہتمام کیا ہے؟ کسی بیمار مجبور و غریب کے علاج کے لئے ذاتی و عملی قربانی دی ہے؟ کسی یتیم بچی یا بچے کی خوراک و لباس اور تعلیم کے لیے کوئی قربانی دی ہے؟ کسی غریب و مرحوم کا قرض اتارنے کی قربانی دی ہے؟ کسی عفت مآب و نادار بچی کی شادی و نکاح و عصمت کے تحفظ کی قربانی دی ہے؟ کسی مجبور و مظلوم معصوم کو جابر و ظالم سے نجات کی قربانی دی ہے؟ کسی بے سہارے کو سہارا دینے کی قربانی دی ہے؟ جس رشتہ دار سے آپ نے ناراضگی کا تسلسل قائم کیا ہوا ہے کیا آپ نے اسے معاف کر دینے کی قربانی دی ہے؟ آپ بڑے افسر ہیں کیا آپ نے اپنے کم گریڈ ماتحت کو عزت دینے کی قربانی دی ہے؟ آپ وقت کے پابند اور با اصول شخصیت ہیں کیا آپ نے وطن و قوم کی ترقی کے لیے اجرت کے بغیر فالتو وقت کام کرنے کی قربانی دی ہے؟ آپ ڈاکٹر و معالج ہیں کیا بغیر فیس کے کسی مجبور کے لیے تعاون کی قربانی دی ہے؟ آپ وکیل ہیں کیا کسی نادار موکل کے حقوق دلانے کی قربانی دی ہے؟ آپ ٹیچر ہیں کیا کسی غریب طالب علم کے لیے مفت رہنمائی کی قربانی دی ہے؟ آپ سیاسی رہنما ہیں کیا آپ نے اپنے حلقہ انتخاب کی سہولیات پورا کرنے کے لیے قربانی دی ہے؟ آپ اکانومسٹ ہیں اپنے وطن کے غریبوں کی اکانومی کو بچانے کے لیے قربانی دی ہے؟

بکرا ذبح کر کے فریج میں رکھنے کا نام قربانی نہیں ہے، گوشت کھانے کا نام قربانی نہیں ہے، گوشت کھلانے کا نام قربانی نہیں ہے خواہش دل کو قربان کر کے کسی کو بچانے کا نام قربانی ہے۔ خودکش بن کر مسلم کشی اور انسان کشی قربانی نہیں بلکہ ظلم اور گناہ ہے کسی کو زندگی دینا قربانی ہے۔ خون کی کمی کے مریضوں کو خون کے عطیات دینا قربانی ہے۔ لوگوں کو دستکاریاں سکھا کر اور ہنر مند بنا کر روزگار پر لگانا قربانی ہے۔ ہسپتال بنانا اور فری میڈیکل کیمپ لگانا قربانی ہے۔ مسافر خانے، یتیم خانے بنانا اور ان اداروں کو سہولتیں دینا قربانی ہے۔ انسانیت سے محبت قربانی ہے اور یہی عمل باعث قرب ربانی ہے۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لیے   جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

ایک قربانی وہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی۔ وہ خلیل ربانی ہو گئے ایک وہ قربانی ہے جو حضرت اسماعیلؑ نے دی وہ ذبیح اللہ ہو گئے۔ ایک جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ اور ایک جہاد خواہش نفس پر کنٹرول ہے۔ ایک قربانی دین اسلام کی صداقت کو تسلیم کراتا ہے اور جھوٹ کو رد کرتا ہے۔ ایک بڑی انوکھی قربانی کربلا میں شہدائے کربلا نے دی تھی یہ قربانی شہادت ہے، ایک قربانی غازی علم الدین نے دی تھی یہ ساری قربانیاں تاریخ ساز ہیں۔ اور قربانیاں دینا اسلام میں اللہ والوں کی شان و پہچان بن گئی ہیں تسلسل کردار قربانی کا عروج ہے۔

کافر کے مقدر میں شہادت نہیں ہوتی — مر دینے میں مومن کو صعوبت نہیں ہوتی
مسلم کی شہادت پہ ہے ارشاد حسینی — اللہ کے بندوں کو ہزیمت نہیں ہوتی

اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے والدین جو قربانیاں دیتے ہیں، اولاد دین بوڑھے والدین کی خدمت کے لیے جو قربانیاں دیتے ہیں۔ نرسیں مریضوں کی خدمت کے لئے جو قربانیاں دیتے ہیں۔ اساتذہ کرام طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لیے جو قربانیاں دیتے ہیں۔ وطن کے دفاع کے لیے افواج وطن جو قربانیاں دیتے ہیں صحافی اپنی خدمات کے سلسلے میں جو قربانیاں دیتے ہیں۔ آزادی کی شمع جلانے کے لیے آزادی کے متوالے جو قربانیاں دیتے ہیں ہر قربانی کا اپنا صلہ ہے اور تمام مقدس و جذبہ خلوص ہے جو نیت و ارادہ قربانی میں پنہاں ہے۔ قائداعظم کاروان آزادی کے سالار ہوں یا علامہ اقبال فکر آزادی کے نقش ساز، جلیس حیدر یا کی طویل قربانیاں ہوں یا حکیم محمد سعید کی خدمات سب قابل تعریف اور پیغام امید ہیں۔ جتنا اعلیٰ مقصد ہوتا ہے اتنی بڑی قربانی ہوتی ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ قربانیاں رائیگاں نہیں جاتیں، قربانیاں دینے والے دنیائے فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر ان کا کردار عالی، جذبہ مثالی بن کر زندہ رہتا ہے ان کے احسانات باقی رہ جاتے ہیں۔

ع کردار مر نہیں سکتا آدمی کے مرنے سے

وطن عزیز کو آج پھر بحرانوں نے گھیرا ہے۔ سازش کسی بھی روپ میں ہوں اسی امانت الٰہی، مسکن اسلام پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے مگر سیاسی راہنما ہوں یا سیاسی پارٹیاں، مذہبی رہبر ہوں یا دینی جماعتیں، تاجر ہوں یا صنعت کار، سرکاری حکام ہوں یا ملازمین، عوام ہوں یا خواص ہر ایک کو وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے پھر سے ذاتی مفادات کی قربانی دینی ہوگی، قومی مفاد کو مقدم رکھنا ہوگا، اسلامی وحدت کو مضبوط بنانا ہوگا، بجلی، گیس، پٹرولیم اور مہنگائی کے بحرانوں سے نکلنے کے لیے بچت اور محنت، فرض شناسی اور حب الوطنی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ عیدالاضحیٰ اور محرم الحرام کے مقدس مہینے ہمیں قربانیوں کے جذبوں کو زندہ رکھنے کا پیغام دیتے ہیں تاکہ ہم آپس میں محبت و مہربانیاں اور آسانیاں تقسیم کر سکیں، دوسروں کی ضرورتوں کا بھی احساس کریں کہ مسلمان معاشرے کی بنیادوں میں ایثار و ہمدردی اور محبت کو اولیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت و راہنمائی نصیب فرمائے کہ ہم قربانی کے مقصد کو سمجھ سکیں۔ آمین!

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

◆◆◆

پنجاب رنگ

حنیف باوا

داج

ملاں والے
ویکھے نوں نیں
وعدے کیتے جو
دو جیاں دے شہنشاہ نے
اپنی دھی نوں
دوجے گھر توں ٹوران لگیاں
اک صندوق اک منجی پیڑھی
تے اک بکری وی دتی سی
اوہ میں وی
دو جیاں دے شہنشاہ وی
ایہو ریت ویکھ کے
اپنی دھی نوں
دوجے گھر توں ٹوران لگیاں
اک صندوق اک منجی پیڑھی
تے اک بکری وی دتی سی
پر ایہہ داج
پچھلے کئی ورھیاں توں
پیو دے ویہڑے وچ پیا اے

پر
اج تا کیں ہیوں
ایہو جیہا کوئی نہیں
کوئی نہیں
جیوا
اوس پیو نوں بیٹھا داج نوں چھڈ کے
اوس دا ٹکے داج نوں
بچے کو بھی وی
اوس دی گل چھوں کدے

OOO

محمد عباس مرزا

بیت

رب نوں گنہار موسے وچوں آکھ وکھا
کوئی کے میں ہجاری اگڑا بن جاواں

دروازاں دے ٹھاٹے آگوں ہکاں تے
کی کرزا اے کوئی پیہہ اٹھے آنے پھٹے

ہوری محفل وچ جاواں، اوہ عشق نال
باقی مکن دا کم جیوں دے دیندا اے

میں تے کرنا گھتیں چلیاں یوسف دا
رب جانے کس ا کا اٹھا کے چاڑھیں

ایہ اگنی دا گہرا سو لکھارا اے
میں وی اکلا اوہدی تپش تک ویکھیا

آؤ اوا وی بو پھکاڑ اے چانچا
اوہ کے دیاں پانواں کے ادا اے

اٹ گتے جاگیراں دا میں مالک ہاں
وچاں اندر کھو دیاں جھاں واڈھو نیں

ماتوں بچ نوں وکھرا سیتم کریئے
دسو زور ای جیہدا تے کوئی مرزا اے

دو چار وکھرے تکڑے بہت پیارے نیں
کے نوں وکھن دا تے سوچیں دیدے ای نیں

یار تے جے دوں نوں ماہیا آ گئی جا
اوس دیا تے دوویں ای تے گل گئی

OOO

ممتاز راشد لاہوری

پنجابی بیت

عشق دے وچ گھر تھاں پاندے رہندے نیں
چھپے اپنا آپ وکھالے رہندے نیں

ٹھیاں ٹھیاں غزلاں والے شاعر سن
اج تے میں لکھن پوں تھک کے آیا واں

اپنی سیرت دی خوشبو دا رنگ تے ویکھ
کنے ای اگے نیں فرشتہ من دے گئے

ساریاں نظراں سوہنے جیہے بکھیاں لئی
لوکی لوکاں پرکھاں جہاڑ لکھدیاں گئے

آ کے چھڈ دے آپنے لوکاں ٹھیک نیں
اپنی عزت اپنے ہتھ وچ ہوندی اے

جیہڑا اپنے پیو نوں اڈ اڈ پیندا سی
اپنے پتراں ہتھوں نس پیا رہندا اے

اک دکی ہیر دا بھوں کیہہ گیا
نظراں دے وچ پچھے پیتے کیں قربوندے

کالیاں دے وچ ٹوٹی ٹوہی والے ہو گئے نیں
ریڑیاں اتے تازہ کھوٹا کے نیں

اک ہیر دا ظالم بھوں گیا اے
ہاں اوہی یاد آیا اے گیتاں دا جوڑا

OOO

تقریب کُچھ بھی سہی!
ہمیشہ شاداب
وشگفتہ رہئیے!
Tibet

جائزے

مصر پہ مُصر: زاہد منیر عامر

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

معلومات کی دنیا اور ہمارے ذہن و قلب کے نقشے پہ کھلا تاریخ و جغرافیہ کا بربا مصر، ایک ایسا ملک، علاقہ یا بستی ہے، جس سے متعلق بچپن ہی سے ہمارے اندر ہمیشہ بہت اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہی۔ جذبات و تصورات میں نفرت و محبت کی ایک انوکھی عمارت مسلسل تعمیر و تخریب و ترتیب کا شکار رہی۔ تاریخ کے جبر، زمانے کے سلسلۂ تحیر اور ہمارے ضمیر کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اس دل فریب و دل آویزگری سے ہمارے تعارف کی ابتدا ہی فرعون سے ہوتی ہے۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر جب جب مصر کا تذکرہ ہوا ذہن کے صحن میں فرعون، ہامان، برادرانِ یوسف، بردہ فروشی، رشوت، سوت، موسیٰ، ممی اور دریائے نیل کا ہر سال جوان لڑکی کی قربانی مانگنا، حضرت یوسف کی جانب بڑھتا دستِ زلیخا، کٹیلے اور کٹیلے لوگوں سے آباد قید خانہ، ساقی، یاد کرا دینے والا قیدی، توحید کی وادی میں ذکرانے والا ہونے کا بچھڑا، قوم کو بہکانے والا سامری جادوگر، انڈیاں اٹھا اٹھا کے اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگتے۔ ابھی کل کی بات ہے، ایک زمانے تک تو اس عزیزو 'قاہرہ' کا نام سن کے بھی ہمارے دھیان میں اہرامِ مصر کی کسی چار دیواری یا مقبرے کا تصور ابھرتا تھا۔ جیم ہی کے بقول تو فرعون کی بیرنگی بھی ہمیشہ سے مصر گشی کا ایک بڑا سبب رہی ہے۔ جذبات و احساسات کی نگری میں لطیف یا خفیف قسم کی اتھل پتھل مچانے کے لیے زنانِ مصری سے کچھ امید بنتی تھی لیکن یہاں تو ان کے ہاتھوں بھی چاقو دکھائی دیتے ہیں، بقول مصنفِ قصہ یوسف زلیخا:

جتھے کٹ لئے مصر دیاں بیبیاں نے ۔۔۔ جدوں حسن یوسف نمودار ہویا

اور بقول مولوی عبدالستار، زلیخا کی جوانی چلے جانے پر یوسف کے ساتھ یہ مکالمہ:

یوسف پچھے اس زلیخا، اکھاں کدھر گئیاں ۔۔۔ کہے زلیخا حسن تیرے میں وانجھیاں کڈھ لیاں

معروف شاعر نسیم لیہ نے بھی اس سرزمین کی سفاکی اور کاروباری ذہنیت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

دیارِ مصر میں دیکھا ہے ہم نے دولت کو ۔۔۔ ستم ظریف جہیز خرید لیتی ہے!

ہمارے ایک سابق آئی جی جناب طاہر انوار پاشا نے مصر کا خوبصورت سفرنامہ لکھا جو قدم قدم مصنف کی حیرانی، بیوی کی لگاتار نگرانی اور جریا فراعنۂ مصر کی فراوانی سے لبالب تھا۔ ہم نے اس کتاب پہ جو تبصرہ لکھا تھا، اس کا لب لباب یہ تھا:

الف انوار، ب بیوی، ف فرعون ۔۔۔ بلھیا کیہ جاناں میں کون؟

پھر یہ بات تو ہمیشہ ذہن میں کھٹکتی رہی ہے کہ یہ کیسی انوکھی بستی ہے کہ جہاں کے باشندوں کی تمام تر ہٹ دھرمیوں، وعدہ خلافیوں، نافرمانیوں، بلاوجہ فرمائشوں اور کج فہمیوں کے باوجود قدرت ان پر ہمیشہ دل کھول کے مہربان رہی۔ تاریخ اپنے صفحوں پہ فخر

کریں تو اس ازلی قوم پر نوازشات کا معاملہ کرتے ہی میں نہیں آ رہا۔ کبھی یہاں معجزات کے نہ ختم ہونے والے سلسلے دکھائی دیتے ہیں۔ شوہر چڑچڑے مزاج نیل ایک بچے کے تھے سے گویا وشاو وقت کے محل میں پہنچانے کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ شہر بھر کے بچوں کا قاتل اپنے قتل کا سبب بننے والے کو گھر میں پناہ دیے بیٹھا ہے، جلا ہوا ہاتھ ید بیضا کے درجے پر فائز ہو رہا ہے۔ شہر بھر کے ساحر خدائے وقت کو نظر انداز کر کے بندۂ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر آمادہ ہیں۔ کہیں آگ لینے جانے والے کو پیغمبری مل رہی ہے، تباہی سے کبھی دو قدم پر دھری ہے، اگرچہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کی محققانہ تحقیق اس فاصلے اور فیصلے کو ماننے سے انکاری ہے۔ پھر کہیں اس ازلی قوم کے لیے من و سلویٰ کی بارش ہے، کہیں لکنت زدہ زبان کو خدا سے ہم کلامی کی نوازش نصیب ہو رہی ہے۔ استاد قمر جلالوی لاکھ کہتے رہے:

موسیٰ سے ضرور آج کوئی بات ہوئی ہے
جاتے میں قدم اور تھے آتے میں قدم اور

لیکن دیکھیے تو سہی کہ پلک کے پڑنے در اصرار پر عصا کی ایک ضرب سے ہر قبیلے کے لیے چٹانوں کی کوکھ سے چشمے ابل آتے ہیں، اسی عصا کے اشارے پر دریائے نیل کے گہرے پانیوں کے بیچوں بیچ راستہ نکل آیا ہے اور راستے پر سرکشوں کا تن من نیل نیل ہوا پڑا ہے۔ ہتھیلی پہ سرسوں جمی دیکھنے والے اسی معاشرے میں ایک بھائی کی فرمائش پر دوسرے بھائی کا نبوت کلب میں داخلہ ممکن ہو رہا ہے۔ لاریب کہتے ہیں کہ معلوم تاریخ میں ہارون علیہ السلام و یوسف ہیں یہ بھرتی کی پہلی اور اکلوتی مثال ہیں۔ مذکورہ بالا کرم گستریوں ہی کے سبب مصر سے ہماری محبت کا سلسلہ اس حد تک برقرار رہا کہ ہم "کبھی تو سارا پڑھے خود" کو بھی خدا سے موسیٰ کی براہِ راست خدا کا بعدی کا کوئی سلسلہ کہتے رہے۔ پھر بھلا ہوا ان چند بھلے مانس لکھاریوں کا، تمام تر جدید کہانیوں کے باوجود وقتے وقتے سے ہماری اس محبت کو طراوت بخشتے رہے۔ معروف مزاح نگار اور شاعر جناب پروفیسر افضل علوی نے تو یہ اوران یوسف والی سنگ دلانہ ونگ دلانہ تصویر کا دوسرا رخ پیش کر کے ہماری اچھی خاصی ڈھارس بندھائی تھی، جو فرماتے ہیں:

پھینکا جو چاہ میں تو ملی سلطنت مصر
یوں بھی تو کام آتے ہیں بھائی کبھی کبھی

ایک زمانے میں سر سید احمد خان، شبلی نعمانی اور یوسف کمبل پوش کی سفری و تفریحی تحریروں نے بھی مصر سے متعلق ہمارے دل کو کچھ نرم کیا۔ محمود اظہار کا نظرۂ حد بھی ماحول کو کسی حد تک نرم کرنے کا ذریعہ بنا۔ پھر جامعہ الازہر میں تدریس کی ذمہ داریاں نبھانے والے ڈاکٹر نجیب جمال اور جامعہ عین شمس میں چار برس گزارنے والے ڈاکٹر اختر شمار کی یادوں، ملاقاتوں، مناجاتوں سے مشکوک معاملات رفع دفع ہوئے۔ یوں ہی کے زمانے میں فرعون و ہامان جیسی قد و قامت رکھنے والے ہمارے دوست اکلاس اور یہ ماہر فیلو اور ایم اے ایم محمد ای ایم نے موسیٰ و ہارون والی اعلیٰ اخلاقیات کا مظاہرہ کر کے ہمارے دیرینہ خوف کو دل بدر کرنے میں اچھا خاصا کردار ادا کیا۔ اور اب ڈاکٹر زاہد منیر عامر اور ان کا پورا کنبہ ایک ایج ورمانی سے ہمارے دو جنوں میں ایک نیا محراب تعمیر کرنے کے درپے ہے۔ ڈاکٹر زاہد منیر کا تعلق سرزمین سرگودھا سے ہے اور سرگودھا کے لوگوں میں ہم نے ایک بات دیکھی ہے کہ یہ دشمن کے دشمن ہوں نہ ہوں دشمن کے پکے ضرور ہوتے ہیں۔ جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کو کہیں کا نہیں چھوڑتے اور جس کے پیچھے لگ جائیں اس کو بھی نہیں چھوڑتے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی پن چکی کی طرح

نہر پہ چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے، کام کی پکی

ڈاکٹر صاحب کی بابت کسی سابقہ مضمون میں ہم نے لکھا تھا کہ تین دہائیاں قبل شاہینوں کے شہر سرگودھا سے 'زاہد ـ منیر ـ عامر' کے

بارہ حروف کا مختصر سا اثاثہ اپنے نازک کاندھوں پہ لادے لاہور کی جانب عازمِ سفر ہوئے تھے۔ یہاں آ کے انھوں نے بارہ آبائی حروف کے ساتھ 'ڈاکٹر' اور 'پروفیسر' کے بارہ انگریزی حروف کا اضافہ کیا اور ان چوبیس حروف کے لاؤ لشکر کے ساتھ، چوبیس گھنٹوں والی گھڑی سے منکا لگا کے بیٹھ گئے۔ مستقل مزاجی کی اسی مار ماری میں متنوع الموضوع کتابوں کے ڈھیر لگاتے چلے گئے۔

'مصر: خواب اور تعبیر' کے مطالعے کے بعد تو یہ حضرت ہمیں مصر میں پاکستان اور پاکستان میں مصر کے کامیاب سفیر دکھائی دینے لگے ہیں۔ حب الوطنی، حب الٰہی اور حب نبی کی تصویر ان کے بین بین خود بخود کھنچتی چلی جاتی ہے۔ بقول ظفر اقبال

آسماں پہ کوئی تصویر بناتا ہوں ظفر   کہ رہے ایک طرف اور لگے چاروں طرف

پھر ان کے عربی مضامین کے مجموعے 'قلبِ مصر' سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کو مصر سے اردو ہی میں نہیں عربی میں بھی محبت ہے۔

ڈاکٹر صاحب مصر کے تاریخی مقامات: جبل طور، نہر سویز، اقصر، راس الحسین، جامعہ قاہرہ اور دریائے نیل پہ ایک ایسے سیاح کے روپ میں نظر آتے ہیں، جو ہمہ وقت آثارِ قدیمہ کے کوزے یا تاثرات کی بجائے تحقیق کا کوزہ ہاتھ میں اٹھائے رکھتے ہیں۔ وہ تو فرعون کے اہرام پہ بھی تعریف کی تری سے مستفید ہونے کی بجائے تاریخ کی خشکی میں غوطہ زن دکھائی دیتے ہیں۔ مذاق لوگوں کی صحبت سے متمتع ہونے کی بجائے وہاں مصری نماز پڑھ لیتے ہیں۔ فرعون کی ممی کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے کی بجائے ساس بہوؤں کی طرح چھیاں دینے لگتے ہیں۔ شاید ان کی اسلام اور پاکستان سے ایسی ہی الوہی محبت اور ارادوں کی بنا پر جرمن سفیر آماریا شمل اور جمعۃ الثقافت کے وقت انٹرویو لینے والے پاکستانی وزیر تک ان کی علمی قابلیت پر فریفتہ دکھائی دیتے ہیں۔

پھر انھوں نے مصری تعلیمی اور معاشی صورت حال، جو اہلِ مصر کے معاملات اور اہلیانِ مصر کی اقبال شناسی کے حوالے سے جو تحقیقی کاوش کی اس پہ وہ الگ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ایک بات کا شکوہ ان سے بہرحال رہے گا کہ وہ مصر کے دلکش گلیوں، گرما گرم ساحلوں اور پُرخمار وادیوں کی بابت ایک صالح شوہر اور گھٹے راوی کی مانند خاموش ہیں۔ اگر وہ بے لفظوں میں کوئی منظر کشید کرتے بھی ہیں تو لذت سے زیادہ وضاحت ان کے اسلوب سے ترشح دکھائی دیتی ہے۔ ان کے اپنے اعتقاد کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ہم جیسے دزدیدہ المطرب و حسرتِ دید وقار کیمپ ہی کا خیال کر لیا ہوتا۔ سچ بات تو یہ بھی ہے کہ ان کی اس وقت نظری نے جہاں ہماری بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے، وہاں بے شمار خوش فہمیوں کا بھی بے دردی سے خون کیا ہے۔ ہم ایک عرصے سے خدا کے جلوے سے جل کر سرمہ بن جانے والے طور پہاڑ کی تقدیر، اس کے سرمے کی تاثیر اور ایک نامعلوم شاعر کے اس شعری تصور کے طلسم میں گرفتار تھے کہ

دعویٰ کروں گا حشر میں موسیٰ پہ قتل کا   کیوں آپ دکھا دی اس نے مرے قاتل کی تیغ کو

ادھر قومی ترانے کے خالق بھی جھوم جھوم کے گاتے رہے: 'موسیٰ نے پہلے ہی قدم پر غش کھایا اور سنتے ہو کہ جل کر رہ گیا طور / مسافر تیری منزل دور'۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بتا کے تو ہمارے تجسس کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی کہ کوہِ طور پہ تو سرے سے سرمے کا جل یا کسی طرح کے مرئی تصورات کے آثار ہی مفقود ہیں۔ قبل ازیں اسی طرح کی بے رحم حقیقت بیانی سے ہم پر اور ہم سے زیادہ 'چاند گاڑی' والے ابن انشا پر ایسا ہی ایک ستم مسٹر آرم سٹرانگ، چاند کی اندرونی تصویر دکھا کے ڈھا چکے ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کی پالنے والا فرعون اور ڈبونے والا فرعون والی عمیق تحقیق نے تو ہمارے اذہان و قلوب میں فرعون سے متعلق صدیوں سے پال پوس کے جوان کی گئی نفرت کو

بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ہم مصر کے قصے کہانیوں سے لطف اندوز ہونے والی قوم خواب خیالی میں مست تعبیر تراشی سے گریزاں۔ نتیجے حقائق کی اچھی حرم ظرفیوں کی بجائے تو اس عالم تحقیق پی ایچ ڈی سے ہمارا ایمان ہی اٹھ گیا ہے۔

مختصر یہ کہ موسیٰ سے مُرسی تک یہ مصر ہمارے نزدیک عجائب و غرائب مصائب کا ایک وسیع کارخانہ رہا ہے۔ ہم آج تک اس سے وابستہ کہانیوں اور اس پر ہونے والی طرح طرح کی حکمرانیوں کے تصور میں مست رہے ہیں۔ یہ جان کے اور بھی خوشی ہوئی تھی کہ مصر کے سیاسی، سماجی حالات بھی وطن عزیز سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ وہاں کے نوجوان بھی ہمارے نوجوانوں ہی کی طرح غیر یقینی صورت حال کا شکار ہیں۔ رشتوں کی صورت حال تو یہاں سے بھی ابتر ہے۔ اس سے ڈاکٹر ابراہیم کی پاکستان میں آ کر شادی کی سمجھ بھی آ جاتی ہے۔ ایسے میں ہمیں ڈاکٹر زاہد منیر عامر جیسے لوگوں کی سمجھ نہیں آتی جو شاعر مشرق کی مانند اب تک اس طرح کے الٹے خواب دیکھنے پر مصر ہیں کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

جب کہ ہمارے حکیم جی کا بھی ہمیشہ کی طرح اٹل فرمان اس خواب کے راستے میں کسی چٹان کی مانند ایستادہ ہے، جو فرماتے ہیں کہ اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کے لیے بہت ضروری ہے کہ 'نیک' ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے'۔ دو سو چالیس صفحات اور خوب صورت سرورق سے مزین 'مصر: خواب اور تعبیر' کو پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تالیف و ترجمہ نے پہلی بار 2023ء میں نہایت آن بان اور شان کے ساتھ شائع کیا ہے۔

◆◆◆

افسانچہ

ڈاکٹر عاصم بخاری

وہ ٹریفک پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ مزاجاً خوش شکل اور خوش مزاج آدمی تھا مگر آج جانے کیوں بڑے جارحانہ موڈ میں تھا۔ سب گاڑیوں کو روک رہا تھا اور زبانی بھاری جرمانے کیے جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ موٹر سائیکل سواروں تک کو بھی معاف نہ کر رہا تھا۔ کسی کی جیب سے اگر سو روپیہ بھی نکلا تو وہ بھی لے کر اپنی جیب میں ٹھونس لیتا۔ کاغذات مکمل ہونے کے باوجود بھی اس روز کوئی پیسے دیے بغیر نہیں جا سکا تھا۔ قصور وار اور بے گناہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جا رہا تھا۔ اس کی بڑی دہشت طاری تھی۔ مخلوق خدا سہمی ہوئی تھی۔ اچانک انسپکٹر صاحب کا جگری دوست عبدالغفور اپنے دوستوں کے ہمراہ کہیں سے آ دھمکا۔ انسپکٹر نے اس کا پرتپاک استقبال کیا مگر لوٹ مار کا سلسلہ حسب معمول جاری رکھا۔ عبدالغفور کو حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ لالہ! خیریت تو ہے؟ ہاں یار خیریت ہے۔ اصل میں آج ہی بڑے بھائی کا فون آیا ہے کہ جمعرات والے دن والد صاحب کا چالیسواں ہے اور ساتھ خیرات بھی۔ آپ کو تو پتا ہے ہماری روایت کا۔ خیرات میں پورے علاقے کو دعوت عام ہوتی ہے۔ بھائی جان نے مجھے ایک گائے لانے کا حکم دیا ہے۔ یہ سب اسی کی تیاری ہے۔ وہ بے اختیار نظریں چرا گیا۔

''کتاب الرشید تبسم''

ڈاکٹر سکندر حیات میکن

خاک بنا سکا نہ تمہارے جمال کا ۔۔۔ نکلی میری نگاہ سے اکثر گزر گئی

میں نے انھیں جب بھی دیکھا تو ایسا ہی دیکھا۔ سفید مونچھیں، سفید بال جن میں مانگ بہت واضح ہر دم تازہ شیو، آنکھوں میں ایک روشنی، موٹی موٹی بھنویں، جن کے بال سیاہ، گندمی رنگت، ویسٹ کوٹ میں ملبوس، اپنے دل پر پاکستانی پرچم سجائے ہر دم جواں، ہر دم حسین، بظاہر بڑی عمر کے نظر آنے والے اس جوان ہمت، منفرد لہجے کی آواز لوگوں کی سماعتوں کو تیز کر رہی تھی کہ مجھے کسی نے بتایا یہ پروفیسر ہارون الرشید تبسم ہیں۔ لیکن میں نے ان کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار زیادہ دیکھے ہیں۔ تصویروں میں زیرِ لب تبسم دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر تصویر میں پھر بھی سنجیدگی اور متانت قائم رہتی ہے۔ یہی انھوں نے زندگی گزارنے کا اصول بھی ٹھہرایا۔ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو اخباروں اور رسائل میں ان کی خبریں اور تصویریں بار بار دیکھ کر ان کی شکل ہمارے شعور میں راسخ ہو گئی۔ ان کی خبریں دیکھ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ شہر کے آدمی ہیں یا ان کا تعلق کسی اخباری قبیلے سے ہے۔ مگر وہ تو شعبہ سے منسلک، لیکن انھوں نے سرگودھا کے اخبار و رسائل میں اپنی مستقل حکمرانی کو اپنی محنت، ہمت اور لگن سے قائم رکھا اور ہنوز قائم و دائم رکھے ہوئے ہیں۔

شاہینوں کے شہر سرگودھا میں اس شخص نے اپنے قول و فعل سے اپنی شاہین صفتی ثابت کی ہے۔ وطن کی مٹی سے جڑا ہوا یہ آدمی، حریت، وطن کے گیت بھی گاتا ہے اور وطن کی محبت میں جب قربانی دینے کا وقت آتا ہے تو بھی اس کے قدم نہیں لڑکھڑاتے۔ سرگودھا کی علمی و ادبی شخصیات اور تاریخ کا وہ ایک روشن چہرہ ہے۔ کبھی وہ جانباز سپاہی ہے، کبھی وہ چیف وارڈن سول ڈیفنس ہے، کبھی نظریہ پاکستان کی ترجمانی کر رہا ہے، کبھی وہ 14 اگست کی مرکزی تقریب کا محور ہے تو کبھی وہ یوم دفاع پاکستان پر اپنے جذبات اور قومی ہیروز کو خراجِ تحسین پیش کر رہا ہے۔ اس کا ہر روپ نرالا اور انوکھا ہے اور وہ ہر روپ میں کامیاب ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح، علامہ محمد اقبال، عبدالستار ایدھی، طارق عزیز، قرار داد پاکستان سے قیام پاکستان تک، اے وطن کے سجیلے جوانو، مستقبل پاکستان، پاکستان سب کے لیے، اسلام اور پاکستان، نگاہِ پاکستان، انوارِ پاکستان، قطب جناح سے جناحِ پاکستان تک، ریاست مدینہ اور پاکستان، جیسے موضوعات ان کے عزیز ترین ہیں۔ ان کے بعض موضوعات کتب کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی بہت بڑا سماجی خدمت گار ہے اور یہ خدمت وہ اپنے قلم کے ذریعے ادا کر رہا ہے۔ سرگودھا کا یہ فعال آدمی ہر وقت پاکستانیت اور ادبیت کا پرچار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اپنے اساتذہ، علمائے دین اور قوم کے معماروں کا احترام کرتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ انھیں کسی کتاب والے کبھی انکاری تھی۔ محفل کے آدمی ہیں، ہر محفل میں جاتے ہیں اور رنگ جماتے ہیں۔ سامعین کو اپنے الفاظ کے جادو سے اپنا بنا لیتے ہیں۔

جس طرح شیخ رشید راولپنڈی میں اپنے حلقے کے ایک ایک ووٹر کو جانتے ہیں اسی طرح ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم بھی سرگودھا کے

بلکہ سرگودھا ڈویژن کے ہر بڑے اہم اور بڑے آدمی کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ وہ بڑا آدمی خواہ کسی بھی شعبے میں بڑا ہو۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی فطرت کا میدان تحقیق و تالیف ہے بلکہ تالیف و تدوین زیادہ ہے۔ وہ ہر شعبے سے آزاد ہیں مگر لکھنے میں قید ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے کہا تھا کہ: ''جس طرح مرغی ایک کونے میں بیٹھ کر انڈے دیتی ہے اسی طرح میں بھی ایک کونے میں بیٹھ کر افسانہ لکھ دیتا ہوں۔''

اسی طرح ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے بارے میں بھی اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی کسی گوشے میں بیٹھتے ہیں اور تالیف و تدوین کا کام انجام دیتے ہیں مگر اس کے لیے ان کی گھنٹوں کی ریاضت ہوتی ہوگی۔ کیوں کہ ان کی کتابوں کی تعداد روز افزوں کی بنیاد پر بڑھ رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی جن پال رکھا ہے، جو یہ کام اتنی سرعت سے انجام دے رہا ہے کہ حیرت ہے۔ الہ دین کے چراغ سے لوگ خزانہ مانگتے ہیں مگر ہارون الرشید تبسم کتابیں اور علم لیتے ہیں۔

ان کی روز افزوں کتب کی تعداد دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے برس تو انھوں نے زندگی بسر نہیں کی جتنی ان کی کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کے نامہ اعمال میں کتابیں اور صرف کتابیں ہیں۔ سر سید احمد خان نے تو کہا تھا کہ قیامت کے روز پوچھا گیا تو کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں، مگر ہارون الرشید سے پوچھا گیا تو وہ کہیں گے بہت ساری کتابیں لکھ کر لایا ہوں۔ اگر سر سید کو ایک کتاب پر معافی مل سکتی ہے تو مجھے بھی دیجیے۔ میں نے کتابیں چھاپنے اور کتابیں بانٹنے میں اتنا سخی آدمی نہیں دیکھا۔ جب بھیجتے ہیں کتابوں کا بنڈل بھیجتے ہیں۔ اسی لیے جواب میں "Bundle of thanks for the bundle of books" کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کو زمانہ طالب علمی سے تحریر و تقریر کا شوق جنون کی حد تک رہا۔ ایک مزدور کے بیٹے نے زندگی کرنے کا سلیقہ اور ہنر پایا اور اپنے زور بازو سے ثابت کیا کہ حوادث زمانہ سے الجھ کر جینے والے کمال کی زندگی جیتے ہیں۔ سکول اور کالج کے دور میں جب بچے سٹیج پر آنے سے ڈرتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید اس زمانے میں سٹیج کو رونق دیا کرتے تھے اور آج تک ڈٹے ہوئے ہیں بل کہ دمک رہے ہیں، مہکا رہے ہیں۔ کمپیئرنگ کا فن ان کو خدا کی عطا ہے، اسی عطا نے ان کو روحانی اور ان کے سخن کو بے بدلی عطا کی ہے۔ محفل کوئی بھی ہو، موضوع کوئی بھی ہو، سامعین جو بھی ہوں ان کے دلوں کو تسخیر کرنا وہ اپنی لفظی جادوگری سے خوب جانتا ہے۔ شہر کا ہر شعبہ ان سے کمپیئرنگ کروانا چاہتا ہے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے بقول: ''ہارون الرشید تبسم ایک نمایاں نام ہے۔ وہ نثر لکھتا ہے، شعر کہتا ہے، تقریریں کرتا ہے اور جب کسی محاذ (ادبی ہو یا عسکری) پر عمل کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ سراپا عمل بن جاتا ہے۔ اس کی ذات کی اس ہمہ جہتی بوقلمونی نے اسے سرگودھا کا ایک مقبول اور معروف کردار بنا دیا ہے۔ یہاں پہ کوئی بھی محفل ہو۔ سرنگیت سے میلہ مویشیاں تک۔ ہارون الرشید تبسم کی نظامت پروگرام کی کامیابی کی ضمانت بن جاتی ہے۔''

سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک کامیاب آدمی ہے اور یہ کامیابی اسے خیرات میں نہیں ملی بلکہ اس کی برسوں کی ریاضت کا ثمر ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کام اور محنت کو ہی بنیاد بنایا ہے۔ وہ روز مرہ کو ایک ڈسپلن کے تحت گزارتے ہیں۔ وہ ٹیوشن پڑھانے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اردو اور انگریزی کی خوب خوب ٹیوشن ایک زمانے میں پڑھاتے رہے۔ بل کہ ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ تو انھوں نے نہم کلاس سے شروع کیا تھا۔ پڑھتے پڑھاتے، انھوں نے خود بھی چار مضامین (اردو، سیاسیات، تاریخ، اسلامیات) میں ایم اے کر ڈالا۔ چنانچہ اردو میں ایم فل اقبالیات اور پی ایچ ڈی (2002ء، پنجاب یونیورسٹی) بھی کر ڈالی۔ مگر پڑھنا اور پڑھانا نہیں چھوڑا

انھوں نے اپنے دستِ و بازو سے اپنی دنیا کمائی ہے اور وہ "Self made man" ہے۔ سرگودھا شہر میں شاید ہی کسی نے اتنی عزت اور شہرت کمائی ہو۔ وہ اپنے ماضی کے مصائب کو فخر سے بیان کرتے ہیں اور طلبا کو ہمیشہ Motivations دیتے رہے کہ غربت اور نامساعد حالات کسی بھی صورت میں مانعِ ترقی نہیں ہو سکتے۔ وہ خود کو ایک مزدور کا بیٹا کہہ کر اپنا سر فخر سے بلند کرتے ہیں۔ یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔ وہ اخلاقی حوالے سے مضبوط آدمی ہیں اسی لیے اپنے باپ دادا کا اصلی نقشہ کھینچنے میں عار محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے مشکل حالات پر نازاں رہے ہیں۔ پہلے پہل ان کا تعارف ایک شاعر کے روپ میں ہوا پھر اسلامیہ کالج کے ایک پروفیسر کے رنگ میں ان کو دیکھا۔ جب وہ کھلتے گلاب جیسا تھا۔ اب گلابی سے سفید ہو کر اور زیادہ معتبر ہو گیا ہے۔ وہ جب بھی زبان شناس تھے مگر زبان دراز نہیں تھے۔ وہ خود بھی رواں ہیں مگر ان کا قلم ان سے بھی زیادہ رواں ہے بلکہ رواں دواں ہے۔ ایک زمانے میں ایم فل اور ریسرچ اسکالر اپنے تحقیقی مقالے کے لیے کسی ادیب کے مرنے کا انتظار کرتے تھے مگر ہارون الرشید تبسم کو تو ڈگری (سند) کا لالچ بھی نہیں ہوتا۔ (ادھر ادیب مرا تو چوتھے روز اس کی کتاب چھپ گئی۔ بلکہ کسی مرنے والے پر پہلی کتاب ان کی ہی ہوتی ہے۔ اب تو یوں محسوس ہوتا انھوں نے اپنے اندر کوئی "مُلّا ادب" پال رکھا ہے۔ بعض حاسد لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "ان کے مضمون ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بس تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور نام بدل دیتے ہیں۔" ہمیں ان کے حاسدین سے چنداں دلچسپی نہ ہے۔ البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہر بڑے آدمی کے حاسد ضرور پیدا ہو جاتے ہیں اور ہارون الرشید تبسم نے اپنی محنت اور ہمت سے خود کو بڑا آدمی ثابت کیا ہے۔

یہ علم کا سودا یہ رسالے یہ کتابیں　　　اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہیں

ہارون الرشید تبسم صاحب بارونق آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنے دل میں محبتوں کے روگ اور سوگ نہیں پالے۔ وہ اگر کسی پر مر مٹنے پر تیار ہیں تو وہ حرمتِ وطن ہے۔ وطن کے گیتوں پر ان کے جذبات مچلتے ہیں۔ بھارتی گانے انھوں نے خود پر حرام کیے ہوئے ہیں۔ پاکستان کو اپنے بیٹے سے پیارا رکھا ہے۔ پاکستانی پرچم ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ وہ مشکل حالات میں بھی سر اٹھا کر جیتے ہیں۔ کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے۔ مرزا محمد ایوب مغل کے بیٹے نے محنت، ہمت اور لگن سے اپنا مقام پیدا کر لیا۔ شاید اقبال کا یہ شعر انھوں نے بچپن میں ہی ازبر کر لیا تھا۔

تیرا طریق امیری نہیں فقیری ہے　　　خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

پہلے سرگودھا میں اور اب پورے ملک میں انھوں نے نام تو پیدا کر لیا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے ہمیں اس سے غرض نہیں۔ جب ان کا اولین شعری مجموعہ "کرچیاں" اشاعت پذیر ہوا تو اس کا فکر انگیز انتساب کم ہمت لوگوں کو ایک دعوتِ فکر دے رہا۔ وہ اپنی کتاب "گل دیدہ ور" میں لکھتے ہیں: "جب میرا پہلا شعری مجموعہ "کرچیاں" 2 فروری 1990ء میں شائع ہوا تو اس کا انتساب یوں تھا: "حالات کی ان تلخیوں کے نام جن سے گزر کر ایک مزدور کا بیٹا پروفیسر بنا" ان حالات کی تلخیوں میں والد گرامی کی بیماری اور والدہ کی سخت محنت آج تک تصویری صورت نگاہوں کے سامنے رہتی ہے۔ 18 مارچ 1982ء کو والد گرامی کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد حالات مزید دگرگوں ہو گئے۔"

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم تنگی ایام میں پل کر جوان ہوا مگر اس نے زندگی کو جس طرح گزارا ہے اور گزارنے کا پیغام بھی دیا ہے۔ وہ زندگی کی جنگ سے پسپا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کھیل کمیٹی سرگودھا کا ایک محرک (2 جولائی 1972ء تا 1980ء)، جشنِ آزادی کی

تقریب میں بحیثیت شرٹ مستعار لے کر (ایم ایچ ظفر) اپنی ساکھ بچانے والا، قیمتی میں پلی کر بڑا ہونے والا، اپنے بہن بھائیوں اور گھر کے اخراجات اٹھانے والا گورنمنٹ امبالہ مسلم کالج سرگودھا سے بطور پروفیسر ریٹائرڈ (یکم اکتوبر 2015ء) ہوا۔ یہ لکھنا اور باتیں کرنا تو آسان ہے مگر نبھانا مشکل ہے۔ بقول ہارون الرشید تبسم:

زندگی قید ہے حالات کی دیواروں میں   وقت نے کھینچ دیے دائرے پرکار کے ساتھ

پروفیسری سے ریٹائرمنٹ کے بعد لوگ عمومی طور پر متحرک نہیں رہتے اور اکثر و بیشتر صوم وصلوٰۃ کی پابندی کرنے لگتے ہیں، جب کہ ہارون الرشید تبسم نے یہ کام جوانی میں ہی اپنی زندگی کا حصہ بنا لیے تھے۔ دورِ ریٹائرمنٹ کے بعد اور زیادہ فعال اور سرگرم ہو گئے۔ اب ان کے شب و روز کتابوں میں بسر ہوتے ہیں۔ تعجب ہے کہ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد کتابوں کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔ فی زمانہ لوگ ہر چیز کو مالی منفعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، مگر انھوں نے اپنے پلے سے روپے لگا کر کتابوں کی بازی لگا دی ہے اور یہی ان کی دلی تسکین کا سبب ہے۔ موبائل کو شیطانی چرخہ سمجھتے ہیں۔ ایک زمانے تک پی ٹی سی ایل فون استعمال کرتے رہے۔ آخر کار اس شیطانی چرخے کے آگے ہار مان گئے اور موبائل اور وٹس ایپ کا استعمال کرنے لگ گئے مگر کم بہت کم۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ ان سے خواتین زیادہ مرعوب ہوتی ہیں، مگر انھیں اپنے سفید بالوں کا اتنا لحاظ ہے کہ کبھی کسی خاتون سے مرعوب نہیں ہوتے۔ سرگودھا میں اتنے معروف ہیں کہ جس بازار سے گزر جائیں، ریڑھی بان سے لے کر دربان تک، سیاستدان سے لے کر حکمران تک، عطیار سے لے کر کمہار تک، منہیار سے لے کر عطار تک، پنساری سے لے کر شلواری تک، رنگ ساز سے لے کر دندان ساز تک، ادیبوں سے لے کر طبیبوں تک، پروفیسر ہارون الرشید تبسم سرگودھا کا ایک مقبول اور معروف کردار بن گیا ہے۔

اس کا کام سرسری ہو سکتا ہے اس کا ذخیرۂ کتب اور تدریسی و تالیفی خدمات کو بڑے سے بڑا نظر انداز کر سکتے ہیں، مگر مجھے ان کی زندگی سرسری نہیں لگتی۔ کیوں کہ وہ ایک دردمند اور تہذیبی و ثقافتی انسان ہے۔ ان کی زندگی میں ایک عوامی رنگ ہے اور اسی عوامی رنگ نے اسے مشکل آدمی نہیں بننے دیا۔ وہ عام فہم اور مہذب آدمی ہے۔ وہ علمی بحث نہیں بلکہ اس نے اپنے ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اس کی وضع داری اس کی شخصیت سے جھلکتی ہے۔ اسے کبھی Loose talk کرتے نہیں دیکھا۔ دبستان سرگودھا میں صحیح معنوں میں آج متحرک آدمی ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ہی ہے۔ جہاں کاغذ کی مہک سے لوگ روٹھتے جا رہے ہیں، جہاں کتاب سے دوری بڑھتی جا رہی ہے، اس معاشرے میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کتاب سے جڑا اور کتابوں میں جڑا ہوا آدمی ہے۔ اس نے اپنا رشتہ کتابوں سے ایسا استوار کیا ہے کہ وہ اب ہمیں ہارون الرشید نہیں بلکہ "کتاب الرشید تبسم" معلوم ہوتا ہے۔ ستر سالہ ہارون الرشید تبسم آج بھی سرگرم عمل ہے۔

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو   رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اتنے سرگرم عمل ہیں کہ پہلے پہل تو سرگودھا شہر کی ہر تقریب میں ان کی شرکت جیسے تیسے ہو جاتی تھی، مگر اب سلسلہ سرگودھا شہر سے بڑھ کر دیگر شہروں میں ہونے والی تقریبات تک پھیل گیا ہے۔ دعوت نامہ قبول کرتے ہیں اور بڑی ذمہ داری سے شرکت کرتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی ہے کہ وہ وقت کے پابند ہیں۔ دعوت نامے پر جو وقت لکھا ہے اس وقت مقررہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اب شہر کے لوگوں نے انھیں بلانا ہو تو وہ تین گھنٹے تاخیر سے بلاتے ہیں۔ ادبی تقریبات میں اگر سٹیج سیکرٹری وہ ہوں تو وقت پر تقریب شروع

ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے وہ کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کا قول ہے کہ "وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔" انھوں نے ہمیشہ خود کو اقبال کے اس شعر کی صورت جانا ہے۔

چلنے والے نکل گئے ہیں   جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ تر چلتے ہی رہتے ہیں اور جلدی جلدی امور کو نمٹاتے ہیں۔ جس تقریب میں جاتے ہیں ان کو جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ بار بار گھڑی دیکھتے ہیں۔ شاید انھوں نے اتنا آئینہ نہ دیکھا ہو جتنی انھوں نے گھڑی کی سوئیاں دیکھیں ہیں۔ ایک تقریب کے بعد دوسری تقریب، دوسری کے بعد تیسری تقریب میں جانے کی جلدی کی بدولت ان کی زندگی سے ٹھہراؤ ختم ہو گیا ہے۔ اسی لیے وہ اکثر جملوں کے آخر میں "فقط" لگانا بھول جاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں کئی کشتیوں میں پیر رکھ لیتے ہیں مگر سب کو سنبھال لیتے ہیں یہ ان کی وقتی حکمت عملی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہاں وقتی سے مراد وقت لیا جائے۔

کلاسیکی مزاج اور تہذیب و شائستگی کا پیکر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ایسا جانباز ہے جو بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہا ہوتا ہے۔ مجال ہے کہ کسی نے کوئی خط لکھا ہو اور اس کا جواب وہ نہ دیں۔ موجودہ عہد میں جہاں پر خوب صورت روایت دم توڑ چکی ہے وہ آج بھی اس کو پالے ہوئے ہیں۔ خط لکھتے ہیں، خطوں کا جواب بھی فرض سمجھ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح عہد جدید میں ریڈیو کے ساتھ بھی وابستہ ہیں اور ادبی پروگرام (دانش کدہ) باقاعدگی سے کرتے ہیں۔ اگر کوئی کتاب بھیجتا ہے تو اس کی فوراً رسید دیتے ہیں اور حوصلہ افزائی کا قرینہ تو شاید انھوں نے ڈاکٹر انور سدید سے سیکھا ہے۔ وہ ہر ملنے والی کتاب کی قدر کرتے ہیں، مصنف کی تسلی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اگر کبھی موقع ملے تو جسمانی تھپکی بھی دیتے ہیں۔ وہ موصولہ کتب کو ردی کی نظر نہیں کرتے بل کہ کتاب کا احترام کرتے ہیں۔ ان کی ادب پروری کا یہ عالم ہے کہ ہر موصولہ کتاب پر تبصرہ لکھتے ہیں اور صرف موصولہ کتب کے تبصروں پر ان کی درجنوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ایسی حوصلہ افزائی شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملی ہو۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ فلاں کی کتاب پر تبصرہ کرنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ ادب پرور ہیں اور ادب پروری کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امجد اسلام امجد نے انھیں "میدان ادب کا آل راؤنڈر" کہا ہے۔

افسر شاہی سے میل ملاپ اور ہر تقریب میں ہر افسر کی تحسین کرنا شاید ان کی کمزوری ہے مگر ذہنی اور اعصابی طور پر کمزور نہیں ہیں۔ وہ قائد اعظم محمد علی جناح کے قول "کام، کام اور صرف کام" کو لگتا ہے یوں سمجھ بیٹھے ہیں۔ "کتابیں، کتابیں اور صرف کتابیں۔" ہر کتاب کی پشت پر کتابوں کی تعداد کا اندراج کرنا نہیں بھولتے اور آخر میں ایک خواب (شہادت) بھی رقم کرتے ہیں۔ ہم کو ان کی نیت پر شک نہیں ہے۔ دعا ہے کہ یہ مؤرخ سرگودھا، فخر سرگودھا اور پروفیسر سرگودھا اپنے خواب کی تعبیر پا جائے۔ وہ اتنی کتابیں لکھنا چاہتے ہیں کہ ان کا نام "Guinness the book of world recoard" میں لکھا جائے اور اگر وہ چند سال اور ہی لکھتے ہیں تو وہ شاید ہر ریکارڈ اپنے نام کر جائیں۔ ہم ان کے پیچھے سے خوش ہیں۔ جتنی ترقی اور ناموری سرگودھا شہر میں انھوں نے کمائی ہے شاید ہی کوئی اور مثال ہو۔ ہارون الرشید تبسم خوش قسمت ہے کہ اس عہد میں اس کا تعلق کتاب سے جڑا ہے اور یہی اس کا تبسم ہے کہ وہ کتاب الرشید ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

◆◆◆

آدھا انسان

مصنف: رشی خان

تبصرہ نگار: صادقہ نصیر

کتاب کے پس منظر میں پہلے مصنف ہوتا ہے لہٰذا کتاب پر تبصرہ اور تعارف سے پہلے مصنف کا تعارف ضروری ہے اور اس کا حق بھی۔ مصنف رشی خان خود ہی صفحہ 15 پر اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میں ہوں رشی خان'' اور یوں وہ تبصرہ نگار اور قاری کے لئے سہولت پیدا کر دیتے ہیں اور اس سلسلے میں انہیں کسی اور کی خوشامد کر کے مدد لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور یہ انداز بیاں مجھے ذاتی طور پر بہت پسند آیا۔ اسی طرح ان کی کتاب میں خلاف روایت کسی قد آور مصنف کا اظہار خیال نظر نہیں آیا۔ مصنف نے شروع سے آخر تک سب کام خود ہی کیا ہے جو ان کی خود اعتمادی، راست بازی اور مقصدیت پسندی کی دلیل ہے۔ وہ پڑھے لکھے پر مطمئن ہیں اور اس کی ترسیل اور فروغ کے لئے بے پرواہ ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کتاب لکھی ہے تو پڑھی بھی جائے گی اور اس کا ابلاغ بھی ہوتا رہے گا۔ قاری کا فرض ہے کہ فروغ کتاب کے لئے اپنا فرض نبھائے۔ میں جو کتاب پڑھتی ہوں اس کا ذکر کرنا اور اس کتاب کا تعارف کروا کر لوگوں کو ترغیب دینا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ اسی ذمہ داری کے تحت اس کتاب کو پڑھا اور تعارف قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ مصنف رشید خان جن کا قلمی نام رشی خان ہے، آبائی وطن لاہور پاکستان ہے جو یکم فروری 1952ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہاں نگہ کالج پہنچے اور فزکس اور بائیو میتھ کی تعلیم جاری تھی کہ 1968 اور 1969 کی ایوب خان کے خلاف تحریک میں شامل ہوئے اور فنون لطیفہ کی طرف رغبت کی وجہ سے انجینئرنگ کی بجائے مصنف بن بیٹھے۔ اس میدان میں آئے تو ڈرامے، سکرین رائٹنگ، صحافت، اخبارات اور ٹی وی کو بھی وقت دیا۔ روزنامہ صدائے وطن کی ڈپٹی ایڈیٹری کے دوران جیل میں جانا پڑا اور رہا ہو کر واپس آئے تو روزنامہ ''صدائے وطن'' کی اشاعت جبری طور پر روک دی گئی تو مختلف راستے اپناتے برلن پہنچے اور پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لئے تحریک کے سرگرم رکن بنے کے ساتھ قلم کا سہارا لیا۔ 1981ء میں ہفت روزہ ''انقلاب'' لندن کے جرمنی کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داری اٹھائی۔ بحالی جمہوریت کے بعد پاکستان آ گئے۔ ''ریزہ ریزہ کائنات'' تحقیقی اور ناولوں پر مشتمل کتابیں ''پردیس دیس'' اور ''عذاب جگر'' کے ناموں سے شائع ہوئیں۔ شاعری کی تین کتابیں ''موسم سرخ گلابوں کے''، ''مادر وطن کے زخم ہے'' اور ''شہروں کو پرندے چھوڑ چلے''۔ اس کے علاوہ ٹی وی کے لئے سیریل بھی لکھے۔ ماہنامہ چترالی کے ایڈیٹر رہے۔ اب تک کی مطبوعہ تصانیف گیارہ ہیں۔

ریزہ ریزہ کائنات، جس روز شہر میں قتل ہوا، جناب بھٹو نے فرمایا، پردیس دیس، موسم سرخ گلابوں کے، مادر وطن کے زخم ہے، عذاب جگر، شہروں کو پرندے چھوڑ چلے (شاعری)، زرینا (ایک مکمل فلم کا مکمل سکرپٹ)، پردیس دیس کا ہندی ترجمہ، اور ناول بت پرستوں کی نسلیں، اور زیر نظر کتاب ''آدھا انسان''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشی خان سیاست کے ایوانوں کی دھاندلیوں کے

خلاف عملی طور پر نہ صرف متحرک نظر آتے ہیں، بلکہ جیل بھی جھیلتے ہیں اور قلم کا جہاد بھی بذریعہ صحافت کرتے ہیں اور فنونِ لطیفہ کے تقریباً سبھی میدانوں کے پیا استاد و کھلاڑی ہیں اور سیاست کے علاوہ ادب کی اصناف کو برائے مقصد استعمال کرتے ہیں۔ ان کی باقی کتب کا مجھے پڑھنے کا موقع نہیں ملا لیکن میرے مطالعے میں جو کتاب ہے اسے پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ واقعی بڑا ادبی کاوش کو سماجی شعور بیدار کرنے، آگاہی دینے اور معاشرے کے ناسوروں کو صحت یاب کرنے کی ٹھانے ہوئے ہیں اور بہت پرعزم، دبنگ اور بے باک اور بے لوث ہیں۔ اب آتے ہیں زیرِ نظر کتاب ''آدھا انسان'' کے خصوصی جائزے کی طرف۔ ''آدھا انسان'' میں نے اس کتب کا جو کہ کہانیوں اور افسانوں کا مجموعہ ہے لفظ بہ لفظ مطالعہ کیا ہے۔ شروع سے آخر تک یہ کہانیاں جگ کی کہانیاں ہیں۔ شاید ہر انسان کی نظر سے یہ کہانیاں واقعات بن کر گزرتے ہوں اور تجربات میں بھی ہوں۔ رکھتا ہے کہ ان کو افواہوں کی طرح زبان سے بنا کر تماش بینی کے مزے لینے کے بجائے قلم کی روشنائی سے صفحات پر بکھیرے تاکہ یہ کہانیاں فکر و شعور پیدا کریں اور صاحبانِ فکر و عمل ان کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچائیں۔ کون ہے جو دیانوں میں کم از کم کچھ فیصد ہی جاگ جائیں اور اس کتاب کے مصنف نے اس سوئے احساس اور شعور کو جگانے کا بھرپور فریضہ انجام دیا ہے۔ کل چودہ کہانیوں پر مشتمل کتاب بہت فی البدیہہ انداز اور روائتی جذبات میں اور شدید پُرخلوص احساس کے اعتماد کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ عام طور پر تبصرہ پہلے صفحے سے شروع ہوتا ہے لیکن مجھے آخری صفحہ پر رشی خان کی مندرجہ ذیل تحریر نے شدتِ حیرت نے چونکا دیا ملاحظہ ہو: ''خدا کے نام لوٹ ہے!'' ''کیا خدا کے نام لیواؤں کو خبر نہیں کہ جب وہ منبر کی بلندی سے اتر کر ہم گناہ گاروں سے چندہ مانگتے ہیں تو خدا خوش نہیں ہوتا۔'' ''کچھ دیا سیکھتے ہوئے جن لوگوں کو شرمندگی کا احساس ہوتا ہے، انھیں جان لینا چاہیے کہ ان کی انا دراصل ان کی دشمن ہے۔''

''تاریخ بتاتی ہے کہ عورت کی جسم فروشی کی ابتدا کی قدیم تہذیب میں مذہبی رہنماؤں نے اپنے دیوتاؤں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے کی تھی۔'' ''غلط ہیں وہ لوگ جو دوستی، محبت یا کسی رشتے میں جان دینے یا جان لینے کی بات کرتے ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی اور شے، کوئی رشتہ یا تعلق انسان کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا۔'' اس آخری صفحہ پر رشی خان کی ان مختصر سطروں میں پنہاں عظیم پیغامات کسی بھی صورت میں عالمی محبت کے پیغامات اور عالمی امن کے پیغامات سے کم نہیں۔ مجھے امید ہے کہ بلکہ میں اس تعارفی تحریر کے ذریعہ کم از کم باشعور لوگوں کو پرزور ترغیب دیتی ہوں کہ ان کہانیوں کے مجموعے کی ہر کہانی کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے قابل ہے۔ معاشرے کی گھناؤنی منافقت سے جس طرح راست گوئی سے پردہ اٹھایا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ جس مرد کی جھوٹی جنسی زیادتی، تشدد اور عورت، عورت کی نفسیات اور مذہب کیسا فا کی کیا کچھ نہیں ہے۔ رشی خان کہتے ہیں کہ یہ کتاب صرف ذہنی بالغوں کے لئے ہے لیکن میں نے اسے پڑھا تو لگا کہ یہ تو سکولوں کے نصاب میں شامل ہونی چاہیے تاکہ بچپن سے یہ شعور آیا کرے گا تو ذہنی بالیدگی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اپنے کھلے ذہن اور بے باک قلم کی وجہ سے رشی خان میں منٹو اور عصمت چغتائی کا رنگ نظر آنے کے باوجود ان کا الگ اندازِ بیان ہے۔ تیرہ افسانوں کی بات کرنے سے پہلے آخری افسانہ جو شاہکار افسانہ ہے۔ جو ''امام مسجد اور جسم فروش عورت کا دوہرا قتل'' بادی النظر میں کرائم سٹوری ہے لیکن چشم کشا ہے۔ اس افسانے میں ایک دن لاسٹر سوسائٹی کے اجتماعی شعور کو جگانے کے لئے قارئین کی نذر: ''ایک کم علم امام مسجد مذہب اور سوسائٹی دونوں کے لئے زہر قاتل ہو سکتا ہے'' کہ کس طرح امام مسجد معاشرے کے لوگوں سے شعور

پہنچتا ہے اور ثواب کے حصول کے لئے علماء بھی براہِ راست مولوی یا امام حاصل کر کے شخصیت پرستی کی لعنت اور گناہ کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک پر امن رہائشی کالونی امام مسجد کی سرپرستی میں جرائم، عصمت فروشی، منشیات اور قتل غارت کی آماجگاہ بنی۔ یہ افسانہ اہل ایمان کے فیصلے درست کرنے کے لئے لازمی ہے پڑھا جائے بلکہ اس کو مشعلِ راہ بنا کر آنکھیں کھولی جائیں اور اس راہِ ہدایت کو فروغ دیا جائے۔ افسانے کی ہر لائن کی وضاحت کرنا کتاب کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہ کام قارئین خود کریں۔ اب آتے ہیں کتاب کی بقیہ کہانیوں کی طرف جن میں ہر کہانی عورت کے حقوق پر ہے اور خاص طور پر عورت کی نفسیات کے حساس پہلو یعنی عورت کے جنسی حقوق کی پامالی پر ہے۔ اس موضوع پر مصنف نے بے باک اور کھلم کھلا لکھا ہے جس پر شاید ابھی تک کسی نے نہ لکھا ہو اور حیرت کا مقام ہے کہ مصنف نے مرد ہو کر عورت کو جنسی معاملات میں برابری کے حقوق اور ان حقوق کے لئے آواز اٹھانے کی جرأت کی ہے۔

دیگر افسانے بھی عورتوں کے معاشی حقوق، تعلیم اور معاشرتی رتبے کو بلند کرنے کے علاوہ ان کی طاقت اور حوصلے کے جوہروں پر بات کی ہے کہ کوئی عورت جس کو نازک اور ناقص العقل سمجھ کر دھتکار دیا جاتا ہے وہ کتنی طاقتور ہو سکتی ہے اور بڑے بڑے مردوں کو پچھاڑ سکتی ہے۔ اپنی افسانوں میں جس خاص موضوع کو چھیڑا گیا ہے اور عورتوں اور مردوں کو جھنجھوڑ کر آگاہی دی گئی ہے وہ ہے عورت کے کنوارپن کو اور پاکدامن ہونے کو اس کے پردۂ بکارت کے ساتھ منسوب کرنے کی جہالت دور کرنے کے لئے ظالمانہ اور سفاکانہ فیصلوں کی نفی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں افسانہ "سہاگ رات کی سفید چادر" شاہکار افسانہ ہے۔ عورت اور مذہب ان کے خاص موضوعات ہیں اور مردوں کے گھٹیا ذہن جو عورت کے بارے میں ہر فیصلہ خود کرتے ہیں اور ان فیصلوں میں شادی کے فیصلے، کنوارپن کے فتوے، گناہ و سزا کے فیصلے اور معاشی اور ذاتی طور پر عورتوں کو کمتر جاننے اور دھتکارنے کے فیصلے اور مرد کے جنسی جنون اور اس سے منسوب جسمانی اور سفاکانہ جنسی تشدد پر بے باک قلم اٹھایا ہے اور اس طرح مصنف اپنی اس کتاب میں کہانیاں بحیثیت نسائی تحریک کے علمبردار دکھائی دیتے ہیں۔ مذہب میں انہوں نے صرف اسلام ہی کو زیرِ بحث نہیں لایا بلکہ عمومی طور پر تمام مذہب کی بات کی ہے کہ کس طرح کوئی مذہب سائنسی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور یہ کہ کسی بھی مذہب کی نئی نسل عقل کی کسوٹی اور شعور کی پرواز سے اپنے والدین کے ان دیکھے خداؤں اور عقائد کو رد کرتی ہے۔ اس بات کو انہوں نے اپنے افسانے "ایک سچے عیسائی اور خالص جرمن کا دل" میں کیا ہے۔ یہ افسانہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اب مختصراً ان کہانیوں اور افسانوں کے نام قارئین کی خدمت میں پیش ہیں:
سہاگ رات کی سفید چادر / ابو صالح اور جوزفین / ایک سچے عیسائی اور خالص جرمن کا دل / عورت کو غلطی کے حقوق / مردوں کا پردۂ بکارت / کہاں گئی مردانگی؟ / ایک بے بس بیوی کا ہمسفر / کنواری لڑکی کی خریداری / تم ایک بے کار عورت ہو / بیوی کی بے وفائی / گرگیوں / دشمن کے بیٹے کی ماں / وہ تو ایک نامرد ہے / امام مسجد اور جسم فروش عورت کا دہرا قتل۔

پیش لفظ بعنوان "قارئین کے حضور" بھی ان کی جانب سادہ مگر پُر اعتماد تحریر ہے جس کو بغور پڑھنا بھی ضروری ہے کہ اس میں افسانے پڑھنے سے پہلے ہی بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ انتساب بھی عورتوں کے حقوق کی زبردست حمایت کا عکاس ہے۔

◆◆◆

تبصرے

تبصرے ڈاکٹر شبیر احمد قادری کے

مختصر تعارف

ڈاکٹر شبیر احمد قادری 23 جولائی 1960ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی اسناد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے حاصل کیں۔ شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں صدر شعبہ رہے۔ 2020ء میں ریٹائر ہونے کے بعد، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایچ ای سی میں ریڈیو پاکستان کی جانب سے بیسٹ پرفارمنس ایوارڈ جیت چکے ہیں۔ ایچ ای سی سے منظور شدہ تحقیقی مجلہ ''زبان و ادب'' کے مدیر رہے۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد کے تحقیقی مجلہ ''تصدیق'' کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ علاوہ ازیں ادبی رسالہ ''نخلستان'' اور ''شعر نعت'' کے بھی مدیر اعلیٰ ہیں۔ اب تک ان کے سینکڑوں علمی و ادبی اور تحقیقی مضامین و مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

نفیری

شاعر : خالد اقبال یاسر

صفحات: 132 قیمت: -/600 روپے ناشر: ابلاغ، رحمان آباد، راولپنڈی

اردو غزل بلاشبہ ایک سخت جان صنفِ سخن ہے اور سب سے مقبول اور محبوب صنفِ شعر بھی۔ کلاسیکی اور جدید شعرا کا بیش تر سرمایۂ سخن اسی صنف کی تجوری میں بند ہے۔ انسانی سوچ کی گرفت میں آنے والا کون سا موضوع ہے جو غزل نے اپنے بے حد تنگ دامن میں نہ سمیٹا ہو۔ موضوعات کے پھیلاؤ اور ہیئتی تجربات نے بھی اردو کو قابلِ توجہ صنفِ سخن بنا دیا۔ بالفاظِ دیگر یہ صنف تھی ہی قابلِ توجہ اور مثالی لچک دار کہ موضوعات پھیلتے چلے گئے اور ہیئت نئے زیورات سے آراستہ ہوتی چلی گئی۔ کسی اور صنف میں بھلا یہ داؤ پیچ کب آزمائے گئے ہیں۔ خالد اقبال یاسر بھی شعرا میں ممتاز مقام و مرتبے کے حامل ہیں جنھوں نے غزل کو نئے موضوعات کے ذائقوں سے آشنا کیا اور تجربات بھی خوب کیے۔ موصوف بنیادی طور پر مشکل پسند شاعر ہیں۔ ردیف قافیہ کے حوالے سے بھی وہ پامال راہوں پر چلنا گوارا نہیں کرتے۔ ایک قافیہ ردیف کی حامل غزل ان کے لیے ناکافی ہو تو دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں غزل کہہ کر اپنے مشامِ ذوق و شوق کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ اس خوش خرامی میں وہ صوتی توانائی کو رزقِ سخن بنانے کو عار نہیں سمجھتے۔ ڈاکٹر فرحت جبیں ورک دیباچے میں لکھتی ہیں: ''نفیری''

کی غزلیات میں عام تخلیقی رجحانات کے برعکس معاملات کے تکرار تواتر سے خصوصی دلچسپی کا اظہار نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً ایسے قوافی جنھیں اکثر شعرا اپنے تخلیقی عمل سے دور رکھنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں ۔۔۔ تصویری اول و آخر تا قدرے سخن کو داد گری کی تحریک دیتا ہوا قارئین کے ذوق کی تربیت کرتا ایک شعری مجموعہ ہے۔ ایسا شعری مجموعہ جو کہ مروجہ شعری معیارات و اقدار کی ارفعیت کا ایک نیا پیمانہ وضع کرنے کی صلاحیت سے معمور ہے۔" (ص 18-25) ڈاکٹر صاحب کی رائے درج کرنے کا مقصد خالد اقبال یاسر کے نئے شعری مجموعے "تصویری" کی آمد کی خبر دینا اور اس کے اہم مشمولات کے بارے میں قارئین کی توجہ مبذول کرانا ہے۔ یہ غزلوں کا مجموعہ ہے اور اس میں شامل چند نظمیں بھی غزل کی ہیئت میں ہیں۔ دو حمدوں، چھ نعتوں کے علاوہ اس مجموعے میں "سیاست نامہ" اور ایک سہرا بھی شامل ہے۔ یہ سہرا شاعر کے پامال راہوں سے ہٹ کر چلنے کی نادر مثال ہے۔ یہ کسی اور کا نہیں شاعر کے بیٹے کا سہرا ہے:

کہا نہ جائے خوشی سے، مگر کہوں سہرا   کہوں زبان سے نہ آپ ہی کہوں سہرا
لکھی ہیں رخصتیاں اور سہرے اوروں کے   لکھاؤں کیوں کسو اپنے کا غیر سوں سہرا
مہکتی ہے کوئی کنج بہشت، وجداں میں   کھلی کلی، بھرے گل ان سے میں چنوں سہرا
(ص128)

"سیاست نامہ" اور "16 دسمبر 2014ء کے شہید طلبہ کی یاد میں" ان کے عصری شعور اور دردمندانہ اظہار کی ترجمان ہیں۔ خالد اقبال یاسر کی غزل، آج کی غزل ہے۔ تر و تازہ اور شگفتہ۔ الفاظ دم بدم اور تراکیب کم سے کم۔ اس قدر مونے پر عمل کاری نے ان کی غزل کو ظاہری حوالے سے قابل مطالعہ اور آسان بنا دیا ہے مگر باطن گویا مصرع مصرع ایک الاؤ کا وجود رکھتا ہے۔

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے   جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

خالد اقبال یاسر کے دو قطعے بھی اس مجموعے کا حصہ ہیں۔ اور اس شعبے میں ہنر آزمائی کی بدولت بہت مقبول ہیں۔ "تصویری" کی شاعری کا حقیقی لطف اس کے مطالعے اور بغور مطالعے ہی سے ممکن ہے۔ شاعر موصوف پس ورق پر درج اپنی وقیع رائے کے تناظر میں سماجی حقیقتوں کی ترجمانی، تخلیقی وارفتگی اور دوسروں کو اپنے غموں اور خوشیوں میں شریک کرنے کی حامل شاعری کے علمبردار ہیں۔ "تصویری" میں شامل شاعری ان کے پہلے مجموعوں کے مانند ان کے اپنے افکار و نظریات کی عکاس ہے۔ اس میں سماجی حقیقتوں کی جھلک ہے، تخلیقی وارفتگی اور قارئین کو اپنے دکھ سکھ میں شریک کرنے کی عملی صورتیں بھی موجود ہیں۔

زیتون دی پتی

شاعر : نذیر قیصر (مترجم: خالد علوانی گل)

صفحات 178   قیمت -/630 روپے   ناشر : شعر و ادب

جن شعرا کو اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان میں سے ایک محترم نام نذیر قیصر کا بھی ہے۔ اردو اور پنجابی

شاعری دونوں میں ممتاز مقام کے حامل نذیر قیصر "آنکھیں چہرہ ہاتھ"، "گنبد خوف سے بشارت" اور "اے شام ہم سخن ہو" سے ادبی دنیا میں مقبول ہو چکے تھے۔ "اے ہوا مؤذن ہو" ان کا اہم نعتیہ مجموعہ ہے۔ 1975ء میں نذیر قیصر کا پنجابی شعری مجموعہ "زیتون دی پتی" منظر عام پر آیا تو علمی و ادبی حلقوں کی جانب سے اس کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ ایک مختصر نظم "چھد اویا" ملاحظہ ہو:

چڑیاں بولن / سورج جاگے / رات دا مخمل کملاوے / ایہہ چھد یکھ کے / چھد اویا / اپنا ہتھ ہلاوے (ص 82)

امرتا پریتم نے "زیتون دی پتی" کے حوالے سے لکھا اپنے عہد کی شہادت قلم بند کی: "میں لیا کہ پہلا حرف خدا دا ناں ہے۔ دوجا موت دے پرچھاویں دا، پر میری مبارک ایسے حرف نوں ہے۔ نذیر قیصر نوں، جیہڑا اوس انسان نوں، جیہدی ذات دا دیوا ہتھاں بلدا ہے۔ ساری دنیا دیاں گلیاں جیہڑی حقیقت نال آباد ہن جیہڑی یہ ہن۔ شاعر پیلاں اوہناں گلیاں وچوں لنگھدا ہے تے جاپدا اے اوتھے ساہ لینے سیاسی دھکو گھوک تنی پئی ہے۔ اوتھے صرف شاعری دی آواز جاگدی ہے۔

اساں اپنا کی دن دا بوہا ویہڑے چ بندوق اگ پئی (ص 11)

ترجمہ کار خالد عطا نوائی نے اب "زیتون دی پتی" کو شاہ مکھی سے گورمکھی میں ترجمہ کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں دونوں رنگ موجود ہیں۔ ایک صفحے پر گورمکھی اور اس سے متصل اوراق شاہ مکھی رسم الخط سے جگمگا رہے ہیں۔ ان دونوں لپیوں کو جاننے والا اس مجموعہ شاعری سے خوب حظ اٹھائے گا اور ساتھ ہی ساتھ اسے اصل متن اور ترجمہ شدہ متن کا تقابلی مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملے گا۔ شاعری کے بارے میں نذیر قیصر کے خیالات بہت اہم اور ان کے دل کی آواز ہیں: "کوئی شاعری کیہ ہے؟ ایہہ تے زندگی تو جنم لیندی ہے۔ جیہڑے اپنی زندگی تے خیالاں نوں بولن دی ہمت نہیں رکھدے او کوئی شاعری کیویں کر سکدے نیں؟ کوئی تے وڈی شاعری کا محسن سنی توں کجھ زیادہ دا تقاضا کردی اے تے شاعری وچ ایس کرلی صوفی دی اکھ ہوئی چاہیدی اے۔ باہر دی اوہنوں ای دریا نظر آندا اے جیہدے اندر دریا ہوندا اے۔" (ص 30) خالد عطا نوائی نے اپنی ذات کے اندر صوفی جی کی شاعری کا ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے درست لکھا ہے: "رنگ، خوشبو، روشنی، امن تے محبت دا پیغمبر جہاں دا اندرون تکیا ہووے تاں نذیر قیصر ہوراں دی شاعری راہیں ویکھیاں جا سکدا اے۔ "زیتون دی پتی" نوں پڑھدے سمے ایس احساس نے مینوں پوری شدت نال گھیر لیا ہے اج تو پنجاہ ورھے پہلاں امن تے محبت دی اینی لوڑ سی اج تے اوس توں وی بہت زیادہ ہے۔ کیوں جے ہر پاسے نفسانفسی آپا دھاپی تے جنگ دی حالت ہے۔ تے دنیا وچ نفرتاں دیاں لہراں پے گئیاں نیں۔ ایہدے نال ایہ خیال وی زور پھڑ گیا کہ "زیتون دی پتی" ماں بولی دا اک بہت وڈا ورثہ ہے جیہڑا ایہدے وارثاں تک اپڑان دی اج لوڑ اے۔" (ص 21-22)

"زیتون دی پتی" کا گورمکھی میں ترجمہ کرنے پر مترجم ہماری تہنیت اور تحسین کے حق دار ہیں۔ انھوں نے بلا شبہ ترجمے کے لیے شاہ مکھی کے بے حد اہم متن کا انتخاب کیا ہے جو مترجم کے ساتھ ہماری بھی پسند ہے۔ اس کتاب میں نصیر احمد اور انجم سلیمی کی آرا بھی شامل ہیں جن میں نذیر قیصر کے اشعار و افکار کو خوب سراہا گیا ہے۔ اول الذکر نے ان کی شاعری کو رنگ، روشنی، انسان دوستی، امید اور جمالیات کی منظر قرار دیا ہے اور ثانی الذکر نے انھیں شاعری کی بہشت میں دیکھے ہوئے خواب سے تعبیر کیا ہے۔ خالد عطا نوائی کے حسن انتخاب کی داد ایک طرف، ان کی محبت اور محنت کے پیچھے بہت داد دیتے ہیں کہ موصوف نے اسے ایک رسم خط سے دوسرے

رسم الخط میں متعارف کرانے کا اہتمام کیا ہے۔ ترجمہ و تحقیق آج کے سائنسی دور کے اہم علمی معیارات ہیں اور یہ ترجمہ شدہ کتاب اسی علمی دنیا کی طرف ایک نئی پیش رفت ہے۔

متفرقات

مصنف : ڈاکٹر بدر مُنیر

صفحات: 192 قیمت: 500/- روپے ناشر: مکتبۂ اسالیب، سرگودھا

کسی ایک شعبے میں شہرت اور مقبولیت ادیب کی دلچسپی کے حامل دیگر شعبوں کے مابین ایک سکرین (اور کبھی دیوار) کی صورت حائل کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر بدر منیر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ طنز و مزاح کے حوالے سے ان کی ادبی شناخت نے دیگر ادبی حیثیتوں کو دھندلا دیا ہے۔ وہ ''مجھے پلکیں جھپکنے دو'' اور ''زرِ گزراں'' کے نام سے سنجیدہ شاعری کے مجموعوں سے ادب کا دامن مالا مال کر چکے ہیں۔ ''بیسویں صدی کا شعری ادب'' ان کے تنقیدی افکار کا حامل مجموعہ ہے۔ 'دیدہ و خوش آب' کے نام سے خوشابی شعراء کی شاعری کا انتخاب اور ''مٹھی بھر جگنو'' کے زیرِ عنوان بچوں کے لیے نظموں کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ مگر ان پر شہرت کی دیوی مہربان ہوئی بھی تو طنزیہ شاعری کے حوالے سے اور ڈاکٹر بدر منیر نے بھی اسی وجہ شہرت کو سینے سے لگا لیا۔ ''الاروانے''، ''شغل بیانہ'' اور ''شغل و لواز'' اردو دنیا میں ان کے تعارف کا وسیلہ بنیں۔ ان کی تازہ تصنیف ''متفرقات'' ہے۔ نام کی توجیہ غالباً یہی ہے کہ اس میں مختلف الموضوع مضامین اور دیباچے شامل ہیں۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1- مضامین 2- حاصلِ زیست 3- دیباچے۔

اول الذکر حصے میں شامل مضامین کے عناوین ملاحظہ ہوں۔ ''حالی کی سیرت و سوانح اور اردو تحقیق و تنقید''، ''موجودہ معاشرہ منظوم تحریروں کی روشنی میں''، ''آنند بخشی ـــــ ایک عہد ساز گیت نگار''، ''ڈاکٹر وزیر آغا ـــــ ایک تاثر''، ''ڈاکٹر انعام الحق جاوید کا تخلیقی پڑاؤ''، ''عباس تابش کے بحرِ شعر''، ''پروفیسر جلیل الرحمٰن کی فکری شگفتگی''، ''ڈاکٹر سکندر حیات میکن کی تحقیقی و تنقیدی روش''، ''مشہور علی نجمی ـــ جوش و جذبہ کی علامت''، ''ادبیات خوشاب ـــ ایک جائزہ''، ''بے تکلف قد ریس''۔ ثانی الذکر عنوان کے تحت دو اساتذہ پر تین مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ـــ کچھ یادیں کچھ باتیں''، ''ڈاکٹر رشید امجد۔ میرے استاد میرے رہنما''، ''ڈاکٹر رشید امجد میرے لیے''۔ آخر الذکر حصے میں دیباچے اور منتخب اداریوں کو جگہ دی گئی ہے۔ دیباچوں کے عنوان یہ ہیں: ''گلستانِ ادب کا گجر باغ و بہار''، ''غزل کی زد پہ آیا ہوا غزال''، ''تحقیق اختر افغانی کی غزل گوئی''، ''خود نوشت سوانح عمری''، ''قلیم کی ضرب کیسی''، ''شعلوں پہ تصویر۔ مختصر جائزہ''، ''گل جہاں کا جہانِ شعر''، ''ایک قابلِ قدر تحقیقی کاوش''، ''ماہیا سحر کی پہلی دستک''، ''جنت مرے خیال کی''۔ اس حصے مجلہ ''جوہر'' کے لیے لکھے گئے اداریے بھی شامل ہیں۔

''متفرقات'' میں ڈاکٹر بدر منیر کا اسلوب شگفتہ اور قدرے شاعرانہ ہے اور یہ ان کے شاعر ہونے کے اثرات ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو: ''مزاح گوئی، انعام الحق جاوید کے تخلیقی پڑاؤ کا ایک موڑ ہے اور یہ پڑاؤ کئی منزلوں پہ مشتمل ہے۔ آپ اس پڑاؤ میں داخل ہوں۔ کسی موڑ پر آپ کو تحقیق و تنقید کی دنیا آباد نظر آئے گی۔ کہیں کالم نگاری اور سفرنامہ نگاری کا ڈیرہ ہوگا۔ کسی موڑ پر

آپ کا سامنا پنجابی شاعری "کِکر جھلے دھپ" سے ہوگا۔ کسی منزل پر سنجیدہ شاعری "ساتویں سمت" کے روپ میں دکھائی دے گی۔ "ساتویں سمت" سے ایک شعر میرے دروِل پر دستک دے رہا ہے۔ آپ بھی سنیے:

نہ پوچھ کیسے ترے دل میں گھر کیا ہم نے　　　　یہ مرحلہ بڑی مدت میں سر کیا ہم نے

جب آپ آپ قطور پر پہنچیں گے تو آپ کو لکھا ملے گا "ہمہ سے آ ذہمہ سے چلا" یہاں خوش کلامیاں اور خوش بیانیاں نظر آ رہی ہیں گی۔ ان کے پہلو بہ پہلو طرفہ اپنی شاعری کے بہترین انتخاب "کئی زعفران منظوم قطعے اور کچھ بارے تبسم بھی دکھائی دیں گے۔ اس تحقیقی پڑاؤ کی بنیادیں بڑی مضبوط ہیں کیونکہ اسے بڑی محنت اور محبت سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ یہ پڑاؤ ہے کہاں؟ تو میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ یہ پڑاؤ "لہائے ظرافت" ہے جہاں آپ کو ہر دم تازہ دم انعام صاحب ادبی جلوے دکھاتے ہوئے نظر آئیں گے۔" (ص 71-70) ایک آدھ مضمون چھوڑ کر مصنف کا یہی اسلوب نگارش ہے۔ جس سے ان مضامین میں پڑھنے والے کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ موصوف نے اپنے مرحوم دوستوں اساتذہ کا ذکر بہت محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے اور معاصر ارباب فکر و نظر کی کتب کے ابتدائیے لکھ کر ان کے خال و خد ابھارا کر دیے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی رائے درست ہے کہ ڈاکٹر بدر منیر نے لفظوں کو کئی رنگوں میں ڈھال کر شعر و سخن کی کہکشاں تشکیل دینے میں کمال ہنر کا مظاہرہ کیا ہے۔" (پس ورق)۔ "متفرقات" اکیسویں صدی کے علمی و ادبی تاثرات کے فہم کے ذیل میں بہت عمدہ پیشکش ہے۔

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی ڈاکٹر وزیر آغا شناسی

مرتب : ممتاز عارف

صفحات: 184　　قیمت: 600/- روپے　　ناشر: مثال پبلشرز فیصل آباد

ممتاز عارف، سرگودھا سے متعلق ممتاز شاعر اور نقاد ہیں۔ ان کے فکر و فن کی پذیرائی اور تحسین کرنے والوں کا شمار ممکن نہیں ہے۔ ایسا قابل تحسین شخص اور شاعر جب کسی ہم عصر کی تحسین پر آمادہ ہوتا ہے تو یہ عمل اس کے کشادہ ظرف ہونے کی بین دلیل ہے۔ "ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی ڈاکٹر وزیر آغا شناسی" ممتاز عارف کی اس اعتبار سے عمدہ کاوش ہے کہ اس کے توسط سے انھوں نے اپنے ایک ہم عصر اور ہم عصر ادیب کی بے کنار صلاحیتوں کا اعتراف ایک خاص قرینے سے کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے لکھے گئے مضامین کا انتخاب، ڈاکٹر تبسم کی جن تالیفات سے کیا گیا ہے ان کے نام ملاحظہ ہوں: "آفتاب ادب ڈاکٹر وزیر آغا"، "سرگودھا میں وزیر آغا شناسی"، "ڈاکٹر وزیر آغا کی اقبال شناسی"، "ڈاکٹر انور سدید کی وزیر آغا شناسی"، "انوار ادب" اور "عظیم ادب"۔ زیر نظر کتاب میں شامل ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے درج ذیل مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان کے عنوان یہ ہیں: "ڈاکٹر وزیر آغا ایک ادبی تحریک"، "ڈاکٹر وزیر آغا شناسی میں ڈاکٹر انور سدید کا کردار"، "انوار ادب۔ یادِ ڈاکٹر وزیر آغا"، "ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش۔ شخصیت و فن"۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے وزیر آغا کی مختلف ادبی جہتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ وزیر آغا کو ایک فرد سے زیادہ ایک

ادبی تحریک قرار دیتے ہیں اور آغا صاحب کی ادبی خدمات کے حوالے سے یہ رائے صد فی صد درست ہے۔ موصوف کے مطابق "ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو ادب کے مختلف اصناف میں عمر کے آخری حصہ تک علمی، ادبی، تحقیقی اور تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ اردو زبان و ادب میں دبستانِ سرگودھا کی بنیاد رکھنے اور اسے پروان چڑھانے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ سرگودھا ایک مردم خیز علاقہ ہے جس میں بہت سی ادبی شخصیات پیدا ہوئیں۔ ان میں وزیر آغا سب سے نمایاں تھے۔" (ص 150)۔ ممتاز عارف نے اس کتاب کو صرف اپنے ممدوح کے مضامین ہی سے نہیں سجایا بلکہ خود بھی ان کی کتب پر تبصرے لکھے ہیں اور قاری کو ان کے مندرجات سے متعارف کرانے کا مستحسن فیصلہ کیا۔ یوں یہ کتاب تالیف ہی نہیں تصنیف بھی بن گئی ہے۔ نصف نصف والا معاملہ ہے۔ مرتب کے مضامین / تبصرے یہ ہیں: "آفتابِ ادب ـــــ ڈاکٹر وزیر آغا"، "سرگودھا میں وزیر آغا شناسی"، "ڈاکٹر وزیر آغا بطور اقبال شناس"، "ڈاکٹر انور سدید کی وزیر آغا شناسی"، "انوارِ ادب ـــــ ڈاکٹر انور سدید"، "سلیم ادب ـــــ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش"۔ مذکورہ بالا مضامین سے اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ اس سے ایک جانب ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی وزیر آغا کے بارے میں افکار و خیالات کا علم ہوتا ہے۔ وہاں مرتب موصوف کی جانفشانی کے اوصاف و کمالات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ پروفیسر طاہر محمود گوندل نے اس کتاب کو بجا طور پر ممتاز عارف کی جوہر شناسی کے تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ممتاز عارف اپنے ادبی رفیق سر محترم تبسم کی بے مثال صلاحیتوں اور ارتفاع کے خوب شناسا ہیں۔ اس لیے وہ ان کی وزیر آغا شناسی کو ضبطِ تحریر میں لا کر اہلِ علم کی تحسین و تحریک کے مستحق قرار پاتے ہیں۔" (ص 25)۔ کتاب کے ابتدائیے لکھنے والوں میں پروفیسر ڈاکٹر یوسف خشک، جبار مرزا، نسیم سحر، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، منصور آفاق اور ملک اشرف ذکی اعوان شامل ہیں جنھوں نے صاحبِ کتاب اور موضوعِ کتاب کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی و ادبی خدمات پر انھیں خراجِ تحسین اور ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ وزیر آغا شناسی کے حوالے سے وزیر آغا کے شہر میں رہنے اور ان سے براہِ راست فیض حاصل کرنے والوں کی اس محسنِ ادب کے زر و جواہر کو سطحِ قرطاس پر منتقل کرنے پر انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور یہ کتاب محققین و ناقدین اور مورخینِ ادب کے لیے اساسی حوالے کے طور پر کام آئے گی۔

بالیتھری

مصنف : شہریار احمد خان

صفحات: 176 قیمت: ـــــ روپے ناشر: ادارہ بیاض، لاہور

"بالیتھری" شہریار احمد خان کے افسانوں کے مجموعے کا نام ہے اور اس مجموعے میں شامل چھبیس افسانوں میں سے ایک افسانہ بھی ہے۔ ایک مرکزی اور اہم افسانہ۔ دیگر افسانوں کے نام ملاحظہ ہوں: "صوفی"، "ہم کلام"، "انوبھگ"، "اک عورت مرد"، "تو تھہ فیری"، "یَفْعَلُ، یَفْعَلَانِ، یَفْعَلُونَ"، "تماش بین"، "مورتی"، "صندلی"، "بڑا بھائی"، "ایک میل"، "ابوجان"، "گلدان وارث"، "مکتوب"، "محبت"، "بیچارا"، "جگ جگ"، "زندگی"، "کون جیتا کون ہارا"، "دیوی"، "پاک سرزمین"،

"باکرہ"، "دشمنی دشمنی"، "فیصلہ"۔ شہریار خاں کے افسانے بالعموم گروہ بندی کے مسائل ہیں جو طبقاتی کشمکش، روپے پیسے کی چمک دمک، لاقانونیت، بدعنوانی، دیانتداری، ذرائع آمدن، لقمۂ حرام اور ہوس کی بنا پر جنم لیتے ہیں اور بہت سے معصوم اور بے گناہ خواتین و حضرات سے اپنی مرضی سے جینے کا حق چھین کر انھیں بے یارو مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے۔ "باتصویری" افسانہ ماں بیٹی کے استحصال کی چیخ ہے۔ دولت اور ہوس کے پجاریوں کے ہاتھوں کمزور لوگوں کی عزت محفوظ نہیں۔ یہ محض قاسمی اور باتصویری اور پھر دوسری خاتون کی کہانی نہیں ہے بلکہ ہر مظلوم کے دل کی آواز ہے۔ اردو افسانوں کے اس مجموعے کے بھی کردار کسی نہ کسی کشمکش اور کھینچا تانی کی زنجیر میں بندھے دکھائی دیتے ہیں۔ افسانے کا بحیثیت ہی تقاضا اور یہی حسن ہے وہ زندگی کی کشاکش میں مبتلا رہیں۔ خود مصنف بھی شہریار احمد خاں پیش لفظ ("نقطۂ نظر") میں لکھتے ہیں: مجھے لکھتے ہوئے کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی۔ اپنی سوچوں کی عکاسی کرنی ہو یا بغاوت کرنی ہو۔ مشکل صرف یہ ہوتی ہے کہ قلم کو لکھنے سے کیسے اور کیونکر روکا جائے جس کے لکھنے سے انسان صدیوں سے معتوب ہوتے آئے ہیں، مصلوب ہوتے آئے ہیں۔ شاید ایک دن میں بھی وہ سب کچھ لکھ ہی دوں گا۔ لکھنا حق ہے، لکھنا ہی امر ہے۔ پتھروں پر لکھی تحریریں تو صدیوں تک رہ جاتی ہیں۔ مگر آج کے دور میں اگر قرطاس ابیض پر یہ الفاظ ثبت نہ کیے جائیں، شائع نہ کیے جائیں تو یہ ہمیشہ کے لیے مٹ جاتے ہیں۔" (ص 9) شہریار احمد خان ہر طرح کے استحصال کے خلاف ہیں چاہے اس کی بنیاد مذہب (مذہبی لوگ) ہوں، سماج ہو یا سیاسی دلفریبیوں کے جال۔ مصنف فریب خوردہ اور مظلوم (شاید معصوم) افراد کو اہمیت نہیں کر کے بلکہ جیسا کہ وہ ہیں ویسا ہی حالت میں سماج کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ فرحت پروین کے مطابق: شہریار احمد خان اپنی روح میں روشن اور اس چراغ کی رہنما روشنی میں انسانیت کی خدمت کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ چونکہ ان میں یہ جوہر فطری ہے اس لیے انہیں پلاٹ، اسلوب، الفاظ تلاش کرنے اور کہانی تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ احساس جو انہیں مضطرب کئے ہوتا ہے پہاڑی چشمے کی طرح ان کے اندر سے پھوٹتا ہے۔ پیچ و خم سے گزرتے ہوئے الفاظ خود اس میں آ آ کر شامل ہوتے رہتے ہیں اور بڑی ہموار روانی سے بہتے چلے جاتے ہیں اور کہانی صورت پذیر ہو جاتی ہے۔" (تعارف، ص 11) شہریار احمد خان کے اس کتاب میں شامل افسانے زبان و بیان کی لطافتوں سے مملو ہیں۔ قارئین کی طرف سے اس کتاب کا یقیناً خیر مقدم کیا جائے گا۔

◆◆◆

صحافی اظہر جاوید کی کتب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو عطیہ کر دی گئیں

لاہور (کامرس رپورٹر) پنجاب یونیورسٹی مین لائبریری کو صدارتی ایوارڈ یافتہ معروف شاعر و ادیب، صحافی اور ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر اظہر جاوید (مرحوم) کے ورثا کی جانب سے ان کا ذاتی ذخیرۂ کتب عطیہ کر دیا گیا ہے،
2 ہزار ہے۔ چیف لائبریرین
چوہدری محمد حنیف کے مطابق پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو ملنے والا یہ 28 واں بڑا ذاتی ذخیرۂ کتب ہے جبکہ چھوٹے ذخائر کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ (روزنامہ "نوائے وقت" کی بات، لاہور، 30 جون 2012ء)

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ "تخلیق" جون 2023ء اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ وارد ہوا۔ "تخلیق" کی تحریریں ہمیشہ کی طرح خوشگوار اور خوش وضع رہیں۔ اس وقت میں بہت غم زدہ ہوں۔ ہمارے پیارے دوست سلطان سکون کی بیٹی نیلم وفات پا گئی ہے۔ مرحومہ نے تعلیم و تدریس کے باب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مرحومہ کی شخصیت قدر کے سب خاندان والے مداح رہے۔ سلطان سکون ہمارے ہزارے کے ممتاز شاعر ہیں۔ دل سوز دوست سکون کی غزل پائے کی ہے۔ وہ اس وقت بہت دکھی ہیں۔ انہوں نے اسی پائے کے شعر کہے ہیں:

دکھوں پہ صبر کی تلقین کر کے چل دے گا　　وہ عمر بھر کی رفاقت کا اتنا پھل دے گا

ہمارے سر پہ کئی آسمان بنتے گئے　　درخت کٹتے گئے اور مکان بنتے گئے

سکون صاحب پرائڈ آف پرفارمنس ہیں۔ ان کو اور بھی بہت سے اعزازات مل چکے ہیں۔ مشہور ادیب قمر زمان نے اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے ان کے خصوص میں کتاب لکھی ہے۔ "اردو ادب کے معمار سلطان سکون۔ شخصیت اور فن" شاید آپ کو معلوم ہو ہمارے ہزارے کے مشہور شاعر ریاض ساغر کا دو دن پہلے انتقال ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری کا مضمون "عمارت کی سرگزشت" ایک مکمل فن تعمیر کی تاریخ ہے۔

آصف ثاقب (ہزارہ)

﴿2﴾ جون 2023ء کا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ سب سے پہلے مدیر حق کا اداریہ "پہلی بات" زیر مطالعہ آیا۔ سطر سطر درد مندی سے لبریز۔ پہلا تجزیہ یہ کہ بحیثیت قوم ہم اخلاقی پستی کے گہرے سمندر میں ڈوب چکے ہیں۔ دوسرا یہ کہ گزشتہ پون صدی سے قوم کو مات سے تجربوں کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے اور نتائج بھی قوم ہی کو بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ کرسی اقتدار پر براجمان خود کو فرشتہ اور دوسروں کو گنہگار کہتا ہے بلکہ کہتا ہی رہتا ہے۔ عوام بھیڑ بکریوں کی طرح منہ تاکتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مایوس ہو کر کسی مسیحا کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اداریہ پڑھنے کے بعد قاری کا دل ملال و رنج سے بھر جاتا ہے اس لیے کہ ایسے حقائق مذکور کیے گئے ہیں کہ جن کا حل نظر نہیں آتا۔ تاہم مدیر صاحب کا یہ کہنا حوصلہ دیتا ہے کہ نا امید بالکل نہیں ہونا کہ مایوسی گناہ ہے مگر محض دعاؤں سے کام نہیں چلتا۔ زندگی کا سفر صرف عمل سے طے ہوگا۔ حصہ مضامین میں آصف ثاقب کا مختصر مضمون ہزارہ کے ایک منفرد اور کم معروف شاعر نسیم عباسی کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیت اور متنوع اسلوب کو بخوبی اجاگر کرتا ہے۔ انہوں نے نمونتاً دو اشعار بھی کوٹ کیے ہیں: "ہم لوگ ہیں سلیٹ پہ لکھے ہوئے نسیم اٹھتا ہوا سوال لگا کے سوالات کے لیے اور بچپن میں آسمان کو چھونے کا شوق تھا جب قد بڑھا تو پیار زمینوں سے ہو گیا۔" "ہم" کی معنی آفرینی کے بارے پروفیسر قاری علم الدین کی ایک خوب صورت اور معلومات افزا تحریر ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ نظر آئی کہ وہ سرطان ایسے مرض

سے مقابلہ آرائی کر کے بحکم ربی صحت یاب ہو گئے۔ ہم بھی قاری ان کے لیے دعا گو ہیں۔ اس حصے میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے یاد کیا ہے "چوراسی سال کے تارڑ" کو۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کی پوری طرح کوریج تو ممکن نہیں، تاہم اس چوراسی سالہ نوجوان کو یوں اچانک یاد کرنا اچھا لگا۔ لوگ حیران ہیں کہ "اس عمر میں تو سوچ، اپروچ کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں لیکن ان کی آئے دن کوئی نہ کوئی تازہ کتاب سامنے آ جاتی ہے۔ "جبار مرزا نے" "راولپنڈی کی ادبی روایت" میں اس شہر روشن میں ادب اور ادب نگاروں کا اجمالی جائزہ لیا اور خوب لیا۔

دیار افسانہ میں سب سے پہلے عذرا اصغر کی تحریر "وہ جب یاد آئے" سامنے آتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر یادنگاری تحقی ہے اس شخص کی جو مصنفہ کا کزن تھا، بچپن اور لڑکپن کے زمانے کا۔ پھر آئی جوانی اور اسی کے ساتھ تقسیم ہند کا دردناک سال بھی جو صدیوں پر محیط ہو گیا تھا، سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ ایسے میں بچھڑ جانے والے نظر نہیں آتے بس آنکھوں میں نمی آ جاتی ہے۔ ایک خوب صورت تحریر جسے درد آشنا ہی سمجھ سکتا ہے۔ "عشق کے رنگوں کی دھنک" بلقیس ریاض کے مشاق قلم سے، بسیار نویس ہیں، بہت سی کتابیں ان کے کریڈٹ پر ہیں۔ کالم نگار بھی ہیں ان کی مزید دو کتابیں زیر طبع ہیں۔ اس افسانے کی اٹھان عمدہ ہے تاہم انجام کے لیے قاری کو افسانہ پڑھنا ہی ہوگا۔ حصہ شعر میں خوب چمک ہے۔ دو منتخب اشعار: ہمارا عشق پوشیدہ نہیں (زمانے کا زمانہ جانتا ہے (آصف ثاقب) اور دل کا چاند ہی نکل آئے اول کے صحرا میں تیرگی ہے بہت (مسلم شمیم)

محمد طارق علی (راولپنڈی، کینٹ)

---

(3) "تخلیق" کا شمارہ جون ملتے ہی اس کا مکمل مطالعہ کر لیا تھا۔ پھر کچھ لکھنے کا ارادہ کرتے کرتے جولائی کا نصف بھی گزر گیا اور شاید آج بھی اپنی روایتی سستی میں یہ دن گزار دیتا مگر آپ کے دفتر سے ایک عدد "تخلیق" بھیجنے کا حکم نامہ آیا تو اس کی تعمیل کرتے ہوئے سوچا کہ یہ پرانا قرض بھی چکا دوں بلکہ فرض بھی ادا کر دوں جو جزوی طور پر اس شمارے پر فیس بک پر تبصرہ کر کے ادا کیا تھا۔ اس شمارے میں آپ کی پہلی بات ہی آخری بات ہے کہ آپ سیاست اور ادبی سیاست کے تمام منظرنامے نظر میں رکھتے اور اعلانیہ ان کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ نے بجا لکھا ہے کہ ہم 75 سال سے کسی مسیحا کے انتظار میں ہیں۔۔۔ افسوس کہ ایک آدھ کو چھوڑ کر جو مسیحا آیا وہ ہمارے لیے زہر کا پیالہ حیات ہو کے شکنجے میں پھنسا کر لایا، جس کا نتیجہ معلوم۔ ہم جتنی جلدی ان لٹیروں سے نجات حاصل کر لیں بہتر ہے ورنہ ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ اللہ خیر کرے۔ اب نئے انتخابات کا زور شور سے ذکر ہو رہا ہے اور تیرہ متحدہ پارٹیاں اپنی اپنی راہیں الگ کر رہی ہیں اور نئی سودے بازیاں اور گروپ بندیاں کر رہی ہیں، دیکھیے اس بار کس سے الحاق ہے کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن پاک پر رحم فرمائے اور کوئی ایسی قیادت سامنے آئے جو قوم و ملک کی ترقی کی خواہاں ہو، ورنہ یہی حالات رہے تو کل پھر ہم یہی کہہ رہے ہوں گے کہ کیا جال لائے ہیں اے شکاری۔

اس شمارے میں مجھے دو نثری تخلیقات ایسی عمدہ لگیں کہ جنھیں بار بار پڑھنے کو اور سراہنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک تو میرے دوست جبار مرزا کا وہ تفصیلی مضمون جو راولپنڈی کی ادبی روایت کے حوالے سے لکھا گیا ہے اور اتنے باکمال انداز میں تاریخی حوالوں کے ساتھ کہ جس کتاب کے دیباچے کے طور پر یہ مضمون لکھا گیا تھا سنا ہے اس کے مصنف نے یہ کہہ کر اسے کتاب میں شامل کرنے سے انکار کر دیا کہ پھر اس کا مضمون یا مقالہ کون پڑھے گا۔ جبار مرزا کی یادداشت کی داد دینی پڑتی ہے کہ خطہ پوٹھوہار کی تقریباً تمام اہم شخصیت اور مقامات کا ذکر کر

کے اس مضمون کو بھی ایک تحقیقی مقالہ بنا دیا ہے۔ اس کے بعد جو دوسرا مضمون قابلِ ذکر ہے وہ ہے ''ڈر تھا تیری جدائی کا۔۔۔ بشریٰ رحمن'' کے عنوان سے آپ کا مضمون جو ایک بیٹے نے اپنی مرحوم ماں پر اور ایک ادب نواز نے ایک بہت عظیم ادبی شخصیت پر لکھا ہے۔ اس میں ان کے بلند مقام کا اعتراف بھی ہے، آپ سے ان کی محبت اور ان سے آپ کی عقیدت کا بھی۔ ان مضامین کے علاوہ اس شمارے میں میں نے ڈاکٹر محمد رفیق خان کا پنجابی کا سفرنامہ بھی دلچسپی سے پڑھا اور بشریٰ رحمن مرحومہ کے سرائیکی کے ناول ''تاگھ'' کی قسط بھی۔ کہ پنجابی تو خیر میری مادری زبان ہے ہی مگر سرائیکی سے بھی اتنا پیار ہے کہ اسے سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور لکھی ہوئی سرائیکی تو جلدی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اسی شمارے میں آپ کی ارسال کردہ چھ کتابوں پر میرے تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں جن کا ذکر ادبی دوستوں اور محفلوں میں ہوتا رہتا ہے۔ اب تک کوئی 18 کتب پر میرے تبصرے تخلیق میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان شاء اللہ کچھ مزید شائع ہونے کے بعد ارادہ ہے کہ انہیں تخلیق کی نسبت سے ''تخلیقی تبصرے'' کا عنوان دے کر کتابی صورت میں شائع کروں۔ پچھلے شمارے پر میں نے ایک اخبار میں کالم لکھا تھا جسے آپ کو بھیجا تھا اور ساتھ ہی اس سے گذشتہ شمارے پر ایک تبصراتی خط بھی۔ مگر حیرت کہ تبصروں کے علاوہ میری غزل، کالم اور خط کچھ بھی شامل نہ ہو سکے۔ بہر حال آپ کے دفتر سے مدیحہ کا حکم ملا تھا سو ایک حمد اور کچھ رباعیات بھی ارسال کر رہا ہوں۔ اللہ آپ کو اور تخلیق کو سلامت رکھے۔

نسیم سحر (راولپنڈی)

---

(4) سخت گرمی اور حبس بھرے موسم میں "تخلیق" تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح وارد ہوا اور اپنی پرخلوص تخلیقات سے حدت کی شدت کے احساس میں کمی کا باعث بنا۔ آپ ایک کامیاب بزنس مین ہیں لیکن آپ نے جس خوبی اور شان محبوبی سے تخلیق کی ترتیب و تدوین کا فریضہ انجام دیا ہے وہ قابلِ تعریف ہی نہیں قابلِ قدر بھی ہے۔ آپ نے اداریے میں بالکل درست لکھا ہے کہ "ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا"۔ بلاشبہ آپ نے نہ صرف اس عہد کو نبھایا بلکہ اس عہد کو اپنی محنت سے عہد ساز بنا دیا۔ تخلیق کا ہر شمارہ متنوع ادبی ذائقوں سے مزین ہے۔ حمد و نعت کی برکتوں سے آغاز ہونے کے بعد اہم موضوعات پر فکر انگیز مضامین دلچسپی اور ذہنی کشادگی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کا مضمون "چوراسی سال کا تارڑ" اپنی مثال آپ ہے۔ منظومات میں طالب انصاری کی نظم "جب تم عشق نہیں کرتے"، ایوب خاور کی "اداس" اور ڈاکٹر فوزیہ مشتاق کی نظم "میں اور میری ماں" خیال انگیز تخلیقات ہیں۔ افسانوں اور غزلوں کے حصے نے بھی فکر و نظر کو وسعت آشنا کیا۔ سفرنامے، طنز و مزاح اور یادِ رفتگاں کے حصے بھی ادبی تسکین کا باعث بنے۔ کتب کے جائزے اور نسیم سحر کے تبصروں نے ادبی سمت نمائی کا فریضہ احسن طریقے سے انجام دیا۔ مختصر یہ کہ تخلیق کا یہ شمارہ اپنے صفحات پر مختلف رنگ کیفیات کو مجتمع کر کے منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اہل ذوق اپنے اندر ایک فکری بالیدگی محسوس کریں گے۔ جس کا تمام تر کریڈٹ آپ کی ذات کو جاتا ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور توفیقات مزید دے۔

ڈاکٹر بدر منیر (خوشاب)

---

(5) نہایت خوبصورت، دیدہ زیب اور شاندار تازہ تخلیق موصول ہوا۔ بے پناہ ممنون ہوں۔ پہلی بات پڑھتے ہوئے آپ سے درخواست ہے کہ خدا کیلئے تحریر کا فونٹ (Font) بڑا کریں۔ بمشکل پڑھا جا رہا ہے۔ اس بار (شاید اس بار) آپ نے پورا اداریہ سیاسی اور معاشرتی موضوع کو مرحمت فرمایا ہے۔ بہرحال جو کچھ تحریر کیا گیا اس سے اختلاف ممکن نہیں۔ اگرچہ کہ تخلیق خالص ادبی جریدہ ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ ادب اور ادیب ان اثرات سے بالاتر اور ماورا نہیں۔ سید ریاض حسین زیدی کی حمد روایتی اور اچھی ہے۔ اثر انگیزی کا فقدان ہے۔ تسنیم کوثر کی حمد بہتر ہے اور کچھ نیا رنگ لئے ہے لیکن آخری شعر کا پہلا مصرع بے وزن ہے۔ ظفر کرم لکھنا غلط ہے یہاں چشم کرم ہونا چاہیے۔ جناب مبارک علی کا مضمون قشیری گجر پسند آیا۔ اسے بہت اختصار کیا گیا ہے اسے مزید مفصل ہونا چاہیے۔ غازی علم دین کا مضمون "گھر کی مٹی آخر تنی" اپنی طرز کا ایک نیا اور دلچسپ مضمون ہے۔ یہ ان کا کمال ہے کہ انہوں نے اس ایک معمولی سے دو حرفی لفظ کو اس قدر عرق ریزی سے واضح کیا، اتنی توجہ اور ارتکاز کے ساتھ قارئین کیلئے قلمبند کیا جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ HEC کے منتخب رسائل اور مسائل پر سید نصرت بخاری کا مضمون اچھا لگا۔ اشفاق احمد ورک کا مضمون "چوراسی سال کا نائن" مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ ہے اور اختتام پر پنچ لائن بھی خوب ہے۔ میرے بہتر اور بڑے شعراء مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ آزاد نظم ایک ہی مصرع پر چل رہی ہوتی ہے اگر وہ ایک مصرع مسلسل نہ ہو اور راہ میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے تو اسے آزاد نظم نہیں کہیں گے۔ اسلم انصاری اور ایوب خاور دونوں کی نظمیں نظم کے تسلسل کا حق ادا نہیں کر رہیں جبکہ ظفر بخاری کی نظم مغربی بی کے سبب نظم ہے لیکن مجھے پڑھ کر لگا کہ محض فرمائشی یا آرائشی نظم ہے۔ توقیر مشتاق کی نظم "میں اور میری ماں" ایک طرح قائم کر رہی ہے۔

محترمہ عطاء الاصغر کا افسانہ "وہ جب یاد آئے" بے حد مختصر ہونے کے باوجود انتہائی اثر انگیز ہے۔ اعلیٰ افسانہ نگار کہانی بغیر بھی اپنے واقعہ یا اسلوب سے قاری کی جان نکال دیتا ہے۔ محترمہ فرح حسین پروین کا افسانہ "سلور بلی" بہت اچھا لگا۔ آغاز سے انجام تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے تاہم اس کے غیر ملکی کردار اسے ہماری سرزمین سے جوڑ نہیں رکھتے اور اس بنیاد پر ہم اسے پاکستانی روایت نہیں کہہ سکتے لیکن افسانہ بہر صورت قابل ستائش ہے۔ جناب شیخ محمد اقبال کا افسانہ "محبت" ایک معروضہ ہے اور شاندار تحریر ہے۔ حیرت ناک ہے کہ اس نوع کی منطقی کہانی کا تصور ان کے ذہن میں کس طرح آیا اور اسے قلمبند کرتے ہوئے اس خوبصورت انداز نگارش کو اختیار کیا۔ وہ وہ اداحمد صفی کی کہانی "خون آشام" تو آپ نے شاید تیسری مرتبہ شائع کی ہے۔ بلقیس ریاض کی کہانی "عشق کے رنگوں کی دھنک" تخلیق کی بجائے کسی ڈائجسٹ کیلئے لکھی گئی تحریر ہے۔ یہ جریدہ ایک ادبی رسالہ ہے۔ محمد اسلم کا "کسی پی خبر یا" ایک دلچسپ تحریر ہے۔ شائستہ مفتی کا افسانہ "ہیرا پھیرے" میں نہیں سمجھ سکا۔ وسیم جبران کی کہانی "راز" عجیب و غریب اور حیرت ناک کہانی ہے۔ نئے افسانہ نگار نے عجیب انداز میں سوچا اور عجب تیز صورت سے تحریر کیا ہے۔ وہ لائق تحسین ہے۔ ثناء یاسمین خان کے افسانے "وبا" کو ایک دلچسپ افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ناصر بخاری کا مختصر افسانہ "ہمارے لئے" ایک غیر فطری تحریر ہے۔ تمام غزلیات کو پڑھ کر اس بار مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تازہ تخلیق میں آپ نے 90 فیصد غزلیں محض شعراء سے ذاتی تعلق یا محبت میں شائع کی ہیں جس میں شامل میں بھی ہوں۔ بدر منیر صاحب کے قطعات پسند آئے۔ مزاح کو عموماً لطیفوں کے اشعار بنا دیتے ہیں۔ بدر منیر نے اس سے کچھ احتراز کیا ہے جو قابل تعریف ہے۔

سلمان اظہر کا مضمون "ارتقا تری حیاتی کا۔ بشریٰ رحمن" مجھے لگتا ہے کہ پہلے بھی پڑھا ہے۔ مریم عباس خاور کا شہزاد نیئر کی غزل کا تجزیاتی مطالعہ پسند آیا۔ کسی کی بھی تخلیق پر تجزیاتی مطالعہ پیش کرنا از خود ایک کٹھن کام ہے۔ بہر کیف یہ غزل عمدہ ہے اور شاید میں اس سے پہلے

کسی جگہ تعریف کر چکا ہوں۔ میں جناب رؤف یاسر اپنی نوشتہ غیر وجہ سے بالکل قاصر ہوں۔ بے حد معافی چاہتا ہوں۔ مکتوب کے آخر میں جناب شاہین عباس کا ایک شعر قارئین کی نذر:

بعض غالب سے ہم آپ ہی اٹھ جاتے ہیں — خود اٹھانے نہ کہیں صاحب بستر آ کر

صفدر صدیق رضی (کراچی)

«6» "تخلیق" بابت ماہ جون 2023ء کی "پہلی بات" محض ایک بات نہیں، پوری داستان ہے۔ محسوسات کی دنیا میں اگر خلل واقع ہو جائے تو انسانی ہستی ڈگمگانے لگتی ہے۔ جبر اور استحصال کے معاشرہ میں رہنے والے دھیرے دھیرے بے حس ہوتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر پورے کا پورا معاشرہ صحت مند رویوں سے عاری ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ ہم پر بھی بیت رہی ہے۔ کھوکھلے وعدوں کی بھرمار نے ہماری آنکھوں سے بصارت اور ذہن سے بصیرت کے عناصر کو تقریباً مفلوج کر دیا ہے۔ مذکورہ اداریہ زندگی کے ہر شعبہ میں مثبت عملی اقدامات کی ضرورت کو بطریق احسن اجاگر کرتا ہے۔ خدا کرے کہ کم سے کم ادب و ثقافت سے متعلق طبقے کے دل میں ہی یہ بات گھر کر جائے۔ پرچے کے دیگر مندرجات میں حمد و نعت کا گوشہ نہایت مختصر ہے۔ مضامین کے حصے میں ڈاکٹر مبارک علی نے "فقیری کلچر" کا بھرپور جائزہ لیا ہے تاہم ان کی نگاہ "فقر" سے متعلق طبقے کی بجائے "گداگری" سے نسبت رکھنے والوں پر زیادہ رہی ہے۔ پروفیسر غازی علم الدین نے حسب سابق اپنے عالمانہ معیار کو قائم رکھا ہے اور "کھر" کے معانی کو الٹ پلٹ کر دکھانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اس مضمون میں شامل اشعار کے ضمن میں بیشتر نام تو جانے پہچانے ہیں لیکن انجم، سحر، جیم اور قدر کی وضاحت ہو جاتی تو بہتر ہوتا۔ ڈاکٹر جواز جعفری کا مقالہ نہایت پُر مغز ہے اور بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھا گیا ہے۔ یہ محض "عمارت کی سرگزشت" نہیں بلکہ فن تعمیر کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ سید نصرت بخاری اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے بھی اپنے اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ منظومات میں اسلم انصاری کی نظم کا ایک مصرع "عشق پہ معمورۂ ہستی اک ویران خرابہ" اپنی جگہ ایک مکمل نظم ہے۔ مرزا اصغر صاحب کا دم غنیمت ہے۔ وہ ایک معروف افسانہ نگار ہیں لیکن شعر و ادب کی دیگر اصناف میں بھی خاصی درک رکھتے ہیں۔ ان کا تازہ افسانہ "وہ جب یاد آئے" دیر تک یاد رہے گا۔ دیگر افسانے بھی قابل ستائش ہیں۔ غزلیں عمدہ ہیں۔ پسندیدہ اشعار نقل کر کے کسی کی حق تلفی نہیں کروں گا۔ انشائیہ اردو ادب سے مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں ممتاز راشد لاہوری کی کوشش سراہے جانے کے لائق ہے۔ نسیم سحر کے تبصرے اچھے لگے۔ "یادِ رفتگاں" کے مطالعے سے یوں لگا جیسے یہ لوگ ابھی بھی ہمارے درمیان موجود ہیں بالخصوص بشریٰ رحمان کے بارے میں مندرجات کو سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر اراکین مع الخیر ہوں گے۔ سلامت رہیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے۔

خاور اعجاز (اسلام آباد)

«7» "تخلیق" ماہ جون 2023ء کا شمارہ خوب صورت سرورق کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ زیر نظر شمارہ بھی حسب روایت اپنے اندر بہت سا دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ سب سے "پہلی بات" میں بجا طور پر ہمارے اہل سیاست و اقتدار کے مکروہ کردار، بے عملی اور مفاد پرستی

کے ساتھ مجموعی بے حسی کے رویے کو بے نقاب کرتے ہوئے مثبت تبدیلی کے لیے عملی جدوجہد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جو وقت کی اہم ضرورت اور حالات کا ناگزیر تقاضا بھی ہے۔ اس کے بغیر محض دعاؤں سے نہ تو پہلے کبھی مسئلے حل ہوئے ہیں اور نہ ہی آج ہو سکتے ہیں۔ محنت اور جدوجہد ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ دیگر مندرجات پر نظر ڈالیں تو محترمہ تسنیم کوثر اور سید ریاض حسین زیدی کا حمدیہ کلام اور صفدر صدیق رضی کی نعت کا یہ شعر

میں تو کرتا ہوں فقط سیرت سرکار ﷺ کا ذکر اور الفاظ بھی لکھتے ہیں خود جملۂ نعت

پر تاثیر ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون "فقیری کلچر"، جواد جعفری کی "قرارت کی سرگزشت"، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کا "پورا اسی سال کا تارا"، اور آصف ثاقب کا "منفرد اسلوب کے شاعر نسیم عباسی کے حوالے سے" ہزارہ میں جدت آہنگ ہزارہ رنگ" کے زیر عنوان مضمون ایک پیچھے ہیرے کو نمایاں کرنے کی قابل قدر کاوش ہے۔ اسی طرح "کلر" کی معنی آفرینی" کے عنوان سے پروفیسر غازی علم الدین کا مضمون بھی خاصے کی چیز ہے۔ افسانوں میں محترمہ عذرا اصغر، بلقیس ریاض، محمد اسلم، شائستہ مفتی، انعام یاسمین خان اور پروفیسر عاصم بخاری کے افسانے اپنی اثر آفرینی اور اختصار کی بنا پر پسند آئے۔ یادِ رفتگاں میں "ارتقا تیری جدائی کا۔۔۔۔۔ بشریٰ رحمٰن" کے زیر عنوان سونان اظہر جاوید نے مرحومہ بشریٰ رحمٰن کی یادوں کو تازہ کیا اور ان کے ساتھ ہونے والی بہت سی نشستیں ذہن کے پردے پر ظاہر ہو گئیں۔ پروفیسر قیصر نجفی کی "چند یادیں، چند باتیں" بھی اچھی ہیں۔ جمیل احمد عدیل نے اکرم کنجاہی کی کتاب "دبستان قلم کے نعت نگار" اور پروفیسر ہارون الرشید تبسم نے ڈاکٹر ارم الطاف کے شعری مجموعے "جانِ شوریدہ" پر خوب نقد و نظر کی ہے۔ اسی طرح مرید عباس خاور نے شہزاد نیر کی تازہ غزل کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ گلزار بخاری، مسلم شمیم، صفدر صدیق رضی، قمر رضا شہزاد، حسن عباسی اور ڈاکٹر شیخ اقبال کی غزلیں پسند آئیں۔

شہباز انور خان (لاہور)

---

(8) ایک عجیب اندھے سفر میں رہا۔ سو فرصت کا ملال رہا۔ اس دوران بھی تخلیق ملتا رہا۔ یہ سب بھی ڈیڑھ ماہ پہلے لکھا اور پھر سفر درپیش۔ تازہ شمارہ موصول ہوا ہے۔ ٹائٹل سے آخری صفحہ تک اطمینان بخش۔ یہ کام آسان تھوڑی ہے۔ محترمہ عذرا اصغر کی اور آپ کی یادیں الگ الگ موضوع مگر انصاف کے دور میں اپنے اپنے موضوع سے انصاف کرتی ہوئیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اب درباری کلچر کی طرح فقیری کلچر کی یاد تازہ کی ہے اور آج کا کلچر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا ہے۔ غزلیں، نظمیں سب کے نقطے روشن۔ ایک گوشہ یہ بھی سامنے ہے جس میں حنیف باوا نے بھی اظہر جاوید کی پنجابی میں لکھی کہانیوں کو بہت احسن انداز میں اردو میں ڈھالا ہے اور مبصرین نے بھی انصاف کیا ہے اس طرح اس تخلیقی سرمائے کو بہت سے نئے قاری مل گئے ہیں۔ تمام تنقیدی اور تحقیقی مضامین فکر انگیز ہیں۔ بچوں سمیت سلامت رہیں۔ بچی کی رخصتی خوشبو دار خبر تھی۔ اللہ تعالیٰ آباد و شاد رکھے۔ تخلیق کے دفتر جلد حاضری دوں گا۔ ایک شمارے میں پڑھا کہ کشور ناہید صاحبہ نے 2000 بھیجے۔ قابل قدر جذبہ ہے۔ تخلیق کے ایڈیٹر بیٹا کا ذاتی فنڈ میں 2500 بھیج رہا ہوں۔ محبت کے ٹوکن کے طور پر۔

بیدار سرمدی (لاہور)

﴿9﴾ شکر گزار ہوں کہ آپ ماہنامہ "تخلیق" خاکسار کو باقاعدگی سے ارسال کرتے ہیں۔ "تخلیق" سے میری قلبی وابستگی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میری پہلی غزل جو کسی ادبی رسالے میں شائع ہوئی وہ تخلیق تھا۔ اس غزل کو میرے بہت مہربان دوست سلیم شہزاد نے بھجوایا تھا۔ پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے آپ کی فرمائش پر وہ غزل آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ یوں "تخلیق" میں میری تخلیق کا دوسرا جنم ہو گا۔ "تخلیق" کو مرحوم اظہر جاوید کی وفات کے بعد آپ نے جس طرح سنوارا اور سجایا ہے اور دنیا بھر میں جس طرح اس کی پذیرائی ہوئی ہے اس کو دیکھ کے میں صرف اتنا کہوں گا "کوڑے پہ کوڑا ایجا باپ سے بھی گورا" "تخلیق" کے تمام سلسلے بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ میری دعا ہے کہ یہ ہمیشہ اسی خوب صورتی کے ساتھ جلوہ نما رہے۔ آپ جیسا لائق اور فرمانبردار بیٹا اللہ تعالیٰ ہر ادیب، شاعر اور رسالے کے مدیر کو عنایت کرے۔ آپ سے مل کر لگتا ہے جیسے اپنے چھوٹے بھائی سے ملاقات ہوتی ہے۔

حسن عباسی (لاہور)

﴿10﴾ عمدہ تخلیقات سے آراستہ "تخلیق" 2023ء جون موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح گراں قدر مضامین ہیں، عمدہ غزلیں ہیں، نظمیں ہیں، تبسم سحر کے جاندار تبصرے ہیں اور قابل قدر ہستیوں کے بھرپور جائزے ہیں۔ پنجاب رنگ میں محترم عباس مرزا خوب رنگ جمائے ہوئے ہیں جبکہ ڈاکٹر محسن مگھیانہ اور ڈاکٹر بدر منیر طنز و مزاح کے پھول کھلائے ہوئے ہیں۔ "تخلیق" کے توسط سے بھی ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی شکر گزار ہوں کہ انہیں اپنی کتب سے نوازا۔ یادِ رفتگاں نے دل درد سے بھر دیا، کیسے کیسے لوگ زمین کا رزق ہوئے۔ "ارشاد تیری جدائی کا" درد میں ڈوبی یہ تحریر آبدیدہ کر گئی۔ میرا تکیہ توشے میں اجمل پاکستان (مرحوم) ہمارے درمیان موجود ہیں۔ بہت پیاری ہستی تھیں جنرل رحمٰن، رب کریم ان کی مغفرت کرے اور درجات بلند کرے۔ تین افسانے پڑھ چکے ہیں جن میں عذرا اصغر، فرحت پروین، بلقیس ریاض اور وسیم جبران کے افسانے پسند آئے۔ دیگر افسانے زیر مطالعہ ہیں۔ محمد اسلم کا افسانہ "کھسی پٹی تحریریں" بھی خوب ہے۔ اس کے بارے میں یہی کہوں گی: "گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے"۔ اپنی پیاری عذرا اصغر سے محبت بھرا گلہ ہے کہ پنجابی میں لکھے کے باوجود وہ میرے افسانے کا مطالعہ نہیں کر پائیں کہ انہیں پنجابی پڑھنے میں روانی نہیں۔ ان سے میرا پیار بھرا تقاضا ہے کہ وہ میرا پنجابی افسانہ پڑھیں ضرور اور رائے بھی دیں۔ اسی شمارے میں غازی علم الدین نے اپنے مضمون "گھری مٹی آفریقی" کے آغاز میں اپنی علالت کا ذکر کیا ہے۔ ان کی صحت کے معاملات کے بارے میں پڑھ کر پریشانی ہوئی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں "تخلیق" جون 2023ء میں شامل غزلوں میں سے کچھ چیدہ اشعار جو دل کو بہت بھائے درج ذیل ہیں:

پل بھر کا وہ اک خواب سا تھا اور کسی نے — یہ خواب نہ پھر دیدۂ حیراں سے نکالا (اسلم انصاری)
بڑے کٹھن بڑے دشوار راستے تھے مگر — خدا کے فضل سے طے ہو گئے مراحلِ غم (سلیم کوثر)
فرق پڑتا ہے تو اس بات سے پڑتا ہے سحر — کس نے چاہا ہے تمہیں کس نے فراموش کیا (سحر انصاری)
ہوا ہے مہرباں کیسے کہ اس کو — بجھانا پیشہ زمانہ جانتا ہے (آصف ثاقب)
ہزار سمجھوتے کرنے پہ بھی — ہاری نہیں قدر خار و خس کی (خالد اقبال یاسر)

گلزار نے ضمیر کا سودا نہیں کیا	دیوانگی میں بھی اسے اتنا تو ہوش ہے	(گلزار بخاری)
اک غلغلہ ہاؤ طوفاں اور کنارہ دور بہت	کتنے ہیں اندیشے دل میں خوف نہ جانے کتنے ہیں	(ڈاکٹر ایوب ندیم)
کیسی شہرت سے ملی تو ہو شہرت کوئی	کیوں کہ ہاں! کوئی تم سا دکھائی دے ہے	(محمد سلیم ساگر)
جابجا بانٹتے پھرتے ہیں محبت اپنی	جب کہ لوگ ہمیں ہر گام دغا دیتے ہیں	(محمد رفیق خان)
جس کو خون دے کر ابھارا تھا کبھی	آج وہ دیوار ڈھائی جا چکی	(شہباز انور خان)
ہر اک در پہ کھڑا تھا کوئی ویران دل دھڑکتا تھا	میں ڈر کر اپنے گھر ہی لوٹ آیا اور کیا کرتا	(ڈاکٹر شیخ اقبال)

خط کے آخر میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ میرے اسلام آباد جانے کی خبر ہوتے ہی تم نے بزم دوستان تخلیق کا اہتمام کروا دیا۔ ایم۔ زیڈ ملک صاحب کا بھی شکریہ کہ مدیر تخلیق کی آواز پر لبیک کہا اور دوستان لاہور میں شعر و ادب کی محفل سجا ڈالی۔ نامور شاعر، ادیب مدعو کئے۔ میری ایم۔ فل کلاس فیلوز (جو ملاقات کی خواہاں تھیں مگر وقت کی کمی کے باعث فرداً فرداً ملنا ممکن نہ تھا) وہ بھی اس بزم کا حصہ بن گئیں اور یہ محفل بہت یادگار ٹھہری۔ 2016ء سے 2021ء تک میرا ایم۔ فل کلاسز کے سلسلے میں اوپن یونیورسٹی اسلام آباد آنا جانا لگا رہا مگر ملاقاتیں نہ ہو سکیں۔ جب یہ کچھ سہیلیوں کو خبر ہوئی تو انہیں ہاسٹل سے نکال لیا گیا۔ شیخ خالد (مرحوم) نے اپنی بیٹی عنبرین کو بھیج کر ہمیں بلوا لیا۔ ہماری ادب دوست سہیلی شمیم ناسازیٔ طبع کے باوجود ادبر کروا کے ملنے آتی رہیں۔ ہمیں اپنے ساتھ لے جاتیں اور پھر واپس ہاسٹل چھوڑنے آتیں۔ شیخ صبح اپنے ہاتھ کے پراٹھے، قیمہ اور آم کی چٹنی لے کے پہنچ جاتیں۔ میرا و شمیم نے تو بی بی گالا کی سیر بھی کروائی تھی اور مقصودہ حسین میری کلاس ختم ہونے کا انتظار کرتیں اور پھر ای۔ الیون۔ ایٹ۔ اپنے گھر لے جاتیں جہاں قریبی ریسٹورنٹ جنگل میں ہمارے قہقہے جنگل کا سماں باندھ دیتے تھے۔ یہ محبتیں یہ دوستیاں ہمارا اثاثہ ہیں۔ سو ان محبتوں کو تم نے کمال محبت سے بڑھا دیا اور میرے اسلام آباد وقت کو شاندار بنا دیا۔ جیو خوشیوں کے رنگ۔

تسنیم کوثر (لاہور)

﴿11﴾ محترم سلطان ناصر یہ و دیا وراں کی پوری معاون جماعت کو مبارک باد کہ مسلسل ادب پروری، ادب نوازی و ادیب نوازی میں ہمہ دم مصروف خدمت ہیں۔ جون 2023ء میں "پہلی بات" نے ہمیں آئینہ دکھایا ہے، اعتراف حقیقت، احساس و محنت کے بغیر ہم ترقی کیسے کر سکتے ہیں! سچے دل کی سچی پکار میں ہم آواز و ہم قدم ہو جائیں تو ؏ "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!" والی بات ہے۔ حمد و نعت بہت خوب ہے۔ نقشری گجری کی تحقیقی معلوماتی تجزیہ ہے۔ محترم آصف ثاقب کا مختصر مضمون قابل ستائش و مفید معلومات کا مرقع ہے۔ تحقیقی مضمون "گجری کی معنی آفرینی" بہت ہی محنت و عرق ریزی کا عکاس ہے بہت خوب، ماشاء اللہ۔ پروفیسر غازی علم الدین صاحب شاد و آباد رہیں۔ ڈاکٹر جواد جعفری صاحب اور سید نصرت بخاری کے تحقیقی مضامین نے حقیقت و صداقت پہ مبنی معلومات فراہم کیں اور محجوب گوشوں کی نقاب کشائی فرمائی۔ مختصر افسانہ (تماشا بے کنار) نے معاشرتی ناسور کو بے نقاب کیا۔ نشے کی لعنت کے تحت بے رحم اثرات کی جھلک دکھا کر اپنے فن کی مہارت خوب دکھائی ہے کہانی سے مواد قابل داد ہے۔ "ذرا تھا تیری جدائی کا" نے رلا دیا۔ بشریٰ رحمٰن صاحبہ ہمارا ادبی

اعلیٰ علمی سرمایہ تھیں جنہوں نے ادبی خادمہ کا فرض اخلاص قلب سے ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ تخلیق اور اس سے وابستہ ہر فرد و ادیب کو خوش سلامت رکھے۔ آمین!

مراد خان (ہری پور)

﴿12﴾ اردو میں ادبی رسائل و جرائد کی ہمیشہ سے بڑی اہمیت رہی ہے۔ ان میں سے بعض رسائل تشہیر سے زیادہ تخلیق کاری کی تربیت کے عمل میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اداریوں کی بنیاد بننے والے فکر انگیز اور خیال افروز سلسلہ وار مباحث ہوں یا اشاعت کے لیے منتخب تخلیقات کا معیار، ماضی قریب میں یہ رسائل ہی ان متون تک رسائی کا وسیلہ بنتے رہے ہیں۔ اس دم توڑتی ہوئی روایت کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ اسے ٹیکنالوجی کے اس دور میں نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ضرورت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ ادبی جریدہ ماہنامہ 'تخلیق' کے مدیر سونان اظہر جاوید نے بجا طور پر اس ضرورت کو محسوس کیا اور کم و بیش نصف صدی قبل اپنے والد اظہر جاوید مرحوم کے جاری کیے ہوئے اس موقر جریدے کی باقاعدہ اشاعت، عمومی مزاج اور مجموعی تشخص کو یقینی بنائے رکھا۔ مدیر 'تخلیق' جس طرح اس پرچے کو معاصر ادبیات کا نمائندہ بنانے کے لیے کوشاں رہے ہیں، اس کے ثبوت کے طور پر 'تخلیق' کا کوئی سا شمارہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جون 2023ء کا شمارہ بھی اپنی روایت، امتیازات اور انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس شمارے میں نظم و نثر کی نمائندہ آوازوں کی موجودگی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ 'تخلیق' میں بغرض اشاعت بار پانے کے لیے مدیر کے پیش نظر کوئی مخصوص یا محدود گروہ نہیں، بلکہ اردو زبان و ادب کے لیے کام کرنے والا ہر قابل ذکر نام ان کے حلقے میں شامل ہے اور 'تخلیق' کا ناگزیر حصہ ہے۔

شاہین عباس (شیخوپورہ)

﴿13﴾ ''تخلیق'' جون 2023ء ہمدست و نظر نواز ہوا۔ اداریے میں آپ نے ادب کے ساتھ سیاسی و معاشی امور پر بھی گفتگو کی ہے۔ 9 مئی 2023ء کو فوجی تنصیبات پر بعض عناصر کے حملے کے بعد سے سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کی رفتار کی تیزی حیران کن ہے۔ امید ہے کہ نومبر 2023ء کے عام انتخابات میں حالات ٹھہراؤ کی طرف جائیں گے۔ ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون ''اظہر کی مجھ'' چشم کشا رہا۔ آصف ثاقب نے ''ہزارہ'' کے ادب کا عمدہ جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر جواز جعفری کے مضمون میں عبارات کے قدیم و جدید انداز کا تقابل لاجواب رہا۔ نصرت بخاری نے ادبی رسائل کا اچھا تعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے چوراسی سالہ اول نگار دار کا خاکہ اپنے مخصوص شگفتہ رنگ میں پیش کیا۔ زبردست! عذرا اصغر کا افسانہ ''وہ جب یاد آئے'' خوبصورت پھولوں کلیوں کی روداد جیسا تھا۔ فرحت پروین کا افسانہ ''سلور جبلی'' خوبصورت احساسات کا نمائندہ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (دیباچہ)، احمد صفی، نفیس ریاض، محمد اسلم اور شائستہ مفتی کے افسانے بھی اچھے لگے۔ بشریٰ رحمن مرحومہ کا سراجیکی ناول ''ناگ'' اچھا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے سراجیکی ادب و تہذیب کی مہکار مشام جاں کو خوب معطر کر رہی ہے۔ آپ نے میر انشائیہ ''غلطیاں'' اور میرے ''کچھ قرب یات'' شامل اشاعت کیے ہیں۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ علی رضا خان نے گلوکار شوکت علی کی یادیں بیان کر کے ہماری کئی یادیں بھی مہکا دی ہیں۔ یہی عالم آپ کی بشریٰ رحمن مرحومہ کی یادنگاری کے عمل کے سبب

سے ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے ''تخلیق'' کے شمارہ مارچ کا کیا مفصل تجزیہ کیا ہے۔ جبار مرزا نے راولپنڈی کے ادبی ماحول کی زبردست عکاسی کی ہے۔ رپورتاژ نگاری کے گرو پروفیسر محمد عباس مرزا نے اس پنجابی صنف سخن کے تعارف کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ ساڑھے پانچ فعلن کی بحر میں اکیس ہزار بیت کہہ چکے ہیں اور یوں ہی بحر اب ''بیتوں'' کے لیے ضروری ہو چکی ہے۔ تبصرۂ کتب اور ''انجمن خیال'' کے صفحات بھی لطف دے گئے۔ شاعری پر تبصرہ رہ ہی گیا۔ ہائے!

ممتاز راشد لاہوری (لاہور)

﴿14﴾ جون کا ''تخلیق'' قدرے تاخیر سے ملا۔ بارے مل گیا۔ شکریہ! اس شمارہ میں اپنے آپ کو ساحل اقبال پر پا کر اچھا لگا۔ شکریہ! ''تخلیق'' ماشاءاللہ اپنے عالمی تخلیق کاروں کی تحریروں سے جگمگا رہا ہے۔ دل موہ لینے والے افسانے، علم و ادب و معلومات میں اضافہ کرنے والے مضامین، شعر و شاعری کی داد داد، اسلم انصاری کی غزل خاص طور پر بہت پسند آئی۔

تصویر کو خوابوں کے شبستاں سے نکالا　　ایک یوسف گم گشتہ کو زنداں سے نکالا

میں نے اپنے یار دیرینہ کو بھول بھلیوں سے نکالا۔ اسلم انصاری اور میں نے ایک ساتھ 1953ء میں ایمرسن کالج ملتان میں داخلہ لیا تھا۔ ہم دونوں مضمون کے حوالے سے فلسفی تھے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری اپنے علم و تعلیم اور شعر و ادب میں ڈاکٹریٹ ہوئے اور میں نے اپنی زندگی کی راہیں گزاریں۔ کالج میں ڈرامہ، پھر افسانے، ڈرامے اور ناول میں، پھر ریڈیو میں براڈکاسٹر اور اسٹیج تھیٹر میں ایکٹر، دنیا کی سیر بطور وزیر، بہر حال حسن آ میں کہ حسن دائم۔ برادرم سونان ماشاءاللہ آپ کے والد گرامی کے ''تخلیق'' کو آپ نے اپنی تخلیقی سوچ سے دوام بخشا ہوا ہے۔ انشاءاللہ ''تخلیق'' کا یہ سلسلہ اپنے بانی کے نام کی برکت سے جاودانی پائے گا۔ آپ کی خوشی اور سلامتی کی دعا کے ساتھ۔

ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی (کراچی)

﴿15﴾ ''تخلیق'' کا شمارہ 2023ء ملا۔ انجمن خیال میں میرا خط چھپا۔ میں نے بے خیالی میں یہ خط تاخیر سے بھیجا تھا۔ آپ کی عظمت ہے کہ آپ نے پھر بھی اسے چھاپ دیا۔ اپنی اس کوتاہی پر معذرت خواہ ہوں۔ خط شائع کرنے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ ''اپنی بات'' میں آپ ایک ایسی سچی، ٹھوس اور قابل یقین بات کہہ جاتے ہیں جو مجھے اپنے دل کی بات ہی معلوم ہوتی ہے۔ میں اس حقیقت میں ایسا کھو جاتا ہوں کہ اس کے حصار سے نہیں نکل سکتا۔ ضرب المثل ہے کہ ''اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی''۔ میرے جنت نظیر وطن میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ جب کسی ملک کی شامت آتی ہے اور اس کے برے دن آتے ہیں تو گلشن وطن کی ہر شاخ پر الو بیٹھ جاتا ہے جس کی نحوست عوام کو لے ڈوبتی ہے۔ اللہ کی رحمتیں روٹھ جاتی ہیں۔ ملک کی کشتی ناانصافی، جھوٹ، منافقت، بدتمیزی اور ناعاقبت اندیشی کے سمندر میں ہچکولے کھانے لگتی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اخلاقی قدریں سسک سسک کر مرنے لگتی ہیں۔ کسی کو یہ احساس تک نہیں رہتا کہ معاشرے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ہر طرف شرافت، نجابت اور انسانیت تنگ دامنوں کی بھیک مانگتی نظر آتی ہے۔

سونان صاحب! احساس مر جائے تو انسان کی کل قوتیں شل ہو جاتی ہیں اور وہ بے عمل ہو جاتا ہے۔ اسی بے حسی اور بے عملی کے

باعث خود غرض سیاسی گدھ بے عمل انسانوں کی لاشیں نوچ نوچ کر کھاتے ہیں اور دن بدن موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ آپ نے سچ کہا ہے کہ بے احساسی کی موت نہیں، انسانیت کی موت ہے۔ ہم سولی سولی اور کھلی آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے ہیں کہ ہمارا دل اندھا ہے۔ ہم بے ضمیر ہیں۔ بے توقیر ہیں۔ جھوٹ بولنا ہماری زندگی کا منشور ہے۔ دوسروں کی تضحیک کرنا ہمارے بگڑے ہوئے اور روبہ تنزل معاشرے کا دستور ہے۔ ہمارے ملک کا ہر بگڑا ہوا بندہ پھنے خان بن کر کوڑے سے کہتا ہے کہ تجھ میں تو دو دو داغ ہیں۔ یہ بے شرمی کی انتہا ہے۔ ہم سچ کہنے سے بھی کتراتے ہیں، گھبراتے ہیں۔ حق بات کہنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے۔ ہماری زبانوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہونٹ سلے ہوئے ہیں، ہمیں چپ سی لگ گئی ہے۔ اگلی نسلوں پر سرعام کوڑے پڑ رہے ہیں، ہم خاموش ہیں۔ ہر سو سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اس دور کا محمد بن قاسم کب بولے گا؟ سوہان صاحب! آپ کو خدشہ ہے کہ اپنی بے عملی کے باعث ہم کہیں تماشا نہ بن جائیں اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ کیا آپ کو اب بھی کچھ شک ہے۔ اپنے اعمال بد کے باعث تو ہمارے سر کافروں کے سامنے بھی جھکے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال کیا خوب بات کہہ گئے ہیں:

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود / ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود / یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو / تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

محمد اقبال صمصام (مردان)

﴿16﴾ جون 2023ء کے شمارے کا اداریہ بہت "تیز" اور "کڑک" ہے۔ ادیب کڑک لفظوں کا استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے تو ہدف کے کرائے کا نال دیتا ہے مگر افسوس کہ بے حسی اس قدر ارزاں ہے کہ کوئی تنبیہ ہدایات کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ ہمارا سماج جو بے موت شاید ایسا ہی رہنا اسے خوش آ گیا ہے۔ بیشتر اہل قلم نے بھی یہی لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ آپ نے اداریے کی ابتدا میں احساس کی بات کی اور اسے زندگی کی روح قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انفرادی و اجتماعی طور پر جذبہ احساس ہماری شناخت ہے۔ احساس کی موت، انسانیت کا خاتمہ ہے۔ احساس مر جائے تو معاشرہ بن جاتا ہے۔" آپ نے ذاتی مشاہدے اور عملی تجربے کی روشنی میں یہ بھی لکھا ہے کہ 90 فیصد لوگوں کے اندر احساس کا جذبہ مر چکا ہے۔" مدیر محترم! اہل قلم جن میں رسائل و جرائد کے مدیران گرامی قدر بھی شامل ہیں، ان کا یہ فرض بنتا ہے کہ دروازہ کھلے نہ کھلے، دستک دیتے رہیں جیسے مؤذن اذان لازمی دیتا ہے مقتدی چاہے ایک نہ ہو۔ آپ نے اپنی اس دستک کو 'احساس' کا نام دیا ہے، وقفے وقفے (کیونکہ وقفہ بہت ضروری ہے) سے بند دروازوں پر احساس کی دستک دیتے رہیں۔ یہ عمل مسلسل ہے۔ یاد رہے حرف مطبوعہ کا اثر بڑا ناقابل تغیر ہے کبھی اس کا مثبت نتیجہ ضرور سامنے آتا ہے۔

غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

شبیر احمد قادری (فیصل آباد)

﴿17﴾ ہمارے جسم کا حسن وقت کے ساتھ ساتھ زوال پذیر رہتا ہے اور ایک دن یہ جسد خاکی خاک کا پیوند ہو جاتا ہے۔ حسن اخلاق اور حسن تخلیق ایسی صفات اور صلاحیتیں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ ہوا کے دوش پر چہار سو پھیلتی رہتی ہیں۔ ماہنامہ "تخلیق" کی ذہانت بتائی گئی یہ سطریں دراصل حقیقت پر روشنی ڈالتی ہوئیں اور ادراک و آگہی کے کئی در وا کرنے کو کافی ہیں۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان فانی ہے لیکن اس کا کیا اور کیا ہوا ہمیشہ رہ جاتا ہے اور اس کی گونج کئی نسلوں تک ہوتی ہے۔ خاص طور پر انسان کی تخلیق چاہے وہ شاعری کی صورت میں ہو نثر یا آرٹ کی کسی بھی شکل میں، وہ برسوں یاد رہتی ہے اور تخلیق کار کا نام صدیوں کا سفر کرتا ہوا ساعتوں میں گونجتا رہتا ہے۔ دنیائے ادب میں بہت سی ایسی کاوشیں نظر آتی ہیں جو اپنے بانی کے دورِ حیات میں تو زندہ رہیں لیکن جیسے ہی اس نے آنکھیں موندیں ان کاوشوں نے بھی دم توڑ دیا۔ پاکستان میں ادب کے حوالے سے افکار، عصر، طلوع افکار اور تقاضے جیسے بہت سے رسائل وجرائد وجود میں آئے لیکن وہ بانی کے رخصت ہوتے ہی اپنا وجود کھو بیٹھے اور اب بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جنہیں ان کے حوالے سے کوئی خاص بات یاد ہوگی لیکن اس کے برعکس 1969ء میں جاری ہونے والے "تخلیق" نے اپنے 54 سال کامیابی کے ساتھ مکمل کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس رسالے کو ایک مخلص اور محنتی بیٹے نے اپنی اصل وراثت کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے اس پر شبانہ روز محنت کی۔ ماہنامہ "تخلیق" کے بانی معروف شاعر، صحافی، ادیب، مدیر، کالم نگار اور محقق جناب اظہر جاوید صاحب نے خود سے کیا ہوا وعدہ کہ وہ اس رسالے کو تاحیات جاری رکھیں گے 14 فروری 2012 تک نبھایا اور قارئین کو تخلیق کی صورت میں ایک معیاری ادبی رسالہ مہیا کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد رسالے کی طباعت واشاعت کی ذمہ داری سونان اظہر جاوید نے سنبھالی اور اپنے والد کی وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سونان اظہر نے نہ صرف اس رسالے کو جاری رکھا بلکہ اس کے معیار کو بہتر بنانے اور اسے ایک منفرد رنگ عطا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

سونان اظہر کی انتظامی مہارت، خوبصورت لب ولہجے اور اخلاص نے نہ صرف اظہر جاوید کے دوستوں کو جوڑے رکھا بلکہ اس ہمسفری کے پیچھے بہت سے نئے ناموں اور خوبصورت چہروں کا اضافہ بھی کیا۔ انہوں نے اپنے والد کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کے لئے تخلیق سالانہ ایوارڈ کی بنیاد رکھ کر ادب سے اپنے تعلق کو مزید مضبوط بنا لیا۔ اس کے علاوہ ادب دوست، کمال فن ایوارڈ اور خیر تخلیق ایوارڈ متعارف کروا کے یہ بھی باور کروا دیا کہ "تخلیق" صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ مکمل تنظیم ہے جو ادب نواز اور ادب پسند لوگوں کو وسعت رکھتی ہے اور تخلیق کاروں کی شاہکار تخلیقات کو ایک بہترین فارم بھی مہیا کرتی ہے۔ جون کا شمارہ ہاتھ آیا تو 11 مارچ 2023ء کو منعقد ہونے والی گیارہویں تخلیق ایوارڈ کی تقریب کا احوال پڑھ کر تمام مناظر آنکھوں میں گھوم گئے۔ آفیسرز کلب لاہور میں منعقد ہونے والی اس تقریب میں ملک کے کونے کونے سے ادب اور فنون لطیفہ کی مختلف جہتوں سے تعلق رکھنے والے دوست احباب ایک خاندان کی صورت اکٹھے ہوئے۔ سونان اظہر ایک سلیقہ شعار اور مہمان نواز میزبان کی صورت خوبصورت لفظوں کا گلدستہ سجائے ہر آنے والے کا گرم جوشی سے استقبال کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ استقبالیہ ٹیم میں شامل سبھی دوست چہروں پر مسکراہٹ سجائے اور آنکھیں فرش راہ کیے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ آغاز سے اختتام تک یہ ایک بہترین تقریب تھی جس میں ادب کے افق پر جگمگاتے کئی ستارے ایک چھت کے نیچے موجود تھے اور اظہر جاوید صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سونان اظہر کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان کی درازی عمر اور صحت و سلامتی کے لئے دعا گو بھی تھے۔ اس سال کا تخلیق ایوارڈ محمد حنیف باوا کو عطا کیا گیا جسے ادبی حلقوں سے بہت پذیرائی ملی۔

جون کے شمارے میں سلطان اظہر نے "کھلی بات" کی صورت میں جس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی تلخی کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے اگر اسے سنجیدگی سے لیا جائے تو شاید ہم نسل نو کی بہتری کے لئے کوئی اقدام کرسکیں ورنہ شہرت و دولت کی دوڑ میں شامل نوجوان اپنی اخلاقی قدریں بھول کر اس معاشرے کے لئے ناسور بن جائیں گے اور بہتری کے تمام راستے مسدود ہوکر رہ جائیں گے۔ یہ قلمکاروں اور دانشوروں کے لئے بھی ایک لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اخلاقیات کی اس ڈوبتی ہوئی ناؤ کو کیسے سہارا دیتے ہیں اور سوشل میڈیا پر ریٹنگ اور شہرت و دولت کی ہوس میں مبتلا تمام حدود پار کرتے ہوئے نوجوانوں کو کیسے اس دلدل سے نکالنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ سرفراز سید، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اور تسنیم سحر کے محمد حنیف بابا کے حوالے سے لکھے گئے مضامین نہایت شاندار ہیں۔ بابا صاحب کی طبیعت، شخصیت، فن اور دنیائے ادب میں ان کے مقام پر بہترین روشنی ڈالتے ہوئے یہ مضامین ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ انہیں تخلیق ایوارڈ کا حقیقی حقدار بھی ثابت کرتے ہیں۔ گویا موسموں کی خوشبو پر محمود شام کا لکھا گیا مضمون بہت شاندار ہے۔ امریکہ کے مرحوم صدر جان ایف کینیڈی نے جن الفاظ میں شاعری کو خراج تحسین پیش کیا، ان الفاظ نے مضمون کی شان و شوکت میں اضافہ کیا۔ غلام حسین ساجد، پروفیسر قیصر نجفی، ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر جواز جعفری، ڈاکٹر عاکف شہزاد، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ اور پروین بخت قاضی کے لکھے گئے بہترین مضامین اس شمارے کا حصہ ہیں۔ "تخلیق" اپنے معیار پر سمجھوتہ نہیں کرتا۔ اس لئے بہترین مضامین کے علاوہ نظموں اور غزلوں کا چناؤ بھی نہایت عمدہ ہے اور کئی نامور شاعروں کی تخلیقات کو رسالے کی زینت بنایا گیا ہے۔ افسانوں میں فرحت پروین کا افسانہ خوف اور عطیہ سید کا افسانہ لاادری بہترین بہتہ کاری کے نمونے ہیں۔ "تخلیق" تقریب کے حوالے سے شاہد علی خان (مدیر الحمرا لاہور)، ڈاکٹر تو صیف زکریا، ڈاکٹر ایوب ندیم، احمد عطیٰ، ارشد طہرانی، ساجد حبیب (ڈاکس ایئر مارشل)، محمد عباس مرزا، عذرا اصغر، ذوالفقار کاظمی، شاہدہ دلاور شاہ اور سرفراز سید کے تاثرات کو بھی رسالے میں شامل کیا گیا ہے جو یقیناً تقریب کی کامیابی اور سلطان اظہر کی محنت کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ گیارہویں تخلیق ایوارڈ کی کامیابی کے ساتھ ساتھ رسالے کی کامیاب طباعت و اشاعت کے پیچھے تخلیق پینل کے علاوہ سلطان اظہر کی فیملی کا بھی بھرپور کردار نظر آتا ہے۔ مدیر سلطان کی شخصیت کی یہ خوبی ہے کہ ان سے پہلی ملاقات بھی پہلی نہیں لگتی۔ ان کا اپنائیت اور گرم جوشی سے بھرپور لہجہ ایک پل میں ہی اپنا بنا لیتا ہے۔ "تخلیق" سے جڑا ہر کردار مبارکباد کا مستحق ہے۔ دعا گو ہوں کہ پروردگار اس چمن کی آبیاری کرنے والوں کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ آمین!

شازیہ رباب (شیخوپورہ)

﴿18﴾ "تخلیق" کے آئندہ شمارے کیلئے چند منظومات، مضمون احمد ضیاء (اضافی نوٹ کے ساتھ) اور مضمون "دامن پہ کوئی چھینٹ" ارسال خدمت ہیں۔ چند روز تک پنجابی کا نفرنس کیلئے کینیڈا جانے کا پروگرام ہے۔ "تخلیق" کے پرچے بھی ساتھ ہوں گے۔ اللہ نے چاہا تو "تخلیق" کے حوالے سے دوستوں سے اچھی ملاقاتیں بھی ہو سکیں گی۔ مولا کریم آپ کی کوششوں میں برکت دے۔ "تخلیق" دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین!

انور ندیم علوی (نواب شاہ)

﴿19﴾ جون 2023 کا رسالہ موصول ہوا تو مدتوں پرانی کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس ادبی مجلّہ سے میرا تعارف اپنے مرحوم والد کے ذریعے سے ہوا تھا جب مجھے اردو پڑھنی ضرور آتی تھی لیکن ادبی تحاریر کے مطالعہ کا ذوق پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب کچھ سمجھ بوجھ پیدا ہوئی تو الماری میں قرینے سے رکھے ہوئے مجلّوں کو خوب لطف لے کر پڑھا اور والد کے ساتھ مل کر بھی پڑھا۔ اس کے بعد تعلیمی دور کی مصروفیات نے عرصہ تک ادبی رسائل وجرائد سے غافل کیے رکھا۔ میں بھی بھول بھال گئی اور کئی دہائیوں بعد جب جناب محمود شام صاحب کی برقی دیوار پر تخلیق کے بارے میں پڑھا تو نہایت خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی۔ بلا تاخیر پہلی فرصت میں تخلیق منگوایا اور بغور مطالعہ کیا۔ مجلّہ پڑھنے کے بعد یہ کہنے میں دوہری خوشی محسوس کر رہی کہ تخلیق کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کے پس پردہ وہی جنون کارفرما نظر آتا ہے جس نے ادب کی پرورش سے کبھی ہاتھ نہیں کھینچا اور اسی سبب اب تک یہ انجمن ادب میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ مدیر محترم سونان صاحب اور تخلیق کی تخلیقی ٹیم میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ میں دعا گو ہوں کہ آنے والی نسلیں اس مجلّہ کی اعلیٰ ادبی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کریں اور رہتی دنیا تک اردو ادب کو دوام رہے۔

نورین عامر (کراچی)

﴿20﴾ امید ہے بخیر وعافیت ہوں گے اور آپ یومِ آزادی کی مسرتوں اور موسمِ برسات کی راحتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہوں گے۔ ہم بھی سرشار ہیں۔ مجال نہیں کہ بجز سرشاری کسی اور کیفیت کا اظہار کریں۔ ہمارے آموں کا کچھ خیال ہو جائے لیکن یہ بیان بھی خطرے سے خالی نہیں۔ یار دوست سفید چونسا یا انور رٹول بھجوانے کی فرمائشیں نہ داغنے لگیں جبکہ فقیر راولپنڈی میں ہے ملتان میں نہیں۔ تو چلو آیئے! ''تخلیق'' شمارہ جون 2023ء کا جائزہ لیتے ہیں! ''پہلی بات'' میں بہت سی فکر انگیز اور خیال افروز باتیں کی گئی ہیں۔ بے شک احساس زندگی کی روح ہے۔ تمیز بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ کسی انسان کی پہچان علم سے نہیں اس کی تربیت ہوتی ہے — سونان جی! آپ کا یہ اداریہ کئی کتابوں پر بھاری ہے اور ''تخلیق'' ! انگریزی کے شہرۂ آفاق ادیب سمرسٹ ماہم نے کہا تھا ''دنیا کی بدصورتیوں اور تلخیوں سے فرار حاصل کرنے کا بہترین طریقہ کتابوں کا مطالعہ ہے۔'' میں اس قول میں یہ اضافہ کروں گا کہ دنیا کو خوبصورت بنانے اور خود کو سنوارنے کا ڈھنگ سیکھنا ہے تو ادبی پرچہ پڑھا کیجیے۔ ''تخلیق'' سرہانے رکھ کر، دفتر کی میز پر مہیا کر کے، کسی پارک کے گلشن ہٹ کی زینت بنا کر، کسی پیارے کو تحفہ دے کر بہت کچھ بدلا جا سکتا ہے! اس شمارے میں ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون ''فقیری کلچر'' پڑھنے کے لائق ہے۔ انہوں نے فرہنگ آصفیہ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ فقیر وہ لوگ ہوتے ہیں جو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز نہیں رکھتے ہیں۔ قلندروں کا تعلق اسی گروہ سے ہے جو دنیاوی معاملات سے دور رہتے ہیں اور طالبِ حق ہوتے ہیں — مولانا رومی کے حوالے سے ایک واقعہ مضمون کی یہ سطور پڑھتے ہوئے یاد آیا۔ ایک اجتماع میں ان سے کسی شخص نے سوال کیا کہ فقیر کون ہوتا ہے؟ آپ نے جواب دینے کی بجائے سکوت فرمایا۔ اس نے تین مرتبہ سوال کیا۔ آپ نے تینوں بار جواب نہیں دیا اور اٹھ کر چلے گئے۔ اس آدمی نے صدرالدین قونوی سے پوچھا کہ حضرت نے میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا؟ انہوں نے فرمایا ''نادان! انہوں نے تینوں دفعہ ایک ہی جواب دیا ہے جسے تو سمجھا نہیں۔ خاموش رہ کر تجھے سمجھا گئے

ہیں کہ جو سب کچھ جان کر خاموش رہے وہ فقیر ہوتا ہے۔'' میں ایک خوبصورت مضمون لکھنے پر ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔ ''ہزارہ میں جدت آہنگ ہزارہ رنگ'' بھی ایک عمدہ مضمون ہے۔ ''مکری مئی آفریقی'' کے کیا کہنے۔ پروفیسر غازی علم الدین نے دل جیت لیا۔ ڈاکٹر جواز جعفری ''عمارت کی سرگزشت'' خوب لکھ رہے ہیں۔ سید نصرت بخاری نے HEC'' کے منتخب رسائل اور مسائل'' میں اہم باتوں کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کا مضمون ''چودہ سالہ کا تارڑ'' پڑھ کر لطف آیا۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی　　　جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

اس شعر کے علاوہ یہ جملہ پڑھ کر سر دھنتا رہا ''اگر قلم کا سر جھکا ہوا ہو تو حرف بنتا ہے اور قلم کار کا سر جھکا ہوا ہو تو حرف آتا ہے۔'' واہ! واہ!

منظومات میں اسلم انصاری کی نظم ''جب تم عشق نہیں کرتے'' تاثر انگیز ہے۔ اب افسانوں پر بات ہو جائے: عذرا اصغر کا افسانہ ''وہ جب یاد آئے'' پڑھ کر آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ''دل ٹوٹا ہوا ہو جائے تو چہرے پر گئی آنکھیں بیکار ہو جاتی ہیں۔'' اور ''درخت بھی حس رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مالکوں کو پہچانتے ہیں۔ ان سے محبت کرتے ہیں۔ بس ہم انسان ان کی محبت کا ادراک نہیں رکھتے۔ وہ بھلا کیسے کٹرا رہتا۔'' بلاشبہ یہ ایک اثر دار افسانہ ہے۔ فرحت پروین کی تخلیق ''سفو بقی'' پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ دوستی، محبت اور خوبصورت صحبت تنہائی کے مارے انسانوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ افسانے میں درج یہ جملہ بہت سچا اور اچھا لگا ''ہاں زندگی بھی خوبصورت ہے اور اس کو سراہنے والی بھی۔'' ''محبت ایک مفروضہ'' ہمارے محترم پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے قلم کا اعجاز ہے۔ یہ ایک دلچسپ اور دل پذیر افسانہ ہے۔ فلسفہ اور منطق اور مفروضوں کی بنیاد پر ایک خوبصورت کہانی ترتیب دینا آسان نہیں۔ کوئی صاحب کمال فن ہی اس معیار کا افسانہ اتنی سہولت کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔ ابن مفتی کے فرزند ارجمند احمد مفتی سوشل میڈیا پر متحرک ایک جانی پہچانی ادبی شخصیت ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی ''خون آشام۔ ایک خوفناک کہانی'' اگرچہ دلچسپ ہے مگر اس معیار کی نہیں جس کی ان سے توقع تھی۔ وہ مات (از وسیم جبران)، دھنک کے رنگوں کی دھنک (از نفیس ریاض)، مٹی پہ تحریریں (محمد اسلم)، بجیا ایسے (شائستہ مفتی) اور وبا (اشاذیہ محسن خان) بھی اچھے افسانے ہیں۔ حصہ غزل میں یہ اشعار دل کو بھائے:

مانگے کوئی سحر کی دعا اس نگر میں کیوں　　　سب جانتے ہیں شب کی قضا پر وہ پوش ہے　　　(نصرت بخاری)
کم نہ تھا جہل کا عذاب نسیم!　　　اور اب کرب آگہی ہے بہت　　　(مسلم نسیم)
حسن کو صاحبی سی جچتی ہے　　　بات کچھ نوکری سے بنتی نہیں　　　(حسن عباسی)
خود کو صادق کہلوانے کے لیے　　　مجھ کو جھوٹی قسم کھانی پڑ گئی　　　(سرفراز تبسم)
ہر ایک شہر ہے کوفہ و شام سا میرا　　　ہجوم نوحہ گراں چار سو جدا سا ہے　　　(دلشاد احمد)
کتاب شعر و ادب ہے خیال کی دنیا　　　کمال تیغ قلم ہے یہاں پہ جو کچھ ہے　　　(کلیم احسان بٹ)

یادِ رفتگاں میں پروفیسر قیصر نجفی کی تحریر ''چند یادیں چند باتیں'' پسند آئی۔ میں گوہر رشید کے علی کے متعلق علی رضا اور بشریٰ رحمن کے بارے میں سوہان انجم جاوید کے تاثراتی مضامین بھی قابل داد و تحسین ہیں۔ جبار مرزا کا لکھا ''راولپنڈی کی ادبی روایت'' کا اجمالی جائزہ

مترادف ہے۔ فرزانہ علی سرور ہاشمی کی یہ تحقیق ہماری نظر سے نہیں گزری۔ جمیل احمد عدیل نے اکرم کنجاہی کی تصنیف "دبستانِ قلم کی نعت نگاری" پر ایسے دل نشیں پیرائے میں جائزہ پیش کیا ہے کہ قاری بے ساختہ داد دینے لگتا ہے۔

[شاعری، ترنم ریزی اور سازینے نے متحد ہو کر کیا قیامت برپا کی ہے؟ "ذوقِ سماع" سے عاری کیا سمجھ پائے گا!! جانے کیوں ہم آہنگ، رنگ، جمال، سے کر تفریق کر کے روحوں کو مجروح کرنے کے درپے ہو گئے ہیں؟ نعت گائی نہیں پڑھی جاتی ہے۔ نعت حضورؐ کی ذات ستودہ صفات سے قلبی تعلق کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔' میں اسی مقام پر ایک ہوش مند پارکھ نے 'سستی' کو نشان زد کر کے گویا قبلے کو درست کر دیا ہے۔"] یہ اور ان جیسے بہت سے خوبصورت اور تخلیقی نکتے جمیل احمد عدیل کی سحر کار تحریر میں جا بجا پڑھنے کو ملتے ہیں۔ "تخلیق" جون 2023ء کے ماتھے کا جھومر ہے یہ جائزہ۔ آپ اور آپ کے احباب کی خدمت میں سلام اور نیک تمنائیں۔

خاقان ساجد (راولپنڈی)

◆◆◆

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو اس میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی ایڈیٹر: محمود شام 0300-8210636	سہ ماہی ادب لطیف لاہور مدیر: مظہر سلیم مجوکہ 0333-4377794
سہ ماہی ادبی ڈائجسٹ کراچی مدیر: ضیاء الرحمٰن ضیاء 0300-2211187	سہ ماہی بک ڈائجسٹ لاہور مدیر: مظہر سلیم مجوکہ 0333-4377794	سہ ماہی ارژنگ لاہور مدیر: عامر بن علی 0300-4489310
ماہنامہ حکایت لاہور مدیر: عارف محمود 0323-4329344	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8430043

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	نظیری	خالد اقبال یاسر	0304-9947170	رمیل ہاؤس پبلی کیشنز، راولپنڈی	600/-
2	لوریاں (زیست)	محمد عباس مرزا	0300-4375871	الحمرا، ادارہ اردو بازار لاہور	1000/-
3	آرٹس ہاؤس	اقبال فہیم جوزی	0333-5900103	ورک پبلی کیشنز، چکوال	500/-
4	متفرقات	ڈاکٹر عبدالوسیم	0315-0569103	مکتبہ اسالیب، سرگودھا	300/-
5	بانجری	شہریار احمد خان	—	ادارہ بیاض، لاہور	400/-
6	زیتون والی پتی	نذیر قیصر	0310-4688568	علم و ادب ٹرسٹ پبلی کیشن، لاہور	630/-
7	ڈاکٹر ہارون الرشید کی ڈاکٹر وزیر	ممتاز عارف	—	مثال پبلشرز، فیصل آباد	800/-
8	بے صدا لمحے	شازیہ وہاب	—	مثال پبلشرز، فیصل آباد	600/-
9	تبسم زیر لب	ڈاکٹر عزیز فاروقی	0321-4044197	سنگی پبلشرز، لاہور	
10	لمحے قیصر	نعیم بے فوری	0315-7727829	سانجھ پبلی کیشنز، لاہور	900/-
11	جادوئی کہانیاں	محمود احمد قاضی	0300-4717801	حسن قلم پبلی کیشنز، گوجرانوالہ	400/-
12	کار زیاں	تسنیم احسان بٹ	0333-4377794	فوزی پرنٹ، اردو بازار لاہور	300/-
13	دہشتگری میں ہوا ہے	حسن عباسی	0322-2957776	رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی	500/-
14	گھروں کے نگران	خاور اعجاز	0302-8738393	52 E/2 سوان گارڈن، اسلام آباد	—
15	سماجی	خاور اعجاز	0302-8738393	شاہ حسن پبلی کیشنز، راولپنڈی	800/-
16	ثاقب سرائی	تسنیم احسان بٹ	0345-6882170	رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی	1,000/-

نوٹ: ادارہ "تخلیق" اپنی تمام پالیسیاں مجلسِ مشاورت کی باہمی رضامندی سے مرتب کرتا ہے۔ ادارے کو بغرض تبصرہ کے لئے دو کتابیں ارسال کریں۔ کسی بھی موصول ہونے والی ایک کتاب پر ادارہ تبصرہ نہیں کروا سکتا۔ کوئی مصنف / شاعر براہِ راست تبصرہ نگار سے تبصرہ کروا کر ادارے کو بھیجے گا تو وہ قابلِ قبول نہ ہو گا۔ ادارہ خود تبصرہ کرواتا ہے۔

(ادارہ تخلیق)

مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ کے زیر اہتمام مطبوعاتِ مولانا ظفر علی خاں

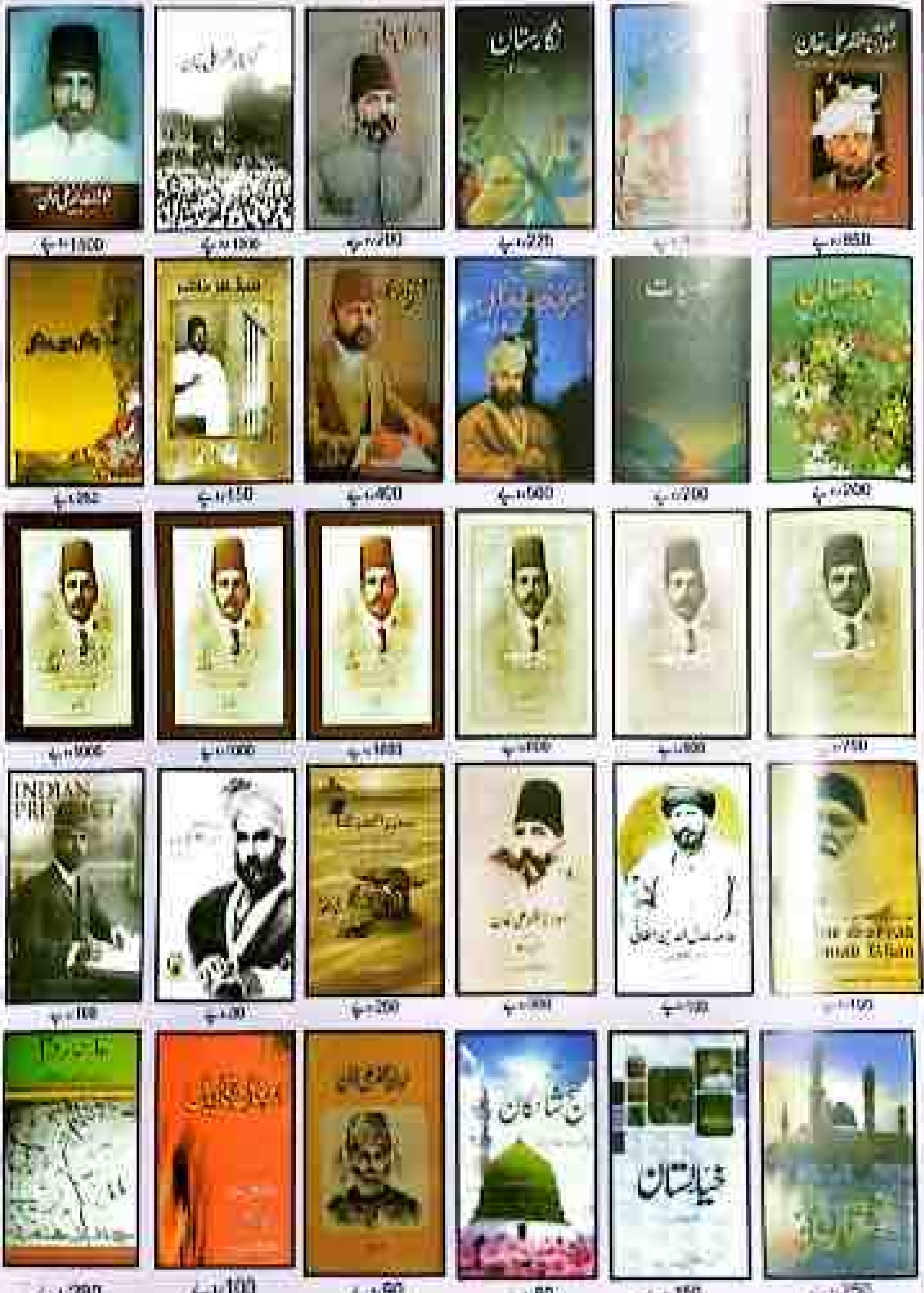

تمام کتب 30% رعایت پر دستیاب ہیں۔۔ رابطہ مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ 21 ڈون ایونیو مسلم ٹاؤن لاہور

فون نمبر 92-42-35846676+ ای میل info@maulanazafar.pk ویب سائٹ www.maulanazafar.pk

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE

September 2023

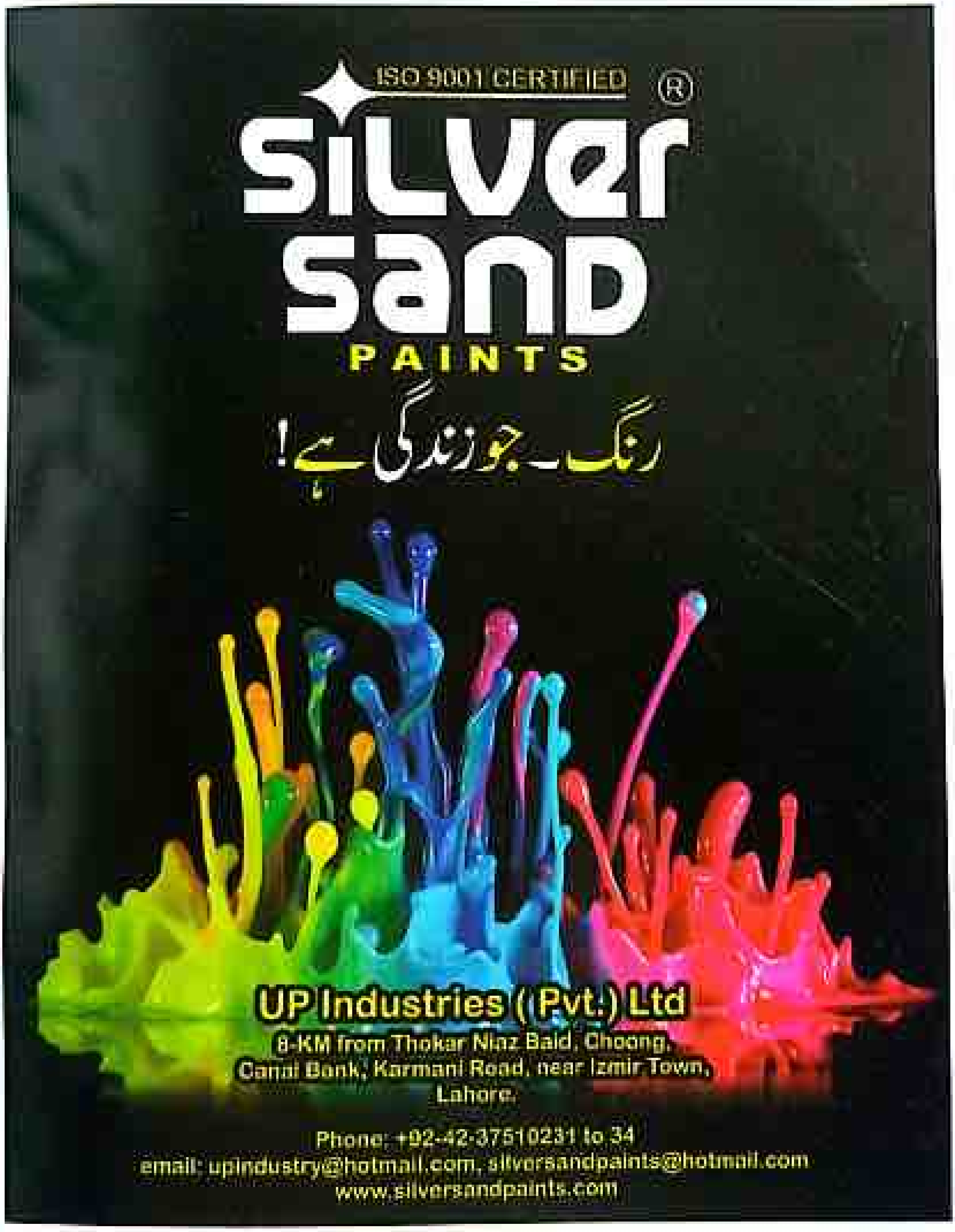

CS CamScanner